

سلطان

صلاح الدین

الکبیری



المکسرایم لے

عرض مصنف

تارنیں کرام۔ سلطان صلاح الدین ایوبی پر اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔ سلطان کی جس جگہ اور جن حالات میں پیدائش ہوئی اس سے قطعی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ نامقبول پچہ مسلمانان اسلام میں اس قدر مقبول ہو گا کہ اس کی جدائی پر ہر مسلمان کی آنکھیں اشکبار ہو جائے گی۔

آج کل بیت المقدس میں یہودیوں کے ہاتھوں جس تباہی، بربادی اور مسلمانان عالم کی بے حسی کا ہیں احساس دلا رہا ہے اس کے سبب ہمارے دل میں بے ساختہ ایک نئے صلاح الدین کی آواز ابھرتی ہے جس بیت المقدس کو حاصل کرنے کے لیے صلاح الدین ایوبی نے اپنی نیندیں حرام کیں بھوک پیاس کو تھج دیا۔ فرش مخمل کے بجائے گھوڑے کی پیٹھ کو بستر بنایا اور اپنی جوانی اور زندگی ختم کر دی کیا یہ سب کچھ اسی دن کے لیے تھا کہ بیت المقدس کے باشندے در بدر ہو جائیں۔ انہیں بیت المقدس کی فضا اور ہواؤں میں سانس لینے کی بھی اجازت نہ ہو اور مسجد اقصیٰ کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں

اب یہ ناول شروع کیجئے اور ایک اور صلاح الدین کو آواز دیجئے مجھے صلاح الدین کے بچپن اور آغاز جوانی کے بہت سے واقعات میں اختصار سے کام نہیں پڑا اس لیے کہ سلطان کے کارناموں کے اس قدر روشن مینار ہیں کہ میں ان کی چشمک زنی میں الجھ کے رہ گیا۔

اگر آپ کو سلطان کے بچپن کے تفصیلی حالات پڑھنا ہیں تو میرا "ناول نور الدین زنگی ضرور مطالعہ فرمائیں

والسلام

الماس (ایم اے)

عرض ناشر

سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی پر ملکی غیر ملکی زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جہاں تک غیر ملکی کتابوں کا تعلق ہے تو انہوں نے اس عظیم ہستی کو ایک سچا مسلمان اور اتنا ہی عظیم الشان فاتح ثابت کرنے کے بجائے صلاح الدین کو الف لیلیٰ کا شہزادہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ کس قدر منحہ خیز بات ہے کہ یورپی مورخین نے سلطان صلاح الدین اور شاہ رچرڈ کی والدہ کی فرضی داستان عشق بیان کرنے نہ صرف انگریز قوم کو بدنام کیا ہے بلکہ سلطان پر کچھ اچھا کر اس کے بے داغ وامن کو داندھار کرنے کی کوشش کی ہے

تعب کی بات یہ ہے کہ جس وقت رچرڈ کی والدہ جوش جوانی سے دیوانی ہو رہی تھی اس وقت صلاح الدین ایوبی کی عمر مشکل سے نو سال تھی اور وہ جاکہ دمشق میں وعظ سنا کرتا تھا ایک دوسرے الزام میں صلاح الدین کو ہتھمہ کے ذریعے عیسائی بنایا گیا ہے حالانکہ صلاح الدین اس قدر دیندار اور مسلمان تھا کہ اپنی موت سے پہلے صرف ایک ہفتہ سے قضا روزے رکھ رہا تھا اور شاہی طبیب کے منع کرنے کے باوجود وہ اس نیک کام سے باز نہ آیا

بہر حال آپ کے محبوب مصنف الماس ایم اے نے اس ناول میں ان تمام الزامات کو رد کرنے کی بھی پوری کوشش کی ہے مگر زبان دیبان کی شکستگی، تشبیہ و استعاروں سے پورا پورہ کام لے کر ناول کو انتہائی دلچسپ انداز میں آپ کے لیے لکھا ہے اللہ کرے زار قلم اور زیادہ

محمد علی قریشی

انتساب:- نور بجنوری کے نام

جو

میرا اچھا دوست اور بہت اچھا دوست ہے

جو

اردو شاعری کا ایک بڑا نام بلکہ بہت بڑا نام ہے

الماس - ایم - اے

261 خیبر بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

مصیبت کی رات

جنگ آزما گھوڑے اپنے سواروں کو آگے ہی آگے بھگائے لئے جا رہے تھے۔ افق پر بھی سفیدی اور سیاہی میں جنگ جاری تھی جھللاتے ستارے صبح کی آمد آمد پکار رہے تھے سواروں کے لباس گرد آلود اور چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ بدن تھکن اور زخموں سے چور راسیں ڈھیلی تھیں بس ہاتھوں میں اتنی طاقت تھی کہ گھوڑے کو سنبھالنے کے علاوہ راستے کا تعین کر سکیں لیکن انہیں صبح راستے کا تو علم ہی نہیں تھا گھوڑے انہیں جس سمت اڑائے لئے جا رہے تھے وہی ان کا نوشتہ تقدیر تھا اور سب اس پر شاکر تھے پھر صبح کاذب صبح صادق میں بدلی اور کہیں دور اللہ اکبر اللہ اکبر کی ایمان افروز صدا بلند ہوئی۔ اس آواز نے جیسے ان کے جسم میں تازگی پیدا کر دی حرارت اور جرات بھر دی گھوڑے رک گئے لشکریوں نے خلوص دل سے ہاتھ بلند کر کے دعا مانگی پھر وہ سب کے سب ایک سوار کے گرد جمع ہو گئے یقیناً ”وہ ان کا سردار ہی تھا۔“

سردار نے پاس کھڑے سوار سے کہا۔ ”اسامہ قریب ہی مسلمانوں کی کوئی آبادی معلوم ہوتی ہے۔“ پھر جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔ ”کیا ہمیں پناہ مل سکے گی؟“ سردار کے صرف ہونٹ ہلے تھے لیکن اسامہ نے ہونٹوں کی زبان پڑھ لی وہ بولا۔ سردار عالی مقام اب تو ہمیں خدا کے دامن عافیت میں ہی پناہ مل سکتی ہے کیا مسلمان کیا نصرانی، مصیبت کے اس وقت تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔“

اسامہ شیرازی کبھی قلعہ شیراز کا حاکم تھا دور سلجوقیہ کا یہ مستند مورخ اور صاحب سیف و قلم جوان حالات کے تھپیڑے کھاتا موصل پہنچا تو موصل کے گورنر عماد الدین زنگی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پہلے ملازمت اور دوستی پھر یہ دوستی اتنی بڑھی کہ لوگ اس دوستی کی قسم کھانے لگے حتیٰ کہ میدان جنگ میں جب زنگی کو شکست ہوئی تو شیرازی دشمن سے

امان مانگنے کے بجائے شکست خوردہ دوست کے ساتھ ہو لیا۔

شیرازی نے جو کچھ کہا عماد الدین زنگی اسے رد نہ کر سکا اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ”ٹھیک کہتے ہو اسامہ، پھر بھی مجھے فخر ہے کہ میرے ساتھ اس وقت بھی دو سو جانباز ہیں اور مجھے تم جیسے دوست کی رفاقت نصیب ہے لیکن میرے دوست! ہمیں کہیں نہ کہیں تو ٹھہرنا ہو گا۔ ہم کسی نامعلوم منزل کی طرف کب تک بھاگتے رہیں گے؟“

”ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں سردار محترم۔“ اسامہ نے مفکرانہ انداز میں کہا۔ ”شاید خدا کا دامن غایت یحییٰ مقام ہے۔“

”تمہارا خیال ہے ہمیں یہیں ٹھہرنا چاہئے؟“ زنگی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں سردار۔“ اسامہ اطمینان سے بولا۔ ”ہوا کے دوش پر گونجتی ہوئی اللہ اکبر کی اس آواز پر غور کیجئے اس میں کتنا رس کتنی نیکی کیسا ٹھہراؤ اور کتنا اطمینان ہے میدان جنگ میں یہ کفار کے دلوں کو دہلاتی ہے لیکن مصائب کی گھڑیوں میں یہی آواز زمنوں پر چھا رکھتی ہے ہمارے لئے تو یہ بشارت ہے انتقام سفر کا اعلان ہے تین دن اور رات ہمارے گھوڑوں نے بے آب و گیہا منزلیں طے کی ہیں انہیں بھی سکون کی ضرورت ہے۔“

عماد الدین زنگی فوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور بولا۔ ”ہم تمہاری رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ پانی تلاش کیا جائے۔ ہم حضور باری تعالیٰ میں سجدہ نیاز پیش کریں گے کیا پتہ ہمیں پھر اس کا موقع نہ مل سکے۔“

زنگی کی تقلید میں تمام سوار گھوڑوں سے اتر پڑے تو اسامہ نے کہا۔ عالی مقام سردار۔ پانی ہم سے دور نہیں ہم دریائے وجلہ کے دائیں کنارے پر چل رہے ہیں بہتر ہو گا کہ ہم وضو کے لئے دریا پر چلیں۔“

اسامہ کی یہ بات بھی مان لی گئی سب نے دریا کا رخ کیا گھوڑے سواروں سے آزاد ہو گئے لیکن ان وفاداروں نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کی جیسے انہیں اپنے سواروں کے ارادے کی خبر ہو گئی تھی وہ کنویںوں سے کنویاں ملا کر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے پیردار خطرے کی بو پا کر اپنے کان کھڑے کر لیتے ہیں وجلہ دور نہ تھا سب نے وضو کر کے باجماعت نماز ادا کی۔

دعا سے فارغ ہوتے ہوتے سویرا ہو گیا۔ خورشید عالم تاب نے سنہری کرنیں بکھیرنا شروع کیں اور پھر اس وقت سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے جب انہیں دریا کے اس پار بلند جٹان پر ایک قلعہ چمکتا نظر آیا۔ ”قلعہ!“ زنگی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”قلعہ ہماری پناہ گاہ۔“ اسامہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

عماد الدین کا دل امید و ہم سے دھڑکنے لگا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ ہمارے لئے قید خانہ بھی تو بن سکتا ہے۔“

ناامیدی گناہ ہے سردار محترم۔“ اسامہ نے زنگی کو ٹوک دیا۔ ہم کو اپنے اللہ سے بھلائی کی امید رکھنی چاہئے۔

عماد الدین زنگی نے کوئی جواب نہ دیا زنگی کیا اس قوت تمام لشکر امیدو ناامیدی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا؟ کس کا قلعہ ہے؟ کیا ہو گا پناہ یا قید؟ ہر ایک اپنے اپنے طور پر سوچ رہا تھا آخر اسامہ نے سکوت توڑا۔ ”سردار محترم مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔“

”کہاں قلعے میں؟“ عماد الدین زنگی نے پریشانی سے دریافت کیا۔

”میرے خیال میں یہ تھکرت کا قلعہ ہے۔“

”اس کا مالک کون ہے؟ زنگی نے سوال کیا۔“

”اگر یہ شادی ابن مروان کا بیٹا ہے تو خدا ہماری ضرورت مدد کرے گا۔“

زنگی نے بے چینی سے پوچھا۔ ”نجم الدین سے ملے ہو؟“

”نہیں سردار محترم۔“ اسامہ نے بتایا۔ ”البتہ شادی سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے کا نام نجم الدین ایوب ہے اور دوسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں وہاں پہنچ کر سب کچھ معلوم کرتا ہوں مجھے اجازت دیجئے سردار؟“

”نہیں اسامہ۔“ زنگی سخت لہجے میں بولا۔ ”عماد الدین خود غرض نہیں ہے۔۔۔ پھر تم جیسے دوست کو گموا دینا بھی کوئی عقلمندی نہیں دوست دشمنی کا کچھ پتہ نہیں تم کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہو۔“

”سردار محترم“ اسامہ نے عاجزی سے کہا۔ ”ڈوبنے کو تھکے کا سہارا ہوتا ہے ممکن ہے یہ شادی کا بیٹا ہو اس سارے کو نظر انداز کر دینا بھی عقلمندی نہیں۔“

زنگی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”تم جا سکتے ہو لیکن تمنا نہیں ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ ایک ساتھ جیئے ہیں تو موت کو بھی ایک ساتھ ہی لیک کر لیں گے۔“

اسامہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ فرط مسرت سے بولا ”آپ کے جذبات دوستی کا عظیم سرمایہ ہیں سردار محترم لیکن میری جان صرف میرے لیے ہے اور آپ کی زندگی سے بہت سی زندگیاں وابستہ ہیں۔ قلعے میں تمنا میں ہی جاؤں گا۔“

عماد الدین زنگی اور اسامہ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ انکار اور اقرار کی یہ تکرار اور بھی طول کھینچی کہ باتیں

کرتے کرتے اچانک زنگی کی نظر دریا کے اس پار پڑی اور وہ ایک دم چپ ہو کر رہ گیا۔
 ”خدا خیر کرے یہ کشتی....“ زنگی نے گھبرا کر دریا کی طرف اشارہ کیا۔ اسامہ اور سب نے دیکھا کہ ایک چھوٹی کشتی، قلعے کے ساحل سے آہستہ آہستہ اس طرف آرہی ہے۔ زنگی نے خیال ظاہر کیا۔ ”قلعہ والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔“

”یہ کشتی امن و سلامتی کا پیغام ہے۔“ اسامہ نے مسکرا کر کہا۔ سردار محترم مجھے یقین ہے کہ قسمت ہمیں صبح جگہ لے آئی ہے۔ آپ یہیں ٹھہریں میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا تو زنگی اور اس کے لشکریوں کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ وہ دم بخود کھڑے آتی ہوئی کشتی کو دیکھ رہے تھے۔

کشتی ان سے کچھ دور ساحل سے آگئی اسامہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ زنگی نے گنتی کی کشتی سے پانچ آدمی اترے یہ پانچواں مسلح تھے اسامہ آنے والوں سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد آنے والے کشتی میں سوار ہو کر قلعے کی طرف واپس چلے گئے اور اسامہ زنگی کی طرف واپس آگیا۔ سب کے چہرے زرد تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اسامہ کے چہرے پر متانت تھی زنگی کو اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی وہ سوالیہ نظروں سے اسامہ کو دیکھ رہا تھا اسامہ زنگی کے پاس آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں بار بار ساحل کے اس پار اٹھ رہی تھیں کشتی دوسری طرف پہنچ چکی تھی اور کشتی کے سوار، ساحل کی پناہوں میں کہیں گم ہو چکے تھے۔

”مجھے اب بھی خدا کی ذات سے امید ہے سردار محترم۔“ آخر اسامہ نے لب کھولے لیکن اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ آواز کی اس ہلکی لرزش کو عماد الدین زنگی نے فوراً پہچان لیا۔

زنگی نے افسردہ آواز میں کہا۔ ”تقدیر میں جو کچھ ہے وہ تو پیش آگری رہے گا تم بتاؤ تو سہی یہ کون لوگ تھے اور کیا جواب دیا انہوں نے؟“

”ہیں تو وہی لوگ جن کا میں نے اندازہ لگایا تھا لیکن ان کی دوستی کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے میں نے قلعہ والوں کو مختصر حالات سے آگاہ کر دیا ہے اور نجم الدین ایوب سے پناہ کی درخواست کی ہے۔“

عماد الدین سمجھ گیا کہ ابھی اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا باقی ہے اس لئے خاموشی اختیار کر لی اسامہ خود کسی ابھن میں تھا اس لیے زنگی نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک گھنٹے کے مبر آزا انتظار کے بعد کشتی واپس آئی دکھائی دی تو دیکھنے والوں کی دھڑکنیں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئیں اسامہ نے آہستہ سے کہا۔ ”سردار محترم میں

قسمت کا فیصلہ سننے جا رہا ہوں میری آواز شاید آپ تک نہ پہنچے اگر میں ہاتھ ہلا کر واپسی کا اشارہ کروں تو آپ فوراً گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھ جائیں۔“ یہ کہہ کر جب اس نے کشتی کی طرف قدم بڑھائے تو زنگی نے دیکھا کہ اسامہ کے پیر لڑکھڑاپے تھے زنگی کا دل پھٹنے لگا۔

کشتی کنارے آگئی۔ اس میں صرف ایک آدمی سوار تھا۔ وہ کشتی سے اتر کر اسامہ کے پاس آیا اور باتیں کرنے لگا زنگی کی نظریں اسامہ کے اشارے پر لگی تھیں اور دھڑکنوں سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا اسامہ اور آنے والے میں صرف چند باتیں ہوئیں پھر اسامہ اشارہ کرنے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زنگی کی طرف واپس آگیا۔ زنگی کو یہ نیک شگون معلوم ہوا اور اس کے قدم بھی بے اختیار اسامہ کی طرف اٹھنے لگے۔ اسامہ قریب پہنچا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی زنگی سے پٹ گیا۔ الحمد للہ ہم کچھ دن قلعہ میں رہ سکیں گے۔“ اسامہ نے کہا۔

”الحمد للہ“ زنگی نے بھی زیر لب کو سراہا۔

”آپ گھوڑے منگوا لیجئے۔ ہمارے لیے کشتیاں آرہی ہیں۔“ اسامہ زنگی کو یہ مژدہ جانفزا سن کر واپس چلا گیا۔

عماد الدین نے واپس آ کر لشکریوں کو خوشخبری سنائی تو ان کے مردہ جسموں میں گویا جان آگئی وہ سب اپنے گھوڑوں کی طرف بھاگے دم کے دم لشکری گھوڑوں پر سوار ہو کر زنگی کے پاس آئے زنگی کی نظریں وجہ کے پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ وجہ کے سینے پر درجنوں بڑی بڑی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کشتیوں کا رخ اسی کنارے کی طرف تھا کشتیاں کنارے آ گئیں تو ساتھ آئے ہوئے عمال اور غلام سامان بار کرنے کے لئے خشک پر آ گئے لیکن ان کے پاس سامان ہی کیا تھا میدان جنگ سے بھاگنے والوں کے ساتھ سامان کب ہوتا ہے۔“ وہ تو صرف اپنی جان لے کر ہی بھاگتے ہیں جنگی گھوڑے اپنے مالکوں کا اشارہ پا کر مع ساز و سامان، کشتیوں پر پہنچ گئے۔

قلعے سے آنے والا واحد آدمی بڑی پھرتی سے غلاموں کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ جتنا پھرتا تھا، اس کا لہجہ اتنا ہی کرخت اور وحشیانہ تھا اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک کوڑا تھا کوئی غلام ذرا غلطی کرتا تو وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچتا اور اس کا کوڑا ہوا میں گردش کر کے غلام کی پیٹھ سے یوں نکراتا کہ جب اسے کھینچا جاتا تو کپڑے کی دھجیوں کے ساتھ کھال بھی ادھر آتی۔ عماد الدین زنگی اس جوان کی وحشیانہ حرکتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس جوان کا کوڑا کسی پر برستا تو دیکھنے والوں کی چیخیں نکل جاتیں لیکن

شادی کے بڑے بیٹے نجم الدین کو دے دیا اس وقت سے نجم الدین اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ سکریت پر حکمرانی کرتا رہا تھا۔ کہنے کو تو بغداد میں عباسی خلیفہ المرشد کی حکومت تھی لیکن اصل طاقت سلطان محمود سلجوق کے ہاتھ میں تھی سلجوقی خاندان نے عباسیوں کے زوال پذیر عہد میں بڑا نام پیدا کیا لیکن صرف ایک سو سال حکومت کرنے کے بعد سلجوقیوں کا شیرازہ بھی بکھر گیا اور پھر ۱۱۳۲ء میں سلطان محمود سلجوق کا انتقال ہوا تو اس خاندان کا چراغ بھی گل ہو گیا۔

سلطان محمود کے مرتے ہی اس کے بیٹوں میں جانشینی کے لئے خنزیر لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا سلطان محمود نے اپنی زندگی میں چھوٹے بیٹے داؤد کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن وہ صرف پندرہ سال کا بچہ تھا اس کے دو بھائی سلجوق شاہ سلجوق اور سلطان مسعود سلجوق زیادہ با اثر تھے سلجوق شاہ نے فوراً بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اس کا ساتھ خوزستان اور فارس کے حاکم قزاج ساقی نے دیا۔ سلطان مسعود اپنے باپ کے پاس قونیہ میں تھا۔ وہ بھائی کو بغداد سے نکالنے کے لئے لشکر لے کر چلا دیا موصول عماد الدین زنگی بھی سلطان مسعود کی مدد کے لئے موصول سے بغداد روانہ ہوا سلجوق شاہ کو زنگی کے آنے کی خبر ملی تو اس نے قزاج ساقی کو اس کے مقابلے پر بھیجا۔ بغداد سے کچھ دور معشوق کے مقام پر دونوں میں زبردست جنگ ہوئی عماد الدین زنگی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح زنگی نے دو سو سواروں کے ساتھ بھاگ کر قلعہ سکریت میں پناہ حاصل کی۔

عماد الدین زنگی اپنے سواروں کے ساتھ دوپہر سے قبل قلعہ سکریت پہنچ گیا۔ بظاہر زنگی کو پناہ مل گئی تھی اور محفوظ تھا لیکن ایک نامعلوم خوف آب بھی اس کے دل میں سایا ہوا تھا۔ تخت نشینی کی جنگ نے ہر طرف آگ لگا رکھی تھی ہر گورنر اور قلعہ دار اپنے مفاد کی خاطر دوسرے سے برسرِ پیکار تھا ایسے میں کس پر اعتبار کیا جاتا کیا پتہ کل نجم الدین بھی لالچ میں آکر زنگی کو دشمنوں کے حوالے کر دے زنگی کا خوف اس وجہ سے بجا تھا قلعہ میں پہنچتے ہی جراحوں اور میسوں نے زخموں کا علاج شروع کر دیا۔ تمام سواروں کو نیا لباس مہیا کیا گیا انہیں آرام دہ بیروں میں ٹھہرایا گیا کھانے پینے کا معقول انتظام ہو گیا لیکن زنگی پھر بھی سہا سہا تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ نجم الدین سے ملے اور اپنے محسن کا شکریہ ادا کرے لیکن نجم الدین اسے کہیں نظر نہ آیا قیام و طعام کی تمام ذمہ داری اسی وجہ و کلیل اور تند خو جوان کے ہاتھ میں تھی اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے رہا تھا۔

زنگی نے دوپہر کے کھانے پر نجم الدین کا انتظار کیا۔ پھر دوپہر سے شام ہو گئی۔ نہ تو

زنگی کے چہرے پر خوشی کی سرفی جھلک جاتی۔ زنگی کو اس کی ظالمانہ روش شاید اس لیے پسند آتی تھی کہ وہ خود بھی اس رعب طعناق اور ٹٹنے کو پسند کرتا تھا زنگی کے غلام اور عمال اس سے اسی طرح سسے سسے تھے جو حال اسے اس نوجوان کے غلاموں کا نظر آ رہا تھا عماد الدین نے کئی بار چاہا کہ اس نوجوان سے مخاطب ہو اور اس کا شکریہ ادا کرے لیکن نوجوان نے زنگی کو یہ موقع نہیں دیا اس نے زنگی کی طرف توجہ نہیں دی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نوجوان کی نظر میں زنگی کی اہمیت اس کے غلاموں سے بھی حقیر ہو۔ یا پھر وہ اپنے کام میں اتنا مست تھا کہ کسی اور طرف توجہ دینا اس کے اصول کے خلاف تھا زنگی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اسامہ یہ کون ہے؟“

”غلام بدماغ“ اسامہ بڑبڑایا۔ پتہ نہیں کون ہے میں نے نام پوچھا تو مجھ پر چیخ پڑا عجیب وحشی آدمی ہے۔“

..... لیکن زنگی کو اس کی یہ وحشت کچھ ایسی پسند آئی کہ قلعے میں داخل ہونے تک اس کی نظریں اس دراز قامت گورے بچے اور تند خو جوان کا تعاقب کرتی رہیں۔

قلعہ سکریت کے حاکم نجم الدین ایوب کا باپ شادی ابن مروان ثمالی آرمینہ کے دارالحکومت وادین کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں اوجانہ کان کا رہنے والا تھا شادی نسلانہ تو عرب تھا اور نہ ہی ترک بلکہ اس کا تعلق کردوں کے روادیدہ قبیلے سے تھا کرد قبائل ایران اور ایشیائے کوچک کے درمیان پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں خانہ بدوش جیسی زندگی گزارتے تھے یہ قبائل اپنی جان بازی لوٹ مار مہمان نوازی اور عزت و ناموس کی حفاظت کے معاملے میں قبل اسلام کے عربوں سے ملتے جلتے تھے کھیتی باڑی سے زیادہ تاخت و تاراج ان کا پیشہ تھا شادی ابن مروان کثیر الاولاد تھا محمود آمدنی میں گزر بسر نہیں ہوتی تھی اس لئے مجبور ہو کر اس نے وادین کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا اور بغداد کا رخ کیا اس نے کسی سے سنا تھا کہ بغداد کا عباسی خلیفہ بہادروں کا قدر دان ہے اور انہیں انعام و اکرام سے نوازتا ہے شادی خود بہادر تھا۔ اس کے دو جوان بیٹے نجم الدین ایوب اور اسد الدین شجاعت اور حوصلہ مندی میں اپنا جواب آپ تھے اس بہادری کی قدر بغداد ہی میں ہو سکتی تھی۔

شادی بن مروان کے بغداد آنے کی یہ وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کا ایک ہم وطن اور دوست بہروز اس قوت بغداد کا گورنر تھا۔ اس لیے شادی نے قسمت آزمائی کے لیے بغداد کا قصد کیا اور یہی وجہ زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب بغداد پہنچ کر شادی اپنے دوست بہروز سے ملا تو اس نے دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا اور قلعہ سکریت

نجم الدین نے زنگی کو اپنے پاس بلوایا اور نہ ہی خود ملاقات کے لئے آیا زنگی کے لیے نجم الدین کا یہ رویہ حیران کن ہونے سے زیادہ پریشان کن تھا۔ آخر زنگی نے اسامہ سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”قلعہ دار نجم الدین اب تک نظر نہیں آئے وہ ہمارے محسن ہیں ہم ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔“

اسامہ بھی اسی ادب پر بن میں تھا۔ یہ بات کچھ عجیب ضرور ہے لیکن ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہئے انہوں نے اتنے اچھے انتظامات کرا کے مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے۔
”اسامہ۔“ زنگی نے بے چینی سے کہا۔ ”کیس یہ قلعہ ہمارے لئے قید خانہ نہ بن جائے یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے کہ میزبان اپنی شکل تک نہیں دکھاتا ہمیں تو کچھ ڈال میں کالا نظر آتا ہے۔“

اسامہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آپ حکم دیں تو میں نجم الدین سے ملنے جاؤں میں ان سے کہوں گا کہ والئی موصل آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔“
”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ زنگی نے تائید کی۔ ”نجم الدین سے کہنا کہ اس ملاقات کا مقصد ان کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔“

اسامہ نجم الدین سے ملنے گیا لیکن نجم الدین نے اس سے ملاقات نہیں کی اس نے کھلوا دیا کہ رات کو وہ خود والئی موصل سے ملنے آئے گا اسامہ اپنا سامنہ لے کر واپس آ گیا زنگی کو اور پریشانی ہوئی لیکن رات کی ملاقات کے وعدے نے انہیں سہارا دیا رات ہوئی کھانے کا وقت ہو گیا مگر نجم الدین نہیں آیا زنگی سے اچھی طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا نوالہ بار بار اس کے حلق میں اٹکتا تھا اسامہ بھی گھبرایا ہوا تھا کھانے کے بعد وہی تند خو جوان زنگی کے پاس آیا نہ سلام نہ دعا اور بڑے کرخت لہجے میں زنگی کو مخاطب کیا۔ والئی حلب و موصل اپنے دل میں بدگمانی کو جگہ نہ دیں برادر بزرگ نجم الدین ایوب قلعہ دار تکریت صبح ملاقات کے لئے آئیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ بغیر جواب کا انتظار کئے واپس چلایا گیا۔

اسامہ کو اس کا یہ انداز پسند نہ آیا اس کے خیال میں جوان کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ قلعہ عجیب طلسماتی قسم کا ہے میزبان کا یہ حال ہے کہ ہم لوگ ان کی صورت دیکھنے کو ترس رہے ہیں اور ان چھوٹے سردار کو دیکھا آپ نے کتنا بد تمیز اور اکھڑ آدمی ہے۔ نہ تہذیب سے واقف اور نہ ہی گفتگو کا سلیقہ۔“

زنگی نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”یہ سرکش اور خود سر جوان کون ہے؟“
”یہ چھوٹا سردار ہے۔“ اسامہ نے نفرت سے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام اسد

الدین ہے یہ نجم الدین کا چھوٹا بھائی ہے مگر بات ایسے غرور سے کرتا ہے کہ جیسے قلعہ تکریت کا حاکم ہی ہے۔“

”اس کے علاوہ بھی کوئی اور عیب ہے، اس جوان میں؟“

اسامہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے دل کا سارا غبار اگل دیا۔ ”سردار محترم کوئی ایک عیب ہو تو بیان کیا جائے۔ تکریت کے فوجی اسے دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ کو تو ال اس سے آنکھیں چراتا ہے۔ یہ حضرت دن بھر خدائی فوجدار بنے لوگوں کے جھگڑے چکاتے پھرتے ہیں اور رات کو قلعے کی چوکیداری کرتے ہیں اور۔۔“ اسامہ نے ادھر ادھر دیکھا پھر راز دارانہ انداز میں بولا۔ ”سردار عالی مقام مجھے ایک فوجی نے بتایا ہے کہ یہ صاحب زادے آج کل ایک ایرانی لڑکی سے عشق بھی لڑا رہے ہیں۔“

زنگی کو ہنسی آگئی۔ اسامہ، تم نے جتنی باتیں کی ہیں ان میں عیب کی کوئی بات نہیں۔ اسد الدین کا لہجہ، تمہیں سخت و کرخت معلوم ہوتا ہے لیکن سرداری کی یہی شان ہے سچ پوچھو تو اس جوان کی رعب دار آواز مجھے بے حد پسند آتی ہے۔ اسد الدین میں مجھے ایک زبردست حکمران کے جوہر نظر آتے ہیں۔“

اسامہ کو اسد الدین دل سے پسند نہ تھا لہذا اس نے زنگی کا تبصرہ بڑی بے دلی سے سنا اور تھوڑی دیر باتیں کر کے اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

زنگی کو ملاقات کا مژدہ مل چکا تھا پھر بھی اس کا دل کچھ بے چین تھا اس نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ اس نے کمرے میں ٹھلنا شروع کر دیا اور یونہی ٹھلنے ٹھلنے صبح ہو گئی فجر کی اذان قلعے کے ایک اونچے برج سے بلند ہوئی تو زنگی نے راہداری میں نکل کر دیکھا ابھی چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا معا اس کی نظر فسیل پر جانے والے زینے پر پڑی زینے سے اسد الدین بڑی تیزی سے اتر رہا تھا چار شمع بردار اس کے پیچھے تھے۔ زینے سے اتر کر وہ قلعے کے صدر دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھلوا کر تنہا باہر چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا عماد الدین زنگی کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا۔ اسد الدین کا فسیل سے باہر جانا اور صدر دروازے کا بند ہونا بڑا معنی خیز تھا۔ زنگی بھاگ کے اسامہ کے کمرے میں گیا اسامہ ابھی سو رہا تھا زنگی نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ زنگی کو پریشان دیکھ کر اس کے بھی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ ”سردار محترم خیریت تو ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟“

زنگی نے جو کچھ دیکھا تھا جلدی جلدی کہہ سنایا۔ اسامہ سوچ میں پڑ گیا۔
”اسامہ اب سے ٹھیک چوبیس گھنٹے پہلے ہم وجہ کے کنارے پہنچے تھے۔ کہیں ہمارا

دشمن پیچھا کرتے ہوئے تو یہاں نہیں آگیا۔ زنگی نے خدشہ ظاہر کیا۔

اسامہ نے سر اٹھا کر زنگی کو دیکھا تو اس کا چہرہ مر جھا گیا۔ ”والہی موصل کو اللہ کے ذات سے امید رکھنی چاہئے اگر قزاجہ ساقی نے ہمیں گھریا ہے تو ہمارے بھاگنے کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ لیکن نجم الدین کرد ہے مہمان نوازی ان قبائل کا طرہ امتیاز ہے میرا دل کہتا ہے قزاجہ ساقی اپنی کوشش میں ناکام رہے گا۔“

عماد الدین زنگی کا دل ڈوبنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ فرا کی بھی کوئی صورت نہیں تھی آخر اس نے حالات کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا جس خطرے سے وہ بھاگ کر قلعہ نکرتے میں پناہ گزین ہوئے تھے، وہ خطرہ موت کی طرح ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں بھی آ پہنچا تھا اسامہ نے اٹھ کر دروازے سے راہ داری میں جھانکا پھر جبکہ کر پیچھے ہٹا اور ہاتھ کے اشارے سے زنگی کو قریب بلایا۔ زنگی نے بھر باہر جھانکا راہداری کے اختتام پر قلعہ کا صدر دروازہ بند ہو رہا تھا۔ اسامہ الدین صدر دروازے سے گزر کر راہداری میں آگیا تھا اسے زنگی کے دروازے کے سامنے سے گزر تھا زنگی اور اسامہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئے چند لمحوں بعد اسامہ نے پھر جھانکا تو اس کی نظر راہداری کے دائیں جانب اٹھ گئی۔ ادھر سے بھی ایک قوی پہل ”ادھڑ عمر کا آدمی“ چند مسابہوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ قد و قامت میں یہ اسامہ الدین کے لگ بھگ تھا لیکن اس کی عمر اسامہ الدین سے آٹھ دس سال زیادہ معلوم ہوتی تھی اسامہ نے پلٹ کر آہستہ سے کہا۔ ”بائیں طرف سے اسامہ الدین اور دائیں جانب سے شاید قلعہ کا حاکم نجم الدین آ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نجم الدین ہی ہے۔“

زنگی نے ذرا سی گردن نکال کر اندر کھینچ لی اور بولا۔ ”ضرور یہ اسامہ الدین کا بھائی ہے۔ وہی ذیل ڈول اور وہی شاہانہ چال۔“

اسامہ الدین اور نجم الدین کی ملاقات اسامہ کے کمرے کے دروازے کے سامنے ہوئی انہیں یہ احساس نہ ہو سکا کہ وہ دو معزز مہمان کھلے دروازے میں اندر کھڑے ہیں نجم الدین نے ذرا پریشانی سے پوچھا۔ ”اسامہ الدین تم قلعے سے باہر کیوں گئے تھے؟“

اسامہ الدین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”ہاں برادر محترم۔ میں باہر گیا تھا ان کتوں سے ملنے۔“

”کون کتے۔ کس کا ذکر کر رہے ہو۔ کون ہے قلعے کے باہر؟“ نجم الدین نے ایک ہر سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

اسامہ الدین ہونٹ چبا کر اور مٹھیاں بند کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ کتے خوزستان اور فارس

والے قزاجہ ساقی۔“

قزاجہ ساقی کا نام جیسے ہی عماد الدین زنگی کے کانوں سے نکلایا، وہ اسامہ کو پیچھے دھکیں کر راہداری میں پہنچ گیا۔ اسامہ الدین اور نجم الدین دونوں نے زنگی کو حیرت سے دیکھا۔ عماد الدین نے پر شکوہ لہجے میں کہا۔ ”والی موصل اپنے میزبان کو سلام عقیدت و غلوص پیش کرتا ہے۔ برادر عزیز دشمن تمہارے قلعے تک پہنچ چکا ہے تمہیں ہماری قسمت کا فیصلہ کرنا ہے لیکن یہ فیصلہ راہداری میں کھڑے ہو کر نہیں ہونا چاہئے۔ اندر بیٹھ کر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔“

اسامہ الدین زنگی کو پہچانتا تھا لیکن نجم الدین نے اسے اب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ حیرت سے زنگی کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”برادر محترم۔ یہ حلب و موصل کے گورنر عماد الدین زنگی ہیں۔“ اسامہ الدین نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے زنگی کا اپنے بھائی سے تعارف کرایا۔

نجم الدین نے بڑی محبت سے اپنے بازو پھیلا دیے۔ زنگی بھی ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا اور وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور زنگی نے کہا ”اے نکرت کے عظیم حاکم۔ تم ہمارے بارے میں جو فیصلہ کرو گے، ہمیں منظور ہو گا۔ چاہو تو ہمیں دشمن کے حوالے کر دو اور چاہو تو اتنی مہلت دے دو کہ ہم تمہارے قلعے سے کہیں بہت دور نکل جائیں۔“

”حوصلہ رکھیے والی موصل..... حوصلہ۔“ نجم الدین نے پیار سے کہا۔ اور زنگی کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے گیا۔

اسامہ نے اب سے نجم الدین کو سلام کیا۔ زنگی نے اسامہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ ہے میرا جانباز دوست اسامہ شیرازی وقت وقت کی بات ہے کبھی یہ اسلامی سرحد کے سب سے مشہور قلعے شیراز کے قلعہ دار تھے لیکن حالات نے انہیں مجھ تک پہنچا دیا۔“

نجم الدین نے زنگی کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی اسے باہر کے حالات معلوم کرنے کی فکر تھی اس لئے اسامہ سے پوچھا۔ ”ہاں اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے تھے۔“

اسامہ الدین کا غصہ اب تک کم نہیں ہوا تھا۔ ”برادر محترم رات کے پچھلے پہر میں فصیل پر تھا کہ دجلہ پار مجھے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اندھیرے کی وجہ سے ان کے چہرے مجھے نظر نہ آ سکے پھر کچھ دیر بعد انہوں نے شمعیں روشن کیں تو میں نے دیکھا کہ دجلہ کے اس طرف ہزاروں سوار کھڑے آپس میں جیسے صلاح مشورہ کر رہے ہیں۔ میں محافظوں کو ہوشیار اور خبردار کرتا ہوا فصیل سے اترا اور سیدھا ان کے پاس پہنچا۔“

”تم اکیلے گئے تھے؟“ نجم نے سختی سے پوچھا اس کے سخت لہجے نے اسامہ الدین کو نرم

”کیا کہا؟“ نجم الدین نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اور کیا حماقت کی تم نے؟“
”میں نے راجہ ساقی کو جواب دے دیا ہے۔“

نجم الدین آپے سے باہر ہو گیا۔ ”بغیر میرے مشورے کے تمہیں جواب دینے کی
ات کیسے ہوئی۔ کیا جواب دیا تم نے؟“
”وہی جواب برادر بزرگ! جو ایک کرد کو دینا چاہئے۔“ اب اسد الدین کی آواز میں
مراؤ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اقبال جرم کر کے سزا کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا

۔ ”کرد ایسے موقعوں پر کیا جواب دیا کرتے ہیں۔“ نجم الدین نے زہر خند سے کہا۔ ”کیا
مد الدین اس جواب سے ہمیں آگاہ کرنا نہیں چاہتے؟“
”میں نے ...“ اسد الدین ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”میں نے کہہ دیا کہ کرو اپنی پناہ میں
انے والے کو دشمن کے حوالے نہیں کیا کرتے۔“

عماد الدین زنگی اور اسامہ نے اسد الدین کے اس جواب کو بڑی حیرت سے سنا پھر اسی
نیرت کے ساتھ انہوں نے نجم الدین کی طرف دیکھا بھائی نے جو جواب دیا وہ غلط ہو یا صحیح
لیکن اس پر عمل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ”پھر اس نے اسد سے کہا۔“ جاؤ، جنگ کی
تیاری کرو اور قراچہ ساقی کو ایسا منہ توڑ جواب دو کہ وہ آئندہ کبھی کروں کے کسی مہمان کی
طرف نظر اٹھانے کی جرات نہ کر سکے۔“

”کرد واقعی عظیم قوم ہے۔“ زنگی نے کروں کے کردار کی تعریف کی۔ ”قدرت نے
ہمیں طاقت دی تو ہم اس احسان کا بدلہ اس طرح ادا کریں گے کہ تاریخ اسے کبھی بھلا نہیں
سکے گی۔“

تکرت کا سر بٹیک قلعہ دریائے دجلہ کے بائیں کنارے ایک اونچی چٹان پر واقع تھا
اس دور میں ہر قلعہ اتنا وسیع و عریض ہوتا تھا کہ اس میں پورا شہر بس جاتا تھا۔ مخالف
گروہوں کی آئے دن کی چپقلش سے بچنے کے لئے تمام آبادی قلعے کے اندر ہی رہا کرتی
تھی۔ قلعے کے باہر چراگاہیں اور کھیت ہوتے جہاں کاشت کاری کی جاتی تھی قلعہ تکرت
ایٹھائے کو چک کے چند ناقابل تخییر قلعوں میں سے ایک تھا۔ اس بلند و بالا قلعے کو مضبوط
ہانے کے لئے خشکی کی طرف ایک گہری خندق کھودی گئی تھی۔ خندق تک پہنچنے کے لئے
چٹانیں کاٹ کے چوڑی گھر پر بیچ سیڑھیاں بنائی گئی تھیں جس وقت قلعے پر حملہ ہوتا تو پہلے
دفاع کے طور پر خیم کو دربار پار کرنے سے باز رکھا جاتا۔ اگر دریا عبور ہو جاتا تو چٹانوں میں
بستی ہوئی پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے تیر انداز حملہ آوروں پر تیروں کی بارش کرتے اگر

کر دیا اور وہ آہستہ سے بولا۔ برادر بزرگ! میں اکیلا گیا تھا لیکن میں نے قلعے سے نکلے،
صدر دروازہ بند کرا دیا تھا۔“

نجم الدین کو اور بھی غصہ آ گیا۔ ”اسد الدین یہ تمہاری غلطی ہی نہیں، بہت بڑا
حماقت بھی ہے اگر دشمن صدر دروازے کے پاس پوشیدہ ہوتا تو کیا تم اسے اکیلے روک
لیتے؟ تمہاری حماقت انگیز شجاعت پورے قلعے کو مصیبت میں مبتلا کر سکتی تھی۔“

اسد الدین نے سر جھکا لیا والی موصل عماد الدین زنگی کو اس کی یہ ادا اور بھی پسند آ
اس کا خیال تھا کہ اس قسم کے سرکش جوان ایسے موقعوں پر اکثر گستاخی پر اتر آتے ہیں
لیکن اسد الدین نے بڑے تحمل کا ثبوت دیا اور بڑے بھائی کو جواب دینے کی گستاخی نہ
گریز کیا۔ جب زنگی نے نجم الدین سے کہا۔ ”اے تکرت کے حاکم بہادر فوجوان اس طر
کی غلطیاں کر ہی جاتے ہیں اور سمجھدار حاکم کو انہیں درگزر کر دینا چاہئے۔“

زنگی نے اسد الدین کی طرف داری کی تھی لہذا اسد نے اسے شکر گزار نظروں سے
دیکھا۔ نجم الدین کو یہ طرفداری پسند نہ آئی۔ ”والی موصل بہادری قابل ستائش ہے لیکن
وہ بہادر جو عقل سے خالی ہو، اپنے ساتھیوں کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔“

”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے برادر بزرگ۔“ اسد الدین نے اپنی غلطی تسلیم کر
نجم الدین کا منہ بند کر دیا۔

”نجم الدین نے لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا آگے جہاد پھر کیا ہوا؟“

اسد الدین کا غصہ ٹھنڈا اور آواز کا زور ختم ہو چکا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دھیسے لے
میں کہا۔ ”دریا پار میری ملاقات قراچہ ساقی سے ہوئی۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار سوار ہیں۔
اس نے مجھے دیکھتے ہی والی موصل کا مقابلہ کیا کہتا ہے کہ اگر عماد الدین زنگی کو واپس نہ د
گیا تو قلعہ تکرت کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔“

نجم الدین نے زور سے ”ہوں“ کہا اس طویل ”ہوں میں ہی بڑا زور اور بڑی گہر
گرج تھی یہ ہوں“ نہ تھی بلکہ اعلان جنگ تھا نجم الدین نے حکم دیا۔ ”تمام فوج فسیل
پہنچا دی جائے۔ تمام دروازوں کی اچھی طرح حفاظت کی جائے۔ قراچہ ساقی کو جواب د
دیں گے۔ اسد الدین جا کر ہمارا حکم سب کو پہنچا دو۔“ اسد الدین اپنی جگہ سے نہ ہلا جیسے
اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ نجم الدین نے اسے گھور کر دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔ ”اسد الدین
تمہارے کانوں تک ہماری آواز نہیں پہنچی۔ کیا تم سو رہے ہو؟“

اسد الدین نے مردہ آواز میں جواب دیا۔ ”بزرگ محترم! مجھ سے ایک غلطی اور بھی
ہوئی ہے۔“

تو آذوری کو کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ ہمیشہ نصف نقاب میں نظر آتی تھی۔ پردے کا عام رواج نہیں تھا۔ عورتیں عام طور پر لباس پر چادر ڈال کر سودا سلف خریدنے کے لئے بازار جاتیں۔ صرف امیر خواتین نصف جالی دار سیاہ نقاب ڈالتی تھیں۔ قلعے میں مسلمانوں کے علاوہ مجوسیوں کفرانیوں اور یہودیوں کی بھی آبادی تھی امن کے زمانے میں سب لوگ سکون اور میل محبت سے رہتے تھے لیکن جنگ اور خصوصاً "صلیبی جنگوں کے دوران عوام مصیبت کا شکار ہوتے تھے یہی حال نصرانی قلعوں کا بھی تھا وہاں بھی مسلمان رہا کرتے تھے۔

جورا تھوڑی دور اسد کے ساتھ چلتی رہی پھر بولی۔ "آپ مجھے پیچھے آئیے میں بھاگ کر آذوری بی بی کو آپ کے آنے کی خبر کرتی ہوں۔"

اسد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جورا اس سے پہلے ہی بھاگ اٹھی اسد کے قدم بھی کچھ اور تیز ہو گئے وہ آذوری کے دروازے پر پہنچا تو جورا باہر کھڑی تھی اور آذوری اندر کی طرف دروازے سے لگی کھڑی تھی اسد نے نظریں اٹھا کر آذوری کو دیکھا۔ نصف نقاب کے پیچھے آذوری کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ لیکن غلامی آنکھوں کی بھاری پلکوں میں آنسوؤں کے موتی بھی چمک رہے تھے۔ "کیوں رو رہی ہو، آذوری؟" اسد نے سپاہیانہ اکھڑن سے پوچھا۔

آذوری کی آنکھوں سے دو موتی نپک پڑے اور غمگین آواز میں بولی۔ "منجملہ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں کیوں روتی ہوں۔"

"اچھا تو پہلے رولو، پھر بات کروں گا۔" اسد نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورتوں کو صرف آنسو بھانا آتے ہیں۔"

آذوری نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور بولی۔ "لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو قیمتی ہوتے ہیں۔"

اس نے ایک ہلکا سا دھنسانہ قہقہہ اگا کر کہا۔ "وہ لوگ احمق اور بزدل ہیں۔ آنسو تو آنکھوں کا پانی ہے۔ اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ ہاں خون بھانا ضرور بہادری ہے۔"

"تو میں بے وقوف ہوں؟" آذوری کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں۔ "تم جنگ پر گئے تھے" میں آنسو نہ بھاتی تو کیا قہقہے لگاتی؟

اسد ہمدردی کرنے کے بجائے جھگڑا گیا۔ "دیکھو آذوری! مجھے رونے والی صورتیں اچھی نہیں لگتیں تم رونے بند نہیں کرو گی تو میں چلا جاؤں گا۔ روتی نہتہ جس کا بیٹا مارا جاتا ہے یا پھر بسن روتی ہے جب اس کا بھائی قتل ہو جاتا ہے تمہیں رونے کی کیا ضرورت ہے تم میری کون ہو۔ نہ ماں اور نہ بہن۔"

اسد اور آذوری کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد تو اسد کا یہ دستور ہو گیا کہ وہ جب بھی گشت کے لئے نکلتا تو محلہ شکاراں کا ایک چکر ضرور لگاتا اور جب محلہ شکاراں میں جاتا تو آذوری کی خادمہ جورا اسے سلام کرنے ضرور آتی۔ یہ سلام و کلام پہلے جورا کی معرفت ہوتے رہے پھر آذوری کے اصرار پر اسد الدین کو آذوری سے محبت ہو گئی ہے لیکن اسد الدین کے لئے یہ لفظ بے معنی تھا۔ اس جیسا وحشی اور شعلہ صفت جوان محبت کے لطیف جذبے سے قطعی نا آشنا تھا لیکن جب وہ رات کی تنہائیوں میں قلعے کی فصیل پر ٹھٹھکتے ہوئے اپنے آپ پر غور کرتا تو اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتا کہ آخر محلہ شکاراں میں کون سی کشش ہے جو اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب تک وہ آذوری کے دروازے پر پہنچ کے اس سے دو ایک باتیں نہیں کر لیتا اسے چین کیوں نہیں آتا؟

اسد الدین گشت پر تھا اور محلہ شکاراں اس کے سامنے تھا۔ یہ محلہ نظر آتے ہی اس کے قدموں میں تیزی آ جاتی تھی اور آج تو اس کے قدم اور بھی تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ پورے ایک ہفتے بعد اس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس نے محلے کی گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ آذوری کی خادمہ جورا بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ جب سے اسد الدین نے ادھر آنا بند کیا تھا آذوری نے جورا کو حکم دے دیا تھا کہ وہ گلی کے سرے پر اسد الدین کا انتظار کرتی رہے اور جیسے ہی وہ نظر آئے اسے لے کر سیدھی گھر آ جائے۔ اسد الدین نے جورا کو دیکھا تو خلاف عادت مسکرا کے پوچھا "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ جورا"

"آپ کا انتظار! جورا نے معصومیت سے جواب دیا۔

اسد الدین چونک پڑا۔ "میرا انتظار۔ وہ کیوں؟ کس نے کہا تھا، تجھ سے؟"

"آج تو میری جان چھوٹ گئی۔" جورا نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "میں تو پچھلے پندرہ دن سے یہاں آکر کھڑی رہتی تھی اور صبح سے شام تک انتظار کر کے واپس جاتی تھی یہ بھی بی آذوری کا حکم تھا۔"

"پاگل کیس کی۔ آذوری نے یہ حکم کیوں دیا؟" اسد الدین چڑسا گیا۔

"میں کیا جانوں، کیوں حکم دیا۔" جورا نے جواب دیا۔ "میں تو حکم کی باندی ہوں جو مالک نے کہا، وہ کرنا پڑا آپ چل کے خود ہی پوچھ لیجئے انہوں نے تو رو رو کے اپنی جان ہکان کر لی ہے۔"

اسد الدین نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور جورا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس نے یوں

آزوری کو اسد کے بھولے پن پر افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ ترس بھی آیا۔ اس نے سوچا کہ کیا اسد واقعی اتنا ہی سیدھا ہے؟ کیا یہ عورت کی آنکھوں میں جھانکتا نہیں جانتا؟ شاید اسے عورت کا چہرہ بھی پڑھنا نہیں آتا۔ دراصل اسد الدین نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہاں نہ تو حسن کی عشوہ طرازیں تھیں اور نہ ہی عشق کی پرکاریاں۔ روسا کے بچے سوئے کا بچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں لیکن اسد الدین سپاہی زادہ تھا وہ پیدا ہوا تو اس کے منہ میں آہنی چھپے دیا گیا جو عمر کے ساتھ ساتھ تلوار میں بدل گیا۔ پھر وہ کیسے جانتا کہ ہجر کیا ہے اور فراق کسے کہتے ہیں محبوب مصیبت میں مبتلا ہو یا جنگ پر جائے تو عورت بیٹھے بیٹھے کیوں رو پڑتی ہے۔ ”اچھا منیخا! میرے دل کا کچھ بھی حال ہو، تمہارے سامنے اب میں کبھی نہیں روؤں گی۔“ آزوری نے کہا۔

اسد الدین کے چہرے سے خوشی چھٹک پڑی جلدی سے بولا ”اب میں بہت خوش ہوں۔ تمہاری ہنسی ہوئی آنکھیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”اور میں اچھی نہیں لگتی؟“ آزوری نے اسد کے خفتہ جذبات پر ضرب لگائی۔

اسد الدین پہلی بار کچھ گھبرا گیا۔ ”ہاں ہاں تم بھی اچھی ہو تمہارے بال اتنے ہیں تمہارا سراپا بہت اچھا ہے۔“

آزوری نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میرے سراپا کا تمہیں کیا پتہ کبھی تم نے مجھے چھو کر تو دیکھا نہیں۔ دیکھو میرا ہاتھ کیسا بھدا اور بے ڈول ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آستین بازو تک کھینچ کر میدے جیسا نرم اور سفید ہاتھ اسد کی طرف بڑھا دیا۔

اسد کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوئی اس نے مرد و زن کے کئے خون میں لتھڑے ہاتھ تو دیکھے تھے لیکن عورت کا بازو تک کھلا ہاتھ دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا آزوری کی خادمہ جو را پاس کھڑی ان کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اس نے محسوس کیا کہ یہ باتیں اگر کسی راہ چلتے کے کان میں پڑ گئیں تو خواہ مخواہ بات کا ہتکڑ بن جائے گا۔ اس لئے وہ خاموش نہ رہ سکی۔ ”باہر کھڑے ہو کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ اندر چل کے بیٹھے۔“ یہ تو جیسے آزوری کے دل کی بات تھی۔ اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہے جو را۔ اندر آ جاؤ منیخا۔“

اسد الدین کا جی چاہا کہ اندر چلا جائے۔ مگر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”نہیں آزوری میں اندر نہیں آؤں گا۔ براور بزرگ نجم الدین نے کہا ہے کہ کبھی کسی عورت سے اکیلے میں بات نہ کرنا اور نہ اس کے گھر میں قدم رکھنا۔“ یہ بات اس نے ایسی معصومیت سے کہی جیسے چھوٹے بچے اپنے والدین کی سکھائی ہوئی کوئی بات بھری محفل میں

دی بے باک معصومیت سے دہرا دیتے ہیں۔

آزوری نے شوخی سے کہا۔ ”اب تم بچے نہیں ہو، منیخا پھر نہ یہ میرا گھر ہے۔ اور نہ میں اکیلی ہوں۔ گھر میں میری ماں اور چھوٹا بھائی ہے۔ ابا جان بھی آتے ہی ہوں گے۔ سب تم کو جانتے ہیں اور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ ہم تمہارے احسان مند ہیں، منیخا۔“ سپاہی کے دماغ میں شاید یہ بات ٹھیک سے بیٹھ گئی تھی اس لئے اس نے بے دھڑک مذم بڑھا دیا۔ جو را نے دوڑ کر آنگن میں چارپائی ڈال کر اس پر قائلین بچھا دیا۔ اسد چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آزوری اس کے بالقابل دوسری چارپائی پر آ بیٹھی۔

”تم گھر سے باہر تو نہیں گئی تھیں؟“ اسد نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”گئی تھی۔ کئی بار۔ آزوری نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسد زور سے چیخا۔ ”کیوں گئی تھیں۔ میں نے منع کیا تھا، تمہیں۔“ آزوری نے اس کے غصے کا کوئی اثر بول نہ کیا اور ہنستی رہی۔

”جواب دو کیوں باہر گئی تھیں۔“ سپاہی زادے نے آزوری کی ہنسی کو شاید اپنی توہین خیال کیا۔

آزوری نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔ ”میں تمہاری کیا لگتی ہوں، مجھے حکم کیوں دیتے ہو؟“

اسد الدین کے سر پر ہتھوڑا سا پڑا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“ وہ غرا آیا۔

”میں نہیں جانے دوں گی۔“ آزوری نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اسد نے بڑے بڑوں سے ہاتھ ملائے تھے۔ بستان کے بچوں میں پنجہ ڈالا تھا لیکن آزوری کا نازک ہاتھ نہ جانے کس چیز کا بنا ہوا تھا اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ ہاتھ چھڑا لے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کا جی چاہا کہ آزوری یونہی اس کا ہاتھ پکڑے رہے اور بجلی کی یہ رواں اس کے جسم میں اسی طرح دوڑتی رہے۔

آزوری نے اسے چارپائی پر بیٹھا دیا۔ ”تم نے یہ تو پوچھا نہیں کہ میں کیوں باہر گئی تھی؟“

”میں نہیں پوچھوں گا۔“ اسد کا غصہ غائب ہو گیا۔

”کیوں نہیں پوچھو گے؟“ آزوری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اسد نے آزوری کے الفاظ دہرائے۔ ”تم میری کون لگتی ہو میں تمہیں کیوں حکم دوں۔“

آزوری کھکھلا کر ہنسی تو اسد کو اس کا ہنسا بے حد بھلا معلوم ہوا وہ بھی مسکرانے لگا

تو آذوری بولی۔ ”تم میرے سب کچھ لگتے ہو، منجھلے تمہیں حکم دینے کا اختیار ہے۔“
اسد الجھتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی ہو کچھ نہیں لگتے، کبھی کبھی ہوتی ہو سب کچھ لگتے ہو۔
تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“
آذوری نے اسد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ باتیں شادی کے بعد سمجھ میں
آئیں گی۔“

”شادی!“ اسد حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”ہاں شادی۔“ آذوری نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تم شادی کر ڈالو منجھلے۔“

”کیوں کروں شادی اور کس سے کروں؟“ اسد نے بحث شروع کر دی۔

آذوری نے اسے سمجھایا۔ ”بھولے منجھلے زندگی کا مقصد صرف کموار چلانا ہی نہیں
ہوتا۔ سب ہی شادی کرتے ہیں۔ حاکم شکریت نے بھی تو شادی کی ہے تم بھی کوئی اچھی سی
لڑکی دیکھ کر شادی کر لو۔“

”اچھی سی لڑکی؟ اسد نے پوچھا۔ ”اچھی سی لڑکی کیسی ہوتی ہے؟“

”جسے تم پسند کرتے ہو، وی۔“ آذوری نے جواب دیا۔

”مجھے تو تم پسند ہو۔“ اسد نے کہا۔

یہ جواب اس وقت غیر متوقع تھا کہ آذوری کی نظریں جھک گئیں اس کا چہرہ گلنار ہو
گیا اور نسوانی شرم و حیا ننھے ننھے موتی بن کے اس کے رخساروں پر ابھر آئی۔ وہ کچھ ایسی
گھبرائی کہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ جورا قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ نے
غضب کر دیا۔ ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ آذوری بی بی شرماء کے چلی گئیں۔“
”میں نے کیا کہا۔ اسد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”آذوری مجھے پسند ہے میں نے کون
سی ایسی بات کی ہے؟“

”آپ جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟“ چالاک اور تجربہ کار جورا نے پوچھا۔

اسد نے سادگی سے جواب دیا۔ ”مطلب و مطلب کیا کسی کو پسند کرنا کون سی بری بات

ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں نے کون سی بری بات کی ہے؟“

”آپ آذوری کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اس نے شادی کرنا

چاہتے ہیں۔“ جورا نے صاف صاف کہہ دیا۔

”شادی....“ اسد گھبرا گیا۔ ”میں نے شادی کا نام کب لیا؟“

اسی وقت اندر سے آذوری کی ماں نے جورا کو آواز دی جورا اندر پہنچی تو بڑی بی بی نے
پہنکار لگائی۔ ”غضب خدا کا اتنی دیر سے کھر مسمان آیا ہوا ہے اور تم نے قہوہ بھی نہیں پلایا

یہ آذوری بیٹی وہاں کیا باتیں بنا رہی ہے؟“

”آذوری تو اپنے کمرے میں ہے، بڑی ماں۔“ جورا نے آذوری کی صفائی پیش کی۔

”اے لو۔ یہ تو اور غضب ہو گیا۔“ بڑی ماں بڑبڑائیں۔ ”مسمان گھر آیا اور وہ اپنے
کمرے میں جا گئی۔ عجیب طبیعت کی لڑکی ہے یا تو ہر وقت اس کا نام رنٹی رہتی تھی اور
اب وہ گھر آیا تو منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔..... پھر بڑی ماں اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”چھوٹے سردار
سے اب تک کیا باتیں ہوئیں؟“

جورا گھبرا گئی۔ وہ کیا جواب دیتی خیر ہوئی کہ بڑی ماں نے جواب کے لئے اصرار نہیں
کیا اور آنگن کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

”میں جا کر دیکھتی ہوں مسمان کو تو قہوہ لے آ۔“

بڑی بی بی اسد کے پاس پہنچ گئیں اسد نے اٹھ کر سلام کیا۔ وہ اس گھر میں پہلے کبھی
نہیں آیا تھا لیکن آذوری کی ماں سے اس کی صاحب سلامتی تھی۔ راستے میں کئی بار ان
سے ملاقات ہوئی تھی لیکن یہ ملاقات اب تک علیک سلیک تک ہی محدود تھی۔ اسد نے
سلام کیا تو بڑی بی بی نے اسے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں انہیں اس سے اس لئے اور زیادہ
دلچسپی تھی کہ ان کے باپ دادا کا وطن بھی آرمینیا تھا۔ ان کی شادی ایرانی خاندان میں
ہوئی تھی جس سے صرف دو اولادیں ہوئیں۔ آذوری بڑی لڑکی تھی۔

آذوری، اسد کی بات سے کچھ ایسی شرمائی کہ کمرے ہی کی ہو کر رہ گئی۔ اس نے اسد
کے پاس جانے کی بہت کوشش کی لیکن شرم و حیا نے کچھ ایسا وامن پکڑا کہ وہ اس دن اسد
کا سامنا نہ کر سکی۔ جورا کو آذوری کے اس رویے پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے آذوری کو کھینچ
کر لے جانے کی بھی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اسد تھوڑی دیر بڑی بی بی باتیں
کرتا رہا پھر ان سے اجازت لے کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد بڑی بی بی نے آذوری کی وہ
چٹاڑ چٹائی کہ بس اللہ دے اور بندہ لے ڈوب مرو احسان فراموش، مسمان گھنٹوں بیٹھ کر چلا
گیا اور تم کمرے میں چھپی بیٹھی رہیں۔“

آذوری نے احتجاج کرنا چاہا اور چاہا کہ یہ بتائے کہ وہ مسمان سے باتیں کر کے کمرے
میں گئی ہے لیکن جورا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”وہ کوئی لپا لفظ تو نہیں کہ تم اس سے چھپتی پھرو۔“ بڑی بی بی پھر شروع ہو گئیں۔

آذوری نے جورا کو اشارہ کیا تو اس نے جرات کر کے بڑی بی بی کی بات کاٹ کر کہا۔
”بڑی ماں۔ آذوری بی بی ان کے سامنے جانے سے شرماء رہی تھیں۔ آخر جوان جہاں ہے
نہ غیر مرد کے سامنے جلنے سے شرم تو آتی ہی ہے۔“

”میں کب کہتی ہوں، شرم کو سر سے اتار بیٹھو۔“ بڑی بی کی زبان تو بس ڈھال پر چلنے والی گاڑی تھی۔ ایک بار دھکا لگ جائے تو آخر تک پہنچ کر ہی رکتی تھی۔ ”شرم کا ایک وقت ہوتا ہے ضرور کرو شرم لیکن اپنے احسان کرنے والے سے کیا شرم اس دن یہ سنا مانس اس شدے سے نہ بچتا تو آج کو یہ شرم کرنے والی نہ رہتی۔“

آزوری کے باپ کے آجانے سے بڑی بی کی زبان رک گئی وہ میاں کے ساتھ اٹھ کے اندر چلی گئیں ممکن ہے انہوں نے میاں کے سامنے بھی یہ مسئلہ چھیڑ کر دل کی پوری بھراس نکال لی ہو لیکن آزوری اور جورا کی جان چھوٹ گئی اور وہ مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگی۔

اسد آزوری کے گھر سے نکلا تو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آزوری کی باتیں اس کے سمجھ میں نہیں آئیں لیکن جورا کا واضح اشارہ اس کی سمجھ میں آگیا تھا شادی کے مسئلے پر اس نے اس سے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ وہ آزوری کو پسند کرنے لگا تھا لیکن اس سے زیادہ کچھ اور نہیں وہ انہی باتوں میں الجھا ہوا، سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ ایک گھوڑا اس کے سامنے آکر رکا اسد نے سر اٹھایا گھوڑے پر تنبل جامو بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ ”سلام عرض ہے چھوٹے سردار۔“ جامو کے لمبے میں بلا کا طنز تھا۔ اسد کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا اس نے سلام کا جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیا۔ شاید اس وقت وہ جامو سے الجھتا نہیں چاہتا تھا۔

”کہاں سے تشریف لا رہے ہیں، چھوٹے سردار؟“ اس بار جامو کے انداز میں پہلے سے زیادہ طنز تھا۔

اسد نے اسے گھور کے دیکھا۔ ”تم کون ہوتے ہو پوچھنے والا۔“ اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

”غصہ نہ کیجئے چھوٹے سردار۔“ جامو ہنس پڑا میں کیوں کہوں کہ آپ آزوری کے پاس سے آ رہے ہیں۔ بہت دنوں بعد ملاقات کے لئے تشریف لائے آپ۔“

اسد جیسا تند مزاج انسان اپنی توہین کیسے برداشت کرتا اس نے بڑھ کر جامو کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا ”اب کہو۔“ اسد اس کا گریبان پکڑ کر بولا۔

”تنبل جامو اس اچانک حملے سے گھبرا گیا۔ نرم آواز میں بولا ”چھوٹے سردار میرا گلا چھوڑیے۔ میں تو آپ کا ہمدرد ہوں۔“ اسد نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تو وہ مزید بولا۔

”ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں۔“

”بات بری نہیں ہونی چاہئے۔“ اسد نے سختی سے کہا۔

”نہیں نہیں چھوٹے سردار۔“ تنبل جامو ہنستے ہوئے بولا۔ ”جنا میں حاکم قلعہ کے بھائی سے گستاخی کی جرات کیسے کر سکتا ہوں۔“

”فضول مت کہو۔“ اسد نے ڈانٹا جو کہتا ہے جلد کہو۔“

”تنبل جامو نے متین چہرہ بناتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹے سردار آزوری کا باپ ایرانی ہے۔“

”ماں تو میرے علاقے کی رہنے والی ہے۔“ اسد کی زبان سے نہ جات کیوں منٹ گیا۔

جامو کو موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”آپ کو شش کر دیکھئے یہ تیل بندھے نہیں چڑھے گئی۔“

اب اسد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا تھا اس نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔ ”تیل منڈھے چڑھے نہ چڑھے۔ میں کوئی کوشش نہیں کر رہا۔“

کتے ہوئے اسد آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں کی تو تو میں میں سن کر کچھ لوگ قریب آئے تھے۔ اسد جلد سے جلد ان سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتا شروع کر دیئے وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ تنبل جامو گھوڑے پر سوار ہو کر پھر اس کے برابر آگیا۔ اسے دیکھ کر اسد کا خون کھولنے لگا۔ غصے سے بولا۔ ”اب کیا کہنا ہے تجھے؟“

”تنبل جامو نے گھوڑا موڑا اور ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مچھوٹے سردار۔ آزوری تر نوالہ نہیں، جسے آپ نکل جائیں اس پر پہلے میری نظریں ہی پڑیں۔“

”ٹھہر تو جا کیئے ذلیل، کتے۔“ اسد اس کی طرف دوڑا مگر جامو کا گھوڑا ہوا ہو چکا تھا۔ اس کو اس وقت اپنے پیدل آنے پر افسوس ہوا لیکن یہ تو اس کا معمول تھا وہ پورے قلعے کا پیدل ہی چکر لگایا کرتا تھا۔ اسد کو اس گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ تنبل جامو کی دشمنی اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔ اس نے آزوری کو اپنانے کا تو اب تک فیصلہ نہیں لیا تھا لیکن یہ ضرور فیصلہ کر لیا کہ وہ آزوری کی طرف بڑھنے والا ہر باتہ کت ڈالے گا خواہ اس میں خود اس کی جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔

نجم الدین ایوب سے پہلے حکمرانیت کے قلعہ پر تنبل جامو کے خاندان کی حکومت تھی۔ ایک پرانا عرب خاندان تھا لیکن تآاریوں سے میل ملاپ اور شادی بیاہ کی وجہ سے یہ لوگ خود کو تآاری کہتے تھے جب نجم الدین نے اس قلعے پر قبضہ کیا تو سابق حاکم قلعہ چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس کے خاندان کے بہت سے لوگ قلعے ہی میں رہ گئے۔ نجم الدین ان لوگوں کی بہت عزت کرتا اور ان کی دل جوئی کے لئے اکثر ان کی غلطیاں نظر انداز کر دیتا۔

نجم الدین نے کہا۔ ”یہ زیادتی نہیں بلکہ ظلم ہے لیکن قلعے سے کسی کو نکالنے کا حق اسد الدین کو حاصل نہیں تاہم یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسد نے آپ کے بیٹے کو اس محلے میں جانے سے کیوں روکا کیا نام ہے اس محلے کا؟“

جامو کے باپ نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ سردار محترم یہ بات بتائے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن آپ کے حکم کی تعمیل میں بتانا ہی پڑے گا نکتہ میں ایک محلہ شکاراں ہے اس محلے میں ایک پرانا ایرانی خاندان آباد ہے چھوٹے سردار کا اس گھر میں آنا جانا ہے اب وہ چاہتے ہیں کہ اس محلے سے ان کے سوا کوئی دوسرا جوان گزر بھی نہ سکے۔“

نجم الدین اس انکشاف سے پانی پانی ہو گیا۔ تغلو جامو کے باپ نے جس انداز سے محلہ شکاراں کا ذکر کیا تھا اس سے نجم الدین کو اصل معاملہ سمجھنے میں ذرا بھی قوت نہ ہوئی اسے اسد الدین سے ایسی توقع نہیں تھی نجم الدین اپنے بھائی کی سرکشی اور خود سری سے تو واقف تھا لیکن اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اسد اخلاقی طور پر اس قدر گر گیا ہے کہ اس نے کسی گھرانے میں علی الاعلان آنا جانا شروع کر دیا۔ اس نے ان لوگوں سے مزید تفصیل معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سمجھ گیا کہ اسد اور تغلو جامو کے درمیان کوئی ایرانی لڑکی حائل ہے جس کا گھر محلہ شکاراں میں کسی جگہ واقع ہے اس نے بڑے خلوص سے اظہارِ ندامت کیا۔ معزز دوستو میں اسد الدین کی اس حرکت پر سخت نادم ہوں۔ میں اسے جو سزا دوں گا، وہ ایک الگ بات ہے لیکن آپ یقین رکھیے کہ آئندہ اسد کے قدم محلہ شکاراں میں نہیں جائیں گے۔“

آنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی واپس چلے گئے۔

ٹھیک اس وقت جب نکتہ کے سابق حکمران خاندان کا زور نجم الدین سے اسد الدین کی جھوٹی جی شکایت کئے میں مصروف تھا منجلا اسد الدین، آزوری کے گھر میں بیٹھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گفتگو کر رہا تھا آزوری کے ہاتھوں میں اس کا وہ ہاتھ تھا جس نے اب تک شمشیر کے سوا کسی نرم چیز کو نہیں چھوا تھا کل کی ملاقات میں آزوری نے اسے جو پیام دیا تھا اس نے اسد الدین کے دل میں لطیف جذبات ابھار دیئے تھے اور آزوری کے قہر نے اس کے پتھر دل کو موم بنا دیا تھا۔ اسد الدین ہستے ہوئے بولا۔ ”اگر کل میرے پاس گھوڑا ہوتا تو تغلو جامو کو ایسا سبق دیتا کہ وہ عمر بھر یاد رکھتا۔ میرا خیال ہے اب وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔“

محبت سے سرشار آزوری نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ”بچلے، اس شدے کے منہ

تھے۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کا بیٹا اچھے کردار کا مالک نہیں اور خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑے مول لیا کرتا ہے لیکن تغلو جامو نے کل کے واقعے کو باپ کے سامنے ایسے انداز میں پیش کیا تھا جس سے اس کے خاندان کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ لہذا وہ بولا اے نکتہ کے حاکم ہم نہ تو اپنی خاندانی عظمت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ہمیں آپ کے ہمدردانہ سلوک سے کوئی شکوہ ہے لیکن چھوٹے سردار اسد الدین جس طرح گلی کوچوں میں ہمارے خاندان پر کچھ اچھالتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر آپ کو یا قلعہ والوں کو یہاں ہمارا خاندانی وجود پسند نہیں تو حکم دیجئے ہم قلعہ چھوڑ کر کیس اور چلے جاتے ہیں لیکن چھوٹے سردار کا توہین آمیز رویہ ہم برداشت نہیں کر سکتے آخر ہم بھی تادیبی ہیں۔“

نجم الدین نے اس طویل گفتگو کے دوران میں کئی بار پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے لیکن اس نے بیچ میں ٹوٹنا مناسب نہ سمجھا اور بڑے صبر سے سنا رہا پھر اس نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”معزز شہریو۔ میرے دوستوں نے بڑی تفصیلی باتیں کیں مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں یقیناً“ آپ لوگوں کو اسد کے طرزِ عمل سے تکلیف پہنچی ہوگی، لیکن اس واقعے کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی جس نے آپ لوگوں کو میرے پاس آنے پر مجبور کیا۔ براہ کرم آپ واقعہ بتائیے اور اگر ثبوت میں یعنی گواہ موجود ہوں تو انہیں بھی پیش کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسد کی گستاخی اور زیادتی ثابت ہوئی تو وہ سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ آپ کو یہ بات دل سے نکال دینی چاہئے کہ میں آپ جیسے معززین کے مقابلے میں اپنے سرکش بھائی کی طرف واری کروں گا۔“

وفد میں سے ایک آدمی بولا۔ ”سردار محترم“ چھوٹے سردار اسد الدین یوں تو آئے دن ہمارے خاندان کی تذلیل کیا کرتے ہیں لیکن اب تو وہ ہمیں ایک عام شہری جیسے حقوق دینے پر بھی آمادہ نہیں۔ ہمارے چلنے پھرنے اور کہیں آنے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے۔“

ان کی شکایت کا مطلب نجم الدین کو اب بھی نہ معلوم ہو سکا تو وہ ذرا چڑ کر بولا۔ ”دوستو! اتنی باتیں کرنے کے باوجود آپ لوگ اصل واقعہ بیان کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔“

تغلو جامو کے باپ نے ایک جھرجھری لی اور بولا۔ ”محترم سردار۔ کل میرا لڑکا تغلو جامو ایک محلے میں گیا تھا وہاں چھوٹے سردار پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے میرے لڑکے کو حکم دیا کہ وہ اس محلے میں نہ آیا کرے اگر اس نے خلاف ورزی کی تو ہماری خاندان کو قلعے سے نکال دیا جائے گا۔ یہ تو سرا سر زیادتی ہے۔“

لگا کرو۔ وہ بڑا خراب آدمی ہے۔

”میں بھی تو خراب آدمی ہوں لوگ مجھے سرکش اور خود سرکشتہ ہیں۔“

”لوگوں کے لئے تم کچھ بھی ہو لیکن میں نے تو تمہیں اپنے دل کا مالک بنا لیا ہے مجھ دھوکا تو نہیں دو گے۔“ آذوری کی آواز جذبات سے بھرا گئی۔

”بہادر مرد زبان سے نہیں پھرا کرتے۔“ اسد الدین نے اسے تسلی دی۔ ”اپنے مار باپ سے اجازت حاصل کر لو۔ میں بھی موقع دیکھ کر برادر محترم سے بات کروں گا۔“

آذوری بھاری پلکیں جھپکا کر بولی۔ ”وعدہ کرو کہ روز آیا کرو گے۔“

”کیوں نہیں مرد کا وعدہ ہے اعتبار کرو۔“ اسد الدین نے سینہ تان کر کہا۔

آذوری نے اسد الدین کے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن کسی کے پیروں کو آہٹ سن کر جلدی سے کھینچ لیا۔ اچانک جورا گھبرائی ہوئی اندر آئی اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اسد اور آذوری بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ آذوری کا ذل زور سے دھڑکنے لگا۔ ”صاحب جی صاحب جی۔“ جورا کھڑے کھڑے لہجے میں بولی۔ ”آپ کے محل سے سوار آیا ہے بڑے سردار نے بلایا ہے، آپ کو۔“

”بڑے سردار نے!“ اسد الدین کی زبان سے نکلا اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جورا اور آذوری اسد الدین کو سوار کے ساتھ جاتے دیکھتی رہیں جورا خوف سے کانپ رہی تھی اور آذوری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

نجم الدین برآمدے میں کھڑا اسد الدین کا انتظار کر رہا تھا اسد کو راستے میں سوار سے معلوم ہو گیا تھا کہ تغلو جامو کا باپ اور دوسرے عزیز اس کی شکایت لے کر آئے تھے اور یہ بلاوا اسی سلسلے کی کڑی ہے اسد قدرتی طور پر پریشان تھا بھائی کو برآمدے میں ٹہلنے دیکھ کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی اسد نے برآمدے میں داخل ہوتے وقت نظریں نیچی کر لیں۔

”کہاں گئے تھے اسد؟“ نجم الدین کی گردن آواز گونجی۔

”گشت کرنے گیا تھا برادر بزرگ۔“ وہ مردہ آواز میں بولا۔

”محلہ شکاراں گئے تھے؟“ نجم الدین کے لہجے میں پہلے سے زیادہ گرج پیدا ہو گئی۔

”جی ہاں۔ برادر بزرگ۔“ اسد کو انکار کرتے نہ بنا۔ سوار اسے محلہ شکاراں سے بلا کر لایا تھا۔ ایک سوار کیا، اسد کے تمام دوستوں اور محل کے بہت سے لوگوں کو اسد کے شکاراں جانے کا علم تھا۔ اس نے انکار کرنا مناسب بھی نہیں سمجھا۔

نجم الدین کا پارہ چڑھ گیا۔ ”ایرانی خاندان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”ابھی تک تو کوئی تعلق نہیں؟ برادر بزرگ۔“ اسد نے سادگی سے جواب دیا۔

”ذوب مرو اسد الدین تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آئی خوب کردوں کا نام اونچا لیا ہے۔“ نجم الدین کا غصے سے حلق خشک ہو گیا ”تمہاری آوارگی نے آج میرا سر نیچا کر لیا۔“

لیکن برادر بزرگ۔“ اسد نے ہمت کر کے کہا۔ ”میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے آپ کا سر نیچا ہو۔ میں نے تو ایک مظلوم خاندان کی مدد کی ہے۔ اسے شہدوں سے بچایا ہے۔“

”چپ رہو۔“ نجم الدین نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”عیب چھپانے کی کوشش نہ کرو میں نہیں اس قدر غیر ذمے دار نہیں سمجھتا تھا۔ تم کرو ہوا تمہیں ایرانی خاندان سے اتنی دردی جتانے کی کیا ضرورت تھی کہ لوگ تم پر انگلیاں اٹھانے لگیں۔ شریف لوگ اس اد سے کترا کر نکل جاتے ہیں جدھر سے بدنامی اور رسوائی کی ہوا آنے کا بھی خدشہ ہو۔“

اسد الدین بہت تند خو اور بد مزاج تھا لیکن بڑے بھائی سے تکرار کرنے کی اس نے کبھی پہلے کوشش کی تھی اور نہ ہی اس وقت اسے ہمت پڑی۔ نجم الدین دیر تک اسد کو ابھلا کرتا رہا۔ اس نے دم بھی نہ مارا۔ چپ چاپ کان دہائے سنتا رہا۔۔۔ پھر نجم الدین نے خزی حکم سنایا۔ ”اسد، کل سے تم گشت پر نہیں جاؤ گے۔ میں نہیں چاہتا کہ محلہ شکاراں ہاتھ آئندہ قدم بھی رکھو۔ امید ہے تم میری عزت کا خیال رکھو گے۔“ وہ تو حکم سنا کر در محل میں چلا گیا اور اسد الدین پر جیسے اوس پڑ گئی۔ مستقبل کے وہ قلعے جو کچھ دیر پہلے اپنی جان آرزو کے پاس بیٹھا تعمیر کر رہا تھا ہوائی قلعے ثابت ہوئے اور دھڑام سے اس نے قدموں میں آگرے اس نے آج تک بھائی کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کی تھی اس نے اس وقت بھی دل پر پتھر رکھا اور فیصلہ کیا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہوتے، وہ نہ شکاراں کا رخ نہیں کرے گا نجم الدین اور اسد الدین کی گفتگو سوائے دوپہریداروں کے در کسی نے نہیں سنی تھی مگر تغلو جامو کو کسی نہ کسی طرح یہ خبر پہنچ گئی کہ اسد کو خوب نٹ پڑی ہے اور شکاراں میں اس کا داخلہ بند ہو گیا ہے۔

اسد الدین پر پابندی عائد ہونے سے آذوری اور اسد کی ملاقات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ان محبت وہ آگ ہے جو ایک بار بھڑک اٹھے تو اس کا بجھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ آگ تو نولوں طرف لگی تھی، آذوری کی تو خیر جوانی تھی اور عورت کی جوانی کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسد سے زیادہ مضبوط سہارا اور کون ہو سکتا تھا لیکن اسد جیسا رکش بھی محبت کی وادی میں قدم رکھ کر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ہجرو فراق کے لذت یزدرو کی خبر نہیں تھی۔ پابندی عاید ہوتے ہی اس میں عاشقانہ خصلتیں اور عادتیں پیدا

پر پابندی لگتے ہی انہوں نے سر اٹھایا اور تفلو جامو کو اپنا سردار بنا کر ادھم چانے لگے شر کو تو ال بھی ان لوگوں سے دتا تھا وہ بڑا گھاگ تھا اسے علم تھا کہ محض ایک حکم کے تحت وہ معزول بھی کیا جا سکتا پھر وہ قلعے کے پرانے حاکم خاندان سے جھڑا کیوں مول لیتا جہاں تک ممکن ہوتا وہ تفلو جامو کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتا تھا۔

تفلو جامو نے آذوری کو بیچ بازار میں گھیر لیا۔ آذوری اور جورا بچنے کے لئے ادھر ادھر بھاگیں لیکن جامو نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا ایک تو نئے میں دھت دوسرے وہ پہلے سے خار کھائے ہوئے تھے۔ آج وہ تمام اگلے پچھلے حساب چکانے پر اترا نظر آتا تھا۔ آذوری پناہ کے لئے بھاگتی بھاگتی مسجد کیسائے پہنچ گئی۔ مسجد اسے بہترین پناہ گاہ نظر آئی اس نے ادھر کا رخ کیا لیکن تفلو جامو نے اس کا راستہ روک لیا..... آذوری کو کوئی راستہ نظر نہ آیا تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئی اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ قریب کی دکان پر اسے ایک ڈنڈا پڑا نظر آیا آذوری نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ تفلو جامو اس کے پاس پہنچ گیا۔ آذوری ڈنڈا تانے کھڑی تھی اس نے چہرے سے نقاب اتار کر دور پھینک دیا اس کی آنکھیں خون کیوٹر ہو رہی تھیں۔ تفلو اس کی طرف بڑھا۔ آذوری نے چیخ کر کہا۔ ”خبردار آگے نہ بڑھنا سر پھاڑوں گی۔“

تفلو نے دانت نکال دیئے اور ہنس کر بولا۔ ”آذوری تیرے ہاتھ میں یہ لکڑی اچھی نہیں لگتی۔ میرے بازوؤں میں آ جاؤ۔“

آذوری نے پوری قوت سے ڈنڈا تفلو کے سر پر مارا۔ مگر گھر میں رہنے والی لڑکی لڑنا کیا جانے۔ اس کا ساتھ ہلکا گیا۔ ڈنڈا سر کے بجائے شانے پر پڑا۔ تفلو نے ڈنڈا پکڑ لیا آذوری کے ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی اس نے زور سے ڈنڈا کھینچا تفلو کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا۔ آذوری نے اس پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ تفلو اس کا ہر وار ہاتھوں پر روک لیتا۔

”دیکھو ماں جاؤ، ورنہ نقصان اٹھاؤ گی آذوری۔“ تفلو جامو نے وار روکتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

”میں عزت پر قربان ہو جاؤں گی، کہیں۔“ آذوری تابڑ توڑ اس پر ڈنڈا برسا رہی تھی۔ مگر جامو تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس پر اثر ہی نہ ہوتا۔ آذوری اس پر وار کرتی جاتی اور پیچھے ہٹی جاتی یہاں تک کہ وہ مسجد کے دروازے پر پہنچ گئی۔ نماز ختم ہوئی تھی۔ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے ایک لڑکی کو اس بے بسی اور بے بسی کے عالم میں دیکھا تو حیرت ملی نے جوش مارا۔ کچھ دکاندار اور راہ گیر بھی آگئے۔ ان سب نے مل کر تفلو جامو پر ہلہ

ہو گئیں۔ اس نے بھائی کے حکم کی پوری پابندی کی لیکن اس سے اس کا دماغ بوجھل، دل اداس اور طبیعت چڑچڑی ہو گئی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت بھائی کے محل میں گزارتا نجم الدین کی رہائش کو محل کا نام کیوں دیا گیا اس کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا۔ اس میں صرف چار کمرے تھے خادموں کے لئے دیوار کے اس طرف چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں مشکل سے دو چار پائیاں بچھ سکتی تھیں ایک بڑے ہال میں اسلحہ خانہ تھا۔ شاید اس اسلحہ خانہ کی وجہ سے اسے محل قرار دیا گیا تھا۔ دو چار دن تو اسد کے بڑی پریشانی سے گزرے وہ کچھ کھویا سارہتا یا اسے محسوس ہوتا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ اور اس کے کھو جانے سے اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی آگئی ہے آخر پانچویں دن آذوری کی خادمہ جورا پوچھتے پوچھتے اس کے پاس آئی کہتے ہیں کہ لیل کا کتا بھی پیارا ہوتا ہے۔ اسد نے اسے دیکھا تو کھل اٹھا بڑی عزت سے بٹھایا اور کئی گھنٹے تک باتیں کرتا۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ جورا روز آذوری کا پیغام لے کر اسد کے پاس آتی اور جواب لے جاتی۔ اس بلا واسطہ نامہ و پیام سے دونوں کو سکون ملنے لگا۔

ایک دن آذوری کی طبیعت بہت گھبرائی تو جورا کو ساتھ لے کر بازار گئی۔ آذوری کا باپ خسرو شیر کہیں گیا ہوا تھا۔ ماں نے منع بھی کیا لیکن آذوری ضد کر کے چلی گئی۔ جس دن سے اسد پر شکاراں آنے کی پابندی لگی تھی آذوری نے بازار جانا تو کجا ڈیوڑھی کے باہر بھی قدم نہ نکالا تھا آذوری نے نصف نقاب کے بجائے پورے چہرے کو سیاہ جالی کے نقاب سے پوشیدہ کر لیا لیکن ماہتابی کریمیں تو بادل میں بھی راستہ بتا لیتی ہیں۔ آذوری کے حسن کا چرچا بازار میں پہلے ہی تھا اور جب سے تفلو جامو اور اسد الدین کی چپقلش کا حال لوگوں کو معلوم ہوا تھا آذوری کے حسن میں آپ ہی آپ چار چاند لگ گئے تھے۔ ایک تو آذوری کا حسن چھپنے والا نہ تھا دوسرے جورا اس کے ساتھ تھی پھر بھلا بازار والے کیوں نہ پہچانتے اور ان کی نظریں اس طرف کیوں نہ اٹھتیں لیکن دیکھنے والوں کی نظریں سہمی سہمی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس چاند پر تفلو جامو جیسا گروہ بند بد معاش یا حاکم قلعہ کا بھائی اسد الدین ہی کمند ڈال سکتا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے آذوری بازار کی سیر اور خریداری میں مصروف تھی کہ تفلو جامو کے ایک ساتھی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ بھاگا بھاگا شراب خانے پہنچا اور تفلو جامو کو خبر کر دی۔ شراب خانے عام تھے۔ سکریت میں مسلمانوں کے علاوہ مجوسی، نصرانی اور یودی بھی آباد تھے۔ لوگوں میں شراب کا استعمال عام تھا۔ جامو مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اٹھا تو اس کے پندرہ بیس ساتھی بھی اس کے ساتھ ہو لئے جب تک اسد الدین کا گشت جاری رہا، بد معاش کونوں میں دبکے رہے۔ اس

بول دیا۔ تنلو جامو گھبرا کر بھاگا مگر بھاگتے بھاگتے اعلان کر گیا کہ ”آج رات تیرے گھر میں آگ نہ لگا دوں تو تنلو جامو نہ کہنا“.... پھر وہ اور اس کے ساتھی مجمع کو چیرتے ہوئے نکل گئے۔

آزوری کو چکر آگیا جو اسے سہارا دے کر ایک دکان پر نلے گئی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے تب کہیں اسے ہوش آیا۔ پورے بازار میں خوف و ہراس پھیل گیا لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں جتنے منہ اتنی باتیں ایک نے کہا۔ ”یہ سب شر کو تو ال کی کمزوری ہے اسے استغفا دے دینا چاہئے۔“

دوسرے نے خیال ظاہر کیا۔ ”تصور نکرت کے حاکم کا ہے۔ اس نے غنڈے بد معاشوں کو ڈھیل دے رکھی ہے۔“

ایک بزرگ بولے۔ ”جب مسلمان راہ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں تو ان پر عذاب الہی نازل ہوتا ہے عزت اور ناموس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“

..... پھر یہ طے پایا کہ اس کی اطلاع شر کو تو ال کو دینی چاہئے کو تو ال کے پاس جانے سے لوگ ڈرے۔ ان کا خیال تھا کہ کو تو ال سے شکایت کرنے سے تنلو جامو ان کا دشمن ہو جائے گا۔ وہ دوسروں کے جھگڑے میں کیوں ٹانگ اڑائیں لیکن حالات کی سنگینی دیکھتے ہوئے کچھ جی دار جوان اور بزرگ کو تو ال کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آزوری کو حفاظت سے اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔ پھر دس بارہ آدمی کو تو ال کے پاس گئے کو تو ال کو اس ہنگامے کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا اور بڑے غور سے باتیں سنیں۔ پھر یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ وہ ابھی جا کر تنلو جامو اور اس کے گروہ کو گرفتار کرتا ہے لوگ اس یقین دہانی سے مطمئن ہو کر گھروں کو واپس چلے گئے۔

محلہ شکاراں میں کرام برپا تھا۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ ”اب نکرت میں کسی لڑکی کی عزت محفوظ نہیں۔“ ان کی بات بھی ٹھیک ہی تھی روز روشن میں سر بازار ایسا ہنگامہ ہو تو لوگ اس کے سوا اور کیا کہیں گے۔ رات سر پر آئی تو لوگوں میں مزید ہراس پیدا ہوا تنلو جامو کے حملے کا خطرہ تھا لوگ شر کو تو ال کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے اس نے شکاراں کی حفاظت کا بھی وعدہ کیا تھا شر کو تو ال کیا اس کا کوئی ہرکارہ بھی نہیں آیا۔ رات گئے تک لوگ جگہ جگہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب بہت رات ہو گئی اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو لوگوں کو اطمینان ہو گیا اور وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر سو گئے... لیکن آزوری اور اس کے گھر والوں پر نیند حرام ہو گئی تھی۔ آزوری گہرائی ہوئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ کس سے کہے کہ اسے تنلو جامو کے

طرف سے خطرہ ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ تنلو آئے گا اور ضرور آئے گا۔ آزوری کا باپ خسرو شیر بیٹی سے خفا تھا اس کا خیال تھا کہ نہ آزوری بازار جاتی اور نہ یہ حادثہ پیش آتا آزوری کا خدشہ درست نکلا۔ رات کے سنانے میں اسے گھوڑوں کی ٹانگیں سنائی دیں تو دوڑ کر دروازے کی بجری سے گلی میں دیکھا کھبوں سے لٹکی ہوئی لائینوں میں شمعیں ٹٹٹا رہی تھیں، روشنی ہلکی تھی لیکن آزوری کو گلی میں کتنے ہی سوار داخل ہوئے دکھائی دیئے۔ آزوری چیخ مار کر دوڑی اور ماں سے لپٹ گئی اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ جو را نے دوڑ کر دیکھا اور وہیں سے آواز لگائی ”تنلو جامو آگیا۔“

خسرو شیر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ آزوری کی ماں نے عقل سے کام لیا اس نے فوراً آزوری جو را اور بیٹے کو دیوار پر چڑھا کر دوسرے گھر میں اتار دیا۔ پھر خسرو شیر کو بچھلے دروازے سے باہر نکال کر اسے تاکید کی کہ فوراً حاکم قلعہ کے پاس جا کر خبر کرے مکان میں صرف آزوری کی ماں رہ گئی اچھا پڑوس خدا کی رحمت ہوتا ہے پڑوس کی خواتین نے پورا پورا تعاون کیا انہوں نے آزوری اور اس کے بھائی کو ایک کمرے میں چھپا دیا آزوری کے دماغ میں فوراً ایک خیال آیا تو اس نے جو را سے کہا۔ ”شاید یہ میرا آخری کام ہے جس طرح ہو سکے منگلے کے پاس جاؤ اور اس سے کہو آزوری کی عزت نیلام ہونے والی ہے۔ بچا سکتے ہو تو فوراً آؤ۔“

جو را سر پر پیر رکھ کر سیدھی محل کی طرف بھاگی۔

تنلو جامو اپنے پچیس سواروں کے ساتھ آزوری کے دروازے پر آیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ یہ آزوری کی ماں تھی۔ ”دروازہ کھولو۔“ تنلو شیر کی طرح گرجا۔

”کس سے ملنا ہے؟“ آزوری کی ماں نے دروازے کی اوٹ سے پوچھا۔

”میں تنلو جامو ہوں۔ دروازہ کھولو ورنہ آگ لگا دوں گا۔“ وہ پھر گرجا۔

”کیوں آگ لگا دو گے ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“ آزوری کی ماں بڑے استقلال سے باتیں کر رہی تھی۔ دراصل وہ تنلو کو باتوں میں لگا کر زیادہ سے زیادہ وقت لیتا چاہتی تھی۔ تنلو نے دروازے پر ٹھوکر کو ماری۔ ”کھولو دروازہ میں آزوری کو لے جاؤں گا۔“

”آزوری تو یہاں نہیں ہے بیٹے۔“

”کہاں گئی ہے وہ؟“

”اسے تو چھوٹا سردار اپنے ساتھ محل لے گیا۔“

”ٹو جھوٹی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے تنلو نے دروازے کو چار پانچ اور ٹھوکر لگائیں۔

آزوری کی ماں حوصلے سے بولی۔ ”بیٹا دروازہ کیوں توڑتے ہو اس میں کھولے دیتی ہو تمہیں یقین نہ آئے تو اندر آ کر خود دیکھ لو۔“

آزوری کی ماں نے دروازہ کھول دیا۔ تفلو ننگی تلوار لئے اندر آ گیا اس کے چار پارے ساتھی بھی گھس آئے۔ ”کہاں چھپا ہوا ہے آزوری کو؟“ تفلو نے تلوار کی نوک بڑی بی کی طرف کردی۔

بڑی بی کے حوصلے میں کوئی فرق نہ آیا۔ بولیں۔ ”میں نے بتایا تو ہے آزوری کو چھوڑو سردار اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

جھوٹ بولتی ہے تو کب لے گیا وہ کتا؟ تفلو نے تلوار بڑی بی کی گردن سے لگا دی۔

”شام کو آیا تھا لے گیا۔“ بڑی بی نے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

تفلو جامو پاگوں کی طرح گھر میں ادھر ادھر بھاگنے لگا کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں اس نے کونہ کونہ چھان مارا۔ آزوری وہاں ہوئی تو ہلتی وہ تھک کر ہارے ہوئے جوار کی طرح چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ ”ساری محنت اکارت گئی۔ وہ کتا ہم سے پہلے پہنچ گیا۔“

اس کے ایک ساتھی نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسد یہاں نہیں آیا۔ چراغ جلے تک میں گلی کی کٹڑ پر تھا۔“

”پھر کہاں گئی آزوری۔“ تفلو دل گرفتگی سے بولا۔

تردید کرنے والے نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اس بڑھیا نے اسے محلے میں کسی کے گھر بھیج دیا ہے۔“

تفلو نے بڑھیا کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ بے چاری زمین پر گر گئی۔ ”کس کے گھر بھیجا ہے آزوری کو؟“ تفلو نے اسے زمین پر کھینچتے ہوئے کہا۔

آزوری کی ماں نے تحمل کی حد کر دی۔ اسی حوصلے سے بولی۔ ”جو بات تھی میں نے بتا دی تمہیں یقین نہ آئے تو میں کیا کروں۔“

تفلو نے مجبور ہو کر اس کے بال جھوڑ دیئے اس کی چوری اور سینہ زوری کا یہ عالم کہ وہیں جم کے بیٹھ گیا اور منصوبے بننے لگے۔ آزوری کو کس طرح برآمد کیا جائے؟ اگر آزوری کو اسد الدین لے گیا تو کیا کیا جائے اور اگر وہ محلے کے کسی گھر میں پوشیدہ ہے تو اسے کیسے پکڑا جائے؟ کس مکان کی پہلے تلاشی لی جائے؟ کیوں نہ محلے کے تمام لوگوں کو نکال کر ایک جگہ کھڑا کر دیا جائے اور پھر تلاشی لی جائے انہیں کسی کا ڈر یا خوف نہیں تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سکریت پر غنڈوں کی حکومت ہو محلے والے گھروں میں چپکے پڑے

بی اپنی خبر مٹا رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ محلے میں غنڈے آئے ہوئے ہیں اور ایک ہر میں زبردستی گھس گئے ہیں لیکن کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ہمت کر کے شیر کو توال کے پاس آ کر خبر کرتا۔

تفلو جامو ایک گھنٹے تک گھر میں ادھم مچاتا رہا محلے میں دندناتا رہا۔ اس نے آزوری کے گھر کا تمام سامان نکال کر باہر پھینک دیا۔ اس کی ماں کو ڈرایا یا دھمکایا دو چار ہاتھ بھی ڈویئے۔ بڑھیا بڑی جیدار تھی وہ مار کھاتی رہی اور بڑبڑاتی رہی لیکن دل کا بھید نہ دیا اور ہی آزوری کا صحیح پتہ بتایا بس یہی رٹ لگاتی رہی کہ آزوری کو چھوٹے سردار اپنے ساتھ لے گئے ہیں تفلو جامو نے تھک ہار کر ایک ایک گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا اسے یقین ہو گیا کہ آزوری اسی محلے میں سے غنڈوں نے پورے محلے کو گھیرے میں لے لیا۔ منصوبے کے مطابق تلاشی برابر والے مکان سے شروع ہونا تھی۔ اسی مکان میں آزوری پوشیدہ تھی۔ وازے پر دستک ہوئی گھر والوں کا جیسے دم ہی نکل گیا۔ انہیں اپنی موت سامنے کھڑی نظر لی لیکن جس کو اللہ رکھے اسے کون چلے تفلو جامو کے ساتھی دیوار پھاند کر اندر جانے کی ر میں تھے کہ محلہ شکاراں میں ایک تیز رفتار سوار داخل ہوا تفلو نے دور ہی سے اسے پان لیا یہ اس کا دشمن اور آزوری کا منگلا شمشیر زن اسد الدین تھا۔ ”اسد الدین گھوڑا ہا کر تفلو جامو کے سر پر پہنچ گیا۔ تفلو بھی گھوڑے پر بیٹھ گیا تھا اس کے تمام ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے سنبھال لئے تھے۔ اسد الدین کا نام سن کر محلے والوں کو بھی صلہ ہوا اور انہوں نے دروازوں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ بعض کوٹھوں پر بھی چڑھ گئے۔ اسد الدین کا اس موقع پر آزوری کے مکان تک پہنچا دراصل جورا کی کوششوں کا جہ تھا۔ آزوری کا پیغام ایسا نہ تھا کہ اسد الدین تڑپ نہ اٹھتا۔ وہ اصول اور قول و قرار لے تمام بندھن توڑ کر آ گیا تھا۔

آخری دنوں کا چاند پیڑوں سے جھانکتا ہوا بلند ہو گیا اور ہر طرف روپہلی چاندنی پھیل لی تفلو جامو اور اسد ایک دوسرے کے آسنے سامنے کھڑے تھے۔ تفلو کے ساتھی اسد لے گرد گھیرا ڈالنے کی فکر میں تھے منہ سے کوئی نہ بولا لیکن خاموش گھورتی نگاہوں نے لان جنگ کر دیا۔ اسد الدین کے پہنچنے کے چند لمحے بعد ایک اور سوار آ گیا۔ یہ اس کا ادار خادم تھا۔ خادم نے یہ رنگ دیکھا تو گھوڑا بڑھا کر اسد کے پاس پہنچ گیا اور اس کی ت پر کھڑے ہو کر مورچہ سنبھال لیا۔ اسد کو سخت غصہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ ل رہی تھی لیکن اسے آزوری کی زندگی اور عزت عزیز تھی۔ اس نے ضبط سے کام لیا ر مصالحانہ انداز میں بولا۔ ”تفلو جامو آزوری کو میرے حوالے کر دو۔ اگر تم نے اس کی

آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کی ہے تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔“

تغلو جامو کو اپنے ساتھیوں کا زعم تھا۔ اس نے ایک بھیاںک ہتھ لگایا اور بولا۔ ”ا ہوا تم خود آگئے۔ مکاری سے کام نہ لو۔ آزوری تمہارے پاس ہے میں اسے ہر حال میں حاصل کر کے رہوں گا۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ آزادی کو واپس کرتے ہو نہیں؟“

اسد کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹنے لگا۔ اس نے گرج کر کہا۔

”بکواس نہ کر تغلو میری پیش کش سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔“
تغلو جامو نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”شکار خود جال میں آگیا ہے اب مجھ سے جا کی امان مانگ اور آزوری کو واپس کرتے ہو یا نہیں۔“

اسد کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹنے لگا اس نے گرج کر کہا۔ ”بکواس نہ کر تغلو میری پیشکش سے فائدہ اٹھاؤ اور نہ زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔“

تغلو جامو نے ایک اور قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”شکار خود جال میں آگیا ہے۔ اب مجھ سے جان کی امان مانگ اور آزوری کو واپس کر دے۔“

”آزوری کے گھر پر تو نے حملہ کیا ہے۔“

”لیکن آزوری کو تو پہلے ہی لے بھاگا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے تغلو نے اسد پر حملے کے لئے اپنا گھوڑا بڑھایا اسی وقت ایک آواز بلند ہوئی جس نے تغلو جامو اور اسد دونوں کی حیرت میں ڈال دیا یہ آزوری کی آواز تھی وہ اپنے کونٹے پر کھڑی چاند کی خشک روشنی میں تنگی تلوار لہرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”آزوری کس کے پاس نہیں آزوری تو زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔“ پھر آزوری نے اسد کو آواز دے کر کہا منجیلے شمشیر زن آزوری کی عزت بچا سکتے ہو تو بچا لو ورنہ وہ اپنی آبرو پر خود قربان ہو جائے گی۔“

”تیری عزت میری زندگی ہے آزوری“ اسد الدین نے نعرہ لگایا اور تغلو جامو پر اتار سخت حملہ کیا کہ وہ روکتے روکتے بیس قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اگر اس کے ساتھی درمیان میں نہ آجاتے تو پہلے ہی وار میں تغلو کا خاتمہ ہو جاتا۔ شکاراں کے تمام مرد، عورتیں اور بچے کونٹوں پر اٹھ آئے۔ انہوں نے ایسا تماشہ اور ایسی لڑائی کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایک طرف چیتیں سوار اور دوسری طرف منجلا اسد اور اس کا ملازم۔ اسد پور قلعے میں شمشیر زن مشہور تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ واقعی شمشیر زن ہے اسد جلد سے جلد تغلو کا خاتمہ کر کے اس ہنگڑے کو نمنا دیتا چاہتا تھا لیکن تغلو کے ساتھی بار بار سامنے آکر اس کا راستہ روک لیتے تھے۔۔۔ پھر انہوں نے اسد اور تغلو کے درمیان ایک دیواری کھڑی کر

ہی۔ آزوری کوٹھے پر جھکی اپنے منجیلے کی شمشیر زنی دیکھ رہی تھیا ور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی پھر اس نے دیکھا کہ اس نے تغلو کے محافظوں کی دیوار توڑ دی۔ اس کے سامنے کے دو سوار مارے گئے اور اسے راستہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسد کی تلوار چمک کر تغلو پر گری۔ یہ موت کا پیغام تھا تغلو کا ایک بازو کٹ کر دور جاگرا پھر دوسرے وار نے تغلو کا ہیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

تغلو جامو کا انجام دیکھ کر اس کے باقی ساتھی سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آزوری کوٹھے سے گلی میں کود پڑی اور دوڑ کر اسد کے پاس پہنچی اس نے گھوڑے سے اتر کر آزوری کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ محلے والے جواب تک ڈرے ڈرے سے کونٹوں پر کھڑے تھے خوشیاں مناتے اور تالیاں بجاتے ہوئے اسد کے پاس آگئے اسد کا بڑا بھائی حاکم قلعہ شکریت نجم الدین ایوب جس وقت اپنے سواروں کے ساتھ محلہ شکاراں میں پہنچا تو تغلو جامو کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔ محلے والوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اسے اسد الدین کی غیر معمولی بہادری اور تغلو جامو کی حرکت سے آگاہ کیا۔ نجم الدین نے اسد کو شکاراں جانے سے منع کیا تھا۔ اسے اسد کے بغیر اجازت یہاں آنے سے پہلے صدمہ ہوا لیکن جب لوگوں نے اسد کو اپنا نجات دہندہ بتایا تو اس کی خفگی کچھ کم ہو گئی۔ نجم الدین گھوڑا بڑھا کر اسد الدین کے پاس پہنچا۔ آزوری کا باپ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اسد الدین نے بھائی کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اس کی نظر حیا اور احترام سے اوپر نہ اٹھتی تھی۔ پھر غصہ یہ تھا کہ آزوری اس سے بالکل ہلکی کھڑی تھی۔ نجم الدین نے مسکرا کر کہا۔ ”اسد۔ سراوہر اٹھاؤ جو ہوا اچھا ہوا۔ میں خوش ہوں۔“

اسد الدین کا خون خشک ہو رہا تھا۔ بھائی کے نرم لہجے نے اسے ہمت دی۔ اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ بھائی کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ اسد کا خوف تو دور ہو گیا لیکن آزوری کی موجودگی کی وجہ سے اس پر شرم غالب تھی۔ نجم الدین نے آزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ لڑکی....؟“

آزوری کا باپ نجم الدین کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”یہی میری بیٹی آزوری ہے سردار محترم۔“

نجم الدین نے ”ہوں“ کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے ولا۔ ”خرو شیر۔ اپنے بال بچوں کو لے کر محل میں آ جاؤ۔“

تغلو جامو کے مارے جانے کے بعد قلعے میں امن و سکون ہو گیا۔ آئے دن کے

جنگلوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قلعے کے سابق حکمران خاندان کا زور ٹوٹ گیا۔ انہیں مقتول کے ح میں کوئی گواہ نہیں ملا۔ اس لئے انہوں نے قاضی کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش کرنے سے بھی گریز کیا۔ نجم الدین نے کو قوال شمر کی غفلت اور نااہلی کی بنا پر اسے معزول کر کے اس کے نائب کو اس کی جگہ مقرر کیا جس نے جامو کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر کے قراقرظ سے دلوائی۔ نجم الدین نے خسرو شیر کی رضامندی سے آذوری اور اسد کے نکاح کی تاریخ مقرر کر دی نجم الدین ان دنوں اس لئے اور زیادہ جوش تھا کہ اس کے گھر خوشی ہونے والی تھی اس کے کوئی زینہ اولاد نہیں تھی۔ اس دفعہ اسے خدا کی ذات سے لڑکا پیدا ہونے کا پوری امید تھی۔

قلعہ سمرت شمعوں اور چراغوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ محل کے ایک کمرے میں مہمان جمع تھے اسد الدین کے نکاح کے لئے قاضی صاحب تشریف لا چکے تھے۔ نجم الدین کی خوشی کا کیا پوچھتا ایک تو بھائی کی شادی، دوسرے سمرت کی تمام دایاں نجم الدین کی بیوی کے گرد جمع تھیں اور ایک نومولود کی پہلی آواز کا انتظار کر رہی تھیں۔ ادھر اسد الدین کا نکاح ہوا ادھر زبان خانے سے ایک خادمہ نے آکر نجم الدین کو ایک چاند سے بیڑ کی خبر دی۔ نجم الدین خوشی سے پھولا نہ سہا اسے دہری مبارک بادیں مل رہی تھیں۔ لیکن لیکن یہ بزم نشاط ایک لمحے میں درہم برہم ہو گئی۔

نجم الدین کو محل کے ایک خادم نے اطلاع دی کہ مجاہد الدین بہروز کا قاصد آیا ہے اور فوراً ملاقات کا خواہش مند ہے۔ مجاہد الدین بہروز بغداد گورنر تھا۔ اسی نے نجم الدین کے باپ کو سمرت کا قلعہ دار مقرر کیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد قلعے کا حاکم نجم الدین ہوا تھا نجم الدین کا ہاتھ ٹھکا اور اس وقت تو اس پر ہر بات بالکل عیاں ہو گئی جب وہ قاصد سے ملنے پہنچا اور اسے قاصد کے ساتھ تغلو جامو کا باپ بیٹھا ہوا دکھائی دیا تغلو جامو کا باپ بڑے معبرانہ انداز میں اپنی لمبی مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ قاصد نے سلام کر کے ایک سرسبز لفافہ نجم الدین کی طرف بڑھایا۔ نجم الدین نے خط کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

”نجم الدین ہم نے تمہارے باپ کو سمرت کا قلعہ دیا۔ اس کے بعد تمہیں قلعے کا حاکم مقرر کیا لیکن تم نے ہمارے احسانوں کو بھلا دیا۔ پے در پے ایسے کام کئے جو ہمارے مزاج کے خلاف تھے۔ اب تمہارے ملائق بھائی نے سمرت کے پرانے حکمران خاندان کے ایک جوان کو بلاوجہ قتل کر دیا۔ سمرت میں دہشت پھیلانی تم اپنے عہدے سے معزول کئے جاتے ہو۔ سمرت کا قلعہ دوبارہ پرانے حکمران کو دیا جاتا ہے۔ مقتول کا باپ قاصد کے ساتھ آ رہا ہے قلعہ اور اسلحہ خانہ کی چابیاں اس کے حوالے کر دو۔ مزید یہ کہ جس وقت

تمہیں یہ خط ملے، اگر دن ہے تو غروب آفتاب سے پہلے اور اگر رات ہو تو آفتاب نکلنے سے پہلے تم قلعہ سمرت چھوڑ دو۔“

جمال الدولہ مجاہد الدین بہروز

بہروز۔ زاور نجم الدین میں اختلاف کی بنیاد اسی رات پڑ گئی جب نجم الدین نے عماد الدین زنگی اور اس کے شکست خوردہ لشکر کو قلعہ سمرت میں پناہ دے کر اس کی خاطر و مدارت کی تھی۔ مجاہد الدین بہروز اور عماد الدین زنگی دونوں اس دور کے بڑے جلیل القدر امیر تھے لیکن ان دونوں میں کبھی نہ بنتی تھی اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔ بہروز کو جب معلوم ہوا کہ زنگی کو قلعہ سمرت میں پناہ دی گئی ہے تو وہ نجم الدین پر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا لیکن وہ اعلانیہ زنگی کی بھی مخالفت نہیں کرنا چاہتا تھا اس وقت تو بہروز خاموش ہو رہا۔ لیکن جب تغلو جامو کے باپ نے اس کے سامنے جا کر اپنے بیٹے کے قتل کا رونا دیا تو بہروز کو ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا اور اس نے اس قتل کو ہمانہ بنا کر نجم الدین کو سمرت کی قلعہ داری سے معزول کر دیا۔ نجم الدین نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ اندر گیا، قلعے اور اسلحہ خانے کی چابیاں لا کر قاصد کے حوالے کر دیں پھر اسی رات بغیر احتجاج کئے اپنے اور خسرو شیر کے خاندان سمیت دجلہ پار کر گیا صبح کو جب سورج کی کرنیں پھوٹیں نجم الدین نے پلٹ کر دیکھا سمرت کے قلعے کا سب سے اونچا برج اسی طرح سر بلند نظر آ رہا تھا۔ اسد الدین کا عقد اور اس بچے کی پیدائش بظاہر ایک بدشگونی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بدشگونی ایک ایسے شگون میں بدل گئی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ منجلا شمشیر زن اسد الدین اس قلعے سے نکل کر شیرکوہ کے نام سے مشہور ہوا اور فاتح مصر کہلایا اور نومولود بچہ آگے چل کر مجاہد اکبر صلاح الدین ایوبی بنا جس نے ملیوں کے چھکے چھڑا دیے اور مصر میں سلطنت ایوبیہ کی بنیاد رکھی۔

کا بیٹا نور الدین تخت نشین ہوا۔ نور الدین بڑا زبردست بادشاہ ہوا تھا۔ اس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور اس پاس کے تمام مسلم علاقوں کے سرداروں کو جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اپنے ساتھ ملا لیا یا ان کا خاتمہ کر دیا پھر ایک عظیم سلطنت قائم جس کا دار الخلافہ سلطنت دمشق ہوا۔

اسد الدین جو اب شیرکوہ کے نام سے مشہور ہوا تھا وہ سلطان نور الدین کی خدمت میں رہا۔ وہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بہادر اور سلطان نور الدین زنگی کی فتوحات میں اس کا دست راست تھا۔ نور الدین زنگی نے شیرکوہ اور نجم الدین کی خدمات کے صلہ میں دونوں بھائیوں کو دمشق میں بڑی جاگیریں دیں۔

نجم الدین ایوب کا نامور بیٹا صلاح الدین اس وقت صرف نو سال کا تھا۔ وہ ایک توطیت پسند، خاموش طبیعت اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ صلاح الدین جامعہ دمشق میں علماء کے وعظ سننے میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔ اس کے والدین اپنے بیٹے کے اس رویہ سے بہت مایوس تھے۔

شیرکوہ نے جس وقت صلاح الدین کو سلطان نور الدین کی خدمت میں پیش کیا اس وقت اس کی عمر سترہ سال ہو چکی تھی۔ صلاح الدین نے اس وقت تک سوائے فوجی تربیت حاصل کرنے کے کسی جنگ میں حصہ نہ لیا تھا مگر جب نور الدین زنگی نے اس نوجوان کو دیکھا تو نہ معلوم اس جوان میں کیا نظر آیا کہ اس نے صلاح الدین پر خصوصی توجہ دینا شروع کی اور اسے حکم دیا کہ وہ یعنی صلاح الدین خود کو اس کے (سلطان) کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

سلطان نور الدین زنگی، امیر زاوے صلاح الدین کو سلطان کے پیکر میں ڈھالنے کی ہدایات دے کر اس کی طرف سے ایسے غافل ہوئے کہ آئندہ دس برس تک پھر صلاح الدین کا نام تاریخ کے صفحات میں کسی جگہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ 1164ء کا سال آیا جب مصر میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ وہاں کا وزیر سلطنت دمشق آیا اور سلطان نور الدین زنگی سے فوجی امداد کا طالب ہوا۔

مصر پر صدیوں سے ایک ایسے خاندان کی حکومت تھی جو حضرت فاطمہ کی نسل سے ہونے کی وجہ سے بنو فاطمہ کہلاتے تھے۔

اس طرح بغداد میں اہل سنت کی خلافت عباسیہ اور قاہرہ (مصر) میں خلافت فاطمیہ یعنی اہل تشیع کی خلافت تھی مگر اس دور میں بغداد کے عباسی اور قاہرہ کے فاطمی خلیفہ صرف برائے

تحریر سے نکل کے نجم الدین ایوب نے موصل کا رخ کیا۔ والی موصل عماد الدین زنگی پر نجم الدین نے بڑا احسان کیا تھا۔ نجم الدین نے عماد الدین اور اس کے مختصر لشکر قلعہ تحریر میں اس وقت پناہ دی تھی جب اس کے پیچھے دشمن کا لشکر لگا تھا۔ اگر الدین اپنے قلعہ میں پناہ نہ دیتا تو عماد الدین کو یقیناً اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ چنانچہ جب نجم الدین ایوب اپنے خاندان کے ساتھ موصل پہنچا تو عماد الدین نے ا لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس احسان کا بدلہ عماد الدین نے یوں دیا کہ نجم الدین کو اپنی فوج میں داخل کر کے اسے جاگیر عطا کی۔ پھر عماد الدین نے حلبک پر قبضہ کیا تو اس نے الدین کو وہاں کا قلعہ دار بنا دیا اور اس کے چھوٹے بھائی اسد الدین کو اپنے بیٹے شہزادہ الدین کی خدمت پر مامور کیا۔

اس وقت مشرق وسطیٰ میں بڑی بڑی عیسائی سلطنتیں قائم تھیں جو ایک کڑی کی طر شمال سے جنوب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شمال میں الرہا (اڈیسہ) عیسائیوں کی بڑی مضبوط سلطنت تھی۔ اس کے علاوہ انطاکیہ اور یروشلیم کی عیسائی ریاستیں تھیں جو دن رات مسلمانوں کو تنگ کرتی رہتی تھیں۔ مسلمانوں کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ عیسائیوں نے ۱۰۹۸ء میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے بے دخل کر کے ان کا قتل عام کیا تھا۔ مسلمانوں کا ایسا شیرازہ بکھرا کہ وہ عیسائیوں کے غلام ہوتے چلے گئے۔

امیر عماد الدین وہ پہلا مسلم فرمانروا تھا جس نے موصل کی مختصر سی حکومت کے باوجود عیسائیوں کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا اور الرہا کی مضبوط عیسائی سلطنت کا خاتمہ کے اس پر قبضہ کر لیا۔ الرہا پر مسلمانوں کے قبضہ سے مشرق وسطیٰ اور یورپ کے عیسائیوں میں ہلکے بچ گیا۔ نصرانی شہنشاہ قسطنطنیہ، یورپ اور ایشیا کے عیسائی حکمرانوں کے ساتھ "ا کو عماد الدین زنگی سے آزاد کرانے کے لئے آیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا لشکر تھا اور ا۔ مشرق وسطیٰ کے تمام عیسائی حکمرانوں کی مدد اور تعاون حاصل تھا۔ مگر عماد الدین نے ا۔ میدان چھوڑ کے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اس طرح مشرق وسطیٰ میں ایک بار پھر صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امیر الدین اور اس کے مجاہدانہ کارناموں خاص کر فتح الرہا کے مکمل اور مفصل حالات پڑھنے کے لئے میرا ناول "فاتح الرہا" کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ (الماس ایم اے)۔

امیر عماد الدین اور عیسائیوں کی بہت سی لڑائیاں ہوئیں مگر عیسائی اسے نقصان نہ دے سکے۔ پھر امیر عماد الدین اپنے غلاموں کے ہاتھوں قلعہ جعبر پر قتل ہو گیا۔ اس کے بعد

نام خلیفہ ہوتے تھے۔ بغداد خلیفہ کسی سلطان کے زیر سایہ حکومت کرتے تھے اور فاطمی خلیفہ اپنے وزیر اعظم جسے وزیر السلطنت کہا جاتا تھا کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔

سلطان نور الدین کا بغداد کی عباسی خلیفہ سے تعلق تھا۔ اس لئے سلطان نور الدین فطری طور پر قاہرہ پر قبضہ کر کے فاطمی خلافت کے بجائے وہاں بھی عباسی خلافت کا پرچم اڑانا چاہتا تھا اور شاید اسی جذبہ کے تحت اس نے مصری وزیر السلطنت کو فوجی مدد دی اور مصری وزیر نے شامی فوج کی مدد سے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا مگر اقتدار حاصل کرنے کے بعد مصری وزیر اعظم نے بے وفائی کی اور معاہدہ کے مطابق مصری علاقے سلطنت دمشق میں شامل کرنے کے بجائے شامی امدادی لشکر اور ان کے سرداروں کو قتل کرنے کی سازش کی مگر وہ پچ کے دمشق واپس پہنچ گئے۔

سلطان نور الدین نے اس سے بے وفائی کی یہ سزا دی کہ وہاں ایک بڑا لشکر بھیجا گیا۔ شامی لشکر کے مصر پہنچنے سے پہلے ہی مصری وزیر سلطنت نے نصرانی شاہ ایما لک جو یروشلیم (بیت المقدس) کا بادشاہ تھا اس سے معاہدہ کیا اور اپنی مدد کے لئے عیسائی لشکر بلوایا۔ ادھر شامی لشکر اسد الدین شیرکوہ کی سرکردگی میں مصر پہنچا۔ اس لشکر میں اسد الدین شیرکوہ کا نوجوان بھتیجا صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھا۔ نوجوان صلاح الدین مصر آنے پر کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا اور اس کا چچا اسے زبردستی اپنے ساتھ لایا تھا۔

یہ صلاح الدین کی قسمت تھی کہ جس مصر جانے سے وہ انکار کر رہا تھا اس مصر نے اس کے قدم چومے اور اس کے لئے ترقی کے راستے کھول دیئے۔ شیرکوہ نے مصری اور عیسائی مشترکہ لشکر کو میدان میں شکست دے کر دارالوزارت پر قبضہ کر لیا اور مصر کا دھوکہ باز وزیر مارا گیا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ العاضد نے شیرکوہ کو قصر خلافت میں بلا کر قلعہ دار وزارت اس کے سپرد کر دیا۔ شیرکوہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کے بعد مصر کی وزارت صلاح الدین کی جھولی میں آگئی۔

سلطان نور الدین زنگی نے جو لشکر فتح مصر کے لئے شیرکوہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس میں سلطان کے کئی بڑے بڑے امرا جو امراء نوریہ کہلاتے تھے شامل تھے۔ جب اسد الدین شیرکوہ کا انتقال ہوا اور مصر کے نئے وزیر اعظم کے انتخاب کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس وقت دمشق سے آنے والے ہر امیر کا یہ خیال تھا کہ اس عہدے کے لئے اسے منتخب کیا جائے گا۔ مگر صلاح الدین جو عمر میں تمام امراء نوریہ سے کم تھا، اس نے مصر میں قیام کے دوران نصرانیوں اور بعض مصری مخالف امیروں کو کئی بار میدان جنگ میں شکست دی تھی۔ اس پر امراء نے کسب صلاح الدین کو مصر کا وزیر اعظم منتخب کیا۔

صلاح الدین کے وزیر اعظم ہو جانے سے کئی شامی امرا صلاح الدین کے خلاف ہو گئے۔ بعض نے صلاح الدین کے ماتحت کام کرنے سے انکار کر دیا اور دمشق واپس چلے گئے مگر مصر میں کچھ ایسے امیر بھی تھے جو بظاہر صلاح الدین کی حمایت کرتے تھے مگر درپردہ سلطان دمشق کو خطوں کے ذریعہ صلاح الدین سے بھڑکاتے رہتے تھے۔ صلاح الدین نے اپنے اہل خاندان کو مصر بلوایا تھا۔ اس کا باپ نجم الدین ایوب زندہ تھا اور مخالف سرداروں کی چالوں کا جواب دیتا تھا۔ اس طرح صلاح الدین مصر میں محفوظ رہا ورنہ امرا نے تو سلطان کو اس کے اس قدر خلاف کر دیا تھا کہ سلطان دمشق سے لشکر لے کر مصر جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا مگر نجم الدین ایوب نے ایک سیاسی چال چل کے سلطان کو مصر آنے سے روک دیا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر صلاح الدین مصر ہی کا ہو کر رہ گیا اور سلطان نور الدین زنگی کی زندگی میں وہ دمشق واپس نہ آسکا۔ اب سلطان نور الدین کا انتقال ہو گیا تھا اور صلاح الدین مصر سے دمشق آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آئیے اب آپ آگے کے حالات ملاحظہ فرمائیے۔

نوٹ --- اگر آپ سلطان نور الدین زنگی اور صلاح الدین کے ابتدائی حالات کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو میرا ناول ”سلطان نور الدین زنگی“ کا ضرور مطالعہ کیجئے۔

(الماس)
صلاح الدین کے مصر میں وزیر ہونے کے دوران کئی بغاوتیں ہوئیں۔ سب سے بڑی بغاوت سوڈانیوں کی تھی۔ سوڈانی مصری حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ موتمن خلافت یعنی باروغہ حملات شامی بھی ایک سوڈانی تھا۔ اس کا نام نجاج تھا۔ دوسرے مصری سرداروں کی طرح نجاج بھی صلاح الدین کی وزارت پسند نہ کرتا تھا اور ہر سازش میں پیش پیش رہتا تھا۔

اس دفعہ جو سازش کی گئی اس میں نجاج کا نام سرفہرست تھا۔ تمام سازشی شہر سے باہر ایک محل میں جمع ہوئے۔ اس مجلس میں شاہ یروشلیم کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ خوب گرم گرم بحث و مباحثہ کے بعد صلاح الدین کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔ مگر عین موقع پر سازش کھل گئی۔ کچھ سازشی معزول ہوئے اور کچھ قتل ہو گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے۔

شہر میں اتنا بڑا انقلاب آیا۔ شامی حملات کا پرسکون ماحول میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ موتمن الخلافت جسے مصر کا سب سے زیادہ طاقتور انسان سمجھا جاتا تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ مصر کے بہت سے جلیل القدر امراء بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ قصر خلافت اور حملات شامی کی پوری وزارت تبدیل ہو گئی سوڈانی نکالے گئے اور دوسری قوموں کی کئی تیز اور

ایوں حرم خلافت میں حسین و جمیل عورتوں کی ایک پوری فوج اکٹھی ہو گئی۔

جوانی کو اگر جوانی سمجھ کر استعمال کیا جائے تو وہ ساتھ دیتی ہے ورنہ جلد ہی بڑھاپے کو گلے لیتی ہے۔ خلیفہ وقت سے پہلے جوان ہوا اس کے چاروں طرف کینوں کی شکل میں حسن کا نذر لہریں مار رہا تھا خلیفہ نے انجام سے آنکھیں بند کر کے اس سمندر میں چھلانگ لگائی اور ان میں ڈوبتا ہی چلا گیا شادیاں کیں درجنوں نہیں سینکڑوں کے حساب سے حتہ کر ڈالے متقول تمن الخلافت نجاج اگرچہ سوڈانی حبشی تھا لیکن اس کی لڑکی نرجس اپنے حسن کا جواب نہ متی تھی نجاج کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی ہوس تھی اور نرجس کو حرم خلافت میں اپنی ریں دکھانے کی آرزو، نتیجہ یہ ہوا کہ نرجس کو کسی بہانہ خلیفہ کو دکھایا گیا نرجس کے توبہ ن حسن نے پہلی نظر میں خلیفہ کو رام کر لیا اور وہ حرم خلافت میں ایک محبوب بیوی کی نیت سے پہنچ گئی۔

حرم خلافت میں داخل ہوتے ہی ہر طرف نرجس ہی نرجس ہو گئی خلیفہ کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھائی کہ تمام بیگمات کے چراغ گل ہو گئے اور خلیفہ کی راتوں پر نرجس کا قبضہ کیا خیال یہی تھا کہ اب خلیفہ کی پریشان نظری ختم ہو جائے گی اور وہ ایک کے ہو کے رہ جائیں گے مگر خلیفہ ہو یا جوانی دونوں کے مزاج میں ٹکون مزاجی ہوتی ہے خلیفہ نے اک دم منہ تو نہ ڈالا لیکن نظروں کی آوارگی میں کسی واقع ہوئی اس زمانہ میں خلیفہ کی صحت کچھ ٹھیک ہو گئی تھی نا کی بے اعتدالیوں میں قدرے اعتدال آ گیا تھا۔ اس ٹھہراؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نرجس باپ جو موتمن الخلافت تھا اس نے نئی دوشیزاؤں کا حرم خلافت میں داخلہ بالکل بند کر دیا تھا بغیر بھی نجاج کا خیال کرتا تھا یا اس سے خوف کھاتا تھا اس لئے اپنی نظروں کو سنبھالے رکھا۔

پھر جب سوڈانیوں پر زوال آیا اور نجاج قتل ہو گیا تو حرم خلافت کی کینوں اور غلاموں نے ایک بار پھر حسین دوشیزاؤں کے حصول کے لئے کوششیں شروع کر دیں انہیں اب کوئی ف نہ تھا خلیفہ نے بھی نجاج کی موت کے ساتھ ہی چولا بدل لیا تھا اور اب اس کی راتیں نئی بیویوں کی ساتھ بسر ہونے لگی تھیں اس کے ساتھ ہی خلیفہ کی صحت پھر گرے گئی تھی۔ شاہی بیب تو لاکھ منع کرتے، طرح طرح کی ہدایتیں دیتے لیکن خلیفہ بد پرہیزی کر ہی جاتا۔ اسے خون نا کی ہی کی بیماری نہ تھی بلکہ بعض اور خطرناک قسم کی بیماریوں نے اسے گھیرا تھا۔ طبیب ایک مرض کا علاج کرتا تو دوسرا مرض زور پکڑ جاتا کتے ہیں کہ دوا سے پرہیز ضروری ہوتا ہے مگر خلیفہ پرہیز کیا کرتا وہ تو جان بوجھ کر بد پرہیزی کرتا پھر طبیب کے سامنے بچوں کی طرح روئے لگتا۔

شاہی طبیب نے کسی نہ کسی طرح اس گرتی دیوار کو لپ پوت کے سارا دیا مگر پھر ایسا

غلام ان کی جگہ مقرر ہو گئے یہ تبدیلی ناممکن معلوم ہوتی تھی لیکن پر عزم وزیر اعظم صلاح الدین کے لئے ہر ناممکن چیز ممکن ہو گئی اور اس نے مصری حکومت پر اپنے قدم جمائے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن قاہرہ کے قصر خلافت کے مالک فاطمی خلیفہ عاضد کو ان معاملات کی ذرہ برا خبر نہ ہو سکی حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ حرم خلافت کے بڑے اور چھوٹے ہر خادم اور ہر کنبہ ان تمام اہم تبدیلیوں کا علم تھا لیکن ان کی زبانوں پر تالے لگا دیئے گئے بلکہ یوں کہنا چاہئے حرم خلافت کے ہر فرد و بشر نے خود اپنے مفاد میں اپنی زباں بندی کر لی تھی وہ سب کچھ جا۔ ہوئے بھی خلیفہ محترم کو اصل حالات سے آگاہ نہیں کر رہے تھے کیونکہ اس میں خود ان کا منہ تھا۔

قاضی القضاۃ جلیس بن عبد القوی کو بھی قضا کے عہدے سے استعفا دینا پڑا تھا اس۔ خلیفہ سے سفارش کرا کے خود کو حرم خلافت سے وابستہ کر لیا تھا اب وہ صرف خلیفہ کا ملا کار اور مشیر تھا جو ہر استاد نے بھی حکومتی جھگڑوں سے وامن بچا کر اپنے آپ کو خلیفہ کی ڈار سے منسلک کر دیا تھا۔ خلیفہ کے مصاحبین کا تیسرا ستون جو سب سے اہم تھا یعنی موتمن الخلافت نجاج جو داروغہ محلات کے علاوہ خلیفہ کا خسر بھی تھا اسے غداری کی سازش میں س چڑھا دیا گیا تھا جو ہر استاد اور جلیس بن عبد القوی ہی اب حرم خلافت کے کرتا دھرتا تھے اور ا دو امیروں کے ذریعے خلیفہ اور وزیر اعظم صلاح الدین میں رابطہ قائم تھا جلیس بن عبد القوی اور جو ہر استاد نے وزیر اعظم سے درخواست کی تھی کہ شاہی محلات یا ان کے باہر کی تمام تبدیلیوں سے خلیفہ کو انسانیت کے نام پر بے خبر رکھا جائے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ خلیفہ زندگی کا چراغ اب جھللا رہا ہے اس لئے اسے مزید کسی کرب میں مبتلا نہ کیا جائے۔

وزیر اعظم صلاح الدین نے خلیفہ کے مصاحبین کی درخواست منظور کر لی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ خلیفہ کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور نہ اس کے کسی حکم میں دخل دیا جائے گا اس سلسلے میں صلاح الدین نے شاہی طبیب سے بھی گفتگو کی تھی طبیب۔ دونوں مصاحبین کے اندازے کی تصدیق کی تھی اور اپنی طرف سے بھی وزیر اعظم۔ درخواست کی تھی خلیفہ کو ان ایام میں کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچنے پائے اور وزیر اعظم نے ا درخواست کو بھی شرف قبولیت بخشا تھا۔ ایک طرف خلیفہ کے مصاحبین ان کی تمام بیگمات اور وزیر اعظم صلاح الدین اس کوشش میں تھے کہ خلیفہ کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچایا جائے مگر خلیفہ کا یہ حال تھا کہ شاہی طبیب کی سخت ہدایت کے باوجود اپنی طاقت کے خزانہ کو حید دوشیزاؤں کے نذر کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ شرعی شادیوں کے علاوہ فقہ جعفریہ میں حتہ؛ جائز ہے خلیفہ نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جس اچھی صورت پر نظر پڑی اسے حتہ میں۔

واقعہ پیش آیا جس نے شاہی طبیب اور ان لوگوں کو جن کی خوشحالی خلیفہ کی زندگی سے وابستہ تھی ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ حرم خلافت کے ایک غلام کو اپنے ایک ہ فروش دوست کے پاس ایک طرحدار دو شیرہ دکھائی دی۔ غلام اسے دیکھ کر چل گیا اور اسے خلیفہ کے لئے خریدنے کی کوشش کی۔ تاجر کو معلوم تھا کہ داروغہ محلات نے دو شیراؤں کا دار حرم خلافت میں بند کر رکھا ہے غلام نے اسے بتایا کہ یہ پابندی لگانے والا داروغہ سولی چڑھ ہے اور اب کسی لڑکی کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں تاجر نے خوش ہو کر درشوار کو بہت معاوضہ پر غلام کے ہاتھ بیچ دیا درشوار اس عالم آراء اور دلنواز کا نام تھا۔

درشوار پر خلیفہ کی نظر پڑی تو اس کی جوانی جیسے لوٹ آئی۔ درشوار تھی ہی توجہ حرم کی مالک فرشتے بھی دیکھتے تو پرواز بھول جاتے۔ دست قدرت نے درشوار کو گویا فرص میں تخلیق کیا تھا اس کا عضو عضو متناسب اور سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا اس بات نے مسکراہٹ اس بلا کی پائی تھی کہ فرزانہ دیکھے تو دیوانہ ہو جائے خلیفہ عاصد کے حضور یہ کسی کو پیش ہونے کی اجازت نہ تھی اور اگر حرم خلافت کا معاملہ پڑ جاتا جس میں خلیفہ سامنے پیشی ضروری ہوتی تو پہلے شاہی طبیب سے اجازت لینا پڑتی طبیب اتنا سخت تھا کہ سوائے چند کنیزوں کے کو کسی اور کو اجازت ہی نہ دیتا تھا۔ جس غلام کے ہاتھ درشوار لگی اگرچہ وہ خلیفہ کی خدمت پر مامور تھا لیکن اس کی خدمت باہر تک محدود تھی خلیفہ کے کمر میں وہ بھی نہیں جاسکتا تھا۔

غلام نے درشوار کو حاصل تو کر لیا تھا لیکن اس بے بہا خزانہ کو چھاپنا اس کے لئے مشا ہو رہا تھا وہ ہزار کوششوں سے درشوار کو حرم خلافت میں لے تو گیا تھا لیکن اسے خلیفہ حضور پیش کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ درشوار نے غلام اور اس کے ہ فروش دوست کی باتیں سنی تھیں بردہ فروش نے غلام سے قسم اٹھوائی تھی کہ وہ اس کنیز صرف خلیفہ کے حضور پیش کرے کنیز نے بھی بردہ فروش کے سامنے ہی غلام سے کہہ دیا تھا اگر اسے خلیفہ کے علاوہ کسی اور کے حوالے کیا گیا تو وہ آفت کر دے گی غلام نے درشوار لئے ایک بھاری رقم ادا کی تھی غلام کی ترقی بھی درشوار کی خلیفہ کی حاضری میں پیش ہو سے وابستہ تھی اس لئے اس نے ایک ہی رات میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔

آخر غلام کی کوششیں کامیاب ہوئیں اس نے اس کنیز کو رضامند کر لیا جو خلیفہ کی مع خدمت پر مامور تھی طے یہ ہوا کہ درشوار اس کنیز کا لباس پہن کے کنیزوں کے اس گروہ شامل ہو جائے گی جو معج کی خدمت کے لئے جاتی ہیں پھر بھی درشوار کو کنیز اور غلام کے تمام راستوں راہداریوں اور سلام و آداب کے تمام رازوں اور ہدایتوں سے واقف کر دیا

درشوار کو خلیفہ کے حضور میں جانے کا بے انتہا شوق تھا پھر وہ ذہین بھی تھی چنانچہ معج کو کنیزوں کا شب کا گروہ باہر آیا تو درشوار دن کے گروہ میں شامل ہو کر اندر پہنچ گئی درشوار کنیز کے لباس میں تھی اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی چند ہی لمحوں میں درشوار نے خلیفہ کا خاص کمرہ پہچان لیا۔ کمرے کے باہر چار کنیزیں کھڑی تھیں جب اندر سے کھنٹی کی آواز آتی تو ایک کنیز اندر جا کر خلیفہ کا حکم بجالاتی درشوار کو یہ بتایا گیا تھا کہ خلیفہ کی مسمری کے ساتھ ایک سونے کا سمندہ لٹکا ہے اور ساتھ ہی ایک سونے ہی کی مگنی رکھی ہے خلیفہ ضرورت کے وقت مگنی سے سمندہ پر چوٹ مارتے ہیں اس سے ایک گونجتی ہوئی آواز اٹھتی ہے۔

درشوار ایک ستون کی آڑ میں اس طرح کھڑی ہوئی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو اس کی نظریں باہر کھڑی کنیزوں پر لگی تھیں وہ منہ سے منہ ملائے کھسک پھر کر رہی تھیں پھر وہ دروازے کے دو ایک طرف اور دو دوسری طرف کھڑی ہو گئیں درشوار کو علم تھا کہ دروازہ کھلا ہے اور اندر کی طرف موتیوں کا بھاری پردہ پڑا ہے دو دو کنیزوں کے ادھر ادھر کھڑے ہونے سے بیچ میں راستہ سامنے گیا تھا درشوار کو اسی وقت کا انتظار تھا وہ تیزی سے خلیفہ کے کمرے کی طرف بڑھی دروازے پر پہنچی۔ کنیزوں کو خیال ہوا کہ یہ راہداری سے گزرتی ہوئی کنیز ہے مگر درشوار کے دروازہ پر قدم رکے اور وہ موتیوں کا پردہ ہٹا کر تیر کی طرح اندر داخل ہو گئی۔

کنیزیں ہکا بکا ہائے کرتی دوڑیں درشوار تیزی سے بڑھتی ہوئی خلیفہ کے پلنگ کے پاس پہنچ گئی خلیفہ چت لیئے تھے انہیں آہٹ محسوس ہوئی تو سر گھما کر دیکھا۔

اس وقت درشوار نے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بغیر سر جھکائے ایک ہاتھ پیشانی تک بلند کیا اور بولی ”کیا میں حضور خلافت میں آداب پیش کر سکتی ہوں“ اللہ اللہ رے حسن کی جرات جس دربار میں مصر کا وزیر اعظم داخل ہو کر تعظیم بجالا کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے اور اذن گفتگو کے حکم کا انتظار کرتا اس دربار میں حسن کی گستاخیوں نے تمام شاہانہ دستور و آداب توڑے رکھ دیئے گئے اور کس بے باکی سے کہا جا رہا تھا۔

”کیا میں حضور خلافت میں آداب پیش کر سکتی ہوں“

حسن اگر واقعی حسن ہو تو اسے بھی اپنے حسن کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس کی طاقت سے کام لیتا بھی جانتا ہے کتنا اعتماد تھا درشوار کو اپنے حسن پر نہ باریابی کی اجازت نہ سر جھکانے کی رسم کی ادائیگی اسے سوائے ایک انداز دلبری کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

درشوار کا اعتماد بجا تھا باہر کھڑی کنیزیں جو درشوار کو پکڑنے اس کے قریب پہنچ چکی تھیں خلیفہ نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے روک دیا۔ وہ جمال تک پہنچ چکی تھی وہیں بت بن کے

کھڑی ہو گئیں۔

”جب تک ہم اجازت نہ دیں کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے خلیفہ نے اس حکم نے کینروں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

درشموار مسکرا رہی تھی اور مسکراتی چلی جا رہی تھی اور خلیفہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

”تم کون ہو لڑکی؟“ خلیفہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ایک اڑتی ہوئی قتل“۔ اس کے ساتھ ہی درشموار نے ایک تھکے بکھرا اوپوں محسوس ہوا جیسے پھول برس پڑے ہو۔ انار کھل گئے ہوں۔

”صرف قتل نہیں بلکہ رنگین قتل“ خلیفہ کے چہرے پر ہل آئی۔

”رنگ قتل سے الگ نہیں ہوتے امیر المومنین۔“ درشموار نے آنکھیں کھماتے ہوئے کہا۔

خلیفہ کی جوانی جاگ اٹھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی در دہنے بازوؤں کا سارا دے کر خلیفہ کو ٹمک سے بٹھا دیا۔

”تم سیما بھی ہو؟“ خلیفہ نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں امیر المومنین میں کینروں میں صرف کینز جے آپ کے ایک غلام نے پردہ فروش سے خرید کر اس محل کا راستہ دکھایا۔“ درشموار نے بڑے انداز سے کہا۔ خلیفہ نے تجسس سے پوچھا ”یہ کینز تمہارے پیچھے کیوں آ رہی تھی؟“

”میں زبردستی اندر آئی ہوں امیر المومنین“ درشموار نے جواب دیا ”اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں بھی ان کی طرح ایک کینز ہوں تو یہ مجھے اندر نہ آنے دیتیں۔“

”مگر اب تم کینز نہیں ہو تم نے ہمارے دل میں جگہ پالی ہے۔“ خلیفہ نے بڑی خوش دلی سے کہا۔

”امیر المومنین میں نے سنا ہے کہ حرم خلافت میں داخل ہونے والی ہر لڑکی کینز ہو کر رہ جاتی ہے خواہ آپ اسے اپنے سر پر کیوں نہ بٹھائیں“ درشموار نے تلخی سے کہا۔

”غلط کہا ہے۔“ خلیفہ نے تردید کی ”اگر پہلے غلط نہ تھا تو اب غلط ہوگا تمہاری جگہ ہمارا سر نہیں بلکہ شاہی مسند ہے تم ہمارے ساتھ مسند پر بیٹھا کرو گی۔“

”زہے نصیب“ درشموار نے انداز دلربائی سے کہا۔ ”خدا خلیفہ محترم کو اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔“

”تمہیں ہمارے وعدہ کا اعتبار نہیں۔؟“ خلیفہ کی انا کو نہیں پہنچی۔

”شاہوں کے وعدوں پر یقین تو کیا جاسکتا ہے لیکن اعتبار صرف اس وقت ہوتا ہے جب وعدہ وفا ہو جائے۔“ درشموار نے خلیفہ کے گہرے ہوئے موڈ کو ٹھنکائی میں تبدیل کر دیا۔

”بہت شخ ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ خلیفہ کے لہجے میں پیار بھر گیا۔

”شونخی کے بہت سے نام ہوتے ہیں امیر المومنین۔“ درشموار کے الفاظ پھولوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔ ”آپ محبوبوں کے جم غفیر میں میرا نام کیسے یاد رکھ سکیں گے؟“

”اس کا اندازہ تمہیں ہو جائے گا نام بتا کے تو دیکھو؟۔“ پیار خلیفہ کی گفتگو میں شونخی بھی پیدا ہونے لگی تھی

”کینز کو کینز سے زیادہ موزوں نام زیب نہیں دیتا۔“ درشموار نے پھر طنز کیا ”اگر یہ نام یاد نہ رہ سکے تو مجھے شموار کہا جاسکتا ہے۔“

”صرف درشموار نہیں بلکہ درشموار آج سے تم اسی نام سے شہرت پاؤں گی۔“ خلیفہ بہت خوش تھا یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ پیار ہے۔

درشموار کے ایک انگ سے شونخیاں پھوٹ رہی تھیں اور خلیفہ بے خود ہوئے جا رہا تھا۔ اس نے ایک اور شونخی کی۔ کینروں میں میرا نمبر کونسا ہوگا امیر المومنین؟

”نمبر بتانا تمہارا کام ہے۔ درشموار۔“ خلیفہ نے کہا۔ ”پہلے ہمارے حلقہ میں شامل تو ہو جاؤ۔“

خلیفہ نے اس وقت سونے کے کھنڈے پر سونے کی مگری سے چوٹ ماری یہ اس بات کی علامت تھی کہ خلوت ختم ہوئی اور کینز خاص خدمت کے لئے ”فورا حاضر ہو جائے۔ ایک کینز باہنچی کا ہنچی اندر آئی اور دروازہ کے پاس ہی سر جھکا کے کھڑی ہو گئی۔

”اور آگے آؤ کینز۔“ خلیفہ نے کراری آواز میں حکم دیا۔

کینز حکم کی تعمیل کے لئے تھوڑی سی آگے کھٹک آئی مگر اسے خلیفہ کی آواز پر تعجب ہو رہا تھا۔ خلیفہ کی قناعت کل تک اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ کینروں کو جھک کر انکی بات سننا پڑتی تھی

اور اس وقت خلیفہ تکیہ کے سارے بیٹھے پڑ پڑتا ہوا کر رہے تھے

”قاضی محترم کو فورا حاضر کیا جائے۔“ خلیفہ نے حکم دیا۔

”کینز کچھ سن نہ سکی یا سمجھ نہ سکی اس نے گھبرا کے خلیفہ کی طرف دیکھا خلیفہ کی پانچٹی پر درشموار ایک گفتگو کئی کی طرح کھلی بیٹھی تھی کینز اس حسن بے مثال کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”تمہی سمجھ میں اب بات آگئی ہو گی؟“ خلیفہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

”جی۔۔۔ امیر المومنین کینز یا کل سمجھ گئی۔“ اور وہ اٹلے پیروں واپس لوٹی۔

دروازے کے باہر قصر خلافت کے تمام ذمہ دار غلام اور کینز حاضر تھیں۔ مسلح پیردار

”سن لیا امیر المومنین“۔ قاضی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”غلام کو حکم کی تعمیل میں تکلف نہیں لیکن شاہی طبیب نے سخت احکامات دے رکھے ہیں کہ اگر امیر المومنین نے کو پرہیزی کی تو اس کی ذمہ داری قعر خلافت کے کارکنوں پر عائد ہوگی میں اگرچہ قاضی ہوں شاہی طبیب کے احکام سے بھی منہ نہیں پھیر سکتا۔“

خفیہ چڑ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے حکم سے زیادہ ہمارے طبیب کے کا
اہمیت ہے۔ کیا یہ شہائی وفاداری کی توہین نہیں؟“

”ہرگز نہیں امیر المومنین۔“ یہ آواز شای طیب کی تھی جو بغیر خلیفہ کی اجازت کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور اس وقت پردے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

خلیفہ نے چونک کر دیکھا۔ ”کون شاہی طبیب“ خلیفہ نے تعجب انگیز خوشگوار لہجہ میں کہ
 ”حجی امیر المومنین۔“ شاہی طبیب نے ادب سے جواب دیا۔ ”غلام کو اس گستاخی
 داخل در معقولات کی معافی عطا فرمائی جائے۔“

”اؤ طبیب شای۔ ہم نے تمہیں معاف کیا اس لئے کہ اس وقت ہمیں تمہاری ضرورت تھی۔“ خلیفہ اس طرح ہنسنے لگا کہ جیسے کوئی تندرست و توانا آدمی باتیں کرتا ہے۔

”غلام خدا کا شکر ادا کرتا ہے جس نے امیر المومنین کو کھنگو کی طاقت عطا فرمائی
طیب نے نہایت احترام سے سر جھکایا۔

”بے شک یہ شکر کا مقام ہے طیب شامی۔“ غلیفہ نے سجدہ کرتے ہوئے کہا۔
تمہارے علاج سے بھی خوش ہیں لیکن ہمیں آسمان سے ایک سیخا بھیجا گیا ہے جس پر نظر
ہی ہماری نصف صحت و تندرستی واپس آگئی ہے۔“

”امیر المومنین کس مسیحا کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔“ طبیب شاہی نے حیرانی پوچھا۔ کیا کسی بادشاہ۔ شہنشاہ نے آپ کے علاج کے لئے کسی حکیم حاذق کو بھیجا ہے؟“

”نہیں طیب شای۔“ خلیفہ مسکرایا۔ ہمارے پیروں کی طرف دیکھو۔ کیا تمہیں شبہ کہ یہ جنت کی حور نہیں؟

طیب نے خلیفہ کے پائلٹی بیٹھی درشمار کو دیکھا تو دیکھائی رہ گیا اسے باہر صرف یہ
 گیا تھا کہ ایک خوبصورت کیز نے خلیفہ کو ہکا دیا ہے لیکن طیب جس حسن کے مجسمہ کو دیکھ
 تھا۔ اس کے لئے خوبصورت کا لفظ بہت چھوٹا تھا۔ وہ تو خوبصورتیوں کا مجموعہ تھی۔ قدرت
 مناعی کا نمونہ تھی طیب شای کے منہ سے گہراہٹ میں یہی جملہ نکل گیا۔

”امیر المومنین نے درست فرمایا۔ یہ قدرت کی معافی کا بہترین نمونہ ہے۔“
 خلیفہ نے فوراً کہا۔ ”اے جماندیدہ انسان کیا یہ نمونہ اس قابل نہیں کہ اسے حرمِ خلافت

کے کسی اہم مقام پر رکھا جائے؟

”بے شک بے شک اس کی قدر دانی اور عزت افزائی ہونا چاہئے۔“ طیب شای اس کے حسن میں کھو گیا تھا اور ایک محبت کے عالم میں بول رہا تھا۔ ”یہ موتی اور یہ جواہر ریزہ تو کسی بھی تاج شای کی رونق دہانے کا سبب بن سکتا ہے۔“

”خوب۔“ غلیفہ خوش ہو کے بولا۔ ”ہم تمہاری گوبر شناسی کی اس لئے داد دیتے ہیں کہ تم نے ہماری درشنوار کو ہماری نظروں سے دیکھا کیا یہ گوبر ہمارے تاج میں ٹانگے جانے کے قابل نہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ طیب اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ ”مگر امیر المومنین آپ
 آپ۔۔۔۔۔“

”کیوں طیب شامی“۔ خلیفہ کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ”کیا تمہارے خیال میں مصر کا فاطمی خلیفہ اس حور ارضی کے قابل نہیں۔“

”نہیں نہیں امیر المومنین غلام ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ طیب نے گھبرائے ہوئے کہا۔
 ”امیر المومنین کے تاج مبارک میں ایک سے ایک قیمتی موتی آویزاں ہے اور اسے تاج شامی
 میں لگایا گیا تو تاج شامی کے بجائے اس بے بہا موتی کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے گا۔
 ”اس کا مطلب ہے تمہیں ہماری پسند سے اختلاف نہیں؟“ خلیفہ نے سوال کیا۔

”اختلاف نہیں غلام کو آپ کی پسند سے پورا پورا اتفاق ہے طیب نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔“

”ہم درشوار سے متعہ کر رہے ہیں۔“ خلیفہ نے بغیر تکلف کے کہہ دیا۔

”جی۔۔۔۔۔ ای۔۔۔۔۔“ اور طبیب شاہی کا سرگھوم گیا۔

طیب شای کو اس لئے بلوایا گیا تھا کہ وہ خلیفہ کو اس خوبصورت کنیز سے دور رکھنے کے تلقین کریں مگر یہاں تم معاملہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور خلیفہ اس سے وعدہ کرنے پر قطعی آمادہ دکھائی دے رہا تھا۔ طیب نے تنکیوں سے ارد گرد دیکھا تب اسے ایک طرف قاضی کھڑا دکھائی دیا اب اس کی سمجھ میں پورا معاملہ آگیا۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ نے پہلے قاضی کو بلوایا ہو گا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ در شہوار سے وعدہ کرے گا۔ لوگوں نے اسے اس وجہ سے بلوایا کیا کہ شاید وہ اس وعدہ کو روک سکے۔ لیکن طیب کو یہ بات مشکل ہی نہیں بالکل ناممکن معلوم ہوتی تھی۔

طیب شای نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر المومنین۔ مجھے حق کی افادیت سے انکار نہیں۔“

”شاہی طبیب۔۔۔“ خلیفہ نے سخت لہجے میں کہا ”ہم نے تمہیں کب بلوایا ہے اور کب کہا ہے کہ نکاح اور متعہ کی خوبیوں پر وعظ دو۔ تمہاری بے جا مداخلت کو بھی ہم نے برداشت

ایک اور ہمیں معاف کر دیا۔ ہم نے تم سے مشورہ بھی طلب نہیں کیا۔ ہمارے جی میں ایک بات آئی اور ہم نے اس کا اظہار بر ملا کر دیا۔ ہمیں انکار اقرار کی جرات کس نے دی؟“

”امیر المومنین نے مجھے اجازت عطا فرمائی ہے۔“ طیب شامی نے جیسے سر سے کفن باندھ لیا۔ ”امیر المومنین کو یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ان کی زندگی صرف ان کی ذات کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے ہے امیر المومنین تمام مصریوں کے دل کی دھڑکن ہیں امیر المومنین خلافت کی نشانی ہیں، مصر کی پہچان ہیں، وہ زندہ ہیں تو خلافت زندہ ہے وہ مسکراتے ہیں تو مصریوں کے گھروں میں باد بھاری چلنے لگتی ہے اور وہ اداس ہوتے ہیں تو مصری چولہا نہیں جلاتے۔ امیر المومنین کو علم نہیں کہ ان کی ناسازی کی وجہ سے قاہرہ کے بازار بے رونق ہو گئے ہیں لوگوں کے ہونٹوں سے ہنسی چھن گئی ہے کوچہ و بازار میں سناٹا چھایا رہتا ہے۔ عوام اپنے سر پر امیر المومنین کا سایہ چاہتے ہیں۔“

طیب بولتے بولتے تھک گیا اور اس کا سانس پھولنے لگا۔ اس تمام باتوں کے دوران شہوار جسے خلیفہ نے در شہوار بنا دیا تھا بالکل خاموش رہی۔ طیب کی جذباتی باتوں نے خلیفہ کو بہت متاثر کیا۔ اور در شہوار کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ دریا کے پاس پہنچ کر پیاسی نہ لوٹ جائے۔ اس کی منزل دھندلانے لگی تھی آخر در شہوار نے ایک فیصلہ کیا۔ بڑا سندرست ا توانا فیصلہ۔ در اصل اس کا فیصلہ ڈوبنے کو بچنے کا سارا تھا اس نے طیب شامی سے بحث کر کے فیصلہ کیا تھا کیونکہ یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا اور وہ حرم خلافت میں داخل ہو کر اس سے بے دخل نہ ہونا چاہتی تھی۔

جس وقت پورے کمرے میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی قاضی اور طیب کے سوتے ہوئے چہرے جھکے ہوئے تھے اور امیر المومنین مصر کا فاطمی خلیفہ تذبذب اور ایک قسم کے کرب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ در شہوار نے بھی طیب شامی کی طرح سر سے کفن باندھ لیا اور طیب کے مقابلہ پر آگئی۔

”طیب محترم۔“ شہوار نے مترنم آواز میں مخاطب کیا۔

اس کمرے کی افسردہ محفل در شہوار کی آواز سے جیسے جاگ اٹھی۔ خلیفہ، قاضی اور طیب سب کی نظریں مختلف زاویوں سے در شہوار کے چہرے پر آکر رک گئی۔

”فرمائیے خاتون محترم۔ گوش بر آواز ہوں۔ پھر طیب نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

قاضی نے خلیفہ کو در شہوار کی طرف مخاطب دیکھا تو اس نے بھی نظریں جھکا لیں۔ خلیفہ اسے بڑی دلچسپی اور محبت سے دیکھ رہا تھا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ اس اجنبی لڑکی میں اس قدر جرات کیسے پیدا ہو گئی کہ وہ طیب جیسے کنہ مشق اور جماندیدہ شخص سے آنکھیں ملا کر بات

کرے۔

”آپ کو متحہ کی اہلیت سے انکار تو نہیں؟“ در شہوار کا لہجہ بالکل سپاٹ مگر بہت نرم تھا۔

”بالکل انکار نہیں لیکن۔“

”در شہوار نے قطع کلام کیا۔ بزرگ محترم۔ شہوار کا انداز اب بھی گداز تھا۔ ”میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ براہ کرم صرف اس بات کا جواب دیجئے جس کے بارے میں سوال کیا جائے؟“

”فرمائیے میں کوشش کروں گا۔“ طیب خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

”متحہ کرنے والے کو کن کن باتوں پر قادر ہونا چاہئے۔“ یہ در شہوار کا دوسرا سوال تھا۔

طیب نے جواب دیا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے متحہ کرنے والے کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اسے واقعی متحہ کی ضرورت ہے کہ نہیں۔“

”طیب نے جواب دینے کے بعد پہلے خلیفہ کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ خلیفہ کو اس کی صاف گوئی ناگوار گزرے گی لیکن خلیفہ کے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہ تھا بلکہ وہ اس طرح بیٹھا مسکرا رہا تھا جیسے اس کے سامنے کسی بازی گر کا تماشہ ہو رہا ہو ایک طرف تو اسے اپنے اندازے کے غلط ہونے کا افسوس ہوا دوسری طرف اس کے لئے یہ صورت بدی تعجب انگیز تھی خلیفہ اگرچہ مغلوب الغضب نہ تھا بلکہ بعض موقعوں پر بڑے تحمل کا اظہار کیا کرتا تھا لیکن اس وقت طیب شامی نے غیر ارادی طور پر خلیفہ پر گہرا طنز کیا تھا۔

خلیفہ نے نظروں کو سمٹھا کر طیب شامی نے در شہوار کی جانب دیکھا۔ اس کے خیال میں در شہوار نے اس سے سوال کر کے اس کی اہلیت جانچنے کی کوشش کی تھی چونکہ طیب شامی نے بالکل درست جواب دیا تھا اس لئے وہ اپنے جواب کا تاثر در شہوار کے چہرے پر دیکھنا چاہتا تھا۔

در شہوار اسی کی جانب دیکھ رہی تھی طیب شامی نے اسے گھور کر دیکھا تو شہوار نے چمک کر کہا۔ ”محترم طیب شامی۔ آپ مجھے مرعوب کرنے کے بجائے اپنی بات مکمل کیجئے کیونکہ آپ کا جواب ابھی نامکمل ہے۔“

”درست فرمایا خاتون محترم۔“ طیب شامی نے کہا۔ ”اس سوال کا جواب واقعی بہت طویل ہے۔“

”آپ جواب ارشاد فرمائیے۔ میں طوالت سے نہیں گھبراتی۔“ شہوار کے لہجے میں قدرے سختی آگئی تھی۔

طیب شامی اسے گھور کے رہ گیا پھر بولا۔ ”میں اس مسئلہ کی طوالت اور تفصیل میں نہیں

جانا چاہتا بلکہ اسے وقت اور حالات کے ترازو پر تولنا چاہتا ہوں۔“
 ”مرد تو لے طیب محترم۔“ درشوار نے جل کر کہا۔ اور اس ناپ تول کا جو
 اس سے مجھے آگاہ کئے۔“

”نتیجہ اس کا یہ ہے کہ میں امیر المومنین کو حصہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔
 شای نے بغیر گلی لپٹی رکھے ایک دم کہہ دیا۔“

”اجازت بڑے کی طرف سے چھوٹے کو دی جاتی ہے۔“ درشوار نے طیب کا
 بات پکڑی۔ مگر یہاں صورت حال مختلف ہے۔ آپ جسے اجازت دے رہے ہیں وہ آ
 عزت و مرتبہ میں بہت بلند ہے آپ اس سے اپنا حکم کیسے مناسکتے ہیں؟“

طیب شای گھبرا گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ قاضی اگرچہ طیب کی طرف متوجہ
 لیکن اس کی نظر اپنی طرف دیکھ کے اس نے فوراً سر جھکا لیا۔

”توبہ توبہ میں امیر المومنین کو حکم دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ طیب نے عاجز
 کہا۔ ”لیکن طیب شای ہونے کی حیثیت سے امیر المومنین کو مشورہ تو دے سکتا ہوں
 اس حق سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔“

”توبہ توبہ آپ کو کون روک سکتا ہے۔“ درشوار نے اس کی نقل اتاری۔ ”لیکن
 مشورہ اس وقت دے سکتے ہیں جب آپ سے مشورہ طلب کیا جائے امیر المومنین نے نہ ا
 کو بلوایا ہے اور نہ کوئی مشورہ طلب کیا ہے پھر آپ اس معاملہ میں کیوں دخل دے
 ہیں؟“

طیب شای بہت جھل ہوا اور خمیہ مٹانے کے لئے بولا۔ ”مجھے حصہ پر کوئی اع
 نہیں لیکن امیر المومنین سخت بیمار ہیں۔ اس وقت یہ حصہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”طیب شای کے خیال میں امیر المومنین کی طبیعت نامناسب ہے؟“ درشوار نے سوالیہ
 میں کہا۔

”بالکل خاتون۔“ طیب نے زور دے کر کہا۔ ”امیر المومنین کی طبیعت نامناسب نہیں با
 بیمار ہیں۔ شدید بیمار ہیں۔“

”طیب محترم۔ ابھی ذرا دیر پہلے آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرما رہے تھے کہ اس نے
 کرم نوازی سے امیر المومنین کو شفا عطا فرمائی اور اب آپ انہی امیر المومنین کو بیمار نہیں
 شدید بیمار فرما رہے ہیں۔ آخر آپ کا کون سا بیان درست تصور کیا جائے؟“ درشوار نے ط
 کو واقعی لاجواب کر دیا تھا۔

طیب اس کا منہ دیکھتا رہ گیا اس نے عاجزانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”محترم خاتون۔ آپ جو کچھ
 بھی فرما رہی ہیں۔ وہ ٹھیک ہے میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا پیشہ مجھے مجبور کرنا
 ہے کہ میں آپ کو امیر المومنین کی بیماری سے آگاہ کروں اور اگر آپ کو امیر المومنین سے
 ہمدردی یا کسی قسم کا تعلق خاطر ہے تو اس کے نام پر آپ سے درخواست کروں کہ آپ براہ
 کرم فی الحال حصہ کے معاملہ پر زور نہ دیجئے۔“

طیب نے بھی ایک اخلاقی حملہ کیا تھا اور کسی نہ کسی انداز میں انسانیت کا واسطہ دیا تھا۔
 اس لئے درشوار کو بھی نرم ہونا پڑا۔ ”آپ نے یہ بات نہایت مناسب فرمائی ہے اور میری
 سمجھ میں بھی آئی ہے کیونکہ امیر المومنین جس طرح اپنی رعیت کی امانت ہیں اسی طرح مجھے
 عزیز اور میرے لئے محترم ہیں۔“ پھر ایک لمحہ کے لئے رک کر بولی۔ ”محترم طیب شای امیر
 المومنین کی طبیعت آج جس قدر بحال ہے اسے دیکھ کر آپ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خلیفہ
 محترم کتنے عرصہ میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے؟“

”میرے خیال میں۔“ طیب شای سوچنے لگا۔ ”امید ہے کہ امیر المومنین دو ماہ کے اندر
 تندرست ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ درشوار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میں طیب شای کو یقین
 لاتی ہوں کہ دو ماہ تک میں امیر المومنین سے دور رہوں گی۔“

خلیفہ عاصم گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”مگر درشوار ہمیں یہ بات منظور نہیں۔ تم نے
 ماری قسمت کا فیصلہ بغیر ہم سے پوچھے کر دیا؟“

”امیر المومنین درشوار نے خلیفہ کو محبت سے بھرپور نظروں سے دیکھا۔“ میں نے طیب
 مای کو اس اعتماد پر قول دیا ہے کہ خلیفہ محترم میری بات رکھ لیں گے اور مجھے غیروں کی نظروں
 سے بیکار نہ ہونے دیں گے۔“


”اللہ رے تیرے حسن کلام کی لذت“ خلیفہ کی زبان سے درشوار کے لئے تعریفی جملہ
 بے پھل پڑا۔ ”ہمیں تمہارے فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں درشوار لیکن تمہیں یہ وعدہ کرنا
 چاہیے کہ دن میں کم از کم ایک بار تم حرم خلافت کو ضرور رونق بخشا کرو گی۔“

”اس وعدہ کو شاید میں وفا نہ کر سکوں امیر المومنین۔“ درشوار نے صاف انکار کر دیا۔
 خلیفہ گھبرا گیا۔ ”کیوں اس میں کیا قیاحت ہے؟“

”اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے طیب شای سے وعدہ کیا ہے کہ میں قرب خلیفہ
 سے دور رہوں گی۔“ درشوار شاید دوسری وجہ بیان کرنا چاہتی تھی کہ خلیفہ نے بات کاٹ دی
 ”اس کے لئے ہم طیب شای سے اجازت طلب کریں گے۔“ خلیفہ نے طیب شای کی

اور انہوں نے طبیب کا ہمانہ لے کر حتحہ کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ طبیب اور قاضی کی جان چھوٹ گئی تھی لیکن خلیفہ کا ذہن پریشان ہو گیا تھا درشوار نے شاہی محلات میں قیام سے انکار کر دیا تھا پھر درشوار کو کہاں رکھا جائے اور کس کی حفاظت میں دیا جائے۔ درشوار نے صورت ایسے غضب کی پائی تھی کہ فرشتہ دیکھے تو ریشہ غلطی ہو جائے پھر کس پر اعتبار کیا جائے انسان تو انسان ہے وہ کسی وقت ہمک سکتا تھا۔

”امیر المومنین میرے قیام کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔“ درشوار کی آواز سے حتحن کا اظہار ہو رہا تھا یا وہ بھی خلیفہ کی طرح پریشان تھی۔

”تمہیں رہائش کے لئے جو پیش کش کی گئی وہ تمہیں قبول نہیں اور تم واپس بھی جانا نہیں چاہتیں۔ پھر مسئلہ کیسے حل ہو؟ خلیفہ با اختیار ہونے کے باوجود دبے دبے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ دراصل اسے درشوار کی دلداری منظور تھی آج تک جتنی لڑکیاں اس کی نظر سے گزریں نہیں یا اس کی خدمت پر مامور تھی درشوار ان میں سب سے زیادہ طرحدار، حسین شوخ و شک اور با سلیقہ لڑکی تھی۔ خلیفہ کو یہ تو منظور تھا کہ وہ اس وقت تک مبر کرتا رہے جب تک طبیب شاہی اس کی کلی صحت کی تصدیق نہیں کرتا لیکن درشوار جیسی  کو ناراض کر کے اسے ہاتھ سے نہیں کھوٹا چاہتا تھا۔

قاضی شر نے ایک اور پیش کش کی۔ ”امیر المومنین۔ اگر خاتون شاہی محلات میں قیام سے گریزاں ہیں تو انہیں شاہی کو توال کی حفاظت میں دیا جاسکتا ہے اس لئے کہ شر کو توال کا محل قاہرہ میں سب سے زیادہ محفوظ جگہ ہے۔“

خلیفہ کچھ کتا چاہتا تھا کہ درشوار نے بات اچک لی۔ ”شر کو توال۔“ درشوار نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”وہ کو توال جن کے محل میں ایک قید خانہ بھی ہے جس میں بے گناہ قید کئے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا پھر اس مجرم صورت انسان کے محل میں کیوں جاؤں؟“

”خاتون صحیح فرماتی ہیں۔“ طبیب شاہی نے دخل دیا ”میں نے سنا ہے کہ شر کو توال کو دیکھ کر خود زمین پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور بچے خوف سے ڈر جاتے ہیں۔ ایک ایسے محل میں جہاں ہر دم جرائم کے افسانے رقص کرتے ہوں کسی باشعور خاتون کا قیام کسی طرح ممکن نہیں۔“

”اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ یہ پیش کش خود درشوار نے کی۔

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ یعنی میں“ طبیب گھبرا گیا۔ ”خاتون محترم آپ کا اشارہ میری طرف ہے یعنی میں امیر المومنین کا معالج، طبیب شاہی۔“ طبیب نے امداد طلب نظروں سے خلیفہ کو دیکھا۔

طرف دیکھا۔

طبیب نے حالات کے مطابق جواب دیا مگر اپنا وقار برقرار رکھا۔ ”بظاہر اس نے اعتراض نہیں کیا اور وجہ نظر نہیں آتی بشرطیکہ اس قربت کو غلطت میں تبدیل نہ کیا جائے“

”طبیب محترم۔ درشوار بولی۔“ اس بات کی یقین دہانی خلیفہ عالی مقام کی طرف۔

کراتی ہوں۔“

”چلے طے ہو گیا اور فیصلہ بھی ہو گیا۔“ طبیب نے مسرت کا اظہار کیا۔ وہ تو یہ سوز کہ بلائے آمد لے بغیر گزشت یعنی مصیبت آگئی تھی لیکن خیریت سے گزر گئی۔

خلیفہ عاضد بھی خوش ہو رہا تھا اور مسکرا مسکرا کے درشوار کو دیکھ رہا تھا مگر اسی وقت ایک دھچکا سا لگا۔

درشوار نے کہا۔ ”نہیں محترم۔ ابھی ایک بات طے ہوئی ہے۔ اور فیصلہ بھی بات کا ہوا ہے۔ مجھے اس کے علاوہ ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے۔۔۔۔۔“

”مذہ نہ کرو درشوار۔۔۔۔۔“ خلیفہ کے لفظ لفظ سے محبت ٹپکی پڑ رہی تھی۔

درشوار نے جواب دینے کے بجائے طبیب کی طرف دیکھا۔

”آپ فرمائیے خاتون اور کیا کہنا ہے؟“ طبیب شاہی نے جرات سے کام لینے درشوار سے دریافت کیا۔

ابھی میری رہائش کا مسئلہ طے ہوتا ہے۔“ درشوار نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں مقام سے آئی ہوں وہاں واپس نہیں جاسکتی۔ اور طبیب شاہی کو قول دینے کے بعد محل نہیں رہ سکتی۔ محل سے میری مراد تمام شاہی محلات ہیں۔“

اس کا جواب طبیب کے پاس نہ تھا اس نے خلیفہ کی طرف دیکھا۔

”درشوار“ خلیفہ نے شاید دکھ سے کہا۔ ”تم ہمارے محل کے سوا کسی اور محل میں سکتی ہو۔ ہم تمہاری حفاظت کے لئے سخت پہرہ مقرر کریں گے۔“

”میں اس کا جواب پہلے ہی عرض کر چکی ہوں۔“ درشوار نے مضبوط لہجے میں کہا۔

امید ہے کہ امیر المومنین مجھے مجبور نہ کریں گے ہاں اگر یہ ان کا حکم ہے تو ایک کینز اس حکم کیسے ٹال سکتی ہے۔ مجھے اس حکم پر سر جھکانا پڑے گا۔“

”طہمتان رکھو درشوار۔“ خلیفہ کا لہجہ نرم اور مشفقانہ تھا۔ ”ہم تمہیں کسی بات نہیں کریں گے۔“

ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ طبیب شاہی خوش تھے کہ حتحہ کا معاملہ دو ماہ تک گیا ان سے زیادہ خوش قاضی محترم تھے جنہیں حتحہ کی رسم ادا کرنے خلیفہ عاضد نے

رہ مملات، شای محل نہیں کھلاتے تھے بلکہ ان کے مالکان محض کسر نفسی کی وجہ سے محل کو حویلی کہتے اور کھلاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے وزیر اور امیر مملات کو ”حویلی“ کا نام دیتے تھے۔

طیب شای کی حویلی اپنے ساز و سامان آرائش و زیبائش اور لوہڑی غلاموں کی کثرت جب سے حرم خلافت کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی یہ حویلی اس قدر وسیع اور عریض تھی اس کا مہمان خانہ ایک چھوٹا سا محل تھا اور اسی محل میں در شہوار کو اتارا گیا تھا اس ماضی میں جھانکنے والا نہ کوئی موجود تھا اور نہ وہ خود اپنے ماضی کے بارے میں بتا سکتی اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، یہی دیکھا تھا کہ وہ ایک بردہ فروش کے ہاتھ سے بے بردہ فروش کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی چلی آ رہی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ وہ جس بردہ کے ہاتھوں فروخت ہوتی وہ اسے بڑے آرام سے رکھتا۔ اچھا کھلاتا پلاتا اور ان کی ت پر ایک کنیز مقرر ہوتی تھی۔

دمیاط کا محاصرہ

در شہوار حرم خلافت سے طیب شای کے محل پہنچ گئی۔

در شہوار کے دماغ میں یہ ڈال دیا گیا تھا کہ وہ شای محل کے لئے ہے اور اسے اپنے کو شای محل کے قائل بنانا چاہئے۔ یہ خیال آہستہ آہستہ در شہوار کے دماغ میں رائج تھا۔ اور اس نے ان استادوں سے بڑی محنت سے سبق لینا شروع کر دیا تھا جو اس کی ت پر مامور کئے جاتے تھے۔ در شہوار کو اپنی خوبصورتی اور دلکشی کا پہلے ہی دن سے اس تھا۔ اس پر استادوں کی تربیت نے اسے نشست و برخاست کے طریقوں اور گفتگو اتار چڑھاؤ اور الفاظ کے استعمال کے طریقوں میں طاق کر دیا تھا۔ اس نے تھوڑی تعلیم حاصل کر لی تھی مصر کے علاوہ وہ دو تین اور زبانوں میں گفتگو کر سکتی تھی۔

اپنے نئے ٹھکانے یا محل میں آئے ہوئے در شہوار کو چار دن گزر چکے تھے لیکن اب اس کی طیب شای سے کھل کر گفتگو نہ ہوئی تھی۔ طیب دن میں ایک بار اس کے ضرور آتا تھا لیکن در شہوار شاید کچھ دن مکمل آرام کرنا چاہتی تھی یا پھر کسی اہم معرکہ لئے خود کو تیار کر رہی تھی اس لئے یا تو وہ سامنے آنے ہی سے گریز کرتی یا پھر سر درد مانہ کر دیتی۔ اس کے اس رویے سے طیب شای کا تجسس اور اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا وہ کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کرتا تھا در شہوار شای گاڑی میں نشست بدل کے پ شای کے پاس آ بیٹھی تھی اس نے طیب کی پرسکون طبیعت میں ایک طوفان برپا کر دیا۔

”تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“

یہ وہ واحد جملہ تھا جو در شہوار نے طیب شای کے برابر بیٹھ کر کہا تھا۔ طیب اس

مصر کے عمائدین سلطنت جن میں قاضی القضاہ، شہر کو تو ال اور طیب شای بھی تھے۔ ان عمائدین اور اکابرین سلطنت کو شای خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن یہ مخلصانہ کی فیاضی تھی کہ وہ ان تمام اراکین و اکابرین کو شای محل عطا کرتا تھا اس پر لطف کہ شای محل خالی نہیں ہوتے تھے بلکہ جب کوئی محل کسی کو عطا کیا جاتا تو اس کا سامان معہ کنیز اور غلاموں کے منتقل ہو جاتا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ شای محل میں تو سینکڑوں کنیز اور غلام ہوتے تھے ان کے اخراجات کون برداشت کر سکتا تھا اس جواب یہ ہے کہ مصری خلفاء کے الطاف شاہانہ کا یہ انداز تھا کہ اگر وہ کسی کو ایک گم عطا کرتے تو اس کے ساتھ گھوڑ کا ساز اور سائیس بھی دیا جاتا۔ اس سائیس کی تنخواہ و سرکاری خزانہ سے ادا کی جاتی۔ اسی طرح جب کسی کو محل بخشا جاتا تو معہ ساز و سامان غلاموں اور کنیزوں کے دیا جاتا اور ان کنیزوں اور غلاموں کی تنخواہیں شای خزانہ سے جاتی تھیں۔

اس غلط بخشی کا یہ نتیجہ تھا کہ شای خزانہ پر سال بہ سال بوجھ بڑھتا جاتا اور اسی سے دار الخلافہ قاہرہ میں شای مملات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا تھا کیونکہ اگر افسر کو عہدہ سے ہٹا کر دوسرے عہدہ پر لگایا جاتا تو اس سے شای محل واپس نہ لیا جاتا اور افسر کو ایک الگ محل عطا کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ تھی اس قسم

”اچھا طبیب اعظم۔ طبیب اعظم کے لئے کیا حکم ہے۔“ سرویا نے پھر یاد دلایا۔

”تم نے مجھے خلیفہ بیگم کہا؟“ درشموار نے پاٹ لہجے میں پوچھا۔
 ”غلطی ہو گئی ہے۔ معاف کر دیجئے آئندہ نہیں کہوں گی۔“ کینز کا رنگ اڑ
 گزرنے لگی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ درشموار اس خطاب سے خوش ہو جائی گی۔

”کیا آپ اپنے بارے میں کچھ کہنا پسند فرمائیں گی۔“ طبیب نے ایک دم سوال کر دیا۔
”میں تو اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ در شہوار نے روکے پن سے

”آپ کو ناگوار گزرا۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“ طبیب نے فوراً بات ہٹائی۔ ظاہر ہے
صرف چادرن میں آپ ایک غیر متعلق شخص پر کیسے اعتماد کر سکتی ہیں۔
”اعتماد تو خیر میں نے پہلے ہی دن کر لیا تھا۔ در شہوار نے کہا۔“ آپ کو شاید یاد نہیں
حرم خلافت پر میں نے آپ کے محل کو فوقیت دی تھی اور میرے ہی کہنے پر مجھے یہاں
کیا تھا اس زیادہ اور کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ مجھے حرم خلافت کون لے لایا
ور میں ماضی میں کس قسم کی زندگی گزارتی تھی اس کے اظہار کا شاید ابھی نہیں آیا۔
کسی مناسب وقت پر اس کا خود ہی اظہار کروں گی۔“

”میں اپنی اس غلطی کے لئے معذرت کا اظہار کرتا ہوں۔“ طبیب نے جواب دیا۔
اصل میں اس وجہ سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی مرضی دریافت کروں اور اگر آپ کو
محل میں تکلیف ہو تو دوسرے محل میں منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے۔
”مجھے افسوس ہے کہ میں چار روز تک آپ کو نہ بلوا سکی اور جب آپ تشریف
لے تو اندر آنے کی اجازت نہ دی۔“ در شہوار نے ایسے بیٹھے انداز میں کہا کہ طبیب اعظم
کانوں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔“

”مجھے جلد نہ جلد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ طبیب نے سرشاری کے عالم میں کہا۔
پ میرے پاس امیر المومنین کی امانت ہیں۔ اور آپ کی حفاظت اور آرام و زیبائش کا
ارکنا میرا فرض ہے۔“

”طبیب محترم۔“ در شہوار سنجیدہ ہو گئی۔ ”جو شخص خود اپنی حفاظت نہ کر سکتا ہو وہ
دوسرے پر توجہ کس طرح دے سکتا ہے۔ امیر المومنین تو ابھی بیمار ہیں آپ نا امید نہ
یہ دیکھ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“ طبیب نے رسمی طور پر در شہوار کو تسلی دی۔
”خدا کی ذات برحق اور اس کی مسیحا کی مسلم۔“ در شہوار نے یقین کے ساتھ کہا۔
خدا اس شخص پر کیوں رحم فرمائے گا جس نے خلیفہ بننے کے بعد آج تک قصر خلافت
نکل کر یہ نہیں دیکھا کہ اس کی رعیت کسی حال میں ہے؟“

”آپ درست فرما رہی ہیں۔“ لیکن ان کی صحت۔
طبیب اعظم بات بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن در شہوار نے اسے روک دیا۔

”اچھا طبیب اعظم۔ در شہوار چونک کے بولی۔ یہ تمہارے طبیب اعظم کس طبیب
کے مالک ہیں ہم ان کے پاس خلیفہ محترم کی امانت ہیں پھر یہ ہم سے روز کیوں ملتا چاہے
ہیں۔ کہیں یہ۔۔۔۔۔۔“

در شہوار نے جملہ ناتمام چھوڑ دیا۔ سرویا نے مسکرا کے سر جھکا لیا۔
”اچھا یہ بتاؤ طبیب اعظم کی کتنی بیویاں؟“ در شہوار نے سوال کیا۔
”برابر والے محل میں تین بیویاں رہتی ہیں۔ دوسرے محلوں کا مجھے علم نہیں۔“ سرویا
کو جو علم تھا اس نے بتا دیا۔
در شہوار کی تسلی نہیں ہوئی ”اس کا مطلب ہے کہ دوسرے محلوں میں بھی طبیب
اعظم نے اپنے لئے کچھ عورتیں رکھی ہیں۔“

”جی شہزادی بیگم یہی سنا ہے۔“ سرویا نے جواب دیا۔
در شہوار مسکرائی۔ ”بس اتنا ہی کافی ہے آنے دو طبیب اعظم کو۔
سرویا چلی گئی پھر ذرا دیر بعد طبیب اعظم کو لے کے واپس آئی۔
”تعطیم پیش کرتا ہوں خدمت عالی میں۔“ اور طبیب اعظم نے سر جھکا لیا۔
”آپ نے سر کیوں جھکا لیا۔ میں امیر المومنین نہیں؟“ در شہوار نے خوش گوار لہجے
میں کہا۔

طبیب اعظم نے سر اٹھا کر سرویا کی طرف دیکھا۔
در شہوار نے فوراً کہا۔ سرویا تم باہر جاؤ اور جب تک طبیب اعظم یہاں ہیں کسی کو
اندر نہ آنے دیتا۔ یہ حکم صرف آج کے لئے نہیں بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہے۔“
”ماشاء اللہ۔ آپ بہت ذہین ہیں۔“ طبیب نے دبے الفاظ میں کہا۔
در شہوار نے ان سنی کر دی۔ ”آپ کا سر اب بھی جھکا ہوا ہے۔ میں نے آپ کو
نظریں اٹھانے سے منع تو نہیں کیا۔“

”خاتون محترم“ طبیب نے تھوک نگل کے کہا۔ ”میں کسی بے ادبی کا مجرم نہیں ہونا
چاہتا نظریں اکثر گستاخی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔“

در شہوار نے فوراً کہا۔ ”میں نے نظریں پڑھنے کا علم سیکھا ہے طبیب محترم۔“
”دوبارہ ماشاء اللہ کہنے پر مجبور ہوں۔“ طبیب کا انداز خوشامدانہ تھا۔ ”کس استاد نے
یہ علم حاصل کیا ہے آپ ہے۔“

”تجربہ سب سے بڑا استاد ہے محترم۔“ در شہوار نے کہا۔ ”میں نے زبانہ کے بڑے
نشیب و فراز دیکھے ہیں۔“

آپ غلط تاویلیں پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے میں جانتی ہوں کہ خلیفہ نے اپنی صحت تباہ کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے انہیں بے اعتمادی سے روکنے کی کوشش نہ ہوئی۔ لیکن انہوں نے حرم خلافت میں عورتوں کی تعداد بڑھانے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔

طیب حیرت بھری نظروں سے در شوار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہی خیال تھا کہ شوار ایک انتہائی حسین کنیز جو کسی خوش قسمت کے ہاتھ لگی جس نے بھاری رقم وصول کے اسے قصر سلطانی تک پہنچا دیا۔ مگر در شوار جس انداز سے گفتگو کر رہی تھی اس صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ در شوار کو معقول تعلیم و تربیت ملی ہے اور وہ کسی قسمت کے میں پھنس کر یہاں تک پہنچی۔

”خاتون محترم۔“ میں اپنے تجسس کو سینے میں نہیں دبا سکا۔ طیب اعظم سے ضابطہ ہو سکا اور اس کے خیالات الفاظ بن کر زبان پر آگئے۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ کا تعلق اعلیٰ خاندان سے ہے کیونکہ آپ کی سوچ اور انداز گفتگو بتا رہا ہے۔ آپ نے باقاعدہ یا قاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ یقین کیجئے آپ میرے لئے پہلے سے زیادہ قابل احترام ہیں۔“

”طیب اعظم۔۔۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتی۔ در شوار نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ آپ کے دل میں میری عزت صرف اس دن ہے۔ جب تک خلیفہ کی سانس چل رہی ہے۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی میں احترام میز حیاں اتر کر پھر ایک کنیز کی جگہ پر پہنچ جاؤں گی اور وہ وقت شاید کچھ زیادہ دور نہیں۔“

”نہیں در شوار۔۔۔۔۔“ طیب نے اس کے ساتھ ہی جلدی سے اپنے منہ ہاتھ رکھ لیا پھر شرمندگی کے انداز میں سر جھکا کر بولا۔ ”مجھے معاف کیجئے خاتون محترم۔“

”طیب اعظم۔۔۔۔۔“ در شوار نے دھیرے لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے کہ آپ اس بڑھ کے بھی گستاخیاں فرمائیں میں نے قصر خلافت میں آ کے جو غلطی کی ہے اس کا فیاضہ بھگتنا پڑے گا آپ کو مضبوط سمجھتے ہوئے میں نے قصر خلافت کے بجائے آپ محل میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے خلیفہ کے زندہ رہنے اور اس کے مرنے کے چند روز تک آپ کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔ یہ فیصلہ میں نے چار دن پہلے کیا تھا لیکن شاید مجھے اس فیصلے پر دوبارہ غور کرنا پڑے۔“

”آپ اپنے فیصلہ میں با اختیار ہیں خاتون۔“ طیب نے مایوس انداز میں کہا۔ ”در

آپ یہاں جب تک چاہیں قیام فرما سکتی ہیں۔ آپ کی خدمت میرے لئے باعث افتخار میری مسرتوں میں اضافہ کا سبب ہوگی۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلیفہ اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مجھے کل ہی طلب کر لے تو کیا آپ مجھے روک سکیں گے۔۔۔؟“ در شوار نے آخر وہ مشکل سوال کر ہی دیا جس کا جواب حاصل کرنے کے لئے اس نے طیب کے قصر میں رہنے کی خواہش کی تھی۔

محل مشہور ہے کہ کنوارے ارمان اور پنا ہے پشیمان۔ انسان کے دل میں بڑے بڑے دلولے ہوتے ہیں وہ سوچتا ہے کہ اگر اسے موقع ملا تو میں یہ کروں گا وہ کروں گا۔ پھر جب خدا اس کی خواہش پوری کر دیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کی اس نے خواہش کی تھی وہ سونے کے بجائے پتیل کی ہے۔ یہی حال در شوار کا ہوا۔ وہ ایک اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی مگر بد قسمتی سے بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئی۔ مگر یہ بد قسمتی بہت جلد خوش قسمتی میں تبدیل ہو گئی اور وہ ایک شاہی غلام کے ذریعہ حرم خلافت میں پہنچ گئی۔ وہاں دنیا کی ہر چیز میسر تھی اور وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتی تھی لیکن اسے پہلے ہی دن یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوئی کہ مصر کا خلیفہ صرف پیار ہی نہیں بلکہ سدا کا روکی ہے اور اس کی آنکھیں کسی بھی وقت بند ہو سکتی ہیں۔

خلیفہ نے اسے پہلی ہی نظر میں پسند بھی کر لیا تھا۔ شاید یہ در شوار کے بے پناہ حسن کی طاقت یا سحر تھا کہ اسے دیکھ کے شاید بیمار خلیفہ اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ اس میں یہ طاقت ذرا دیر کے لئے آئی تھی اور در شوار کے وہاں سے آتے ہی اس پر پھر غشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ در شوار ایک ذہین لڑکی تھی اس نے طیب اور خلیفہ کی گفتگو غور سے سنی تھی اور خود بھی اس میں شریک رہی تھی اس سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ چمکا ضرور ہے مگر یہ بہت جلد دھندلا جائے گا۔ خلیفہ اس وقت تو اسے سب کچھ دے سکتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ پھر در شوار سے کنیز بن کر کسی امیر یا وزیر کی خدمت پر مامور کر دی جائے گی۔

شاید یہی سوچ کے اس نے طیب اعظم کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ طیب اویس عمر کا ایک صحت مند انسان تھا اور اس کا امراء وزراء پر اثر بھی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ شادی شدہ تھا لیکن در شوار کا حسن ایسا نہ تھا کہ کوئی اس کی ایک غلط انداز نظر کی تاب بھی لاسکے۔ در شوار کا یہ سوال بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ طیب اعظم اس کا سوال سن کر چونک پڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر در شوار کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر مضبوط لہجہ میں بولا۔

”خاتون محترم۔ آپ نے مجھ سے جو سوال کیا ہے کیا آپ اس سوال میں سنیوہ

در شہسوار نے کہا۔ ”طیب اعظم میں مضبوط ارادہ کی مالک ہوں اور جو بات منہ سے نکالتی ہوں پہلے اس پر غور کر لیتی ہوں میرے سوال کا تعلق میری زندگی اور موت سے ہے اس لئے میرے غیر سنجیدہ ہونے کا کوئی موقعہ نہیں۔“

”تو پھر سستے خاتون۔“ طیب نے بھی مضبوط لہجے میں کہا۔ میں اگرچہ ایک طاقتور اور با اثر شخصیت ہوں لیکن خلیفہ کی زندگی میں میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں ہاں اگر خلیفہ کے بعد آپ نے مجھ پر اعتماد کیا تو میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچنے دوں گا۔ میرا تعاون آپ کو حاصل ہوگا اور آپ کے لئے میں پہاڑوں سے ٹکرا جاؤں گا۔“

”طیب اعظم۔“ در شہسوار نے پہلی بار پروتار لہجہ اختیار کیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے آپ سے کم و بیش بالکل ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جس وقت بھی مجھے کسی مضبوط سارے کی ضرورت ہوگی تو میری دستک سب سے پہلے آپ کے دروازے پر ہوگی۔“

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی پہلی ہی دستک پر میرے گھر ہی کے نہیں بلکہ دل اور ذہن کے بھی تمام دروازے کھل جائیں گے۔“ طیب کا چہرہ خوشی سے دکھ اٹھا تھا۔ جیسے اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔

طیب شاہی کی یہ زبردست فتح تھی۔ وقت کی حسین ترین دوشیزہ بغیر کوئی دکھ اٹھائے بازو کھول کے اس کی طرف بڑھی تھی یہ در شہسوار کی مجبوری نہیں ضرورت تھی حالات نے اسے اتنا باشعور کر دیا تھا کہ وہ مستقبل کی تاریک راہوں میں جھانک کے اپنا راستہ تلاش کر سکے۔ اور یہ راستہ طیب اعظم کے گھر سے نکل کے اسی کے گھر میں ختم ہوتا تھا۔

در شہسوار بھی بہت خوش تھی ہو سکتا ہو کہ اس کے ارادے اور زیادہ بلند ہوں لیکن ان بلند یوں تک پہنچنے کے لئے بھی در شہسوار کو طیب اعظم کی سیرمی استعمال کرنا ضروری تھی۔

اسے اچانک سر دیا کا خیال آیا اور اس نے طیب سے کہا۔ ”طیب اعظم آپ کی کینر سر دیا مجھے پسند ہے میں چاہتی ہوں کہ کل وہ وقتی میری خدمت میں رہے۔“

”خاتون محترم“ طیب کے لہجے میں محبت کی مٹھاس آگئی تھی۔ ”آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس محل کے تمام غلام اور کینرس آپ کی ملازم ہیں۔ آپ انہیں ہر قسم کا حکم دے سکتی ہیں اور ان پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔“

”میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔ طیب اعظم۔“ در شہسوار نے بڑی مسرت سے کہا۔

”اگر خاتون محترم مجھے طیب اعظم کے بجائے صرف طیب سے مخاطب فرمائیں تو مجھے زیادہ مسرت ہوگی۔ طیب نے شاید بے تکلفی کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔

در شہسوار نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”آپ بھی اگر مجھے میری نام سے مخاطب کیجئے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

طیب اعظم کی خوشی میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا اور اس طرح در شہسوار جیسی البر لڑکی اور ایک گرگ بارہاں دیدہ طیب کے درمیان ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا۔

شمالی مصر کا شہر ویاط دریائے نیل کے ڈیلٹا کی ایک شاخ پر آباد ہے۔ ویاط ایک بڑا تجارتی شہر اور بحیرہ روم سے صرف آٹھ میل دور واقع ہے اس لئے اس کا شمار اسکندریہ کی طرح بندرگاہ میں ہوتا ہے جس وقت اسکندریہ اور قاہرہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اسی وقت ویاط پر بھی قبضہ کیا گیا کیونکہ یہ شہر براہ راست بحری راستہ پر واقع تھا۔ ویاط اسد الدین شیر کوہ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا اور اس وقت یہاں کا گورنر شمس الحق تھا اس پر اسے اس قدر اعتماد تھا کہ اس کی گورنری کو اس نے بالکل نہیں چھوڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صلاح الدین کے وزارت کا عہدہ سنبھالنے پر شمس الحق پہلا گورنر تھا جس نے قاہرہ پہنچ کر صلاح الدین کو مبارک باد دی تھی۔

ایمالرک شاہ یروٹلم نے مصر میں مسلمانوں کے ہاتھوں شرمناک شکست کھانے کے بعد خود کو یروٹلم میں محدود کر لیا تھا۔ اسے سلطان نور الدین زنگی اور امیر صلاح الدین ایوبی کے تیوروں سے معلوم ہو گیا تھا کہ فلسطین کی عیسائی حکومت کے اب ایک نہیں بلکہ دو دشمن ہیں۔ شمال میں دمشق کا عظیم سلطان نور الدین اور جنوب میں اسی سلطان کا تربیت دیا ہوا امیر صلاح الدین جو جوان عمر ہونے کے باوجود اس قدر بیدار مغز ہے کہ اس نے مصر کے مرو آہن وزیر اعظم ملک شاور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مصر کی دوسری بڑی طاقت سوزانی حبشی تھے جن کا سروار نجاہ تھا اور یہ نجاہ تمام شاہی محلات کا ناظم اور واروغہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصر کے خلیفہ عاضد کا خسر بھی تھا مگر امیر صلاح الدین نے اسے بھی ایک ہی ہلے میں نجاہ اور اس کے پچاس ہزار سوزانی حبشیوں کو ایسا زچ کر کے مارا تھا کہ انہیں مصر میں کسی جگہ پناہ نہ ملتی تھی مصر کے علوی امراء کا حال بھی اس نے سوزانیوں جیسا کیا تھا۔

شاہ ایمالرک کو یہ شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کبھی شمال سے سلطان دمشق نے دمشق سے قدم نکالے اور جنوب سے امیر صلاح الدین یروٹلم کی طرف بڑھا تو اس کی حکومت بچی کے دو پاؤں کے درمیان پس کے تباہ ہو جائے گی۔ اسے ایک اور بھی

وہ یہ کہ اسکندریہ اور دمیاط میں مسلمانوں کے بحری دستے موجود تھے اگر وہ کسی وقت حرکت میں آگئے تو یروشلیم کو یورپ سے بالکل الگ کر کے رکھ دیں گے۔ ان یورپین فوجوں کی امداد پر ہی ایمارک بہت پھولتا تھا اور مسلم علاقوں کو تاراج کرتا تھا مگر اس وقت حالات مسلمانوں کے حق میں تھے اور وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔

ان باتوں کو سوچ کر شاہ یروشلیم نے تمام عیسائی بادشاہوں کے علاوہ مشرقی سلطنت روم یعنی قسطنطنیہ کے بازنطینی شہنشاہ کے دربار میں بھی سفارت بھیج رکھی تھی۔ اور ان سے درخواست کی تھی کہ اگر یروشلیم (بیت المقدس) کو بچانا ہے تو تمام لہرائی حکومتیں اسے اپنی فوجیں روانہ کریں ورنہ وہ وقت دور نہیں جب بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے۔ اس سے پہلے سلطان نور الدین کے والد عماد الدین زنگی کے زمانہ میں بھی ایک بار شہنشاہ قسطنطنیہ اپنے اور یورپ کے بہت سے بادشاہوں کا لشکر لے کر موصل کے مسلمان امیر کو ختم کرنے آیا تھا۔ مگر مجاہد اعظم عماد الدین زنگی نے اس کی ناک میں ایسی تکیل ڈالی تھی کہ اسے میدان جنگ میں تمام اسلحہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور آج اسی کا بیٹا نور الدین زنگی سلطان دمشق کی صورت میں اس کا خون خشک کرنے کے لئے اکثر لہرائی ریاست کے شامی علاقوں پر تافذ و تاراج کیا کرتا تھا۔

روایت ہے کہ اسپین (اندلس) اور جزیرہ سلسلی (مقلیہ) کے فوجی دستے شاہ ایمارک کی مدد کو بیت المقدس کی مذہبی جنگ لڑنے کے لئے یروشلیم پہنچ گئے۔ لہرائی شہنشاہ مشرف نے بھی مدد کا وعدہ کیا اور اطلاع پہنچی کہ قسطنطنیہ سے بحری جہازوں میں فوج روانہ کی جا رہی ہے۔ شاہ ایمارک کو جو یہ سہارا ملا تو اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اس نے فوراً جنگی تیاریاں شروع کر دیں

وزیر اعظم مصر ابھی سوڈانیوں کے جھگڑے سے فارغ ہوا تھا کہ اسے جاسوسوں نے یروشلیم میں جنگی تیاریوں کی خبریں دینا شروع کر دیں۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ اس بار صرف یروشلیم کا لشکر ہی حملہ آور نہ ہوگا بلکہ شاہ یروشلیم کے ساتھ یورپ کے بہت سے ملکوں کے فوجی دستے بھی ہوں گے جاسوسوں نے اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کیا کہ شاہ یروشلیم نے اپنی سفارت شہنشاہ قسطنطنیہ کے دربار بھی بھیجی ہے اور بہت ممکن ہے کہ شہنشاہ بھی یروشلیم کی مدد پر تیار ہو جائے۔

یہ اطلاعات صلاح الدین کے لئے بڑی پریشان کن تھیں اس نے اسکندریہ اور بلیس کی طرف کمک روانہ کر دی تھی اور وہاں کے حاکموں کو حکم دیا تھا کہ حملہ کی صورت میں قلعہ بند ہو کر مقابلہ جاری رکھیں تاکہ انہیں مزید لشکر روانہ کیا جاسکے۔ پھر ایک شب

صلاح الدین کو سوتے جگایا گیا اور دمیاط کے قاصد کو اسی وقت پیش کیا گیا۔ قاصد نے افسردگی سے اطلاع کر دی۔ "یروشلیم کے شاہ ایمارک نے دمیاط کے شمال میں اپنا لشکر اتار دیا ہے۔ دمیاط کے بحری راستے پر اس کے جہاز چکر لگا رہے ہیں"

"جنوبی راستہ ابھی خالی ہے؟" صلاح الدین نے گھبرا کے پوچھا۔
"جی ہاں وزیر اعظم۔ قاصد نے تصدیق کی۔ ابھی تک محاصرہ مکمل نہیں ہوا ہے"
صلاح الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ والی دمیاط شمس الخواص نے مذاقت کے لئے کیا اقدام کئے ہیں؟

قاصد نے جواب دیا۔ ابھی تک دمشق کی فوج کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا اس لئے والی دمیاط احتیاطاً "قلعہ بند ہو گئے ہیں اور فوری مدد کی درخواست کی ہے"
"تم جس قدر تیزی سے آئے ہو۔ اسی تیزی سے واپس جاؤ۔ اور شمس الخواص بخور کو اطمینان دلاؤ کہ مصری حکومت دمیاط کو کمک بھیجنے میں ایک لمحے کی کوتاہی نہ کرے گی۔"
صلاح الدین نے بڑے جوش سے کہا۔ "ہم دمیاط مصر کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہ ہونے دیں گے"

صلاح الدین نے قاصد کو خالی واپس نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ فوری طور پر پانچ سو شامی سواروں کا ایک مضبوط دستہ اس کے ساتھ کر دیا۔
"یہ ہماری کمک کی پہلی قسط ہے۔" صلاح الدین نے قاصد کو رخصت کرتے وقت کہا۔ دمیاط مسلمانوں کا ہے اور مسلمانوں کے قبضہ میں رہے گا۔"
"وزیر اعظم۔۔۔۔۔" والی دمیاط بہت پریشان تھے اس کمک سے انہیں بہت سہارا ملے گا اور وہاں موجود فوجیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔"

قاصد کے رخصت ہوتے ہی صلاح الدین نے تمام امراء نوریہ کو طلب کر لیا۔ رات بھر مجلس مشورت بھی رہی تمام معاملات طے ہو گئے مگر صلاح الدین کے دمیاط جانے پر بات آکر رک گئی۔

نقیہ عیسیٰ ہکاری نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "جیشوں کا فتنہ ابھی ختم ہوا ہے ایسی صورت میں وزیر اعظم کا دار الخلافہ چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں میں اس تجویز کی شدید مخالفت کرتا ہوں۔"

محمود حامی ہے کہا۔ "نقیہ معظم۔ دمیاط جانے کی تجویز خود وزیر اعظم نے پیش کی ہے آپ اس کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں وزیر اعظم سے بہتر اور کون امیر لہرائیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے؟"

امیر حامی نے درست فرمایا۔ فقیہ ہکاری نے جواب دیا۔ لیکن امیر صلاح الدین کی موجودگی جس طرح جنگ کے لئے اہمیت رکھتی ہے اسی طرح قاہرہ کے لئے بھی ضروری ہے۔ میرے منہ میں خاک اگر دمیاط کسی کمزوری کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل بھی گیا تو ہم اسکندریہ میں جمع ہو کر دمیاط کو واپس لے سکتے ہیں لیکن اگر خدا نخواستہ قاہرہ کے حالات بگڑ گئے تو اسے سوائے صلاح الدین کے اور کوئی نہیں سنبھال سکتا۔

”فقیر محترم“ آپ نے دمیاط کے قاصد کا حال نہیں دیکھا۔“ صلاح الدین نے دخل دیا۔ ”اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر والی دمیاط کی فوجی مدد نہ کی گئی تو دمیاط پر نصرائیوں کا قبضہ ہو جائے گا میں چاہتا ہوں دمیاط پہنچ کے خود اپنی آنکھوں سے وہاں کا حال دیکھو اگر اگر شاہ ایمارک کے ساتھ پورا یورپ آگیا ہے تو ہمیں کچھ اور بھی سوچنا ہوگا۔“

”اور کیا سوچنا ہوگا؟“ فقیہ ہکاری نے گھبرا کر صلاح الدین کو دیکھا۔ کہیں وزیر اعظم پسائی کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“

”لا حول ولا قوۃ اللہ باللہ۔ صلاح الدین کی زبان سے اک دم نکلا۔“ میں پسائی کا تصور نہیں کر سکتا اور میری امراء سے درخواست ہے کہ جب بھی میری زبان سے پسائی کا لفظ سنیں تو میرا ساتھ فوراً چھوڑ دیں۔ ہم اتنا خون بہانے اور شہادتیں دینے کے بعد مصر کے چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔“

فقیر ہکاری کچھ شرمندہ ہو گئے۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے وزیر اعظم کے بارے میں ایک غلط رائے قائم کی۔ ان کے لیے میں شرمندگی اور افسردگی کا استخراج تھا۔“

”ایسا نہ کہنے فقیر محترم۔“ صلاح الدین نے پورے غلوص سے کہا میں امراء نوریہ کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ہمیشہ ان کا مشورہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں یہ کہتا چاہتا ہوں کہ جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق یورپ کے کئی ممالک کی فوجیں یروٹلم پہنچی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ شاہ یروٹلم کے ساتھ دمیاط آئی ہوں گی۔ نصرائی شہنشاہ قسطنطینہ کے بارے میں بھی یہ اطلاعات ملی ہیں کہ وہ ایک بڑا لشکر روانہ کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نصرائی سرزمین مصر پر ایک نئی صلیبی جنگ کا آغاز کرنا چاہتے ہیں دمیاط ایک چھوٹی سی منڈی ہے لیکن عسکری اعتبار سے اس کا محل وقوع بہت اہم ہے۔ ان تمام باتوں سے ہمیں سلطان کو مطلع کرنا چاہئے۔“

”نہایت مناسب خیال ہے۔“ امیر محمود حاری نے تائید کی ”میرے خیال میں صرف اطلاع دینے سے کام نہیں بنے گا۔ ہمیں دمیاط کو بہر صورت بچانا ہے اس لئے ہم سلطان سے کمک کی درخواست بھی کر سکتے ہیں کیوں فقیر محترم آپ کا کیا خیال ہے؟

”نصرائیوں کی تیاری سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مصر کی آخری جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ فقیر ہکاری نے خیال ظاہر کیا۔“ خواہ شاہ ایمارک اس جنگ کو صلیبی جنگ کا نام نہ دے مگر اس نے یورپ اور شہنشاہ روم سے جو کمک طلب کی ہے اس میں مذہبی جنگ کا نام ضرور لیا ہوگا۔“

”یہ خیال بھی درست معلوم ہوتا ہے۔“ صلاح الدین نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ ایمارک نے حلیف ملکوں کو لکھا ہے کہ شمال سے سلطان دمشق اور جنوب سے صلاح الدین یروٹلم پر قبضہ کے لئے بڑھ رہا ہے اور اگر اس وقت نصرائی قوم نے اس کی مدد نہ کی تو یروٹلم عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور انہیں یروٹلم کی زیارت کے لئے مسلمانوں کے سامنے اپنی درخواست پیش کرنا پڑے گی۔“

وزیر اعظم صلاح الدین کا یہ خیال حقیقت سے بہت قریب تھا۔ مجاہد اعظم عماد الدین زنگی کے عہد حکومت میں جب شاہ یروٹلم نے امیر عماد الدین کے خلاف میدان کھولا تھا تو اس نے ملک شام کی تمام عیسائی سلطنتوں اور شہنشاہ قسطنطینہ کو یہی لکھا تھا کہ یروٹلم خطرے میں ہے۔ مسلمان اس پر قبضہ کر لیں گے۔ اس وقت بھی اس آواز پر تمام عیسائی دنیا اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس وقت کا شہنشاہ قسطنطینہ جان کانی ایک لشکر جرار لے کر مسلم علاقوں کو روندنا دمشق تک پہنچ گیا تھا۔ اس وقت بھی بالکل وہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

فقیر ہکاری نے رائے دی۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے شاہ یروٹلم کسی نہ کسی بہانہ اپنی نیگسٹوں کا بدلہ لیتا چاہتا۔ اگر وہ واقعی اتنی تیاری سے آیا ہے تو پھر اس سیلاب پر فوراً بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ مصر میں اتنی فوج موجود نہیں جو متحدہ نصرائی لشکر کا مقابلہ کر سکے مصریوں سے کچھ زیادہ امیدیں نہیں باندھی جاسکتیں۔ سوڈانی باغیوں اور مصر کے علوی امراء پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا شاہی لشکر منگوانا بہت ضروری ہے۔

دوسرے دن دمیاط کو کچھ فوجی دستے روانہ کئے گئے قاہرہ کے دفاع کے لئے بھی اقدام کئے گئے دمیاط کا شرنیل کی ایک شاخ پر آباد تھا اسکندریہ اس کے قریب تھا اس لئے اسکندریہ پر بھی توجہ دینا ضروری تھا۔ صلاح الدین، براء الدین قراقوش کو دمیاط بھیج چکا تھا اب اسکندریہ بھی دو امیروں کو بھیجا کہ وہ اسکندریہ پہنچ کے بذات خود وہاں کے حالات دیکھیں اور صلاح الدین کو مطلع کریں ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد صلاح الدین نے چار آدمیوں پر مشتمل ایک وفد سلطان دمشق کی خدمت میں بھیجنے کے لئے ترتیب دیا اس وفد کو پورے ملک کے خاص خاص حالات سے آگاہ کیا گیا۔ خاص کر دمیاط کے محاصرہ کی تفصیل مع ایک نقشہ کے تیار کی گئی ان باتوں کے علاوہ صلاح الدین نے اپنی طرف سے

جٹاں تھے۔ یہ مخالفت کھل کے اس وقت سامنے آئی تھی جب شیرکوہ کی وفات کے بعد صلاح الدین کو مصر کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ امراء نوریہ کو اس پر اعتراض تھا کیونکہ صلاح الدین نے بلیس کے معرکہ میں پہلی بار اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے تھے جبکہ دوسرے امراء نوریہ ایسی درجنوں لڑائیوں میں حصہ لے چکے تھے ظاہر ہے کہ انہیں صلاح الدین کے مقابلہ میں زیادہ تجربہ تھا۔

عمر کے سلسلے میں بھی امراء کا اعتراض جائز تھا۔ صلاح الدین ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوا تھا اور مصر کی وزارت کے وقت ۱۲۶۹ء میں اس کی عمر اکیس سال تھی یہ عمر کم نہیں لیکن عسکری تجربہ کے لحاظ سے اس کم عمری کہا جاتا ہے جبکہ دوسرے امراء اس سے پندرہ بیس سال بڑے تھے لیکن بعض لوگوں میں خداوند صلاحیت ہوتی ہے اور وہ کم عمری میں ہی اس قدر تجربہ کار ہو جاتے ہیں کہ بوڑھے سردار بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے شاید اسی وجہ سے صلاح الدین کا انتخاب وزارت سب نے پسند کیا سوائے ایک امیر جس کا نام امیر عین الدولہ باروتی تھا وہ صلاح الدین کے وزیر اعظم ہوتے ہی لڑ جھگڑ کر مصر سے واپس چلا گیا تھا۔

صلاح الدین نے وفد کے ساتھ اپنے اعتماد کے امیر اس وجہ سے بھی بھیجے تھے کہ وہ عین الدولہ اور دوسرے مخالف امیروں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر لیں۔ ایک خیال یہ بھی ہوا کہ صلاح الدین نے جان بوجھ کر دمیاط جانے سے گریز کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شاید سلطان بھی دمیاط کو بچانے آجائے اور اس کا اور سلطان کا سامنا ہو جائے صلاح الدین کے بارے میں یہ بھی افواہ گرم تھی کہ وہ خود سلطان بننا چاہتا ہے یہ افواہ اس کے دمشق میں موجود دشمنوں نے اڑائی تھی یہ افواہ اتنی گرم ہوئی کہ صلاح الدین نے اپنے رفقاء کے مشورے سے خود دمیاط جانے سے گریز کیا اور وہاں برابر کمک بھیجتا رہا۔

در اصل شامی اور شمشانی دور میں اس قسم کی افواہیں بھلیتی اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں اس لئے ان کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ ہونا مشکل ہوتا تھا لیکن آئندہ جو حالات پیش آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ افواہ ہی غلط تھی یا پھر موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر سلطان نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب صلاح الدین کا خط دربار دمشق میں پڑھا گیا تو عین الدولہ باروتی وہ پہلا امیر تھا جس نے سلطان کے سامنے صلاح الدین کی سخت مخالفت کی اور یہاں تک کہ دیا کہ صلاح الدین نے مصر میں ایک متوازی آزاد سلطنت قائم کر لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ صلاح الدین جس دن سے مصر کا وزیر اعظم ہوا ہے اس نے دربار دمشق میں ایک بار بھی حاضری نہیں دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نور الدین زنگی نے صلاح الدین کے خلاف کسی بات پر کان

ایک خط سلطان کو لکھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔
اعلیٰ حضرت آقائے محترم نور الدین زنگی سلطان دمشق و شام کے نام از طرف۔

خادم و وفادار ملت و تاج امیر صلاح الدین ایوبی، سپہ سالار افواج شام، مقیم قاہرہ ملک مصر۔

بہد ادب و احترام غلام عرض کرتا ہے کہ یروٹلم کے نصرانی بادشاہ ایمارک نے تثلیث و نصرانیت کا واسطہ دے کر یورپ کے کئی ملکوں کے فوجی دستوں کو بیت المقدس بلا لیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ افواہ جس میں حقیقت زیادہ ہے۔ گرم ہے کہ نصرانی شہنشاہ، قسطنطنیہ بھی شاہ ایمارک کو کمک کے طور پر ایک لشکر عظیم بری اور بحری راستوں سے بھیج رہا ہے۔

بعد میں وجہ حضرت اقدس سے التماس ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے۔ اور جتنی تعداد میں ممکن ہو شامی سواروں کے دستے مصر روانہ فرمائے جائیں نصرانی لشکر شاہ ایمارک کی سرکردگی میں شہر و بندرگاہ دمیاط تک جس کا محل وقوع مسئلہ نقشہ میں درج کیا گیا ہے پہنچ گیا ہے۔ اس غلام نے دمیاط کو معقول کمک روانہ کر دی ہے لیکن امراء نوریہ نے اس خادم کو دمیاط سے جانے سے روکا ہے کیونکہ قاہرہ کے حالات ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں۔ سوڈانیوں اور مصری امراء کی طرف سے کسی وقت بھی بغاوت کی آگ بھڑک سکتی ہے۔

سلطان کی خدمت والا میں ایک عرض یہ بھی ہے کہ اگر باب عالی یہ مناسب سمجھے تو سلطنت یروٹلم کے شمالی علاقوں پر فوجی کارروائی شروع کر دیں اس سے نصرانیوں کی توجہ اپنے علاقوں کی طرف ہو جائے گی اور مصر پر ان کا دباؤ کم ہو جائے گا۔

غلام سلطانی صلاح الدین

سپہ سالار شامی لشکر مقیم

سلطنت مصر

صلاح الدین نے دمشق جانے والے وفد میں اپنے اعتماد کے دو امیر بھی شامل کر دیے اس کا مقصد تھا کہ امیر کو اچھی طرح مطمئن کر سکیں گے اور صلاح الدین کے قاہرہ چھوڑنے کی وجہ سے سلطان نور الدین کو مطمئن کر سکیں گے یہ تو قارئین کو علم ہو گا صلاح الدین کے ساتھ دمشق سے جو امراء نوریہ آئے تھے ان میں سے بعض صلاح الدین

نہیں دھرے اور صلاح الدین کی درخواست کے جواب میں اس قدر برق رفتاری سے ملک روانہ کی کہ صلاح الدین حیران رہ گیا۔ سلطان نے ایک ہی بار ملک نہیں بھیجے آگے پیچھے ملک کا تائب باندھ دیا اور صلاح الدین کو مطلع کیا کہ وہ قطعی نہ گھبرائے دم ہاتھ سے نکلنے نہ دے۔ سلطان نے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ خود لشکر جرار لے کر یروشلم شمالی علاقوں پر حملے کے لئے روانہ ہو رہا ہے تاکہ شاہ یروشلم کی توجہ دمیاط کی طرف ہٹ جائے۔

اکثر جنگوں پر موسم بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاہ ایملارک کی درخواست پر نہ شہنشاہ قسطنطین نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی مدد کے لئے سوا دو سو جہازوں کا زبردست بحری بیڑہ روانہ کیا جا رہا ہے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس بحری بیڑے میں سپاہ تھی اور شاہ ایملارک تب یہ نوید سن کر کس قدر خوش ہوا ہوگا اس کے لئے بیڑے کی آمد کی اطلاع ہی کافی تھی اس نے فوری طور پر دمیاط کے محاصرے کی تیاری اور دوسری یورپی سلطنتوں کی فوجوں کو لے کر دمیاط پر چڑھ دوڑا۔ اس نے دمیاط سمندر کے درمیان اپنی فوجیں پھیلا دیں تاکہ دمیاط کو سمندری راستے سے مدد نہ مل سکے دمیاط کا والی ٹمس الخواس سکندر ایک بہادر اور جہاندیدہ انسان تھا۔ پہلے تو اس پاس جتنی فوج تھی اسے مورچوں پر لگایا پھر وزیر اعظم قاہرہ کو اطلاع دی وزیر اعظم صلاح الدین ایوبی نے بھی اسی تیزی سے اقدام کیا اور قاہرہ اور دمیاط کے درمیان فوجوں کا بندھ گیا اور جیسے ذکر کیا گیا ہے کہ موسم جنگ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو مو حالات جنگ کا پانسہ ہی بدل دیتے ہیں یہی صورت دمیاط کے محاصرے کے وقت پیش آئی آپ جانتے ہیں کہ قسطنطین کا شہر پانچ میل چوڑی ایک گھاٹی پر آباد ہے اور یہ کھاڑی اسے دفاع کرتی ہے نصرانی شہنشاہ کا بحری بیڑہ عام طور پر سے اسی کھاڑی میں لنگر انداز ہوتا اس اہم کھاڑی کو انگریزی میں گولڈن ہارن اور ہم اسے شاخ زریں کہتے ہیں پس شہنشاہ قسطنطین کے حکم پر سوا دو سو جہازوں کا بیڑہ یروشلم کی مدد کو دمیاط روانہ ہوا تو اس کا یہ مقابلہ مخالف ہواؤں سے پڑا۔ مخالف ہوا اس قدر تیزی سے چلنے لگی کہ بحری بیڑہ تین دن تک شاخ زریں سے باہر نہ نکل سکا۔ اور یہی تین دن دمیاط کے محاصرہ کے لئے فیصلہ کر ثابت ہوئے

شاہ یروشلم ایملارک اور دمیاط کے شمالی حصے کا محاصرہ کئے قسطنطین کے بحری بیڑے انتظار کر رہا تھا۔ بحری بیڑہ موسمی ہواؤں کے تھپڑے کھاتا تین دن کی تاخیر سے دمیاط قریب پہنچا لیکن ادھر صلاح الدین نے تین دن کے اندر اندر دمیاط کو اس قدر مضبوط کر دیا

کہ نصرانیوں کے لئے اس پر قبضہ کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس محاصرے میں صلاح الدین نے ایک انتہائی اہم جنگی چال چلی وہ چال یہ تھی اس نے دمیاط کے سامنے پانی کے نیچے نیچے ایک آہنی زنجیر اس طرح پھیلا دی کہ اسے کوئی جہاز پار ہی نہ کر سکتا تھا۔ جب قسطنطین کا بحری بیڑہ دمیاط پہنچا اور وہ ساحل کی طرف بڑھا تو پانی کے اندر ہی آہنی زنجیر نے اس کا راستہ روک لیا اور جہازوں کو ساحل سے دور رکھنا پڑا۔

صلاح الدین کی اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ ہوا کہ قسطنطین کی بحری فوج شاہ یروشلم کی اتنی مدد نہ کر سکی جتنی توقع تھی۔ شاہ نے جھلا کر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور پوری قوت سے دباؤں اور منہیتوں سے حملہ کر دیا۔ دباوے ایک طرح کے متحرک قلعے ہوتے ہیں ان کی پشت پر چرخی دار منہیتیں ہوتی ہیں جن سے بڑے بڑے پتھر برسائے جاتے ہیں جس طرح آج کل توپیں گولے اگلتی ہیں اسی طرح منہیتیں وزنی پتھر پھینکتی تھیں جن سے جانی نقصان ہونے کے علاوہ قلعہ کی تفصیل ٹوٹ جاتی تھی شاہ یروشلم کا یہ حملہ بڑا شدید تھا لیکن دمیاط کی مدافعت اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ وہاں کی فوج نے صرف یہ حملہ پسپا کر دیا بلکہ بہت سی منہیتیں بیکار کر دیں۔ دباوے اوندھے کر دیئے۔ اور بحری بیڑے میں آگ لگا کر اس کے چوتھائی کے قریب جہاز خاکستر کر دیئے۔

کہنے کو تو دمیاط محاصرے میں تھا لیکن اسے دریائے نیل کے راستے سے ہر طرح کا سامان مل رہا تھا پھر قاہرہ سے تازہ دم فوجی دستے لے کر صلاح الدین دمیاط پہنچ گیا۔ فوج کے علاوہ اپنے ساتھ کئی لاکھ دینار بھی ساتھ لایا تھا تاکہ اخراجات میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ شاہ ایملارک نے دمیاط کو محاصرے میں لیا تھا لیکن صلاح الدین نے اپنی فوجیں دور دور تک پھیلا کر شاہ کی فوجوں کو اس قدر تنگ کیا کہ ان کا ناک میں دم ہو گیا۔ نصرانی فوج کے رمد کے تمام راستے بند کر دیئے اور شاہ کی فوج بھوکوں مرنے لگی اور اس میں افزائش ہو گئی محاصرہ کرنے والے لشکری صاف الفاظ میں واپسی کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہیں کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا صرف پھلوں پر گزارہ تھا جس سے ان کا ہانسمہ خراب ہو گیا اور پیٹ کی بیماریاں پھیلنے لگیں۔ ہر طرف قحط تھا یا بیماری۔ شاہ ایملارک محاصرہ کر کے پچھتا رہا تھا۔

موسم نے پہلے بھی مسلمانوں کے ساتھ دیا تھا جب شاخ زریں سے چلنے والا بحری بیڑا مخالف ہوا کی وجہ سے تین دن تاخیر سے دمیاط پہنچا۔ اور نصرانیوں کو پوری مدد نہ کر سکا۔ اب پھر موسم مسلمانوں کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ دمیاط کے محاصرے کے دوران سخت طوفان باد و باران آیا۔ ہر جگہ جل تھل ہو گیا نصرانیوں کے خیمے آندھی سے اڑ گئے یا پانی

کے ریلے میں بہہ گئے۔ اس طوفان نے دریائے نیل میں بھی طوفانی کیفیت پیدا کر دی قسطنطنیہ سے آیا ہوا بحری بیڑا تیس تیس نہس ہو کر رہ گیا سینکڑوں نصرانی دریا کی لہروں میں گئے۔ منیمنتیں کچھڑ میں پھنس گئی ادھر دمیاط کے محصورین کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا انہوں نے اپنے مورچے آگے بڑھا کر نصرانیوں پر منیمنتوں سے تیز برسانا شروع کر دیئے۔ اس سے اور تباہی مچی۔ لشکری پہلے ہی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ شاہ ایمالرک کو مجبور ہو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ یہ ایک بہت بڑی شکست تھی۔

دمیاط کا محاصرہ نومبر ۱۱۹۹ء کے آغاز میں شروع ہوا اور شاہ یروٹلم کو دسمبر کے آ میں محاصرہ اٹھا کر بھاگنا پڑا۔ تقریباً "پچاس دن کے اس محاصرے نے شاہ یروٹلم کی فوج شدید نقصان پہنچایا۔ پسا ہونے والے لشکر کی حالت اتنی خستہ تھی کہ بقول ایک یورپائی مورخ کے واپس آنے والے اس طرح گرتے پڑتے اور بھوکے پیاسے واپس آ رہے تھے وہ کسی قطرہ زہر سے نکالے گئے ہوں۔ شہنشاہ قسطنطنیہ کا وہ بحری بیڑا جو بڑی شاہیں پھیرے اڑاتا آیا تھا۔ اس حال میں واپس ہوا کہ آدھے سے زیادہ جہاز تباہ یا خاکستر ہوئے تھے اور باقی جہاز اس قدر شکست تھے کہ انہیں ایک دوسرے میں باندھ کر گھسیٹا جا رہا تھا۔ دمیاط کی زبردست شکست نے یروٹلم کے شاہ ایمالرک کی جارحانہ طاقت کو ختم کر دیا اور اسے اپنی سلطنت بچانے کی فکر پڑ گئی۔ دمیاط کی فتح نے مصری عوام کی کایا پلٹ کر دی یوں تو عوام صلاح الدین کے آہستہ آہستہ ہمنوا ہوتے جا رہے تھے لیکن داروغہ عملاہ نجاح کے مارے جانے اور سوڈانی جشیوں کی بغاوت میں جو خونریزی ہوئی تھی اس کا قہرہ کی فضا کو کچھ خراب کر دیا تھا۔ لیکن دمیاط میں صلاح الدین کو کامیابی حاصل ہوئی اس مصریوں کی نظروں میں صلاح الدین کو مصر کا ہیرو بنا دیا۔ مصری ایک زمانہ سے یروٹلم بادشاہ کو خراج دیتے آ رہے تھے۔ صلاح الدین سے پہلے کسی مصری وزیر اعظم نے مصر یروٹلم کی غلامی سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی لیکن جب دمشق کا شاہی لشکر مصر میں داخل ہوا تو اس نے نہ صرف یروٹلم کو خراج دینا بند کر دیا۔ بلکہ شاہ ایمالرک کو قتل کر دیا۔

دمیاط کی فتح سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ سوڈانی جشی جو قہرہ سے نکل کر ادھر ادھر پھیل گئے تھے اور لوگوں کو صلاح الدین کے خلاف اکسایا کرتے تھے ان کی ریشہ دوانیاں ختم ہو گئیں دمیاط کے محاصرہ کے وقت ان باغی جشیوں کی ایک کثیر تعداد پوشیدہ طور دمیاط میں داخل ہو گئی تھی اور صلاح الدین کی شاہی فوجوں کے خلاف حرکتیں کر رہی تھی نصرانیوں کی شکست اور پسپائی نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

مصر کے کونے کونے میں دمیاط کی فتح کا جشن منایا گیا مصری عوام دور دراز علاقوں سے صلاح الدین کو مبارکباد دینے کا قہرہ پہنچے۔ صلاح الدین نے بھی ان کی دل سے پذیرائی کی اور تحفہ و تحائف دے کر انہیں واپس کیا۔ مصری خلیفہ عاضد جس پر چوبیس گھنٹے غشی پاری رہتی تھی وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اور اپنے مصاحب جو ہر استاد اور مجلس بن عبد القوی کو غلت فاخرہ دے کر صلاح الدین کے پاس مبارک باد کے لئے بھیجا مگر صلاح الدین اس وقت دمیاط سے واپس نہ آیا تھا۔ مجلس بن عبد القوی پہلے مصر کے قاضی القضاہ تھے شیر کوہ نے تو انہیں بحال رکھا تھا لیکن صلاح الدین نے انہیں قاضی القضاہ کے عہدے سے ہٹا دیا تاہم چرب خلیفہ عاضد نے بہت سفارش کی اور اپنی مصاحبی میں مجلس بن عبد القوی کو مانگا تو صلاح الدین انکار نہ کر سکا۔ جو ہر استاد خلیفہ عاضد کے مصاحب خاص اور حاجب تھے خلیفہ اپنے اہم کاموں پر انہی دو مصاحبوں کو مامور کرتا تھا۔

صلاح الدین نے دمیاط میں ایمالرک شاہ یروٹلم کی پسپائی کا حال اپنے آقائے والی نعمت سلطان دمشق نور الدین دنگی کو بھی لکھ بھیجا تھا۔ اس اطلاع سے دربار دمشق میں صلاح الدین کے خلاف اڑتی ہوئی افواہوں کا بہت کچھ سدباب ہو گیا اس کے جواب میں سلطان نے صلاح الدین کی جنگی حکمت عملی کی بہت تعریف کی اور اس کے والد نجم الدین اور دوسرے تمام اہل خاندان کو مصر جانے کی اجازت دے دی۔ صلاح الدین نے دمیاط کے اطلاعی خط میں اپنے عزیزوں کو قہرہ بھوانے کی درخواست کی تھی جسے سلطان نے بعض امراء کی مخالفت کے باوجود منظور کر لیا تھا۔

صلاح الدین نے اپنے خاندان والوں کا قہرہ میں شاندار استقبال کیا۔ اس خصوصی جشن میں امراء نوریہ کے علاوہ مصر کے تمام بڑے بڑے امراء اور عمائدین سلطنت نے بھی شرکت بھی اور صدقے کے طور پر صلاح الدین کے باپ نجم الدین نے ہزاروں دینار نچھاور کئے صلاح الدین نے اس موقع پر ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا اور غریبوں اور مسکینوں میں دل کھول کے خیرات تقسیم کی۔

رات جب تمام مہمان رخصت ہو گئے اور صلاح الدین کے گرد صرف اس کے عزیز و اقارب رہ گئے تو صلاح الدین کی آنکھیں نم ہو گئیں اس خوشی کے موقع پر صلاح الدین کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیرانی ہوئی اس کا باپ نجم الدین ایوب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”اے جان ایوب۔ یہ مقام مسرت اور خدا کا شکر ادا کرنے کی گھڑی ہے کہ ہم تمام عزیز ایک جگہ پر جمع ہو گئے ہیں پھر تمہاری آنکھوں پر اشک کیوں۔ اگر یہ آنسو خوشی یا

اعتماد تفکر کے ہیں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور اگر تمہاری آنکھیں ہمارے آنے سے اٹکبار ہوئی ہیں تو اے جان پر۔ صاف صاف کہہ دو۔ ہم کسی اور طرف کو نکل جائیں۔ اور اپنی دنیا کیس اور آباد کریں گے۔

”اے میرے قابل فخر اور محبوب باپ۔“ یہ کہتے ہوئے صلاح الدین کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں غلوص و محبت کے موتی برسائے لگیں پھر جب ذرا دل ٹھہرا تو صلاح الدین نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ آپ لوگوں کی جدائی میں نے یہ دن کس طرح کاٹے ہیں۔ عین الدولہ باروتی نے قاہرہ میں بھی میری مخالفت کی تھی اور دمشق پہنچ کے بھی وہ میرے خلاف زہرا گل رہا ہے۔“

”اس شیطان کی فکر نہ کرو میرے بیٹے۔“ نجم الدین ایوب نے اسے تسلی دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے تمہاری بہت غیبت کی مگر شریف الطنج سلطان پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تم اپنے آنسو پونچھ ڈالو اور یہ سمجھو کہ عین الدولہ تمہارے لئے مر گیا ہے۔“

”بابا جان۔ مجھے اس بات کا غم نہیں تھا کہ عین الدولہ میری برائیاں کر کے مجھے سلطان کی نظروں سے گرا دے گا۔“ صلاح الدین کے جذبات بھڑک اٹے۔ میں اور آپ سب سپاہی اور سپاہی زادے ہیں۔ ہم صرف اپنی تلوار کی روٹی کھاتے ہیں۔ اگر سلطان ناخوش ہوگا تو ہم کسی اور ملک نکل جائیں گے اور شمشیر کے زور پر روزی پیدا کر لیں گے۔ اس وقت آپ سب کو اپنے قریب دیکھ کر میں آبدیدہ اس وجہ سے ہو گیا کہ مجھے سلطان دمشق سے یہ امید نہ تھا کہ وہ آپ لوگوں کو میرے پاس آنے دیں گے ایسی صورت میں جب عین الدولہ نے میرے خلاف اس قدر ہرزہ سرائیاں کی ہیں۔“

”چلو۔ تمہیں اب تو اطمینان ہو گیا کہ ہم تمہارے پاس آگئے اور سلطان کی طرف سے بھی تمہارا دل صاف ہو گیا ہوگا۔“ نجم الدین ایوب نے بڑے پیار سے کہا۔ اب میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے مہربان اور محسن سلطان کے خلاف کبھی تلوار بلند نہ کرنا اور نہ ہمارے خاندان پر احسان فراموشی کا الزام لگ جائے گا۔

”آپ اطمینان رکھئے بابا جان۔“ صلاح الدین نے مضبوط لمبے میں کہا۔ میں اپنے آقا کی فرمانبرداری اور خدمت بالکل اسی طرح کروں گا جیسے ایک نمک حلال غلام کرتا ہے سلطان دمشق تو بہت بڑی چیز ہیں ان کے اہل خانہ کی تابعداری میں بھی کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا مگر آپ کو بھی میری ایک شرط قبول کرنا ہوگی؟

نجم الدین ایوب نے حیران نظروں سے صلاح الدین کو دیکھا۔ ”شرط — کیا شرط ہے تمہاری“

”میں اپنے آقا نور الدین زنگی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے الطاف خسروانہ برتنے آپ لوگوں کو مصر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ صلاح الدین نے غلوص دل سے دھمکیوں میں نے آپ سب کو صرف اس وجہ سے نہیں بلایا کہ میں یہاں اکیلا تھا یہ ٹھیک کہ آپ لوگوں کی محبت بہت ستاتی تھی لیکن آپ کو یہاں بلائے کی اصل وجہ یہ ہے کہ نے مصر میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس میں میرے والد کی کوششیں اور میرے بھائی اور عزیز داروں کی دعائیں شامل ہیں۔ اتنا کہ کر صلاح الدین خاموش ہو گیا۔

بات ابھی نامکمل تھی نجم الدین ایوب اور دوسرے عزیزوں کو فکر پیدا ہو گئی۔ کافی دیر تو نجم الدین ایوب نے وضاحت کی کہ ”صلاح الدین یہ ٹھیک ہے کہ دعاؤں میں بہت ہوتا ہے ہم سب نے تمہارے ترقی درجات کی دعائیں ضرور کی تھیں لیکن جہاں تک کوششوں کا تعلق ہے تو یہ تمہاری محبت کا کرشمہ ہے ورنہ تمہیں بتانے اور سنوارنے یا تو مرحوم اسد الدین شیرکوہ کی کوششیں تھیں یا پھر خود سلطان معظم نے تمہاری ت کی ہے تمہیں اس کے لئے بھی ان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔“

”آپ درست فرماتے ہیں بابا جان۔“ صلاح الدین نے تسلیم کیا۔ چچا جان اسد نا شیرکوہ نے مجھ پر جتنے احسانات کئے ہیں انہیں تو میں شمار بھی نہیں کر سکتا ان کا سب بڑا تو یہی احسان تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ مصر لائے حالانکہ میں مصر آنے پر بالکل تیار نہ تھا۔ چچا شیرکوہ اگر مجھے زبردستی یہاں نہ لائے ہوتے تو میں اس مقام تک کیسے پہنچتا۔ تاکہ سلطان دمشق کا تعلق ہے تو وہ میرے مہربان اور استاد اور آقا ہیں جس طرح ان والد محترم عماد الدین زنگی مرحوم اپنے امراء سے کہا کرتے تھے۔ کہ انہیں دیکھو اور ان اجنبی کی کوشش کرو یہی بات سلطان عالی مقام بھی مجھ سے ہر موقع پر کہتے تھے اور یہ کی تربیت کا اثر ہے کہ میں نے مصر جیسی اجنبی حکومت اور سوڈانی جیشوں پر قابو ل کیا۔ لیکن آپ سب کو مصر میں جمع کرنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔

”صلاح الدین تمہارا ذہن کچھ الجھا ہوا ہے۔“ نجم الدین نے اسے ٹوکا۔ ”پہلے تم کوئی شرط منوانا چاہتے تھے اور اب کہہ ہو کہ ہم لوگوں کو مصر میں بلائے میں را کوئی مقصد ہے آخر یہ سب کیا ہے؟“

”بابا جان آپ نے دونوں باتیں ٹھیک کہیں۔“ صلاح الدین نے تسلیم کیا۔ آپ لوگوں مصر بلائے کا مقصد یہ ہے کہ آپ مصر کی سلطنت میں اپنا حصہ حاصل کیجئے میری طرف اجازت ہے کہ جو اپنے کو جس عہدے کے قابل سمجھتا ہے اس عہدے پر فائز ہو جائے کوئی نہیں روکے گا اور جو روکے اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔“

ہے یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم اپنی خوشیوں اور اپنے دست و بازو سے پیدا کر
اقدار میں ہم لوگوں کے حصہ دار بنانا چاہتے ہو لیکن ہر شخص کو ایسا عمدہ دو جس کا وہ اہل
ہو۔

”مگر اہل اور نااہل کا فیصلہ کون کرے گا میرے خیال میں انسان اپنے بارے میں
دوسروں کی نسبت زیادہ جانتا ہے۔“ صلاح الدین نے جواب دیا۔
”کیا کہہ رہے ہو صلاح الدین؟“ نجم الدین الجعفی لگا۔ اس طرح تو تمہارا ہر بھائی مہ
کا وزیر اعظم بننے کا فیصلہ کرے گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟“
”میرے کچھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ صلاح الدین نے خوش دلی سے کہا۔
بات آپ کے سوچنے کی ہے فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا۔“

”میں مجھے۔۔۔۔۔۔“ نجم الدین ایوب نے اس کی طرف حیرت
سے دیکھا ”ملک کے وزیر اعظم تم ہو اور فیصلہ مجھے کرنا ہے یہ کس طرح ممکن ہے؟“
”بابا جان“ یہ اس طرح ممکن ہے کہ آج سے آپ مصر کے وزیر اعظم بن جائیں۔
صلاح الدین نے مستقل مزاجی سے کہا۔ میں نے آپ لوگوں کو اسی لئے دمشق سے بلوایا ہے
کہ آپ وزارت کا عمدہ سنبھالیں اور اپنی طرف سے مجھے اور دوسرے بھائیوں کو عمدہ بہت
خیال عطا کر دیجئے

نجم الدین اور دوسرے عزیزوں کی آنکھیں حیرت سے پھل گئیں۔
نجم الدین نے کہا۔ ”صلاح الدین یہ تمہاری سعادت مندی ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے
جو عمدہ تمہیں بخشا ہے اس پر میرا یا کسی اور کا کوئی حق نہیں۔ اوپر والا اسے دیتا ہے جو
کو وہ اس کا اہل سمجھتا ہے تم نے یہاں تک پہنچنے کے لئے جس لگن اور ذہانت اور شجاعت
سے نیک و بد کی ہے وہ قابل تعریف ہے مستقبل کا علم صرف وحدہ لا شریک کو ہے لیکن
آثار یہ بتاتے ہیں کہ تم نے ایک اچھا آغاز کیا ہے انشاء اللہ تمہارے قدم آگے ہی بڑھتے
جائیں گے۔“

صلاح الدین کچھ افسردہ ہو گیا۔ ”بابا جان“ میں نے سوچا تھا کہ مصر کی وزارت آپ
کے سپرد کر کے میں کچھ آرام کروں گا لیکن آپ اس پر آمادہ نہیں ہوتے اب میں کیا کروں
؟

تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کی رضا پر راضی رہو اور آگے
بڑھنے کی کوشش کرتے رہو جو حاصل ہو اسے مقدر سمجھ کر قبول کرو اور جو نہ ملے اسے یہ
سمجھ کر بھول جاؤ کہ وہ تمہاری قسمت میں نہیں۔ ”نجم الدین نے بیٹے کو شفقانہ نصیحت
نجم الدین ایوب نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔“ نہیں صلاح الدین یہ کس طرح ممکن

”میں آپ کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کروں گا۔“ صلاح الدین نے سر تسلیم خم کر دیا۔
لیکن آپ کو میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ اسے آپ میری درخواست سمجھیں یا
نہ۔“

”کہو کیا چاہتے ہو؟“ نجم الدین نے محبت سے کہا۔
”آپ کو مصری حکومت میں کم از کم ایک عمدہ ضرور قبول کرنا ہو گا۔“ صلاح الدین
نے واقعی بچوں کی طرح ضد کی۔ ”اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کون سا عمدہ پسند
فرماتے ہیں۔“

نجم الدین ایوب بیٹے کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے اور انہوں نے بڑے پس و پیش
کے بعد مصر کی وزارت خزانہ کو سنبھالنے کا وعدہ کر لیا۔ صلاح الدین نے اپنے تمام بھائیوں
اور عزیزوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کر کے انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ جو مصری حاکم
ان عہدوں پر کام کر رہے تھے انہیں ملک کے دور دراز علاقوں کا والی بنا کر بھیج دیا اور
انہیں وہیں جاگیریں بھی عطا کر دیں۔ اس طرح صلاح الدین کے ارد گرد تمام اس کے عزیز
جمع ہو گئے اور وہ مصری امراء اور عمدیدار جن سے کسی وقت بغاوت کا خطرہ پیدا ہو سکتا
تھا، قاہرہ سے دور چلے گئے۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ فاطمی خلیفہ عاضد کے ہمدردوں
کا حلقہ ٹوٹ گیا۔

تقر خلافت اور دیگر شاہی محلات کا داروغہ ہماء الدین قراوقش کو بنا دیا گیا تھا۔ جو
صلاح الدین کا خاص آدمی تھا۔ اس طرح محلات میں سوزائوں کا زور ختم ہو گیا اور ہر جگہ
صلاح الدین کے آدمی کام کرنے لگے۔ تمام محلاتی سازشوں اور ریشہ و دانیوں کا خاتمہ ہو گیا
اور خلیفہ محض ایک مذہبی پیشوا یا آئینی سربراہ بن کے رہ گیا۔ صلاح الدین کے عزیزوں کے
مصر آ جانے سے صلاح الدین کو بڑی تقویت حاصل ہوئی مگر اب مشکل یہ تھی صلاح
الدین دو کشتیوں پر سوار تھا۔ مصر میں وہ خلیفہ عاضد کا وفادار ملازم تھا خلیفہ عاضد کا تعلق
فقہ جعفریہ (شیعہ) سے تھا دوسری طرف اس کا آقا اور مربی سلطان نور الدین زنگی تھا جو حنفی
مذہب سے متعلق تھا اور بغداد کے عباسی خلیفہ کا معتقد۔

یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں میں بیک وقت دو مختلف العقیدہ خلیفہ برسر اقتدار تھے۔
ایک مصر کا خلیفہ جو فاطمی کہلاتا اور شیعہ فقہ کا رہبر سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا بغداد کا عباسی
خلیفہ تھا جسے تمام اہل سنت اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں خلیفوں کی عسکری
طاقت ختم ہو چکی تھی لیکن وہ مذہبی اعتبار سے سب سے اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ جب سے
مصر میں صلاح الدین نے وزارت کا عمدہ سنبھالا تھا اس وقت سے سینوں کو یہ امید بندھ گئی

تھی کہ جلد یا بدیر مصر بھی فاطمی خلیفہ سے کٹ کے عباسی خلیفہ کے حلقہ اثر میں آجائے گا۔

ہیں تاکہ وزارت کا رعب بھی قائم رہے اور کسی کی نیت میں فتور نہ آئے۔“
مگر اس طرح تو حرم خلافت کا وقار ختم ہو جائے گا۔ ”صلاح الدین نے مخالفت کی۔“ فاطمی خلیفہ کے گرد مصنوعی اقتدار کا جو ہالہ ہم نے بنا رکھا ہے وہاں اگر فوج کے قدم پہنچ گئے تو صدیوں کی روایتوں اور عقیدوں کی دیواریں زمین بوس ہو جائیں گی۔ ہم خلیفہ کو مددہ پہنچا کر قتل نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ خلیفہ پر موت کا سایہ پڑے تو ملین ہو کر وہ مصر کا خلیفہ تھا اور خلیفہ کی حیثیت ہی سے موت کی آغوش میں جا رہا ہے۔“

خلیفہ عاضد نے وزیر اعظم مصر کو کئی بار ملاقات کے لئے طلب کیا لیکن ہر دفعہ اس نے امر اس کی راہ کا رد کیا۔ وہ نہ جاسکا۔ ہم ایک دن ایسا ہوا کہ جب صلاح الدین دارالوزارت امر سے گفتگو میں داخل ہوا اور چکر کاٹ کر صلاح الدین کے پاس پہنچا۔ صلاح الدین کسی امیر سے مخاطب تھا۔ اس کی نظر غلام پر پڑی تو وہ چونکا۔

”کیا بات ہے۔ تم کیوں آئے ہو؟“ صلاح الدین فکر مند ہو گیا تھا۔ اس غلام کو ائے کسی خاص وجہ کے پرہ چھوڑنے کی اجازت نہ تھی۔

غلام تھوڑا سا صلاح الدین کی طرف جھکا۔ صلاح الدین سمجھ گیا کہ وہ کچھ سرگوشیوں کا چاہتا ہے۔ اس نے یہ مناسب نہ خیال کیا کہ محفل میں غلام کے ساتھ سرگوشیوں کا گفتگو کرے۔ اس لئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اہل مجلس سے معذرت کی اور غلام کے تھ بظنی کرے میں چلا گیا۔

”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟“ صلاح الدین کے لہجے میں انتظار تھا۔

”آقاے محترم۔ فاطمی خلیفہ تشریف لا رہے ہیں۔“ غلام نے واضح الفاظ میں کہا۔

صلاح الدین اچھل پڑا۔ ”کیا۔۔۔۔۔ کیا کہا تم نے۔ تمہارا دماغ تو خراب ہوا ہے؟“

غلام نے ذرہ جرات سے کہا۔ ”آقا میں جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ خبر دل درست ہے۔“

”اس خبر کا راوی کون ہے؟“ صلاح الدین نے قدرے سخت لہجہ اختیار کیا۔ ”خبر غلط تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔“

”موت من خلافت داروغہ محلات شاہی جماء الدین قراقرش اس خبر کے راوی ہیں۔“

صلاح الدین کی اگرچہ مصر پر اس قدر گرفت تھی کہ وہ کوئی بھی قدم اٹھاتا تو بھی کم کو مخالفت کی جرات نہ ہوتی لیکن صلاح الدین کے بھی کچھ اصول تھے۔ اس نے اگر خلیفہ مذہب کو رواج دینے کے سلسلے میں قدم اٹھائے تھے۔ بڑی بڑی حویلیوں اور عمارتوں کو شافعی مدرسوں میں تبدیل کر دیا تھا پھر بھی مصر کے عوام اور خواص کے جذبات کا خیال تھا۔ نجار کی معزولی اور قتل۔ سوانیوں کی بغاوت مصری عمائدین سلطنت کو دور دراز مقامات پر بھیجنا۔ سب ایک ہی منصوبہ کا مختلف کڑیاں تھیں لیکن اب بغداد کے خلیفہ دمشق کے سلطان اور ان کے ساتھ۔۔۔ ہوئے امرائے نوریہ اس پر زور دے رہے تھے کہ مصر میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ نہ پڑے۔ کے عباسی خلیفہ کا نام اور خطبہ رائج کیا جائے۔ یہ بات صلاح الدین کے پیش نظر تھی لیکن۔۔۔ اتنا بڑا قدم اک دم نہ اٹھانا چاہتا تھا۔

فاطمی خلیفہ عاضد اب تک بیمار تھا۔ دوا کی فتح نے پتہ نہیں اس میں کہاں سے طاقت پیدا کر دی کہ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اپنے مصاحبوں کے ذریعہ صلاح الدین کو مبارکباد اور خلعت بھی روانہ کر دی اور ایک شب دوا کی فتح کا جشن بھی منا ڈالا۔ خلیفہ نے صلاح الدین کو کئی بار پیغام بھیجا کہ وہ قصر خلافت آکر خلیفہ سے ملاقات کرے لیکن اس کے امراء نے اس کی شدید مخالفت کی۔

فتیہ عیسیٰ ہکاری کو تو غصہ آگیا۔ ”آخر مصری ہمیں اس قدر بیوقوف کیوں سمجھتے ہیں۔ شاہی لشکر کے لئے صلاح الدین کی زندگی اس قدر ضروری ہے جس طرح انسانی زندگی کے واسطے ہوا اور پانی ہم وزیر اعظم کو قصر خلافت بھیجنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔“

”فتیہ محترم۔ صلاح الدین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے حرم خلافت اور تمام محلات کو سوڈانیوں سے بالکل پاک کر دیا ہے اور ہر اہم جگہ ہمارے وفادار متعین ہیں۔ پھر کس بات کا خطرہ؟“

”محترم وزیر اعظم۔“ فتیہ نے جواب دیا۔ ”حدیث مبارک ہے کہ ہمیشہ حلال چیز کھاؤ اور جس چیز پر شبہ پیدا ہو اسے چھوڑ دو۔ آپ نے یقیناً حرم خلافت کو بدذاتوں سے پاک کر دیا ہے لیکن شبہ تو کیا جا سکتا ہے۔ کسی غیر معمولی بات کا امکان بھی تو موجود ہے۔ حرم خلافت ایک قلعہ اور بھول بھلیوں کا مرکز ہے۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے راستے۔ آسمان سے باتیں کرتے ستون اور طویل راہداریاں۔ یہ سب اچھا خاصا طلسم خانہ ہے۔ اگر وزیر اعظم کو خلیفہ کا بلاوا اسی قدر عزیز ہے تو وہ ایک فتنی دستے کے ساتھ قصر خلافت جا سکتے

”غلام نے بڑی بے خونی سے کہا۔ ”ان کا ہر کارہ ڈیوڑھی پر حاضر ہے۔ حکم ہو تو تصدیق لے اس پیش کیا جائے“

صلاح الدین سوچ میں پڑ گیا۔ براء الدین قراقوش ایک انتہائی با اعتماد اور وفادار افسر تھا۔ اس کی بھیجی ہوئی اطلاع کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ اسے غلط اطلاع دینے سزا بھی معلوم تھی۔ صلاح الدین انہوں اور غلط باتوں کے سلسلے میں برا سخت تھا۔

اس نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔ ”تفصیل سے بتاؤ قراقوش نے کیا اطلاع دی ہے؟“ غلام نے ادب سے جواب دیا۔ ”محترم براء الدین قراقوش نے قاصد کے ذریعے پوچھا ہے کہ وزیر اعظم کو اطلاع دی جائے کہ فاطمی خلیفہ آج صبح سے حرم خلافت سے با نکلتے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ خلیفہ حرم خلافت سے کیوں نکل رہے ہیں اور کہاں کا قصد ہے۔ محترم قراقوش نے خلیفہ محترم کا ارادہ معلوم کرنے کے لئے تو محلات کی جاسوس کنیزوں کو اس کام پر مامور کر دیا۔ آخر ان چالاک کنیزوں نے کسی نہ کسی طرح خلیفہ کو اپنے دل کا راز ظاہر کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ محترم نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کا وزیر اعظم ملکی معاملات میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ ان کے طلب کرنے باوجود حرم خلافت پر آنے کے لئے وقت نہیں نکال سکا اس لئے وہ خود دارالوزارت وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے جائیں گے۔“

”بڑے تعجب کی بات ہے۔“ صلاح الدین کو کسی طرح یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ ”یہ سنا ہے کہ خلیفہ محترم آج تک قصر خلافت سے باہر نکلے ہی نہیں۔ کبھی کبھی جھوٹے بیٹھ کے عوام کو دیدار کراتے تھے لیکن یہ سلسلہ بھی ان کی بیماری کی وجہ سے عرصہ بند ہو چکا ہے اور اب وہ حرم خلافت سے دارالوزارت تشریف لا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کے ساتھ کون کون آئے گا؟“

”اس بارے میں قاصد نے کچھ نہیں بتایا میرے آقا۔“ غلام نے جواب دیا۔ ”جو استاد اور جلیس عبدالقوی تو ضرور ہمراہ ہوں گے۔“

”ہاں یہ بات تو یقینی ہے۔“ صلاح الدین سوچتا ہوا بڑے ہال میں چلا گیا۔ امرائے نوریہ صلاح الدین کے اس طرح اٹھ کے چلے جانے سے کچھ پریشان ہوئے تھے۔ انہیں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خاص اطلاع آئی جب سے وزیر اعظم ان سے معذرت کر کے غلام سے گفتگو کرنے دوسرے کمرے میں گئے ہیں۔ صلاح الدین کے دل آنے سے ان کے بھٹکتے خیالوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ گئے۔

”آپ لوگ یقیناً بہت بے چین ہوں گے۔“ صلاح الدین نے انہیں مخاطب کیا۔ ”حرم خلافت سے آنے والی خبر زیادہ اہم تو نہیں لیکن دلچسپ ضرور ہے۔ آپ لوگ یقیناً اس اطلاع کو حیرت اور دلچسپی سے سنیں گے کہ فاطمی خلیفہ دارالوزارت یعنی اس محل میں تشریف لا رہے ہیں۔“

صلاح الدین نے تفصیل نہیں بتائی تھی۔ تفصیل بتاتا بھی تو کیا۔ اسے بھی تو صرف یہی بتایا گیا تھا کہ خلیفہ دارالوزارت آنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ وہ یہ دھت کیوں گوارہ فرما رہے ہیں۔ ہمیں وجہ تو یہی بتائی گئی تھی کہ صلاح الدین خلیفہ کے پیہم اصرار کے باوجود حرم خلافت نہیں گیا تھا اس لئے وہ خود وزیر اعظم سے ملنے آ رہے تھے۔ اس بات کا اظہار کچھ معیوب بلکہ خود ستائی معلوم ہوتا تھا اس لئے صلاح الدین نے اس تفصیل سے گریز کیا تھا۔

آخر فقیہ عیسیٰ ہکاری نے پوچھ لیا۔ ”اس انہونی کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ جس شخصیت نے عوام کو دیدار دینے کے لئے جھوٹے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے وہ قصر خلافت اور دارالوزارت کا درمیانی فاصلہ کس طرح طے کرے گا؟“

”وجہ کوئی خاص معلوم نہیں ہو سکی۔“ صلاح الدین نے پھر بھی نہ بتایا۔ ”صرف یہی معلوم ہوا ہے کہ دارالوزارت آنے کی تیاریاں صبح سے ہو رہی ہیں۔“

اس پر قاضی فقیہ عیسیٰ بھی مسکرا دئے۔ ”تیاریاں کس بات کی ہو رہی ہیں۔ لیا وہ کسی تقریب میں تشریف لا رہے ہیں یا دارالوزارت پر قبضہ کرنے کا ارادہ ہے۔“ فقیہ عیسیٰ ہکاری کی اس بات پر سب ہی مسکرا دیئے۔ امیر محمود حاری نے کہا۔ ”فاطمی خلیفہ بادشاہ ہیں بلکہ شہنشاہ کتنا مناسب ہو گا۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی کون مزاجی مشہور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس مقصد کے لئے صبح سے تیاریاں ہو رہی تھیں خلیفہ نے وہ مقصد ہی ختم کر دیا ہو یا آج کا معاملہ کل پر ٹال دیا ہو اور ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ گئی ہوں۔“

”اس خیال کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔“ صلاح الدین نے کہا۔ ”بادشاہ تو بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ ارادہ کرنے والا اپنے ارادے کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے کچھ آدمیوں کو دریافت حال کے لئے قصر خلافت بھیجا ہے۔ بالفرض خلیفہ واقعی تشریف لا رہے ہیں تو میں ان کا کہاں اور کیسے استقبال کرنا چاہئے۔ اس معاملے کو ابھی سے طے کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔“

فقیہ عیسیٰ نے صرف چند جملوں میں اس مسئلہ کو طے کر دیا۔ انہوں نے کہا ”خلیفہ

محترم نے اپنی آمد کی اطلاع ہمیں پیشگی نہیں دی اس لئے انہیں خوش آمدید کہنے میں تکلیف کی ضرورت نہیں۔ ہم سب یہاں سے اٹھ کے اس ہال کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اللہ اللہ خیر ملے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں۔

امیر محمود حامی نے اس میں ذرا سی ترمیم کی۔ ”میرا خیال ہے کہ خلیفہ محترم کی شکل میں تشریف لائیں گے۔ اس لئے یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ ہم اس ہال کے دروازے استقبال کرنے کی بجائے دارالوزارت کے صدر دروازے پر انہیں خوش آمدید کہیں۔ خلیفہ کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ قصر خلافت سے وزیراعظم کے استقبال کے لئے آئے۔ وزیراعظم نے انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے اپنے دفتر کے باہر بھی قدم نہیں نکالے۔ اس بات کو سب نے سراہا۔

صلاح الدین کو اک دم خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ”ہماری آج کی محفل ختم ہو رہی ہے کہ خلیفہ کی آمد کی اطلاع ملی۔ اب پتہ نہیں کہ وہ آئیں گے بھی کہ نہیں اور آئیں کس وقت اگر آپ لوگ رخصت ہوتے ہیں اور خلیفہ اتفاقہ آجاتے ہیں تو پھر آپ کو فوری طور پر کس طرح اطلاع دی جاسکے گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ لوگ اس عین کھانا تناول فرمائیں۔ کھانے کا وقت بھی ہو گیا ہے اور قصر خلافت ہے اب تک مزید خبر نہیں آئی۔“

سب نے وزیراعظم کی دعوت طعام قبول کر لی۔ فوراً کھانا چن دیا گیا اور سب یہاں سے اٹھ کے کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ زرق برق لباس میں غلام ادھر ادھر رہے تھے یا ہاتھ باندھے حکم کے منتظر تھے۔ جب سب لوگ دسترخوان پر بیٹھ گئے تو الدین نے ”بسم اللہ“ کی صدا بلند کی اور تمام امیر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

☆

کھانا ختم ہوا تھا اور سلیغوں میں ہاتھ دھوئے جا رہے تھے کہ ادھر سے دھول کی آوازیں سنائی دیں۔ سب کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے حیران نظروں سے دوسرے کو دیکھا۔ صلاح الدین بھی حیران ہو رہا تھا کہ اس کا وہی غلام پھر حاضر ہوا اور کسی تکلیف کے صلاح الدین کے پاس پہنچ کے بولا۔

”آقا کے بلند اقبال۔ فاطمی خلیفہ محترم قصر خلافت سے دارالوزارت آنے کے سوار ہو چکے ہیں۔ امکان ہے کہ وہ ایک بڑے جلوس کی صورت میں دارالوزارت آئیں گے۔“

سب ہکا بکا رہ گئے۔ ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کچھ دیر سب پر بھی بے

ماری رہی پھر صلاح الدین نے سنبھل کر کہا۔ ”معزز امرا اور حاضرین خلیفہ محترم کے استقبال کے لئے صدر دروازے پر تشریف لے چلے۔“
فقیر عینی نے سوال کیا۔ ”کیا وزیراعظم کو یقین ہے کہ خلیفہ واقعی دارالوزارت ہی تشریف لارہے ہیں؟“

صلاح الدین نے جواب دینے کے بجائے اپنے غلام کی طرف دیکھا۔ اس نے سر جھکا کر بلند آواز میں کہا۔ ”خلیفہ محترم نے شاہی گاڑی پر سوار ہوتے ہوئے اعلان فرمایا تھا کہ وہ دارالوزارت تشریف لے جا رہے ہیں۔“

اس بات کی تصدیق کی ضرورت اس وجہ سے نہ محسوس ہوئی کہ دھول اور تاشوں کی آوازیں دارالوزارت تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ سب کے کان آوازوں پر لگ گئے اور صلاح الدین کو مصر کا فتنہ پرواز وزیراعظم ملک شادور یاد آگیا۔ مرے ہوئے انسان کو برے نام سے یاد نہیں کرنا چاہیے مگر بعض لوگ اس قدر بدنام ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد بھی وہ اکثر یاد آجاتے ہیں۔ صلاح الدین کو ملک شادور اس وجہ سے یاد آیا کہ جب ملک شادور اور صلاح الدین لہرائیوں کو شکست قاش دے کر قاہرہ میں داخل ہوا اور فاطمی خلیفہ نے لشکر کی پذیرائی بھی کی تو بھی ملک شادور اپنے آپ کو وزیراعظم ہی سمجھتا رہا۔ اس نے مصر کو لہرائیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ شاہی لشکر کو گھیر کے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا یہ تو شیرکوہ کی دور اندیشی تھی کہ وہ لہرائیوں اور مصریوں کا محاصرہ زور دہش واپس ہو گیا۔

یہ سب کچھ کیا دھرا ملک شادور کا تھا لیکن وہ اس قدر بدنیت اور بے ضمیر تھا کہ جب شیرکوہ دوسری مرتبہ فاتحانہ مصر میں داخل ہوا تو وہ پہلے جیسے دھوم دھڑکے کے ساتھ شیرکوہ کو مبارکباد دینے گیا۔ صرف ایک ہی بار نہیں بلکہ وہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ بدزبانہ شیرکوہ کی خدمت میں سلام کرنے حاضر ہوتا۔ اسے ذرا بھی شرم نہ آتی تھی کہ اس شخص کے سامنے تو نہ جائے جسے اس نے فریب سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس ایسے عالم ہوتا تھا کہ جہاں دن چڑھا۔ اس نے جلوس کا حکم دیا۔ آگے آگے جنڈے۔ نارسے۔ بوق و قرنا بجتے ہوئے اس کے پیچھے محافظوں کے مسلح دستے اور درمیان میں ملک نادر اس کو فرسے گھوڑے پر سوار چلا تھا جیسے وہ دولہا ہے اور باقی سب براتی۔

صلاح الدین کے کان میں جو آوازیں آرہی تھیں یہ بالکل ویسے ہی تھاردوں اور بوق قرنا کی آوازیں تھیں۔ صلاح الدین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”بے شک یہ فاطمی خلیفہ ا جلوس ہے۔ ہم سب کو ان کا استقبال دارالوزارت کے صدر دروازے پر کرنا ہے آپ

لوگ میرے ساتھ آئے۔“

صلاح الدین نے قدم اٹھائے تو تمام امرا اس کے ساتھ ہو گئے۔ دارالوزارت پہلے ہی شور مچ گیا تھا کہ خلیفہ معظم تشریف لا رہے ہیں۔ غلام اور کنیزیں روزانہ تبدیل کرتے تھے پھر بھی بعض کنیزوں نے فوراً دوسرے جوڑے بدل لئے۔ پھر وہ سب اور سلیقے سے راستے کے دونوں طرف ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں دروازے پر پہنچے ہی جلوس سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ جلوس کیا تھا یوں معلوم ہوتا ہے پورا قاہرہ الٹ آیا ہے۔ قاہرہ والوں نے کئی سال سے اپنے خلیفہ کا جو ان کا سب سے مذہبی پیشوا بھی تھا، دیدار نہیں کیا تھا۔ انہیں جو خبر ملی فاطمی خلیفہ کملی گاڑی میں دارالوزارت جا رہا ہے تو وہ سڑکوں پر اٹھ آئے۔

جلوس کا وہی انداز تھا جو ملک شاد اختیار کرتا تھا۔ آگے آگے باجے گاجے۔ بو قربا، دھول تاشے اس کے پیچھے محافظہ دتے۔ پہلے یہ محافظہ سوڈانی حبشی ہوتے تھے اب کی جگہ سفید قام محافظوں نے لے لی تھی۔ محافظوں کے پیچھے ایک کملی گاڑی میں سائے طرف پورے شاہی لباس میں خلیفہ بیٹھا تھا۔ خلیفہ کے سامنے کی نشست پر جو ہر استاد مجلس بن عبدالوی بیٹھے تھے۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک اور بند شاہی گاڑی تھی جس خلیفہ کی سب سے محبوب بیوی سوار تھیں۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ آخر خلیفہ صلاح الدین ملاقات کے لئے آئے تھے تو انہیں اپنے ساتھ کسی خاتون کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ حال یہ عقدہ جلوس کے دارالوزارت پہنچنے کے بعد کھلا۔ ان دونوں گاڑیوں کے دائیں بائیں اور پشت کی طرف بھی مسلح سپردار سوار چل رہے تھے۔

”آج خلیفہ بے نقاب ہیں اور عام دیدار دے رہے ہیں۔“ یہ آواز ہر طرف بلند اور مصری ایک دوسرے کو دھکے دیتے۔ قطاریں توڑتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دارالوزارت کے سامنے کا پورا میدان سیرھیوں تک ضعیف العقیدہ دیدار کرنے والے سے بھرا تھا۔ فاطمی علماء کے ایک گروہ نے مشہور کیا تھا کہ جس نے زندگی میں ایک بار خلیفہ وقت کی صورت دیکھ لی اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ دوسرے گروہ بات پھیلانی تھی کہ جس پر فاطمی خلیفہ کی نظر پڑ جائے گی وہ بلا حساب کتاب جنت میں جا گا۔ اس طرح کے مختلف نعروں سے ہر جہت نے اپنی دکان سجا رکھی تھی۔

نقاہوں اور قزموں کے شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور میدان میں بڑھتا جا رہا تھا جسے مسلح سوار بڑی مشکل سے سنبھال رہے تھے اور لوگوں کے درمیان رہا بنا رہے تھے کہ جلوس دارالوزارت تک پہنچ سکے۔ صلاح الدین اور تمام لوگ دارالوزار

سیرھیوں کے اوپر کھڑے تھے اور دور سے آتے جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ فاطمی خلیفہ کا راقم ختم ہونے کے باوجود لوگ اسے دیکھنے کو ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ یہ ام کا خلیفہ کے ساتھ محبت کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔ جلوس جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا عوام نے راستے دینے کے لئے خود سینٹے جا رہے تھے باقی کام سواروں کے سپرد تھا وہ گھوڑے والے چھوٹے راستے کو بڑا کر رہے تھے۔

دونوں شاہی گاڑیاں دارالوزارت کی سیرھیوں کے نیچے پہنچیں اور صلاح الدین اپنے نعروں کو لے کے سیرھیوں کے نیچے اتر آیا۔ خلیفہ کملی گاڑی میں اپنے دونوں مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی صلاح الدین نے آگے بڑھ کے خلیفہ کو تعظیم پیش کی۔ نہ کی رنگت زرد ہو رہی تھی لیکن وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو ہر استاد مجلس بن عبدالقوی نے خلیفہ کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ نیچے اور سیرھیوں پر قیمت قالینوں کا فرش تھا۔

خلیفہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے وزیر اعظم بہت مصروف ہیں اس لئے ان خود ان سے ملاقات کے لئے آگئے۔“

”یہ خلیفہ محترم کی عین بندہ نوازی ہے۔“ صلاح الدین نے خوشدلی سے کہا۔ ”آپ نے قدم رنجہ فرما کر غلام پر حدودِ کرم فرمایا ہے۔“

”وزیر اعظم“ خلیفہ نے بڑی محبت سے کہا۔ ”ہمارے مصاحب تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم بہت مصروف رہتے ہو۔ ہم تمہاری خدمات سے بہت شکر ہیں۔“ پھر انہیں جیسے خیال آیا۔ بولے۔ ”وزیر اعظم۔ اس بند گاڑی میں تمہارے خلیفہ کی آمد ہے۔ اسے عزت سے اتروا کے اندر لے چلو۔“

”ابھی حکم کی تعمیل ہوتی ہے خلیفہ محترم۔“ صلاح الدین نے جواب دیا۔ ”آپ عوام کو اپنے دیدار سے سرفراز فرمائیے تاکہ یہ اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں۔“

خلیفہ کی سمجھ میں آگیا۔ وہ سیرھیاں چڑھ کے اوپر پہنچا اور ہاتھ ہلا کر لوگوں کو خاموش لیا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”خلیفہ اور خلافت کے پرستاروں۔ اپنے خلیفہ کو جی بھر کے دیکھ لو۔ شاید پھر یہ موقع نہ ملے۔ دیکھو اگر مصر کی سلامتی اور خوشحالی چاہتے ہو تو وزیر اعظم کا ہاتھ نہ چھوڑنا۔ یہی تمہارا نجات دہندہ اور ہمدرد ہے۔“

خلیفہ کی آواز دھیمی تھی لیکن خلیفہ کے ہاتھ ہلانے سے پورے مجمعے پر سناٹا چھا گیا تھا اور اس کی آواز دور تک سنی جا رہی تھی۔ خلیفہ خاموش ہوا تو عوام نے اس کے حق میں نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے میدان خالی ہو گیا۔

صلاح الدین نے حکم دیا۔ "شہابی خواتین کو احترام سے اتروا کر زناخانہ میں جائے۔"

کنیزیں قہیل حکم کے لئے بند گاڑی کی طرف دوڑ پڑیں۔

فاطمی خلیفہ عاصم نے بڑی سے کہا۔ "ہماری آبدو کو زناخانہ میں بھیجنے کے بجائے کمرے میں پہنچایا جائے جہاں وزیر اعظم سے ہماری گفتگو ہوگی۔"

خلیفہ نے صلاح الدین کو تذبذب میں دیکھا تو کہا۔ "وزیر اعظم کو اس میں کیا ذمہ داری ہو رہی ہے۔ یہ ہماری خواہش ہے۔"

"خلیفہ محترم کی خواہش کا ضرور احترام ہو گا۔" صلاح الدین نے فوراً جواب دیا۔

"ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ ہم تھکنے میں گفتگو کریں۔" خلیفہ کی بات پر صلاح الدین لاپرواہ ہوا۔ خلیفہ نے لجاجت سے کہا۔ "وزیر اعظم۔ شاید یہ ہماری آخری ہو گئی اس لئے ہماری ہر خواہش کی تعمیل کا حکم دیا جائے۔"

صلاح الدین نے اسی وقت تمام امرا اور دیگر اراکین سلطنت کو رخصت کر دیا کامل تحلیلہ کا حکم دیا۔ امراء نوریہ نے خلیفہ کی باتیں خود سنی تھیں۔ وہ خاموشی سے گئے۔ صلاح الدین خلیفہ کو لے کر اس کمرے میں آ بیٹھا جہاں اسے گفتگو کرنا تھی۔ کے دماغ میں سخت الجھن تھی۔ آخر خلیفہ اس گفتگو میں جو بقول اس کے آخری گفتگو ایک خاتون کو کیوں شامل کرنا چاہتا ہے۔ صلاح الدین نہ تو آدم ہزار تھا اور نہ ا عورتوں سے نفرت تھی لیکن اس نے بچپن سے جوانی تک نہایت سادہ پروقار اور متفہ جیسی زندگی گزاری تھی۔ اس وقت اس کی عمر تیس اکتیس سال ہو رہی تھی۔ یہ عمر زیادہ نہیں اور اسے جوانی کا عالم ہی کہا جائے گا لیکن صلاح الدین نے اقتدار حاصل کر کے باوجود آج تک سوائے اپنی منکوحہ بیوی کے اور کسی طرف نظر نہیں اٹھائی تھی۔

صلاح الدین کی پوری زندگی پر نظر ڈالی جائے تو بس اس میں کوئی ایکٹنل نہیں یوں یورپین مورخوں نے اس کی ذات پر بڑی رومانوی انداز میں کچھ اچھالنے کی کوشش ہے۔ یہاں تک کہ ایک مورخ افسانہ نگار نے صلاح الدین اور شہنشاہ انگلستان رچرڈ والدہ کے عشق پر کئی ناول بھی تصنیف کر ڈالے ہیں لیکن ان کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ صلاح الدین کی چھپن سالہ زندگی سنجیدہ بہادر اور پاکباز انسان کی زندگی ہے۔ کئی ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے سامنے حسین ترین خواتین کے مقدمے پیش ہوئے لیکن اس قدم کبھی نہ ہیکے اس نے پوری عمر کسی غیر عورت کی طرف بد نظر سے نہیں دیکھا۔

صلاح الدین اور خلیفہ جس کمرے میں بیٹھے تھے وہاں بالکل تحلیلہ تھا بلکہ اس کے

دور دور تک کوئی کنیز یا غلام نظر نہ آتا تھا۔ اسی عالم میں اس خاتون کو خلیفہ کے پاس لایا گیا جسے وہ اپنی "آبدو" کہہ رہا تھا۔ آنے والی کا لباس سیاہ ریشمی کپڑے کا تھا جس پر سونے کام کیا ہوا تھا اور چہرے پر ایک رومال اس طرح لپٹا ہوا تھا جس سے صرف اس کی روشن اور چمکدار آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس خاتون نے بغیر تعارف ہوئے جگہ کے بڑے ادب سے صلاح الدین کو سلام کیا۔ اس کی اس حرکت پر خلیفہ مسکرا دیا۔

"در شہوار۔ نقاب اتار دو۔ وزیر اعظم سے پردے کی ضرورت نہیں۔"

خلیفہ نے اس کے تعارف کا آغاز کیا۔ پھر وہ پلٹ کے صلاح الدین سے بولا۔ "وزیر اعظم در شہوار ہماری عزیز ترین ملکہ ہیں۔ اس بات سے تم ضرور حیران ہو گے کہ ہم انہیں یہاں کیوں لائے اور تمہارے سامنے ان کا نقاب کیوں اتروایا ہے؟"

"خلیفہ محترم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔" صلاح الدین نے ساٹا لہجہ میں کہا۔ "اگر کوئی اہم ضرورت تھی تو مجھے قصر خلافت طلب کر لیا ہوتا تاکہ کسی کو یہاں لانے کی زحمت نہ گوارہ کرنا پڑتی۔"

"خیر اس کی وجہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔" خلیفہ نے کہا۔ "سب سے پہلے ہم تمہیں دیاط میں کامیابی کی مبارک باد دیتے ہیں۔ نصرانی ایک عرصہ سے مصر سے خراج وصول کر رہے تھے نئی وزارت نے مصر کو اس ذلت سے نجات دلائی۔ اب نصرانی مصر پر پورے قبضہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ دیاط کا محاصرہ اسی کا شاخسانہ تھا۔"

"خلیفہ محترم نے درست فرمایا۔" صلاح الدین نے جواب دیا۔ "خلیفہ محترم کو شاید علم ہو کہ اب تک صرف یروشلیم کا نصرانی شاہ ایمارک مصر پر حملہ آور ہوتا تھا لیکن دیاط کا محاصرہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ شاہ ایمارک نے مصر کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد یورپ کے تمام درباروں میں اپنے سفیر بھیجے تھے اور ان سے تثلیث اور عیسائیت کے نام پر فوجی مدد طلب کی تھی۔ ہسپانیہ اور مقلید نے اپنے فوجی روانہ کر دیئے تھے۔ مشرقی رومی شہنشاہ نے بھی دو سو سے زیادہ جہاز بھیجنے کا وعدہ کیا تھا لیکن شاہ یروشلیم بیرونی طاقت پر ایسا پھولا کہ اس نے رومی شہنشاہ کے بحری بیڑے کا انتظار بھی نہ کیا اور دیاط پہنچ گیا بہر حال خدائے جل شانہ نے مصر پر اپنا کرم کیا اور رومی شہنشاہ کے بھیجے ہوئے دو سو جہازیں جہاز بھی محاصرہ کرنے والوں کو کوئی خاص مدد نہ کر سکے۔"

"ہاں وزیر اعظم ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم نے دریائے نیل کی دیاط شاخ پر پانی کے اندر آہنی نیچیوں کا ایسا جال بچھا دیا تھا کہ رومی جہاز محاصرہ کرنے والوں کی مدد نہ کر سکے۔" خلیفہ نے اس بات کو بڑی شان سے بتایا شاید یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ملکی حالات سے

دکونہ پہنچ سکے۔“

”خدا تمہیں دراز عمر دے اور تم مصر کی اس طرح خدمت کرتے رہو۔“ خلیفہ نے صلاح الدین کو دعا دی پھر درشوار کی طرف دیکھ کے کہا۔ ”وزیر اعظم۔ یہ ہماری محبوب ملکہ درشوار ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے دن بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ گو کہ موت برحق ہے لیکن انسان اگر عمر طبعی کو پہنچ کے انتقال کرے تو اس کا صدمہ متعلقین کو کم ہوتا ہے پھر ابھی تو ہماری عمر کا پھول اچھی کھل بھی نہ پایا تھا کہ اس پر خزاں غالب آگئی

ملاح نے خلیفہ کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ”خلیفہ محترم۔ آپ اس قدر مایوسی کی باتیں نہ کیجئے۔“

”وزیر اعظم۔ یہ مایوسی یا کم ہمتی کی باتیں نہیں۔“ خلیفہ نے بڑے حوصلے سے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے خود بیماریوں کو دعوت دی اور اپنی موت کو پکارا ہے لیکن کسی نے آج تک حقیقت میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ نہ ہم نے بیماریوں کو دعوت دی اور نہ موت کو پکارا ہے بلکہ مفاد پرستوں نے ہماری کمسنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیماریوں کو ہماری طرف دھکیل دیا۔ موت کو ہمارے قریب کر دیا۔ ہمیں شراب کباب اور شباب کی آب جو میں غوطے دیئے گئے۔ ہم جب ابھرتے تو ہمیں دوبارہ غوطہ دے دیا جاتا۔ ہمیں جب ہوش آتا تو پھر شراب میں منڈایا جاتا پھر جب ہم نے اپنی جوانی اور جوانی کی طاقتوں کو کھودیا تو ہم پر عیاشی کا الزام لگایا گیا۔ مگر کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ ہمیں عیاش کس نے بنایا۔۔۔۔۔۔“ پھر خلیفہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

صلاح الدین نے محسوس کیا کہ اتنی باتیں کرنے سے خلیفہ بت تھک گیا ہے اور ضعف کی وجہ سے کانپ رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”آپ اب گفتگو نہ فرمائیے خلیفہ محترم آپ بت تھکے نظر آ رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ بیماری بڑھ جائے۔“

”وزیر اعظم۔ تمہارا شکریہ کہ تمہیں ہماری بیماری کا احساس ہوا۔“ خلیفہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ ہمارے کانوں میں یہی آوازیں آتی ہیں کہ امیر المومنین بالکل تندرست ہیں۔ جوان ہیں چہرہ شگفتہ ہے۔ ذرا کسمندی ہے جو دو چار روز میں ختم ہو جائے گی۔ سنا تم نے۔ یہ ہیں ہمارے مشیروں اور وفاداروں کی باتیں حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ جانتے ہیں کہ ہم ہوا کی دوش پر اڑ رہے ہیں۔ طوفانی لہروں میں بہہ رہے یا پھر کانڈی ناؤ پر سوار ہیں جو کسی وقت الٹ سکتی ہے“

صلاح الدین نے اسے پھر روکا۔ ”محترم خلیفہ مصر۔ میری درخواست ہے کہ آپ زیادہ

پوری طرح باخبر رہتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خلیفہ اگر چاہتا تو ملک کی چھوٹی بڑی ہر خبر سے باخبر رہ سکتا تھا اسے ایسی باتوں کے سننے کی کب فرصت تھی۔ پہلے وہ تمام اوقات خوبصورت کینزوں اور نئی تحفہ میں آئی ہوئی دو شیرازوں کے ناز نخرے میں الجھا رہتا تھا پھر جب بیمار ہوا تو پھر یہ سب بہ مشکل ہی سے اٹھ سکتا تھا۔ اسے خبریں ملنے کا ذریعہ صرف اس کے دو مصاحب : استاد اور جلیس بن عبدالقوی تھے جو اس وقت بھی خلیفہ کے ساتھ تھے لیکن صلاح ال نے ان پر ہی نہیں بلکہ قصر خلافت کے تمام غلاموں اور کینزوں پر پابندی عائد کر دی تھی خلیفہ کو کسی ایسی بات کی خبر نہ دی جائے جس سے اس کی بیماری بڑھ جائے کا امکان سوائے ان خبروں کے جس سے خلیفہ کو خوشی اور مسرت حاصل ہو۔ محلات پر صلاح ال کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ ہر ایک خود کو غلام الالدین کا غلام سمجھتا تھا اور اس وفاداری ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔

صلاح الدین نے مصر اور قاہرہ میں بہت سی تہذیبیاں کی تھیں۔ مصری جاگیرداروں دور دراز علاقوں میں بھیج دیا گیا تھا تاکہ خلیفہ کے ہمدردوں کی قاہرہ میں تعداد گھٹ کر ہونے کے برابر رہ جائے۔ شرکو تال۔ قاضی شر۔ داروغہ محلات۔ وزیر خزانہ اور تمام عہدوں پر مصریوں کے بجائے شامی یا پھر صلاح الدین کے اعتماد کے لوگ مقرر کئے گئے تھے۔ اس نے فاطمیوں کے کئی محلات کو شافعی عقیدہ کے اسکولوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سوائے جلس عبد القوی اور جوہر استاد کے خلیفہ کے حلقہ میں اور کوئی پرانا نمک خوار باقی رہ گیا تھا خلیفہ کے یہ دونوں مصاحب بظاہر خلیفہ کے وفادار تھے لیکن وہ دراصل وزراء کے لئے خلیفہ کی جاسوسی کرتے تھے۔ انہوں نے خلیفہ کو اب تک یہ بہ بتایا تھا کہ قاہرہ پورے ملک مصر کا عقیدہ آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہا تھا۔

صلاح الدین نے شاید اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔ ”خليفة محترم ملکی حالات۔ اس قدر باخبر رہتے ہیں اس کا مجھے علم نہ تھا۔ جہاں تک رومی جہازوں کو روکنے کی حکمہ عملی کا تعلق ہے تو وہ مجھے بروقت سوچھی تھی۔ دیاط دریا طے نیل کی جس شاخ پر آباد ہے ایک جگہ بہت تنگ ہو گئی ہے۔ دیاط آنے والے جہازوں کو اس تنگ شاخ سے گزر ضروری تھا۔ میں نے وہاں پانی کے نیچے اس کنارے سے اس کنارے تک ایک موٹی زنج لگوا دی اور اس میں جگہ جگہ کانٹے لگوا دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جہاز اس نیلی سے گزرنے کی کوشش کرتا وہ کسی نہ کسی کانٹے میں الجھ جاتا۔ صرف چار گھنٹے میں اسے جہاز کانٹوں میں پھنس گئے کہ دریائی راستہ بند ہو گیا اور رومی جہاز محاصرہ کرنے والوں

منگلو نہ کیجئے۔ آپ حکم دیجئے کہ آپ کی کیا خواہش ہے۔ ان خاتون کے لئے میں کر سکتا ہوں؟“

☆
درشوار کو طبیب اعظم کے پاس امانت رکھا گیا تھا۔ جس طرح خلیفہ کو اپنے اوپر اعتماد تھا اسی طرح وہ کسی دوسرے پر بھی اعتماد نہ کرتا تھا۔ درشوار کے جانے کے چار پانچ روز تو خلیفہ نے واقعی آنکھیں نہ کھولیں۔ قصر خلافت کی کینڑوں اور غلاموں کو خلیفہ کے نہ بچنے کی کوئی پرواہ نہ تھی اس لئے کہ وہ خلیفہ کے پرانے ملازم نہ تھے۔ صلاح الدین تمام قدیم ملازمین کو یا تو برخاست کر دیا تھا یا پھر دوسرے محلات میں بھیج دیا تھا اور اپنی سے اور اپنے اعتماد کے غلاموں اور کینڑوں اور پرہ داروں کو قصر خلافت کے اندر باہر رکھا تھا۔ خلیفہ کو بھی اپنے پرانے ملازمین سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے کہ خدمت تو نہ کرتے لیکن اصل میں نوکر داروغہ محلات کے ہوتے تھے۔ پس جب جو تمس خلافت تخت اٹھا اور پرانے ملازموں کو ہٹا کر نئے ملازم رکھے گئے تو خلیفہ کو اس تبدیلی پر نہ تو تعجب ہوا اور نہ افسوس اس کے لئے نئے اور پرانے دونوں ہی برابر تھے۔

تقر خلافت سے در شہوار کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ایک شام خلیفہ نے اچانک
میں کھول دیں۔ اور کسی کو خوشی ہوئی ہو یا ہوئی ہو مگر خلیفہ کے دونوں مصاحب جن کی
یاں اور زندگیاں خلیفہ کی زندگی سے وابستہ تھیں۔ ان کے چہرے مسرت سے دمک
ہے۔ جب سے خلیفہ کی بیماری میں شدت پیدا ہوئی تھی جو ہر استاد اور جلیس بن عبد القوی
اپنے گھر جانا چھوڑ دیا تھا خلیفہ نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ تقر خلافت کے مہمان
میں رہا کریں مگر اس وقت ان مصاحبین کو خلیفہ کی زیادہ پروا نہ تھی اس لئے وہ ٹال
تھے لیکن اب تو وہ پوری طرح خلیفہ سے وابستہ تھے اور رات دن اس کی خدمت میں
رہتے تھے۔ خلیفہ کو بھی ان کی خدمات کا اعتراف تھا اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب
ما موقع ملا وہ صلاح الدین سے ان دونوں کی سفارش کریں گے۔ اس دن خلیفہ معہ
شہوار کے وزیر اعظم سے ملنے جانے لگا تو جو ہر استاد اور جلیس بن عبد القوی نے ہاتھ باندھ
یاں سے عرض کیا تھا کہ وہ وزیر اعظم سے ان کے بارے میں ضرور ذکر کریں۔

جلیس بن عبدالقوی نے تو درشوار سے گڑگڑا کے درخواست کی تھی۔ ”یلم عالیہ
مہ جب امیر المؤمنین، وزیر اعظم سے گفتگو فرما رہے ہوں تو آپ انہیں یاد دلا دیجئے گا کہ

”اس کے علاوہ کوئی اور حکم؟“ صلاح الدین نے پوچھا۔
 ”مصر کو اپنا ملک اور وطن سمجھنا اور رعیت سے محبت کرنا۔“ خلیفہ نے شاید خلوص
 سے کہا کیونکہ وہ تو اپنی رعیت کی خدمت کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔
 ”آپ کچھ دیر آرام فرمائیے خلیفہ محترم۔“ صلاح الدین نے پیش کش کی۔
 ”نہیں وزیر اعظم۔ ہم جس کام کے لئے آئے تھے وہ پورے ہو گئے۔ اب ہم واپس
 جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے خلیفہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔
 اب درشہوار کے جسم میں بھی جیسے جان پڑ گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور خلیفہ کو

”عالیہ محترمہ۔“ جوہر استاد نے فوراً ایک نیا خطاب ایجاد کیا۔ ”غلام تو آپ کے اشارے پر اپنی کھال کے جوتے بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ آپ حکم تو دیجئے۔“

”جوہر استاد۔ میں کس قدر بد نصیب ہوں کہ کسی ہمدرد سے کھل کے بھی بات نہیں کر سکتی۔“ درشمار نے جوہر استاد کو متاثر کرنے کے لئے اپنے لہجہ میں رقت پیدا کی۔

جوہر استاد خود ہی درشمار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ ذرا اور کھلے۔

”عالیہ محترمہ آپ خلیفہ کی طرف سے بالکل اطمینان رکھئے میں قصر خلافت کے تمام معاملات سنبھال لوں گا۔ آپ باہر کی فکر کیجئے۔“

درشمار نے جوہر استاد کو غور سے دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”جوہر استاد پہلیاں نہ بچاؤ جو کہتا ہے واضح الفاظ میں کہو۔ میری طرف سے مطمئن رہو۔ مجھ سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔“

”عالیہ محترمہ۔“ جوہر استاد نے گلا صاف کیا۔ ”اگر آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ میں اور آپ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اس لئے کہ ہم دونوں کا مفاد صرف ایک ہستی سے وابستہ ہے اور وہ ہستی امیر المومنین فاطمی خلیفہ العاضد کی ہے۔“

”یہ بات آپ نے ٹھیک کہی جوہر استاد۔“ درشمار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”لیکن ہم اور کبھی کیا سکتے ہیں۔ اور کون سارا دے سکتا ہے ہمیں؟“

”عالیہ محترمہ۔“ جوہر استاد نے سنبھل کے کہا۔ ”بظاہر آپ مجبور ہیں لیکن قدرت نے آپ کو ایسی خوبیوں اور حسن و جمال سے نوازا ہے کہ جس دروازے کی طرف نظر اٹھائیں گی وہ خود بخود کھل جائے گا۔ مشکل تو میری ہے جو امیر المومنین کی آنکھیں بند ہوتے ہی کنگال ہو جائے گا۔“ اور جوہر استاد نے واقعی موٹے موٹے آنسو بہانا شروع کر دیئے۔

”دل نہ چھوٹا کرو جوہر استاد۔“ درشمار نے اسے تسلی دی۔ ”اگر خدا نے خلیفہ کو اٹھا لیا تو میں یقین دلاتی ہوں کہ جہاں میں جاؤں گی وہاں تم کو بھی لے جاؤں گی۔“

”بہت بہت نوازش ہے آپ کی۔“ جوہر استاد نے شکر کے اظہار کیا۔

”مگر محترمہ عالیہ۔ یہ باتیں وقت پر سوچنے کی نہیں۔ انہیں تو قبل از وقت سوچنا ہوتا ہے۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گی۔ جوہر استاد کس دروازے پر جبہ سائی کرے گا۔ یہ باتیں بھی سے سوچ لینا چاہئے اور ہو سکے تو طے بھی کر لینا چاہئے۔“

”جوہر استاد تم نے مجھے تو مشورہ دے دیا لیکن اپنے لئے کیا کیا ہے تم نے؟“ درشمار نے الٹا سوال کر دیا اپنے ہی لئے تو کر رہا ہوں اب تو میں سب کچھ آپ کے لئے سوچ رہا

امیر المومنین کو اپنے خانہ زادوں کے لئے بھی کچھ کہتا ہے۔“

درشمار خلیفہ سے بہت ناراض تھی۔ وہ طیب اعظم کے پاس آرام سے رہ رہ کر ایک دن خلیفہ نے چند غلاموں، کینڑوں اور جوہر استاد کو طیب اعظم کے گھر پر اسے حکم دیا کہ وہ درشمار کو لے کے فوراً قصر خلافت پہنچے۔ طیب اعظم اور درشمار وہاں کچھ اور ہی گل کھلا رکھے تھے اور بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ درشمار کو نہ بلاوا بہت ناگوار گزرا لیکن خلیفہ ابھی زندہ تھا اور اس کا حکم کم از کم عمائدین سلطنت ضرور چلنا تھا بشرطیکہ اس کا حکم تعلق حکومت کے کسی محکمہ کے بارے میں نہ ہو۔

اعظم نے درشمار کو حالات کو اونچ نیچ سمجھائی اور اسے قصر خلافت جانے پر آمادہ کر لیا اس نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایک بیمار آدمی کے پاس جانے سے یہ بہتر سمجھتی۔ محل کی دیوار پھاند کے جان دے دے۔ یہ گفتگو اگرچہ طیب نے تمناؤں میں کی تھی جمائیدہ جوہر استاد درشمار کا چہرہ دیکھ کر فوراً تازہ کیا تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

جوہر استاد کے دل میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سوائے خلیفہ کی مصاحبت کے انہیں اور کام نہ تھا۔ خلیفہ بھی بیمار تھا۔ خلیفہ جب تک اچھا رہا جوہر استاد اور جلیس بن عبداللہ انعام و اکرام دیتا رہتا تھا مگر اب وہ سلسلہ بھی ختم تھا اور دونوں مصاحبوں کو روٹیوں لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب جوہر استاد کو طیب اعظم اور درشمار کے مابین کچھ میں کالا نظر آیا تو اس نے صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ طیب اعظم کے محل واپسی کے وقت جوہر استاد زبردستی درشمار کی بند گاڑی میں کس کے بیٹھ گیا تھا۔ درشمار اس کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی تھی لیکن وہ یہ سوچ کے خاموش ہو گئی کہ سلطانی میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں پھر کیوں نہ وہ جوہر استاد کی خدمات سے فائدہ اٹھا جوہر استاد سے کبھی اس کی گفتگو تو نہ ہوئی تھی لیکن پردہ بھی نہ تھا۔

بند شاہی گاڑی قصر خلافت کی طرف رواں دواں تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے استاد اور درشمار گفتگو کی خواہش رکھنے کے باوجود خاموش تھے حالانکہ درشمار نے بالکل بے تاثر بنا لیا تھا تا کہ جوہر استاد کو یہ نہ محسوس ہو کہ وہ اس سے ناراض ہے یا جوہر کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کرے۔ آخر اس کا موقعہ خود بخود پیدا ہو گاڑی نے ایک زور کا جھٹکا کھایا اور درشمار اچھل کر جوہر استاد پر آگری۔ جوہر استاد نہایت ادب سے درشمار کو اپنے سے الگ کر کے اس کی نشست پر بٹھا دیا۔

بات درشمار ہی نے شروع کی۔ ”جوہر استاد اگر آپ اس وقت سامنے نہ بیٹھے تو میرا سر ضرور کسی چیز سے ٹکراتا پھر پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔“

”آپ جو کچھ کر رہے ہیں میرا مطلب ہے جو کچھ آپ نے سوچا ہے وہ مناسب تو مگر آپ اس پر قائم رہ سکتی ہوں تو بہت مناسب ہوگا۔“ جوہر استاد نے فوراً جواب دیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیا سوچا ہے؟“ در شہوار مسکراتے ہوئے انسان کے اندازے اکثر غلط ہوتے ہیں۔

”محترمہ عالیہ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا۔ جوہر استاد نے کہا اندازے عام طور پر ہوتے ہیں لیکن دل کی حالت چہرے پر بکھر جائے تو پڑھنے والا غلطی نہیں کرتا۔“ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو جوہر استاد اور در شہوار کو ہوش آیا وہ قصر خلافت پہنچ گئے ہیں جوہر استاد نے فوراً کہا۔ محترمہ عالیہ آپ جس زندہ لاش کے پاس جا رہی ہیں؟

در شہوار نے کچھ جواب دینا چاہا لیکن قصر خلافت کی کینڑوں نے گاڑی کو گھیر لیا جو استاد اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور در شہوار کینڑوں کے جلوس میں خلیفہ کے حصہ پہنچی۔

”تم ہمیں چھوڑ کے کیوں چلی گئی تھیں در شہوار؟“ خلیفہ نے اسے دیکھ کے شکایت کے لیے میں کہا۔ ”ہم صبح سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”امیر المومنین۔ میں آپ سے کب جدا ہونا چاہتی تھی لیکن برا ہو اس منحوس طبیب اعظم کا اس نے مجھے آپ سے الگ ہونے کا حکم دیا اور آپ مان گئے۔“ در شہوار۔ مصنوعی افسردگی سے کہا

”ہاں ہاں ان دونوں ہماری طبیعت کچھ ایسی ہی تھی خلیفہ نے پیار سے کہا۔ تم انہیں کہیں کہ پھر ادھر کا رخ ہی نہ کیا کیا ہمیں بالکل بھول گئیں تھیں؟

”کیا فرماتے ہیں امیر المومنین۔“ در شہوار نے لیے میں محبت کی پوری توانائیاں بھری دیں۔ وہاں تو مجھے کسی پہلو چین نہ ملتا تھا لیکن روزی اطلاع ملتی تھی کہ دشمنوں کی طبیعت ٹھیک نہیں آج جب جوہر استاد نے اطلاع دی کہ آپ بالکل صحت یاب ہیں اور چہرہ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہے تو نہ پوچھئے کہ کتنی مسرت ہوئی۔ میں۔ لباس میں تبدیل نہیں کیا جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح کے اٹھ چلی آئی۔“

در شہوار صاف جھوٹ بول رہی تھی اس نے ایک گھنٹے تک طبیب اعظم سے بحث کرتے ہوئے اس کے سمجھانے سے قصر خلافت آنے پر آمادہ ہوئی تو اپنی تیاری میں لگ گئی۔ لباس تبدیل کیا مشاطرے بال نبوائے سنگار کئے پھر گاڑی پر سوار ہوئی تھی اور

کا خیال تھا کہ خلیفہ چراغ سحری ہے اس کی بیماری کو شش کے باوجود اسکے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

مگر در شہوار کو اس وقت حیرت ہوئی جب خلیفہ نے ایک کینڑ کو اشارہ کیا اور وہ آداب بالا کر باہر چلی گئی در شہوار یہی سمجھی کہ خلیفہ نے کینڑ کو کمرے سے اس وجہ سے بھیج دیا ہے کہ شاید وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے لیکن خلیفہ نے بالکل خاموشی اختیار کی پھر یہ اموشی اس وقت ٹوٹی جب کمرے سے باہر جانے والی کینڑ واپس آئی اور اس کے پیچھے قاضی لہر آ رہے تھے اس کا دل دھک سے رہ گیا در شہوار نے طبیب اعظم کے ساتھ اپنے شہنشاہ کے کچھ خواب بنے تھے جو قاضی کو دیکھ کر تمام بکھر کر رہ گئے تھے۔

قاضی شہر کو شاید پہلے ہی یہ حکم دے دیا گیا تھا اس لئے انہوں نے آتے ہی در شہوار کو فاطمی خلیفہ العاضد کی رسم متعہ ادا کی اور خلیفہ کو اس کی مبارک باد دی۔ رسم ادا ہوئی، وقت خلیفہ نے کینڑ کو وہاں سے ہٹا دیا اور سوائے ان تین اور کوئی اس رسم کے وقت جود نہ تھا لیکن جو کہا گیا ہے کہ شہنشاہی محلات کی ہوائیں بھی جاسوسی کرتی ہیں اور در و در کے کان رکھتے ہیں تو یہ صورت یہاں بھی پیش آئی۔ قاضی شہر جب رخصت ہوئے تو آکر انہیں معلوم ہوا کہ جو رسم اس قدر خاموشی سے ادا کی گئی تھی اس کی خبر ان کے آنے سے پہلے ہی عام ہو چکی تھی۔

طبیب اعظم کے محل سے آنے کے بعد یا یوں کہنا چاہئے کہ در شہوار سے متعہ کے ہفتے بعد خلیفہ العاضد کی طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہوئی طبیب اعظم اب بھی رے دن خلیفہ کی مزاج پر ہی کے لئے آتے تھے لیکن خلیفہ اپنی بیماری کو ان سے چھپاتا در کوئی دوا استعمال نہ کرتا تھا اس دوران طبیب اعظم اور در شہوار کی آنکھیں کئی بار ہوئیں مگر وہ ایک دوسرے سے بالکل اجنبی بنے رہے پھر ایسا ہوا کہ خلیفہ کو غشی کے پڑنے لگے اور پھر جب اس نے خود بھی یہ محسوس کر لیا کہ اب یہ ریت کی دیوار دن قائم نہیں رہ سکتی تو وہ در شہوار کو لے کر وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے دار رت گیا اور اپنی محبوبہ کے مستقبل کے لئے ہر ممکن پیش بندی کرادی۔

فاطمی خلیفہ العاضد نے در شہوار کو صلاح الدین کے سامنے پیش کر کے اس کے لئے ت کا وعدہ تو کر لیا لیکن اپنے لئے نہ کچھ مانگ سکا اور نہ کوئی رعایت حاصل کر سکا اس اپنے لئے مانگنے کی یوں ضرورت محسوس نہ کی کہ اس کے ہر خواہش بغیر کئے پوری تھی اس کے پاس جواہرات کا ایسی قیمتی خزانہ تھا جو کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہوگا پھر صلاح الدین کے پاس تھا بھی کیا جو وہ خلیفہ کو دیتا۔ مصر کی تمام آمدنی ملک

کے اصلاح احوال اور رعیت کی بھلائی پر خرچ ہو جاتی تھی خلیفہ کی ایک خواہش ضرور تھی جسے صرف صلاح الدین پوری کر سکتا تھا اور وہ خواہش تھی اس کے بحیثیت خلیفہ برقرار رہنے کی جو اس کے بغیر کئے اب تک پوری ہو رہی تھی۔

مصر میں جب کوئی وزیر تبدیل ہوتا تو خلیفہ پر کچھ دنوں کے لئے ایک بڑا سخت پڑتا تھا کوئی اس کے اختیارات کم کرنے کی فکر کرتا تو کوئی اس کی بیش بہا دولت کو کرنے کی کوشش میں لگ جاتا تھا لیکن صلاح الدین کے وزیر اعظم ہونے کے بعد اس کے تمام جھگڑوں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ پہلے اسے نجاہ اور اس کے سوڈانی غلاموں کینروں سے جان کا خطرہ رہتا تھا لیکن اب تمام سوڈانی حملات سے نکال دیئے گئے تھے نئے غلام اور کینریں اور محافظ اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ خلیفہ کو یہ معلوم ہو گیا نجاہ اور اس کے بیشتر ہمدردوں کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن خلیفہ نے اس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یہ تبدیلی خوش آئند لگی تھی۔

صلاح الدین اگرچہ تقریباً "اکتیس سال کا ہو چکا تھا اور یہ عمر کاروبار سلطنت چلانے اس زمانہ کے لحاظ سے بہت کم تھی لیکن صلاح الدین نے اپنی ذاتی قابلیت اور کاوش سے اس مصر میں امن و امان قائم کر دیا تھا جہاں امراء علویہ کا سکہ چلتا تھا کی اصل باگ دوڑ ایمارک شاہ یروشلم کے ہاتھ میں رہتی تھی اس نے صرف امراء کا شیرازہ بکھیر دیا تھا بلکہ شاہ یروشلم کو ایسا زوج کیا تھا اس نے چہرہ دست جیشوں کو ملک سے نکال کر شمالی حصے میں بند کر دیا تھا لیکن اسے پھر بھی پوری طرح اطمینان تھا مصر میں اقتدار اعلیٰ اس کے ہاتھ میں تھا لیکن مصر میں فاطمی خلیفہ اور فاطمی خلافت تھی اور جب تک خلیفہ اور خلافت قائم تھی اس وقت تک علویوں کی سازش اور اذخوشہ نظر انداز نہ کیا جاسکتا تھا۔

صلاح الدین نے مصر میں کئی سخت قدم اٹھائے تھے لیکن خلیفہ العاضد کے مدد و نزم پڑ جاتا تھا اس کے ذہن میں خلیفہ کے لئے کئی نرم گوشے موجود تھے خلیفہ کا یا راستہ سے ہٹانا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن جب بھی کوئی ایسا وقت آتا تو خلیفہ پر آجاتا اور وہ اس خیال کو ذہن سے نکال دیتا تھا۔

لیکن کچھ دنوں سے وہ اس معاملہ میں بہت پریشان تھا دنیائے عجم کے ایک مصر تشریف لائے ہوئے تھے ان کے ادارے اگرچہ نیک تھے مگر اس سے کوئی نیا جنم لے سکتا تھا فقیہ صاحب نے بزعم خود صلاح الدین کو اپنے پاس بلوایا تھا تاکہ مسئلہ پر گفتگو ہو سکے صلاح الدین اگرچہ علماء اور فضلاء کی بڑی عزت کرتا تھا لیکن

جاسوسوں نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ دنیا نے عجم کے معروف فقیہ امیر العالم جیشانی مصر اس لئے تشریف لائے ہیں کہ وہ فاطمی خلیفہ کی خلافت ختم کر کے مصر میں بغداد کا عباسی خلافت رائج کریں۔ صلاح الدین کے خیال میں بھی یہ ایک نیک کام تھا کیونکہ وہ خود حنفی عقیدہ کا پابند تھا بغداد سے روز کوئی نہ کوئی عالم قاہرہ پہنچے کے اسے خلافت بدلنے کا مشورہ دیتا جب صلاح الدین اسے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لیتا تو پہلے وہ صلاح الدین سے مودبانہ درخواست کرتا اور جب اس درخواست پر بھی خاموشی اختیار کی جاتی تو وہ صلاح الدین کے خلاف اول فoul بکنے لگتا تھا۔ لطف یہ تھا کہ صلاح الدین ان کے غصے کو بھی پی جاتا تھا اور وہ اپنا منہ پیٹ کر رہ جاتا تھا۔

فقیہ امیر العالم جیشانی کو قاہرہ آئے کئی ہفتے ہو چکے تھے لیکن صلاح الدین ان سے ملاقات سے گریز کر رہا تھا یہ نہیں کہ وہ فاطمی خلافت کا ہمدرد تھا بلکہ اس کی خاموشی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ فاطمی خلیفہ کو اس آخری وقت میں یہ اس کا خیال تھا اتنا بڑا صدمہ نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ سوچ رہا تھا کہ یہ مسئلہ اپنے آپ ہی حل ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے لیکن روز روز کے فقیہ جیشانی کے ملاقات کے تقاضے اسے پریشان کر رہے تھے اسے مہربی در آقا نور الدین زنگی سلطان دمشق نے بھی اس کے پاس پیام بھیجا تھا کہ فاطمی خلافت کا اس قدر جلد فیصلہ ہو جائے اتنا ہی صلاح الدین کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

صلاح الدین نے فقیہ جیشانی کو اب تک ٹالے رکھا تھا لیکن سلطان کے پیہم اصرار نے اسے گھبرا دیا تھا۔ انہی دنوں وہ ایک دن جامعہ سیدنا حسین کے سامنے سے گزر رہا تھا مشہور ہے کہ اس مسجد میں امام حسینؑ کا سر مبارک دفن ہے پہلے یہ دمشق اور عسقلان میں ان رہا۔ وہاں سے ۵۸ھ ہجری میں خلفائے فاطمی مصر لائے اور جامعہ ازہر کے اس مسجد میں مدفون کیا۔ اتفاق سے فقیہ امیر العالم جیشانی بھی جامعہ سیدنا حسین میں آئے تھے وہ جامعہ سے باہر نکل رہے تھے کہ ان کی نظر صلاح الدین پر پڑی صلاح الدین صرف دو محافظ اردوں کے ساتھ ادھر سے جا رہا تھا فقیہ جیشانی نے ایک لمحہ میں فیصلہ کیا اور جھٹ صلاح الدین کے گھوڑے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے صلاح الدین نے فوراً راسیں کھینچ لیں۔ فقیہ محترم کو پہچانتا تو نہ تھا لیکن ان کے لمبے حہ اور لمبی داڑھی کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ضرور کوئی بزرگ ہستی ہیں اور جرات مند بھی کیونکہ مصر کا تو کوئی شخص صلاح الدین کو گروہ روکنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔

صلاح الدین کے سوار فوراً آگے بڑھے لیکن صلاح الدین نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور گھوڑے سے اتر پڑا۔

”بہتر ہے میں حاضر ہوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“

پھر خلافت پر وہ وقت آیا کہ اس کی عسکری قوت ختم ہو گئی اور خلیفہ مسلمانوں کا آیا۔

اسی وقت صلاح الدین ہال میں داخل ہوا۔ چونکہ صلاح الدین وزیر اعظم تھا اس لئے اس کی نشست نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے امراء سے قدرے بلند تھی۔ اس بلند جگہ پر اس صلاح الدین بیٹھا تھا، بالکل اسی طرح کا قالین کا فرش تھا جیسا دوسرے لوگوں کے لئے لگایا گیا تھا۔ وزیر اعظم کے احترام میں تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور وقت تک کھڑے رہے جب تک صلاح الدین اپنی جگہ بیٹھ نہ گیا۔ اس کے ساتھ تمام اس کی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

صلاح الدین کا غلام خاص گھنٹوں کے بل اس کے شانہ کے ساتھ لگ کر بیٹھا اور روشیوں میں وزیر اعظم سے کچھ کہا۔ صلاح الدین کو شاید غلام کی کسی بات ناگوار گزری۔ اس کا چہرہ فوری طور پر متغیر ہو گیا اور اس نے تقریباً چیخ کے حکم دیا۔

”پیش کرو اس غلام کو۔“

صلاح الدین نے اتنے غصے یا تیز آواز میں حکم دیا تھا کہ تمام درباری جیسے چونک گئے۔ سب کا خیال فوراً حریم خلافت سے آنے والے غلام کی طرف گیا اور وہ تمام دے ختم ہو گئے جو ان کے ذہنوں میں کلبلا رہے تھے۔ خدا نخواستہ اگر غلام کوئی خبر بد لایا تا تو صلاح الدین کو اس وقت غصہ کیوں آتا۔ اس کا مطلب تھا کہ حریم خلافت سے کوئی اطلاع آئی ہے۔

صلاح الدین کا غلام تیزی سے باہر گیا اور لمحوں میں حریم خلافت کے غلام کو لے کر ہن آگیا۔ غلام نے ادب سے صلاح الدین کو سلام کیا جیسے اس نے سر کی جنبش سے ل کیا اور اس کے ساتھ ہی شیر کی طرح گر جا۔

”تم کس کے غلام ہو؟“

حریم خلافت کا غلام لرز اٹھا مگر فوراً ہی سنبھل کے بولا۔۔۔ ”عالی مقام وزیر اعظم۔ خلافت کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔“ اس نے ادب سے وضاحت کی۔

”تم خلیفہ کی خدمت پر مامور ہو پھر کسی دوسرے کا پیغام لے کے کیوں آئے؟“ صلاح الدین کے لہجے میں تنبیہ اب بھی پہلے جیسی تھی۔

اس مرتبہ غلام نے جرات کا ثبوت دیا۔ ”غلام کی غلطی معاف فرمائی جائے لیکن جس نے مجھے خلافت کی خدمت پر مامور کیا گیا اس وقت خلیفہ محترم کنیزوں اور غلاموں کی اہانت میں حریم خلافت میں تہا رہتے تھے لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ خلافت کے تہا اب محترمہ عالیہ درشمار بھی حریم خلافت میں نہ صرف شب بسر کرتی ہیں بلکہ شب و روزیں قیام فرماتی ہیں اس لئے خلافت کی خدمت کے ساتھ میں نے محترمہ عالیہ کی

مذہبی پیشوا بن کر رہ گیا۔ اس خلافت پر ایک دور یہ بھی آیا کہ اس میں بیک وقت دو خلیفہ ہونے لگے۔ ایک خلیفہ جو بغداد میں رہتا تھا عباسی کہلاتا۔ اس خلیفہ کو تمام فقہ حنفیہ وار اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے تھے دوسرا خلیفہ مصر کے صدر مقام قاہرہ میں تھا جسے فاطمی خلیفہ کہا۔ اور فقہ جعفریہ کے تمام لوگ اسے اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ ان خلیفہوں کے نام کے خطبہ میں شامل ہوتے تھے۔ اس وقت مصر میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا اور وہاں کا سرکاری مذہب فقہ جعفریہ پر کاربند تھا۔ چنانچہ فقیہ امیر العالم جستانی مصر واسطے تشریف لائے تھے کہ مصر کی تمام مساجد کے خطبہ میں فاطمی خلیفہ العاضد کے بجا بغداد کے عباسی خلیفہ المستنقی باللہ کا نام جاری کیا جائے۔

یہ مجلس مشورت اس غرض کے لئے اکٹھا ہوئی تھی کہ اس مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکالی جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی بھی نہ ٹوٹے۔ تمام امراء آپہنچے اب صرف صلاح الدین کے آنے کا انتظار تھا۔ فقیہ جستانی کو دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت گیا تھا تاکہ اس دوران صلاح الدین امرائے نوریہ سے صلاح و مشورہ کر سکے۔ جس اجلاس میں زیادہ لوگوں کی شرکت کا امکان ہوتا اس کا انتظام دارالوزارت کے بڑے ہال میں جاتا تھا۔ یہ مجلس اسی بڑے ہال میں لگئی تھی۔ آخر صلاح الدین کا خاص غلام ہال داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ صلاح الدین کی نشست کی دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا۔ اس کے آسے تمام امراء چونکے ہو گئے۔ غلام کی آمد اس بات کی دلیل تھی کہ صلاح الدین محل برآمد ہونے والا ہے۔ تمام لوگ موڈب ہو گئے اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔

یہ وقت صلاح الدین کے آنے کا تھا لیکن اس کے بجائے حریم خلافت کا ایک غلام میں آیا اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور آہستہ قدم چلتا صلاح الدین کے پاس پہنچا۔ حریم خلافت سے آنے والا غلام بھی وہ خاص غلام تھا جو خلیفہ کی خدمت خاص پر مامور تھا۔ صلاح الدین کے غلام نے ایک قدم آگے بڑھ کے اس کا استقبال کہ دونوں میں آہستہ آہستہ کچھ گفتگو ہوئی اور آنے والا غلام جس انداز سے اندر آیا تھا طرح واپس چلا گیا۔ حریم خلافت کے غلام کی آمد سے لوگوں میں تجسس پیدا ہو گیا کہ خلیفہ کی صحت کے بارے میں ان دنوں مختلف قسم کی افواہیں اڑتی رہتی تھیں۔ خام فاطمی خلیفہ کا وہ متعہ جو اس نے بیماری کے دوران درشمار سے کیا تھا۔ اس کے درباری امراء کے لئے خلیفہ کا معد اپنی محبوبہ کے دارلوزارت آنا اور خلیفہ کا درشمار لئے مراعات کی درخواست کرنا بھی ایک اہم موضوع بنا ہوا تھا جس میں اہمیت کم اور کا پہلو کچھ زیادہ ہی تھا۔

اعظم ہونے کی وجہ سے خلیفہ محترم سے لے کر ایک دربان تک کے حالات سے باخبر رہتا ہے انہوں نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ ہم خلیفہ کی بگڑتی حالت سے واقف نہیں۔ ہمیں خلیفہ کی زندگی ان سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ آئندہ ہمیں یاد دلانے کی کوشش نہ کی جائے۔“

غلام نے صلاح الدین کی بات غور سے سنی پھر سر جھکائے باہر چلا گیا۔ مجلس کا ماحول بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ درباری اس معاملے میں صلاح الدین کے ہمنوا تھے۔ امراء نوریہ بعض معاملات میں اس کی مخالفت کرتے مگر جہاں تک صلاح الدین کے کردار کا معاملہ تھا تو وہ اسے انتہائی متقی اور پرہیز گار سمجھتے تھے۔ انہیں بھی درشوار کا ایک فضول پیغام بھیجنا اچھا نہ لگا۔ آخر وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ کہیں اس نے صلاح الدین کو بھی خلیفہ العاضد کی طرح حسن پرست اور دل پھینک تو نہیں سمجھا کہ اس طور رابطہ سے اس سے تعلقات بدھانے کی کوشش شروع کر دی۔ بہر حال اگر بہ نکتہ روز اول باند (بی) کو پہلے ہی روز مارنا چاہتے) کے مصداق صلاح الدین نے اسے پہلے ہی پیغام پر ڈانٹ دیا اور یہ اس ڈانٹ کا اثر تھا کہ درشوار نے اپنی کئی جائز ضرورت کے لئے بھی وزیر اعظم کو اطلاع نہ دی۔

صلاح الدین نے درشوار کے پیام بر کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا مگر اب اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں خلیفہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو جس کی اطلاع اسے کل رات ملی تھی۔ وہ خلیفہ کی طرف سے بے خبر نہ تھا۔ صبح دوپہر اور شام تینوں وقت اسے خلیفہ کی حالت سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ ان اطلاعات سے اسے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ خلیفہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے اور یہی بات درشوار نے کہلوائی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ خلیفہ سے مخلص ہو اور خلیفہ کی محبت اسے وزیر اعظم کو اطلاع دینے اور مزید بہتر علاج کی درخواست کرنے پر مجبور کیا ہو۔

حاضرین مجلس بھی اسی کی طرح خاموش تھے۔ شاید وہ بھی درشوار ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ درشوار نے وزیر اعظم کو پیغام بھیج کے اس کی توہین کی ہو یا پھر اس نے صلاح الدین کو اپنے حسن کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی ہو۔ بات کچھ بھی ہو لیکن محفل کا رنگ بڑا گنہگار اور انتہائی سنجیدہ تھا۔ یہ حالت معلوم نہیں کب تک قائم رہتی کہ فقیہ امیر العالم جیشانی کے آنے کی اطلاع ملی۔ صلاح الدین نے انہیں فوراً بلا لیا۔ یہ مجلس مشورت انہی سے گفتگو کے لئے منعقد کی گئی تھی۔

امیر العالم فقیہ جیشانی سے ان کے اعلیٰ مذہبی مرتبہ کی وجہ سے صلاح الدین نے اپنے

خدمت بھی اپنے اوپر فرض کر لی۔ اس وقت محترمہ عالیہ کا پیغام وزیر اعظم کے پاس کے آتا میرے اسی فرض منصبی کا ایک حصہ ہے۔ غلام امید کرتا ہے کہ اس کی غلطی درج فرمائی جائے گی۔“

”بے شک تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ ہمیں اس کی خوشی ہے۔“ صلاح الدین نے کے اقدام کو سراہا۔ ”لیکن اس خیال سے کہ تم سے یہ نامناسب فرض پھر نہ ادا ہو سکے تمہیں خلیفہ کی خدمات سے سبکدوش کرتے ہیں۔ کل سے تم اپنے آپ کو ہماری خدمت مامور سمجھنا۔“

”محترم اعلیٰ۔“ غلام نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس قدر دانی اور عزت افزائی لئے وزیر اعظم کا شکر گزار ہوں۔“

صلاح الدین اس کی طرف سے منہ گھما کر درباری امراء کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لہجے میں کہا۔ ”آپ حضرات یقیناً یہ سننا پسند کریں گے کہ فاطمی خلیفہ کی نئی پسند درج نے ہمیں وہ کون سا پیغام بھیجا ہے جس سے ہمارے لہجے میں تلخی آگئی۔“

پھر صلاح الدین نے بغیر جواب کا انتظار کئے کہنا شروع کیا۔ ”درشوار نے اس کے ذریعے یہ پیغام بھیجا ہے کہ فاطمی خلیفہ نے گزشتہ دو دن سے آنکھ بند نہیں کی اس کے معالج کا معقول انتظام کیا جائے۔ سنا آپ نے۔ ہمیں حکم دیا جا رہا ہے۔ جس کی خلیفہ نے خود کبھی کوشش کی۔ وہ درشوار کہلا رہی ہے۔“

”یہ وزیر اعظم مصر کی توہین ہے۔“ امراء نوریہ سے ایک نے کہا۔ حرم خلافت کے غلام نے دخل دینے کی ہمت کی۔ ”قابل احترام وزیر اعظم۔ معاف فرمایا جائے اس لئے کہ میں محترمہ عالیہ کا پیغام صحیح طور پر بیان نہیں کر سکا۔“ عالیہ نے دراصل وزیر اعظم مصر کو خلیفہ کی حالت غیر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ درخواست کی تھی خلیفہ کے علاج کے لئے حکما اور اطباء کا ایک بورڈ بٹھایا جائے تاکہ ان کے ام کی صحیح تشخیص ہو اور معقول علاج ہو سکے۔“

”ٹھیک ہے لیکن درشوار کی درخواست پر اس لئے غور نہیں کیا جا سکتا کہ خلیفہ کے سب سے بڑے حکیم یعنی طبیب اعظم مصر کے مشورہ کے تحت ہو رہا۔ ہم اس معاملہ میں کوئی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔“ اس ساتھ ہی صلاح الدین نے رخ دوسری طرف کر لیا۔

پیغام لانے والا غلام دل شکستہ سا واپس جانے کے لئے مڑا۔ اسی وقت صلاح الدین نے مڑ کر اسے روکا۔ ”ٹھہرو۔۔۔ اپنی محترمہ عالیہ سے کہہ دینا کہ صلاح الدین ملک کا

امیر العالم فقیہ جشانی نے قاہرہ کے بیشتر امراء جو تمام کے تمام امراء نوریہ :-

خطیب و پیش امام اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن فقیہ جنبانی صورت و شکل سے بھی مسمیٰ اور پرہیزگار معلوم ہوتے تھے۔ خطیب نے انہیں قدرے تعجب سے دیکھا پھر ادب سے

اب تو کسی انکار کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وزیر اعظم مصر کا نام سن کے خطیب کو بھی نہ آیا تھا۔ ”بسم اللہ۔۔۔ آپ تو ضرور خطبہ پڑھئے۔ اعتراض کرنے کی کس میں ہمت۔۔۔“ خطیب نے نرمی سے کہا پھر موزن کو اذان دینے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چارہ خطیب کو بزرگ سے گفتگو میں مصروف دیکھ کر رک گیا تھا۔

خطیب و پیش امام کے اشارہ پر خطبہ کی اذان ہوئی۔ امیر العالم فقیہ جشانی نے اذان ہوتے ہی منبر پر قبضہ کر لیا اور خطبہ شروع کر دیا۔ نمازی چونکہ خطیب کی آواز سے نا اور مانوس تھے وہ ایک غیر مانوس آواز سن کر کچھ متعجب ہوئے۔ انہوں نے گردن اٹھا منبر کی طرف دیکھا۔ ایک نیا خطیب خطبہ پڑھ رہا تھا اور پرانا خطیب اگلی صف میں بیٹھا کا خطبہ غور سے سن رہا تھا۔ وہ بھی مطمئن ہو کے خطبہ سننے لگے مگر اس وقت وہ ضرور نئے جب خطیب نے خطبہ میں خلیفہ العاصد کے بجائے خلیفہ المستنسی کا نام پڑھا۔ خطبہ درمیان میں کوئی یوں بھی بول سکتا تھا۔ پھر جب خطبہ کے بعد جماعت کھڑی ہوئی اور یہ پڑھنے والے بزرگ ہی نے نماز پڑھانا شروع کر دی تو پھر نہ کسی کو اعتراض ہوا اور نہ

نماز کے بعد نمازیوں میں کچھ دیر چہ میگوئیاں ضرور ہوئیں لیکن جب انہیں یہ بتایا گیا فاطمی خلیفہ العاصد کا نام نکال کے عباسی خلیفہ المستنسی کا نام وزیر اعظم مصر سلطان قی اور خود خلیفہ بغداد کے حکم پر شامل کیا گیا ہے تو وہ مطمئن اور پرسکون ہو کر اپنے رول کے چلے گئے۔

مصر میں جو مذہبی انقلاب آیا تھا اس کی کسی نے مخالفت نہ کی۔ مصری عوام صلاح الدین کی طرف اس قدر راغب تھے کہ ان کے دل میں عقیدہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ مصر پر اب صلاح الدین جیسا مضبوط انسان ہی حکمرانی کر سکتا ہے۔ اس اعتقاد کی ایک وجہ گزشتہ مائ کی غزہ اور المیت پر صلاح الدین کی یورش تھی۔ یہ کامیاب یورش دمیاط کے سرے کے دوسرے سال یعنی 1170ء میں ہوئی تھی۔

دراصل دمیاط میں لہرائیوں کی شکست نے صلاح الدین کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ انے لہرائیوں کو گھبرانے اور پریشان کرنے کے لئے یروشلم کی سلطنت کی سرحدی چوکی ایازانہ پر حملہ کر دیا۔ یہ فلسطین کی سب سے جنوبی شہری حکومت تھی۔ یہ شہر ذاتہ قدیم سے بت سے تجارتی راستوں کا نقطہ اتصال تھا۔ 1480ء قبل مسیح میں جب تیونس نے اپر فوج کشی کی تو اس شہر میں اس کی لشکر گاہ تھی۔ پھر 720 قبل مسیح میں سرعون دوم نے اس پر قبضہ کیا۔ 332 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر

دریافت کیا۔ ”بزرگ برادر۔ میں نے آپ کو اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ کیا آپ اپنا تعارف کرانے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے؟“

”خطیب جامعہ۔ میرا نام امیر العالم فقیہ جشانی ہے۔ میں قاہرہ میں نو وارد ہوں۔ فقیر نے بھی اسی ادب سے جواب دیا۔

”سمان اللہ۔“ کہہ کر خطیب نے فقیر کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ”آپ کی آمد مصر کے لئے مبارک ہے۔ آپ خطبہ بھی عطا فرمائیے بلکہ آج کی نماز جمعہ بھی آپ ہی پڑھائیں گے۔“

”شکریہ خطیب محترم۔“ فقیر جشانی بھی خوش ہو گئے کہ خطبہ پڑھنے کی اجازت انسانی سے مل گئی۔

خطیب نے اسی وقت سوال کیا۔ ”فقیر اعظم۔ میں اس جامعہ کا قدیم خطیب و پیش امام ہوں۔ آپ ضرور خطبہ ارشاد فرمائیے لیکن کم از کم یہ تو فرمائیے کہ آج کا خطبہ پڑھنے کا آپ کو کس نے حکم دیا ہے؟“

”خطیب معظم۔ میں علمائے عجم کا نمائندہ ہوں۔ انہوں نے مجھے خطبہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔“ فقیر جشانی نے بڑے رعب سے کہا۔

خطیب نے کوئی اعتراض تو نہ کیا لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ فقیر کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہے۔ فقیر نے اسے مطمئن کرنے کے لئے وضاحت کی۔ ”آپ فکر نہ کیجئے خطیب معظم۔ اس جامعہ میں آج خطبہ پڑھنے کا حکم مجھے خلیفہ بغداد المستنسی عباسی نے بھی دیا ہے اور میں ان کے حکم کی تعمیل کے لئے بغداد سے قاہرہ پہنچا ہوں۔“

”بجا فرمایا۔ درست فرمایا۔“ خطیب نے سر ہلایا مگر وہ یوں سر ہلا رہا تھا کہ اس کا دل مطمئن نہیں ہے۔

آپ ابھی مطمئن نہیں معلوم ہوتے ہیں خطیب محترم؟“ فقیر کو آخر سوال کرنا ہی پڑا۔

”یہ بات نہیں ہے فقیر اعظم۔“ خطیب نے گھبرائے لہجہ میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس اہم فیصلہ کی اطلاع مصر کے وزیر اعظم کو ضرور ہوگی۔؟“

”کیوں نہیں۔۔۔“ فقیر نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ”اس کی خبر صرف سپہ سالار افواج شام امیر صلاح الدین کو ہی نہیں بلکہ اس اہم خطبہ کا حکم مجھے سلطان دمشق نور الدین زنگی نے بھی دیا ہے۔ میں نے آج کے خطبہ کی اجازت وزیر اعظم مصر سے براہ راست حاصل کی ہے۔“

رائیں۔ یہ کشتیاں کئی حصوں میں ہوتی تھیں۔ انہیں الگ الگ اونٹوں پر لا کر بحر قلم
بحر لایا گیا جہاں انہیں جوڑ کر مکمل کشتیاں تیار کی گئیں۔ یہ کشتیاں جہازوں کی طرح بھاری
بھرم تھیں۔ ایلات پر صلاح الدین نے بری اور بحری دونوں سمتوں سے حملہ کیا۔ دشمن
(فراری) اس حملہ کی تاب نہ لا سکے اور صلاح الدین کا ایلات پر قبضہ ہو گیا۔

ایلات پر قبضہ اور غازہ کی تباہی ایسے واقعات تھے جس کے سبب صلاح الدین نے
مصر میں کادل موہ لیا۔ وہ صلاح الدین سے اس قدر متاثر ہوئے کہ باوجود اپنی تمام مخالفتوں
کے جنگ کے موقع پر کیا قطانی اور کیا سوڈانی، تمام لوگ اس کے لشکر میں شامل ہو کر
دشمن کا مقابلہ کرتے تھے یہ اور بات ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر اکثر لوگ پھر صلاح الدین
کے خلاف ہو جاتے اور اس کی جڑیں کاٹنے کی فکر کرتے تھے۔

ان حالات میں قاہرہ کی تبدیلی کا عوام پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے خطبہ میں خلیفہ
العاضد کے نام کے بجائے خلیفہ المستنصر کا نام سنا ایک لمحے کے لئے چونکے لیکن کوئی رد عمل
ظاہر نہ کیا۔ صلاح الدین کو عوام کے مزاج کا حال کا اندازہ تھا اس لئے اس نے بھی پس و
پیش کا راستہ چھوڑ کے جرات مندانہ قدم اٹھایا اور حکم جاری کیا کہ -----

”مصر کے تمام خطیبوں پر فرض ہے کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں عباسی خلیفہ المستنصر
المرشد کا نام جاری کریں۔“

اس مکننامہ سے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ پھر بھی صلاح الدین کو فاطمی
خلیفہ کا اس قدر لحاظ تھا یا اس کے جذبہ ترمیم نے اسے مجبور کیا کہ اس نے داروغہ
محلات ہما الدین قراقوش کو بلا کر حکم دیا۔

”خبردار۔ خلیفہ العاضد کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان کا نام خطبہ سے خارج کر دیا گیا
ہے۔ اگر ان کی زندگی باقی ہے اور وہ صحت یاب ہو گئے تو کبھی نہ کبھی انہیں اس تبدیلی کا
علم ہو جائے گا لیکن کم از کم میں یہ نہیں چاہتا کہ خلیفہ کو بیماری کی اس حالت میں یہ معلوم
ہو کہ ان کا نام خطبہ سے خارج کیا گیا ہے۔ ان کی پرسکون موت میں تلخی نہ گھلنی
چاہئے۔“

طیب اعظم یعنی خلیفہ کے معالج کو اندازہ ہو گیا تھا کہ خلیفہ صرف چند دن کا مسمان
ہے۔ پچھلے کئی دن سے خلیفہ نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ درشوار بہت تھوڑے دن طیب
اعظم کی پرہیزی میں رہی تھی لیکن اس مختصر عرصہ میں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب
آگئے تھے۔ طیب اعظم ادھیڑ عمر کا انسان تھا۔ کہتے ہیں کہ مرد بوڑھا نہیں ہوتا اور اگر مرد
قسمت سے حکیم اور طیب ہو تو پھر سونے پر سناہ۔ ہر چند کہ طیب اعظم جوانی کی حدیں

قبضہ کیا تھا۔ یہ بد نصیب شہر کئی بادشاہوں، رومیوں، یودیوں، اور عربوں کے ہاتھوں تارا
ہوا۔ صلیبی جنگوں میں بھی اسے کافی اہمیت حاصل رہی۔ 1799ء میں اس اہم شہر
نپولین بونا پارٹ نے فتح کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں یہاں تین جنگیں ہوئی تھیں۔

غزہ یا غازہ پہنچنے سے پہلے صلاح الدین کو داروم کے قلعہ سے نمٹنا پڑا۔ یہ
ریمارک کا ایک مضبوط قلعہ تھا اور غازہ کی حفاظت کرتا تھا۔ قلعہ کی حفاظت نصرانی ہمارو
کے سپرد تھی جو تمبلرز اور ہاسپٹلز کہلاتے تھے۔ صلاح الدین نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو قا
داروم نے بڑی ہمارو کا ثبوت دیا اور کئی روز تک صلاح الدین کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ ا
عرصہ میں شاہ ریمارک کو اطلاع پہنچ گئی اور وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ قلعہ داروم کی
کے لئے پہنچ گیا۔ صلاح الدین جو اپنی جنگی حکمت عملیوں کے لئے مشہور ہو چکا تھا اس۔
اس محاصرہ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے راتوں رات خیمے ڈیرے اکھاڑے اور حماء
چھوڑ کر غازہ چل پڑا۔

صبح کو جب قلعہ داروم نے فصیلوں سے جھانک کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ ان
کچھ میں نہ آ رہا تھا کہ صلاح الدین رات میں کدھر چلا گیا۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا جب
غازہ کے شہری بے سروسامانی کے عالم میں قلعہ داروم کے سامنے جمع ہونا شروع ہوئے ا
انہوں نے بتایا کہ غازہ پر صلاح الدین کا قبضہ ہو چکا ہے اور اس کا لشکر داروم کے قلعہ
طرف واپس آ رہا ہے۔ قلعہ والے اس خبر سے اس قدر گھبرائے کہ انہوں نے ان پریشا
حال لوگوں کے لئے قلعہ کے دروازے نہیں کھولے۔ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کب
صلاح الدین کا لشکر وہاں پہنچے ان کے ساتھ ہی قلعہ میں داخل نہ ہو جائے۔ اس حما
اور بے دردی کا یہ نتیجہ ہوا کہ صلاح الدین کے لشکر کے تعقب کرنے والے دستے قد
تک پہنچ گئے اور انہوں نے ان بھاگ کے آنے والوں کو قتل کر دیا لیکن قلعہ والوں۔
ان کی ذرا بھی مدد نہ کی۔

صلاح الدین کا مقصد قبضہ کرنا نہ تھا۔ دشمن کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ اس نے پورے
علاقہ کو تاخت و تاراج کیا واپس چلا گیا۔ اسی سال کے آخر میں صلاح الدین نے ایلات
ایلات بحر قلم (بحر احمر) کی تلح عتیہ کی ایک مشہور بندر گاہ ہے۔ حاجی مکہ و مدینہ جا
کے لئے اس بندر گاہ کو استعمال کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے اس کی ایک مذہبی اہمیت
تھی وہ یہ کہ عہد قدیم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بحری بیڑہ اسی جگہ سے روانہ
تھا۔ ایلات بندر گاہ تھی اس لئے اس پر قبضہ کے لئے بحری طاقت کی بھی ضرورت تھی
صلاح الدین نے اس مشکل پر قابو پانے کے لئے قاہرہ میں بڑی بڑی فولڈنگ کشتیاں تیا

یہ اس کے عشق ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ درشمار کو زیادہ دن اپنے سے جدا نہ رکھ سکا اور با اعظم کے منع کرنے کے باوجود اسے واپس بلوا لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے درشمار متعہ کیا اور شب عروسی کا بھی انتظام کر ڈالا۔ پھر یہ شب عروسی کئی راتوں پر محیط ہو گئی اس دن ختم ہوئی جب اس کے ہاتھ پیروں نے تقریباً "جواب دے دیا۔ شاید یہ درشمار حسن کا کرشمہ تھا کہ خلیفہ اسے لے کر دارالوزارت گیا اور صلاح الدین سے اس کے مراعات حاصل کیں۔

ظاہر میں تو درشمار کا طوطی بول رہا تھا۔ خلیفہ جب بھی بیماری کی غفلت سے چونکتا تو پہلے درشمار کو پوچھتا۔ درشمار کو معلوم تھا کہ یہ چراغ سحری کسی وقت گل ہو ہے پھر بھی وہ خلیفہ کو اس عالم میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے دن کا چین اور رات نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ ایک سونے کے پنجرے میں قید تھی جہاں پھر پھڑا بھی نہیں سکتی اس قید سے اسے اسی وقت رہائی مل سکتی تھی جب خلیفہ قید حیات سے آزاد ہو۔ شیطان نے اسے کئی بار بھکاریا کہ اسے نادان جب تیری رہائی خلیفہ کی موت سے ہے تو پھر اس موت کو قریب لا کر خلیفہ کو اپنے راستے سے بیش کے لئے کیوں نہیں تا لیکن درشمار شیطان کی اس آواز پر کان دھرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتی تھی۔ وہ سلسلہ پر ایک لمحہ کے لئے بھی سوچتی تو اس کا دل فوراً "جواب دیتا کہ ایسی نادانی ہرگز نہ درنہ اس محل کے در و دیوار تیرے خلاف گواہی دیں گے اور تو نے طیب اعظم کے سارے کابوت جو اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے وہ بھی چور چور ہو کر رہ جائے گا۔ طیب اعظم نے اس سے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

درشمار میرے دروازے تمہارے لئے اس وقت کھل جائیں گے جب تمہارا سہارا جائے گا۔"

یہ سارا خلیفہ کی زندگی تھی۔ طیب اعظم کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ خلیفہ کی اہم درشمار کو نہیں اپنا سکتا ہاں اگر یہ سارا ختم ہو جائے تو اس کے دروازے اور پر کھل جائیں گے لیکن اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ درشمار اپنے سہارے کو خود رکے اس کے پاس آجائے۔ اگر خدا نخواستہ درشمار ایسی نادانی کی حرکت کرتی تو اسے کے لئے کوئی آگے نہ آتا۔ طیب اعظم اس کے قریب آنے کے بجائے اس سے کچھ دور ہو جاتا۔ ان خیالوں نے اسے ایک گناہ کبیرہ سے بچائے رکھا تھا۔ طیب اعظم جانتا تھا کہ اگر اس نے درشمار کو اس بات کا مشورہ دیا تو درشمار کے ساتھ ساتھ بھی اس قتل کا الزام آجائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب طیب اعظم خلیفہ کو دیکھنے آتا

پار کر چکا تھا لیکن درشمار کی چند روزہ قہمت نے اسے پھر سے جوان کر دیا تھا۔ درشمار نے بھی بہت چالاک تھی۔ طیب کا زیادہ وقت درشمار کی حویلی میں گزرتا۔ اکثر رات کو ہم وہ اسی حویلی میں ٹھہر جاتا لیکن درشمار اتنی قہمت کے باوجود اپنے اور طیب اعظم درمیان ایک حد رکھی تھی اک خاص فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس نے طیب کو یقین دلایا تھا کہ اس کی دوسری پسند طیب اعظم ہی ہوگا یعنی خلیفہ کی وفات کی صورت میں درشمار کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈنے کے بجائے اسی حویلی میں بیش کے لئے اٹھ آئے گی

درشمار نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کے کیا تھا۔ اسے بھی علم تھا کہ خلیفہ کوئی دن مہمان ہے۔ یہ ضرور تھا کہ خلیفہ نے اسے دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا اور اس وقت وہ خلیفہ کی عزیز ترین محبوبہ تھی۔ لیکن خلیفہ کے بعد اس کا کیا حشر ہو گا۔ اس بارے میں اس کا ذہن پہلے تو نہ صاف تھا لیکن طیب اعظم نے اپنے مفاد کے خاطر خلیفہ کے بعد کا نقشہ کچھ ایسے انداز سے کھینچا تھا کہ درشمار کانپ اٹھی تھی۔ طیب نے کچھ زیادہ غلط بھی نہ کہا تھا۔ ہار اس کے کہنے کا انداز ضرور غلط تھا۔ خلیفہ العاصد کی چار نو بیابا بیویاں تھیں۔ جس میں سے ایک تو محلہ رائے خلافت کے داروغہ ضرغام کی بیٹی تھی۔ ضرغام پہلے داروغہ محلات تھا پھر مصر کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اس نے اپنے دوست ملک شاور گورنر ملید سے دغا بازی کی تھی۔ ملک شاور بھی ایک ہی فتنہ تھا۔ ضرغام سے شکست کھا کر وہ دمشق پہنچا اور شامی فوجوں کی مدد سے ضرغام کو نہ صرف وزارت سے نکالا بلکہ اسے صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ اس کی ایک لڑکی سے خلیفہ نے شادی کی تھی۔ ضرغام یعنی اس کا خسر تو مرچکا تھا لیکن اس کی بیگم کا شامی محلات میں بڑا رعب داب تھا۔ باقی تین بیویاں چونکہ باقاعدہ نکاحی بیابا تھیں اس لئے وہ بھی بڑے رعب سے رہتی تھیں۔

فاطمی خلیفہ کی چار نکاحی بیویوں کے علاوہ حرم خلافت میں بے شمار خوب صورت عورتیں اور بھی تھیں جن میں سے بہت سے عورتوں سے خلیفہ نے متعہ کیا تھا اور باقی وہ تھیں جو اصل میں کنیزیں تھیں لیکن خلیفہ کی منظور نظر ہونے کی وجہ سے ان کا شمار کنیزوں میں نہ ہوتا تھا اور کنیز ہوتے ہوئے بھی انہیں ایک غلام اور ایک ایک کنیز کی خدمات کی سہولت حاصل تھی۔ اسی طرح کی ایک کنیز درشمار بھی تھی لیکن فاطمی خلیفہ نے اس سے متعہ کر کے اس کا مرتبہ بھی بیگمات سے بھی بڑھا دیا تھا۔ خلیفہ اگرچہ بیس ایکس سال ہی کا تھا لیکن اس نے اس جوانی کو جوانی میں ہی برباد کر کے بڑھاپے کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ خلیفہ نے درشمار سے بوڑھے کا عشق کیا ہے تو کچھ غلط نہ ہو گا۔

تو کثیر کے ذریعہ درشمار کو خلیفہ کی خواب گاہ سے پہلے ہی ہوا دیتا تاکہ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو۔ درشمار کو اس کی یہ بات پہلے تو سخت ناگوار گزری تھی اور طیب اعظم کی طرزِ نامید بھی ہو گئی تھی لیکن ایک شب اس نے خلیفہ کے پاس جاتے ہوئے درشمار راہداری میں بلوایا تھا۔

درشمار راہداری میں کھڑی طیب اعظم کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ طیب اعظم اپنے کمنے کے مطابق راہداری میں آیا۔ اس نے درشمار کو مرمرین ستون کے سارے کو دیکھا لیکن اس کے پاس سے اس طرح گزر گیا جیسے ہوا کا جھونکا کہ ادھر سے آیا اور ادھر چلا گیا مگر ہوا کے جھونکے کی طرح درشمار کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک سرگوشی ضرور کی تھی۔

”درشمار میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مگر خبردار کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔“

اس سرگوشی نے درشمار کے حوصلوں میں جان ڈال دی تھی اور وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھانے کے بجائے ایک تابعدار بیوی کی طرح خلیفہ کی خدمت میں حاضر رہتی حالانکہ اس خدمت اور حاضری میں نہ تو خلوص تھا اور نہ محبت بلکہ وہ تو ہر گھڑی اس ڈراے احتیاط کی دعا مانگا کرتی تھی۔

مگر جب حرمِ خلافت کے شہستانوں، راہداریوں اور روشوں پر یہ افواہ گردش کرنے لگا کہ فاطمی خلیفہ کو خلافت کے عہدے سے برطرف کر کے خطبہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ المستنسی کا نام شامل کر دیا گیا تو درشمار گھبرا گئی اور اس پر ایک نامعلوم خوف سے لٹاری ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنی کثیر خاص کو بھیج کے طیب اعظم کو بلوایا۔

طیب اعظم اس دزدیدہ نظری اور مصلحت آمیز گریز سے پریشان تھا۔ اگر اس درشمار کو دور ہی دور سے دیکھا ہوتا تو شاید اس پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوتا لیکن درشمار کی حویلی میں چند روز گزار آئی تھی۔ لوگ تو صرف چند لمحوں کی ملاقات کو نظروں اور اذنیوں میں بٹھا کر زندگی گزار دیتے ہیں یہاں چند روز مسلسل طیب اعظم، درشمار کے قریب رہے تھے۔ ان کا دن اور رات کا بیشتر وقت اس کے پاس گزرتا تھا۔ سنجیدہ، غیر سنجیدہ اور دل باتیں ہوتی تھیں۔ طیب اعظم نے کچھ وعدے بھی کر ڈالے تھے پھر بھلا وہ درشمار حسین و جمیل ہستی کی جدائی سے بے قرار نہ ہوتے یہ کیسے ممکن تھا۔ خلیفہ نے درشمار ان کی حویلی سے واپس بلایا تو طیب اعظم کے سینے پر جیسے آگے چل گئے یا یوں کہنا چاہیے وہ جگر کو پکڑ کر رہ گئے مگر خلیفہ کا حکم تھا۔ فاطمی خلیفہ لاکھ بے دست و پا تھا لیکن تھا تو آخلفہ طیب اعظم نہ تو درشمار کو روک سکے اور نہ خلیفہ کا کچھ بگاڑ سکے۔

درشمار کے طیب اعظم کی حویلی سے آنے کے بعد کیا حال ہوا اس بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں اپنے حال سے بے حال ہو گئے۔ درشمار کو اپنے مستقبل کا جو مضبوط سارا ملا تھا وہ اس کے ہاتھ سے نکلتا معلوم ہوا اور طیب اعظم کو اس وقت کی ایک عظیم مایوسی قہر حاصل ہوئی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ خلیفہ نے زندگی کا آخری سنبھالا لیا تھا اس لئے طیب اعظم ان کے پاس جاتے تو بہت محتاط رہتے۔ خلیفہ نے درشمار کو خود ہی طیب اعظم کے گھر بھیجا تھا اس لئے ان دونوں کے درمیان پردہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن جس وقت طیب خلیفہ کے پاس ہوتا تو درشمار اس سے اس ذریعہ کی پیش آتی جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے ہی نہ ہوں۔ طیب اعظم بھی اتنی احتیاط برتا اور اگر دونوں کی نظریں اتفاقیہ چار ہو جاتیں تو گھبرا کر نظریں نیچی کر لیتے۔

طیب اعظم کے لئے درشمار کا بلاوا کسی مرثوہ جانفزا سے کم نہ تھا۔ اس نے تمام احتیاطوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور فوراً بن سنور کر چلنے پر آمادہ ہوا۔ درشمار کو حقیقت میں طیب اعظم سے نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ محبت۔ وہ تو ایک مجبور محسن کی طرح طیب اعظم کی شخصیت سے دلچسپی لینے لگی تھی۔ اسے اپنا تاریک مستقبل صاف نظر آ رہا تھا اس وقت تو درشمار ضرور خوش ہوئی تھی جب شاہی غلام نے اسے بتایا تھا کہ اس کا سودا فاطمی خلیفہ العاضد کے لئے کیا گیا ہے۔ یہ ایک خوش کن تصور تھا پھر جب وہ ایک دن واقعی حرمِ خلافت کی چکا چوند کر دینے والی روشنیوں میں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ جنت تو اس دنیا میں بھی موجود ہے۔

مگر درشمار کا روشنیوں کا یہ طلسم کدہ اس وقت بحرِ ظلمات میں بدل گیا جب اسے معلوم ہوا کہ خلیفہ ایک ہمیشہ کا بیمار شخص ہے اور اس کے دست و پا میں اتنی توانائی بھی نہیں کہ وہ درشمار کی اندرتی جوانی کو چند لمحوں کے لئے بھی سارا دے سکے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلے ہی روز خلیفہ سے نظریں چرا کر طیب اعظم کی طرف دیکھا تھا۔ بہر حال یہ سب تو پچھلی باتیں تھیں۔ اس وقت تو سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ پہلے فاطمی خلیفہ کا نام خطبہ سے نکالا گیا پھر وزیر اعظم مصر نے اپنے ایک اعلان کے تحت خلیفہ مصر کو خلافت کے عہدہ سے معزول کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا اثر درشمار پر کیا پڑے گا۔ اس کی اس الجھن اور پریشانی کو اس وقت صرف طیب اعظم ہی دور کر سکتا تھا۔

درشمار اپنے خیالوں میں گم بیٹھی تھی کہ اسے طیب اعظم کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ درشمار نے جلدی سے اٹھ کر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا اور بال درست کئے۔ ”طیب اعظم کو برابر کے کمرے میں بٹھاؤ۔“ درشمار نے کثیر سے سرگوشی کی۔

کنیز حکم سن کر باہر کی طرف چلی گئی اور درشوار ایک بغلی دروازے سے گزر کر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے پہنچنے ہی کنیز طیب اعظم کو لے کر آگئی۔ درشوار اس استقبال میں کھڑی ہو گئی۔ کنیز اس کا اشارہ پا کر پہلے ہی باہر چلی گئی تھی۔ طیب اعظم نے ہنچکتی نظر درشوار پر ڈالی۔ ”رخساروں کے گلاب کیوں مرجھا ہیں۔“

”خزاں کا موسم جو چڑھ آیا ہے۔“ درشوار نے شاید جل کر جواب دیا۔ ”ایسے موسم میں پھول پتے کی شاخیں تک مرجھا جاتی ہیں۔“

”نصیب و شمنان مزاج تو اچھے ہیں؟“ طیب اعظم نے اداس ماحول میں مزاح کا پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”کیا طیب اعظم نے خلیفہ کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں سنی؟“ درشوار نے اس خبر کی طرف متوجہ کیا جس کے لئے اسے بلایا گیا تھا۔

طیب اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا لیکن اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ”درشوار مجھے یہ بتانا چاہتی ہیں کہ امیر المومنین، فاطمی خلیفہ مصر العاضد اپنے منطقی انجا پہنچنے والے ہیں؟“

”نہیں طیب اعظم۔“ درشوار چڑ کے بولی۔ ”میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ امیر المومنین اب میرے امیر المومنین نہیں رہے۔“

”درشوار درست فرما رہی ہیں۔“ طیب اعظم نے سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔ ”لیکن شایہ کو یہ بات اس وقت سے معلوم ہے جب پہلی مرتبہ حکومت کا اقتدار مصر کے اعظم کے ہاتھ میں آیا تھا۔ امیر المومنین العاضد اسی دن سے مسلمانوں کے امیر المومنین کے بجائے صرف حرم خلافت کے امیر المومنین ہو گئے تھے۔“

”طیب اعظم۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“ درشوار جھلا اٹھی۔ ”امیر المومنین تو اب امیر المومنین ہیں اور نہ خلیفہ مصر۔ مصری حکومت بغداد کے خلیفہ المستنسی کے اثر چلی گئی ہے۔“

”مگر درشوار کو اس کی فکر کیوں پڑ گئی؟“ طیب اعظم کے لہجے میں بھی تلخی آگئی۔

”میرے لئے؟“ درشوار نے حیرت سے طیب اعظم کو دیکھا۔ ”یہ ہوائی کسی دشمن اڑائی ہوگی۔ اگر میں محفوظ ہوتی یا میرا مستقبل محفوظ نظر آتا تو میں طیب اعظم کو ملا کی تکلیف کیوں دیتی۔“

”درشوار۔“ طیب اعظم بلبلتا اٹھا۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ آپ حکومت سے مراعات حاصل کرنے دارالوزارت گئی تھیں؟“

”یہ صحیح بھی اور غلط بھی۔“ درشوار نے جواب دیا۔ ”صحیح صرف اس حد تک ہے کہ میں دارالوزارت گئی تھی اور غلط اس لئے کہ میں دارالوزارت خود نہیں گئی تھی بلکہ آپ کے امیر المومنین مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جہاں تک مراعات کے حاصل کرنے کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے وزیر اعظم سے کوئی گفتگو نہیں کی اور نہ وزیر اعظم نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھ سے گفتگو فرماتے۔ مراعات کی گفتگو خلیفہ اور وزیر اعظم کے درمیان ہوتی رہی تھی۔“

”آپ اس گفتگو کے وقت موجود ضرور تھیں۔ یہ تو ٹھیک ہے ناں؟“ طیب اعظم نے سے قابل کرنے کی کوشش کی۔

”طیب اعظم۔ آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔ درشوار افسردہ ہو گئی اور اس کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔ ”میں قسم کھاتی ہوں کہ مجھے یہ بھی نہیں یاد کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور کیا طے پایا۔“ درشوار سسکیاں بھرنے لگی۔

طیب اعظم کا دل فوراً پہنچ گیا۔ ”درشوار نے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔“ ہم نے آپ سے کیا کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ آپ نے تو ہمارا دل ہی توڑ دیا۔“

”نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو درشوار۔“ طیب اعظم بھی لعن طعن چھوڑ کر نرم پڑ گیا۔ ”میں نے اسے پکھلا کے رکھ دیا۔“ میں نے پہلے دن جو وعدہ کیا ہے اس پر اب بھی قائم ہوں۔“

”معاف کیجئے طیب اعظم۔“ درشوار خڑے سے بولی۔ ”آپ کی باتوں میں پہلے ان جیسا جوش نہیں ہے۔“

”تم بھی تو اب پہلے دن جیسی نہیں ہو درشوار۔“ طیب اعظم کے منہ سے اک دم نکل گیا۔

طیب اعظم نے درشوار پر اراداً طعنے نہیں کیا تھا لیکن اس کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ درشوار اسے اپنے اوپر طعنے سمجھ بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ طیب اعظم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ایک تو انہیں باتیں کرتے اتنی دیر ہو گئی تھی دوسرے درشوار نے ٹسوے بھانا شروع کر دیے تھے اس کو خوف پیدا ہوا کہ اگر کوئی کنیز اندر آگئی تو اس کی پارسلانی کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں درشوار۔“ طیب اعظم کا انداز ملتجیانہ تھا۔ اگر میری بات

ناگوار گزری ہو تو معاف کر دو۔ میرے دل میں کوئی بدگمانی نہیں۔“

”قسمت بگڑے تو اسی طرح اپنے پرائے ہو جاتے ہیں۔“ درشوار نے حسن ایک اور ادا دکھائی۔

طیب اعظم پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ ”بس بھی کرو درشوار۔ اب میری توبہ اور نہیں کموں گا۔“

درشوار کو بھی وقت کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”اب فرمائیے اعظم کے اس اعلان کا ہم لوگوں پر میرا مطلب ہے کہ شاہی بیگات پر کیا اثر پڑے ہمارا شمار اب شاہی بیگات کی حیثیت سے نہیں ہو گا؟“

طیب اعظم کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”درشوار۔ یہ بتاؤ میں تمہارا مشیر کون ہے۔ کہیں وہ غلام تو نہیں ایسے مشورے نہیں دیتا جو تمہیں غا حضور میں لایا تھا؟“

”نہیں طیب اعظم۔“ درشوار نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”یہ ٹھیک ہے خلافت تک اس نے مجھے پہنچایا تھا لیکن اس کا صلہ میں نے ایک قیمتی ہار کی صورت اسے ادا کر دیا تھا۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”پہلے ایک بات بتاؤ۔“ طیب اعظم نے دریافت کیا۔ ”یہ تم سے کس نے خلیفہ تمہیں شاہی خاندان میں داخل کرے گا۔“

”اس میں کسی کے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔“ درشوار نے اپنی عظمیٰ بات یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ جب خلیفہ کسی عورت سے نکاح کرتے ہیں تو خاندان میں داخل ہو جاتی ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ لیکن خلیفہ نے تم سے نکاح کب کیا ہے؟“ طیب اعظم نے اس کے سامنے ایک ایسی بات کہی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”واہ طیب اعظم۔ آپ کو اس کی خبر ہی نہیں۔“ درشوار نے شوخی دکھائی جس دن آپ کی حویلی سے آئی ہوں اس دن اسی دم خلیفہ نے مجھ سے نکاح انہوں نے قاضی کو پہلے ہی بلوا لیا تھا۔ میرے یہاں آتے ہی قاضی نے نکاح پڑھ دیا کو اس کی خبر ہی نہیں۔ یعنی چراغ تلے اندھیرا۔“

طیب اعظم کو ہنسی آگئی۔ ”اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تمہارا مشیر کوئی غلط نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ خلیفہ نے تم سے نکاح نہیں کیا تھا۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں طیب اعظم۔“ درشوار نے حیران نظروں سے اسے

میں خود اپنے نکاح میں موجود تھی۔“

”درشوار۔ وہ نکاح نہیں متعہ تھا۔“ طیب اعظم نے کہا۔ ”نکاح اور متعہ میں جو فرق ہے وہ تم نے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور اگر بتایا گیا ہے تو غلط بتایا گیا۔ نکاح نے درجہ کو متعہ کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو مرد اور عورت میں ایک وقتی معاہدہ ہوتا ہے۔ شاہ یا خلیفہ اگر کسی عورت سے متعہ کرتا ہے تو وہ عورت شاہی خاندان میں نہ تو داخل ہو سکتی ہے اور نہ اسے شاہانہ مراعات حاصل ہو سکتی ہیں۔“

درشوار سناٹے میں آگئی۔ ”لیکن طیب اعظم۔ مجھے تو تمام بیگات سے اونچا مقام مل ہے۔ محل کے غلام اور کنیزیں میرے حکم کے تابع ہیں۔ عمائدین سلطنت تک رہے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ میرے سوا کسی اور بیگم کو خلیفہ کی خواب گاہ میں داخل کرنے کی اجازت نہیں۔ کیا اب بھی میرا مرتبہ کسی بیگم سے کم ہے؟“

”مرتبہ یا مقام سے اصول اور قانون متاثر نہیں ہوتے درشوار۔“ طیب اعظم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر خلیفہ کے بجائے العاضد بادشاہ ہوتے اور وہ متعہ کے رہتے ہیں اپنے ساتھ شاہی تخت پر بھی بٹھایا کرتے تو بھی تمہیں ایک نکاحی ملکہ کے برابر نہ حقوق حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ بہر حال اب اس خیال کو تم دل سے نکال دو اور یہ سوچو کہ جس سے تم وابستہ ہو جب وہ سارا ختم ہو جائے گا تو پھر کیا ہو گا۔؟“ ”طیب اعظم تم آپ نے مجھے تسلی دینے کے بجائے اور گھبرا دیا۔“ درشوار نے پریشانی سے کہا۔ ”میں یہ سوچ کے ایک حد تک مطمئن تھی کہ میرا ابھی کوئی شرعی حق ہو گا جو مجھے خود ہی ملے گا۔ اصل پریشانی تو مجھے وزیر اعظم کے اس اعلان کی تھی جس کے ذریعہ اسی نے براہِ مؤمنین العاضد کو خلافت ہی سے معزول کر دیا۔ آپ اس سلسلے میں کوئی راہ دکھائیے اور تری کی صورت پیدا کیجئے۔“

”درشوار۔ وزیر اعظم کے اعلان کے آگے تو کوئی دم بھی نہیں مار سکتا۔“ طیب اعظم نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”اعلان ہو چکا ہے اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا۔ مارے لئے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ وزیر اعظم کے حکم سے ہو سکتا ہے۔“

”وزیر اعظم نے میرے لئے خلیفہ سے وعدہ کر لیا ہے۔“ درشوار نے بتایا۔ ”لیکن اگر ماحل چھوڑنے کا حکم ہوا تو میں کیا کروں گی؟“

ایسا نہیں ہو گا درشوار۔“ طیب اعظم نے خیال ظاہر کیا۔ ”وزیر اعظم نے براہِ مؤمنین کو معزول کیا ہے۔ اس کی مراعات نہیں جیہنی ہیں۔ شاہی خاندان یا خلیفہ کے سرے متعلقین کے لئے بھی حکم میں کوئی ذکر نہیں۔“

”اعلان کے علاوہ وزیر اعظم نے کوئی زبانی حکم تو نہیں دیا؟“ درشوار کے دل کا چور تھا۔ ”داروغہ پچھلات ہباء الدین قراقوش کو بھی تو کوئی حکم دیا جا سکتا ہے؟“

”اس سلسلہ میں تم اطمینان رکھو۔“ طبیب اعظم نے انکشاف کیا۔ ”قراقوش کی سے گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وزیر اعظم کے اعلان سے خلیفہ کے اور کوئی تو متاثر نہیں ہوتا۔ قراقوش نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا تھا کہ صلاح الدین کا بہت لحاظ کرتا ہے لیکن اسے یہ اعلان مجبوراً کرنا پڑا۔ تم جانتی ہو کہ صلاح الدین افواج کا سپہ سالار ہے اس لئے وہ فاطمی خلیفہ کا ملازم یعنی وزیر اعظم نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف تو ہونا ہی تھا۔ پھر بھی اس نے قراقوش کو سخت حکم دیا ہے کہ اگر کسی فرد نے خلیفہ کو یہ اطلاع دی کہ اسے خلافت سے معزول کیا گیا ہے تو اس شخص کو سولی پر دیا جائے گا۔“

”طبیب اعظم۔“ درشوار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وزیر کا یہ حکم خلیفہ کی موت تک کے لئے ہو۔ اس کے بعد دوسرا حکم جاری کر دیں۔“

”ایسی فضول باتوں کو نہیں سوچا کرتے درشوار۔“ طبیب اعظم نے درشوار نصیحت کی۔ ”ایسی باتیں سازشی لوگ سوچا کرتے ہیں۔ تم خلیفہ کی زندگی میں بالکل ہو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں طبیب اعظم۔“ درشوار مفہوم ہو گئی تھی۔ ”میں نے کو اسی وجہ سے تو بلایا تھا کہ آپ مجھے میرے مستقبل کے بارے میں کوئی مشورہ دیجئے۔“

”درشوار۔“ طبیب اعظم اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ ”تم میرا وعدہ کیوں بھول رہی خلیفہ کے بعد میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔“

”اور اگر وزیر اعظم نے وہ کچھ نہ ہونے دیا جو آپ چاہتے ہیں؟“ درشوار نے بالکل نئے خدشہ کا اظہار کیا۔

طبیب اعظم پھر بیٹھ گیا۔ ”درشوار کوئی بات ایسی ضرور ہے جو تمہیں بار بار دے رہی ہے مگر تم اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔ مجھے بتاؤ، وہ کیا بات ہے جو تمہیں نامعلوم خوف میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ آخر وزیر اعظم کو کیا پڑی ہے کہ وہ خلیفہ کے بعد بھی تمہارے معاملات میں دلچسپی لے اور تم اس کے حکم کی پابند رہو۔“

”آپ نے ٹھیک فرمایا طبیب اعظم۔“ دراصل میں نے ایک غلطی کی ہے جس ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ سے وہ غلطی اب چھپائے رکھی۔ بات یہ ہوئی کہ کچھ دن پہلے خلیفہ کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی اور

پیدا ہوا کہ کہیں خدا نخواستہ ان کا آخری وقت نہ آگیا ہو۔ اس وقت مجھ سے نادانی یہ کہ اس کی اطلاع آپ کو بھیجنے کے بجائے میں نے براہ راست وزیر اعظم کو بھجوا دی۔“

درشوار نے اتنا کہہ کر چور نظروں سے طبیب اعظم کو دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے ایک خطرناک جرم کیا اور اسے مجھ سے بھی چھپایا۔“

اعظم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وزیر اعظم نے تمہاری اس اطلاع پر کس رد عمل کا کیا؟“

”وزیر اعظم مجھ پر سخت ناراض ہوئے اور سختی سے منع کیا کہ خلیفہ کے بارے میں انہیں اطلاع نہ دی جائے اس لئے کہ خلیفہ کا مسئلہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔“ درشوار نے تھرائی آواز میں کہا جیسے اس پر اب زف طاری ہو۔

”عشر کرو کہ بات وزیر اعظم کی ناراضگی تک رہی۔“ طبیب اعظم نے کہا۔ ”میں نے کہہ دیا کہ وزیر اعظم بہت سخت ہیں۔ اپنی باتوں میں خصوصیت کے ساتھ وہ کسی کی دخل در ت قطعی پسند نہیں کرتے اور فوراً سزا دیتے ہیں۔“

”مگر میں نے کوئی ایسی ویسی بات تھوڑی کہلوائی تھی۔“ درشوار نے جواب دیا۔

میں خلیفہ کی بیمار دار اور بیوی ہوں۔ خلیفہ کی طبیعت زیادہ بگڑی اس لئے میں نے حکم کو اطلاع دی۔ اس سزا کا کیا دخل ہے۔ میں نے کونسا جرم کیا تھا۔؟“

”بات ٹالنے کی کوشش نہ کرو درشوار۔“ طبیب اعظم نے کہا۔ ”تم نے وزیر اعظم

آج دسے کر اپنی طاقت کا اندازہ لگایا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”طبیب اعظم۔ مجھ پر کیوں الزام لگا رہے ہیں۔“ درشوار نے غمگین آواز میں کہا۔

”پاس کون سی ایسی طاقت ہے جسے میں وزیر اعظم پر آزماؤں گی۔؟“

”ہے۔۔۔ ہے۔۔۔ تمہارے پاس ہے۔“ طبیب اعظم پھر کھڑا ہو گیا۔ ”تمہارے پاس طاقت ہے۔ تم نے وزیر اعظم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ تم مصر کے نئے وزیر و سمجھ نہ سکیں۔ صلاح الدین کا کردار بے داغ ہے بالکل اسی طرح دمشق کا سلطان بے داغ کردار کا مالک ہے۔ دمشق سے قاہرہ تک صلاح الدین کے دامن پر ہلکا سا لی نہ لگ سکا۔ تم پر وہ ناراض ہوا۔ یہ ایک بہت معمولی سزا ہے۔ وہ تمہیں کوئی سزا بھی دے سکتا تھا۔“

نہ چھوڑیئے اس بات کو۔“ درشوار نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”میں غلط

تھی یا صحیح اب اس ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ آج خلیفہ کیا گیا ہے کل اسے اس محل سے بے دخل بھی کیا جاسکتا ہے پھر میں کیا کروں گا جاؤں گی۔“

”یہی تو میں کہتا ہوں کہ تم صلاح الدین کو سمجھ نہیں سکیں۔“ طیب اعظم ”وہ سخت ضرور ہے لیکن سنگدل نہیں۔ اس نے خلیفہ کو معزول کیا لیکن یہ اعلان اس اعلان کی خبر خلیفہ کو نہ ہونے پائے اور اگر کسی شخص نے یہ بات خلیفہ تک اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ جو شخص اس قدر نرم دل ہو وہ بھلا ایک بیمار کو اس سے کس طرح نکال سکتا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے لیکن کسی وقت کوئی انہونی بھی تو ہو سکتی ہے؟“ درشہوار اس بار اپنے حق میں صاف اور واضح فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

”ہر بات ممکن نہیں ہوتی درشہوار۔“ طیب اعظم نے جھکے لیے ”خدا خواستہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے اور ہمیں کوئی بہتر ٹھکانہ نہ مل سکے دروازے تمہارے لئے کھلے ہوں گے۔ میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔“ درشہوار کی جیسے ساری تکلیف دور ہو گئی۔ وہ پہلے اک ادا سے مسکرائی پھر ہنس پڑی اور یوں لگا جیسے دستاں کھل گیا۔ پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ درشہوار نے طیب اعظم کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔

”یہی الفاظ تو سننا چاہتی تھی آپ کے منہ سے۔“ درشہوار نے کچھ ایسی ادا طیب اعظم پریشہ غلطی ہو گیا۔

طیب اعظم نے عالم سرخوشی اور سرشاری میں کہا۔ ”یہ بات میں نے نہ تھی اور آج بھی گفتگو کے آغاز ہی میں دہرائی تھی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں طیب اعظم“ درشہوار نے اسے دزدیدہ نظروں ”لیکن میں یہ الفاظ بار بار سننا چاہتی ہوں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے منہ سن کے میں کس قدر خوشی اور طمانیت محسوس کرتی ہوں۔“

تھوڑی دیر تک دونوں ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران طیب فکک میوؤں سے مدارت کی گئی پھر وہ ہنسی خوشی اٹھ کے چلا گیا۔

10 ستمبر 1171ء (567ھ) کو موصل کے دلیر فقیہ امیر العالم جستانی کے مستقل خطیب کے آنے سے پہلے جمعہ کا خطبہ پڑھا جس میں فاطمی خلیفہ بجائے عباسی خلیفہ المستنصر کا نام لیا گیا۔ اس سے اگلے دن صلاح الدین وزیر

اعلان کے ذریعہ مصر کی تمام مساجد میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ بند کر کے عباسی خلیفہ کا جاری کیا پھر دو دن بعد صاحب فراش فاطمی خلیفہ العاضد نے عدم کی راہ لی۔ ایک بیان مطابق مرنے والے نے آخری رات کو آخری سنبھالا لیا اور اچانک آنکھیں کھول دی

۔ درشہوار اس کے قریب تھی۔ خلیفہ کے ہونٹ بل رہے تھے۔ درشہوار نے جھک کر خلیفہ کے منہ کے قریب کر دیئے۔

خلیفہ نے بہت نحیف آواز میں کہا۔ ”میرا آخری وقت ہے۔ وزیر اعظم کو بلایا۔“

خلیفہ کی سانس اکھڑ گئی اور وہ انک انک کر بول رہا تھا۔ درشہوار نے اس کی بات لی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وزیر اعظم صلاح الدین نے اسے سے منع کر دیا تھا کہ خلیفہ کی بیماری کی کوئی خبر اسے نہ بھیجی جائے۔ وہ اسی مکتش میں کہ خلیفہ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ درشہوار پھر اس پر جھک گئی۔

”وزیر اعظم کو جلدی سے بلاؤ۔“ خلیفہ کی آواز میں درد تھا۔ التجا تھی۔ درشہوار کو مجبوراً کہنا پڑا۔ ”وزیر اعظم نے منع کیا ہے کہ انہیں آپ کے بارے کوئی خبر نہ دی جائے۔“

پتہ نہیں خلیفہ نے درشہوار کی آواز سنی کہ نہیں لیکن اس کی آنکھیں جو بند ہوئیں تو وہ نہ کھل سکیں۔ درشہوار نے جی کڑا کر کے کہہ تو دیا لیکن اب وہ بھی پریشان ہو گئی۔ کادل بھی اندر سے چاہا کہ خلیفہ کی یہ آرزو کسی طرح پوری ہو جائے۔ اس نے فوراً استاد اور بلیس بن عبدلغوی کو طلب کیا۔ وہ ایک عرصہ کے بعد قصر خلافت میں آئے۔ طیب اعظم نے سختی سے تاکید کی تھی کہ خلیفہ کے پاس کوئی نہ جائے۔ خلیفہ کے دل مصاحب بھگم بھگم حرم خلافت پہنچے۔ ان دونوں کے اٹک رواں تھے۔ قصر خلافت ہر کارے نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ خلیفہ زندہ ہیں یا موت کی آغوش میں جا چکے۔ انہیں یہی خیال تھا کہ خلیفہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

درشہوار نے انہیں بڑی جلدی میں بتایا۔ ”خلیفہ کی خواہش ہے۔ نہیں نہیں۔ انہوں نے التجا کی ہے کہ وزیر اعظم کو فوراً بلایا جائے۔“

”شکر ہے۔“ جوہر استاد نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ہماری تو جان ہی نکل گئی۔“

”جوہر استاد۔ بحث نہ کیجئے۔ فوراً دارالوزارت جائے اور خلیفہ کی التجا پیش کیجئے۔“

”مگر عالیہ محترمہ“

اوش کو مقرر کیا تھا جس نے سوڈانی غلاموں اور کینڑوں سے قصر خلافت ہی نہیں بلکہ
رے دار خلافت کو صاف کر دیا تھا پھر بھلا اس کے دل میں کون شبہ پیدا کر سکتا تھا۔ صلاح
بین سپای زادہ تھا اور خود ایک جری اور بہادر سپہ سالار تھا پھر قصر خلافت جانے سے کس
سبب خوف کھا سکتا تھا۔

خوہر استوار اور مجلسین بن عبدالقوی حمیم خلافت سے نکل کر سیدھے دارال
پہنچے۔ دارالوزارت کے صدر دروازے کا پہرے دار اعلیٰ برائیک اور خدا ترس قہ
نے جب سنا کا خلیفہ کا آخری وقت ہے اور وزیر اعظم سے ملنا چاہتے ہیں تو اس
اندر اطلاع بھجوا دی۔ صلاح الدین بھی اس خبر سے ایسا متاثر ہوا کہ دونوں مصفا
فوراً طلب کر لیا۔

اس طرح شاہی محلات کے سب سے عظیم قصر جسے قصر کبیر کا نام دیا گیا تھا اور جس کا خلیفہ العاضد مقیم تھا اس کے بڑے ہال میں مرحوم کے تمام عزیز و اقارب جمع ہوئے اور وزیر اعظم صلاح الدین ان سے تعزیت کے لئے بہ نفس نفوس مع اپنے تمام افراد کے آیا۔ خلیفہ کی ہر یکم اور عزیز اپنی درخواست صلاح الدین کے حضور میں ذاتی طور پر پیش کرنے کا خواہش مند تھا لیکن صلاح الدین نے کہا کہ وہ پہلے ان مراعات کا ذکر کرے گا جو ان کے خلیفہ کے متعلقین کے لئے اپنے طور پر ملے گی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی مرد خاتون اس سے ملنا چاہے گی تو اسے بھی اجازت دی جائے گی۔ خلیفہ کے عزیزوں نے وزیر اعظم کی اس بات کو بہت پسند کیا۔

ملاح الدین نے پہلے مرحوم خلیفہ کی ان خوبیوں اور اوصاف کا ذکر کیا جو ایک نیک
سان میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے واضح الفاظ میں اعلان کیا۔ ”خلیفہ
روح کی تمام بہنوں یا بیگمات اور صاحبزادگان اور دیگر تمام متعلقین کے عیش و آرام کے وہ
ام لازم برقرار رہیں گے جو خلیفہ کی حیات میں جاری تھے۔ اس سب اخراجات کی
انگلی شاہی خزانہ سے ہوگی۔ تمام بیگمات اور رشتہ داروں کے وہ القاب و خطاب جو خلیفہ
کا مکلف سے انہیں عطا ہوئے تھے وہ برقرار رہیں گے۔ کسی عزیز و اقارب کے غلاموں
درکنیزوں کی تعداد نہیں ان کی زندگی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ لیکن شاہی
ملات کی تعداد نصف کر دی جائے گی۔ حریم خلافت یعنی قصر کبیر میں چونکہ فاطمی خلیفہ کا

صلاح الدین کے اس حسن سلوک کو دشمنان اسلام نے اپنی تحریروں میں اس بیان کیا کہ مصر کے آخری خلیفہ العاضد نے مرنے سے پہلے وزیر اعظم صلاح الدین ملاقات کی درخواست کی۔ صلاح الدین ملاقات کے لئے تیار ہوا لیکن اس کے امراء اس کے دل میں شکوک پیدا کر دیئے اور اس نے قصر خلافت جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس الزام کے بارے میں صرف یہی دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر صلاح الدین قدر سگدل ہوتا تو یہ حکم کیوں دیتا کہ خلیفہ عاضد کو یہ ہرگز نہ بتایا جائے کہ اسے خلا سے محروم کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صلاح الدین نے قصر خلافت کا داروغہ ہماء ال

لوم ہوتا ہے کہ اس قصر میں چار ہزار کمرے تھے۔ ایک طلائی پھانک تھا جو ایک طلائی ہال میں رکھا تھا۔ ایک بلند و بالا شہ نشیں تھی۔ شہ نشیں پر ایک طلائی تخت رکھا تھا۔ فاطمی بنہ اس تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ خلیفہ جس وقت جلوس فرماتا تو اس کے گرد ندیم و خدام ہوتے۔ شاہی خادموں میں یونانیوں اور سوڈانوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ سامنے بے زردوزی چلن پڑی ہوتی جس کے پیچھے بیٹھ کے خلیفہ جشن دیکھتے تھے۔ قصر میں زمیں کا تھا جس کے ستون سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوان عالم بھی تھا۔ دیوان کے اندر کھڑکی لگی تھی۔ ہر دو شنبہ اور چار شنبہ کو یہ کھڑکی کھولی جاتی اور خلیفہ اس میں بیٹھ کے عوام کو اپنا جلوہ دکھاتا۔ دیوان عام ہی میں ایک بلند مقام پر فریادی کھڑے ہو کر خلیفہ کو اپنی فریاد سناتے اور خلیفہ اس کی داد دے کر دیتا تھا۔

وزیر اعظم صلاح الدین نے اس محل کا جو خزانہ بحق سرکار ضبط کیا تھا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: چار انگل لبا ایک ہیرا جس کا نام جبل نور تھا۔ ایک یا قوت جس کا وزن (2400) چوبیس سو قیراط تھا۔ مشہور مورخ ابن اثیر نے اس ہیرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ خزانہ میں زمر، موتی، چاندی سونے کے ظروف، مینا کاری اور نست کاری کی طلائی طشتریاں، طلائی تجوریاں، سامان میں صندل، آنسوں اور ہاتھی دانت کا زنجیر اور جواہرات سے مرصع دوسرا سامان۔ مشک کافور سے بھری ہوئی صراحیاں، بیش قیمت بلوریں اور چینی کے جام، سونے چاندی کے چو کھٹوں میں بڑے ہوئے آئینے جن پر زمر اور عقیق کے حاشے بنے تھے۔ سنگ سلیمان کی سرس، بے شمار سونے چاندی کے کلمدار برتن، بادشاہوں اور خلیفوں کی تصاویر سے مزین سونے کے کارچوبی شجر، ریشم اور جامدہ دار۔

ایک اور بیان کے مطابق فاطمین کی دولت جو جواہرات یا زیورات کی شکل میں تھی مدتوں تک ضرب المثل بنی رہی۔ اس سنگ ساق کی میزیں، بے شمار برنجی ظروف جن پر سونے چاندی کا کام تھا۔ مرصع دیوار پوش، بھاری زرری کے ریشمی پارچے جن پر بادشاہوں کی شہنشاہی زرری میں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کل دولت جو مصر کے وزیر اعظم صلاح الدین کے قبضہ میں آئی اس میں سے ایک چیز بھی اپنے پاس نہ رکھی اور نہ کوئی سامان اپنے استعمال میں لایا۔ اس نے یہ ضرور کیا کہ کچھ نادر و نایاب چیزیں اس نے اپنے مہل اور آقا سلطان نور الدین زنگی کے پاس دمشق روانہ کر دیں۔ اسی طرح کچھ اور چیزیں اس نے اپنے ساتھی امراء لوریہ اور دیگر عمائدین سلطنت میں تقسیم کر دیں۔ باقی تمام ہیرے جواہرات، سونا چاندی اور دیگر سامان و ظروف فروخت کر کے تمام رقم بیت المال میں داخل کر دی۔ صلاح

مقام رہتا تھا اور اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے اس لئے یہ عظیم قصر اس کا سامان و خزانہ کے قبضہ میں رہے گا میں یعنی وزیر مصر اس قصر میں منتقل نہیں ہو گا بلکہ اس قصر حکومت مصر کے دفاتر قائم کئے جائیں گے۔

ایک روایت کے مطابق جس وقت صلاح الدین نے ان مراعات کا اعلان کیا تو ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو گئے ان کے ان میں بھی نہ تھا کہ ایک غیر ملک، غیر فرقہ کا وزیر اعظم خلیفہ کے انتقال کے بعد ان کے تمام آسائیاں اور عیش و عشرت کا سامان برقرار رکھے گا۔ اس کے بعد کسی کو اپنی عرضی کرنا یا ملاقات کی ضرورت پیش نہ آئی۔

خلیفہ کی چار نکاحی بیویوں کے علاوہ بہت سی متنبی خواتین بھی تھیں۔ ان کے لئے الگ محل مع سارو سامان اور لودھی غلاموں کے دیا گیا۔ وہ اس محل میں تا عمر رہتھیں۔ اگر شادی کرنا چاہیں تو سرکاری اخراجات پر شادی کر کے محل سے رخصت ہو جاتیں۔ جتنے محلات شاہی خاندان والوں کے لئے دئے گئے۔ ان کا انتظام بھی قراقوش کے تھا۔ اس نے حفظ مانتقدم کے طور پر ان کے محلات کے گرد سخت پہرہ لگا دیا۔ باہر کے شخص کو ان محلات کی حدود میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ دوسری طرف شاہی خانہ والوں کو بھی ان حدود سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی کیونکہ انہیں ضرورت کی ہر چیز حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھی۔ اس احتیاط کے باوجود شاہی خاندان کے کچھ لوگوں محلات سے نکل کے حکومت کے خلاف کچھ گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی۔ صلاح الدین قراقوش کو تاکید کی تھی کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کے ساتھ سختی نہ کی جائے خواہ وہ ہی بڑی غلطی کیوں نہ کریں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صلاح الدین نے خلیفہ کے ا کے بعد بھی افراد خانہ کے ساتھ نہایت شرافت کا مظاہرہ کیا۔

خلیفہ الناصر کی معزولی اور موت کی خبریں دور دراز کے علاقوں میں ایک ساتھ پہنچیں۔ بغداد میں اس خبر سے مسرت کی لہر دوڑ گئی اور مصر میں فاطمی خلیفہ کے عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری ہو گیا ہے۔ المستنقی خلیفہ بغداد نے سلطان دمشق نور الدین کو دو تلخیں بھجوائیں۔ ایک خلیفہ بغداد کے لئے اور دوسری خلعت صلاح الدین ابوبکر کے لئے جواب مصر کا صحیح معنوں میں سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ خلیفہ بغداد نے مصر کے بڑے بڑے خطیبوں کو بھی تلخیں بھجوائیں اور ساتھ میں سیاہ علم بھی روانہ کئے۔ عباسیوں کا خاص نشان تھا جو معززوں اور معتبرین کی عزت افزائی کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ قصر خلافت جو قصر کبیر کے نام سے مشہور تھا اس کے بارے میں تاریخی شواہد

الدین کو فاطمی خلفاء کے کتب خانہ سے ایک لاکھ بیس ہزار کتب کا بیش قیمت ذخیرہ دستیاب ہوا۔ یہ پورا کا پورا کتب خانہ صلاح الدین نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری جو بعد میں اس کا وزیر بھی ہوا یعنی قاضی فاضل کو عطا کیا گیا۔

صلاح الدین کا شاہی لشکر اور امرائے نوریہ تو اس کے مطیع اور فرمانبردار تھے ہی بلکہ اس کے حسن سلوک نے مصری عوام کو بھی اس کا ہمنوا بنا دیا اور ان کے دل سے غریب احساس ختم ہو گیا۔ صلاح الدین نے پہلے ہی عوام کے لئے قاہرہ میں جگہ جگہ اور دوسرے شہروں میں کتب خانے اور شفا خانے کھلوا دیئے تھے۔ اب جو بیت المال بھرا تو اس نے ایسے ہی کاموں پر دل کھول کے رقم خرچ کی۔ عوام پر اس کا اور زیادہ اچھا اثر ہوا۔

ان کاموں سے فارغ ہوا تو اسے ایک دن اچانک مرحوم خلیفہ سے کئے ہوئے وعدے کا خیال آیا۔ اس نے اگرچہ خلیفہ کی بیگمات اور دوسری خواتین کا معقول بندوبست کر دیا تو لیکن خلیفہ عاضد اپنی بیماری کے دوران درشوار کو ساتھ لے کر اس کے پاس آیا تھا اور درشوار کے لئے خاص مراعات کی درخواست کی تھی۔ وزیر اعظم صلاح الدین نے اس کی درخواست کو شرف قبولیت بخشے ہوئے درشوار کو تمام مراعات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس وعدے کو نبھانا چاہتا تھا۔ پس اس نے درشوار کو دارالوزارت طلب کیا۔ بھاء الدین قراقوش نے درشوار کو ان خواتین کے ساتھ رکھا تھا جہاں اس جیسی خواتین کا قیام تھا۔ خلیفہ نے جن خواتین سے متعہ کیا تھا انہیں دو الگ محلوں میں رکھا گیا تھا۔ ان کے آرام و آرائش کا پورا بندوبست تھا۔ ہر ایک کی خدمت پر کئی کئی کنیزیں مامور تھیں لیکن ان محلات کے قریب کسی مرد کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بعض تواریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ داروغہ محلات بھاء الدین قراقوش بڑا سخت انسان تھا۔ اس نے شاہی خاندان کے مردوں اور عورتوں کو الگ الگ محلوں میں رکھا تھا اور انہیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہ بات قطعی خلاف واقعہ ہے اور سراسر صلاح الدین پر تہمت ہے۔ صلاح الدین اس قدر ظالم اور سخت دل نہیں ہو سکتا کہ وہ بہن بھائیوں اور ماں بیٹوں کو الگ رکھنے کا حکم دیتا۔ یا تو یہ صلاح الدین کو بدنام کرنے کی نصرانی کوشش ہے یا پھر کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا لکھا گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ فاطمی خلیفہ جن خواتین سے متعہ کرتا وہ عام طور پر زر خرید یا تحفہ میں آئی ہوئی کنیزیں ہوتیں وہ شاہی حرم میں تنہا آتی تھیں۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہ ہوتا تھا۔ ایسی خواتین کو ضرور سب سے الگ رکھا گیا تھا اور ان کے محلات کی حدود میں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

شاہی خاندان کی خواتین جو وزیر اعظم کے حضور میں اپنی عرضداشت پیش کرنا چاہتی تھیں یا جنہیں وزیر اعظم طلب کرتا تھا وہ سب ہر جمعرات کو دارالوزارت میں حاضری جاتی تھیں۔ وزیر اعظم نے بھی عجب سادہ طبیعت پائی تھی۔ قصر کبیر خالی ہونہ تو اس کے سازد سالان سے فائدہ اٹھایا اور نہ اس قصر میں رہائش اختیار کی۔ وہ معہ اپنے اہل و عیال اور خاندان والوں کے دارالوزارت میں رہتا تھا۔ خلیفہ کے انتقال کے بعد وہ دارالوزارت ہی میں مقیم رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے دارالوزارت کے در و دیوار سے محبت ہو گئی تھی۔

جمعرات کو درشوار کو بھاء الدین قراقوش کے مسلح محافظوں کے پہرے میں دارالوزارت پہنچایا گیا۔ اس دن شاہی خاندان کی کچھ اور خواتین بھی وزیر اعظم کے پاس درخواست لے کر آئی تھیں یا بلائی گئی تھیں۔ دارالوزارت میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ آنے والی خواتین کو ان کے درجے اور مرتبہ کے مطابق مہمان خانوں میں بٹھایا جاتا۔ پہلے ان کی خاطر و مدارت کی جاتی پھر باری باری انہیں وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جاتا۔ سب سے پہلے درشوار کا بلاوا آیا۔

”خاتون محترم۔“ وزیر اعظم نے آپ کو باریابی کی اجازت دی ہے۔“ کنیز نے ادب سے اطلاع دی۔ درشوار کھڑی ہو گئی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے دوسوے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ بار بار سوال کرتی کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے جبکہ اس نے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔ درشوار نے کنیزوں سے یہی سنا تھا کہ جمعرات کو ایسی خواتین کو طلب کیا جاتا ہے جو وزیر اعظم کے حضور کوئی عرضی پیش کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی خواتین کو بھی بلایا جاتا ہے جن کے بارے میں داروغہ محلات کوئی شکایت کرتا ہے۔ کسی خاتون سے شکایت کی صورت میں پہلے بھاء الدین قراقوش ذاتی طور پر اس خاتون سے گفتگو کرتا اور اگر بات بڑھ جاتی تو قراقوش اسے وزیر اعظم کے پاس بھجواتا تھا۔ درشوار کے ساتھ ایسی کوئی صورت پیش نہ آئی تھی۔ اس نے عرضی بھی نہیں دی تھی اور نہ قراقوش کو اس سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی۔

ایسے ہی خیالوں میں ابھی درشوار کنیز کے پیچھے چلتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جو اس کی ششماہ تھی۔ عام مقدمات ہوں یا شاہی خاندان اور ان کے متعلقین کی درخواستیں صلاح الدین ایسے تمام موقعوں پر اپنے وزیر اور قاضی فاضل کو بلا لیا کرتا تھا۔ قاضی فاضل جمعرات کے دن پیش ہونے والے مقدمات کو صرف سنتا رہتا تھا۔ اسے اس وقت بولنے کی ضرورت پڑتی تھی جب صلاح الدین کسی زیر فیصلہ مقدمہ کے بارے میں شرعی صورت حال

”مجھے کسی سے شکایت نہیں۔ یہ تو اپنی اپنی تقدیر ہے۔“ درشوار نے غمگین لہجہ میں کہا۔ ”داروغہ عجلات نے کسی کے ساتھ بالانصافی نہیں کی۔ مجھے بھی میری حیثیت کے مطابق رہائش دی گئی ہے۔ اگر میرا نصیب اچھا ہوتا تو خلیفہ مجھے کیوں چھوڑ جاتے۔“

”اس کو تاہی کی ذمہ داری ہماری مصروفیت ہے۔“ صلاح الدین نے بڑی فراخ دلی سے اپنی بے توجہی کا اقرار کر لیا۔ ”آئندہ جمعرات تک اگر تمہیں مطمئن نہ کیا گیا تو ہم سے شکایت کرنے آ سکتی ہو۔“

درشوار نے جھک کر رخصتی سلام کیا۔ کینز اس کمال نوازش پر وزیر اعظم کا دوبارہ شکر یہ ادا کرتی ہے۔“

”وہ جس طرح کینز کے پیچھے چل کر آئی تھی اسی طرح واپس ہوئی۔ خواتین کا کافی ہجوم تھا۔ وزیر اعظم دوپہر تک ان سے گفتگو مکمل نہ کر سکے۔ اس لئے خواتین سے کھانا کھانے کی درخواست کی گئی۔ کھانے کا انتظام بھی تین الگ الگ کمروں میں کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی سہ پہر تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ وزیر اعظم نے اس دن کسی کو باریابی کا اجازت نہ دی اور باہر کے تمام کام معطل رہے۔ مغرب سے کچھ پہلے یہ سلسلہ ختم ہوا۔ فوراً سواریاں ڈیوڑھی سے لگ گئیں اور خواتین سوار ہونے لگیں۔

درشوار کی شکوہ شکایت حقیقت پر مبنی تھی۔ جب سے درشوار حرم خلافت میں داخل ہوئی تھی دوسری تمام بیگمات اور خواتین کا داخلہ حرم خلافت میں بند کر دیا گیا تھا۔ صرف درشوار کو خلیفہ کی قربت حاصل تھی۔ پورے قصر بلکہ تمام شاہی عجلات میں درشوار کے نام کا ڈنک بجتا اور سب چھوٹی بڑی بیگمات سامنے ہونے پر درشوار کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں درشوار کا یہ اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور سب اسے حد کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ پھر جب خلیفہ کا انتقال ہوا تو ان کی نظریں اک دم پھر گئیں۔ ہباء الدین قراقوش نے بھی درشوار کو خلیفہ کی متعہ کی ہوئی خواتین کے ذمے میں شامل کیا حالانکہ اسے علم تھا کہ خلیفہ نے خاص طور سے درشوار کے سلسلہ میں وزیر اعظم سے ملاقات کی تھی اور کچھ مراعات حاصل بھی کی تھیں۔

درشوار کو قراقوش کے اس عام سلوک سے شکوہ تھا لیکن اس نے اس کا شکوہ اس لئے نہ کیا کہ شاید وزیر اعظم خلیفہ کے مرتے ہی اپنے وعدے سے پھر گیا ہو۔ ادھر جب وزیر اعظم نے ہباء الدین قراقوش کو بلا کر اسے درشوار کے بارے میں کچھ ہدایات دیں تو قراقوش نے اپنی کوتاہی کی معافی مانگی حالانکہ اسے تمام باتوں کا علم تھا لیکن اس نے خلیفہ کی دوسری بیگمات کی ناراضگی کے خیال سے درشوار کے ساتھ کسی خصوصی سلوک کا اظہار نہ

پوچھتا۔

کینز نے درشوار کو کمرے کے دروازے پر چھوڑا۔ وہ اندر گئی اور دوسرے ہی لئے واپس آکر درشوار کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ درشوار گھبرائی اور لرزتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر ڈرتے ڈرتے نظریں بلند کیں اور جھک کر وزیر اعظم اور قاضی فاضل کو ادب سے سلام کیا۔ وہ قاضی کو نہیں پہچانتی تھی مگر قاضی چونکہ وزیر اعظم کے برابر ایک ہی منبر پر بیٹھے تھے جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ضرور کوئی اہم شخصیت ہے۔

”خاتون۔ تمہیں اس لئے بلایا گیا ہے کہ مرجوم خلیفہ نے اپنی زندگی میں ہم سے تمہارے لئے کچھ مراعات مانگی تھیں۔“ وزیر اعظم نے اسے طلب کرنے کی وضاحت کر دی۔

”کینز اس عزت افزائی کے لئے وزیر اعظم کی شکر گزار ہے۔“ درشوار نے سنبھل کر کہا۔ وزیر اعظم کے نرم لہجے نے اسے بڑی طمانیت بخشی تھی۔

”ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تم سے تمہاری موجودہ رہائش کے بارے میں دریافت کریں۔“ صلاح الدین نے اسی نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو بے جھجک بیان کرو۔ ہم تمہیں الگ محل میں منتقل کر دیں گے۔“

درشوار سوچ میں پڑ گئی۔ ”اے بیواؤں اور بے کسوں کے مہمان آقا۔ میں اپنی طلبی کی اطلاع سے اس وقت تک الجھن میں گرفتار رہی کہ آخر مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بنا پر وزیر اعظم نے مجھے طلب فرمایا ہے۔ میں اپنے بارے میں فوری طور پر نہ کچھ سوچ سکتی ہوں اور نہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوں اگر وزیر اعظم مجھ پر کرم کرتے ہوئے کچھ وقت دے سکیں تو میں کسی نتیجہ پر شاید پہنچ سکوں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ صلاح الدین نے اسے تسلی دی۔ ”یہ تمہارا امتحان نہیں کہ پریشان ہو۔ ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خلیفہ سے ہم نے جو وعدہ کیا تھا اس میں کچھ کمی بیشی ہوئی ہے اور تم اس سے کس حد تک مطمئن ہو۔“

”وزیر اعظم مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ قصر خلافت سے میرے موجودہ محل کا کوئی مقابلہ نہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔“ درشوار نے حوصلے سے کہا۔ بہر حال میرا تعلق شاہی خاندان سے نہیں اس لئے مجھے شکوہ کرنے کا حق نہیں۔ میں جہاں ہوں خوش ہوں۔“

صلاح الدین اس کے اس بیباکانہ اظہار سے بڑا متاثر ہوا۔ چند لمحے سوچ کے بولا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ قراقوش نے تم پر وہ توجہ نہیں دی جس کی تم حقدار ہو۔“

دارالوزارت سے واپس آنے کے دو ہی گھنٹے بعد ہباء الدین قراقوش بذات خود درشموار کے پاس آیا۔ اس سے معذرت کی پھر بڑی خوشامد کر کے درشموار کو چھوٹے مگر بہت آراستہ پیراستہ محل میں منتقل کیا۔ اس کی خدمت کے لئے کینزوں کا اضافہ کیا گیا۔ قراقوش نے بڑے فخر سے درشموار کو بتایا کہ اس نے درشموار کو جو محل دیا ہے اس کے مقابلہ کا محل کسی شاہی بیگم کے پاس نہیں ہے۔ درشموار کو ہباء الدین قراقوش سے شکایت تھی لیکن اس نے درشموار کو اب ایک ایسے محل میں منتقل کر دیا تھا جس پر حرم خلافت کا شہر ہوتا تھا۔

درشموار اپنے نئے محل میں ایک حد تک مطمئن ہو گئی تھی مگر ساز و سامان ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ درشموار کو محل کی تنہائی کاٹنے کو دور ڈرتی تھیں اس کے پاس کئی کینزرس بھی تھیں جو تعلیم تربیت سے آراستہ معلوم ہوتی تھیں لیکن قراقوش کا ایسا رعب تھا کہ درشموار کینزروں کو اپنے دل کا حال بتاتے ڈرتی تھیں۔ محلات میں مقیم خواتین ایک دوسرے کے پاس آسکتی تھیں لیکن درشموار سے تقریباً ہر بیگم حسد کرتی جو اب نفرت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ دن بھر ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ بہت دل گھبراتا تو تمام کینزروں کو جمع کر کے ان کی باتیں سنتی رہتی لیکن خود کلام نہ کرتی۔ قراقوش نے تمام محلات میں جاسوس کینزرس چھوڑ رکھی تھیں اور یہ جاسوس اسے محلوں کی ایک ایک بات پہنچاتی تھیں۔

درشموار کو طبیب اعظم پر سخت غصہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مصیبت کے وقت طبیب اعظم اس کی مدد کرے گا لیکن اس نے اس طرح خاموشی اختیار کر رکھی تھی جیسے وہ درشموار کو جانتا ہی نہ تھا۔ خلیفہ کا انتقال کیا ہوا کہ شاہی محلات کے دن رات بدل گئے۔ پہلے قصر خلافت سے درشموار کو عارضی طور پر ایک شاہی مہمان خانہ میں بھیج دیا گیا۔ قصر خلافت کے بعد ایک ایک کر کے تمام شاہی محلات بحق سرکار ضبط کر لئے گئے۔ درشموار کی طرح دوسری بیگمات کو بھی مہمان خانوں میں منتقل کیا گیا پھر جب بیگمات اور دوسری خواتین کے لئے چند محلات مخصوص ہوئے تو ان سب کو ان محلوں میں پہنچا دیا گیا۔

یہ نہیں کہ طبیب اعظم کو درشموار کا خیال نہ تھا۔ خلیفہ کا انتقال ہوا تو درشموار کی تصویر اس کی نظروں کے سامنے آکھڑی ہوئی لیکن شاہی محلات میں اس قدر اکھاڑ بچھاڑ ہو رہی تھی کہ طبیب اعظم کی محلات کی طرف جانے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ وہ اب صرف اس وقت محلات کی طرف جاتے جب انہیں کسی بیگم یا دوسری خاتون کی طرف سے بلاوا ملتا۔ اس وقت بھی یہ کیفیت ہوتی کہ طبیب اعظم کو بلائے کی درخواست زبانی یا تحریری طور پر

اروغہ محلات کو پیش کی جاتی پھر داروغہ کا ایک غلام طبیب اعظم کے پاس جاتا اور انہیں لے کر بیگم کے پاس پہنچاتا تھا۔ ان پابندیوں کی وجہ سے طبیب اعظم بہت الجھتے تھے اور ریاضہ کی نبض دیکھ کر فوراً واپس آجاتے تھے۔

درشموار اگرچہ ان سے خفا تھی لیکن اتنی بے خبر بھی نہ تھی کہ یہ بھی نہ جان سکتی کہ طبیب اعظم بیگمات کے بلاوے پر محلات میں آتے رہتے ہیں۔ ایک بار تو اس کا دل کچھ ایسا بے چین ہوا کہ اس نے طبیب اعظم کو بلائے کے لئے ایک کینز کو بھیج دیا مگر اسے فوراً خیال آیا کہ اس کا یہ قدم کوئی تہہ کھڑا کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں یہ عیش و آرام تم ہو سکتا ہے۔ اس نے دوڑ کے کینز کو پکڑ لیا جو دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ پچھلے چار روز سے طبیب اعظم برابر والے محل میں کسی مریضہ کو دیکھنے آرہے تھے۔ ان مرد میں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہ تھی اس لئے پردہ کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا تھا۔ درشموار کی نظر پہلے ہی دن طبیب اعظم پر پڑ گئی تھی لیکن وہ سوائے ٹھنک کے لڑنے ہو جانے کے اور کچھ نہ کر سکی۔ مزید دو دن اسی طرح گزرے پھر چوتھے دن وہ بے ادب قابو نہ رکھ سکی اور کینز کو بلائے بھیج کر پھر دوڑ کے پکڑنے کا واقعہ پیش آیا۔

درشموار کی پرانی کینزرس کی اور محل میں منتقل ہو چکی تھی۔ وہ کینز درشموار کی راز دار کی تھی اور وفا دار بھی۔ نئے محل میں نئی کینزروں کے درمیان رہتے ہوئے اسے چند ہی دن لڑے تھے۔ اگر اسے طبیب اعظم دکھائی نہ پڑتے تو شاید وہ کسی کینز سے بے تکلف اپنے کی کوشش نہ کرتی۔ وہ کینز جسے درشموار نے طبیب اعظم کو بلائے کے لئے بھیجا پھر بڑ کر روک لیا تھا، درشموار کے اس اضطراری فعل سے بہت متعجب ہوئی تھی لیکن درشموار سے وہ بے تکلف نہ تھی اس لئے خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔

چارپانچ دن کے بعد درشموار نے اسی کینز کو تنہائی میں بلایا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ درشموار نے نرمی سے پوچھا۔

”نیل۔“ کینز نے مختصر جواب دیا۔

”نیل یعنی دریائے نیل۔ تمہاری آنکھیں بھی دریائے نیل جیسی گہری ہیں۔“ درشموار نے اس کی خواہ مخواہ تعریف کی۔

”محترمہ عالیہ۔“ کینز نے افسردگی سے کہا۔ ”میری آنکھیں گہری ضرور ہیں لیکن ایک آنکھ میں سفید جزیرہ بھی ہے جسے شاید آپ نہیں دیکھ سکیں۔“

”کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟“ درشموار الجھ کر رہ گئی۔

”ملاحظہ فرمائیے محترمہ عالیہ۔۔۔“ کینز نے دونوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ”میری بائیں

آٹھ میں ایک سفید داغ ہے۔ نظر آیا آپ کو؟“

درشوار نے غور سے دیکھا۔ ”ہاں ایک ہلکا سا نشان ہے مگر یہ نہ تو دکھائی اور نہ برا محسوس ہوتا ہے۔“

”محترمہ عالیہ۔“ کینز نے سنبھل کے کہا۔ ”سب کہتے ہیں کہ میں صورت اچھی ہوں۔ تربیت یافتہ بھی ہوں اور ایک اچھی کینز ثابت ہو سکتی ہوں۔ لیکن اس داغ نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ جس بیگم کے پاس بھیجی جاتی ہوں وہ ہفتہ بعد مجھے بدلوا دیتی ہے۔“

”کیوں۔ کیا وجہ ہے اس کی؟“ درشوار نے حیرت کا اظہار کیا۔

”سب کہتی ہیں کہ سفید نشان نحوست کی نشانی ہے۔“ نیل نے جواب دیا۔ ”خیال ہے کہ میں جس گھر میں رہوں گی وہ برباد ہو جائے گا۔ میں در بدر پھر رہی ہوں مستقل ٹھکانہ نہیں ملتا۔“

”یہ سب وہم کی باتیں ہیں۔“ درشوار نے بے پرواہی سے کہا۔ ”میں تمہیں پاس رکھوں گی۔ ہمیشہ ساتھ رکھوں گی۔“

نیل کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ”آپ کتنی عظیم ہیں محترمہ عالیہ۔“

”نیل میں تم پر اعتبار کر سکتی ہوں؟“ درشوار نے پوچھا۔

”جی محترمہ عالیہ۔ میں سمجھی نہیں۔“ نیل گھبرا گئی۔

”میرا مطلب ہے کہ اگر میں تمہیں کوئی راز کی بات بتاؤں تو تم اس راز کو محفوظ رکھو گی۔“ درشوار نے نیل کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔

”محترمہ عالیہ۔ میں آپ کے راز کو جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔“ نیل سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”آپ مجھ پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ آپ پر جان قربان کر دینے مجھے خوشی ہو گی۔“

”بس بس۔ اعتبار آگیا مجھے۔ کل تمہارا امتحان لوں گی۔“ درشوار نے مسکرا کر کہا گلے میں پڑا قیمتی ہار نیل کے حوالے کر دیا۔

نیل بہت خوش تھی کہ اسے مستقل سارا مل گیا۔ درشوار نے اسے یقین دلایا کہ وہ نیل کو اپنے سے جدا نہیں کرے گی اور اسے یہ محل چھوڑ کر کسی اور جگہ جانا پڑا تو نیل کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ اس رات اسے خوشی کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی درشوار کے پاس سے وہ اٹھ کر وہ دیر میں آئی تھی۔ اس نے بڑے دل سے درشوار

کی بات کی تھی۔ وہ روز درشوار کا سر دباتی تھی کہ آج جس انداز سے نیل نے اس کا دیا اس سے درشوار بڑا سرور حاصل ہوا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ درشوار نیل کے بعد محنتوں کروٹیں بدلتی تھی تب کہیں جا کے اسے نیند آتی تھی لیکن اس رات نے اسے سر دبانے سے اسے ایسی لذت حاصل ہوئی اور سکون ملا کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ نیل کو رخصت کر کے خواب کا لطف اٹھائے لیکن اسے خیال آ کر کہیں نیل کو اس کی بات ناگوار نہ گزرے۔ اس لئے وہ خاموش پڑی رہی۔ پھر نہ بے کب اسے نیند آگئی اور نیل غلام گردش میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح کو درشوار بیدار ہوئی تو اس کی طبیعت معمول سے زیادہ ہشاش بشاش تھی۔ نیل جلدی سے اس کی خدمت میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے درشوار کو منہ ہاتھ دھوئے میں دی۔ انے میں ناشتہ تیار ہو کر آگیا۔ درشوار نے نیل کو ناشتہ میں اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس طرح چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دونوں میں خاصی بے تکلفی اور دوستی پیدا ہو گئی۔ درشوار اپنے حسن سلوک اور حسن کلام سے نیل کو اپنا گرویدہ کر رہی تھی تاکہ اس سے سب مرضی کام لے سکے۔ دوسری طرف نیل بھی اس کے آگے بچھی جا رہی تھی اور درشوار کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

درشوار ایسے درپچہ کے پاس بیٹھی تھی جہاں سے محل کے قریب سے گزرنے والے اف نظر آتے تھے۔ دو گھنٹی دن چڑھا تھا کہ درشوار کو سامنے سے طیبہ اعظم گزرتے محال دیکھے۔ انہوں نے اپنی سواری پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ جب وہ محل کے بالکل قریب آئے تو درشوار نے شوکا مار کر نیل کو کھڑا کر دیا۔

”ادھر دیکھو نیل۔ وہ سامنے کون جا رہا ہے؟“ درشوار نے اشارہ سے بتایا۔

نیل مسکرائی۔ ”آپ میرا امتحان لے رہی ہیں محترمہ عالیہ۔ یہ اپنے طیبہ اعظم ہیں۔“

نیل کی نبض دیکھنے روز آتے ہیں۔ ”ہاں نیل یہ طیبہ اعظم ہیں۔“ درشوار نے سنبھل کے کہا۔ ”تمہارا کام یہ ہے کہ بے طیبہ اعظم واپس جانے لگیں تو تم انہیں میرے پاس لے آنا۔“

”اللہ خیر کرے!“ نیل نے گھبرا کر درشوار کو دیکھا۔ ”خیریت تو ہے آپ کے مزاج کیسے ہیں؟“

”طبیعت کچھ خراب ہے۔“ درشوار آواز دبا کر بولی۔ ”انہیں بلا کے لاؤ گی تو علوم ہو جائے گا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔“

”کیا کہوں ان سے؟“ نیل نے پوچھا۔

”کہہ دینا درشہوار کی طبیعت خراب ہے۔“ درشہوار نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔“ نیل سر ہلاتی ہوئی باہر کی طرف چلی۔

درشموار نے ہمت کر کے طیب اعظم کو بلاوا تو بھیج دیا تھا لیکن اندر ہی اندر
تھی کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ پھر اس نے دریچہ بند کر دیا اور اپنے کمر
آگئی۔ اب اس پر انتظار کی کیفیت طاری تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، اس
کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے بڑی بے چینی اور الجھ
گزرے۔ وہ کئی بار دریچے کے پاس گئی کہ کھول کے باہر دیکھے لیکن پھر سوچ کے
آگئی۔

اس وقت نیل اسے واپس آتے دکھائی دی لیکن وہ تنہا تھی۔ طیبہ اعظم ۱
ساتھ نہ تھے۔ درشمار کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیس راز تو نہیں کھل گیا یا پھر طیبہ
نے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ نیل اس کے پاس آکر کا
معنی اور درشمار کو اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی بلکہ اسے آتے دیکھ کر وہ آنکھ
کر کے لیٹ گئی۔

”محترمہ عالیہ۔۔“ نیل نے آہستہ سے آواز دی۔

”ہوں۔“ درشہوار نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں نے طبیب اعظم سے کہا تھا۔“ نیل نے دھیمی آواز میں کہا۔

”آج آہستہ کیوں بول رہی ہو۔ کیا طبیب اعظم نے تمہیں ڈانٹا ہے۔“ در شہ

”ڈانٹتے کیوں مجھے؟“ نیل نے جواب دیا۔ ”وہ بے چارے تو بہت اچھے ہیں۔
 نے میرا نام پوچھا۔ خیریت معلوم کی۔ اتنے بڑے آدمی ہیں اور مجھ جیسی معمولی
 خیریت پوچھتے ہیں۔ کیوں محترمہ عالیہ ہیں نا وہ اچھے اپنے طیب اعظم؟“
 در شہوار کڑھ بھی رہی تھی اور لطف بھی لے رہی تھی۔ ”وہ تو اچھے ہیں مگر
 انہوں نے کیا جواب دیا؟“

”بہت اچھا جواب دیا۔“ نیل پھولے نہ سہاتی تھی۔ ”ایسی نرمی سے بات کر کہ بس شاکرے۔ محترمہ عالیہ آپ نے کبھی ان سے بات کی ہے؟“

”نیل — نیل۔ یہ کیا کھواس کر رہی ہو تم۔“ درشموار چیخ پڑی۔ ”میں نے کس لئے بھیجا تھا؟“

”میں نے کہا تھا ان سے“ نیل گھبرا گئی۔ ”میں نے کہا کہ محترمہ عالیہ آپ کو

ہیں۔ "اتنا کہ کرنیل پھر بیسے سوچ میں پڑ گئی۔"

درشوار نے ڈانٹا۔ ”نیل تم جواب دے رہی ہو کہ مذاق کر رہی ہو؟“

نیل نے سر کو جھٹکا دیا اور بولی۔ ”معاف کیجئے محترمہ عالیہ۔ طبیب اعظم ایسی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ میں اس میں کھو کے رہ گئی۔ اب میں آپ کو سب باتیں بتاتی ہوں۔ انہوں نے میرا نام پوچھا۔ حال پوچھا پھر دیر تک آپ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔“

”میرے بارے میں کیا باتیں کرتے رہے؟“ درشہوار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہ کہہ رہے تھے۔ زمانے نے کیا انقلاب دکھایا ہے۔ محترمہ عالیہ کس محل میں
بٹھیں اور اب کہاں آگئی ہیں۔ سینکڑوں کنیزیں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں۔ دن بھر سلام
ہوتے تھے۔ محترمہ عالیہ جہاں جاتی تھیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ امیرالمومنین تو آپ کو
آٹک میں رکھتے تھے۔ سر پر بٹھاتے تھے۔ انہوں نے جتنا پیار آپ کو دیا۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ باتیں رہنے دو۔ طبیب اعظم آئے کیوں نہیں۔“ درشمواری نے بات مختصر کر
دی۔

”وہ آنے کو تیار تھے لیکن داروغہ — وہی مخلوق کا داروغہ بڑا بد ذات ہے۔“ نیل نے چٹا چٹا کھٹا شروع کیا۔ ”طیب اعظم کہنے لگے کہ وہ آپ کا نام داروغہ کے دفتر میں لکھا دیں گے۔ بس پھر آئیں گے۔“

”کب آئیں گے کوئی دن تاریخ بتائی ہے۔“ درشوار الجھنے لگی۔

”ہاں ہاں جی۔۔ تاریخ بتائی ہے۔ کل کیا تاریخ ہے محترمہ عالیہ؟“ نیل سر پکڑ کے بڑبڑاتی تھی۔

”تاریخ ڈالو چلے میں۔ کیا کل آرہے ہیں طبیب اعظم؟“ درشوار بے چین ہو گئی۔
 ”جی ہاں کل آئیں گے یا پرسوں۔ کہتے تھے دو چار دن میں کسی وقت آجاؤں گا۔“
 نل نے انگلیاں چمچاتے ہوئے کہا۔ ”محترمہ عالیہ۔ آپ میری سفارش کر دیجئے گا ان
 سے۔“

”کاہے کی سفارش۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ درشہوار نے حیرانی سے پوچھا۔

”وہی جی میری آنکھ کے سفید داغ کے لئے۔“ نیل نے معصومیت سے کہا۔

”کیوں وہم کرتی ہے نخل۔ اچھی خاصی صورت ہے۔ دوسرے کو اپنا عیب بتانے سے
بچتی رہتی ہے۔“ درشوار نے ہمدردی کی۔ ”جو نہیں جانتا اسے کیوں بتاؤ تم۔ اگر
خدا نخواستہ یہ داغ بوجھ لگے تو پھر طبیب سے بتانا ضروری ہے۔“

پرو در شہوار نے انہیں اپنے علاج کے لئے بلایا ہے۔ قراقوش کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے جس عزت سے خوش آمدید کہا تھا اسی عزت سے انہیں رخصت کیا اور پھر صبح ہوئے ہی طبیب اعظم در شہوار کے محل پر پہنچ گئے۔

”طبیب اعظم۔“ نیل کی آواز پر طبیب چونک پڑا۔

”کیا بات ہے کو۔“ طبیب نے سنبھل کے کہا۔

”آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا۔“ نیل نے جواب میں کہا۔

”کیوں۔ کیا در شہوار اس وقت تک سو رہی ہیں؟“ طبیب اعظم نے قدرے

ناگواری سے پوچھا۔

”جی نہیں طبیب اعظم محترمہ عالیہ بیدار ہو چکی ہیں“ نیل نے ہلکی سی سوخی سے کہا۔

”جب تک در شہوار نہیں آئیں تم میرے پاس ٹھہرو گی“ یہ نہ نہیں طبیب اعظم کیوں کیا

شاید وہ تنہا بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔

”مگر وہ۔۔۔۔۔“ نیل اٹھیاں چٹکانے لگی ”محترمہ عالیہ نے مجھے آواز دی تو۔۔۔۔۔“

غضب ہو جائے گا طبیب اعظم۔ مجھے آپ جانے دیجئے۔“

”ایک شرط پر جا سکتی ہو“ طبیب اعظم نے بڑے رعب سے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ شرط۔۔۔۔۔ بتائیے شرط“ نیل اپنی جان چھڑانا چاہتی تھی۔

”شرط یہ ہے کہ سچ بچ بتا دو کہ در شہوار کیا کر رہی ہیں؟“ اور وہ مسکراتے لگے۔

”طبیب اعظم! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔۔۔۔۔“ نیل بھی مسکرائی ”میں نے جب آپ کے آنے کی اطلاع دی تو محترمہ عالیہ بستر میں تھیں آپ کا نام سن کے چونکی پھر فرمایا کہ آپ کو مہمان خانے میں بٹھایا جائے جب میں آپ کی طرف آئی تو انہیں گیسو سنوارنے کے لئے مشاطہ کو بلوایا تھا میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت لباس تبدیل کر کے گیسو سنواروا رہی ہوں گی“

”بت اچھی گفتگو کرتی ہو کیا نام ہے تمہارا؟“

”نیل“

”نام بھی بت اچھا ہے“ طبیب نے تعریف کی ”اب تم جا سکتی ہو“

”کیا میں چلی جاؤں؟“

”تمہاری مرضی۔۔۔۔۔ مگر میں نہیں روکتا“ طبیب اعظم پریشان ہو گیا اس نے تو بس معلومات حاصل کرنے کے لئے نیل سے شوخی کی تھی لیکن وہ تو جیسے پیچھے لگ گئی۔

نیل پرمردہ ہو کر چلنے لگی حالانکہ اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا وہ طبیب اعظم کے

”آپ ٹھیک فرماتی ہیں محترمہ عالیہ۔“ نیل کی سمجھ میں در شہوار کی بات آگئی۔

”کیوں بتاؤں کسی کو اپنا عیب۔ بس آج سے داغ کے بارے میں بالکل نہیں سوچوں گی۔“

دوسرے دن ابھی سویرا ہی تھا کہ نیل بھاگتی ہوئی در شہوار کے کمرے میں داخل ہوا۔

در شہوار ابھی بستر پر تھی۔ آہٹ پا کر پلٹ کے دیکھا۔ سامنے نیل کھڑی تھی۔

”کیا بات ہے نیل۔ اتنے سویرے کیوں آئی ہو؟“ در شہوار نے نرمی سے پوچھا۔

”جی وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ آگئے ہیں محترمہ عالیہ۔“ نیل اب تک ہانپ رہی تھی۔

”کون آگئے؟“ در شہوار نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

وہ حیران اس لئے تھی کہ اس کا ملنے والا نہ تھا۔

”عالیہ محترمہ وہی۔ اپنے طبیب اعظم۔“ نیل نے در شہوار کو چونکا دیا۔

”ارے طبیب اعظم۔“ در شہوار اچھل کے کھڑی ہو گئی۔ ”دوڑ کے جاؤ۔ انہیں مہمان خانہ میں لے جاؤ۔“

نیل مسکرائی پھر بھٹنے لگی۔

”کیا کھڑی کھڑی ہنس رہی ہے۔ جاتی کیوں نہیں۔“ در شہوار نے مصنوعی غصہ۔

کہا۔

”محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔ کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں۔“ نیل نے جواب دیا۔

انہیں مہمان خانہ میں پہنچا کے آپ کو اطلاع دینے آئی ہوں۔“

”شاباش۔ شاباش۔ ہماری نیل کتنی عقلمند ہے۔“ در شہوار نے اس کی دل سے تعریف کی۔ ”اب میں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔“

”اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیے محترمہ عالیہ۔“ نیل نے بزرگانہ انداز میں کہ ”مہمان کو زیادہ انتظار نہ کرانا چاہئے۔“

”وہ مہمان نہیں میرے طبیب ہیں۔ میرے بلاوے پر آئے ہیں۔“ در شہوار نے کہ

”میں تیار ہو رہی ہوں۔ تم ذرا مشاطہ کو بلا لاؤ۔ ہال ٹھیک کراؤں گی۔“

نیل مشاطہ کو بلانے چلی گئی۔

طبیب اعظم مہمان خانہ میں بیٹھے الجھ رہے تھے۔ وہ کل شام ہی کو داروغہ محلات!

الدین قراقوش کے پاس پہنچے تھے۔ قراقوش اتفاق سے دفتر میں موجود تھا۔ وہ انتہائی بدو

اور سخت ہونے کے باوجود طبیب اعظم کو دیکھ کے کھڑا ہو گیا۔ طبیب اعظم کو بڑی عز

سے بٹھایا اور نرمی سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ طبیب اعظم نے بتایا کہ امیر المومنین

کو دیکھ کر ہونٹ بن گئی تھی وہ کبھی درشوار کو دیکھتی اور کبھی طبیب اعظم کو، طبیب
 ا تو خیر بوکھلائے ہوئے تھے درشوار کا حسن ہی ایسا تھا کہ جو دیکھ پاتا دیوانہ ہو جاتا لیکن
 درشوار کو کیا ہوا تھا وہ بھی طبیب اعظم کو اک تک دیکھے جا رہی تھی۔
 ”درشوار کے مزاج کیسے ہیں؟“ طبیب اعظم نے آخر بات شروع کی۔
 ”شکر ہے۔ اچھی ہوں۔ آپ اپنی سناٹے؟“ درشوار نے جواب دیا اور پھر نیل کو دیکھ
 کچھ اشارہ کیا۔

نیل چپکے سے ایک طرف چلی۔

درشوار نے اسے تاکید کی ”ذرا خیال رکھنا“

”جی اچھا۔۔۔“ نیل نے جواب دیا اور ایک طرف نکل گئی۔

”مہمان کو بیٹھنے کو بھی نہیں کہو گی؟“ طبیب اعظم مسکرا پڑے۔

”میں آپ کو مہمان نہیں سمجھتی ہاں اگر آپ مہمان ہی بننا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو
 ان خانہ میں ٹھہرنا ہو گا“ درشوار نے ہنس کے کہا۔

”میں بلاوے پر آیا ہوں اب چاہے جہاں ٹھہراؤ میں ہر بات میں خوش ہوں“ طبیب
 ا اس کے حسن سے پوری طرح مرعوب ہو گئے تھے۔

”نی الحال تو آپ میری خواب گاہ میں تشریف لائیے“

دونوں کمرے میں آگئے درشوار مسہری پر طبیب اعظم ایک مرصع آنسو کرسی پر بیٹھ
 ۔

”ہاں۔ اب بتائیے۔ آپ میرے بلاوے پر کیوں آئے آپ کا دل کبھی نہ چاہا آنے
 ”درشوار نے ایک ادائے خاص سے کہا۔

”میرے قدم احتیاط نے پکڑ رکھے تھے درشوار“ طبیب اعظم نے بتایا ”اس دوران
 ے بڑے انقلاب آئے پرانے ندیم و اسیر ادھر ادھر ہو گئے کچھ گوشہ نشین ہو گئے جو لوگ
 عمل تھے انہیں جاگیریں دے کر سرحدوں پر بھیج دیا گیا تمام شہری جانا دوسرے جتنی سرکار
 ط ہو گئیں قصر کبیر اجڑ گیا تمام میرے جواہرات سونا چاندی قیمتی ظروف اور اعلیٰ درجہ کا
 فوکی اور بلوری ساز و سامان کھڑے کھڑے فروخت کر دیا گیا بعض چیزیں تو ایسی نایاب
 تھیں کہ دنیا کے کسی خزانہ میں نہ ہوں گی“

درشوار نے ایک آہ کھینچی ”وہ ہماری تقدیر میں نہ تھیں اتنا خزانہ اور مال و اسباب پا
 لے تو وزیر اعظم خوش ہو گئے ہوں گے ان سے امیر تو کوئی بادشاہ نہ ہو گا“

”نیل درشوار۔۔۔“ طبیب اعظم سنجیدہ ہو گیا ”وزیر اعظم نے اس میں سے ایک

منہ سے اپنی تعریف سننا چاہتی تھی۔

درشوار واقعی لباس تبدیل کر کے اور بال بنوا کے واقعی پری بن چکی تھی نیل کو دیکھ
 ہی بولی ”طبیب اعظم کو لے آؤ“

نیل کو شوخی سوچھی بولی ”محترمہ عالیہ۔۔۔ طبیب اعظم تو بعد میں دیکھیں گے پ
 میں تو اس چودھویں کے چاند کو دیکھ لوں“

سیاہ لباس میں اس کا گلاب جیسا چمکتا چہرہ بدلی سے نکلا ہوا چاند ہی معلوم ہوتا
 درشوار نے شرعاً ہوتے کہا ”چل ہٹ رہنے دے بلا کے لا انہیں“

نیل اٹھلاتی ہوئی چلی۔

طبیب اعظم کو پسینے چھوٹ رہے تھے انہیں جب معلوم ہوا کہ درشوار ان کی آمد
 بناؤ سنگھار کر رہی ہے۔ ت۔ خوش ہوئے لیکن یہ خیال کر کے گھبرا گئے کہ اگر درشوار

نے ان سے پوچھا کہ اب تک اس کی خبر کیوں نہ لی تو وہ کیا جواب دیں گے۔
 ”چلے آپ کی طبعی ہوئی ہے“ نیل نے اٹھلا کے کہا۔

طبیب اعظم نے چونک کے دیکھا ”اچھا۔۔۔ کیا میں چلوں۔ مجھے بلایا ہے درشوار
 نے؟“

”جی ہاں آپ کو طلب کیا گیا ہے حسن کے دربار میں ذرا سنبھل کے جائیے گا“ طبیب
 اعظم پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے نیل کی اس بات پر اور زیادہ بوکھلا گئے۔

”کیوں۔ کیا بات ہے کیا مزاج بگڑا ہوا ہے درشوار کا“ طبیب کے بڑھتے قدم اک دم
 رک گئے تھے۔

”جی ہاں شعلہ جوالہ بنی بیٹی ہیں خاک ہو جائیے گا دم کے دم میں“ نیل نے ان کا
 اور خون خشک کر دیا۔

”اچھا چلو دیکھا جائے گا“

طبیب اعظم، نیل کے پیچھے پیچھے چلے گئے درشوار ان کی پیشوائی کے لئے اپنی خواب
 گاہ کے دروازے پر کھڑی تھی طبیب اعظم نے جھجکتی ہوئی نگاہ اٹھائی اور درشوار کو دیکھا
 پھر وہ آگے نہ بڑھ سکے اور بت بنے حسن کے اس پیکر کو دیکھتے رہے سیاہ ماتی لباس میں اس
 کا حسن نکل کر رہ گیا تھا اس پر غضب یہ کہ درشوار اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی طبیب
 اعظم کے چہرہ کانپ رہے تھے اور درشوار اس کی اس کیفیت سے محفوظ ہو رہی تھی۔

ادھر یہ منظر تھا اور دوسری طرف نیل کی حالت دیکھنے کے قابل تھی وہ ان دونوں کے
 درمیان سے ذرا ہٹ کے کھڑی ہو گئی تھی لیکن طبیب اعظم اور درشوار کی نظروں کے

اگر بادشاہ ہو مگر دل بے چین ہو تو مخلوق میں بھی چین نہیں ملتا مجھے ایک محل ملا پھر دوسرا اس سے اچھا ملا مگر دل کو اطمینان نہیں سوائے اس کینز نیل کے اور کوئی نہ تو ہمدرد ہے اور نہ کسی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ایک دن آپ نظر آتے تو دل کو کچھ عجب طرح کی خوشی ہوئی پھر کئی دن آپ دکھائی نہیں دیئے پھر دل ایسا بے چین ہوا کہ بھوک پیاس اڑ گئی روز آپ کے آنے کے وقت درجنے میں جا بیٹھتی مگر آپ جیسے ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرا ایک بار پھر ادھر آنا ہوا اور نیل مجھے ملی اس نے ہمارا پیغام کیا دیا جیسے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آگئی شکر ہے کہ آج تمہارا دیدار ہو رہا ہے۔

”اب بتائیے نا — میرے لئے کیا کرنا ہے — یا مجھے کیا کرنا چاہئے —؟“

درشمار نے بڑی امیدوں سے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتا تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے بتاؤ نہیں تو مجھے حکم دو“ طبیب اعظم نے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔

”مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں نہ کھانے کی نہ پہننے کی“ درشمار بڑے خلوص سے اقبال کیا ”وزیر اعظم نے بھی ایک دن بلوایا تھا بڑی مہربانی سے پیش آئے اور رہنے کے لئے پہلے سے زیادہ اچھا محل دینے کا حکم دیا“

طبیب اعظم نے درشمار کو پہلے غور سے دیکھا پھر دریافت کیا ”وزیر اعظم کی مہربانی میں کوئی غرض تو پوشیدہ نہیں تھی؟“

”بالکل نہیں —“

”کوئی بناوٹ یا لگاوٹ؟“

”لیکن کوئی بات نہیں تھی طبیب اعظم“ درشمار نے الجھتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی اسی خاص مہربانی کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟“ طبیب اعظم کو اطمینان نہ ہو رہا تھا۔

”میں نے بتایا تو آپ — امیر المومنین نے وزیر اعظم سے وعدہ لیا تھا کہ اس کی موت کے بعد میرے اعزازات اور محل وغیرہ اسی طرح برقرار رہیں گے“ درشمار نے تفصیل بیان کی ”تقریر تو جتنی سرکار ضبط ہو گیا اس لئے اس میں تو کسی کو بھی حصہ نہ ملا“

مجھے بھی چند عورتوں کے ساتھ رکھ گیا پھر یہ محل دیا گیا“

”اچھا یہ بتاؤ تمہارا اپنا کیا ارادہ ہے“ طبیب اعظم نے اس سے سوال کیا۔

”میں آپ کے وعدہ کا انتظار کر رہی ہوں“ درشمار نے شرما کے کہا۔

جز بھی نہ لی اور درہم و دینار میں نہ ہاتھ لگایا“

”جی — کیا فرمایا آپ کے وزیر اعظم نے کچھ نہیں لیا تو یہ سب کسے دیا گیا“

نے حیرانی سے پوچھا۔

طبیب اعظم نے کرسی پر پہلو بدلا ”اس معاملہ میں وزیر اعظم صلاح الدین سامان قائم کر دی اس نے شاہی خزانہ کا نام بیت المال رکھا تمام ہیرے جواہرات سامان غلام عام سے فروخت کر کے کروڑوں دینار بیت المال میں داخل کئے اس بیت سے عوامی اور فلاحی کام ہوں گے اسکول شفا خانے اور کتب خانے کھولے جائیں وزیر اعظم نے اپنی مقررہ تنخواہ کے علاوہ ایک ہجہ بھی بیت المال سے نہیں لیا ہاں! کچھ چیزیں بطور تحفہ اپنے سلطان کو بھیج دیں اور کچھ سامان امیروں میں تقسیم کر اپنے پاس کوئی چیز نہیں رکھی حالانکہ لوگوں کا خیال تھا کہ قاہرہ کی دولت سے دہم خزانے بھر جائیں گے“

”خیر — چھوڑیے ان باتوں کو“ درشمار نے بے دلی سے کہا ”اس دولت کا ذکر ہے جو ہماری تقدیر میں نہیں اب چاہے وہ قاہرہ میں رہے یا دمشق پہنچ جائے آپ مستقبل کا حال بتائیے یہ کس طور گزرنے کا؟“

”میں شاید تم سے زیادہ بے چین رہا ہوں درشمار“ طبیب اعظم نے کہا ”مجھے ا دن تک یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ تم کہاں —“

”میں رہنے دیجئے“ آپ منہ دیکھی باتیں کرتے ہیں“ درشمار نے جاگواری کے میں کہا ”اگر آپ کو میرا خیال ہوتا تو میری تلاش کرتے لوگ تو خدا کو ڈھونڈ لیتے ہیں“

”یہ بات نہیں ہے درشمار“ طبیب اعظم نے جواب دیا ”انتظامی معاملات وزیر اعظم بہت سخت ہے بڑے بڑے امیروں کا قلع قمع کر دیا ہے اس نے“ مجھے اپنا

پچانا مشکل ہو رہا تھا وہ تو پچھلے دنوں میں نے چار پانچ شاہی امیروں کا علاج کیا تھا اور سے خوش تھے ورنہ مجھے بھی جواب مل گیا ہوتا امیر المومنین کی آنکھ بند ہوتے ہی جا

جال بچھ گیا تھا میں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی تمہارے بارے میں یوں نہ دریافت کہ قراقوش نے بڑی سختی کر رکھی تھی میں نے سوچا کہ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں پھر

خیال تھا کہ امیر المومنین نے تمہارے لئے مراعات حاصل کر لی تھیں تم جہاں بھی آرام سے ہو گی“

”طبیب اعظم —“ درشمار نے مایوسی سے کہا ”آرام دراصل دل اور دماغ ہے غریب کا دل غنی ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی جھونپڑی میں بھی پیر پھیلا کے سوتا ہے

”یعنی تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟“ طبیب اعظم اس سے واضح الفاظ میں سن رہا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔ ہم دونوں نے یہی عہد کیا تھا“ درشوار نے کہا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری بیوی کے علاوہ دو بچے بھی ہیں جو جوانی میں قدم رہے ہیں“ طبیب اعظم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

”میں دو جوان بچوں کی ماں بننا پسند کروں گی“ درشوار نے فیصلہ کر دیا۔

طبیب اعظم نے اطمینان کا سانس لیا ”مجھے تمہارے فیصلے سے بڑی خوشی ہوئی“ خیال تھا کہ شاید تم بھی کسی شامی امیر کو پسند کرو گی“

”کیوں۔۔۔ کیا شامی امیروں میں سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں“ درشوار نے کیا۔

طبیب اعظم نے جواب دیا ”دنیا جتنے سورج کی پرستش کرتی ہے۔ اس وقت لشکر مصر پر قابض ہے اس لئے اکثر شامی بیگمات اور دوسری خواتین اپنے مفاد کی خاطر شامیوں سے رشتہ کی خواہشمند ہیں میں نے سنا ہے اس مضمون کی درخواستیں قراقوش معرفت وزیراعظم کو بھیجی جا چکی ہیں مرحوم امیر المومنین چاروں بیواؤں اور بہنوں نے امیروں سے شادی کی خواہش کی ہے“

”کیا امیر المومنین سے متعلق کوئی عورت کسی مصری امیر سے شادی کی درخواست دے سکتی؟“ درشوار نے سوال کیا۔

”ضرور درخواست کر سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مصری امیر اسے قبول کرنے پر آمادہ“ طبیب اعظم نے جواب دیا۔

”آپ کا شمار بھی مصری امیروں میں ہوتا ہے“ درشوار نے دریافت کیا۔

”بے شک۔۔۔۔ مگر میں ایسا امیر ہوں جس کا حال تم جانتی ہو“ طبیب اعظم بولا۔

”میں اپنی درخواست قراقوش کی معرفت وزیراعظم کو بھیج رہی ہوں میرا خیال ہے آپ سے رضامندی حاصل کی جائے گی“

”میں تو پہلے ہی غلام ہو چکا ہوں“ طبیب اعظم نے ہنس کے کہا۔

”میں کب درخواست بھیجوں؟“ درشوار نے دریافت کیا۔

”کچھ دن انتظار کرنا ہو گا حالانکہ مجھے تم سے زیادہ جلدی ہے“ طبیب اعظم نے شامی بیگمات کی درخواستوں کا فیصلہ اس جمعہ تک ہونے کا امکان ہے“

دونوں کی یہ ملاقات بڑی کامیاب رہی طبیب اعظم جس حور کو حاصل کرنا چاہتے تھے

ن کی گود میں بچے آم کی طرح آگری تھی طبیب اعظم نے بتایا تھا کہ بیگمات کی درخواستیں جمعہ تک نمٹ جائیں گی اس کے بعد دوسری خواتین کے لئے راستہ کھل جائے گا شہزادہ بہت خوش تھی۔ اس سے زیادہ نیل خوش تھی اس کی مالکہ کو محل کی قید سے یا کہنا چاہئے کہ داروغہ محلات ہباء الدین قراقوش کی قید سے نجات مل رہی تھی اس کی زندگی بے یو و مددہ کیا تھا کہ وہ خود آزاد ہونے کے بعد نیل کو بھی آزاد کر دے گی اور وہ غلام یا جس مرد سے شادی کرنا چاہے گی اس کے ساتھ اس کا عقد کر دیا جائے گا ادھر طبیب اعظم کی مسرتوں کا حال دیکھنے والا تھا وہ اگرچہ ادیبز عمر کا تھا لیکن کھلائی پلائی اور علم کے زور پر اس میں جوانوں جیسی طاقت موجود تھی اور چہرے سے مرے سے بھی وہ تیس سال سے زیادہ کا نہ معلوم ہوتا تھا اس کے دو لڑکے جوان ہو رہے تھے لیکن اس پاس اتنی دولت تھی کہ وہ دو بیویوں کے اخراجات آسانی سے پورے کر سکتا تھا۔

جیسا کہ قارئین پڑھ چکے ہیں کہ سوڈانیوں نے اپنے اقتدار کے لئے خلیفہ عاصد کی مدد سے بغاوت کر دی تھی اور پچاس ہزار سوڈانی جنہیں مصری امراء کی حمایت حاصل صلاح الدین کے خلاف اک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن صلاح الدین نے کچھ اپنی عملی اور کچھ طاقت سے ان کا قلع قمع کر دیا تھا صلاح الدین نے سوڈانیوں کی مرکزیت لڑی تھی اور یہ لوگ شمالی مصر کی طرف بھاگ گئے تھے بظاہر ان کا خاتمہ ہو گیا تھا اندرون خانہ یہ لوگ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے ان کے تعلقات قاہرہ میں ایسے مصریوں سے تھے جن کے امیروں کو دور دراز صوبوں میں بھیج دیا گیا تھا ان وہ ان سوڈانیوں نے شامی خاندان کے بعض افراد جن میں کچھ شہزادے بھی شامل تھے ان کے تعلقات تھے یہ سب لوگ وقت کا انتظار کر رہے اور بغاوت کی آگ اندری اندر بجی تھی۔

رحمن اس جمعہ کو جب بیگمات کی درخواستوں کا فیصلہ ہوتا تھا تو شہر میں اک دم افواہ مانی سوڈانیوں نے بغاوت کر دی ہے اور وہ قاہرہ تک پہنچ گئے یہ افواہ اس تیزی سے پھیلا کہ عمائدین سلطنت اور امراء نے فوراً پریشان ہو گئے اس افواہ میں اس وقت اور بڑا ہونے لگا جب بیان کیا گیا کہ مصر کے مرحوم امیر المومنین خلیفہ عاصد کا بڑا لڑکا داؤد نے خلافت اور امارت کا دعویٰ کیا ہے اور سوڈانیوں اور بعض مصری امراء نے اس پر بیعت کر لی تھی۔

خبر کا پھیلا تھا کہ تمام شامی محلات کا محاصرہ کر لیا گیا اور شہزادہ داؤد بن عاصد کی زندگی بے خطر ہوئی شہزادہ داؤد نے جو یہ خبر سنی تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور بڑی خاموشی کے ساتھ

کئی اور محل میں جا کے چھپ گیا اس کو شاید خیال یہ آیا ہو کہ اسے گرفتار کر دیا جائے گا اور جب ایک فوجی دستہ داؤد بن عاصد کو لینے اس کے محل پر پہنچا تو اسے غائب پایا پھر کیا تھا محل محل سخت تلاشی شروع ہو گئی اور اس تلاشی میں اس برقی گئی کہ بیگمات اور شاہی خاندان کے افراد نے اس خانہ تلاشی کو اپنی توہین مزاحمت شروع کر دی اس طرح ایک ہنگامہ کی صورت پیدا ہو گئی براء الدین داروغہ محلات تھا اور اس علاقہ کی ذمہ داری اس پر تھی وہ اس صورت حال پریشان ہوا اور فوراً وزیر اعظم کے پاس گیا۔

مصر کے وزیر اعظم صلاح الدین کو بھی ان افواہوں اور خبروں کی اطلاع پہنچی تھی قراقوش نے مزید بتایا کہ ”محاصرہ کے بعد شہزادے داؤد بن عاصد کی گرفتاری جب محلات کی تلاشی لینا شروع کی تھی تو شاہی خاندان کے افراد نے ہنگامہ کر دیا الدین کو سخت غصہ آیا اس نے کہا ”اگر شہر میں افواہ پھیل جائے تو کیا تم بغیر جنگ شروع کر دو گے آخر تم نے محلات کا محاصرہ کیوں کیا جبکہ وہ علاقہ پناہ تمہارے نگہداشت میں ہے؟“

”محترم وزیر اعظم“ قراقوش نے معذرت کے انداز میں کہا ”مجھے بتایا گیا کہ اس شہزادہ داؤد بن عاصد شامل ہے تو میں نے محاصرہ کا حکم دیا“

”قراقوش“ تمہیں معلوم تھا کہ اس علاقہ میں اس ملک کے سابق حکمرانوں اقارب مقیم ہیں پھر بھی تم نے محاصرے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش صلاح الدین نے بڑے طیش سے کہا ”تم نے شاہی خاندان کی توہین کی ہے اور گئی مراعات کا مذاق اڑایا ہے تم نے اپنے احکامات میں آمریت کا اظہار کیا حال مروت کا حکم دیا گیا تھا تمہارے بجائے یہ ذمہ فقیہ عیسائی ہکاری کو سونپی جاؤ دارالوزارت میں رہو گے۔۔۔۔۔“

صلاح الدین نے قراقوش کو فوری طور پر معزول کر دیا فقیہ عیسائی ہکاری کا محاصرہ ختم کر کے شاہی خاندان کے افراد سے اس زیادتی پر معذرت کی جا۔ ہکاری نے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی شاہی خاندان کے افراد نہ صرف بلکہ انہوں نے شاہی فوجی دستے کے ساتھ جو مزاحمت کا رویہ اختیار کیا تھا مانگی۔ شام ہونے سے پہلے پہلے شہزادہ داؤد بن عاصد جو دوسرے محل میں وہ باہر آ گیا اور اس نے اعلان کیا کہ میں وزیر اعظم کا وفادار ہوں۔ افواہیں اور دم توڑ گئیں۔ اس سے اگر کسی کو نقصان ہوا تو وہ شاہی خاندان کی بیگمات و درخواستوں پر جمعہ کے بعد غور ہوتا تھا مگر جمعہ کا پورا دن اس ہنگامہ میں گزر گیا۔

ایک انار سو بیمار

مسلمان بادشاہوں نے مصر کے صدر مقام کو جنوب سے شمال مشرق میں ہٹا کر کئی بار دیکھا تھا پہلا صدر مقام انفساط تھا۔ فسطاط کے معنی خیمہ کے ہیں اس کی بنیاد 641ء میں مسلم جنرل اور دانشور ابن العاص نے رکھی تھی دوسرا در مقام العسک تھا جسے 750ء میں عباسی جنرل کے کیمپ کی جگہ تعمیر کیا گیا تھا تیسرا صدر مقام ابن طولون نے 869ء میں قہطی کے نام سے تعمیر کیا تھا پھر چوتھا اور آخری صدر مقام قاہرہ ہے جو آج تک بڑی ب و تاب سے موجود ہے قاہرہ کی بنیاد 649ء میں اس وقت کے ایک فاطمی جنرل جوہر نے رکھی فاطمیوں کا اصل مرکز شمالی افریقہ کے شہر قیروالون میں تھا پھر جب فاطمیوں نے مصر کیا تو جنرل جوہر نے اپنے فاطمی آقا و خلیفہ معز الدین کی رہائش کے لئے القاہرہ جو بعد میں قاہرہ مشہور ہوا، کی بنیاد رکھی۔

اس شہر کا نام المدینہ بھی تھا جہاں خلیفہ اپنے بے شمار حرم، کینڑوں اور غلاموں کے ساتھ رہتا تھا محل کے گرد وزیروں، امیروں اور سرکاری دفینوں کی شاندار عمارتیں بنی لی تھیں اس کا وسیع احاطہ مضبوط دیواروں اور فارمن طرز کے عالی شان دروازوں سے نوازا گیا تھا صلاح الدین نے فاطمی محلات کے خزانوں کا بیشتر حصہ اپنے آقا نور الدین کی کو بیچ کر اس کے دل میں اپنے لئے اور زیادہ جگہ حاصل کر لی تھی ان بیش بہا خزانوں میں کم حصہ امراء نوریہ میں تقسیم کیا گیا تھا خود صلاح الدین نے اپنے لئے کچھ بھی لے لیا تھا اس نے فاطمی خلیفہ کے شاہی محل میں جانے کے بجائے دارالوزارت میں قیام ترجیح دی تھی اور قصر خلافت کو سرکاری دفتر میں تبدیل کر دیا تھا۔

صلاح الدین کے دل میں کچھ ہو لیکن بظاہر وہ سلطان دمشق نور الدین زنگی کا مطیع و باہر دار تھا قاہرہ کی تمام مساجد کے خطبوں میں سلطان دمشق کی صحت و سلامتی کی دعائیں

مانگی جاتی تھیں مصر میں جو سکے ڈھالے جاتے تھے اور ان میں سلطان دمشق کا نام غرضیکہ صلاح الدین نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے اس کی فرمانبرداری پر آج بھی وہ ان امرا کی طرف سے خائف تھا جو اسے قاہرہ میں چھوڑ کے دمشق واپس آتے اور دربار میں رہ کر صلاح الدین کے خلاف سلطان کے ہر وقت کان بھرتے رہتے اور شاید یہی وجہ تھی کہ صلاح الدین کے دل میں سلطان کی طرف سے ایک قسم کا بیٹھ گیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اگر اس کا کبھی سلطان سے سامنا ہوا یا سلطان اس پر غلبہ حاصل کر لیا تو پھر اس کا زندہ بچنا ناممکن ہو گا۔

فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی باب عالی یعنی سلطان دمشق قاصد قاہرہ پہنچا اور اس نے دارالوزارت میں صلاح الدین سے ملاقات کی شاہی قافلہ میں ملاقات کی درخواست کی تھی اس لئے صلاح الدین نے اسے دارالوزارت کمرے میں بلایا جہاں وہ امرا اور وزراء سے خصوصی ملاقات کرتا تھا قاصد نے حاضری پر سلام کے بعد صلاح الدین کو سلطان دمشق نور الدین زنگی کا ایک فرمان پیش کیا۔ صلاح الدین نے فرمان کو بوسہ دے کر اسے ریشمی خریطہ سے باہر نکال کے فرمان میں صلاح الدین کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر سرحدی قلعہ الشویک پر اسے تباہ کر دے صلاح الدین پر یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ اگر سلطان نے محسوس کی تو وہ خود بھی صلاح الدین کی مدد کے لئے قلعہ الشویک آجائے گا صلاح اس فرمان سے بڑی مسرت ہوئی دراصل مصر کے حالات درست ہونے کے بعد صلاح کا دل اسے جہاد پر اکسا رہا تھا یہ ٹھیک ہے کہ صلاح الدین نے آج تک جتنی لڑائیاں تھیں اس میں اس کا جذبہ جہاد کارفرما رہا تھا لیکن بالشویک پر حملہ دراصل نصرانی یعنی براہ راست شاہ یروٹلم پر حملہ ہو گا۔

قلعہ الشویک اور قلعہ کرک پر قبضہ کا منصوبہ صلاح الدین نے دو تین سال بنایا تھا اس نے سوچ رکھا تھا کہ ذرا اطمینان ہوتے ہی وہ ان دونوں قلعوں پر نہ کرے گا کیونکہ الشویک کا قلعہ سلطنت شام اور سلطنت مصر کی سرحد پر ایک سنتر رہتا تھا اور دونوں ملکوں کے تجارتی قافلے ادھر سے ہی گزرتے تھے اس چھوٹے شاہ یروٹلم بالذات اول نے 1115ء میں تعمیر کرایا تھا اس کی چمکدار سفید فصیح پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھی اس پہاڑی پر زیتون کے باغات اور ترائی میں خوبانی باغات تھے اتنی بلندی پر ہونے کی وجہ سے شاہی قافلے قلعہ والوں کی نظروں سے سکتے تھے اور ان کے لئے یہ قلعہ ایک مصیبت بنا ہوا تھا۔

صلاح الدین نے کچھ دن پہلے اپنے جاسوسوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ موجودہ شاہ یروٹلم ایمارک کی نقل و حرکت پر خصوصی نظر رکھیں اور اگر ایمارک یروٹلم سے باہر جائے تو اس کی خبر فوراً قاہرہ پہنچائی جائے۔ چنانچہ صلاح الدین نے دمشق کے قاصد کو ایک ہفتہ کے لئے قاہرہ میں ٹھہرا لیا صلاح الدین کے باپ نجم الدین ایوب نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ جب دمشق کو قاصد بھیجے یا دمشق کا قاصد اس کے پاس آئے تو اس کا رویہ بت ندیانہ ہونا چاہئے تاکہ قاصد دمشق جا کر اس کی مہمان نوازی اور سلطان سے وفاداری کا منقول الفاظ میں اظہار کرے۔

صلاح الدین نے قاصد سے درخواست کی ”اے مہمان شاہی قاصد میں فرمان شاہی سے آگاہ ہوا اور اس کی بجا آوری میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوگی میں کل ہی قلعہ الشویک کی طرف روانہ ہو جاتا لیکن تم اس شہر خواہاں سے آئے ہو جو میرا وطن ہے اور جہاں میرے آقا اور مہربان سلطان دمشق قیام فرما ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں تم مجھے کم از کم ایک ہفتہ اپنی مہمان نوازی کا موقعہ دو تاکہ میرے دل کو سکون حاصل ہو۔“

قاصد اس کے پر خلوص رویہ سے بہت متاثر ہوا اس نے جواب دیا ”اے مصر کے برگورز آپ ٹھیک کہتے ہیں وطن کی محبت ہی کچھ اور ہوتی ہے میں بھی چونکہ وطن سے مٹا ہوا ہوں اور یہاں رہتا ہوں اس لئے میں وطن کی محبت سے واقف ہوں سلطان معظم نے مجھے واپسی کے بارے میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا اس لئے میں اپنی عزت افزائی پر فخر مند ہوں گا“

”میں ذاتی طور پر شاہی قاصد کا شکریہ ادا کرتا ہوں“ صلاح الدین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ناظم مہمان خانہ کو حکم دیا کہ شاہی قاصد کی خاطر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

یہ شخص اتفاق تھا کہ شاہی قاصد کو قاہرہ میں ٹھہرے صرف دو دن ہوئے تھے کہ یروٹلم بھیجا ہوا ایک جاسوس واپس آیا اور اس نے بتایا ”امیر محترم شاہ یروٹلم ایمارک دو ناپلے قسطنطنیہ روانہ ہوا ہے“

صلاح الدین اس اطلاع پر چونکا ”اس کی واپسی کی کب تک امید ہے!“

”یہ تو نہیں معلوم ہو سکا امیر“ جاسوس نے جواب دیا ”لیکن اس کے آنے جانے میں تو دو ہفتے تو ضرور ہی لگ جائیں گے“

صلاح الدین کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا ”اچھا تم یروٹلم واپس جاؤ اور ایمارک کے آنے کی جب اطلاع ملے تو اس وقت میں جہاں بھی ہوں تم وہاں پہنچ کے مجھ سے بات کرو“

دقت کہا "سلطان عالی مقام کی خدمت میں عرض کرنا کہ صلاح الدین قلعہ الشویک پر چکا ہے امید ہے کہ بہت جلد قلعہ پر قبضہ کی خبر حضور عالی میں بھیجی جائے گی۔ سلطان یہ بھی عرض کرنا کہ قلعہ بالشویک کا معرکہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور اسے سلطان غلامی سر کر لے گا اس لئے سلطان عالم کو کوئی تردد نہ ہونا چاہئے سلطان اگر اس حملہ کے لئے زحمت نہ گوارہ فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے یوں سلطان مالک اور میرے آقا

صلاح الدین کے اس پیغام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطان دمشق سے کسی وجہ یا بلا وجہ خائف تھا اور اس کا سامنا کرتے ڈرتا تھا بہر حال ادھر قاصد روانہ ہوا اور صلاح الدین قلعہ کی طرف بڑھا چونکہ یہ ایک سرحدی قلعہ تھا اور اپنے محل وقوع کی سے ناقابل تخییر سمجھا جاتا تھا اس لئے شاہ ایبارک کے قلعدار نے قلعہ بند ہو کے ت کا فیصلہ کیا صلاح الدین اس مضبوط اور اہم قلعہ کو برباد نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے نے حاکم قلعہ کے پاس ایک وفد بھیجا اور پیشکش کی کہ اگر قلعدار ہتھیار ڈال دے تو اور اس کے لشکریوں کو قلعہ سے بحفاظت نکل جانے دیا جائے گا۔

قلعہ بہت بلندی پر تھا اور صلاح الدین کا لشکر شام کے وقت وہاں پہنچا تھا اس کی آمد ا قلعدار کو ہو گیا تھا اس نے اسی وقت ایک قاصد شاہ یروشلم کی طرف دوڑا دیا تھا اس علاوہ یہ قلعہ اپنی تعمیر سے اب تک نصرانیوں کے قبضہ میں تھا اس لئے وہ سوچ ہی نہ تھے کہ اس پر صلاح الدین جیسا نیا جنرل قبضہ کر سکے گا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلاح الدین کے پیچھے ہوئے قاصد کو قلعہ میں داخل بھی نہ ہونے دیا اور وہ بغیر گفتگو کئے واپس

صلاح الدین کا لشکر پہاڑی کے نیچے خوبانی کے بانات میں محفوظ مقام پر خیمہ زن تھا الدین کا بھیجا ہوا قاصد رات بھر پہاڑی ڈھلوں پر بھٹکتا ہوا صبح دم واپس آیا اس تک سوائے محافظ سواروں کے باقی لشکر آرام کر رہا تھا صلاح الدین نے قاصد کا حال دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی سفارت ناکام ہوئی ہے پھر بھی اس نے قاصد کو کاموقعہ دیا۔

صلاح الدین یہ تفصیل سننے سننے تھک گیا تھا اس نے قاصد سے کوئی سوال نہ کیا یہ ضرور کیا کہ اب اس قاصد کو آئندہ سفارت کا کوئی کام سپرد نہ کرے گا۔ صلاح الدین اپنے امرا اور سرداروں سے مشورے کرتا رہا آخر یہ طے پایا کہ رات کو سپاہی باپ چڑھنا شروع کریں اور صبح ہوتے ہوتے چوٹی پر پہنچ کے قلعہ والوں کو حیران کر

جاسوس کی سمجھ میں صلاح الدین کی پوری بات تو نہ آئی مگر اسے قہیل حکم ضرور اس لئے سلام کر کے واپس ہوا اور اسی دن یروشلم چلا گیا۔

"شہابی قاصد" صلاح الدین نے ٹھہرے لہجہ میں کہا "مجھے افسوس ہے کہ تم مہمانداری کا شرف میں زیادہ دن نہ حاصل کر سکا مجھے کسی ایسی اطلاعات موصول ہوئی کہ شاید میں کل صبح قلعہ بالشویک کی طرف روانہ ہو جاؤں تم جب تک جاہو یہاں سکتے ہو"

قاصد نے عرض کیا "اے امیر گورنر" میں آپ کے حکم کے تحت قاہرہ میں رک ورنہ مجھے تو فرمان پہچانے کے بعد واپس جانا چاہئے تھا اگر آپ کل روانہ ہو رہے ا واپس جانے کی اجازت دیجئے میں بھی سرحد تک آپ کے ساتھ چلوں گا"

"یہ بالکل صحیح ہے۔ صبح کو تم ہمارے ساتھ چلو گے" صلاح الدین نے جواب دیا۔ قسطنطنیہ اس زمانہ میں مشرقی شہنشاہ روم کا دارالسلطنت تھا انہیں باز یغینی شہنشاہ کہا جاتا تھا اور اس تعلق سے اسے سلطنت باز یغینی بھی پکارتے تھے قسطنطنیہ کا میونہل کا منی نس تھا جس کی بیٹی سے شاہ زیبارک نے شادی کی تھی شاہ زیبارک جب مصیبت میں گرفتار ہوا تو مدد کے لئے قسطنطنیہ بھاگا تھا۔

جنوب میں شاہ دمشق کے ایک امیر نے حکومت مصر پر قبضہ کیا ہے اگر مسلمانوں جنگ شروع ہوئی تو اسے شمالی اور جنوبی دونوں محاذوں پر سخت مقابلہ کرنا پڑے گا۔ ایبارک اسی سلسلہ میں اپنے خسر شہنشاہ کا منی نس کے پاس قسطنطنیہ گیا تھا کہ اس مسلمانوں کے متوقع جنگ کے لئے مدد حاصل کرے نیز یورپی ممالک میں ایک بار پھر ایسی تحریک شروع کرے جو صلیبی جنگ کے نام پر سلطنت یروشلم کی مدد پر آمادہ ہو۔

صلاح الدین میں چونکہ شوق جہاد پیدا ہو گیا تھا اس لئے وہ عیسائیوں سے نفرت ہونے کے لئے چپکے چپکے تیاریاں کر رہا تھا چونکہ ملک شام اور مصر دونوں ملکوں کے الشویک کی وجہ سے وہ راستہ اختیار کرتے گھبراتے تھے اس لئے یہ قلعہ بہت پہلے سے الدین کی نظر میں تھا سلطان دمشق کے فرمان نے اس کے شوق پر تازیانہ کا کام کیا صلاح الدین نے رات بھر میں اپنے محفوظ لشکر کو روانگی کے لئے تیار کر لیا دمشق کا اس کے ساتھ تھا اور اس نے قاصد کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ سلطان دمشق کو کہ صلاح الدین نے اس کے حکم کی پوری قہیل کی ہے اور وہ قلعہ کی طرف اپنے لشکر روانہ ہو چکا ہے۔

قلعہ کے قریب پہنچ کے قاصد اس سے جدا ہو گیا صلاح الدین نے اسے رٹ

دیں ممکن ہے کہ اس وقت قلعہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتے اور قلعہ بغیر تباہ اس کے قبضہ میں آجائے۔

صلاح الدین کا شکر چونکہ خائب میں تھا اور دشمن اس کے سر پر پہاڑی کی چوٹی اس لئے اس بات کا بھی امکان تھا کہ اوپر سے کسی وقت بھی بھاری پتھر لڑھکا کر نہ پھینچا جاسکتا تھا اس خطرے کے پیش نظر صلاح الدین نے لشکر کو حکم دیا تھا وہ اپنے اسی چٹانوں کے نیچے لگائیں جو باہر کی طرف جھکی ہوں اور چھت کا کام دے سکتی لشکریوں نے اس ہدایات کے تحت خیمے لگائے تھے شام کے وقت جب صلاح الدین لشکر کے ساتھ پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک اوپر سے آگ برسنا ہو گئی۔ یہ آگ اس قدر تیزی سے برس رہی تھی کہ صلاح الدین کے لشکری گھبرا صلاح الدین نے فوراً اعلان کر لیا کہ تمام لوگ چٹانوں کے نیچے ہو جائیں اور اس تک باہر نہ نکلیں جب تک انہیں حکم نہ دیا جائے۔

اوپر سے برسنے والی یہ آگ دراصل رال کی ہاٹیاں تھیں پرانی جنگوں میں رال نفت کا عام استعمال ہوتا تھا نفت بھی ایک قسم کا تیل تھا رال اور نفت دونوں بڑی تیز آگ پکڑتے ہیں رال یا نفت کو ہاٹیوں میں بھر دیا جاتا ہے پھر انہیں دشمن لشکر پر پھینچا ہے۔ شعلے لپکاتی ہوئی یہ ہاٹیاں ٹوٹنے پر اور تباہی مچاتی ہیں اور یہ شعلے دور دور تک جاتے ہیں شعلوں اور آگ کی اس بارش سے صلاح الدین کے لشکر کو کچھ زیادہ نقصان پہنچ سکا کیونکہ اعلان ہوتے ہی لشکری بھاگ بھاگ کے چٹانوں کی آڑ میں ہو گئے تھے شعلوں نے بہت سے خیمے جلا دیئے اور صلاح الدین پہاڑی پر چڑھنے کے منصوبے آ رات مکمل نہ کر سکا۔

دوسرے دن صلاح الدین نے پہلے اپنے لشکر کو پہاڑی کے گرد پھیلا کر سخت محاصرہ پھر چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سنبھل سنبھل کے اوپر چڑھیں اور کوئی محفوظ اور راستہ تلاش کریں اس کوشش میں بھی کچھ سپاہی زخمی ہوئے کیونکہ قلعہ کے اندرونی جگہ جگہ زیتون کے باغات میں چھپے تھے اور جب کوئی سپاہی ان کی زد پر آتا تو وہ تیر اسے زخمی کر دیئے لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ صلاح الدین کو ایک صاف اور راستہ مل گیا جس سے گزر کر وہ زیادہ نقصان اٹھائے بغیر قلعہ تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن دوسری رات بھی پہلی رات والا واقعہ پیش آیا رات کا آغاز ہوتے ہی آ بارش پھر شروع ہو گئی اور یہ بارش کل کی نسبت آج زیادہ تھی اس میں ایک بات بھی اضافہ ہو گیا وہ یہ کہ کل تو اس آگ کا نشانہ صلاح الدین کی خیمہ گاہ تھی لیکن

پہاڑی کے چاروں طرف آگ برساتی جا رہی تھی شاید قلعہ والوں نے دن کے وقت صلاح الدین کے ان سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا جو اوپر آنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری رات بھی لشکر پہاڑی پر نہ چڑھ سکا۔

صلاح الدین اپنے سپاہیوں کی جانبیں فصول ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی خاموشی اختیار کی جیسے وہ اپنی خیمہ گاہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا قلعہ والے آئندہ دو راتیں بھی آگ برساتے رہے مگر پھر اس میں کمی ہوتی گئی جس سے اندازہ ہوا کہ یا تو ان کے پاس رال اور نفت کی کمی ہو گئی یا انہوں نے بھی اپنے سامان جنگ کو بیکار ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا صلاح الدین اس دوران بظاہر خاموش رہا مگر اس کے سپاہی رات کے وقت ایک ایک کر کے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے اوپر چڑھتے رہے۔

چھ دن کی مسلسل کوشش کے بعد صلاح الدین کا لشکر پہاڑی کے اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا صلاح الدین قلعہ کے سامنے اچانک نمودار ہوا تو محصورین اسے دیکھ کے حیران رہ گئے قلعہ دار کو بتایا گیا کہ صلاح الدین کا لشکر قلعہ کے سامنے پہنچ گیا اس نے قلعہ کے ایک برج سے جھانک کر اس کی تصدیق کی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے صلاح الدین اور اس کے لشکر کی بہادری کے قصے قلعہ دار پہلے ہی سن چکا تھا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسی جزل نے اپنے چچا اسد الدین شیر کوہ کے ساتھ شاہ یزدن کو شکستوں پر شکستیں دے کر مصر سے بے دخل کر دیا تھا اور اب صلاح الدین مصر پر قبضہ کر چکا ہے۔

قلعہ دار نے اپنے سرداروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ سردار فیصل صلاح الدین کے لشکر کو دیکھ چکے تھے یہ لشکر بڑے اطمینان سے اپنے مورچے قائم کر رہا تھا وہ پہلے ہی بدحواس ہو گئے تھے قلعہ دار کے سامنے پہنچنے تو ان کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی تھی قلعہ دار نے ان کی حالت دیکھ کے دل کا حال معلوم کر لیا تھا۔

”میرے بہادر سردارو!“ قلعہ دار نے ان میں حوصلہ پیدا کرنے کے لئے کہا ”یہ ٹھیک

ہے کہ دشمن ہمارے سر پر آگیا ہے لیکن مجھے اپنے بہادروں سے امید ہے کہ -----“

”محترم قلعہ دار“ ایک سردار نے قلعہ دار کی بات کاٹ دی ”پہلے یہ بتائیے کہ ہمارے

سنگین سپاہی جو زیتون کے باغوں سے خوبانی تک جاسوسی اور حفاظت کے لئے مقرر تھے وہ

سب کہاں ہیں آخر یہ لشکر اوپر کس طرح آگیا ہمارے جاسوسوں اور محافظوں نے ہمیں

اطلاع کیوں نہیں دی“

دوسرے سردار نے اس سے سخت بات کہی اس نے کہا ”میں تین راتوں تک دشمن پر

آگ برساتے رہے تاکہ وہ اوپر نہ آسکیں لیکن یہ لوگ بھوت بن کر اوپر چڑھ آئے کہ ایسا تو نہیں ہوا کہ وہ آگ جو ہم نے اپنے خیال میں دشمن پر برساتی تھی وہ ہمارے جاسوسوں اور محافظ پر برستی رہی اور وہ سب کے سب جل کے خاک ہو گئے۔

قائد پر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا ہی گیا ایک اور سردار نے کہا ”آج ہفتہ ہونے کو آیا جب ہم نے شاہ یروٹلم کو اس محاصرہ کی اطلاع بھیجی تھی مگر یروٹلم دار تو چھپے کانوں میں تل ڈال کے بیٹھے ہیں انہوں نے ہماری کوئی خبر نہیں لی۔“
چوتھے سردار نے جیسے گلی پر اور لگائی اس نے کہا ”میرا خیال ہے کہ یروٹلم سے ملک نہیں آئے گی کیونکہ ہمارے قاصد کو دشمنوں نے ضرور گرفتار کر لیا ہو گا یہ واقعی بھوت پریت ہیں ورنہ ہمارا کوئی جاسوس تو واپس آکے بتاتا کہ اس کے ساتھیوں پر گزری یا پھر یروٹلم جانے والا قاصد ہی ملک کی خبر لاتا۔“

”ہم کس قدر بے بس ہیں قائد محترم“ کسی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ لوگ ہمیں گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دیں گے“ ایک مایوس سردار نے کہا ”کس قدر بزدلی کی باتیں کر رہے ہو میرے سردار!“ قائد کو غصہ آگیا ”آپ لوگ نے ہر بات کو فرض کر لیا لیکن یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سپاہیوں اور محافظوں نے مبادری سے مقابلہ کر کے جان دی ہو اسی طرح یروٹلم سے بھی ناامید نہ ہونا چاہئے عجب کہ ایک دو دن میں وہاں سے بھی ملک آجائے۔“

ایک سردار نے بے دلی سے کہا ”قائد محترم! آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں“
”جی ہاں! فرمائیے آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے“ ایک آواز میں زیادہ تلخی تھی۔
”میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے حوصلہ بلند کئے اور سر سے کفر باندھ کے دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ جائیے“ قائد نے بڑی جرات سے کہا۔

”لیکن“ قائد ”ایک غصہ میں بھری آواز ابھری ”یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں کہ ہم سے کفن باندھ کے اور آنکھیں بند کر کے خندق میں پھاند پڑیں دشمن کے مقابلہ پر ہمارے طاقت بہت کم ہے۔“

قائد اپنے سرداروں کی کڑوی اور کسلی باتیں سن کے مایوس ہو گیا آخر اس نے پست آواز میں دریافت کیا ”اچھا آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟“

”ہم وہی چاہتے ہیں جس کی خواہش دشمن نے ہم سے کی تھی“ ایک طرف سے کہہ بولا۔ قائد بڑبڑ گیا ”کیا تم دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنا چاہتے ہو؟“

اس سردار نے جواب دیا ”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں“

”نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا“ قائد نے غصہ سے کہا ”میں اس طرح خاموشی سے بیٹھ نہیں ڈال سکتا۔“ ابھی تو ایک دن بھی جنگ نہیں ہوئی۔ ہمارے سپاہی فسیلوں پر مارے ہمارے حکم کے خطر ہیں۔“

”قائد محترم! اگر آپ نے مقابلہ کی کوشش کی تو پھر ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔ پھر حملہ آور ہماری کوئی شرط تسلیم نہ کرے گا“ کسی سردار نے واضح کیا۔

”ہم دشمن سے گفت و شنید بھی تو کر سکتے ہیں“ قائد نے ایک رائے پیش کی ”ہمارے کے دوران سفارتی کارروائیاں شروع ہوتی ہیں ہم ایک سفارت دشمن کے پاس بھیجیں گے وہ سفارت جواب لے کر آئے گی ہم پھر سفارت بھیجیں گے جواب کے لئے ملت طلب کریں گے بہت ممکن ہے کہ اس دوران ہمیں یروٹلم سے مدد حاصل ہو جائے۔“

یہ رائے بڑی معقول تھی۔ کوئی سردار اس کی مخالفت نہ کر سکا۔

قائد نے کہا ”میرا خیال ہے آپ لوگ میری رائے سے متفق ہیں؟“

”قائد محترم! آپ کوشش کر کے دیکھ لیجئے نتیجہ کچھ نہ نکلے گا“ ایک سردار نے کہا۔

قائد نے ایک لمحہ کی دیر نہ کی اس نے دو سرداروں کو ساتھ لیا نیزے سفید پرچم اڑایا اور قلعہ کا دروازہ کھلوا کے باہر نکلا دونوں سردار اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے قائد نے خوار کیا ”خبردار کسی پر یہ نہ ظاہر ہونا چاہئے قائد تمہارے ساتھ ہے تمہیں صرف یہ ظاہر کرنا ہے جیسے اس سفارت کا میں سردار ہوں اور تم میرے نائب ہو۔“

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

قائد نے مزید تاکید کی۔ ”تمام گفتگو میں خود کروں گا۔ تم لوگ دخل نہ دینا۔ کوئی اچھی بات ذہن میں آئے تو مجھے چپکے سے بتا دینا۔“

دونوں ساتھیوں نے پر تائید میں سر ہلایا۔

صلاح الدین حملہ کی تیاری کر رہا تھا اس کا ایک ہفتہ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا وہ مزید وقت برباد کرنے پر آمادہ نہ تھا صلاح الدین سرداروں کو ہدایات دے رہا تھا کہ پہرے پر موجود ایک سپاہی نے آگے عرض کیا۔

”اے امیر وزیر اعظم! قلعہ سے تین سواری برآمد ہو کر ادھر آرہے ہیں۔ ایک سوار کے نیزے پر سفید پرچم ہے۔“

صلاح الدین کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی ”انہیں آنے دو اور عزت سے ہمارے پاس لاؤ۔ یہ امن کی سفارت ہے اس کے وقار میں ذرا بھی کوتاہی نہ ہونی چاہئے۔“

امیر کے سامنے پہنچ کے افسر استقبالیہ نے سفارت کاروں سے کہا ”آپ لوگ امیر لشکر کے سامنے ہیں“

سفارت کاروں نے ادب سے سر جھکا دیا۔ پھر قلعہ دار نے جھپکتے ہوئے نظر اٹھائی۔ ”میر محترم“ اور قلعہ دار کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

بعض مورخوں کا بیان ہے کہ صلاح الدین کے چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ ساتھ بلا کا عجب قہارہ بہت کم کھل کے ہنستا تھا ہاں مسکراتا ضرور تھا لیکن اس کی مسکراہٹ، سنجیدگی اور رعب میں ادب کے رہ جاتی تھی یہ کیفیت اس کے سلطان دمشق ہونے تک قائم رہی سلطان ہونے کے بعد تو اس کا چہرہ اس قدر پر رعب اور پر جلال ہو گیا تھا کہ انسان نظریں اٹنے کی جرات ہی نہ کرتا تھا۔

قلعہ دار نے خود کو سنبھالا اور کہا ”امیر محترم نے سفارت کاروں کو جو عزت بخشی ہے اس کے لئے ہم اور قلعہ دار الشویک آپ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے“

صلاح الدین نے مسرت سے جواب دیا ”ہمیں خوشی ہے کہ قلعہ دار نے نبرد آزمائی کے بجائے گفت و شنید کا راستہ اختیار کیا“

”اعلیٰ ظرف امیر“ قلعہ دار بولا ”قلعہ دار قلعہ آپ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں کچھ وقت چاہئے تاکہ ہم اپنا انتظام کر سکیں اور تکلیف و پریشانی سے بچ جائیں“

”انتظام کے لئے کتنا وقت درکار ہو گا؟“ صلاح الدین نے سوال کیا۔

”محترم امیر! ہم اپنا اسلحہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ اس بات کی ہمیں اجازت دی جائے“ قلعہ دار نے لجاجت سے کہا اور کنکھیوں سے صلاح الدین کو دیکھا۔

”قلعہ والوں کو صرف اسلحہ نہیں بلکہ ہر چیز لے جانے کی اجازت ہو گی“ صلاح الدین نے مختصر سا جواب دیا۔

”بہت بہت شکریہ امیر“ قلعہ دار خوش ہو گیا۔ ”صرف دس دن تک ہم سے کوئی تعرض نہ کیا جائے“

”شرط منظور کی جاتی ہے لیکن گیارہویں دن ہم سے کوئی شکوہ نہ ہو“

قلعہ دار الشویک اور صلاح الدین میں معاہدہ ہو گیا صلاح الدین مطمئن ہو گیا کہ دس دن بعد قلعہ بغیر خون بہائے اس کے ہاتھ آجائے گا۔ قلعہ دار بھی خوش خوش واپس ہوا کہ حالات نے اسے قلعہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا پس یہ معاہدہ بہت غنیمت تھا۔ اگر اس دوران یروٹلم سے کمک آتی جاتی ہے تو وہ شاہ یروٹلم کے سامنے بھی سرخو رہے گا کہ

اس کے ساتھ صلاح الدین نے پلٹ کر میدان کی طرف دیکھا امن کے تینوں مرا آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہے تھے صلاح الدین کو گھڑ سوار دیکھ کر ذرا تعجب ہوا بلندی پر گھوڑوں کا پہنچنا واقعی تعجب خیز تھا جبکہ اوپر سے آنے والی کوئی بھی پگڈنڈی ایسی تھی جس پر گھوڑا چل سکتا ہو مگر اس وقت یہ مسئلہ سوچنے کا نہ تھا سوار قلعہ اور خندق درمیان کا چھوٹا سا میدان پار کر چکے تھے اور اب خندق کے اس پار کھڑے اس پر لکڑی پل ڈالوا رہے تھے لکڑی کے تختوں کا یہ مضبوط پل زنجیروں سے بند ہوا تھا خطرے کے وقت اس پل کو خندق پر سے کھینچ کے ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا اور جب خطرہ دور ہو جاتا تو پل کو دوبارہ خندق پر بچھا دیتے اور راستہ بن جاتا۔

اتنی بلندی پر گہری خندق میں پانی کی موجودگی ہی تعجب خیز تھی قلعہ کے اندر یقیناً پانی کا بڑا ذخیرہ ہو گا جس سے یہ خندق بھری جاتی ہو گی لکڑی کے پل سے گزر کر سوار اس طرف آگئے تھے جہاں سے صلاح الدین کے پیادوں کی صفیں شکل سے سوز گز ہوں گی صلاح الدین ان صفوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔

جب سوار بالکل قریب پہنچ گئے تو صلاح الدین کا ایک سردار جو استقبالیہ افسر مقرر کیا گیا تھا وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے تین سپاہیوں کو اشارہ کیا، سپاہی بڑھ کے سواروں کے پاس پہنچ گئے انہوں نے سواروں کو اترنے میں مدد دی اور جب وہ گھوڑوں سے اترے تو ان کے گھوڑے سنبھال لئے۔

استقبالیہ افسر سفارت کاروں کو خوش آمدید کہنے آگے بڑھا۔

”میں امیر صلاح الدین سپاہ سالار افواج دمشق مقیم قہارہ کی طرف سے سفارت کا خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ لوگوں کا درود مبارک ہو“ استقبالیہ افسر نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اس کے جواب میں قلعہ دار جو آگے تھا اس نے اپنے بازو کھول دیئے گویا وہ مصافحہ کے بجائے بٹگیٹر ہونا چاہتا ہے استقبالیہ افسر نے بھی بازو کھول دیئے دونوں بڑی گرم جوش سے ملے قطع نظر اس کے کہ ان کے دلوں میں کیا تھا استقبالیہ افسر نے قلعہ دار کے بعد باقی دونوں سے بھی مصافحہ کیا پھر وہ انہیں لے کر صلاح الدین کی طرف چلا۔

”میرے ساتھ تشریف لائیے۔ میں آپ کی ملاقات سالار افواج امیر صلاح الدین سے کراتا ہوں“

قلعہ دار نے جواب میں کہا ”میں اور میرے ساتھی اس عزت افزائی کے لئے آپ کے امیر کے شکر گزار ہیں“

اس نے معاہدہ کافرئیب دے کر صلاح الدین کو قلعہ پر حملے سے باز رکھا تھا اور اگر سے کوئی مدد نہ ملی تو وہ معہ تمام ساز و سامان کے قلعہ سے نکل کر کسی طرف جا سکتا۔ حادثہ زمانہ کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ انسان خود کو کتنا ہی محفوظ اور مطمئن کیے سمجھے مگر جب قدرت مخالف ہو جائے تو کسی کی ایک نہیں چلتی قلعہ، شوٹیک کو دس را ملت دیئے ابھی ایک دن گزرا تھا کہ دربار دمشق سے ایک قاصد صلاح الدین کی خدمت میں حاضر ہوا وہ دور شاہوں اور غلیفانوں کا تھا اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ہجر ہوتا تھا اس لئے درالسلطنت اور دارالخلافہ سے دور علاقوں کے امیر اور گورنر اپنے جاہ دار الخلافہ یا صدر مقام پر مقرر کرتے تھے جو ان کے خلاف دربار میں ہونے والی سازشوں خبریں فوراً متعلقہ گورنر یا امیر کو پہنچاتے تھے اور امیر و گورنر اس خبر کے تحت تھا انتظام کرتا تھا۔

امیر و گورنر تو خیر بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اس لئے ان کا بادشاہ وقت سے خوش رکھنا درست تھا لیکن خود بادشاہ بھی اپنے گورنروں اور امیروں کی طرف سے مطمئن نہ تھا اس لئے وہ خود بھی اپنے جاسوس گورنروں اور امیروں کے علاقہ میں مقرر کرتا تھا جو اہم کی خبریں بھیجتے تھے اور بادشاہ ان خبروں کے تحت گورنر یا امیر کے خلاف قدم اٹھاتا بڑی بڑی مضبوط سلطنتوں میں جاسوس کے بجائے بادشاہ وقت کی طرف سے ہر علاقہ میں پرچہ نویس مقرر کئے جاتے تھے جو براہ راست بادشاہ کے ملازم ہوتے اور علاقہ کے حالات کے خوف سے بالاتر ہو کر بادشاہ کو سچی خبریں بھیجتے تھے یہ نظام بڑا کامیاب تھا اور اس بادشاہ وقت کو دور دراز علاقوں کی خبریں بہت جلد پہنچ جاتی تھیں۔

قاصد سیدھا صلاح الدین کے پاس پہنچا صلاح اسے لے کر اپنے خیمہ میں آگیا دربار دمشق سے کسی خبر کے آنے لگی اطلاع ہی بڑی اہمیت رکھتی تھی صلاح الدین کی دربار دمشق میں موافقت اور مخالفت دونوں کا پلہ تقریباً برابر تھا خود صلاح الدین کے ساتھ جو امراء نوریہ تھے ان میں بھی بعض امراء سلطان دمشق کے وفادار تھے اور صلاح الدین کی جاسوسی کرتے تھے مگر بظاہر وہ صلاح الدین کے وفادار تھے اور اپنے کسی فعل سے ثابت نہ ہونے دیئے کہ صلاح الدین کے وفادار نہیں قاصد کے آنے سے ان کے کان ضرور کھڑے ہوئے ہوں گے۔

مگر عجب اتفاق ہوا کہ دربار دمشق سے آنے والے قاصد کے فوراً بعد مصر سے صلاح الدین کے والد نجم الدین کا غلام آگیا۔ اس کا آنا بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا قاہرہ سے آنے والے غلام کو امیروں نے گھیر لیا لیکن اس نے قطعی زبان نہیں کھولی اور صلاح الدین کے

ریغ ہونے کا انتظار کرتا رہا دمشق کے قاصد سے گفتگو کے بعد صلاح الدین نے اپنے والد کے غلام کو طلب کیا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔

صلاح الدین جب دونوں قاصدوں سے گفتگو کے بعد خیمہ سے باہر آیا تو اس کے رہے پر پریشانی کے آثار تھے اس نے دونوں قاصدوں کو اسی وقت رخصت کر دیا پھر اپنے مرا اور سرداروں سے مخاطب ہوا اس نے ٹھہرے ہوئے لمحے میں کہنا شروع کیا ”اے دربار دمشق کے وفادار، حضرت غل سجانی سلطان معظم نے قاصد کے ذریعہ مطلع کیا ہے کہ سلطان بہ نفس نفیس ایک لشکر جرار کے ساتھ اس طرف تشریف لا رہے ہیں تاکہ اپنے گورنر کی مدد فرمائیں اور قلعہ الشویک نیز قلعہ کرک پر سلطانی پرچم لہرائیں۔ سلطان معظم نے کوئی فرمان جاری نہیں کیا تھا بلکہ قاصد کے ذریعہ اطلاع بھجوائی تھی میں نے اپنی اور آپ لوگوں کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کیا ہے اور قاصد کے ذریعہ اطلاع بھیجی ہے کہ ہم دیکھ ان کے درود کے لئے چشم براہ ہیں“

اس اطلاع دینے کے بعد صلاح الدین نے امرا پر ایک ملازمانہ نظر ڈالی اور کہا ”میرا خیال ہے کہ آپ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے بھی بے چین ہوں گے قاہرہ سے والد محترم نے کیا خبر بھیجی ہے اس کے لئے عرض ہے کہ شمالی مصر کے ان علاقوں میں جہاں سوڈانی ہنسی اکٹھے ہو گئے تھے وہاں کچھ فاطمی امراء اور شہزادے پہنچ گئے اور انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے ہم نے ان جیشوں کے خلاف پہلے بھی ایک لشکر بھیجا تھا لیکن بد ذات جیشوں نے قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا اعلان کیا تھا انہوں نے ہمیں فریب دیا اور فاطمی خلافت کے دعویداروں کے ساتھ ہو گئے ہیں“

امراء نوریہ میں سے ایک امیر نے جس کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ صلاح الدین کے خلاف ہے، کہا۔ ”ان حالات میں امیر صلاح الدین کیا قدم اٹھانا چاہتے ہیں؟“

امیر صلاح الدین نے جواب دیا ”ظاہر ہے کہ قلعہ الشویک کے مقابلہ پر مصر کی سلطنت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لئے میں محاصرہ اٹھا کر قاہرہ جا رہا ہوں تاکہ ایک طرف قاہرہ کو مضبوط کروں دوسری طرف باغیوں کی سرکوبی کے لئے معقول لشکر بھیج سکوں“

صلاح الدین نے امیر کو جواب دینے کے بعد نظریں اس کے چہرے پر گاڑے رکھی تھیں اس سے سوال کرنے والے امیر کو اندازہ ہو گیا کہ صلاح الدین کے اس موہال یا اعتراض پر خوش نہیں ہے چنانچہ امیر نے کوئی اور سوال نہ کیا خاموش ہو گیا۔

صلاح الدین نے فوری کوچ کا حکم دیا اور شام ہونے سے پہلے پہلے پورے لشکر کو ہماڑی کے نیچے لے آیا پھر وہاں سے سیدھے راستے سے قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہماڑی

سے نیچے اترنے کے بعد اس نے اپنے قاصد کے ذریعہ سلطان کو ایک نامہ بھیجا جو کچھ طرح تھا۔

جیسا کہ سلطان والا تبار کو علم ہے کہ سابق فاطمی خلیفہ العاضد نے سیاہ فام حبشیوں کے سردار نجاج کی لڑکی سے شادی کی تھی جس کے صلہ میں العاضد نے نجاج کو شاہی محل کا امیر ساماں بنا دیا تھا اس پر ساماں نے شاہی محلات کی تمام کنیزوں اور غلاموں کو درخواست کر کے ان کی جگہ سوڈانی حبشیوں اور حبشوں کو مقرر کر دیا تھا پھر جب نجاج نے مصری سلطنت کے خلاف سازش کر کے مصر سے شاہی اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا تو اس کی قوم یعنی سیاہ فام سوڈانیوں نے زبردست بغاوت کر دی اور مصر کے دارالوزارت جس میں غلام مقیم تھے پر حملہ کر دیا میں نے حبشیوں کے حملے کو پسا کر دیا اور انہیں قاہرہ سے نکال باہر کیا یہ لوگ تتر بتر ہو کر ایک بار پھر شاہی مصر میں جمع ہو گئے میں نے ان کے مکمل خاتمہ کے لئے ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ معافی مانگ کر مطیع ہو گئے اب انہی لوگوں نے بعض فاطمی سرداروں اور شہزادوں کے ساتھ پھر سے بغاوت کر دی ہے اس لئے میں اپنے والد محترم کی ایک اطلاع پر قلعہ الشویک کا محاصرہ چھوڑ کر مصر واپس جا رہا ہوں کیونکہ شاہی مصر میں بغاوت کے پیش نظر اور اس کے خاتمہ کے لئے میرا قاہرہ میں ہونا بہت ضروری ہے چونکہ مصر کے حالات غیر معمولی ہو گئے ہیں اس لئے دربار عالی میں یہ فریضہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

احقر غلام

صلاح الدین امیر دگورز اور سپہ سالار افواج شام

مقیم بلاد مصر

قاہرہ پہنچ کے صلاح الدین نے باب عالی سے قاصد کے آنے سے لے کر الشویک کا محاصرہ چھوڑنے کے تمام حالات سے اپنے والد نجم الدین ایوب کو آگاہ کیا۔ یہ معلوم ہو سکا کہ نجم الدین ایوب نے ان حالات پر کس رد عمل کا اظہار کیا لیکن وہ مند ضرور ہو گیا وہ امرائے نوریہ جو صلاح الدین کے ساتھ قلعہ الشویک گئے تھے انہوں

س بات کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ صلاح الدین قاہرہ میں پہنچنے لافنی تیاریوں میں لگ گیا تھا اس لئے سرداروں کی توجہ اس طرف ہو گئی حالانکہ ان سب کا یہ خیال تھا کہ صلاح الدین دراصل سلطان دمشق کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے الشویک کا محاصرہ ختم کر کے مصر واپس آگیا۔

بعض امرا کا یہ بھی خیال تھا کہ صلاح الدین اپنے محسن و آقا سے باغی ہو گیا ہے اور مری سلطنت کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر شاہی مصر میں بغاوت ہو بھی گئی تھی تب بھی یہ الشویک کا محاصرہ نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ قلعہ تو دس دن بعد اس کے ہاتھ میں آئی جاتا تھا۔ پھر مصر میں صلاح الدین کے سات بھائی اور درجنوں پیچھے موجود تھے میں سیف الدین ابوبکر العادل جیسا عظیم سردار بھی تھا جو حبشیوں کی بغاوت تو کیا اگر پورا رہی باغی ہو جاتا تو بھی انہیں ختم کرنے کے لئے وہ کافی تھا۔

ابھی امرائے نوریہ اور محلات میں یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ بات کھل کر سامنے آئی۔ ہوا یہ کہ صلاح الدین کا مقرر کیا ہوا ایک جاسوس دمشق سے بھامگ قاہرہ پہنچا جاسوس نصف شب کے بعد دارالوزارت پہنچا تھا اس نے داروغہ دارالوزارت سے فریاد کیا کہ وزیر اعظم سے اس کی ملاقات اسی وقت کرائی جائے دارالوزارت کے ان خانہ میں وزارت کے تمام افسران جمع ہو گئے لیکن کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ صلاح الدین کو اس وقت بیدار کیا جائے۔

جاسوس کو سخت غصہ آیا اور اس نے صاف الفاظ میں کہا ”میں آپ لوگوں سے پھر فریاد کرتا ہوں کہ وزیر اعظم کو میری ذمہ داری پر جگا دیا جائے کیونکہ میں ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں جس کا وزیر اعظم تک فوری طور پر پہنچنا انتہائی ضروری ہے اگر آپ نے نہ درخواست نہ تسلیم کی تو کل وزیر اعظم سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس تاخیر کے دار آپ لوگ ہیں“

جاسوس نے دراصل ان لوگوں کو وارننگ دی تھی۔ آخر طے یہ کیا گیا کہ دربار عالی آنے والے قاصد کی ذمہ داری پر وزیر اعظم کو بیدار کیا جائے اور اگر وزیر اعظم حکم تو قاصد کو جو دراصل صلاح الدین کا جاسوس تھا ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

صلاح الدین کے خاص محافظ نے وزیر اعظم کو آہستہ سے بیدار کیا۔ صلاح الدین ہڑبڑا اٹھ بیٹھا۔

”خبریت ہے کیا بات ہے؟“ صلاح الدین نے گہرائے لہجہ میں کہا۔

”آقاے محترم! دربار دمشق سے قاصد آیا ہے اور اسی وقت آقا سے ملنا چاہتا ہے“

”جس وقت آپ کا نامہ حضور سلطان میں پیش ہوا“ سلطان معظم اس وقت دربار خاص کا جلوس فرما رہے تھے سلطان نے بڑی بے تابی سے آپ کا نامہ پڑھنے کا حکم دیا ان کی پہلی اس وجہ سے تھی کہ ان دنوں سلطان کی پوری توجہ قلعہ الشویک کی طرف تھی اور اس وقت بھی سلطان اسی قلعہ پر گفتگو فرما رہے تھے پہلے تو سلطان کے چہرے پر خوشگوار آثار پیدا ہوئے پھر ان کی تبدیلیوں پر بل پڑ گئے۔۔۔“

”مہر زرا۔۔۔!“ صلاح الدین نے اسے روک دیا ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ تفصیل کس سے سنی اور پھر اس کی تصدیق کا کیا طریقہ اختیار کیا؟“

”وزیر اعظم!“ جاسوس نے فوراً جواب دیا ”اس دن دربار میں جو حالات پیش آئے وہ سب میں نے خود دیکھے اور سنے ہیں میں ان دنوں دربار میں کنش برادری کی خدمت پر مامور تھا یہ خدمت میرے عزیز کے سپرد تھی جو بیمار ہو گیا تھا اور اس کی جگہ میں خدمت انجام دے رہا تھا“

”شاباش! تمہاری خدمات سے میں بہت خوش ہوں۔ اب آگے بیان کرو“ صلاح الدین نے اس کی تعریف کی۔

صلاح الدین بعض معاملات میں بہت سخت تھا۔ جن آدمیوں کو اس نے خاص کام سپرد کئے تھے ان کے معاملات پر خاص نظر رکھتا تھا۔ اس کا جاسوسی کا محکمہ بھی ”خاص خدمت“ کے ذیل میں آتا تھا۔ جاسوسوں کی فراہم کردہ اطلاعات کی وہ بڑی چھان بین کرتا تھا۔ جس وقت جاسوس نے سلطان دمشق نور الدین زنگی کے چہرے کے تاثرات بیان کئے تو اسے شک ہوا کہ شاید جاسوس حفاظتی کام لے رہا ہے اس لئے اس نے اپنے اطمینان کے لئے اس سے سوال کیا تھا پھر جب جاسوس نے بتایا کہ وہ خود دربار میں موجود تھا تو صلاح الدین نے بڑی ایمانداری سے اس کے کام کی تعریف کی۔

جاسوس نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے اس کی بات کٹ گئی تھی۔ اس نے کہا ”سلطان معظم کا چہرہ خط پڑھے جانے کے دوران متغیر ہوتا رہا پھر جب خط ختم ہوا تو ان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ درباریوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ دم بخود بیٹھے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ سلطان نے امرا پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر شیر کی طرح گرج کر کہا کہ صلاح الدین کے دماغ میں ضرور فتور آگیا ہے جو وہ ہمیں حیلے بینوں سے مصر آنے سے روکنا چاہتا ہے وہ ہمیں حکم دینے والا کون ہوتا ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وزیر اعظم نے سلطان سے درخواست کی تھی کہ وہ زمت نہ فرمائیں“

”تم آگے بیان کرو۔۔۔“ صلاح الدین گہری فکر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

محافظ نے بتایا۔

”دربار دمشق سے؟“ صلاح الدین پریشان ہو گیا۔

”جی ہاں آقا“ محافظ نے کہا ”ہم لوگوں نے تو انکار کر دیا لیکن اس نے ہمیں وہ دی کہ اگر اسے آپ کے پاس اسی وقت نہ پیش کیا گیا تو وہ تمام متعلقہ لوگوں کی آپ شکایت کرے گا“

صلاح الدین نے اسے فوراً طلب کر لیا لیکن وہ پریشان تھا کہ خدا معلوم ما دمشق نے کوئی اطلاع بھیجی ہے جسے اس تک پہنچانے کے لئے قاصد اس قدر بے ہے۔

پھر جب قاصد اس کے سامنے پیش ہوا تو صلاح الدین اسے دیکھ کر مسکرا دیا کیونکہ سلطان کے قاصد کے بجائے اس کا ذاتی جاسوس تھا جسے سوائے صلاح الدین کے عز کے اور کوئی نہ پہچانتا تھا۔ صلاح الدین نے کہا ”مجھے خبر دی گئی ہے کہ دربار دمشق قاصد آیا ہے۔ اچھا ہوا کہ تمہیں کوئی پہچان نہیں سکا“

”وزیر اعظم محترم!“ قاصد نے سنبھل کے کہا ”مجھے افسوس ہے کہ آپ سے ملنے کے لئے مجھے دارالوزارت کے محافظوں سے گستاخی کرنا پڑی اور آپ کو بھی تکلیف دی میں ایک انتہائی پریشان کن خبر لے کر حاضر ہوا ہوں“

صلاح الدین نے چونک کر اسے دیکھا ”پریشان کن خبر۔۔۔“ صلاح الدین کے الفاظ دہرائے پھر خود ہی بولا ”دمشق سے آنے والی پریشان کن خبر صرف یہ ہو سکتی ہے کہ میرے بد خواہوں نے سلطان معظم کے کان بھرے ہوں اور وہ مصر پر لشکر کشی آرہے ہوں“

جاسوس نے آنکھیں پھاڑ کے صلاح الدین کو دیکھا پھر اس کی آنکھیں کھلی گئیں۔

صلاح الدین نے اسے حیران دیکھا تو متانت سے کہا ”گھبراؤ مت! میں ہر طرح سننے کے لئے تیار ہوں۔ تم بے ہنجمک بیان کرو؟“

”وزیر اعظم! خدا آپ کو زندہ و سلامت رکھے“ جاسوس نے جواب دیا ”کس نہ کی بات ہے کہ جو اطلاع لے کر میں حاضر ہوا ہوں اس کی خبر آپ کو ہو گئی۔ یقیناً کے قبضہ میں جہات ہیں جو آپ کو خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں“

”تفصیل بیان کرو“ صلاح الدین نے فکر مندی سے کہا۔

جاسوس نے تفصیل بیان کرنا شروع کی۔

دینا کہ اپنے ولی نعمت، آقا اور استاد سے مقابلہ کرنا اور اس کے سامنے ہنگی تلوار لے کر جانا اتنی بڑی نمک حرامی ہے جس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملیں گی اسی اوچھڑپن میں سویرا ہو گیا اور نماز فجر کی اذان سنائی دی۔ صلاح الدین کلمہ پڑھتا ہوا اٹھا اور وضو کرنے میں مصروف ہو گیا۔

نماز کے بعد صلاح الدین نے ناظم دربار کو طلب کر کے اسے حکم دیا ”آج کے تمام کاروبار سلطنت منسوخ کئے جاتے ہیں صرف امراءے نوریہ اور میرے تمام عزیز و اقارب کو مطلق کیا جائے کہ وہ سورج طلوع ہونے کے ساتھ دارالوزارت میں جمع ہو جائیں کیونکہ ان سب سے ایک مسئلہ پر صلاح مشورہ مقصود ہے“

نظام دربار غور سے وزیر اعظم کا حکم سنتا ہے اور ان کے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ اس وقت صلاح الدین نے اپنا حکم پھر دہرایا۔ ”تائید رہے کہ صرف امراءے نوریہ اور میرے ان عزیزوں کو دربار میں جمع ہونے کی اطلاع دی جائے جو دربار میں حاضری دیا کرتے ہیں۔ باقی تمام کاروبار معطل کیا جاتا ہے“

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ مصر میں مقیم امراءے نوریہ اور صلاح الدین کے عزیز و اقارب دارالوزارت میں جمع ہونا شروع ہو گئے ہر شخص پریشان اور ہر چہرہ تشکر تھا صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب اور ماموں شہاب الدین ہمہ وقت قاہرہ میں رہتے تھے۔ وہ بھی دربار آگئے۔ نجم الدین ایوب سب سے زیادہ پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ رات کو کون سا ایسا واقعہ پیش آیا جس نے صلاح الدین کو مجلس مشورت طلب کرنے پر مجبور کر دیا تھا کل شام کو اس کی صلاح الدین سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس نے کسی غیر معمولی واقعہ کی طرف اشارہ تک نہ کیا تھا۔

صلاح الدین اپنے باپ کی بہت عزت کرتا تھا وہ تمام معاملات میں باپ سے مشورہ کرتا اور اس کی بات کو مقدم رکھتا تھا اس اہم معاملہ میں بھی باپ سے قبل از وقت مشورہ کرنا اس کا فرض تھا لیکن اسے اس کا موقع ہی نہ مل سکا۔ دمشق سے آنے والا جاسوس اس تک نصف شب گزر جانے پر پہنچا تھا پھر اس سے گفتگو ہوئی اور اس نے جاسوس کو رخصت کر دیا اس وقت تک صبح کاذب کا وقت ہو چکا تھا صلاح الدین نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس وقت باپ کو تکلیف دے جبکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح کو مجلس مشاورت منعقد کرے گا جس میں اس کا باپ بھی شریک ہو گا۔

بہر حال اب دربار خاص بلکہ مجلس مشاورت میں اس کے تمام رشتہ دار اور امراءے نوریہ حاضر ہو گئے تھے صلاح الدین نے سب پر ایک نظر ڈالی پھر متانت سے کہا ”سب سے

”پھر سلطان نے باری باری ہر امیر سے اس کی رائے معلوم کی ”جاسوس نے اپنی جاری رکھی ”جو امیر آپ کے ہمدرد تھے انہوں نے گول میں بات کی لیکن جو امرا آپ مخالف تھے انہوں نے سلطان کی باتوں کی تائید کی مجھے صرف امیر عین الدولہ باروق کا جملہ یاد رہ گیا اس بد طینت امیر نے صاف الفاظ میں کہا کہ امیر صلاح الدین کے خلاف بغاوت کی ہو آتی ہے سلطان نے عین الدولہ باروق کے تبصرے کی تائید کی اور فیصلہ وہ صلاح الدین کی طفل تسلیوں میں نہیں آئیں گے اور اس طرح کی عدول حکمی کے لئے وہ مصر پر حملہ کریں گے اس کے ساتھ ہی سلطان نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔“

مصری وزیر اعظم کے لئے یہ وقت بڑا سخت تھا اس نے سلطان دمشق کے فیصلے کو تحمل سے سنا اسے معلوم تھا کہ سلطان مطلق العنان ہے۔ اسے اپنے فیصلے سے کوئی روک سکتا۔

صلاح الدین نے سمجھ لیا کہ یہ سلطان کا انتہائی اقدام ہے اس لئے اسے بھی فیصلہ کرنا ہو گا اس نے جاسوس کو رخصت کرتے ہوئے حکم دیا ”تم اس طویل سفر میں تھک چکے ہو گے تمہیں آرام کی ضرورت ہے لیکن خطرات بہت سنگین ہیں تم جس قدر ممکن ہو سکے دمشق واپس چلے جاؤ لیکن جس وقت تمہیں تمہیں شہر یہ احتیاط برتو کہ امراءے نوریہ میں سے کسی کی نظر نہ پڑے ورنہ وہ تم سے خواہ مخواہ کے سوالات کریں۔“

”وزیر اعظم کا حکم ہو تو میں ابھی دمشق روانہ ہو جاؤں“ جاسوس نے دلیری سے ہاں اگر مجھے دوپہر تک آرام کا موقع مل جائے تو میری تمام تھکن دور ہو سکتی ہے“

”بہتر ہے کہ تم دوپہر کے بعد ہی روانہ ہو مگر احتیاط لازمی ہے“ اس آخری ہدایت بعد صلاح الدین نے اسے رخصت کر دیا۔

رات کا کچھ حصہ ابھی باقی تھا۔ اسے یوں بھی نیند نہ آرہی تھی۔ اس نے یک خیال کیا کہ اس تازہ صورت حال پر وہ صبح تک اپنے طور پر غور کرے پھر اس معا دربار میں پیش کر کے اپنے قرابت داروں اور امراءے نوریہ کی رائے معلوم کی جا۔ جنگ یا موت سے نہیں ڈرتا ہے سپاہیانہ زندگی اور اقتدار کی جنگ میں تو موت پا فتراک سے بندھی رہتی ہے لیکن سوال یہ تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو قاہرہ میں موجود نوریہ میں سے کتنے امیر اس کا ساتھ دیں گے کیونکہ سلطان کا مقابلہ کرنا کسی بھی لئے بہت مشکل تھا خود صلاح الدین جب اپنے دل کو ٹٹولتا تو اس کا دل بے دھڑک

ان باتوں کے علاوہ صلاح الدین کے سات بھائی اور بھتیجے اس کے اس قدر وفادار اور جاں نثار تھے جو صلاح الدین کے پیسنہ پر اپنا خون بہانے کے ہر وقت تیار رہتے تھے ان کا سلطان دمشق سے کوئی تعلق نہ تھا وہ تو صلاح الدین اور صرف صلاح الدین کو جانتے تھے شاید یہی جذبہ تھا جس نے نو عمر تقی الدین عمر کو دربار کا سکوت توڑنے کا موقعہ دیا نو عمر تقی الدین، امیر صلاح الدین کے ایک بھائی نور الدولہ شاہاں شاہ کا بیٹا تھا۔

تقی الدین تلوار نیک کے کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا اس نے اپنی تلوار بے نیام کی اور لہراتے ہوئے کہا ”اگر نور الدین زنگی نے مصر میں قدم رکھا تو خدا کی قسم ہم اس سے لڑیں گے اور اس ملک سے نکال دیں گے“

نوجوان تقی الدین کے اس پر جوش اعلان سے صلاح الدین کے دوسرے عزیز و اقارب جن کی گردنیں سلطان دمشق کا نام سن کر جھک گئی تھیں ان کی گردنیں بھی اگڑ گئیں اور وہ بولنے کے لئے پر تو لے لگے لیکن نجم الدین ایوب نے کسی کو بولنے کا موقعہ نہ دیا اور غصہ میں بھرا ہوا کھڑا ہوا۔

نجم الدین نے تقی الدین کو مخاطب کر کے کہا ”او بد زبان لڑکے! منہ سنبھال کر بات کر ورنہ مجھے تیری زبان تراشنا پڑے گی۔ تیری یہ مجال کہ شاہ دولائے سلطان دمشق کا نام تو بغیر القاب کے لے۔ کیا تجھے اپنا سر کاندھوں پر بھاری اور تو جان بوجھ کے شیر مشرق کو لٹکا رہا ہے تیرا اگر یہ خیال ہے کہ اس دربار میں کوئی تیری ہمنوائی کرے گا تو یہ تیری بھول ہے ہمارے مری، ہمارے آقا اور ہمارے شاہ معظم، سلطان عالم اعلیٰ حضرت نور الدین زنگی ہیں“ پھر نجم الدین ایوب نے بھی تلوار نیام سے نکالی لی اور اسے لہراتے ہوئے صلاح الدین سے سوال کیا ”اے شہسوار اور شمشیر زن صلاح الدین، میں تیرا باپ نجم الدین ایوب ہوں اور اس بے لگام تقی الدین کے برابر کھڑا ہوا شخص تیرا سگا ماموں شاہاب الدین ہے اس دربار میں کیا کوئی دوسرا آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ تمہیں ہم دونوں سے زیادہ چاہتا ہے یا ہم سے زیادہ کسی اور نے تمہیں پیار دیا ہے؟“

”ہرگز نہیں بابا جان“ صلاح الدین نے فوراً انکار کیا ”آپ دونوں بزرگوں سے زیادہ مجھے کس نے چاہا ہے اور نہ چاہ سکے گا“

”تو تو اے صلاح الدین! باوجود تجھ سے اس قدر پیار اور محبت کے اگر میری یا تیرے ماموں کی سلطان دمشق سے ملاقات ہو جائے تو یقین کر کہ ہم اس کی خاک پا کو بوسہ دیں گے اس کے آگے سر جھکائیں گے اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کے چلیں گے اور اگر وہ ہمیں تیرا سر قلم کرے گا حکم دیں گے تو ہم اس کی فی الفور تعمیل کریں گے اس بات

پہلے تو میں معذرت پیش کروں گا کہ میں نے آپ لوگوں کو اس قدر سویرے زحمت لیکن بات ہی ایسی تھی کہ میں ایک لمحہ انتظار نہ کر سکتا تھا۔ اب میں اپنے دوست ہمدردوں اور رشتہ داروں پر افسوس کے ساتھ اس بات کا انتظار کر رہا ہوں کہ دربار دمشق میں میرے بد خواہوں نے سلطان معظم کے اس قدر کان بھرے ہیں کہ انہیں میرے بغداری اور حکم عدولی کا شبہ ہونے لگا ہے۔ چنانچہ سلطان عالی مقام اپنے اس غلام کی سر کے لئے ایک لشکر جزار کے ساتھ مصر کا رخ کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ خبری فوری تو مطالبہ کرتی ہے اور اس لئے میں نے آپ لوگوں کو زحمت دی ہے آپ لوگ میرے بزرگ اور ہمدرد ہیں مجھے مشورہ دیجئے کہ اس سلسلہ میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہئے؟“

اس خبر سے دربار پر سناٹا چھا گیا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہر شخص تھرا اٹھا سلطان دمشق لشکر لے کر مصر آنے کا مطلب تھا کہ دمشق کی عظیم مسلم مملکت اور مصر کی اہم مملکت مسلمان ریاست آپس میں ٹکرا جائیں۔ وہ وقت کیسا بھیانک ہو گا جب مسلمان کی مسلمان ہی کی تلوار سے ٹکرائے گی اگر صلاح الدین نے سلطان دمشق نور الدین زنگی پنجہ آزمائی کی کوشش کی تو زمانہ کیا کہے گا یہی کہ ایک آقا کے مقابلہ پر اس کا غلام ایک محسن کے سامنے ایک احسان فراموش کھڑا ہو گیا کیا یہ غلط تھا کہ جب صلاح الدین باپ نجم الدین ایوب کو قلعہ شکریت سے ٹکنا پڑا تھا تو اسے نور الدین زنگی کے باپ الدین زنگی نے اپنے سائیہ عافیت میں جگہ دی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی خود صلاح الدین کی پرورش اور تربیت سلطان نور الدین زنگی نے کی تھی صلاح الدین کو صلاح الدین بنا میں اس کے چچا اسد الدین شیر کوہ کا بھی بڑا حصہ تھا فنون سپہ گری کے گردوں سے صلاح الدین کو شیر کوہ ہی نے آگاہ کیا تھا لیکن یہ سلطان نور الدین زنگی کی بلندی نظری اور اظہار تھی جس نے صلاح الدین کی تربیت میں اس قدر دلچسپی لی جیسے صلاح الدین، امیر الدین کا بیٹا نہیں بلکہ سلطان نور الدین زنگی کا اپنا نعت جگر ہو۔

دربار کا سناٹا طول کھینچتا جا رہا تھا درباریوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس معاملہ کیا مشورہ دیں کس رائے کا اظہار کریں ایک طرف وہ سلطان تھا جس کے وہ سب ملازم غلام تھے دوسری طرف وہ جوان عمر پہ سالار اور مصر کا وزیر اعظم تھا جس نے اپنی شہسہ ہر وار اور حکمت عملی سے مصر سے تقریباً دو سو سالہ فاطمی اقتدار ختم کر دیا تھا جس معرکوں نے یروشلم کے نصرانی شاہ ایملارک کی چہرہ دستیوں سے مصر کو محفوظ کیا اور اسے شکستوں پر شکستیں دے کر اسے اپنی حدود میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا اور آج سلطان مصر، سلطنت یروشلم ہی نہیں بلکہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا منی نس کے لئے بھی خطرہ بن گئی تھی

سے اندازہ لگا لے کہ جب ہم جو کہ تیرے پیارے ہیں وہ تیرے ساتھ یہ سلوک کریں گے تو پھر غیروں کا تیرے ساتھ کیا رویہ ہو گا اگر سلطان معظم یہاں آجائیں تو ہم سب اور پورے لشکر اس کی تعظیم کرے گا ملک شام کی طرح ملک مصر بھی اس کے لیے ہے وہ اگر ہمیں سرفرازی کوئے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے اور اگر معزول کرے تو ہم اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔

باپ کے خطاب سے صلاح الدین کا سر جھک گیا تھا۔ نجم الدین ایوب نے سانس نہ کر کہا ”اے میرے بیٹے اگر تجھے اپنے باپ، خاندان اور خود تیرے اوپر سلطان دمشق کے احسانوں میں سے ایک احسان بھی یاد ہے تو بے شک سلطان کو کہلو، اے کہ اے میرے آقا مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس غلام پر غداری کا شبہ ہے اور آپ کا ارادہ اس ملک حملہ کرنے کا ہے لیکن اس زحمت اور تکلیف کی کیا ضرورت ہے آپ ایک اونٹنی پر ایک قاصد کو یہاں بھیج دیجئے تاکہ وہ ایک پٹکے سے میری گردن باندھ کے آپ کے حضور پیش کر دے مصر میں کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ آپ کے قاصد کی بھی مزاحمت کر سکے۔“

آخر میں نجم الدین نے حاضرین سے کہا ”آپ اصحاب واپس جا سکتے ہیں۔ ہم سر لوگ سلطان دمشق نور الدین زنگی کے غلام ہیں وہ جو سلوک چاہیں ہمارے ساتھ کریں۔ یہاں کسی میں زبان ہلانے کا بھی پارہ نہیں۔“

جب سب چلے گئے اور صرف نجم الدین اور صلاح الدین رہ گئے تو نجم الدین نے بہ کو سمجھایا ”صلاح الدین بیٹے! امیروں اور حکمرانوں کو اپنے دل کا حال افسروں کے ساتھ کبھی نہ بیان کرنا چاہئے کیونکہ دو کشتیوں میں بیٹھے افسروں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ امرا۔ نوریہ میں بہت سے حامد موجود ہیں ان سے بھلائی کی توقع رکھنا عبث ہے اگر میں تقی الدین کی بات کی تائید کرتا تو تمہارے یہی قاصد سلطان کو اور زیادہ تمہارے خلاف بھڑکاتے اور جنگ تک پہنچ جاتی اس وقت جنگ جو کہ خانہ جنگی ہو گی ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ نے مصالحت کا طریقہ اختیار کیا اور ایسی باتیں اپنی زبان سے کہیں کہ اگر امرا ان باتوں سلطان تک پہنچائیں گے تو اس سے تمہیں نقصان کے بجائے فائدہ ہی پہنچے گا۔“

صلاح الدین نے باپ کے مشورہ پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا ”بابا جان! آپ بالکل صحیح مشورہ دیا اور بڑی دور اندیشی سے کام لیا میں آپ کی باتوں کو بالکل اسی طرح اپنے خط میں درج کروں گا جس طرح آپ نے اس وقت کہی ہیں۔“

مشورہ نہایت مناسب تھا صلاح الدین نے اسی وقت اپنے ہاتھ سے خط لکھا اور باپ قاصد کے ذریعہ دمشق روانہ کر دیا۔ نجم الدین اس سلسلہ میں اتنا بے چین تھا کہ بعد وہ

خود صلاح الدین سے ملنے پہنچ گیا ”بابا جان خیریت تو ہے آپ نے کیونکر تکلیف فرمائی مجھے بلوایا ہوتا۔“ صلاح الدین کے انداز سے پریشانی اور حیرت کا اظہار ہوتا تھا۔

”بس یونہی آگیا“ نجم الدین نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا ”ارے ہاں تم نے سلطان کو خط بھیج دیا؟“

”خط بھیج دیا اور قاصد کو تاکید کی کہ وہ جلد از جلد دمشق پہنچنے کی کوشش کرے۔“ صلاح الدین نے اطمینان سے جواب دیا ”میں نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ سلطان جہاں اور جس جگہ بھی ہوں یہ خط انہیں دیں پہنچایا جائے۔“

”شبائش بیٹے۔ یہ تم نے بڑا اچھا کیا“ نجم الدین کا لہجہ بھی مطمئن تھا ”یہ بات تو خیر اس مصلحت کی تھی جو حکمرانوں کو اکثر پیش آتی ہیں ورنہ اس سے ہٹ کے حقیقت تو یہ ہے کہ میرے اور جوان عمر تقی الدین کے خیالات میں ذرہ برابر فرق نہیں اس بچے نے سلطان کے خلاف زبان کھول کر اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ایوبی خاندان میں تقی الدین جیسے سر پھرے جوان بھی موجود ہیں جو کسی مصلحت کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی اور اپنے خاندان کی سربلندی چاہتے ہیں۔“

”بابا جان آپ درست فرما رہے ہیں“ صلاح الدین نے کہا ”میں بھی اس وقت مصلحتاً خاموش رہا ورنہ میرا دل چاہا تھا کہ اس جوان کی پیٹھ ٹھوکوں اور اس کی جرات کی داد دوں۔“

”تمہیں علم نہیں صلاح الدین کہ اس وقت میرے دل پر کیا گزری تھی جب تم نے یہ کہا تھا کہ سلطان کو تم پر غداری کا شبہ ہے اور وہ مصر پر فوج کشی کر رہے ہیں۔“ یہ الفاظ راکرتے وقت بوڑھے جرنیل کا جسم کانپ رہا تھا۔ یقین کرو بیٹے مصر تو خیر ایک عظیم سلطنت ہے اگر سلطان تم سے اس ملک کا ایک گنا واپس لینے کی کوشش کرے تو میں اور میرا پورا خاندان مرنے مارنے پر تیار ہو جائے گا۔ اس ملک میں سب سے پہلے تمہارے چچا سعد الدین شیر کوہ نے نصرائیوں کے تسلط سے آزاد ملک کا تصور دیا پھر اس کی بنیاد رکھی اور تم نے اس بنیاد پر ایک عظیم اسلامی سلطنت کا ایوان تعمیر کیا کیا تمہاری قربانیوں کو ضائع کیا جاسکتا ہے نہیں ہرگز نہیں۔“

نجم الدین ایوب کا اندازہ ٹھیک تھا صلاح الدین کی مجلس مشاورت سے اٹھتے ہی تمام امراء نوریہ نے اپنے اپنے طور پر آج کی مجلس کی پوری روداد سلطان کو لکھ بھیجی وہ امراء نوریہ جو صلاح الدین کے ہی خواہ تھے ان کی تحریریں صلاح الدین کی موافقت میں تھیں انہوں نے پر زور الفاظ میں صلاح الدین پر ”غداری“ کے الزام کی تردید کی تھی رہے

”بے شک بابا جان آپ صحیح فرماتے ہیں میں جب اس جنگ کا تصور کرتا ہوں تو اپنی جگہ کاپ اٹھتا ہوں“ امیر صلاح الدین وزیر اعظم مصر نے جو خود ایک زبردست سلطنت کا ایک بن گیا تھا یہ کہہ کر ایک بڑی حقیقت کا اعتراف کیا۔

سلطنت مصر میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں آرہی تھیں۔ مرحوم فاطمی خلیفہ کے خاندان والوں کو صلاح الدین نے جو مراعات دے رکھی تھیں اس سے وہ جائز اور ناجائز فائدے اٹھا رہے تھے شاہی خاندان کی دیکھ بھال اور ان کے معاملات کو طے کرنے کے لئے پہلے ماؤ الدین قراقوش کو مقرر کیا گیا تھا لیکن اس نے شاہی خاندان کے افراد پر کچھ سختی کی تھی جس کی بنا پر لوگ اس سے براہم ہو گئے یہ بات جب صلاح الدین تک پہنچی تو اس نے اس عہدے سے قراقوش کو ہٹا کر فقیہ عیسیٰ ہکاری کو لگایا گیا تھا فقیہ عیسیٰ ہکاری، شاہی خاندان والوں کے لئے فرشتہ ثابت ہوئے انہوں نے شاہی خاندان پر سے بہت سی پابندیوں کا خاتمہ کر دیا اب وہ لوگ نہ صرف آپس میں مل جل سکتے تھے بلکہ قاہرہ کے دوسرے محلوں میں بھی اٹنے لگے تھے۔

یہ سب کچھ ہوا مگر شاہی خاندان کے افراد کی شادی پر اب بھی بدستور پابندی تھی اور رخصت کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنی شادی کے سلسلہ میں دارالوزارت سے اجازت اہل کرنا پڑتی تھی۔ شادی کی یہ درخواست اگر مرد کی طرف ہوتی تو اسے اپنی پسند کی رت کے کوائف دینا ہوتے اور اگر درخواست دہندہ عورت ہو تو اسے اپنی پسند کے مرد کے بارے میں ضروری اطلاعات فراہم کرنا پڑتی تھیں اس طرح ایک درخواست درشوار نے بہاؤ الدین کے ذریعہ وزیر اعظم کی منظوری کے لئے پیش کی تھی لیکن اسی دوران شہزادہ آدین عاضد کی بغاوت کی افواہ اڑی اور پکڑ دھکڑ اور گھر گھر تلاشی شروع ہو گئی صلاح الدین سے بعض شہزادوں نے شکایت کی بہاؤ الدین قراقوش نے بغاوت کی آڑ لے کر خزانوں پر زیادتی کی ہے پس صلاح الدین کے تحقیقات کے بعد بہاؤ الدین کو اس عہدے سے ہٹا دیا۔

اس کے بعد قلعہ الشویک کے محاصرے کا واقعہ پیش آیا اور صلاح الدین خود ایک نکل میں پھنس گیا اگر اس کا باپ نجم الدین ایوب اسے سلطان دمشق کے پاس معذرت نہ بھیجے گا مشورہ نہ دیتا تو پھر نہ جانے مصر کا کیا حشر ہوتا مختصر یہ کہ اس الٹ پلٹ میں درشوار کی درخواست کہیں غرور ہو گئی جب کافی عرصہ گزرنے پر بھی درشوار کو جواب نہ ملا تو اسے فکر ہوئی درشوار کی کنیزوں اور غلاموں نے طیب اعظم کو اس محل میں آتے

وہ امرا جو صلاح الدین کے نہ موافق تھے اور نہ مخالف انہوں نے سادہ الفاظ میں آج کے واقعات کی تفصیل لکھی تھی اور اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔

صلاح الدین نے تو سلطان کو دوسرے کے بعد خط لکھا تھا اور اس کا قاصد قریب دمشق روانہ ہوا تھا لیکن امراء نوریہ نے سلطان کو اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے فوراً ہی اپنے قاصد دمشق روانہ کر دیئے تھے جو صلاح الدین کے قاصد سے بہت پہلے سلطان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ سلطان دمشق نے اس وقت تک لشکر کوچ کا حکم نہ دیا تھا اور اس ترتیب میں مصروف تھا کہ امراء نوریہ کے قاصد یکے بعد دیگرے آئے شروع ہو گئے امراء نوریہ کے پیغامات ہی سے سلطان کے خیالات میں صلاح الدین کی طرف سے زلزلہ پیدا ہو گئی تھی پھر جب صلاح الدین کا خط موصول ہوا تو سلطان نور الدین زنگی اپنے مصر نائب کی طرف سے بہت کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا دل پور طرح صاف ہو گیا لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس نے مصر پر فی الحال قوت کشی کا ارادہ ملتوی کر دیا سلطان بڑا جماندہ تھا ممکن ہے کہ اس کو دل میں یہ بھی خیال آیا ہو کہ یہ فوج کشی اور دمشق دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ ایک اندازے کے مطابق صلاح الدین نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ وہ نصرانی بادشاہ یروثلیم کا نہ صرف آسانی سے مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ خود بھی یروثلیم پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اس نے صلاح الدین کے زبانی اظہار اطاعت پر خوشنودی کا اظہار کیا اور مصر کے خلاف فوج کشی سے باز رہا۔

پھر جب دمشق سے اطلاع پہنچی کہ سلطان نور الدین نے صلاح الدین کے معذور نامہ کو شرف قبولیت بخشا ہے اور اس نے فوجی تیاریوں کو منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔ تو قاہرہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صلاح الدین اسی وقت باپ کے پاس پہنچا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا ”بابا جان خدا آپ کا سایہ میرے سر پر قیامت تک برقرار رکھے“ اطلاع آئی ہے کہ سلطان نے مصر پر حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لشکر کی تیاری منسوخ گئی ہے اور میرے خط میں لکھی گئی حقیقتوں کو سلطان نے منظور فرمایا ہے“

نجم الدین ایوب کی بوڑھی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک اٹھے اس نے بھرا ہوئے لہجہ میں کہا ”صلاح الدین شکر ہے کہ ہم ایک بڑی مصیبت سے محفوظ رہے ورنہ خدا نخواستہ مصر اور دمشق کے لشکر ٹکرا جاتے تو دو میں سے ایک کا خاتمہ لازمی تھا جیسے بھی نقصان ہی میں رہتا اس لئے کہ اس جنگ کے بعد اس میں اتنی سکت بھی نہ رہتی کہ شاہ یروثلیم کے حملے کو بھی روک سکتا۔“

جاتے کئی بار دیکھا تھا لیکن سوائے درشوار کی رازدار کنیز نیل کے اور کوئی نہ جانتا تھا درشوار نے طبیب اعظم کے ساتھ شادی کی اجازت مانگی ہے۔

درشوار کی حیرت گوارہ نہ کرتی تھی کہ وہ طبیب اعظم سے اپنی درخواست کے بارے میں کچھ پوچھے وہ طبیب اعظم پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ شادی کے لئے بے پیر ہے۔ درشوار شادی کے لئے بے چین تو نہ تھی لیکن شادی اس کی ضرورت بن گئی تھی ملکی حالات میں مد و جزر پیدا ہو رہا تھا بغاوت کی افواہیں روز اڑا کرتی تھیں ان حالات میں وہ چاہتی تھی کہ کس طرح ایک ٹھکانے لگ جائے اور ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑا انقلاب آجائے اور اس کی مراعات ختم کر دی جائیں۔

طبیب اعظم کا درشوار کے محل آنا جانا بھی ان دنوں کچھ ہو گیا تھا دراصل جب۔ فقیہ عیسیٰ ہکاری نے شاہی خاندان کی نظامت کا عہدہ سنبھالا تھا اس وقت سے اخراج کے کم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی زد میں بہت سے لوگ آگئے تھے قصر کبیر یعنی خلافت کے تمام ملازمین اب تک شاہی خزانہ سے مشاہرہ پا رہے تھے حالانکہ فاطمی ظا العاضد کی وفات کے بعد ان کا کوئی کام نہ رہ گیا تھا سرکاری خزانہ پر یہ ایک طرح کا تھا فقیہ عیسیٰ ہکاری نے ان بیکار ملازمین کو دوسرے دفتروں اور دوسرے شہروں میں تعینا کرنے کی سفارش کی تھی پس وہ لوگ جو حلال کی روزی کمانا چاہتے تھے وہ تو باقی رہ گئے لوگ خود ہی ملازمت چھوڑ گئے تھے۔

طبیب اعظم اور اس کی طرح کے اور بہت سے عہدیدار جو فاطمی خلیفہ کی ذات و وابستہ تھے ان کے لئے کوئی کام باقی نہ رہ گیا تھا فقیہ عیسیٰ ہکاری نے یا تو ان کا مشاہرہ بند کر دیا تھا یا نصف کر دیا تھا طبیب اعظم کے پاس ایک چھوٹی سی جاکیر تھی اور قاہرہ تین چار محل نما حویلیاں تھیں ان کا مشاہرہ بند ہوا تو ان کا چہرہ بھی شکن آلود ہو گیا شکائیں غصہ کی نہیں بلکہ فکر کی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے درشوار کے پاس کم کر دیا تھا۔

ایک دن درشوار نے رازدارانہ انداز میں نیل سے کہا ”تو دیکھ رہی ہے نیل کہ طبیب اعظم کے رویے میں کچھ دنوں سے فرق آگیا ہے؟“

”محترمہ عالیہ!“ نیل نے فوراً جواب دیا ”یہ بات میں کئی دن سے آپ سے کہنا تھی لیکن اس خیال سے زبان بند رکھی کہ کہیں محترمہ عالیہ کو ناگوار نہ گزرے۔“ طبیب اعظم کی بات تو بالکل صاف ہے ان میں آپ کے لئے پہلی سی لپک باقی نہیں رہی پہلے آتے تو اپنی عمر سے منہ موڑ کر جوانوں کی طرح گدگدیاں کرتے تھے ان کے آنے سے

میں رونق آجاتی تھی کیس اب ان کا آنا بھی کم کم ہے اور بات کرنا بھی کم کم۔“ ”ٹھیک ہے نیل۔ میں بھی اسی طرح محسوس کرتی ہوں مگر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“ نیل نے اس سے سوال کیا۔

”بھلا یہ اندازہ تو نے کیسے لگایا؟“ درشوار نے دلچسپی ظاہر کی۔

”پہلی بات تو یہ کہ طبیب اعظم کو اپنی زندگی میں آپ جیسی حینہ کے قریب بیٹھنا تو درکنار بات کرنا بھی نصیب نہ ہوا ہو گا دوسرے یہ کہ ان کے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ وہ خلیفہ محترم کی محبوب ترین بیوہ کے شوہر ہونے والے ہیں یہ تو ان کی خوش قسمتی ہے کہ آپ انہیں اپنے محل میں داخل ہونے دیتی ہیں ورنہ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ شاہی خاندان کی کوئی عورت ان سے علاج کے علاوہ دوسری بات کرے۔“ نیل اپنی رو میں درشوار کی تعریفیں کرتی چلی گئی۔ اس کی تعریف کچھ غلط بھی نہ تھی ایسی عورتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور قسمت والے ہی کو ملتی ہیں۔

درشوار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”ان باتوں کے باوجود اسے شادی سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔“ مجھے اجازت کی درخواست دیئے کتنے مہینے ہو گئے اس نے آج تک نہ تو مجھ سے پوچھا ہے اور نہ خود کوئی کوشش کی۔“

”ماں! اگر مہراں ہو تو کنیز اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے یہی جذبہ نیل کے دل میں پیدا ہوا اس نے کہا ”محترمہ عالیہ! میں بہت حقیر سی کنیز ہوں لیکن آپ اجازت دیں تو میں آپ کے کام کے لئے ناظم کے دفتر کے علاوہ دارالوزارت بھی جا سکتی ہوں۔“

درشوار نے تعجب سے اسے دیکھا ”تم۔۔۔۔۔ تم دارالوزارت جاؤ گی؟“

درشوار کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی ”میرا خیال ہے کہ پہلے تم یہاں کے ناظم کے دفتر جاؤ اگر وہاں کچھ پتہ نہ چلے پھر دارالوزارت جانا۔“

”آپ اس کی فکر نہ کیجئے محترمہ عالیہ“ نیل نے کہا ”آپ کو اپنے کام سے مطلب ہے تو دارالوزارت سے ہو یا پھر قصہ سلطانی سے ہو۔“

”بھئی واہ! تجھ میں تو بڑی ہمت ہے نیل۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا ورنہ اب تک میرا کام ہو چکا ہوتا۔“ درشوار کو اس پر اعتبار ہوتا جا رہا تھا۔

نیل نے پوچھا ”مجھے کب جانا ہو گا محترمہ عالیہ؟“

”یہ تمہاری مرضی! جب چاہے چلی جاؤ۔“ درشوار نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا۔

”میں آج ہی سے اپنا کام شروع کئے دیتی ہوں“ نیل نے فیصلہ کر دیا ”ہاں ایک بات

”تم نے کوئی گستاخی نہیں کی“ فقیہ سادگی سے بولے ”اس جگہ جو بھی آتا ہے وہ لوگ ہوتا ہے اور پریشانی میں انسان کا دماغ ٹھکانے نہیں رہتا میری کوشش ہوتی ہے کہ سب کو مطمئن کروں ہاں تم نے کام نہیں بتایا ابھی تک؟“

..... محتار مالیہ نے ایک درخواست دی تھی۔ اسے تین مہینے گئے ہر

جگہ اسے پوچھتا پڑا اور وہ دوسریں پار کر کے نام سے دوسری خانہ داخل
نیل کو دفتری کاموں کا پتہ نہ تھا اس نے نظام کا دفتر پوچھا اور سیدھی دفتر میں داخل
ہو گئی دفتر کے اندر ایک بزرگ بیٹھے کانڈات الٹ پٹ کر رہے تھے نیل نے ان کی بزرگ
کا لحاظ کیا اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی اس نے سوچا کہ بزرگ کانڈات سے فارغ؟
جائیں تو وہ بات کرے لیکن بزرگ کا کام ختم ہی نہ ہوتا تھا وہ ایک کانڈا لٹھاتے اسے غر
سے پڑھتے کچھ سوچتے پھر اس پر کچھ لکھ کے الگ رکھ دیتے پھر دوسرا کانڈا اٹھا لیتے نیل آیا
گھنٹے تک یہی لکھا پڑھی دیکھتی رہی۔

ناظم نے شہزادے نزار کو مخاطب کیا ”شہزادے بہادر! میں نے آپ کی درخواست کے جملہ کوائف کی تحقیقات کی مجھے خوشی ہے کہ آپ کی تحریر کردہ کوئی بات غلط نہیں آپ کی جاگیر کسی غلطی کی بنا پر ضبط ہوئی ہے۔ میں نے آپ کے کانڈات دارالوزارت بھیج دیے ہیں“

ناظم کی بات کٹ گئی۔ کیونکہ وہ آدمی جسے ناظم نے درشوار کی درخواست کے سلسلہ میں کہا تھا وہ ایک بھاری رجسٹرلے کے آگیا۔ اس نے رجسٹر ناظم صاحب کے سامنے پھیلا دیا اور ایک جگہ انگلی رکھ کے بولا ”یہ ملاحظہ فرمائیے۔ محترمہ عالیہ درشوار کی درخواست کا یہ اندراج موجود ہے اس کے دوسرے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ درخواست دارالوزارت بھیجی گئی تھی لیکن اس کی واپسی کا کوئی اندراج نہیں ملتا“

ناظم فقیہ عسکری ہکاری کچھ سوچنے لگے۔ شہزادہ نزار چونکہ پڑا تھا اسے معلوم تھا کہ درشوار مصر کی حسین ترین خاتون ہے اور وہ کچھ عرصہ قصر کبیر میں مرحوم فاطمی خلیفہ کی محبوب ترین بیوی رہ چکی ہے اس کے دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہوئی شہزادہ نزار نے اب تک شادی نہیں کی تھی جاگیر کے ضبط ہو جانے کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھا کسی دشمن نے اس پر الزام لگایا تھا کہ شہزادہ کا تعلق باغی سوڈانیوں سے ہے اس شبہ میں اس کی جاگیر جتنی سرکار ضبط ہو گئی تھی۔

ناظم نے سر اٹھا کے نیل کی طرف دیکھا ”تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا بیٹی؟“

”نیل“ نیل نے جواب دیا۔

”ہاں نیل! محترمہ عالیہ سے کتنا کہ ان کی درخواست دارالوزارت بھیجی گئی تھی لیکن اس کی واپسی کا کوئی اندراج نہیں ملتا“ ناظم نے ٹھہر ٹھہر کے کہا ”یہ سب کچھ محکمہ کے کسی کارکن کی بے پروائی کی وجہ سے ہوا ہے میں اس کی تحقیق کروں گا اور خطا کار کو سزا ملے گی بالفرض اگر درخواست نہ مل سکی تو میں محکمہ کے کسی ذمہ دار شخص کو محترمہ عالیہ کی خدمت میں بھیجوں گا تاکہ وہ ان کی دوبارہ درخواست تیار کرائے۔ نئی درخواست پر میں اپنی عمرانی میں عمل درآمد کروں گا“

نیل ناظم کی باتیں غور سے سن رہی تھی لیکن اس کی نظریں بار بار بھٹک رہی تھیں کیونکہ شہزادے نزار کا ساتھی اسے بار بار دیکھ رہا تھا اور نہ معلوم نظروں ہی نظروں میں کیا مقام دے رہا تھا وہ اس نظر بازی میں مصروف تھی کہ ناظم کی آواز ابھری۔

ناظم شہزادے سے کہہ رہے تھے ”آپ کے کانڈات وزیراعظم کے ملاحظہ کے لئے روانہ کر دیئے ہیں۔ آپ کو فرصت ہو تو ذرا دارالوزارت چلے جائیے تاکہ صحیح صورت حال

جواب اب تک نہیں ملا محترمہ عالیہ جواب نہ پانے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں“ نیل نے ناظم کو وہ سب کچھ بتا دیا۔

ناظم کی پشت پر ایک کھڑکی تھی۔ انہوں نے وہ کھڑکی کھولی اور کسی کو آواز دی نیل نے گردن اونچی کر کے دیکھا کھڑکی کے اس طرف ایک بڑا ہال تھا جہاں بہت سے لوگ کام کر رہے تھے اتنے میں ایک آدمی باہر کی طرف داخل ہوا۔

”جی میں حاضر ہوں کیا حکم ہے؟“ آنے والے نے کہا۔

نیل سمجھ گئی کہ یہ وہی شخص ہے جسے ناظم نے آواز دی تھی۔

اس کی آواز پر ناظم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”دیکھو تین چار ماہ سے پہلے سے اب تک کے کانڈات کی پڑتال کرو ایک درخواست موجود ہو تو میرے پاس لے آئے“

کیا کارروائی ہوئی اگر درخواست موجود ہو تو میرے پاس لے آئے۔ اسی وقت دو آدمی چلا گیا ناظم کام میں لگ گئے اور نیل ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگی۔ اسی وقت دو آدمی اور داخل ہوئے انکی عمریں تیس تیس سال کی ہوں گی دونوں کی صحت اچھی تھی لیکن لباس میں فرق تھا ایک کا لباس امیرانہ اور دوسرا اوسط درجہ کا لباس پہنچے تھا جس کا لباس امیرانہ تھا اس نے ناظم کے قریب پہنچ کر ادب سے سلام کیا۔

ناظم نے سر اٹھایا اور آنے والے کو دیکھ کر مسکرائے ”زبہ نصیب“ شہزادے نزار تشریف لائے ہیں“

”میں فقیہ محترم کے سلام کو حاضر ہوا ہوں“ شہزادہ نزار بھی مسکرایا۔

”آپ تشریف رکھئے، میں ایک منٹ میں فارغ ہو کے آپ سے بات کرتا ہوں“ یہ کہہ کے ناظم پھر کام میں لگ گئے۔ شہزادہ نزار اور دوسرا آدمی نیل سے ذرا ہٹ کے بیٹھ گئے۔

نیل نے انہیں آتے دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی اہم آدمی ہیں ایک کے بار۔ میں تو معلوم ہو گیا کہ وہ شہزادے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا تعلق فاطمی خلیفہ کے خاندان۔ ہو گا رہا دوسرا آدمی تو اس کا راز نہیں کھل رہا تھا۔ نیل نے اس کے بازے میں سوچا کہ ضرور شہزادے نزار کا غلام ہے اگر وہ دوست ہوتا تو اس کا لباس بھی کم و بیش شہزاد جیسا ہی ہوتا۔

ناظم نے گردن اٹھائی اور نیل کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا سوائے اس کے شہزادے کا ساتھی بھی اسے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا یہ نیل کا وہم نہیں تھا بلکہ اس مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا اور دونوں بار اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

معلوم ہو سکے

”جی ہتر ہے میں اسی وقت جا رہا ہوں“ شہزادے نے جواب دے بھر جیسے اسے اک دم کچھ خیال آیا ”فقیر محترم! اگر آپ اجازت دیجئے تو میں محترمہ عالیہ کی درخواست کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے آپ کو اطلاع دیتا جاؤں“

ناظم نے نیل کی طرف دیکھا اور کہا ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ان سے پوچھ لیجئے۔۔۔۔۔ یہ ہیں نیل۔ محترمہ عالیہ کی خاص کنیز۔ یہ اجازت دے دیں تو آپ اس بارے میں بھی دریافت کر سکتے ہیں“

شہزادے نزار نے نیل کی طرف دیکھا ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں محترمہ عالیہ کی درخواست کے بارے میں بھی معلومات حاصل کروں“

نیل نے سوچتے ہوئے کہا ”یہ تو بڑا نیکی کا کام ہو گا۔ میں خود بھی اس سلسلہ میں دارالوزارت جانا چاہتی تھی لیکن میرے پاس سواری نہیں ہے اور مجھے یہاں کے راستے بھر معلوم نہیں“

”اگر تم دارالوزارت جانا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہے میری سواری موجود ہے مجھے محترمہ عالیہ کا کام کر کے بہت خوشی محسوس ہو گی“ شہزادے نزار نے بڑی بے تکلف سے نیل کو سواری کی پیشکش کر دی۔

نیل نے فقیر عیسیٰ ہکاری کی طرف دیکھا جیسے وہ ان کی اجازت چاہتی ہو فقیر نے ”جاسکتی ہو یہ شاہی خاندان کے ایک نیک جاگیردار ہیں“

نیل کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ دارالوزارت جانے کے لئے تیار ہو گئی اس نے بڑے مذہب طریقے سے شہزادے کا شکریہ ادا کیا ”میں مذہب شہزادے کی شکر گزار ہوں انہوں نے میرے کام۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے محترمہ عالیہ کے کام میں ا قدر دلچسپی ظاہر کی“

”شکریہ کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ جانے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا“ شہزادے نے نزار نے جواب دیا۔

پھر وہ سب ناظم فقیر عیسیٰ ہکاری کو سلام کر کے پلہ آئے بیڑیوں کے نیچے ان گاڑی کھڑی تھی رتھ نما خوبصورت گھوڑا گاڑی شہزادہ نزار اور ان کا ساتھی ایک طرف گئے اور ان کے مقابل کے کوچ پر نیل بیٹھی۔ دارالوزارت زیادہ دور نہ تھا یہ لوگ جلد وہاں پہنچ گئے دارالوزارت کہنے کو تو وزیر اعظم صلاح الدین کی رہائش گاہ تھی لیکن اس مردانہ حصے میں خدا معلوم کتنے دفتر قائم تھے مردانہ اور زنانہ حصہ کے درمیان میں

میں تھا جس پر صرف ایک سنتری کھڑا تھا۔

شہزادے نزار نے اپنے ساتھی سے کہا ”قسام تم نیل کے ساتھ برآمدے میں بیٹھو۔ میں کام کر کے ابھی آتا ہوں“

قسام نے جواب میں سر ہلایا شہزادہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔

”ادھر آجاؤ نیل۔ میں یہاں کئی بار آچکا ہوں“ قسام کو گفتگو کا موقع مل گیا۔

نیل نے قسام نے آنکھوں آنکھوں میں کئی باتیں کی تھیں مگر اب جو قسام نے زبان سے گفتگو کا آغاز کیا تو وہ جھج گئی اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ طویل راہ داری میں بیٹھنے کے لئے جگہ جگہ نشستیں لگی تھیں قسام نے ایک جگہ رک کر ایک نشست کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادے نزار کے آنے سے ان کی گفتگو ختم ہو گئی شہزادہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ قسام نے اسے دیکھتے ہی پوچھا ”میرے آقا آپکا چہرہ اس وقت کھلا پڑتا ہے کیا وزیر اعظم نے ہماری سنی ہے؟“

”تم بھی خوش ہو جاؤ قسام“ شہزادے نے مسرت سے کہا ”وزیر اعظم نے واقعی ہماری سن لی ہے ہماری جاگیر دار گزار ہو گئی ہے“

”مبارک مبارک۔ آپ کو مبارک ہو آقا“ پھر قسام نے نیل کی طرف دیکھ کے کہا ”نیل تم بھی آقا کو مبارک باد دو۔ شہزادے کی ضبط شدہ جاگیر واپس مل گئی ہے“

”شہزادے بہادر کی خدمت میں یہ کنیز بھی مبارکباد پیش کرتی ہے“ نیل نے قسام کے کہنے کے مطابق مبارکباد دی۔

”شکریہ!“ شہزادہ یہ کہہ کر چپ سا ہو گیا مگر فوراً ہی بولا ”بھئی مجھے افسوس ہے تمہاری محترمہ عالیہ کی درخواست کا کوئی پتہ نہیں خیال یہ ہے کہ درخواست دارالوزارت تک پہنچی ہی نہیں“

”آپ کا پھر بھی شکریہ شہزادے بہادر“ نیل نے کہا ”آپ کی یہ کیا کم انسانیت ہے کہ آپ نے ایک اجنبی کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی“

”ارے چھوڑو بھی ان تکلفات کو“ شہزادہ نزار نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی ”یہ محترمہ عالیہ کی درخواست کس بارے میں تھی؟“

”شہزادے بہادر! کنیز کا یہ کام نہیں کہ وہ مالکن کے رازوں کو کریدتی پھرے پھر اگر مجھے معلوم بھی ہوتا کہ اس میں کیا لکھا تھا تو بھی میں شاید آپ کو نہ بتاتی“ نیل کا جواب نہ تھا۔

”محترمہ عالیہ ان کا تعلق بھی تو آپ کی درخواست سے ہے“ نیل معصومیت سے بولی۔
 ”کیا۔ کیا۔۔۔ ان کا تعلق میری درخواست سے ہے یہ تو کیا یک رہی ہے۔ میں نہ
 م کو جانتی ہوں نہ کسی شہزادے کو پھر ان کا تعلق میری درخواست سے کیسے نکل آیا“
 ”محترمہ عالیہ! آپ مجھے بتانے تو دیجئے آپ بولنے ہی نہیں دیتیں“ نیل نے سوہا سا
 بتایا۔

”اچھا بھی بتا۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہے؟“ درشہوار نے اسے اجازت دے دی۔
 ”جی محترمہ عالیہ۔۔۔ شہزادے نے بھی درخواست دی تھی اور اس کا جواب بھی
 وزارت سے نہیں آیا تھا۔۔۔“

”کیا شہزادے نے بھی شادی کی اجازت مانگی تھی“ درشہوار نے چونک کے سوال کیا۔
 ”نہیں محترمہ عالیہ انہوں نے شادی کی درخواست نہیں دی تھی ویسے وہ ہیں ابھی
 بے بڑے لمبے چوڑے اور سرخ و سفید لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ایک

”تو کیا وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“ درشہوار نے اک دم سوال کر دیا۔
 نیل شرما گئی۔۔۔ ”نہیں محترمہ عالیہ۔۔۔ میرے لئے تو قسم۔۔۔“
 ”یعنی تو نے قسم کو پسند کر لیا ہے۔ خیر جب وہ رشتہ مانگے گا تو میں خیال رکھوں گی“
 درشہوار نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

”آپ تو مجھے بات پوری ہی نہیں کرتے دیتی ہیں“ نیل بھولے پن سے بولی۔
 ”ارے کیا وہ مہمان خانہ میں بیٹھے ہیں؟“ درشہوار گھبرا گئی۔
 ”جی ہاں عالیہ محترمہ یہی تو میں آپ سے کہہ رہی تھی۔ آپ سن ہی نہیں رہی تھیں
 نیل نے جواب دیا۔

درشہوار نے سر پکڑ لیا ”اری کبخت پہلے کیوں نہیں بتایا؟“
 ارہ دونوں شہزادے نزار کی خاطر و مہارت کے انتظام میں لگ گئیں۔

”نیل اگرچہ تمہارا جواب گستاخی کی حدود میں آتا ہے مگر میں بہت خوش ہوا ایک
 وفادار کنیز کا یہی کردار ہونا چاہئے“ شہزادے نزار کو ناگوار گزرا تھا لیکن وہ نیل کی تعریف کے
 بغیر نہ رہ سکا۔

قسام نے بھی شوخی دکھائی ”میرے آقا نیل تو بہت خوبیوں کی مالک ہے میں تو اس کی
 باتوں سے اس قدر خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا“

”ٹھیک ہے بھی۔ جب نیل اس قدر سلیقہ مند اور وفادار ہیں تو ان کی مالکن کیسی
 ہوں گی“ شہزادہ نزار نے ایک ہلکی سی سسکی لی۔

نیل چونکی پھر اس کے تصور میں طبیب اعظم کی تصویر گھوم گئی اور وہ طبیب اعظم اور
 شہزادہ نزار کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ شہزادہ نزار خوبصورت اور جوان اس کے مقابلہ
 طبیب اعظم جو اپنے بڑھاپے کو ہواؤں کے زور پر روکے ہوئے ہیں پھر شہزادہ حیثیت
 طبیب اعظم سے کم بھی نہیں۔ اب تو شہزادے کی جاگیر بھی بحال ہو گئی ہے۔

تینوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نیل کے بتائے راستہ پر گاڑی چلتی رہی محترمہ عالیہ درشہوار
 کے محل کے گیٹ پر رک گئی۔

نیل نے گاڑی سے اتر کر کہا ”کیا شہزادے بہادر اور قسام کوئی مشروب پینے کی
 عزت بخشیں گے؟“

شہزادہ نزار راستے بھر یہی سوچتا آرہا تھا کہ کسی طرح درشہوار کے محل پر اترنے
 موقع ملے نیل کی دعوت پر اس کا جی خوش ہو گیا مگر اس نے کسر نفسی سے کام لیا۔
 ”مجھے تمہاری ضیافت کھانے میں بھی عذر نہیں مگر تمہاری محترمہ عالیہ کیا سوچیں گی کہیں
 ناراض نہ ہوں کہ تم نے بن بلائے مہمانوں کی خاطر مہارت کیوں کی“

نیل نے جواب دیا ”شہزادے بہادر میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ محترمہ عالیہ
 قدر بد اخلاق نہیں کہ گھر آئے مہمان کو نکال دیں“

شہزادہ اور قسام دونوں بے تکلف گاڑی سے اتر آئے، پیردار نے گیٹ کھول
 نیل دونوں کو لئے ہوئے مہمان خانہ میں آئی اور انہیں وہاں بٹھا کے اندر کی طرف بھاگ
 ”اس کا پتہ تو میں نے پہلے کیا تھا“ نیل نے کہا ”ناظم صاحب نے تمام کاندات
 ڈالے پر صرف یہ پتہ چلا کہ درخواست آئی تھی اور دارالوزارت بھیج دی گئی ہے وہاں

اب تک واپس نہیں آئی“
 ”چلو قصہ ختم ہوا۔ اتنی سی بات تھی پھر یہ قسام اور شہزادے کہاں سے کودے
 درشہوار نے ذرا نرمی سے کہا۔

نے اسے خود دارالوزارت جانے کو کہا پھر درشہوار کی درخواست تلاش کرائی یہ تمام باتیں آپ نے اس لئے کی تھیں کہ کسی طرح آپ کی رسائی درشہوار تک ہو جائے مگر اب آپ کو معلوم ہو گا کہ یہاں آنے سے ”رسائی“ نہیں بلکہ رسوائی ہوئی ہے“

”مجھے اس کی پروا نہیں، درشہوار تک پہنچنے میں اگر رسوائی ہوتی ہے تو ہو جائے“
شہزادے نے اس طرح کہا جیسے ان کا عشق بہت عرصہ سے چل رہا تھا ”تم نے ابھی درشہوار کو دیکھا نہیں جب دیکھو گے تو کہہ اٹھو گے کہ اسے دست قدرت نے بڑی فرصت میں تراشا ہے“

”مگر آپ نے اسے کب دیکھا ہے جو اس قدر تعریف فرما رہے ہیں؟“ قسام نے ان کی بات پکڑی۔

”دیکھا نہیں سنا تو ہے، کتنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خلیفہ کا انتقال نہ ہوتا تو درشہوار تمام بیگمات میں ”بڑی بیگم“ کے درجہ پر فائز ہوتی امیر المومنین تو ایک دن درشہوار کو ساتھ لے کر وزیر اعظم کے پاس پہنچ گئے تھے اور اس کے لئے خاص عنایت کی سفارش کی تھی“

”یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے“ قسام نے سر ہلایا ”لیکن میرے آقا۔ آپ کو درشہوار کے پاس بڑے وقار سے آنا چاہئے تھا، پہلے نیل سے یہ تو پوچھ لیتے کہ درشہوار نے کی اور سے رشتہ تو نہیں جوڑ لیا“

”تو پاگل ہے گدھا کہیں کا“ شہزادے نے اسے پیار میں ڈانٹا ”نیل کا مجھے لے کر آنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ درشہوار نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا“

”خدا کرے آپ کا خیال درست ہو اور آپ اپنی مراد کو پہنچیں“ قسام نے جیسے شکست تسلیم کر لی۔

”اب تم نے کی عقل کی بات“ شہزادہ خوش ہو گیا ”مگر ایک بات کی کمی رہ گئی قسام“
”کس بات کی کمی؟“ قسام نے پوچھا۔

”میں کہ ہم نے نیل کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب تک کنوارا ہوں“ شہزادے نے فکر مندی سے کہا۔

قسام مسکرایا ”شہزادے بہادر“ میں آپ کا غلام ہوں یہ فرض میں نے ادا کر دیا ہے میں نے نیل کو صرف یہی نہیں بتایا کہ ہمارے شہزادے اب تک کنوارے ہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ شہزادے نزار کا غلام بھی کنوارا ہے“

”بہت شریر ہو تم“ شہزادہ ہنس پڑا ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے بھی اپنا انتظام شروع

قلعہ کرک

نیل محل کے اندر درشہوار کے ساتھ خاطر داری کا انتظام کرنے لگی۔

ادھر مہمان خانہ میں شہزادہ نزار اور قسام، نیل کا انتظار کر رہے تھے جب اس آنے میں دیر ہوتی تو دونوں فکر مند ہو گئے۔ قسام اپنے آقا کا منہ چڑھا اور رازدارانہ اسے شہزادہ پر رہ رہ کے غصہ آرہا تھا جب اس سے برداشت نہ ہوا تو بولا بلکہ بھٹ پڑا ”شہزادے آپ بننا ہوا کام بگاڑ دیتے ہیں بھلا نیل کے ساتھ اس محل تک آنا ضرورت تھی نیل نے درشہوار سے بتایا ہو گا کہ شہزادے نزار اس کے ساتھ آئے آپ کی عزت دو کوڑی کی رہ گئی ہو گی انہوں نے نیل کو بھی پھینکار دیا ہو گا کہ تو! مرد کو اپنے ساتھ کیوں لائی۔۔۔۔۔۔“

”قسام۔۔۔۔۔۔ قسام“ شہزادے نے اسے ٹوکا ”کس طرح کی فضول باتیں کر درشہوار کا توجہ میں ذکر ہی نہیں آیا نیل کے پاس سواری نہیں تھی میں نے ایک قدم اٹھایا اور اسے پہچانے یہاں تک آگیا“

”ٹھیک ہے میرے آقا“ قسام نے جواب دیا ”آپ اخلاقاً“ یہاں تک آئے۔
محل کے اندر آنے کو کس نے کہا تھا؟“

”وہ تو نیل نے دعوت دی تھی یہ بات تو اخلاق سے بعید تھی کہ میں اس کی د نہ قبول کرتا“ شہزادہ اپنے اوپر الزام لینے کو تیار نہ تھا۔

آخر قسام نے سچی بات کہہ دی ”مجھے نہ ہلایئے شہزادے آپ کے دل میں خیال اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب آپ کو معلوم ہوا تھا کہ نیل، درشہوار کی کنیز

کر دیا قسم کہیں ایسا تو نہیں کہ نیل نے تمہارے طفیل مجھے بھی محل کے اندر آد دعوت دی ہے۔

”نہیں میرے آقا ایسی بات نہیں ہے“ قسم بولا ”نیل نے کچھ سوچ ہی کے ا ہو گا خیر جو کچھ ہوتا تھا وہ ہو گیا اب دیکھئے تقدیر کیا دکھاتی ہے“

ان کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ نیل آگئی اس کے ساتھ دو کنیزیں ماور دو غلام تھے ان کے سروں پر خوان رکھے تھے جس پر ریشمی خوان پوش دھرے تھے نیل معذرت پیش کی ”شہزادے بہادر معاف فرمائیے مجھے باتیں کرنے میں دیر ہو گئی در محترمہ عالیہ آپ لوگوں کے بارے میں مطمئن ہونا چاہتی تھیں“

”اطمینان ہو گیا محترمہ عالیہ کا؟“ شہزادے نزار نے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل مطمئن ہو گئیں“ نیل نے کہا ”میں نے انہیں بتایا کہ شہزادے فاطمی خاندان کے ایک معزز فرد ہیں وہ اپنے کام سے دارالوزارت جا رہے تھے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اب مجھے یہاں پہچانے آئے ہیں“

”پھر محترمہ عالیہ نے کیا فرمایا؟“ شہزادے نے بے چینی سے پوچھا۔

”محترمہ عالیہ نے مجھے ڈانٹا کہ جب انہوں نے تیرے ساتھ اتنا سلوک کیا تو باہر کیوں چھوڑ آئی انہیں فوراً اندر لا اور خاطر و مدارت کے بعد رخصت کر“ اور شہزادے نزار کو دیکھ کے مسکرائے لگی۔

”نیل تم اتنی دیر بعد آئی ہو اور بھی تو کچھ کہا ہو گا محترمہ عالیہ نے؟“ شہزادے کرید کی۔

”شہزادے بہادر“ محترمہ عالیہ میری مائیکن ہیں اور میں ان کی کنیز“ نیل نے شہزادے سمجھانے کے انداز میں کہا ”آپ جانتے ہیں کہ آقا اور خادم میں بہت سی باتیں ہوتی غلام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آقا کی باتیں ہر جگہ ظاہر کرتا پھرے۔ جس طرح آپ کی کوئی بات مجھ سے نہیں کہہ سکتا اسی طرح میں محترمہ عالیہ کی کوئی بات آپ کا بتا سکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس سلسلہ میں مجبور نہیں کریں گے۔ یہ بات میں بھی آپ سے کہہ چکی ہوں“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو نیل“ شہزادہ نزار شرمندہ ہو گیا۔

قسم نے بھی شہزادے کو گھور کے دیکھا جیسے شہزادے کو اس کی غلطی جتا رہا تھا۔ کنیزوں اور غلاموں نے میوے اور مشروب سلیقے سے میز پر چن دیئے تھے اور ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے تھے۔

شہزادے نے نیل سے کہا ”تم ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو سکتیں؟“

”نہیں شہزادے“ نیل نے انکار کیا ”انسان کو اپنی اوقات نہ بھولنا چاہئے“

”نیل تم کس قدر سمجھدار ہو اگر محترمہ عالیہ کے پاس نہ ہوتیں تو میں خنمیں ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جاتا“ شہزادے نے نیل کی تعریف کی۔

نیل سمجھدار ہو یا نہ ہو مگر بعض موقع پر اس سمجھداری کی بات کرتی تھی کہ سننے والا عیش کر اٹھتا تھا شہزادے کی تعریف پر وہ مسکرائی ”شہزادے بہادر“ اس میں سمجھداری کی بات نہیں یہ تو صرف مالک کی قدردانی ہوتی ہے جو غلام کو عقلمند بنا دیتی ہے آپ کے قسام بھی تو کچھ کم سمجھدار نہیں اور آپ بھی ان کی بھرپور قدردانی فرماتے ہیں“

”تم نے سچ کہا نیل“ قسام نے فوراً ”تائید کی“ خدا شہزادے نزار جیسا آقا ہر ایک کو دے“

”قسام“ تم نے پھر مجھے آقا کا ”شہزادے نے مصنوعی غصہ سے کہا ”تم میرے ہمدرد ہو قسام“ میں نے کسی معاملے میں تم سے فرق نہیں رکھا“ اور شہزادے نے قسام کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”آپ کی نوازش ہے آقا کہ آپ مجھے اپنے برابر جگہ دیتے ہیں“ قسام نے کہا ”لیکن میں اس وقت کچھ نہیں کھا سکوں گا میرے آقا“

”کیوں نہیں کھاؤ گے“ تم بھی تو صبح سے میرے ساتھ پریشان ہو رہے ہو“ شہزادے نے اسے پھر کھانے کی دعوت دی۔

”میرے آقا“ شہزادے بہادر“ قسام نے نیل کی طرف نظر اٹھائی ”میں بھلا کچھ کیسے کھا سکتا ہوں جبکہ میری میزبان نیل ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہے“

”نہیں قسام“ تم شہزادے بہادر کے حکم کی تعمیل کرو، کنیزوں کی زندگی تو ہاتھ باندھے ہی گزر جاتی ہے“ نیل نے ایک بار پھر سمجھداری کی بات کی ”اگر کبھی وقت آیا تو میں تمہارے ساتھ ضرور شریک ہوں گی“

آقا اور غلام میوے ٹوٹکتے چباتے اور کھاتے رہے پھر کنیزوں نے انہیں مشروب پیش کیا شہزادے کا وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا مگر قسام کے اشارہ کرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا نیل“ تمہارا بہت بہت شکریہ“ شہزادہ افسردگی سے بولا ”کاش ہمیں یہاں پھر آنا نصیب ہو“

”کاش میں شہزادے بہادر کو سر آکھوں پر بٹھا سکتی“ نیل نے فوراً ”جواب دیا“ لیکن مزایہ منصب نہیں کہ میں شہزادے کو دعوت پر بلاؤں ہاں قسام میرے گردہ کے ہیں ان کا

جب جی چاہے آسکتے ہیں۔

شہزادہ اور افسردہ ہو گیا لیکن قسام کا جیسے غنچہ دل کھل گیا۔

جب دونوں واپس ہو رہے تھے تو قسام نے کہا ”شہزادے بہادر آپ خواہ مخواہ افر ہوتے ہیں نیل نے راہ کاٹی نہیں بلکہ راستہ کھلا رکھا ہے آگے ہماری قسمت“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے“ شہزادے نے قسام کی بات سے اتفاق کیا۔
نیل ان دونوں کو رخصت کر کے محل میں گئی تو محترمہ عالیہ کو اپنا شکر پایا وہ بہت۔
چین نظر آ رہی تھیں نیل کو آتا دیکھ کر دو قدم آگے بڑھ آئیں نیل مسکرا دی۔

”محترمہ عالیہ، وہ چلے گئے“ نیل نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

”چلے گئے!“ درشہوار جیسے حیران رہ گئی۔

”کیا وہ نہ جاتے؟“ نیل نے شوخی سے پوچھا۔

”ہاں، نہیں نہیں“ درشہوار گھبرا گئی ”مگر تم نے مجھے تو بتایا ہوتا“

”آپ کو کیا بتاتی محترمہ عالیہ“ نیل منہ بنا کے بولی ”انہوں نے کہا ہم جا رہے ہیں۔

نے کہا جانیے اب میں کیا کہتی آپ سے؟“

”کچھ اور بھی تو کہا ہو گا؟“ درشہوار نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہاں کچھ کہا تو تھا“ نیل بن کے بولی ”یاد نہیں کیا کہا تھا“

”اچھا بن مت بہت“ درشہوار نے غصہ دکھایا ”یاد کر کے بتا کیا کہا تھا انہوں نے؟“

”ہاں یاد آگیا“ نیل کھلکھلا کے ہنسی ”شہزادے بہادر نے کہا تھا کاش ہمیں پھر یہا

آنا نصیب ہو“

”اچھا یہ کہا تھا“ درشہوار نے چپک کر کہا ”پھر تو نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے کہہ دیا شہزادے بہادر میری مجال نہیں کہ میں آپ کو دعوت دے سکوں

نیل نے اٹھلا اٹھلا کے بتایا۔

”چل تو بھی نری احمق نکلی“ درشہوار جیسے روٹھ گئی ”کسی بہانے بلا لیا ہوتا“

”محترمہ عالیہ، میں یہ کیسے کر سکتی تھی آپ نے کہا تھا مجھ سے“ نیل نے سنجید

اختیار کی۔

”میں نے کہا تو نہیں تھا۔۔۔۔۔“ درشہوار کچھ سوچنے لگی۔

زرا دیر بعد بولی ”ہاں یاد آیا، تو کہہ رہی تھی ان کی جاگیر بحال ہو گئی“

”بالکل بحال ہو گئی اب وہ شہزادے بھی ہیں اور جاگیردار بھی“ نیل شوخ نظروں۔

درشہوار کو دیکھنے لگی۔

”عمر کتنی ہو گی ان کی؟“ درشہوار نے ایک دم سے پوچھا۔

”بہی تیس پینتیس سال، میں نے آپ کو پہلے بھی تو بتایا تھا“ نیل نے بتایا۔

درشہوار نے آج تک کسی جوان آدمی سے گفتگو نہ کی تھی جن پردہ فروشوں نے اسے
پکڑا تھا ان کے چہرے ایسے تھے کہ دیکھے خوف آئے پھر قصر خلافت کا ایک غلام اسے خرید
کے خلیفہ کے پاس لے گیا وہ اگرچہ جوان تھا لیکن وہ صرف مفاد پرست تھا خلیفہ بھی جوان
تھا لیکن سدا کا بیمار وہ زندہ ہی کتنے دن رہا طبیب اعظم کو اس نے خلیفہ کے حضور ہی میں دیکھا
ان کی جوانی ڈھل چکی تھی حالانکہ وہ اپنے کو جوان ثابت کرتے تھے۔

”شہزادہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟“ درشہوار نے خیالوں سے چونک کے پوچھا۔

”شہزادہ خوبصورت ہے، جوان ہے، صاحب حیثیت اور ایک بڑی جاگیر کا مالک ہے“

نیل کو شہزادہ نزار کی جاگیر کی کوئی تفصیل معلوم نہ تھی لیکن اس نے جاگیر میں ”بڑی
“ کا ٹکڑا اپنی طرف سے لگا دیا۔

درشہوار پھر خیالوں میں کھو گئی۔ نیل اسے ذرا دیر دلچسپی سے دیکھتی رہی پھر چپک کے

بولی ”اگر محترمہ عالیہ کا حکم ہو تو شہزادے بہادر تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکالا جائے؟“

درشہوار نے نیل کو غور سے دیکھا ”تو مجھے بتا تو نہیں رہی ہے؟“

”محترمہ عالیہ“ نیل نے سنبھل کے کہا ”کنیز کبھی اپنی مالکین کو بنانے کا تصور بھی نہیں

کر سکتی“

”نہیں نہیں نیل“ درشہوار نے بات سنبھالی ”میرا مطلب کچھ اور نہیں دراصل میری

پرانی کنیز کچھ عجیب طبیعت کی تھی اس کی روش سے مجھے کچھ نقصان بھی پہنچا تھا“

”آپ بے فکر رہئے محترمہ عالیہ، نیل اپنی جان دے دے گی مگر آپ کو نقصان نہیں

پہنچے دے گی“ نیل نے بہت پر یقین لہجہ میں کہا۔

”درشہوار نے مسکرا کے کہا ”اچھا بتاؤ شہزادے تک تمہاری رسائی کیسے ہو گی؟“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ آپ بس حکم دیجئے“ نیل نے جواب دیا۔

”پتہ نہیں وہ تمہارے جانے کو کیا سمجھیں، ہو سکتا ہے کہ انہیں ناگوار گزرے؟“

درشہوار نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔

”میں سیدھی ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔ انہیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ آپ

نے مجھے ان کے پاس بھیجا ہے“ نیل نے درشہوار کو یقین دلایا۔

”میں سمجھ گئی۔ تم شہزادے کے غلام سے ملو گی کیا نام ہے اس کا؟“ درشہوار نے

مسکرا کے کہا۔

نیل کو بڑا تعجب ہوا اور اسے اپنی غلطی پر افسوس بھی ہوا اس نے اگر سوچ لیا ہوتا کہ
لاموں سے کسی غلام کا پتہ تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن شہزادے کا پتہ معلوم کرنا
نیل کو بڑا مشکل تھا۔ وہ ایک بڑی تپائی پر آرام سے بیٹھ گئی غلام نے اپنے ساتھی کو نیل کا خیال
سننے کو کہا اور قسام کو بلائے چلا گیا دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ واپس آیا تو قسام اس
کا ہاتھ تھام کر نیل اور قسام نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے
اور مئے ان کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

”نیل مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم یہاں آئی ہو“ قسام نے کپکپاتی آواز میں
کہا۔

شوخی نے شوخی دکھائی ”یقین نہیں آ رہا ہے تو مجھے چھو کے یقین کر لو“
قسام اس کے اس جواب سے جھوم اٹھا ”اب یقین آ گیا مجھے“ اور قسام نے نیل کے
ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”قسام“ اسے بلا کے لانے والے غلام نے دخل دیا۔ ”اندر بیٹھ کے باتیں کرو“ یہاں
ب آتا ہے ایک جاتا ہے“

قسام نے شکر گزار نظروں سے اسے دیکھا اور نیل کو لئے ہوئے ایک کمرے میں چلا گیا
صدر دروازے کی بغل میں بنا ہوا تھا اور جہاں غلام اپنی ڈیوٹی کے بعد آرام کرتا تھا۔
”تمہیں یہاں تک پہنچنے میں زیادہ پریشانی تو نہیں ہوئی؟“ قسام نے بڑے پیار سے
چھا۔

”کچھ ایسی پریشانی!“ نیل نے منہ بنایا ”صبح سے جگہ جگہ ماری ماری پھر رہی ہوں“ اب
اے اس بھائی سے معلوم ہوا“

”تعجب کی بات ہے“ مجھے تو اس بستی میں ہر شخص جانتا ہے“ قسام نے جھل ہو گیا۔
”نیل تم نے کس سے کس پوچھا کہ میرا پتہ معلوم نہ ہو سکا؟“

نیل نے پھر شوخی دکھائی ”اس میں میری ہی غلطی تھی۔ میں ہر دروازے پر شہزادے
ار کو پوچھتی تھی اور لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ بتوں نے تو مجھ پر آوازے
لا کے یہاں میں نے تمہارا نام لیا اور تم میرے سامنے ہو“

”نیل“ قسام نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا ”یہ شہزادوں کی بستی ہے جس میں
غلام شہزادے رہتے ہیں ممکن ہے کہ بعض شہزادے کچھ شہزادوں کے نام جانتے ہوں
نہ سب اپنے اپنے رنگ میں ہیں یا یوں سمجھو کہ اپنے میں مگن ہیں انہیں ایک دوسرے
کا خبر نہیں ہوتی یا وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن اس بستی کے دروازے ہم

نیل کی چوری پکڑی گئی وہ شرما کے بولی ”قسام“

”ہاں قسام“ اچھا میری طرف سے اجازت ہے تمہیں“ در شہزاد نے ایک نئے عیش
ڈول ڈالا۔

ایسی پریشان نظر عورتوں کا کوئی اعتبار نہیں ان کے پیش نظر صرف اپنا عیش و آ
ہوتا ہے قاضی خلیفہ کی بیماری کے پیش نظر در شہزاد نے طبیب اعظم کا سہارا ڈھونڈا تھا
لئے کہ اس وقت طبیب اعظم سے بہتر کوئی شخص اس کی پہنچ سے دور تھا اب جو اس
شہزادہ نزار کا حال سنا تو بغیر اس سے ملے اس کی طرف راغب ہو گئی کینر نیل اس کا
دینے پر اس لئے آمادہ ہو گئی کہ اس کا بھی اسی میں مفاد تھا اس کا آنا جانا اگر شہزادے
کے محل میں ہو جاتا تو وہ اپنے پسندیدہ غلام قسام سے آسانی سے مل سکتی تھی در شہزاد
ایک کینر پہلے بھی اسی طرح ایک غلام کے گھر بیٹھ گئی تھی۔

نیل نے دو تین دن دوڑ دھوپ کر کے شہزادے نزار کے محل کا پتہ معلوم کر لیا
کیا معلوم تھا کہ در شہزاد اس معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لیں گی کہ اسے شہزادے کے پا
ہیچے پر بھی آمادہ ہو جائیں گی ورنہ وہ شہزادے یا قسام سے ان کا پتہ معلوم کر لیتی پتہ مع
کرنے میں اس سے ایک اور غلطی ہوئی وہ ڈھونڈنے نکلے تو اس نے ہر جگہ شہزادہ نزار کا
لیا اس کے جواب میں اسے ہر جگہ جواب ملا کہ پہلے وہ یہ بتائے کہ وہ کس خاندان
شہزادی ہے جو اس طرح شہزادے کو تلاش کر رہی ہے نیل بڑی کھیاں ہوئی اب اس
یہ ترکیب کی کہ شہزادے نزار کے بجائے اس نے اس شہزادے کا پتہ پوچھا جس کی جانب
ابھی کچھ ہی دن پہلے بحال ہوئی تھی مگر پھر بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ایک
وہاں شہزادوں کے محلات ایک سے شروع ہوتے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے؛
شہزادہ نزار کی طرح کئی اور شہزادوں کی جاگیریں بھی بحال ہوئی تھیں۔

نیل ایک کینر تھی اس لئے وہ ہر محل کے صدر دروازہ پر کسی غلام یا کینر سے شہزادہ
نزار کا پتہ پوچھتی تھی ظاہر ہے کہ کسی نے شہزادے سے بات کرتے ہوئے وہ گھبراتی
پھر اسے ایک نیا خیال آیا اور دو چار محل کے جب اگلے محل پر پہنچی تو اس نے ایک غلام
سے سوال کیا۔

”کیوں بھائی قسام کا تعلق کس محل سے ہے؟“

غلام نے بڑے سلیقہ سے جواب دیا ”ہن تو یہاں بیٹھو“ میں ابھی قسام کو بلائے لا
ہوں“

لوگوں کے قبضہ میں ہیں اور ہم نہ صرف ایک دوسرے کو جانتے ہیں بلکہ پہچانتے بھی ہمارے دکھ درد اور خوشیاں مشترک ہیں۔

”یہی تو میں بھول گئی تھیں قسم، سچ ہے ہمارا دکھ درد ہمارے ہی آدمی جان سکتے ہیں۔“

نیل ایک دم سنجیدہ باتیں کرنے لگی۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو، کہو کیسے آنا ہوا؟“ قسم نے اسے پیار بھری نظروں سے، نیل کی نظریں تاب نہ لا سکیں اور جھک گئیں ”کیوں، کیا مجھے نہیں آنا چاہئے تھا؟“

”نیل تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے آنے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی“ قسم محبت الفاظ میں چھپنے لگی ”میرا روز دل چاہتا تھا کہ تمہارے پاس جاؤں مگر ہمت نہ پڑی

تمہاری اس دن کی باتوں سے مجھے حوصلہ تو ہوا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ بغیر تمہارے ہا تمہارے پاس آجاؤں میں تمہاری محترمہ عالیہ درشوار کے مزاج سے بھی واقف نہیں وہ مرحوم خلیفہ کے حرم میں رہ چکی ہیں کہیں میرا آنا انہیں ناگوار نہ ہو“

”محترمہ عالیہ کے سلسلہ میں نہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں“ نیل نے اسے در نظروں سے دیکھا ”تمہارے پاس آنے کے لئے انہوں نے مجھ سے خود کہا“

”اچھا۔۔۔!“ قسم نے حیرت سے پوچھا ”لیکن انہیں کیا سوجھی، کیا تم نے اپنے اور میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟“

”نہیں قسم“ نیل نے انکار میں سر ہلایا ”یہ باتیں کسی کو بتائی نہیں جاتیں، بات ہے کہ جب میں نے بتایا کہ شہزادے نزار جوان اور خوبصورت ہیں ان کی جاگیر بھی بحال

گئی ہے تو محترمہ عالیہ درشوار نے کچھ دلچسپی ظاہر کی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا شہزاد کنوارے ہیں بس اس طرح بات سے بات ٹکتی رہی اور اب میں تمہارے سامنے ہوں“

”کیا محترمہ عالیہ درشوار نے اب تک کہیں رشتہ کا اشارہ نہیں کیا میرا مطلب ہے انہیں خلیفہ مرحوم کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے بڑا سے رشتہ مل سکتا ہے انہوں نے کم

پسند تو نہیں کیا؟“ قسم نے ایک ہی سوال میں سب کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ”میرا خیال ہے کہ اب تک ایسی کوئی بات نہیں“ نیل نے بتایا ”ایک کچا سا تعلق ان کا

نے محسوس کیا ہے لیکن اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ تمہارے شہزاد نزار میں انہوں نے دلچسپی ظاہر کی ہے اگر شہزادے کردار کے مناسب ہیں تو یہ رشتہ

رہے گا اور اگر شہزادے محض تفریحاً ”محترمہ عالیہ سے شادی کرنا چاہیں تو پھر اس بات پر ختم کر دینا چاہئے“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو نیل، میں بھی کسی غلط کام میں نہیں پڑنا چاہتا“ قسم نے

باری سے کہا ”میں شہزادے نزار کے ساتھ بہت دنوں سے ہوں اور ان کی رگ رگ واقف ہوں یہ تو میں نہیں کہتا کہ شہزادے فرشتہ ہیں لیکن وہ ہزاروں سے بہتر ہیں اب

ان کی شادی نہیں ہوئی اس کی یہ وجہ نہیں کہ انہیں کوئی لڑکی نہیں ملتی اچھے اچھے آئے مگر شہزادے نے سب نا منظور کر دیئے اب رہا محترمہ عالیہ درشوار کا معاملہ تو

نہیں جانتا تھا کہ درشوار سے وہ پہلے سے واقف ہیں وہ اقرار تو نہیں کرتے لیکن میرا ہے کہ وہ درشوار کو کسی جگہ دیکھ چکے ہیں اس لئے وہ ان کے دیوانے ہو رہے ہیں“

”اس کا مطلب ہے کہ بات کچھ بن سکتی ہے“ نیل نے ہنس کے کہا ”یہ تو ظاہر ہے محترمہ عالیہ درشوار کنواری نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ بھی فرشتہ نہیں ہو سکتیں

نیل ہے کہ اگر یہ نیل مونڈ ہے چڑھ جائے تو اچھا ہی ہو گا“

”لیکن نیل پہلے تو اپنی نیل مونڈ ہے چڑھنا چاہئے“ قسم نے بے صبری سے کہا ”ایسا کہ شہزادے کو درشوار مل جائے اور ہم دونوں کو دودھ کی کبھی کی طرح نکال پھینکا

“واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے“ نیل سچ کے بولی ”اگر اپنی بات نہ بنی تو میں محترمہ عالیہ کو قدم آگے نہ بڑھنے دوں گی پھر ابھی تو بسم اللہ ہوئی ہے اگر شہزادے نے درشوار کو

بھی لیا ہے تو یہ یک طرفہ بات ہے ابھی تو درشوار بھی شہزادے کو دیکھیں گی اور بریں گی“

”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا نیل“ قسم نے نیل کو ہوشیار کیا ”شہزادے کی وجاہت نے بھی دیکھی ہے اگر درشوار نے انہیں دیکھ لیا تو فوراً پسند کر لیں گی ایسی صورت

درشوار کہیں تمہارے ہاتھوں سے نہ نکل جائیں“

”اس کی فکر نہ کرو نیل“ نیل نے پر اعتماد لہجے میں کہا ”میں نے ایسی کچی گولیاں نہیں ل درشوار دیکھیں گی اپنی آنکھوں سے لیکن شہزادے کو پسند یا نا پسند کریں گی میری

اسے سمجھے کہ نہیں؟“

”ٹھیک ٹھیک، بالکل سمجھ گیا، مگر اب سوال یہ ہے کہ دونوں کی ملاقات کس طرح

ہو جائے؟“ قسم نے کہا ”محترمہ عالیہ تو شہزادے سے ملنے آنے سے رہیں ہاں شہزادے

اسکے ہیں وہاں شرط یہ کہ محترمہ عالیہ انہیں دعوت دیں“

”نیل قسم یہ کیسے ہو سکتا ہے درشوار انہیں کس رشتے سے بلائیں گی“ نیل نے

”دو“ ”یہ تو آئیل مجھے مار والا معاملہ ہو جائے گا درشوار تو بدنام ہو جائیں گی“ ناظم ان

جواب بھی طلب کر سکتے ہیں“

ے ہمارے نیل ایک کنیز ہے اسے کہیں آنے جانے کے لئے اطلاع دینے کی نیل نے جواب دیا ”یہ چونچلے تو بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کے ہوتے ہیں اسے برآمد ہوں تو آگے آگے باجانب رہا ہو اور مسلح زریں کمر غلام مارچ کرتے“

کہ رہی ہو نیل ”شہزادہ افسردہ ہو گیا“ اسی چمک دک اور بیجا نمود و نمائش نے ت ختم کر دی اگر ہم اپنے آپ میں رہتے تو یہ دن دیکھنا نہ نصیب ہوتا خیر تم کیسے بھول پڑیں؟“

ے! آپ بڑی جلدی افسردہ ہو جاتے ہیں“ نیل نے بات بتائی ”اگر اب میں کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں تو بھی آپ افسردہ ہو جائیں گے؟“
بھئی ایسی بات نہیں ہے“ شہزادے کی افسردگی دور نہ ہوئی تھی ”دراصل مجھے رکنا پسند نہیں“

ے آپ جوان ہیں، اعلیٰ خاندان کے ہونے کے علاوہ ایک بڑے جاگیردار ہیں پھر می سے بیزار نظر آتے ہیں سادگی اچھی چیز ہے لیکن ہر موقع پر سادگی اچھی دلی“ نیل نے خوب چبا چبا کے کہا ”ہمارے محترمہ عالیہ اس پریشانی کے عالم کی خوشیوں میں بھرپور حصہ لیتی ہیں“

محترمہ عالیہ بہت خوش مزاج ہیں؟“ شہزادے نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔
یہی خوش مزاج“ نیل نے انزا کے کہا ”ہماری محترمہ عالیہ ہر تہوار کو تہوار کی اور اگر تہوار دور ہو تو خوشی کے موقع پیدا کر کے خوشیاں مناتی ہیں انہوں کو خوشیوں کے پانی سے دھو ڈالا ہے“

وصلے والی ہیں محترمہ عالیہ“ شہزادے نے خواہ مخواہ تعریف کی ”مگر اس طرح ت بڑھ جاتے ہوں گے؟“

ے ہمارے محترمہ عالیہ شہزادی نہیں مگر امیرزادی ضرور ہیں وہ اخراجات کی پروا نیل نے بھی اپنی شہزادی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے شروع کر ایک جاگیردار نے محترمہ عالیہ کا رشتہ مانگنے کا ارادہ کیا محترمہ عالیہ کو معلوم ہو جاگیردار کے پاس کلا بھیجا کہ اس کی جاگیر تو میری کنیزوں اور غلاموں کی یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی پھر وہ ان سے شادی کس طرح کرے گا“

براگیا اس نے دبی زبان سے کہا ”نیل“ میری جاگیر بھی شاید چھوٹی ہی ہے تو کیا یہ کا خیال چھوڑ دینا چاہئے؟“

”یہ بات بھی ٹھیک ہے“ قسام نے سر ہلایا ”مگر ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے“ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے، کوئی موقع ہو تو انہیں ملا دیں گے ورنہ دن یونہی چلے دیں گے“

”یہ بات ہو گئی“ اب ذرا شہزادے ہمارے سے بھی مل لیا جائے“ نیل نے تجویز کی۔ قسام نے فوراً ”خالفات کی“ شہزادے سے ملنے کی کیا ضرورت ہے، معاملہ ہمارے درمیان ہے، ہم جب اور جیسا چاہیں گے اس پر عمل کریں گے“

”تم بڑے خود غرض ہو قسام“ نیل نے ہنس کے کہا ”میں تمہارے پاس کیا آئی اپنے آقا کو بھول گئی، یہ بات ٹھیک نہیں، میں محترمہ عالیہ کے حکم پر یہاں آئی تھی شہزادے سے ملنا بہت ضروری ہے تاکہ دوبارہ آنے کا بہانہ مل سکے“

”خیر، تمہاری مرضی ہے، ورنہ ان سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں“ قسام اب بھی کر رہا تھا۔ اس نے شہزادے کے کردار کی بہت تعریف کی تھی لیکن اس وقت وہ گھبرا شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ نیل کا شہزادے سے سامنا ہو۔

”تم کیسی فضول باتیں کر رہے ہو قسام“ نیل چڑ گئی ”شہزادے ہوں یا در شہزادہ میل رکھنے ہی میں ہمارا فائدہ ہے“

”کہہ تو دیا کہ چلو میں ملائے دیتا ہوں“ قسام نے بے دلی سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔
نیل بھی اٹھ کے کھڑی ہو گئی ”میں سمجھ گئی، تمہیں اپنے آقا پر اعتماد نہیں مگر تم مجھ پر تو اعتماد کر سکتے ہو میں ایسی ویسی کنیز نہیں کہ ہر طرف ٹاک جھانک کرتی پھروں“
”اوہ۔۔۔۔۔ تم تو ناراض ہو گئیں، میں نے ایک بات کہی تھی تم اسے اپنے اوپر لگیں“ قسام نے جواب دے کر نیل کی طرف دیکھا۔

نیل، قسام کی آنکھوں میں محبت کی چمک دیکھ کر پانی ہو گئی اور اس کے ساتھ چلے دونوں باہر نکلے تو صدر دروازہ کا محافظ غلام خشک میوے سے بھری پلیٹ لئے آتا دکھائی دے ”ارے کہاں چلے تم دونوں، میں تمہارے لئے۔۔۔۔۔“ اور غلام نے میوے کی با آگے کر دی۔

قسام اور نیل نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر واپس آگئے انہوں نے غلام کو بھی ذرا اپنے ساتھ بٹھا لیا اور پھر تینوں نے خوب میوے کھائے پھر قسام نے غلام کی اس پر غلط خاطر داری پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

قسام، نیل کو لئے اپنے محل پر پہنچا تو شہزادہ اسے باغ کی روش پر مشغول گیا شہزادہ نے نیل کو دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا ”ارے نیل تم کیسے آگئیں، کوئی اطلاع بھی نہیں دی“

یہ شہزادے بہادر — اچھا اب رخصت
اپنے کے چلنے لگی شہزادے نے روکا ”ٹھہرو میں تمہیں سواروں سے بھجواتا ہوں“
”فکر نہ کیجئے قسام مجھے پہنچا آئے گا“ نیل نے ہنس کے کہا۔
”جی چیز قدموں کے ساتھ نیل کے پاس پہنچ گیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ح الدین نے بحیثیت وزیر اعظم یا ایک حکمران کے مصر کا پورا نظام سنبھال لیا تھا
ت سے جتنے امرا منسلک تھے انہوں نے یا تو اطاعت قبول کر لی تھی یا پھر سازشوں
کر ختم ہو گئے تھے جو امرا زندہ تھے اور انہوں نے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا صلاح
ان پر مہمانی کی تھی لیکن ان کا تقرر قاہرہ سے دور دراز علاقوں میں کیا تھا اس
لی مرکزیت ختم ہو گئی تھی اور وہ منتشر ہو کر رہ گئے تھے۔

نی جشیوں پر بھی تقریباً قابو پالیا گیا تھا۔ ان کو قاہرہ اور قاہرہ کے قریب تمام
مخلوں سے بے دخل کر دیا گیا تھا جو کچھ بچے تھے وہ شمال اور شمال مغرب کے
جا کر آباد ہو گئے تھے ہر چند کہ انہوں نے پر امن رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کبھی
کڑمی میں ابال آجاتا ہے اور وہ کسی پرانے مصری امیر یا شہزادے کے بھڑکانے پر
بلند کرتے جنہیں آسانی سے دبا دیا جاتا۔

اپنی حالات درست کرنے کے ساتھ ساتھ صلاح الدین نے اپنی سرحدوں کو بھی
مضبوط کر لیا تھا نصرانی سلطنت یروشلم نے مصریوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر
راج تک وصول کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جب صلاح الدین کے چچا اسد الدین
قدم اس ملک میں آئے اس وقت سے سلطنت یروشلم کا اثر و رسوخ مصر پر سے
خاموش ہو گیا تھا سلطان نور الدین زنگی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر مصر کی کمزور
اور ”مدونہ کی گئی تو اس پر یروشلم کے نصرانی بادشاہ کا قبضہ ہو جائے گا۔

سلطان نور الدین زنگی نے مصر کی طرف یکے بعد دیگرے کئی لشکر روانہ کئے اور
پہ سالار اسد الدین شیر کوہ نے نصرانی بادشاہ ایملارک کی فوجوں کا منہ پھیر دیا۔
مصر پر مکمل قبضہ کا خواب بکھر کر رہ گیا اس بہادر پہ سالار کے بعد جب مصر کے
اور وزیر اعظم کی دستار فضیلت صلاح الدین کے سر پر رکھی گئی تو مصر میں حالات
اور انقلاب آیا صلاح الدین نے یروشلم کے شاہ ایملارک کو دیناط میں شکست فاش
سے اس کو سرحدوں میں محدود ہو جانے پر مجبور کر دیا شاہ ایملارک مصر پر قبضہ
تھا اور کہاں اب اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اسے اپنی شمالی اور جنوبی دونوں سستوں

”واہ شہزادے“ بھلا آپ کا اور اس جاگیردار کا کیا مقابلہ“ نیل نے فوراً
جاگیردار اور آپ جاگیردار کے علاوہ شہزادے بھی ہیں شاہی خاندان کے معز
کی باتیں تو الگ ہی ہوتی ہیں“
شہزادے نے چونک کے نیل کو دیکھا ”نیل کیا محترمہ عالیہ کے حضور کبھی
ہوتا ہے؟“

”آپ تو بہت بھولے ہیں شہزادے“ نیل نے ہنس کے کہا ”اگر آپ کا ذرا
میں اس وقت آپ کے محل پر کیوں آتی میں نے کہا نا کہ کچھ باتیں صاف صاف
جاتیں“

شہزادے کی باجیس خوشی سے کھل گئیں ”اس کا مطلب ہے کہ محترمہ عالیہ
یہاں بھیجا ہے؟“

”آپ مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتے ہیں“ نیل بولی ”میں یہاں آئی ہوں
اجازت سے آسکتی ہوں“ اپنے آپ تو نہیں آئی“

شہزادے نے معنی خیز نظروں سے اپنے غلام قسام کو دیکھا۔
”میرے شہزادے آقا“ قسام نے ہنس کر کہا ”میں نیل کو آپ کے پاس
اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی میں یہ یوقف نہیں ہوں“

”چلو اندر چل کے بیٹھو کیا بیس کھڑے کھڑے سب باتیں ہو جائیں گی اگر
حال چال پوچھتا ہے“ شہزادہ مسرت سے کہلا پڑا رہا تھا۔

نیل نے شوق سے کہا ”باقی باتیں دوسرے پھیرے پر ہوں گی میں آپ
معلوم کرنے آئی تھی اللہ کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں“

”خیرت تو خیر ہو گئی میرے لئے کیا حکم ہے؟“ شہزادے نے امید بھری نظروں
کو دیکھا۔

”شہزادوں کو حکم نہیں دیا جاتا، درخواست کی جاتی ہے“ نیل نے جواب دیا۔
”درخواست“ مگر درخواست تو میں کرنا چاہتا ہوں“ شہزادے کے منہ سے جیسے
”شوق سے اپنی درخواست دیجئے محترمہ عالیہ کے حضور پیش ہوگی تو مقبول
گا“ نیل نے ایک ہی جملہ میں سب کچھ کہہ دیا۔

”واہ نیل“ تم نے طبیعت خوش کر دی جی تو چاہتا ہے کہ تمہارا منہ موتا
دوں مگر اس وقت یہ انگوٹھی تمہاری نذر ہے“ شہزادے نے انگلی سے انگوٹھی اٹھا
کو پکڑا دی۔

ہوتی ہے اس دور میں صوبہ کے گورنر، قلعہ کا قلعدار کسی ملک کا بادشاہ خود سر اور
المان ہوتا تھا اور نور الدین زنگی تو سلطان دمشق تھا اور سلطان مشرق کے لقب سے
جانا تھا سلطان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہوتا تھا دمشق میں مقیم امراء نوریہ
سلطان سے صلاح الدین کے بارے میں بہت زہر اگلا تھا اس لئے صلاح الدین کا
ہاکی نظروں سے دور رہنا ہی مصلحت تھا ممکن تھا کہ سلطان، صلاح الدین سے الگ
مے سوالات کرتا یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ صلاح الدین جو ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا
ان کے کسی سخت کلام پر غیظ میں آجاتا تو پھر اس وقت کیا ہوتا۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صلاح الدین اپنے مربی اور دلی نعت کا دلے
راور فرمانبردار تھا اس نے اگر سلطان کا سامنا کرنے سے گریز کیا تو اس کے پاس اس
لی کا جواز اور سبب بھی موجود تھا لیکن دمشق میں بیٹھے ہوئے صلاح الدین کے دشمن
نوریہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہ آ رہے تھے انہیں الشوک کے معاملہ میں سیاسی
ہوئی تھی اور بوکھلا گئے تھے اس لئے یہ بدطینت امرا موقعہ کی تلاش میں تھے اور
یہ موقعہ مل بھی گیا جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

الشوک کے محاصرے کے دوران دلوں میں پڑے ہوئے شکوک و شبہات کو ایک سال
تھا کہ دربار یعنی قاہرہ میں سلطان دمشق کا ایک تازہ فرمان صلاح الدین کو موصول ہوا
تھا صلاح الدین کی مجلس میں جو دھیرے دھیرے دربار کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا
نوریہ کے علاوہ صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب اور اس کے تمام بھائی بند
تھے سلطان دمشق کا فرمان قیامت مفرات سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت کوئی اہم مسئلہ زیر بحث تھا کہ ایک غلام دربار میں داخل ہوا اور سیدھا
ام صلاح الدین کے پاس پہنچ گیا غلام کی یہ حرکت درباری آداب کے خلاف تھی تمام
مجلس آلود ہو گئے لیکن جہانگیرہ نجم الدین ایوب اور ذہین صلاح الدین غلام کے اس
نئے پر فکر مند ہو گئے مگر ان کی یہ فکر صرف چند لمحوں کی تھی آنے والے غلام نے
لدین سے کچھ سرگوشی کی پھر جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے واپس ہوا لوگوں
ن آلود چروں پر اب حیرت کے آثار بھی پھیل گئے تھے۔

کی وقت صلاح الدین کی گھیبہ آواز سنائی دی ”معزز امرا اور وفاداران تاج دمشق
لی کا قاصد سلطان معظم کا ایک اہم فرمان لے کے آیا ہے فرمان کے مندرجات سے
لو آگاہ کیا جائے گا“

صلاح الدین کی بات ختم ہوئی تھی کہ دمشق کا قاصد اسی غلام کی رہنمائی میں دربار

کی سرحدوں کی فکر پڑ گئی تھی۔

صلاح الدین کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس نے 1171ء میں قلعہ
حملہ کیا تھا یہ قلعہ شام اور مصر کی سرحد پر نصرانیوں کے ایک شہری کی طرح
دونوں مسلم ممالک کے قافلے اس کی نظر میں رہتے تھے اور دونوں ہی مملکتوں
خطرے کی تھنی بنا ہوا تھا صلاح الدین نے اس قلعہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا
والے صلاح الدین کی اجازت سے اپنا مال و اسباب باندھ رہے تھے کہ ایک غیر
پیش آیا۔

ہوایوں کہ صلاح الدین کو اطلاع ملی کہ سلطان دمشق نور الدین زنگی بہ
قلعہ الشوک کی طرف کوچ کرنے والا ہے یہاں تک تو بات درست ہے لیکن
الدین یکا یک قلعہ الشوک سے قاہرہ واپس ہو گیا تو متعجب یورپی مورخوں نے اس
طرح کی تاویلیں کی، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صلاح الدین
سے اس لئے واپس آگیا کہ وہ سلطان نور الدین زنگی سے ڈرتا تھا اور وہ سلطان
نہیں کرتا چاہتا تھا۔

یہ سراسر بہتان ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ فاطمی امرا اور
حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی حصول اقتدار کے لئے کوشش کرتے رہے
جس وقت صلاح الدین قلعہ الشوک کا محاصرہ کئے ہوئے تھا قاہرہ میں بنو فاطمہ
سازش کا جال پھیلایا تھا جس کی خبر صلاح الدین کو الشوک پہنچائی گئی اور وہ اثر
اثر سے اس قدر پریشان ہوا کہ فوراً قاہرہ واپس چلا گیا۔

صلاح الدین نے یہی بات سلطان دمشق کو لکھ دی تھی مگر صلاح الدین
امیروں نے سلطان کو بھڑکا کر اسے مصر پر فوج کشی کے لئے آمادہ کر دیا صلا
اپنے باپ کے مشورے سے سلطان کو ایک ایسا معذرت نامہ لکھا اور اس ا
وفاداری کا اظہار کیا کہ سلطان دمشق کا دل صلاح الدین کی طرف سے صاف
امراء نوریہ جو مصر سے دمشق واپس چلے گئے تھے وہ سلطان کو صلاح الدین ا
بدگمان کرتے رہتے تھے۔

سلطان دمشق کی بدگمانی کے بارے میں یورپین مورخ کچھ نہیں لکھتے بلکہ
صلاح الدین کو مطعون کرتے ہیں کہ وہ سلطان کی آمد کی خبر سن کر قاہرہ بھا
فرض بھی کر لیا جائے کہ صلاح الدین نے قلعہ الشوک کا محاصرہ سلطان کے
سے چھوڑا تھا تو بھی صلاح الدین کو برا نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ ہر شخص

غلام کی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں کہ شاہی فرمان کی تعمیل میں شاہی فوجیں اسی وقت قلعہ کرک کی طرف روانہ ہوں گی اور مجھ پر اس وقت تک کھانا حرام ہے جب تک میں قاہرہ سے قلعہ کرک کی طرف کم از کم نصف منزل کا فاصلہ نہ طے کر لوں میری عدم موجودگی میں میرے اور بزرگوار مصر میں میری نیابت فرمائیں گے آپ لوگ اپنے گھروں کو جائیے اور مصر میں وقت میں کوچ کے لئے میدان میں جمع ہو جائیے۔

دربار سے امرائے نوریہ اٹھے تو ان کے قدم بوجھل بوجھل تھے اور احساس ندامت سے ان کی آنکھیں اوپر نہ اٹھ رہی تھیں وہ سوچ رہے کہ بوڑھے نجم الدین ایوب نے ایک بار پھر اپنی بڑائی ثابت کر دی ہے شک وہ سلطان کا سب سے زیادہ وفادار امیر ہے اور اسی وجہ سلطان نور الدین بجا طور پر اس خاندان کی سرپرستی کرتا ہے وفاداری میں اس کا بیٹا صلاح الدین دو قدم اس سے آگے ہی ہے صلاح الدین نے اس وقت لشکر کی روانگی کا حکم دے کر حملے پر دہلے کی مثال قائم کی ہے ہم سے ہر ایک کو نجم الدین ایوب اور صلاح الدین کے نقش قدم پر چل کے سلطان سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینا چاہئے مگر پتہ نہیں کہ سلطان کا فرمان سن کر ہم خاموش کیوں رہے اور اظہار وفاداری کے اس موقع سے بھی باپ بیٹے نے فائدہ اٹھایا۔

روانگی سے پہلے سب سے اہم مسئلہ لشکر کے انتخاب کا تھا اس کے بعد فرائض تقسیم چونکہ وقت بہت کم تھا اس لئے نجم الدین ایوب نے اس معاملہ میں صلاح الدین کا ہاتھ بٹایا پہلے فوجی دستوں کا انتخاب ہوا پھر خوراک، باروداری کے جانوروں کا انتظار، لشکر کی منزلوں کا انتظام، غرضیکہ تمام محکموں کے سردار مقرر کئے گئے اور ہر اول دستوں کو دربار برخاست ہونے کے صرف نصف گھنٹے بعد روانہ کر دیا گیا۔

اسی تیز رفتاری کے تین حصوں میں منظم لشکر کی روانگی ہوئی جس وقت دارالوزارت کے سامنے کے میدان میں فوجی سوار حرکت کرتے دکھائی دیئے لوگوں کے کان اسی وقت کھڑے ہوئے اور آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اصل معاملہ کا علم کسی کو نہ ہونکا لیکن یہ ضرور ہوا کہ کوچ کے وقت تقریباً پورا قاہرہ اپنے بہادر لشکر کو بن بلائے رخصت کرنے کے لئے میدان کے گرد جمع ہو گیا لطف کی بات یہ تھی جو آ رہا تھا اس کے ساتھ پھولوں سے بھری نوکری ہوتی پھر جب لشکر روانہ ہوا یہ ساری نوکریاں سواروں پر خالی کر دی گئیں۔

کیرک یا کرک کا مشہور قلعہ، الشویک کے شمال میں بحر مردار کی جنوبی سرحد کے قریب تھا جس طرح قلعہ الشویک مصر اور شام کے قاتلوں کے راستے میں تھا اسی طرح یہ قلعہ بھی

میں آیا قاصد کو دیکھ کے صلاح الدین اپنی مسند سے کھڑا ہو گیا ”خوش آمدید شاہ آپ کا آنا ہمارے لئے باعث افتخار ہے“

سلطانی قاصد کے استقبال کے لئے وزیر اعظم مصر کے کھڑے ہو جانے تمام اس کی تقلید میں اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔

قاصد نے قریب پہنچ کر کہا ”میں اس عزت افزائی کے لئے وزیر اعظم مصر حاضرین کا شکر گزار ہوں“

پھر قاصد نے ریشمی خرطے سے شاہی فرمان نکال کے صلاح الدین کو دیا صلاح الدین نے رسم کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا پھر چوم کے اسے کھولا اس وقت صلاح الدین اور تمام دوسرے حاضرین کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے صلاح الدین فرمان پر سرری نظر ڈالی سلطان مشرق کا فرمان صرف چار لفظی تھا صلاح الدین سے نظریں ہٹا کر پہلے نجم الدین ایوب کو دیکھا پھر دوسرے درباریوں پر نظر دوڑائی نے صلاح الدین کی نظروں کا جواب نظروں ہی میں دے دیا تھا۔

صلاح الدین نے ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہا ”آقائے محترم کا پیغام صرف چار مشتمل ہے، فرمان غور سے سماعت فرمائیے اور اپنے مشورے سے آگاہ کیجئے فرمان صرف یہ ہیں۔

قلعہ کرک کو سرنگوں کیا جائے

فرمان پڑھ کے صلاح الدین نے خاموشی اختیار کی لوگوں پر پہلے ہی سکوت سلطان کے مختصر فرمان سے وہ کچھ گہرا گئے اور سوچنے لگے۔

صلاح الدین نے اپنے باپ نجم الدین ایوب کی طرف دیکھا باپ بیٹے کی میں تصادم ہوا جس کے نتیجے میں بوڑھے نجم الدین نے تیزی سے تلواریں کھینچ کے سر کی اور شیر کی طرح گرجا ”مجھے افسوس ہے کہ دمشق کے وفاداروں اور جان نثار فرمان سلطانی کے بارے میں رائے دینے میں اتنی دیر کی میرے ساتھ آقا اور غلام بہت نازک مگر بڑا مضبوط بھی ہوتا ہے کیونکہ آقا حکم دیتا ہے اور غلام اس حکم کی فوراً سر جھکا دیتا ہے غلام کے ذہن میں سوائے تعمیل ارشاد کے اور کوئی خیال نہیں ہو سکتا میں نے سلطانی فرمان کی اطاعت میں اپنی تلوار بلند کر دی ہے اور یہ وقت تک بلند رہے گی جب تک شاہی لشکر قلعہ کرک کی طرف کوچ نہیں کرتا“

نجم الدین ایوب نے یہ سیاسی اور دلولہ انگیز الفاظ کہنے کے بعد صلاح الدین کو دیکھا صلاح الدین نے باپ کی تقلید کی اور فوراً اعلان کیا ”میں سلطان مشرق کے

نح الدین نے منزلیں مختصر کر دیں اور ڈیڑھ منزل اور کبھی دو منزل پر قیام کرتا اچانک سے سامنے نمودار ہوا قلعہ کرک پر صدیوں سے کسی نے حملہ نہ کیا تھا اس لئے قلعہ بندہ اور یا محاصرہ کے الفاظ تک بھول چکے تھے لیکن جب شامی لشکر کے سوار کرک کے گرد پھیل گئے تو شہر والوں کو یقین ہو گیا کہ محاصرے میں آگئے ہیں اور اب ان اور مال صلاح الدین کے رحم و کرم پر ہے۔

صلاح الدین نے اپنی لشکر گاہ شہر کے اس پار اس جگہ قائم کی جہاں سے قلعہ تک دروازہ جاتا تھا اس نے شہر پر نہ حملہ کیا اور نہ اسے نذر آتش کیا بلکہ اس کا لشکر ماموشی بہنہ تگوار بلند کئے شہر کے اس سرے سے داخل ہو کر اس سرے پر پہنچ گیا رات کے دروازے بلند کئے دروازوں یا کونھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور آنے والے کے تصور سے کانپ رہے تھے لیکن نہ کوئی طوفان پیدا ہوا نہ قیامت نبی ٹوٹی ہوتے ہوتے ان کے گھروں میں چولہے جل گئے۔

صبح غروب ہونے پر چند سوار شہر کی کارواں سرائے پر پہنچے سرائے کا بڑا دروازہ بند دل کے سردار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور سرائے کے مالک کو یقین دلایا کہ اسے کوئی نہیں پہنچایا جائے گا بشرطیکہ وہ لشکر سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو مرتبا کیا نہ کرتا کے مالک نے چند لمحوں بعد دروازہ کھول دیا اور شامی سوار سرائے میں داخل ہو گئے کا مالک قہر قہر کانپ رہا تھا مسافروں اور دوسرے لوگوں کے چہرے فق تھے اور وہ انکھوں سے اجنبی سواروں کو دیکھ رہے تھے۔

اول کے یقین دلانے پر مالک سرائے کے حواس کچھ درست ہوئے اس کی مدد سے معززین ایک فرست تیار کی گئی پھر مالک سرائے کے ساتھ دو سوار کئے گئے کہ وہ فرست کے مطابق ہر معزز شہری کے گھر پر دستک دے اور اسے حکم دے کہ وہ سالار لشکر کے سامنے پیش ہو جائے اگر کسی شخص نے حکم عدولی کی تو اس کی ذمہ داس پر ہوگی مالک سرائے اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ معززین شہر نے اگر اسی دن کیا جس کا اظہار مالک سرائے نے کیا ہے تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

کام بڑا وقت طلب اور صبر آزما تھا لیکن مالک سرائے نے اس میں نمایاں کام کیا بیک ایک درجن معززین شہر صلاح الدین کے خیمہ پر پہنچ چکے تھے صلاح الدین بیک شہر کی بڑی عزت افزائی اور نرم لہجے میں کہا ”آپ لوگ جانتے ہیں قلعہ کرک آہوتا ہے جبکہ شہر کی حفاظت اگرچہ حاکم قلعہ کے ماتحت ہوتی ہے لیکن شہر کی اچھے وابستہ نہیں ہوتی اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہمارے لشکر نے شہر آبادی کو

تجارتی راستوں پر تھا اور اسے شام کی کھجی کہا جاتا تھا کرک کا قلعہ دار اپنی خود سری کی بد سے شاہ کرک کھلاتا تھا اور یہ مسلمانوں کے پہلو کا ایک مستقل کھانا تھا کرک کی بغیر رومن طرز تعمیر کی تھی اور اسے کوہ سیر کی بلند ترین چوٹی پر بنایا گیا تھا سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً ”تین ہزار فٹ“ تھی قلعہ کے نیچے گرم پانی کے چشمے زرخیز وادی اور پہلو کے پامات تھے قلعہ انتہائی مضبوط تھا اور محل وقوع کی وجہ سے ناقابل تسخیر تصور کیا جاتا تھا قلعہ کرک اور شہر کرک کے درمیان ایک خوفناک خندق تھی اس خندق سے قلعہ تک ایک زمین دوز راستہ جاتا تھا جو دو ڈھلوان چٹانوں میں کاٹ کر بنایا گیا تھا ایک سیدھی چٹان اس کے مشرقی حصہ کی حفاظت کرتی تھی یہ ایک مشہور اور مضبوط جنگی قلعہ تھا مشہور تھا کہ اگر قلعہ میں کھانے پینے کا وافر انتظام کر دیا جائے تو یہ طویل مدت تک ایک نہیں بلکہ کئی محاصرہ کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

صلاح الدین ایک اعلیٰ قسم کے حکمران کے ساتھ ساتھ ایک بہت عظیم جنرل بھی اس نے مختصر عرصہ میں مصر کے ارد گرد تمام ممالک، جنگی اور شہری مقامات، وہاں آب و ہوا اور تمام راستوں سے پوری واقفیت حاصل کر لی تھی بلکہ ان باواشتوں کو نقصان میں محفوظ کر لیا تھا اس نے جس وقت شامی فرماں میں قلعہ کرک کا نام پڑھا تو اسے دماغ میں قلعہ کا ایک ہلکا سا نقشہ آگیا تھا وہ قلعہ کی مضبوطی سے واقف تھا لیکن ان تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود اس نے قلعہ کی طرف روانگی میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ اور فوراً ”قیل حکم میں لگ گیا وہ سلطان سے ضروری انتظام کے لئے کچھ وقت بھی مانگ سکتا تھا لیکن اس نے فوراً ”قیل کر کے نہ صرف دمشق میں موجود اپنے دشمنوں کے چہرے پر طمانچہ مارا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ وہ اور اس کا باپ سلطان دمشق کے وفادار ہیں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

صلاح الدین آندھی اور طوفان کی طرح قلعہ کرک کی طرف روانہ ہوا اب نہ نصرانی، مصر پر حملہ کرتے تھے مگر اب خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں میں اتنی طاقت پیدا کر دی تھی کہ وہ نصرانی قلعوں پر فوج کشی کر رہے تھے ڈیڑھ سال پہلے صلاح الدین نے قلعہ الشویک کا محاصرہ کیا تھا لیکن قاہرہ میں بغاوت کی افواہ کی اطلاع پا کر صلاح الدین کو اس وقت محاصرہ اٹھانا پڑا جب قلعہ الشویک والوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور قلعہ کا کرنے کے لئے انہوں نے چند دنوں کی مہلت مانگی تھی۔

اور اب یہ دوسرا موقع تھا کہ صلاح الدین نصرانی قلعہ کرک کی طرف جا رہا تھا جو مضبوطی اور محل وقوع کی بنا پر الشویک سے زیادہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اس سفر یا

کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ محاصرے کے دوران انہیں کسی طرح کا نقصان سلوک کے صلہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ معززین شہر ہم سے تعاون کریں اور ہمیں کرنے کی کوشش کریں جو ہمیں قلعہ سر کرنے کے لئے درکار ہوگی“

صلاح الدین نے یہ کہہ کر دراصل شہروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا نے اس پیشکش پر بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا انہوں نے پہلے ایک دوسرے کو اشارہ ایک بزرگ نے سب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ”ابے شای سپہ سالار کرک کے آپ کے لشکر گزار ہیں کہ آپ کے لشکر نے نہ تو بستیوں کو تاراج کیا اور نہ خاکستر کیا ہم اس با عزت پیشکش کے لئے بھی آپ کے شکر گزار ہیں اور آہ دلاتے ہیں کہ ہم محاصرے کے سلسلے میں ہر وہ چیز آپ کو مہیا کریں گے جو آپ طلب فرمائیں گے“

پہلا بزرگ خاموش ہوا تو دوسرے بزرگ نے اس کی بات کو آگے بڑھایا اسلام کے جوان عمر اور جوان مرد سپہ سالار! سب سے پہلے تو میں اس بات کا اظہار سمجھتا ہوں کہ یہ لشکر اور اس سپہ سالار کی تعریف کے قابل ہے کہ اس نے ایک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا ہے جو اپنی جدید تعمیر کے بعد سے آج تک کسی سے دوسری بات یہ کہ ہم اپنے پورے تعاون کا آپ کو اس لئے بھی آپ کو یقین دلا قلعہ کرک کے مالکان ہم شہروں کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں زرخیز داری اور پانا بھال تو ہم لوگوں کے ذمہ ہے لیکن اس سے فائدہ قلعہ والے اٹھاتے ہیں وہ شہر کو پکڑ لے جاتے ہیں اور ان سے بیگار لیتے ہیں“

صلاح الدین اور اس کے سرداروں نے دونوں بزرگوں کی باتیں بڑی توجہ کچھ دیر اور بھی باتیں ہوئیں جس میں بزرگوں نے انہیں بتایا کہ قلعہ کے گرد جو اس کے نیچے سے ایک زمین دوز راستہ قلعہ تک گیا ہے اگر اس راستہ پر کسی ط جائے تو قلعہ تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے کیونکہ اس راستہ کے دونوں جانب چٹانیں ہیں شہر والوں نے زمین دوز راستے کے دروازے کی نشاندہی کر دی اور گھاٹی میں اس دروازہ تک پہنچنا نہایت دشوار ہے پھر بھی اگر کوئی وہاں پہنچ جائے تو چھٹی چٹانوں سے اس قدر پتھر لڑھکائے جاتے ہیں کہ دروازے کے قریب پہنچنے میں دبا کر رہ جاتا ہے۔

صبح کو صلاح الدین نے چند سرداروں کے ساتھ اس گھاٹی کا اچھی طرح جہاں زمین دوز راستے کا دروازہ بتایا گیا تھا پھر اس نے ایک سردار کو حکم دیا کہ وہ

لے کر گھاٹی میں اترے اور دروازے کی صحیح جگہ معلوم کرے سردار صلاح الدین کے لم کی فوراً قبیل کی اور چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا گھاٹی میں اتر گیا اس نے واپس آکے بتایا کہ اب جگہ چٹان میں دروازے کا نشان تو ہے مگر اسے اندر کی طرف سے ایک اور چٹان نے باندھ کر دیا ہے اور اس میں کوئی دروازہ تک نظر نہیں آتی۔

اس سے اگلی صبح صلاح الدین نے چند جوانوں کا ایک دستہ بنایا اور اسے حکم دیا کہ ان کی روشنی میں اوپر کی طرف چڑھیں اور دشمن کی ان کمین گاہوں کو تلاش کریں جو قلعہ کے باہر ڈھلوان پر قائم کی گئی ہیں شاہی جوانوں نے چٹانوں اور اپنی ڈھال کی آڑ لے کر پڑھنا شروع کر دیا یہ لشکری کافی اوپر چڑھ گئے اور ان کا راستہ کسی نے نہ روکا اب وہ سین ہو کر اوپر کی طرف چڑھنے لگے ٹھیک اسی وقت انہیں یوں محسوس ہوا جیسے پہاڑ بڑی چٹانوں میں تبدیل ہو گیا ہے اور یہ چٹانیں اوپر سے لڑھکتی ہوئی ان کے سروں پر گر رہی ہیں۔

لشکریوں نے فوراً اپنے قدم روکے اور ایسی چٹانوں کی آڑ میں پناہ لی ڈھلوان پر چھت کام کرتی تھیں مگر یہ کام بہت پھرتی سے کیا گیا اور جن لشکریوں نے ذرا بھی تساہل سے لیا وہ زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکے چونکہ پتھروں کی یہ بارش ہر طرف ہو رہی تھی اس لئے لشکری قریب ترین چٹانوں کی آڑ میں ہو گئے یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا پھر رک گیا ریلوں نے پہلے سے زیادہ احتیاط کے ساتھ دوبارہ چڑھنا شروع کیا اب وہ ایک پناہ گاہ سے نکلے اور بھاگ کے دوسری پناہ گاہوں میں پہنچ جائے ان کی رفتار کافی سست ہو گئی پھر ان اوپر چڑھنا اس وقت بالکل بند ہو گیا جب ان پر پتھروں کے بجائے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

دشمن کے تیر انداز جیسے انہیں دیکھ دیکھ کے تیر پھینک رہے تھے کیونکہ تیر ان کے لپاس گرے تھے اور اگر وہ جلدی سے آڑ میں نہ ہو جاتے تو ان کا زخمی ہونا لازمی تھا آگے تو نہ بڑھ سکے لیکن انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ کس قدر بلندی تک راستہ صاف ہے رکھال سے خطرہ شروع ہوتا ہے جب اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ واپس ہوئے اور اپنے سپہ سالار کو ن بھر کی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

صلاح الدین نے اسی وقت مجلس مشاورت منعقد کی اور سرداروں کو صورت حال بتائی لیکن گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ قلعہ کو سر کرنے کے لئے دونوں محاذوں پر کوشش کی جائے یعنی ایک طرف تو لشکری اوپر چڑھنے کی کوشش کریں دوسری طرف خندق کے نیچے زمین دوز راستے کے دروازہ کو کسی طرح کھولا جائے صلاح الدین نے اس کی یہ تدبیر پیش کی

”مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اللہ کی ذات سے ناامید نہیں ہوتے“ قاصد نے ہمدی سے کہا ”وہ تو مردے میں بھی جان ڈال سکتا ہے مگر سردار نجم الدین بہت زیادہ زخمی ہیں میں آپ سے جلد قاہرہ جانے کی درخواست کرتا ہوں“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بابا جان کی زندگی سے ناامید ہو گئے ہو؟“ صلاح الدین نے فوڈ کلائی کے انداز میں کہا۔

”میں سوائے آپ سے درخواست کرنے کے اور کچھ نہیں کہتا چاہتا“ یہ جواب دے کر قاصد نے سرجھکا لیا۔

صلاح الدین نے سمجھ لیا کہ حالات واقعی بڑے گہیر ہو گئے ہیں اس نے فوراً سرداروں کو جمع کیا صلاح الدین اس قدر پریشان تھا کہ وہ سرداروں سے ٹھیک طرح گفتگو نہ کر سکا اور سرداروں نے قاصد سے پورے حالات معلوم کئے اسی وقت کوچ کا حکم ہو گیا در سرگ کی کھدائی کا کام وہیں پر چھوڑ دیا گیا خیمے اکھاڑے جانے لگے اور سلمان گاڑیوں پر ہار ہونے لگا میدان میں صرف صلاح الدین کا خیمہ باقی تھا کہ ایک سوار کسی طرف سے دوڑا ہوا اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں وزیراعظم کے خیمہ کے قریب پہنچ کے کھینچیں۔

صلاح الدین کا محافظ غلام تیزی سے سوار کے پاس پہنچا اور قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کے کمانہ لہجے میں پوچھا ”کون ہو تم؟“

اس کے جواب میں سوار نے آہستہ سے کچھ کہا جسے سنتے ہی غلام صلاح الدین کے پیچھے میں داخل ہوا پھر چند لمحوں بعد وہ واپس آیا اور سوار سے کہا ”اندر چلو“ تمہیں زیراعظم نے طلب کیا ہے“

سوار نے قدم بڑھائے تھے کہ صلاح الدین خود خیمہ سے نکل آیا اور سپاٹ لہجے میں ”ابو“ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں عقاب“

جواب میں عقاب نے سر جھکا کر اسے تعظیم پیش کی ”مجھے فوراً“ اذن گفتگو عطا کیا جائے“

صلاح الدین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اسی طرح سوار کو لئے ہوئے اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ جب صلاح الدین اور سوار خیمے میں داخل ہو رہے تو صلاح الدین نے ٹھمر کے اپنے غلام کو تاکید کی تھی ”عقاب کے آنے کی کسی کو خبر نہ ہو اور ہماری گفتگو میں کوئی دخل نہ ہونے پائے“

غلام بہت تھکا ہوا تھا اور صلاح الدین اس کے آنے سے سخت فکر مند تھا صلاح الدین نے آنے والے سوار کو عقاب کے نام سے مخاطب کیا تھا یہ اس کا اصلی نام نہ تھا

کہ چٹانوں سے بند راستے کے نیچے سرگ کھودی جائے اور اس میں لکڑیاں بھر دکھائی جائے اس طرح اڑے گی اور ساتھ میں دروازے کو بند کرنے والی چٹانیں جائیں گی یہ ایک نہایت مفید تدبیر تھی سب نے اس پر اتفاق کیا اور فوراً ہی انتظامات شروع ہو گئے۔

پتھریلی زمین میں سرگ کھودنا اور اس حالت میں کہ زمین کے اندر بھی چٹانیں انتہائی دشوار گزار کام ہے مگر شامی لشکریوں اور ساتھ آئے ہوئے ماہرین ارضیات کو ششیں جاری رکھیں اور سرگ نصف کے قریب تیار ہو گئی مگر ہوتا وہی ہے جو تصور ہوتا ہے ایک دن شام کے وقت قاہرہ سے ایک تیز رفتار قاصد پہنچا اور اس ایسی خبر سنائی کہ صلاح الدین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”محترم وزیراعظم۔۔۔“ قاصد نے سلام کے بعد عرض کیا ”آپ کے والد سردار نجم الدین ایوب شدید زخمی ہیں اور آپ کی صورت دیکھنے کے آرزو مند ہیں“ خبر بڑی لرزہ خیز تھی۔ صلاح الدین کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ اسد الدین شیرکوہ کے انتقال کے بعد صلاح الدین ہر اہم معاملہ میں اپنے باپ سے کرتا تھا اس خبر سے صلاح الدین کے ہاتھ پیر تو لرز اٹھے تھے پھر بھی اس نے خود کو اور پوچھا ”پدر بزرگوار زخمی کس طرح ہوئے؟“

”محترم وزیراعظم“ قاصد نے جواب دیا ”سردار نجم الدین ایوب فوجوں کا معا رہے تھے کہ باب الفتح کے باہر گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور معہ سوار زمین پر آ رہا شدید زخمی ہوئے ہیں اور آپ کو فوراً“ بلایا ہے“

قلعہ الشویک کے محاصرے کے دوران مصر میں بغاوت کی افواہ پھیلی تھی اور الدین کو جیتی جنگ کو ادھورا چھوڑ کے قاہرہ واپس جانا پڑا تھا اور اس وقت بھی وہی اس سے زیادہ خطرناک صورتحال پیدا ہو گئی تھی مصر کے حالات کو درست اور قائم رکھنے کے لئے نجم الدین ایوب جیسے مدبر اور دل گردے کے سردار کی ضرورت تھی الدین کے لئے مصر اور نجم الدین ایوب دونوں انتہائی اہمیت رکھتے تھے کیونکہ نجم الدین حالت سے باغی فائدہ اٹھا سکتے تھے اور صلاح الدین کی اتنے دنوں کی محنت خاک میں ڈال دی تھی۔

صلاح الدین نے واپس جانے کا فیصلہ تو فوراً ہی کر لیا تھا پھر بھی اس نے اطمینان کے لئے قاصد سے استفسار کیا ”کیا بابا جان کے زخم مندل ہونے کی کوئی نہیں؟“

دراصل وہ صلاح الدین کی طرف سے دمشق میں مقیم جاسوسوں میں سے ایک تھا صلاح الدین نے اپنے تمام جاسوسوں کے نام پڑندوں کے نام پر رکھے تھے مثلاً "بلبل"، "ہنس" اور فاختہ وغیرہ۔

صلاح الدین نے خیمے میں داخل ہوتے ہی کہا "عقاب وہ خبر جلد سناؤ جو تمہارے ما پر بوجھ اور ہماری فکر مندی کا باعث ہے؟"

"آقائے محترم" قاصد (جاسوس) نے کہا "سلطان دمشق نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا ہے۔"

"یہ شعلہ کس ملک کو خاستہ کرنے کا عزم رکھتا ہے؟" صلاح الدین نے ٹھہرے! میں کہا۔

"اعلان ہوا ہے کہ یہ آتش بدایاں لشکر قلعہ کرک کو پھونکنے آرہا ہے" قاصد۔ انکشاف کیا، صلاح الدین نے قدر تلخ لہجے میں کہا "لشکر کی سرداری کس کے سپرد ہے؟" "سلطان مشرق بہ نفس تنیس خود یہ فرض ادا فرمائیں گے" قاصد نے دوسرا انکشاف کیا۔

صلاح الدین نے ایک ٹھنڈی سانس لی "انیس کہ دشمن اپنی ریشہ دوانیوں سے با نہیں آتے سلطان کو مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ میں اس مہم کو تنہا سر کر سکتا ہوں خیرام وقت تو میں قاہرہ واپس جا رہا ہوں پھر بزرگوار گھوڑے سے گر کے شدید زخمی ہیں ان کا حالت بہت نازک ہے آج ہی مجھے اطلاع ملی اور میں نے فوراً واپسی کا حکم دے دیا۔"

صلاح الدین نے اسی وقت اپنے دوسرے غلام کو بلوایا اور حکم دیا "تم اس وقت دمشق روانہ ہو جاؤ اور دربار عالی میں میری طرف سے عاجزانہ عرض کرو کہ میں سلطان غلام صلاح الدین سپہ سالار اور وزیر اعظم مصر مقیم قاہرہ اپنے والد ماجد کے شدید زخمی ہو۔ کی خبر پا کر قلعہ کرک کا محاصرہ ختم کر کے قاہرہ واپس جا رہا ہے، خطرہ ہے کہ والد کے زخم ہونے سے دشمن علم بغاوت نہ بلند کر دیں اس لئے واپسی ضروری ہے باقی باتیں تم ذرا بیان کر دینا جاؤ فوراً تیاری کر کے روانہ ہو جاؤ"

ادھر غلام رخصت ہوا ادھر صلاح الدین نے عقاب کو بھی رخصت کیا "عقاب اگر تم بہت جلد تھکے ہو اور تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے لیکن ہم اس وقت قاہرہ واپس رہے ہیں تم چاہو تو ہمارے ساتھ قاہرہ چل سکتے ہو وہاں کچھ دن آرام کرنے کے بعد دمشق واپس جانا"

عقاب نے اس پیشکش سے فائدہ اٹھایا اس کے بال بچے قاہرہ میں تھے اس نے کہا

میں آپ کے ساتھ قاہرہ چلنے پر آمادہ ہوں"

"نیک ہے، چلو میرے ساتھ" صلاح الدین نے اسے اجازت دے دی۔

صلاح الدین کی بھی کیسی قسمت تھی، ڈیڑھ سال پہلے الشویک کا محاصرہ کیا تو قاہرہ میں کی افواہ نے اسے محاصرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور اب وہ اپنے والد نجم الدین کی خراب حالت کی خبر پا کر قلعہ کرک سے محاصرہ اٹھا کر واپس جا رہا تھا راستے بھر کی طرح طرح کے خیالات گھیرے رہے گو کہ وہ دمشق سے سلطان کے آنے کی خبر پانے پہلے ہی قاہرہ واپس جانے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ دمشق کے امراء نے نوریہ کے پھر کان بھرس گئے کہ صلاح الدین نے اس دفعہ بھی سلطان کا سامنا کرنے سے کیا ہے اور باپ کی خراب حالت کا بہانہ کر کے قاہرہ واپس ہو گیا ہے۔

صلاح الدین اسی طرح کے دوسوں میں الجھا ہوا قاہرہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا لشکر منزل پیچھے رہ گیا تھا اور چند سرداروں اور امراء کے ساتھ بہت آگے نکل آیا تھا ایک باپ کی خستہ حالت کا خیال تو دوسری طرف سلطان دمشق کے جلال کا تصور، وہ خاموشی سے مگر اپنے آپ سے الجھتا ہوا قاہرہ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مخالف ست ایک تیز رفتار سوار آتے دکھائی دیا صلاح الدین کا دل نہ معلوم کیوں دھڑکنے لگا سوار آیا اور جب اس کی نظر صلاح الدین پر پڑی تو وہ فوراً گھوڑا روک کے بچ راستے میں ہو گیا صلاح الدین نے بھی قریب آکر گھوڑا روک لیا۔

سوار نے صلاح الدین کو ادب سے سلام کیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

صلاح الدین کو الجھن ہوئی اس نے خود ہی سوار کو مخاطب کیا "سوار تم شامی معلوم نے ہو اگر تم واقعی شامی ہو تو بتاؤ مجھے دیکھ کے تم رک کیوں گئے؟"

سوار اب بھی خاموش رہا۔

صلاح الدین نے اپنا سوال دہرایا "اگر تم شامی ہو تو ضرور جانتے ہو گے کہ میں مصر کا اعظم ہوں اور میرے سوال کا جواب نہ دینا گستاخی میں داخل ہے؟"

سوار جس کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا اب خاموش نہ رہ سکا اور چیخ مار کر نے لگا صلاح الدین کو اور زیادہ حیرت ہوئی اس نے نرمی سے دریافت کیا "اے بندہ خدا" پر کیا افتاد پڑی کہ تو اس طرح روتا ہے؟"

سوار اسی طرح روتا پھٹتا گھوڑے سے اترا اور اپنے سر کے بال نوچ کے بولا "میرے میرے سردار" میں آپ کا خادم ہوں اور دارالوزارت سے یہ خبر لے کر آرہا ہوں کہ لک سردار اور دانشوروں کے دانشور آپ کے والد محترم نجم الدین ایوب ہم لوگوں کو

چھوڑ کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، اب ہم انہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔
 صلاح الدین آگے نہ سن سکا سوار دیر تک کچھ کہتا رہا سوار کو روٹا دیکھ کر
 سردار وہاں آگئے انہوں نے صلاح الدین کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو کم سن ہو
 ممکن ہے کہ وہ سن رہا ہو اور اس میں جواب دینے کی طاقت نہ رہ گئی ہو صلاح الدین
 حال دیکھ کر سرداروں نے اپنے طور پر اعلان کیا کہ لشکر بغیر کوئی منزل کے قاہرہ کی
 رواں رہے گا دوسرا صلاح الدین کے دائیں بائیں اس کے گھوڑے سے گھوڑا ملا
 لگے شامی سرداروں نے صلاح الدین کو اس سے پہلے اتنا مغموں نہ دیکھا تھا وہ چاہئے
 کسی طرح صلاح الدین اور یہ لشکر خیریت سے قاہرہ پہنچ جائے وہاں بہت سے
 امراء نوریہ بھی موجود تھے ان کی موجودگی میں صلاح الدین کی طبیعت بحال ہو سکتی
 کسی نہ کسی طرح یہ لشکر گرتا پڑتا قاہرہ پہنچا ہر لشکری سوگوار تھا ہر آنکھ پر نم تم
 ہر لب پر ٹھنڈی آہیں تھیں صلاح الدین نے جیسے چپ کا روزہ رکھا تھا بقیہ تمام راستہ
 وہ نہ منہ سے بولا اور نہ کسی کے سوال کا جواب دیا لشکر قاہرہ پہنچا تو شہر کی سرحد
 بڑے بڑے اور امرا اس کے استقبال کو یا تو کھڑے ہوئے کہ صلاح الدین سے نجم الدین
 کی تعزیت کو موجود تھے صلاح الدین کو دیکھ کر ان کے آنسو چھلک آئے اور وہ نہ
 بھرنے لگے۔

فقہ موسیٰ ہکاری نے آگے بڑھ کے صلاح الدین کے گھوڑے کی باگ پکڑی،
 الدین خاموشی سے نیچے اترا اور فقہ محترم کے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح نہ
 بھرنے لگا۔ یہ منظر بڑا رقت آمیز تھا۔ صلاح الدین کی سسکیوں میں اور پچاسوں سے
 شامل ہو گئیں لوگوں کی داڑھیاں اشکوں سے تر ہو گئی تھیں ان کی سمجھ میں نہ آ رہا
 صلاح الدین سے کس طرح تعزیت کریں کیونکہ پچا اسد الدین شیرکوہ کی وفات کے بعد
 الدین کی محبت اور مشورت کا مرکز نجم الدین ایوب ہی تھا وہ ہر اہم موقع پر صلاح الدین
 کے سینہ سپر ہو جاتا صلاح الدین جب بھی دشمنوں کے زعمے میں پھرتا تو نجم الدین
 اسے ایسا مشورہ دیتا کہ دشمنوں کے منہ پھر جاتے تھے۔

نجم الدین ایوب کا نام آتے ہی شہریت کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جب ایک شام
 شکست خوردہ لشکر دریائے دجلہ کے کنارے آکر ٹھہرا دریا کے دوسرے کنارے ایک
 چوٹی پر شہریت کا قلعہ واقع تھا جو ایک مغرور سنتری کی طرح ہر سمت نگران معلوم ہوا
 اس شکست خوردہ لشکر کے عقب میں اس کا دشمن بڑھا چلا آ رہا تھا جس کے نام معلوم
 سے لشکر کا ہر سوار لرزہ برانداز تھا۔

آخر سردار لشکر نے دریا کے کنارے آکر بڑی حسرت سے بلند و بالا قلعہ کی طرف دیکھا
 لشکر کے دشمن سے بچاؤ کا واحد ذریعہ یہ قلعہ ہو سکتا تھا کیونکہ اگر یہ لشکر کسی طرح
 اپار کر کے اس قلعہ میں داخل ہو جاتا تو پھر دشمن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہوتا اس لشکر کو
 ان نقصان نہ پہنچا سکتا پھر اسے تائید غیبی ہی کہنے کے حاکم قلعہ نے دریا پار لشکر کی بد حالی
 پریشانی کا اندازہ لگایا اور کشتیوں کا ایک بیڑہ بھیج کے پورے لشکر کو بحفاظت اس سمت
 آیا اب لشکر دشمن کی پہنچ سے بالکل محفوظ تھا یہ رحم دل اور دور اندیش حاکم قلعہ نجم
 الدین ایوب ہی تھا۔

اس جگہ نجم الدین ایوب کے خاندان کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا اس لئے کہ نجم
 الدین ایوب ہی خاندان ایوبیہ کا بانی تھا جس خاندان میں اسد الدین شیرکوہ اور صلاح الدین
 ف جیسے بہادر، شہ زور اور حکمرانی کے جذبہ سے بھرپور ہمتیاں پیدا ہوئیں نجم الدین
 ب نہ علی تھا اور نہ ترک یہ دراصل رودادیہ قبیلہ کا ایک کرد تھا اس کی پیدائش آرمینیا
 وادیں کے نزدیک ارجانہ کان نامی ایک گاؤں میں ہوئی تھی کرد قوم نہایت سرکش اور
 بدوش زندگی گزارتے تھے زمانہ قدیم سے یہ لوگ ایران اور ایشیائی کوچک کے درمیانی
 ڈی سلسلوں میں جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں اور آج کل بھی ان کی یہ جدوجہد ایران
 روس کی سلطنتوں کے لئے درد سری بنی ہوئی ہے کرد قوم کے مزاج کا اندازہ لگایا جائے
 یہ لوگ قبائلی طرز زندگی تاج و تاراج مہمان نوازی جاں بازی عزت وفاداری کی حفاظت
 بہادری میں عمدہ قدیم کے عربوں سے ملتے جلتے ہیں۔

مسلم مورخین ایوب کے خاندان کو وادیں کے معزز ترین خاندانوں میں بتاتے ہیں
 ان کو وادیل بھی کہا جاتا تھا جو دسویں صدی عیسویں میں شمالی یا وسطی آرمینیا کا
 السلطنت تھا نجم الدین ایوب کے باپ شادی بن مروان کو اگرچہ عزت اور شہرت ورثہ
 ملی تھی لیکن وادیں پر زوال آگیا شادی کثیر الاولاد تھا اس لئے اس نے وادیں چھوڑ کے
 راجہ جانے کا قصد کیا اس نے سنا تھا کہ خلیفہ بغداد بہادروں اور شہسیر زونوں کو انعام و
 رام سے نوازتا ہے اسی خیال سے اس نے بغداد جانے کا فیصلہ کیا اسے اپنی اور اپنے
 بول کی بہادری اور شجاعت پر بڑا فخر تھا۔

خوش قسمتی سے شادی بن مروان کا ایک دوست ان دنوں بغداد کا شخص تھا وہ دوست
 ن کا نام بہروز تھا وہ بھی وادیں کا رہنے والا تھا چنانچہ شادی بن مروان مع اہل و عیال
 مدعا بغداد پہنچا اور اپنے دوست سے مدد کا طالب ہوا بہروز شہر کو تو ال ہونے کی وجہ سے
 ت بااثر تھا اس کی سفارش سے شادی بن مروان کے بڑے بیٹے نجم الدین کو قلعہ شہریت

معزل کر دیا۔

ہروز نے اپنی بد طبعی کا پورا مظاہرہ کیا اس نے صرف نجم الدین کو صرف معزل ہی نہیں کیا بلکہ جسے نیا قلعہ مقرر کیا گیا تھا اسے خلیفہ کا ایک فرمان دیا گیا جس میں نجم الدین کو حکم دیا گیا کہ اگر اسے معزولی کا حکم دن میں موصول ہو تو وہ شام سے پہلے قلعہ خالی کر دے اسی طرح اگر اسے حکم نامہ شام کو موصول ہو تو وہ صبح ہونے سے پہلے قلعہ سے نکل جائے۔

1138ء کی وہ رات بڑی بھیانک تھی جب قلعہ دار حکمران نجم الدین کو معزولی کا فرمان پہنچا اور اسے حکم ہوا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے قلعہ خالی کر دے اس قیامت خیز منظر کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے کیونکہ اس قیامت پر ایک اور قیامت ٹوٹی، نجم الدین ایوب کی بیوی حاملہ تھی اور اسے درد زہ شروع ہو چکا تھا وہ درروں میں مبتلا تھی اور نجم الدین جلدی جلدی سامان بندھوانے میں مصروف تھا پھر ٹھیک پچھلے پہر جب اس کا سامان قلعہ سے نکلنے والا تھا کہ قلعہ کے اس کمرے میں جہاں نجم الدین کی بیوی درد سے تڑپ رہی تھی، ایک لڑکھلکھ کی چیخ بلند ہوئی۔

اس خاندان پر شاید یہی رات سب سے بھاری تھی ایک طرف نجم الدین سر جھکائے معزولی کے حکم کی تکمیل میں لگا تھا اور دوسری طرف ایک نئی جان نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں، ضعیف الاعتقاد لوگ بچہ کی اس بے وقت کی پیدائش کو یقیناً بڑا منحوس کہیں گے لیکن اس بچہ کی پیدائش نے وہم و سوسہ اور فکروں کی تمام باتوں کو رد کر کے رکھ دیا تھا کیونکہ اس رات پیدا ہونے والا یہ بچہ منحوس نہیں بلکہ اس خاندان کے لئے ایک نیک فکون ثابت ہوا یہ بچہ صلاح الدین تھا جس نے سلطان صلاح الدین ایوبی بن کر نصرانی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

نجم الدین ایوب اپنے بھائی اسد الدین کو لے کر معہ دیگر اہل خانہ موصل کے حکمران عماد الدین زنگی کے پاس پہنچا عماد الدین نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دونوں بھائیوں کو دربار موصل سے وابستہ کر لیا۔ جبکہ کی فتح پر نجم الدین کو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا پھر وہ دمشق کا گورنر ہوا صلاح الدین نے ایسے باپ کے سائے میں پرورش پائی پھر اسد الدین جو اس وقت شیر کوہ کے نام سے مشہور ہو چکا تھا، نے صلاح الدین کو عماد الدین زنگی کی وفات کے بعد موجودہ سلطان نور الدین زنگی کے حضور میں پیش کیا اس کے بعد جب صلاح الدین مصر پہنچا اور اس کے چچا اسد الدین شیر کوہ کا انتقال ہو گیا تو وہ جوان جو بظاہر خاموش طبیعت اور فطرتی خیال کا معلوم ہوتا تھا اس کے جوہر کھلتا شروع ہوئے اور وہ وزیر اعظم مصر کے اعلیٰ

کا حاکم مقرر کر دیا گیا اس طرح یہ خاندان حکمران کے قلعہ میں پہنچ گیا پھر اسی قلعہ میں ایک شکست خوردہ لشکر کو پناہ دینے کا واقعہ پیش آیا جس نے بظاہر اس خاندان کی راہ کاٹنے بو دیئے مگر یہ کانٹے جلد ہی پھول بن گئے اور اس طرح نجم الدین ایوب، اسد الدین شیر کوہ اور صلاح الدین مہتاب اور آفتاب بن کر چمکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکمران کے قلعہ میں شکست خوردہ لشکر کو پناہ دینے والا قلعہ دار نجم الدین ایوب تھا اور جس کو پناہ دی گئی تھی وہ موصل کا حاکم عماد الدین زنگی تھا عماد الدین زنگی نے سلجوقی شہزادوں کی اقتدار کی جنگ میں ایک شہزادہ کا ساتھ دیا تھا اور مخالف فوجوں سے شکست کھا کر دجلہ کے کنارے پہنچا تھا اگر اسے حکمران میں پناہ نہ ملتی خدا معلوم اس کا کیا حشر ہوتا۔

اس زبردست احسان کے صلہ میں عماد الدین زنگی جب حکمران سے رخصت ہوا تو انہوں نے نجم الدین ایوب کو قول دیا کہ اگر نجم الدین کبھی ضرورت محسوس کرے تو فوراً موصل آجائے تاکہ اس کے احسان کا بدلہ اتارا جاسکے بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ایسا موقعہ ہر جلد آگیا بغداد کا شہنشاہ جس نے نجم الدین ایوب کو حکمران کا قلعہ دار مقرر کرایا تھا وہ عماد الدین زنگی کا سخت مخالف تھا جب اسے معلوم ہوا کہ نجم الدین نے عماد الدین زنگی کو حکمران کے قلعہ میں پناہ دی تھی تو اسے سخت طیش آیا اور وہ نجم الدین ایوب کا مخالف بن گیا اب وہ موقعہ کی تلاش میں تھا کہ نجم الدین کو عماد الدین زنگی کو پناہ دینے کی سزا دے۔ اسی زمانہ میں نجم الدین ایوب کا چھوٹا بھائی اسد الدین جو ایک خوبصورت، گرائیڈ اور بہت بڑا شیریں زن تھا اس کا جھگڑا حکمران کے بد معاشوں کے ایک گروہ سے ہو گیا مشہور ہے کہ بہادر آدمی بڑا رحمدل ہوتا ہے اس کی یہی رحم دلی تھی جس نے ایوب خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا بد معاشوں کے گروہ نے ایک شریف عورت کو گھیر لیا تھا اور اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے اتفاق سے اسد الدین ادھر آنکلا پھر کیا تھا اسد الدین ایک طرف اور بد معاشوں کا پورا گروہ دوسری سمت خوب نکواری چلی اسد الدین نے بد معاشوں کو مار بھاگایا اور ان میں سے ایک بد معاش اسد الدین کے ہاتھ سے مارا گیا۔

جو بد معاش مارا گیا تھا اس کا بھائی بہت با اثر تھا اور اس کی رسائی خلیفہ بغداد تک نہم اس نے بغداد پہنچ کر دربار میں فریاد کی کہ حکمران کے قلعہ دار کے بھائی اسد الدین نے اس بھائی کو خواہ مخواہ قتل کر دیا ہے چونکہ بغداد کے شہنشاہ نے نجم الدین کو قلعہ دار حکمران مقرر کیا تھا اس لئے یہ مقدمہ اس نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہروز پہلے ہی نجم الدین کے خلاف ہو گیا تھا چنانچہ اس نے خلیفہ سے کہہ کر نجم الدین کو حکمران کی قلعہ داری سے

عمدہ پر فائز ہو گیا۔

صلاح الدین نے اپنے باپ اور اہل خاندان کو قاہرہ بلوا لیا تھا اور باپ کے دشمنوں کے سارے مشکل سے مشکل حالات پر قابو پا رہا تھا اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ صلاح الدین کی دنیا تاریک ہو گئی اس کا محبت کرنے والا باپ اور ایک مشفق رفیق کے لئے اس سے جدا ہو گیا تھا صلاح الدین باپ کا جس قدر بھی غم کرتا وہ کم تھا۔

صلاح الدین کی قلعہ کرک سے واپسی پر یورپین مورخین نے اپنی عادت کے مطابق طرح طرح کے افسانے تراشے ہیں انہوں نے کرک سے واپسی کو الشویک کی واپسی سے دیا ہے اور لکھا ہے کہ صلاح الدین میں سلطان دمشق نور الدین زنگی کا سامنا کرنے جرات ہی نہ تھی اور وہ ایسے موقع پر بھاگ نکلتا تھا اس سلسلے میں سوائے اس کے اور کہا جا سکتا ہے کہ دشمنان اسلام ہر موقع پر مشاہیر اسلام کو بدنام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے صلاح الدین کے سلسلہ میں ان کی یہی کوشش رہی کہ اسے سلطان دمشق کا باغی ثابت کر اور اس کی بہادری اور شجاعت کو بزدلی سے تعبیر کریں۔

صلاح الدین کی قلعہ کرک سے واپسی باپ کے انتقال کی وجہ سے ہوئی تھی یہ ظاہر ہے کہ سلطان دمشق نے قلعہ کرک جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ صلاح الدین قاہرہ واپس جانا اس سے کہیں زیادہ ضروری تھا کہ وہ کرک میں ٹھہر کر سلطان کی آمد انتظار کرتا اگر وہ ایسی غلطی کرتا تو خدا معلوم اس وقت تک مصر کا کیا حال ہو جاتا اور قاہرہ موجود امراء نوریہ پر کیا گزرتی ہر حال قاہرہ پہنچ کے اس نے امراء نوریہ اور عزیزوں سے صلاح بشورے کئے جس میں طے پایا کہ سلطان کے پاس ایک معتمد قاصد جائے جو ایک طرف تو سلطان کو الشویک اور کرک سے واپسی کی صحیح وجوہات سے آگاہ کرے دوسرے طرف سلطان کے دماغ میں پیدا ہونے والے ان دوسووں کو زائل کرے صلاح الدین کے مخالف امراء نے پیدا کر دیئے تھے۔

دمشق بھیجنے کے لئے یوں تو قاہرہ میں کئی امراء نوریہ موجود تھے لیکن صلاح الدین نظر انتخاب فقیہ عیسیٰ ہکاری پر ٹھہری اس نے فقیہ صاحب کو تنہائی میں طلب کیا یہاں اس بات کا اعادہ کر دیا جائے تو بہتر ہو گا کہ صلاح الدین نے اس کام کے لئے فقیہ ہکاری کا انتخاب کیوں کیا تھا اس کی وجہ تھی کہ جس وقت صلاح الدین کے چچا اسد اللہ شیرکوہ جو مصر کے وزیر اعظم کے عہدہ بخلیلہ پر فائز تھا کا انتقال ہوا تو اس کا جانشین کرنے کا سوال اٹھا صلاح الدین زنگی کے مصوبہ فوج کشی کے وقت امراء نوریہ

بہرہ پر اسد الدین شیرکوہ کے ساتھ کر دیا تھا اور انہیں اختیار دیا تھا کہ وہ ہر اہم فتنہ پر باہم مشورہ سے خود فیصلہ کر لیا کریں انہیں بار بار سلطان دمشق کی اجازت کی روت نہیں۔

”امراء نوریہ“ وہ امراء کہلاتے تھے جنہیں سلطان نور الدین زنگی کے جنگ اور امن زمانہ میں اچھی طرح پرکھ کر اپنے دامن سے وابستہ کر لیا تھا چنانچہ ان کی ایک تعداد کے لشکر کے ساتھ بھی روانہ کی گئی تھی یہ امراء جس قدر بہادر تھے اسی قدر تند خو اور سر بھی تھے شیرکوہ کے انتقال کے وقت قاہرہ میں جتنے امراء نوریہ تھے ان میں عمر کے سے صلاح الدین سب سے چھوٹا تھا لیکن صلاح الدین نے بیچس اور دوسری جنگوں اپنی شجاعت کا نکتہ بٹھا دیا تھا اس لئے انتخاب کے وقت فقیہ عیسیٰ ہکاری نے صلاح بن کا نام شیرکوہ کے جانشین کے لئے پیش کیا تھا۔

صلاح الدین میں اگرچہ تمام قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں لیکن بعض امراء نوریہ یہ اعتراض کیا کہ صلاح الدین ابھی بہت کم عمر ہے اور کم عمری کی وجہ سے اس میں کی بھی کمی ہے اس لئے صلاح الدین کے بجائے کسی معمر امیر کو شیرکوہ کا جانشین یعنی کایا وزیر اعظم منتخب کیا جائے اس موقع پر فقیہ عیسیٰ ہکاری نے امراء کے سامنے ایک بہت تقریر کی اور بتایا کہ تجربہ کا تعلق عمر سے نہیں بلکہ انسان کے عملی کاموں سے ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں صلاح الدین نے جتنی جنگوں میں حصہ لیا اور شجاعت کے جوہر اے اس تک کوئی امیر نہیں پہنچتا اسی طرح انتظامی معاملات میں بھی صلاح الدین نے رعب کے گورنر کے طور پر بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور اسکندریہ کو اندرونی دھوئی دباؤ کے باوجود نصرانیوں کے حوالہ نہیں کیا یہاں تک کہ شیرکوہ اسکندریہ کے روکی خیرن کر جنوبی مصر سے واپس آگیا اور نصرانیوں کو محاصرہ چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔

فقیہ عیسیٰ ہکاری کی اس تقریر نے دشمنوں کے منہ پھیر دیئے اور امراء نوریہ کے امیروں نے فقیہ عیسیٰ ہکاری کا ساتھ دیتے ہوئے صلاح الدین کو مصر کا وزیر اعظم منتخب کیا۔ اگرچہ یہ انتخاب اتفاق رائے سے ہوا تھا لیکن بعض امراء نوریہ اس فیصلے کے تھے اور انہوں نے مصلحتاً اس سے اتفاق کیا تھا ایک امیر تو کھلم کھلا صلاح الدین کا ہو گیا اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اس عہدہ کے لئے صلاح الدین سے زیادہ کا حق ہے کیونکہ وہ صلاح الدین سے عمر میں بڑا اور زیادہ تجربہ رکھتا ہے یہی نہیں بلکہ صلاح الدین کے ماتحت کام کرنے سے انکار کر دیا اور قاہرہ سے دمشق واپس چلا گیا وقت سے اب تک یہ امیر جس کا نام عین الدولہ باروقی تھا دوبارہ دمشق میں صلاح

الدین کی مخالفت کے مواقع ڈھونڈا کرتا تھا۔

عین الدولہ باروتی کے علاوہ قاہرہ میں بھی دو تین امیر اپری دل سے صلاح سیادت تسلیم کرتے تھے ورنہ اصل میں وہ بھی عین الدولہ باروتی کے ہم خیال سلطان کو صلاح الدین کے بارے میں خفیہ رپورٹ بھیجا کرتے تھے صلاح الدین فقیہ عسکری ہکاری کو دمشق بھیجتا چاہتا تھا کہ اسے ان پر سب سے زیادہ اعتماد سلطان نور الدین زنگی بھی ان کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔

پس صلاح الدین نے فقیہ عسکری ہکاری سے کہا ”بزرگ محترم“ ابا جان کے بعد میں آپ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہوں الشویک کے قلعہ سے میری اچانک دشمنوں نے جو میرے اور سلطان کے درمیان غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی تو تو ابا جان مرحوم نے نکال لیا تھا مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں اور قلعہ کرک کو آؤ بنا کر دوبار دمشق ہی دشمن پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کر رہے ہوں گے اگر یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو دمشق بھیجا جائے اور آپ اپنی صوابدید کے مطابق صلاح صاف کرنے کی کوشش کریں“

فقیہ عسکری ہکاری نے متانت سے جواب دیا ”محترم وزیر اعظم“ الشویک ہو دونوں مقامات سے لشکر کی واپسی کے مضبوط دلائل موجود ہیں کیا بزرگ سردار انتقال نہیں ہوا اور کیا نجم الدین وزیر اعظم کے والد بزرگوار نہیں تھے کیا ایک ماہ بیٹے کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ نہ صرف باپ کے غم سے غمگین فوراً المیہ پاس پہنچے بلکہ اس سرزمین کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی فوراً واپس آئے جسے ماہ کے لئے لشکر شام نے خون بہایا ہے“

”یہ حقیقت ہے کہ میری حمایت میں بہت سی دلیلیں ہیں“ صلاح الدین نے سلطان کے سامنے کون زبان کھول سکا ہے، سلطان صرف امرائے نوریہ ہی کی بلکہ اور ان کے دربار میں جتنے امرائے نوریہ موجود ہیں اس میں سے بیشتر میرے مخالف ”وزیر اعظم کو پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں“ فقیہ عسکری ہکاری۔ الدین کو اطمینان دلایا ”سردار نجم الدین کے انتقال کی خبر سلطان کو مل چکی ہوگی اگر نے پھر بھی اس واقعہ کو کوئی اور رنگ دیا ہو گا تو میں وہاں پہنچ کے سب سنبھال سلطان کو اصل حالات سے آگاہ کروں گا“

فقیہ عسکری ہکاری دمشق پہنچے وہ ایک خاص مشن پر آئے تھے انہیں مناسب مناسب بات کہنے کا ڈھنگ بھی آتا تھا سلطان دمشق نور الدین زنگی کے مزاج۔

اپنی طرح واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سلطان اپنے دربار میں کسی امیر کی تعریف نہ کر سکتا تھا اس لئے انہیں بہت سنبھل کے گفتگو کرنا تھی۔ انہیں صلاح الدین کی طرف بھی اس انداز میں کرنا تھی کہ سلطان کو ناگوار نہ گزرے فقیہ عسکری ہکاری کی عمر ساٹھ کے باب تھی لیکن وہ جوانوں کی طرح گھوڑا سرپٹ بھاگتے قاہرہ سے دمشق پہنچے تھے انہوں نے مطلع اپنا گھوڑا دمشق کے قصر سلطانی کے صدر دروازے پر جا کے روکا تھا اس وقت بارگاہ تھا فقیہ عسکری گھوڑے سے اتر کے سیدھے دربار میں پہنچ گئے انہیں دربار کے تمام ردار جانتے تھے اس لئے کسی نے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہ کی۔

فقیہ عسکری ہکاری نے دربار میں داخل ہو کر جب سلام پیش کیا تو درباریوں اور خود خان کو بڑی حیرت ہوئی سلطان دمشق نے کمال تعجب سے پوچھا ”امیر عسکری ہمیں اپنی ٹھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ تم ہمارے دربار میں کھڑے ہو، قاہرہ سے کب آئے؟“

”سلطان معظم“ فقیہ عسکری ہکاری نے ہاتھ باندھ کے کہا ”غلام سیدھا قاہرہ سے آ رہا ہے میں نے ابھی اپنا گھوڑا دربار کے صدر دروازہ پر چھوڑا ہے“

”تم نے تو کمال کر دیا امیر عسکری“ سلطان نے کہا ”ابھی قاہرہ سے آ رہے ہو تو کچھ دیر رام کیا ہوتا پھر دربار آ جاتے“

”حضور عالی! اگر میں دمشق پہنچ کے پہلے تھکن دور کرتا اس کے بعد سلام کو حاضر ہوتا امیر اسلام باسی ہو چکا ہوتا اور مجھے وہ لذت اور سکون حاصل نہ ہوتا جو اس وقت کے لام میں حاضر ہوا ہے“ فقیہ عسکری نے ایک معمولی بات کو اس انداز میں کہا کہ سلطان کا وہ سرت سے چمک اٹھا۔

”سبحان اللہ امیر عسکری، ہم تمہاری محبت کے قائل ہو گئے“ سلطان نے فوراً ان کی طرف کی پھر ایک لمحہ توقف کے بعد پوچھا ”ہمارے نائب کا کیا حال ہے امیر عسکری“ اب سلطان کا چہرہ مطمئن ہو گیا تھا۔

فقیہ عسکری ہکاری نے فوراً وقت سے فائدہ اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے کہا ”سلطان معظم لی تربیت نے جس ہیرے کو تراشا تھا اس کی چمک دمک سے سلطنت مصر روشن ہو گئی ہے اب کا وہ غلام آج بھی دمشق کی طرف منہ کر کے عالی جاہ کی نوازشوں کا اقرار کرتا ہے اور ضرور کی درازی عمر کی دعا مانگتا ہے“

سلطان اور خوش ہوا اس نے فوراً کہا ”بے شک، بے شک“ اس نے ہماری تربیت کا تحفہ فائدہ اٹھایا۔

فقیہ عسکری نے کوئی جواب نہ دیا لیکن صلاح الدین کے مخالف امرا کے چہروں کا رنگ

اڑ گیا۔

سلطان نے فقیہ عیسیٰ ہکاری کو دیکھتے ہوئے کہا ”امیر عیسیٰ تم جا کے آرام کر لے جاؤ تو تم رات کو حاضر بھی ہو سکتے ہو“

”جہاں پناہ کا سایہ ہم پر قیامت تک قائم رہے“ پھر فقیہ نے رخصتی سلام کیا اور سے نکل گئے۔

دن کا باقی حصہ فقیہ عیسیٰ ہکاری نے پرانے دوستوں سے ملاقات میں گزارا، ہکاری جس وقت سے مصر گئے تھے انہیں واپس آنے کا موقع نہیں ملا تھا انہوں نے دوستوں سے مل کے پرانی یادیں تازہ کیں اس گلی سے گزرے جہاں ان کی حویلی تم کے دکانداروں نے انہیں فوراً پہچان لیا اور مصر کے حالات پوچھنے لگے فقیہ عیسیٰ ہکاری بڑے امیر تھے لیکن محلہ والوں کے ساتھ وہ کھل مل گئے اور ساتھیوں کی طرح باتیں کر لگے۔

فقیہ عیسیٰ ہکاری کے صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی عرصہ ہوا ہو چکی تھی وقت وہ اور اس کا شوہر دمشق کے شمال میں .طبک میں رہائش پذیر تھے .طبک مشہور تاریخی قصبہ اور شہر ہے صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب جب سکریٹ کے سے نکل کر عماد الدین زنگی کے پاس معہ اپنے اہل خاندان کے پہنچا تھا تو اسے سب پہلے .طبک کا حکم مقرر کیا تھا فقیہ عیسیٰ ہکاری نے سوچا تھا کہ دمشق کی واپسی سے پڑی بیٹی داماد سے ملاقات کے لئے .طبک ضرور جائیں گے۔

فقیہ کے یار دوستوں اور شناسائیوں کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ ان سے ملاقات کرتے اسے رات ہو گئی پھر بھی وہ بہت سے دوستوں سے نہ مل سکا سلطان نے اسے کی ملاقات کا اشارہ کیا تھا وہ جلدی جلدی احباب سے جان چھڑا کے قصر شاہی کی روانہ ہوا قصر کے دروازوں پر پہنچا تو ایک محافظ نے آگے بڑھ کے ان کا استقبال کیا اور لفظوں میں کہا۔

”عالی جاہ بڑے ویر سے آپ کے خضر ہیں کئی بار حاجب نے آکر آپ کے بارے دریافت کیا ہے، آپ فوراً حضور شاہ میں تشریف لے جائیے“

محافظ نے مفتی صاحب کی رہبری کے لئے اپنا ایک آدمی ساتھ کر دیا جو انہیں خاص مقام تک لے گیا وہاں اس نے فقیہ کو شاہی محافظوں کے سپرد کیا جو اسے سلطان مشرق نور الدین زنگی کی طرف چلا، سلطان نور الدین اپنی خواب گاہ کے برابر چھوٹے ہال میں موجود تھا اس جگہ سلطان خاص خاص لوگوں کو قدم بوسی کی اجازت

ہال اور شاہی خواب گاہ کی آرائش و زیبائش کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں دمشق کا قصر ی صدیوں سے غلیفوں اور مختلف بادشاہوں کا مسکن رہا تھا اس میں ہر کین اپنی طبیعت بذاتی کے مطابق کمی بیشی کرتا رہتا تھا سلطان نور الدین زنگی کی زندگی کا مقصد ہی جہاد اس لئے اس کمرے میں جو دراصل ملاقات کے لئے استعمال ہوتا تھا دیواروں پر اس قدر لکھ لکھا ہوا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا اسلحہ خانہ بن گیا تھا۔

سلطان مشرق اس مہمان خانہ یا اسلحہ خانے میں کچھ بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ اسے یہ عیسیٰ ہکاری کے آنے کی اطلاع دی گئی سلطان نے بلا توقف انہیں بلوا لیا فقیہ ہال میں غل ہوا تو سلطان بالکل دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور اس کی نظریں دروازے کی طرف میں سلطان کو اس انداز میں دیکھ کے فقیہ عیسیٰ پریشان ہو گئے اور گڑ بڑا کے فوراً آداب ل کیا۔

سلطان مشرق نور الدین زنگی کو شاید فقیہ عیسیٰ ہکاری کی یہ بوکھلاہٹ پسند آئی۔ انہوں نے تبسم فرمایا اور کہا ”امیر عیسیٰ تم ابھی تک تھکے ہوئے ہو، طبیعت نہیں ٹھیک تھی تو صبح آجائے، اتنی جلدی کیا تھی کب واپس جانے کا ارادہ ہے؟“

سلطان نور الدین زنگی نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے تھے فقیہ پہلے ہی گھبرائے دئے تھے سلطان کے سوالوں نے انہیں اور پریشان کر دیا سلطان کو شاید یہ ان کی حالت سے لطف ہو رہا تھا انہوں نے حکم دیا ”امیر عیسیٰ اس چوکی پر بیٹھ کے پہلے اپنے حواس رست کرو پھر باتیں ہوں گی“

فقیہ عیسیٰ ہکاری نظریں جھکائے چوکی کی طرف بڑھے قریب پہنچے مگر اس پر بیٹھے تھے نہاں پناہ آپ کھڑے ہیں پھر یہ غلام بیٹھنے کی کیسے جرات کر سکتا ہے؟ اللہ اللہ اس وقت کے درباری اپنے بادشاہ کا کس قدر احترام کرتے تھے حالانکہ سلطان نے خود ان سے بیٹھنے کو کہا تھا لیکن فقیہ نے کھڑے ہوئے سلطان کے سامنے بیٹھنے سے گریز کیا۔

سلطان نے فرمایا ”بزرگ امیر، اگرچہ امرا پر شاہی احترام لازم ہے لیکن شاہی حکم اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے“

”حکم حاکم جان وارد“ فقیہ محترم نے کہا اور بے تکلف چوکی پر بیٹھ گئے۔ زر نگار چوکی دیکھنے کے قابل تھی اس کے پائے نیچوں پر جگہ جگہ جواہرات لگے تھے اور سونے چاندی کے تاروں سے پھول بوٹے بنے تھے اس زر نگار صندی چوکی ایک بیش قیمت عالجی بچھا تھا جس کے ایک کونے پر ایک مخملی جانا نما رکھی تھی۔

سلطان کچھ اور قریب آکر کھڑا ہو گیا ”بزرگ امیر، ہم سے آنکھیں ملا کر گفتگو کرو“

بھی دیکھ لی تھی اسی لئے اسے کوئی جلدی نہ تھی۔

قلم بھی اسی طرح فرصت میں تھا شہزادہ نزار اسی کے ذریعہ درشہوار تک پہنچ سکتا تھا۔ قلم اس منزل کا پہلا سنگ میل تھا تو نیل کو دوسرے سنگ میل ہونے کا درجہ مل تھا اس طرح قلم اور نیل میں جس طرح کا رابطہ پیدا ہو رہا تھا اس کی مثال ایک دو کاج سے دی جا سکتی تھی ایک طرف نیل اور درشہوار تھی تو دوسری طرف قلم اور وہ نزار تھا اور ان سب کا مفاد آپس میں گڈ مل تھا۔

قلم شہزادہ نزار کے محل سے روانہ ہوا تو اس نے جان بوجھ کے دور کا راستہ اختیار نیل بہت چالاک تھی اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ قلم نے دور کا راستہ اختیار کیا ہے درشہوار کے محل تک پہنچنے میں کافی وقت صرف ہو اور اس طرح قلم کو نیل سے گفتگو نہ حال دل بیان کرنے کا پورا موقع مل جائے نیل بھی یہی چاہتی تھی قلم اسے پسند آگیا اور قلم کو اس کی آنکھ کا وہ ہلکا سا سفید تل بھی نظر نہ آیا تھا جس کی وجہ سے نیل اپنی جنموں میں بد شکل مشہور تھی۔

قلم بہت بے صبر نظر آ رہا تھا اس لئے اسی نے گفتگو کا آغاز کیا مگر پہلے اپنے آپ کو دکھا اس نے نیل سے آنکھیں چار کرتے ہوئے پوچھا ”نیل تمہارا کیا خیال ہے کیا شہوار میرے شہزادے کو پسند کر لیں گی؟“

”یہ ضروری تو نہیں ہے قلم“ نیل نے جواب دیا ”درشہوار نے ایک بار بھی زانوے کو نہیں دیکھا“ جب تک وہ شہزادے کو دیکھ نہ لیں اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو نیل“ قلم نے جواب دیا ”محبت اور شادی کے لئے ایک دوسرے کا دیکھنا اور پسند کرنا ضروری ہے“

”میں تمہاری یہ بات بھی نہیں مان سکتی قلم“ نیل نے اس کی یہ بات بھی کات دی یہاں تک شہزادے نزار کا تعلق ہے وہ صرف شاہی خاندان کے ایک شہزادے یا فرد ہیں اس کے علاوہ ان میں اور کوئی ایسی خوبی موجود نہیں جو عورت کو ان کی طرف راغب کر سکے برخلاف اس کے درشہوار ایک غیر معمولی عورت ہیں ان کا پہلا اعزاز یہ ہے کہ وہ مصر کے غلیفہ کی بیوہ ہے دوسری بات ان کا بے مثال حسن ہے سب جانتے ہیں کہ مصر میں درشہوار سے زیادہ خوبصورت عورت کوئی اور نہیں“

”مگر نیل تم نے یہ غور نہیں کیا کہ میرے شہزادے بھی خوبصورت ہیں اور انہوں نے مگر درشہوار کو اب تک آنکھوں سے نہیں دیکھا“ قلم نے اپنے آقا کی تعریف کرنا چاہی۔

فقیر عیسیٰ ہکاری نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

”بزرگ امیر۔۔۔۔“ سلطان نور الدین نے کمال سنجیدگی سے کہا ”کیا ہمارا پروردگار صلاح الدین آج بھی اسی طرح ہمارا مطیع و فرمانبردار ہے جیسے وہ دمشق میں ہوا کرتا تھا؟“

”سلطان معظم!“ فقیر عیسیٰ ہکاری نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا ”اس سلسلہ میں غلام یہ کہنے پر اکتفا کرے گا کہ صلاح الدین بیانگ دہل اور برسر دربار یہ کہتا ہے کہ اگرچہ میرا وہ باپ جس کا نام نجم الدین ایوب تھا اور جس کی میں اولاد ہوں، اس دنیا سے کوچ کر گیا ہے لیکن میرا وہ ثانوی باپ جس نے مجھ کدہ فائزاش کو تراش کر اور تربیت دلا کر اپنے پیروں پر کھڑا کرنا سکھایا ہے اس کا سایہ میرے سر پر قائم ہے اور اسی کی چھاؤں میں میں دشمنوں کے حروں کو بیکار اور ریشہ دوانیوں کے جال کو کاٹ رہا ہوں“

”بزرگ امیر، تمہاری زبان سے یہ باتیں سن کے ہمیں بڑی مسرت ہوئی“ سلطان نے کہا ”ہم جانتے ہیں کہ تم ایک دین دار اور راست گو امیر ہو، ہم نے اسی لئے تمہیں صلاح الدین کے ساتھ مصر روانہ کیا تھا ہمیں اگرچہ بہت سی غلط باتیں بتائی گئی تھیں لیکن اگر صلاح الدین کی طرف سے ہمارا دل بالکل صاف ہو گیا ورنہ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم مصر پہنچ کے خود اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات دیکھیں گے“

”مصر کے لوگ حضور کے دیدار کے مشتاق ہیں“ فقیر نے فوراً تائید میں کہا ”سلطان کی یہ سب سے بڑی کرم نوازی ہو گی کہ وہ مصر کی سرزمین کو قدم بوسی کی عزت بخشیں“

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”عیسیٰ ہکاری، ہمیں شام اور موصل کے جھگڑوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ دور کا سفر اختیار کر سکیں، جہاں تک مصر کا تعلق ہے اسے ہم صرف سلطنت و مشق کا ایک حصہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں ورنہ صلاح الدین سمجھدار ہے وہ اپنی حکمت عملی کے تحت ہر قدم اٹھا سکتا ہے“

”سلطان عالی کے خیالات کس قدر بلند ہیں“ فقیر نے تعریف کی ”سلطان کی ایک حوصلہ افزائی ہی تو وابستگان تخت و تاج کے وفاداری اور جاں نثاری میں اضافہ کرتی ہے خدا سلطان کو تابہ زندہ و سلامت رکھے“

قلم اور نیل کے لئے جیسے لمبی کے بھاگوں چھپکا ٹوٹا، دونوں شہزادہ نزار سے رخصت کر آہستہ آہستہ چلنے لگے، دونوں میں سے کسی کو بھی جلدی نہ تھی نیل کو درشہوار نے شہزادے نزار کا پتہ معلوم کرنے بھیجا تھا نیل نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اس نے شہزادے نزار کا نہ صرف پتہ معلوم کیا تھا بلکہ ان کے دل میں اتر کے درشہوار کے لئے محبت کی جگہ

قام اور نیل اس طرح کبھی سیدھی اور کبھی الٹی باتیں کرتے درشوار کے محل پہنچ
نیل اسے باہر چھوڑ کے اندر چلی گئی۔ درشوار نے اسے دیکھتے ہی پھٹکار لگائی ”
رے آنے کا یہ وقت ہے خدا کی پناہ، صبح سے شام کر دی، کیا قسام نے تجھے پکڑ کے بیٹھا
فانجھے بالکل ہی بھول گئی وہاں جا کے“

درشوار اسے ڈانٹ پلا رہی تھی اور نیل دانت نکالے کھڑی تھی جب درشوار بک
کے خاموش ہوئی تو نیل بولی ”اے محترمہ عالیہ! یہ کیسا زمانہ آیا کہ الٹا چور کو قاتل کو
نے، آپ نے ہی تو مجھے شزارے نزار کی خبر خبر لینے کے لئے بھیجا تھا اور اب مجھ کو
باتیں سن رہی ہیں“

شزارے نزار کے نام پر درشوار ٹھنڈی پڑ گئیں، بڑے چاؤ سے پوچھا ”شزارے سے ملی
تو۔۔۔ خیریت سے تو ہیں وہ؟“

”خیریت کہاں محترمہ عالیہ۔۔۔ وہ بیچارے تو۔۔۔۔۔“ اور نیل نے ردہا سنا منہ بنا کر
ٹھنڈی سانس لی ”بس اللہ ہی رحم کرے ان پر۔۔۔۔۔“
”ارے ارے، کیا ہوا شزارے کو؟ خیریت تو ہے اری کچھ منہ سے تو بول، چپ کیوں
دھل توئے؟“ درشوار گھبرا گئی اور نیل کو جھنجھوڑنے لگی۔

”محترمہ عالیہ! کیا بتاؤں، بس یوں سمجھئے اللہ نے جان بچا لی“ نیل نے چپا چپا کے کہا
”ارے کیا، مگر جاں بچنے سے کیا ہوتا ہے، زندگی بھر کے لئے۔۔۔۔۔“
”خدا کے لئے کچھ بتا تو نیل، کیا ہوا ہے شزارے کو؟“ درشوار کا رنگ فق ہو گیا۔
”مجھ سے تو ان کا حال بیان نہیں کیا جاتا“ نیل نے مکاری سے سسکیوں کے درمیان
”ما“ آپ قسام سے پوچھ لیجئے۔۔۔۔۔“

”قسام!“ درشوار نے حیرانی سے نیل کو دیکھا ”یہ قسام کون ہے؟“
”وہی قسام، شزارے نزار کا غلام، میں آپ کو بتا تو چکی ہوں“ نیل نے افسردگی سے
ذرا دیا۔

”اچھا قسام، مگر وہ ہے کہاں؟“ درشوار حواس باختہ ہو رہی تھی۔
”باہر کھڑا ہے، میں اسے ساتھ لائی ہوں، وہی شزارے کا حال بیان کرے گا“ نیل نے
بڑی سادگی سے کہا۔

”کہاں کھڑا ہے وہ؟“ یہ کہتے ہوئے درشوار باہر کی طرف چلی۔
نیل نے دوڑ کے اسے پکڑ لیا ”ہوش میں آئیے محترمہ عالیہ! آپ کے سر پر دوپٹہ تو
ہے نہیں پھر آپ باہر جا رہی ہیں، قسام کو آپ کیا جانیں وہ غیر مرد ہے اس سے آپ کیا

بس رہنے دو اپنے شزارے کو“ نیل نے منہ بنایا ”اسی مصر میں بلکہ تمہارے محلہ میں
ایک سے ایک خوبصورت شزارہ پڑا ہے اور سب جو تیاں چٹختے پھرتے ہیں انہیں کوئی اپنی
بیٹی نہیں دینا چاہتا خود تمہارے شزارے کا کیا حال ہے وہ بھی جوانی کے سرے پر کھڑے ہیں
ایک دو سال اور شادی نہ ہوئی تو کوئی منہ بھی نہ لگائے گا“

قسام نے محسوس کیا کہ نیل کا مزاج کچھ گڑ رہا ہے اس لئے اس نے فوراً رخ بدلا
اور بولا ”ارے چھوڑو بھی ان شزاروں کو، ہمیں انے کیا لینا ہمارا ان کا تو بس یہ واسطہ ہے
کہ یہ ہمیں تنخواہ دیتے ہیں اور ہم نیک نیتی سے ان کی خدمت کرتے ہیں جہنم میں جائیں
یہ سب انہوں نے تو ہماری باتوں کا ستیاناس کر دیا کیوں نہ نیل میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

نیل خواہ مخواہ مسکرا دی ”ٹھیک کہا تم نے، ذرا وقت ملا ہے تو ہم ان کی باتیں کیوں
کریں“

”تو اب میں اپنی بات کر سکتا ہوں؟“ قسام نے اسے محبت سے دیکھا۔
”کرو باتیں۔۔۔۔۔“ اور نیل شرما گئی۔

”کیا باتیں کروں۔۔۔؟“ قسام نے پھینچا۔

”میں کیا جانوں۔۔۔۔۔“ نیل نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”اچھا میں کیا ہوں یعنی تمہیں کیا لگتا ہوں؟“ قسام نے پوچھا۔

”تم اپنے شزارے سے اچھے ہو“ نیل نے ادا دکھائی۔

”ج۔۔۔۔۔؟“ قسام پھول گیا۔

پھر خاموشی طاری ہو گئی جیسے دونوں کچھ سوچ رہے ہوں۔

”کچھ اور بولو ناں۔۔۔۔۔“ نیل نے کہا۔

”اچھا اب کب ملو گی؟“ قسام کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو یہی کہہ بیٹھا۔

”یہ کیا بات ہوئی قسام، ابھی میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم آگے کی بات کہہ رہے

ہو“ نیل چاہتی تھی کہ قسام کوئی ایسی بات کہے جس سے اس کا دل خوش ہو۔

”نیل تم دنیا میں مجھے سب عورتوں سے زیادہ اچھی لگتی ہو۔ جی چاہتا ہے کہ ہم تم

یونہی چلتے رہیں اور یونہی عمر ختم ہو جائے“ آخر قسام کی زبان کھل ہی گئی۔

”کاش ایسا ہو جائے قسام“ نیل کے ہونٹ پھرنے لگے، ”یہ بات اس وقت ہو سکتی

ہے کہ شزارے نزار اور درشوار ایک ہی جگہ رہنے لگیں“

”یعنی دونوں کی شادی ہو جائے۔۔۔۔۔“ قسام نے مسکرا کے کہا۔

کیس گی؟

درشمار کو جیسے ہوش آگیا۔۔۔۔۔ ”ہاں نیل، میں اس سے کیا بات کروں گی، اسے جانتی بھی نہیں، کیسی پاگل ہوں میں بھی، اچھا تو ہی بتا دے شہزادے نزار کو کیا ہے؟“

”محترمہ عالیہ! آپ کو شہزادے کا بہت خیال ہے؟“ نیل نے ایک دم سوال کر دیا۔
”ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو نا نیل، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے، انسانی ہمدردی ہے“ درشمار نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”اچھا اگر میں کہوں کہ شہزادے نزار کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے تو پھر؟“ نیل آنکھیں لٹکا کے کہا۔

”تیرے منہ میں آگ لگے، ٹھیک بتا کیا ہوا شہزادے کو؟“ درشمار کو پسینے چھوٹا تھے۔

”کچھ بھی نہیں ہوا، وہ بالکل ٹھیک ہیں“ نیل ہنسنے لگی۔

”مگر تو کہہ رہی تھی کہ۔۔۔۔۔“

”وہ تو میں مذاق کر رہی تھی۔۔۔۔۔“

”خدا تجھے عارت کرے، ایسا خطرناک مذاق کرتی ہے، میری تو جان ہی نکل گئی تھی“ درشمار کی جان میں جان آئی۔

”بڑی ہمدردی ہے آپ کو شہزادے سے مگر آپ نے تو ان کو دیکھا بھی نہیں ہے نیل نے درشمار کو پھر چھیڑا۔

”ایک بار دیکھا تھا مگر دور سے“ درشمار نے اقبال کیا۔

”اب قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں کیا؟“ نیل نے دریافت کیا۔

”میں نے تجھے بھیجا کس لئے تھا؟“ درشمار مصنوعی غصہ سے بولی۔

”جی محترمہ عالیہ! میں پورا کام کر کے آئی ہوں“ نیل نے سنجیدگی اختیار کی ”شہزاد نزار بہت اچھے آدمی ہیں، طبیعت بڑی باغ و بہار پائی ہے آپ پر تو بس سو جان سے نثار“

”جھل ہٹ، رہنے بھی دے کیوں بتا رہی ہے؟“ درشمار شرما گئی۔

”آپ کی جان کی قسم، میرے ساتھ آنے کی ضد کر رہے تھے، کہتے تھے کہ محترمہ ما سے سفارش کرو“

نیل خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور درشمار لبالبی جا رہی تھی شرابی جا،

”میں بات کی سفارش کر رہے تھے تم سے؟“ درشمار نظریں نیچی کر کے کہا۔
”سفارش اس بات کی کہ آپ ان کے حال رحم فرمائیے اور انہیں اپنے قدموں میں نزلالہجے میں نے ان کی درخواست آپ کے حضور پیش کر دی اب آپ کو اختیار ہے

ہے پیارے کو قبول کیجئے یا نا منظور کر دیجئے“
”درشمار کچھ سوچ کے بولی ”تمہاری سفارش تو ٹھیک ہے مگر ابھی تو کوئی جھگڑے طے

اہل گئے“
”کیسے جھگڑے، میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی“ نیل نے اٹھلا کے کہا۔

”نیل میری ایک درخواست دارالوزارت تک پہنچ چکی ہے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو

اس کی اور طرف کیسے دیکھ سکتی ہوں“
”چولے میں جھو کئے اس درخواست کو۔ اس کا تو پتہ ہی نہیں چل سکا“ نیل نے بے

لی سے کہا ”اگر آپ کو شہزادہ نزار پسند آجائے تو ایک نئی درخواست دے دیجئے“
”ہم کہہ کہ آپ نے پہلی درخواست میں آپ نے کس کا نام لکھا تھا اب کی یہ درخواست

اقسام کے۔۔۔۔۔“
نیل کہتے کہتے اک دم رک گئی، اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

درشمار نے پوچھا ”یہ ایسا ایسا کی قسم کیا ہو گیا نیل، پریشان کیوں ہو گئیں؟“

درشمار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس نے پھر پوچھا ”کچھ بتاؤ تو بھی۔ تم نے مجھے بھی

ان کر دیا؟“
”خیر میں اس سے معافی مانگ لوں گی“ نیل نے پھر خود کلامی کی پھر درشمار کی طرف

کے مسکرائی ”محترمہ عالیہ! میرے ساتھ قسام آیا ہے وہی شہزادے نزار کا ملازم“ اور

انے نظریں نیچی کر لیں۔
درشمار ہنس کے بولی ”یوں کو، تم قسام کو ساتھ لے کے آئی ہو؟“

”جی، محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔“ نیل نے اقرار کیا ”اسے ساتھ لائی نہیں بلکہ وہ بیچارہ مجھے

نا تک پہنچانے آیا تھا میں اسے باتوں میں بالکل ہی بھول گئی“
”مگر وہ ہے کہاں، کدھر چھوڑا ہے اسے؟“ درشمار نے سخت لہجے میں کہا ”آخر تم

واں کیوں ہو جاتی ہو؟“
”میں نے اسے مسمان خانہ میں بٹھا دیا تھا مگر اب اس کا سامنا کرتے شرم آ رہی ہے۔

ماتے ملتی نظروں سے درشمار کو دیکھا۔

”اچھا چلو، میں تمہاری صلح صفائی کرا دوں گی“ درشوار نے پیشکش کی۔

”آپ — محترمہ عالیہ آپ“ نیل نے حیرانی سے درشوار کو دیکھا۔

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے میں پردہ تو نہیں کرتی پھر قسم تو تمہارا۔

درشوار جملہ نامکمل چھوڑ کے ہنسنے لگی۔

”آپ محترمہ عالیہ! اس کنیز پر کس قدر جہربان ہیں“ نیل نے متشکر نظروں

درشوار کو دیکھا۔ نیل اور درشوار دونوں ایک ساتھ مہمان خانہ میں داخل ہوئیں:

انہیں دیکھ کے حواس باختہ ہو گیا اس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں پھیل گئیں قسم!

استقبال میں کھڑا ہو گیا پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا درشوار کی شخصیت ہی کچھ ایسی دگلا

پرکشش تھی دیکھنے والا بدحواس ہو جاتا تھا نیل اس کی بدحواسی سے خوش ہو رہی تھی

درشوار کو اس پر رحم آگیا اس نے نرمی سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ قسم! ہم نے تمہارا سلام قبول کر لیا“

اور قسم جلدی سے سلام کے لئے جھک گیا۔

ابھی ان لوگوں کی گفتگو شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک کنیز نے اندر آکر اطلاع

”محترمہ عالیہ دارالوزارت کا ہرکارہ حاضر ہے اور کوئی اطلاع لے کر آیا ہے“

دارالوزارت یعنی وزیراعظم مصر صلاح الدین کا دفتر جس میں اس کی رہائش تھی

اس دفتر کے نام ہی سے لوگ کانپ اٹھتے تھے اس دفتر سے ترقی اور تنزلی کے اہکا

ہوتے تھے اور اس محل کے زیر سایہ فوجی چھاؤنی تھی جہاں سے لشکر دشمن کی سرا

لئے روانہ ہوتا تھا۔

درشوار نے نیل کو دیکھا پھر ایک لمحہ سوچ کے کہا ”نیل تم جاؤ اور دارالوزار

ہرکارے کو اپنے ساتھ لے آؤ“

نیل باہر گئی ذرا دیر بعد نیل کے ساتھ ہرکارہ آگیا درشوار اور قسم اس وقت

نشستوں پر بیٹھ چکے تھے اندر داخل ہو کر نیل نے ہرکارے سے کہا ”تم اس وقت

عالیہ کے سامنے ہو“

ہرکارے نے ادب سے سلام کیا ”محترمہ عالیہ آپ نے ایک درخواست دی

سلسلہ میں متعلقہ حاکم نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ خود یا کسی کے ذریعہ اپنی در

کی پیروی کے لئے دارالوزارت حاضر ہوں۔۔۔۔۔“

درشوار سنائے میں آگئی۔ اس نے گہرا کے نیل کی طرف دیکھا۔ نیلی بھ

پریشان تھی۔ قسم ان دونوں کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

ایک ستارہ اور ٹوٹا

طاہی خلیفہ عاصد کے افراد خانہ اور اہل خاندان کے لئے جو محکمہ قائم کیا گیا تھا اس

موجودہ سربراہ یا ناظم اعلیٰ فقیہ عیسیٰ ہکاری تھے جو ان دنوں وزیراعظم مصر امیر صلاح

ہا کے ایک خاص مشن پر دوبارہ دمشق گئے ہوئے تھے ان کی عدم موجودگی میں قزل نام

ایک سردار ان کی جگہ کام کر رہے تھے قزل کی تمام عمر فوجی خدمات میں گزری تھی اس

د قلم و ضبط کے بہت پابند تھے انہوں نے اس محکمہ کا انتظام سنبھالتے ہی اسے فوجی

پر چلانا شروع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام گزشتہ درخواستوں کو دو ہفتوں کے اندر

نفاذ کیا گیا اس سے محکمہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا اور شاہی خاندان کے افراد بھی خوش ہو

اب صرف چند الجھے ہوئے معاملات رہ گئے تھے جن میں سے کچھ تو شہزادوں کے آپس

جھگڑوں کے بارے میں تھے اور کچھ وہ درخواستیں تھیں جو ادھر ادھر ہو گئی تھیں اور

کوئی پتہ نہ ملتا تھا ناظم محکمہ نے اس سلسلہ میں وزیراعظم کو مفصل رپورٹ پیش کی

میں کہا گیا کہ گزشتہ درخواستوں کے لئے حکم دیا جائے کہ انہوں نے درخواست

دہ سے دوبارہ حاصل کیا جائے اور ان کا فوری فیصلہ کیا جائے شاہی خاندان کے افراد

محکمہ کے بارے میں یہ رائے دی گئی کہ شاہی خاندان کے سات بزرگ شہزادوں کی

مدد کی جائے جو اس طرح کے جھگڑے نمٹائے وزیراعظم نے یہ دونوں مشورے قبول

کئے اس پر فوراً عمل شروع ہو گیا۔

بزرگ شہزادوں کی مجلس عمل کے قیام سے اس محکمہ کا کام بالکل ہی ختم ہو گیا رہا

اصغر خاندان کا معاملہ تو ان میں بھی شہزادوں کے آپس کے اختلافات پر بیشتر

تھیں جس جو مجلس عالمہ کی طرف منتقل ہو گئیں۔ شاہی افراد کی شادی کے سلسلہ میں

صرف دو درخواستیں تھیں ایک تو محترمہ عالیہ کی اور دوسری کسی اور بیوہ شہزادی کی دونوں کو دارالوزارت بلا لیا گیا۔

محترمہ عالیہ درشہوار دارالوزارت جانے سے گھبرا رہی تھیں۔ انہوں نے ہرکا رخصت کر دیا لیکن اس کے جاتے ہی بڑے غصہ سے اعلان کیا کہ وہ دارالوزا صورت بھی نہیں جائیں گی اس وقت درشہوار کے پاس کنیز خاص نیل کے علاوہ کا غلام قسام بھی موجود تھا۔ درشہوار کو جلال میں دیکھ کر قسام بھی گھبرا گیا نیل کی ہمت ہی نہیں پڑی رہی تھی۔

درشہوار کچھ دیر پھولی بیٹھی رہی پھر آپ ہی بولی ”دیکھو بھلا یہ بھی کوئی حکم۔ دارالوزارت میں حاضر ہوں، میری کوئی حیثیت ہی نہیں، درخواست میں نے دی ہو گئی ہے تو میں اس کی ذمہ دار نہیں، وہ لوگ خود تلاش کریں میں کیوں ان کرنے جاؤں“

محترمہ عالیہ ----- قسام نے جرات کی ”میری یہ مجال نہیں کہ آپ معاملات میں کچھ بول سکوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ حکم قطعی غلط ہے اور حکم دینے کا کوئی حق نہیں ہے“

قسام نے درشہوار کی بات کی تائید کی تھی۔ وہ بہت خوشی ہوئی۔ ”یہی تو میرا ہوں، میرا وقت بگڑ گیا تو کیا میری عزت بھی ختم ہو گئی، وزیراعظم نے مرحوم خلیفہ کیا تھا کہ وہ میری سرپرستی کریں گے اور میری مراعات میں کوئی فرق نہ آئے گا“ قسام نے پھر بولا ”آپ کے مرتبہ سے سب واقف ہیں محترمہ عالیہ، اس جرات کیسے ہوئی کہ آپ کو دارالوزارت میں طلب کرے“

نیل نے دیکھا کہ قسام خواہ مخواہ درشہوار کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش ہے، اس سے بات بگڑ بھی سکتی تھی درشہوار خلیفہ کی زندگی میں کچھ اور تھی لیکن کی حیثیت تبدیل ہو چکی ہے اور اس کا شمار محکوم طبقے میں ہوتا ہے اگر اس نے نہ مانا اور انگریزی بیٹھی رہی تو خدا معلوم کیا فتنہ کھڑا ہو جائے۔

نیل نے فوراً ”قسام کو ٹوکا“ تم چپ رہو قسام۔ تمہیں حالات صحیح علم نہیں محترمہ عالیہ کا مسئلہ ہے وہ خود اسے حل کریں گی“

”میں معافی کا خواستگار ہوں محترمہ عالیہ“ پھر قسام نے نیل کی طرف دیکھا اسے اشارے سے کہا کہ وہ اس وقت چلا جائے۔

قسام نے ایک لمحہ بعد کہا ”محترمہ عالیہ مجھے اجازت دیجئے، شہزادے بہادر“

اب آئے، میں پھر حاضر خدمت ہوں گا“

ہاں نہ ہو جانا قسام“ نیل نے ایک خاص ادا سے کہا ”کل نہیں تو پرسوں ضرور آنا لاگلی ہو گیا“ ضرور اب ضرور آؤں گا میں حکم سے انکار نہیں کر سکتا ہوں“

ام جواب کا انتظار کئے بغیر واپس ہو گیا۔

ام کے جانے کے بعد بہت دیر تک خاموشی رہی۔ درشہوار اپنے خیال میں گم تو نیل لوں میں کھوئی ہوئی تھی آخر خاموشی کا ظلم ٹوٹا درشہوار مسکرائی اور بولی۔

”نیل کیا ہو گیا ہے، ایسی خاموش ہوئی جیسے سانپ سوگھ گیا ہو؟“

پ کو غصہ جو آگیا تھا محترمہ عالیہ“ نیل نے دبی آواز میں کہا۔

”مہ مجھے آیا اور خاموشی تجھ پر طاری ہوئی۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟“ درشہوار نے

مہ سے کہا حالانکہ وہ یہ غصہ بھی مصنوعی تھا۔

پ ماکن ہیں غصہ کر سکتی ہیں لیکن جو غصہ اپنا نقصان کرے وہ اچھا نہیں ہوتا“

احسانہ انداز اختیار کیا۔

ماہیں رہنے بھی دے، بڑی آئی نصیحت کرنے والی“ درشہوار نے منہ بنایا ”نقصان ہانکنا، تھوڑا سا خون جلا ہو گا اور کیا ہوا؟“

ما کے علاوہ بھی کچھ نقصان اور ہوا ہے“ نیل نے سنجیدگی اختیار کی۔

ر۔۔۔۔ اور کیا نقصان ہوا؟“ درشہوار نے حیرانی سے پوچھا۔

میرے ساتھ قسام نہیں آیا تھا؟“ نیل نے اس سے الٹا سوال کیا۔

ایا تھا مگر میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا؟“

پ کیا کہیں، کہنے کو تو وہ خود آیا تھا“ نیل نے افسردگی سے کہا ”وہ بے چارہ کیا

ایا تھا اور یہاں کیا ہو گیا“ آپ کے غصہ نے سب کام بگاڑ دیا“

افسوس ہے نیل، واقعی بڑی غلطی ہوئی، اب کیا کرنا چاہئے“ درشہوار انگلیاں

بٹولے۔

”کیا ہو سکتا ہے“ نیل نے افسوس سے کہا ”ایک تو آپ نے قسام کو گفتگو کا

اطلا دے آپ نے ضبط کا اظہار کرنے کے بجائے ایک غیر مرد کے سامنے بے

بے بات غصہ دکھایا۔ قسام کیا سوچتا ہو گا اور شہزادے نزار کو آپ کے بارے میں

ایک ناکہ آپ غصے کی بہت تیز ہیں“

”کہہ رہی ہو نیل“ درشہوار افسردہ ہو گئی ”مجھے اتنی سی بات پر اس قدر چراغ پا

پڑتا تھا“

میں ہوں" محترمہ عالیہ نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا "یہ ٹھیک ہے کہ مجھے سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ سارا مضبوط ہونا چاہئے میں اپنے آپ کو کسی بیمار یا بوڑھے کے نہیں باندھ سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ طیب اعظم سے آپ کو کوئی رشتہ نہیں ہوگا" نیل نے اس کی باتوں سے یہی سمجھا تھا، "لیکن اب سوال یہ ہے کہ آپ کو کیا جواب دیں گی؟"

"جواب تو خیر میں دے لوں گی" درشمار نے بڑے استقلال سے کہا "لیکن ابھی تو یہ لڑائی ہے کہ میں دارالوزارت جاؤں کہ نہ جاؤں، تمہارا کیا مشورہ ہے نیل؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کو ناظم کا حکم ماننا چاہئے" نیل نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا "پ حکم کی تعمیل نہیں کرتیں تو ناظم طاقت سے بھی اپنا حکم منوا سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے آج کل ناظم کے عہدے پر ایک فوجی سردار کام کر رہا ہے ان فوجیوں سے خدا ہی ان کی کھوپڑی الٹی ہوتی ہے دوست بنیں تو جان بچھاؤ کر دیں اور مخالفت پر اتریں تو ایک آثار لیتے ہیں"

"نیل میرا خیال ہے کہ شاہی ہرکارے نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنی درخواست کی کسی اور کے ذریعہ بھی کر سکتی ہوں؟" درشمار کا خیال صحیح تھا، ناظم نے ہرکارے کے درشمار کو اجازت دی تھی کہ وہ اگر خود پیروی نہ کر سکے تو کسی اور کو اختیار دے کر نمائندہ کی حیثیت سے بھیج سکتی ہے۔

"مئی محترمہ عالیہ، ہرکارے نے یہ ضرور کہا تھا" نیل نے درشمار کی بات کی تائید کی لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اپنا نمائندہ کیسے بنائیں گی، نمائندہ کوئی مرد ہی ہو سکتا ہے" "کیا شہزادے نزار یہ فرض نہیں ادا کر سکتے؟" درشمار کا خیال اک دم شہزادے کی کیا۔

"محترمہ عالیہ، کسی وقت آپ بچوں جیسی باتیں کرنے لگتی ہیں" نیل نے مسکرا کے اسے کہا "کیا آپ شہزادے کو یہ بتا سکیں گی کہ پہلے آپ نے طیب اعظم کے ساتھ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ شہزادے کے دل میں کیا کیا خیال پیدا ہوں گے اس کی اہم آپ کی کیا وقت رہ جائے گی؟"

"میری عقل پر پھنکار" درشمار نے اپنا سر پکڑ لیا "اس درخواست کی تو شہزادے کو مگر نہ ملنا چاہئے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا" "مگر تو آپ کو خود ہی دارالوزارت جانا ہو گا؟" نیل نے فوراً کہا۔

"محترمہ عالیہ۔۔۔ ایک دوست تو سودشمن، آپ نے غصے میں ناظم۔ جو کچھ کہا ہے وہ اگر ناظم کے کانوں تک پہنچ گیا تو خدا معلوم کیا قیامت آجائے ملکہ مصر ہیں اور نہ شاہی محل میں رہتی ہیں ہم سب وزیر اعظم مصر اور اس کے غلام کے برابر ہیں" نیل کے دل میں جو کچھ بھرا تھا وہ سب اس نے اگلے درشمار پریشان ہو گئی۔ اس نے پوچھا "کیا قسم یہ سب باتیں ناظم تک"

"قسم فرشتہ نہیں ہے محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔" نیل نے جواب دیا "پھر ابھی مزاج سے بھی واقف نہیں، امید تو نہیں کہ وہ ایسی کمینگی حرکت کرے گا اس آقا کی بات بھی انکی ہوئی ہے اس لئے شاید وہ ایسا نہ کرے کمین کل کو وہ بھی ہو سکتا ہے پھر دشمنی تو سب کچھ کر ڈالتی ہے"

"یہ تو ہے۔۔۔۔۔" درشمار نے جیسے خود سے کہا پھر چونک کے بولی "نیل" کہا تھا کہ قسم کے آقا کی ایک بات انکی ہوئی ہے اس سے تمہارا کیا مطلب بات ہے؟"

"وہی بات جو قسم آپ سے کہنے آیا تھا اور آپ نے اسے کہنے کا موقع نہ بات کھولتے ہوئے کہا "دراصل شہزادے نزار آپ کے تمنائی ہیں اور ان کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ باتوں باتوں میں آپ کا خیال معلوم کرے"

"ہائے نیل، یہ بات تو نے مجھے پہلے ہی بتا دی ہوتی" درشمار ہاتھ ملنے لگا "خیر جو ہو گیا سو ہو گیا مگر آئندہ خیال رکھئے گا محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔ نیل۔

اطمینان دلانے کے لئے کہا "قسم نے اس محل سے نانا توڑا نہیں ہے میں۔ کو کہہ دیا ہے وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ گستاخی معاف اگر وہ آپ کے۔۔۔۔۔ گا تو آپ کی کنیر نیل یعنی میرے آئے گا اور آتا ہی رہے گا"

"اچھا تو یہ بات ہے" اور درشمار مسکرائے لگی۔

"اب بتائیے محترمہ عالیہ آپ کی کیا رائے ہے" نیل نے اصل مسئلہ طرف شہزادے نزار کی آپ کے لئے درخواست ہے دوسری طرف وہ درخوا آپ نے طیب اعظم سے شادی کے لئے دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی فیصلہ ہو گیا ہے یعنی آپ کو طیب اعظم سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی ہے "لیکن اب میں طیب اعظم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ بات پرانی ہے اس بے مروت نے تو ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں ایسے خشک آدمی۔"

”ٹھیک ہے میں خود جاؤں گی اور ناظم سے صاف الفاظ میں کہوں گی کہ یہ اعظم سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لئے میری درخواست مجھے واپس کر دی جائے۔“

”اگر ناظم نے پوچھا کہ کیوں شادی نہیں کر سکتی تو آپ کیا کہیں گی؟“ بچو نے آنکھیں لٹکا کے سوال کیا۔

”تو۔۔۔۔ تو کہہ دوں گی میرا شادی کا ارادہ نہیں“ درشموار نے نیل کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو دیکھ میں نے کیا معقول جواب سوچا ہے۔

”ٹھیک فیصلہ ہو گیا“ آپ کہہ دیں گی کہ آپ نے شادی کرنے کا ارادہ تہہ ہے“ نیل نے پہلے کی طرح پھر آنکھیں گھما کر کہا ”لیکن محترمہ عالیہ آپ کو شہزادہ کی درخواست کا بھی فیصلہ کرنا ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ شہزادے کے حق کریں گی۔ اس صورت میں آپ ایک بار شادی سے انکار کے بعد پھر شہزادے شادی کرنے کی درخواست کیسے کر سکتی ہیں۔ ناظم پوچھ سکتا ہے کہ شادی کوئی بچہ نہیں کہ جب چاہا انکار کر دیا اور جب چاہا اقرار کر لیا؟“

”یہ تو بڑی مشکل ہو گی۔ اب میں کیا کروں؟“ درشموار بہت گھبرا گئی۔

”محترمہ عالیہ دل نہ چھوٹا کیجئے“ مشکل پڑی ہے تو آسان بھی ہو جائے گی“ تسلی دی ”یہ تو طے ہے کہ آپ کو دارالوزارت جانا ہو گا“ ناظم سے دشمنی مول بات نہیں“

”تم میرے ساتھ چلو گی نا؟“ درشموار نے پوچھا۔

”کیوں نہیں محترمہ عالیہ میں تو سرکار کی کنیز ہوں آپ کے حکم سے کیسے انکا ہوں“ نیل نے ماکن کو اور حوصلہ دیا ”میں آپ کے ساتھ ہوں گی“ اگر کوئی سوال کیا گیا تو میں جواب دوں گی آپ بالکل فکر نہ کیجئے“

درشموار اور نیل کے لئے ناظم کی طرف سے دارالوزارت میں طلبی ایک بن گیا تھا۔ درشموار بہت پریشان تھی اس نے ایک طویل عرصہ سے محل سے تہہ تھا وزیر اعظم سے ملنے وہ مرحوم خلیفہ عاصد کے ساتھ گئی تھی اس کے بعد سے وہ گئی تھی سوائے اس کے کہ حرم شاہی سے اٹھ کے یہاں آگئی تھی درشموار کی دارالوزارت پہنچ کے بہت آسان ہو گئی اس قدر آسان کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی دوسرے دن درشموار اور نیل اپنی سواری میں محل سے نکلیں انہوں نے کو ملازم ساتھ نہ لیا تھا بیوی دروازے پر پہنچ کے نیل نے محترمہ عالیہ درشموار کا نام ناظم کے حکم پر دارالوزارت جا رہی ہیں محافظوں کے سردار کو جب معلوم ہوا

نیل کی چیتی بیوی درشموار دارالوزارت جا رہی ہیں تو وہ سلام کے لئے حاضر ہوا اور درشموار کے منع کرنے کے باوجود پانچ مسلح سواروں کا دستہ درشموار کی گاڑی کے ساتھ کر

سواروں کے پرے میں درشموار دارالوزارت پہنچی تو لوگوں کو جتس ہوا کہ یہ کس کی اری ہے سواروں نے بتایا کہ مرحوم خلیفہ کی ایک بیگم درشموار ایک درخواست کے سلسلے دارالوزارت تشریف لائی ہیں یہ خبر ناظم تک پہنچی تو گھبرا کے بھاگا ہوا آیا اسے کیا پتہ تھا جس درخواست دہندہ کو اس نے دارالوزارت طلب کیا ہے وہ عام شہزادہ یا شہزادی نہیں خلیفہ عاصد کی چیتی بیوہ ہے۔

ناظم نے سواری کے پاس پہنچ کے پہلے محترمہ عالیہ کو ادب سے سلام کیا پھر معذرت کی ”میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے جنابہ عالیہ کو یہاں آنے کی زحمت دی دراصل یہ معلوم نہ تھا کہ وہ درخواست آپ نے دی تھی“

نیل نے سواری کا پردہ سرکا کر جواب دیا ”محترمہ عالیہ آپ کی شکر گزار ہیں کہ آپ وقت بھی انہیں اس قدر عزت دیتے ہیں“

ناظم نے عرض کیا ”جنابہ عالیہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی درخواست دفتری کاغذات میں ادھر ہو گئی ہے آپ اس درخواست کے کوائف زبانی بیان کر دیجئے میں اسی وقت آپ حق میں فیصلہ کر دوں گا“

نیل نے پردے سے پھر سر نکالا ”محترمہ عالیہ اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتی ہیں بل جس سلسلہ میں درخواست دی گئی تھی اب وہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لئے محترمہ اس کی بیروی نہیں کرنا چاہتیں وہ اس وقت آپ کے حکم کی تعمیل میں دارالوزارت لائی ہیں“

ناظم نے بھی درشموار کے مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے دوبارہ معذرت کی ”میں محترمہ سے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں کہ انہیں یہاں آنے کی زحمت اٹھانا پڑی“

نیل کو اک دم کچھ خیال آیا تو اس نے فوراً کہا ”ناظم محترم“ محترمہ عالیہ کا خیال ہے سادگی کے ساتھ تو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں اگر ناظم محترم فرمائیں تو اس میں باقاعدہ درخواست پیش کی جائے“

”محترمہ عالیہ کو درخواست دینے کی کوئی ضرورت نہیں“ ناظم نے ادب سے کہا ”نعم مصر امیر صلاح الدین نے شاہی خاندان سے متعلق تمام افراد کو اس بات کی تہہ دی ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے تحت شادی بیاہ کے رشتے استوار کر سکتے ہیں

رشتہ داروں پر حکومت کی طرف سے شادی کے لئے جو پابندی لگائی گئی تھی وہ تمام کی پابندیوں کے ساتھ یکسر ختم کر دی گئی تھی وزیراعظم مصر نے شہزادوں کی بطور دلجوئی اطمان کے لئے ایک الگ محکمہ قائم کیا تھا ممکن ہے وزیراعظم کا یہ خیال ہو کہ اس کی مرمانی سے شہزادے اس کے احسان مند ہوں گے اور حکومت کے خلاف کسی سازش برپا نہ ہو سکی لیکن اس سے حکومت کو کوئی فائدہ نہ ہو سکا۔

مصر میں شاہی حکومت قائم ہو چکی تھی جس کا سربراہ وزیراعظم امیر صلاح الدین ایوبی لی خلیفہ کے نام کے بجائے خطیبہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا بظاہر مصر ایک مضبوط حکومت برسرِ اقتدار تھی لیکن فتنہ پرور سوڈانی جو فاطمی دور حکومت میں سیاہ کے مالک تھے وہ اقتدار سے محروم کر دیئے گئے تھے اور یہ محرومی مسلسل بغادوتوں کی کرتی رہتی تھی وزیراعظم نے ہر بار ان کی بغادوت کو سختی سے کچلا تھا لیکن وہ باز نہ تھے اور کسی نہ کسی بہانے فتنہ پیدا کرتے رہتے تھے۔

صلاح الدین کو سوڈانیوں کی زیادہ فکر نہ تھی اس لئے کہ ان کے بڑے بڑے سردار جاچکے تھے اور انہیں شاہی مصر بھیج کر ان کی مرکزیت ختم کر دی گئی تھی لیکن اس دن نے اپنی طاقت ختم ہونے کے بعد فاطمی شہزادوں کو حکومت وقت کے خلاف اکسانا نہ بھلا شروع کر دیا تھا چنانچہ ہر بغادوت کے پیش منظر میں کوئی نہ کوئی فاطمی شہزادہ ہوتا جو نہ کا دعویٰ کر کے علم بغادوت بلند کر دیتا کچھ جذباتی قسم کے مصری جوان اور زیادہ تر اس بغادوت کو اور ہوا دیتے پھر جب سرکاری فوج ان کا قلع قمع کرنے پہنچتی تو وہ مامانگے لگتے تھے۔

ان حالات میں صلاح الدین نے یہی بہتر خیال کیا اس نے فاطمی خلیفہ کے پس ماندگان بڑے کے لئے جو محکمہ بنایا تھا اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس پر اٹھنے والے بھاری ات سے کوئی اور ادارہ بنایا جائے جس سے مصری عوام کو فائدہ پہنچ سکے پس وزارت لم سے پہلے شہزادوں پر لگائی گئی پابندیاں اٹھائی گئیں پھر رفتہ رفتہ اس محکمہ کو بند کر دیا ل طرح مرحوم خلیفہ کے تمام قربات دار عوام کی طرح آزاد ہو گئے اور اپنی مرضی منگی گزارنے لگے۔

نیل نے دارالوزارت میں جس ذہانت کا ثبوت دیا تھا اس سے درشہوار خوشی سے نہ ملتی تھی وہ اپنی کنیز کی عقلمندی کی پہلے ہی قائل تھی لیکن اب تو وہ اس کی مہذب بھی ہو گئی تھی نیل قسام کو رخصت کر کے آئی تو درشہوار نے اسے اپنے سینے لایا اور بڑے پیار سے اس کے منہ کو کئی بار چوما۔

شاید محترمہ عالیہ کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا وزیراعظم مصر نے تو یہاں تک اجازت دی ہے کہ خاندان شاہی کے ارکان مخصوص علاقے کو چھوڑ کر جہاں چاہیں سکونت اختیار کر سکتے ہیں۔

درشہوار اور نیل محل واپس پہنچیں تو انہیں قسام کو اپنا منتظر پایا، نیل صدر دروازہ ہی پر سواری سے اتر گئی اور بند گاڑی میں درشہوار کو لئے زنان خانے پہنچ گئی۔

”قسام، تم آج کیسے آگئے، خیریت تو ہے؟“ نیل نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
قسام نے بھی ہنس کے جواب دیا ”اگر تمہیں میرا آنا ناگوار گزرا ہو تو میں واپس جاتا ہوں۔“

”نہیں نہیں، میں تو خوش ہوں کہ تم آگئے“ نیل نے نخرے سے کہا۔
”میں نے سنا ہے کہ تم اور محترمہ عالیہ دارالوزارت گئی تھیں؟“ قسام نے پریشانی پوچھا ”کو کیسی گزری؟“

”گزری کیسی، بس جیسی گئی تھی ویسی ہی آگئی ہوں، باقی سب خیریت ہے“ نیل سے بولی۔
”ہم سے اچھی تو تم ہو کہ ہر وقت ہنستی اور مسکراتی رہتی ہو“ قسام نے انہرنگی کہا۔

”میں مسکراتی رہتی ہوں تو کیا تم روتے رہتے ہو، تمہیں کیا پریشانی ہے، اچھی اور آقا مہربان ہم لوگوں کو اس کے سوا اور کیا چاہئے“ نیل نے ترجمہی نظروں سے دیکھا۔

”پریشانی یہ ہے کہ تم نے دو دن بعد بلایا تھا اور میں ایک دن پہلے ہی آگیا“ قہ ٹھنڈی سانس لی اور سر جھکا لیا۔

”بس رہنے بھی دو، مت بناؤ مجھے، شہزادے بہادر بے چین ہو رہے ہوں گے تمہیں بھیجا ہے“ نیل نے قسام کو تیز نظروں سے دیکھا۔

”بڑا افسوس ہے نیل، تمہیں شہزادے کی بے چینی تو نظر آگئی لیکن میرے دل گزر رہی ہے اس کا ذرا بھی خیال نہیں“ قسام نے جل کے کہا۔ ”اچھا اچھا، مہربان میں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“

اور نیل اٹھلائی، بل کھاتی محل میں چلی گئی۔ قسام اسے جاتا دیکھتا رہا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔
فاطمی شہزادہ نزار اور ناز آفریں درشہوار کی شادی میں کوئی چیز مانع نہ تھی، خلیفہ

نیل نے عرض کیا جاتا ہے۔

”پھر اس کا علاج کیا ہے؟“ درشموار نے بھی شوخی دکھائی۔

”حکیم اس کا علاج ”شریت دیدار“ بتاتے ہیں“ نیل نے جواب دیا۔

”مگر یہ ممکن نہ ہو تو۔۔۔۔۔؟“

”تو مریض اللہ کو پیارا ہو جائے گا اور آپ اس کے غم میں عمر بھر روتی رہیں گے“

نیل نے یہ ترکیب جواب دے رہی تھی۔

”مرض اور علاج دونوں قابل غور ہیں، ہم سوچ کے جواب دیں گے“ درشموار نے

نیل کے انداز میں کہا۔

”مگر آپ سوچتی رہیں اور مریض جان سے چلا جائے تو الزام کس پر آئے گا؟“ نیل

نے پھر طنز کے انداز میں کہا۔

”شرارے اس قدر غیرت مند نہیں کہ جان سے گزر جائیں۔ قسم سے کہا جائے کہ

نیت دیدار تیار کیا جا رہا ہے۔“

”قسم کل پھر آئے گا محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔“ نیل نے یاد دہانی کے لئے کہا۔

”کل تک دوا تیار ہو جائے گی۔ قسم سے کہو کہ بیمار شرارے کو اپنے ساتھ لے کے

آئے۔“

درشموار نے فیصلہ کر دیا، نیل خوش ہو گئی۔

شرارہ نزار کا دعویٰ تھا کہ اس نے درشموار کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ یہ خبر قسم سے

ما اور نیل سے درشموار کو پہنچی۔ درشموار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اب یہ بات الٹی چلی

درشموار نے نیل کے سامنے لاعلمی کا اظہار کیا تھا نیل نے قسم کو جھٹلایا کہ شرارے کا

وہی غلط ہے قسم شرمندہ ہو گیا اس نے دعویٰ اور جواب دعویٰ اپنے آقا شرارہ نزار کے

سے پیش کیا مگر کچھ تنہی کے ساتھ۔

”شرارہ قسم کا بڑا خیال رکھتا تھا قسم اس کا غلام بھی تھا اور مونس و ہمدرد بھی۔

لڑنے دینا سے ناتا توڑ کے قسم کو اپنا دوست بنا لیا تھا اور اس پر وہ علی الاعلان فخر کرتا

اس نے قسم کے چہرے پر افسردگی اور غصہ کو فوراً بھانپ لیا۔

اس نے نرمی سے پوچھا ”کیا آج نیل کی ڈانٹ پڑی ہے تم پر جو اس طرح منہ بنا

ہو؟“

شرارے کے انداز میں شوخی تھی، قسم نے فوراً ”مذرتانہ لہجہ اختیار کیا“ نیل نے

ناتوا نہیں مگر طر ضرور کیا تھا اس نے۔“

”تو کس قدر سمجھدار ہے نیل“ درشموار نے اسے سینے سے ہٹاتے ہوئے کہا

”یہ سب آپ کی صحبت کا طفیل ہے محترمہ عالیہ“ نیل نے بڑے فخر سے

سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب فاطمی خلیفہ کی در

اپنے سینے سے لگا کر میرا منہ چومیں گی، میں خود پر جس قدر فخر کروں وہ کم ہے۔“

”نیل“ تو نے میرا دل جیت لیا ہے“ درشموار کھلی پڑ رہی تھی، ”میں دا

جاتے کس قدر خوفزدہ تھی لیکن تو نے ناظم سے ایسے سوال و جواب کئے نہ صرف

کیا بلکہ ہمیں دارالوزارت کے خوف سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا مل گیا۔“

”پھر اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟“ نیل نے شوخی سے پوچھا۔

درشموار نے اسے تعجب سے دیکھا۔ کس بارے میں پوچھ رہی ہو؟“

”اس غریب شہزادے نزار کے بارے میں جس کی نیندیں آپ نے حرام کر

نیل نے برہنہ جواب دیا۔

درشموار شرمناک گئی ”میں نے کب ان کی نیندیں حرام کی ہیں میرا تو ان سے

بھی نہیں ہوا؟“

”ٹھیک ہے، آپ ملاقات کے لئے تیار ہوئے، میں آتنا سامنا کرا دوں گی“

مضبوط لہجے میں کہا۔

”مگر میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ درشموار پر حجاب طاری ہو گیا اور اس کی ذ

گئی۔

”صاف بات بتائیے محترمہ عالیہ۔۔۔۔۔“ نیل نے اس کا سراونچا کر کے پو

شرارے سے شادی کرنا چاہتی ہیں یا نہیں؟“

”ایک بار کہہ تو دیا، بار بار کہتے مجھے شرم آتی ہے“ درشموار نے پھر سر جھکا کر

”اب میری سننے“ نیل اس کے سامنے بیٹھ گئی ”قسم بتا رہا تھا کہ شرارے ن

بست اترے، زندگی کے لالے پڑے ہیں انہیں؟“

”ہائے ہائے، کیا ہوا انہیں؟“ درشموار گھبرا گئی۔

”بستر سے لگ گئے ہیں، پیچھے کھانا پینا چھوٹ گیا ہے، دن بھر چھت کو

رات آسمان کو تکتے رہتے ہیں“ نیل نے چپا چپا کر بتایا۔

”مگر کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے انہیں، کوئی بیماری ہے یہ؟“ درشموار نے زور

پوچھا۔

”اس بیماری کو محبت کہتے ہیں محترمہ عالیہ“ نیل نے ہنستے ہوئے کہا ”مرض،

نیل نے

”کیا طنز کیا تھا ذرا ہم بھی تو سنیں؟“ شہزادے نے قسام کا غصہ ختم کرنے کے لیے دچھی ظاہر کی۔

”اس نے کہا تھا ----“ اور قسام سوچنے لگا، پھر بولا ”اس نے کہا تھا کہ محترمہ کو دیکھنے والا ہوش میں نہیں رہتا، تمہارے شہزادے نے بے پرکی اڑائی ہے“

”بے شک، بے شک“ وہ واقعی اتنی خوبصورت ہوں گی“ شہزادے نے جیسے خود کی ”قسام تم نے جو محترمہ عالیہ کو کھلی آنکھوں دیکھا، تم بتاؤ کیا وہ اس قدر خوبصورت کہ نظرس ان کے دیدار کی تاب نہیں لا سکتیں؟“

”شہزادے بہادر آپ پوچھ رہے ہیں تو میں بتاتا ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ“ عالیہ کو کوشش کرنے کے باوجود نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا چاند میں میل ہے مگر ان میں میں شاعر نہیں ورنہ شائد ان کے حسن کا نقشہ کھینچ سکتا“ قسام نے تعریف نہیں کی حقیقت بیان کر دی۔

محترمہ عالیہ درشہوار یقیناً کسی اعلیٰ گھرانے کی چشم و چراغ تھی جو بردہ فروشوں ہاتھوں گرفتار ہو کر فاطمی خلیفہ کے عشرت کدہ تک پہنچی خلیفہ سے متعہ کے ذریعہ ہونے کے بعد وہ بہت خوش نظر آتی تھی خلیفہ عاضد بھی اس کے حسن جہاں سوز اور چہرے کو دیکھ کر ایک بار تو بستر مرگ سے اٹھ بیٹھا تھا مگر یہ درشہوار کی بد نصیبی تم عاضد زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا اور اسے چند دنوں بعد ہی حرم خلافت سے نکلنا پڑا اسے نہیں بلکہ اپنی عزت و توقیر اور بے پناہ اختیارات سے محبت تھی درجنوں اور بیٹا نہیں بلکہ ہزاروں حسین کنیزیں ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ شمع محفل ہے اور کنیزوں کے غول کے غول پروانے جو نچھاور ہو۔ آہادہ نظر آتے تھے شاید یہی وجہ تھی اس نے حرم خلافت سے نکلنے وقت دو چار آنسو تھے۔

شہزادہ اپنی قسمت پر جس قدر ناز کرتا وہ کم تھا قصر خلافت سے باہر ہونے باوجود درشہوار کا حسن بے مثال اور بے داغ تھا اور ایک روایت کے مطابق درشہوار وقت کی سب سے زیادہ حسین عورت تھی اس کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے پر کئی کنیزیں عاشق ہو گئی تھیں جنہوں نے داروغہ محلات سے سفارش کرا کے اپنے آپ درشہوار کی خدمت پر مامور کرایا تھا۔

شہزادہ نزار اور درشہوار کی بات چیت باقاعدہ شروع ہوئی مگر اس بات چیت میں محلوں کے علاوہ باہر کے کسی مرد یا عورت کو شامل نہیں کیا گیا درشہوار کی طرف سے

تہر نے بات کی اس طرح شہزادے نزار کی نمائندگی کا فرض قسام نے ادا کیا اس گفتگو کے دوران ایک بار قسام نے دبی زبان میں درخواست کی۔

”شہزادے نزار کی خواہش ہے کہ گفتگو کی تکمیل سے پہلے ایک بار انہیں محترمہ عالیہ کے درشہوار کے حضور میں باریابی کی اجازت دی جائے“

نیل نے بڑی سختی سے جواب دیا ”شہزادے نزار کی درخواست قابل غور نہیں اس لئے محترمہ عالیہ اجازت دینے کے حق میں نہیں“

قسام کو درخواست منظور ہونے کی پوری امید تھی اس نے شہزادہ کو پہلے ہی سے ثروت دیدار کا شہرہ بھی سنا دیا اس انکار سے وہ بہت پریشان ہوا اس نے جرح کے انداز میں کہا ”محترمہ عالیہ کے حضور کہا جائے کہ اب تو شادی کے تمام معاملات طے ہو چکے ہیں اور صرف شادی کی تاریخ مقرر ہونا باقی رہ گیا ہے اس لئے اب شہزادے کا حضور حسن میں بیٹھنا کوئی عیب بھی نہیں پر وہ غیروں سے کیا جاتا ہے انہوں سے پردہ جائز نہیں“

”شہزادے کا یہ خیال بھی غلط ہے“ نیل نے بڑی تمکنت سے جواب دیا ”شادی سے چند روز پہلے تو انہوں سے بھی پردہ ہو جاتا ہے چچا زاد اور خالہ زاد بہن بھائی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کا سامنا روز ہی ہوتا ہے لیکن رشتے کی بات چل پڑتی ہے لڑکی اپنے چچا زاد اور خالہ زاد بھائیوں سے بھی پردہ کرنے لگتی ہے“

قسام بھلا اٹھا۔ اس نے مذہب کا سہارا لیا ”شرع میں حکم ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی کی رضا مندی حاصل کرنا ضروری ہے پھر بھلا ان کی ملاقات میں کیا حرج ہے۔ محترمہ عالیہ اس ملاقات کے وقت کسی اور عورت کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکتی ہیں“

”شرعی حکم سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ شادی سے پہلے لڑکے کو لڑکی دکھائی جا سکتی ہے لیکن شہزادے کے معاملہ میں اس کی ضرورت نہیں“ نیل نے صاف جواب دے دیا۔

”کیوں ---- کیوں ضرورت نہیں“ تم خودی تو کہہ رہی ہو کہ لڑکا، لڑکی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے شہزادے کو محترمہ عالیہ کے دیدار کی اجازت شرعی ضرورت ہے اور ان کا یہ حق ہے“

نیل نے ٹھہر کے گہیر آواز میں جواب دیا ”شہزادے کو اس کی قطعی ضرورت نہیں در انہوں نے اپنا یہ حق بھی کھو دیا ہے۔ اس لئے کہ خود شہزادے کے کہنے کے مطابق انہوں نے محترمہ عالیہ کو ایک بار دیکھا تھا“

اس جواب سے قسام کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ کنیز بول رہی

ہے یا کوئی قاضی مقدمہ کا فیصلہ کر رہا ہے۔

”شنوارہ نزار التماس کرتے ہیں کہ محترمہ عالیہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں، قسم دوسری طرح نیل کو قائل کرنا چاہا۔

نیل نے مسکرا کے کہا ”شنوارہ کا التماس قبول ہوا۔ انہیں جمعہ کے دن ملکہ عالیہ دیدار نصیب ہو گا۔ اب شادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔“

قسام بہت خوش ہوا ”شنوارہ نزار کی طرف سے شکریہ قبول فرمایا جائے محترمہ عالیہ طرف سے جو بھی تاریخ مقرر کی جائے گی وہ شنوارہ کو قبول ہو گی۔“

نیل جیسے سوچنے لگی چند لمحوں کے بعد بولی ”شنوارہ نزار بہت بے چین نظر آتے اس لئے شادی کی تاریخ اسی ہفتے میں مقرر ہونا چاہئے۔۔۔۔۔“

”بہت بہت نوازش، شنوارہ بہت شکر گزار ہوں گے“ قسام نے خوشی سے پھول بات کاٹ دی اور شکریہ ادا کیا۔

نیل کے چہرے پر ایک شرارت آمیزیا پر اسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑی خواتین کی طرح انگلیوں پر دونوں کو گنا پھر کہا ”آج اتوار کا دن ہے پھر پیر منگل بدھ، خیال ہے جمعرات کا دن مبارک رہے گا۔ شنوارہ کیا فرماتے ہیں“

”بالکل ٹھیک“ قسام جلدی سے بولا ”شنوارہ کو شکریہ کے ساتھ جمعرات کا دن ہے۔“

”شنوارہ اور ان کا خادم خاص قسام کو مبارک ہو، یہ بات تو طے ہو گئی لیکن معاملے میں شنوارہ ذرا سی چوک یا غلطی ہو گئی اسے اسی وقت درست کر لیا جائے تو، اچھا ہو گا۔“ نیل نے شوخ نظروں سے قسام کو دیکھا۔

قسام بڑا حیران ہوا ”چوک، غلطی، شنوارہ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟“

نیل نے جواب دیا ”شنوارہ نے محترمہ عالیہ سے ملاقات کی درخواست کی تھی محترمہ عالیہ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے جمعہ کے دن ملاقات کا وعدہ فرمایا لیکن اب اس درخواست کو منسوخ کیا جاتا ہے اس لئے کہ محترمہ عالیہ جمعرات کو شنوارہ نزار کے محل میں پہنچ چکی ہوں گی۔ جمعہ کو کسی مزید ملاقات کی ضرورت نہ ہو گی۔“

قسام سناٹے میں آیا ”تم کس قدر چالاک ہو نیل، تم نے جمعہ کا دن اسی وجہ مقرر کیا تھا کہ تم جمعرات کو شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتی تھیں، اس طرح تم اپنی ہی اوپر رکھی ہیں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔“

”خاموش ہو جاؤ قسام“ نیل نے کڑک کے کہا ”تم اس وقت محترمہ عالیہ کی کنیرنگ

بہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ گفتگو شنوارہ نزار اور محترمہ عالیہ کے درمیان ہو رہی ہے اور قسام یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔“

قسام نے اسے ایک بار پھر حیران نظروں سے دیکھا اور سنبھل کے بولا ”میں محترمہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی کنیرنگ کی زبان بند کرائیں کیونکہ اب میں اپنے قسام اور محترمہ عالیہ کی کنیرنگ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

گفتگو کا اختتام ہو چکا ہے۔ محفل برخاست کی جاتی ہے۔ شنوارہ کو جو کہنا ہے وہ ملاقات میں عرض کریں۔“

یہ کہہ کے کنیرنگھڑی ہو گئی۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ نیل اور قسام کے درمیان جتنی گفتگو ہوئی وہاں نے اپنے اپنے مالکوں کے نمائندہ کے حیثیت سے کی تھی لیکن اس موقع پر محترمہ درشمار اور شنوارہ نزار بھی موجود تھے درشمار نے شنوارہ نزار کو شادی کی تاریخ مقرر

نے کے اپنے محل پر بلوایا تھا شنوارہ کا خیال تھا کہ شاید اس ہمارے اس کی درشمار ملاقات ہو جائے اس لئے وہ بہت بن سنور کے تشریف لائے تھے لیکن انہیں درشمار

محل پر پہنچ کے بہت مایوسی ہوئی۔

ہوا یہ کہ شنوارہ اور قسام کو مہمان خانہ میں بٹھایا گیا اس مہمان خانے کے بچوں سچ چلن ڈال کر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ان دونوں حصوں کے درمیان صرف

ایک نہ تھی بلکہ چلن کے ایک طرف باریک سفید جالی کا پردہ بھی لگایا گیا تھا تاکہ ایک سے دوسری طرف کچھ بھی نظر نہ آئے۔

ماہوتے ہی نیل نے قسام کے ذریعہ شنوارہ کو اس بات کا پابند کر دیا تھا کہ وہ اس مائیں گونگے بن کے بیٹھیں گے اور کوئی سوال کرنے یا جواب دینے کی کوشش نہیں

کے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیل اور قسام میں سوال و جواب ہوتے رہے یہاں تک کہ

نیل کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی لیکن شنوارہ نزار بت بنے بیٹھے رہے اور جب وہاں سے توڑیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت خود کو سمجھتے ہوئے اٹھے اور نیل کا شکر ادا

تے ہوئے رخصت ہو گئے۔

مشہور ہے کہ چاند چڑھتا ہے تو سب دیکھتے ہیں درشمار شاہی خاندان کے محلے میں

بچے ہوئے بھی انہی تھی وہ نہ کسی سے خود ملتی تھی اور نہ کسی کو اپنے محل میں بلاتی تھی

نکم لوگوں کو معلوم تھا کہ یہاں مصر کی سب سے زیادہ حسین عورت اور فاطمی خلیفہ کی نو

ریشہ درشمار رہتی ہے لیکن جیسے ہی خبر پھیلی کہ شنوارہ نزار اور فاطمی خلیفہ کی بیوہ

در شہوار شادی کر رہے ہیں تو ہر شہزادی اور شہزادے کو در شہوار دیکھنے کا شوق؛ شہزادیاں بن بلائے مہمان کی طرح در شہوار کے پاس آنا شروع ہو گئیں۔

دوسرے دن تو یہ حال ہوا کہ در شہوار کے محل میں بیگمات اور شہزادیوں ہجوم ہو گیا کہ در شہوار کو اپنا محل چھوٹا معلوم ہونے لگا بیگمات اور شہزادیاں آ در شہوار کو گلے ملتیں پھر شادی میں نہ بلائے کا شکوہ کرتیں۔

ایک بیگم نے کچھ اس انداز سے شکوہ کیا ”در شہوار بیگم ہماری محبت تمہارے بلائے بغیر آگئے محل سے نکلا تو نہ دوگی ہمیں؟“

”توبہ کیجئے بیگم صاحبہ، آپ میری بزرگ ہیں، بھلا یہ جرات کیسے کر سکتی ہو کہ مجبوراً انہیں خوش آمدید کہنا پڑا“ میں نے سوچا تھا کہ تقریب سے ایک بیگمات کو بلادیا بھیجوں گی اب یہ ان کی خوشی کہ آئیں یا نہ آئیں۔

”ان خوش نصیبوں میں کیا میرا نام بھی تھا؟“ ایک شوخ شہزادی نے در شہوار طرف مخاطب کر لیا۔

”کیوں نہیں شہزادی، تمہارا نام تو سرفہرست ہے کہو تو میں فہرست منگوا کے دوں“ در شہوار نے سفید جھوٹ بولا تھا وہ اس شادی کی کسی کو اطلاع بھی نہ تھی۔

”شکریہ آپ کا۔۔۔“ شہزادی نے مسرت سے جواب دیا ”میں ضرور آؤں میں بلکہ ایک دن پہلے ہی آجاؤں گی آپ ناراض تو نہ ہوں گی؟“

”توبہ توبہ، تم کیسی باتیں کرتی ہو شہزادی“ در شہوار نے پیار سے کہا ”میرے آنکھوں پر ہتھکڑیاں لگیں تو کتنی ہوں کہ تم ابھی سے آجاؤ“

غرض یہ کہ بیگمات اور شہزادیوں نے ایک ایک کر کے پہلے تو شکوے شکایہ کھولے پھر در شہوار سے شادی میں شرکت اجازت لے کر واپس ہوئیں اس طرہ دن بھی مہمان داری میں گزر گیا۔

ادھر شہزادے نزار کے محل پر بھی اس قسم کا ہجوم تھا۔ شہزادے کو در شہوار سے منع کر دیا گیا تھا کہ شادی میں دھوم دھڑکے کی ضرورت نہیں اس لئے اس دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا لیکن تمام بوڑھے اور جوان شہزادوں نے نزار کا محل آ جب تک نزار نے سب کو بارات میں شرکت نہ دے دی اس وقت تک وہ اس جے بیٹھے رہے۔

دونوں طرف سے زبردستی کی مہمانداری نے اس شادی کی رونق میں اضافہ

در شہوار نے حکم دیا کہ مہمانوں کے لئے اعلیٰ درجہ کا انتظام کیا جائے فرش فروش اور کھانے کا بہترین انتظام ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ خلافت ختم ہونے کے بعد بھی فلسفہ کی پیہ میں اتنا دم ختم ہے کہ وہ ہزار دو ہزار مہمانوں کی خاطر و مہارت کر سکتی ہے نزارہ نزار نے بھی دل کھول کے انتظام کیا بارات چڑھی تو بلائے اور بن بلائے باراتیوں کی تعداد ہزار سے زیادہ تھی۔

در شہوار نے مردوں کو کم مدعو کیا تھا لیکن شاہی خاندان کی کوئی بیگم یا شہزادی ایسی نہ تھی جسے بلاوانہ بھیجا گیا ہو اور سوائے بیمار اور معذور خواتین کے تمام بیگمات اور شہزادیاں بارات کے دن در شہوار کے محل میں موجود تھیں بارات کا بڑا شاندار استقبال ہوا نکاح کے بعد مہمانوں کی شاندار دعوت ہوئی پھر جب در شہوار کا ڈولا اٹھا تو اس قدر درہم و دینار پھار ہوئے جیسے سادہ بھادوں کی برکھا جھم جھم برے۔

اس طرح محترمہ عالیہ در شہوار کسی تاجدار یا خلیفہ کی ملکہ تو نہیں بن سکی لیکن ایک بت کرنے والے شہزادے کی دلہن بنی شہزادہ خود بھی محبت کا بھوکا تھا اس نے در شہوار کو اپنی محبتوں سے نمال کر دیا اور جواب میں در شہوار نے شہزادے کی فرمانبرداری اور تابعدار میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ شہزادے اور شہزادیوں کی شادیاں اکثر پانی کا بلبل ثابت ہوتی تھیں لیکن ان دو دلوں کے ملاپ نے دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کر دی در شہوار نے اپنی شادی پر طیب اعظم کو بھی مدعو کیا تھا مگر وہ شریک نہیں ہوئے شاید اسی لئے کہ انہوں نے در شہوار کی طرف سے کس وجہ کی بنا پر آنکھیں پھیر لی تھیں۔ خیال ہے ان کے مالی حالات بگڑ گئے تھے۔ بھوکے پیٹ سے عشق نہیں کیا جاتا۔

قلعہ الشویک اور کرک پر فوج کشی ناکام ہو گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ شامی فوجوں نے کمزوری کا مظاہرہ کیا امیر صلاح الدین نے غلط منصوبہ بندی کی تھی دونوں قلعوں پر لشکر کئی کی کمان صلاح الدین کے ہاتھ میں تھی قلعہ الشویک کا محاصرہ اس قدر سخت ہوا تھا کہ قلعہ والے قلعہ حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن ٹھیک اس وقت قاہرہ سے فاطمی شہزادوں کی بغاوت کی اطلاع پہنچی اور صلاح الدین محاصرہ اٹھا کر قاہرہ واپس آ گیا یہ محض اتفاق تھا کہ سلطان مشرق نور الدین زنگی انہی دونوں صلاح الدین کی مدد کے لئے الشویک جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے صلاح الدین کی واپسی کی خبر ملی اور اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

کچھ ایسا ہی اتفاق قلعہ کرک کے محاصرہ کے وقت ہوا۔ قلعہ کرک صلح کی بات چیت

کر رہا تھا کہ قاہرہ میں امیر صلاح الدین کے والد امیر نجم الدین کے گھوڑے سے واقعہ پیش آیا اور صلاح الدین کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر قاہرہ جانا پڑا اس دفعہ بھی صلاح الدین اپنے لشکر کو ترتیب دے کر صلاح الدین کی مدد کے لئے قلعہ کرک کی طرف حکم دینے والا تھا کہ صلاح الدین کی کرک سے واپسی کی اطلاع سلطان کو ملی اور کوچ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

قارئین کی یاد دہانی کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ دربار دمشق میں امیر صلاح الدین کے کئی مخالف امیر موجود تھے جنہیں صلاح الدین اور اس کے خاندان کا اقتدار ایک بھاتا تھا اور وہ سلطان سے اس خاندان کے بارے میں لگائی بجھائی کرتے رہتے تھے موقوفہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے قلعہ الشویک اور قلعہ کرک سے صلاح الدین کے اس وقت اٹھایا تھا جبکہ ہر دو موقعوں پر سلطان نور الدین زنگی، صلاح الدین کی مدد کرنے والا تھا دشمنوں کے لئے یہ موقع کافی تھا انہوں نے سلطان دمشق کے کان میں کہ صلاح الدین مصر کی وزارت پر فائز ہونے کے بعد خود سر اور باغی ہو گیا ہے اپنے پورے خاندان کو قاہرہ بلوا لیا ہے اور اب سلطان مشرق سے سامنا کرنے سے ہے۔

سلطان نور الدین زنگی اگر صلاح الدین اور اس کے باپ اور چچا نجم الدین اور الدین شیرکوہ کی خدمات کا دل سے قائل تھا پھر بھی صلاح الدین کے دونوں محاذوں اچانک واپس آنے سے اس کے دل میں بھی دوسوے نے جنم لیا جسے صلاح الدین مخالف امرانے اور ہوا دی خوش قسمتی سے پہلے موقع پر صلاح الدین کے باپ نے زبردست چال چل کے صلاح الدین کو سلطان کے غضب سے بچا لیا اور سلطان صلاح الدین کی طرف سے صاف ہو گیا۔

دوسرے موقعہ یعنی قلعہ کرک سے واپسی کے وقت بھی صلاح الدین کو اس کے نجم الدین نے ہی بچایا نجم الدین ایوب گھوڑے سے گرنے کے بعد انتقال کر گیا تھا الدین نے اس موقع پر اپنے دیرینہ رفیق فقیہ عیسیٰ ہکاری کو دمشق بھیجا اور انہوں سلطان سے وضاحت کی کہ صلاح الدین کی کرک سے واپسی کی وجہ سے بغاوت لشکر نہیں بلکہ نجم الدین کے گھوڑے سے گرنے کا حادثہ تھا جس کی اطلاع پا کر صلاح قاہرہ واپس ہوا تھا مگر وہ باپ کو زندہ نہ پاسکا اور اس کے قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی نجم کا انتقال ہو گیا۔ سلطان نے صلاح الدین کی معذرت قبول کر لی ہو سکتا ہے کہ سلطان مصلحت سے کام لیا ہو کیونکہ سلطان کو صلاح الدین کی عسکری طاقت کا علم تھا

صلاح الدین اور نور الدین کے لشکر آپس میں ٹکرا جاتے تو دونوں سے ایک ہارتا والے کی جیت بھی ہار کے برابر ہوتی کیونکہ اس کا لشکر بھی تباہ ہو چکا ہوتا۔

لیکن صلاح الدین کے لئے یہ دونوں موقعے اس قدر کٹھن ثابت ہوئے جس نے اس کے وجود کو ہلا کے رکھ دیا ہو سکتا ہے ان واقعات کے پیش نظر اس نے یہ سوچا کہ اگر اسے کسی وقت مصر چھوڑ کر کسی اور جگہ جانا پڑے تو وہ کدھر کا رخ کرے گا لاج الدین کا آقا مربی اور استاد سلطان نور الدین زنگی ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اس کے دربار میں صلاح الدین کے مخالف امیر موجود تھے وہ اگرچہ اب تک صلاح الدین کو کوئی مان نہ پہنچا سکتے تھے لیکن وہ سلطانی اور شہنشاہی دور تھا اور سلطان اور شہنشاہ کی نظر کس نے بھی پھر سکتی تھی امیر صلاح الدین نے شائد نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا اس لئے اس نے سلامتی کے لئے پیش بندیاں کرنا شروع کر دی تھیں۔

شاید یہی کچھ سوچتے ہوئے اس نے مصر کے قریب شمالی افریقہ کے دو صوبے جو مکمل ایش تھیں ان کی طرف ایک لشکر بھیجا یہ ریاستیں طرابلس اور برقہ تھیں جس سردار کی ان میں لشکر روانہ کیا گیا اس کا نام بلاء الدین قراقوش تھا مصر کی فاطمی خلافت کو صلاح الدین نے جس حکمت عملی سے ختم کیا تھا اس کی وجہ سے وہ دور و نزدیک میں بہت مشہور تھا چنانچہ جب مصری لشکر کی خبر طرابلس اور برقہ میں پہنچی تو مجبوروں نے یہی بتایا کہ اب الدین کا لشکر طرابلس کی طرف بڑھ رہا ہے وہی صلاح الدین جس نے یروشلیم کے شاہ ایملارک کو ناکوں پنے چھوڑ دیئے تھے اور وہی صلاح الدین جس نے تین صدی پرانی رکی فاطمی خلافت کو چند دنوں میں ہمیشہ کے لئے اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔

اس طرح امیر صلاح الدین کا نام ہی طرابلس اور برقہ پر قبضے کا سبب بن گیا اور دونوں استوں کے صوابے داروں نے معمولی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے بے شک یہ شائد کار کامیابی تھی یہ مقامات دربار دمشق سے دور بھی تھے لیکن شمالی افریقہ کے یہ علی علاقے ہر وقت بری اور بحری حملوں کی زد میں رہتے تھے اس لئے صلاح الدین نے علاقہ میں کوئی فوجی چھاؤنی بنانے کی کوشش نہ کی جو اس کے کسی مشکل وقت میں کام آتی۔

طرابلس اور برقہ کی فتح کے بعد صلاح الدین کی نظریں جنوب کی طرف اٹھیں اور اس نے اپنے بڑے بھائی شمس الدولہ توران شاہ کی سرکردگی میں لشکر سوڈان کی طرف روانہ کیا نہ ہے کہ صلاح الدین نے سوڈان پر اس لئے فوج کشی کرائی ہو کہ سوڈانی حبشیوں نے

قاہرہ میں اس کے خلاف زبردست بغاوت کی تھی تو رانشاہ بڑا دلیر اور بہادر تھا وہ اتھری سے سوڈان کی طرف چلا راستہ بڑا دشوار گزار تھا صحرائی اور ریگستانی علاقہ وحشی اور جنگلی سوڈانی قبائل کی مزاحمت لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود توران شہر آگے ہی بڑھتے رہے اور سوڈانیوں کے سر قلم کرتا ہوا ان کے صدر مقام ابریم گیا۔

ابریم پر قبضہ کے لئے ایک مہمیں جنگ ہوئی جس میں ہزاروں سوڈانی کام آبریم کو نہ بچا سکے اور اس پر توران شاہ نے مصر کا پرچم لہرایا اس بے آب و میں داخل ہونا پھر ابریم پر قبضہ کرنا توران شاہ ہی کا کام تھا ورنہ وہاں کے جنگلی قدر خطرناک تھے کہ ان پر آج تک کسی غیر ملکی نے قابو نہ پایا تھا مشہور ہے کہ جنگلات میں بعض ایسے قبائل بھی ہیں جو سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور قبیلے والے نہیں ملتے انہوں نے اپنے علاقے میں اپنی ایک الگ دنیا بنا رکھی ہے اور اس میں ہیں اس بات کا یقین شاید توران شاہ کو نہ آتا اگر اس کا ایک لشکر ایسے ہی حادثاتی طور پر نہ پہنچ گیا ہوتا۔

مصری فوج کا وہ لشکر جس نے ایسے ہی ایک الگ تھلگ قبیلے کا حال بیان نام مناف تھا ابریم پر قبضہ کے بعد توران شاہ نے اس جگہ مستقل قیام کا ارادہ کیا ایک شہر آباد کرنے کے انتظام میں لگ گیا اس دیرانہ میں کسی بڑے شہر کی بنیاد رکھنے ہی غلط تھا لیکن توران شاہ جس قدر دلیر تھا اسی قدر ضدی بھی تھا اس نے حکم دیا کہ اردگرد کا علاقہ صاف کیا جائے اور یہاں سے شمال کی طرف ایک سڑک بنائی جا۔ کے ذریعہ شمال کے شہروں سے تعمیر کا سامان منگائے ابریم میں ایک بڑا شہر تعمیر کیا جا۔ یہ کام بڑا مشکل تھا مگر حکم حاکم جاندار کے مصداق ہر شخص کام میں لگ گیا پتھری زمین کو ہموار کیا جانے لگا اور جھانڈیوں اور کانٹے دار درختوں کو تراشا خر لشکر مناف کی ڈیوٹی ان محافظوں کے ساتھ لگی جنہیں سڑک کی تعمیر کام کی حفاظت کام سونپا گیا تھا جنگلی قبائل سڑک کی تعمیر میں رخنہ ڈالتے تھے اور روز کسی نہ کسی جا کر کے کام کرنے والوں کو زخمی کر دیتے ان حملہ آوروں کو روکنے کے لئے جگہ جگہ تعینات کئے گئے تھے ان محافظوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتی تھیں تاکہ پھریدار چوہہ اپنے کام پر موجود رہیں دن بھر پہرہ دینے والے رات کو سوتے تھے اور رات پہرہ والے دن کو سوتے تھے ان کے آرام کے لئے خیمے لگا دیئے گئے تھے۔

مناف کی ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی پس وہ رات بھر پہرہ دیتا اور صبح کو واپس آتا

جانا تھا ہر خیمے میں چار محافظ سوتے تھے ایک صبح رات کے پھریداروں میں تین اہل خیمے میں پہنچ گئے مگر چوتھا محافظ واپس نہ پہنچا تو اس کے ساتھیوں کو فکر ہوئی انہوں نے اس کی تلاش شروع کر دی واپس نہ آنے والا یہی محافظ مناف تھا یہ خبر دوپہر اور طرف پھیل گئی محافظوں کے سردار نے چاروں طرف لشکر دوڑائے کہ مناف کو ہر طرف مگر تمام دن کی تلاش بیکار ثابت ہوئی اور شام کو یہ تصور کر لیا گیا کہ مناف کو جنگی جانور یا تو مار کے کھا گیا ہے یا پھر وحشی حملہ آور اسے اٹھالے گئے ہیں۔

مناف کے غائب ہونے کی خبر جب توران شاہ کو پہنچی تو اس نے محافظ دستوں میں کر دیا لیکن ٹھیک ہفتہ بعد مناف اچانک واپس آگیا مناف اکیلا نہ تھا اس کے ساتھ نہایت حسین دو شیزہ تھے جس کے لباس میں کپڑے کی دو پٹیاں تھیں جن سے اس نے بڑا اور ستہ چھپایا تھا لشکریوں کو مناف کے آنے کی خوشی بھی تھی اور تعجب بھی لشکر کے ساتھ آنے والی دو شیزہ کو گھور گھور کے دیکھ رہے تھے اور وہ دو شیزہ مناف کے بھی جاری تھی۔

آخر مناف نے یہ کہہ کر ساتھیوں کو اور حیرت میں ڈال دیا ”یہ جنگلی لڑکی تمہاری اپنی میری بیوی ہے“ اسے اس طرح نہ دیکھو“

اس دوران مناف کی اچانک واپسی کی خبر پہ سالار توران شاہ تک پہنچ گئی اور اسے یہ بتایا گیا کہ مناف کے ساتھ ایک خوبصورت جنگلی لڑکی بھی ہے توران شاہ بھی بہت ہوا اور دریافت حال کے لئے مناف کو اپنے خیمے پر بلا لیا۔

مناف پہ سالار کے پاس جانے ہی والا تھا کہ ادھر سے اس کا بلاوا آگیا وہ جنگلی لڑکی کو لئے ہوئے پہ سالار کے سامنے پہنچا مناف نے دستور کے مطابق پہ سالار کو سلام کر اپنے ساتھ آنے والی لڑکی سے کسی اور زبان میں کچھ کہا لڑکی نے بھی مناف کو اسی میں جواب دیا پھر مناف نے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر لڑکی کو اشارہ کیا۔

لڑکی مسکرائی اور پہ سالار کی طرف رخ کر انہیں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا توران شاہ کو زیادہ تعجب ہوا اس نے پوچھا ”مناف یہ لڑکی کون ہے اور تم اسے لشکر میں کیوں لائے؟“

مناف نے بتانا شروع کیا ”محترم پہ سالار! اس لڑکی کا نام شولو ہے اور یہ ایک جنگلی کے سردار کی بہن ہے“

”ٹھیک ہے یہ کسی کی بہن اور کسی کی بیٹی ہے“ توران شاہ نے سخت لہجے میں کہا ”مگر سے اس طرح لشکر میں کیوں لائے ہو، کیا تم نہیں جانتے کہ کسی لڑکی کو درغلا کر بھگالانا

دینی اور دنیاوی دونوں قانونوں میں بہت بڑا جرم ہے۔
 ”میرے آقا! میرے حاکم یقین کیجئے کہ میں نے نہ اسے درغایا ہے اور نہ ہوں۔“ مناف نے بڑی رقت سے کہا ”یہ بچاری ایک ایسی مصیبت میں گرفتار تھی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی مدد کرنے پر ضرور آمادہ ہو جاتا۔“

توران شاہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا ”اچھا تفصیل سے بتاؤ کہ تمہیں یہ لڑکی اور اس پر کیا مصیبت آئی تھی جس نے تمہیں اسے اغوا کرنے پر آمادہ کیا خبراً مت بولنا ورنہ سخت سزا دی جائے گی؟“

”پہلے سالار کے سامنے ایک معمولی لشکری جھوٹ نہیں بول سکتا میرے آقا نے بڑے استقلال سے کہا ”میں تفصیل سے بیان کرتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ کہاں اور یہ لڑکی مجھے کن حالات میں ملی ہے۔“

یہ کہہ کر مناف خاموش ہوا اور کسی گرمی سوچ میں ڈوب گیا جیسے وہ اپنے ذہن میں جمع کر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا ”پہلے سالار کو علم ہو گا کہ مجھے ان محافظہ شامل کیا گیا تھا جو سڑک بنانے والوں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ میں رات کی ڈیوٹی پر ایک ہفتہ پہلے میں رات کی ڈیوٹی ختم کر کے واپس آ رہا تھا کہ مجھے دور پر کوئی دھمکی دکھائی دیا صبح پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھی اور دور کی چیز صاف دکھائی نہ دیتی ایک دم خیال آیا کہ یہ بھاگنے والا حضور کوئی جاسوس ہے جسے سوڈانیوں نے ہمارے مخبری کے لئے بھیجا ہو گا یہ خیال آتے ہی میں اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔“

مناف سانس لینے کے لئے رکا پھر کہنا شروع کیا ”میرے آگے بھاگنے والا بڑا سے بھاگ رہا تھا مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اسے پکڑنے کے لئے اپنی رفتار اور دی روشنی پھیل چکی تھی اور دور تک صاف نظر آ رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک ننگ جس کے جسم پر برائے نام ہی کپڑے تھے وہ ناک کی سیدھ میں بے تحاشہ بھاگ اسے نہ نشیب کی فکر ہے اور نہ فراز کی کئی اونچے اونچے ٹیلے اور چٹانیں آئیں جنہ نے بغیر کسی دقت کے عبور کر لیا میرے آقا مجھے اس طرح اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے کھنسنے سے زیادہ ہو گیا تھا میں نے اتنی تیز بھاگنے کا عادی تھا اور نہ زیادہ دیر تک بھاگ تھا میری رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ اسی غماز بڑھنے لگا اب ہم ایک پتلی پگڈنڈی پر بھاگ رہے تھے جس کے ایک طرف گہرا نالہ دوسری طرف خاردار جھاڑیاں پھر گہنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔

”میں بہت تھک گیا تھا اور واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میرے آگے بھاگنے والا

ہم رک کے کھڑا ہو گیا جیسے کسی نے اس کا راستہ روک لیا ہو میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں تیزی سے بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا میں نے دیکھا کہ بھاگنے والا کوئی جاسوس نہیں بلکہ ایک لڑکی شوہ ہے۔

یہ کہتے ہوئے مناف نے شوہ کی طرف دیکھا جو گرم سم کھڑی تھی، مناف نے اپنی بات باری رکھتے ہوئے کہا ”شوہ سے نظر ہٹا کر میں نے پگڈنڈی کی طرف دیکھا تو شوہ کے رک کے کھڑے ہونے کا سبب سمجھ میں آ گیا تنگ پگڈنڈی پر ایک اڑدہا بڑے اطمینان سے لیٹا تھا اور اپنا بھاری پھن اٹھا کر شوشوں کی آوازیں نکال رہا تھا شوہ نے اپنی حفاظت کے لئے ایک موٹی لکڑی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور جب اڑدہا شوشوں کے اس کی طرف پھینکا تو وہ پوری طاقت سے لکڑی اس کے پھن پر دے مارتی مگر اس لکڑی کا اڑدہا کے پھن پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔

میں کبھی اڑدہا کو اور کبھی شوہ کو دیکھتا تھا۔ پھر ایک بار میری اور شوہ کی نظریں چار ہوئیں تو میں نے اس کی آنکھوں خوف کے علاوہ مایوسی اور بے بسی کو تیرتے دیکھا میں نے اگرچہ دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر بھاگنے والا میرے ہاتھ آ گیا تو پہلے میں خود اس کی اچھی طرح مرمت کروں گا اس کے بعد آپ کے حضور میں اسے پیش کروں گا لیکن اس وقت شوہ کی غم ناک آنکھیں دیکھ کر میری انسانیت جاگ اٹھی اور میں نے کمر میں لگی تلوار کھینچی یہ تلوار مجھے بھاگتے وقت ایک بوجھ محسوس ہو رہی تھی لیکن اس وقت اسی بوجھ نے شکل آسان کی۔

میں نے پینترا بدل کر اڑدہا کے پھن پر بھرپور وار کیا میرا خیال تھا کہ بھرپور وار سے اس کا پھن کٹ جائے گا میرا خیال غلط ثابت ہوا زخم کھا کر اڑدہا غصے میں آ گیا اور میری طرف اپنے بھاری دم کو سمیٹ کر بڑھنے لگا میں بھی اپنے ناکام وار سے جھلا اٹھا تھا اس لئے میں نے رخ بدل بدل کر اس کے پھن کو نشانہ بنایا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کا پھن جسم سے الگ ہو چکا تھا شوہ اطمینان کا سانس لیا اور شکرگزار نظروں سے میری جانب دیکھا تلوار کے وار کرتے کرتے میرا دم پھول گیا تھا اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا مگر شوہ کی شکرگزار نظروں نے مجھے تازہ دم کر دیا اور میں بھی مسکرا دیا۔

اس وقت شوہ نے اپنی زبان میں کچھ کہا جسے میں سمجھ نہ سکا اور یہ خیال کر کے شائد شوہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہے میں نے اپنا سر ہلا دیا اور تائید میں ہاتھ بھی ہلایا۔ پتہ نہیں کیا کبھی اس نے مراد اڑدہا کے جسم پر سے ایک جست لگائی لیور پگڈنڈی پر آگے کی طرف چلے گئی۔ میں حیران نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے

پلٹ کر مجھے دیکھا پھر مسکرائی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

شوبہ کے اشارے میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میں سحرزدہ سا اس کے پیچھے چلے گا۔ مناف نے بتایا کہ وہ اور شوبہ نصف گھنٹے کے قریب چلتے رہے مناف نے اس سے اس لئے گفتگو نہ کی کہ شوبہ کی بات سمجھ ہی نہ سکتی تھی اور میں شاید اسی وجہ سے خاموش رہا۔ پھر سامنے کی طرف ایک پہاڑی سلسلہ دکھائی دیا یہ پہاڑیاں زیادہ بلند نہ تھیں مگر بہت ڈھلوان اور چکنی تھیں جن پر چڑھنا ناممکن نظر آتا تھا مناف نے دور تک نظریں دوڑائی کہ شاید کوئی درہ دکھائی دے مگر اسے کچھ نظر نہ آیا شوبہ کھڑی مسکراتی رہی شاید وہ ہاتھ کی پریشانی پر خوش ہو رہی تھی مناف کو اس کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔

پھر ایسا ہوا کہ شوبہ نے مناف کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور سیدھی پہاڑیوں پر اس طرح چڑھنے لگی جیسے بندر درخت پر چڑھتا ہے اس کے سہارے سے مناف بھی چڑھتا رہا وہ دونوں جھکے جھکے چڑھ رہے تھے شوبہ کے چہرے پر پریشانی کے قطعی آثار نہ تھے مگر مناف جی میں ڈر رہا تھا کہ اگر شوبہ نے اس کا ہاتھ ذرا بھی ڈھیلا کیا تو لڑھکتا ہوا نیچے پھینے کا اور اس کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں لیکن کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا اور دونوں پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے اور مناف کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ پہاڑی ایک دائرے کی طرح گھومتی چلی گئی ہے جس کے درمیان میں گھاس کے میدان اور جنگل نظر آ رہا ہے یہ احاطہ چاروں طرف سے یہ پہاڑی کئے ہوئے ہے۔

شوبہ نے اس کا ہاتھ اب نہ چھوڑا اور اسی طرح پکڑے ہوئے دوسری طرف ڈھلوان اترنے لگی مناف کو اترنے میں کوئی پریشانی محسوس نہ ہوئی یہ دونوں ابھی نیچے نہ پہنچے تھے کہ مناف کو نیچے جنگلیوں کا ایک غول نظر آیا وہ سب ڈنڈوں اور تیر کمان سے مسلح تھے مناف بہ صورت حال دیکھ کر کانپ اٹھا اس نے سوچا کہ یہ وحشی اس لڑکی کے قبیلے والے ہیں اور اس کے نیچے اترتے ہی اس کے ٹکڑے کر دیں گے لیکن شوبہ کے چہرے پر کسی قسم کا ڈر ظاہر نہ ہوتا تھا۔

ابھی تھوڑی سی ڈھلوان باقی رہ گئی تھی کہ شوبہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا مناف نے ہوش اڑ گئے اس نے جلدی شوبہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلایا کہ وہ اسے اکیلا نہ چھوڑے شوبہ اس کی زبان تو نہ سمجھ سکی مگر اس نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ اس کا محسن اس کے قبیلے والا ہے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا ہے شوبہ نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور تھپاتا شروع کیا پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مناف نے پریشان نظروں سے شوبہ کو دیکھا جس نے جواب میں اس نے مناف کو اس طرح دیکھا جیسے اسے تسلی دے رہی ہو۔

مناف کی جیسے تسلی ہو گئی ہو۔

شوبہ اتر کے اپنے قبیلے والوں میں پہنچی تو ایک جوان نے آگے بڑھ کے شوبہ کے اچھے اے بال پکڑے اور جیج جیج کے کچھ بکے لگا۔ شوبہ بھی اسے تیز آواز میں جواب دیتی رہی اور اپنے بال چھڑانے کی کوشش کرتی رہی پھر جانے کیا ہوا کہ اس جوان نے شوبہ کے بال اور دینے اور دوڑ کے مناف کے پاس پہنچا مناف نے موت اپنے سامنے دیکھی تو تلوار کھینچ لی وہ بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے تلوار نہ چلانا پڑی کیونکہ آنے والا جوان اس کے سامنے سجدہ میں گر گیا تھا۔ شوبہ کے قبیلے والے جو اس کے ارد گرد کھڑے تھے وہ بھی مناف کے پاس پہنچ کے سجدہ ریز ہو گئے مناف نے اپنی تلوار میدان میں کر لی۔

دشمن کے بادل چھٹ گئے اور دوستی کی پھوار پڑنے لگی۔ شوبہ کے قبیلے والوں نے مناف کو اپنے کانڈھلوں پر اٹھا لیا اور سب کے سب ناپچتے گاتے ایک جلوس کی صورت میں بدلتی چراگاہ کی طرف واپس ہوئے شوبہ آگے آگے چل رہی تھی میدان کے سر پر جہاں سے جنگ شروع ہوتا ہے وہ مناف کو اتارا گیا پیچ میں آگ کا لالہ جل رہا تھا جس کے چاروں طرف اس قبیلے کے بانی لوگ بیٹھے تھے ایک طرف کسی جانور کی دو کھالیں بچھی تھیں ایک کھال پر ایک رعب دار آدمی جس کی عمر پچاس کے قریب تھی بیٹھا تھا چار پانچ اس کے گرد اور بدن دبا رہے تھے دوسرے لوگ بڑے ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

شوبہ کے بال پکڑنے والا جوان گروہ سے الگ ہو کر اس شخص کے پاس پہنچا جو کھال پر بیٹھا تھا وہ دوسری کھال پر بیٹھ گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ جوان رتبہ میں اس رعب دار آدمی سے کچھ نیچے تھا پھر اس جوان نے اپنی زبان میں اس سے باتیں شروع کر دیں پیچ پیچ وہ مناف کی اشارے کرتا جا رہا تھا رعب دار آدمی جیسے خوش ہو رہا تھا اس نے کئی بار بڑی دلچسپی اور محبت سے مناف کی طرف دیکھا مناف کے برابر شوبہ کھڑی تھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رعب دار آدمی اس قبیلے کا مہنت یا مذہبی گرو تھا اور وہ جوان شوبہ کا سگا بھائی تھا جسے مناف اپنا رقیب سمجھ بیٹھا تھا۔

شوبہ کو بھائی دراصل قبیلے کا سردار تھا دلچسپ بات یہ تھی شوبہ اور اس کا بھائی بہت خوبصورت اور سرخ و سفید رنگت کے تھے جبکہ باقی تمام مرد اور عورتیں سیاہ فام تھیں مناف نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ بہت پہلے یورپ کے ایک میاں بیوی نے جن کے ساتھ ان کی جوان بیٹی بھی تھے اس علاقے میں آنے کی کوشش کی تھی جس کے نیچے میں ان دشمنوں نے میاں بیوی کو قتل کر دیا اور جوان لڑکی کو قبیلے کے سردار نے اپنے جھوپڑے میں رکھا۔ اس سے جو لڑکا پیدا ہوا وہ ماں کی طرح سرخ و سفید تھا بڑا ہو کر وہ قبیلہ سردار بنا

اس طرح سردار کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ سفید و سرخ رنگ کا ہو۔

اس قبیلے کے بڑے عجیب و غریب رسم و رواج اور قانون تھے قبیلہ سردار اور پیشوا کا رتبہ تقریباً برابر ہوتا تھا سردار کا حکم ہر ایک مانتا تھا سوائے پیشوا کے، وہ پیشورے سے قبیلے پر حکومت کرتا تھا یہ قبیلہ دوسرے قبیلوں سے بالکل الگ تھلک میں سے بیرونی دنیا کسی نے بھی نہ دیکھی تھی وہ اپنی زندگی قدیم طرز پر گزارتے تھے کھود کے اس میں سرنگ سی بناتے پھر اس کو گھاس پھوس سے ڈھک کے گھر بناتے تھے تیر کمان بھدے تھے تلوار انہوں نے پہلی بار مناف کے پاس دیکھی تھی ان لوہے کا موٹا ڈنڈا ہوتا تھا جس کی نوک پتھر پر گھس کر وہ بھالے اور نیزے کے استعمال کرتے تھے۔

ان میں اجتماعی شادیوں کا رواج تھا ہر چاند رات کو جشن منایا جاتا مرد اور عورت ہی شراب پیتے اور رقص کرتے تھے اس رقص میں عورتوں کے علاوہ بالغ لڑکیاں شریک ہوتی تھیں ان لڑکیوں کو جشن میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی جو خواتین مخصوص ایام میں ہوتی تھیں انہیں ٹاپاک سمجھا جاتا اور ایک الگ گھر میں رکھا جاتا رات کو قبیلے کے سب سے بہادر جوان کو اجازت ہوتی کہ وہ جس لڑکی کو چاہے اپنے لے جا سکتا تھا صرف ایک لڑکی پر بس نہ تھی وہ اس رات جتنی لڑکیوں کو چاہے اپنی نشانہ بنا سکتا تھا۔

اس کے انتخاب کے بعد دوسرے جوانوں کو اجازت ہوتی کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی پکڑ لیں وہ جس کا ہاتھ پکڑتے وہ لڑکی اس کی بیوی ہو جاتی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کو دو راتوں تک اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا لڑکی کو ایک رات مذہبی پیشوا کی ہو شکار ہونا پڑتا دوسری شب وہ قبیلہ سردار کے گھر رہتی تیسری شب سے وہ اپنے پسند والے مرد کے ساتھ رہنا شروع کرتی تھی یہ شادیاں صرف ایک ماہ کے لئے ہوتیں دو چاند رات کو پھر اسی طرح کا جشن ہوتا اور ہر جوان اپنی پسند کی بیوی دوبارہ چننا وہ جو ایک بار مذہبی پیشوا اور قبیلہ سردار کے گھر رہ چکی ہوتی تھیں انہیں اس مرحلہ سے گزرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی ان کا عارضی شوہر ہاتھ پکڑ کر سیدھا اپنے گھر لے جاتا تھا۔

شوہر کا بھائی جب پیشوا کو پورا قصہ سنا چکا تو اس نے شوہر اور مناف کو اپنے پاس اور ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں پھر شوہر کے بھائی کے کان میں سرگوشی کی کہ بھائی سر ہلاتا رہا شوہر کے کان گفتگو کی طرف لگے تھے اس نے گفتگو سنی تو حیا سے

ہو سرخ ہو گیا پیشوا نے کھڑے ہو کر شوہر اور مناف کا پورا واقعہ قبیلے والوں کو سنایا ان کے دل میں بھی مناف کے لئے احترام کا جذبہ جاگ اٹھا اور وہ اسے عقیدت سے دیکھنے لگے مگر ان میں ایک بھاری ذیل ڈول کا جوان مناف کو گھور گھور کے دیکھ رہا تھا اسے شاید پیشوا کی زبان سے مناف کی بہادری کی تعریف ناگوار گزری تھی مناف نے اس کی نظروں سے چھان لیا کہ وہ مناف کو پسند نہیں کرتا اور وہ کسی وقت اس کا دشمن ہو سکتا ہے۔

پیشوا نے شوہر کو اپنے قریب بلا کر اس سے کچھ پوچھا شوہر نے سر ہلا کر جواب دیا اور ٹرم سے دہری ہو گئی پھر پیشوا دوبارہ کھڑا ہوا اور اس نے کوئی اعلان کیا اس اعلان پر وہ دیو بیل انسان پھر کے کھڑا ہو گیا اور بڑی گستاخی سے پیشوا سے سوال و جواب کرتا رہا پیشوا کو ہی غصہ آگیا تھا اس نے اسے بہت ڈانٹا پھنکارا اور بیٹھنے کا حکم دیا لیکن وہ کسی بات پر اڑا رہا پھر جب اس نے ہاتھ سے مناف کی طرف اشارہ کر کے غصہ سے کچھ کہا تو مناف کو غبن ہو گیا یہ سب جھگڑا اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ادھر شوہر کی یہ حالت تھی کہ وہ مناف کے پہلو سے چپٹی جا رہی تھی جب بات بہت بڑھ گئی تو قبیلہ سردار نے اس دیو نما انسان ان کے بٹھایا پھر محفل برخواست ہو گئی شوہر نے اپنی بہن سے کچھ کہا شوہر، شوہر، مناف کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چلنے لگی۔

مناف کا دماغ سخت پریشان ہو رہا تھا اسے اپنے اوپر غصہ بھی آرہا تھا کہ یہ سب خداس کا کیا دھرا ہے شوہر لاکھ خوبصورت اور دلنواز سہمی مگر اس کے لئے خود کو ہلاکت میں ڈالنا کوئی عقلمندی نہ تھی اس نے اپنے آپ بالکل شوہر کے حوالے کر دیا کیونکہ وہی اس کی مدد تھی اور اس کی مدد سے وہ ان جنگوں سے نجات پا سکتا تھا شوہر اسے سرنگ نما جمبوڑی میں لے گئی جس کا چھپر اوپر سے جگہ جگہ پھٹا تھا۔

اب مناف کو یہ الجھن پیدا ہوئی کہ وہ شوہر سے گفتگو کس زبان میں کرے کیونکہ گفتگو کے بغیر وہ اپنی رہائی کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا تھا کہتے ہیں کہ محبت کی زبان کچھ اور ہی ہوتی ہے جسے دو محبت بھرے دل بغیر الفاظ کا سہارا لئے اپنی بات دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں ظاہر ہے کہ مناف کو شوہر سے محبت بیک نظر ہوئی تھی اس لئے وہ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ان بھیڑیوں کے بٹھنے میں آگیا تھا شوہر کے دل میں بھی یہی جذبہ موجزن ہوا تھا ایک تو مناف نے اڑدے سے اس کی جان بچائی تھی دوسرے مناف شوہر کے مانند سرخ سفید تھا شوہر اس نسبت کی وجہ سے مناف کے اور زیادہ قریب ہو گئی تھی وہ بچپن ہی سے چاہتی تھی کہ اس کی شادی ان کالوں کے بجائے کسی گورے سے ہو مگر قبیلے میں سوائے اس کے بھائی کے اور کوئی گورا نہ تھا وہ نہ جانے کیوں بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ اس

قبیلے میں سگی بہن سے کیا بیٹا اپنی ماں سے بھی شادی کر سکتا تھا۔

بہر حال شوہو اور مناف کی محبت کی زبان میں گفتگو شروع ہوئی اور یہ دونوں بے تکلف باتیں کرتے رہے مناف نے اشاروں میں پوچھا کہ یہاں کوئی اور تو نہیں آ رہا ہے؟ اشاروں ہی میں جواب دیا کہ انہیں اس گھر میں اکیلے رہنے کا حکم دیا گیا۔ مناف نے اس دیو نما انسان کے بارے میں کئی سوال کئے اس پر شوہو نے اسے سمجھایا کہ بے ڈالی آدمی قبیلہ کا سب سے طاقتور جوان ہے اور شوہو سے شادی کا خواہش رکھتا ہے لیکن جب پیشوا نے اعلان کیا شوہو جوان ہو گئی ہے اس نے اس غیر ملکی کو پسند کیا۔ غیر ملکی بھی اس کو پسند کرتا ہے اس لئے ان دونوں کی شادی اب کی چاند رات میں اس بے ڈول نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے اس لئے پہلا حق اس کا ہے پھر بہت تکرار کے بعد پیشوا نے فیصلہ کیا کہ چاند رات سے ایک پہلے غیر ملکی اور اس دیو سے کشتی کا مقابلہ ہو گا دونوں میں سے جو جیتے گا وہ شوہو کا تھا گا۔

اس پر مناف نے سینہ تان کر شوہو کو یقین دلایا کہ وہ دیو کا مقابلہ کر کے اسے کرے گا جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ تمام باتیں مناف نے ایک ہی رات میں شوہو سے کی تھیں اور اس نے آئندہ کے لئے پروگرام بھی بنا لیا تھا یہ بات بہت عجب خبر ہوتی ہے لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے مناف اور شوہو دونوں ایک دوسرے کی ذرا قطعی ناواقف تھے لیکن ان کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا اور اسی محبت نے رہنمائی کی اور انہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنے دل کی باتیں دوسرے پہنچائیں۔

مناف اور شوہو تمام رات اس زمین دوز جھوپڑے میں تنہا رہے تھے لیکن صبح نے اپنے بھائی اور پیشوا کے سامنے پر زور الفاظ میں اپنے اور مناف کے پاکیزہ ہو دعویٰ کیا تھا اور ان دونوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا پھر مناف کو کسی سے کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کی نمائندگی کا فرض شوہو نے اپنے سر لے لیا تھا اور پیشوا کو بتایا کہ غیر ملکی جوان قبیلے کے دیو ہیکل پہلوان سے کشتی کا مقابلہ کرنے پر تیار ہے اور اگر اس نے یہ مقابلہ جیت لیا تو وہ شوہو سے شادی کرے گا۔ پیشوا نے بھی اعلان کیا کہ قاعدے کے مطابق اگر غیر ملکی نے یہ مقابلہ جیت لیا تو وہ شوہو کو اس کے حوالے دے گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ شوہو پہلی شب پیشوا اور دوسری شب اپنے بھائی کے ساتھ گزارے گی۔

چاند رات کو چار دن اور مقابلہ کو صرف تین دن باقی تھے مناف اور وہ قوی ہیکل دیو دنوں مقابلے کی تیاریاں کرنے لگے قبیلے والوں میں بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا مناف نے دھڑکھڑکیا اور شاہو نے بھی اس بات کی تصدیق کی قبیلے کے تقریباً نصف سے زیادہ لوگ پہنچے ہیں کہ غیر ملکی جوان، قبیلے کے دیو کو شکست دیدے، یہ ان کی خواہش تھی لیکن ان میں صرف چند ہی ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ غیر ملکی اس دیو کو ہچھاڑ سکے گا ورنہ عام خیال یہی تھا کہ وہ دیو اپنے فولادی پنجے سے غیر ملکی کی گردن مروڑ کے اس کا خاتمہ کر دے گا۔

آئندہ تین دن اور تین راتیں بھی شاہو اور مناف نے سب سے الگ اسی سرنگ نما جھوپڑے میں گزارے شاہو کو یہ گمان تھا کہ وہ دیو کے مقابلے سے پہلے ہی غیر ملکی کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا اس نے مناف کو ہوشیار کر دیا تھا اس لئے مناف ہر وقت چوکنا رہتا تھا شوہو کے بھائی یعنی قبیلہ کے سردار نے مناف کی تلوار بہت پسند کی تھی اور مناف کو مجبوراً اپنی تلوار اسے تحفہ کے طور پر دینا پڑی تھی لیکن شاہو اپنے بھائی سے یہ کہہ کر تلوار واپس لے آئی تھی کہ غیر ملکی کو دیو کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے اس لئے مقابلہ کے دن تک وہ تلوار اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے سردار نے موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر تلوار واپس کر دی تھی جسے مناف ہر وقت اپنی کمر سے لٹکائے رکھتا تھا اور رات کو برہنہ تلوار پہنے قریب رکھ کر لیتا تھا۔

تین دن گزرے اور مقابلے کا دن آیا تو صبح ہی سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مقابلہ ڈس میدان میں ہونا تھا مقابلہ شام کے وقت ہونا تھا لیکن میدان میں مرد عورتیں اور بچے دھڑکھڑکیا شروع ہو گئے تھے دیو ہیکل پہلوان اپنے چند دوستوں کے ساتھ دوپہر ڈھلتے ہی میدان میں آگیا تھا اور لکڑی کے ترشے ہوئے پیالے میں بھر بھر کے شراب پی رہا تھا اور بیٹنے کی طرح ڈکار رہا تھا۔

مناف، شوہو کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ اس وقت بھی تلوار اس کی کمر سے لٹکی تھی اس نے میدان کی دوسری جانب اپنے مخالف کے بالکل مقابل اڑھ جمایا میدان اگرچہ کافی بڑا تھا لیکن اس کے دو اطراف سے گہری کھائیں تھیں جن کے نیچے پہاڑی نالے بستے تھے ان گہرائیوں کو دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا اگر خدا نخواستہ ان کھائیوں میں کوئی گر جائے تو اس کی موت لازمی تھی۔

مقابلہ سے کچھ دیر پہلے مذہبی پیشوا اور قبیلہ سردار ایک ساتھ میدان میں آئے ان کے بیٹنے کے لئے سردار کھالیں زمین پر بچھا دی گئی تھیں ان کے بیٹنے کے بعد مقابلہ کرنے

والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ خالی ہاتھ میدان میں آئیں مناف نے تلواریں اٹھ کر دی پر اتارے اس کے جسم پر صرف ایک جاٹھلیا نما لنگوٹ باقی رہ گیا تھا دوسرا پہلوان تو تھا اس نے کمر کے گرد کسی جانور کی کھال لپیٹ رکھی تھی جو اس کے آگے پیچھے سے چھپاتی تھی۔

دونوں مقابلہ کرنے والوں کو الگ الگ اس طرح کھڑا کیا گیا کہ ان کے درمیان سو قدم کا فاصلہ تھا پھر پیشوا نے ہاتھ ہلایا جو مقابلہ شروع ہونے کا اشارہ تھا اشارہ ہو دونوں ایک دوسرے کی طرف بھوکے شیر کی طرح غراتے ہوئے بڑھے قبائلی وحشی جسم اور لمبے قد کا تھا اور اس طرح دونوں ہاتھ آگے کر کے پنجے کھول کے بڑھ رہا وہ اپنے مقابل کی گردن پکڑ کے مروڑ دے گا مناف آگے بڑھتے ہوئے پر سکون تھا تھا وہ وحشی کے مقابلہ میں طاقت کے معاملہ میں بہت کمزور تھا مگر ایک فوجی کی حیثیت اس میں بلا کی چستی اور پھرتی موجود تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ نے قریب پہنچ کے مناف کو پکڑنا چاہا مگر وہ پھل کی طرح تڑپ کے اس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس کی پشت کی طرف پنج کے اس نے وحشی کی پیٹھ پر اس زور کا ماری کہ وہ لڑکھڑا گیا اور زمین پر گرتے گرتے بچا۔

وحشی کا جوابی حملہ بڑا خطرناک تھا اس نے مناف کو دوپٹے کی کوشش کی مناف کے پھر اس کے ہاتھوں کے پنجے سے نکلا مگر وحشی ہوشیار تھا اس نے فوراً اپنے دونوں پنجے کر لئے اس طرح مناف کا جسم تو اس کی گرفت میں نہ آسکا مگر اس کی ایک ٹانگہ کے ہاتھ میں آگئی وہ مناف کی ٹانگہ پکڑ کے اسے کھینچتا ہوا گہری کھائی کی طرف چلا زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا اور ٹانگہ چھڑانے کی کوشش بھی کر رہا تھا وحشی کے دوست کر اسے داد دے رہے تھے دوسری طرف شاہو چیج رہی تھی اور مناف کو گہری کھا خبردار کر رہی تھی مناف نے آخر کھائی کے کنارے پر پہنچنے سے پہلے اپنی ٹانگہ چھڑا طرح خطرہ ٹل گیا۔

لڑنے والوں اور دیکھنے والوں میں بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا وحشی نے کئی بار مناف کی ٹانگہ پکڑی اور کھائی تک ٹھیکٹ کے لے گیا مگر مناف نے خود کو آزاد کرا لیا اور پیٹھ پر کئی بار لاتیں جمائیں مقابلہ جاری تھا اور اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا مگر مقابلہ کا فیصلہ نہ ہو سکا تھا مناف نے بتایا کہ وہ شام ہونے سے پہلے کسی نتیجہ پر چاہتا تھا اس لئے کہ وہ خطرہ مول لے کے خود ہی کھلاڑی کے قریب پہنچ گیا اور وحشی کو موقعہ غراہم کیا کہ وہ اسے دھکیل کے کھائی میں گرا دے۔ وحشی یہ دیکھ کر

ہوا وہ چنانچہ اس نے مناف کو دونوں ہاتھ پھیلا کر کھائی کی طرف رگیدنا شروع کر دیا وہی ہوشیاری سے پیچھے ہٹتا رہا پھر ایک خاص جگہ پہنچ کے وہ چیتے جیسی پھرتی سے دے کر وحشی کے دائیں ہاتھ کے پنجے سے نکلا اور اس کی پشت پر پہنچ کے پوری سے جست لگائی اور اپنی دونوں ٹانگیں وحشی کی پیٹھ پر جمادیں یہ اتنا بھرپور حملہ تھا کہ سنبھل نہ سکا اور منہ کے بل زمین پر گر پڑا اس وقت وحشی کا منہ کھائی کی طرف تھا نے طاقت جمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی اسی وقت مناف نے جست لگا کر دوسرا حملہ وحشی کی تھوڑی دُور سے زمین سے ٹکرائی۔

وحشی لوبان ہو گیا تھا پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی جو مناف نے لات مار کر پادری پھر مناف اسے لاتیں مار مار کر کھائی کے کنارے تک لے گیا اور اسے کھڑا کا موقعہ دیا جب وہ کھڑا ہو گیا تو مناف نے ایک بار پھر دونوں لاتیں اس کے جسم پر وحشی کا رخ مناف کی طرف تھا اور پشت کھائی کی جانب، مناف کے حملے سے وہ لڑ کے پیچھے کی طرف گرا اس نے زمین پر ہاتھ پٹینے کی کوشش کی مگر وہ زمین نہ پکڑ سکا۔ کے ہاتھ کھائی کے کنارے سے ٹکرائے اور اس کا بھاری جسم نیچے گہری کھائی میں گیا کرتے کرتے اس نے ایک خوفناک چیخ ماری جس سے پورا میدان گونج اٹھا یہ اس خری چیخ تھی کیونکہ کھائی میں گر کر اس کی ہڈیاں پسلیاں تک چور چور ہو گئی تھیں۔

چنچا چلا نا مجمع ایک دم خاموش ہو گیا تھا اسے چپ لگ گئی قبیلے والے عام طور پر وحشی ان کے ہوردتھے وحشی اپنے قبیلے کی ناک تھا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایک اوسط بے کاغیر ملکی اس دیو قامت کو کھائی میں دھکیل دے گا۔ ان کے لئے تو یہ ناقابل یقین تھا حادثہ اور سانحہ تھا قبیلہ سردار اور پیشوا بھی ہکا بکا رہ گئے تھے کئی منٹ تک تو لوگوں نے کیفیت تھی جیسے وہ بے جان ہو گئے ہوں بت بن گئے پھر پیشوا نے سر کو جھٹکا دے کر باہوش ہونے کا اظہار کیا وہ اس دنگل یا کشتی کا منصف تھا کشتی ختم ہو چکی تھی اور لوگوں کو اس کا نتیجہ بھی معلوم ہو گیا تھا لیکن اس نتیجے پر پیشوا کے اعلان کی مر لگتا باقی پیشوا کسی طرح کا اعلان بھی کر سکتا تھا وہ کھائی میں گرنے والے کو بھی بھی فاتح قرار دیکھ کسی کو مخالفت کی جرات نہ ہو سکتی تھی۔

آخر پیشوا نے قبیلہ سردار کو حکم دیا کہ وہ چار آدمیوں کے ساتھ کھائی میں اترے اور لی میں گرنے والے کے بارے میں اطلاع دے کیونکہ اصول کے مطابق جب تک ت کھانے والا اپنی شکست تسلیم نہ کرے دوسرے کو فاتح نہیں قرار دیا جا سکتا تھا قبیلہ لانے پیشوا کے اس حکم کو سراہا شاید انہیں امید تھی کہ ان کا پہلوان زندہ ہے اور وہ

واپس آکر پھر مقابلہ کرے گا مگر قدرت پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی قبیلہ سردار نے دا بتایا کہ وحشی پہلوان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور اس کا بھیجہ کھوپڑی آگیا ہے۔

سردار قبیلہ نے وحشی پہلوان کی موت کی تصدیق کر دی اس پر پیشوا نے غیر کم کو کشی کا فاتح قرار دیا اور اعلان کیا کہ آج سے شاہو کو غیر ملکی کی بیوی سمجھا جائے گا۔ بھاگ کے مناف کے پاس گئی اور اس کے سینے سے لگ گئی شاہو کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ وہ بار بار مناف کے منہ کو چوم رہی تھی اور اپنا جذبات سے بھرا سینہ مناف کے رگڑ رہی تھی اس قبیلے میں جیانا نام کی کوئی چیز نہ تھی ہر چاند رات کو بیویوں کی معیا جاتی تھی اور ہر مرد کو دوسری بیوی کے انتخاب کا حق حاصل تھا اس لئے مرد جس سے پسند کرتے اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اسی جگہ یا دو چار قدم ہٹ کے وہ ہنسی مونی منا انہیں ذرا بھی شرم نہ آتی نہ کوئی روکتا اور نہ ٹوکتا سب ہی ایک رنگ میں رنگ جا جس ماحول میں سگی بہن اور ماں جائز ہو وہاں شرم و حیا کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ شاہو اور مناف کو پیشوا نے اپنے پاس بلایا پیشوا کے ساتھ شاہو کا بھائی بھی پیشوا نے مناف کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دی مناف نے شاہو سے قبائلی زبان میں کہ اس نے پیشوا کا شکریہ ادا کیا پھر پیشوا نے اسے بتایا کہ شاہو اس کی بیوی بن چکی۔ شاہو کو اپنی پہلی اور دوسری رات پیشوا اور قبیلہ سردار کے پاس گزارنا ہو گی اس کے غیر ملکی کی بیوی بن جائے گی اس کے علاوہ غیر ملکی کو اس قبیلے سے باہر جانے کی اجازت نہ ہو گی اگر اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو پہاڑیوں پر متعین اسے قتل کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

شاہو نے مناف کو قبیلہ کا یہ اصول پہلے ہی بتا دیا تھا اس لئے مناف نے اس خلاف نہ کچھ کہا اور نہ کسی قسم کے تاثر کا اظہار ہونے دیا پیشوا نے شاہو کو مناف کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی لیکن اسے تاکید کی کہ وہ نصف شب کے قریب جھونپڑے میں پہنچ جائے شاہو نے اس کے حکم پر سر جھکا دیا مگر اب شاہو کا چہرہ پڑما تھا وہ آنکھیں چرا رہی تھی اور مناف نے محسوس کیا کہ شاید رو رہی ہے آنسوؤں قطرے اس کی آنکھوں سے کوشش کے باوجود ٹپک پڑے تھے مناف کو اس کے غم کا کیا تھا لیکن اس نے شاہو کو کوئی تسلی نہ دی اور اسے لئے ہوئے خاموشی سے جھونپڑے پہنچ گیا۔

روز کی طرح شاہو اس رات چمک نہ رہی تھی بلکہ گھٹری بنی ایک طرف پڑا

مناف کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے شاہو کو بتایا کہ وہ جس معاشرے اور ماحول کا باشندہ ہے وہاں کا مرد اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ ہنسنے بولنے بھی دیکھ لے تو دونوں کو یا تو قتل کر دے گا یا پھر خود قتل ہو جائے گا شاہو نے اسے حیران نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس کا مطلب نہ سمجھ پائی ہو پھر مناف نے بڑے جوش سے اعلان کیا کہ شاہو اس کی بیوی ہے اور وہ کسی دوسرے کو یہ اجازت نہ دے گا کہ وہ شاہو کے کنوارے بدن کو ہاتھ بھی لگا سکے شاہو کے لئے وہ جان کی بازی لگا دے گا بشرطیکہ شاہو کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو۔

شاہو اسے پہلے ہی دل دے بیٹھی تھی اس نے جواب میں اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور لگا کہ وہ مناف کے ہر حکم کی تعمیل کرے گی مناف کو اس سے بڑی تقویت پہنچی شاہو کو لڑکی رات کے وقت پیشوا کے جھونپڑے میں جانا تھا اس جھونپڑے کو قبیلے کی تمام عورتیں اور کنواری لڑکیاں جانتی اور پہچانتی تھیں برائے نام شادی شدہ عورتیں ایک شب اس جھونپڑے میں پیشوا کے ساتھ گزار چکی تھیں اور جو کنواری تھیں انہیں اس جھونپڑے کا دل دوقر بیاہی عورتوں نے بتا دیا تھا اور ان کے کان میں یہ بھی پھونک دیا تھا کہ اگر مرنے کے بعد بلاؤں سے نجات حاصل کرنا ہے تو پیشوا کے حکم سے انکار نہ کرنا اور اسے پہلی بے خوش کر کے مرنے کے بعد کی مسرتیں حاصل کر لینا ان حالات میں کوئی لڑکی پیشوا یا بلکہ سردار کے جھونپڑے میں جانے سے کیسے انکار کر سکتی تھی۔

یہ تو شاہو پہلی لڑکی تھی جسے مناف نے بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا مناف نے شاہو کو پیشوا کے جھونپڑے کی طرف روانہ کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر اسے اپنے ملکی شوہر کی خوشی اور خوشنودی منظور ہے تو وہ خود کو پیشوا سے دور رکھے اس کی ترکیب ناف نے یہ بتائی تھی کہ وہ پیشوا کو بہانے بہانے اپنے ہاتھ سے شراب پلاتی رہی یہاں تک کہ پیشوا بالکل بے خود اور بے سدھ ہو جائے اس کے بعد مناف اپنا کام شروع کرے جس کا اس نے شاہو کو کوئی حوالہ نہ دیا تھا۔

شاہو روانگی کے آخری لمحے تک مناف کی باتیں سنتی اور انہیں ذہن نشین کرتی مگر پھر سب مناف نے سرنگ نما جھونپڑے سے نکل کر آسمان پر نظریں دوڑائیں تو ستاروں کے زلزلوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ نصف شب گزرنے والی ہے اس نے شاہو کو باہر لا کر رخصت کیا اور اسے سمجھا دیا کہ وہ پیشوا کے جھونپڑے میں بالکل نہ گہرائے اور نہ اپنے کو نامعسوس کرے شاہو نے اس منزل سے گزرنے کے لئے اپنے دل کو کافی مضبوط کر لیا تھا مگر پہلے وقت وہ گہرا گئی اور اس نے خند کر کے پوچھا کہ پیشوا کے بے سدھ ہونے کے بعد کیا ہو گیا مناف بھی بات کو نہ چھپا سکا اور اس نے بتایا کہ وہ پیشوا کے جھونپڑے

جس دلیس والے چپ چاپ ظلم سہتے رہتے تھے ظلم کا یہ طریقہ ہے کہ اگر اسے نہ روکا جائے تو یہ مظلوم کو بزدل بنا دیتا ہے اور مظلوم ظلم سہتے سہتے اپنی خود داری اور آن بھی کھو جاتا ہے۔ جس قبیلے کے لوگوں کا یہی حال تھا وہ ظلم کے عادی ہو گئے تھے اور بڑی سے بڑی دولت خوشی خوشی برداشت کر لیتے تھے ایک دفعہ جدیس قبیلے کے کسی فرد سے کوئی غلطی ہوئی جس سے شاہ عمیق کو جلال آگیا اس نے اعلان کر دیا کہ آج سے جدیس والوں کی لڑکی یا بیٹی جائے اسے پہلے دولہن بنا کر شاہی محل میں بھیجا جائے وہ پہلے رات عمیق کے دلہن کے طور پر دوسرے دن اس کو رخصت کیا جائے۔

جدیس قبیلے کے لئے یہ حکم ان کی غیرت کی موت کے برابر تھا لیکن وہ ظلم سہتے سہتے بے گناہ ہی بھول گئے تھے چنانچہ انہوں نے دولہنوں کو پہلی رات کے لئے عمیق کے محل میں داخل کر دیا کئی سال تک یہ رواج یا حکم چلتا رہا پھر جدیس قبیلے کی ایک غیرت مند لڑکی غیرت جاگ اٹھی اس نے محل میں جانے سے انکار کر دیا مگر اس کے بے غیرت بھائی اور باپ نے اسے پکڑ کر محل میں پہنچا دیا کہتے ہیں کہ اس دولہن نے عمیق کو سخت بے دریا اور سخت مزاحمت کی مگر کمزور لڑکی کہاں تک مقابلہ کر سکتی تھی آخر عمیق نے اسے اس کی آبرو چھین لی اور صبح کو اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔

جدیس کی وہ دولہن جس کا سب کچھ لٹ گیا تھا مگر اس سے غیرت کا احساس کوئی نہیں ہوتا تھا وہ گرتی پڑتی تباہ حال اور دریدہ لباس اپنے محلے میں پہنچی اور بازار کے چوراہے پر گھومنے لگی کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو آواز دی لوگ اس کے گرد جمع ہوئے تو اس نے ان سے لگاتار کہتے ہوئے کہا۔

”اے قبیلہ جدیس کے بے غیرت لوگو! آؤ میرے پچھے کپڑے دیکھو، میرے جسم پر وہ نشان تلاش کرو جو ظالم عمیق نے لگائے ہیں اور اس عصمت اور آبرو کو دیکھو جو عمیق نے میری شہمت سے چھین لی ہے“

کہتے ہیں کہ اس بے غیرت دولہن نے ایک چم ماری اور اپنے پچھے ہوئے کپڑوں کو پورے پلے کے سامنے تار تار کر کے برہنہ ہو گئی اور اعلان کیا وہ اس وقت تک اپنے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ڈالے گی جب تک عمیق سے اس ظلم کا بدلہ نہیں لیا جائے گا اس نے اس قدر بدست و قرار کی کہ جدیس کی برسوں سے سوئی ہوئی غیرت جاگ اٹھی کہاں تو ان کا یہ ساق کا کہ جب وہ برسرِ اقتدار قبیلہ قسم کے کسی شخص کو آتا دیکھتے تو اس کے راستے چھوڑ دیا ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور کہاں ان کو ایسا جلال آیا کہ انہوں نے نکواریں بھیجیں اور عمیق کے محل پر حملہ کر دیا عمیق کے محافظوں اور اس کی فوجوں نے جدیس

کے پاس ہی موجود رہے گا اور جب پیشوا بے سدھ ہو جائے گا تو وہ جھوپڑے میں کے شاہ کو اپنے ساتھ لے آئے گا اور وہ دونوں اس وقت بھاگ کھڑے ہوں گے۔ شاہ کو یہ منصوبہ تو پسند آیا مگر اس نے یہ اعتراض کیا کہ جب یہاں سے بھاگتا ہے تو پھر وہ پیشوا کے جھوپڑے میں کیوں جائے اور ابھی کیوں نہ فرار ہونے کی کوشش کرے مناف کو شاہ کی سادہ لوحی پر ہنسی آگئی اس نے شاہ کو بتایا کہ پیشوا اس قدر وقوف نہیں کہ وہ شاہ اور اس نے غیر ملکی شوہر کو بھاگ جانے کا موقع دے اس کے پیچھے ضرور آدی لگا رکھے ہوں گے جنہیں حکم ہو گا کہ اگر شاہ وہاں جانے سے کہے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گرفتار کر لیا جائے اور مزاحمت کی صورت میں کر دیا جائے شاہ اپنے ہونے والے شوہر کی عقلمندی کی قائل ہو گئی اور اس سے ہوئے رخصت ہوئی۔

مناف کا اندازہ درست تھا شاہ کچھ ہی دور چلی تھی کہ اسے قبیلہ سردار یعنی بھائی ادھر آتے ہوئے ملا اس کے ساتھ کئی مسلح آدمی تھے شاہ کو آتے دیکھ کر وہ بہت ہوا اور اس کے ساتھ پیشوا کے جھوپڑے تک گیا پیشوائے شکار کے انتظار میں جم کے باہر ہی ٹھہر رہا تھا قبیلہ سردار نے شاہ کو پیشوا کے حوالے کر دیا پیشوائے اسے دے کر رخصت کیا اور شاہ کو لے کر سرنگ نما جھوپڑے میں اتر گیا جھوپڑے کے لکڑی کے تنکوں کے اندر شراب بھری رکھی تھی پینے کے لئے لکڑی ہی کے پیالے قبائلی ذرخت کے تنے کے کئی ٹکڑے کر لیتے پھر انہیں اندر سے کھوکھلا کر کے پیالے بناتے تھے۔

کسی نکواری لڑکی کا شادی کی پہلی رات مذہبی پیشوا کے ساتھ اور دوسری رات کے سردار کے ساتھ گزارنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور عام حالات میں اسے مذہب کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا لیکن تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت انسان نے لڑکیوں کی عزت سے کھینچنے کے لئے ہر دور میں مختلف جھگڑے استعمال کئے ہیں کسی قبیلے میں مذہب کا لبادہ اوڑھ کر عورت کی عصمت کا مذاق اڑا گیا تو کسی جگہ دولت اور اقتدار کے زور پر عورت کی عصمت کا نیلام ہوا عرب میں نور اسلام کے پھیلنے کی ایسی ظلمت کا راج تھا جس میں دنیا کا ہر عیب جائز تھا اس ضمن میں ظلمت کدہ عز وادشاہ عمیق کا نام بہت مشہور ہوا۔ بادشاہ عمیق کی حکومت مکہ اور مدینہ کے درمیان کے علاقہ پر تھی اس علاقہ میں عربوں کے دو قبیلے قسم اور جدیس آباد تھے عمیق قسم بادشاہ تھا بڑا ظالم اور حد درجہ کا عیاش تھا جدیس قبیلہ کی طاقت قسم والوں سے کم

شاہو نے ہمت کی بڑھ کے لوہے کی سلاخ اٹھائی اور اس کی نوک پیشوا کے سینے میں
 مار دی۔ پیشوا کے جسم میں ہلکی سے حرکت پیدا ہوئی شاہو سلاخ پر زور دینے پیشوا پر جھکی
 فی اس نے سلاخ پر اور وزن ڈالا پھر سلاخ کو باہر کھینچا اس کے ساتھ ہی پیشوا کے سینے
 سے خون کا فوارہ ابل پڑا شاہو کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور وہ سلاخ وہیں پھینک کر
 ہر کی طرف بے تحاشہ بھاگی۔

”تو میرے آقا میرے سپہ سالار! یہ ہے وہ شاہو جسے میں پیشوا کے جھونپڑے سے لے
 رہا ہوں تو اب تک بھاگتا ہی رہا ہوں، میں نے پیچھے کی طرف مڑ کے بھی نہیں دیکھا“
 ہاں نے اپنی داستان کو ختم کیا۔

سپہ سالار توران شاہ اس واقعہ سے متاثر ہوا اس نے حکم دیا ”اس جنگی لڑکی ہمت
 ردقاری دونوں ہی قابل داد ہے۔ اسے ننلا دھلا کر لباس پہنایا جائے پھر پیردار مناف
 سے اس کا نکاح پڑھایا جائے“

سپہ سالار کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ لشکر کے ساتھ بار برداری کا کام کرنے والے
 زورداروں کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی تھے ان سے شاہو کے لئے لباس لیا گیا ہے اور
 ی عورتوں نے شاہو کو ننلا دھلا اور کپڑے پہنا کر لشکر میں بھیج دیا۔ ہر لشکر کے ساتھ
 مٹی چلتے تھے جن کا شمار لشکر میں کیا جاتا تھا قاضی نے شاہو اور مناف کا نکاح پڑھایا سپہ
 سالار توران شاہ خود شاہو کا سرپرست بنا اور ایک باپ کی طرح شادی کی تمام رسومات میں
 ریک ہوا شاہو نے مذہب اسلام قبول کر لیا اور اس کا اسلامی نام شازیہ رکھا گیا۔

توران شاہ نے شہر بنانے کا حکم تو دے دیا تھا اور اس کے لئے سڑک کی تعمیر بھی
 روک ہو گئی تھی لیکن ایک تو سڑک کی تعمیر میں حبشی روزانہ رخنہ ڈالتے تھے دوسرے
 مانے پینے کا جو ذخیرہ توران شاہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا خیال یہ تھا
 کہ جنوب میں پہنچ کے پھر سامان جمع کر لیا جائے گا لیکن جس علاقے میں لشکر خیمہ زن تھا
 لا اور اس کے ارد گرد سوائے مکئی کے اور کسی اناج کی کاشت نہ ہوئی تھی حبشیوں کی
 رف مکئی غذا تھی اور اسی پر ان کی گزر ہوتی تھی اس طرح توران شاہ کا یہ خواب دھرا رہ
 یا کہ وہ جنوب میں ایک بڑا شہر آباد کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کرے گا گرم خشک
 بد ہوا ملکوں تک پانی کا پینہ نہ ہونا اس پر اناج پیدا نہ ہونا ان باتوں کی وجہ سے توران
 کا دل اچاٹ ہو گیا اس نے لشکر کے سرداروں سے مشورہ کیا سرداروں کا متفقہ فیصلہ یہ
 کہ یہ مقام رہنے کے قابل نہیں اس لئے پورے سال صرف مکئی پر گزر کرنا حبشیوں کے
 لئے ممکن ہے مگر اس کا لشکر صرف مکئی پر گزر نہیں کر سکتا۔

والوں کو روکنے کی ہمت کوشش کی لیکن وہ آندھی اور طوفان کی طرح قسم کے
 دھکیلتے ہوئے اس کے محل میں داخل ہو گئے اور جب تک عمیق کے ٹکڑے ٹکڑے
 دیئے انہوں نے محل کو نہیں چھوڑا۔

وہ عمیق تو اپنے انجام کو پہنچ گیا لیکن عمیق تو ہر زمانے اور ہر قوم میں
 ہیں اور آج بھی ملکوں ملکوں عمیق پائے جاتے ہیں یہ دڑیرے، زمیندار، تعلقہ دار
 داران میں کوئی نہ کوئی عمیق ضرور ہوتا ہے جو پیسے یا اقتدار یا مذہب کی آڑ میں
 ڈولیاں روک لیتا ہے پھر جب غریبوں اور مظلوموں کی غیرت جاگتی ہے تو وہ ان
 بھی وہ حشر کرتے ہیں جس سے عرب کا بادشاہ عمیق دو چار ہوا تھا۔

خیر یہ قصہ تو ایک جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہوا اصل حال تو شاہو کا بیان
 مناف کے سمجھائے ہوئے منصوبے کے تحت شاہو نے پیشوا کو بھر بھر کر شراب
 دینا شروع کئے ایک دو، آٹھ دس بارہ، پیشوا کا پیٹ تھا کہ مکہ، شاہو نے پیالے
 شراب کا پورا مکہ خالی کر دیا لیکن پیشوا اتنی پینے کے باوجود نہ تو بے سدھ ہوا
 نے پینے سے انکار کیا اب تو شاہو کو ہول اٹھنا شروع ہو گئے وہ اس خیال سے
 رہی تھی کہ اگر پیشوا بے سدھ نہ ہوا تو کیا ہو گا شاہو نے گھڑے سے پیالے
 کئے پیشوا تین پیالے اور پی گیا پھر اس نے شاہو کو ہاتھ ہلا کر منع کیا۔

شاہو نے ہاتھ روک لیا اور یہ انتظار کرنے لگی کہ پیشوا بے سدھ ہو کر گر
 جھونپڑے سے نکل کے مناف کے پاس پہنچ جائے جھونپڑے کے منہ پر جلتی
 تقریباً ”بجھ چکی تھی لیکن کسی کسی وقت کوئی لکڑی شعلہ کی طرح جل اٹھتی اور
 میں اجالا پھیلا جاتا آخری بار بجوں کی چاند کی مدھم روشنی بھی جھونپڑے کے چو
 سوراخوں سے اندر آ رہی تھی اسی روشنی میں پیشوا ایک بھوت کے بیولے کے
 طرف بڑھ رہا تھا شاہو سمنٹی جاری تھی اور دہشت سے اس کے جسم پر لرزہ پید
 شاہو ہٹے ہٹے سرنگ کی دیوار سے جا لگی اور پیشوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

شاہو کا بدن جیسے سن پڑ گیا پیشوا کا ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا شاہو کو
 صورت نظر نہ آ رہی تھی پھر پیشوا کا ہاتھ اس کے سر سے مس ہوا اور شاہو کو چپ
 اس نے آنکھیں بند کر لی اور پوری طاقت سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے پیشوا کے
 ایک بھرپور لات ماری اس کے ساتھ ہی کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی
 گھبرا کے آنکھیں کھول دیں پیشوا اس کے سامنے فرش پر چت پڑا تھا شاہو نے
 نظریں دوڑائیں ایک لوہے کی سلاخ کھڑی تھی جس کا سر اٹھس کر نوک لایا گیا تھا

توران شاہ نے سڑک تعمیر کرنے کا حکم واپس لے لیا اور شرکی تعمیر کا خیال نکال دیا اس وقت تک کئی سو حبشی غلاموں کا ایک پورا قافلہ لشکر کے ساتھ تھا۔ قاهرہ واپسی کا حکم دیا تو حبشی غلاموں کا ایک پورا قافلہ لشکر کے ساتھ تھا۔ توران شاہ شازیہ اور مناف کی رہبری میں اس عجیب و غریب قبیلے میں پہنچا قبیلہ وا مزاحمت کی کوشش کی کچھ مارے گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے گرفتار ہونے والے شازیہ کا بھائی بھی تھا۔

شازیہ کا بھائی چونکہ قبیلہ کا سردار تھا اس لئے اسے سپہ سالار توران شاہ کے پیش کیا گیا سپہ سالار نے اسی وقت مناف اور شازیہ کو بھی بلوا لیا بھائی بمن کی آنکھ بھائی بمن کو پورے لباس میں دیکھ کر حیران رہ گیا توران شاہ نے بھائی کو شازیہ سے اجازت دے دی شازیہ نے اس سے قبیلہ سے بھاگنے سے لے کر مناف سے شادی تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دیئے بھائی اپنی بمن کے حالات سن کر بہت اور بمن کی ترغیب پر وہ بھی مسلمان ہو گیا توران شاہ نے اسے اپنے لشکر میں شادی کے قبیلے کے زندہ بچنے والے تمام لوگ گرفتار ہوئے تھے شازیہ اور اس کے سفارش پر انہیں رہائی دے دی گئی انہیں پیشتر مسلمان ہو کر یا تو لشکر میں ملازم ہو سستی میں واپس چلے گئے وہ چند مسلمانوں میں رہے تھے ان کے طور طریق دیکھنے پر انہوں نے توبہ کر لی اور نیک زندگی گزارنے لگے۔

قاهرہ واپس پہنچنے کے توران شاہ نے اپنے وزیر اعظم بھائی کو لشکر کشی کی پوری بتائی آخر میں اس نے کہا کہ پانی کی شدید کمی اور اناج کی نایابی کی وجہ سے وہ علاقہ کے قابل نہیں اور نہ اسے آسانی سے ترقی دی جاسکتی ہے یہ مہم اگرچہ ناکام ہو لیکن توران شاہ کے ساتھ غلاموں کی کثیر تعداد گرفتار ہو کے آئی تھی ان سب کاموں میں لگایا جو آئندہ چل کے مفید شری ثابت ہوئے۔

صلاح الدین کے سلسلے میں یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مغربی مور اگر مسلمان مشاہیر کے حالات ترتیب دینے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے لیکن لئے ہر وہ مسلم بادشاہ سردار یا فاتح قابلِ مذمت ہے جس کا عیسائیوں سے سابقہ پڑا الدین چونکہ مجاہد اعظم اور سلبی جنگوں کا ہیرو بنے اس لئے اس کی برائی کرنا زبان نہیں تھکتی۔ صلاح الدین نے شمالی افریقہ میں طرابلس اور برقعہ پر قبضہ کے روانہ کی اور اس میں کامیابی حاصل ہوئی تو مغربی مورخ نے لکھ دیا کہ مہم تو مصروف رکھنے اور مال اکٹھا کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔

صلاح الدین نے توران شاہ کو سوڈان بھیجا تو انہوں نے لکھ مارا کہ صلاح الدین کو نور الدین کے لشکر سے بچنے کے لئے ایک محفوظ جائے پناہ چاہئے تھی اور سوڈان چونکہ قاهرہ دور اور غیر آباد علاقہ تھا اس لئے اس نے فتح کرنے لشکر بھیجا گیا تھا توران شاہ واپس آیا انہوں نے فوراً ٹکڑا لگایا کہ سوڈان ویران جگہ تھی اس لئے صلاح الدین نے اسے اپنی جگہ نہیں بنایا عرض یہ کہ وہ صلاح الدین کی کسی مہم کو "جہاد" نہیں کہتے حالانکہ جہاد ہی کا مقصد زندگی تھا اور اس کے لئے وہ بستر مرگ تک کوشاں رہا سلطان نور الدین زندگی کا صلاح الدین کی طرف سے صاف ہو گیا تھا یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ سلطان نے مصلحتاً "ح الدین کی فتوحات اور جہاد کی اجازت دی تھی کیونکہ دونوں کے تصادم کی صورت میں انہیں کہہ سکتا تھا کہ کس کو فتح حاصل ہوگی۔

مصر کے دار الحکومت کو مسلم فرمانرواؤں نے جنوب سے شمال مشرق کی طرف کئی بار آباد کیا موجودہ دار السلطنت قاهرہ کو قاهرہ بننے تک کئی مرحلوں اور ناموں سے گزرنا پڑا ملک میں پہلا اسلامی دار السلطنت الفسطاط تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت میں مصر کو مشہور دانشور اور سپہ سالار عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے زمانہ 641ء میں فتح کیا تھا انہوں نے فسطاط کے مقام پر اپنی لشکر گاہ قائم کی تھی پھر جب بن العاص، سکندریہ فتح کرنے چلے اور انکے لشکر نے خیمے اکھاڑنا شروع کئے تو انہیں بتایا ایک خیمہ میں کبوتر نے انڈے دیئے اور ان سے بچے نکل آئے ہیں عمرو بن العاص نے دیا کہ اس خیمہ کو بالکل نہ چھیڑا جائے چنانچہ لشکر روانہ ہو گیا اور وہ خیمہ اسی طرح رہا۔

جب عمرو بن العاص فتح سکندریہ سے واپس آئے تو خیمہ اس طرح موجود تھا خیمہ کو میں فسطاط کہتے ہیں اس لئے عمرو بن العاص نے پھر وہیں قیام کیا اور ایک شہر آباد کیا ان کا نام الفسطاط رکھا گیا۔

مصر کا دوسرا دار السلطنت "الشکر" بنا لشکر کی بنیاد ایک عباسی جنرل نے 750ء میں لایا کیونکہ اس جنرل کے لشکر نے اس مقام پر قیام کیا تھا۔

پھر اس کے تقریباً سو سو سال بعد ابن طولون نے 869ء میں الفسطاط کو دار السلطنت جو شمال مشرق میں تھا یہ دار السلطنت پورے سو سال تک قائم رہا اس کے ٹھیک ایک اہم فاطمی خلافت قائم ہوئی اور فاطمی خلیفہ کے جنرل جوہر نے مصر کو فتح کیا فاطمیوں کا اور صدر مقام قیرواں میں تھا جوہر نے اپنے خلیفہ کی رہائش کے لئے ایک شہر آباد کیا

دھوکہ دیا ہو جائیں اور یہ فیصلہ، فیصلہ شہر کا کام دے۔ اس لئے اس نے کوہ مقطم مغربی پہاڑیوں پر ایک قلعہ قصر الجبل کے نام سے تیار کرنے کا منصوبہ بنایا وہ چاہتا تھا کہ قلعہ حکومت کا مرکز اور ایک ایسی فوجی چھاؤنی بن جائے جو شہر کی نگرانی اور بیرونی دفاع کا کام کرے صلاح الدین نے قلعہ تو بنایا لیکن پورا منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔

سودان کی مہم کے اگلے سال یعنی 1174ء کے آغاز میں صلاح الدین کے شیر دل بیٹے شمس الدولہ توران شاہ نے بھائی کے سامنے یمن پر فوج کشی کا منصوبہ پیش کیا پہلے کیا جا چکا ہے کہ قاہرہ میں ملک یمن کا ایک شاعر اور مورخ عمارہ رہتا تھا جس نے اب الدین کے خلاف فاطمی شہزادوں اور سودانیوں کا ساتھ دیا تھا عمارہ نے اپنے ملک یمن ازخیزی خوشحالی اور خوبصورتی کے بارے میں بے شمار شعر کہے تھے ان اشعار کو صلاح الدین اور توران شاہ نے بھی سنا تھا توران شاہ کے دل میں یمن فتح کرنے کا خیال عمارہ کے دامن سے ہی پیدا ہوا تھا۔

صلاح الدین نے بھائی کے منصوبہ پر غور کیا اور اسے اجازت دے دی توران شاہ نے ناکامی کی مہم کے لئے زبردست تیاری کی پھر فروری 1174ء میں مکہ معظمہ کی طرف لشکر نکرا، کربلا صلاح الدین کی فتوحات اور اس کے بھائی بھتیجیوں اور بیٹیوں کی بہادری کا شہرہ بے غرب میں پھیل چکا تھا جب توران شاہ کا عظیم لشکر مکہ کے قریب پہنچا تو عرب کے مشہور سردار نے اس کا ایک منزل آگے بڑھ کر استقبال کیا توران شاہ اور عرب سردار لشکروں نے یمن پر بھرپور حملہ کیا یمنیوں نے بھی حتی الامکان مزاحمت کی مگر زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکے کچھ بھڑپوں اور ایک ایک جنگوں کے بعد توران شاہ نے زبدہ، جندہ نا اور صفاء پر قبضہ کر لیا باقی قلعے بھی اسی سال فتح کر لئے گئے توران شاہ نے تاتار کو حکومت اور دو سال تک وہاں حکومت کر کے مصر لوٹ گیا۔

صلاح الدین ایک طرف دور دراز علاقوں میں فتوحات کے لئے لشکر بھیج رہا تھا دوسری طرف مصر میں اس کے خلاف یکے بعد دیگرے سازشیں ہو رہی تھیں صلاح الدین کے فوج جس قوم نے سب سے زیادہ بغاوتیں کیں وہ سودانی تھے جو شکست کھانے اور معافی مانگنے کے بعد پھر نئے انداز سے سازش کرتے رہتے تھے صلاح الدین کے خلاف وہ سازش تازہ دست تھی جس کا سرغنہ شاعر عمارہ یعنی تھا عمارہ نے مصریوں، سودانیوں پر دشمنی کے ساتھ ایثارک اور شاہ متقیہ کا تعاون حاصل کیا کسی کو دولت کا لالچ دیا کسی کو حکومت کا لالچ دیا کسی کو بھڑپوں اور بری دونوں جانب سے صلاح الدین پر وار کیا جائے سازش بڑی مہم تھی اگر خدا نخواستہ سازش کامیاب ہو جاتی تو مصر کا نقشہ ہی بدل جاتا لیکن جس کو

اور اس کا نام قاہرہ رکھا۔
قاہرہ کی بنیاد کے لئے ایک روایت بہت مشہور ہے جسے تاریخی حیثیت حاصل ہے روایت کچھ اس طرح ہے کہ 358ء یعنی 969ء میں فاطمی جنرل جوہر متقی کے بعد 17 شعبان 358ء یوم سہ شنبہ یعنی فسطاط کی تعمیر سے 337ء سال بد علو یمن عبدین کے لئے جدید شہر منصورہ المحصورہ کی بنیاد ایک زاغ صحرائی کے جہیز اشارہ پر رکھی جوہر نے یہ فیصلہ کیا تھا شہر کی بنیاد کے ساتھ دارالامارہ مدارس شافعی مسجد دارالقضاء دفن کے سنگ بنیاد ایک ہی وقت میں رکھے جائیں گے اس کے لئے جھنڈیوں میں ڈوری باندھ کے گھنٹیاں لٹکا دی گئیں کہ ساعت مسعود پر جب گھنٹیاں بجیں تو ہر جگہ سنگ بنیاد نصب کرنا شروع کر دیئے جائیں اس فیصلے کے مطابق مسعود پر جب گھنٹیاں بجیں تو سنگ بنیاد رکھنا شروع کر دیئے گئے تعمیر کا کام زور شروع ہو گیا فاطمی خلیفہ معزالدین اللہ کی آمد کے دن قریب آ رہے تھے اس عمارتیں وقت سے پہلے بن کر تیار ہو گئیں۔

کہتے ہیں جنرل جوہر متقی معنوم تھا شاید اس کو یہ طریقہ پسند نہ آیا تھا یا یہ طرح کی عمارتیں بنوانا چاہتا تھا اس میں کچھ کمی رہ گئی تھی اسے اس شہر کا مجوزہ منصورہ المحصورہ بھی پسند نہ تھا آخر جب فاطمی خلیفہ مصر پہنچا اور اپنے جنرل جوہر بنائے ہوئے دو محلوں میں سے ایک محل میں ٹھہرا تو اس نے زانچہ بنایا خلیفہ مفرات علم الافلاک اور علم نجوم کا ماہر تھا اس نے زانچہ دیکھ کر کہا کہ اس وقت آفتاب میں ہے اور سلطان فلک مرخ ہے جو قاہرہ آسمان ہے اس لئے شہر کا نام منصورہ الح بجائے قاہرہ رکھا جائے جوہر متقی یہ نام سن کر پھڑک اٹھا اور اس کی تعمیلی ختم ہر طرح یہ نیا شہر منصورہ کے بجائے قاہرہ کے نام سے مشہور ہوا۔

مصر کی مشہور یونیورسٹی جو تمام عالم اسلام میں مشہور ہے یعنی جامعہ ازہر اب بھی اسی فاطمی جنرل نے رکھی تھی دراصل جوہر متقی نے اس شہر کی بنیاد بغداد رکھی تھی اس نے شہر کے وسط میں دو محل بنوائے تھے فاطمی خلیفہ نے جب قاہرہ دار الخلافہ بنایا تو وہ ان میں سے ایک قصر جس کا نام قصر کبیر تھا میں رہنے لگا قصر آئندہ تمام فاطمی خلیفہ رہائش پذیر رہے تھے۔

تمام مشرقی حکمران فن تعمیر کا ذوق رکھتے تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے خلا نے بھی فن تعمیر میں دلچسپی لی اس نے چاروں دارالحکومتوں کو ملانے کی کوشش انضباط العساکر انتظامی اور قاہرہ کے گرد ایک فیصلہ بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ

انے پوری قوت لگا دی لیکن اسکندریہ کی فوج کو شہر سے اتنی مدد حاصل ہو گئی تھی
انے نہ صرف حملہ روک لیا بلکہ دوپہر کے بعد جوابی حملہ کیا حملہ آور کو جوابی حملے
فوج نہ تھی انہیں یقیناً حیرانی ہوئی ہوگی دوپہر سے شام تک شدید جنگ ہوتی رہی اور
معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں طرف کے لشکر نے زمین میں اپنے قدم گاڑ دیئے ہیں اور
انچ پیچھے نہیں ہٹتے ہیں۔

شام کے وقت اسکندریہ والوں کو غیبی مدد اس طرح حاصل ہوئی کہ وہ ہر کارہ بنے
یہ سے وزیر اعظم کے پاس قاہرہ بھیجا گیا تھا وہ اس خبر کے ساتھ واپس آیا کہ
ہم ایک لشکر کے ساتھ اسکندریہ کوچ کر چکے ہیں اور بس کسی دم پہنچنے والے ہیں اس
نے اسکندریہ کے محصورین میں جیسے روح پھونک دی انہوں نے سنبھل کے ایسا
ت حملہ کیا کہ دشمن کے پیر اکھڑ گئے اور سامان حرب چھوڑ کے پسا ہونا شروع ہوا
ان نے حملہ آوروں کی یقینیت اور دبا بے جلا دیئے اور انہیں بحر روم کی لہروں میں
دبا عقیدہ والوں نے بھاگ کے جان بچائی اور جہازوں پر سوار ہو کے ایسے غائب
ہو گئے کہ سر سے سینک۔

اب رہے کہ یہ باغیوں کی طرح سے اقتدار حاصل کرنے کی دوسری بڑی کوشش تھی
شش کاسرغہ سوڈانی واروغہ محلات نجاہ تھا اس نے بھی مصریوں اور شاہ یرد شلم کو
لے کے اقتدار پر قبضہ کی کوشش کی تھی لیکن ہباء الدین قراقوش نے وزیر اعظم کو اس
کی اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں کئی سردار معہ نجاہ کے قتل کر دیئے گئے اس
سازش کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ختم کر دی گئی مگر اس دفعہ سازشیوں نے شاہ
کے علاوہ شاہ عقیدہ (سلی) کو بھی سازش میں شریک کیا تھا مگر یہ سازش بھی ناکام ہو
سازش کے تمام کرتا دھرتا لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

اللہ رکھے اسے کون چکھے قدرت کو صلاح الدین سے ابھی بہت بڑے بڑے کام لینا
کے دشمنوں کی ناکامی کے اسباب خود انہیں کے ہاتھوں پیدا کر دیئے۔

عمارہ کو شاہ عقیدہ اور شاہ یرد شلم نے اپنی مدد کا پورا یقین دلایا تھا لیکن کہتے ہیں
کا دل کتا، وہ اب بھی گھبرا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون
ہو جائے چنانچہ اس نے ایک عالم دین کو اپنے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا وہ خود عالم
گھر گیا اور سازش کے تمام پہلو اس کے سامنے کھول کے رکھ دیئے عالم دین نے
اگر اس نے سازش میں شریک ہونے سے انکار کیا تو یہ لوگ اسے یقیناً قتل کر دیں
اس نے سازش کو خوب سراہا اور اپنی طرف سے ہر تعاون کا وعدہ کیا اسے دکھائے
عالم دین نے کچھ ایسے کام بھی کئے جس سے سازشیوں کو یقین ہو گیا کہ عالم دین
سازش میں شریک ہے اور ہر قدم پر ساتھ دے گا۔

عالم دین نے انہیں دھوکے میں رکھا اور ایک رات دارالوزارت پہنچا اور وزیر
صلاح الدین کو پوری سازش سے آگاہ کر دیا صلاح الدین نے عالم دین کو تو حفاظت
کے گھر پہنچا دیا اور سازش کی اپنے طور پر تحقیق کی تو عالم دین کی باتوں کی تصدیق
اب صلاح الدین نے ایسا انتظام کیا کہ سازشیوں کے پورے گروہ کو اچانک چھاپ
گرہنار کر لیا سازشیوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان کا راز کس نے شست ازبام
صلاح الدین کے حکم سے ان تمام لوگوں کی گروہیں اڑا دی جو اس سازش میں شریک
کچھ اور لوگ بھی گرفتار ہوئے تھے جن پر جرم ثابت نہ ہو سکا انہیں قتل تو نہیں کیا
وہ قاہرہ بدر کر دیئے گئے جلا وطن ہونے والوں میں مصری، سوڈانی اور کچھ ترکمان بھی
قاہرہ میں تو یہ ہوا ادھر شاہ یرد شلم کو جب سازش کی ناکامی کا علم ہوا تو اس
لشکر کو مصر کی طرف کوچ کرنے سے روک دیا اس طرح وہ تو بچ گئے لیکن شاہ

سازش ناکام ہونے کی خبر نہ مل سکی اور اس نے 282 جہازوں کا ایک بحری بیڑہ
کی مدد کے لئے اسکندریہ روانہ کر دیا اسکندریہ پر یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ
شدید مزاحمت کے باوجود عقیدہ کی فوج خشکی پر اتر گئی اور اس نے سنبھلتوں اور دبا
شہر کی دیوار پر حملے شروع کر دیئے اسکندریہ کی فوج کو حملہ آوروں کو پسا کرنے
عرق ریزی کرنا پڑی بہر حال انہیں پسا کر دیا گیا لیکن اسکندریہ والوں کا کافی نقص
دوسری صبح حملہ آوروں نے پھر زبردست حملہ کیا اور اپنی سنبھلتوں اور دباؤں کو شہر
کے اور قریب لے آئے خوش قسمتی سے دوسرے دن فوج کو شہر والوں کی طرف
اور حملہ آوروں کو پھر پسا کر دیا گیا تیسرے دن اسکندریہ والے سنبھل چکے تھے

میں نام پیدا کیا تھا پھر اس کے بیٹے سلطان نور الدین زنگی نے نصرانیوں کو ناکوں پہنے
پناہ۔ عماد الدین زنگی کے قتل پر زنگی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ موصل میں
نور الدین زنگی کے بڑے بیٹے سیف الدین غازی نے حکومت بنائی اور حلب کو دارالسلطنت
کر نور الدین زنگی نے حکومت قائم کی جو آگے چلی موصل کی حکومت سے بہت آگے نکل
گئی کیونکہ نور الدین زنگی نے دمشق فتح کر کے ملک شام کی سب سے بڑی حکومت بنائی
کی۔

نور الدین باوجود ایک بڑی حکومت کا سلطان ہونے کے اپنی ذاتی زندگی میں بڑا قانع اور
فایت شعار تھا۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ نور الدین نے حکومت کے بیت المال
کا ایک پیسہ نہیں لیا۔ اس سلسلے میں نور الدین اور اس کی بیوی جو سلطانہ کلماتی تھی کے
میان ایک موقع پر مکالمہ ہوا وہ قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے تحریر کیا جاتا

سلطان دمشق کے قصر کبیر میں رہتا تھا لیکن اس کی بیگم کی یہ حالت تھی کہ اس کے
چارہ جوڑے کپڑوں کے علاوہ پانچواں جوڑا نہ تھا۔ کسی تقریب کے موقع پر بیگم نے
بیت غازی سے سلطان سے عرض کیا۔ ”جہاں پناہ اگر تقریب میں پہننے کے لئے دو
لے کر لے جانے کا حکم صادر فرمایا جائے تو عین نوازش ہوگی۔“
نور الدین نے ذرا توقف کے بعد کیا۔ ”بیگم، چار پانچ ماہ پہلے تم نے دو جوڑے بنوائے
تھے کیا ہوئے؟“

بیگم نے انک کے جواب دیا۔ ”میں نے وہ دو جوڑے اس وقت بنوائے تھے جب پچھلے
لے پہل کے چھترے ہو گئے تھے۔ آخر میں ملک شام کی ملکہ ہوں۔ مجھے سلطانہ کہا
ہے۔ عام دنوں میں نہ سہی لیکن تقریب کے موقع پر تو مجھے نیا جوڑا پہننا چاہیے۔“
”یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ میری آمدنی محدود ہے۔ اسی میں سب کچھ کرنا پڑتا
ہے۔“ سلطان نے متانت سے جواب دیا۔

سلطان کو اور زیادہ طیش آیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آخر آپ دن رات محنت
کرتے ہیں۔ جنگ میں فوج کے آگے چلتے ہیں تو کیا اتنے بڑے شاہی خزانے پر میرا کوئی حق
ہے؟“

”بیگم، تمہارے سوچنے کا یہ انداز غلط ہے“ سلطان نے سرزنش یا سمجھانے کے انداز
کا۔ ”تمہاری فوج پر نہ تمہارا حق ہے اور نہ میرا۔ یہ تو ضرورت مند مسلمانوں کا بیت
مقدس ہے اسے صرف ملک کی حفاظت یا رعایا کی بھلائی پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔“

زنگی سلطنت کا خاتمہ

سلطان نور الدین زنگی کی وفات کا جس قدر غم کیا جائے وہ کم ہے۔ سلطان کی وفات
دنیا کی بے ثباتی کا ایک عین ثبوت ہے۔ مشہور ہے کہ ۶ مئی کو وہ احباب میں بیٹھا دنیا
نپا سیداری اور بے ثباتی پر بڑے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور اس کے صرف نو
بعد یعنی ۱۵ مئی ۱۱۷۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملہ اور اپنے پیچھے بے ثباتی عالم کی مثال
چھوڑ گیا۔ سلطان صرف مسلمانان عالم ہی میں محبوب نہ تھا بلکہ اس کے سخت مخالفین اور
یورپی مورخین بھی اس کے صفات کی تعریف کرتے ہیں۔
ولیم آف ٹائمرز کہتا ہے۔۔۔

”نور الدین منصف مزاج، دانشمند اور دیندار

شہزادہ تھا لیکن نصرانیوں کے معاملہ میں سخت کوش اور جابر تھا۔“

تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد مرز
حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سوا سلطان نور الدین زنگی اس وقت کے تمام مسلم حکمرانوں
عظیم تھا۔ عباسیوں کی عظیم سلطنت جب مفاد پرستی، خود غرضی اور عیش و عشرت کے
کمزور ہوئی تو پہلے آل جویہ نے مسلمانوں کی عظمت کو سنبھالا دیا پھر آل سلجوق برسر اقتدا
آئے پھر جب ملک شاہ سلجوق کے بعد سلجوقی شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ایک
خاندان میدان سیاست میں ابھرا۔ یہ خاندان دراصل سلجوقی دربار کے غلاموں کا تھا
اقابک کے نام سے مشہور ہوئے۔

ان غلاموں میں ایک غلام نے خوارزم شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کے بادشاہ
الدین خوارزم شاہ اور منگول حملہ آور چنگیز خان میں جنگ ہوئی تھی۔ ایک دوسرے غلام
عماد الدین زنگی نے موصل میں ایک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ امیر عماد الدین نے صلیبی جنگوں

اچھی طرح واقف تھے اور ان کی صورت و شکل بھی عربوں سے ملتی تھی۔
 دونوں کو پورا منصوبہ ذہن نشین کرا کر مدینہ بھیج دیا گیا۔ انہوں نے روضہ مبارک
 کے باہر کی طرف ایک مکان کرایہ پر لیا اور اس مکان کے ایک کمرے سے سرنگ
 شروع کی۔ سرنگ کی کھدائی سے جو مٹی نکلتی تھی اسے وہ تھیلوں میں بھر کے صبح کو
 نکل جاتے تھے پھر مٹی کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمام دن روضہ مبارک پر مشکیں
 زائین کو پانی پلاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ادھر
 بن تین راتوں تک برابر حضور کو دیکھتا تھا اور ہر بار حضور دو آدمیوں کی طرف اشارہ
 کیا کرتے تھے کہ یہ دونوں مجھے تکلیف پہنچا رہے ہیں۔

برے دن نور الدین زنگی شیرکوہ اور چند سواروں کو لے کر مدینہ چل پڑا۔ حاکم حجاز کو
 کے آنے کی خبر ہوئی تو دوڑا ہوا آیا۔ سلطان نے حاکم کو حکم دیا کہ مدینہ کے تمام
 کو ہمارے سامنے سے گزارا جائے۔ حاکم اس حکم کو نہ سمجھ سکا اس نے حکم پر فوراً
 اور ڈگی پڑائی کہ مدینہ کا ہر مرد حاکم حجاز کے محل کے دروازے کے سامنے سے
 اور سلطان دمشق نور الدین زنگی کے دیدار سے فیضاب ہو۔ حکم کی دیر تھی کہ
 کے لوگ سلطان کے دیدار کو گھروں سے نکل پڑے۔ صدر دروازے پر سلطان کے
 ت بچایا گیا اور حاکم حجاز کے لئے سلطان کے تخت کے برابر ایک مسند لگا دی گئی لیکن
 باز نے سلطان کے احترام میں مسند پر بیٹھنے کی بجائے سلطان کے تخت کے ساتھ
 ہونے کو ترجیح دی۔

ل تقار باندھ کر سلطان کے سامنے سے گزرنے لگے۔ سلطان ہر شخص کو بغور دیکھتا
 ل تک کہ سب لوگ اس کے سامنے سے گزر گئے۔ سلطان بڑا مایوس ہوا اس نے
 پوچھا کہ کیا تمام مدینہ والے سامنے سے گزر گئے یا کوئی باقی ہے۔ حاکم نے جواب
 تمام لوگ دیدار سے فیضاب ہو چکے ہیں سوائے ان دو بزرگوں کے جو نماز فجر کے بعد
 ہی میں ٹھہر جاتے ہیں اور شام تک مشکوں سے زائین کو پانی پلاتے رہتے ہیں۔
 نے حکم دیا کہ انہیں بھی پیش کیا جائے۔ حاکم مدینہ نے ان کی بزرگی اور دینداری کی
 شروع کردی لیکن سلطان نے سختی سے حکم دیا کہ انہیں فوراً حضور میں پیش کیا

حاکم مدینہ خود کچھ آدمی لے کر مسجد نبوی پہنچا اور ان سے بڑی عاجزی سے کہا کہ وہ
 سلطان دمشق کے دیدار کو چلیں انہوں نے ہمارے تراشا شروع کئے پھر آنا کافی کرنے
 حاکم مدینہ کو تو حکم مل چکا تھا کہ انہیں پیش کیا جائے چنانچہ وہ انہیں سمجھا بجا کر خلیفہ

”پھر میں اپنی ضرورتیں کہاں سے پوری کروں۔“ بیگم لاجواب ہو کے بولی۔ ”کیا سلطان
 یہ پسند فرمائیں گے کہ میں اپنے اخراجات کے لئے اپنے میکے سے خرچ منگواؤں۔“
 ”خدا کا شکر ادا کرو بیگم۔“ سلطان نے پر غلوص لہجے میں کہا۔ ”ہم بیت المال سے
 جو ماہانہ لیتے ہیں اس سے ہماری گزر بسر ہوتی ہے۔ ہاں اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہے
 میں فرمان جاری کئے دیتا ہوں کہ محس میں میری ذاتی ملکیت میں جو تین دکانیں ہیں اور
 سالانہ کرایہ تمہیں دیا جایا کرے۔“

بیگم چڑ گئی۔ بولی ”عالیجاہ۔ مجھ پر مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ
 دکانوں کا سال بھر کا کرایہ صرف دو دینار ہوتا ہے۔ میں اس بخشش کو شکریہ کے
 نام منظور کرتی ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں رعایا کی امانت
 ہاتھ لگانے سے مجبور ہوں۔“ سلطان نے صاف جواب دیدیا۔

اس چھوٹے سے واقعہ سے سلطان نور الدین زنگی کی زندگی گزارنے کا انداز ظاہر
 ہے۔ بیت المال کے اس خزانے سے ہی اس نے اتنا بڑا لشکر تیار کیا تھا جو لہراندا
 آنکھیں دکھاتا تھا۔ اسی بیت المال سے اس نے اسد الدین شیرکوہ کو ایک لاکھ دینار۔
 ایک عظیم لشکر مصر کی فتح کے لئے روانہ کیا تھا۔ یہ ایک لاکھ کا خرچ تو لشکر کے اخرا
 کے لئے تھا اس کے علاوہ اس نے ہر لشکر کو بیس بیس دینار اس کے ذاتی خرچ کے
 عطا کئے تھے۔ بہر حال یہ سلطان نور الدین کی کفایت شعاری یا دوراندیشی تھی جس کے
 مصر فتح ہوا۔ نصرانیوں کو نہ صرف بلیس اور اسکندریہ میں ہزیمت اٹھانا پڑی بلکہ
 منلیہ نے ۲۸۲ ہجری کے بحری بیڑے سے اسکندریہ پر چڑھائی کی تو انہیں منہ کی مار
 اور پھر وہ ایک زمانہ تک مقابلہ میں نہ آ سکے۔

بلاشبہ سلطان نور الدین زنگی ایک شجاع اور نیک دل و نیک طبیعت انسان تھا۔
 ساری زندگی صلیبی محاربات میں گزری۔ جہاں تک اس کی دینداری کا تعلق ہے تو
 لئے وہ واقعہ ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جب اسے خواب میں حضور
 اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور حضور نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 کہ اے نور الدین تو آرام سے سو رہا ہے اور مجھے یہ دو کافر تکلیف دے رہے ہیں
 کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں نے سازش کی کہ کسی طرح مسلمانوں کے
 حضرت محمد رسول اللہ کے جسد مبارک کو مدینہ سے غائب کر دیا جائے تاکہ مسلمان
 مرکزیت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے دو ایسے عیسائیوں کا انتخاب کیا

کے حضور لے گیا۔

سلطان نور الدین زنگی کی نظر ان پر پڑی تو وہ جیج اٹھا کہ ان دونوں اختیار گرفتار کیا جائے۔ حکم سلطان، کون انکار کر سکتا تھا۔ دونوں گرفتار ہوئے۔ سلطان ساتھ لے کر ان کے گھر گیا۔ ان کا گھر مسجد نبوی کے پچھواڑے تھا۔ گھر کی تار سوائے چند کھانے کے برتنوں اور کچھ برآمد نہ ہوا۔ ایک کمرہ جو مسجد نبوی کی ساتھ بنا ہوا تھا اس میں ایک لائنی چٹائی بچھی تھی۔ چٹائی ہٹائی گئی تو اس کے نیچے ایک لمبا چوڑا تختہ بچھا ہوا تھا۔ اس تختہ کو ہٹایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے نیچے منہ ہے۔ کئی آدمی سرنگ میں اترے اور شعیب ہاتھ میں لئے دور تک چلے گئے۔ سرنگ کو ناپا گیا تو معلوم ہوا کہ سرنگ حضور کے روضہ اقدس کے نیچے تک اگر ایک دو دن اور پتہ نہ چلتا تو نصرانی لعنتی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ سا پوچھنے پر انہوں نے جرم کا اقبال کر لیا۔ سلطان نے انہیں سولی پر چڑھوا دیا۔ سلطان نور الدین زنگی اس واقعہ کو بڑی عقیدت سے بیان کرتا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی حضور صلی وسلم نے تین شب تک مسلسل خواب میں اپنے دیدار سے مشرف کیا تھا۔ سلطان نور الدین زنگی کی وفات پر سلیسوں اور خاص کر شاہ یروٹلم اور شاہ خوب بغلیں بجا ئیں کیونکہ یہ دونوں بادشاہ سلطان دمشق سے بالواسطہ شکست کھائے ان کا خیال تھا کہ سلطان نور الدین زنگی کے انتقال سے شام کی زبردست سلطنت زو ہو جائے گی اس لئے کہ سلطان کا لڑکا ابھی کمسن تھا اور اتنی بڑی سلطنت کو نہیں سکتا تھا۔ یورپ کے بادشاہوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب وہ مسلمانوں کو کمزور دیکھتے مذہبی جنگ کا ڈول ڈالتے تھے۔ اس مذہبی جنگ کو صلیبی جنگ کا نام دیا جاتا تھا۔ سلطان نور الدین زنگی کے انتقال کرتے ہی شاہ یروٹلم نے یورپ کے نصرانی بادشاہ صلیبی جنگ کے لئے تیار رہنے کی اصلاح دی۔

عیسائیوں کی یہ پہلی کوشش نہ تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کو (حاکم بدین) منہ لئے وہ پہلے بھی بھرپور کوشش کر چکے تھے۔ چنانچہ ۶۳۸ء (۱۹۰۶ء) میں عیسائیوں نے م کے خلاف پہلی صلیبی جنگ لڑی تھی۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ یورپ کا متحدہ لشکر ہوا تو لشکر کے آگے آگے سونے کی صلیب اٹھائے راہب چل رہا تھا۔ یہ لشکر لوٹ اور جنگری اور برطانیہ کے لوگوں سے لڑتا جھگڑتا ایشیائی کوچک میں داخل ہوا۔ ایشیا کو حکمران سلطان قلیج ارسلان اور قوضیہ اس کا دارالسلطنت تھا۔ سلجوقی سلطان اپنے ساتھ یورپ کے متحدہ لشکر کے سامنے صف آرا ہوا۔ ایک زبردست جنگ ہوئی جس

ن ارسلان اور اس کے لشکریوں نے اپنی شجاعت اور بہادری کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ان لشکر کو اس قدر زبردست شکست ہوئی کہ ایک بیان کے مطابق ان کا کوئی فوجی میدان سے جان بچا کر نہ بھاگ سکا اور سب کے سب قتل ہو گئے۔

دوسری صلیبی جنگ ۵۴۲ء میں لڑی گئی۔ اس مرتبہ سلطان نور الدین زنگی نے نصرانیوں کو خواب بچانا چور کر دیے۔ ”الربا“ جسے نصرانیوں نے پہلے فتح کر لیا تھا اسے سلطان نور الدین زنگی نے چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ حملہ کر کے ان سے چھین لیا۔ انہوں نے بار بھر پیائے روم سے فریاد کی اور یہ التجا کی کہ ایشیا کے عیسائیوں کی مدد کے لئے کے بڑے بڑے ممالک کا لشکر بھیجا جائے۔ پیائے روم عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا ہے۔ پیائے روم نے یورپ کے تمام شاہوں کو حکم دیا کہ وہ صلیبی جنگ کے لئے اپنی فوج روانہ کریں۔ انطاکیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور انگلستان وغیرہ کے لشکر شاہ یروٹلم رو کو چل پڑے۔ یہ لشکر بڑھتے ہوئے دمشق کے قریب پہنچ گئے۔ ان کا ارادہ ملطنت دمشق پر قبضہ کر کے سلطان نور الدین زنگی کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنا سلطان نور الدین زنگی ذرا نہ گھبرایا اور مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ شاہ فرانس لوکس ہفتم اور شاہ کوزاؤ نے بہت زور مارا مگر ان کی ایک نہ چلی اور وہ منہ کی کھا کر واپس ہو گئے۔

۱۱۷۴ء کا سال صرف مسلمانوں پر برق بن کر نہیں گرا بلکہ اس نے شام کی سب سے غرانی سلطنت یروٹلم کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ مئی کے مہینے میں سلطان نور الدین کا انتقال اور اس کے صرف دو ماہ بعد یعنی جولائی ۱۱۷۴ء میں ایملارک شاہ یروٹلم بھی اس دنیا اٹھ گیا۔ بلاشبہ ایملارک نصرانیوں کا ایک ذہین اور بہادر بادشاہ تھا۔ اس نے مصر سے الدین کے قدم اکھاڑنے کے لئے کئی جتن کئے لیکن صلاح الدین اس سے کہیں زیادہ اور شجاعت کا مالک تھا اس لئے ایملارک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس سلطان نور الدین زنگی نے اپنا کوئی جانشین نہ چھوڑا تھا اسی طرح شاہ یروٹلم کا بھی مناسب جانشین نہ ہو سکا۔ ایملارک کے مرنے کے بعد بالذون تخت یروٹلم پر بیٹھا۔ لی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی اور بعض مورخوں کے مطابق بالذون کو ڈھکا مریض تھا۔ اس لئے رعند آف طرابلس اس کا سرپرست اعلیٰ بن گیا۔

ان حالات میں اگر یہ کیا جائے کہ اس وقت دمشق اور یروٹلم دونوں کے تحت خالی کچھ غلط نہ ہوگا اور یہ بات بھی غلط نہ ہوگی کہ اگر صلاح الدین یروٹلم کے بگزے طاقت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ صلاح الدین کے بہترین اور آزمودہ کار لشکر تھا۔ اگر وہ یروٹلم کا رخ کرتا تو کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ

جس کا مضمون اس طرح تھا۔۔۔

الصلاح اسماعیل بن سلطان نور الدین زنگی

اور تمام امراء نوریہ کے نام امیر

صلاح الدین بن نجم الدین ایوب

وزیر اعظم مصر کا کھلا ہوا خط

میں صلاح الدین ولد نجم الدین وزیر اعظم مصر سب سے پہلے اپنے مرحوم مربی سلطان زنگی کے فرزند دلی بند الصالح اسماعیل اور امراء نوریہ مقیم دمشق اور ملک شام کو تاج ملت دمشق کے ساتھ پورے خلوص سے اپنی مکمل وفاداری کا یقین دلاتا ہوں پھر حکم دلا کہ "الصلاح بن نور الدین" کا نام خطبہ میں شامل اور سکون پر کندہ کیا جائے۔

اس حکم کے بعد امراء نوریہ کو متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے رشک و رقابت نے ت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر سلطان نور الدین تم سے کسی کو بھی میری جگہ مقرر کرنے کے قابل سمجھتے یا پھر کسی پر میری طرح اعتماد کرتے ہوتے تو وہ اسے مصر کی گورنری پر مامور کرتے کیونکہ مصر سلطنت دمشق کا اہم ترین علاقہ تھا۔ اب ان کا اچانک ہوا گیا ورنہ وہ اپنے بیٹے کا سرپرست اور اتالیق سوائے میرے اور کسی دوسرے کو نہ سمجھے یہ سن کر سخت تکلیف ہوئی ہے کہ تم میرے آقا اور ولی نعمت کے بیٹے کی نئی کاغذ دعویٰ کر رہے ہو۔ یہ خیال رہے کہ میں بہت جلد دمشق پہنچ کر الصالح بن زنگی کی وفاداری کا حلف اٹھاؤں گا اور سلطان مرحوم کے احسانات کا اپنی خدمت سے ملے دوں گا جو تاریخ میں یادگار رہے گا اور تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے کردار کے نیک سلوک کروں گا خاص کر ان امراء کو ضرور پیش نظر رکھوں گا جنہوں نے سلطنت کے کو نظر انداز کیا ہے۔"

صلاح الدین کا خیال تھا کہ اس کے اس حکم نامہ یا تادیبی خط کا خاطر خواہ اثر ہوگا دمشق اور شام کے دوسرے علاقوں کے والیوں اور امراء پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہٰذا شہزادہ سیف الدین ایک ایک کر کے شام کے شہروں کو دباتا رہا اور دمشق کے امراء دبائے بیٹھے رہے۔ ان کے خیال میں مصر کا صلاح الدین اور موصل کا سیف الدین — بالکل طور پر ان کے دشمن تھے۔ ان دونوں سے نجات کا انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ ان کے دشمنوں سے کفر (نکس نصرانی) سے صلح کر لی۔ یہ اسی قسم کی ساز باز تھی جیسی ناکے ایک وزیر اذن نے کی تھی۔ امیر صلاح الدین کو جب اس ساز باز کی خبر ملی تو اسے کھلی باتی تمام امراء نوریہ سے نفرت ہو گئی۔

اس کا راستہ روکتا۔ لیکن صلاح الدین نے کمزور ہمسایہ پر ہاتھ اٹھانا مردانگی کے غلام اور یرغلم کے حالات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ صلاح الدین دہ معاملت میں بھی دخل دینا نہیں چاہتا تھا لیکن سلطنت دمشق کے حالات دو ماہ کے اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ اگر صلاح الدین اس طرف توجہ نہ کرتا تو خود اس کے استاد نور الدین زنگی کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کے پیشے کے لئے ختم ہو جاتا۔ صلاح الدین نے پھر بھی تحمل کا ثبوت دیا۔ مرحوم سلطان کا جانشین صالح اسماعیل گیارہ سال کا تھا۔ اس کی عمر سے فائدہ اٹھا کر ایک امیر شمس الدین ابن مقدم سرپرست اور کارپرداز سلطنت بن بیضا مگر دوسرے امراء نوریہ بگڑ بیٹھے جس کا نتیجہ کہ زنگی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔

سلطان نور الدین کا بھتیجا سیف الدین جو موصل کا والی تھا۔ اس نے الجریو کر لیا۔ اس دوران موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دوسرا امیر سعد الدین بن دمشق کے کمن بادشاہ صالح اسماعیل کو لے کر حلب پہنچا۔ اس نے امیر الامراء شمس ابن دایہ اور حلب کے دوسرے اقا کی امرا کو گرفتار کر لیا اور حکومت کی باگ دوڑا۔ میں لے لی۔ شمس الدین ابن مقدم دمشق میں رہ گیا تھا۔ اس نے جوش انتقام میں الدین والی موصل کو دمشق آنے کی دعوت دیدی مگر سیف الدین موصل چھوڑ کے آمادہ نہ ہوا۔

نور الدین کے دوسرے امراء یہ افزائش اور طوائف الملوک دیکھتے اور دل ہی کڑھتے تھے آخر وہ سب ایک جگہ اکٹھا ہوئے اور یہ صلاح ٹھہری کہ امیر صلاح الدین مصر سے بلایا جائے کیونکہ ان کے خیال میں سلطنت دمشق کو صرف صلاح الدین ہی تھا۔ انہوں نے صلاح الدین کو خط لکھا کہ اگر آپ دمشق کی عظیم سلطنت کو حاسدا مفاد پرستوں سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں تو قاہرہ سے فوراً دمشق روانہ ہو جائے ورنہ اور خود غرض امراء مسلمانوں کی ہڈیوں پر قائم ہونے والی اس سلطنت کو سینکڑوں حصو تقسیم کر دیں گے۔

صلاح الدین کو جب یہ خط ملا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے دل میں نور الدین اولاد کا بڑا احترام تھا۔ وہ دمشق کو فتح نہ کرنا چاہتا تھا لیکن دمشق کے حالات واقعی اس پہنچ چکے تھے کہ اگر وہ بھی اس موقع پر خاموش رہتا تو وہی کچھ ہو سکتا تھا جس کا ذکر کیا گیا تھا۔ صلاح الدین نے پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور دمشق روانہ پہلے امراء نوریہ کو ان کی حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے ایک بار دمشق میں ایک

میں وہ موقع تھا جب امیر سعد الدین بن کشتکین، الملک الصالح اسلعل کو دہلا پھسلا کے حلب لے گیا تھا۔ اس خبر نے صلاح الدین کو اس قدر بے چین کر دیا کہ اس نے اپنے اس خط کے رد عمل کا بھی انتظار نہ کر کے دمشق کے دربار میں بھیجا تھا۔ صلاح الدین نے سلطنت مصر کا انتظام اپنے بھائی حوالے کیا اور صرف سات سو چیدہ سواروں کو لے کر دمشق چل پڑا۔ نصرانی سلطنت کی اگرچہ خود بھی کچھ اچھی حالت نہ تھی مگر مسلمانوں سے جو انہیں ازلی بغض تھا انہوں نے دمشق کے راستے میں انکو روکنے کا فوری منصوبہ بنایا اور یروشلم کا لشکر قہرہ پر فوراً پہنچ گیا۔ قلعہ کرک، شام اور دمشق کے راستے پر تھا۔ صلاح الدین نے اس محاصرہ بھی کیا تھا لیکن اپنے والد نجم الدین کے گھوڑے سے گرنے کی خبر پر اسے محاصرہ اٹھا کر قہرہ واپس جانا پڑا تھا۔

یروشلم نے قلعہ کرک پر لشکر بھیج کر صلاح الدین کو زنج کرنے کی ایک اچھی عملی اختیار کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ صلاح الدین قلعہ کرک کے ساتھ جا۔ راستے سے گزرے گا اور یروشلم کا لشکر صلاح الدین کو اس ریگستانی علاقے میں گہرے حد تک پریشان کر سکے گا۔ لیکن صلاح الدین نصرانیوں سے کہیں زیادہ دوراندیش نصرانی جاسوسوں نے یروشلم میں صلاح الدین کی روانگی کی خبر پہنچا دی تھی تو صلاح الدین نے بھی قہرہ میں یہ اطلاع دی تھی کہ یروشلم کا لشکر قلعہ کرک پر پہنچا ہے۔ پس صلاح الدین نے قہرہ سے روانگی کے وقت تو یہ اطلاع دی تھی کہ یروشلم قلعہ کرک پر جمع ہو گیا ہے۔ پس صلاح الدین نے قہرہ سے روانگی کے وقت تو راستہ اختیار کیا جو قلعہ کرک ہو کر گزرتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں اس تبدیل کر دیا اور اس ریگستانی علاقے پر چل پڑا جس راستے سے اس کے جاسوس قہرہ اور قہرہ سے دمشق آتے جاتے رہے تھے۔

صلاح الدین کی اس حکمت عملی نے نصرانیوں کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ جاسوس سوار راستے کے ارد گرد دور دور تک صلاح الدین کے لشکر کرتے رہے مگر اس کا انہیں کوئی نشان نہیں ملا پھر جب انہیں پانچویں دن اطلاع قہرہ کا لشکر راستہ کاٹ کر کرک سے بہت آگے نکل چکا ہے تو وہ اپنا منہ پٹیت کر ادھر صلاح الدین اپنے سات سو سواروں کے ساتھ دمشق پہنچ گیا۔

امیر صلاح الدین کے داخلے کے وقت دمشق میں سوائے شمس الدین ابن

اور کوئی قابل ذکر امیر موجود نہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ تمام امراء نوریہ دمشق چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ صلاح الدین کے ہمدرد اور حمایتی امراء اس وقت بھی دمشق میں موجود تھے مگر یہ امراء دوسروں کی طرح مفاد پرست نہیں تھے۔ وہ سلطنت دمشق کو مضبوط دیکھنے کے خواہشمند تھے اور اسی لئے انہوں نے صلاح الدین کو مصر آنے کی دعوت دی تھی۔ سلطان نور الدین دہلی کے انتقال کے وقت شمس الدین ابن مقدم سب امیروں پر حاوی تھا اس لئے وہ نہایت ہی شراوسے ملک الصالح اسلعل کا سرپرست بن بیٹھا اور کار سلطنت سنبھال لیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد دوسرے امیر سعد الدین بن کشتکین نے کسب شراوسے کو ابن مقدم کے خلاف درغلایا اور شاہی محل کی کینزوں اور غلاموں کی مدد سے شراوسے کو حلب لے کے چلا گیا۔ ابن مقدم اور اس کے ساتھیوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ شراوسے کو حلب سے واپس لاسکتے۔ چنانچہ وہ صرف دمشق پر قناعت کر کے بیٹھ گئے۔

ابن مقدم کو صلاح الدین کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ دمشق میں کچھ فوج بھی تھی۔ ابن مقدم نے فوج کے سپہ سالار کو اپنے پاس بلانے کے بجائے خود اس کے پاس جانا مناسب سمجھا۔ شاہی لشکر انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔ مرکزی فوج کے کئی حصے بکھرے ہو گئے تھے۔ تو فوج سعد الدین بن کشتکین کے ساتھ حلب چلی گئی تھی۔ کچھ دستے موصل چلے گئے۔ بہت سے فوجیوں نے سلطان نور الدین کے انتقال کے بعد فوجی ملازمت چھوڑ دی تھی اور دوسرے پیشے اختیار کر لئے تھے۔ دمشق میں جو فوج تھی وہ اگرچہ ابن مقدم کے زیر نگرانی تھی اور اس کا سپہ سالار جسے خود ابن مقدم نے مقرر کیا تھا۔ وہ اگرچہ ابن مقدم کا اہلکار تھا مگر ہوا کا رخ بدل چکا تھا اور امیر صلاح الدین کے دمشق پہنچنے کی خبروں نے دمشق کی بے بس سیاست کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔

ابن مقدم جب فوجی چھاؤنی میں پہنچا تو دمشق کے سپہ سالار نے اس کا استقبال بڑا گرمی سے کیا۔ ابن مقدم نے فوراً اندازہ کر لیا کہ فوج بھی صلاح الدین کی آمد کی خبر سے حائر ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن مقدم نے گفتگو میں خود پہل کی۔

ابن مقدم نے نہایت نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”سالار دمشق کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ امیر صلاح الدین مصر کی حکومت اپنے بھائی بھتیجیوں کے حوالے کر کے دمشق کی سرکاری حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر کے ساتھ دمشق کی طرف بڑھ رہا ہے؟“

”امیر ابن مقدم کا خیال درست ہے“ سالار نے بیدلی سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ امیر صلاح الدین دمشق تشریف لا رہے ہیں۔“

سالار کے اس جواب سے ابن مقدم کا دل بچھ گیا۔ پھر بھی اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”کیا سپہ سالار کے خیال میں صلاح الدین کا دمشق آنا سلطنت دمشق سے متعارف نہیں؟“

”اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں“ سپہ سالار کا رویہ سرد تھا۔ ”یہ تو اقدار نے کا مسئلہ ہے اس کا جواب اقدار کے حقدار ہی دے سکتے ہیں۔“

ابن مقدم کو پھر بھی کوئی کامیابی کی صورت نہ نظر آئی۔ اس نے بات گھما کر ”میں نے حقدار شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کو جانشین مقرر کیا تھا۔ کیا آپ کے شہزادہ ملک الصالح سلطنت دمشق کا جائز حقدار نہیں؟“

”ضرور ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔“ سپہ سالار نے مختصر سا جواب دیا۔ ”امیر صلاح الدین دمشق کے صحیح وارث کا حق چھیننے آرہا ہے۔ اس لئے ہے۔“ سپہ سالار نے جرح کے انداز میں کہا۔

”یہ بات میں اور آپ نہیں کر سکتے۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کو غدار کہیں۔ ہم تخت و تاج دمشق کے غلام ہیں اور ہماری وفاداری تخت و تاج دمشق ہے۔“ سپہ سالار نے ایک معقول بات کہہ کر امیر ابن مقدم کے خیالات تبدیل کوشش کی۔

ابن مقدم مایوس ہو کے بولا۔ ”تو کیا آپ دمشق کو بغیر جنگ کے صلاح الدین کو حوالے کر دیں گے؟“

”ایسے موقع پر ہر بات ممکن ہے امیر ابن مقدم“ سپہ سالار نے ٹکا سا جواب دیا۔ ”جہاں تک امیر صلاح الدین کے دمشق شہر میں داخلے کا تعلق ہے۔ اس کی مزاحمت نہیں کریں گے۔ دمشق کی تمام شاہی فوج قلعہ دمشق میں جمع ہو چکی ہے۔ حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم امیر صلاح الدین سے جنگ نہیں چاہتے لیکن یہ کہ دمشق کا قلعہ امیر صلاح الدین کے حوالے اس وقت تک نہیں کیا جائے گا۔ ہم امیر موصوف سے بعض ضمانتیں اور وضاحتیں نہ حاصل کر لیں۔“

امیر ابن مقدم کی امید کا آخری ستارہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب اسے اپنی فکر پڑاؤ نے بڑی امید سے کہا۔ ”کیا میں امید کروں کہ سپہ سالار مجھے بھی قلعہ میں رہنے کی عطا فرمائیں گے۔“

”ضرور ضرور۔۔“ سپہ سالار نے اسے یقین دلایا۔ ”آپ آخر ایک معزز امیر ہیں۔ آپ سلطان مرحوم کے جانشین شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کے سرپرست رہ چکے ہیں۔ کہ یہ عرصہ بہت مختصر تھا لیکن دمشق کی تمام فوج نے آپ کو سرپرست تسلیم کر لیا تھا۔“

ابن مقدم کا ڈوبتا دل ٹھہر گیا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”سپہ سالار میں آپ کے اس بیان کو زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے شہزادے کی سرپرستی تمام امرا سے کی ہے۔“

”آپ ٹھیک فرما رہے ہیں امیر ابن مقدم۔“ سپہ سالار نے کہا۔ ”میسکن میں یہ بھی دیکھا کہ جن امیروں نے آپ کی حمایت کی تھی ان میں ہی ایک امیر شہزادے الصالح کو بڑی خاموشی طلب بھگالے گیا۔ اس کے بعد شاہی لشکر کا بھی ہتیار ہوا اور ہماری تعداد طلب چلی گئی۔ اگر شاہی لشکر تمام کا تمام دمشق میں رہتا تو شاید امیر صلاح الدین سے معقول شرائط پر صلح ہو جاتی۔ اس وقت تو ہم خود امیر صلاح الدین کے رحم و کرم پر ہیں۔“

”مجھے حالات کی نزاکت کا صحیح اندازہ ہے سپہ سالار۔“ ابن مقدم اس کی ہاں میں ہاں کراہی بخت کی صورت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ”پھر بھی میں آپ سے یہ درخواست کروں گا۔ امیر صلاح الدین سے صلح کے وقت آپ مجھے بھی معافی دلانے کی کوشش کیجئے گا۔“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میری سفارش آپ کے حق میں کس حد تک مفید رہے گی مگر میں آپ کو یہ ضرور یقین دلاتا ہوں کہ میں اس سلسلے میں ہر قسم کی کوشش کر رہا ہوں۔“

دمشق کے سپہ سالار نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی۔ اس نے ابن مقدم پر یہ نہیں ابر کیا کہ وہ امیر صلاح الدین کی خدمت میں پہلے ہی ایک سفارت روانہ کر چکا ہے۔ اس نال کی تفصیل یہ ہے کہ شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کے طلب منتقل ہو جانے سے یہ بات ناف ظاہر ہو گئی تھی کہ امرا نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ دمشق کے لئے رسد کشی نہیں بلکہ کھلی خانہ جنگی ہوگی۔ تخت کے ہمدردوں نے پہلے امیر موصل غازی سیف الدین کو دمشق آنے کی دعوت دی لیکن والی موصل کو امیر صلاح الدین کی صلاحیتوں اور عسکری طاقت کا اندازہ تھا اس لئے اس نے دمشق آنے سے قطعی انکار کر دیا۔

ابن مقدم کو اطمینان ہو گیا۔ بولا ”آپ دمشق کے لشکر کے سپہ سالار ہیں۔ آپ دمشق کی سلطنت کو بچانے کے لئے جو مناسب سمجھیں کریں لیکن میرا ضرور خیال رکھیے گا۔“

یہ کہہ کر ابن مقدم چلا گیا۔ سپہ سالار کو اس کی یہ مزید تائید پسند نہ آئی۔ وہ ابن مقدم کو تخت نظروں سے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک راہداری سے اتر کر نظروں سے دھمکتا نہ ہو گیا۔

صلاح الدین کے دمشق کی طرف روانگی سلطنت یروشلیم اور سلطنت دمشق میں

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ یروشلیم کے فوجی دستے قلعہ کرک پر ملا روکنے کے لئے پہنچ گئے تھے لیکن امیر صلاح الدین انہیں جھکائی دے کر ریگستان دمشق کے قریب پہنچ گیا۔ ادھر دمشق، حلب اور موصل میں اس خبر نے لرزہ پیدا والی موصل نے چونکہ دمشق کے حالات میں ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا اور کچھ اطمینان تھا مگر حلب میں امیر سعد الدین بن کشنگین کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ ملک الصالح اسلعل کو بلا پھلا کر حلب لے آیا تھا۔ اس سے ایک طرف توڑ جانے والے تمام امراء اس کے مخالف ہو گئے بلکہ وہ امراء بھی اس کے خلاف "جرا" اپنا مطیع بنانا چاہتا تھا اور اب تو اسے سب سے بڑا خطرہ امیر صلاح الدین سے تھا جو اس کی موت کا فرشتہ بن کے دمشق کی طرف محو پرواز تھا۔

امیر صلاح الدین بے انتہا ذہین تھا وہ اچانک دمشق نہیں پہنچا بلکہ دمشق کی دوری پر فکر اس نے قیام کیا۔ اسے دمشق، موصل اور حلب کی دم کی خبر تھیں لیکن اس کا یہاں قیام کا یہ مقصد تھا کہ ایک تو اسے تمام مرکزی مقابلہ خلاف اور موافقت میں ہونے والی کارروائیوں کی تازہ ترین صورت حال معلوم دوسرے یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ دمشق میں اس طرح داخل ہو جیسے اسے کوئی جلا اس کے اس عمل کا یہ اثر ہوا کہ اس کے مخالفین کی قوت برداشت جواب دہ بدحواس ہو کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔

صلاح الدین کے اسی قیام کے دوران پہ سالار دمشق کی سفارت اس کے ہوئی۔ اس سفارت میں نائب پہ سالار اور دمشق کے مفتی اعظم شامل تھے۔ م نے سفارت کو اپنے تماخیمے میں بلایا تھا تاکہ وہ تنہائی میں سفارت سے کھل کر سکے۔

سفارت سے صلاح الدین کا پہلا سوال بڑا سخت تھا جس نے دونوں ارکان پریشان کر دیا۔ صلاح الدین نے سفارت کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ صلاح الدین وزیر اعظم مصر اور پہ سالار افواج شام مقیم قاہرہ، دمشق کی سفارت آمدید کئے پر ہرگز تیار نہیں تاوقتیکہ یہ نہ معلوم ہو کہ سفارت کس ذمہ دار نمائندگی کرنے آئی ہے اور اس میں کس حیثیت اور مرتبہ کے ارکان شامل ہیں۔ ایک تو صلاح الدین کا پر رعب چہرہ جس سے شاہانہ جلال نکلا پڑتا تھا اس کی نظریں نائب پہ سالار کو تو پینہ اٹھیا۔ مفتی دمشق نے اس کا ہاتھ دبا کر ہمت دہانے بھی خود کو سنبھالا اور دھیمی اور قدرے لرزتی زبان میں بولا۔ "اے امیر!

دونوں کو آپ کی خدمت میں دمشق میں موجود شامی لشکر کے پہ سالار نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

"میں غدار کی بات سننے پر تیار نہیں۔" صلاح الدین نے اسے ٹوکا۔ "شامی لشکر کے پہ سالار تو میرے مربی اور آقا مرحوم سلطان نور الدین زنگی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پہ سالار کا منصب کسی دوسرے شخص کو منتقل نہیں کیا پھر یہ دمشق کا پہ سالار کون پیدا ہو گیا؟"

مفتی اعظم نے نائب پہ سالار کو روک کر امیر کو خود جواب دیا۔ "اے امیر محترم سلطان دمشق کی اچانک موت نے دمشق اور سلطنت دمشق کا نقشہ الٹ کے رکھ دیا ہے۔ امراء نوریہ کے بیشتر امیر بزع خود دمشق کے وزیر اعظم اور پہ سالار اعظم بن بیٹھے تھے۔ پہلے امیر شمس الدین ابن مقدم نے اقتدار سنبھالا اور شہزادہ ملک الصالح اسلعل کا سرپرست اور نگران بن بیٹھا۔ پھر شہزادہ کو دوسرا امیر سعد الدین کشنگین حلب لے بھاگا اور حلب کو دارالسلطنت بنانے کا اعلان کر دیا۔ ادھر والی موصل نے سلطنت دمشق کے کئی اہم شہر دیائے اور امراء نوریہ کوئی مزاحمت کرنے کے بجائے سلطنت دمشق کی بندر بانٹ کرنے میں لگے رہے۔"

"یہ حالات بہت افسوسناک ہیں۔" صلاح الدین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بزرگ رکن سفارت کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں سلطنت دمشق کا سچا درد ہے۔ منگلو آگے بڑھانے سے پیشتر میں چاہتا ہوں کہ محترم رکن اپنا اور اپنے ساتھی رکن کا تعارف کرائیں اور سفارت بھیجنے والے سالار فوج کے کوائف بیان کئے جائیں؟"

مفتی شہر نے جواب دیا۔ "امیر عالی مقام۔ اس سفارت کو بھیجنے والا اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے آپ کو مصر آنے کی دعوت دی تھی۔ اگر امیر کو میرے دل میں سلطنت دمشق کا درد محسوس ہوا ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ سالار فوج تخت و تاج دمشق کا ایک سچا بی خواہ ہے۔ میرے ساتھ آنے والا یہ رکن اسی سالار فوج کا نائب ہے۔ رہا میرا تعارف تو میں عرض کر دوں کہ ملکی سیاست سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن جب کسی مسلم ملک کا تخت و تاج داؤں پر لگ جاتا ہے تو علمائے دین اسے بچانے کے لئے تیغ و براں کی طرح میدان میں آتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی ایک مجاہد ہوں۔ اگر میں میری زندگی مذہب و ملت کے کام آجائے تو سمجھوں گا کہ مجھے اپنی زندگی بھر کی عبادت و ریاضت کا موقع مل گیا۔"

صلاح الدین، مفتی شہر کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ "اے بزرگ ہستی۔

اس بات کی وضاحت کردی تھی کہ ہم نے شہزادہ کو اپنا بادشاہ اور سلطان مرحوم کا جانشین جن لیا ہے لیکن بعض مفاد پرست امرائے تخت و تاج کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں ہیں اس لئے ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ فوری دمشق پہنچ کے مفاد پرستوں کی سرکوبی کیجئے اور سلطان کے جانشین کے ہاتھ مضبوط فرمائیے کیونکہ ہمارے خیال میں آپ کے سوا کوئی اور امیر اس سلطنت کی گرتی دیوار کو سہارا دینے کے قابل نہیں ہے۔“

مفتی اعظم اتنا کہہ کر امیر کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہوں نے اپنی بات مکمل کر لی ہو مگر ابھی نامکمل تھی اور امیر صلاح الدین اس خیال میں تھا کہ مخاطب اپنی بات مکمل کر لے تو وہ جواب دے۔ جب دونوں پر خاموشی طاری رہی تو امیر نے سر اٹھا کر مفتی اعظم کو دیکھا۔ مفتی اعظم خود بھی امیر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

امیر صلاح الدین نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ سب باتیں آپ لوگوں کے اس خط میں لکھی گئی تھیں جو آپ نے مجھے قاہرہ بھیجا تھا۔ اب آگے فرمائیے کہ آپ کے سالار فوج اس سلسلے میں مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟“

”سالار فوج اور ہم سب صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان سب باتوں کی تصدیق کر دیجئے تاکہ ہم لوگ کھلے دل سے قلعہ میں آپ کا استقبال کرنے کا اہتمام کریں۔“ مفتی اعظم نے سالار فوج کا عندیہ بیان کر دیا۔

”مفتی اعظم، میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔“ امیر صلاح الدین نے نری سے کہا۔ ”میں نے آپ کے خط کی کسی بات کو رد نہیں کیا بلکہ آپ کے خیالات کو سراہا ہے۔“

”امیر محترم۔ کیا میں اس سے یہ نتیجہ نکالوں کہ آپ بھی شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کو سلطان مرحوم کا صحیح جانشین تسلیم کرتے ہیں؟“ مفتی اعظم نے ایک ہی جملے میں اپنا پورا مضمون بیان کر دیا۔

”بالکل۔ بالکل۔ شہزادہ اسماعیل کے سوا اور کوئی جانشین ہو ہی نہیں سکتا۔“ امیر صلاح الدین نے پر زور تصدیق کی۔

”الحمد للہ۔“ مفتی اعظم نے شکر یہ ادا کیا۔ ”امیر محترم گستاخی معاف صرف ایک بات کی اور وضاحت کر دیجئے۔“

”ضرور۔ آپ بیان کیجئے۔“ امیر نے مختصر سا جواب دیا۔

”ہمارے بعض امرائے خیال ہے کہ آپ تخت دمشق پر قبضہ کرنے تشریف لائے ہیں اور شہزادہ ملک الصالح اسماعیل سے آپ کو کوئی ہمدردی نہیں؟“ مفتی اعظم نے بڑے

یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ایک عالم باعمل ہیں مگر کیا آپ یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ الحال آپ کس حیثیت میں مذہب و ملت کی خدمت کر رہے ہیں۔؟“

”مجھے دمشق کا مفتی اعظم ہونے کا فخر حاصل ہے۔“ مفتی نے جواب دیا۔ ”میں اب سے التماس کروں گا کہ خواہ کتنی ہی جانوں کی قربانی دنا پڑے لیکن سلطنت دمشق کو باقی رکھا جائے۔“

”میرے بھی یہی جذبات ہیں مفتی اعظم۔“ صلاح الدین نے کہا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ میری زندگی تک سلطنت دمشق باقی رہے گی۔“

”مجھے خوشی ہے کہ ہم نے آپ کو دمشق نے کی دعوت دے کر کوئی غلطی نہیں کی۔ مفتی اعظم نے جواب دیا۔

”مجھے بھی خوشی ہے کہ میں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور آپ کی درخواست فوراً جواب بھیج دیا۔“ صلاح الدین نے بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مفتی اعظم نے حیرانی سے صلاح الدین کو دیکھا۔ ”امیر محترم۔ آپ کی طرف سے ہم کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ شاید اسی وجہ سے امرائے دل چھوڑ دیا اور امیر شمس الدین کشمکشیں شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کو حلب لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔“

صلاح الدین نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ”تعب کی بات ہے کہ میرا خط دربار دمشق میں نہیں پہنچا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خط کسی مفاد پرست نے ضائع کر دیا ہو۔ اس خیال کو اگر وجہ سے اور تقویت پہنچتی ہے کہ میں نے وہ خط ایک خاص قاصد کے ہاتھ روانہ کیا تھا مگر وہ قاصد قاہرہ واپس نہیں پہنچا۔“

”میں امیر محترم کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔“ مفتی اعظم نے کہا۔ ”عین ممکن ہے کہ وہ خط شمس الدین ابن مقدم یا سعد الدین بن کشمکشیں کے ہاتھ پڑا ہو اور انہوں نے خط دبا کے قاصد کو قتل کرا دیا ہو۔“

امیر صلاح الدین کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”فرمائیے مفتی اعظم۔ سالار فوج نے آپ کے ذریعہ کیا پیغام بھیجا ہے؟“

مفتی اعظم بڑی دیر سے انتظار میں تھے کہ موقع ملے تو وہ سالار کا پیغام امیر صلاح الدین کو پہنچائیں لیکن گفتگو کا رخ کسی اور طرف ہو گیا تھا۔ امیر کے سوال کرتے ہی مفتی اعظم نے کنا شروع کیا۔ ”امیر محترم میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ سالار فوج اور ہم سب تخت و تاج و دمشق کے وفادار ہیں۔ ہم شہزادے ملک الصالح اسماعیل کو اپنا بادشاہ اور آقا تسلیم کر لیا ہے۔ ہم نے جب آپ کو دمشق آنے کی دعوت دی تھی تو اس خط میں بھی

استقلال سے سوال کیا۔

”لاحول ولا قوۃ“ امیر نے فوراً کہا۔ ”آخر امرا کے دل میں یہ خیال پیدا کیسے ہوا میں نے اپنے اس خط میں جو میں نے دربار دمشق روانہ کیا تھا واضح الفاظ میں کہا تھا شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کو تمام امرا سلطان مرحوم کا جانشین تسلیم کریں اور شہزادے کا نام خطبہ میں داخل کیا جائے اور ان کے نام کے فوراً سب کے ڈھالے جائیں۔ یہی نہیں بلکہ میں نے خود سر امرا کو تنبیہ کی تھی کہ اگر انہوں نے شہزادہ کی اطاعت سے انحراف کیا ان کو سخت سزا دی جائے گی۔ شہزادہ اسماعیل میرے آقا اور میں ان کا غلام ہوں میں ان کے لئے مصر سے چل کر یہاں آیا ہوں۔ مگر افسوس کہ مفاد پرستوں نے میرے آقا زاد کو دربد کردیا اور اس عظیم سلطنت کے حصے بخرے کرنے میں لگ گئے۔“

”مجھے اجازت دیجئے امیر محترم۔“ مفتی اعظم اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ ”مجھے تہہ وضاحتیں اور ضمانتیں حاصل ہو گئی۔ میں دمشق پہنچ کے سالار کو تمام باتوں سے آگاہ کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ دمشق کے قلعہ سے باہر نکل کے آپ کا استقبال کریں گے۔“

”نہیں مفتی اعظم۔ امیر نے انہیں بیٹھنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ہم میں اور آپ میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ ہمارے ہی درمیان رہے گی۔ اب آپ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے ساتھ ہی دمشق میں داخل ہوں گے۔“

امیر صلاح الدین نے تالی بجا کر ایک غلام کو اندر بلایا اور مفتی اعظم اور ان کے ساتھی کو اس تاکید کے ساتھ اس کے سپرد کیا کہ ان کا خیال معزز مہمانوں کی طرح کیا جائے۔

دوسرے دن امیر صلاح الدین نے دمشق کی طرف پھر کوچ کیا۔ اب اس کے سواروں کی رفتار تیز تھی۔ شام کے وقت جب امیر نے اپنا گھوڑا روکا تو وہاں سے دمشق صرف نصف منزل پر تھا اور اگر امیر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسی شب دمشق پہنچ سکتا تھا لیکن امیر نے وہیں خیمے لگانے کا حکم دیا۔ دمشق والے بڑی بے چینی سے امیر صلاح الدین کا انتظار کر رہے تھے مگر جب انہوں نے سنا کہ امیر صلاح الدین دمشق سے صرف نصف منزل کے فاصلے پر رک گیا ہے تو ان کی جیتابی اس قدر بڑھی کہ اس کے چار ہمدرد اہل بیت نے فوراً اسی رات امیر کے پاس پہنچ گئے۔

امیر صلاح الدین ایک رات اور ایک دن اسی جگہ مقیم رہا۔ ادھر دمشق سے اس کی خیمہ گاہ تک دمشق کے عوام اور خواہی کا ہجوم در ہجوم آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ امیر صلاح الدین تمام دن اپنے خیمے کے باہر بیٹھا رہا۔ وہ ہر آنے والے سے مصافحہ کرتا یا بغلیگر

ان کی مزاح پر سی کرتا اور دلداری کرتا رہا پھر شام کے وقت وہ ایک جلوس کی شکل میں کی طرف روانہ ہوا۔ نصف شب کے قریب جب اس کی سواری فسیل شہر کے چٹنی تو تقریباً پورا شہر دمشق اسے دیکھنے کے لئے اٹھ آیا اندھیرا ہونے کی وجہ سے امیر لوگوں سے نہ مل سکا۔ اس نے عوام و خواص سے معذرت کی اور اعلان کیا کہ وہ بے دن تمام لوگوں سے ملاقات کرے گا۔

لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے اور امیر صلاح الدین اپنے سات سو دن اور چند معززین شہر کے ساتھ شہر دمشق کے بڑے بازار میں رکا کھڑا تھا۔ وہاں سے فاصلہ پر دمشق کا قلعہ تھا جس کے برجوں پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ امیر صلاح الدین نے سالار فوج کے بیٹھے ہوئے وفد کے ارکان کو اب تک واپس جانے کی اجازت نہ تھی۔ اسی وجہ سے قلعہ کے تمام دروازے بند کر لئے گئے تھے اور برجوں اور میناروں پر مستعد ہو کر کھڑے تھے۔

امیر صلاح الدین نے قلعہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنے سواروں کے ساتھ آہستہ ہوا اپنے آبائی اور قدیم محل پر پہنچا۔ محل کے تمام پرانے ملازم اسے خوش آمدید کہنے کے لئے محل سے نکل آئے تھے۔ امیر صلاح الدین گھوڑے سے اترا اور بلا امتیاز درجہ و بہر ملازم سے بغلیگر ہوا۔ یہ محل صلاح الدین کے باپ نجم الدین ایوب کو سلطان نور الدین زنگی نے عطا کیا تھا۔ صلاح الدین جب ملازمین سے بغلیگر ہو کر محل میں داخل ہوا تو اس کے دل کی عجب حالت تھی۔ اس کی زندگی مہ و سال اس کے سامنے ایک ایک کر کے رننے لگے۔ اس کی آنکھیں نمناک بھی تھیں اور مسرت سے لبریز تھی۔ نمناک اس لئے کہ آج وہ اس محل میں تقریباً چھ سال بعد داخل ہو رہا تھا اور وہ خوش اس لئے تھا کہ اب وہ اس محل سے نکلا تھا تو وہ محض نجم الدین ایوب کا ایک خاموش طبع بیٹا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک بااثر امیر کا بیٹا ہے اس میں کوئی اور خوبی نہ تھی لیکن اب وہ نہ صرف ولایت مصر کا مرد آہن اور بلا شرکت غیرے فرمانروا تھی بلکہ سلطنت دمشق بھی اس کے ماتحت رہی تھی۔

امیر صلاح الدین ۱۲۳۸ء میں قلعہ شکریت میں بڑے ناساعد حالات میں پیدا ہوا تھا۔ اس شب وہ پیدا ہوا اس شب اس کے باپ نجم الدولہ کو قلعہ شکریت سے بے دخل کیا گیا تھا۔ اسی حادثہ کی وجہ سے صلاح الدین کو منحوس سمجھا جانے لگا تھا۔ پھر اس کی عمر کے ابتدائی نو سال طبلک میں گزرے جہاں اس کا باپ گورنر رہا تھا۔ ۱۲۴۶ء میں جب اس کے والد نجم الدین ایوب کو دمشق کی گورنری ملی تو وہ طبلک سے دمشق آگیا۔ اس طرح

کے ساتھ آئے تھے۔ دونوں چچا بیٹیجے نے تمام رات صلاح الدین کی خوابگاہ کے باہر رہنے کے لئے کھڑے رہے۔ صبح کے وقت صلیبیوں نے صلیبیوں کے ساتھ پہرہ دیا تھا۔ محل کے مختلف مقامات پر بھی محافظ مقرر کئے گئے تھے۔ صلاح الدین خلاوت سے فارغ ہوا تو اس کا بھائی سیف الاسلام طغٹکین گھبرایا ہوا خواب گاہ میں داخل ہوا۔

صلاح الدین نے کلام پاک جزوان میں رکھنے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہوا۔“
”میرے بھائی کیوں ہو سیف الاسلام؟“
”محترم وزیراعظم، ہزاروں آدمی محل کے باہر میدان میں جمع ہیں اور آپ کے دیدار کے لئے مدد کر رہے ہیں۔“ سیف الاسلام طغٹکین نے پریشان انداز میں کہا۔
”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔؟“ امیر نے اطمینان سے کہا۔ ”تمہیں ان کے غلوں کی قدر کرنا چاہیے۔“

”پھر میرے لئے کیا حکم ہے وزیراعظم؟“ طغٹکین نے عاجزانہ انداز میں پوچھا۔
”کوئی حکم نہیں سوائے اس کے کہ تم جاؤ اعلان کردو کہ اگر امرا اور معززین ہم سے ملنا چاہتے ہیں تو دربار میں انتظار کریں۔ ہم پہلے عوام سے ملاقات کریں گے۔“ امیر صلاح الدین کا لہجہ اچانک شاہانہ ہو گیا تھا۔

امیر صلاح الدین اگرچہ مصر کا وزیراعظم تھا مگر اس کا امرا اور اپنے عزیز و اقارب پر اس قدر عبث تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس کے سامنے بول نہیں سکتا تھا۔ اس وقت اس کا بھائی سیف الاسلام طغٹکین گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔ ایسی صورت وہ اپنی بات فوراً کہہ سکتا تھا لیکن اس نے اس وقت تک خاموشی اختیار کئے رکھی جب تک امیر نے اس سے سوال نہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر صلاح الدین کو درباری طور طریقوں اور نظم و ضبط کا اس وقت بھی خیال تھا جب وہ مصر کے وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھا۔

دوسرے بات یہ کہ امیر کے بھائی نے اسے ”وزیراعظم“ کہہ کے مخاطب کیا تھا شاید اس لئے کہ اس کے عزیز و اقارب مصر کی وزارت کو دمشق کی امارت پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ لفظ امیر میں غلامی کا پہلو نظر آتا تھا۔ خواہ یہ غلامی سلطان نور الدین زنگی جیسے جلیل القدر بادشاہ کی کیوں نہ ہو۔ صلاح الدین کے چچا اسد الدین شیرکوہ اور باپ نجم الدین ایوب نے تمام عمر خود کو نور الدین زنگی کے غلام ہونے پر فخر کیا۔ صلاح الدین کا بھی پہلے یہی حال تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو وزیراعظم مصر کہلوانا پسند کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب بھی سرکاری مکتوبوں میں سلطان محمد کو اپنا آقا اور شہزادے ملک الصالح اسماعیل کو ”آقا

دمشق کے اس محل میں اس نے مسلسل اٹھارہ سال گزارے۔ محل کی ہرائیٹ اور سے صلاح الدین کو عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ رات کے بیشتر حصہ تک وہ راہداریوں اور کمروں اور روشوں میں گھومتا رہا۔

امیر صلاح الدین نہ صرف نمازی تھا بلکہ وہ تہجد گزار بھی تھا۔ اس کا ذہن سے مذہب کی طرف مائل تھا پھر جب وہ سلطان نور الدین زنگی کے دربار میں پیش کیا سلطان کی دور رس نظروں نے صلاح الدین کے پیکر میں مستقبل کے ایک عظیم ہیولا دیکھا تو اسے فوراً اپنی سرپرستی میں قبول کیا اور حکم دیا کہ۔۔۔۔۔
”مجھے دیکھو اور خود کو میرے قالب میں ڈھالو۔“

اپنے مربی کا یہ قول صلاح الدین نے اپنی گرہ میں باندھ لیا اور اٹھارہ سال کی کے بعد وہ دوسرا نور الدین بن گیا۔ شیرکوہ یہ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ یہ کم گو توہم جو ان ایک منجھا ہوا شمشیر زن اور ایک ذہین حاکم بن سکتا ہے مگر جب صلاح الدین کے پہلے معرکہ میں اپنی شمشیر کے جوہر دکھائے تو شیرکوہ حیران رہ گیا۔ مختصر یہ کہ جب صلاح الدین نے بچپن کے نو سال۔ حلبک میں نہایت خاموشی سے گزارے تھے اس نے جوانی کے نو سال میدان جنگ میں بسر کئے۔ مصر میں اس کا قیام میدان بدر مترادف تھا۔ قدم قدم پہ مشکلات، روز روز کی جنگیں، سازشیں، بغاوتیں، صلاح الدین گری اور جہانداری کے ہر کرب سے گزر چکا تھا۔

مصر سے واپسی پر دمشق کی یہ پہلی صبح اس کے لئے کس قدر دلفریب تھی۔ پچا وہ دمشق میں تھا خود کو سلطان نور الدین زنگی کا غلام کہنے پر فخر کرتا تھا اور آج دمشق میں دوبارہ وارد ہوا تو پوری سلطنت دمشق اس کی غلامی کے لئے بے چین تھی۔ صلاح الدین حسب معمول تہجد کے لئے بیدار ہوا۔ تہجد کے بعد اس نے درود اور وظائف کا ورد کیا پھر نماز فجر ادا کی۔ کچھ وقت خلاوت میں گزارا پھر دربار کے۔۔۔۔۔ لیکن پہلے کی تیاری اور آنے کی تیاری میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ صلاح کے لئے دمشق کے زمین و آسمان الٹ گئے تھے۔ پہلے اسے سلطان کی سلامی کے لئے جانے کی جلدی ہوتی تھی اور آج وہ اگرچہ سلطان نہ تھا مگر سلطان کے انداز میں دربار تھا۔

صلاح الدین پورے خاندان کو قاہرہ میں چھوڑ کر دمشق آیا تھا۔ سات بھائیوں سے صرف ایک بھائی سیف الاسلام طغٹکین اور دوسرے بھائی شاہان شاہ کا بیٹا فرخ شاہ

زاوہ“ کہتا تھا۔

انہ ہوں اور نہ پرواہ لیکن میں ان امرائے نوریہ کو قطعی معاف نہیں کروں گا جن نے میرے آقا زاوہ کو درغلایا ہے اور سلطنت دمشق پر قابض ہونے کی کوشش کی ہے۔ یہ دواعیان ریاست بھی میرے غضب سے نہ بچ سکیں گے جنہوں نے دمشق کے کسی شہر اور علاقہ غضب کر کے اپنی ریاستوں میں شامل کر لئے ہیں۔“

صلاح الدین کی تقریر نے لوگوں کے دل جیت لئے۔ انہوں نے اس کی تعریف و ثناء کرنے لگا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس کی تقریر صرف عوام ہی نے نہیں سنی بلکہ اور خواص جو اس کی ملاقات کے لئے دربار پہنچ چکے تھے وہ بھی اٹھ کر میدان میں نکلے۔ عجب اس بات کا تھا کہ امیر صلاح الدین کی تقریر اور اس کے اعلانات نے جس م کو متاثر کیا تھا اس سے کہیں زیادہ خواص نے اسے سراہا تھا۔

ملاقات ختم ہوئی۔ میدان آہستہ آہستہ عوام سے خالی ہو گیا۔ امیر صلاح الدین، عزیز شہر کے جلوس میں دربار میں پہنچا۔ صلاح الدین اب تک محض ایک امیر اس نے امرائے نوریہ سے اسی طرح ملاقات کی جیسے وہ کسی سلطنت کا فرمانروا ہو۔ بادشاہ کے ہاتھ چما کرتے تھے۔ بعض امرائے صلاح الدین کی دست بوسی کی خواہش کرنے لگے۔ بے تکلف ہاتھ آگے بڑھا دیا پھر تمام لوگوں نے صلاح الدین کے ہاتھ کو بوسہ لگا کر رکھ لیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے سب سے مصافحہ کیا اور مصافحہ کی خواہش کی اس سے بخوشی بے تکلف ہوا۔ دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ امیر دربار میں دربار محل کے مہمان خانہ میں سجا تھا۔ امیر محل کے اندر چلا گیا اور پھر شام نہ ہوا۔

کی نماز کے وقت پھر دربار گرم ہوا۔ امرائے حاضری دی۔ امیر ان سے دیر تک بات چیت اور مصلحت کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ مغرب کی نماز اس کے بعد پھر دربار شروع ہو گیا۔ امیر نے کچھ سوچ کے دعاوی کی اجازت دی۔

میں صرف ایک آدمی تھا۔ بارش اور نورانی چہرہ امیر نے اس کے سلام کیا۔ ”بزرگ محترم اپنے آنے کا مقصد بیان کیجئے؟“

بزرگ محترم نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

میں بزرگ محترم آپ سالار فوج کی سفارت کے فرائض انجام

سیف الدین کے باہر جانے کے بعد امیر صلاح الدین نے لباس تبدیل کیا پھر دربار خاص کے ساتھ باہر کی طرف چلا۔ غلاموں کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھیں اور وہ الدین کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ محل کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ سال پورا میدان لوگوں سے بھر چکا تھا اور لوگ محل کی سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ صلاح الدین کے برآمد ہوتے ہی تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہوا۔ صلاح الدین نے ہاتھ اٹھا کر انہوں کو پذیرائی بخشی پھر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں ایسی خاموشی چھا گئی۔ جیسے میدان میں کوئی تنفس موجود ہی نہ تھا۔

امیر صلاح الدین اپنی پر عجب آواز میں مجمع سے مخاطب ہوا۔ ”میرے دوستو ساتھیوں اور تخت و تاج دمشق کے وفادارو۔ میں یعنی امیر صلاح الدین تم سے الگ بلکہ تم میں سے ہوں۔ میرا بچپن اور پوری جوانی دمشق کی گلیوں، سڑکوں اور باغوں گزری ہے۔ سلطان مرحوم نور الدین زنگی میرے اور میرے باپ اور چچا کے محل میں جس طرح سلطان مرحوم کا غلام تھا اسی طرح اپنے آقا زاوہ ملک الصالح اسماعیل کا غلام اور وفادار ہوں۔ میں اس لئے نہیں آیا کہ دمشق کی سلطنت پر قبضہ کروں۔ اقتدار کی ہوس نہیں اور نہ میں مفاد پرست ہوں۔ میں چاہتا تو مصر سے ایک عظیم لشکر کر بھی آسکتا تھا لیکن میں صرف سات سو محافظ سواروں کے ساتھ دمشق میں داخل ہوں۔ میرے کوئی دوسرے ارادے نہیں سوائے اس کے کہ سلطنت دمشق اسی طرح رہے جیسی سلطان مرحوم کے وقت میں تھی۔“

”یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ سلطان مرحوم کی آنکھ بند ہوتے ہی مفاد پرست اور دواعیان ریاست نے سلطنت دمشق کے حصے بخرے شروع کر دیے اور بڑے خودیہ آقا زاوہ کے سر پرست بن بیٹھے۔ یقین کیجئے کہ اگر سلطان مرحوم اپنی زندگی میں شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کا کسی کو اتالیق مقرر کرتے وہ میری اور صرف میری ذات ہوتی اس کے اگر امرائے نوریہ میں انہیں مجھ سے زیادہ وفادار اور مناسب امیر ہوتا تو وہ اسے بجائے مصر کا وزیر اعظم مقرر کرتے کیونکہ مصر سلطنت کا ایک صوبہ ہی نہیں بلکہ اپنی ایک مکمل اور مضبوط سلطنت ہے۔“

”میں آپ کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ فوری طور پر شہزادہ ملک الصالح اسماعیل نام کے بچے ڈھالے جائیں اور سلطنت دمشق کے تمام مساجد کے خطبوں میں ملک اسماعیل کا نام شامل کیا جائے۔ آخر میں میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ

ہے پادشاہ ایلارک مرچکا ہے اور اس کے بیمار جانشین کو نصرانی سرداروں نے بے دست و پا کر دیا ہے۔ اگر میں یروشلیم پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لوں تو مجھے کبھی معاف نہ کرنی۔ یہی حال سلطنت دمشق کا ہے۔ شہزادہ ملک الصالح بن مفاد پرستوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ میرے دمشق آنے کا یہ مقصد یہ فیصلہ شہر پر قبضہ کر کے اور فیصلہ قلعہ پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان دمشق کا شہر ہو یا قلعہ یہ تو ملک الصالح کی میراث ہیں اور اسی وارث تخت و تاج کو مجھے قلعہ پر قبضہ کی کوئی جلدی نہیں۔ جلدی ہے تو ان امرا کو کیفر کردار تک جو ملک الصالح کو اپنی قید میں رکھے ہوئے ہیں۔

صلاح الدین کی یہ تقریر نہیں بلکہ دل کی آواز تھی جس نے امراء نوریہ کی قلب سے بالکل صاف کر دیے اور وہ بیساختہ امیر صلاح الدین کا نعرہ بلند کر اٹھے۔

ہو گیا کہ صلاح الدین سلطنت دمشق کا دل سے خیر خواہ ہے۔

اموش ہوا تو قاضی شہر نے عرض کیا۔ ”امیراعظم کے جذبات کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں۔ تاریخ دمشق سے ان کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ سچ تو وقت صرف امیر ہی ایسی ہستی ہیں جو دمشق کی ذوقی کشتی کو سارا دے سکتے

شہر نے رک کر امیر کو دیکھا اور بولا۔۔۔“ کیا میں امیر کی گفتگو سے یہ نتیجہ حق بجانب ہوں کہ انہوں نے سپہ سالار اور افواج دمشق کی درخواست کو شرف ہے اور سپہ سالار فوج اس دربار میں خزانہ اور قلعہ کی چابیاں پیش کرنے آسکتے

محترم۔ سالار فوج کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ کل صبح ہمارا عزیز بھتیجا انور الدولہ شہان شاہ خود قلعہ دمشق پہنچ کے چابیاں حاصل کرے گا۔“ امیر نے بار بار غصہ کر دیا اور قاضی شہر اور پہلی وزارت کے مفتی اعظم اور نائب سالار جانے کی اجازت دیدی۔

شہر ہے کہ جب گیلڈر کی موت آتی ہے تو وہ آبادی کی طرف بھاگتا ہے۔ امیر ابن مقدم کا شہزادہ ملک الصالح اسماعیل پر زور نہ چل سکا کہ اسے دوسرا امیر بن کر شہر میں طلب لے بھاگا تھا۔ ادھر سے مایوس ہونے کے بعد اس دمشق پہ سالار کو اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی اور چاہا کہ وہ امیر صلاح الدین کی اعلیٰ کی مزاحمت کرے لیکن سالار فوج نے بھی اسے نکال دیا کہ وہ

دینے آئے ہیں۔“ امیر نے دوسرا سوال کیا اور سفیر کو غور سے دیکھنے لگا۔

”امیراعظم نے درست خیال فرمایا۔“ بزرگ نے کہا۔ خادم قاضی شہر حضور عالی میں سپہ سالار افواج دمشق کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہے۔

”کس قسم کی درخواست ہے؟“ امیر نے ہر سری انداز میں پوچھا۔

قاضی شہر نے سنبھل کے کہا۔ ”سپہ سالار درخواست گزار ہیں کہ انہیں شہر کی چابیاں حضور عالی میں پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔“

”یہ پیش کش مشروط ہے کیا؟“ امیر کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا تھا۔

”پیش کش مشروط نہیں بلکہ مودبانہ ہے امیراعظم۔“ قاضی شہر نے فوراً درباریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شہر کے دروازے امیر صلاح الدین کھل گئے تھے۔ شہریوں نے امیر کا پرچہ استقبال بھی کیا تھا لیکن قلعہ دمشق فوج کا قبضہ تھا اور اس کے دروازے صلاح الدین پر بند کر دیئے گئے تھے۔ امراء نوریہ جو امیر صلاح الدین کو خوش آمدید بھی کہہ چکے تھے انہوں نے درخواست کی تھی کہ قلعہ دمشق پر فوری طور پر قبضہ کر لیا جائے۔ شمس الدین محمد ابن مقدم کو تاج دمشق سے غداری اور قلعہ پر قبضہ بے جا ہے مگر امیر صلاح الدین نے ان کی تمام دلیلیں سننے کے بعد کہا۔

”مجھے امراء نوریہ کے جذبات کا احترام ہے لیکن میں سرزمین دمشق کے بھی میدان جنگ میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ وہ مقدس زمین ہے جس کی مکہ کے پے میں سمائی ہوئی ہے۔ یہاں پھولوں کی بارش تو ہو سکتی ہے لیکن خون کا آبا بہایا جاسکتا۔“

امیر کے اس جواب کے بعد امرا کی زبانوں پر مر سکوت لگ گئی تھی پھر آقا زادہ قلعہ کے سالار فوج غیر مشروط طور پر قلعہ کی چابیاں حوالے کرنے کی پیش کش ملک الصالح خوشی کی کوئی حد نہ رہی لیکن امیر صلاح الدین اب بھی خاموش تھا۔ اس کے بعد نہ معلوم صلاح الدین کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی خاموشی نے طول بجائے مصر کا دل ہو گئے اور دربار میں ایک دوسرے کو اشارے شروع ہو گئے۔

امیر صلاح الدین نے بڑی غور و فکر کے بعد سر اٹھایا۔ درباریوں کی نظر ”میں آپ“ ”دوستو“ صلاح الدین نے قلعہ کی سفارت کی بجائے اپنے ساتھ نام کے سکے ڈالے۔ ”میں اقتدار کا بھوکا نہیں اور نہ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا

اسماعیل کا نام گیری کی تمنا ہوتی تو میں سب سے پہلے یروشلیم پر حملہ کرتا جہاں کا حکمران

فصیل شہر پر امیر صلاح الدین کو اس لئے نہیں روک سکتا کہ وہ خود بھی اسی کے آب و دانہ کا پروردہ ہے۔ سالار فوج نے اسے یہ ضرور یقین دلایا کہ الدین نے کچھ ضمانتیں اور وضاحتیں نہ پیش کیں تو اسے قلعہ و مشق میں نہ جائے گا۔

چونکہ شمس الدولہ ابن مقدم کا کردار مشکوک ہی نہیں بلکہ کھلا ہوا منافق تھا اور وہ جانتا تھا کہ صلاح الدین اسے ہرگز معاف نہ کرے گا اس لئے ا کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے اپنے زور بازوں اور دل و دماغ پر اعتماد کرنے مقدم کے ذاتی محافظ دستے میں پچاس آہن پوش سوار اب تک اس سے جارہے تھے اور اس کے پسینے پر خون بہانے پر ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ علاوہ ابن مقدم کے پاس ایک اور طاقت بھی تھی جو سو دوسو پر نہیں ہزار بھاری تھی۔ وہ تھی اس کی پر جمال بیٹی ارمغانہ۔

ارمغانہ واقعی حور معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ماں بچپن ہی میں انتقال کے باپ ابن مقدم نے اسے ماں کی ممتا کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس وہ چاہتا تو شادی کر سکتا تھا لیکن اس نے معصوم ارمغانہ کے لئے اپنی جوانی تج اور باپ دونوں بن کے پالا پوسا اور جوان کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کس قدر شدید محبت تھی۔ ارمغانہ کو بھی باپ کی محبت اور قربانیوں کا تھا اور وہ اپنے باپ کے لئے جان دینے پر بھی تیار ہو سکتی تھی۔

پھر جب سلطان نور الدین زنگی کا انتقال ہوا اور ابن مقدم کچھ ایسا
شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کا سرپرست بنا تو اسے دور کی سوچیں۔ ایک دن
کے سرپرست محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی تو جانتی ہے مجھے تجھ
سے؟“

”ابا جان۔ میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ آپ دنیا کے تمام باپوں سے محبت کرتے ہیں۔“ ارمغانہ نے دل سے باپ کی محبت کا اعتراف کیا۔ ابن مقدم نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”ٹھیک کہتی ہو ارمغانہ۔“ سب کچھ دیدیا۔ اپنا دھن و دولت اپنا وقت۔ یہاں تک کہ اپنی پوری خوشیوں کو تم پر نثار کر دیا۔“

ارمغانہ باپ کے گلے سے لگ گئی۔ ”ابا جان۔ مجھے احساس ہے۔
خوشیاں میری جھولی میں ڈالی ہیں۔ کاش میں آپ کی محبت کا کچھ بدلہ آپ

”میں تم سے کسی بات کی خواہش نہیں کرتا۔“ ابن مقدم نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔
 ”ہاں اگر مجھے یہ خیال آتا ہے اگر تمہارے بجائے مجھے اللہ نے بیٹا دیا ہوتا تو اس وقت وہ
 میرے بڑے دنوں میں کام آتا۔“

ارمغانہ افسردہ ہو گئی۔ ”ابا جان، میں بیٹا تو نہیں بن سکتی لیکن آپ نے مجھے تمام مردانہ صلاحیتوں کی تربیت دلائی ہے۔ میں فنون سپہ گری میں ایسی ہی طاق ہو گئی ہوں جیسے آپ کا بیٹا ہوتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں جسم پڑا سلحہ سجا کر ہر وقت آپ کے ساتھ رہا کروں اور موقعہ ملے تو آپ پر نثار ہو جاؤں۔“

”میں تمہارے جذبہ ایثار کی قدر کرتا ہوں ارغمانہ“ ابن مقدم د گلیہ آواز میں بولا۔
 لیکن مجھے اس وقت ایک مرد کے طاقتور ہاتھ کی ضرورت ہے جو میری مشکلات میں ڈھال
 بات ہو۔ میں مصائب میں بری طرح گھر گیا ہوں بیٹی۔ امرا نے میری خوشامد کر کے مجھے
 نوازہ ملک الصالح السخیل کا سرپرست بننے پر مجبور کیا مگر اب وہی لوگ میرے مخالف ہو
 گئے ہیں۔ میں ان سے غمخیز کی طاقت رکھتا ہوں مگر شہزادے کی تلون مزاجی نے مجھے پریشان
 کر رکھا ہے۔ وہ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے
 کس طرح قابو کروں۔ اگر کچھ دن اس کی یہی حالت رہی تو نہ صرف اس کی سرپرستی سے
 تھ اٹھتا ہوں بلکہ خود میری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔“

”شہزادے کیا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو کیوں پریشان کرتے ہیں؟“ ارغمانہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”کہہ تو دیا بیٹی۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بچوں کی طرح ضدیں کرتا ہے۔“ ابن مقدم نے مایوس انداز میں کہا۔ میں نے تمہیں ماں بن کے پالا ہے مگر شزاوہ یکہ ایسا مشکل سوال ہے جس کا حل میرے پاس نہیں۔“

”مشکل سوال کا حل بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔“ ارمغانہ سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ شاہی محل میں پلنے والا بارہ سال کا لڑکا بچہ نہیں لگا جاسکتا۔ اس میں یقیناً“ شعور ہوگا۔ آپ اس کی خواہشوں کا احترام کیا کیجئے۔“

ابن مقدّم کچھ دیر سوچتا رہا پھر چونک کے بولا۔ ”ہاں شنزادے کو ایک طرح سے قابو لے لیا جاسکتا ہے۔“

”کس طرح ابا جان؟“ ارمغانہ نے جلدی سے پوچھا۔
 ”اس کی شادی ہو جائے تو وہ سنبھل سکتا ہے۔“ ابن مقدم نے فوراً جواب دیا۔
 ارمغانہ شادی کر لے۔ یہ فطری حیا سے اس کی گردن نیچی ہو گئی۔

ارمغانہ کمال حیرت سے باپ کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ایہ وہی باپ ہے جو اس کی بیماری کے دوران اسے تمام رات گود میں لئے کھڑا رہتا تھا۔ اب اس کی یہ حالت ہے کہ مجھے اقتدار کی سولی پر چڑھا رہا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ انساناً فطرتاً برا نہیں ہوتا۔ اسے ماحول اور حالات برا بنا دیتے ہیں۔ ابن مقدم نے بہت سوچ کے کیا تھا۔ اسے امید تھی اس کی بیٹی اس بات میں اس سے ضرور تعاون کرے گی۔ ملکہ دمشق ایک ایسی لالچ تھی جو لڑکی قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی لیکن پتہ نہیں۔ ارمغانہ کس فطری اور کس کردار کی لڑکی تھی کہ ”ملکہ دمشق“ کا تاج بھی اسے متاثر نہ کرے۔

اس نے بڑے ادب سے کہا۔ ”ابا جان عزت اور ذلت تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ میں ملکہ دمشق سے زیادہ آپ کی بیٹی رہنے میں خوش ہوں۔ میں تو اس وقت کو کوسی میں جب آپ اقتدار کی جنگ میں شامل ہوئے تھے۔ آپ کا دن رات کا آرام ختم ہو گیا۔ پنے پرانے بن گئے اور اب وہ وقت آگیا کہ آپ اس اس جنگ کو جیتنے کے لئے اپنی بیٹی کو لالچ پر لگا رہے ہیں۔“

”نہیں ارمغانہ۔ اس میں تیری بھلائی ہے۔ شاہی محل میں پہنچنے کی تو تمام دنیا تیرے لئے بھگے گی۔“ ابن مقدم بیٹی کو طرح طرح سے ترغیب دے رہا تھا۔ ”میری عمر تو گزر رہی ہے۔ میں یہ سب کچھ تیرے لئے کر رہا ہوں۔“

”ابا جان آپ میری جان لے لیجئے مگر اس بات کے لئے مجبور نہ کیجئے۔“ ارمغانہ ہانسی ہو گئی۔ ”آپ مجھے شاہی محل کے سازشی ماحول میں دھکیل رہے ہیں۔ وہاں میرا کون سا کام ہے؟“

”شہزادہ۔۔۔ تمہارا ساتھ شہزادہ دے گا بیٹی۔“ ابن مقدم نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”کیا زائد اس قدر ناسمجھ ہے کہ وہ تجھے سازشوں کا شکار ہونے دے گا؟“

”وہ واقعی ناسمجھ اور نادان ہے ابا جان۔“ ارمغانہ جھنجھلا گئی۔ ”نہیں بیٹی یہ تمہارا خیال ہے۔ اس کی عمر اگرچہ بارہ سال ہے مگر وہ شعور کی حدود سے باہر ہو چکا ہے بادشاہ زادے تو گیارہ بارہ سال میں جوان ہو جاتے ہیں۔“ ابن مقدم سے قائل کرنے پر بضد تھا۔

”ارمغانہ طرح طرح کے بہانے کر رہی تھی۔ وہ باپ کو صاف جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔“ ابا جان خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کیجئے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ شہزادہ ابھی شکل سے لڑ سال کا ہے۔ امیروں اور درباریوں نے اسے بارہ سال کا بنا دیا ہے۔ ارمغانہ کو غصہ

”کیوں بیٹی۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔ تم ہی نے تو پوچھا تھا۔“ ابن مقدم نے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

ارمغانہ پھر بھی خاموش رہی۔ ابن مقدم نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”ارمغانہ کیا محبت کا یہی صلہ ہے کہ اب تم میری بات کا جواب بھی نہیں دیتیں؟“

”ابا جان یہ بات نہیں ہے۔“ ارمغانہ کو آخر زبان کھولنا پڑی۔ ”دراصل شادی کے معاملات کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ میں کیا جواب دے سکتی ہوں آپ کو؟“

”آخر تمہاری بھی تو کوئی رائے ہونی چاہیے؟“ ابن مقدم نے جواب کے لئے اصرار زور دیا۔

”کس بارے میں ابا جان؟“ ارمغانہ الجھ گئی۔

”میں نے کہا کہ اگر شہزادے کی شادی کر دی جائے تو وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔“

ارمغانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ابا جان اگر آپ کا خیال درست ہے اور میرا

ہے کہ آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہوگا۔ پھر آپ اس کی شادی کر دیجئے۔ میں آپ کے سے اتفاق کرتی ہوں۔“

”مگر سوال یہ ہے کہ شادی کس لڑکی سے کی جائے؟“ ابن مقدم نے اس انداز میں ارمغانہ کو دیکھا جیسے ارمغانہ کے پاس اس کا جواب تھا۔

ارمغانہ کی نظریں نیچی تھیں۔ اس نے سرسری سا جواب دیا۔ ”آپ شاہی محل تمام لڑکیوں کو جانتے ہیں جسے مناسب سمجھے اس سے شادی کر دیجئے۔ میرا خیال۔

شہزادے سے شادی کرنے پر ہر لڑکی تیار ہو جائے گی۔“

”تم بھی تیار ہو جاؤ گی کیا؟“ ابن مقدم نے اک دم ارمغانہ سے سوال کر دیا۔

ارمغانہ نے گھبرا کے باپ کو دیکھا پھر اس کا پورا بدن پسینے میں بھگ گیا۔

”ابا جان۔ شہزادے کے لئے کسی شہزادی کا رشتہ موزوں رہے گا۔ آپ میرے

نہ سوچئے۔“

”ارمغانہ تم عقلمند ہو۔ ذرا سوچو اگر شہزادے کی شادی کسی شہزادی سے کر دو

میری بات کب مانے گا۔“ ابن مقدم نے خوشامدہ رویہ اختیار کیا۔ ”اگر تو شہزادہ شادی کر لے تو ہم دونوں کی قسمت کھل جائے۔ تو دمشق کی ملکہ بنے گی اور میں

بے تاج بادشاہ ہو جاؤں گا۔“

نہی کے سواروں نے تمام محافظوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کی لاشیں مغربی دروازے سے اُٹھ کر شہزادے اسماعیل کی خوابگاہ تک بکھری پڑی تھیں۔
 شمس الدین محمد ابن مقدم نے شہزادے کی خوابگاہ میں اندر جا کر دیکھا۔ وہاں کسی کے آثار نہ تھے۔ ابن مقدم شہزادے کے چھپر کھٹ پر سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ سونے پڑا اڑ چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا شہزادہ بغیر چوں چرا امیر کشکین کے ہمراہ چلا گیا۔
 ابن مقدم کا تمام منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔

ارمغانہ ایک بڑے عذاب سے بچ گئی تھی۔ اس نے بظاہر باپ کی ہمدردی کی لیکن دل خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک آنے والی بلا سے اس کو بچا لیا تھا۔ اس کے بعد ابن مقدم کے حالات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ قلعہ میں کافی فوج موجود تھی لیکن شہزادے طلب پہنچ جانے سے فوج کا دل ٹوٹ گیا۔ کچھ نے ملازمت چھوڑ دی۔ کچھ لشکر شہزادہ پاس طلب چلا گیا۔ باقی ادھر ادھر ہو گیا۔ ابن مقدم نے بھی ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ طلب پر حملہ کر کے شہزادے کو واپس دمشق لاتا۔

اب امیر صلاح الدین کے دمشق آنے کی خبر اڑی تو جیسے باسی کڑھائی میں ابال آیا۔ صلاح الدین ابن مقدم کے دل میں ایک بار پھر اقتدار حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ صلاح الدین کے دشمنوں نے اسے دربار دمشق میں کافی بدنام کر رکھا تھا۔ عوام بھی اس کے نفرت اور قلعہ دمشق جہاں فوجی چھاؤنی تھی اور بچی کچھی فوج رہتی تھی اسے صلاح الدین کی نیت پر شبہ تھا اور وہ اس کی وفاداری کے شاکہ تھے۔ فوج نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ صلاح الدین سے وفاداری کی ضمانت مانگے گی اور اگر صلاح الدین نے فوج کو مطمئن کیا تو اس کے حوالے کیا جائے گا ورنہ سخت مدافعت ہوگی۔

ابن مقدم قلعہ کی فوج اور صلاح الدین کو لڑانا چاہتا تھا لیکن سپہ سالار نے اسے نکاسا اب دے دیا۔ ادھر سے ناامید ہو کر ابن مقدم نے اپنے طور پر اقتدار پر قبضہ کی تدبیریں چنا شروع کیں مگر وقت کم تھا۔ درمیان میں صرف ایک رات تھی دوسرے دن صلاح الدین کا بھتیجا فرخ شاہ قلعہ کی چابیاں لینے آرہا تھا۔ ابن مقدم کے پاس کچھ سوار تھے لیکن بڑے وفادار اور دلیر تھے۔ ابن مقدم کو ان سے بڑی امید تھی۔ دوسری طاقت اس کے لارمغانہ کی تھی۔ ایک بار اس نے ارمغانہ کو اپنی مقصد براری کے لئے رضامند کر لیا تھا لہذا وہ بھی وہ ارمغانہ کی کمان سے تیر چلانا چاہتا تھا۔

اس کے فتنہ پرور ذہن نے یہ منصوبہ بنایا کہ صبح کو جس وقت صلاح الدین کا بھتیجا فرخ قلعہ میں داخل ہو تو اسے قتل کر دیا جائے اور فرخ شاہ کے ساتھ آنے والے سواروں

”میری عمر سولہ سال کی ہو چکی ابا جان۔ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں۔“

ابن مقدم خاموش رہا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے زیادہ زور دیا تو ارمغانہ بائی گی۔ شہزادے کا سر پرست بن کے اس نے اپنے دشمنوں میں کافی اضافہ کر لیا ارمغانہ کی بغاوت اسے ایک مستقل عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ وہ کوئی اور تدبیر لگ گیا۔

ارمغانہ نے آج تک نہ اس طرح کی گفتگو کی تھی اور باپ کو اتنے تلخ جو تھے۔ اسے باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ اس محبت کا جواب تھا جو ابن مقدم سے جوانی تک اس کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ابن مقدم کا فکر مند چہرہ ارمغانہ سے گیا۔ بڑے پیار سے بولی۔ ”ابا جان آپ ناراض ہو گئے؟“

ابن مقدم نے ٹھنڈی سانس کے ساتھ جواب دیا۔ ”نہیں بیٹی، کوئی اپنی ناراض ہو سکتا ہے؟“

ارمغانہ تڑپ اٹھی۔ اس کی مدافعت باپ کے ایک محبت بھرے جملے میں بر جان۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جاوے آپ کے حکم پر سر جھکاؤں ہوں۔“

”میری بیٹی!“ اور ابن مقدم نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

اس رات ابن مقدم کو خوشی کے مارے نیند نہ آئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ہی شہزادے ملک الصالح اسماعیل کو ارمغانہ سے شادی کرنے پر رضامند کرے شہزادہ خوشی سے راضی نہ ہوا تو اس کام میں زبردستی سے بھی گریز نہ کرے گا۔ اور ابن مقدم خوشی خوشی شاہی محل پہنچا۔ مگر محل کے صدر دروازے پر اسے کچھ سنائی گئی۔

”امیر محترم۔“ صدر دروازے کے محافظ اعلیٰ نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ ”رات پہر امیر سعد الدین بن کشکین جنوبی دروازے سے زبردستی محل میں داخل ہوئے۔ ساتھ پانچ سو سواروں کا دستہ تھا۔ دروازے کے تمام محافظ لڑتے لڑتے قتل ہو گئے۔ کشکین شہزادے ملک الصالح اسماعیل کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اسی دروازے گئے۔“

ابن مقدم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ چند لمحے محافظ کو پھٹی پھا سے دیکھتا رہا بے تحاشہ محل کے مغربی دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے ہر ایک سوسلح سوار مقرر کئے تھے۔ محل کے اندر بھی اس نے دو سوار مقرر کئے گئے

کو قابو میں کر کے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اس طرح جب صلاح الدین ملے گی کہ قلعہ والوں نے اسے دھوکہ دیا ہے اور اس کے نتیجے کو قتل کر دیا۔ قلعہ پر حملہ آور ہوگا اور قلعہ کی فوج کو مجبوراً قلعہ کی مدافعت کرنا پڑے گی۔ میں بہت خامیاں تھیں اور اس کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن شمر مقدم کا جتنا دماغ تھا وہ اس کے مطابق کام کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن کامیابی کا پورا یقین تھا اسی وجہ سے وہ ارمغانہ کو داؤ پر لگا رہا تھا۔

شمر الدین ابن مقدم نے اپنے منصوبہ کے مطابق ارمغانہ کو اپنے اعتبار کو شش کی۔ اس نے ارمغانہ کو پاس بلا کر اپنے سامنے بٹھایا۔ ارمغانہ نے شکر لیا تھا کہ آج اس کا باپ بہت خاموش خاموش اور پریشان ہے۔ باپ کی دبا ارمغانہ نے گفتگو میں خود پہل کی۔

”ابا جان۔ آپ بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔“ ارمغانہ نے آغاز کیا۔ اس صلح پر بڑی خوشیاں منا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح قلعہ جو اور قلعہ والوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”یہ سب ان کا خیال ہے بیٹی۔“ ابن مقدم نے کمال افسردگی سے کہا۔ اور قلعہ والوں کی تباہی پر رونا آرہا ہے۔ تم صلاح الدین کی فطرت سے دا اسکندریہ، بلیس اور قاہرہ میں اس نے جو تباہی مچائی تھی۔ اسے وہ دمشق میں کل اس قلعہ کا کوئی برج اور مینار باقی۔۔۔۔۔۔“

”مگر ابا جان۔۔۔۔۔۔ قلعہ کی مختصر فوج امیر صلاح الدین کو قلعہ میں داخل روک تو نہیں سکتی“ ارمغانہ نے دلیل پیش کی۔ جس طرح وہ شہر میں داخل قلعہ پر بھی قابض ہو سکتا ہے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے بیٹی۔“ ابن مقدم نے بڑی محبت سے ارمغانہ کی ”صلاح الدین کے ساتھ مشکل سے سات سو سوار ہیں اور قلعہ میں تین ہزار ہے۔ ہمت کی جائے تو صلاح الدین کو بھاگنے کا راستہ نہیں مل سکتا۔“

”ابا جان۔ اگر اتنا لشکر ہے تو پھر سپہ سالار نے صلاح الدین کو شہر میں ہونے دیا اور اگر وہ شہر میں داخل ہو گیا تھا تو اسے بغیر لڑے بھڑے قلعہ کی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟“ ارمغانہ کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ یہ نہیں کہ مخالفت کر رہی تھی بلکہ وہ خود کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

”اسی کی وجہ سپہ سالار کی خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔“ ابن مقدم نے

سپہ سالار پر الزام لگایا۔ ”اس نے صلاح الدین کے پاس خفیہ طور پر اپنے نائب کو بھیجا جس نے دونوں میں معاہدہ کرا دیا ہے۔“

ابا جان کی خبر دمشق کے لشکر کو نہیں ہے؟“ ارمغانہ نے پھر ایک ذہانت بھرا سوال

”یہ بات نہیں بیٹی۔“ ابن مقدم نے بیٹی کو پھر فریب دیا۔ ”لشکر تو جنگ کرنا چاہتا ہے سپہ سالار کی غداری کی وجہ سے وہ بھی خاموش ہے۔ لشکر کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنے مالدار کے حکم پر چلتا ہے۔“

”پھر اب کیا ہو سکتا ہے ابا جان۔۔۔“ ارمغانہ نے افسردگی سے کہا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا اب بھی امیر صلاح الدین سے صلح کر کے ان جھگڑوں سے الگ ہو جائیں؟“

”ایسا نہیں ہو سکتا ارمغانہ۔۔۔“ ابن مقدم نے سختی سے کہا۔ صلاح الدین اعلان کر چکا کہ وہ شہزادے کو درغلانے والے امرا کو سخت سزا دے گا۔۔۔“

”ابا جان۔ کیا کوئی ایسا راستہ نہیں کہ ہم قلعہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ جائیں؟“ ابن مقدم نے مصیبت سے کہا۔

”ہرگز نہیں۔ میں بزدل نہیں۔ صلاح الدین بھی میری طرح ایک امیر ہے۔ میں اس نابلد کروں گا۔“

”مگر آپ کی مدد کون کرے گا ابا جان؟“ ارمغانہ نے پوچھا۔

”میری مدد۔ میری مدد وہ کرے گا جو مجھے چاہتا ہے۔ میرے لئے جان دے سکتا ہے؟“

”ابا جان۔۔۔۔۔۔ قلعہ کی مختصر فوج امیر صلاح الدین کو قلعہ میں داخل روک تو نہیں سکتی“ ارمغانہ نے دلیل پیش کی۔ جس طرح وہ شہر میں داخل قلعہ پر بھی قابض ہو سکتا ہے۔“

”ابا جان۔ اگر اتنا لشکر ہے تو پھر سپہ سالار نے صلاح الدین کو شہر میں ہونے دیا اور اگر وہ شہر میں داخل ہو گیا تھا تو اسے بغیر لڑے بھڑے قلعہ کی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟“ ارمغانہ کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ یہ نہیں کہ مخالفت کر رہی تھی بلکہ وہ خود کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

”اسی کی وجہ سپہ سالار کی خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔“ ابن مقدم نے

”ابا جان۔ اگر اتنا لشکر ہے تو پھر سپہ سالار نے صلاح الدین کو شہر میں ہونے دیا اور اگر وہ شہر میں داخل ہو گیا تھا تو اسے بغیر لڑے بھڑے قلعہ کی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟“ ارمغانہ کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ یہ نہیں کہ مخالفت کر رہی تھی بلکہ وہ خود کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

”اسی کی وجہ سپہ سالار کی خود غرضی اور مفاد پرستی ہے۔“ ابن مقدم نے

بار پہلے بھی اپنی بیٹی ارمغانہ کو اپنے مفاد پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوا تھا اور ارمغانہ یہ جانتے ہوئے بھی شہزادہ ملک الصالح اسماعیل کی عمر صرف دس سال ہے اور اس سے چھ سال چھوٹا ہے باپ کی ضد سے مجبور ہو کر اس بات پر آمادہ ہوئی تھی کہ اسے شادی کرے گی لیکن قدرت کو اس کو اس عذاب سے بچانا منظور تھا اس لئے مجوزہ شادی سے صرف ایک رات قبل دربار دمشق کا ایک دوسرا امیر سعد الدین بن یحییٰ شہزادہ کو فرار کرا کے حلب پہنچ گیا۔ اس طرح یہ تیل مونڈے نہ چڑھ سکی۔

اب یہ ابن مقدم کی دوسری کوشش تھی۔ وہ ارمغانہ کے ہاتھوں ایک خطرناک کام کرا اقدار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پہلے اس نے ارمغانہ کو اس مذموم اور خطرناک کام کے لئے آمادہ کیا پھر اپنے محل سے نکل کے قلعہ کی چھاؤنی میں پہنچا۔ قلعہ کی تمام فوج اپنے سپہ سالار کے ساتھ تھی لیکن ابن مقدم نے فوج کے ایک ہم سردار کو توڑ لیا یوں کہتا چاہیے کہ وہ خود ابن مقدم کے قدموں میں پکے آم کی طرح آگرا تھا۔ اس کا نام دانیال تھا۔ شمس الدین ابن مقدم کے زمانہ عروج میں یعنی اس وقت جب ابن شہزادہ ملک الصالح کا سرپرست بنا تھا۔ دانیال کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ ارمغانہ کو مقدم کے محل سے اپنے پرے میں شاہی محل پہنچائے کیونکہ ابن مقدم نے اقدار کو ل کر کے شاہی محل کے ایک حصے میں رہنا شروع کر دیا تھا اور ارمغانہ کو بھی وہیں بلوا

مشہور ہے کہ دانیال نے ارمغانہ کو اس کے محل سے شاہی محل منتقل کرنے کے لئے دیکھ لیا تھا اور وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت ابن مقدم کو اختیارات حاصل تھے اس لئے دانیال اپنی خواہش کا اظہار نہ کر سکا اور ارمغانہ کی خدمت اندر ہی اندر جتا رہا اور سلکتا رہا۔ اس کی خبر ارمغانہ کو بالکل نہ تھی مگر ابن مقدم کی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ دانیال اس کی بیٹی کو چاہنے لگا ہے۔ اگر ابن مقدم یہ نہ کر دیتا تو کچھ برا نہ تھا لیکن اس کے دماغ میں تو ارمغانہ کو شہزادے کی بیوی بنانے کا مانگ تھیں۔ اس لئے اس نے اس طرح توجہ نہ دی اور وہ بات دہی رہی۔

مگر جب شہزادہ ملک الصالح اسماعیل اس کے ہاتھ سے نکل کے حلب پہنچ گیا تو ابن مقدم نے فوراً دانیال کا سارا ڈھونڈا اور اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس کے لشکر کا سپہ سالار بن جائے تو ارمغانہ سے اس کی شادی کروئی جائے گی۔ دانیال شاید انکار کر دیا یا پھر اس میں اتنی اہلیت نہ تھی اس لئے یہ بات بھی دہی رہی۔ ابن مقدم نے اس وقت شناس اور شاطر تھا۔ اس نے ایک بار پھر دانیال کا تعاون حاصل کرنے کی

میں دعا کرتی ہوں کہ وہ آپ کی سچے دل سے مدد کرے اور اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے۔
”نہیں ارمغانہ۔ تم اتنی اہم ہستی کا نام تو پوچھو؟“ ابن مقدم کو جیسے ضد ہو گئی۔
ارمغانہ نے بے دلی سے پوچھا۔ ”اچھا بتائیے ابا جان وہ عظیم ہستی کون ہے؟“
”وہ عظیم ہستی سوائے میری ارمغانہ کے اور کون ہو سکتا ہے۔“ اور ابن مقدم نے بے شری سے دانت نکال دیئے۔

ارمغانہ چونک پڑی۔ ”میں۔ میں آپ کی کیا مدد کروں گی۔۔۔؟“
”صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو بیٹی۔“ ابن مقدم نے اس قدر زور دے کے اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو۔

”میں کیا کروں گی۔ کچھ مجھے بتائیے تو ابا جان؟“ ارمغانہ گھبرا گئی۔ اس کی پیشکش کی منہی منہی بوندیں چمکنے لگیں۔

”میں تجھے سب بتا دوں گا۔ حوصلہ رکھو۔ دل کو سنبھال بیٹی۔ تو ایک بہادر باپ کی بیٹی ہے۔“ ابن مقدم نے ارمغانہ کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔
”نہیں ابا جان۔ مجھے فوراً بتائیے۔ کیا کام لینا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“
بچوں کی طرح بلکنے لگی۔

”ہاں بتاتا ہوں۔ تو اکیلی نہیں ہوگی۔ تیرے ساتھ میرے اعتماد کا ایک آدمی بھی ابن مقدم نے پھر سمجھایا۔

”بتائیے۔ بتائیے۔ میں آپ کے لئے جان دے سکتی ہوں لیکن کوئی ایسا کام کروں گی جسے میرا دل میرا ضمیر قبول نہ کرے۔“ ارمغانہ نے ذرا سا احتجاج کیا۔
”ارمغانہ تیری جان اور میری جان تو ایک ہی ہے۔ میں تیری جان کیسے ہوں۔“ ابن مقدم نے بظاہر بڑی محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تجھے صرف میرا اپنے باپ کو پھر سے اقدار پر قبضہ کے لئے تھوڑی سی کوشش کرنا۔ ذرا ہاتھ پیرانا باقی میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ میں اپنے محافظ دستے کے قلعہ کے دروازے پاس موجود ہوں گا۔“

”آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے ابا جان؟“ ارمغانہ اٹھ کے کھڑی ہوئی۔
ابن مقدم بگڑ گیا اور ارمغانہ کو آہستہ آہستہ کچھ سمجھانے لگا۔

وہ والدین ظالم اور جہنی ہوتے ہیں جو دنیاوی مراعات حاصل کرنے کے معصوم اولاد کو تلہ کار بناتے ہیں۔ شمس الدین ابن مقدم بھی اسی گروہ سے تعلق

کوشش کی۔ ابن مقدم نے اس رات دانیال سے ملاقات کی جس رات کی صبح کو قلعہ دمشق کا قبضہ لینے آنے والا تھا۔

”دانیال۔۔“ ابن مقدم نے شرم و غیرت بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے مخاطب ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے پہلے بھی ارمغانہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کا ارادہ کیا تھا۔“

”مجھے یاد ہے امیر محترم۔“ دانیال نے اقرار کیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں اس شرط پوری نہیں کر سکا۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ شرط یقیناً بہت مشکل تھی۔“ ابن مقدم نے دانیال کی آنکھوں آنکھیں ڈالیں۔ ”لیکن تمہیں یہ ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ میں نے اب تک ارمغانہ شادی نہیں کی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ارمغانہ کی قسمت تمہارے ساتھ ہے۔“

”امیر محترم۔۔۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی اگر آپ۔۔۔۔۔“

”ذرا ٹھہرو دانیال۔۔“ ابن مقدم نے اس کی بات کاٹی۔ ”جو چیز آسانی سے ما جائے وہ خواہ کتنی ہی قیمتی اور نایاب کیوں نہ ہو مگر اس کی قدر نہیں ہوتی۔ ارمغانہ میری بیٹی ہونے کے علاوہ اپنے حسن اور دلکشی کا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے حصہ لئے تمہیں کسی سخت منزل سے ضرور گزرنا ہوگا۔“

”حکم دیجئے امیر محترم۔“ دانیال کے دل میں ارمغانہ کی محبت کی دبی ہوئی چنگاری اٹھی۔ میں سخت سے سخت منزل سے گزرنے پر آمادہ ہوں۔ خواہ میری جان ہی کیوں جائے۔“

”نہیں دانیال۔ ایسا نہ کہو۔“ ابن مقدم نے اپنی مکاری پر محبت کا غازہ ملایا۔ تمہاری جان اتنی ہی عزیز ہے جیسی تمہیں ہے۔ آخر تم ہمارے ہونے والے والد تمہاری جان گنوا کر اپنی بیٹی کو بیوگی کا دکھ کس طرح دے سکتے ہیں۔“

”یہ آپ کی نوازش ہے امیر محترم۔“ ابن مقدم کا دماغ ہونے کا تصور دانیال خیالوں کی حد سے پرے تھا۔ وہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ”فرمائیے مجھے کس منزل گزرنا ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب میں آگ کا دریا بھی پار کر سکتا ہوں۔“

”تمہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی دانیال۔“ ابن مقدم نے اسے تسلی دی۔ ”نہ ارمغانہ کے ساتھ ہو گے ارمغانہ میرے منصوبے کی تکمیل کرے گی۔ تمہیں اس کے پیچھے کا یہ مقصد ہے کہ ارمغانہ لڑکی ہے۔ اسے ابھی نرم گرم کا تجربہ نہیں۔ اگر

ابن مقدم پر جھجک جائے یا اس پر خوف طاری ہو جائے تو تم فوراً اس کی جگہ لو گے اور میرا منصوبہ پورا کرو گے۔“

”میں حاضر ہوں امیر محترم۔“ دانیال ابھی سے خود کو ارمغانہ کے پہلو بہ پہلو چلنا کرنے لگا تھا۔

شمس الدین ابن مقدم نے دانیال کو اپنے منصوبے کی جزئیات سے پوری طرح آگاہ دانیال ارمغانہ کی محبت میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ وہ ابن مقدم کی ہر بات پر ہاں دیتا رہا۔ ابن مقدم نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے پیش نظر کامیابی کا سو نہیں تو پیچاس ناممکن تھا۔

دانیال کو سب کچھ سمجھا کے اور اسے پوری طرح تیار کرا کے ابن مقدم سیدھا سپہ کے پاس پہنچا۔ سپہ سالار فرخ شاہ کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کے اور کئی سردار بیٹھے تھے۔ ابن مقدم مسکراتا ہوا سپہ سالار کے پاس پہنچا۔ ابن مقدم کی ہٹ تعجب خیز تھی۔ اس لئے کہ امیر صلاح الدین اس کے خلاف تھا اور امکان تھا کہ ابن مقدم کو کوئی سخت سزا دی جائے گی۔

سپہ سالار نے پوچھا۔ ”امیر بہت خوش نظر آرہے ہیں۔ کیا مجھے اپنی خوشی میں شامل کریں گے؟“

”ضرور ضرور۔۔۔“ ابن مقدم نے بڑی مسرت سے کہا۔ ”میں خوشخبری سننے ہی تو کے پاس آتا ہوں۔“

”سناؤ۔ میں گوش بر آواز ہوں۔“ سپہ سالار بھی مسکرا دیا۔

ابن مقدم نے بڑی مسرت سے بتایا۔ ”میں نے اپنی بیٹی ارمغانہ کو امیر صلاح الدین کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اتنا کہہ کر ابن مقدم رک گیا۔ وہ سپہ سالار کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ سپہ سالار کو ابن مقدم کے انکشاف پر تعجب ہوا۔ ”پھر کیا ہوا امیر محترم؟“

”آپ سے کیا چھپانا سپہ سالار۔۔۔“ ابن مقدم نے بے تکلفی سے کہا۔ ”دراصل میں ارمغانہ کے ذریعہ امیر کے حضور اپنا معافی نامہ پیش کرایا تھا۔“

”اچھا اچھا۔ پھر امیر صلاح الدین نے کیا جواب دیا۔؟“ سپہ سالار نے دھڑکتے دل سے لے لیا۔

”امیر صلاح الدین بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ارمغانہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا جڑ اپنے باپ سے کہہ دو کہ ہمیں شمس الدین ابن مقدم جیسے امرا کے تعاون پر فخر اور یہ کہ ابن مقدم کو وہ تمام مراعات حاصل ہوں گی جو انہیں سلطان دمشق اعلیٰ

حضرت نور الدین زنگی مرحوم کے وقت میں حاصل تھیں۔
 "یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے امیر۔" سپہ سالار نے مصنوعی مسرت کا اظہار کر
 آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

"آپ کا شکریہ سپہ سالار۔" ابن مقدم نے ظاہری خلوص سے کہا۔ "ہاں یہ
 آپ نے امیر زادے فرخ شاہ کے استقبال کے لئے کیا انتظامات کئے ہیں؟"

سپہ سالار پر ابن مقدم کی باتوں کا رعب پڑ چکا تھا۔ اس نے جواب دیا۔
 اپنے طور پر انتظام کر لیا۔ اب آپ جیسا فرمائیے ویسا کیا جائے؟"

"میرے لئے تو امیر صلاح الدین کا حکم ہے کہ میں قلعہ کے دروازے پر امیر
 استقبال کروں۔" ابن مقدم بڑی دلیری سے بول رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر آ
 محل کی سیڑھیوں پر ان کا استقبال کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح امیر زادہ
 جگہ استقبال ہوگا۔ پہلے قلعہ کے دروازے پر پھر محل کی سیڑھیوں پر۔ اس کا امیر زا
 زیادہ اچھا اثر پڑے گا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ امیر صلاح الدین کو اپنے بھائیوں
 سے زیادہ محبت نور الدولہ شاہان شاہ سے ہے اور امیر زادہ فرخ شاہ اسی شاہان شاہ
 چراغ ہے۔ امیر صلاح الدین اپنے ساتھ صرف اسی بھتیجے کو لائے ہیں۔ فرخ شاہ کو
 جس قدر خوش کریں وہ ہمارے لئے بہتر ہوگا۔"

سپہ سالار پہلے مرعوب ہو گیا تھا اور اب تو وہ ابن مقدم کا جیسے غلام ہو گیا۔
 آپ جیسا حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا۔ میں محل کی سیڑھیوں پر امیر زادے فرخ
 استقبال کروں گا۔"

"نہیک ہے سپہ سالار۔" ابن مقدم کی گردن اکڑ گئی۔ "آپ ذرا قلعہ کے محاذ
 میرے بارے میں مطلع کر دیجئے گا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ تمام محاذ آپ کے حکم کے تابع ہوں گے۔"
 سپہ سالار نے اسی وقت اپنے ایک معتبر سوار کے ذریعے دروازے کے محافظ حاکم
 بھیجا کہ وہ دروازے پر فرخ شاہ کا تمام انتظام امیر شمس الدین ابن مقدم کے پرد
 ہے۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل ہر محافظ کا فرض ہے۔

ابن مقدم جب سپہ سالار کے پاس سے واپس ہوا تو اسے اپنے منصوبے کے پورا
 کا کامل یقین ہو گیا تھا۔ واپسی پر وہ ایک بار پھر ذانیال سے ملا اور اسے بتایا کہ وہ
 مطمئن ہو کر کام کرے۔ اس لئے کہ صبح کو قلعہ کے دروازے پر وہ اور اس کا محافظ
 ذانیال اسے خبر سے اور زیادہ خوش ہوا اس کے چشم تصور سے ارمغانہ

کچھ دن چڑھے صلاح الدین کا بھتیجا فرخ شاہ اپنے ایک سو چیدہ سواروں کے ساتھ محل
 کے سامنے کے میدان میں پہنچ گیا۔ امرا کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آج امیر زادہ فرخ شاہ
 قلعہ دمشق کا قبضہ لینے جائے گا۔ اس کے جلوس کا منظر دیکھنے امرا کے علاوہ سینکڑوں شہری
 بھی جمع ہو گئے تھے۔

"آگائے نامدار۔۔۔" امیر صلاح الدین کے غلام خاص نے عرض کیا۔ "امیر زادے کو

اطلاع کر دو کہ اسے رخصت کرنے ہم اپنے ہمدرد امرا کے ساتھ آرہے ہیں۔“
غلام جانے لگا تو جیسے صلاح الدین کو کچھ یاد آیا۔ اس نے غلام کو روک لیا اور ما
امرا سے بولا۔۔۔ ”امیر زادہ فرخ شاہ قلعہ دمشق کا قبضہ لینے جا رہا ہے کیا یہ مناسب ہے
اسے ہم اور تمام امرا رخصت کرنے میدان میں جائیں؟“

”یہ کوئی ضروری نہیں ہے امیر۔۔۔“ ایک امیر نے کہا۔ ”امیر زادہ فرخ کسی جگہ
نہیں جا رہے ہیں وہ اس قلعہ میں تشریف لئے جا رہے ہیں جو پہلے ہی سر ہو چکا ہے۔“
”امیر محترم۔ میری رائے اس کے برعکس ہے۔“ دوسرے امیر نے کہا۔ ”ہر چند
امیر زادہ کسی جنگ پر نہیں جا رہا پھر بھی اسے قلعہ پر قبضہ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔
امیر اپنے مصاحبین کے ساتھ امیر زادے کو رخصت کریں گے تو اس سے نہ صرف اس
زادے کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ اس واقعہ کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگا۔“

صلاح الدین نے دوسرے امرا کو بولنے کا موقع نہیں دیا اور خود اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔
غلام نے باہر جا کر امیر کی آمد کا اعلان کر دیا اور وہاں موجود تمام لوگ موٹب ہوئے
امیر صلاح الدین اپنے مصاحبین کے ساتھ محتاط قدم اٹھاتا محل سے برآمد ہوا۔ میدان
کھڑے ہوئے عوام نے امیر صلاح الدین کی سلامتی کے نعرے بلند کئے۔ امیر نے ہاتھ
کر ان کے نعروں کا جواب دیا پھر اس غلام کو اشارہ کیا۔ غلام بیڑھیوں سے اتر کر گھوڑ
پر سوار ہوا اور گھوڑا بھگاتا امیر زادہ فرخ کے پاس پہنچا جو اپنے ایک سو سواروں کے ما
میدان میں صفیں بنائے کھڑا تھا۔

غلام نے فرخ شاہ سے کچھ گفتگو کی اور فرخ شاہ غلام کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا محل
بیڑھیوں کے پاس پہنچا۔ پھر وہ دونوں گھوڑے سے اترے اور بیڑھیاں چڑھ کے امیر
پاس پہنچ گئے۔

فرخ شاہ نے امیر کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

صلاح الدین، فرخ شاہ کے سلام پر کوئی توجہ نہ دے سکا کیونکہ اس کی نظریں مید
کی طرف تھیں۔ فرخ شاہ کے ایک سو سوار میدان میں دور تک صفیں بنائے کھڑے تھے
امیر صلاح الدین ان سواروں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ان کی گنتی کر رہا ہو۔ حاض
امیر کو تعجب سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اس نے اب تک فرخ شاہ کے سلام کا جواب نہ
طرف رہا اس کی جانب نظریں نہ کی تھیں۔

”فرخ شاہ۔۔۔“ امیر کی پر رعب آواز نے فرخ شاہ اور دوسرے لوگوں کو چونکا دیا۔
”جی۔۔۔ امیر عالی مقام۔“ فرخ شاہ امیر کے تلخ لہجے سے گھبرا گیا تھا۔

”جس وقت ہم قاہرہ سے روانہ ہوئے ہمارے ساتھ کتنے سوار تھے؟“ امیر کا لہجہ پہلے
سے زیادہ تلخ ہو گیا تھا اور اس کی پیشانی پر ایک بل سا پڑ گیا تھا۔
”ذریعہ اعظم مصر اپنے ساتھ سات سو سوار لے کر روانہ ہوئے تھے۔“ فرخ شاہ نے کچھ
نہ سمجھے ہوئے بھی سواروں کی تعداد صحیح بتائی تھی۔
”ہونہ۔۔۔“ امیر صلاح الدین نے ایک لمبی سانس لی۔ ”دمشق کی طرف روانگی سے
ہمارا مقصد کیا تھا؟“

”ہاں امیر اپنے آقا زادے کے ہاتھ مضبوط کر سکیں اور مفاد پرست امرا کو ان کے غلط
اقدامات کی سزا دیں۔“ فرخ شاہ کا خوف سے برا حال ہو رہا تھا۔
”ٹھیک تم نے ٹھیک بتایا۔“ امیر کے لہجے میں ہلکی سی نرمی پیدا ہوئی۔ ”اس وقت
میں کوئی خدمت تفویض کی گئی ہے؟“

”ہی کہ میں امیر کے ایک غلام کی حیثیت سے دمشق کے قلعہ میں داخل ہوں اور
وہاں کی سالار سے خزانہ اور قلعہ کے دروازوں کی چابیاں حاصل کروں۔“ فرخ نے بہت
سوچ کے جواب دیا مگر اس وقت تک خوف کی وجہ سے اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوب گیا
تھا۔

”ایک سوال اور فرخ شاہ۔۔۔“ امیر کا لہجہ پھر تلخ ہوا۔ ”یہ بتاؤ کہ مصر سے دمشق
آنے کا ہمارا سفر مشکلات کا حامل تھا یا تمہارا اس وقت قلعہ جانا زیادہ مشکل ہے؟“
فرخ شاہ گڑ بڑا گیا۔ ”جی امیر محترم۔ میں آپ کا سوال نہیں سمجھ سکا؟“
”بہت صاف ہے فرخ شاہ۔“ امیر کی خشکی نظروں نے فرخ شاہ کو گھبرا دیا۔ ”اس
وقت ہم زیادہ مشکل میں تھے یا اس وقت تم زیادہ مشکل میں ہو۔“

فرخ شاہ کو ذرا اطمینان ہوا۔ اس نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”امیر عالی مقام کا سفر
مشکل تھا کہ وہ صرف سات سو سواروں کے ساتھ ایک عظیم سلطنت کے صدر مقام کی
طرف آرہے تھے جہاں ان کے دمشق زیادہ اور دوست کم تھے۔ اس کے مقابلے میں میرا یہ
فقر مغرب جس کا فاصلہ قدموں میں شمار کیا جاسکتا ہے بہت آسان ہے کیونکہ قلعہ کا قابض
ہر سال پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہے۔“

امیر نے فرخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ ”فرخ شاہ ایک ایسا قلعہ جس کا
تھوڑا سا پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہے کیا اس قلعہ میں تمہارا ایک سو سواروں کے ساتھ داخل
ہونا مناسب ہے۔ کیا قلعہ والے یہ نہ سوچیں گے کہ صلاح الدین نے دوستی کے ایک وند
کو بھی ایک سو سواروں کے پہرے میں قلعہ میں بھیجا ہے۔ بتاؤ جواب دو؟“

”مدد افتخار ہے۔ قدم بڑھائیے سپہ سالار اور افواج دمشق اور امیر شمس الدین ابن
مقدم بوسی کے لئے آپ کے منتظر ہیں۔“

فرخ شاہ نے بھی خوشنودی کے اظہار میں اپنا سر ہلایا لیکن اسے تعجب ہو رہا تھا کہ
یہ کامراد استقبال کے لئے دروازے کے باہر کیوں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ فرخ شاہ کو
ایٹایا گیا تھا کہ قلعہ کا حاکم صرف سالار فوج ہے مگر اس وقت آہن پوش سوار نے اس
کا اظہار کیا تھا کہ سپہ سالار افواج قلعہ اور امیر شمس الدین ابن مقدم اس کی پیشوائی
کے اندر موجود ہیں۔ بہر حال یہ وقت سوچ بچار کا نہ تھا۔ فرخ شاہ بے تکلف اپنے
روں کے ساتھ جو اس سے دس قدم پیچھے چل رہے تھے قلعہ کے دروازے میں داخل
ہوئے۔ انہیں آہن پوش سوار امیر زادے کے دائیں بائیں اس کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر
رہے تھے۔

فرخ شاہ نے یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ وہ سالار فوج کے حجرے میں ان آہن پوش
روں سے کوئی سوال کرے۔ وہ سوار بھی نہایت خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چل
ہتے ہوئے اس کے کہ دائیں جانب چلنے والا سوار بار بار اپنے گھوڑے کی لگائیں کھینچ
تھیں محسوس ہوتا تھا جیسے گھوڑا اس سے پورا طرح نہ سنبھل رہا ہو۔ فرخ شاہ ابھی یہ
بات تھا کہ اسے پشت پر قلعہ کا صدر دروازہ بند ہونے کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ
بہت تعجب فیز تھی جب وہ دروازے میں داخل ہوا تھا تو وہ پانوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ آخر
کے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ امیر زادہ فرخ شاہ ایک بہادر باپ کا بیٹا تھا اس لئے
انے ذہن میں پیدا ہوتے دوسوں کو جھٹک دیا اور آگے چلا رہا۔

فرخ شاہ ابھی مشکل سے بیس گز چلا ہوا کہ اسے اچانک ایک لرزتی آواز سنائی دی۔
”امیر زادے ہوشیار۔۔۔“

اس آواز کے ساتھ ہی فرخ شاہ کو اپنے بائیں پہلو میں ایک تلوار چمکتی دکھائی دی۔ وہ
جست اور پھرتلا جوان تھا۔ ”ہوشیار“ کی آواز نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ اس نے بڑی
سے اپنے گھوڑے کو موڑ کر ایک طرف کر لیا پھر جو اس نے پلیٹ کے دیکھا تو بڑا
اک منظر تھا۔ فرخ شاہ سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر اس کے پہلو پہ پہلو چلنے والے
ناپوش سوار ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ ان کی تلواں آپس میں ملتی اور جدا
ہوتی تھیں۔

فرخ شاہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اس پر کسی نے بائیں جانب سے حملہ کیا تھا۔ بائیں طرف
والا آہن پوش وہی تھا جس نے صدر دروازے کے باہر اسے خوش آمدید کہا تھا۔ ظاہر

”مجھ سے غلطی ہوگئی امیر۔۔۔ مجھے معاف فرمایا جائے۔“ فرخ شاہ اور کیا کہہ سکا
”یاد رکھو فرخ شاہ۔۔۔“ امیر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”دوستوں کے
کھلے دل سے جاؤ خواہ تمہیں کچھ نقصان ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔ صلح کے بعد دوسرے
پر رعب ڈالنا اصول مردانگی کے خلاف ہے۔“

قلعہ دمشق کے تمام دروازے صبح ہی سے چشم انتظار کی طرح کھلے ہوئے تھے اور
والوں اور شہر والوں میں رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ قلعہ کے تین اطراف کے دروازوں
بھیڑ بھاڑ ہو گئی تھی۔ لوگ کئی دن سے ایک دوسرے سے جدا تھے۔ سامان تجارت
خور و نوش اندر کا اندر اور باہر کا باہر رک کر رہ گیا تھا۔ چوتھا یعنی صدر دروازہ ہمار
گزر کر فرخ شاہ کو اندر جاتا تھا وہاں سناٹا تھا۔ باہر کی طرف ایک تنفس تھا ہاں
دروازے کے اندر کچھ سوار ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔

اس دروازے پر دن چڑھے تک خاموشی طاری رہی۔ قلعہ کی فوج کے کچھ
دونوں جانب کی طویل راہداریوں میں کھڑے تھے۔ دروازے کے اندر کی طرف جن
کا سپرہ تھا وہ تمام کے تمام شمس الدین ابن مقدم کے آدمی تھے۔ اس دروازے کی
ابن مقدم کے حوالے کی گئی تھی۔ قلعہ کا سپہ سالار اپنی تمام فوج کے ساتھ شاہی
سامنے صف آرا تھا۔ سپہ سالار اور ابن مقدم میں یہی طے ہوا تھا کہ سپہ سالار
کے ساتھ شاہی محل پر فرخ شاہ کا استقبال کرے گا۔

ادھر امیر صلاح الدین کی تنبیہ پر فرخ شاہ نے اپنے ساتھ لے جانے والے
کی تعداد ایک سو سے گھٹا کر صرف دس سوار کر دی تھی۔ دراصل امیر صلاح الدین
والوں کا دل جیتنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب فرخ شاہ نے صرف چند سوار
ساتھ قلعہ میں داخل ہوگا تو اس کا یہ داخلہ دوستوں جیسا ہوگا اور قلعہ کی فوج کو یہ
نہ ہوگا کہ انہوں نے ہتھیار ڈالے ہیں یا وہ کسی دوسری طاقت کے محکوم ہو گئے ہیں
دن کافی چڑھ گیا تو امیر صلاح الدین نے فرخ شاہ کو کوچ کا اشارہ کیا اور فرخ اپنے
کے ساتھ منہ گھما کر قلعہ کی جانب روانہ ہوا۔

صرف گیارہ سواروں کا یہ رسالہ یا جھٹکا جب قلعہ کے دروازہ پر پہنچا تو باہر کی
اس کا استقبال صرف دو آہن پوش سواروں نے کیا۔ اس میں سے ایک سوار گھوڑا
فرخ شاہ کے پاس آیا۔ فرخ شاہ سب سے آگے تھا۔

سوار نے جس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں گھوڑے پر ذرا خم ہو کر کہا۔
”امید امیر زادے فرخ شاہ بن شاہان شاہ۔۔۔ آپ کی تشریف آوری قلعہ والوں“

تھا کہ اس پر اسی آہن پوش تلوار کا بھرپور وار کیا تھا جسے شاید دائیں طرف چلے وار نے اپنی تلوار پر روکا تھا اور اب وہ ایک دوسرے سے گھٹم گھٹا ہو گئے تھے۔ فرخ نے کچھ محاسبے کی اہمیت سمجھ گیا تھا مگر اس کے محافظ سوار جو اس سے کچھ فاصلہ پر تھے ان کی سمجھ میں بالکل کچھ نہ آیا تھا۔ وہ گھوڑے روک کر کھڑے تھے اور فرخ حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

فرخ شاہ کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اسی وقت ایک آہن پوش دوسرے آہن پوش کا زرہ کانتی اس کے پہلو میں داخل ہو گئی اور چیخ مار کر زمین گیا۔ فاتح آہن نے اپنی تلوار واپس کھینچتے ہوئے امیرزادے کو وہیں سے مخاطب کیا۔ ”امیرزادے آپ کو دھوکہ دیا گیا۔ فوراً قلعہ سے نکل جائیے۔“

فرخ شاہ کو پہلے ہوشیار کرنے اور اب قلعہ سے نکلنے کی درخواست کرنے والی نسلانی تھی۔ اتنا موقع نہ تھا کہ وہ اپنی ہمدرد اور محسنہ کا شکریہ ادا کرتا۔ اس گھوڑے کا رخ دروازے کی طرف کیا اور اپنے آدمیوں سے چیخ کر کہا۔ ”بہادر دروازے جا پڑو اور اسے کھول کر باہر نکل جاؤ۔“

لحوں میں فرخ شاہ اور اس کے ساتھی بند دروازے پر پہنچے۔ دروازے کی زنجیروں کی ٹیک ابھی نہیں لگائی گئی تھی کہ فرخ شاہ کے سوار ان پر بازوں جھپٹے اور پہلے ہی وار میں آٹھ محافظوں کا خاتمہ ہو گیا۔ محافظ بدحواس ہو گئے اور ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کی مگر فرخ شاہ اور اس کے ساتھیوں کی تلواریں موت پر گر رہی تھیں۔ دم کے دم میں آدھے سے زیادہ محافظ قتل ہو گئے پھر نہ جانے کہ بیس پچیس اور آدمی نکل پڑے۔ فرخ شاہ نے فوراً لڑائی کی حکمت عملی تبدیل کی۔ ”ساتھیوں دروازہ کھولنے کی کوشش کرو۔“ فرخ شاہ کی آواز پر چھ سوار دروازے لگ گئے اور انہوں نے دونوں پٹوں کو دھکیلتا شروع کیا۔ دروازہ کافی بھاری تھا آدمیوں سے نہ کھل رہا تھا۔ مگر کوشش کرنے والوں کی نظر اس زنجیر پر پڑی جسے دروازہ کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ سوار گھوڑوں سے کود پڑے اور سب زنجیر سے اسے ایک طرف کھینچنے لگے۔ اس ترکیب سے دروازے کا ایک پٹ آہستہ آہستہ کھلا ہوا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا کہ ایک آدمی اس کے اندر سے نکل کے بھاگا اور باہر کے دور تک بھاگتا چلا گیا اس کا رخ امیر صلاح الدین کے محل کی طرف تھا۔ پھر گھڑ سوار نظر پڑا اس نے سوار سے گھوڑا مانگا اور اس پر سوار ہو کر امیر صلاح الدین

پاس پہنچ گیا۔

”امیر۔۔۔۔۔ دھوکہ۔۔۔۔۔ فرخ شاہ دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ جلدی چلئے۔“ آنے لے سوار نے ساتھیوں کے درمیان ہانپتے ہوئے کہا۔

امیر صلاح الدین مہمان خانے میں امرا کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ موضوع سخن دشمن تھا۔ اسی وقت فرخ شاہ کے ساتھ جانے والے سوار نے اسے قلعہ والوں کی امداد اور فریب کاری کی اطلاع دی۔ پھر صلاح الدین کو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن جب باتا تھا تو پھر وہ قابو میں نہیں رہتا تھا۔ سوار کے منہ سے نکلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اسے مطلب سمجھنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ وہ تڑپ کے اٹھا اور غلام خاص کو سواری اشارہ کیا۔ غلام تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔

امیر کے ساتھ کے امرا بھی اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ چکے تھے وہ امیر صلاح الدین کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور اس کے پیچھے چلنے لگے۔ امیر تیز قدم مانتا یا یہ کہنا چاہیے کہ بھاگتا ہوا محل کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ اس وقت اس کا غلام گھوڑا لے کے سیڑھیوں کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ امیر نے دو دو اور تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ طے رہا شروع کیں اور جب آخری چار سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو وہ جست کر کے گھوڑے پر ٹپکیا۔

”لشکر قلعے پہنچے۔“ صرف اتنا حکم دے کر اس نے گھوڑے کو ممیز کیا باگیں اٹھائیں تو اٹھ دنوں میں قلعہ دشمن کے دروازے پر تھا۔ فرخ شاہ نے باوجود کم تعداد میں ہونے کے دروازے کے محافظوں کو پسا کر کے دروازہ کھول دیا تھا اور اب وہ اس کے سوار چھ دروازے میں کھڑے شمشیر کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اندر کی طرف سے ان پر سواروں اور لڑائی کی یلغار ہو رہی تھی جو اسے دھکیل کر قلعہ کا دروازہ بند کرنا چاہتے تھے جبکہ فرخ شاہ کی کوشش تھی کہ دروازہ بند نہ ہو سکے۔

امیر صلاح الدین جو آنے والوں میں سب سے آگے تھا اس نے دور ہی سے آواز

”فرخ گھبرا نہیں۔ ہم آگئے ہیں۔“

فرخ شاہ کے کانوں میں امیر کی آواز پڑی وہ ادھر ادھر مڑتے ہوئے چلایا۔ ”امیر صلاح الدین آگئے ہمارا لشکر آگیا۔“

فرخ شاہ کی آواز کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ حملہ آوروں کے ہاتھ رگ گئے اور وہ بے تحاشہ اندر کی طرف بھاگے۔ امیر صلاح الدین فرخ شاہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ حملہ آوروں کے بھاگ جانے سے لڑائی رک گئی تھی۔ امیر کو اپنے سامنے دیکھ کر فرخ شاہ گھوڑے سے

دار کیا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو تیزی سے پیچھے ہٹایا لیکن اگر مجھے غیبی مدد نہ حاصل ہو جاتی تو آہن پوش کی تلوار شاید میرا سر قلم کر جاتی اس وقت ----

”غیبی مدد سے تمہاری کیا مراد ہے فرخ؟“ امیر صلاح الدین نے اس کا قطع کلام کیا۔
”امیر عالی مقام ----“ فرخ نے گلہ صاف کر کے بتایا۔ ”میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ مجھے ایک آواز نے ہوشیار کر کے بتایا تھا کہ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر آہن پوش سوار نے تلوار کا وار کر دیا مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دوسرے آہن پوش نے مجھ پر ہونے والے وار کو اپنی تلوار پر روک لیا اور پھر وار کرنے والے پر پینترہ بدل کر ایسا حملہ کیا کہ تلوار اس کے پہلو میں اتر گئی اور حملہ آور آہن پوش زمین سے لگ گیا۔“

”بات واقعی حیرت انگیز ہے مگر تمہیں بچانے والا دوسرا آہن پوش کون تھا؟“ امیر صلاح الدین نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

”وہ ----“ فرخ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ”وہ ابھی یہیں تھی“
”وہ تھی ---- کیا کہہ رہے ہو فرخ؟“ امیر نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔
”وہ کوئی عورت یا لڑکی تھی۔ ابھی یہیں تھی۔ میرے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ فرخ شاہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔“

”خیر وہ کوئی عورت تھی یا مرد۔ اسے تلاش کیا جائے۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔“ امیر نے حکم دیا۔

”آپ شاہی محل پر چلے امیر۔ میں اسے ڈھونڈ کر ابھی حاضر کرتا ہوں۔“ فرخ شاہ نے جواب دیا۔

”نہیں ---- تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“ امیر صلاح الدین نے فرخ شاہ کی بات سے اتفاق نہ کیا امیر صلاح الدین نے فرخ شاہ کو روک لیا تھا اور وہ اسے ساتھ لے کر شاہی محل جانا چاہتا تھا مگر پھر اس نے شاہی محل جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”ہم اسی جگہ دربار لگائیں گے اور دشمنوں کو سزا کا حکم دیں گے۔“

قلعہ کے وہ پہریدار اور محافظ جنہیں ابن مقدم نے ہٹا کر اپنے آدمیوں کو مقرر کیا تھا۔ ان پہریداروں نے جب سنا کہ امیر اسی مقام پر دربار کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھاگے بھاگے ایک ریشم کے گھر پہنچے اور وہاں سے چار قالین اٹھا لائے۔ وہ ریشم بھی ان کے ساتھ ہی امیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ دربار تو نہ تھا لیکن اس زمانہ کے دستور کے مطابق علاقائی گورنر اور بڑے جاگیردار بھی اپنے محلات میں احباب کی محفلیں جلاتے تھے اور ان محفلوں

اتر پڑا۔ اس کے ساتھی بھی پایادار ہو گئے۔
امیر نے گھوڑے سے اتر کر فرخ شاہ کی پیٹھ ٹھوکی۔ ”تم نے اپنے باپ کی شجائے لاج رکھ دی۔ تمہیں کتنے زخم آئے ہیں؟“
”ایک بھی نہیں امیر اعلیٰ مقام۔“ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ فرخ شاہ نے بڑی ہر سے کہا۔

”تمہارے کتنے سوار کام آئے۔“ امیر نے اس کے سواروں کی طرف دیکھا جو ایک جمع ہو گئے تھے۔

فرخ شاہ نے آدمی شمار کئے۔ ”خدا کا شکر ہے امیر۔ میرا کوئی آدمی ضائع نہیں ہوا۔“ الحمد للہ۔۔۔“ امیر نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اسی وقت راہداروں میں کھڑے ہوئے مسلح محافظوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیے دوڑتے ہوئے امیر صلاح الدین کے پاس آئے۔

”امیر عالی مقام ۶۔ ہم سب بالکل بے قصور ہیں۔ ہمیں معاف کیا جائے امیر۔“
”پھر یہ کون لوگ تھے جو ہمارے آدمیوں سے برسہا برسہا تھے؟“ اس نے جواب دیا۔
”ہمارے سپہ سالار نے ہمیں حکم دیا تھا کہ صدر دروازے کی دیکھ بھال ابن مقدم حوالے کر دی جائے۔ امیر ابن مقدم نے ہمیں رات کے پچھلے پھر صدر دروازے سے کے راہداری میں کھڑا کر دیا تھا۔“

امیر کے تقریباً دو سو سوار قلعہ میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر نے حکم دیا۔ ”ابن مقدم کو تلاش کیا جائے اور سپہ سالار افواج دمشق کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش جائے۔“ پھر امیر نے فرخ شاہ سے پوچھا۔ ”فرخ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوا۔ اس تفصیل بیان کر دو۔“

فرخ شاہ نے امیر کو بتایا۔ ”امیر محترم۔ میں محل سے کوچ کر کے قلعہ کے دروازہ پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر کی طرف دوسلح آہن پوش میرے استقبال کے لئے کھڑے تھے انہوں نے مجھ سے قلعہ میں داخل ہونے کی درخواست کی اور بتایا کہ ابن مقدم فوج آپ کا استقبال شاہی محل کے سامنے کریں گے چنانچہ میں بے دھڑک قلعہ میں داخل ہوا۔ میری ساتھی مجھ سے کچھ قدم پیچھے آرہے تھے لیکن قلعہ کے دونوں آہن پوش میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ میں قلعہ کے اندر چند ہی قدم چلا تھا کہ نقاب پوشوں میں سے ایک نے مجھے آواز دے کر ہوشیار کیا اور بتایا کہ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا۔ قبل اس کے کہ میں تلوار کھینچ سکتا کہ دوسرے آہن پوش نے بڑی پھرتی سے مجھ پر حملہ

کو دربار کا نام دیتے تھے۔

دورزی کے کون لوگ ذمہ دار ہیں۔۔۔۔۔

پورے مجمع کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔ دراصل وہ امیر کا سوال ہی نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ بت گئے کھڑے رہے تو امیر نے اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ لوگ بالکل نہ سمجھتے۔ ہم تو اصل مجرموں کے نام معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے صبح کی لڑائی دیکھی تو ہنس گئے؟“

مجمع سے ایک نے جرات سے کام لیتے ہوئے زبان کھولی۔ ”اے امیر۔ آپ کس واقعہ اور کس لڑائی کا ذکر فرما رہے ہیں۔ ہم لوگ تو آپ کی آمد کی خبر سن کر دیدار کو حاضر ہوئے ہیں“

”اچھا تو آپ لوگوں کو کچھ بھی نہیں معلوم“ امیر کے لہجے میں حیرت کی آمیزش تھی۔
 ”بالکل نہیں امیر۔۔۔ ہمیں بالکل خبر نہیں کہ صبح کو کیا ہوا اور کس نے فریب کاری کی۔“ اس آدمی نے جواب دیا۔

”اگر کوئی نہیں جانتا تو ہم بتاتے ہیں۔“ امیر نے پیش کش کی۔ ”کل ہمارے پاس قلعہ کے سالار کا پیغام پہنچا تھا کہ وہ خزانہ اور قلعہ کی چابیاں لے کر ہمارے پاس آنا چاہتا ہے۔ یہ پیغام لانے والے قاضی شہر تھے۔ ہم نے اس پیغام کا یہ جواب بھیجا تھا کہ سالار فوج کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں بلکہ کل یعنی آج صبح ہمارا بھتیجا فرخ شاہ خود قلعہ میں آئے گا اور ضروری کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ حسب اعلان ہم نے آج صبح امیر زادے فرخ شاہ کو صرف دس سواروں کے ساتھ قلعہ بھیجا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہمارا جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں لیکن جب صبح کو امیر زادہ قلعہ میں داخل ہوا تو اس کے داخلے کے ساتھ ہی قلعہ کا دروازہ بند کر دیا گیا اور امیر زادے فرخ شاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ فرخ شاہ نے حملہ آوروں کا اس وقت تک مقابلہ کیا جب تک ہم مزید کمک لے کر قلعہ نہیں پہنچ گئے۔“

بات ختم کرنے کے بعد امیر نے اپنے مخاطب کے چروں پر نظر ڈالی۔ ان کے چروں پر حیرت کے آثار تھے اور وہ ایک دوسرے کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ پھر گفتگو کرنے والے نے جواب دیا۔ ”امیر محترم۔ آپ نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہمیں تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ حاکم قلعہ نے آپ سے صلح کی گفتگو کی ہے اور اسے اس میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ قلعہ کا قبضہ بغیر کسی جنگ کے آپ کو دیدیا جائے گا۔ ہم لوگ اس بات سے بہت

دربار جماعت فرخ شاہ کو حکم دیا گیا۔ ”شمس الدین ابن مقدم کو زندہ یا مردہ حاضر“
جائے۔“

امیر صلاح الدین نے یہ حکم فرخ شاہ کو دیا تھا۔ فرخ شاہ جانے کے لئے تیار ہوا صلاح الدین نے کہا۔ ”ابھی حکم ختم نہیں ہوا۔ پورا حکم سننے کے بعد روانہ ہونا فرخ۔“ فرخ سر جھکا کر کھڑا اور مزید حکم کا انتظار کرنے لگا۔

امیر صلاح الدین نے کہا - ”نفس الدین ابن مقدم کے علاوہ قلعہ کی فوج کے سالار بھی گرفتار کر کے حاضر کیا جائے کیونکہ فرخ شاہ پر حملہ بغیر سالار فوج کی مرضی کے نہیں جاسکتا۔ یہ ایک بڑی سازش معلوم ہوتی ہے اس میں قلعہ کے متعدد اشخاص ملوث ہیں اس لئے ہمارے پاس قلعہ سے جو پہلا صلح کا وفد بھیجا گیا تھا اس کے ارکان کو بھی گرفتار جائے۔ ان میں دمشق کے مفتی بھی شامل تھے۔ انہیں عزت سے پیش کیا جائے اور جب تک ہم ان کے متعلق کوئی اور حکم نہ دیں انہیں احترام سے حراست میں رکھا جائے۔ سلوک قاضی شر کے ساتھ ہوگا جو سالار فوج کی طرف سے وفاداری اور اطاعت کا پتہ لے کر گئے تھے۔ ان احکامات کی فوراً تعمیل ہو۔“

فرخ شاہ نے تعمیل حکم کی اجازت مانگی۔ اس پر امیر صلاح الدین نے اسے تاکید کر ”فرخ شاہ، لڑائیوں کے ساتھ کوئی بد تمیزی یا زیادتی نہ کی جائے۔ ان پر اب تک جرم ثابت نہیں ہوا ہے اور انہوں نے اپنی صفائی بھی پیش نہیں کی۔ تم سالار فوج کی گرفتاری لے لے اپنے ساتھ پچاس سوار لے جاسکتے ہو اور اگر زیادہ مزاحمت ہو تو ہمیں اطلاع دے دے۔“

فرخ شاہ نے جانے کے لئے پھر قدم اٹھایا تھا کہ امیر کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ”فرخ اس آہن پوش سوار کی تلاش ضروری ہے جس نے نہ صرف تمہیں خطرے سے آگاہ بلکہ حوصلے سے کام لے کر تم پر حملہ آور ہونے والے کا خاتمہ کر دیا۔ مقتول کی لاش پیش کی جائے۔“

امیر صلاح الدین خاموش ہو چکا تھا لیکن فرخ شاہ کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ نہ اٹھائے بادا کہ امیر اسے رکنے کا حکم دے۔

”فرخ شاہ تم جا سکتے ہو۔۔۔“ آخر امیر نے اسے جانے کی اجازت دیدی۔
فرخ شاہ تو ادھر چلا گیا اور امیر صلاح الدین ان معززین قلعہ سے مخاطب ہوئے جو
کی آمد کی خبر سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ امیر نے ان لوگوں سے پوچھا۔ ”آپ لوگوں

لی بات پر اعتبار کر لیا جس کے نتیجے میں اس وقت ہم امیر کے حضور میں مجرموں کی طرح افسر ہوئے ہیں۔ فریب دراصل ابن مقدم نے کیا اور امیر زادے پر حملہ اس کے حکم سے کیا گیا کیونکہ قلعہ کے صدر دروازہ کی حفاظت اس کے ذمہ داری تھی۔

”تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔“ امیر نے الجھتے ہوئے کہا۔ ”آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ ایک طرف تو جرم کا اقرار کرتے ہو دوسری طرف انکار۔ صاف صاف حالات بیان کرو۔“

”امیر محترم۔“ سالار نے بڑے استقبال سے کہا۔ ”کل شام امیر شمس الدین ابن قدم میرے پاس آئے اور بیان کیا کہ آپ نے انہیں معاف کر کے ان کی امارت بحال کر دی ہے۔ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی پھر انہوں نے امیر زادے کے استقبال کے ارے میں انتظامات کا حال پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں قلعہ کی پوری فوج کے ساتھ قلعہ سے باہر نکل کے امیر زادے کا استقبال کروں گا۔ اس پر وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر اگلے کہ وہ خود بھی اپنے محافظ دستے کے ساتھ صدر دروازے پر امیر زادے کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔ پھر انہوں نے تجویز پیش کی کہ امیر زادے فرخ شاہ کا استقبال ایک جگہ کے بجائے دو مقامات پر کیا جائے وہ اس طرح کے صدر دروازے پر امیر ابن مقدم، امیر زادے کا اپنے آدمیوں کے ساتھ استقبال کریں اور میں امیر زادے کا استقبال شاہی محل کے دروازے پر پوری فوج کے ساتھ کروں۔ ان کا خیال تھا کہ امیر زادے نے فرخ شاہ کا استقبال جب دو مقامات پر ہو گا تو امیر زادے پر اس کا اچھا اثر ہو گا۔

”امیر عالی مقام۔ بس اس جگہ میں دھوکہ کھا گیا۔ ابن مقدم کی مکاری میں نہ سمجھ سکا اور اس کے کہنے پر میں نے صدر دروازے پر استقبال کام اس کے سپرد کر دیا اور میری اس غلطی کا یہ نتیجہ ہوا کہ امیر زادے پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کے آدمیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔“

امیر یہ بیان سن کر متعجب ہوا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہارا بیان درست ہو لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ ابن مقدم ہمارے عزیز بھتیجے کو قتل کر کے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اگر خدا نخواستہ امیر زادہ قتل ہو جاتا تو کیا ہم دمشق چھوڑ کے قاہرہ واپس چلے جاتے۔ ہمارے سوار تو پھر بھی زندہ رہتے اور ہم قلعہ دمشق کو کسی وقت بھی فتح کر سکتے تھے؟“

”امیر عالی مقام۔۔۔“ سالار نے جواب دیا۔ ”اس سوال کا جواب تو وہ شاطر ابن مقدم عداوت کر سکتا ہے۔ خدا معلوم اس نے کیا منصوبہ بنایا ہے۔ خدا کا شکر ہے امیر زادے محفوظ رہے ورنہ اس غلط فہمی کی بنا پر قلعہ والوں کا خدا معلوم کس قدر خون بہہ جاتا۔“

خوش تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ آپ کب تشریف لائیں اور ہم آپ کے دیار فیضیاب ہوں۔“

امیر صلاح الدین سمجھ گیا کہ قلعہ والے تمام واقعات سے بالکل بے خبر ہیں۔ اس اعلان کیا کہ ”قلعہ کے کسی شخص سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے۔ آپ لوگ مطمئن کے اپنے گھر جائیے۔“

لوگ خاموشی سے مگر خوش خوش اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد فرخ شاہ واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ پیدل آرہا تھا اور اس کے عقب ہزاروں آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ امیر نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ فرخ شاہ کے ایک شخص تھا جس کے گلے میں تلوار چمک رہی تھی۔ گلے میں تلوار لٹکانے کا مطلب تھا کہ اس نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ امیر نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص قلعہ کا سالار ہو سکتا ہے۔

فرخ شاہ کی دوسری جانب تین آدمی اور چل رہے تھے۔ قریب آنے پر امیر الدین نے انہیں پہنچا لیا۔ وہ مفتی شر اور قاضی شہرتے۔ تیسرا آدمی وہ تھا جو پہلے وند مفتی شہر کے ساتھ امیر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور خود کو سالار فوج کا نائب بتاتا ان چاروں کے پیچھے قلعہ کی ایک ہزار فوج کے لشکری تھے۔ ان کے گلوں میں بھی اطاعت کے لئے تلوار لٹکی ہوئی تھیں۔

امیر صلاح الدین نے گردار آواز میں حکم دیا۔ ”لشکریوں کو دور رکھا جائے۔ فرخ اپنے ساتھ کے تینوں اشخاص کو لے کر حاضر ہو۔“

فرخ شاہ نے فوراً پلٹ کر لشکریوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب الٹے پیروں ہونے لگے۔ فرخ شاہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک لشکری دور نہ پہنچ گئے۔ ساتھ آنے والوں کو لے کر امیر صلاح الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سالار فوج۔۔۔ اس کا نائب، قاضی شر اور مفتی شہر نے امیر صلاح الدین کو سلام کیا۔ انہیں دیکھ کے امیر کا مزاج برہم ہو گیا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں سوال کیا۔ تم لوگوں کو اپنے جرم کا اقبال ہے؟“

سالار فوج نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ امیر سے گفتگو وہ خود کرے گا۔ اس لئے اس ساتھی خاموش رہے اور سالار فوج نے کہا۔ ”امیر عالی مقام۔۔۔ ہم مجرم ہیں مگر اس کے نہیں کہ آپ سے غداری کی یا آپ کو فریب، امیر زادے فرخ شاہ کو قتل کرنا کوشش کی۔ ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم نے غدار ملک و ملت امیر شمس الدین ابن

”تم اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو؟“ امیر نے اچانک سوال
 ”میر محترم۔ میں مفتی اعظم کو ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔ میں نے کل رات امیر
 کر ابن مقدم سے ملاقات کی پوری تفصیل سنائی تھی اور انہوں نے بھی اس بات کا
 تھا کہ ابن مقدم کے کہنے کے مطابق ایک جگہ کے بجائے دو جگہ امیر زادے کا استہارہ
 زیادہ بہتر رہے گا۔“

”مفتی اعظم۔۔۔۔۔“ آپ کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ ابن مقدم اتنی زبردست چال
 رہا ہے؟“

”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں ابن مقدم کے فریب کو بالکل نہ سمجھ رہا
 مفتی اعظم نے بڑی سادگی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔“

امیر صلاح الدین بڑی دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ
 ”بات ابھی تک صاف نہیں ہو سکی۔“ امیر نے فرخ شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 تک ابن مقدم گرفتار نہیں ہوتا ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ فرخ شاہ یہ تمہارا
 واری ہے کہ یا تو ابن مقدم کو پیش کرو یا پھر اس آہن پوش کو ہمارے پاس لاؤ۔
 تمہیں خطرے سے آگاہ کیا اور تمہارے دشمن کے پہلو میں تلوار اتاری تھی۔“

فرخ شاہ نے اطاعت میں گردن جھکا دی۔ ”میں امیر کے حکم کی تعمیل میں اپنی جا
 دوں گا۔“

امیر نے فیصلہ کیا۔ ”بہر صورت یہ بات تو یقینی ہے کہ سالار فوج اور دوسرے لوگ
 ابن مقدم کی فریب کاری کے شکار ہوئے ہیں۔ ان کی صرف یہ غلطی ہے کہ وہ ابن
 کے فریب میں آگئے۔ انسان آخر خطا کا پتلا ہے۔ ہم سب کو معاف کرتے ہیں۔“
 تمام لوگوں کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے۔

خانہ جنگی

شمس الدین کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور مکاریوں کی فہرست کافی طویل تھی
 اس کا پورا نام امیر شمس الدین محمد بن عبدالملک المقدم تھا۔ یہ شخص ایک سازشی ذہن کا
 ایک تھا اس لئے اس سے ہر قدم پر ایک جرم سرزد ہوتا تھا۔ قلعہ دمشق کے قبضہ کے
 سلسلہ میں اس نے جو گھٹاؤں کر دار ادا کیا اس کا پردہ چاک ہونے پر نہ صرف اہل دمشق نے
 اس پر لعنت بھیجی بلکہ اس کی نیک اور خوبو بی اثر مغانہ اس قدر شرمسار ہوئی کہ وہ گوشہ
 نشین ہو گئی۔ لوگوں کے سامنے آنے کی اسے ہمت نہ تھی۔

شمس الدین المقدم نے اس سے پہلے سلطان نور الدین زنگی کے انتقال پر
 دہلی دہشت کا ایک ایسا کھیل کھیلا کہ جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
 سلطان کی وفات پر جب جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو اس وقت شمس الدین المقدم دمشق میں
 موجود تھا۔ تمام امراء فوراً، سرداران فوج اور معززین شہر سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ ان
 معززین میں قاضی کمال الدین شہر زوری شامل تھے انہوں نے بزرگ ہونے کی حیثیت سے
 سلطان مرحوم کے بیٹے الملک الصالح اسماعیل کو تخت دمشق کا وارث نامزد کیا اور امیر شمس الدین
 محمد بن عبدالملک المقدم کو ملک صالح کا گھراں، سلطنت کا منتظم اور سربراہ مقرر کیا۔
 لوگ المقدم کے دل کا حال نہ جانتے تھے اس لئے کسی نے اس انتخاب کی مخالفت نہ کی
 اور شمس الدین المقدم کو اقتدار سونپ دیا گیا۔

اس وقت سلطنت دمشق سے تعلق رکھنے والے دو امیر زیادہ طاقتور تھے
 ایک تو مصر کا وزیر اعظم صلاح الدین اور دوسرا سلطان مرحوم کا بھتیجا سیف الدین غازی
 جس کو سلطان مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں موصل کا حاکم مقرر کیا تھا۔
 سلطان کی وفات پر اس نے الجزیرہ کے تقریباً تمام قلعے فتح کر لئے تھے۔
 دمشق میں امیر شمس الدین ابن مقدم کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر مصر سے

لجے میں جواب دیا قاضی کمال شہزوری امیر کے جواب پر سناٹے میں آگئے لیکن
ہل میں ملک اور قوم کا سچا درد تھا اس لئے اس سخت جواب کے باوجود انہوں نے
”امیر محترم اگر آپ کا خیال ہے کہ حاکم موصل فرنگیوں کے مقابلہ پر
بت کی کوئی مدد نہیں کرے گا تو اس پر خاک ڈالئے اور امیر صلاح الدین سے فوجی مدد
پہنچانے کے لئے بانیاں کے قلعہ کو کافروں سے جلد از جلد آزاد کرایا جاسکے۔“

”قاضی محترم۔ خدا کے لئے آپ مجھے ایسے مشورے نہ دیجئے۔“ امیر شمس الدین
”ملکی دباؤ بچوں کے کھیل نہیں ہوتے بانیاں کے بارے میں امراء سے مشورہ کیا
جے۔“

قاضی کمال الدین شہزوری دل برداشتہ ہو کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ مشورے
بچے فرنگی دمشق کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے بانیاں سے بھی آگے بڑھ آئیں
میں نہیں سمجھتا کہ امیر صلاح الدین سے ملک منگنے سے کیا نقصان ہو جائے گا جبکہ
ن ملک الصالح اسماعیل کی جانشینی پر مسرت اور اطاعت کا اظہار کیا ہے۔“

قاضی کمال الدین تو بڑا بڑاٹے چلے گئے مگر شمس الدین بن المقدم کو فکر پڑ گئی کہ
بات بڑھ نہ جائے قاضی اس کے خلاف کوئی محاذ نہ بنائیں۔ چنانچہ اس نے صرف ان
لوگوں میں لیا جن کا مقام ابن مقدم سے وابستہ تھا پھر اسی دن شام کو تاج۔ دمشق کی
سے اعلان کیا گیا کہ شاہی فوجیں بانیاں سے فرنگیوں کو نکالنے کے لئے روانہ ہو رہی
اس اعلان سے جہاں قاضی کمال الدین شہزوری کے آنسو پچھ گئے وہاں امیر شمس
دین لوگوں کا اعتماد کچھ اور بڑھ گیا۔

امیر شمس الدین بن المقدم کا اعلان بڑا دل خوش کن تھا مگر المقدم نے اس اعلان کو
طرح جادہ پٹنایا وہ قابل نفرت بن گیا۔ امیر شاہی لشکر لے کر دمشق سے نکلا اور بانیاں
کو دور پہنچ کے پڑاؤ ڈال دیا۔ ادھر قلعہ بانیاں کا یہ حال تھا کہ اس پر فرنگی قبضہ نہ
کرتے بلکہ انہوں نے صرف قلعہ کا محاصرہ کیا تھا۔ بانیاں کا محاصرہ کر کے فرنگی یہ
الگا چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں اب کتنی طاقت ہے کیونکہ وہ اب بھی مسلمانوں سے
تھے۔ ان کو اس بات کا خوف تھا کہ اگر بانیاں پر قبضہ کر کے اسے تباہ کر دیا گیا تو
مسلمان آپس کے بھڑکے بالائے طاق رکھ اکٹھا نہ ہو جائیں اور فرنگیوں کو لینے کے
پڑ جائیں۔

فرنگیوں کو پتہ چلا کہ دمشق کا شاہی لشکر بانیاں کو بچانے پہنچ گیا تو وہ بہت پریشان
ہوئے لیکن میں محاصرہ اٹھانے کی باتیں کرنے لگے اسی شام امیر الامراء شمس الدین محمد

صلاح الدین ایوبی نہ بھی آیا تو موصل کا حاکم سیف الدین غازی ضرور دمشق
کو شش کرے گا۔ اس طرح شمس الدین ابن مقدم اپنے مفاد کی خاطر صلاح
سیف الدین غازی دونوں ہی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس دوران جبکہ صلاح الدین ابھی مصر سے روانہ بھی نہ ہوا تھا،
مسلمان علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ عیسائیوں نے اندازہ کر لیا تھا
الدین زنگی کی وفات سے سلطنت دمشق کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے۔ دمشق
لڑکا برسر اقتدار ہے اس لئے اگر مسلمانوں کے دور دراز علاقوں پر حملہ کیا جا
کے لئے کوئی نہ پہنچ سکے گا۔ پس فرنگی تیزی سے مسلم علاقے میں داخل ہو
نے مشور قلعہ بانیاں پر قبضہ کر لیا یہ قلعہ براہ راست دمشق کی مرکزی حکومت
تھا۔ اس نئی مصیبت سے دمشق کے امراء میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔

قاضی کمال الدین شہزوری نے ابن مقدم سے کہا تھا۔ ”اے امیر
قلعہ پر کافروں کے قبضہ سے سلطنت دمشق کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ بانیاں
واپس لینے کے لئے آپ کو سلطنت کے طاقتور امراء کا تعاون حاصل کرنا چاہئے
شمس الدین محمد بن عبد الملک المقدم سمجھ گیا کہ قاضی کیا کہنا چاہتے
بن کے پوچھا۔ ”قاضی کن امراء کا تعاون چاہتے ہیں؟“

”ظاہر ہے کہ فرنگی خطرہ کو صرف دو امیر دور کر سکتے ہیں۔“ قاضی نے
زوری نے بے دھڑک جواب دیا۔ ”ایک امیر مصر کا وزیر اعظم صلاح الدین
امیر موصل کا حاکم سیف الدین غازی۔ ان میں سے آپ جس کا بھی تعاون
کے وہ سلطنت دمشق کے لئے مفید ہوگا۔“

امیر شمس الدین بن المقدم نے قاضی کمال کو قدرے سختی سے جواب
محترم یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے آپ حل کریں گے ملکی معاملات میں چاروں
پڑتی ہے۔ حاکم موصل سیف الدین غازی کا کروار آپ کے سامنے ہے سلطان
بند ہوتے ہی اس نے الجزیہ میں ادھم مچا دیا اور ایک ایک کر کے تمام قلعوں
اس سے دمشق کی بھلائی کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں امیر۔“ قاضی کمال نے تائید کی۔ ”لیکن
مسلمان علاقوں پر قبضہ ہے ان کے مقابلے میں سیف الدین غازی ہماری
گا۔“

”اور مدد کرنے کے بجائے دمشق پر قبضہ کر لے گا۔“ امیر شمس الد

کرنے کے لئے شاہی افواج نے بڑی کاشتوت دیا اور فرنگیوں کو قلعہ خالی کرنے کے لئے لاکھ دینار بطور رشوت ادا کئے گئے۔ امیر صلاح الدین کی خیال میں فرنگیوں کو دے کر امراء نوریہ نے موت کے فرشتے کو گھر دکھادیا ہے۔ اب ان کا جب جی اور کسی مسلم علاقہ پر چڑھ دوڑیں گے اور بغیر رقم حاصل کئے واپس نہ جائیں گے۔ امراء نے یہ بھی پیغام دیا ہے کہ امراء کی بدعنوانیوں کی وجہ سے سلطنت دمشق کے ہونے ہیں اور وہ خود دمشق پہنچ کر اپنے آقائے مرحوم کے فرزند شاہ دمشق ملک و بدعنوان امراء سے نجات دلائیں گے۔

قائد جب یہ سخت جملے ادا کر رہا تھا اس وقت بہت سے امراء نوریہ وہاں موجود کسی میں بہت نہ ہوئی کہ وہ قاصد کو روکے سوائے قاضی کمال الدین شہزوری کے نے امیر الاشمس الدین المقدم کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ قاضی اور دوسرے امراء کو بن نے یہ بتایا تھا کہ اس نے قلعہ بنایاں کو فرنگیوں سے بزور شمشیر واپس لیا ہے۔ اس جھوٹ کا بھانڈہ آج پھوٹ گیا تھا۔ قاصد کے ذریعہ پیغام بھیجنے کے بعد امیر بن نے امیر شمس الدین المقدم کو ایک نہایت سخت خط لکھا تھا مگر اس دوران امیر ناکس شاہ دمشق ملک الصالح کو حلب اغوا کر کے لے گیا۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے دین کو فوری طور پر دمشق روانہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب جب صلاح الدین صرف سات سو سواروں کے ساتھ مندریں مارتا دمشق پہنچ گیا تو امیر شمس الدین نے قلعہ کو صلاح الدین سے بچانے کے لئے اپنی معصوم بیٹی واستعمال کیا لیکن نیک دل دوشیزہ وہ کردار ادا نہ کر سکی جس کے لئے اس کے باپ دے کر اسے تیار کیا تھا۔ ان دو واقعات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ابن الاملائے پہلے ہی سے سیاہ تھا۔ اس بے شرم نے یہ بھی نہ لحاظ کیا کہ اگر اس کی اند صلاح الدین کے بھتیجے فرخ شاہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے لایا جاتا۔ کم از کم دمشق کا کوئی غیرت مند نوجوان ارمانہ کو اپنی بیوی بنانے پر ہوتا۔

صلاح الدین اپنے سواروں کے ساتھ قلعہ دمشق میں منتقل ہو گیا۔ تھا اس نے فرخ ادا کیا تھا کہ وہ شمس الدین ابن المقدم کو زندہ یا مردہ اس کے سامنے حاضر کرے، اللہ کی سزا دی جا سکے۔ فرخ شاہ کے لئے یہ بھی حکم تھا کہ اگر ابن المقدم ہاتھ تو کم از کم اس نقاب پوش خاتون کا پتہ لگایا جائے تاکہ ابن مقدم کی پوری سازش مانگے فرخ شاہ نے ابن مقدم کو نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ قلعہ اور شہر کے کونے

بن عبد الملک المقدم کا قاصد فرنگی خیمہ گاہ میں پہنچا تو کافروں کی باچھیں کھل کر ان کی صفوں میں بھاگنے کے منصوبے تیار ہو رہے تھے اور کہاں اب وہ ان کے امیر شمس الدین نے اپنے ایک خاص معتمد کو صلح کی بات کرنے فرنگیوں اور اسے سمجھادیا کہ فرنگیوں سے ہر صورت صلح کرنی ہے۔ اس عقلمند نے ڈرانے دھمکانے کے بجائے ان کے سامنے اپنی کمزوریاں بیان کرنا شروع کر دیں فرنگی سالار فوج کو بتایا کہ دمشق کی مرکزی حکومت اس وقت خانہ جنگی میں الہم سلطنت کے دو طاقتور حریف دمشق پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں ایک طاقت مصر صلاح الدین ایوبی کی ہے جو قاہرہ سے دمشق کے لئے پر تول رہا ہے۔ د موصول کے حاکم سیف الدین غازی کی ہے جس نے الجوزیہ کے تمام قلعوں ہے۔ اب وہ کسی وقت اپنے لشکر جبار کے ساتھ دمشق کا رخ کر سکتا ہے۔ کے بعد اس نے فرنگی سالار سے درخواست کی وہ بنایاں کا محاصرہ اٹھا کر واپس چا جناد کے نام پر دمشق کی دونوں حریف طاقتیں یکجا ہو جائیں گی پھر ایک صلیبی ہو جائے گی جس کی تباہ کاریوں کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

صلح کے سفیر نے فرنگیوں پر یہ باتیں واضح کی کہ دمشق کی مرکزی حکمر امیر شمس الدین بن المقدم اس کوشش میں ہیں کہ مصر کے صلاح الدین ایوبی سیف الدین کا گٹھ جوڑ نہ ہونے پائے اور وہ آپس میں ٹکرا کے ختم ہو جائیں۔ نے فرنگی سالار سے درخواست کی کہ وہ بنایاں کا محاصرہ اٹھا کے اپنے علاقے جائیں کیونکہ یہ بات ان کے حق اور مفاد میں ہے اس پر سالار کو پیش کش کی فوری طور پر محاصرہ ختم کر دیں تو اس کے لئے انہیں ایک معقول رقم پیش کی اندھا کیا چاہے دو آنکھیں فرنگی محاصرہ اٹھانا چاہتے تھے۔ صلاح الدین کا انہیں اندازہ نہیں تھا بلکہ وہ اس سے بہت خائف تھے اس لئے وہ محاصرہ راضی ہو گئے۔ انہیں اس کے صلہ میں ایک معقول رقم ادا کی گئی جو شمس الدین شاہی خزانہ سے نکال کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس رقم کی صحیح مقدار کا پتہ سوائے اس کے کہ یہ رقم لاکھوں دینار کی شکل میں ادا کی گئی۔

صلاح الدین کے جاسوس نے اسے قاہرہ خبر پہنچائی تو اس نے سربہ اسی وقت اپنا قافلہ دمشق روانہ کیا جس نے یہاں پہنچ کے نئے بادشاہ امراء نوریہ کے سامنے سخت الفاظ میں صلاح الدین کا پیغام سنایا۔ صلاح الدین نے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ اپنا

اچانک ہی ہو گیا ہے اور صلاح الدین اس خاندان کے کھنڈرات پر ایوبی سلطنت کی عمارت تعمیر کر رہا ہے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ صلاح الدین کے دامن سے وابستہ کر دیا تھا۔ وہ امرا جو گوشہ نشین ہو گئے تھے وہ پھر عملی زندگی میں واپس آ گئے

صلاح الدین کی صورت میں ایک نیا سلطان دمشق نظر آ رہا تھا۔ صلاح الدین کے بھتیجے فرخ شاہ کو مجلس یا درباری زندگی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صلاح الدین کے ساتھ قیام کرنے سے گریز کیا تھا اور وہ مصر سے سواروں کے ساتھ فوجی بیرک میں رہتا تھا۔ فرخ شاہ کا بچپن دمشق ہی میں گزرا تھا دمشق سے اس وقت قاہرہ منتقل ہوا تھا جس وقت امیر صلاح الدین مصر کا بادشاہ تھا اور اس نے سلطان نور الدین زنگی مرحوم سے اپنے خاندان والوں کو مصر کی درخواست کی تھی۔ اس طرح فرخ شاہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ قاہرہ پہنچا تھا میر صلاح الدین اسے اپنے ساتھ ایک بار پھر دمشق لے آیا تھا۔

شاہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اس میں اپنے باپ نورالدولہ شاہان شاہ کی طرح رومانی کوٹ کوٹ کے بھری تھی لیکن وہ بے باک خاموش تھا یا پھر وہ اس وجہ سے خاموش رہتا کہ اسے جوانوں میں اٹھنے بیٹھنے کے بہت کم مواقع میسر آتے تھے۔ ہاں ان میں وہ بہت خوش رہتا تھا۔ اسے قلعہ میں آئے ایک ہفتہ گزر رہا تھا کہ ایک آدمی کھانے کے بعد دو گھڑی آرام کے لئے بستہ پر دراز ہوا تو اس کے غلام نے بلاتے ہوئے کہا۔

ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔

شاہ نے حیران نظروں سے غلام کو دیکھا۔ ”تجھے دھوکہ تو نہیں ہوا۔ کون ہے وہ

ایہ تو میں نہیں جانتا کہ کون ہیں مگر یقین کیجئے کہ مجھے کسی قسم کا دھوکہ نہیں ہوا۔ بات کا یقین نہ ہو تو باہر چل کے دیکھ لیجئے یا پھر اسے اندر آنے کی اجازت غلام نے انک انک کے فرخ شاہ کو بتایا۔

نور پاگل ہو گیا ہے۔ فوجی بیرک میں اور عورت؟“ فرخ شاہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

”میں اس سے کسے دیتا ہوں کہ آقا سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔“ غلام نے لڑکھائے۔

”میرے سوچنے دے۔“ فرخ شاہ نے اسے واپس جانے سے روک دیا پھر کچھ لمحہ ”چھالے آس خاتون کو۔“

کونے میں پہنچا تھا اور ابن مقدم کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اب رہا اس خاتون کا سوال جس نے نقاب پوش کو قتل کر کے فرخ شاہ اس خاتون کے متعلق بھی فرخ شاہ کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ کون ہے اور اس نے یہ میرانی کیوں کی۔ فرخ شاہ جس وقت قلعہ دمشق میں داخل ہوا تھا اسے دو نقاب دامنیں بائیں سے اپنے حلقے میں لے لیا تھا پھر اچانک اس نے ایک نقاب پوش آواز سنی اور دیکھا کہ اس نے دوسرے نقاب پوش کو جو فرخ شاہ پر حملہ کر رہا اسے حملہ سے باز رکھا بلکہ اپنی تلوار اس کے پہلو میں اتار کے ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ پھر ہنگامہ راہ گیر شروع ہو گیا اور فرخ شاہ اپنی محسنہ کو نہ دیکھ سکا۔ ہنگامہ کے بعد بھی فرخ شاہ کو وہ نقاب پوش حسینہ نظر نہ آئی۔

فرخ شاہ کو اس نقاب پوش حسینہ میں اس لئے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ صرف اس کی جان بچائی بلکہ اس پر ناقابل فراموش احسان بھی کیا تھا بلکہ اسے قطعی بے لوث تھی۔ اگر اس نے یہ کردار کسی مفاد کی خاطر ادا کیا ہوتا تو ہر کر اپنی خدمت کا صلہ حاصل کرنا چاہئے تھا مگر وہ بھی بالکل اسی طرح غائب شمس الدین المقدم روپوش ہوا تھا۔ فرخ شاہ کو اس کی تلاش اس وجہ سے امیر صلاح الدین نے اسے اس کام پر مامور کیا تھا دوسرے یہ کہ وہ اپنی محسنہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ پر خلوص ہستی نہ تو فرخ شاہ کو تلاش ہر سکی اور نہ اس نے خود امیر صلاح الدین یا فرخ شاہ کے سامنے پیش ہونے کی صلاح الدین نے قلعہ دمشق پر قبضہ کرتے ہی شاہی خزانے کا منہ کھول کے لوگوں میں انعام و اکرام تقسیم کئے۔ اس کے پاس صرف سات

دمشق کی شاہی فوج کے بھی حصے بخرے ہو گئے تھے۔ صلاح الدین فوری طور لشکر نہیں منگاتا چاہتا تھا مگر اسے ایک بھاری لشکر کی سخت ضرورت تھی تاکہ حاکم سیف الدین غازی کا زور توڑے اور الجزائرہ کے وہ تمام قلعے واپس ماتحت تھے۔ اس نے زبردست بھرتی شروع کی اور بہت جلد ایک لشکر تیار ہوا۔ امیر صلاح الدین نے دمشق کے خزانے سے لشکر تیار کیا تھا لیکن وہ

وہ کس ملک الصالح اسماعیل کے نام پر کرتا اور لوگوں کو یہی تاثر دیتا کہ وہ کا مطیع اور وفادار ہے۔ اس کے اس اظہار نے اس کے مخالفوں کو بھی ابر تھا۔ امرا یوں بھی چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں۔ انہوں نے محسوس

ہاں ہاں نہیں دیکھا ہوگا۔“ فرخ شاہ گھبرا گیا۔ ”دراصل بعض آوازیں اتنی ملتی جلتی
ہیں کہ دھوکہ ہو جاتا ہے۔“

ارمغانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر امیر زادے یہ فرمائیں کہ انہوں نے میری آواز پہلے
سنی ہے تو میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔“

”کیا تم نے۔“ یہی ہاں کہ میں نے تمہاری آواز پہلے بھی سنی ہے؟“ فرخ شاہ نے
مٹی سے اسے دیکھا لیکن ارمغانہ نے بھاری پلکیں جھپکا کے سر جھکا لیا۔

”جی امیر زادے۔ میں نے یہی عرض کیا تھا۔ اس کی آواز میں افسردگی کھل رہی تھی۔
ہاں۔ اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ امیر زادہ فرخ شاہ سنبھل کے بیٹھ گیا۔

”امیر زادے ماضی قریب کے اس واقعہ کی طرف ذہن دوڑائے جب آپ چند سواروں
ساتھ اس قلعہ کے صدر دروازے پر تشریف لائے تھے۔“ ارمغانہ نے اس کی
شت کو جھنجھوڑا۔

فرخ شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس واقعہ کا ایک ایک لمحہ۔ ایک ایک قدم اور
ایک حد پر میری نظر ہے۔ تم کیا پوچھنا چاہتی ہو مجھ سے؟“

”حاکم قلعہ کی طرف سے دو آہن پوش اور نقاب پوش سواروں نے آپ کا استقبال کیا
۔“ خاتون سردار نے میں بتا رہی تھی کہ فرخ شاہ نے اسے روک دیا۔

”معمود خاتون۔۔۔ اس کے آگے میں بیان کرتا ہوں۔“ اور فرخ شاہ نے جیسے خواب
منا شروع کیا۔

”دونوں سوار میرے دائیں بائیں تھے۔ ایک سوار کا گھوڑا بے قابو ہو رہا تھا جیسے اس
سنبھل نہ رہا ہو۔ اور۔۔ وہ پھری میری پشت کی طرف سے ایک لرزتی ہوئی آواز
۔ امیر زادہ ہوشیار۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو میرا استقبال کرنے والے دونوں آہن
ایک دوسرے سے شمشیر زنی کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اسی وقت
آہن پوش کی تلوار دوسرے آہن پوش کی پسیلوں میں داخل ہو کر اس کے دل تک
ٹی۔ آخر ہمارے جوان نے مقتول کے جسم سے اپنی تلوار کھینچے ہوئے کہا۔ امیر زادے
کو دھوکہ دیا گیا۔ فوراً“ قلعہ سے نکل جائے۔ کیوں خاتون یہی کچھ پیش آیا تھا ناں
“

”جی ہاں امیر زادے۔ یہی کچھ ہوا تھا۔“ اب اس کی آواز غم کی گہرائیوں میں ڈوبی
رہی تھی۔

”اور مجھے قمر قرانی آواز میں خبردار کرنے اور قلعہ سے نکل جانے کا حکم دینے والی

چند لمحوں بعد غلام ایک خاتون کو اندر لایا۔ اس کے چہرے پر آدھا نقاب تھا
روشن روشن آنکھیں اور نصف پیشانی نظر آرہی تھی۔

”میں امیر زادے کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہوں۔“ خاتون کی سترم
فرخ شاہ کو چونکا دیا۔

فرخ شاہ اب تک سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خاتون کے سلام کرنے پر اس نے
اٹھائیں پھر جھکتے ہوئے کہا۔ ”خاتون تم۔۔۔ تم وہی تو نہیں ہو؟“

”جی بالکل وہی ہیں آقا۔ انہی کے آنے کی میں نے آپ کو اطلاع دی تھی
نے فرخ شاہ کی بات اچک لی۔

”تم خاموش رہو۔۔۔“ فرخ شاہ نے غلام کو دوسری مرتبہ ڈانٹا۔

غلام منہ لٹکا کر باہر کی طرف جانے لگا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ فرخ شاہ نے اس کے قدم روک دیے۔

”باہر جا رہا ہوں آقا۔ ضرورت پڑے تو بلا لیجئے گا۔“ غلام نے نظریں نیچی

جواب دیا۔

”نہیں۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ بیٹھ جاؤ۔“

فرخ شاہ نے غلام کو دوسرا حکم دیا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ فرخ شاہ دریا
میں عورت سے گفتگو نہ کرنا چاہتا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ اس نے آج تک

عورت سے تنہائی تو تنہائی لوگوں کے سامنے بھی بات نہیں کی تھی۔
”میں امیر زادے سے کچھ عرض کرنے حاضر ہوئی ہوں۔“ خاتون نے کہا۔

فرخ شاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کہیں بلبل چھپا رہا ہو۔ کتنا لوج ہے اس
آواز میں مگر یہ آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔ فرخ شاہ خیالوں میں گم ہوا

نے سر کو جھٹکا دیا اور سنبھل کے پوچھا۔
”کیا نام ہے تمہارا خاتون؟“

”میں مظلوم ہوں امیر زادے اور مظلوم کا کوئی نام نہیں ہوتا“ خاتون کی
ہو گئی۔

فرخ شاہ نے جرات کر کے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں پہلے ہی
ہے؟“

”کبھی نہیں امیر زادے۔ آپ نے مجھے کہیں نہیں دیکھا۔“ خاتون نے
کی۔

عظیم ہستی تم ہو۔۔۔ کیا میں نے غلط تو نہیں کہا خاتون؟۔۔۔

”امیر زادے نے ایک ایک لفظ درست فرمایا۔۔۔“ خاتون نے غمناک آواز میں دیا۔

امیر زادہ فرخ شاہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ ”اگر وہ درست ہے تو پھر یہ بھی درست میں اس وقت اپنی اس محسنہ کے سامنے کھڑا ہوں جس نے مجھے نہ صرف موت سے بلکہ مجھ پر حملہ کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔“ خاتون نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں کے کورے پڑے۔

”ارے رے۔ یہ کیا میں اپنی محسنہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“ ذ نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”مجھے بتاؤ کہ وہ کون ظالم ہے جس نے تمہیں روئے پر ہے۔“

”میں کسی کے سلسلے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ امیر زادے۔“ اس کی سسکیا گئیں۔

”خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔ جب تک میں اس سے تمہارا بدلہ نہ لے لوں گے نہیں آئے گا۔“ اور امیر زادہ کا ہاتھ کمر میں لگے خنجر کے قبضہ پر پہنچ گیا۔

”نہیں امیر زادے۔ میں اس سے بدلہ نہیں لے سکتی۔“ خاتون کی سسکیاں جا آنسو رواں تھیں۔

امیر زادہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”پھر میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“ ”میں اپنے دل کا غم کھول کے آپ کے سامنے رکھتی ہوں۔“ خاتون نے آند ڈالے۔ ”پھر آپ فیصلہ کیجئے آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ امیر زادہ فرخ شاہ بیٹھ گیا۔

”سنئے امیر زادے۔“ خاتون نے واضح الفاظ میں مخاطب کیا۔ ”میرا نام ارغنا اور میں امیر شمس بن عبدالمک کی بیٹی ہوں۔“ ارغنا نے رک کے امیر زادہ چہرے پر اپنے اظہار کا تاثر تلاش کیا مگر امیر زادے کے چہرے کسی طرح کے تاثر خالی تھا۔

”کہو کہو۔۔۔ رک کیوں گئیں خاتون؟“ امیر زادہ فرخ شاہ نے اسے خاموش دیکھا

”میرا خیال تھا آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔ کیا آپ امیر شمس الدین کو جانتے؟ ارغنا نے حیرانی سے پوچھا۔

”امیر شمس الدین کا نام سنا ہے۔ مگر میں ان سے زیادہ واقف نہیں۔“ فرخ شاہ نے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ارغنا نے کچھ سوچا پھر بولی۔ ”کیا آپ شمس الدین ابن مقدم کو بالکل بھول گئے؟“

”ابن مقدم۔“ فرخ شاہ چونکا۔ شمس الدین ابن مقدم جس نے قلعہ اور امیر صلاح

ناپولی کی فوجوں کو لڑانے کی کوشش کی تھی؟“

”جی ہاں امیر زادے۔۔۔“ ارغنا نے نظریں جھکا کے کہا۔ ”میں اسی ابن مقدم کی بیٹی اپنے باپ کہتے ہوئے آج میری گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔“

”میں نہیں جانتی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔“ اس نے غمگین آواز میں کہا۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ اس نے اپنی بیٹی کو کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔“

”نہیں ارغنا۔۔۔“ فرخ شاہ نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا۔ ”ہر ایک کے اعمال اس ماتھ ہوتے ہیں۔ تم کسی کی بھی بیٹی ہو مگر میرے لئے قاتل احترام ہو۔ تم نے مجھے ادا دی ہے۔ میری محسن ہو تم۔ میں تمہیں امیر کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ تمہیں نذر انعام سے نوازیں گے۔“

”تمہیں امیر زادے۔ میں امیر کا سامنا نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں بری ہوں۔“ ارغنا نے افسردگی سے کہا۔ ”میں اپنے باپ کے جرم میں برابر کی ہوں۔ میں بھی اس بھیاںک سزا کی حقدار ہوں جو آپ نے میرے باپ کے لئے ہے۔“

ارغنا کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمام عمر میں کرب میں مبتلا رہو کہ مجھے میری محسنہ ملی بھی لے اس کے احسان کا کوئی بھی صلہ نہ دے سکا۔“

”امیر زادے اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی نیک کیا ہے تو مجھے صلہ دینے کے بجائے میری آنکھوں سے بننے والے اس خون کو روک

شرم و ندامت کے آنسو بن کر میری آنکھوں سے جاری رہتا ہے۔“

”مگر۔۔۔“ مگر ارغنا مجھے بتاؤ تو سہی کہ تمہارے آنسو کس طرح رک سکتے ہیں؟“

شاہ جذباتی ہو گیا۔ ”میں اپنی محسنہ کو رونے کے بجائے ہنستا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”امیر زادے اگر آپ چاہتے ہیں کہ میرا بچو کے دہتا ہوا ضمیر مطمئن ہو جائے تو آپ

مگر باپ شمس الدین ابن مقدم کو معاف کر دیجئے۔ ارغنا کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

”اگر آپ نے مجھے مایوس کیا تو پھر مجھے سوائے موت کی آغوش کے اور کہیں سکون

نہ مل سکے گا۔

”امیر زادہ فرخ شاہ پریشان ہو گیا۔ ارمغانہ اس شخص کے لئے معافی چاہتی تھی نہ صلاح الدین کی نظروں میں ملک و قوم دونوں کا دشمن اور غدار تھا پھر صلاح الدین کی گرفتاری پر فرخ شاہ کو نامور کیا تھا۔

”نیک خاتون ارمغانہ ----“ فرخ شاہ نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد کہا۔ تمہارے غم کا اندازہ ہو گیا ہے۔ مگر تمہارا ضمیر تو مجرم نہیں۔ جو کچھ ہوا وہ ابن مقدم فعل تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو بخدا میں ابن مقدم کو دل سے معاف کرتا ہوں۔ کا جرم کتنا ہی گھناؤنا سہی مگر وہ اس کردار کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتا جو میرے بچانے کے سلسلے میں ادا کیا۔ لیکن میرے معاف کردینے سے ابن مقدم کے جرم کوئی کمی نہیں ہو سکتی کیوں وہ امیر صلاح الدین کا مجرم ہے اور وہی اسے معاف ہیں۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں امیر زادے۔“ ارمغانہ نے گھٹی آواز میں کہا۔ نے میرے دل کا بوجھ ختم کر دیا۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ جب آپ کو معلوم ہو اس باپ کی بیٹی ہوں جو تخت دمشق کا غدار ہے تو آپ مجھے ملاقات کا بھی شرف بخشیں گے۔“

امیر زادے نے اسے مطمئن دیکھ کر کہا۔ ”ارمغانہ اب میں تم سے ایک درخواست کروں گا؟“

”آپ حکم دیجئے امیر زادے۔ میں انکار نہیں کروں گی۔“ ارمغانہ کے لبے میں پیدا ہو گیا تھا۔

امیر زادے نے بھی ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ ”امیر کو یہاں تک تو معلوم ہوا ابن مقدم نے قلعہ دار کو فریب دے کر اپنے ذاتی دستہ کا پہرہ صدر دروازے پر لگا دیا ابھی تک ان کا ذہن صاف نہیں ہوسکا امیر نے مجھے ایک طرف تو ابن مقدم کی گرفتاری حکم دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ اس نقاب پوش خاتون کو بھی تلاش کیا جا جس نے عین وقت پر اس کے نتیجے کی جان بچائی ہے۔ امیر اس سلسلے میں تمہارا شکر کرنا چاہتے ہیں۔“

”مگر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ارمغانہ نے الجھتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ امیر کے پاس چلو۔ پھر تم موقعہ دیکھ کے با وقت جب امیر تمہارا شکریہ ادا کر رہے ہوں تو خود امیر سے اپنے باپ کے لئے معافی

کر دیا جب ہے کہ امیر اس کا جرم معاف کر دیں۔“ فرخ شاہ کا مشورہ بڑا مخلصانہ تھا۔ اس میں اس بات کا امکان موجود تھا کہ امیر شمس الدین کو ارمغانہ کے اہم کام کی وجہ سے معافی مل سکتی ہے۔

”نیک ہے امیر زادے ----“ ارمغانہ نے اس کی بات مان لی۔ ”اگر آپ کا خیال ہے کہ اس طرح میرے باپ کو معافی مل سکتی ہے تب تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔“

اسی رات فرخ شاہ نے امیر صلاح الدین سے تنہائی میں عرض کیا۔ ”امیر محترم۔ شمس الدین ابن مقدم کی تلاش جاری ہے۔ ہاں اس واقعہ کا ایک اہم چشم گواہ مجھے مل گیا ہے۔ تم ہو تو اسے حضور میں پیش کیا جائے۔“

اگر تمہارا گواہ اس سلسلے میں کوئی نئی بات بتا سکتا ہے تو اسے لے آؤ ورنہ فضول لوگوں کی باتیں سننے سے صرف وقت ہی ضائع ہوگا۔“ صلاح الدین نے بے دلی سے کہا۔

”امیر عالی مقام۔ اگر وہ کوئی نئی بات نہ بتا سکے تو بھی آپ نے اسے حاضر کرنے کا حکم دیا تھا۔“ فرخ شاہ نے گفتگو کو پراسرار بنا دیا تھا۔

”فرخ۔ تم معصوم میں کیوں بات کر رہے ہو۔“ امیر نے الجھتے ہوئے کہا۔ آخر وہ کون شخص ہے جس کو پیش کرنے کے لئے میں نے کہا تھا اور تم اسے پیش کرنے کی از سر نو بازت چاہتے ہو؟“

”وہ میری محسنہ ارمغانہ ہے۔ جس نے قلعہ کے اندر مجھے پہلے خطرے سے آگاہ کیا پھر وہ حملہ کرنے والے نقاب پوش کے دل میں اپنی تلوار اتار دی تھی۔“ فرخ شاہ نے بے جوش و جذبے سے کہا۔

”شکر ہے کہ تم نے اس ظلم کو بے نقاب کیا۔“ صلاح الدین نے سپاٹ لبے میں کہا۔ ”تم اس قدر پراسرار باتیں کیوں کرنے لگے ہو فرخ۔ جسے تم محسنہ کہہ رہے ہو شاید ماکام ارمغانہ ہے۔ اس کے پیش کرنے میں یہ پس و پیش کیوں۔ وہ تمہاری محسنہ نہیں۔ اس نے ہمارے اہم لشکر کی جان بچا کر ہم پر بھی احسان کیا ہے۔ وہ اس وقت ہے ہاں؟“

”یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا امیر۔“ فرخ نے جواب دیا۔ ”اس کا دل بہت مہربان ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ امیر نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس نقاب پوش خاتون ان کے پاس پیش کیا جائے۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ میں صبح کو آپ کے سامنے پیش کروں۔“

”نیک ہے تم اسے لے آؤ۔“ امیر نے کہا۔ ”ہم اسے انعام بھی دیں گے اور وہ

الجہنم جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کریں گے۔ بہتر ہے کہ تم اسے شہر کے وقت لاؤ۔“

ارمغانہ سے فرخ شاہ نے امیر کے پاس جانے کا وعدہ لے لیا تھا۔ دوسرے دن صبح حسب وعدہ فرخ شاہ کے پاس آئی۔ امیر نے ارمغانہ سے ملاقات کے لئے شام کا وقت مقرر کر دیا تھا۔ فرخ شاہ نے اسے یہ بات بتائی۔

”ارمغانہ۔ امیر تم سے شام کے وقت ملیں گے۔“ فرخ شاہ کا انداز بڑا بے تکلف تھا۔ وہ ارمغانہ کی نظروں میں نظریں ڈال کر بات کر رہا تھا۔

ارمغانہ نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے امیر سے ملتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“

”اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔“ فرخ شاہ نے اسے حوصلہ دیا۔ ”وہ تو تمہیں انہما دینے کو کہہ رہے تھے۔ پھر ملاقات کے وقت میں بھی تو تمہارے ساتھ موجود ہوں گا۔“

ارمغانہ نے نظریں اٹھائیں تو فرخ شاہ کو اسی بیتابی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ امیر زادہ ایک بات کہوں آپ کو ناگوار تو نہ ہوگی؟“

”ضرور کہ ارمغانہ۔“ فرخ شاہ چکا۔ ”مجھے تمہاری بات بری نہیں لگے گی۔“

”اگر آپ نے امیر کے سامنے بھی یہی انداز اختیار کیا تو ان پر اچھا تاثر نہ ہوگا۔ ارمغانہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

فرخ شاہ نے اسے چونک کے دیکھا۔ ”کیسا تاثر۔ میں کیا ارمغانہ؟“

امیر زادے۔ میری آپ سے یہ دوسری ملاقات ہے اور آپ مجھے اس قدر بے تکلف سے دیکھ رہے ہیں کہ دوسرا آدمی اس کا کوئی غلط مطلب بھی نکال سکتا ہے۔“ ارمغانہ کو آواز دھیمی مگر لہجے میں تلخی موجود تھی۔

امیر زادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”معاف کرنا ارمغانہ۔ میں اپنے اس بے تکلفی پر سخت شرمندہ ہوں۔ تمہیں آئندہ مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔“

امیر صلاح الدین نے دمشق پر قبضہ کے بعد یہ محسوس کیا کہ اب دمشق کی وہ اہمیت نہیں جو سلطان نور الدین زنگی کی حیات میں تھی۔ دمشق سلطان کا دارالسلطنت تھا اس کی شہرت اور اہمیت سلطان کی موجودگی کی وجہ سے تھی۔ بغیر سلطان کے دمشق محض ایک قدّہ شہر تھا اس کو دارالسلطنت کہنا کسی طرح درست نہ تھا۔ سلطان کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا وارث و جانشین ملک الصالح اسماعیل دمشق کی بجائے حلب پہنچ گیا تھا پھر یہ کہ امیر صلاح الدین نے دمشق پر قبضہ بھی اس اعلان کے بعد ہی کیا تھا کہ وہ سلطنت کے وارث ملک

ملک کا وفادار اور محض ایک امیر ہے اور یہ کہ میں قاہرہ سے اس لئے آیا ہوں کہ وارث کے وراثت کو مفاد پرست امیروں کے چنگل سے چھڑا کے ان کے ان شہروں کو واپس دلا دے اور دمشق کے ماتحت تھے۔

امیر صلاح الدین یہ بھی جانتا تھا کہ ملک الصالح اسماعیل کے دل میں گھر پیدا کرنا یا اسے حلب سے واپس لانا لوہے کے چنے تھے حالانکہ اس نے خطبہ میں ملک الصالح کا نام اہل کرنے کا حکم دے دیا تھا اور سکے پر بھی اسی کا نام درج کیا جا رہا تھا۔ صلاح الدین کے ہاں تو وہ امیر دشمن تھے جو سلطان مرحوم کی حیات میں سردار صلاح الدین کے خلاف ہر انتہائی کرتے تھے اور اب وہی حلب میں بیٹھے ملک الصالح کو یہ باور کر رہے تھے کہ اگر سن بادشاہ ایک بار صلاح الدین کے ہاتھ لگ گیا تو پھر وہ دنیا کی صورت نہ دیکھ سکے گا۔ صلاح الدین نے فی الحال حلب پر قبضہ کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بجائے شمس الدین نے مقدم جیسے منافق دشمنوں کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا جس کا آزاد رہنا کسی وقت بھی کوئی فتنہ فرا کر سکتا تھا۔

امیر صلاح الدین نے فرخ شاہ کو بچانے والی خاتون کو شام کے وقت اس لئے بلوایا تھا کہ اس سے اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔ فرخ شاہ پر قاتلانہ حملے کی سازش کے سلسلے میں اسے قلعہ لانے جو معلومات فراہم کی تھیں انہیں جھٹلانے کی تو کوئی وجہ نہ تھی لیکن اس کی نمائندگی کسی اور ذریعے سے اب تک نہ ہوئی تھی۔ امیر کو یقین تھا کہ ملاقات کو آنے والی اتان نہ صرف سازش کی گمشدہ کڑیاں مہیا کرے گی بلکہ قلعہ دار کے بیان کی بھی تصدیق دے گی۔

امیر زادہ فرخ کو ارمغانہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن اس نے امیر کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ارمغانہ سازش کا پورا حال بیان کرے اور اگر امیر سے کچھ انعام دیا جائے تو وہ اپنے گناہ گار اور منافق باپ کے لئے امیر صلاح الدین سے مالی طلب کرے۔

فرخ شاہ وقت مقررہ پر ارمغانہ کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ امیر صلاح الدین کی نظر میں اس خاتون کی ملاقات شاید بہت اہم تھی اس لئے اس نے اپنی شام کی تمام مصروفیات فریاد کر دی تھیں اور وہ فرخ شاہ اور خاتون کے آنے کا منتظر تھا۔ اسی وقت غلام نے حاضر ہو کر فرخ شاہ کے آنے کی اطلاع دی۔ امیر نے فرخ شاہ کو فوراً بلوایا۔ فرخ شاہ امیر کے سامنے پہنچا تو ارمغانہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس کے چہرے پر نصف نقاب تھا جس نے غور داخل ہوتے ہوئے الٹ دیا تھا۔ اس دور کے رواج اور تہذیب کے مطابق امیر یا

سلطان رعیت کا باپ خیال کیا جاتا تھا اس لئے کوئی عورت امیر و سلطان سے پرہیز نہ کرتی تھی۔

فرخ شاہ نے پہلے امیر کو سلام کیا پھر ارغمانہ نے حسب دستور مودیانہ کو ریش پیش کی۔ فرخ شاہ نے ارغمانہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”امیر عالی مقام یہی ہیں وہ خاتون جنہوں نے اگر مجھے عین موقع پر خبردار نہ کیا ہوتا اور پھر مجھ پر حملہ کرنے والے کو کمال پھرتی ۛ موت کے گھاٹ نہ اتارا ہوتا تو آج میں اس دربار میں موجود نہ ہوتا۔“

امیر صلاح الدین نے فرخ شاہ اور ارغمانہ کو داخل ہوتے وقت سرسری نظر سے دیکھا تھا لیکن جب فرخ شاہ نے ارغمانہ کے تعارف میں ”خاتون“ کا لفظ استعمال کیا تو صلاح الدین نے چونک کر اس خاتون کو دیکھا۔ پھر امیر نے ارغمانہ سے نظر ہٹا کر فرخ شاہ کو دیکھا۔

”فرخ شاہ تم اس کسن لڑکی کو خاتون کے بزرگ الفاظ سے متعارف کر رہے ہو۔“

”کیا اس کا سبب بیان کرو گے؟“ امیر نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”جی ہاں امیر عالی مقام۔“ فرخ شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دراصل اس ہستی نے میری جان بچا کر ایک ایسا کام کیا ہے جس کا شمار عظیم ترین کارناموں میں ہونا چاہیے میں نے ان کی عظمت کو پیش نظر رکھ کر انہیں ”خاتون“ کے لفظ سے متعارف کرایا ہے۔“

”بے شک۔ بے شک احسان کرنے والا عظیم ترین مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔“ امیر نے تائید کی۔ ”ہماری نظر میں یہ خاتون صرف تمہاری محنت نہیں بلکہ انہوں نے ہم پر بھی اتنا ہی احسان کیا ہے۔ کیا محترم خاتون ان واقعات کو اپنی زبان سے دہرانا پسند کریں گی جس کے لئے انہیں یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے۔“

”امیر عالی مقام۔“ ارغمانہ نے سر کو ذرا خم کر کے کہنا شروع کیا۔ ”کنیز کا نام ارغمانہ ہے میں کس کی بیٹی ہوں اس بارے میں میں اپنے بیان کے آخر میں بتاؤں گی۔ امید ہے کہ امیر مجھے اس سلسلہ میں معاف فرمائیں گے۔“ ارغمانہ نے ہنستے ہوئے امیر کو دیکھا۔

”کوئی مضائقہ نہیں۔“ امیر نے مختصر جواب دیا۔ وہ جلد از جلد اصل حالات سے باخبر ہونا چاہتے تھے۔ ارغمانہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جس صبح کو امیر زادے فرخ شاہ قلعہ دمشق کا قبضہ لینے آئے والے تھے اس سے پہلی رات کو مجھے کچھ واسطے دے گئے کہ میں اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ صبح کو دانیال کے ساتھ امیر زادے فرخ شاہ کو خوش آمدید کہنے قلعہ کے صدر دروازے سے باہر جاؤں گی اور میں اور دانیال امیر زادے کو اپنے ساتھ لے کر اندر آئیں گے۔ ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ امیر زادے فرخ شاہ کے قلعہ میں

داخل ہوتے ہی صدر دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ اس وقت دانیال امیر زادے پر اچانک وار کر کے انہیں قتل کر دے گا۔ میرا کام صرف دانیال کی معاونت کرنا تھا۔“

امیر صلاح الدین نے اس موقع پر ارغمانہ کا قطع کلام کیا۔ ”یہ دانیال کون شخص تھا؟“

امیر کی تیوریوں پر اس وقت تک بل پڑ چکے تھے۔

”دانیال قلعہ کا محافظ فوج کا معمولی سا سردار تھا۔“ ارغمانہ نے پھر نظریں نیچی کر لیں۔ ”اس بے غیرت دانیال نے کسی وقت مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھ سے شادی کا خواہشمند تھا۔“ اس حوالے سے دانیال کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اگر امیر زادے کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کی شادی میرے ساتھ کر دی جائے گی۔ اس طرح اپنی مجبوریوں کے تحت اس مذموم قتل میں دانیال کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی۔ صبح کو میں نے اور دانیال نے

زہ بکھڑا اور خود کو سر پر اس قدر جھکایا کہ چہرہ نظر نہ آئے۔ اس ہیئت میں ہم دونوں امیر زادے فرخ شاہ کے استقبال کو قلعہ سے باہر پہنچے۔ امیر محترم یقین کیجئے کہ میں نے امیر

زادے فرخ شاہ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر جب میری پہلی نظر ان پر پڑی تو میں ان کی معصوم صورت دیکھ کر کانپ اٹھی۔ میرے دل میں یہ سوال اٹھا کہ اس بے گناہ کو کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔ جنگ میں اگرچہ ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا مگر یہ ضرور دیکھنا پڑتا ہے کہ

کون حق پر ہے اور کوئی ناحق تلوار بلند کر رہا ہے۔

”مجھے معلوم تھا کہ امیر قاہرہ سے اس لئے تشریف لائے ہیں کہ وہ کسن بادشاہ ملک

الصلح کو مفاد پرست امیروں سے چھڑا کر تخت دمشق پر بٹھائیں۔ اس لئے میں امیر کو حق پر سمجھتی تھی۔ پس نیکی اور ہمدردی کی جنگ میرے دل میں اس وقت تک جاری رہی جب امیر

زادے فرخ شاہ قلعہ میں داخل ہو کر اس مقام پر پہنچے جہاں ان پر دانیال کو وار کرنا تھا۔ مجھے خوشی ہے اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میری رہنمائی کی اور میرے دل

میں پھرتی ہوئی جنگ میں نیکی کو فتح حاصل ہوئی۔ میں نے اسی وقت امیر زادے کو آواز دے کر خبردار کیا کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے اور وہ قلعہ سے فوراً نکل جائیں۔ ٹھیک اس

وقت جب دانیال کے ارادے کا بھانڈا پھوڑ رہی تھی، دانیال نے امیر زادے پر بھرپور وار کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ امیر زادے ابھی میری بات کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں اور غفلت میں ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں نے دانیال کا وار اپنی تلوار پر روکا اور تلوار کی

لڑک اس کے سینے میں پیوست کر دی۔ دانیال اگرچہ اپنی زنجیروں کا جال پٹے ہوئے تھا لیکن

میری تلوار کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ دانیال کے اندر تک اترتی چلی گئی اور وہ گھوڑے کی زین سے لٹک گیا۔ عالم مقام امیر یہ تھے وہ واقعات جن سے آپ کا باخبر ہونا ضروری تھا۔“

”اُمّی نہیں امیر زادے۔ غم کے بادل چھپنے میں دیر لگے گی۔“
ارمغانہ نفییدہ قدموں سے ایک طرف چلنے لگی۔

تھے امیر صلاح الدین نے دمشق پر قبضہ کے بعد اعلان کیا کہ وہ الجوریہ کے ان تمام قلعوں کو حاکم موصل سیف الدین غازی کے قبضے سے آزاد کرائے گا جو پہلے راست نہیں ٹکرائے چاہتا تھا۔ اس کے چھوٹے مقبوضات کو ایک ایک کر کے اس

”نہیں امیر زادے۔ آپ ایسی کوشش بھی نہ کیجئے گا ورنہ آپ بھی اس آگ کی پلہ میں آجائیں گے جو مجھے پھونکنے ڈال رہی ہے۔“ ارغوانہ ایک طرف چلنے لگی۔

”مستکین۔۔۔“ عزیز الدین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں سفیر ہوں اور اپنے ملک الدین کی طرف سے زنگی بادشاہ ملک الصالح کے لئے صلح و دوستی کا پیغام لے کے ہوں۔“

”ملک الدین صلح کا پیغام دینے والا کون ہوتا ہے۔ وہ تو غاصب ہے۔ اس نے دمشق کا قلعہ قبضہ کیا ہے۔“ مستکین نے سخت غصہ سے کہا۔

”امیر مستکین۔۔۔ آپ میرے امیر صلح الدین کی تحقیر کر رہے ہیں۔“ عزیز الدین نے ترکی جواب دیا۔ ”میں شاہ ملک الصالح کے پاس پیغام لایا ہوں۔ آپ مجھے ان گفتگو کرنے دیجئے اور ہماری گفتگو میں دخل نہ دیجئے۔“

عزیز الدین تم ایک قیدی ہو اور کسی قیدی کو شاہ ملک الصالح سے گفتگو کی اجازت دی جاسکتی۔“ اس محفل میں شاہ ملک الصالح بھی موجود تھا مگر وہ ڈرا اور سہما بیٹھا تھا۔ اہمیت نہ پڑتی تھی کہ وہ زبان کھول سکے۔

اگر میں شاہ ملک الصالح سے گفتگو نہیں کر سکتا تو مجھے واپس جانے کی اجازت دی۔“ عزیز الدین نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

تم واپس بھی نہیں جاسکتے۔“ مستکین نے صاف جواب دیدیا۔

آپ ایک سفیر کو زبردستی روک کے تمام رائج قوانین کی توہین کر رہے ہیں۔ اس کا پ کے اور سلطنت حلب کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میرا امیر مجھے رہائی دلانے ضرور آئے۔“ عزیز الدین نے بھی سینہ تان کے جواب دیا۔

نہ پھر وہ آواز اپنے امیر کو دیکھتے ہیں کہ وہ حلب کی سرزمین پر کیسے قدم رکھتا ہے۔“ مستکین نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ بادشاہ ملک الصالح پہلے ہی خوفزدہ ہو رہا تھا اس وقت سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

مستکین نے حکم دیا۔ ”اس بد زبان کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔“

جانے عزیز الدین کی گرفتاری کی خبر کس طرح امیر صلح الدین کو پہنچ گئی اور وہ لشکر تو حلب پہنچ گیا۔ مستکین کے ساتھ اگرچہ کافی لشکر تھا لیکن اس نے مدافعیانہ جنگ نہ دی اور قلعہ کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔

ب کا محاذ تمس اور حما سے مختلف تھا۔ ان دونوں شہروں اور قلعوں کو امیر صلح نے یہ کہہ کر حاصل کیا تھا کہ وہ شاہ ملک الصالح کا فرمانبردار ہے اور الجزیرہ کے تمام والی موصل سیف الدین غازی سے آزاد کرا کر اپنے آقا زادے ملک الصالح کے

طرح واپس لینا چاہتا تھا جس طرح سیف الدین غازی نے ان پر قبضہ کیا تھا۔ امیر صلح الدین نے قاہرہ سے اپنے کچھ بھائی بھتیجوں کو دمشق بلوایا تھا۔ چنانچہ نے دمشق میں اپنے بھائی سیف الاسلام مستکین کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود لشکر لے تمس کی طرف بڑھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عام طور سے شر اور قلعہ الگ ا حاکموں کے ماتحت ہوتے تھے۔ صلح الدین تمس پہنچا تو حاکم شہر نے تمس اس کے در کردیا لیکن قلعے پر قبضہ نہ ہو سکا۔ اسے فتح کرنے کے لئے محاصرہ ضروری تھا۔ صلح الد نے وہاں کچھ روز ٹھہر کر نیا لشکر تیار کیا اور تمس کے محاصرے پر کچھ لشکر چھوڑ کر صحا طرف بڑھایا۔

قلعہ حما کا قلعہ دار خرویک تھا۔ اس نے قلعہ دینے سے انکار کیا۔ صلح الدین حاکم قلعہ کے پاس ایک سفارت بھیجی اور حاکم کو یہ پیغام دیا کہ وہ تخت دمشق کے شاہ الصالح کا فرمانبردار ہے اور یہاں اس لئے آیا ہے کہ ملک الصالح کے وہ شر اور قلعہ الدین غازی سے واپس لے جس پر اس نے غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ اب کوئی ایسا د تھی کہ حاکم قلعہ خرویک قلعہ حوالے کرنے میں پس و پیش کرتا۔ اس طرح صلح الد ایک اور اہم قلعہ مل گیا۔

تمس اور حما کے بعد اب حلب صلح الدین کے نشانے پر تھا جہاں سلطان نور زنگی کا کسبن بیٹا ملک الصالح اسماعیل موجود تھا۔ یہ بد نصیب بادشاہ جب دمشق میں تھا تو الدین ابن مقدم کے زیر اثر بلکہ ماتحت تھا اور جب اسے مستکین اپنے ساتھ حلب تو بھی اس کی حالت تبدیل نہ ہوئی اور مستکین نے گورنر اور وزیر اعظم دونوں سنبھال کے ملک الصالح اسماعیل کو بے بس کر دیا تھا۔ امیر صلح الدین شاید کبھی حلب نہ کر سکا لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ صلح الدین کو فوراً حلب روانہ ہونا پڑا۔

وہ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ حما کی فتح پر صلح الدین نے وہاں عزیز الدین نائب مقرر کیا۔ اس کے ساتھ ہی عزیز الدین کو سفیر بنا کر حلب بھیجا گیا۔ سفارت مقصد یہ تھا کہ ملک الصالح سے مصالحت کی گفتگو کی جائے۔ صلح الدین یہ نہیں چاہا کہ ملک الصالح سے اس کی جنگ ہو۔ اس لئے اس نے عزیز الدین کو حکم دیا تھا کہ اور کچھ دو کے اصول پر ملک الصالح سے بات کی جائے اور جنگ کی نوبت نہ آئے سفارت بری طرح ناکام ہوئی۔ عزیز الدین کو حلب کی سرحد پر گرفتار کر کے گورنر کے سامنے پیش کیا گیا۔

”تم نے حلب میں داخل ہونے کی کیوں کوشش کی؟“ مستکین نے بڑی رعوت

بت بڑا ہوا تھا اور اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کشنکین نے اس سے الٹی سیدھی باتیں کیں تو وہ اس کے خٹے ادھر دے گا۔ باپ کے انتقال کے وقت سے ملک الصالح نے سیاہ لباس پہنا شروع کر دیا تھا۔ کشنکین کے کہنے پر ملک الصالح مسند پر بیٹھ گیا تھا۔ تمام لوگ قالیوں کے فرش پر بیٹھے تھے اور کشنکین جو حلب کا گورنر اور وزیر اعظم تھا۔ وہ ملک الصالح کی چوکی کی دائیں جانب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

گورنر کشنکین نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ ”اے شاہ دمشق و حلب الملک الصالح انیل آپ کا یہ غلام یعنی کشنکین آپ کو دمشق سے بعض امرا کی مخالفت کے باوجود حلب لے آیا تھا تاکہ آپ مفاد پرستوں کے جنگل سے نکل جائیں لیکن۔۔۔۔۔“

ملک الصالح آخر گیارہ سالہ بچہ ہی تو تھا۔ اسے کشنکین کی باتوں پر غصہ آگیا۔ اس نے کشنکین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”امیر کشنکین ہمیں شاہ دمشق اور حلب کے نام سے قائل نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ دمشق ہم سے پہلے چھن گیا تھا اور حلب اس وقت فارس میں ہے۔ کیا پتہ اس کا انجام بھی دمشق جیسا ہو اور صلاح الدین اس پر بھی قابض ہو جائے۔“

کشنکین ملک الصالح کا یہ طنزیہ انداز سن کر غصہ سے جل اٹھا مگر بڑا موقع پرست تھا اس لئے قتل سے بولا۔ ”اے شاہ معظم۔ یہ خاکسار آپ کو دمشق سے اس لئے نکال لایا تھا کہ وہاں کے درو دیوار آپ کے دشمن ہو گئے تھے۔ اگر آپ کو دمشق اتنا ہی عزیز ہے تو میں آپ کو وہاں پہنچاؤں گا۔ رہا حلب پر صلاح الدین کے قبضہ کا سوال تو اس کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ حلب کا دفاع یا اس پر قبضہ صرف اور صرف آپ کے حکم سے ہو سکتا ہے۔“

ملک الصالح پہلے ہی چڑا ہوا تھا۔ کڑ کے جواب دیا۔ ”کیا میں اور کیا میرا حکم۔ تم لوگوں نے میرے ہاتھ جبر باندھ دیے ہیں اور ازیان پر تالے ڈالے ہیں۔ میں اگر کہوں کہ حلب کو صلاح الدین کے حوالے کر دو تو تم نہیں مانو گے اور اگر کہوں کہ محاصرہ کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دو تو بھی تم میری بات تسلیم نہیں کروں گے۔“

”شاہ۔ آپ ہمیں حکم دے کے تو دیکھئے۔“ کشنکین مکاری سے بولا۔ ”ہم سب آپ کے تبعدار ہیں۔ جہاں تک حلب کو حوالے کرنے کا تعلق ہے تو یہ بہت آسان بات ہے۔ صلاح الدین نے پیغام بھیجا ہے کہ سلطان مرحوم کے چشم و چراغ کو اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ حلب کا محاصرہ اٹھا کر دمشق واپس چلا جائے گا۔ وہ صرف آپ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس کے یار جانے کے لئے تیار ہوں تو اس وقت معاہدہ ہو سکتا ہے۔“

حوالے کرنا چاہتا ہے۔ لیکن حلب کے محاذ پر اس کے بیان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور صلاح الدین کے بھیجے ہوئے سفیر عزیز الدین کو سرحد پر گرفتار کر کے پہلے اسے کشنکین سامنے پیش کیا گیا پھر قید خانے کے حوالے کر دیا گیا۔

صلاح الدین نے حلب کا محاصرہ کیا تو کشنکین پریشان ہو گیا۔ حلب میں کشنکین کے جو امیر تھے وہ اسے دل سے نہ پسند کرتے تھے کیونکہ کشنکین کا رویہ ملک الصالح کے ساتھ سخت اور تحقیر آمیز تھا۔ ملک الصالح خود بھی اپنے گورنر اور وزیر کشنکین کو پسند نہ کر بلکہ اس سے ہر وقت ڈرا اور سہا رہتا تھا۔ اس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ کشنکین شطرنج کے مہرے کی طرح استعمال کر رہا تھا اور اسے جب بھی پورا اقتدار حاصل ہو ملک الصالح کا کائنا نکال دیتے گا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ کشنکین سے بگاڑ کے نہ چاہتا تھا۔ اس کی جان کشنکین کے ہاتھ میں تھی اور اس کا ایک اشارہ ملک الصالح ہستی سے مٹانے کے لئے کافی تھا۔

صلاح الدین کے محاصرہ کی وجہ سے ملک الصالح کی قدر و منزلت بڑھ گئی کشنکین کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بہتر فوج اور دفاعی حکمت عملیوں سے اب الدین کو شکست نہیں دے سکتا۔ صلاح الدین مصر کی بیشتر جنگوں میں شریک ہوا تھا جنگوں کی اس نے خود کمان بھی کی تھی۔ اس نے مصریوں کے علاوہ شاہ بروہلم کے چھڑا دیے تھے۔ قدر تجربہ کار جزل سے جنگ کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ الدین کا مقابلہ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ حلب کے تمام عوام کشنکین اور غلوصل ول کے ساتھ ساتھ دیں مگر عوام کشنکین کو پسند نہ کرتے تھے۔

کشنکین بڑا شاعر امیر تھا۔ اس نے سوچا کہ صلاح الدین کو قلعہ حلب سے دور رکھا جاسکتا ہے جب حلب کے علاوہ صلاح الدین کے لئے اور کئی محاذ ہوں جائیں۔ کشنکین نے اس سلسلے میں زبردست منصوبہ بندی کی لیکن اس کے منہ طور پر اس وقت عمل ہو سکتا تھا جب حلب کے عوام اس کے جھنڈے کے نیچے چلیں۔ پھر اس نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔

کشنکین نے ایک دن حلب کے تمام امرا اور معززین شہر کو جمع کیا پھر ملک لے کر ان کے سامنے پہنچا۔ ملک الصالح کا ہاتھ ٹھکا۔ وہ اگرچہ کسب تھا لیکن وہ دوزیروں کی چالبازیوں اور اکھاڑ پھچاؤ نے اسے تجربہ کار بنا دیا تھا۔ اس کے ذہن معززین شہر کو اکھٹا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صلاح الدین کے محاصرے کو توڑ کوئی متفقہ تدبیر کی جائے اور پھر ملک الصالح کے نام پر قدم اٹھایا جائے۔ وہ

گمشدین۔ عوام تو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ میرے خلاف کیسے قدم اٹھائیں

ہاں آپ کو اس بات کا پورا یقین ہے؟“ گمشدین نے زور دے کر کہا۔

ہاں یقین ہے۔ سو فیصدی۔“ ملک الصالح نے بڑے اعتماد سے کہا۔

شاہ معظم اگر آپ کو یقین ہے کہ عوام آپ کے ہمدرد اور وفادار ہیں تو قلعہ سے باہر کے آپ عوام سے وفاداری کا حلف لیجئے اور ان سے قسم کھلوائیے کہ وہ آپ کو

میں خزانہ چھوڑیں گے۔“ گمشدین نے آخر گھما کر اپنا منصوبہ بیان کر دیا۔

”مگر یہ کیسے ہوگا گمشدین“ ملک الصالح نے گھبرا کر کہا۔ ”تمام لوگ محل میں کیسے

آئیں گے؟“

”شاہ عوام سے خطاب کرنے پر آمادہ تو ہوں۔ باقی انتظام میں خود کروں گا۔“ گمشدین

ایمانی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

”میں تیار ہوں گمشدین۔ لیکن تم بھی ایک وعدہ کرو گے؟“ ملک الصالح شاید اپنی

ملی چاہتا تھا۔

”میں بغیر نئے وعدہ کرتا ہوں۔ آپ جو فرمائیں اس پر عمل کروں گا۔“ گمشدین نے

”وعدہ کر لیا۔

”یہی تم سے درخواست ہے کہ اس جنگ کا خواہ کچھ بھی انجام ہو لیکن تم مجھے صلاح

دینا کے حوالے نہ کرو گے۔“ ملک الصالح کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے صلاح

دینے کے بارے میں بہت بھرا گیا ہے۔

گمشدین نے فوراً جواب دیا۔ ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے شاہ۔ اگر خدا نخواستہ ہمیں

با قلعہ چھوڑنا پڑا تو آپ میرے ساتھ ہوں گے۔ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گی۔“

طلب کے قلعہ میں صرف قلعہ کی آبادی ہی نہ تھی بلکہ جب سے حالات گہڑے تھے

دقت سے طلب کے شہری جو قلعہ کے باہر رہتے تھے آہستہ آہستہ قلعہ کے اندر منتقل

ہو گئے تھے۔ اس لئے قلعہ میں محتاجات سے زیادہ ہی لوگ مقیم تھے۔ شاہ طلب اپنے

اس سے عام ملاقات کریں گے تو لوگ بڑے حیران ہوئے۔ جس طرح علوی، عباسی اور مصر

”مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ملک الصالح گھبرا گیا۔۔۔۔۔“ تم لوگ کہتے ہو کہ صلاح
بست ظالم ہے وہ مجھے قتل کر کے پوری سلطنت پر قبضہ کرے گا۔“ کیا ایسے ظالم کو
پاس میرے لئے بہتر ہوگا؟“

”شاہ معظم۔ بہتر اور بدتر کا حال تو اس وقت معلوم ہوگا جب وہ آپ پر قبضہ
کرے گا۔“ گمشدین بات گھما پھرا کر کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اس
کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ آپ جو چاہیں فیصلہ کریں لیکن اگر جلد فیصلہ نہ کیا تو
کو بچانے کے لئے صلاح الدین کی شرط مان لیں گے۔“

”کیا کہا۔۔۔۔۔؟“ ملک الصالح بدحواس ہو گیا۔ ”کیا تم مجھے اس ظالم کے حوالے کرنا

وہ مجھے قتل کر دے۔ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں سلطان نور الدین کا بڑا

تم نے مجھے بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ تم اپنے بادشاہ کو ایک بھیڑیے کے حوالے کیوں کر

ہو؟“

”اس کے علاوہ ہم اور کبھی کیا سکتے ہیں شاہ معظم؟“ گمشدین نے الفاظ کے

ملک الصالح کو پھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ہم حکم کے بندے ہیں۔ ہماری ذ

آپ کا حق ہے۔ فرمائیے ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“

”کیا تم صلاح الدین کو شکست دے کے یہاں سے بھاگ نہیں سکتے ہو؟“ ملک

دو ٹوک سوال کیا گمشدین نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

تھوڑے انتظار کے بعد ملک الصالح بولا۔ تم خاموش کیوں ہو گمشدین۔

نہیں۔ کیا ہم اتنے ہی کمزور ہیں کہ صلاح الدین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”شاہ۔۔۔۔۔ ہم میں طاقت بھی ہے اور ہمت بھی۔“ گمشدین نے بڑے جوش

”مگر ہم دو محاذوں پر جنگ نہیں کر سکتے۔“

”دو محاذ۔۔۔۔۔“ ملک الصالح نے تعجب سے گمشدین کو دیکھا۔ ”دو محاذوں

کیا مطلب ہے۔“

”میں بتاتا ہوں شاہ معظم۔“ گمشدین آخر ملک الصالح کو اس راستے پر

وہ لے جانا چاہتا تھا۔

”پہلا محاذ تو قلعہ کی فصیلیں ہیں اور دوسرا محاذ قلعہ کی شہری آبادی ہے۔

لئے ہم لا سکتے ہیں اور اسے بچا سکتے ہیں لیکن سول آبادی کو کون سنبھالے گا

ہمدردی آپ کے بجائے صلاح الدین سے ہیں۔ انہیں قابو میں کون رکھے گا۔

جنگ کرتے ہوں اور شہری آبادی دشمن سے رابطہ قائم کر رہی ہوگی۔“

نہ تھا کہ بادشاہ کبھی عوام کے درمیان بھی آسکتا ہے۔

اعلان کے مطابق دوسرے دن لوگ نماز فجر کے بعد ہی سے قلعہ کے وسیع اور میدان میں جمع ہونے شروع ہو گئے اور دھوپ نکلتے نکلتے اس قدر اڑدھام ہو گیا ہے کہ پھینکیں ٹو سر ہی سر جائے۔ حلب کے وہ بیمار جو چل پھر نہیں سکتے تھے ان کے علاوہ میں کوئی مرد، عورت، بچہ، بوڑھا ایسا نہ تھا جو اپنے بادشاہ کو دیکھنے میدان میں جمع نہ ہو۔ میدان کے درمیان میں قلعہ پر تخت رکھ کے اونچا اسٹیج بنایا گیا تھا جہاں سے الصالح کو دیدار دینا تھا۔ پھر اعلان ہوا کہ شاہ دمشق الملک الصالح تشریف لا رہے ہیں۔ محل قلعہ کے اندر تھا وہاں سے میدان تک قالین بچھا کر راستہ بنایا گیا تھا۔

کسمن شاہ الملک الصالح سیاہ ماتی لباس میں محل سے برآمد ہوا۔ اس کے آگے شاہی اعلان کرتا چل رہا تھا۔ اس کے عقب میں شاہی پرچم بردار تھا پھر ملک الصالح امرا اور کے جلوس میں سر جھکائے آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ملک الصالح کا سر کا اور اس کے ریشمی بال ہوا سے اس کے چہرے پر لہرا رہے تھے۔ شاہ کے چہرے پر چھائی تھی۔ حلب کے عوام اسے دیکھ کے سنائے میں آ گئے۔ بعض لوگ تو سسکیاں بول گئے۔ آگے چلنے والا نکتب خاموش ہو گیا تھا۔ آواز اس کے حلق میں انک کے رہ گئی تھی اسٹیج پر پہنچ کے ملک الصالح نے سیاہ عبا کی آستین ہوا میں لرائی اور بھرائی آواز گویا ہوا۔

”میرے بھائیوں، میری بہنوں میرے بزرگوں، میرے دوستوں اور تخت و تاج دمشق شہدائیوں اور وفادار و سلطنت و دمشق کے اس وارث کی طرف دیکھو جس کے لئے دمشق سرزمین تنگ ہو گئی۔ تمہارے عظیم سلطان نور الدین زنگی کے اس چشم و چراغ کو مفاد اور غداری کی آندھیوں نے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ میں وطن چھوڑ تمہارے دروازے پر آیا لیکن وہ صلاح الدین جسے میرے عالی مقام باپ کی چشم کرم زرہ سے آفتاب بنایا وہی صلاح الدین آج میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ اے حلب سلطان کے بد نصیب بیٹے کو آج دیکھ لو۔ جی بھر کے دیکھ لو کیونکہ کل پھر تم اسے نہیں سکو گے۔ صلاح الدین کا درندہ صفت لشکر حلب کو گھیرے پڑا ہے اور پکار پکار ”الصلاح“ کا مطالبہ کر رہا ہے اب تمہارے لئے امن کا صرف یہی راستہ ہے کہ تم مجھے غاصب صلاح الدین کے حوالے کر دو جس نے میرے نام پر دمشق، حمص، صفاۃ پربت ہے جس نے میرا حق مارا ہے جو شاہی خاندان کو در بدر کر رہا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی ملک الصالح نے عبا کا گرہ بان چاک کر دیا اور اسٹیج سے اڑ

دیکھو۔۔۔ اپنے شہزادے اور بادشاہ کا حال دیکھو۔ میں اپنے قاتلوں کے پاس صلاح الدین صرف مجھے سولی پر چڑھانا چاہتا ہے وہ تمہارے شہر کو کوئی نقصان پہنچائے گا۔ میں تم لوگوں کے آرام کے لئے اپنی زندگی کی قربانی دے رہا ہوں۔

الصلاح کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور وہ عالم میں بال نوح رہا تھا۔ یکایک مجمع میں ہلچل پیدا ہوئی بالکل اسی طرح جیسے ہا طوفان آجائے اور موجیں بھر پڑیں۔

میں۔ مرحوم سلطان کے بیٹے کو ہم نہیں جانے دیں گے۔“ مجمع میں سے کسی نے مدد کر کے اعلان کیا۔

رہزداروں آدمیوں کی آوازیں اس آواز میں مل گئیں۔ ملک الصالح کو لوگوں نے سر پر اور ہر طرف آوازیں بلند ہوئیں۔

صلاح الدین غدار ہے۔“

صلاح الدین غاصب ہے۔“

ملک الصالح ہمارا بادشاہ ہے۔“

ملب ہمارا ہے، دمشق ہمارا ہے۔“

صلاح الدین پر حملہ کرو۔ اسے مار بھاؤ۔“

پھر تو ہر طرف تلواریں ہی تلواریں بلند ہوئیں۔ کہاں تو لوگ ملک الصالح کو لے کر اسے حلب سے نکالنے کا مطالبہ کر رہے تھے اور کہاں اب وہ ملک الصالح ن دینے پر قتل گئے تھے۔ کشمکش کا منصوبہ بڑا کامیاب ہوا۔ اس نے عوام کے اس اسے پورا فائدہ اٹھایا۔ حلب کے لشکر کو فوراً جازخانہ جنگ کا حکم دیا گیا۔ قلعہ کا صدر ناکھول دیا گیا اور حلب کے فوجیوں اور عوام کا ایک سیلاب دروازے سے نکل کے صلاح الدین کی ان صفوں پر ٹوٹ پڑا جو حیران نظروں سے ان آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ صلاح الدین کی فوج باقاعدہ تربیت یافتہ تھی لیکن اسے اس بے ترتیب اور بے ہنگم لائیٹار کو روکنے میں سخت دقت ہوئی پھرے اور ملک الصالح کے نعرے لگاتے عوام راح الدین کے لشکر پر اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کے گر رہے تھے جیسے پروانے شمع پر ٹار ہوتے۔

صلاح الدین اور اس کے سردار اس اچانک حملے سے سخت مضطرب ہو گئے تھے۔ عوام مابے جگری سے لڑ رہے تھے جس طرح مسلمان جہاد کرتے ہیں۔ صلاح الدین کی سمجھ مانہ آ رہا تھا کہ حلب کے وہ عوام جو کشمکش سے بدظن ہو رہے تھے ان کے دماغوں اور

بدان میں اس کی کوئی حکمت عملی کام نہ آئی اور اب وہ قلعہ پر حملہ کرنے کی بجائے صرف اس کے محاصرے پر اکتفا کر کے بیٹھ گیا۔

ادھر کششکین کو یہ اندازہ ہو گیا کہ صلاح الدین کو میدان جنگ میں شکست دینا ناممکن ہے۔ قلعہ والے ایک روز تو ملک الصالح کے رونے دھونے پر قلعہ سے نکل کے صلاح الدین کے لشکر سے دست و گریباں ہو گئے لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ آپس کی لڑائی درجہ ہے اور میدان میں نکل کے مخالف لشکر سے مقابلہ کوئی اور ہی بات ہے یہی وجہ تھی کہ قلعہ کا کوئی شخص باہر جا کے لڑنے پر آمادہ نہ ہوا اور کششکین کو پھر سے قلعہ بند ہونا پڑا۔ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ جب تک صلاح الدین حلب کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اس وقت تک اس کی جان محفوظ نہیں۔ وہ امیر جو اس کی طرف سے جان توڑ کے لڑتے تھے، کسی وقت بھی لالچ میں آکر اس کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے۔ اس لئے کہ امیر صلاح الدین کا سورج چڑھ رہا تھا اور اس کی روشنی کے مقابلہ میں چھوٹے بڑے تمام ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔

مگر کششکین کا تخریب پسند دماغ کسی صورت شکست ماننے پر تیار نہ تھا۔ حلب کی فوجوں سے وہ صلاح الدین کو شکست نہ دے سکتا تھا اس لئے اس نے نئے دوست اور حلیف پیدا کرنے کے لئے اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر وہ خوشی سے چلا اٹھا۔۔۔

”خیشین۔۔۔ خیشین۔۔۔“

اس زمانہ میں خیشین دہشت اور موت کا نام سمجھا جاتا تھا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خیش جو ایک نوتو بھی تھا۔ ایک تحریک بھی تھی اور ایک مضبوط سلطنت بھی تھی، اس کی بکھریاں بیان کر دی جائے۔ خیش کے معنی بھگ کے ہوتے ہیں۔ یہ ایک نشہ آور بوٹی ہے جس کو کھل میں پس کر پانی ملا کر شربت تیار کرتے ہیں۔ اس کا نشہ یا سرور انسان کو آہلوں پر اڑا لے جاتا ہے اور اسے ہر چیز رکھیں دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خیش سے سب سے پہلے حسن بن صباح نے کام لیا اور اس نے اس نشہ کے قاری اور فرضی جنت کے شیدائیوں کو اپنے قابو میں کر کے بڑے بڑے علماء، فضلاء، امرا، وزرا اور بادشاہوں تک کو قتل کرا دیا اور پھر یہ لفظ اس قدر دہشت ناک بن گیا کہ لوگ خواب میں بھی چمک پڑتے تھے۔ ممکن ہے مورخوں کا یہ خیال صحیح ہو کہ حسن بن صباح اس فرقہ کا بانی ہے لیکن ہمیں یہ فرقہ یا اس سے ملتا جلتا یہ فرقہ خلافت راشدہ میں بھی ملتا ہے۔ اس فرقہ کا مختصر حال بیان کرنا بھی قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ذرا خلافت راشدہ پر غور فرمائیے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی صرف فطری

ذہنوں میں وہ کوئی بات ڈالی گئی جس نے ان میں شہر والوں کی طاقت بھری۔ اسے دفاع کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ حلب کے عوام پچھلے خیموں تک پہنچ گئے تھے جہاں سامان خورد و نوش کے علاوہ اسلحہ کا ذخیرہ بھی تھا۔

یہ جنگ یا خانہ جنگی دوپہر سے پہلے شروع ہوئی تھی اور اب شام کے سائے لے جا رہے تھے لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو رہا تھا۔ صلاح الدین کے لشکر کے مقابلہ میں کی فوج اور عوام بہت نا تجربہ کار تھے اور وہ محض جوش و جذبہ کے زور پر لڑ رہے تھے۔ کا نتیجہ یہ ہوا کہ حلب کے مرنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ گئی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا لیکن کششکین فوجوں کو واپسی کا حکم نہ دے رہا تھا وہ جانتا تھا کہ حلب کے عوام میں ملک الصالح کی تقریر نے جو آگ پھونکی ہے وہ کل باقی نہ رہے گی۔ کی کوشش تھی کہ رات ہونے سے پہلے پہلے صلاح الدین کو میدان سے مار بھاگ دیا جا۔ ادھر صلاح الدین اس پھرے ہوئے مجمع کو جو کسی طرح بھی باقاعدہ فوج نہیں جاسکتی تھی بڑی کوشش اور حکمت عملی سے پچھلے خیموں تک جانے سے روک رہا تھا۔ علم تھا کہ اگر حلب کے عوام نے پچھلے خیمے تباہ کر دیئے تو اس کی فوج بد دل ہو جائے گی ممکن ہے کہ وہ میدان چھوڑ بھاگے۔ پھر قدرت نے صلاح الدین کا ساتھ دیا اور ہزاروں مقتول میدان میں چھوڑ کر قلعہ واپس چلا گیا۔ خیال ہے کہ صلاح الدین کے نے اس بات کو غنیمت سمجھا اور بجھے بجھے دل سے اپنے خیمے اور سامان سینٹے لگے۔ معمر کے میں صلاح الدین کے لشکر کی زیادہ کام نہ آئے تھے لیکن زخمیوں کی تعداد بہت تھی۔

زیادہ زخمی صلاح الدین کے لشکر کی ہوئے تھے لیکن قلعہ کے اندر تقریباً ”ہر گھر بکھرا“ بنا ہوا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس کا کوئی فرد نہ کام آیا ہو۔ اس چیز نے دل توڑ دیا تھا اور پھر جب صبح کو اس نے قلعہ سے باہر جنگ کے لئے لشکر جمع کر کوشش کی تو عوام کی طرف سے بڑی سرد مری کا مظاہرہ ہوا اور ایک شخص بھی تعاون آیا۔ وہ اچھا ہوا کہ صلاح الدین نے خود قلعہ پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ دراصل اپنے زخمیوں کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا اور کچھ دن لشکر کو آرام دینا چاہتا تھا۔

صلاح الدین نے حلب والوں کی اس جنگ سے جس میں پچاس فیصد سے زیادہ غیر تربیت یافتہ لوگ تھے یہ سبق حاصل کیا کہ میدان جنگ میں بہترین اسلحہ اور تربیت سے زیادہ لڑنے والوں کا جوش اور جذبہ کام کرتا ہے۔ صلاح الدین نے معمر کے لشکر کے عیسائیوں کے اپنے سے چار گنا زیادہ لشکر کو شکست دی تھی لیکن آج حلب

کہ عبد اللہ بن سبا نے حضرت علیؑ کے علاوہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن ابی سفیانؓ کو بھی قتل کرانے کا منصوبہ بنایا تھا اور ان کے قتل پر الگ الگ تین سبائیوں کو عبد اللہ بن سبا کے پیروکار سبائی کے نام سے پکارے جاتے تھے مقرر کیا اس کے لئے ایک دن اور ایک ہی وقت مقرر کیا۔ منصوبہ کے مطابق تینوں مقتدین پر ایک ہی وقت میں حملہ نماز فجر کے دوران ہونا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اس لئے محفوظ رہے۔ ان کی بیعت خراب تھی اور اس دن وہ نماز فجر کے لئے مسجد میں نہ جاسکے تھے۔ رات امیر معاویہؓ بھی اس دن اتفاقیہ طور پر مسجد میں نہیں گئے تھے اس لئے اس شر سے بچ رہے۔ حضرت علیؑ کی موت کا وقت آگیا تھا چنانچہ وہ نماز فجر میں تشریف لے گئے اور مسجد میں ابن ابی سفیانؓ نے آپ پر زہر آلود خنجر یا گھوڑے سے وار کیا۔ زہر تمام جسم میں پھیل گیا۔ جو حضرت علیؑ کی شہادت کا باعث ہوا۔

اس تفصیل سے مطلب یہ تھا کہ حبش کی تحریک سے پہلے بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے یہودیوں نے مختلف ناموں سے تحریکیں چلائیں۔ اس قسم کی تحریکیں اصل سیاسی ہوتی تھیں لیکن ان پر مذہب کا پردہ ڈالا جاتا تھا۔ باطنی تحریک، معتزہ تحریک، ارمی تحریک، فرائد تحریک اور سب سے خطرناک حبش تحریک جسے فدائی تحریک کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا یعنی مسلمانوں میں خانہ جنگی پیدا کرنا اور مشہور علماء اور رہنماؤں کو ختم کرنا۔

ابن ابی سفیانؓ حبش کے بارے میں کچھ بیان کرتے ہیں جن سے حلب کے گورنر اور وزیر اعظم کنستانتین نے اس لئے رابطہ قائم کیا کہ اس کے خیال میں امیر صلاح الدین کو صرف حبش ہی حلب کے محاصرے سے باز رکھ سکتے تھے۔ یہاں پر اس تحریک کی پوری تفصیل نہیں لکھی جاسکتی کیونکہ امیر صلاح الدین کے سلسلے میں صرف ایک بار اس کا ذکر آیا ہے۔ جو قاری اس کے مفصل حالات پڑھنا چاہتے ہیں وہ مولانا عبد الحکیم شرر کھنوی کا تاریخی ناول فردوس بریں کا مطالعہ کریں جس میں اس شیطانی تحریک کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں پر ہم صرف اس کا مختصر حال تحریر کر رہے ہیں۔

حبش بھگ کو کہتے ہیں اور حبش بھگ پینے والے۔ یہ ٹھیک طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ حبش پینا اس تحریک میں فرض تھا یا ایک لازمہ زندگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے حسن بن صالح نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے حبش کا پینا لازمی قرار دیا ہو۔ ابن حذرون کے خیال میں یہ تحریک قراطہ سے ملتی جلتی ہے لیکن یہ قراطہ سے نکلی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نافرمانی تھا جسے اسماعیلیہ کہا جاسکتا ہے۔ مصر کے فاطمی خلیفہ مستنصر کے زمانہ میں اس کی دو

موت ہوئی۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو ایک ایرانی نژاد غلام نے شہید کیا۔ خلیفہ سوم عثمانؓ بھی شہید کئے گئے اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؑ کو تو ابن ابی سفیانؓ نے محض اپنی خوش کرنے کے لئے قتل کیا تھا۔ اب ذرا تاریخ پر غور فرمائیے۔ بنی اسرائیل (یہودی) اپنی کتابوں سے پہلے ہی علم ہو گیا تھا کہ آخری نبی ارض حجاز میں پیدا ہوں گے انہوں نے حضورؐ کی ولادت سے بہت پہلے مکہ، مدینہ اور دوسرے شہروں میں کہا شروع کر دیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آخری نبی جس قوم میں پیدا ہوگا تمام اقوام کی سرناج ہوگی اور وہ نبی میدان حشر میں سب سے پہلے اپنی قوم کی راہ کرنے گا۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ آخری نبی یہودی خاندان میں پیدا ہو مگر وہ قوم عرب کو اس اعزاز سے سرفراز کرنا تھا اس لئے حضورؐ کی ولادت بنی ہاشم میں ہوئی حضورؐ کا لایا ہوا دین اسلام ان کی حیات ہی میں عرب کی حدود سے نکل کر دور دراز پھیل گیا۔

چنانچہ یہودی قوم مسلمانوں کے سخت خلاف تھی اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے تباہ کیا جائے یا پھر مسلمانوں کے عمائدین کو قتل کر کے طاقت کمزور کی جائے۔ مشہور ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور میں یہودی مسلمانوں کے خلاف ایک تحریک چلائی۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے ایک تعلیم یافتہ جو عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا تھا اسے مسلمانوں کے بھیجے میں بھینسا۔ اس میں بھین کا دار السلطنت سبا تھا وہ وہی مقام سبا ہے جہاں کی ملکہ بلقیس سبا اور سلیمانؑ کا قصہ مشہور ہے۔ چنانچہ اس یہودی جوان نے سبا پہنچ کے اپنا نام عبد اللہ کیا اور زہد و تقویٰ میں وہ مقام پیدا کیا کہ وہاں کے تمام علماء محدث اور فقیہ اسے ماننے لگے۔

پھر اس عبد اللہ بن سبا کی شہرت یمن سے مدینہ اور مدینہ سے دمشق تک پہنچ گئی جہاں جاتا ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دین کا وہ جو نکتہ بیان کرتا وہ پتھر کی لکیر بن جاتا چلاک یہودی عبد اللہ بن سبا کے بے شمار قصے مشہور ہیں جن کے بیان کرنے کو گنجائش نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں منافرت پھیلانے والی تحریک اسلام ہی میں پیدا ہو گئی تھیں اور ان مخالف تحریکوں کا بانی عبد اللہ بن سبا ہے۔ بن سبا نے قضاہ نامی ایک عورت کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے عاشق ابن ابی سفیانؓ سے کرے کہ وہ اپنے عشق کے ثبوت میں (نہو باللہ) حضرت علیؑ کا سر مبارک لائے طرح قضاہ کی فرمائش پر ابن ابی سفیانؓ نے حضرت علیؑ کو شہید کرنے کا عہد کیا۔ یہ بھی

لاب شیخ الجبل تھا۔ مختلف ادوار میں ان کے مختلف نام کے پیشوا ہوتے تھے لیکن وہ شیخ الجبل کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ مسلمانوں کے یہ ازلی اور ابدی دشمن تھے۔ سلمان اخلاقی طور پر اس قدر گر چکے تھے کہ وہ اپنی خانہ جنگی اور دشمن کے خلاف ہوں سے مدد لیتے تھے اور انہیں بھاری رقم ادا کرتے تھے۔ ان کی داستان قتل و غارت اس قدر طویل ہے کہ اس کے لئے ایک الگ کتاب چاہیے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم اصل حالات کی طرف آتے ہیں۔ حلب کے ن میں امیر صلاح الدین اور محصور امیر دمشق کے لشکروں میں ایک زبردست معرکہ کا تھا لیکن پورے دن کی شدید جنگ کے بعد کوئی فریق فتح نہ حاصل کر سکا تھا۔ امیر صلاح الدین کے وہ سوار جو مصر میں معرکہ سر کر چکے تھے وہ حلب کے غیر تربیت یافتہ لشکر کیست دینے میں ناکام ہو گئے تھے۔ حلب والے دراصل بڑے جوش و جذبے سے لڑے۔ کس بادشاہ نے ان کے سامنے آنسو بہائے تھے اور انہیں تاج دمشق اور اپنے آباء کی تمیں دلائی تھیں اس لئے وہ کٹ کٹ کر رہے تھے لیکن میدان نہ چھوڑتے۔ یہاں تک کہ رات کا اندھیرا طاری ہو گیا۔ دوست دشمن کی تمیز ختم ہو گئی اس لئے رک گئی۔ حلب کا لشکر قلعہ میں واپس چلا گیا اور امیر صلاح الدین جس نے آج تک اندر شدید جنگ کبھی نہ لڑی تھی۔ اپنے لشکر کے ساتھ خیموں میں واپس آ گیا۔

اس جنگ سے ایک طرف تو قلعہ والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جہاں تک ہو سکے گا قلعہ کی حفاظت کریں گے اور دوبارہ قلعہ سے نکل کے جنگ کوشش نہ کریں گے اس لئے کہ ایک دن کی جنگ میں ہزار آدمیوں سے زیادہ ہاتھ دھونا ے تھے۔ اور امیر صلاح الدین پریشان تھا کہ حلب والے ملک الصالح کو کس قدر چاہتے کہ ان کے خون دریا بہہ گئے لیکن قلعہ والوں کے قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ وہ تمام رات واروں کے ساتھ صلح مشورے کرتا رہا اس نے جنگ کی حکمت عملی بھی تبدیل کی پھر بھی جنگ کے وقت پریشان تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ اس کی مشکل آسان ہو۔

امیر صلاح الدین سے خدا تعالیٰ کو ابھی بہت سے کام لینا تھے اس لئے اس کی دعا قبول کی اور قلعہ والوں نے باہر نکل کے جنگ کرنے کی کوشش نہ کی۔ صلاح الدین نے اسے یہ نیکی سمجھا اور قلعہ کا محاصرہ سخت کر کے بیٹھ گیا۔ حلب کے گورنر اور وزیر دمشق کی فطرت تھی کہ وہ انہم سے اہم معاملہ میں بھی کسی دوسرے امیر سے مشورہ نہ کرتا تھا۔ یہ کی ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے کسی امیر پر اعتماد نہ رہا ہو یا پھر وہ اپنے آپ کو عقل کل کا سمجھتا تھا۔ بہر حال اس نے ایک رات بھی بیکار نہ کی اور جنگ کی اس رات کو جب

”سلام علی مستنصر باللہ امیر الدنيا و قاهر السلاسل الدین“

صباحی تحریک جسے ”فدائی تحریک“ بھی کہتے تھے اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ صباح کے ہر کارے شہروں شہروں گھومتے اور وہاں سے ضرورت مند جوانوں کو بلا قلعہ الموت پر لے آتے۔ پھر انہیں چند دن کے لئے اس جنت میں داخل کیا جاتا بن صباح نے بڑی محنت اور کاریگری سے تعمیر کی تھی۔ اس جنت میں دودھ کی نہ تھیں۔ جواہرات کے طیور شاخ پر چھماتے تھے۔ کیف آور ہوائیں چلتی تھیں۔ اور حسین حور علمان خدمت میں موجود ہوتے۔ محلات پر جواہرات کی چکی کاری سورج کی روشنی میں ہیرے جگمگا کر آنکھوں میں چکا چونہ پیدا کرتے تھے۔ دودھ بہترین شراب کی نہریں بھی بہتی تھیں۔ اور اس جنت میں داخل ہونے والے کی طرح خاطر و مدارت کی جاتی تھی جیسے ہمارے عقیدے کے مطابق نیک لوگوں کی قدر و منزلت ہوگی۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جنت میں داخل ہونے والے کو سب شراب طہور کا جام پلایا جاتا تھا جو کہ دراصل بھنگ کا شراب ہوتا تھا پھر جب طاری ہو جاتا تو اسے گدھے پر بٹھا کر البرز کے مختلف راستوں سے گزرتے تھے جاتے تھے کہ وہ اس وقت دوسرے آسمان پر پھر تیسرے آسمان پر ہے۔ اس طرح عالم میں اسے جنت میں داخل کرتے اور کچھ دن وہ حسین عورتوں جنہیں حور نام تھا ان کے ساتھ اپنا وقت گزارتا تھا اس طرح جب اس داخل ہونے والے کو بجاتا تھا کہ وہ واقعی جنت میں ہے تو پھر اسے بھنگ پن سے نکالا جاتا تھا۔ جب وہ آتا تو منظر یکسر تبدیل ہو چکا ہوتا تھا۔ جنت کی چاٹ پڑ جانے پر وہ پھر جنت کی خواہ اسے کسی امیر، وزیر یا بادشاہ کو قتل کرنے کا حکم دیا جاتا اور بلا عذر اپنے خنجر۔ شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

ایک دو قتل کے بعد اسے ”فدائی“ کے عہدے پر فائز کیا جاتا۔ اسے بار بار سیر کرائی جاتی اور وہ بار بار بلا عذر لوگوں کو قتل کرتا رہتا۔ اس سلسلے میں پوری فدائی کی مدد کرتی۔ جس کو قتل کرنے کا کام سونپا جاتا وہاں کے مرکز کو مطلع کر فلاں فدائی فلاں شخص کو ختم کرنے آ رہا ہے۔ پس اس فدائی کو ہاتھوں ہاتھ لے اسے وہاں تک پہنچانے کا بندوبست کرایا جاتا جہاں اسے اپنا کام کرنا ہوتا۔ یہاں تک کہ ہر ملک کے لشکر میں فدائی ملازم تھے اور وقت ضرورت وہ اپنے ساتھیوں کی تھے۔ ایک مورخ کے مطابق فدائیوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔

پہلے ہی پہنچ چکے ہیں۔

سوار نے اپنا شک رفع کرنے کو پوچھا۔ ”اے بندگان کرام۔ کیا میرے پہلے دونوں آپ تک پہنچ سکے۔ ہمیں افسوس ہے سلیمان غیار کے دونوں ساتھی ضرور راستے سے مرنے اس لئے اب تک یہاں نہیں پہنچ سکے“ ایک بزرگ صورت نے سوار کا نام لے کر جواب دیا۔

سوار کو اور تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”بزرگ محترم۔ میرے ساتھی آپ تک نہیں آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

اس میں تردد کی زیادہ ضرورت نہیں۔ بزرگ صورت نے کہا۔ ”خدا نے جل شانہ رشتے بھی پیدا کئے ہیں جن کے لئے فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہمیں تینوں سواروں اور ان کی روانگی کے اوقات ان کے چلنے کے ساتھ ہی معلوم ہو گئے تھے۔ ہمیں یہ علم ہے کہ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟“ سوار سلیمان نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا۔ ”امید کروں کہ آپ مجھے شیخ الجبل کے حضور پیش کریں گے۔“

”ضرور سلیمان ضرور۔۔۔۔۔“ سلیمان کو جواب ملا۔ ”ہم لوگ اس لئے یہاں موجود

ہیں جلد سے جلد شیخ الجبل کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔“ میں تیار ہوں۔ لے چلے

”ہم شیخ الجبل کے حضور میں پیش ہونے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں۔ امید ہے آپ کو ناگوار نہ گزرے گا۔“ بزرگ نے شرط پیش کی۔

”آپ جس طرح چاہیں مجھے لے جاسکتے ہیں۔“ سلیمان نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

ان میں سے ایک بولا۔۔۔۔۔ ”آپ کا گھوڑا یہیں پر رہے گا۔ واپسی میں آپ اسے کر لیجئے گا۔“

ایک نے سلیمان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ راستہ اور اونچا نیچا تھا لیکن سلیمان بے دھڑک ان کے ساتھ چلا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اہوا جیسے وہ میڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ سلیمان نے میڑھیاں گئیں۔ وہ تعداد میں پچھتر میڑھیاں ختم ہوئیں تو سلیمان کی آنکھیں کھول دی گئیں۔ اب وہ ایک چوکور چٹان تھا اور نیچے دور تک میڑھیاں اترتی چلی گئی تھیں۔ سلیمان کے ساتھ صرف دو آدمی تھے۔ تیسرا آدمی کیس چلا گیا تھا۔

سلیمان کے سامنے کی طرف ایک اونچی چٹان دیوار کی طرح عمودی شکل میں کھڑی تھی۔

اس کا لشکر قلعہ میں واپس آگیا تو اس نے تین سواروں کی ایک سفارت ترتیب دی تینوں کو آگے پیچھے کوہ البرز کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ جلد از جلد قلعہ الموت پہنچیں۔ الجبل کو کششیں کا پیغام پہنچائیں۔ تین سواروں کو الگ الگ بھیجنے کا یہ مقصد تھا کہ اس میں سے دو مارے جائیں تو تیسرا وہاں تک پہنچ جائے۔

حشیش کا قلعہ الموت جہاں شیخ الجبل کا مسکن تھا اور جہاں حسن بن صباح نے بد رکھی تھی۔ اس کا راستہ نہایت خطرناک تھا دوسرے یہ کہ اگر کوئی لشکر شیخ الجبل سے کے لئے بھیجا جاتا تھا تو اس کی اطلاع شیخ الجبل کو بہت پہلے ہو جاتی تھی اور وہ اپنی د کے پورے پورے انتظامات کر لیتا تھا۔ لشکر کے علاوہ جو سفارتیں اس کے پاس بھیجیں اس کی اطلاع بھی سفارت کے قلعہ تک پہنچنے سے بہت پہلے شیخ الجبل کو ہ تھیں۔ وہ اگر مناسب سمجھتا تو سفارت کو قلعہ میں بلوالیتا ورنہ سفارت کار کا راستہ خاتمہ کر دیا جاتا تھا۔

امیر کششیں کے پہلے دو سفیروں کا تو پتہ نہ چلا کہ ان پر کیا گزری لیکن تیسرا پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گیا جس کی چوٹی قلعہ الموت یعنی عقابوں کا گھونسلہ واقع بڑی سمجھداری سے انہیں راستوں پر سفر کرتا ہوا آیا تھا جس کی نشاندہی امیر کشش کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کششیں اس سے پہلے شیخ الجبل تک پہنچا تھا کسی ایسے شخص کے ساتھ ان راستوں سے گزرا تھا جو قلعہ الموت کو جاتے تھے۔ کا سفیر اس راستے کے اختتام پر آکر رک گیا کیونکہ آگے سے بند تھا اور نیچے آکا کھائی تھی۔ اسے کششیں نے یہی بتایا تھا کہ راستے کے اختتام پر شیخ الجبل کے آکا ہوں گے جو اسے خود آگے لے جائیں گے۔

پس بالکل اسی طرح ہوا۔ کششیں کے سوار نے راستے کے اختتام پر گھوڑا رکھنے درختوں میں سے تین آدمی یوں نکلے جیسے درختوں نے اگل دیا ہو۔ سوا پیدل آتا دیکھ کر خود بھی گھوڑے سے اتر پڑا۔ آنے والوں کے چروں پر چھوٹی تھیں۔ ان کی روشن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ ان کے چروں سے معلوم ہوتا تھا۔

سوار سلام کے لئے ہاتھ دھو رہا تھا۔ بسم انداز میں کہا۔ ”آئید اے گورنر حلب کے سفیر۔ تمہارا آتا اس سرزمین۔۔۔۔۔ نے مبارک ہو۔“ سوار ان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سیدھا حلب سے آ رہا تھا۔ پھر ان اس کے آنے کی خبر پہلے کیسے پہنچ گئی۔ مگر اسے خیال آیا کہ شاید اس کے دونوں

ہاروں اور کمروں سے گزرتا ہوا ایک بڑے ہال کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر
بچوں کی جھار کا پردہ پڑا تھا اور چار خوبصورت لڑکے جن کی عمر میں دس گیارہ سال
اب نہ تھیں۔ کمر میں نیچے لگائے اور سروں پر سبزی تاج سجائے کھڑے تھے۔ فدا کی
ہان کو ان لڑکوں کے حوالے کیا اور واپس ہو گیا۔ ان میں سے ایک لڑکا بھاگ کے
اور چاندی کی چوکی اٹھا لایا اور سلیمان کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سلیمان کو وہاں بیٹھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چار انتہائی خوبصورت لڑکیاں، اعلیٰ
ہاں پہنے۔ جسم کے ہر حصہ پر ہیرے جواہرات کے زیور سجائے پردہ ہٹا کر باہر
سلیمان ان کا حسن دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ ان حسن کی دیویوں نے بڑے سلیقے سے
سلیمان کو مجرا پیش کیا پھر ایک نے جیسے نغمہ بکھیر دیا۔ ”معزز مہمان کی آمد باعث
ہے۔ حضور عالی میں آپ کو یاد کیا گیا ہے۔“

ہان کو کوئی جواب نہ سوجھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

چاروں خوبصورت لڑکیوں نے جن کے بارے میں سلیمان کو بعد میں بتایا گیا کہ وہ
خوہش ہیں اور وہ خوبصورت لڑکے غلمان ہیں، سلیمان کو اپنے جلو میں لیا اور اسے
بٹھایا۔ سلیمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کمروں، دالانوں اور راہداریوں کی سجاوٹ اور
بدیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اگر یہ جنت نہیں تو جنت کی نقل ضرور ہے۔
یہیں نہیں وہاں تو سیکڑوں کی تعداد میں حوریں اور غلمان اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے
ہیں اس قدر خوشبو بھری تھی کہ سلیمان کیف میں ڈوبا جا رہا تھا۔ دھوپ کا پتہ نہیں
اسے چھن کے آ رہی تھی کہ اس میں تمازت نام کو نہ تھی۔ پودے، پھل، پھول
کی نہریں جس میں گنگا جمنی کام کے بجرے پڑے تھے اور مرد عورتیں باہم بڑے
سے محو گفتگو تھیں۔

یا اللہ یہ تو تیری جنت ہے“ سلیمان کے دل میں اک دم خیال آیا لیکن اس نے خود
خیال کو جھٹک دیا۔ اس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ خدیش کے شیخ الجبل نے
ات پر ایک جنت ارضی بنائی ہے جس کی لالچ دے کر شیخ لوگوں سے غلط کام کراتا
ل خیال کے آتے ہی سلیمان سر جھکا کے چلے لگا۔ نہ معلوم کتنے دروازے اور
اٹلے کرنے کے بعد لڑکیاں سلیمان کو ایک ایسے کمرے میں لے گئیں جس پر کسی
افواہ کا گمان نہ ہوتا تھا۔

معزز مہمان۔ نظریں جھکا لو اس وقت تم اعلیٰ حضرت شیخ الجبل کے حضور میں ہو۔“
چلنے والی ایک لڑکی کی آواز تھی۔ کمرہ بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ مست خوشبو کی لپٹیں

جس کی چوٹی دیکھنے کے لئے سلیمان کو گردن پیچھے کی طرف لے جانے پڑی۔ چٹان
میں ایک تاریک راستہ اندر کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد تیسرا فدا کی واپس
اسی تاریک راستے سے آیا تھا۔

”مبارک ہو سلیمان۔ حضرت سیدنا شیخ الجبل نے تمہیں بازیابی کی اجازت
ہے۔“ فدا کی نے بڑے سرت سے کہا۔ جس وقت وہ سیدنا شیخ الجبل کے الفاظ
سے ادا کر رہا تھا اس وقت اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر جھکا لیا تھا جس سے
تھا کہ فدا کی شیخ الجبل کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ امیر صلاح الدین کے دور کو
قلعہ الموت کے شیخ الجبل کا نام سیدنا راشد اللہ تھا۔

سلیمان اس انتظار میں تھا کہ فدا کی اس اندھیرے راستے میں داخل ہوں تو
کے ساتھ چلے لیکن وہ تینوں چپ چاپ کھڑے سامنے کی چٹان کو دیکھ رہے تھے
زتلرہ سا آگیا۔ یہ لوگ جہاں کھڑے تھے وہ ہل رہی تھی اور سلیمان ڈر رہا تھا
سامنے والی چٹان اب پر نہ آجائے لیکن فدا کیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تھا اور
اطمینان سے کھڑے تھے۔

پھر سامنے کی چٹان میں یکایک ایک بڑا سوراخ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
اندر سے پتھر کا ایک لمبا چوڑا ٹکڑا ایک طرف کو کھسک گیا ہے اور اس میں ایک
گیا۔ وہ فدا کی آگے پیچھے اس راستے میں جو کہ دروازہ کی شکل کا تھا داخل ہوئے
فدا کی نے سلیمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر دروازے میں داخل ہوا۔ جب یہ
پہنچ گئے تو پھر گڑگڑاہٹ ہوئی اور پتھر کا وہ دروازہ جو ایک طرف ہٹ گیا تھا خود
پر واپس آگیا اور اس طرح چٹان میں پیوست ہو گیا جیسے وہ وہاں سے ہٹا ہی نہ تھا۔
اب سلیمان نے اندر کے منظر پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ
چٹان کے پیچھے ایک خوبصورت اور بڑا شہر آباد تھا۔ عالیشان محلات، چوڑی سڑکیں
اور سبزہ زار جن میں شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ سلیمان کے ساتھ والے
قدموں سے چل رہے تھے اور سلیمان کو ان کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد
عظیم الشان محل پر پہنچے۔ سلیمان نے ایسا عالیشان محل طلب یا دمشق میں بھی
فدا کی سلیمان کو لئے بیڑھیاں چڑھ کے محل کی راہداری میں پہنچے۔ اس میں ایک
وسیع کمرہ تھا جس میں چند لوگ رجسٹروں پر جھکے ہوئے تھے۔ سلیمان کو اندازہ
وفا ہے جس میں حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔

سلیمان۔ کچھ دیر وہاں۔ پھر ایک فدا کی اسے بلانے آیا۔ فدا کی کے

بہارے آقا نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جو کسی حد تک درست بھی تھا تو پھر اس سے نکل کر صلاح الدین اور اس کے لشکر کو بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھانے کا موقع دیا۔ اگر گمشدین قلعہ بند رہتا تو عین ممکن تھا کہ صلاح الدین کچھ دنوں محاصرہ کے بعد کسی اور طرف نکل جاتا۔

ہیں یہ غلطی ہو گئی اسے شیخ معظم۔ "سلیمان نے فوراً اعتراف کر لیا۔" آقا محترم آپ کی خدمت میں اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ حلب کو صلاح الدین کی لعنت سے پاک

گمشدین محاصرہ ختم کرانا چاہتا ہے یا اس سے آگے کچھ اور بھی؟" شیخ الجبل یوں رہا تھا جیسے اس دور کی عظیم ترین ہستی ہے اور اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ پتھر کی آہ ہے۔

شیخ معظم "سلیمان نے پیٹھر بدلا اور صلاح الدین نے اگر محاصرہ اٹھالیا تو بھی اہل لے دلوں سے صلاح الدین کا خوف اور دہشت کم نہ ہوگی۔ اس مصیبت کا کوئی مستقل دوا چاہئے۔"

ہونہ۔ "شیخ الجبل راشد اللہ بن شان نے ایک لمبی ہکاری بھری پھر دیر تک سوچتا

سلیمان۔ "شیخ الجبل نے بڑے تھکانہ انداز میں کہا۔ "گمشدین کو خبر پہنچا دو کہ الدین کا علاج ہو جائے گا لیکن اس کے صلہ میں ہمارے داعی حلب اور حلب کے تمام علاقے میں باطنی تحریک کی دعوت عام دیا کریں گے ان پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ لے ساتھ گمشدین پر یہ بھی واضح کر دینا کہ اگر اس نے ہمارے اس اعلان کی خلاف کی تو اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو صلاح الدین کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

سلیمان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس کی سفارت کامیاب ہوئی تھی۔ "شیخ معظم آپ عظیم ہی نہیں بلکہ عظیم ترین ہیں۔ اس حکم کے علاوہ آپ نقد رقم کی ادائیگی کے بہت کم پائند فرمائیں گے۔"

نہیں سلیمان۔ ہم دوستوں پر احسان کیا کرتے ہیں۔ احسان کی قیمت نہیں وصول

شیخ الجبل نے اسی وقت ایک حور سے جو کینز بنی کھڑی تھیں کچھ سرگوشی کی۔ حور نے سرے میں مٹی اور ایک بزرگ صورت انسان کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ شیخ الجبل نے بھی کچھ سرگوشیاں کی۔ اسی وقت ایک حور سونے کی تھالی میں مشروب کے دو

پھیلی ہوئی تھیں۔ کئی حوریں ایک سادہ رنگت اور دراز قامت شخص کے آگے جھکی تھیں۔ سلیمان نے شکموں سے اس کی صورت دیکھی۔ سوائے چمکدار آنکھوں کے اس کے چہرے پر اور کوئی خوبصورتی یا تاثر دکھائی نہ دیا۔ وہ یقیناً شیخ الجبل تھا جو زونکیوں کے سارے نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ انگوڑ کا ایک خوشہ تھا جس کے انگوڑا کھانے کی بجائے وہ منہ میں انگوڑے لے کر کھا رہا تھا۔

"بیان کرو سلیمان تمہارے آقا گمشدین نے تمہیں کس لئے بھیجا ہے؟" شیخ الجبل پر رعب آواز ابھری۔

سلیمان نے وہاں کی باتوں سے بہت کچھ اندازہ کر لیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شیخ کو اس کے آنے کی پہلے ہی خبر ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے چالاکی سے کام لیا۔ حضرت شیخ الجبل کو علم ہے کہ گمشدین کا یہ غلام کیا پیغام لے کر حاضر ہوا ہے۔

"مرحبا۔ ہم تمہاری ذہانت کی تعریف کرتے ہیں۔" شیخ الجبل نے سلیمان کی کی۔ "ہمیں سب کچھ علم ہے لیکن ہم تمہاری زبان سے ان باتوں کی تصدیق چاہتے ہیں۔" "بہتر ہے عالی مقام شیخ۔" سلیمان نے جواب دیا۔ "میرے آقا گمشدین کو آواز

امیر صلاح الدین نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ حلب کی فوجوں نے ایک بار قلعہ سے صلاح الدین کی فوجوں پر حملہ کیا تھا۔ تمام دن سخت لڑائی ہوئی لیکن ہم صلاح الدین کے قدم میدان سے نہیں اکھاڑ سکے۔ اس وقت سے اب تک صلاح الدین حلب کے ہوئے ہیں اور خبر ہے کہ اس نے حلب کو فتح کرنے کے لئے مصر سے لشکر منگایا۔

"سلیمان۔ تمہارے آقا گمشدین کو علم ہونا چاہئے تھا کہ امیر صلاح الدین ایک اور بہادر جنرل ہے۔ یہ تو حلب کا محاذ ہے اس نے مصر کے فاطمیں اور یرو نصرانیوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ گمشدین کو ایسے انسان سے خاصیت مول نہیں

تھی۔" شیخ الجبل دھیمی آواز میں ٹھٹھہ ٹھٹھہ کے بول رہا تھا لیکن اس کے اندازہ شان اور شاہانہ تمکنت تھی۔

"شیخ عالی مقام۔" سلیمان نے بھی لفاظی سے کم لیا۔ میرے آقا گمشدین کو

الدین کے تدبیر اور شجاعت کا اندازہ تھا لیکن انہیں حلب میں موجود امرائے نوریہ میں رکھا اور انہیں یہ باور کرایا کہ مرحوم سلطان کے بیٹے ملک الصالح کی حلب

صلاح الدین کو بے بس کر دے گی۔" یہ کہہ کر سلیمان خاموش ہو گیا۔ شاید وہ شیخ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

بہر حال شیخ الجبل نے اسے ایسا جواب دیا کہ سلیمان کی عقل ٹھکانے آئی

ملب کا محاصرہ بدستور جاری تھا۔ گورنر اور وزیر کشمکین کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ صلاح الدین نے نئی فوج بھرتی کر لی تھی اور مصر سے بس لشکر آنے کی خبر تھی۔ بن نے ایک طرف تو قلعہ الموت کے شیخ الجبل سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ قلعہ الموت کے اپنے سفیر سلیمان کو بھیج کر مطمئن سا ہو گیا تھا لیکن جب اس کے بھیجے ہوئے میں سے کوئی بھی پلٹ کر نہ آیا تو اسے اپنی موت نظر آنے لگی۔ کشمکین جس قدر نہ امیر تھا اسی قدر اس نے ذہن رسا اور ذکاوت پائی تھی۔ وہ صرف ایک رابطہ پر ن کر سکتا تھا اس لئے اس نے ایک اور تدبیر کی۔

سلطان نور الدین زنگی نے جنگ حارم (506ء ہجری) میں طرابلس کے حاکم سنہ کو قید کر کے بعض مورخوں نے سمجھ لکھا ہے یہ دراصل رمنڈ کاؤنٹ آف ٹریپولی تھا۔ امیر بن نے رمنڈ سے ایک بھاری رقم وصول کر کے اسے رہا کر دیا تھا۔ رقم کے علاوہ، فرنگیوں کے قبضے میں جو مسلمان تھے انہیں بھی رمنڈ کے صلہ میں آزاد کرالیا تھا۔ سلطان نور الدین زنگی کی حیات میں ہوا تھا۔ رمنڈ رہا ہونے کے بعد بالذون چارم کے زمانہ میں لاطینی حکومت کا ولی مقرر ہو چکا تھا۔ چونکہ رمنڈ، کشمکین کا احسان اور اس وقت نور الدین زنگی کے بیٹے ملک الصالح کا گورنر اور وزیر تھا اس سے ملتے ہوئے کشمکین نے رمنڈ سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اس طرح بن نے ایک طرف خشیش کے شیخ الجبل سے مدد مانگی تھی اور دوسرے اس کا رابطہ سے بھی ہو گیا تھا اور ہردو طاقتوں سے صرف شرائط طے ہونا باقی تھے۔

کشمکین کو شیخ الجبل کی طرف سے صلاح الدین کو راستے سے ہٹانے کی پوری یقین تھی اور جب کشمکین حلب میں خشیش کا دفتر اور دعوت دینے پر راضی ہو گیا تو اس کے حکم پر شیخ القتال نے چند فدائین کو صلاح الدین کے قتل پر مامور کر دیا۔ ان کی منصوبہ بندی اس قدر مکمل ہوتی تھی کہ نامزد انسان کے بچ جانے کا سوال پیدا نہ تھا۔

ایک رات چار فدائی صلاح الدین کے خیمے میں داخل ہوئے۔ صلاح الدین بڑا مدبر تھا لیکن اپنی حفاظت کا بھی معقول انتظام کرتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ فدائی سخت کے باوجود صلاح الدین کے خیمے میں کس طرح داخل ہوئے کیونکہ کوئی سپریدار زخمی نہیں ہوا تھا۔ ہر حال فدائی کسی طرح بھی داخل ہوئے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آنے والوں کی تعداد چار تھی۔ تین فدائی تو اندر داخل ہو کر خیمے کے دروازے کے رے ہو گئے چوتھے فدائی نے سوتے ہوئے امیر صلاح الدین کے قریب پہنچ کر ہاتھ

گھاس لئے شیخ الجبل کے پاس پہنچی۔ شیخ الجبل نے تھالی سے ایک گھاس اٹھا لیا پھر ملب سے کہا۔ ”کشمکین کے معزز سفیر۔ ہم پر معاہدے کی تکمیل پر شہرت پیتے ہیں اور مزہ بھی شہرت پیش کرتے ہیں۔“

شیخ الجبل نے حور کو اشارہ کیا وہ دوسرا گھاس لے کر سلیمان کے سامنے گئی۔ اس تھالی سے گھاس اٹھا لیا۔ شیخ الجبل نے گھاس اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہلی جاؤ“ سلیمان یہ جام صلاح الدین کی موت کا اعلان ہے۔ تمام عالم کو اس کی تلوار سے نجات جائے گی۔“

سلیمان کے خوشی کی وجہ سے جیسے پر لگ گئے تھے۔ اس جام کو منہ سے لگا لیا اور الجبل کے ساتھ ساتھ پورا جام ایک ہی سانس میں حلق سے اتار لیا۔ سلیمان کو عجیب کیف محسوس ہوا۔ اس نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی پھر اس پر غنوغوی طاری ہوئے قریب کھڑی حوروں نے اسے اپنی آغوش میں سنبھال لیا پھر جب سلیمان کی آنکھ کھلی تو نے خود کو ایک قالین پر لیٹا ہوا پایا۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا اس کا گھوڑا اس کے قریب تھا اور وہی تینوں فدائی جو اسے شیخ کے پاس لے گئے تھے اس کے سر ہانے ہاتھ ہاتھ کھڑے تھے۔

ایک فدائی نے کہا۔ ”سفارت کی کامیابی مبارک ہو معزز سلیمان آپ کا گھوڑا ہے۔“

”آپ لوگوں کا شکریہ“ سلیمان مسکرایا۔ ”امام اعظم کا حکم ہے کہ آپ جہاں

فرمائیے وہاں تک ہم آپ کو حفاظت کے ساتھ پہنچا دیں۔“

”اس مہربانی کا مزید شکریہ۔“ سلیمان مسکرایا ”مجھے راستے کا علم ہے میں پہنچ گا۔“

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قلعہ الموت کے شیخ الجبل کے محل میں خاص دفتر تھا جہاں ان لوگوں کا مکمل ریکارڈ جنہیں شیخ الجبل کے حکم سے اس کے قتل کر دیتے تھے ہر قتل کے بارے میں مفصل حالات لکھے جاتے تھے مثلاً ”قتل کی وجہ کس امیر، وزیر یا سربراہ مملکت نے کی۔ کیا شرائط طے ہوئیں پھر کن فدائیوں کو قتل سپرد کیا گیا وغیرہ۔“ شیخ الجبل نے ایک حور کے ذریعہ جس شخص کو بلوایا تھا وہ شخص شیخ کھلاتا تھا یہ شیخ الجبل نے اسے صرف امیر صلاح الدین کا نام بتایا تھا باقی تمام احکامات شیخ القتال کو جاری کرتا تھا اور قتل کی تکمیل کے بعد وہی مقررہ رقم یا مراعات حاصل کرتا تھا۔

نبے پر پہنچا مگر وہاں کا عالم دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ فوجی سردار ہاتھ باندھے نیم دائرے میں کے سامنے کھڑے تھے۔ امیر صلاح الدین کا چہرہ اگرچہ متین تھا لیکن اس کی آنکھوں پچھریاں سی اٹھ رہی تھیں۔ امیر کے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ اس ذاتی کی گردن تھی جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ طفل کو اس وقت تک کچھ معلوم نہ تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اس نے ایک اندازہ ضرور لگایا تھا اور وہ اندازہ درست ہوا۔

”آگے آؤ طفل۔“ صلاح الدین نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

طفل سر جھکائے اس کے سامنے پہنچ گیا۔ خون آلود تلوار اب تک اس کے ہاتھ میں امیر کے سامنے پہنچ کے طفل نے اپنی تلوار زمین پر رکھ دی۔

”باقی حملہ آوروں کا کیا حشر ہوا طفل؟“ امیر نے بڑے جلال سے کہا۔

”وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں امیر معظم۔“ طفل نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب

”جو تم نے کہا ہے اس کا ثبوت پیش کرو۔؟“ امیر کا جلال کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

اسی وقت مجمع میں ایک طرف ہلچل ہوئی اور تین لشکری تین سروں کو اپنی تلوار پر بلند اُٹھ ہوئے۔ طفل کا ڈوٹا دل ٹھہر گیا۔

”ثبوت حاضر ہے۔ امیر معظم“ طفل نے ٹھہری آواز میں کہا۔

امیر طفل نے سر اُٹھانے والے کو اپنے قریب بلایا اور تین فدا یوں کے سراپنی تلوار کے

”کھوائے اور امیر سے مخاطب ہوا۔“ جب امیر نے مجھے آواز دی اس وقت میں خیمے

مقدم دور گیا تھا کیونکہ کچھ کھٹکا ہوا اور کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ میں اس

کی حقیقت معلوم کرنے جا رہا تھا۔ اسی وقت امیر کی آواز بلند ہوئی اور میں خیمے کی

بھاگ پڑا۔ میں تین آدمیوں کو خیمے سے نکل کے بھاگتے دیکھا۔ ایک لمحہ ضائع کئے

مانے ان پر حملہ کیا۔ ان میں سے ایک زمین پر گر گیا باقی دو بھاگ نکلے۔ میں تذبذب

پہنچ گیا کہ بھاگنے والوں کا پیچھا کروں یا آپ کے خیمے پر جاؤ۔ اسی وقت آپ کا دوسرا

ٹائی داجس کا مطلب میری سمجھ میں یہی آیا کہ بھاگنے والوں کو روکا جائے۔ پس میں

اُٹھ کر بھاگا اور ان دونوں کو بھی مار گرایا۔ اب مجھے امیر کے خیمے پر پہنچنے کی جلدی

لے لے اپنا باقی کام ان لشکریوں کو سپرد کر کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

”تمہاری وفاداری قابل تعریف ہے۔“ امیر نے کھلے الفاظ میں طفل کی

کی لیکن چونکہ سر جو امیر صلاح الدین کے ہاتھ میں تھا وہ اب تک اسی طرح تھا۔

میں خنجر کو تولا پھر امیر کے دل کا نشانہ لے کر قدر جھکا اور امیر پر بھر پور وار کیا ہے کہ تدبیر کند ہندہ اور تقدیر کند خندہ۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ فدا کی سوتے ہوئے انسان پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن اس کا خنجر ابھی صلاح الدین کے یہ ایک فیٹ دور تھا کہ سوتے ہوئے صلاح الدین کا دایاں ہاتھ اٹھا اور خنجر چلا۔ کلائی صلاح الدین کی گرفت میں آگئی پھر ایک لمحہ گزرا تھا کہ خنجر صلاح الدین تھا اور دوسرے ہاتھ سے صلاح الدین نے حملہ آور کی گردن دلوچ لی تھی۔

”طفل۔“ امیر کی گرجدار آواز خیمے میں گونجی۔ اس کے ساتھ ہی صلا

فدا کی کی گردن پر اس زور سے مروی کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

یہ سب کچھ لمحوں میں ہوا تھا۔ خیمے کے اندر کھڑے ہوئے باقی تین فدا

ساتھی کی درگت بنتی دیکھی تو خیمے سے نکل بھاگے۔

طفل امیر کے ذاتی محافظ دستے کا سردار تھا۔ جس وقت امیر نے اسے آوا

سے چند قدموں کی دوری پر تھا۔ امیر کی آواز پر اس نے ”جی آقا“ کہا اور

بھاگا ابھی اس نے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ امیر کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

”طفل کوئی بیچ کے جانے نہ پائے۔“

طفل کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ اس نے خیمے سے نکلتے ہوئے تین آ

دیکھ لیا تھا۔ اس کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور ایک فدا کی زمین پر آ رہا۔

شروع کر دیا تھا۔ طفل اپنے آقا کا حکم سن چکا تھا اس لئے خیمے کے اندر جا

اس نے ان دونوں کا تعقب کیا اور تھوڑی دور انہیں جالیا۔ ایک فدا کی نے طف

کھینچ مارا طفل ایک طرف ہٹ گیا اور اسی وقت اس کی تلوار فدا کی کے

ہو گئی۔ دوسرا فدا کی خنجر تانے طفل کی طرف بڑھا طفل فدا کی کے سینے سے

تھا۔ دوسرے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ فدا کی نے اس پر

نے وار خالی دے کر اس کے ٹخنوں پر اس زور سے لات جمائی کہ وہ لڑکھڑا گیا

آسانی سے اسے جہنم رسید کر دیا۔

لشکر گاہ میں جاگ ہو چکی تھی لوگ دریافت حال کے لئے ادھر ادھر بھاگ

طفل نے فوجیوں کو فدا یوں کی لاشیں حوالے کیں اور انہیں حکم دیا کہ

قلم کر کے امیر کے خیمے پر لائی جائیں۔ پھر وہ امیر کے خیمے کی طرف بھاگا۔

تمام لشکر جاگ گیا تھا اور بہت سے لوگ امیر کے خیمے کے سامنے جمع

طرف شعلیں جل گئیں تھیں اور لشکر گاہ جگمگا اٹھی تھی۔ طفل بھاگتا ہوا

حاضرین پر سکوت طاری تھا کہ امیر کی آواز پھر بلند ہوئی۔ ”یہ گردن۔“ گردن کو جھٹکا دیا تو اس میں خون کے قطرے گرنے لگے۔ ”ہاں یہ گردن اس لمحہ جس نے میرے سینے کا نشانہ لے کر سوتے میں مجھ پر بھرپور وار کیا تھا پھر میں نہیں کہ میری وہ کوئی نیکی تھی جو خدائے قدوس کے دربار میں قبول ہوئی تھی کہ مجھے یوں عطا ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب حملہ آور کا ہاتھ وار کے لئے اوپر بلند مجھے کسی غیبی طاقت نے بیدار کر دیا۔ آنکھ کھلتے ہی مجھے وقت کی سنگینی کا فوری اد اور میں نے ایک ہاتھ سے حملہ آور کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس میں خنجر تھا۔ اس کے میں دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ میری انگلیاں اس کی شہ رگ پر گئیں اسی وقت میں نے تم کو آواز دی تھی۔“

بڑا حیرت انگیز اور خونی واقعہ تھا۔ بظاہر حملہ آور چار معلوم ہوتے تھے۔ اب تک امیر صلاح الدین کے ہاتھ میں تھی اور باقی تین گردنیں طفعل کی کھوار رکھی تھیں۔ طفعل نے واقعی ایک گرافندر کارنامہ کیا تھا۔ لوگ جوں جوں اس واقعہ پر غور کرتے ان کی حیرت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا۔

حیرانی کے اسی عالم میں ایک بار پھر امیر کی گرجدار آواز ابھری۔ اس واقعہ کا بھی اسی وقت ہوگی اور جب تک کارروائی ختم نہیں ہوتی یہ گردن اور خنجر میرے رہے گا۔ یہ خنجر میرا نہیں بلکہ مجھے خوشی ہے کہ میرا خنجر اس حملہ آور کے ہاتھ آلودہ نہ ہوا بلکہ یہ خنجر اپنے ہی مالک کے خون سے خون رنگ ہو گیا۔ لشکر گاہ کو فوراً ”خبردار کیا جائے کسی بھی شخص کو لشکر گاہ سے فرار نہ ہونے دیا جا۔ حکم یہ کہ تمام سردار اور رسالدار اپنے پیادوں اور سواروں کو لے کر میدان جائیں بالکل اس طرح جیسے میدان جنگ میں صف آرا ہوتے ہیں اب تم سب اجازت ہے سوائے طفعل کے۔“

تمام چھوٹے بڑے سردار جو وہاں جمع ہو گئے تھے تعمیل حکم کے لئے چل پڑے۔ کو ٹھہرنے کا حکم تھا اس لئے وہ سر جھکائے کھڑا رہا مگر اس کے پیر کانپ رہے۔ خدا معلوم اس سے کیا کیا سوال کرے گا کیونکہ اس حملہ کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

سب کے جانے کے بعد امیر صلاح الدین نے طفعل سے سوال کیا۔ ”طفعل مانا کہ تم میری پکار کے وقت کسی خاص وجہ سے کچھ دور چلے گئے لیکن کیا تم سامنے سے ہٹنے سے پہلے اپنے نائب کو خبردار اور ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی؟“

”امیر معظم۔ انسان خطا کا پتلا ہے لیکن میں یہ قول صادق دہرا کر اپنی ذمہ داری سے چکی کو شش نہ کروں گا۔ جس وقت میں خطرہ محسوس کر کے خیمے کے سامنے سے جانے اور میں نے اپنے نائب کو سختی سے تاکید کی تھی کہ خبردار کسی کو خیمے کے قریب مت آنے باور ضرورت پڑنے پر جان دینے سے بھی دریغ نہ کرنا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ نائب نے ہوشیار رہنے کا یقین دلایا تھا۔ اس احتیاط کے باوجود اس حملہ کی ذمہ داری پر ماند ہوتی ہے اور میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں امیر معظم۔“

”ہونہ۔۔۔“ امیر نے سر ہلایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہارا نائب ایک قابل اعتماد انسان ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حملہ آور خیمے کے اندر کس وقت داخل ہوئے کہ بارے آدمی انہیں دیکھ نہ سکے۔“

”امیر معظم۔ یہی بات میرے دل کو بھی کھٹک رہی ہے۔“ طفعل نے مختصر جواب دیا۔

”تو جاؤ اس کھٹک کو دل سے دور کرو اور اپنے چاروں آدمیوں کو ساتھ لے کر میدان مان لوگوں کے پاس پہنچو جو وہاں صف آرا ہو رہے ہیں۔“

طفعل کے ساتھ چار محافظ اور ہوتے تھے۔ ایک طفعل کا نائب باقی تین بااعتماد اور دارنہ ظاہر ہے کہ امیر کے خاص محافظ دستوں کی امیر کے ذاتی محافظوں کی بھی اچھی طرح مان بین کی جاتی تھی اور خصوصاً اس وقت اور زیادہ احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی تھی بالکل میدان جنگ میں ہو۔ امیر صلاح الدین کے اسی وجہ سے طفعل اور اس کے نائب لڑائی میں ظاہر نہ کیا بلکہ انہیں صفائی کا موقعہ دیا۔

ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ستائیس آدمیوں کو گرفتار کر کے امیر صلاح الدین کے لئے پیش کیا گیا۔ یہ لوگ اس وقت گرفتار کئے گئے جب صفیں آراستہ ہو رہی تھیں اور اچھوٹے بڑے سردار اور رسالدار اپنے فوجیوں کو پہچان پہچان کے صف میں کھڑے کر رہے۔ گرفتار ہونے والے یہ لوگ بھی صفوں میں جا کے گھس گئے تھے لیکن ان کے بالادلوں نے جب تحقیق کی تو وہ غلط نکلے اور گرفتار کر لئے گئے۔ مگر عجیب بات اس وقت ان کی جب ان ستائیس آدمیوں نے بیگانہ دلیل اعلان کیا کہ وہ شیخ الجبل کے فدائی ہیں انہیں صلاح الدین کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امیر صلاح الدین نے فدائیوں کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں پھر حکم دیا کہ ان کی ذمہ داری کے قلعہ الموت کی پہاڑی کے نیچے پہنچا دی جائیں۔ حکم کی ذمہ داری سب گردنیں اتار لی گئیں اور انہیں قلعہ الموت بھیجنے کی تیاری ہونے لگی۔

نہ صادر فرمائے ہیں اور آپ کو اس کی موت پر مبارک باد دی ہے۔“
مبارکباد تو قبل از وقت ہے۔ صلاح الدین آج بھی اور اس وقت بھی زندہ
نے اسے پرے سے دیکھا ہے۔ وہ گھوڑے پر اپنے لشکریوں کو ہدایات دیتا پھر رہا
تھیں نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔
ابن کا قاصد مسکرایا۔ ”میرے کشمکشیں آپ کو حضرت شیخ کی طاقت کا اندازہ نہیں
جس شخص کے قتل کا حکم صادر فرما دیں اسے مردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ
نے کہ صلاح الدین مرنے کا ہے۔“

بات ہے۔۔۔ ”کشمکشیں چڑ گیا۔“ صلاح الدین میری آنکھوں کے سامنے چل
اور تم کہتے ہو کہ میں اسے مردہ سمجھ لوں۔ یہ کیا بکواس ہے؟“
کشمکشیں آپ شیخ الجبل کی توہین فرما رہے ہیں۔“ قاصد نے بھی سختی سے جواب
دیا۔ ”شیخ الجبل کا حکم اٹل ہوتا ہے۔“

زادہ بکواس مت کرو۔“ کشمکشیں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”جس طرح تو بکواس کرتا
تیرا شیخ الجبل بھی بکواس کرتا ہے۔ شرائط طے کئے دو ہفتے گزر چکے ہیں مگر وہ
نہ ذرا بھی غصہ آگیا۔ اس نے کشمکشیں پر فوراً ”خبر تان لیا۔“ ”خبردار اگر
شیخ کی شان کے خلاف زبان سے نکلا تو زبان کاٹ۔۔۔۔۔“

اجملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کشمکشیں کے دو محافظ جو ہر دم اس کے ساتھ رہتے
پر ٹوٹ پڑے اور اسے دبوچ لیا۔

انے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ جس قدر خطرناک ہو اس سے
بے نیاز اور بزدل ہو۔ تم مردوں کی طرح آواز دے کر وار نہیں کرتے بلکہ لوگوں
ماتل کرتے ہو۔“ پھر اس نے اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ ”اسے قید خانہ میں
میں رکھا جائے اگر ایک ہفتہ میں شیخ الجبل نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو اس
کو قتل کر دیا جائے گا۔“

سے تھنیتے ہوئے باہر لے گئے اور قید میں ڈال دیا۔ دوسری صبح کو یہ خبر دور دور
تک الجبل کے فدائیوں نے امیر صلاح الدین پر سوتے میں قاتلانہ حملہ کیا لیکن
آؤ کو پکڑے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس حملہ آور کے ساتھ ایک سو کے قریب
لے لشکر میں داخل ہوئے تھے۔ ان کو بھی گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ یہ
لیکن کوئی تو اس نے فدائی قاصد کو اپنے سامنے بلوا کر اس کی گردن اڑا دی۔
صلاح الدین پر اس قاتلانہ حملے کے کئی رد عمل ہوئے۔ وہ شیخ الجبل سے اس قدر

امیر صلاح الدین اس طرف سے فارغ ہوا تھا کہ لشکر گاہ کے محافظوں کی طرز
بیس لاشیں پیش کی گئیں۔ یہ ان فدائیوں کی لاشیں تھیں جنہوں نے رات کا فائدہ
لشکر گاہ سے نکل جانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت تک مرنے والے فدائیوں کی
سنتالیس ہو چکی تھی اور ابھی سامان خورد و نوش اور اسلحہ کے خیموں کی تلاش باقی تھی
کا نتیجہ بھی جلدی آگیا۔ پانچ آدمی وہاں سے گرفتار کر کے لائے گئے جنہیں فوراً
چڑھا دیا گیا۔

ان لوگوں کے علاوہ پچاس آدمی اور گرفتار ہوئے جو اپنا غلط نام اور پتہ لکھا
لوگوں میں شامل ہو گئے تھے جنہیں دوسرے دن امیر کے سامنے پیش کر کے لئے لکھا
بھیجا تھا۔ ان سب کو الگ الگ بلا کر ان کا نام اور پتہ معلوم کیا گیا۔ یہ تحقیقات اس
کے سامنے شروع ہوئی جس میں ملک کے تقریباً تمام علاقوں کے لوگ نامزد کئے
تھے۔ اس طرح غلط اندراج کرانے والوں کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ان کی تعداد پچپن تھی۔
کو شیخ الجبل پر اس قدر اعتماد ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات جاگزیں بلکہ پھری
جاتی تھی کہ وہ شیخ الجبل کے بتائے ہوئے کام کے سلسلہ میں اگر مارا گیا تو بغیر پوچھ
جنت میں جائے گا۔

ان پچپن فدائیوں نے گرفتار ہوتے ہی بتا دیا کہ وہ شیخ الجبل کے فدائی ہیں اور
صلاح الدین کی فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ امیر صلاح الدین نے انہیں ہم
پر لٹکا دیا امیر صلاح الدین پھر بھی مطمئن نہ تھا۔ اس کے خیال میں اب بھی لشکر میں
موجود ہیں لیکن اس کی تمام کوشش کے باوجود مزید کوئی فدائی پکڑا نہ جاسکا۔ یہاں
قابل ذکر ہے کہ مفتی حکیم انتظام اللہ شاہی مرتب تاریخ ملت نے صاف الفاظ میں لکھا
کہ قلعہ اعزاز یا عزیز کے محاصرہ کے دوران اسماعیلی بائیسوں (فدائی) نے دو مرتبہ
حملہ سلطان صلاح الدین پر کیا۔ لیکن اس کی سند کسی دوسری تاریخ سے نہیں ملتی۔
ہے کہ پہلا حملہ حلب کے محاصرے کے دوران اور دوسرا حملہ قلعہ اعزاز کے محاصرہ
دوران ہوا ہو مگر دونوں مرتبہ خدا نے امیر کو بچالیا اور حملہ آور گرفتار ہو کر قتل ہوئے
امیر صلاح الدین کے ہاتھوں تقریباً سو سو اسو فدائیوں کا مارا جانا ایک بہت بڑا
تھا اس سے شیخ الجبل کی ساکھ کمزور پڑ گئی اور لوگوں نے اکا دکا فدائی کو جہاں پایا وہیں
خاتمہ کر دیا۔ فدائیوں کے مارے جانے کا سب سے زیادہ غم امیر کشمکشیں وزیر و گورنر
کو ہوا۔ شیخ الجبل کے ایک ذاتی غلام نے حلب پہنچ کر کشمکشیں کو اطلاع دی۔
”امیر کشمکشیں کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت امیر شیخ الجبل نے صلاح الدین کے

امیر معظم

میں گنہ گار اور خطاوار ہوں مگر میرا ایمان ہے
دمشق کی بکھرتی ہوئی سلطنت کی شیرازہ بندی
صرف آپ کر سکتے ہیں۔ خدا کے لئے اپنی
حفاظت کا معقول انتظام کیجئے۔ شیطان صفت
شیخ الجبل کے فدائی آپ کے لشکر تک پہنچ
چکے ہیں۔

معافی کا خواستگار

ابن مقدم

امیر صلاح الدین آرام کرنا بھول گیا اور دیر تک اس مختصر تحریر کے مندرجات پر غور
لنا رہا۔ ابن مقدم ہر چند مفاد پرست تھا۔ اس نے دمشق پر قبضہ کے لئے بڑا خطرناک
ہم اٹھایا تھا، لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے
بعد امرائے نوریہ میں سے تقریباً سب ہی امیر تخت دمشق کا خود کو حقدار سمجھتے تھے۔ کیا
نور الدین ابن مقدم کیا سعد الدین کشتکین سب نے اپنی اپنی بساط بھر کوشش کی تھی اور
بھی کر رہے تھے پھر صرف شمس الدین ابن مقدم کو اکیلا ہی غدار ملک و وطن کیوں کہا
بائے اور پھر اس صورت میں تخت دمشق پر قبضہ میں ناکام ہونے کے بعد اس نے صاف
ماف الفاظ میں کہا تھا کہ۔

”دمشق کی بکھرتی ہوئی سلطنت کی شیرازہ بندی

صرف آپ کر سکتے ہیں۔“

ابن مقدم پر غداری کا الزام تو ہمیں سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابن مقدم
نے امیر صلاح الدین کے مخالف ہونے کے باوجود اسے شیخ الجبل کے فدائیوں سے خبردار
رہنے کی اطلاع دی تھی۔ یہ اطلاع صلاح الدین کو قاتلانہ حملے کے بعد پہنچی لیکن ابن
مقدم نے ایک دن پہلے ہی امیر کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا ضمیر نجرم تھا اس
لئے امیر کے سامنے خود نہ آسکا اور کسی ذریعہ سے بند لافہ امیر تک پہنچا دیا۔

امیر صلاح الدین نے دماغ میں اڑتے خیالات کو جھٹکا دے کر الگ کیا پھر غلام سے
کہا ”فرخ شاہ کو فوراً حاضر کرو۔“

صلاح الدین کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ غلام اک دم بھاگ پڑا۔ خوش قسمتی سے
فرخ شاہ لشکر میں موجود تھا۔ وہ کسی ضروری کام سے دمشق گیا ہوا تھا اور اس وقت واپس

متفر اور منغض ہوا تھا کہ اگر اس وقت حلب کا محاصرہ جاری نہ ہوتا تو وہ اپنی پوری
سمیٹ کر قلعہ الموت کا رخ کرتا اور اس قلعہ کا نام تک مٹا ڈالتا۔ مصر میں جب
اور سوڈانیوں نے بغاوت کی تھی اس وقت بھی امیر صلاح الدین کو یہ بتایا گیا تھا کہ
بغاوت کی پشت پر شیخ الجبل کا ہاتھ ہے جس نے سابق مصری امیر اور سوڈانیوں سے
خطیر رقم لے کر اس بغاوت کو کامیاب بنانے کی کوشش کی تھی۔

اس وقت وہ حلب کا محاصرہ ختم بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے اس کی استقامت
دلیری پر حرف آتا تھا۔ بہر حال اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وقت آتے ہی وہ شیخ
سے اس کا انتقام لے گا۔ امیر پر اس حملے کا ایک تعمیری رد عمل بھی ہوا جس نے ایک
اور نفرت کو دوستی اور محبت میں تبدیل کر دیا۔ جس شب امیر پر حملہ ہوا اس رات
تمام رات بلکہ دن چڑھے تک نہ سو سکا۔ دوپہر تک اس کا جسم کستمند سا رہا۔ اسے
لوگوں سے ملاقات کرنا پڑی جو اسے نئی زندگی کی مبارکباد دینے آئے تھے۔

اس کا دماغ خیالات کی آماہ جگاہ بنا ہوا تھا اور جسم تھکن سے چور تھا۔ اس نے
چند لمحے کمر کو سیدھا کر لے اس نے کمر سے خنجر نکالا۔ صلاح الدین آرام کے وقت
سے کھول کے تکیے کے نیچے رکھا کرتا تھا مگر یہ تو میدان جنگ تھا۔ کہاں کا بستہ کہ
ایک چادر کو دھرا تھرا کر کے تکیہ بنایا گیا تھا۔ صلاح الدین نے خنجر چادر کے تکیے
سرکایا تو اس کی انگلیاں کسی کانڈ سے ٹکرائیں۔ امیر صلاح الدین نے تکیہ ہٹایا تو وہ
بند خط رکھا تھا۔ امیر کو یاد آیا کہ گزشتہ شام ایک غلام یہ خط لے کر اس کے پاس
غلام کا بیان تھا کہ خط اسے امیر کے خیمے سے کچھ دور زمین پر پڑا ملا تھا۔ چونکہ
صلاح الدین کے نام تھا اس لئے غلام اسے اٹھا لایا۔

ممکن تھا کہ امیر صلاح الدین خط کھول کے پڑھتا لیکن جب اس نے خط کے
بھیجنے والے کا نام پڑھا تو اس کا مزاج برہم ہو گیا اور اس نے بغیر پڑھے خط کو تکیے
بھڑ دیا تھا۔ جس نام نے امیر کا مزاج برہم کیا تھا وہ نام تھا۔۔۔

گنہ گار۔ معافی کا خواستگار

شمس الدین محمد ابن مقدم

امیر کو اس وقت اس نام پر غصہ آگیا تھا لیکن اس وقت اس کا دل جاہا کہ وہ
اور دیکھے کہ ابن مقدم اس قدر یحسین جرم کرنے کے بعد اس سے کس بنا پر اور کس
معافی کا خواستگار ہوا ہے۔ پس امیر صلاح الدین نے خط کھولا۔ لافہ کے اندر
سطریں تحریر تھیں جسے پڑھ کے امیر صلاح الدین چونک پڑا۔ وہ تحریری کچھ یوں تھیں:

آیا تھا۔

”امیر معظم نے آپ کو فوراً طلب کیا ہے۔“ غلام نے ہانپتے ہوئے کہا۔

فرخ شاہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ ”خیریت تو ہے۔ مزاج سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

”امیر زادے۔ مجھے صرف اتنا علم ہے کہ امیر ایک خط پڑھ رہے تھے پھر سوچے۔ اس کے بعد چونک کے آپ کی طلبی کا حکم دیا۔ غلام نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ فرخ شاہ نے مزید گفتگو بیکار سمجھی اور غلام کے ساتھ چل پڑا۔

امیر صلاح الدین لفافہ ہاتھ میں دبائے خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ اس وقت فرخ شاہ پر اٹھا کر داخل ہوا۔ امیر کے قدم رک گئے۔

”فرخ شاہ۔ ۶ امیر ابن مقدم کہاں ہے؟“ امیر نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

فرخ شاہ لرز اٹھا۔ ابن مقدم کی گرفتاری کی ذمہ داری فرخ شاہ پر ڈالی گئی تھی۔ فرخ شاہ امیر کے ساتھ حلب کے محاصرہ میں آیا ہوا تھا۔ وہ یکسوئی سے ابن مقدم کو تلاش نہ کر سکا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہے امیر معظم۔ اس محاصرہ کی وجہ سے میں اس کی گرفتاری پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ بہت جلد اس غدار کو آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔“

”ہو نہ۔۔۔ امیر نے لمبی سانس لی۔ ”ابن مقدم کی ایک بیٹی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟“

”ارمغانہ“ فرخ نے نظریں نیچی کر لیں۔

”اس کا پتہ معلوم ہے تمہیں؟“ امیر نے دوسرا سوال کر کے فرخ شاہ کو اور گھبرا دیا۔

”نہیں امیر معظم۔ وہ خود ہی ایک بار آئی تھی اور میں نے اسے آپ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔“ فرخ شاہ نے ٹھہر ٹھہر کے جواب دیا۔ ”وہ دوبارہ نہیں آئی اور میں نے اس سے پتہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔“

”تمہیں پتہ پوچھنا چاہیے تھا۔“ امیر صلاح الدین نے زور دے کے کہا۔ ”آخر تمہاری محنت تھی۔“

فرخ شاہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ وہ صرف ایک نظر امیر پر ڈال کے گیا۔

”خیر۔۔۔“ امیر نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”خیر وہ مل جائے تو اسے ہمارے پاس لے کے آنا اور ہاں ابن مقدم تک یہ خبر پہنچانے کی کوشش کرو کہ اس کا خط ہمیں مل گیا ہے۔ اس کی خطا معاف ہوئی۔ وہ فوراً ہم سے ملنے کی کوشش کرے۔“

”جی امیر معظم۔۔۔۔“ فرخ شاہ نے گھبرا کے امیر کو دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں کیا

”سمجھو گے بھی نہیں۔“ امیر نے ہاتھ میں دبا خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”وہ گنہ گار ہے لیکن غدار تخت و تاج نہیں۔۔۔۔“

فرخ شاہ نے جلدی جلدی چار سطری خط پر نظر ڈالی اور اطمینان کا سانس لیا۔

”مگر اس دن تم اپنی جان پر کھیل کر مجھے نہ بچاتیں تو آج میں تم سے ہم کلام کس
 ج ہوتا۔“

اس وقت ان کے پاس سے ایک سوار دونوں کو گھورتا ہوا نکل گیا۔
 ”امیر زادے مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔“ ارمغانہ نے گھبرائے لہجے میں کہا۔ ”یوں
 سربراہ متھکو کرنا شرافت کے خلاف ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو ارمغانہ۔“ فرخ شاہ نے تائید کی۔ ”مجھے اپنے ساتھ چلنے کی
 زت دو تمہارے گھریٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں امیر زادے۔“ ارمغانہ نے قدرے برسی کا اظہار کیا۔ ”جب
 باپ کا دامن چھوٹا نہ میرا گھر ہے نہ در۔ آج اس سہیلی کے یہاں تو کل دوسری کے
 ۔“

”مجھے بہت افسوس ہے ارمغانہ۔“ فرخ شاہ نے ہمدردی دکھائی۔ ”میں تمہیں یوں بے
 ارا بھی نہیں دیکھ سکتا۔“

”شکریہ امیر زادے۔“ ارمغانہ نے قدم بڑھایا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ نہ تو میری فکر
 یں گے اور نہ کبھی مجھے یوں راہ چلتے پریشان کریں گے۔“

ارمغانہ آگے بڑھ گئی اور فرخ شاہ کا کچھ کہنے کو کھلا ہوا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

اس دن کے بعد آج اسے ارمغانہ دکھائی دی تھی۔ وہ بھی بھرے بازار میں۔ فرخ شاہ
 اس کے قریب پہنچنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے ارمغانہ کو گلی
 مڑتے دیکھا تھا لیکن جب وہ گلی میں داخل ہوا تو وہاں سناٹا پڑا ہوا تھا وہ مجبور ہو کے
 نہ گیا۔ فرخ شاہ کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ جھپٹی اور آخری
 فٹ میں ارمغانہ نے اپنے پیچھا کرنے سے روک دیا تھا۔ اگرچہ ارمغانہ کی یہ درخواست
 غم فرخ شاہ کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا لیکن اس نے ارمغانہ کی اس خواہش کا احترام کیا
 اس سے سامنا کرنے کی کوشش نہ کی۔ فرخ شاہ بہت دنوں تک دمشق میں مقیم رہا۔
 غلغلہ بھی اسی شہر میں تھی۔ فرخ شاہ کو وہ کئی بار نظر آئی لیکن اس نے خود پر جبر کیا اور
 ماس ملاقات کی کوشش نہ کی۔ لیکن اس طرح کے ہر موقع پر فرخ شاہ کی کچھ ایسی
 فیت ہوتی جیسے کسی زخمی کا پرانا زخم تکلیف دینے لگے۔

فرخ شاہ نے کئی بار اس بات کا تجزیہ کیا کہ آخر وہ ارمغانہ سے ملاقات کے لئے اس
 اسباب میں کیوں ہے جبکہ ارمغانہ نہ صرف اس سے گریز کرتی ہے بلکہ یہ بھی نہیں چاہتی
 اسے روکا ٹوکا جائے۔ اس تجربے کے نتیجے میں اس کے دل نے یہ طفل تسلی دی کہ

ساحل کے قریب

وہ دمشق کے بوے بازار میں سے ایک گلی میں گھومی تھی کہ کسی نے آوا
 ”ارمغانہ۔ ٹھہرو ارمغانہ“

ارمغانہ نے پلٹ کے دیکھا۔ امیر صلاح الدین کا بھتیجا فرخ شاہ گھوڑا بڑھائے
 جانب آرہا تھا۔ یقیناً ”یہ آواز فرخ شاہ کی تھی۔ ارمغانہ کی فرخ شاہ سے صرف دو تین
 ملاقاتیں ہوئی تھیں پھر بھی وہ اس کے چہرے مہرے اور آواز کو نہیں بھول سکی تھی
 یقین ہو جانے کے بعد کہ فرخ شاہ اسے آواز دے رہا ہے ارمغانہ بے تحاشہ گلی میں
 لگی۔ وہ فرخ سے اب نہ ملنا چاہتی تھی۔ دونوں کی آخری ملاقات شاہی محل میں ہو
 جہاں فرخ شاہ نے اسے امیر کے سامنے اس لئے پیش کیا تھا کہ ارمغانہ کے فرخ شاہ
 ہوئے احسان کے بدلے شاید امیر صلاح الدین اس کے باپ المقدم کا قصور معاف
 لیکن امیر نے اسے رتی بھر امید کا بھی سہارا نہ دیا تھا اور وہ نہایت مغموم محل سے
 ہوئی تھی۔

فرخ شاہ اس سے پہلے محل چھوڑ کے باہر آگیا تھا تاکہ ارمغانہ سے اپنی صفائ
 کر سکے۔ پھر اس نے ایک موڑ پر اچانک سامنے آکر معذرتانہ لہجے میں کہا تھا۔ ”ارمغانہ
 تم سے شرمندہ ہوں کہ امیر نے ابن مقدم کی تقصیر معاف نہیں کی۔“

”آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں امیر زادے۔“ ارمغانہ نے بوے دکھ سے جوا
 تھا۔ ”دراصل بابا کی پیشانی پر غدا ری کا اتنا گہرا داغ ہے کہ میں اپنے احسان کے با
 اسے نہ دھو سکی۔ میں خود اپنی جگہ شرمندہ ہوں کہ میں نے احسان کی آبرو بھی خا
 ملادی اور اپنی اور آپ کی نظروں میں گر گئی۔“

”یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں ارمغانہ۔“ فرخ شاہ نے بات کو طول دینے کی

مکھی نہ کی۔ وہ اب ارمغانہ سے اس لئے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ اس سے ملنے کو اس کا دل چاہتا تھا بلکہ اس دل کے چاہنے میں یہ مسرت بھی شامل ہوگئی تھی امیر، ارمغانہ کے دل کو معافی کے ساتھ ساتھ انعام و اکرام سے بھی نوازنا چاہتے تھے لیکن وائے ناکامی کہ وہ ارمغانہ کو دیکھنے کے باوجود اس تک نہ پہنچ سکا۔

ارمغانہ، فرخ شاہ سے جان بچا کر بھاگتے اس گھر پہنچ گئی جہاں وہ عارضی طور پر مقیم تھی یہ اس کی گہری سہیلی حارثہ کا مکان تھا۔ پچھلے دو ہفتے سے وہ حارثہ کے پاس مقیم تھی یہاں وہ وہاں سے بھی نقل مکانی کرنے والی تھی۔ وہ ایک جگہ جم کے نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ اسے شبہ تھا کہ امیر صلاح الدین کے کارندے اسے دیکھتے ہی گرفتار کر لیں گے اور اس سے ابن مقدم کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ارمغانہ کو اپنے باپ کے قتل کو کچھ بھی علم نہ تھا۔ ابن مقدم سے اس کی آخری ملاقات اس رات ہوئی تھی جب اس کے باپ نے فرخ شاہ کے قتل کے سلسلہ میں دانیال سے تعاون کرنے کی درخواست کی تھی اور ارمغانہ کو بادل خواستہ محبت پدری سے مجبور ہو کر قتل جیسے گناؤں کے کام میں تعاون ادا کرنا پڑا تھا۔ اس رات کے بعد اس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کا گھریاں اس وقت لٹ گیا تھا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ابن مقدم، فرخ شاہ کو قتل کر کے قلعہ میں پرتھ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ارمغانہ اسی دن سے خانماں برباد ہوگئی تھی اور لڑائی کے ڈر سے جگہ جگہ چھپتی پھرتی تھی۔

حارثہ کے گھر پر دستک دے کے ارمغانہ گھر میں داخل ہوئی تو حارثہ اور اس کی ماں ملک سے رہ گئیں ارمغانہ کا رنگ فق تھا۔ سانس پھول رہی تھی اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے حارثہ نے دوڑ کر پانی کا گلاس بھرا اور زبردستی ارمغانہ کے منہ سے لگا دیا۔ حلق سے لائی آواز تو اس کے ہوش ٹھکانے ہوئے مگر نظریں ہمک رہی تھیں۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حارثہ کی ماں ایک جہانزیہہ خاتون تھیں انہوں نے ارمغانہ کی کیفیت بھانپتے ہوئے پوچھا۔ ”ارمغانہ بیٹی کیا کوئی غنڈہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟“

”ہاں خالہ جان۔۔۔۔۔۔ مگر نہیں نہیں وہ غنڈہ نہیں ہے۔“ ارمغانہ گھبرا گئی۔

”اے بیٹی۔۔۔۔۔۔ حارثہ کی ماں کہتے کہتے رک گئی

حارثہ، ”ارمغانہ کی راز دار تھی وہ فوراً“ بولی۔ ”اماں آپ جا کر دوسرے کمرے میں آرام کیجئے میں ارمغانہ سے بات کروں گی۔“

بہ چاری بیوی بی کچھ سوچتی اور سر ہلاتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

ارمغانہ اس کی محسن ہے اور محسن بھی ایسی کہ فرخ شاہ کی یہ زندگی اسی کی مرہون ہے۔ موت و زندگی اگرچہ خدا کے ہاتھ میں ہے مگر خدا بھی تو زندگی اور موت کے جواز کرتا ہے۔ قدرت کو فرخ شاہ کی زندگی عزیز تھی۔ اس نے ارمغانہ جو کہ ابن مقدم کی تھی اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کیا اور ارمغانہ اپنے ساتھی دانیال کا ساتھ دے بجائے اس کی مخالف ہوگئی اور آخرش دانیال کو تلوار سے ختم کر دیا۔

اس احسان کا بدلہ چکانے کے لئے فرخ شاہ ارمغانہ کو امیر صلاح الدین کے پاس گیا تھا لیکن امیر نے ارمغانہ کے احسان کا اعتراف کرنے کی باوجود اس کے باپ امیر ابن مقدم کو معاف نہ کیا۔ پھر جب امیر صلاح الدین پر قلعہ الموت کے حاکم الجبل کے حکم سے فدا سننے کا تعلقانہ حملہ کیا اور امیر قدرت خداوندی سے بچ گیا۔ فوراً بعد امیر صلاح الدین نے شمس الدین ابن مقدم کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کی بیٹی سے ملاقات کی خواہش کی۔ امیر صلاح الدین کے مزاج میں اس تبدیلی کی تھی کہ اپنے قاتلانہ حملے کے دوسرے دن امیر کو ابن مقدم کا ایک خط ملا جس میں امیر کو شیش (فدا سن) سے ہوشیار رہنے کی درخواست کی تھی ابن مقدم نے یہ خط سے ایک دن پہلے پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر وہ مقبور تھا اس لئے امیر کے پاس جا بجائے اس نے وہ خط کسی اور ذریعہ سے امیر کو پہنچا دیا اور امیر نے اسے ابن مقدم کی معافی کی درخواست تصور کرتے ہوئے پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

لیکن امیر جب اپنی جان بچ جانے پر شکرانے کے نفل پڑھ رہا تھا تو ابن مقدم ”اتفاقاً“ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جسے پڑھ کے امیر نے شمس الدین ابن مقدم کو فوراً ”اتفاقاً“ اور فرخ شاہ کو حکم ہوا کہ وہ دونوں کو پیش کرے تاکہ انہیں ان کی خدمات کا جائزہ۔ یہ واقعات حلب کے محاصرے کے دوران پیش آئے تھے۔ فرخ شاہ امیر کے حلب آیا ہوا تھا۔ امیر کا حکم ہوتا ہی وہ دمشق روانہ ہو گیا تاکہ ارمغانہ اور اس کے ابن مقدم کو تلاش کر کے امیر کے سامنے پیش کرے لیکن اس کی پہلی کوشش ناکام ارمغانہ گلیوں میں گم ہوگئی تھی جسے فرخ شاہ تلاش نہ کر سکا۔

فرخ شاہ نے عہد کر لیا تھا کہ وہ ارمغانہ سے اس وقت تک ملاقات کی کوشش کرے گا جب ابن مقدم گرفتار ہو کر اپنے انجام کو نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے عہد پر قائم امیر نے ابن مقدم کو معاف کر دیا اور فرخ شاہ جس کے سپرد ابن مقدم کی گرفتاری داری تھی اب اسے حکم دیا گیا کہ ابن مقدم کو احترام کے ساتھ پیش کیا جائے۔ فرخ شاہ نے دمشق پہنچ کے ارمغانہ کی تلاش شروع کی۔ بدلے ہوئے حالات میں فرخ شاہ۔

مکرت حال میں فرخ شاہ اس سے کیا کہتا اور کہتا بھی تو اسے کسی امید افزا جواب کی امید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ال تھا کہ وہ بازار میں کھڑی ہے۔ اس نے جلدی سے نظریں نیچی کر لیں۔
فرخ شاہ کو بھی ہوش آگیا۔ اس خیال سے کہ کہیں ارمغانہ پھر کہیں غائب نہ
جائے۔ فرخ شاہ تیز قدم اٹھاتا سڑک پار پہنچ گیا زمین اب تک ارمغانہ کے پکڑے ہوئے

”ارمغانہ مبارک ہو۔ امیر شمس الدین ابن مقدم کی خطا معاف ہوگئی۔“ فرخ شاہ
بغیر ایک لمحہ ضائع کئے کہہ ڈالا۔

ارمغانہ نے حیران نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا
”امیر زادے۔“ ارمغانہ نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ ”آپ نے ابھی کیا کہا تھا۔
بار پھر فرمائیے۔ فرخ شاہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ میں نے غلط نہیں کہا
مغانہ۔ امیر صلاح الدین نے امیر شمس ابن مقدم کی خطا سے درگزر کیا ہے اور مجھے حکم
اہے کہ میں امیر موصوف اور ان کی بیٹی ارمغانہ کو ان کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ
دل کو انعامات سے نوازیں۔“

”امیر زادے۔“ یہ حکم میرے لئے تو ہو سکتا ہے لیکن میرے باپ کے لئے کیسے ہو سکتا
ہے جبکہ انہوں نے امیر صلاح الدین کی مخالفت کی اور آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا؟“
مغانہ کے انداز میں اب بھی بے یقینی تھی۔

”ارمغانہ۔“ ابن مقدم نے ماضی میں جو کیا سو کیا لیکن حلب کے محاز پر انہوں نے
برصلاح الدین کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔“ فرخ شاہ نے کہا۔ ”میں تمہیں پوری
میل بتانے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم میرے ساتھ شاہی محل چلو یا پھر وہاں لے چلو جہاں تم
م ہو۔“

ارمغانہ کے دل و دماغ میں مسرت کی زبردست لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ تنہائی میں جب بھی
پاپے کے کردار پر غور کرتی تو اسے ابن مقدم کے تمام کام شیطانی نظر آتے۔ وہ اس
پاپے پر پہنچی تھی کہ اس کا باپ بدی کے راستے پر اتنی دور جا چکا ہے جہاں سے اس کی واپسی
مکن نہیں لیکن اس وقت فرخ شاہ نے یہ نوید دے کر اس کا دل باپ کی طرف سے معاف
دیا۔

کیا سوچ رہی ہو ارمغانہ؟ اسے خیالات میں الجھا دیکھ کر فرخ شاہ نے پوچھا۔
”ہونہ۔“ ارمغانہ نے چونک کے جواب دیا۔ ”آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔“

”دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ان دونوں آج جیسا ماحول نہ تھا کہ لڑکی بس اسٹاپ پر
لکڑی ہو تو میں جوان اس کا طواف کرنے لگتے ہیں۔ نہ عیاشی تھی نہ فاشی۔ لوگ ایک

نہ ہو سکتی تھی۔ ارمغانہ کو یہی خیال ہوتا کہ فرخ شاہ اس پر ناجائز دباؤ ڈال رہا ہے۔
یہ فرخ شاہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ شاید یہ مار
ڈانٹ پھٹکار اور سمجھانے بجھانے کا اثر تھا کہ ارمغانہ صبح ہی صبح بغیر ضرورت کے کم
نکل پڑی۔ وہ پھونک پھونک کے قدم رکھ رہی تھی لیکن دل برابر دھڑکے جا رہا تھا۔ اگر
شاہ کا آج سامنا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ وہ اس کی بات کا جواب دے سکے گی کہ نہیں۔
جواب دے گی وہ؟ اس کی کیا حیثیت ہے؟ اور وہ کون لگتا ہے اسے راہ میں ٹوڑے
ارمغانہ کو غصہ آنے لگا کہ اسی وقت دل کا کوئی درپچہ کھلا اور اس سے آواز آئی۔ ار
اگر فرخ شاہ سے بات نہیں کرنی تھی تو گھر سے کیوں نکلی؟ کیا کام تھا تجھے بازار میں
کھڑی ہوئی گھر سے۔

دل کی آواز نے ارمغانہ کے قدم روک دئے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے دل۔ میں کم
کیوں نکلی ہوں۔ حارث بھی تو کہتی ہے کہ مجھے اس سے ملنا چاہئے۔ وہ میرا مخالف تو
وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے سپرد اس کے باپ کی گرفتاری کا
لیکن اس نے اب تک اس کے باپ کو گرفتار نہیں کیا۔ کیا پتہ کہ فرخ شاہ نے اس
باپ کا پتہ لگا لیا ہو اور اسے گرفتار نہ کیا ہو۔ ارمغانہ اور دل میں یہ باتیں ہوری
ایک تیز رفتار گھوڑا گلی میں داخل ہوا۔ ارمغانہ ٹھٹھک گئی۔ وہ سمجھی کہ یہ گھوڑا فرخ
لیکن وہ کوئی بے لگام گھوڑا تھا جس پر سوار قابو نہ پارہا تھا۔

پھر ارمغانہ نے پلٹ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ بازار میں ابھی بھیڑ نہ ہوئی تھی۔
لوگ چل پھر رہے تھے۔ اس نے قدم اٹھایا تھا کہ دل اس زور سے اچھلا جیسے سینے سے
جائے گا۔ سڑک کے اس پار فرخ شاہ سڑک کی لالین کے کھجے کے ساتھ کھڑا تھا۔
نظریں ادھر ہی تھیں۔ اس طرح ارمغانہ اور فرخ شاہ کی نظروں میں زبردست تصادم
ارمغانہ نے ارادہ کیا کہ بھاگ پڑے مگر زمین نے جیسے اس کے پیر پکڑ لئے۔ حارث کی
ڈانٹ اس کے سامنے آگئی۔ وہ بھاگ کے کہاں جائے گی؟ گھر گئی تو حارث کو کیا جواب
گی۔

ارمغانہ عام طور سے نصف نقاب میں رہتی تھی۔ فرخ شاہ نے اسے اسی انداز
دیکھا تھا سوائے اس دن کے جب ارمغانہ امیر صلاح الدین کے سامنے پیش ہوئی تھی۔
اس نے پردہ نہ کیا تھا کیونکہ امیر صلاح الدین اس وقت دمشق کا فاتح اور حاکم اعلیٰ
ارمغانہ اور فرخ کی نظریں ایک بار ملیں تو پھر الگ نہ ہو سکیں۔ وہ فرخ شاہ کے چہرے
تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نظروں کا یہ تصادم کئی لمحے قائم رہا پھر ارمغانہ

”بکنو تم نے باہر کھڑا کیا ہے انہیں۔ اندر کیوں نہیں بلایا۔“ یہ کہتے ہوئے بزرگ امیر زادے کی طرف چلے۔
 امیر زادے نے جلدی سے ایک چارپائی پر صاف سی چادر بچھا دی۔ اسی وقت حارث کے والد امیر زادے کو لئے اندر آگئے۔
 ”بے تکلف تشریف لائیے۔ آپ سے کوئی پردہ نہیں کرتا۔“ بزرگ نے بے تکلفی کا اظہار کیا۔ فرخ شاہ مسکین صورت بنائے چارپائی پر بیٹھ گئے۔
 ”آپ نے بڑا کرم کیا امیر زادے۔“ بزرگ بولے۔ ”فرمائیے ہم غریب آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“

”بزرگ محترم۔“ فرخ شاہ نے چپ کا دروازہ توڑا۔ ”دراصل امیر شمس الدین ابن دم کا قصور امیر صلاح الدین نے معاف کر دیا ہے بلکہ ابن مقدم کی ایک کارگزاری کے صلے میں انہیں انعام دینے کا بھی اعلان فرمایا ہے۔“
 ”سبحان اللہ سبحان اللہ۔ امیر صلاح الدین بھی کیا خوبیوں کے مالک ہیں۔“ بزرگ نے امیر صلاح الدین کی تعریفیں شروع کر دیں۔ ”بڑی نیک اور شہیدہ طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ ان برسوں امیر کو جامعہ دمشق میں درس و وعظ میں شریک دیکھا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خاموش طبیعت بچہ ایک دن مصر کا وزیر اعظم بنے گا۔“

”یہ آپ بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے بزرگ محترم۔“ فرخ شاہ نے رسا کہا۔
 ”امیر زادے ابھی آپ جوان ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی نظر مستقبل پر نہ ہو لیکن نہیں سمجھتے کہ میری بوڑھی آنکھیں امیر صلاح الدین کے سر پر دمشق کا تاج دیکھ رہی ہیں۔“ بزرگ نے ایسے واضح الفاظ میں پیش گوئی کی کہ سب چونک پڑے۔

”آمین ثم آمین۔“ یہ آواز حارث کی والدہ کی تھی۔ انہوں نے فوراً شوہر کی تائید کی۔
 فرخ شاہ کو بھی بولنا پڑا۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو ہم صرف دعا کر سکتے ہیں۔“

حارث نے دیکھا کہ یہ تو سیاست کی محفل جم رہی ہے اس نے فوراً موضوع بدلا۔ ”ابا جان امیر زادے ارمانہ اور خالو ابن مقدم کی تلاش میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ ارمانہ تو یہاں موجود ہے لیکن خالو ابن مقدم کو کیسے تلاش کیا جائے؟“

فرخ شاہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ کھلی۔ ”چلے ایک کام تو ہو گیا۔ ارمانہ مل گئی ہیں تو اب ان کے والد بھی ضرور مل جائیں گے۔ جس شب امیر پر شیش والوں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا اس کے دوسرے ہی دن امیر نے امیر شمس الدین ابن مقدم کی معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں ابن مقدم اور ان کی بیٹی ارمانہ کو تلاش کر کے

دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیتے تھے۔ اپنے کام سے کام اور بس اللہ کا نام۔ یہ لوگ خاموشی سے چلتے ہوئے حارث کے دروازے پر پہنچے۔ ارمانہ نے قدر سے کہا۔ ”آپ ذرا انتظار فرمائیے میں اندر پردہ کرا کے بلاتی ہوں۔“

پردے کا اگرچہ عام رواج نہ تھا لیکن بڑی بوڑھیاں باپردہ رہنے کو شرافت کی سمجھتی تھیں ارمانہ پسینے میں ڈوبی اندر پہنچی حارث کی نظر بڑی تو گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہوا ارمانہ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“ حارث گھبرا گئی۔

ارمانہ نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ آگئے ہیں۔“
 ”وہ آگئے ہیں کون آگئے ہیں؟ حارث گھبرا گئی۔“

”ارے وہی امیر زادے فرخ شاہ۔“ ارمانہ نے سنبھل کے کہا۔

”امیر زادے فرخ شاہ وہی امیر صلاح الدین کے بیٹے۔“ حارث نے کیرد کی ”ہاں ہاں وہی اور کون ہو سکتا ہے؟“ ارمانہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی۔ ”تو نے ہی تو کہا تھا کہ ان سے ملو۔ آج ذرا منہ لگایا اور وہ ساتھ لگے چلے آئے۔“
 یہی بات تو بری ہوتی ہے۔ حارث گم سم کھڑی کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کا بھائی بھاء اندر آیا۔ ”بابی۔ بابی۔ ایک خوبصورت سا آدمی باہر کھڑا ہے پتہ نہیں کون ہے وہ لگتا ہے۔“

حارث نے اسے ڈانٹا۔ ”چپ رہ تو خبردار جو باہر گیا۔“ پھر ارمانہ سے بولی۔
 ”اللہ وہ امیر زادے ہیں انہیں کہاں بٹھاؤں۔ بیٹھک (ڈرائنگ روم) تو نہیں ہے اگر میں لے دے کے یہی دو کونٹریاں ہیں۔“ اس وقت حارث کی ماں اور بوڑھے باپ کوٹھری سے برآمد ہوئے ماں نے لڑکیوں کو حیران پریشان دیکھا تو پوچھا۔ ”کیا ہوا۔ دونوں کو کیوں پریشان کھڑی ہو؟“

”ماں امیر زادے ہیں نا۔ امیر صلاح الدین کے بیٹے وہ آئے ہیں۔“ حارث تفصیل بتائی۔

ارمانہ اپنے تمام حالات سے حارث اور اس کے والدین کو آگاہ کر چکی تھی۔
 زادے کے نام سے حارث کے باپ چونکے۔ ”امیر زادے فرخ شاہ؟“

”جی ہاں خالو جان۔“ ارمانہ نے تائید کی۔ ”امیر صلاح الدین نے ابا جان کو معاف کر دی ہے۔ یہی خبر دینے آئے ہیں مجھے۔“

”مگر وہ ہیں کہاں؟“ بڑے میاں نے گھبرا کے پوچھا۔

”دروازے پر کھڑے ہیں۔“ ارمانہ نے بے دھڑک کہہ دیا۔

تھے کا اسے موقع ملا۔ شیرکوہ کے بعد یہ ذمہ داری امیر صلاح الدین کو سونپی گئی۔ عجیب
تھی کہ امیر صلاح الدین جو شجاعت اور شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ امور سلطنت کی
پیداہنی طور پر موجود تھی اور اسی اہلیت کی بنا پر اس نے ایک طرف تو عیسائیوں
موسا شاہ یروشلم سے کئی بار مورچے کئے اور دوسری طرف مصر کے فاطمی سردار جو اپنی
دوسری میں کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے انہیں امیر نے اس خوبی سے نچا دکھا کر اپنا مطیع کیا کہ
مصر اور دمشق میں اس کی تعریف کے ترانے بجنے لگے۔

مگر امور سلطنت کی سوجھ بوجھ اور شاہانہ طریقوں سے صرف امیر صلاح الدین ہی
واقف تھا اس کے بھائی بختیہ اب تک محض سردار فوج اور میدان جنگ کے ماہر تھے۔
سلطنت کے اصولوں کا انہیں قطعاً پتہ نہ تھا۔ امیر زادے فرخ شاہ کا بھی یہی حال تھا۔ اگر
مارش کے بزرگ باپ اسے تشییر کی بات نہ سمجھاتے تو وہ ابھی جانے کتنے سال تک ابن
مقدم کو ادھر ادھر تلاش کرتا پھرتا۔ یہی حال سیف الاسلام طغرگین کا تھا۔ وہ نکوار کے زور
پر حکومت تو کر رہا تھا مگر قاعدے قانون کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پھر جب فرخ شاہ نے اس کے
کان میں بات ڈالی تو وہ فکر میں پڑ گیا۔

”فرخ شاہ۔“ گورنر سیف الاسلام نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تم اتنے روز سے دمشق
آئے ہو لیکن یہ بات تم نے مجھے آج بتائی ہے اگر پہلے کہا ہوتا تو اب تک میں کئی بار
ادھر ڈرا پڑا چکا ہوتا۔“

”نائب محترم۔“ فرخ شاہ نے بڑے افسار سے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ بات
مجھے خود نہیں معلوم تھی۔ آج ایک بزرگ نے بتائی ہے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔
آپ اس پر فوراً عمل کیجئے۔ اب دیر نہ ہونا چاہیے ورنہ امیر کے ناراض ہونے کا خدشہ
ہے۔“

”ضرور ضرور۔ یہ کام ابھی اور اسی وقت ہوگا۔“ گورنر سیف الاسلام طغرگین نے
کہا۔ ”لیکن یہ بتاؤ فرخ شاہ کہیں امیر اس بات کی پوچھ گچھ تو نہیں کریں گے کہ ہم نے ان
کے اعلان کی فوراً تشییر کیوں نہیں کی؟“

طغرگین، امیر صلاح الدین سے بہت ڈرتا تھا۔ وہی نہیں بلکہ صلاح الدین کے بڑے
بھوٹے تمام بھائی اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ ان سب نے اپنی قسمت صلاح الدین سے
وابستہ کر دی تھی اور اس کے حکم کو بالکل حکم خداوندی کی طرح مانتے تھے۔ فرخ شاہ سمجھ
گیا کہ گورنر گھبرا گیا ہے اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

”نائب محترم۔۔۔ اب امیر کی فکر نہ کیجئے اگر الٹی سیدھی پڑ گئی تو الزام میں اپنے سر

”ہاں امیر زادے۔“ بزرگ نے تائید کی۔ ”اگر آپ اپنے طور پر ابھی مقدم کو یہ
تک تلاش کرتے پھریں تو بھی وہ آپ کے ہاتھ نہیں آئیں گے کیونکہ وہ تو زیرِ عتاب ہیں
وہ اپنے کو کسی کے سامنے کیسے ظاہر کر سکتے ہیں۔“

حارث کے بزرگ باپ کی بات بہت معقول تھی۔ امیر زادے فرخ شاہ نے ارمان
وعدہ لیا کہ وہ جب تک ابن مقدم کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوتا اس وقت وہ حارث
گھر سے کہیں اور نہیں جائے گی اس وعدہ وعید کے بعد فرخ شاہ گورنر دمشق سیف الاسلام
طغرگین کے محل کی طرف روانہ ہوا۔

فرخ شاہ نے دمشق آتے ہی طغرگین کو بتا دیا تھا کہ امیر صلاح الدین نے ابن
ابن مقدم کو معاف کر دیا ہے اور یہ کہ وہ حلب سے ابن مقدم اور اس کی بیٹی کی تلاش
دمشق آیا ہے لیکن اس امر کی تشییر کے لئے نہ فرخ شاہ نے گورنر پر زور دیا تھا اور نہ
گورنر نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ گو سیف الاسلام طغرگین، فرخ شاہ کا چچا
لیکن شاہی آداب کے تحت وہ اسے چچا کے بجائے دمشق کے نائب سلطنت کے لقب
مخاطب کرتا تھا۔

”نائب سلطنت۔۔۔“ فرخ شاہ نے ادب سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاہی دربار
کے مطابق جب مغرور مجرم کی سزا کا اعلان کیا جاتا ہے تو شاہ وقت کا یہ اعلان شہر شہر
گلی گلی و محندورچی پکارتا پھرتا ہے۔ یہی طریقہ کسی مجرم کے معافی نامہ کے معاملہ میں
اختیار کرتے ہیں۔ امیر صلاح الدین اگرچہ شاہ وقت نہیں لیکن دارالسلطنت پر ان کا قابض
ہے اور آپ ان کے نائب ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ امیر صلاح الدین نے
الدين ابن مقدم کی معافی کا جو اعلان کیا ہے اس کی پوری تشییر آپ کی طرف سے
چاہیے تاکہ یہ خبر ابن مقدم تک پہنچے اور امیر کے سامنے پیش ہو کے اپنی نیکی کا صلہ پائے
نائب سلطنت نے فرخ شاہ کی بات بڑے غور سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ نجم الدین
ایوب کا خاندان دراصل شمشیر زلوں اور بہادروں کا خاندان تھا۔ ان کی زندگیاں ہمہ
جنگ میں سرداری کرتے گزرتی تھیں۔ نجم الدین اور اسد الدین شیرکوہ و دوزوں کی اولاد
سلطنت دمشق سے وابستہ تھیں اور سلطان نور الدین زنگی کے حکم کی تعمیل پر یہ لوگ جا
ثار کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ پھر جب اسد الدین شیرکوہ کو مصر بھیجا گیا اور مصر کی دوا
کا قلعہ ان اس کے حوالے ہوا تو امور سلطنت اور شاہی قانون اور دستور کے سمجھنے

لے لوں گا۔ آپ بس فوراً" تشیر شروع کر دیجئے۔ میں اس قول کا قائل ہوں کہ در
دست آئید۔ اس کام میں اگرچہ ہماری ناقص معلومات کی وجہ سے کچھ دیر ضرور ہوگی
لیکن اس میں بھی کوئی اچھائی پوشیدہ ہے۔"

گورنر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور ناظم دربار کو بلا کر حکم دیا۔ "شہر شرار
گلی اعلان کیا جائے کہ امیر صلاح الدین نے امیر شمس الدین ابن مقدم کا قصور معاف
ہے اور ابن مقدم اور اس کی بیٹی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دونوں امیر کے سامنے پیش
اور انعام حاصل کریں۔"

ادھر گورنر کی زبان سے حکم نکلا ادھر دھندل چلی اور علاقہ ان تمام علاقوں میں
گئے جہاں جہاں امیر صلاح الدین کا قبضہ تھا اس طرح دو دن کے اندر ہر شخص کو مد
ہو گیا کہ ابن مقدم نے جو کہ معتب تھا کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ امیر نے نہ م
اس کا قصور معاف کیا ہے بلکہ اسے انعام بھی دیا جائے گا مگر اتنی تشیر کے باوجود امیر
الدین ابن مقدم نہ معلوم جس جگہ چھپا ہوا تھا کہ اسے کوئی خبر نہ ہو سکی۔ فرخ شاہ
ایک ہفتہ ابن مقدم کے انتظار میں دمشق میں ٹھہرا رہا لیکن سب بے سود۔ پھر حلب۔
اس کا بلادا آگیا اور اسے فوراً روانہ ہونا پڑا۔ چلتے وقت وہ ارمغانہ سے مل بھی نہ سکا۔
فرخ شاہ نے دمشق کے قیام کے دوران ایک بار ارمغانہ سے ملنے کی کوشش کی
لیکن ارمغانہ ٹال گئی تھی اور اس نے حارث کے ذریعہ کھلوا دیا کہ وہ گھر پر موجود نہیں
اپنی خالہ کے گھر گئی ہوئی ہے۔ فرخ شاہ سمجھ گیا کہ ارمغانہ اس سے ملنے سے گریز کر رہا
ہے۔ اس کا اقدام درست تھا اس لئے کہ اب تک ابن مقدم کا کچھ پتہ نہ چلا تھا اور
ارمغانہ باپ سے ملے بغیر اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ حلب
رواگی سے پہلے بھی فرخ شاہ حارث کے گھر گیا تھا لیکن یہی بتایا گیا کہ ارمغانہ اب تک
واپس نہیں آئی۔

حلب کے حالات اچانک بگڑ گئے تھے۔ گورنر کشمکشیں نے دہری چال چلی تھی۔ ایک
طرف تو اس نے قلعہ الموت کے شیخ الجبل کے ذریعہ امیر صلاح الدین کی زندگی کا چراغ گل
کرنے کی کوشش کی تھی پھر جب امیر صلاح الدین فداویوں کے ہاتھوں بچ گیا اور کم و بیش
ایک سو فداوی جو امیر کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے گرفتار ہو کر قتل کر دیئے گئے اس وقت
کشمکشیں نے عیسائیوں سے پھر رابطہ قائم کیا۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان نور
الدین زندگی کے دور حکومت میں ہر منڈ کاؤنٹ آف تریپولی جو جنگ حارم میں گرفتار ہو کر
حلب میں قید کر دیا گیا تھا۔ اسے کشمکشیں نے ایک بھاری رقم اور کچھ مسلمان قیدیوں کے

درا کر دیا تھا۔ وہی رمنڈ اس وقت نابالغ بالذون چارم کا سرپرست اور لاطینی سلطنت
کے گمشدہ رہا ہوا تھا۔

کشمکشیں کا گمشدہ رمنڈ کے پاس طرابلس (تریپولی) پہنچا۔ کاؤنٹ آف طرابلس کی
مسلمانوں کی خانہ جنگی پر لگی ہوئی تھیں اور وہ کسی بہتر موقعہ کی تلاش میں تھا۔ حلب
سے وزیر گورنر کشمکشیں کے ہر کارے کی آمد رمنڈ کے لئے ایک نوید مسرت تھی۔
رمنڈ گمشدہ کو فوراً اپنے محل میں طلب کر لیا۔

حلب کے گمشدہ نے کاؤنٹ کو کورنش پیش کیا تو کاؤنٹ نے گفتگو میں خود ہی پہل کی
حلب کے گورنر سعد الدین کشمکشیں کے قاصد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ قبل اس کے
قاصد ہمیں حلب سے لایا ہوا پیغام پہچائے ہم قاصد سے اپنے دیرینہ دوست کی خیریت
م کرنا چاہیں گے۔ ہم اپنے دوست کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بہت بے چین تھے
حلب کی طرف اپنا ہرکارہ بھیجنے کی فکر میں تھے کہ ادھر سے تم آگئے۔ ہمیں تفصیل سے
کہ ہمارے دوست اور ان کے اہل و عیال خیریت سے تو ہیں۔ انہیں مصری وزیر صلاح
الدین کی طرف سے کوئی پریشانی تو نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ صلاح الدین مصر سے دمشق
گیا ہے اور اس نے کچھ علاقے بھی حاصل کر لئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ
وہ دوست کشمکشیں اور وزیر صلاح الدین کے درمیان دوستی کے رشتے استوار ہیں کہ
ت کی دیوار اٹھ گئی ہے۔"

کاؤنٹ آف طرابلس نے بڑی چالاکی سے کشمکشیں کے نمائندے کو مرعوب کرنے کی
کوشش کی تھی۔ اسے تمام حالات کا علم تھا۔ حلب کے محاصرہ کے بارے میں بھی وہ سب
جانتا تھا مگر اپنی دوستی کے اظہار کے لئے قاصد کے سامنے بالکل انجان بن گیا تھا۔

"عالی جناب کاؤنٹ آف طرابلس نے میرے آقا کے ساتھ اپنی دوستی کا جس انداز سے
کیا ہے۔ اس کے لئے میں اپنے آقا کی طرف سے کاؤنٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"
کشمکشیں کا نمائندہ واقعی مرعوب ہو گیا تھا۔ "میرے آقا طرابلس کی طرف سے اس لئے
منہ تھے کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی آپ کے حضور ایک پیغام بھیجا تھا مگر اس پیغام
میں کوئی واضح جواب نہیں ملا تھا۔ اب اس خادم کو آپ کے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے
میں حلب کے محاصرے کی پوری تفصیل سے آپ کو آگاہ کروں اور آپ سے اتنا س
کہ اس مشکل وقت میں آپ میرے آقا جنہیں آپ دوست کے محبوب نام سے یاد
تے ہیں ان کی نہ صرف زبانی بلکہ فوجی مدد فرمائیں۔

"ضرور۔ ضرور۔ ہم اپنے دوست کے لئے اپنی جان تک لادیں گے۔" کاؤنٹ نے

چہ آقا کے پاس سے۔ ”میں اپنے آقا کا رازدار تو نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ پر قلم اٹکار نہ کر سکا۔“ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اپنے آقا کا پیغام لے کر آپ کے پاس راہنما کرتے ہیں اور اس موقع پر پوری سفارت بھیجی جاتی ہے۔“

”ہمارا خیال ٹھیک ہے قاصد۔۔“ کاؤنٹ نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ہمیں بھی امیر کشمیں کی طرف سے ایک بھرپور سفارت کے آنے کی امید تھی مگر شاید امیر نے یہ اب نہ سمجھا اور تمہیں بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ امیر کشمیں نے تمہیں بھی وہ اختیارات دے دیے ہوں گے جو سفارت کو دیئے جاتے ہیں؟“

قاصد کو پھر اقبال کرنا پڑا۔ ”عالی مقام کاؤٹ کا خیال درست ہے۔ آقائے محترم نے بے پورے اختیارات دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔“

”خیر یہ بات تو ہو گئی۔“ کاؤنٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”قبل اس کے ہم گفتگو آگے
برائے تو یہ تو بتاؤ کہ شیخ الجبل نے اپنے ذرائع کے ذریعے امیر صلاح الدین پر جو قاتلانہ
ملہ کرایا تھا وہ ناکام کیوں ہو گیا۔ اس سے قبل تو ذرائع کبھی ناکام نہ ہوتے تھے؟“

”عالی مقام کاؤنٹ۔“ قاصد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر محمد ج الدین عین حملہ کے وقت بیدار ہو گیا اور اس نے ملہ آور کو پکڑ لیا اس کے بعد۔۔۔۔۔“

”ٹھہرو قاصد۔۔ ٹھہرو۔۔“ کاؤنٹ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بھی روکا۔ ”پہلے بتاؤ کہ صلاح الدین کے خیمے میں داخل ہونے والا حملہ آور اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کئی درندائیں بھی تھیں؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا محترم کاؤنٹ۔“ قاصد نے اکتاتے ہوئے کہا۔ ”مشہور یہ ہے کہ چار حملہ آور صلاح الدین کے خیمے میں داخل ہوئے تھے جس میں سے ایک صلاح الدین کے ہاتھ سے مارا گیا اور باقی تین کو محافظوں کے سردار ظفر نے ختم کرایا۔“

”میں نے اس سلسلے میں ایک بات اور سنی ہے۔ تم یقیناً اسے جانتے ہو گے؟“

”نمائے محترم کاؤٹ۔“ قاصد نے جواب دیا۔ ”میرے علم میں ہوگا تو ضرور بتاؤں گی۔“

”میں نے سنا ہے کہ امیر گمشدگان نے شیخ الجبل کو اتنی رقم کی ادائیگی نہیں کی جس کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے شیخ الجبل کے مذاہمیں نے قاتلانہ حملے کا صرف ٹانگہ کیا تھا۔“

جواب دیا۔ ”ہمیں یاد پڑتا ہے کہ کچھ دن پیشتر امیر کشمکین نے ہمیں مطلع کیا تھا کہ پر صلاح الدین کے حملہ کا شدید خطرہ ہے اس لئے انہیں فوجی مدد کی ضرورت پڑ سکتی قاصد سے ہم نے کہہ دیا تھا کہ کشمکین جن کے ہم احسان مند بھی ہیں جب بھی آواز دیں گے تو میدان میں ہم ان کے پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے۔“

”عالی جناب کاؤٹ نے درست فرمایا۔“ لشکرین کے قاصد نے کہا۔ ”اس وقت پر حملہ کا امکان تھا لیکن اب امیر صلاح الدین نے حلب کا محاصرہ کر لیا ہے۔ میر نے حوصلہ کر کے محاصرہ توڑنے کی کوشش کی تھی اور حلب کی فوجیں قلعہ کے در کھول کر صلاح الدین کے لشکر پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ تمام دن شدید جنگ ہوتی رہی فیصلہ نہ ہو سکا۔ شام کو مجبوراً حلب کی فوجوں کو قلعہ میں واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد الدین کو مصر سے کمک پہنچ گئی اور حلب کی فوجیں دوبارہ میدان میں نہ نکل سکیں۔ ار اس محاصرے کو جلد نہ توڑا گیا تو حلب ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ کاؤنٹ نے بڑے جوش سے بولا۔ ”جب تک ہم زندہ حطب پر صلاح الدین قبضہ نہیں کر سکتا۔ تم امیر کو ہماری طرف سے اطمینان دلاؤ کہ نہ گھبراہیں۔ ہم بہت جلد بجلی بن کر صلاح الدین پر گریں گے اور اسے حطب کا امام کرنے پر مجبور کر دیں گے۔“

”کاونٹ محترم - میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ براہ کرا واپسی کی اجازت دی جائے۔ میرے آقا بے چینی سے غمگین ہیں۔“

”تم جاسکتے ہو قاصد۔۔“ کاؤنٹ آف طرابلس نے فوراً اجازت دیدی۔ ”لیکن بھی جلدی کیا ہے۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ ابھی تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں اور معاملات پر گفتگو ہونا ہے۔ آج رات کو تم ہمارے ساتھ کھاؤ گے اسی وقت تمام معاملے بائیں گے۔“

گماشتہ سمجھ گیا کہ کاؤنٹ محض دوستی کے ناطے گمشدین کی مدد نہیں کرے گا بلکہ مدد کا پورا پورا معاوضہ طلب کرے گا۔ اس سلسلہ میں گمشدین نے قاصد کو کھلی پیروی تھی کہ وہ کاؤنٹ آف ٹراولس کی ہر شرط تسلیم کرے اور معاہدہ پر اس کی طرف دستخط کروے۔ چنانچہ گمشدین کا قاصد یا سفیر رک گیا اور اس نے واپسی پر زور نہ دیا۔ رات کے کھانے پر کاؤنٹ آف ٹراولس نے اور زیادہ محتاط گفتگو کی۔ اس کے بعد گمشدین کا قاصد چونک پڑا۔ کاؤنٹ نے اس سے پوچھا تھا۔ "طلب سے قاصد"

تک وہاں ٹھہرا رہا جب تک حمص نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بیس دن کے سخت رہنے کے بعد حمص پر امیر صلاح الدین کا قبضہ ہو گیا۔ امیر صلاح الدین نے حمص کا محصور کیا پھر وہ۔ طبک کی طرف چلا۔ طبک وہ پہلا قلعہ تھا جو صلاح الدین نے فتح کیا۔ حمص کو امیر عماد الدین زنگی نے عطا کیا تھا۔ اس وقت تک زنگی خاندان میں ثابت نہ آئی تھی اور یہ خاندان امیر کہلاتا تھا۔

قلعہ طبک کو امیر صلاح الدین کی زندگی میں بڑا دخل حاصل ہے۔ اس لئے کہ صلاح الدین کے بچپن کے آٹھ نو سال یعنی ۱۱۳۶ء تک جب امیر عماد الدین زنگی قتل ہوا، طبک گزرے تھے۔ تاریخ میں اس دور کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ عام خیال یہی ہے کہ صلاح الدین نے جبکہ میں گزرے ہوئے بچپن کے زمانہ میں عام مسلمانوں کی طرح دنیاوی کام حاصل کی ہوگی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب، ایک کامیاب گورنر تھا اس لئے صلاح الدین کو بہترین استادوں کی خدمات حاصل ہوئی ہوں گی تاہم سب قیاس آرائیاں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صلاح الدین کا باپ اپنے زمانہ کا بڑا رہنما حکمران تھا۔ نجم الدین ایوب نے تارک الدینا صوفیوں کے لئے طبک میں خانقاہ بھی بنوائی تھی۔

بہر حال کچھ نہیں ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ صلاح الدین نے عمر کے تقریباً نو سال تک میں گزرے تھے۔ اس لئے اسے طبک سے انس سا تھا۔ اس نے کلام اللہ، فرائض، خطابت اور شاعری وغیرہ کی ابتدائی تعلیم اسی مقام پر حاصل کی تھی۔ عموماً مدی عیسوی میں اب حکمران خود کسی نسب سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کی تعلیم کا بار عربوں جیسا ہی ہوتا تھا۔ حدیث و قرآن کی تعلیم اور علم نحو کی باریکیاں اس زمانہ کے بہ یافتہ طبقہ کا علمی مشغلہ ہوا کرتی تھیں۔ طبک وہ شہر تھا جہاں صلاح الدین کو یہ خبر ملی کہ اس کے باپ نجم الدین ایوب کا مرنے اور آقا قتل کر دیا گیا ہے۔ صلاح الدین نے اس واقعہ کا کیا تاثر لیا اس کا کوئی علم نہیں کیونکہ اس وقت اس کی عمر صرف نو سال تھی اس عمر کے بچے سے کسی تاثر کے اظہار کی توقع غلط معلوم ہوتی ہے۔

طبک کی فتح نے امیر صلاح الدین کو دمشق کے تقریباً تمام شمالی علاقہ کا حاکم بنا دیا۔ دمشق اس کے پاس پہلے ہی تھا۔ حمص، حماہ اور طبک اب فتح ہوئے تھے۔ امیر صلاح الدین کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حلب کا دفاع مشکل نظر آرہا تھا۔ کشمکشیں ملک الصالح کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے چچا زاو بھائی سیف الدین غازی سے مدد طلب کرے۔ ملک الصالح، سیف الدین غازی کے بہت خلاف تھا۔ اس لئے سلطان

”نہیں محترم کاؤنٹ۔“ قاصد نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا میرے آقا اور شیخ الجبل میں کیا معاہدہ طے پایا تھا لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو وعدہ کرتے ہیں وہ پورا ضرور کرتے ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں بالکل مطمئن چاہیے۔“

”مجھے اعتبار ہے قاصد۔ صلاح الدین پر حملہ کی بات تو میں نے برسبیل تذکرہ تھی۔“ کاؤنٹ بات کو ٹال گیا۔ تم امیر کشمکشیں کو پورا یقین دلانا کہ حلب کا محاصرہ ختم جائے گا خواہ اس کے لئے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے لیکن انہیں پہلے اپنا وعدہ پورا ہوگا۔“

”محترم کاؤنٹ آپ کو میرا اعتبار کرنا ہوگا۔“ قاصد نے جواب دیا۔ ”ابھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ رقم مطلوبہ بیان فرمائیے۔ میں نہ صرف حلف پر وعدہ کروں گا بلکہ رقم لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔“

”ہاں۔ یہ ہوئی مردوں والی بات۔“ کاؤنٹ خوش ہو گیا۔ اس کے بعد کاؤنٹ آف طرابلس اور کشمکشیں کے گماشتہ میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ کشمکشیں کی طرف سے کتنی رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا لیکن ماٹے پا گیا اور قاصد واپس چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاصد حسب وعدہ ایک بار کاؤنٹ کے پاس واپس آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمکشیں کے عہد نامہ کی رقم ادائیگی کر دی تھی۔ اس کے ٹھیک دو ہفتے بعد یعنی یکم فروری ۱۱۷۵ء کو رینڈ کاؤنٹ آف طرابلس فوجیں لے کر حمص کی طرف روانہ ہوا۔ حمص اور حماہ کا اس وقت تک امیر صلاح الدین کی فوجیں محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔

عیسائیوں کے حمص کی طرف پیش قدمی کی خبر جب امیر صلاح الدین کو حلب پہنچا اس نے فوراً حلب کا محاصرہ اٹھایا اور بڑی تیزی رفتاری سے حمص کی طرف روانہ ہوا۔ کاؤنٹ آف طرابلس اور کشمکشیں میں یہی معاہدہ ہوا تھا کہ کاؤنٹ امیر صلاح الدین کو محاصرہ ختم کرنے پر مجبور کر دے گا چنانچہ حمص پر حملے سے حلب کا محاصرہ ختم ہو گیا۔ طرح کاؤنٹ آف طرابلس نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ وہ دراصل امیر صلاح الدین سے جنگ کرنا چاہتا تھا اور نہ اس میں اتنی طاقت تھی کہ امیر صلاح الدین جیسے دشمن کا مقابلہ کرے۔ چنانچہ جب صلاح الدین کی فوجوں نے دریائے ارنٹ کے کنارے مورچے بنائے تو کاؤنٹ آف طرابلس پیٹھ دکھا گیا اور بغیر مقابلہ پر آئے اپنی فوج لے کر واپس چلا گیا۔ عیسائیوں کی واپسی پر امیر صلاح الدین نے آگے بڑھ کر حمص کا محاصرہ کیا اور

حب کی شجاعت نے حلب کو اب تک صلاح الدین کی دست برد سے بچائے رکھا ہے لیکن اب وہ حلب پر برصورت قبضہ کرنے کے لئے ایک طرف تو نیا لشکر تیار کر رہا ہے اور دوسری جانب مصر سے اسے برابر فوجی کمک مل رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر اسے حلب کے دوبارہ محاصرے سے نہ روکا گیا تو پھر حلب کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ظاہر ہے۔

”صلاح الدین اس وقت کہاں ہے؟“ سیف الدین غازی نے دریافت کیا۔

”صلاح الدین۔ حلبک میں غی فوجی بھرے کر رہا ہے۔“ ناظم سفارت نے جواب دیا۔

”معلوم ہوا ہے کہ اسے مصری کمک پہنچ چکی ہے اور اب وہ پوری طاقت سے حلب پر حملہ آور ہوگا۔“

”کاؤنٹ آف طرابلس نے مسلم علاقوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کا کیا انجام ہوا؟“ تعجب ہے کہ سیف الدین غازی کی معلومات اس قدر ناقص تھیں کہ اسے سوائے موصل کے کسی اور جگہ کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔

”اے محترم و معظم والی موصل۔“ ناظم سفارت نے جواب دیا۔ ”رہنہ کاؤنٹ آف طرابلس اپنی فوجیں لے کر حمص کی طرف چلا تھا۔ اس وقت صلاح الدین، حلب کا محاصرہ کرے ہوئے تھا۔ اسے جیسے ہی اطلاع ہوئی وہ محاصرہ اٹھا کر کاؤنٹ کے مقابلہ پر روانہ ہو گیا۔ قبل اس کے کہ کاؤنٹ اور صلاح الدین میں مقابلہ کی نوبت آئے کاؤنٹ جو کہ حمص کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چپ چاپ واپس ہو گیا۔ عظیم والی موصل آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صلاح الدین کی طاقت کس قدر بڑھ چکی ہے۔ عیسائی سلطنتیں اس کے مقابلے پر آنے سے کتراتے ہیں۔ آپ نے شیخ الجبل کے فدائیوں کا انجام تو سنا ہوگا۔ انہوں نے ایک سو سے زیادہ فدائیوں کی مدد سے صلاح الدین پر حملہ کیا تھا لیکن صلاح الدین کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔“

”یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے۔“ سیف الدین غازی نے تبصرہ کیا۔ ”بہر حال صلاح الدین کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا ہوگا۔“

”والی موصل کی بڑی کرم نوازی ہوگی۔“ ناظم سفارت نے فوراً کہا۔ ”صلاح الدین صرف آپ سے خوف کھاتا ہے اس لئے اس نے آپ کے کسی علاقہ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔“

”اصل وہ آپ کے مقابلہ پر نہیں آتا چاہتا۔“

”وہ مقابلہ پر نہیں آتا چاہتا تو ہم بھی اسے آزاد چھوڑنا نہیں چاہتے۔“ اس کے ساتھ ہی سیف الدین غازی نے اپنے درباریوں پر نظر ڈالی۔ اس نے دربار میں ایک ایک سردار کو غور سے دیکھا۔ یہ تمام سردار زنگی خاندان کے مشہور شہسوار اور شمشیرزن تھے۔

نور الدین زنگی کے انتقال کرتے ہی سیف الدین غازی نے سلطنت دمشق کے بڑے دیگرے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس کا ہمکار کمن ہے۔ طمع نے اسے اندھا کر دیا اور وہ سلطنت زنگی کا سب سے بڑا شہزادہ ہو۔ حیثیت سے اپنے دادا کی سلطنت پر اپنا حق سمجھتا تھا۔

ملک الصالح کی طرف سے ایک سفارت دوبارہ موصل بھیجی گئی۔ سیف الدین غازی اسے بڑی مشکل سے بازیاہی کی اجازت دی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ملک الصالح الجبرج وہ تمام علاقے جس پر سیف الدین غازی نے زبردستی قبضہ کر لیا ہے واپس مانگنے کے سفارت آئی ہے۔ پھر جب اسے یقین دلایا گیا کہ سفارت کا مقصد کوئی علاقہ واپس لینا بلکہ فوجی کمک مانگنا ہے تب سیف الدین غازی نے سفارت کو محل میں طلب کیا۔

ناظم سفارت نے بازیاہی ہو کر عرض کیا۔ ”پہلے میں ملک الصالح اسلغیل پر دمشق نور الدین زنگی کی طرف سے آپ کے حضور جو کہ شاہی خاندان کے شہزادہ امیروں میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑے اور افضل ہیں، سلام پیش کرتا ہوں۔“

”گفتگو مختصر کی جائے۔“ والی موصل سیف الدین غازی نے الجھتے ہوئے کہا۔

”رشتے، ناٹے پٹانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ملک الصالح، سلطان دمشق کی اولاد ہے تو میر عماد الدین زنگی کا پوتا ہوں اور میرا بھی سلطنت دمشق پر اتنا ہی حق ہے جتنا کوئی سکتا ہے۔“

”امیر زیشان۔۔“ ناظم سفارت نے ادب سے کہا۔ ”ملک الصالح آپ کو اپنا بڑا اور سلطنت دمشق میں سب سے زیادہ طاقتور اور عظیم امیر تسلیم کرتے ہیں۔ ملک اللہ آپ سے کوئی اختلاف یا شکوہ نہیں بلکہ وہ تو آپ کی امداد کے خواہاں ہیں۔ انہیں اب کہ آپ اس پر آشوب زمانہ میں ان کی اعانت فرما کر برادر بزرگ کا حق ادا کریں گے۔“

ناظم سفارت نے بات سنبھال لی ورنہ غازی تو بہتے پر سے اکھڑ گیا تھا۔ کچھ دیر فکر کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”صلاح ہم سے کس قسم کی اعانت کا امیدوار ہے؟“

”اے والی موصل اور عزت و حرمت سلطنت دمشق، ناظم سفارت نے اسے کرنے کے لئے اور زیادہ خوشامدانه طرز اختیار کیا۔ ”اس وقت سلطنت دمشق پر غدار غاصب صلاح الدین نے جو وقت ڈال رکھا ہے اس سے صرف آپ ہی نپٹ سکتے ہیں۔“

دمشق پر قبضہ پھر حمص، حماہ اور۔ حلبک کی فتح۔ اس نے پورا شمالی شام دبا لیا ہے۔“

تو وہ خود کو الملک الصالح کا وفادار کہتا ہے لیکن انہیں حلب سے بھی نکالنے پر تیار ہوا۔

ملک الصالح کی وفادار شاہی فوجوں، وزیر، مشفقین کی عقلمندی اور حکمت عملی پر جوش

شیرکوہ کا جانشین بنے۔ جہاں تک امرائے نوریہ کی شجاعت اور تاج دمشق سے ان کا تعلق تھا تو وہ بہادر بھی تھے اور وفادار بھی اور وہ شیرکوہ کا جانشین ہونے کے اہل تھے لیکن دمشق سے ہزاروں میل دور ایک غیر ملک میں اور ایک غیر مزاج رکھنے والی حکومت میں رکھنے کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے دماغ اور سوچ بوجھ کی ضرورت اور یہی وجہ تھی فقیہ عیسائی ہکاری نے صلاح الدین کا نام وزارت کے لئے پیش کیا تھا۔

صلاح الدین اس وقت دوسرے امرا کے مقابلہ میں عمر کے لحاظ سے چھوٹا تھا لیکن دور آنور جنگی مہارت میں دوسرے امرا اس سے کمتر تھے۔

جانشین کے معاملہ میں امرائے نوریہ میں اختلاف پیدا ہوا تھا اور صلاح الدین کے وزیر اعظم ہونے کے اس اختلاف میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ بعض امرائے مصر چھوڑ کے دمشق واپس آگئے تھے۔ مصر سے واپس آنے والے امرا سلطان نور زنگی سے صلاح الدین کی برائیاں کرتے رہتے تھے۔ پھر سلطان نور الدین کا انتقال ہوا صلاح الدین دمشق واپس آیا تو دمشق اور اطراف میں صلاح الدین کے تمام مخالف امرا اس کی سخت مخالفت اور مزاحمت کی۔ سیف الدین غازی کے دربار میں بھی صلاح الدین کے مخالف امرا موجود تھے اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ سیف الدین اور صلاح الدین کی جنگ ہو اور وہ صلاح الدین سے میدان میں بدل لے سکیں۔

زنگی کا پورا نام عزیز الدین مسعود تھا اور یہ سیف الدین غازی کا بھائی تھا۔ سپہ عزیز الدین زنگی اور امیر موصل کا حکم پاتے ہی ایک بڑے لشکر کے ساتھ حلب کی روانہ ہوا۔ حلب کا شاہ ملک الصالح اور اس کا وزیر کششکین سخت پریشان تھے۔ انہوں نے پہلے کششکین کے شیخ الجبل کے ذریعہ امیر صلاح الدین کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی ٹک کی مگر ان کا منصوبہ بار آور نہ ہوا پھر انہوں نے کاؤنٹ آف طرابلس کے ذریعہ کا حاصرہ ختم کرانے کی تدبیر کی۔ اس میں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ امیر الدین کو کاؤنٹ آف طرابلس کے مقابلہ پر جانے کے لئے حلب کا حاصرہ ختم کرنا پڑا۔ امیر احرار سے جلدی فارغ ہو گیا بلکہ اسی یلغار میں اس نے حلب بھی فتح کر لیا جہاں ان کی زندگی کے پہلے نو سال گزرے تھے۔ اس طرح اب وہ دمشق کے شمال میں تمام شاہی فوجوں کے قبضہ ہو گیا اس کے جاسوسوں نے اس تک یہ خبریں پہنچا دی تھیں کہ حلب کے کاؤنٹ آف طرابلس کو ایک بھاری رقم دے کر امیر صلاح الدین کے ہاتھوں سے حاصرہ ختم کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

سیف الدین نے ایک جگہ نظریں روک کر کہا۔ ”زنگی دار۔“

زنگی دار اپنی جگہ سے اچھل کے ایک قدم آگے آیا۔ ”حکم ہو آقا محترم۔“

”کیا صلاح الدین میں جرات ہے کہ ہمارے لشکر کے سامنے آئے؟“ غازی زنگی دار سے استفسار کیا۔

”ہرگز نہیں آقا۔“ زنگی دار نے جواب دیا۔ ”صلاح الدین زنگی سلطان کے پر پلا ہوا محض ایک معمولی امیر ہے۔ اس کی رگوں میں زنگی خاندان کا ایک قطرہ بھی اگر مقابلہ پر آئے گا تو منہ کی کھائے گا۔ آپ کی عظمت تسلیم کرے گا تو فلاح پائے گا۔“

”صلاح الدین ہمارے بھائی ملک الصالح کو پریشان کر رہا ہے۔“ سیف الدین غازی تک زنگی دار سے مخاطب تھا۔ ”ملک الصالح نے اگرچہ ہم سے کوئی مشورہ نہیں کیا بلکہ امرا کے کہنے پر چلا رہا مگر اس کی رگوں میں ہماری طرح زنگی خون ہے۔ اس نے ہمیں دی ہے۔ ہم اسے مایوس نہیں کریں گے۔“

”یہ میرے آقا کی اعلیٰ طرفی ہے۔“ زنگی دار بولا۔ ”میرے لئے کیا حکم ہے آقا؟“

”لشکر لے کر حلب جاؤ اور ملک الصالح کے فوجیوں کو شامل کر کے صلاح الدین کی غدار کی سزا دو۔“ سیف الدین غازی نے فیصلہ کر دیا۔

دانی موصل کے اس فیصلے سے درباری، سپہدار اور امرا بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے برملا غازی کی تعریف کی۔ ”شہا۔“ ایک امیر بولا۔ ”ہماری تلواریں صلاح الدین غازی کی سزا دینے کے لئے نیاموں میں بے چین ہیں۔ آپ نے فیصلہ کر کے ہمارے جیت لئے۔“

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس وقت اسد الدین شیرکوہ اور الدین مصر بھیجے گئے تھے اس وقت مرحوم سلطان نور الدین زنگی نے امرائے نوریہ کی جماعت ان کے ساتھ کر دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر شیرکوہ یا صلاح الدین کو قدم اٹھائیں تو امرائے نوریہ ٹوکیں اور انہیں سیدھا راستہ دکھائیں۔ بظاہر تو یہی تھا لیکن درپردہ سلطان نے ان امرا کو اپنے خاص آدمیوں کی حیثیت سے لشکر کے ساتھ کیا تھا تاکہ وہ مصر میں ہونے والے واقعات کی تفصیل سلطان دمشق کو روانہ کرتے کرتے مصر جانے والے امرائے نوریہ سے بلاشبہ ہر معرکہ میں داد شجاعت دی اور شہر شامی لشکر کے شانہ بشانہ لڑ کر مصر پر قبضہ میں آسانیاں پیدا کیں لیکن جب اسد الدین جو اس وقت تک مصر کا وزیر اعظم بن گیا تھا کا انتقال ہوا اور اس کی جانشینی کا سوال تو امرائے نوریہ کا ہر امیر اپنے آپ کو قلمدان وزارت کا اہل سمجھتا تھا اور اس کی

صلاح الدین نے حلب پر حملہ کے لئے مصر سے ایک لشکر بھی طلب کر لیا تھا سے دمشق روانہ ہو چکا تھا۔ ادھر تو یہ انتظامات تھے اور ادھر حلب والے بغلیں ہمارے کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ موصل سے سیف الدین غازی نے ایک بڑا لشکر طرف بھیج دیا تھا تاکہ ملک الصالح اپنے اور موصل کے لشکر کی مدد سے امیر صلاح ایسی کاری ضرب لگائے کہ اسے دمشق چھوڑ کر مصر کی طرف بھاگنا پڑے حلب پر گھم کے چراغ جلائے جارہے تھے کیونکہ موصل کا لشکر شام میں سب سے زیادہ جاتا تھا۔

شاہ حلب ملک الصالح نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنے تمام سردار، امرا اور مسو کے ساتھ موصل سے آنے والے لشکر کا قلعہ سے باہر نکل کے استقبال کرے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ جگہ جگہ محرابیں بنائی جارہی تھیں غریبہ جشن جیسا سماں تھا۔ شاہ حلب نے اعلان سے زیادہ اہتمام کیا تھا اور جب موم عزیز الدین زلقندار کی سپہ سالاری میں حلب میں داخل ہوا تو قلعہ والوں نے واہ فرش راہ کر دیں۔ لشکر پر اس قدر پھول برسائے گئے کہ راستہ پھولوں سے لہلہا ملک الصالح نے عزیز الدین کو گلے لگایا اور وہیں کھڑے کھڑے پہلے والی موصل معلوم کی پھر لشکر بڑی شان سے قلعہ میں داخل ہوا۔

پھر جب دوسرے دن موصل اور حلب کے لشکر قلعہ کے میدان میں شاہ کے ملاحظہ کے لئے جمع ہوئے تو شاہ حلب کا سر فخر بلکہ غرور سے اکڑ گیا۔ بلاشبہ نہ صلاح الدین کے پاس تھا اور نہ وہ دمشق میں رہ کے اتنا عظیم لشکر اکٹھا کر سکتا الدین کے پاس اگرچہ بڑی آزمودہ کار فوج تھی۔ مصر سے بھی اسے فوجی کمک پھر بھی صلاح الدین پریشان ہو گیا تھا اور وہ اس متحدہ لشکر سے ٹکرانے کے لئے چاہتا تھا کیونکہ لڑائی کو کچھ اور دن ٹالے بغیر وہ پوری طرح تیار نہ ہو سکتا تھا۔

حلب میں موصل کے لشکر کو پہنچے ہوئے تین دن ہو چکے تھے اور طے یہ ہوا ایک دن آرام کے بعد حلب اور موصل کے لشکر صلاح الدین سے جنگ کے ہوں گے۔ صلاح الدین اس وقت صحابہ کے نواح میں فوجیں لئے پڑا تھا اور اسے پہنچنے کے لئے تدبیریں سوچ رہا تھا۔ پھر آخری دن جبکہ دوسری صبح متحدہ لشکر کو تھا۔ تو شاہ ملک الصالح کو اطلاع دی گئی کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے ایک رکنی سفارت آئی ہے یعنی اس سفارت کا واحد رکن عزیز الدین فرخ شاہ عجب اتفاق تھا کہ صلاح الدین کا سفیر بھی عزیز الدین تھا اور ملک الصالح کے

لاہ کام بھی عزیز الدین زلقندار تھا۔

ملک الصالح نے اپنے وزیر کشمکشین اور موصل کے سپہ سالار عزیز الدین زلقندار سے کہا کہ بعد امیر صلاح الدین کے سفیر کو طلب کیا۔ فرخ شاہ ایک درباری غلام کی معیت لے کر دربار میں پہنچا۔ کشمکشین اور زلقندار نے ملک الصالح کو سمجھا دیا تھا کہ وہ سفیر کو دیکھ کر اپنے شاہانہ وقار کو برقرار رکھے اور اپنی شان میں کسی قسم کی کمی نہ دے۔

فرخ شاہ نے دربار میں داخل ہو کر سامنے کی طرف دیکھا۔ تخت شاہی پر کسین شاہ ملک الصالح اپنے اوپر جاہ و جلال طاری کئے بیٹھا تھا۔ تخت کے ایک طرف وزیر کشمکشین اور دوسرے طرف سپہ سالار زلقندار ہاتھ باندھے اور نظریں نیچی کئے کھڑے تھے۔ فرخ شاہ نے رکو رکش پیش کی۔

”ہمارا نام؟“ ملک الصالح نے بڑے رعب سے دریافت کیا۔

”عزیز الدین۔“ فرخ شاہ کا اصل نام عزیز الدین تھا۔ چونکہ وہ سفارت کے فرائض پام دے رہا تھا اس لئے اس نے فرخ شاہ کے بجائے عزیز الدین نام بتایا۔

ملک الصالح اس نام پر چونکا اور اس کی نظریں میساختہ اپنے سپہ سالار عزیز الدین کی طرف اٹھ گئیں۔ عزیز الدین زلقندار کو بھی اس بات سے حیرت ہوئی تھی اور وہ گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ ملک الصالح اور زلقندار کی طرح وزیر کشمکشین بھی سفیر کی زبان عزیز الدین کا نام سن کر پریشان سا ہو گیا تھا۔

ملک الصالح نے وزیر اور سپہ سالار سے نظریں گھما کر سفیر کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں صلاح الدین نے سفارتی گفتگو کے لئے بھیجا ہے یا محض مذاق کے لئے؟“ ملک الصالح کے منہ سے یہی جملہ نکل رہا تھا۔

فرخ شاہ کو واقعی نہیں معلوم تھا کہ دربار میں اس وقت ایک اور عزیز الدین موجود ہے۔ اس لئے اسے شاہ حلب کے سخت لہجے پر تعجب سا ہوا۔ ”اے شاہ ملک الصالح جگر شرمندہ سلطان نور الدین زنگی میں محض ایک پیامبر یا سفیر کی حیثیت سے آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ مجھے کیا حق یا ضرورت ہے کہ شاہ حلب کی شان میں کسی قسم کی تانی کا قصور بھی کروں۔ آپ نے نام دریافت فرمایا اور میں نے عرض کر دیا۔“

”تم نے اپنے آپ کو عزیز الدین کیوں کہا۔ تمہیں اپنا نام بتانا چاہیے تھا۔؟“ ملک الصالح نے کہا۔ فرخ شاہ نے ہوا تھا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

فرخ شاہ پکرا گیا۔ ”میں اپنی کم فہمی کی وجہ سے شاہ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟“

”شاہ عالی مقام۔ حلب میں آپ کی موجودگی اور غیر موجودگی برابر ہے اس لئے کہ آپ کے بجائے آپ کے وزیر کا حکم چلتا ہے۔ میرے آقا چاہتے ہیں کہ شاہ معظم کی تعریف لائیں اور امیروں اور وزیروں سے بالاتر ہو کر حکومت فرمائیں۔“

”میرے ایک سفیر ہو۔“ کشمکشیں غصہ سے بھنا اٹھا۔ ”تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ امیروں اور وزیروں کی توہین کرو؟“

”امیر محترم نے درست فرمایا۔“ فرخ شاہ نے آنکھیں ملا کے کہا۔ ”میں صرف ایک رہوں مگر امیر محترم یہ بھول گئے کہ سفیر اپنے بھیجنے والے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ میں نے جو کہا وہ میرے آقا کا کہا ہوا ہے اور آگے بھی جو کچھ کہوں گا وہ میرے آقا امیر صلاح الدین کی زبان سے کہا ہوا سمجھا جائے۔“

کشمکشیں کو معقول اور سخت جواب ملا تھا۔ وہ صرف تملاکر رہ گیا۔

”ہم دمشق نہیں جانا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ امیر صلاح الدین دمشق چھوڑ دیں۔“

ملک الصالح کا لہجہ بہت نرم ہو گیا تھا۔

”اے شاہ فیضان۔۔۔ میرے آقا دمشق پر آپ کے نام پر حاکم ہیں۔ تمام مفتوحہ علاقے، مکہ آپ کے نام کا چلتا ہے۔ مساجد میں امام خطبہ میں آپ ہی کا نام لیتے ہیں۔ میرے نام کے نام کو کہیں پر استعمال نہیں کیا۔“ فرخ شاہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کے فرخ شاہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر شجاعت اور ذہانت کی سرخی میں نیلی بھی گھلی معلوم ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ جس سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا اس سے لگتا تھا جیسے وہ ایک مٹھا ہوا سیاستدان ہے۔

”ہوں۔۔۔“ ملک الصالح نے ایک لمبی سانس لی۔ ”اگر امیر صلاح الدین دمشق پر سے نام سے حکومت کر رہے ہیں تو انہوں نے تمہیں اور حماہ پر کیوں قبضہ کیا؟“

فرخ شاہ نے قدرے حیرانگی سے ملک الصالح کی طرف دیکھا لیکن جواب دینے کے لئے اس نے سر جھکا لیا جیسے وہ لاجواب ہو گیا ہو۔

”بولو۔ بولو سفیر۔۔۔ اب تم خاموش کیوں ہو گئے۔“ ملک الصالح بہت خوش ہو رہا تھا اس خیال سے کہ اس نے صلاح الدین کے سفیر کی زبان بند کر دی تھی۔ ”شاید اسے پاس اس کا کوئی جواب نہیں؟“

”شاہ معظم۔۔۔“ فرخ شاہ گھٹی آواز میں بولا جیسے اسے جواب دیتے تکلیف ہو رہی۔ ”اگر عالیجاہ کو حمص اور حماہ پر امیر صلاح الدین کے قبضہ پر اعتراض ہے تو دونوں نول اور شہروں کی چابیاں حضور کے قدموں میں ڈال دی جائیں گی۔“

اس وقت کشمکشیں نے دخل کیا۔ ”سفیر۔ کیا تمہارا نام صرف عزیز الدین ہے کے آگے پیچھے کچھ اور بھی ہے؟“

فرخ شاہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”میرا پورا نام عزیز الدین فرخ نورالدولہ شاہان شاہ ہے۔ میرے والد شاہان شاہ امیر صلاح الدین کے گھر بھائی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ عزیز الدین، صلاح الدین کا بھتیجا ہے۔“ اور کشمکشیں مزہ لگا۔

”یہ ایک حقیقت ہے امیر محترم۔۔۔“ فرخ شاہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

”سفیر۔۔۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس دربار میں ایک اور عزیز الدین موجود؟ اس کے ساتھ ہی کشمکشیں نے نظریں گھما کر عزیز الدین زلقندار کو دیکھا۔

فرخ شاہ کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ اس نے جواب دیا۔ ”دربار شاہ ملک الصالح آپ کے سوا صرف ایک امیر اور موجود ہیں“ اس کے ساتھ ہی اس نے زلقندار کی دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ دوسرے عزیز الدین یا آپ خود ہیں یا وہ دوسرے امیر ہیں۔“

عزیز الدین زلقندار نے فرخ شاہ کو گھور کر دیکھا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تمہارا نام عزیز الدین ہے جبکہ میں عزیز الدین زلقندار ہوں اور اس فوج کا سپہ سالار ہوں جو موصل اور میرے آقا سیف الدین غازی نے شاہ حلب ملک الصالح کی مدد کے لئے ہے۔“

زلقندار نے فرخ شاہ کو مرعوب کرنے کے لئے زبردستی اپنا تعارف کرایا تھا۔

ملک الصالح، صلاح الدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بے چین اس نے فرخ شاہ سے کہا۔ ”ہمیں بتایا جائے کہ امیر صلاح الدین ہم سے کیا چاہتے ہیں“

”شاہ۔۔۔“ فرخ شاہ نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”میرے آقا امیر صلاح الدین دمشق اور آپ کے وفادار ہیں۔ وہ آپ سے جنگ کے بجائے صلح کے خواہش مند ہیں۔ ملک الصالح نے تیوریوں پر بل ڈال کے کہا۔ ”اگر امیر صلاح الدین ہمارے وفادار تو انہوں نے دمشق پر قبضہ کیوں کیا؟“

”عالیجاہ۔۔۔“ فرخ شاہ نے ملک الصالح کا پورا دقار برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”دمشق پر قبضہ اس لئے ہو گیا کہ شاہ وہاں موجود نہ تھے اور دارالسلطنت اپنے بادشاہ خالی تھا۔“

”مگر حلب میں تو ہم موجود ہیں پھر امیر صلاح الدین نے اس کا محاصرہ کیا۔“

شاہ نے جرح کے انداز میں سوال کیا۔

اہل جنگ بھی حلب کی سلطنت کے سپرد کر دیا جائے گا۔“
 ”نیک ہے سفیر۔“ شاہ ملک الصالح صلح پر آمادہ ہو گیا۔ ”لیکن سفیر کے پاس اس
 کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم صلح کے معاہدے پر آمادہ ہو جائیں تو تمہیں صحتہ اور
 ہمارے حوالے کر دیئے جائیں گے۔“

”اے شاہ حلب۔ ہر سفیر اپنے آقا یا حاکم کا نمائندہ ہوتا ہے اور نمائندگی کرتے وقت
 بات طے کرتا ہے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن سفیر کی بات کا پاس کرنا اس کے آقا
 یا حاکم کا فرض بن جاتا ہے شاہ اطمینان فرمائیں میں نے بحیثیت امیر صلاح الدین کے
 لئے کے جن قلعہ جات کو سلطنت حلب کے حوالے کرنے کا اعلان کیا ہے اس پر
 بالضرور عمل ہو گا۔“
 ”نیک اس وقت وزیر کشمکشین نے جبکہ کے شاہ ملک الصالح سے سرگوشی کی۔ پتہ نہیں
 ی بات تھی جسے سن کر شاہ کا چہرہ اتر گیا۔“

شاہ نے بڑی بے دلی سے کہا۔ ”اچھا ہم تمہاری پیش کش کا کل جواب دیں گے۔“
 پھر شاہ نے اپنے مصاحب کو حکم دیا کہ امیر صلاح الدین کے سفیر عزیز الدین فرخ شاہ
 اسی ہمان خانہ میں رکھا جائے اور اس کی خاطر داری اور عزت میں کوئی کسر نہ اٹھا
 جائے۔ فرخ شاہ ملک الصالح کو سلام کر کے باہر آگیا۔

فرخ شاہ کے رخصت ہونے کے بعد حلب کے شاہی محل میں بڑی ہنگامی صورت حال
 ہو گئی۔ ملک الصالح چاہتا تھا کہ امیر صلاح الدین سے جنگ کرنے کے بجائے صلح کر لی
 مگر کشمکشین نے اسے صلح سے منع کیا تھا اور بات کل پر ٹالنے کی تاکید کی تھی۔
 ملک الصالح کو اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے غصے اور غم سے بھرے لہجے میں
 ”کاش یہ مصالحت آج ہی ہو جاتی اور آج رات ہم لوگ سکھ اور آرام کی نیند سو
 لیکن ہمارے وزیر نے شاید اس میں کچھ مصلحت دیکھی اور آج معاہدہ نہ ہونے
 دیا۔“

پھر سالار عزالدین زلقندار، شاہ ملک الصالح کا ہم خیال تھا۔ اس نے ترش لہجے میں
 ”میں نہیں سمجھ سکا کہ کل پر بات ٹالنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے جبکہ صلاح الدین
 غیر قلعہ محص، حمہ کے علاوہ۔ حلب بھی ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا تھا؟“
 ”اے حلب اور موصل کے لشکروں کے سپہ سالار۔“ سعد الدین بن کشمکشین نے سر بلند
 نہ ہوئے کہا۔ ”بے شک صلاح الدین کی طرف سے ہمیں بہترین پیش کش کی گئی ہے

کشمکشین اور عزیز الدین زلقندار نے چونکہ کے اس طرح فرخ شاہ کو دیکھا جیسے اپنے
 اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔ ملک الصالح خود بھی اس جواب کی توقع نہ کر رہا تھا۔ اس
 خیال تھا کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے اس کا سفیر محص اور حماہ پر قبضے کا بھی کوئی جو
 پیدا کرے گا۔

”سفیر۔۔۔“ ملک الصالح نے رک رک کے کہا۔ تم نے ابھی کیا جواب دیا۔ ایک
 پھر دہراؤ اسے؟۔“

”شاہ عالی مقام۔۔۔“ فرخ شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا جواب صاف
 اور واضح ہے کہ اگر شاہ محص اور حماہ پر امیر صلاح الدین کا قبضہ پسند نہیں فرماتے تو
 دونوں شہر اور قلعے سلطنت حلب کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔“

”ہوں۔۔۔“ ملک الصالح نے دوبارہ ہمکاری بھری اور کشمکشین اور زلقندار کو ام
 طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں کہ دیکھو میں نے اپنی باتوں کے ظلم میں صلاح الدین کے سزا
 کو اس طرح الجھا دیا ہے کہ وہ محص اور حماہ کے قلعے سلطنت حلب کے حوالے کرنے
 آمادہ ہو گیا۔ فرخ شاہ نے اک دم ایسی بات کہہ دی تھی کہ وزیر کشمکشین اور سپہ سالار
 عزیز الدین زلقندار الجھ کے رہ گئے تھے۔

شاہ ملک الصالح نے دیکھا کہ دونوں ذمہ دار ہمتیاں بالکل خاموش ہیں تو اس نے
 زلقندار سے دریافت کیا۔ ”کیا ہمارے سپہ سالار عزیز الدین زلقندار اس سلسلے میں کچھ کہ
 پسند فرمائیں گے؟“

”شاہ عالی شان۔۔۔“ زلقندار نے زبان کھولی۔ ”امیر صلاح الدین کے سفیر نے مرز
 محص اور حماہ کا ذکر کیا ہے جبکہ صلاح الدین نے قلعہ۔ حلب پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اس
 سلسلے میں سفیر کا کیا جواب ہے؟“

”سپہ سالار محترم۔۔۔“ فرخ شاہ نے متانت سے کہا۔ ”اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ
 میں سپہ سالار کے کسی سوال کا جواب دوں۔ اس لئے کہ سفیر صرف حاکم اعلیٰ سے گفتگو
 کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سپہ سالار جن کام میدان جنگ میں فوج کو لڑانا ہوتا ہے وہ
 سفارت کی ان باریک باتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ان دونوں باتوں کے باوجود چونکہ
 سپہ سالار کو شاہ حلب نے بولنے کی اجازت دی تھی اس لئے میں ان کے سوال کا بھی
 جواب دوں گا۔ سنئے سپہ سالار بہادر۔ میں نے محص اور حماہ کے قلعوں کی شاہ حلب کو
 پیش کش کی ہے۔ اب اگر سپہ سالار یہ ضروری سمجھتے ہیں میرے آقا امیر صلاح الدین
 قلعہ۔ حلب سے بھی ہاتھ اٹھالیں اور اسے شاہ کی نذر فرمائیں تو ایسا بھی ہو جائے گا۔ صلح

لیکن ہمیں پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ وہ کیا حالات اور واقعات ہیں جن سے مجبور ہو کر ملکہ الدین نے تین اہم قلعے ہمیں طشتری میں رکھ کے پیش کئے ہیں۔ کہیں یہ کوئی خواب یا دھوکہ تو نہیں۔“

”بے شک بے شک۔“ ملک الصالح بچوں کی طرح چیخا۔ ”ہمارا وزیر کس قدر حق پر ہے۔ ہم دھوکہ کھانا نہیں چاہتے۔ ہر بات پر پوری توجہ دینی چاہئے۔“

گمشدین کا سر غور سے کچھ اور بلند ہو گیا۔ ”ایک بات اور بھی ہے سپہ سالار زلقدار! زلقدار۔ امیر موصل سیف الدین غازی ہمارے حلیف اور کرم فرما ہیں۔ اگر ہم ان سے مشورہ کئے بغیر معاہدہ کرتے ہیں تو انہیں اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔“

امیر موصل کے نام پر عزیز الدین زلقدار بھی نرم پڑ گیا۔ ”وزیر حلب کی اس بات میں کافی وزن ہے امیر موصل کو اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔“

ملکہ الصالح نے ایک نیا نقطہ اٹھایا۔ ”امیر موصل سے مشورہ ضرور کرنا چاہئے لیکن کل تو ہمیں سفیر کو جواب دینا ہے۔ پھر یہ بھی خطرہ ہے کہ سفیر ہماری طرف سے مایوس ہو کر کہیں اپنی پیش کش واپس نہ لے لے۔“

”مجھے اسکی پیش کش کی پرواہ نہیں۔“ گمشدین نے زور دے کر کہا۔ ”جنگ کی تیاریاں بالکل مکمل ہیں اور یہ ہماری جنگی تیاریوں کا ہی فیض ہے کہ صلاح الدین نے گہرا کے صلح کی بات شروع کی ہے۔“

”تو کیا ہم کل اس سے کہہ دیں کہ ہم صلح نہیں کر سکتے اور میدان جنگ میں فیصلہ ہوگا؟“ ملک الصالح کے چہرے پر گہرا ہبٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

”صاف جواب دینے کی ضرورت نہیں ہم کوئی بہانہ بھی کر سکتے ہیں۔“ گمشدین نے اس انداز سے کہا جیسے وہ ملک الصالح کو ڈانٹ رہا ہو۔

سپہ سالار زلقدار کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ ”عالی جناب وزیر ہم جنگی لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جو ملتا ہے اس پر فوراً قبضہ کرو۔ اس کے بعد آگے کی سوچو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں تمس، حمہ اور حلب کو بغیر لڑے بھڑے مل رہا ہے اسے لے لیتا چاہئے پھر باقی کے لئے جنگ کرنا چاہئے کیوں عالی مقام وزیر آپ کا کیا خیال ہے؟“

گمشدین اپنے سپہ سالار سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھانری سے بولا۔ ”سپہ سالار زلقدار کی بات بہت معقول ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کل اس سفر سے تمس، حمہ، حلب کے ساتھ ساتھ دمشق کا مطالبہ بھی کریں۔ کیا عجیب ہے کہ صلاح الدین جنگ سے جان بچانا چاہتا ہو اور دمشق بھی ہمارے حوالے کر کے مصر واپس چلا

جائے۔“

ملکہ الصالح اور زلقدار دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر سپہ سالار بولا۔ ”عقلمند وزیر کی بات دل کو گنتی ہے جب امیر صلاح الدین تمس، حمہ اور حلب سے دستبردار ہو سکتا ہے تو پھر دمشق بھی چھوڑ دے گا ہمیں دمشق کا ضرور مطالبہ کرنا چاہئے۔“

آخر تھوڑی رد و کد کے بعد یہ طے پایا کہ دوسرے دن سفیر سے دمشق کا بھی مطالبہ لیا جائے۔ وہ اگر رضا مند ہوتا ہے تو معاہدہ کر لیا جائے ورنہ پھر جس کی لاشی اس کی بیٹیں۔ گمشدین نے ملک الصالح اور عزیز الدین زلقدار سے کہہ دیا کہ کل سفیر سے صرف وہ گفتگو کرے گا خود ہی جنگ یا صلح کا فیصلہ کرے گا۔

صبح کو امیر صلاح الدین کے سفیر کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا۔ دراصل گمشدین نام امراء اور سرداروں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ صلاح الدین جنگ سے گھبرا رہا ہے اور اس طرح عزت بچا کے مصر واپس جانا چاہتا ہے۔

گمشدین نے دربار میں فرخ شاہ سفیر صلاح الدین سے بڑے سخت لہجے میں سوال کیا۔ سفیر ہمیں کیا امید ہے کہ ہم تمہاری پیش کش قبول کر لیں گے؟“

”وزیر محترم۔“ فرخ شاہ نے اس کے تلخ لہجہ کی پرواہ نہ کی۔ ”حکومت کا وہی وزیر بے زیادہ عقلمند ہوتا ہے جو جنگ سے گریز کرے اور شاہی خزانہ کو رعایا کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔ اس وقت جنگ کرنے یا نہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔ جنگ نہ کرنے کی صورت میں سلطنت حلب کو دمشق کے شمال میں تمام شامی قلعہ اور شہر مفت مل جائیں گے۔ دوسری صورت جنگ کی ہے اور اس کا انجام صرف اوپر والا جانتا ہے اس کی پیش کش دینی سے کوئی پھر نہیں سکتا۔۔۔۔۔“

”سفیر زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔“ گمشدین نے سفیر کو روک دیا۔ ”ہمیں ظہم ہے کہ صلاح الدین ہمارے مشترکہ لشکر کے مقابلہ پر نہیں نکل سکتا۔ وہ اپنی عزت اٹا چاہتا ہے اسی لئے وہ جنگ سے بھاگ رہا ہے لیکن ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ اسے جنگ میں تھکائیں گے اور یہ بتائیں گے کہ تاج دمشق سے غداری کی کیا سزا ہوتی ہے۔“

فرخ شاہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں سمجھ نہیں سکا کہ وزیر محترم کیا کہتا ہے؟“

”سنو اور غور سے سنو کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ گمشدین غرایا۔ ”صلاح الدین کی ت عملی یہ ہے کہ شمالی شام کے علاقے سلطنت حلب کو دے کر وہ جنگ کرنے کی بجائے

آپ کے مطالبہ کو پورا کرنا میرے امکان میں نہیں۔ مجھے امیر نے جس قدر اختیارات دیئے تھے میں انہیں استعمال کر چکا ہوں۔ رہا دمشق کا مطالبہ تو اس کا فیصلہ امیر صلاح الدین ہی کر سکتے ہیں۔ میں اس ناکام گفتگو کے بعد واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

”تم جاسکتے ہو سفیر۔ ہمارا پیغام صلاح الدین تک پہنچا دینا۔ جواب دینا نہ دینا انکا کام ہے۔“

”مشتکین نے گفتگو کا خاتمہ کر دیا۔“

فرخ شاہ نے ملک الصالح کو سلام کیا پھر پیٹھ موڑ کے چلا۔ ملک الصالح کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا لیکن وہ مشتکین کے سامنے بے بس تھا۔ درباریوں نے تمام گفتگو غور سے سنی تھی اور بیشتر کا خیال تھا کہ مشتکین کو صلاح الدین کی پیش کش قبول کر لینا چاہئے تھی۔ فرخ شاہ دربار کے قائلین کے کوئے پر پہنچ کے رکا اور پلٹ کے بولا۔ ”اے حلب کے بادشاہ اور درباریو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امیر صلاح الدین شاہ سے جنگ نہیں چاہتے وہ اپنی پیش کش میں مخلص ہیں لیکن افسوس کہ ان کی پیش کش کو فوجی کمزوری سمجھا گیا۔ بہر حال آپ شاہد ہیں کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے جنگ روکنے کی پوری کوشش کی گئی لیکن جنگ ناگزیر معلوم ہوتی ہے اور اس کا انجام صرف خلاق عالم کے ہاتھ میں ہے۔“

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ امیر صلاح الدین ان دنوں حمہ کے نواح میں تھا۔ فرخ شاہ نے ادھر ہی کا رخ کیا اور لشکر گاہ میں پہنچ کے امیر کو اپنے سفارت کی تمام گفتگو سے آگاہ کیا۔ فرخ شاہ نے آخر میں یہ بھی بتایا کہ ملک الصالح تمس اور حمہ لینے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن مشتکین نے اسے سختی سے منع کیا اور خود دمشق کا مطالبہ پیش کر دیا۔

دراصل امیر صلاح الدین سے بے حد خائف تھا۔ اسے اس بات کا خطرہ رہتا تھا کہ اگر ملک الصالح اور صلاح الدین میں میل ہو گیا تو ملک الصالح جلد یا بعد میں امیر صلاح الدین کو شام کا وزیر اعظم بنادے گا اور اس صورت میں مشتکین کے اقتدار کا خاتمہ ہو جانا ضروری تھا۔

بہر حال وزیر مشتکین نے بظاہر اپنا اقتدار بچانے کی صورت پیدا کر لی تھی۔ اس لئے کہ صلاح الدین اور ملک الصالح کی صورت میں سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن پھر ان دونوں میں لڑائی یا میل جول کا کوئی امکان باقی نہ رہ جاتا تھا۔ مشتکین اس کوشش میں لگا تھا کہ صلاح الدین کو ہر قیمت پر ملک شام سے نکال دیا جائے تاکہ ہر وقت کا یہ دھڑکا بیٹھ کے لئے ختم ہو جائے۔

صلاح الدین نے فرخ شاہ کی تمام باتیں بڑی توجہ سے سنیں پھر اس نے کہا۔ ”موت و زندگی اور فتح و شکست تو رب کعبہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن مشتکین جو چاہتا ہے اسے میں نہ

چپ چاپ دمشق واپس چلا جائے اور ہم موصل اور حلب کے مشترکہ لشکر کو منتشر کر دیں پھر جب موصل کا لشکر واپس چلا جائے تو وہ حلب کو تنہا پا کر فوراً حملہ کر کے قبضہ کر لے لیکن ہم اس کی یہ تدبیر کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔“

فرخ شاہ چڑ گیا۔ ”وزیر محترم میں جنگی حکمت عملی کا درس لینے نہیں آیا ہوں۔ میں نے صلح کی پیش کش کی اور اس کے صلے میں تین قلعے آپ کو دینے کا وعدہ کیا۔ اگر آپ کو یہ پیش کش منظور نہیں تو مجھے صاف الفاظ میں جواب دے دیجئے۔“

”صاف جواب یہ ہے۔“ مشتکین نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔ ”اگر صلاح الدین جنگ نہیں چاہتا تو وہ دمشق بھی ہمارے حوالے کر دے ورنہ ہم دمشق کا قبضہ بزور شمشیر حاصل کر لیں گے۔ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو دمشق ہمارے حوالے کرتے ہو کہ نہیں؟“

”قابل احترام وزیر حلب۔“ فرخ شاہ کے لہجے میں بھی تلخی آگئی۔ ”میں اس دربار میں ایک سفیر کی حیثیت سے پیش ہوا ہوں اس لئے آپ کو میرے سامنے میرے آقا امیر صلاح الدین کی توہین نہیں کرنی چاہئے۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرے آقا صلاح الدین کا مرتبہ تمام امراء نوریہ اور تمام سرداران شام سے بلند و بالا ہے۔ امیر صلاح الدین کو جمانگیری اور جمانداری کا جتنا عظیم تجربہ حاصل ہے اس کی گرد تک بھی کوئی امیر پہنچ نہیں سکتا۔۔۔“

”رک جاؤ سفیر۔“ مشتکین نے اسے پھر روکا۔ ”اگر تم صلاح الدین کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے منہ سے اپنی اور دوسرے امراء کی تذلیل بھی برداشت نہیں کر سکتے فضول باتیں کرنے کی بجائے تم ہمارے سوال کا دو ٹوک جواب دو۔“

”کس سوال کا جواب وزیر محترم؟“ فرخ شاہ چڑ گیا تھا۔

”یہی کہ تمس حمہ اور حلب کی طرح امیر صلاح الدین دمشق بھی ہمارے حوالے کر سکتے ہیں کہ نہیں مشتکین نے بالکل واضح سوال کیا۔“

”وزیر محترم اگر میرے آقا دمشق بھی چھوڑ دیں تو پھر وہ کہاں رہیں گے اور کہاں جائیں گے؟ فرخ شاہ نے بھی ایک سوال کیا۔“

مشتکین اس سوال کے لئے پہلے ہی تیار تھا۔ ”صلاح الدین امیر سے آئے تھے اور انہیں مصر ہی واپس جانا چاہئے۔ ہم شام میں انہیں کیس دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہاں یہ ضرور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر صلاح الدین مصر واپس جانا چاہیں تو انہیں راستے میں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ ہم انہیں بحفاظت مصر پہنچانے کا بھی انتظام کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب پوری طرح سمجھ گیا ہوں وزیر محترم۔“ فرخ شاہ نے کہا۔ ”لیکن

صلاح الدین کے خلاف جنگ شروع کی تو پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے تحت صلاح الدین کے لشکر کا ایک حصہ بظاہر پسا ہو کر پیچھے کی طرف ہٹا۔ مشترکہ لشکر کے سپہ سالار زلقندار نے پسا ہوتے ہوئے دشمن پر اور زیادہ دباؤ بڑھادیا اور اسے دور تک دھکیلتے چلے گئے۔

صلاح الدین کا پسا ہوتا ہوا لشکر بظاہر شکست کھا رہا تھا لیکن اصل میں وہ ایک تنگ نالے کے گرد اپنے نئے مورچے سنبھالنے کی کوشش میں تھا۔ چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد ملب اور موصل کا لشکر گھاٹی کے ایک تنگ نالے میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت امیر صلاح الدین نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ نالے میں اترنے والے دشمن لشکر کو گھیر لے۔ اس طرح نالے میں گھرے ہوئے لشکر کو صلاح الدین کے فوجیوں نے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ وہ ماننا چاہتے تھے لیکن اس میں بھاگنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ ایک تو امیر صلاح الدین کا آزمودہ لکڑہری اس کی حکمت عملی کہ اس نے دشمن کو ایک تنگ نالے میں گھیر لیا۔ اس کا نپوہ ہوا کہ دشمن نے بری طرح شکست کھائی۔ صلاح الدین کے فوجیوں نے نہ صرف نہیں گھیر کے مارا بلکہ بھاگنے والوں کا حلب کے دروازے تک پیچھا کیا۔

اب کشمکش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے تمس، حماہ اور حلبک کے قلعے مفت لال رہے تھے لیکن اس نے کفران نعمت کیا اور اللہ کی اس کرم نوازی کو اپنے تکبر میں لکڑا دیا۔ حلب اور موصل کا لشکر منتشر ہو کر میدان سے بھاگا تھا۔ اس لئے وہ نصف کے برابر حلب واپس آسکا۔ باقی نصف لشکر یا تو میدان جنگ میں امیر صلاح الدین کے لشکر کے ہاتھوں مارا گیا یا پھر جس کا منہ جدھر اٹھا ادھر بھاگ نکلا۔ اس بھاگے ہوئے لشکر کا حلب نامی مشکل تھا کیونکہ امیر صلاح الدین کا لشکر بھاگنے والوں کا پیچھا کرتا ہوا حلب پہنچ گیا اور اس نے حلب کا سختی سے محاصرہ کر لیا تھا۔

حلب کے عوام نے ایک بار ملک الصالح کی مدد کر کے اسے امیر صلاح الدین سے بچالیا لیکن اب وہ مدد کے لئے تیار نہ تھے۔ انہیں کشمکش کے اقتدار سے بھی شکایت تھی اور وزیر موصوف ملک الصالح کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ روا رکھتا تھا۔ بات بات پر اسے ٹاؤر قتل کرنے کی دھمکی دیتا تھا۔ یہ کشمکش ہی تھا جس نے صلاح الدین سے جنگ کا ارادہ ملا تھا۔ صلاح الدین اور موصل کا سپہ سالار زلقندار دونوں ہی کشمکش کے خلاف تھے لیکن اب وہ خود محصور تھے۔ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ اس شکست کا یہ اثر ضرور کشمکش کا غرور خاک میں مل گیا اور اس نے ملک الصالح کی باتوں میں دلچسپی لینا روک دی۔

حلب کے محاصرے کے تیسرے دن زلقندار نے ملک الصالح کے سامنے ایک جائزہ

ہونے دوں گا۔ اگر میرا لشکر تباہ ہوا تو حلب و موصل کا مشترکہ بھی اس قابل نہ رہ جائے کہ پھر کسی لڑائی میں حصہ لے سکے۔ خدا کی قسم میرے فوجی دشمن کے ہر لشکر کو ایسا زہر پہنچائیں گے وہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ رہے گا۔

”امیر معظم“ فرخ شاہ نے کہا۔ ”موصل سے لشکر آجانے کی وجہ سے کشمکشیں ملک الصالح کا دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے اور وہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے فرخ شاہ۔“ صلاح الدین نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”کہ اگر کشمکشیں جگمگاتا ہے تو ہم کب پیچھے ہٹ رہے ہیں جاؤ اور لشکر کو تیاریوں کا حکم سناؤ۔“

فرخ شاہ اور اس کے دستے نے علاقہ کی طرف ادا کیا اور چند ہی لمحے میں پورے علاقہ کو معلوم ہو گیا کہ جنگ ہونے والی ہے۔ پس انہوں نے وہاں سے اپنے خیمے اور ڈیر اکھاڑے اور امیر صلاح الدین کے ساتھ قردن حماہ کی طرف چلے۔ صلاح الدین کو شاید ہو گیا تھا یا اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جنگ بہر صورت ہوگی اس لئے وہ چند دن پہلے دریا ارنٹ کی ایک گھاٹی کو منتخب کر آیا تھا۔ اپنے تمام لشکر کے ساتھ جس میں دمشق کے مشن اور مصری فوج کے شمشیرزن موجود تھے اس گھاٹی میں پہنچ گئے۔ صلاح الدین نے وہ خیمے لگوائے اور دشمن کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض مورخوں نے یہ لکھا ہے کہ صلاح الدین کا سفیر موصل کے والی سیف الدین غازی کے پاس صلح کا پیام لے کر پہنچا تھا سیف الدین غازی نے وزیر اعظم مصر کو حکم دیا تھا کہ وہ شام کے تمام علاقے چھوڑ واپس مصر چلا جائے لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ موصل کا لشکر حلب پہنچ چکا تھا اس لئے شاہ بجائے موصل کے حلب گیا تھا۔ ایک تاریخی غلطی کی درستی فرمائیے۔ کسی سچیلی جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ صلاح الدین پر شیش کے دو قاتلانہ حملے ہوئے لیکن دوسرے حقائق کوئی سند نہیں ملتی۔ دوسرے حملے کی سند اور مفصل حالات بھی مل گئے ہیں جس کا آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

حلب اور موصل کے لشکر کی مجموعی تعداد صلاح الدین کے لشکر کی اگر دو گنی نہ ڈیڑھ گنی ضرور تھی۔ شاید اسی طاقت کے بل بوتے پر کشمکش نے صلح کے بجائے جنگ راستہ اختیار کیا تھا۔ بس مشترکہ لشکر صلاح الدین کی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا اور اس سامنے صفیں درست کرنا شروع کر دیں۔ صلاح الدین نے چونکہ اس پورے علاقہ کا پہلے ہی کیا تھا اس لئے اس نے محل وقوع کے لحاظ سے اپنی فوجوں کی ترتیب بنائی تھی۔ جب 13 اپریل 1175ء کو حلب اور موصل کے مشترکہ لشکر نے طاقت کے زعم میں

میں۔۔۔۔۔“ گمشدین نے بڑی مشکل سے تھوک نکلا۔ ”شاہ کے حکم پر
نہ ہے لیکن امیر صلاح الدین میرے بہت خلاف ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے دیکھ کر

”نہیں شاہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ زلفندار نے بڑے عزم سے کہا۔ ”میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ صلاح الدین سے فوراً صلح کی گفتگو شروع کر دیجئے۔“

انہیں غصہ آجائے اور صلح کی بات چیت میں کوئی رخ نہ پڑ جائے۔“

”گھبراؤ نہیں کشمکشیں۔“ زلفقدار کا انداز طنزیہ تھا۔ ”صلاح الدین تمہیں کرائے گا وہ ایک بہادر سردار اور حاکم ہے۔ ایک سفیر کو قتل کرا کے وہ اپنی شہرت نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ بشرط یہ ہے۔ اسے کسی وقت غصہ بھی آسکتا ہے۔ اس لئے میں شاہ سے درخواست کرتا ہوں کہ تمہارے بجائے وہ اس کام کے لئے کسی اور ذہین شخص کو نامزد فرمائیں۔“

”ٹھیک ہے ہم کسی اور کو بھیج دیں گے۔“ شاہ ملک الصالح کو جیسے اپنی احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ بڑی شان اور بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا۔ سفارت بہت جلد جانا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ کل کسی کو بھیج کر گفتگو جائے؟“

موصل اور حلب کی متحدہ فوجوں نے اگرچہ میدان جنگ میں شکست کھائی تھی۔ شاہ ملک الصالح کے لئے فتح کا شاخسانہ بن گئی۔ وزیر کشمکشیں کا منحوس الصالح کے سر سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور شاہ نے سکھ اور اطمینان کا سانہرہ شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن ایک رکنی سفارت صلاح الدین کے پاس بھیج دیا۔ وہ قلعہ پر سفید پرچم لہرا دیا گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ قلعہ والے جنگ امن کے خواہش مند ہیں۔ امیر صلاح الدین کو اطلاع دی گئی کہ قلعہ کے برج پر اڑ رہا ہے۔ امیر صلاح الدین نے اپنے خیمے سے نکل کے سفید جھنڈے کو دلچسپی اڑ رہا تھا۔ اسی وقت قلعہ کا چھوٹا دروازہ کھلا۔ دروازے سے پہلے ایک شخص پھرا نکلا۔ وہ شخص گھوڑے پر سوار ہوا اور اس نے اپنے نیزے پر سفید کپڑا باندھ بات کی علامت تھی کہ امن کا سفیر گفتگو کے لئے آ رہا ہے۔ امیر صلاح الدین سرداروں کے ساتھ خیمے کی قطاروں سے آگے بڑھا اور اس نے خود آنے والے کیا۔

”اے امن کے پیامبر تمہارا آنا مبارک ہو۔“ امیر صلاح الدین نے اسے کہا۔

”امیر صلاح الدین کو دمشق کی حکومت مبارک ہو۔“ سفیر نے پہلے ہی جملہ الدین کو دمشق کا حاکم اور والی تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

امیر صلاح الدین کا چہرہ سپات تھا لیکن اس کے سردار ایک دوسرے کو آنکھوں میں مبارک باد دے رہے تھے۔ امیر صلاح الدین نے پہلے سفیر سے

برامیر صلاح الدین کے اس مشفقانہ رویہ سے بہت خوش ہوا۔ اسے امید بندھ بات چیت ضرور کامیاب ہوگی۔

ات چیت امیر صلاح الدین کے خیمے میں شروع ہوئی۔ صلاح الدین کے علاوہ ہی اس گفتگو میں شریک ہوئے۔ آغاز امیر صلاح الدین نے کیا۔ آقا زادے ملک الصالح کے مزاج کیسے ہیں؟“

۔۔ شاہ بخیریت ہیں اور آپ کو سلام بھیجا ہے۔“ سفیر نے خوشدلی سے کہا۔ میں سلامت رکھے۔ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ امیر صلاح الدین اس سے کہا۔

علم کی خواہش ہے کہ آپ حلب کا محاصرہ ختم کر کے دمشق واپس تشریف لے رہے وہ فرض ادا کیا جو اس کے سپرد کیا گیا تھا۔

ح الدین نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔ ”شاہ ملک الصالح نے کوئی شرط تو نہیں نہیں۔“ سفیر نے جواب دیا۔

کوئی خواہش نہیں سوائے اس کے آپ انہیں حلب کا حاکم اور بادشاہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔“ امیر صلاح الدین نے یہ کہہ کر امیر کی طرف غور سے دیکھا۔

آقا زادے اس کے صلہ میں مجھے کیا عنایت فرمائیں گے؟“ امیر صلاح الدین سے کہا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ جو بات طے ہونا ہے وہ اسی وقت اور اسی طے پا جائے۔

علم آپ کو دمشق کا والی تسلیم کرنے پر تیار ہیں۔“ سفیر نے صاف لفظوں میں الدین کی دمشق کی بادشاہت کرنے کا اعلان کیا۔

بات کی اور وضاحت چاہیے سفیر۔۔“ امیر صلاح الدین نے سنبھل کے کہا۔ اس حماۃ وغیرہ کے علاقے بزور شمشیر فتح کئے ہیں۔ ان کا قبضہ کسی دوسرے کو لے لیا۔ شاہ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

لب آپ کو دمشق کے علاوہ شام کے تمام شمالی مفتوحہ علاقوں کا حاکم تسلیم کرتے ہیں۔“ امیر صلاح الدین نے جواب دیا۔

لہذا الدین کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”تمہاری زبان خیر۔ میں الملک الصالح اسماعیل کو حلب کا بادشاہ تسلیم کرنے کا اعلان کرتا

سفیر نے بھی اعلان کیا۔ ”میں شاہ حلب کی طرف سے امیر صلاح الدین اور دمشق کے تمام شاہی علاقوں کا حاکم تسلیم کرتا ہوں۔“

”مبارک۔۔۔ مبارک۔۔۔“ یہ دو آوازیں ان سرداروں کی تھیں الدین کے خیے میں موجود تھے۔

امیر صلاح الدین نے اسی وقت محاصرہ اٹھانے کا اعلان کر دیا اور سفیر احترام سے رخصت کیا۔ صلاح الدین کی طرف سے ملک الصالح اسماعیل کی مذمت تحائف بھی بھیجے گئے۔ تحائف کے تھال کئی غلاموں کے سر پر رکھ کر انہیں کر دیا گیا۔ سفیر غلاموں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوا تو وہاں خوشی کے شادیاں لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ ناچ گانے کی محفلیں جم گئیں۔ جنگ ہوئے بادل ہٹ گئے تھے۔ پھیکے اور افسردہ چروں پر رونق آگئی تھی۔ قلعہ دایوآنے ہوئے جارہے تھے۔

قلعہ کے باہر امیر صلاح الدین کا لشکر خیمے ڈیرے اکھاڑ رہا تھا۔ سامان جانوروں پر بار کیا جا رہا تھا۔ لشکر بہت خوش تھے اس لئے نہیں کہ جنگ بلکہ اس لئے کہ امیر صلاح الدین دمشق کا حاکم یعنی بادشاہ بن گیا تھا۔ اس حماۃ، طلبک، کفرتاب، بارین اور مفرہ تک کا علاقہ آگیا تھا۔ صلاح الدین کے وقت شاہ حلب ملک الصالح نے بھی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے تمام اور عزیز الدین زلقندار کے ساتھ قلعہ سے نکل کے امیر صلاح الدین کے صلاح الدین نے اس کی پوری تعظیم کی۔ اس طرح دو دشمن دوست بن الدین کا لشکر حلب سے واپس ہو گیا۔

شام کی خانہ جنگی بظاہر ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ فرخ شاہ نے دمشق جا مانگی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ امیر صلاح الدین اب حماۃ جائے گا اور حماۃ رخ ہو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ فرخ شاہ کو دراصل ارمغانہ کی یاد ستا رہی تھی حد تک تو کہا جاسکتا تھا کہ اسے ارمغانہ سے انیت ہوئی جو اب محبت میں لیکن ارمغانہ کے بارے میں کچھ کتنا مشکل ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی دیتی تھی لیکن حالات نے اسے پس کے رکھ دیا تھا۔ اس کے شگفتہ اور شا اداسی چھائی رہتی تھی پھر جب فرخ شاہ نے اس سے مل کے بتایا کہ امیر اس کے باپ شمس الدین ابن مقدم کو معاف کر دیا ہے اور اسے انعام و طلب کیا ہے تو اس کے چہرے کی رونق ایک بار پھر لوٹ آئی تھی۔ فرخ شاہ

کی فحی کہ جب تک اس کا باپ اسے نہ ملے اس وقت وہ اپنی سیلی حارثہ کے گھر سے اور نہ جائے۔

اب اسے اجازت لے کر فرخ شاہ سیدھا دمشق پہنچا۔ وہ رات کے وقت دمشق پہنچا تھا پہلے ارمغانہ کے پاس جاتا پھر کسی اور سے ملتا۔ رات اسے قلعہ میں گورنر شاہ وہ پہلے ارمغانہ کے پاس گزرا بی بی۔ طفرگین نے اسے رات بھر سونے نہ دیا اور کرید کرید کے اسے حماۃ، طلبک اور حلب کے حالات دریافت کرتا رہا۔ فرخ شاہ لحاظ کے مارے کچھ نہ سکا اور اس کے سوالات کے خندہ پیشانی سے جواب دیتا رہا۔ اس طرح تین چوتھائی رات گزر گئی جب کہیں طفرگین نے اس کی جان چھوڑی۔ فرخ شاہ کا تکلیف و زحمت دھک رہا تھا۔ وہ ایسا گھوڑے بیچ کے سویا کہ اس وقت تک اس کی آنکھ نہ کھلی تک سورج کی کرنوں نے اسے سینے میں شراپور نہ کر دیا۔

وہ جلدی جلدی نمایا دھویا پھر فوجی بیرک میں گیا۔ فرخ شاہ جب دمشق میں مقیم تھا تو لایسی بیرک میں رہائش تھی اور اس کا مختصر سامان اب بھی وہیں رکھا تھا۔ اس نے تبدیل کیا پھر ارمغانہ کی طرف جانے کے لئے تیار ہوا۔ وہ بیرک سے نکلا تھا کہ گورنر ن کا خاص غلام اس کے پاس بھاگتا ہوا آیا۔

”امیر زادے آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پورا محل چھان مارا۔؟“ غلام مسلسل بارہا تھا۔

فرخ شاہ اس کی حالت دیکھ کر مسکرا دیا۔ ”اب تو معلوم ہو گیا کہ میں کہاں تھا“

”جی۔۔۔ وہ تو معلوم ہو گیا لیکن مجھے کیا پتہ تھا۔ جلدی تشریف لے چلے۔ گورنر بہادر کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اور غلام گھوم کر چلنے لگا۔

”دراغھو۔“ فرخ شاہ نے اسے روکا۔

غلام رک کر اس کے پاس واپس آگیا۔ فرخ شاہ بڑی الجھن میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے پاس گیا تو وہ دو تین گھنٹوں سے پہلے اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابھی وہ کوئی سوچا ہی نہ پایا تھا کہ غلام گھبرائے لہجے میں بولا۔

”امیر زادے۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ جلدی چلے ورنہ گورنر میری ملازمت ختم مانگے۔“

غلام نہیں جاؤں گا ان کے پاس۔“ فرخ شاہ نے جی کڑا کے صاف انکار کر دیا۔

غلام کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ ”جی آپ نہیں جائیں گے۔ مگر کیوں؟“

”اچھے والے کون ہوتے ہو۔ میں تمہارا یا گورنر کا نوکر نہیں ہوں۔“ فرخ شاہ

چڑھا ہو گیا تھا۔

”آپ غضب کرتے ہیں امیر زادے۔“ غلام نے گہرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
مجھ پر اور میرے بچوں پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ آپ ایسے تو نہیں تھے۔ میں
کہ آپ بہت رحمدل ہیں۔“
”جاؤ۔۔ گورنر سے کہہ دو کہ فرخ شاہ چلا گیا۔“ فرخ شاہ کو غصہ آگیا۔
بچوں کو سولی پر تو نہیں چڑھا دے گا۔“

”مگر امیر زادے۔ آپ یہاں موجود ہیں۔ پھر میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ آپ
ہیں۔“ ٹھیک ہے گورنر مجھے سولی پر نہیں چڑھائیں گے مگر ملازمت سے تو جوا
گے۔ اس سے اچھا ہوتا کہ وہ سولی پر چڑھا دیتے۔ غلام نے رک رک کے افرار
”پھر جھوٹ بولنے کی میری عادت بھی نہیں ہے۔ آپ اگر مجھ پر ترس کھا کر چند
لئے چلے چلیں تو میرے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔“

اب فرخ شاہ سے انکار نہ ہو سکا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلا ہوا
کمرے میں پہنچ گیا گورنر طفرگین کھانے کے کمرے میں تھا۔ وہ غلام کے ساتھ
گیا۔ گورنر کھانے کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ فرخ شاہ کو دیکھ کر تیزی سے اتر
برہا اور اس کا ایک بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”کمال کر دیا صاحبزادے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔“ گورنر نے اس کے
گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ”صبح سے ایک دانہ نہیں گیا منہ میں اور
نہیں کہاں گھومتے پھر رہے ہو؟“

”میں نے آپ کا دانہ پانی بند تو نہیں کیا محترم گورنر۔“ فرخ شاہ چڑ گیا
پہلے کپڑے تبدیل کرنے گیا تھا کہ آپ اور آپ کے غلام نے پورا محل سربراہ
”دیکھو فرخ۔۔“ طفرگین پیار سے بولا۔۔ ”تم امیر صلاح الدین کے بیٹے
بھی کچھ لگتے ہو پھر تمہارے بغیر میں دانہ منہ میں کیسے ڈال سکتا تھا۔ سمجھ گئے؟
”جی بالکل سمجھ گیا۔“ فرخ شاہ کو دیر ہو جانے کا خیال بار بار ستا رہا تھا۔
دوست سے ملاقات کرنی ہے۔ آپ مجھے جلدی چھوڑ دیں گے نا۔“

”لو جی۔ میں تمہیں چھوڑ کیسے دوں گا۔“ گورنر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
بھی کوئی ذمہ داری ہے۔ خدا نخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں امیر کو کیا جواب دوں
گورنر طفرگین ناشتے کے دوران فضول سی باتیں کرتا رہا۔ فرخ شاہ کو با
تھی اس لئے وہ بھی ہاں ہاں کرتا رہا پھر درمیان ہی میں کھڑے ہوتے کہا۔

دور زہاد۔ مجھے بھی امیر کو جواب دینا ہے اس لئے آپ مجھے جانے دیجئے۔“ فرخ
بونی کہہ دیا۔

بر کا نام سن کر طفرگین نے بھی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ”یہ بات تم نے مجھے پہلے
نہیں بتائی۔ جاؤ جاؤ۔۔۔ جلدی جاؤ۔ امیر تم سے منٹ منٹ کا حساب لیں گے۔“
فرخ شاہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور محل سے نکل کے دم میں دمشق کے
میں پہنچ گیا۔ بازار ابھی پوری طرح نہ کھلا تھا مگر بھیڑ بھاڑ ابھی سے شروع ہو گئی تھی۔
زار کے درمیان سے گلی حارثہ کے گھر کی طرف گھومتی تھی۔ وہ گلی میں داخل ہوا تو
دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پتہ نہیں ارمغانہ ملے گی کہ نہیں۔ کہیں حارثہ نے گھر
لیا ہو۔ فرخ شاہ کو طرح طرح کے دسوسے ستارہ تھے۔

خیالات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ حارثہ کے گھر سے چار گھر آگے نکل گیا۔ پھر
فوری خیال آیا کہ شاید وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اس نے کوئے یار کے ہر گھر کو ذہن
مالیا تھا مگر جس جگہ وہ پہنچا تھا وہاں کے گھر اور در دیوار اسے اجنبی لگ رہے تھے۔
اسے دور پر ایک دو منزلہ مکان دکھائی پڑا۔ وہ مکان حارثہ کے مکان کی خاص نشانی
اس سے تیسرا مکان حارثہ کا تھا جہاں ارمغانہ ٹھہری ہوئی تھی۔ فرخ شاہ واپس ہوا اور
دول میں حارثہ کے مکان پر پہنچ گیا۔

فرخ شاہ دروازے پر کھڑا تھا مگر اس کا دل تھا کہ جیسے سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ کہیں ایسا
جائے کہیں دیبا نہ ہو جائے۔ اس کا ہاتھ کسی صورت دروازے کی زنجیر تک نہیں پہنچ
ا۔ پھر قدرت نے اس کی خود مدد کی اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ فرخ شاہ نے چونک
نکھا۔ دروازے کے اندر حارثہ کھڑی تھی۔ وہ بھی حیران نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھ
تھی۔

”کیا آپ۔۔ آپ امیر زادے فرخ شاہ ہیں نا؟“ حارثہ نے بے یقینی کے انداز میں

”ہاں حارثہ۔ میں فرخ شاہ ہی ہوں۔۔۔ وہ۔۔۔“

فرخ شاہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ حارثہ اٹھ پیروں لوٹی اور پھر ”ارمغانہ۔۔ ارمغانہ“
اندر کی طرف بھاگی۔

فرخ شاہ کا دل ٹھہر گیا۔ ارمغانہ گھر میں موجود تھی۔

چند لمحوں بعد حارثہ ہنسی ہوئی واپس آئی۔

”شرف لائیے امیر زادے۔“ حارثہ نے اسے بے تکلفی سے اندر آنے کی دعوت

ہاں حارثہ مہنی تھی۔ اس وقت حارثہ اور ارمغانہ کمرے سے نکلیں۔
 ”ہاں۔۔۔ آپ اندر چلے جائیے۔ یہاں دھوپ آرہی ہے۔“ حارثہ نے باپ کے قریب
 جگہ کے کہا۔

بزرگ خالو گفتگو ادھوری چھوڑ کے کمرے میں چلے گئے۔
 حارثہ اور ارمغانہ، فرخ شاہ کے قریب کھڑی تھیں اور اس کا دل دھک دھک کر رہا
 تھا۔ دل تو ارمغانہ کا بھی قابو میں نہ تھا مگر وہ حیا پتلی سر جھکائے خاموش نیچی نظریں کے
 دئے تھی۔

”امیر زادے۔ کیا ارمغانہ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہے گا؟“ حارثہ نے چمک کے کہا۔
 ”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ مگر حارثہ یہ گھر تو تمہارا ہے۔“ فرخ شاہ بوکھلا
 لیا تھا۔

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ آپ کا دولت کدہ ہے۔“ حارثہ نے اسے اور بوکھلا
 لایا۔
 ”بیٹھ جاؤ ارمغانہ۔۔۔“ اور فرخ شاہ چارپائی سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

ارمغانہ چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گئی۔
 ”آپ بھی تشریف رکھیے امیر زادے۔۔۔“ حارثہ نے شوخی سے کہا اور ایک طرف
 لی۔

”تم کہاں جا رہی ہو حارثہ؟۔۔۔“ ارمغانہ گھبرا گئی۔
 ”گھبراؤ نہیں۔۔۔ امیر زادے کھا نہیں جائیں گے۔۔۔“ اور حارثہ ہنسی ہوئی چلی گئی۔
 فرخ نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔ ”تم گھبرا رہی ہو تو میں چلا جاؤں؟“
 ”نہیں نہیں۔۔۔ میں بالکل نہیں گھبراتی۔۔۔“ ارمغانہ نے بڑے حوصلے سے کہا۔
 ”کچھ امیرالمقدم کا پتہ چلا؟“ فرخ شاہ نے بات شروع کی۔
 ”جی وہ آئے تھے میرے پاس۔“ ارمغانہ نے بتایا۔

”اچھا۔۔۔ کب آئے تھے۔ کیا کہہ رہے تھے؟ فرخ شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”کئی بار آپکے ہیں۔“ ارمغانہ نے جواب دیا۔ ”انہیں اپنی معافی کا علم ہو گیا لیکن وہ
 میرے سامنے جاتے ڈرتے ہیں۔“

”ڈرتے کیوں ہیں۔ اعلان کے بعد تو انہیں بے خوف امیر کے سامنے پیش ہو جانا
 لایا ہے فرخ شاہ نے بڑے جوش سے کہا۔ ”میں انہیں اپنے ساتھ لے کے جاؤں گا۔ کہاں
 ہیں وہ؟“

دی۔

فرخ شاہ اس وقت تک پوری طرح حواسوں پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے قدم
 مکان کتنا بڑا تھا صرف دو کمرے یا کونٹھریاں۔ حارثہ کے والدین صحن میں بیٹھے تھے
 ”خالہ جان۔ خالو جان السلام علیکم۔۔۔“ امیر زادے فرخ نے انہیں جھٹ
 خالو بتا لیا حالانکہ پہلی ملاقات میں انہیں ”بزرگ محترم“ تک محدود رکھا تھا۔
 ”جیتے رہو بیٹے۔۔۔ بڑی بی نے دعا دی۔

”خدا عمر دراز کرے اور مرتبے بڑھائے۔“ خالو جان نے بھی دعا دی۔ ”ادھر آؤ
 پاس بیٹھو خالہ اٹھ کے کمرے میں چلی گئیں اور فرخ شاہ خالو کے سامنے چارپائی کے
 بیٹھ گیا۔ حارثہ بھاگ کے دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ فرخ شاہ نے اندازہ
 ارمغانہ بھی اسی کمرے میں ہے۔

خالو نے دسی گفتگو شروع کر دی۔ ”بہت دنوں بعد آئے امیر زادے۔ خیریت
 اس وقت کہاں سے آرہے ہو۔ شاید کسی دوسرے شہر گئے تھے۔ دمشق میں ہونے
 آتے۔“

بزرگ خالو نے ایک ساتھ بے شمار سوالات پوچھ ڈالے۔ فرخ شاہ گھبرا ہوا ان
 دیکھ رہا تھا۔ اسے خالو کا صرف آخری سوال یاد رہ گیا۔ اسی کا جواب فرخ شاہ نے دیا۔
 ”جی ہاں۔ میں دمشق میں نہیں تھا ورنہ ضرور آتا۔“ فرخ شاہ جواب دے کے
 ہو گیا۔

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اچھا اتنے دن رہے کہاں؟“ خالو پھر شروع ہوئے
 فرخ شاہ کو یاد آیا کہ خالو نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ”میں
 میں حمص، حماہ، حلب کے محاصرے میں مصروف رہا۔ پھر ایک بہت بڑا
 ہوئی۔ اس جنگ میں زندگی خاندان کی پوری فوج ایک طرف تھی اور میرے امیر ملار
 دوسری طرف تھے۔ یہ بڑی زبردست جنگ تھی لیکن ہمارے لشکر نے موصل اور
 لشکروں کو کاٹ کے رکھ دیا۔۔۔“

”اچھا۔۔۔“ خالو نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ”پھر تو امیر صلاح الدین کا پوری
 قبضہ ہو گیا ہوگا۔

”بس یہی سمجھئے آپ۔۔۔“ فرخ شاہ بات کو مختصر کرنا چاہتا تھا۔ ”اب ہمارے
 اور تمام شمالی شاہی علاقوں کے بادشاہ ہیں۔ وہ کسی کے ماتحت نہیں۔ ان کا کوئی آقا
 فرخ شاہ باتیں کر رہا تھا مگر اس کی نظریں بار بار اس کمرے کی طرف اٹھ رہی

والدین بھی کمرے سے نکل کر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ شمس الدین المقدم سر ہائے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ واقعی بہت مضطرب تھے۔ فرخ شاہ نے انہیں صرف ایک بار لکھا تھا اس حال میں دیکھ کے اسے افسوس ہوا۔ قسمت بگڑے تو سب کچھ بگڑ جاتا ہے۔ ارمغانہ بابا کہہ کر شمس الدین سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ریشہ کے والد نے انہیں سلام کیا۔ شمس الدین نے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرخ شاہ نے میں بڑے ادب سے سلام کیا۔

”میں امیر شمس الدین محمد ابن مقدم کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔“
شمس الدین المقدم نے سر اٹھا کر دھندلائی ہوئی نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھا۔ ”شاید آپ امیر زادے فرخ شاہ ہیں؟“

”جی۔ آپ نے درست فرمایا“ فرخ شاہ نے جواب دیا۔
”امیر صلاح الدین آپ کے چچا ہیں؟“ شمس الدین کی نحیف آواز میں ترشی آگئی تھی۔ اس ترشی کو سب ہی نے محسوس کیا۔ فرخ شاہ پریشان ہو گیا۔ ”جی ہاں“ سے آگے وہ نہ اور نہ کہہ سکا۔

”امیر نے آپ کو میری گرفتاری پر مامور کیا ہے؟“ شمس الدین ابن مقدم کے اس لال میں تلوار کی کٹ والا طنز پنہاں تھا۔

فرخ شاہ نے فوراً جواب دیا۔ ”جی ہاں یہ درست ہے لیکن۔۔۔۔۔“
”میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔“ شمس الدین ابن مقدم نے فرخ شاہ کو آگے نہ لے دیا۔

فرخ شاہ نے پھر وضاحت کرنا چاہی۔ ”وہ حکم پرانا تھا اور اب۔۔۔۔۔“
”آپ مجھے گرفتار کر سکتے ہیں۔“ المقدم نے دوبارہ قطع کلام کیا۔
فرخ شاہ پریشان ہو گیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے ارمغانہ کو دیکھا۔
”بابا۔۔۔۔۔“ ارمغانہ نے دخل دیا۔ ”آپ پرانا ذکر کیوں چھیڑتے ہیں۔ امیر معظم نے وہ افسوس کر کے نیا فرمان جاری کیا ہے۔“

”نئے حکم سے میرے گناہ تو نہیں دھل گئے۔ کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں میں نے روپوشی اور ان۔۔۔“ امیر شمس الدین المقدم نے پرانی باتیں شروع کر دیں۔ ”کبھی حلب میں تو لی موصول میں۔ آج شام میں ہوں تو کل مصر پہنچا۔ زندگی کے اس لاش کو کیسے گھسیٹا ہے مانتے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کسی دوست نے مجھے پناہ نہیں دی۔ جو میرا کھاتے تھے، انہیں دکھانے لگے۔ دوسروں سے کیا شکایت خود اپنا خون اپنے خلاف ہو گیا۔۔۔۔۔“

”وہ یہاں نہیں ٹھہرتے ہیں۔“ ارمغانہ نے غم آلود لہجے میں کہا۔ ”پتہ نہیں گھر بڑے ہوئے ہیں۔“ ارمغانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”گھر آؤ نہیں ارمغانہ۔۔۔۔۔“ فرخ شاہ نے تسلی دی۔ ”مصیبت کے دن تو فرخ ہیں۔ اب انہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ امیر انہیں کئی بار یاد کر چکے ہیں۔“
ارمغانہ کو کوئی اور بات سوجھ ہی نہ رہی تھی۔ فرخ شاہ نے بہت باتیں کہیں لیکن ارمغانہ کے سامنے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھ حارثہ آئی اس نے دونوں کو خاموش دیکھا تو بگڑ گئی۔

”چپ کا روزہ رکھا ہے کیا دونوں نے۔۔۔ امیر زادے آپ تو نے گھٹا کیا۔ پنا ہے۔ کچھ بولنے نا۔۔۔“

”میں تو بول رہا ہوں مگر ارمغانہ خاموش ہیں۔“ فرخ شاہ نے ساری بلا ارمغانہ دی۔

”میں کب خاموش ہوں۔ ہر بات کا جواب دیا ہے میں نے۔ یہ خود ہی خاموش تھے۔“ ارمغانہ نے اپنا دفاع کیا۔

”اچھا اب زبان کھلی ہے تو چلتی رہنا چاہیے۔ میں جارہی ہوں۔“ اور حارثہ ہو گئی۔

”بڑی شوخ ہے تمہاری سہیلی۔“ فرخ شاہ نے بات شروع کی۔
”جی ہاں۔۔۔ اس کی شوخ باتوں نے ہی مجھے زندہ رکھا ہے ورنہ میں تو غول۔ کب کی مرچکی ہوتی ارمغانہ نے بھی جواب دینے میں دیر نہ کی۔
”کاش امیر المقدم سے ملاقات ہو گئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“ فرخ شاہ۔ موضوع شروع کر دیا۔

”میں ان کے آنے کی دعا ہی کر سکتی ہوں۔“ ارمغانہ نے جواب دیا۔ ”بابا کہنے آدھا کر دیا ہے۔ ان کی صحت بہت گر گئی ہے۔“
ارمغانہ نے معلوم نہیں کتنے خلوص سے دعا کی تھی کہ اسی وقت دروازے ہوئی۔ حارثہ بھاگ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

”کون ہے؟“ حارثہ نے دروازے سے کان لگا دیئے۔
”حارثہ بیٹی۔۔۔ میں ہوں تمہارا چچا شمس الدین۔۔۔“ باہر سے آواز آئی۔
”چچا شمس الدین آگئے۔“ حارثہ نے وہیں سے آواز لگائی اور دروازہ کھول دیا۔ شمس الدین کی آواز سن کر فرخ شاہ اور ارمغانہ بھی دروازے کی طرف نہ

الدین المقدم میں اچانک جوانوں جیسی چستی آگئی۔ ”میں امیر کے سامنے ضرور جاؤں گا اور اگر امیر نے مجھے کچھ دیا تو پھر تم دیکھو گے کہ میں ارمغانہ اور حارث کی شادی کس دھوم دھام سے کرتا ہوں۔“

فرخ شاہ اور ارمغانہ آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ شمس الدین المقدم کیا کہہ رہے ہیں۔

”بابا۔ خدا کے لئے اس قصے کو نہ دہرائیے۔“ ارمغانہ چیخ پڑی۔ ”امیر زادے آپ کو لینے آئے ہیں امیر معظم صلاح الدین آپ کو کئی بار یاد کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔“

”اب کہاں جاؤں بیٹی۔ زندگی اس قدر بوڑھی ہو گئی ہے کہ اس کا بوجھ مجھ سے نہیں اٹھتا۔“ امیر شمس الدین المقدم کا لہجہ حد درجہ افسردہ اور مغموم ہو گیا تھا۔ وہ زندگی سے بیزار نظر آتے تھے۔

حارث کے بزرگ باپ جو اب تک بالکل خاموش تھے۔ انہوں نے المقدم کی باتیں سنیں تو جیسے انہیں اس بدھاپے میں جلال آگیا۔ کڑک کے بولے۔

”امیر شمس الدین۔ آپ کیا دیوانوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ صدمات انسان کا دل بوڑھا کر دیتے ہیں مگر یہ غبار صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک تقدیر پلٹا نہیں کھاتی۔ آپ نے جو کچھ بویا وہی کاٹا مگر اب اس کا ذکر بیکار ہے۔ حکومتوں اور اقتدار کے لئے تو یہ قول مشہور ہے کہ ”تخت یا تختہ“ آپ کو تخت نہ ملا مگر قدرت نے آپ کو تختہ سے بھی بچالیا۔ اب امیر صلاح الدین نے آپ کو معاف کیا ہے اور دربار میں طلب کیا ہے۔ جائیے اور دیکھیے کہ پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔“

”تو تمہاری بھی یہی رائے ہے کہ دربار میں چلا جاؤں؟“ شمس الدین المقدم کو ذرا حوصلہ ہوا۔

”ضرور جائیے امیر شمس الدین المقدم۔“ حارث کے والد نے کہا۔ ”آپ نے تو دنیا ہی چھوڑ دی تھی ورنہ اگر آپ امیر صلاح الدین کے قدم بقدم جدوجہد پر غور کرتے تو اس نتیجے پر ضرور پہنچتے کہ آج کا یہ امیر کل کیا بن جائے گا۔ اس کا اندازہ کرنا ہی مشکل ہے آپ کو نہ صرف اپنے لئے زندہ رہتا ہے بلکہ ابھی بیٹی ارمغانہ کے فرض سے بھی فارغ ہوا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ شمس الدین نے پہلی بار تائید کی۔ ”لوگ دوسروں کے لئے بھی تو زندہ رہتے ہیں۔ میں اگر ارمغانہ کے لئے زندہ رہوں تو کوئی عجیب بات تو نہ ہوگی۔ رہا ارمغانہ کے فرض کی ادائیگی کا سوال تو اس کا حل میں نے پہلے ہی نکال لیا ہے۔“

”کیا کیا۔“ حارث کے باپ چونک کے بولے۔ ”آپ نے ارمغانہ کا رشتہ کہیں لے کر لیا ہے۔؟“

”صرف ارمغانہ کا نہیں۔ میں تو حارث کے لئے بھی لڑکا پسند کر لیا ہے۔“ پھر شمس

الح الدین دونوں کے نام مضروب تھے۔ اب جو نیا سکہ ڈھل کے آیا اس پر :-
 "الملك الناصر يوسف بن ايوب" لکھا گیا تھا۔ خیال رہے کہ صلاح الدین
 سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے زیادہ مشہور ہوا لیکن اس کا اصل نام
 صلاح الدین یوسف تھا۔ "الناصر" اس کا لقب تھا ناصر کے معنی مددگار یا مدد کے
 لئے تیار رہنے والا ہیں اور اس کا یہ لقب اس کی زندگی کی تمام جدوجہد اور
 باہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ صلاح الدین اسلام کی مدد کے لئے ہر وقت مستعد
 تھا بلکہ اس کی زندگی کے آخری تقریباً بیس سال تو خالص صلیبی جنگوں میں
 رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین الملك الناصر يوسف بن ايوب

1157ء کا سال صلاح الدین کے لئے اور زیادہ کامیابی اور شادمانی لایا
 13 اپریل کو حلب اور موصل کے مشترکہ لشکر نے صلاح الدین پر حملہ کیا۔
 صلاح الدین نے دریائے ارت کی گھاٹی میں قرونِ حماہ پر مورچے لگائے تھے۔
 مشترکہ لشکر کی کمان عزیز الدین زلقندار کے ہاتھ تھی جو شاہ موصل سیف غازی کا
 بھائی تھا۔ یہ لشکر اپنی تعداد میں امیر صلاح الدین کے لشکر سے تعداد میں ڈیڑھا
 تھا لیکن اس لشکر میں دمشق اور قاہرہ سے آئے ہوئے تجربہ کار اور جنگ آزمودہ
 سپاہی تھے جس نے تعداد کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔
 صلاح الدین نے اپنی جنگی حکمت عملی سے متحدہ لشکر کو ایک تنگ نالے میں
 بری طرح گھیر لیا پھر اس کے تجربہ کار لشکر نے متحدہ دشمن کے سپاہیوں کو گلا
 کے رکھ دیا۔ صلاح الدین نے مفرور فوج کا حلب تک تعقب کیا پھر شاہ طم
 ملک الصالح کے مشیر صلح پر مجبور ہو گئے اور طے یہ پایا کہ جو علاقہ جس کے پاس
 ہے وہ اس کے قبضہ میں رہے گا۔

اس معاہدہ نے صلاح الدین کو ملک الصالح کی اطاعت اور فرمانبرداری -
 آزاد کر دیا تھا۔ صلاح الدین نے حماہ واپس پہنچ کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا
 اس کے ساتھ ہی مصر اور شام کے مقبوضہ علاقوں میں الملك الصالح کے نام
 خطبہ بند کر دیا گیا۔ صلاح الدین نے مصری نکال کو حکم بھیجا کہ اب مشترکہ
 کے بجائے صرف اس کے نام کے سکہ ڈھلوائے جائیں۔ صلاح الدین نے دمشق
 پر قبضہ کے بعد مصری نکال سے دو سکہ ڈھلوائے تھے ان پر ملک الصالح

اس عرصہ میں صلاح الدین جو اب امیر صلاح الدین سے بادشاہ دمشق ہو گیا
 اسے اپنے بھتیجے عزیز الدین فرخ شاہ کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ فرخ
 اس سے اجازت لے کر دمشق گیا ہوا تھا۔ وہ امیر شمس الدین المقدم اور
 کی بیٹی ارمغانہ کو دمشق لانے کی تیاری کر رہا تھا کہ صلاح الدین نے اسے
 رز دمشق طغیانی کے ذریعہ فوراً حماہ پہنچنے کا حکم دیا۔ فرخ شاہ نے دل کا
 لہ تو درمیان ہی میں چھوڑا اور شاہ دمشق کا حکم پاتے ہی حماہ جانے کے لئے
 رہ گیا۔

"ارمغانہ میں جلد ہی واپس آ کے تم دونوں کو دمشق لے جاؤں گا۔" فرخ
 نے اسے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ امیر ابن مقدم دمشق جانے میں کچھ تکلیف
 سون کر رہے ہیں۔" "میرا بھی یہی خیال ہے" ارمغانہ نے جواب دیا۔ "کاش
 کچھ دن اور ٹھہر سکتے۔"

فرخ نے کہا۔ "شاید اس میں خدا کی مصلحت ہو۔ میں تو ان کی ہچکچاہٹ کی
 نہیں سمجھ سکا۔ ممکن ہے کہ تمہیں کچھ بتائیں۔ بہر حال تم انہیں تیار کرنے
 کی کوشش کرتی رہنا۔"

حارث نے آکر ایک اور خبر سنائی۔ "مجھے تو چچا امیر کی مرضی کچھ اور ہی
 م ہوئی ہے" فرخ اور ارمغانہ چونک پڑے۔

"کچھ تو بتاؤ۔" ارمغانہ زیادہ پریشان نظر آرہی تھی۔

"یہ باتیں کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ امیر زاوے فرخ شاہ کا احسان
 لے لیا چاہتے" حارث نے آہستہ سے کہا کیونکہ امیر شمس الدین المقدم اور
 کے والد سنان کی کوٹھری میں گفتگو کر رہے تھے اور فرخ باہر جاتے جاتے

”جہیں شادی کی اجازت نہ دیں گے تم شادی نہیں کرو گی۔“
 ”بالکل یہی بات ہے۔ اس میں الجھن کیا ہے؟“ ارمغانہ نے سوالیہ انداز
 کیا۔
 ”جہنم یہ ہے کہ اگر تمہیں تمہاری مرضی کی شادی کی اجازت نہیں دی
 تو کیا تم عمر بھر کنواری بیٹھی رہو گی؟“

”ہاں بھی ایسا ہی ہو گا۔“ ارمغانہ نے صاف الفاظ میں کہا۔ ”اس سے پہلے
 نے مجھے دانیال کے ساتھ تعاون کرنے کو کہا تھا تو میں نے بڑے جبر کے
 ان کی بات مانی تھی لیکن جب انہوں نے کہا کہ دانیال کی کامیابی کی
 ت میں وہ میری شادی دانیال سے کروں گے تو میں نے ان سے صاف الفاظ
 یہی کہا تھا کہ میری شادی - میری شادی ہے اور وہ میری مرضی سے ہو گی۔
 حارثہ اور ارمغانہ کے باپ کمرے سے آگن میں آگئے تھے فرخ نے اب
 فخرنا مناسب نہ سمجھا اور ارمغانہ پر ایک ایسی نگاہ ڈالی جس میں سینکڑوں
 ان کے ساتھ ایک دلی دلی التجا کی آمیزش بھی تھی۔

تقریباً چار ماہ پر صلاح الدین نے موصل اور حلب کی متحدہ فوجوں کو شکست دی
 شاید اسی وجہ سے انہوں نے حماد کو اب اپنا عارضی مرکز بنالیا تھا وہ گھوم
 لڑھکے آجاتے۔ فرخ سیدھا ان کے پاس حماد پہنچا۔ صلاح الدین کچھ جلدی
 تھے انہوں نے حکم دیا۔

”تمہیں آج ہی بغداد جانا ہے۔ باقی ہدایات فقیہ عیسیٰ سے حاصل کرو“ یہ
 دے کر صلاح الدین اپنے نائب سے پھر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔
 فرخ خاموشی سے خیمہ کے باہر آگیا پھر وہ فقیہ عیسیٰ ہکاری کے خیمہ پر
 مگر فقیہ عیسیٰ نے خیمہ بدل لیا تھا۔ ایک لٹکری کے ساتھ وہ ان کے نئے
 پر گیا وہاں معلوم ہوا کہ فقیہ عیسیٰ شاہ دمشق صلاح الدین کے خیمہ پر گئے
 تھے۔ فرخ کو اک دم خیال آیا کہ اس نے فقیہ عیسیٰ کو صلاح الدین کے
 محل دیکھا تھا۔ اسے اپنی بدحواسی پر افسوس ہوا۔
 فرخ داخل ہونے والا تھا کہ سامنے سے فقیہ عیسیٰ آتے دکھائی دیئے۔ فرخ
 سے کھڑا ہو گیا۔

”میرے ساتھ آئیے امیر زاوے“ فقیہ عیسیٰ نے قریب پہنچ کے کہا۔
 فرخ ان کے پیچھے خیمے میں داخل ہوا۔

رک کر ارمغانہ سے گفتگو کرنے لگا تھا۔

”میں ان پر کیا احسان کر رہا ہوں“ فرخ شاہ نے جیسے خود سے سوال کیا۔
 حارثہ نے ذرا تفصیل سے بتایا۔ ”چچا المقدم کا خیال ہے کہ آپ ان
 احسان کر کے ارمغانہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ انہوں نے ارمغانہ کے
 کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔“

فرخ اور ارمغانہ کو پہلے ہی شبہ تھا امیر المقدم نے کچھ دن پہلے کہا تھا
 میں حارثہ اور ارمغانہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کروں گا۔ اسی وقت
 دونوں چونک اٹھے تھے اور اب حارثہ نے صاف الفاظ میں ان کے شک کو یقین
 بدل دیا تھا۔

”مگر میں تو ان پر کوئی احسان نہیں کر رہا تھا“ فرخ شاہ نے بے بسی
 کہا۔ ”مجھے پہلے امیر المقدم کی گرفتاری پر معمور کیا تھا اور اب میرے سپرد یہ
 ہے کہ انہیں شاہ دمشق کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ اپنی خدمات کا صلہ
 کر سکیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ارمغانہ؟“

”میرا خیال کس بارے میں؟“ ارمغانہ پریشان ہو گئی۔
 ”یہی کہ میں نے ان پر پہلے نہ احسان کیا ہے اور نہ اب احسان
 ہوں۔“ فرخ نے وضاحت کی۔
 ”بہر حال احسان تو آپ کا ہے ہم پر اس سے تو آپ انکار نہیں کر
 ارمغانہ نے جواب دیا۔

”رہا میری شادی کا مسئلہ تو اس کی میں ذمہ دار ہوں۔ اس میں اب
 کسی کے حکم کو تسلیم نہیں کروں گی۔“
 ”یعنی اگر تمہارے والد کہیں اور شادی کرنا چاہیں تو تم انکار کرو گی۔“
 نے فوراً سوال کیا۔

”اس کا جواب میں اس وقت نہیں دے سکتی۔“ ارمغانہ نے مستقل
 سے جواب دیا۔ مگر یہ بات طے ہے کہ میری شادی۔ میری شادی ہے اور
 میری مرضی سے ہو گی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میں بابا کی مرضی کے بغیر
 نہیں کروں گی۔“

حارثہ نے سر جھٹک کے کہا۔ ”عجب بات ہے ایک طرف تم کہتی
 شادی اپنی مرضی سے کرو گی اور دوسری طرف یہ شرط ہے کہ جب تک تمہارا

خالد بن ولید نے ”انبار“ پر دریائے دجلہ کے کنارے جیسے استادہ کئے تھے۔
نے چند لشکریوں کے ساتھ اس منڈی کے موقعہ پر حملہ کیا تھا اور مال

ہمارے دیا۔ مامون رشید کی ملکہ بولان قصر حسنی میں رہتی تھی۔
 سولہویں خلیفہ المعتضد کے عہد میں خلافت مشرقی بغداد میں منتقل ہوئی اور

بغداد کی جانی کے بعد عباسی خلافت 1262ء میں از سر نو قاہرہ (مصر) میں ہوا اگرچہ یہ خلافت برائے نام ہی تھی پھر اس کے اٹھارہ خلیفہ برسرِ اقتدار رہے۔ خلافت 1518ء تک قائم رہی۔ اس طرح یہ مدت خلافت دو سو چھپن تھی ہے۔ مصر کی عباسی خلافت کا پہلا خلیفہ مستنصر باللہ اور آخری خلیفہ علی اللہ جاہل تھا۔

یہاں بغداد کے مشہور محلات کا حال نمٹا لکھا گیا ہے ورنہ دور عباسی کی بڑی سے قطع نظر اگر صرف بغداد، اس کے مختلف محلوں، بازاروں اور بازاروں کا تفصیلی حال لکھا جائے تو اس کے لئے ایک پوری کتاب کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب بعنوان ”بغداد“ مرتبہ خواجہ محمد عبداللہ بی اے امرتسری موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس کی پوری تفصیل ہو سکتی ہے۔

یہ میسری ہکاری نے امیر زادے فرخ کو خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے تیار کرنے میں یہ بھی بتایا کہ خلیفہ بغداد اب برائے نام خلیفہ ہیں مگر ان کے ہاتھ پہلے ہی جیسے ہیں۔ وہی لوٹڈی غلاموں اور خواجہ سراؤں کی فوج اور وہی نکلت کی چمک دکھ۔

رفیقہ میسری نے رازداری سے بتایا۔ ”دیکھیے امیر زادے۔ خلیفہ بغداد کو ل اور ضعیف العقیدہ لوگ بت کی طرح پوچھتے ہیں اور اس کے آستانہ پر رتے ہیں مگر خبردار رہے کہ آپ شاہ ملک شہنشاہ دمشق صلاح الدین یوسف اب کی نیابت کر رہے ہیں اس لئے نہ کسی بدعت کا شکار ہونے کی ن ہے اور نہ حاجب یا کسی عباسی وزیر کے رعب میں آئیے گا۔ ہمارے دیواری مرتبہ خلیفہ سے بہت بڑا ہے مگر خلیفہ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ ہمیں ان کا احترام لازم ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔“

امیر زادہ فرخ نے فقیہ عیسیٰ کے اطمینان کے لئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کیجئے تیرے میں نے اگرچہ شاہوں کے دربار نہیں دیکھے اور ان کے آداب سے ہوں لیکن بچپن میں ایک بار میں شاہ صلاح الدین کے ساتھ سلطان نور زنگی کے دربار میں گیا تھا۔ اس طرح میں نے اس دربار کی شان و شوکت رعب داب کا صرف ایک نظارہ دیکھا تھا۔ مجھے امید ہے کہ خلیفہ بغداد کا

خلیفہ نے عین قصر تعمیر کرائے جن کے نام قصر ثریا، قصر فردوس اور قصر آراٹھارویں خلیفہ المتقدر نے قصر اثیر اور دو چھوٹے قصر تعمیر کئے تیسریں خلیفہ ابوالقاسم المنجین ابن مقتدر نے قصر معزالدولہ، قصر طائر مشن اور قصر مرجع تعمیر کرائے

اٹھائیسویں خلیفہ ابوالیاس المستنصر باللہ ابن مقتدی نے 427ھ 1075ء میں قصر رحمانین تعمیر کرایا۔ اسی قصر میں امیر زادہ فرخ، خلیفہ کے سامنے پیش ہوا تھا۔

اس کے بعد کوئی اور نیا قصر تعمیر نہیں ہوا سوائے ایک پرانے قصر 1170ھ (529ھ) میں دجلہ کی طغیانی کی وجہ سے منہدم ہو گیا تھا جسے مستنصر نے از سر نو تعمیر کرایا۔

اگرچہ صلاح الدین ایوبی کا سلطنت عباسیہ سے براہ راست کوئی تعلق لیکن ایوبی خاندان نے عباسی خلافت کے دوران ہی ترقی حاصل کی پھر جب خاندان میں سلطانی کا پروانہ بھی عباسی خلیفہ کے دربار ہی سے جاری ہوا تھا لئے خلافت عباسیہ کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہر قاری پسند کریں گے۔

پہلی بات تو یہ کہ عباسی خلافت کا آغاز 130ھ مطابق 747ء میں اس کا پہلا خلیفہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد تھا مگر وہ اپنی سفاکی اور ظلم کے سے ”سفاک“ کے نام سے مشہور ہوا۔

دوسری بات یہ کہ اس خلافت نے بڑا عروج پایا۔ اسی خلافت کے خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید تھے لیکن نظام فطرت ہے کہ ہر کمال رانا اس لئے جب اس خلافت نے جاہ حق سے انحراف کیا اور لولوب میں ہوئی تو ان کا زوال ہوا اور 655ھ مطابق 1258ء میں بغداد کی اس خلافت کا خاتمہ منگول سردار ہلاکو خاں کے ہاتھوں ہوا۔ اس وقت عباسی شہنشاہ باللہ تحت خلافت عباسیہ بغداد پر متمکن تھا جو اپنے وزیر ابن مازش کی وجہ سے منگول سردار ہلاکو خاں کے سامنے پیش ہوا اور اس کے ہلاک کر دیا گیا۔

خلافت عباسیہ 747ء سے 1258ء تک قائم رہی تھی یہ درست پانچ سو گیارہ سال ہوتی ہے۔

امراء کو گرفتار کر لیا جائے مگر وزیر سلطنت ابو جعفر ملدی کی قسمت خراب
خلیفہ مسجد اچانک بیمار ہو گیا اور بیمار بھی اتنا کہ بستر سے لگ گیا اس سے
امراء کی گرفتاری کا معاملہ کٹھالی میں پڑ گیا۔

اور علاؤ الدین اور قطب الدین کو اطلاع مل گئی کہ خلیفہ نے وزیر سلطنت
نر کو ان کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ ان دونوں نے خلیفہ کے قتل کی سازش
اور اس سازش میں خلیفہ کا طبیب بھی شامل ہو گیا۔ سازش کے تحت شاہی
خلیفہ کے پاس حاضر ہوا۔ خلیفہ چلے پھرنے کے بھی قائل نہ تھا مگر طبیب
اسے غسل کا مشورہ دیا۔ خلیفہ بستر سے اتر بھی نہیں سکتا تھا لیکن طبیب
الدین اور قطب الدین کی مدد سے خلیفہ کو حمام میں لے گیا اور دونوں
انہیں اس حمام میں بند کر دیا جہاں وہ دم گھٹ جانے کی وجہ سے مر گیا۔

خلیفہ کے مرتے ہی دونوں امیر خلیفہ مسجد کے بیٹے الحسن کے پاس پہنچے۔
انہیں دیکھ کے گھبرا گیا۔ کیونکہ وہ دونوں خلافت کے ستون سمجھے جاتے
مگر انہوں نے گفتگو شروع کی تو ان کا انداز بڑا دوستانہ تھا۔

مغذوالدولہ نے مستنی کو ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ الحسن آپ ولی
ہیں پھر خلیفہ کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ وزیر سلطنت ابو جعفر معقول آدمی
اس لئے اسے برخاست کر دیا جائے۔

”الحسن نے سسے لہجے میں کہا۔“ معزز امیر۔ میں تو ولی عہد بھی نہیں ہوں پھر
پاکیے توقع کر سکتے ہیں کہ خلیفہ معظم میری بات مان لیں گے؟“
”نہیں الحسن آپ ولی عہد ہیں۔ ہم آپ کو ولی عہد سمجھتے ہیں اور جسے ہم
عہد سمجھتے ہیں وہی خلیفہ ہوگا۔“ علاؤ الدین نے امیر زادے سے کہا۔

الحسن بڑا ذہین تھا وہ سمجھ گیا کہ ان دونوں کی مخالفت منہجی ثابت ہوگی اس
نے طے کر لیا کہ وہ ان کسی بات کی مخالفت نہیں کرے گا۔

”پھر الحسن نے کیا سوچا۔؟“ یہ سوال قطب الدین قانماز نے کیا جس کا لہجہ
نکت تھا کہ الحسن مستنی گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

”الحسن نے لرزتے ہوئے کہا۔“ آپ دونوں جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں
یہ۔“

”ہم چاہتے ہیں کہ آپ علاؤ الدین کو ابو جعفر کی جگہ وزیر مقرر کریں اور
یعنی قطب الدین قانماز کو سپہ سالار کے عہدے پر فائز کر دیں۔“ یہ کہتے

دربار دمشق کے دربار سے زیادہ بڑا نہ ہوگا۔“

”اس کا اندازہ تو آپ کو بغداد جا کے ہی ہوگا۔“ فقیہ عیسیٰ نے جواب
”مگر یہ ضرور ہے کہ بغداد وہ جگہ ہے جس کے دیکھنے کی ہر شخص کے
آرزو ہوتی ہے۔“

”کیا آپ کا بھی بغداد جانے کو دل چاہتا ہے۔“

”کیوں نہیں امیر زادے فقیہ عیسیٰ بولے۔“ امیر زادے آپ خوش
ہیں کہ مدینہ السلام تشریف لئے جا رہے ہیں۔ باسلامت رومی و باز آئی
سے جائے اور سلامتی سے واپس آئیے۔“

امیر زادے فرخ کو خلیفہ بغداد کے نام خط اور سامان کی ایک فہرست
تھی یہ سامان جو خلیفہ بغداد کو نذرانہ کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ ایک
قیمت جواہرات کا ہار۔ ایک زمرد کی تیج اور ایک کلام پاک رکھ کے پڑے
لئے ریل تھی۔ سونے کی بنی تھی اور اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے
سامان ایک صندوقچی میں رکھا تھا جسے مذہبیت کے کادار غلاف میں لپیٹا
خلیفہ بغداد کو اگرچہ ہیرے جواہرات کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لئے بغداد
خزانے میں منوں کے وزن سے ہیرے جواہرات بھرے تھے پھر بھی ہر بار
خلیفہ سے اپنے لئے بادشاہت کا پروانہ حاصل کرتا وہ نذرانہ کے طور پر
کچھ چیزیں بھیجا کرتا تھا۔

فقیہ عیسیٰ ہکاری نے امیر زادہ فرخ کو اپنے ساتھ پچاس سوار لے جا
اجازت دی تھی لیکن امیر زادہ اپنے ساتھ صرف دس سوار لے کر غلام
ہوا۔

بغداد میں مستنی بابر اللہ عباسی کا دور خلافت تھا۔ یہ خلیفہ بیعت کا
اور بڑا انصاف پسند تھا لیکن جن حالات میں اسے خلافت ملی تھی اس کا
دردناک ہے۔ بات یہ ہوئی کہ مستنی کا والد مسجد کے زمانہ میں ابو جعفر
ملدی وزیر سلطنت تھی۔ مسجد اس کی بڑی قدر کرتا تھا لیکن دربار خلافت
دو امیر علاؤ الدین اور قطب الدین وزیر کے سخت خلاف تھے اور اسے راضی
ہانا چاہتے تھے۔

وزیر سلطنت ابو جعفر ملدی کو دونوں امراء کی سازش کا علم ہو گیا۔ ان
خلیفہ مسجد سے دونوں امیروں کی شکایت کی۔ خلیفہ نے وزیر سلطنت کو حکم

ہوئے قاناز کا ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ گیا۔
 ”بالکل۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ جو آپ چاہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گا
 ”قاناز کا ہاتھ شمشیر پر دیکھ کر الحسن کو پسینے چھوٹ رہے تھے۔
 ”ہوگا نہیں بلکہ آپ ابھی اعلان کیجئے۔“ قطب الدین کی تلوار نصف
 زیادہ نیام سے باہر آگئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں میں نے اعلان کر دیا۔“ الحسن کا گلا خشک ہونے لگا۔
 ”اس طرح نہیں۔“ قطب الدین قاناز نے الحسن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا
 یوں کہے کہ میں ابو محمد حسن بن مستبد اعلان کرتا ہوں کہ امیر علاؤ الدین
 میرے وزیر اور امیر قطب الدین قاناز پہ سالار کے عہدے پر فائز کے
 ہیں۔“

الحسن گھبرا گیا۔
 ”مگر دیکھیے نا۔۔۔“ اس نے ہٹکاتے ہوئے کہا۔ ”میرے اعلان کرنے سے
 ہوگا جب کہ۔۔۔“
 ”سب کچھ ہوگا۔۔۔“ اور قاناز کی تلوار نیام سے نکل کے بلند ہو گئی۔

الحسن نے فوراً اعلان کیا۔
 محمد ابو محمد حسن امیر علاؤ الدین کو وزیر اور امیر قطب الدین قاناز کو پہ
 سالار مقرر کیا۔
 بس اب آپ اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیے۔ قاناز نے حکم دیا۔
 ابو محمد حسن نے سبز زہ انسان کی طرح ہاتھ آگے کر دیا۔
 ”میں ابو محمد حسن بن مستبد کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتا ہوں۔“ پہلا
 قطب الدین قاناز نے بیعت کی۔

اس کے بعد علاؤ الدین نے بیعت کر کے ابو محمد حسن کی خلافت کی تصدیق
 کر دی۔

ابو محمد حسن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ منہ کھولے کھڑا تھا اور کبھی علاؤ الدین
 اور قطب الدین کی طرف نہ دیکھتا تھا۔

”دربار میں تشریف لے ملتے امیر المومنین۔ خلیفہ مستبد کا انتقال ہو چکا ہے۔
 دوسرے امراء آپکے دربار میں بیعت کے لئے حاضر ہیں۔“ علاؤ الدین نے مسکراتے
 ہوئے کہا۔

محمد حسن کی سمجھ میں یہ معنی اب آیا۔ پہلے دونوں امیروں نے اپنا اپنا عہدہ
 پر ابو محمد حسن کو بغداد کا خلیفہ بنا دیا۔ ابو محمد حسن، مستنسی بامر اللہ کے
 خلیفہ ہوا۔ یہ عباسی خلافت کا تیسواں خلیفہ تھا۔ یہ واقعہ ۵۶۲ ہجری کا

جس وقت امیرزادہ فرخ بغداد میں داخل ہوا تو ابو محمد حسن المستنسی خلیفہ
 خلافت کی باگ دوڑ امیر علاؤ الدین اور امیر قطب الدین قاناز کے ہاتھ
 جو بالترتیب خلیفہ کے وزیر اور پہ سالار بن چکے تھے۔ ان دونوں امیروں
 پہلے وزیر ابو جعفر بن ملدی سے پر خاش تھی اس لئے انہوں نے ابو جعفر
 کے بمانہ قصر ریحان میں بلا کر قتل کر دیا تھا اور لاش دجلہ میں پھینکوا

زادہ فرخ کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ بغداد، دمشق ہی جیسا شہر ہوگا۔
 اور خوبصورت شہر کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ بغداد دریائے دجلہ کے
 ف آباد تھا۔ امیر زادہ فرخ اپنے سواروں کے ساتھ فسیل شہر میں داخل
 ق و چونکہ محافظوں میں سے ایک سوار اس کے قریب آیا۔ امیر زادہ
 آگے تھا۔ اس لئے سوار نے اسے مخاطب کیا۔

بہ المنصور اور شہروں کے سرتاج بغداد میں آپ کا آنا مبارک ہو۔ میں
 سلین امیر المومنین ابو محمد حسن مستنسی بامر اللہ کی طرف سے آپ کو خوش
 نا ہوں۔

علم و ادب، دولت و ثروت کے گہوارہ اور تہذیب و تمدن کے مرکز کے
 لی کو سلام پیش کرتا ہوں۔“

نے پہلے جیسے مذہب انداز میں سوال کیا۔

ف فسیل شہر کے صدر دروازہ کا ایک ادنی خادم ہوں اور میرے فرائض
 اٹل ہے کہ مسافروں اور خصوصاً آپ جیسے صاحب علم غیر ملکوں کے
 نام کا انتظام کروں اور دفتری اندراج کے لئے یہ دریافت کروں کہ معزز
 اس سے تشریف لائے ہیں اور اگر ناگوار نہ ہو اور وہ بتانا بھی پسند کریں
 ہوں کہ ان کے اس شہر میں قدم رنجہ فرمانے کا کیا مقصد ہے۔“

زادہ نے جواب دیا۔
 چ مجھے سوائے شاہی محل کے عمال یا حرم خلافت کے قابل احترام

صاحب کے کسی اور کو اپنی شناخت کرانے کا حکم نہیں لیکن یہ محسوس ہوئے کہ مجھ سے سوال کرنے والا سلطنت اور خلافت کا ایک ذمہ دار رکھ اس لئے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔

”بسم اللہ -- محترم مہمان۔“ سوار نے بات آگے بڑھائی۔

امیر زادے عزیز الدین نے کہنا شروع کیا۔

”میرا خیال ہے کہ دولت بغداد کے معزز رکن دمشق اور ملک شام ضرور واقف ہوں گے۔ میں اس ملک اور اس شہر سے آ رہا ہوں۔ مجھے ملک اور ملک مصر کے بادشاہ اعلیٰ حضرت صلاح الدین ایوبی نے حکم دیا ہے کہ بغداد پہنچ کر امیر المومنین کے حضور اپنے شاہ کی طرف سے نذر عقیدت کروں۔“

”سبحان اللہ زہے نصیب۔“ یہ کہتے ہوئے سوار گھوڑے سے اتر کر قدر ہوا اور اس نے امیر زادہ فرخ کو فوجی سلام پیش کیا۔ پھر بولا۔

”اے عالی مقام مہمان۔ میں بڑے ادب سے اپنی گستاخی کی معافی چاہتا کہ میں نے آپ کو اپنے سوالات کے جواب دینے کی زحمت دی۔ میری جرات نہیں کہ آپ سے کسی قسم کی گفتگو یا سوال و جواب کروں۔ براہ کرا اجازت دیجئے کہ میں آپ کی اس مقام تک رہنمائی کروں جہاں تشریف آپ کا مقصد ہے۔“

”اے تمیز دار محافظ۔ ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے اگر تم امیر المومنین پہنچنے میں ہماری رہنمائی کرو گے۔“

امیر زادہ فرخ کی بات ختم ہوتے ہی محافظ سوار اپنے گھوڑے پر سوار مہمانوں کے آگے آگے چلے لگا۔

بغداد کیا عجب شہر تھا۔ نہایت خوشنما، صاف ستھرا، فصیل شہر کے اندر سری خندق تھی جو شفاف پانی سے بھری تھی۔ اس خندق پر جگہ جگہ بڑے بڑے تھے۔ ان میں رے اور زنجیریں لگی تھیں اور جب ضرورت ہوتی تھی پل کو خندق سے الگ کر دیا جاتا۔ خندق کے دوسری جانب ایک فصیل تھی جو پہلے ہی جیسی مضبوط اور اونچی تھی۔ اس فصیل کے بڑے سے یہ لوگ اندر داخل ہوتے۔ وہاں بے شمار خوبصورت اور عالیشان عمارتوں جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں۔ درمیان میں باغات تھے۔ ان باغات

در پھولدار درخت تھے جن کی ہریالی دیکھ کر آنکھوں میں تراوت آجاتی تھی۔ یہ لوگ اس عظیم الشان محل کے پاس پہنچے تو امیر زادہ فرخ کو گمان ہوا کہ یہ قلعہ بغداد کا محل ہے۔ اس نے سوار سے دریافت کیا۔

اے برادر۔ کیا ہم منزل مقصود سے قریب ہیں؟

قدرے مسکرایا بولا۔

محل فرمائیے اور بغداد کی سیر کرتے چلئے۔

امیر زادہ پر بغداد کا پہلے ہی رعب پڑ چکا تھا۔ اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وقت کا محل واقعی بہت بڑا ہوگا۔ محل کی قطاروں سے گزر کر وہ ایک میں پہنچے۔ اس میدان کے چاروں طرف دکانیں تھیں۔ دکانوں کی ترتیب عجیب تھی اگر پارچہ جات کی دکانیں شروع ہوتیں تو ان کے درمیان کوئی اور نہ آتی۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ ختم ہوتا اور دوسری سامان کی دکانوں کا شروع ہو جاتا۔ میدان کے درمیان میں ایک باغ تھا۔ محافظ سوار نے بتایا کہ باغ میں ایک باغ وحش (چڑیا خانہ) ہے جس میں پرندوں کے علاوہ ملک کے جانور اور درندے موجود ہیں۔

امیر زادے نے سوال کرنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور شاید محافظ سردار نے یہ داری از خود اختیار کر لی تھی۔ وہ جب کسی چیز کی وضاحت محسوس کرتا تو خود رنے لگتا۔ اس طرح وہ آگے بڑھتے رہے اور محافظ انہیں بغداد کی عجیب و غریب چیزوں کی تفصیل جاتا رہا۔ وہ سب اب تک تین فیصلیں پار کر چکے تھے جس سے ہر فصیل قلعہ کی فصیل سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فیصلوں کے درمیان بڑے عالیشان محلات کی قطاریں تھیں۔ بعض محل تو اس قدر خوبصورت تھے کہ ان پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ امیر زادہ اور اس کے ساتھ آنے والے یہ کہتے تھے کہ جب یہ محلات باہر سے اس قدر خوبصورت ہیں تو ان کی آرائش کا کیا حال ہوگا۔

ان کے گھوڑوں کی رفتار کم تھی مگر ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی وہ اب غرظافت پر نہیں پہنچ سکے۔ پھر جب وہ ایک فصیل کے قریب پہنچے تو محافظ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

معزز مہمان۔ ہم حرم تک آ پہنچے ہیں۔

امیر زادے فرخ نے گھبرا کے سامنے کی طرف دیکھا مگر اسے سوائے فصیل

کے کچھ اور دکھائی نہ دیا اس نے دریافت کیا۔

”شاید ہم حرم خلافت کے قریب پہنچ گئے ہیں؟“

”جی نہیں معزز مہمان۔“ محافظ نے جواب دیا۔ ”ہم حرم خلافت سے اڑ دوڑ ہیں لیکن اس فیصل نما دیوار کا نام بھی ”حرم“ ہے۔ ہم بغداد والے سر اس فیصل یا دیوار کو کہتے ہیں جو خلفاء عباسی کے محلات اور مقبروں کا احاطہ کرتی ہے۔ آپ ابھی دیکھیں گے کہ حرم کے اندر صرف محلات اور مقابر نہیں بلکہ وہاں ایک پورا شہر آباد ہے اور یہ شہر ہی اصل میں بغداد کا دل ہے اس حرم یا فیصل میں ایک بہت عظیم دروازہ تھا شاید اس وجہ سے اس اندر شاہی محلات تھے۔ اس دروازے سے گزر کر جب یہ لوگ اندر پہنچے تو زادہ فرخ کا یہ خیال درست نکلا حرم کے اندر ایک سے ایک خوبصورت اور شان محل تھا۔ ہر محل کے سامنے یا تو میدان تھا یا ایک بڑا باغ تھا۔

محل سب سے پہلے تعمیر ہوا اس کا نام قصر جعفری تھا۔ اس کی بنیاد پانچویں خلیفہ ہارون رشید مجددی کے زمانہ میں رکھی گئی۔ الف لیلٰی کی تمام کہانیاں خلیفہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ پھر تو یہاں ہر خلیفہ نے قصر بنانے شروع کر دیے مگر یہ محلات عام طور سے خشت خام سے تیار کئے جاتے تھے اور یہ مٹی اسی صدی بعد عام طور پر اس مٹیل میں مل جاتی تھی جس سے یہ اینٹیں بنائی تھیں۔

محافظ کے اس عالی شان قصر کی سیڑھیوں کے پاس گھوڑا روکا۔ وہاں چائے چوبند باوردی سوار اور پیادے پہرہ دے رہے تھے۔ امیر زادہ فرخ نے اطمینان سانس لیا کہ چلو قصر ختم ہوا اور وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

احتیاط کے طور پر امیر زادہ نے اپنے راہبر سے دریافت کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم قصر خلافت کے بہت قریب ہیں؟“

راہبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ یقیناً قصر خلافت کے قریب ہیں۔“

امیر المومنین خلیفہ سے اب بھی آپ بہت دور ہیں۔“

”کتنا وقت لگ جاتا ہے خلیفہ سے ملاقات میں؟“ امیر زادہ اور پریشان ہو کر پوچھا۔

”ایک ہفتہ۔۔۔ ایک ہفتہ یا پھر ایک سال۔“ راہبر نے جواب دیا۔

عرصے کے گزر جانے کے باوجود میں کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے دوبار خلافت میں طلب کیا جائے گا۔“

کہہ کر محل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

امیر زادے نے اسے آواز دے کر روکا۔ ”تم کب واپس آؤ گے۔ کب تک ارا انتظار کریں؟“

”آپ یہیں ٹھہریے میں ابھی واپس آتا ہوں۔“ اور وہ بھاگ بھاگ کے یاں طے کرنے لگا۔

امیر زادہ فرخ کو وہاں کھڑا ہونا بہت شاق گزر رہا تھا۔ ہر راگیر انہیں لفظوں سے گھورتا ہوا نکلتا تھا۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ محافظ سردار ہی واپس آکر بولا۔ ”آپ میرے ساتھ ملے میرا کام یہیں تک تھا آگے آپ دوسرے لوگ لے جائیں گے۔“

”مگر ہمارے گھوڑوں کا کیا بنے گا؟“ امیر زادہ فرخ نے پوچھا۔

راہبر نے پیچھے گھوم کے دیکھا۔ اس کی پشت پر ایک درجن سے زیادہ غلام باندھے کھڑے تھے۔

راہبر بولا۔ ”گھوڑے یہ سنبھالیں گے آپ لوگ بے فکر ہو کے میرے ساتھ جائیں۔“

امیر زادہ فرخ اور اس کے ساتھی سوار محافظ رہبر کے ساتھ چلنے لگے۔ ابھی ارمیاں چڑھ کے اوپر ہی پہنچے تھے ایک شخص بھاگتا ہوا محافظ رہبر کے پاس

آئے پھولی سانسوں میں کہا۔ ”جلدی چلو۔ دمشق کے سفیر کی طلبی ہو گئی

ہاں ہاں۔ میں نے اندر اطلاع دی تھی شاہ مصر و شام کا سفیر آیا ہے۔ پہنچے ہی اندر سے غلام خاص آگیا۔ سفیر کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

محافظ نے امیر زادے فرخ کی طرف دیکھا۔ ”مبارک ہو۔ آپ کی فوراً طلبی درجہ میاں تو لوگ مہینوں پڑے انتظار کرتے رہتے ہیں۔“

”ان میں سفیر کون ہے۔“ آنے والے نے امیر زادے کی طرف دیکھ کے سے سوال کیا۔

”میں سفیر ہیں۔“ اور محافظ نے امیر زادہ کا ہاتھ پکڑ کر اس آدمی کے ہاتھ

پکڑ لیا۔ ”اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ میں بری الذمہ ہوں۔“

”لیک ہے تم جاسکتے ہو۔“ اس نے محافظ کو رخصت کر دیا۔

انے اس سے الٹا سوال کر دیا وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے جواب دیا۔
 ”یہ عالی شان محل، لمبی لمبی راہداریاں، بڑے بڑے دالان، باغ، سب
 اس محل میں لیکن لوٹڈی غلاموں کا کوئی پتہ نہیں۔ میں دمشق کے سلطان
 دیکھا کیا شان ہے اس کی۔ جگہ جگہ چوکی پہرہ۔ کس غلام چپ چاپ
 کمرے ہیں تو کس محترم جیسے گشت پر ہوں مگر تمہارے خلیفہ کے محل
 رونق نہیں۔ کوئی شان نہیں۔ باہر سے آنے والوں پر کیا اثر پڑتا ہوگا
 لانی کا؟“

یہ کمر غلام بڑی دلچسپی یا حیرانی سے امیر زادہ کا منہ دیکھ رہا۔ امیر زادہ کا
 ہوا تو غلام نے کہا۔

پ مجھے بڑی زبردست غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں؟“

زادے نے جواب دیا۔ ”کیوں بھائی۔ کیا میں نے کوئی بات غلط کہی؟“
 بھائی نے آپ یہ فرمائیے کہ آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ یہ محل، قصر
 ہے؟ غلام نے مسکراتے ہوئے مگر کچھ طنزیہ انداز میں امیر زادے سے
 کہا۔

اس کے سوال پر جیسے امیر زادے کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھ گیا۔ پہلے غلام
 کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے پھر یہ سوال کہ کس نے بتایا ہے کہ قصر
 ہے۔ امیر زادہ واقعی غلط فہمی میں مبتلا تھا اور اس نے اس کا بڑا
 کیا۔

انے ٹھیک کہا بھائی۔ میں واقعی غلطی سے اسے قصر خلافت سمجھ بیٹھا تھا۔
 کیا بات ہے ناں؟“

پ بہت ذہین ہیں سفیر محترم“

انے جواب دیا پھر خود ہی تفصیل بتانے لگا۔ ”یہ محل دراصل امیر
 کے وزیر اعظم امیر علاؤ الدین کا ہے۔ میرے آقا امیر علاؤ الدین بغداد کے
 زیادہ عقلمند آدمی ہیں۔ بڑے رعب دار اور ٹھٹ باٹ کے مالک ہیں۔
 اسے مل کے ضرور خوش ہوں گے۔“

پن مجھے وزیر اعظم کے سامنے کیوں پیش کیا جا رہا ہے جبکہ میں اپنے شاہ
 مہر کا نامہ امیر المومنین اور خلیفہ المسلمین کے نام لایا ہوں اور مجھے انہی
 نور پیش ہوتا ہے؟“

”آپ کو اندر طلب کیا گیا ہے۔ غلام خاص آپ کو لے جانے کے
 میرے دفتر میں بیٹھا ہے۔“ آنے والے نے کہا۔ آپ کے ساتھی میرے دفتر
 بیٹھیں گے۔ صرف آپ اندر تشریف لے جائیں گے۔“

”مگر آپ --- آپ کی تعریف؟“ امیر زادہ فرخ نے متانت سے کہا۔
 ”میں استقبالیہ افسر ہوں۔ آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔“ اس
 لجاجت سے کہا۔

”مگر مجھے اس وقت خوشی ہوگی جب آپ مجھے اندر بھجوا دیں گے۔“ امیر
 نے خوشدلی سے کہا۔

”ضرور ضرور --- آپ ابھی اندر جائیں گے۔ بے فکر رہیے ہم آپ
 خادم ہیں۔“

استقبالیہ افسر سب کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ وہاں ایک زریں کمر غلام
 تھا۔ وہ استقبالیہ افسر کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا سفیر تشریف لے آئے؟“ غلام نے پوچھا۔
 ”ہاں آگئے ہیں۔ وہ سفیر صاحب ہیں۔“ افسر استقبالیہ نے فرخ کی طرف
 کیا۔

غلام نے آگے بڑھ کے امیر زادہ فرخ کو ادب سے سلام کیا۔ ”آپ
 ساتھ تشریف لے جاتے۔ اندر آپ کو یاد کیا گیا ہے۔“

فرخ نے سلام کا جواب دیا اور اس زریں کمر غلام کے ساتھ ہولیا۔
 یہ قصر اندر سے بہت بڑا تھا۔ امیر زادہ ایک راہداری میں داخل ہوا
 ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ محل میں بے شمار کمرے تھے اور
 راہداری کے علاوہ دوسری راہداریاں بھی تھیں۔ پھر اس کے اندر دائیں
 ایک باغ شروع ہو گیا۔ خوبصورت کیاریاں اور راستوں کے کنارے پھولوں
 طرح قطاریں تھیں جیسے گل فروشوں نے دکائیں لگائی ہوں۔

یہ سب کچھ تھا۔ وسیع و عریض، طویل راہداریاں، باغ اور روشیں
 زادہ کچھ حیران حیران تھا۔ آخر وہ زریں کمر غلام سے سوال کر ہی بیٹھا۔

”کیوں بھائی۔ کیا خلیفہ بہت سادگی پسند ہیں؟“
 غلام اس کی آواز یا سوال پر رک کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادب سے
 ”سفیر محترم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا؟“

”قابل احترام سفیر۔“ غلام نے ادب سے جواب دیا۔ ”بڑے لوگوں کی بڑی ہوتی ہیں۔ وزیراعظم نے مجھے حکم دیا کہ محترم سفیر کو احترام کے آؤ۔ میں آپ کے پاس حاضر ہو گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ آپ کو کس ہے اور کس کے حضور پیش ہونا ہے۔ یہ آپ وزیراعظم سے دریافت حکم ہو تو میں آگے بڑھوں۔“

امیر زادے نے غلام کو گھور کے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ”قاضی کے چوہے سیانے“ یہ غلام اپنے آقا سے بھی تیز معلوم ہوتا ہے اس خوبصورتی سے بات ٹال دی تھی۔

”چلو مجھے جلد وزیراعظم کے سامنے پیش کرو۔“ یہ کہہ کر امیر زادہ ساتھ چلنے لگا۔

آگے بڑھے تو راہداریوں میں کچھ لوگ چلتے پھرتے نظر پڑے۔ وہ بڑھتے گئے اسی اعتبار سے راہداریوں میں لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ کہ غلام ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ اس کمرے پر چار نیزہ بردار پہرہ تھا اور سوائے دائیں جانب کی راہداریوں کے اس کمرے کے آس آدی نہ تھا۔

غلام امیر زادہ کو باہر کھڑا کر کے کمرے میں چلا گیا۔ پھر فوراً ہی اور امیر زادے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ امیر زادے نے اندر داخل ہوا کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص فائلوں میں سر جھکائے ہوئے ہے۔ یہ کمرہ نوا بجا ہوا تھا اور وزیراعظم کے عہدے کے مطابق اسے آراستہ کیا گیا تھا۔ ”السلام علیکم۔۔۔“ امیر زادے فرخ نے مسلمانوں کی طرح سلام کیا ”بیٹھ جاؤ۔۔۔“ سلام کا جواب دینے کے بجائے وزیراعظم نے اسے لئے کہا۔

امیر زادہ جوان تھا اور جوانی کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا خلیفہ کے وزیراعظم کی یہ تمکنت جو اس کے خیال میں نخوت تھی پٹ وہ چڑچڑایا بیٹھا تھا کہ وزیر نے سوال کر دیا۔

”شاہ دمشق نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟“

سوال بڑا کھردرا سا تھا امیر زادہ فرخ پہلے ہی چڑا ہوا تھا۔ اس کھردرا سا جواب دیا۔

شاہ دمشق نے مجھے امیرالمومنین کے حضور پیش ہونے کا حکم دیا ہے۔“ لیکن شاہ دمشق نے پیغام کیا بھیجا ہے؟“ وزیراعظم نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر زادے کو دیکھا۔

قابل احترام وزیراعظم۔۔۔۔۔ ”امیر زادہ فرخ سنبھل کے بولا۔“ ”میرے آقا اب الدین یوسف بن ٹیم الدین ایوب صرف دمشق کے بادشاہ ہی نہیں بلکہ نصف اقدار میں مصر جیسا عظیم ملک بھی ہے۔“

براعظم نے ٹیڑھی نظروں سے امیر زادے کو دیکھا۔

”ہم کیا ہے تمہارا؟“

”ہم امیر زادہ عزیز الدین فرخ شاہ نورالدولہ شاہان شاہ۔ خاندانی امیر ہوں شاہ مصر اعلیٰ حضرت صلاح الدین یوسف میرے سگے چچا ہیں۔“ فرخ شاہ نے تمکنت سے اپنا تعارف کرایا۔

ایک بادشاہ کے سہیلے ہونے پر بہت غرور ہے؟“ وزیراعظم نے جل کے کہا۔

”شاہ نے فوراً“ جواب دیا۔

”در نہیں فخر ہے۔ شاہ صلاح الدین یوسف کا غلام بھی اپنے اوپر فخر کرتا امیر زادے فرخ شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔“

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تمہارے شاہ نے کیا پیغام بھیجا ہے۔“

”لم سیدھا بیٹھ گیا۔“

پیغام ایک بند لفافہ ہے اور وہ لفافہ خلیفہ محترم و معظم کے نام ہے۔“ فرخ پورے وقار سے گفتگو کر رہا تھا۔

”وہ لفافہ پیش کرو۔“ وزیراعظم کا انداز تھکمانہ ہو گیا تھا۔

”مجھے لفافہ امیرالمومنین کو پیش کرنے کا حکم ہے۔“ فرخ شاہ اڑ گیا۔

”مگر یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ میں وزیراعظم ہوں میرے حکم کے بغیر تم خلیفہ سے ملاقات نہیں کر سکتے۔“ وزیراعظم نے رعب ڈالا۔

”اگر امیرالمومنین سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو کوئی بات نہیں۔ میں دمشق کا جانا ہوں۔ واپس چلا جاؤں گا مگر وہ امانت جو مجھے امیرالمومنین خلیفہ بغداد کو کرنا ہے اسے کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دیا جاسکتا۔“

”میر زادہ فرخ شاہ نے اتنی مستقل مزاجی سے جواب دیا کہ وزیراعظم بغداد لہ گیا۔ پھر جب امیر زادہ نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔“

”مجھے دمشق واپس جانے کی اجازت دی جائے۔“

تو وزیراعظم بغداد کا حیرانی سے منہ کھل گیا۔ اس وقت دربار خلافت ہی مرد آہن تھے۔ ایک وزیراعظم علاؤ الدین اور دوسرا سپہ سالار قطب قانماز۔ ان دونوں کے سامنے بغداد کے عوام تو ایک طرف رہے کوئی امیر نہیں مار سکتا تھا۔ امیر زادہ فرخ شاہ کے کھرے کھرے جوابوں سے وزیراعظم منہ پھر گیا۔

آخر نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”دمشق کے جوان بہت تیز طبیعت ہوتے ہیں۔“

”عالی مقام وزیراعظم۔۔۔“ امیر زادہ فرخ شاہ نے بھی نرم لہجہ اختیار کیا۔ دمشق واپس جا رہا ہوں اگر کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“ وزیراعظم علاؤ الدین اپنی جگہ سے اٹھ کے فرخ شاہ پاس آگیا۔

”اب تم میرے ساتھ امیر المومنین کے پاس چلو گے“ یہ کہہ کے وزیراعظم نے فرخ شاہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے ہوئے راہداری میں آگیا۔

علاؤ الدین بڑا مغرور تھا۔ بڑے بیڑوں کو منہ نہ لگاتا مگر امیر زادہ فرخ شاہ نے اسے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اس کا دماغ ٹھکانے آگیا۔ باہر ان دونوں جس نے دیکھا حیران رہ گیا۔ دوسری طرف راہداری میں جو لوگ کھڑے تھے وزیراعظم سے ملاقات کے لئے دور دور سے آئے تھے۔ ان کو آئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے ان کی اب تک طلبی نہیں ہوئی تھی۔

وزیراعظم کے ساتھ چلتے ہوئے امیر زادہ کو محسوس ہوا وہ واقعی مملکت راہداریوں اور راستوں سے گزر رہا ہے۔ وزیراعظم کا محل اگرچہ طویل و عریض تھا مگر اس میں زیادہ سجاوٹ نہ تھی مگر فرخ شاہ جن راستوں سے گزر رہا تھا وہاں سے اسے اپنے دونوں طرف مملکت ہی مملکت دکھائی دے رہے تھے۔ اسے ایک عالیشان ایک سے ایک خوبصورت محل۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زمین سے اگتے ہیں اسی طرح یہ مملکت بھی اس زمین پر اگ آئے تھے۔

”کیا قصر خلافت ابھی دور ہے؟“ امیر زادہ فرخ شاہ نے چلتے چلتے پوچھا۔ ”ہم قصر خلافت کے سامنے ہیں۔“ وزیراعظم علاؤ الدین نے قدم روک کر کہا۔ ”بتاؤ کہ قصر خلافت کونسا ہے؟“

امیر زادہ نے رک کر اپنے سامنے اور دائیں بائیں دیکھا۔ دو قصر سامنے۔ دو اور دو ہی بائیں جانب تھے۔ اس نے ایک لمحہ سوچ کے کہا۔

انے کے دونوں قصر باقی محلوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دونوں قصروں میں سے ایک قصر قصر خلافت ہے۔

”ذہین بھی ہو نوجوان۔۔۔“ علاؤ الدین نے اس کی ذہانت کی داد دی۔ ان کے دونوں قصر امیر المومنین کے ہیں۔ ایک قصر میں وہ دربار لگاتے ہیں میں حرم سردار شاہی خواب گاہ ہے۔“

نہ مستفی قصر دارالریحانین میں رہتا تھا۔ عباسیوں کو حکومت لئے چار سو سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے بڑے عالیشان محلات تعمیر کئے تھے ان کے ساتھ ساتھ وہ مندم اور معدوم ہوتے گئے۔ قصر دارالریحانین کو خلیفہ مستنصر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے سوق الریحانین کا اکثر حصہ اور دار اور دار سیدہ کو مسمار کرا کے اس کی جگہ قصر دارالریحانین بنوایا تھا۔ اس میدان تین سو گز مربع تھا۔ وسط میں ایک باغ تھا۔ قصر میں تینوں سے شاہ کمرے تھے۔ دربار میں خاتون بھی ایک قصر تھا یہ باب ثوبیہ کے متصل اس قصر میں شہزادی فاطمہ رہا کرتی تھی جو ملک شاہ سلجوق کی پوتی اور خلیفہ کی بیوی تھی۔

شہزادی فاطمہ کا نکاح خلیفہ مستنصر کے ساتھ ۱۱۳۹ء (۵۳۳ ہجری) میں ہوا تھا۔ فاطمہ کی علمی قابلیت کی مورخین بہت تعریف کرتے ہیں۔ شہزادی کا انتقال ۱۱۴۷ء (۵۴۱ ہجری) میں ہوا تھا۔

دارالریحانین کی تعمیر کے پچاس سال بعد مستنصر کے پوتے مستنصر بالله نے اس قصر میں ایک جھروکہ (جسے منظر کہتے تھے) بنوایا تھا۔ عباسی خلیفہ مملکت سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ عوام کے اصرار پر وہ ہفتہ میں ایک بار جھروکہ میں بیٹھ جاتے اور عوام اس جھروکہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے کا دیدار کرتے تھے۔ دیدار کا بس نام ہی تھا۔ اتنی دور اور بلندی سے کیا دکھائی دیتا ہوگا۔ عوام کو صرف جھروکہ نظر آتا تھا جسے دیکھ کر وہ تصور نہ تھے کہ انہوں نے خلیفہ کا دیدار کیا ہے۔

وزیراعظم کے اچانک قصر خلافت پہنچنے سے قصر کے سپرداروں کو کینوں لاس کھلبلی مچ گئی کیونکہ وزیراعظم ہی دراصل سلطنت عباسیہ کا مالک تھا۔

خلیفہ میں سلام کیا۔ خلیفہ نے اپنا دایاں ہاتھ وزیراعظم کی طرف لمبا
 وزیراعظم علاؤ الدین نے خلیفہ کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا امیر
 خ شاہ نے وزیراعظم کی پیروی کی۔

اعظم علاؤ الدین نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔ ”میں امیر المومنین کے حضور
 اس کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کر رہا ہوں جس کی آمد کا دربار خلافت
 دن سے انتظار ہو رہا تھا۔“

علاؤ الدین۔۔۔۔۔ خلیفہ نے امیر زادہ فرخ شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 مارا اشارہ اس جوان کی طرف ہے۔“
 امیر المومنین کے اندازے کی داد دیتا ہوں۔“ علاؤ الدین نے خوشامدانہ
 کہا۔

جوان کا لباس چغلی کھا رہا ہے کہ بغدادی نہیں۔؟“ خلیفہ کا اندازہ سوالیہ

علاؤ الدین نے جواب دیا۔ ”جی ہاں امیر المومنین صرف یہی نہیں کہ یہ کسی
 ملک سے آیا ہے بلکہ اس شخص نے بغداد کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“
 بلدی بتاؤ یہ کون ہے۔ ہمارے صبر کا امتحان نہ لو علاؤ الدین؟“ خلیفہ بے
 کیا تھا۔

امیر المومنین یہ جوان شاہ مصر جو اب شاہ دمشق بھی ہیں یعنی شاہ صلاح
 یوسف ایوبی کا سفیر ہے اور حضور خلیفہ میں اپنے آقا کا ایک خط پیش کرنا
 ہے۔“

بلد مستفی شاہ صلاح الدین کا نام سن کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

اے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم صلاح الدین کے سفیر ہوں۔ کیسا ہے ہمارا بیٹا۔ ہم
 اے بہت یاد کرتے ہیں۔“

خلیفہ نے ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

خلیفہ چپ ہوا تو امیر زادے فرخ شاہ نے اب سے کہا۔ ”شاہ صلاح الدین
 بالکل صحیح و سلامت ہیں امیر المومنین وہ اور اہل دمشق اور اہل مصر آپ
 راز کی عمر کی دعا کرتے ہیں۔“

”خدا اسے زندہ و سلامت رکھے۔“ خلیفہ مستفی نے خلوص دل سے دعا
 سلطان نور الدین زنگی کے انتقال سے ہم بہت پریشان تھے۔ ہمیں معلوم

خلیفہ تو بس برائے نام ہوتے۔ ان کے صرف دو کام تھے۔ پہلا کام بادشاہوں
 شاہی سند روانہ کرنا۔ ہر نیا بادشاہ اس وقت تک مستند نہیں مانا جاتا تھا جب
 اس عباسی خلیفہ بادشاہی سند نہ بھجوائے۔ دوسرا کام مذہبی تھا۔

جب کوئی بڑا عالم۔ مفتی یا فقیہ بغداد میں آتا اس سے خلیفہ کی طرف
 وعظ کی دعوت دی جاتی۔ واعظ اس جھوٹے کے نیچے میدان میں وعظ دیتا
 خلیفہ اس جھوٹے میں بیٹھ کے وعظ سنتا تھا۔ ایسے موقع پر خلیفہ کی بیگمات
 لڑکے لڑکیاں بھی خلیفہ کے ساتھ وعظ سننے میں شریک ہوتے۔ ان کے لئے
 کی راہداری میں چٹائیں ڈال دی جاتی تھیں۔ عام سننے والوں کے لئے میدان
 فرش بچھایا جاتا تھا اور عوام کے داخلہ کے لئے قصر کا ایک دروازہ کھول دیا
 تھا۔

خلیفہ مستفی اگرچہ دیندار آدمی تھا لیکن اس کے دور خلافت میں وعظ کی
 ایسی محفل کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کے بیٹے ناصر الدین اللہ کے زمانہ میں
 عظیم الشان محفل وعظ منعقد ہوئی تھی اس وعظ میں ابن جبر خود موجود تھا
 نے تو اس کی تفصیل لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔۔۔۔۔

”باب بدر کے قریب خلیفہ کے محل کے اندر ایک میدان میں شیخ جمال
 ابی الفضل بن علی البواری کی مجلس وعظ منعقد ہوئی۔ مجلس کے ایک طرف
 ناصر الدین اللہ ان کی والدہ بیٹیاں بیٹے اور دیگر رشتہ دار جھوٹوں میں
 وعظ سن رہے تھے اور دوسری طرف مخلوق کے واسطے ایک دروازہ کھول دیا
 پورے میدان میں فرش بچھا ہوا تھا۔ ابن جبیر نے اس مجلس کی تاریخ ۱۵
 ۵۸۱ ہجری لکھی ہے۔“

وزیراعظم بغداد کو خلیفہ بغداد سے ملاقات کے لئے اجازت لینے کی ضرورت
 تھی وہ جس وقت چاہے خلیفہ کے پاس چلے جاتے انہیں روکنے کی کو
 اجازت نہ تھی۔ مگر وزیراعظم کو آتے دیکھ کر چند غلام اور کینز بھاگ کے
 کے پاس پہنچیں اور انہیں وزیراعظم علاؤ الدین کے آنے کی خبر کی۔ ظنف
 اپنی محفل اسی وقت برخاست کر دی۔ خلیفہ وزیراعظم کی بہت قدر کرتے اور
 بھی کرتے تھے۔

وزیراعظم امیر زادہ فرخ شاہ کو ساتھ لئے ہوئے سیدھے خلیفہ مستفی کے
 پہنچے۔ وزیراعظم نے قدرے غم ہو کر خلیفہ کو سلام پیش کیا۔ امیر زادے نے

المومنین صلاح الدین کو ہر موقع پر اپنی خدمت پر مستعد اور تیار پائیں گے

نیاز مند

حقیر ناچیز صلاح الدین یوسف بن ایوبی

اعلم علاؤ الدین کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ مستثنیٰ پکار اٹھا۔

نک -- بے شک -- سلطان نور الدین زنگی کے تم ہی جانشین ہو۔
دین تم پر اللہ کی برکتیں نازل ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ دمشق اور مصر
ان نحرانیت کی جو خس و خاشاک پھیلی ہوئی ہے اسے تم صاف کرو۔
زادے فرخ شاہ نے گرہ لگائی۔

المومنین -- میرے آقا شاہ دمشق نے جس طرح خانہ جنگی کا خاتمہ کیا
طرح وہ یروشلم کی عیسائی حکومت کو جو آئے دن مسلم علاقوں میں لوٹ
رہی ہے۔ اس سے بھی ایک فیصلہ کن جنگ کی تیار کر رہے ہیں۔

ہاں اللہ --- سبحان اللہ - اللہ اس کے ارادوں میں استقامت پیدا

نے صلاح الدین کو دوبارہ دعا دی پھر حاجب کو حکم دیا۔

صلاح الدین کے لئے خلعت فاخرہ پیش کی جائے اور ہاں علاؤ الدین تم
اب سے سفیر شاہی لکھا کر ابھی پیش کرو۔ ہم صلاح الدین کو نور الدین
الطرح "سلطان" کا لقب عطا کرتے ہیں۔

امیر المومنین کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اعلم علاؤ الدین جو کاتب سے سند سلطانی لکھانے جا رہا تھا اس نے پلٹ
دے عرض کیا۔

امیر المومنین۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا قاصد سلطان کا سگا بھتیجا ہے۔ یہ
نہ کی عنایت کا حقدار ہے۔

مخت خوب -- کیا نام ہے تمہارا؟ خلیفہ نے مسرت سے کہا۔

کام کا نام عزیز الدین فرخ شاہ ہے امیر المومنین۔ فرخ شاہ نے فخر سے

نہ نے حاجب سے کہا۔

ہوا تھا سلطان کے انتقال کے بعد امراء نوریہ نے سلطنت دمشق کی بندر باز
شروع کر دی ہے۔ مگر جب ہمیں صلاح الدین کے مصر سے آنے کی اطلاع ملی
ہمیں اطمینان ہو گیا۔ ہمیں امید تھی کہ صلاح الدین یوسف سلطان دمشق کا
جانشین ثابت ہوگا۔ ہماری یہ امید پیدا ہوئی۔ تمہیں علاؤ الدین نے بتایا ہوگا
جب صلاح الدین نے حماہ میں باغیوں کے متحدہ لشکر کو شکست دی اس وقت
پورے بغداد میں چراغاں ہوا تھا اور صلاح الدین کی سلامتی کی دعائیں مانگی
تھیں۔

"میں شاہ دمشق کی طرف سے آپ کے خلوص کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دہ
پہنچ کے میں انہیں بتاؤں گا کہ امیر المومنین اور دربار خلافت کے متعلقین کے
میں صلاح الدین کے لئے کس قدر پیار اور محبت ہے۔" امیر زادہ فرخ شاہ۔
بھی سفارت کا حق ادا کیا۔

پھر امیر زادہ نے وہ زر نگار صندوقچی اور صلاح الدین کا خط خلیفہ کو پیش کر
صندوقچی تو خلیفہ کے برابر کھڑے ہوئے حاجب نے سنبھال لی اور خط کے
خلیفہ نے علاؤ الدین کی طرف اشارہ کیا۔

"علاؤ الدین نے لفافہ چاک کیا پھر خط پڑھا لکھا تھا۔۔۔

امیر المومنین خلیفہ المومنین ابو محمد حسن بن مستجد المقلب بہ
مستثنیٰ بامر اللہ کے حضور حقیر و نیاز مند صلاح الدین یوسف بن
ایوب کی عرضداشت شروع کرتا ہوں اس ذات پاک کے نام
سے جس کی تعریف لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندروں
کے برابر روشنائی ناکافی ہے اور بعد اسی نبی پاک کی مدحت
اور ثناء کے جس نے معراج کا اعلیٰ ترین اعزاز پایا۔ یہ بندہ
ناچیز عرض پرواز ہے کہ حماہ میں موصل اور حلب کے مشترکہ
لشکر کو شکست دینے کے بعد نہ صرف ملک شام کے عوام
اور خواص بلکہ شہزادہ ملک الصالح جو اپنی کسی ناسمجھی کے
باعث امراء کے برکائے سے میرے خلاف کھڑا ہوا تھا اس
نے بھی مجھے ملک شام اور ملک مصر کا حکمران تسلیم کر لیا
ہے۔ آپ کی ذات والا صفات سے امید ہے کہ اس بندہ
ناچیز کو دمشق اور قاہرہ کی مسند شاہی کی مسند عطا فرمائیں

کے کمرے ہونے کی جگہ تک لے گیا۔ وزیر اعظم نے حاجب کو یہ کہہ کر بھیج دیا کہ خان بعد میں قصر خلافت بھیج دیا جائے گا۔ مسئلہ فرمان خلافت یعنی صلاح الدین کو ”مسند سلطانی“ باقی تھا۔ اس کے باب نے پھر سفیر دمشق کو آواز دی۔ فرخ شاہ نے مسند خلافت کے سامنے بے سند سلطان کا لفافہ وصول کیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھے اگلے بیروں اپنی جگہ واپس گیا۔

ن پر وقار تقریب میں سوائے وزیر اعظم بغداد کے اور کوئی عمال خلافت موجود نہ تھے۔ خلیفہ مستفی نے وزیر اعظم کو تاکید کی کہ شامی سفیر کو وہ شام کے کھانے کے ساتھ لائے چنانچہ رات کو امیر زادہ فرخ شاہ نے خلیفہ اور وزیر اعظم کے مکان کھانا کھایا۔ وہاں سپہ سالار افواج بغداد قطب الدین قاناز سے بھی امیر کی ملاقات ہوئی۔ سپہ سالار کو پیغام بھیج کے خلیفہ نے بلوایا تھا۔

ماتے کے بعد خلیفہ نے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ شامی سفیر کو تین روز تک البلاد بغداد میں ٹھہرایا جائے اور اسے پورے بغداد کی سیرا کرائی جائے۔ مگر امیر زادے فرخ شاہ کو مشرقی اور مغربی دونوں طرف پھیلے ہوئے بغداد اب سیر کرائی گئی۔ اگرچہ عباسی خلافت زوال پذیر تھی اور اس کے بیشتر اہم جہن گئے تھے مگر بغداد کی رونق اب بھی قائم تھی۔ اس شہر میں بڑی ترقی۔ لوگ مطمئن اور بے فکر تھے خلافت کے خزانے ہیرے جواہرات بھرے تھے مگر خلافت بغداد کی عسکری طاقت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے کسی حصہ میں بھی خفاشاہ نہ تھا اس لئے فوج کی طرف خلیفہ کی توجہ رہتی تھی۔

طلب سے واپسی پر صلاح الدین کچھ روز حماہ میں ٹھہرا پھر فوج لے کر بصرہ لڑنے کو نکلا۔ وہ شام کے ان تمام مقامات کو واپس لینا چاہتا تھا جس پر تاتار الدین زنگی کا قبضہ تھا اور ان کے انتقال پر یا تو وہ باغی ہو کر آزاد ہو جاتے یا پھر سلطان مرحوم کے کسب شہزادے ملک الصالح اسعیل کی کمزوری سے اٹھا کر صالح کے چچا زاد بھائی سیف الدین کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ صلاح الدین عازمی نے سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے علاقوں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دمشق کے بعض عظیم امرا نے مصر سے

”سلطان کے بھیجنے کے لئے بھی ایک نعت پیش کی جائے۔“

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ خلیفہ بغداد کا کام مذہبی مجالس میں شرکت اور بادشاہوں کو سند اور نعت بانٹنا رہ گیا تھا اس لئے اس کے توشہ خانہ میں بڑے شدہ نخلوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ ان میں نعت فاخرہ بھی تھیں جو خاص خاص لوگوں کو دی جاتی تھیں اور عام نخلیں بھی تھیں۔ بہر حال نعت فاخرہ یا عام نعت جب یہ کسی کو دی جاتی تھیں تو نہ صرف اس کا اپنے ہم پٹہ میں مرتبہ بڑھ جاتا تھا بلکہ وہ خود کو صاحب نعت ہونے پر فخر کرتا تھا۔

خلیفہ کے حکم کی دیر تھی کہ دونوں نخلیں دربار میں آئیں۔ دونوں نخلیں الگ الگ سونے کے خوانوں میں رکھی تھیں۔ جن پر زرنگار خوان پوش ڈال دیئے تھے۔ ان خوانوں کو چاندی کی ایک چوکی پر جو مسند خلافت کے قریب رکھی تھی۔ اس پر رکھا گیا اور اوپر سے خوان پوش بنادئے گئے۔

اس دوران وزیر اعظم علاؤ الدین نے امیر زادہ فرخ شاہ کو نعت وصول کر کے طریقے سمجھا دیئے تھے چنانچہ جب حاجب نے سفیر دمشق کا نام بلند آواز سے پکارا تو امیر زادہ فرخ شاہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مسند خلافت کے سامنے پہنچا۔ حاجب نے امیر زادے والا خوان چوکی سے اٹھا کر خلیفہ مستفی کے سامنے کیا۔ خلیفہ نے اس پر ہاتھ رکھا۔ یہ اس بات کی اجازت تھی کہ نعت حقدار کو پڑھ جائے۔

خلیفہ نے خوان سے ہاتھ کھینچا تو حاجب نے خوان امیر زادے کی طرف کر دیا۔ امیر زادے نے خوان میں رکھی ہوئی نعت جس کے گرد ریٹم کے بندھے تھے اٹھالی پھر وہ اگلے بیروں اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ وزیر اعظم نے غلام کو قریب بلایا تھا۔ امیر زادہ نے اپنی نعت اس غلام کے حوالے کر دی۔ ایک حاجب نے یہ آواز بلند کی۔

”امیر المؤمنین السلین ابو محمد حسن بن مستجد الملقب نہ مستفی باہ سلطان مصر و شام صلاح الدین یوسف ایوبی کو نعت فاخرہ معہ کلاه گوند پارچہ جات سے نوازتے ہیں سفیر دمشق اس عظیم تحفہ کو وصول کرے۔“

اس آواز پر امیر زادہ فرخ شاہ نے ایک بار پھر حرکت کی اور مسند خلافت کے سامنے پہنچا۔ حاجب نے خوان خلیفہ کے سامنے کیا۔ خلیفہ نے اس پر ہاتھ رکھا۔ چونکہ اس نے امیر زادہ کو اس لئے حاجب خود اس خوان کو

امیر صلاح الدین کو بلایا جس نے آتے ہی منہ زور اور مفاد پرست امرائے لوریہ کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

بعض بھی ان علاقوں میں سے آئے تھے جس کا حاکم سلطان کی وفات پر غور مختار ہو گیا تھا۔ اس کے صلاح الدین کے لشکر کے آنے کی خبر سنی تو فوراً ہتھیار ڈال دیئے اور صلاح الدین کا بعض پر بغیر جنگ کے قبضہ ہو گیا۔ وہاں سے صلاح الدین پھر اپنے عارضی مرکز یعنی صحابہ واپس آیا۔ صلاح الدین کی بعوض سے واپسی کے دوسرے ہفتہ امیر زادہ فرخ شاہ دربار خلافت واپس آیا اس کے ساتھ خلیفہ بغداد کا خادم خاص آیا تھا تاکہ وہ تصدیق کرے کہ امیر زادہ فرخ شاہ جو سند سلطانی لایا ہے وہ دربار خلافت سے جاری ہوئی ہے۔

صلاح الدین کے سامنے جب امیر زادہ نے سند سلطانی، نعلت فاخرہ، کلاہ، گوبند اور ریشمی پارچہ جات پیش کئے تو صلاح الدین مسرت سے بے قابو ہو گیا اور اس نے امیر زادہ فرخ شاہ کو گلے لگالیا۔ حماہ، حمص، طبرک، دمشق اور شام کے تمام مقبوضات میں جشن شادمانی منانے کے احکامات جاری ہوئے اور غریب و مساکین میں نقد رقم اور کھانے کا سامان تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسی ہفتہ امیر صلاح الدین نے حماہ میں دربار خاص لگایا جس میں تمام علاقوں کے حکمران اور گورنر شریک ہوئے۔

اس دربار میں صلاح الدین نے مقبوضہ علاقوں پر حاکم مقرر کئے۔ اس نے حماہ اپنے ماموں شہاب الدین محمود کو دیا۔ حمص کا حاکم ناصر الدولہ بن شیرکوہ کو مقرر کیا گیا۔ اس دربار میں امیر زادہ فرخ شاہ نے دربار خلافت کے تمام واقعات سب کے رو بہ بیان کئے۔ صلاح الدین نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ دمشق پہنچ کے جامعہ دمشق میں خلیفہ مستنسی کی عطا کی ہوئی نعلت فاخرہ، گوبند اور کلاہ پہنے گا اور اس وقت وہ خلیفہ کا دیا ہوا خطاب یعنی ”سلطان“ ہونے کا اعلان کرے گا۔

دربار کے بعد صلاح الدین نے خلیفہ کے غلام خاص کو جوڑا، گھوڑا اور معقول رقم دے کر بغداد رخصت کیا اور اس کو بحریہ پہنچانے کے لئے پچاس سواروں کا دستہ مقرر کر دیا۔ پھر صلاح الدین نے امیر زادے کو بلا کر حکم دیا کہ امیر شمس الدین المقدّم کو دمشق میں اس کے سامنے پیش کیا جائے کیونکہ اس نے المقدّم کو طبرک کا عامل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امیر زادہ فرخ شاہ اسی دن دمشق روانہ ہو گیا تاکہ صلاح الدین کے دمشق

آنے پر اس کے استقبال کے انتظامات کرائے نیز امیر شمس الدین المقدّم کو سر کے شاہ صلاح الدین کے سامنے پیش کرے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے کی سب سے زیادہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ وہاں اسے ارمغانہ سے کی پوری امید تھی۔

پنچ کے امیر زادہ فرخ شاہ نے سب سے پہلے گورنر دمشق طغرکین رض توارخ میں طغکین لکھا گیا ہے) سے ملاقات کی اور اطلاع دی۔

لطان سلطنت مصر و شام صلاح الدین یوسف بن ایوبی دمشق تشریف لارہے گورنر دمشق طغکین نے فرخ شاہ کو حیران نظروں سے دیکھا۔

پ کی حیرانی بجا ہے چچا طغرکین ”فرخ شاہ نے مسکرا کے کہا۔ ”قبل کہ آپ مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال کریں۔ میں خود اس اجمال کی بیان کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟“

فرخ شاہ۔ تم اب کچھ زیادہ ہی عقلمند ہوتے جا رہے ہو اور اس کے ساتھ ”گورنر دمشق نے بڑے پیار سے اپنے بھتیجے کو دیکھا۔

حاکم دمشق نے درست فرمایا۔ ”فرخ شاہ کی معیت میں نہ جانے کیوں لی تھی۔ ”میری شوخی ہو یا عقلمندی یہ سب اس ہستی کا فیض ہے جس کی میں مامور ہوں۔ اب آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں کہ عباسی اور مستنسی نے ہمارے آقا اور چچا جان امیر صلاح الدین کو ”سلطان مصر و لیبیہ عطا فرمائی ہے اور میں نعلت فاخرہ گوبند اور کلاہ سے بھی نوازا ہوں۔“

ان اللہ کیا مسرت امیر خبر سنائی ہے تم نے۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ ”راقی بہت خوش ہوا۔ دراصل سلطان صلاح الدین کے تمام بھائی بھتیجے نہ ل سے محبت کرتے تھے بلکہ اس کے وفادار بھی تھے۔ سلطان نے بھی ہر حوصلہ افزائی کی اور اس کی اہلیت کے مطابق عمدے عطا کئے تھے۔

شاہ نے پھر شوخی دکھائی۔ ”یہ خبر تو نوید مسرت تھی اب ایک اہم خبر خیر یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین خلیفہ بغداد کے عطا کئے ہوئے لقب کا حق میں اعلان فرمائیں گے وہیں ان کی دستار بندی ہوگی اور وہ نعلت بہ تن کریں گے۔ علم تقریب جس میں سلطنت دمشق و مصر کے تمام حاکم شریک ہوں گے کا انتظام آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ سلطان نے

”یہ نوید مسرت اسی ہفتہ میں موصول ہوئی ہے۔“ فرخ شاہ نے جواباً اس سلسلہ میں بہت جلد ایک عظیم تقریب سلطانی اور کلاہ بندی ہونے والی اس کی اطلاع گورنر دمشق تک پہنچ چکی ہے اور اس کا اعلان آج ہی ہوا۔۔۔“

فرخ شاہ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ ڈھندورچی کے ڈھندورا پر آواز سنائی دی۔

”لےجے وہ اعلان ہو رہا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے“ فرخ شاہ اسے مخاطب کیا۔

شمس الدین المقدم بظاہر منہل نظر آ رہا تھا مگر ڈھندورے کی آواز سن کر کھڑا ہوا ”چلو ہم سب باہر چل کے سنتے ہیں کہ کیا اعلان ہو رہا ہے۔“ شمس الدین المقدم کو شاید فرخ شاہ کی بات کا اعتبار نہ آیا تھا اس اپنے کانوں سے اعلان سننا چاہتا تھا۔ شمس الدین المقدم حارث کے والد اور زادہ فرخ شاہ باہر چلے گئے اور حارث اور ارمغانہ باہر کے دروازے سے اُکھڑی ہو گئیں۔

اعلانچی نے اعلان کیا۔

”ملک خدا کا حکومت سلطان صلاح الدین ایوبی کی۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ بغداد المستنصر بامر اللہ نے ملک مصر و شام کے بادشاہ کو ”سلطان“ کا لقب اختیار کرنے کی سند عطا کی ہے۔ اس سلسلہ میں عوام و خاص کو ایک ہفتہ تک جشن شادمانی منانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ صاحب ثروت لوگوں سے امید ہے کہ وہ غریب اور مساکین میں نقد اور جنس کی صورت میں خیرات تقسیم کر کے انہیں بھی اس خوشی میں شریک کریں گے۔“

دوسرا اعلان یہ ہے کہ سلطان عالی مقام صلاح الدین ایوبی بہت جلد دمشق میں نزول فرمائیں گے اور جامعہ دمشق میں ان کی کلاہ بندی ہوگی اور وہ خلیفہ بغداد کی عطا کی ہوئی نعت فاخرہ کو زیب تن فرمائیں گے۔ اس تقریب میں ہر خاص و عام کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔“

اعلان ختم ہوا تو شمس الدین المقدم نے منہ بنا کر کہا۔ ”اچھا تو امیر صلاح اب سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی کے نام سے پکارے جائیں گے؟ المقدم کے کہنے کا اندازہ سوالیہ تھا جیسے اسے اب بھی اعتبار نہ آیا ہو۔ امیر زادہ فرخ شاہ نے ایسے بے اعتباری کے عالم میں شمس الدین المقدم پر اور انکشاف کیا۔

”بزرگ امیر۔۔۔ اس اعلان کے بعد میں سلطان صلاح الدین کا حکم آپ تک آ ہوں۔ سلطان نے میرے ذریعے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اور آپ کی ارمغانہ بنت شمس الدین المقدم جامعہ دمشق کی اس تقریب میں شریک ہوں سلطان کی کلاہ بندی اور نعت فاخرہ کو پہننے کے سلسلہ میں برپا ہونے والی ہے تقریب میں امیر شمس الدین المقدم کو جلیک کی حکمرانی کا پروانہ عطا کیا گا اور ارمغانہ کو سلطان معظم اپنے دست مبارک سے انعام عطا فرمائیں فرمائیے بزرگ محترم اب آپ کا کیا خیال ہے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ امیر زادے آپ کی تمام کوششیں بار آور ہوئیں۔“ المقدم نے اسی کھردرے لہجے میں کہا۔ ”رہا میرا مسئلہ تو میں سلطان کے حکم کیل کے لئے تقریب میں ضرور شرکت کروں گا۔ اگر ارمغانہ کی اس وقت رخصتی نہ ہوئی تو یہ بھی میرے ساتھ آئے گی۔“

امیر زادے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اسے آج اندازہ ہوا کہ شمس الدین المقدم کس قدر کینہ اور مسند ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ صلاح الدین کو کم از کم اس بارے میں ضرور آگاہ کر دے امیر شمس الدین نے اس میں اس قدر کدورت بھری ہے کہ وہ کسی وقت دغا بازی کر سکتا ہے امیر زادہ کے دل میں اس طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ المقدم نے ایک اور ظلم کیا اس نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

”امیر زادے آپ نے سلطان کا حکم مجھ تک پہنچایا جس کا جواب میں آپ کو دے چکا ہوں۔ اب اگر کوئی مزید حکم بھیجیں تو آپ براہ کرم اسے بیٹی حارثہ کے پاس لے جائیں اور ارمغانہ آج اس گھر سے چلیں جائیں گے۔“

امیر المقدم نے امیر زادہ کا راستہ ہی بند کر دیا۔ اس کی اس بات سے صاف ہو گیا کہ وہ نہیں چاہتا کہ امیر زادے اور ارمغانہ کی ملاقات ہو اور یہ کہ ارمغانہ کی کئی دوسری جگہ شادی طے کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں ارمغانہ

نے کے لئے دعوت دی گئی تو وہ اس میں بھی پیش پیش تھا لیکن جب صلاح دمشق پہنچ گیا تو خدا معلوم اسے کیا ہوا کہ وہ باغی ہو گیا اور درپردہ امیرزادہ شاہ کو قتل کرا کے قلعہ دمشق پر قبضہ کا پروگرام بنا بیٹھا۔

امیرزادہ فرخ شاہ کے دل میں ارمغانہ کے لئے جو جگہ پیدا ہوئی تھی پہلے نہ تھی بلکہ ارمغانہ کا وہ جرات مندانہ قدم تھا جس کے ذریعہ اس نے بارے کو موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا یہ بھی عجیب بات تھی کہ نے فرخ شاہ کو ارمغانہ کے ذریعے قتل کرانے کی کوشش کی اور ارمغانہ آپ کا ساتھ دینے کی بجائے فرخ شاہ کو بچانے پر تیار ہوئی اور دانیال کو قتل فرخ شاہ کو بچالیا۔

ارمغانہ کا یہ اقدام تھا جس نے امیرالمقدم کو ارمغانہ اور فرخ شاہ دونوں اٹک بنا دیا۔ پھر سلطان صلاح الدین نے فرخ شاہ کو المقدم کی گرفتاری پر کیا۔ المقدم روپوش ہو گیا تھا لیکن اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی گرفتاری پر شخص کو مامور کیا گیا ہے جسے اس کی بیٹی ارمغانہ نے بچایا تھا۔ اس لئے اس کی فرخ شاہ کے خلاف نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس کے اس نئے سے کہ وہ ارمغانہ کی کسی دوسری جگہ شادی کر رہا ہے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ فرخ شاہ سے نہیں بلکہ اپنی بیٹی سے بھی بدلے لے رہا تھا۔ حالانکہ اب ت تبدیل ہو گئے تھے اور سلطان اس مخالف امیر کو طلبک کی حکمرانی بخش رہا

کئے ہیں کہ کسی کی فطرت اور طینت نہیں بدلتی۔ دوسرے ہی ہفتہ سلطان الدین کی جامعہ دمشق میں بڑی دھوم دھام سے کلاہ پوشی ہوئی۔ مصر اور کا کوئی ایسا امیر نہ تھا جس نے اس تقریب میں شرکت نہ کی ہو۔ معززین اور قلعہ نے بھی تقریب میں بھرپور حصہ لیا۔ امیر فرخ شاہ اگرچہ اس تقریب بخت ایک کارکن کے پیش پیش تھا لیکن اس کا دل امیرالمقدم کی باتوں بہت دکھا تھا۔

پھر اس وقت تو وہ اور زیادہ افسردہ ہوا جب اس نے اس تقریب میں شمس المقدم کو تنہا شریک ہوتے ہوئے دیکھا۔ شمس الدین المقدم کو وہاں بھی زادے فرخ شاہ کا سارا لیتا پڑا اس لئے گورنر کے دوسرے کارکن شمس کو نہیں پہچانتے تھے اور وہ امیر جو اس محفل میں شریک ہوئے تھے وہ

کا کیا رد عمل تھا اس کا پتہ امیر زادے کو مشکل ہی چل سکتا تھا کیونکہ المقدم نے ایک طرح اسے منع کر دیا تھا کہ وہ حارث کے گھر مت جاتے۔ امیر زادے فرخ شاہ نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ خیال کیا اور انہیں کر کے جدا ہو گیا۔ آج جس تلخ تجربہ سے اس کا واسطہ پڑا تھا اس نے اسے دل توڑ کے رکھ دیا تھا۔ آیا تو وہ بہت خوش خوش تھا لیکن واپسی پر اسے قدم من من کے محسوس ہو رہے تھے۔ امیر زادہ اپنے چچا متعلکین حاکم دمشق ساتھ نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت ایسی غیر ہو رہی تھی کہ وہ دمشق کے قلعہ میں پہنچا اور چچا سے سر درد کا بہانہ کر کے ایک کمرے میں پڑ رہا۔

ادھر شہر اور قلعہ میں عید جیسا سا تھا۔ جشن شادمانی کا اعلان ہو چکا تو لوگوں نے اس جشن میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کہیں دھول تارتے رہے تھے تو کہیں موسیقی کی محفلیں لگی تھیں۔ حلوائیوں کی دکان پر تازہ مٹ تیار ہو رہی تھیں۔ بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھیں۔ بچے مختلف جگہوں بازاروں میں رتکین جھنڈیاں لئے گھوم رہے تھے۔ لوگ ٹولیوں میں گھوم رہے اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے نعرے لگا رہے تھے۔

امیر زادے فرخ شاہ کی شام کو کچھ طبیعت ٹھہری تو وہ فیصل قلعہ گیا۔ ابھی مغرب کی اذان نہ ہوئی تھی لیکن گھر گھر روشنی ہو رہی تھی اور کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ امیر زادہ آج بہت افسردہ تھا۔ دل ہلانے کے لئے کے دفتر میں چلا گیا لیکن معلوم ہوا کہ گورنر متعلکین تو دو گھنٹے پہلے انتقال سلطے میں شہر گئے ہوئے ہیں اور اب تک قلعہ واپس نہیں آئے۔ شہر کے اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے چاہا کہ حارث کے گھر جا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے مگر اس نے اس ارادے کو خود ہی اس لئے کہ وہاں امیر شمس الدین المقدم سے بھی ملاقات ہو سکتی تھی جو اسے وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔

شمس الدین المقدم کی ذہنی کیفیت کے بارے میں وہ جس قدر غور و قدر الجھتا چلا جاتا۔ جس وقت صلاح الدین قاہرہ میں تھا اس وقت یہ دمشق میں امراء کی اس جماعت میں شامل تھا جو صلاح الدین کی ہمدردی جب سلطان نور الدین زنگی کے انتقال پر صلاح الدین کو دمشق آکے کاروبار

میں اس میں کس طرح دخل دے سکتا ہوں۔" فرخ شاہ اس کے
بچنے لگا تھا۔

خبر کوئی بات نہیں۔ میں اس وقت تک ٹھہرا رہوں گا۔" المقدم نے بے
کلام کیا۔

فرخ شاہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور امراء نوریہ کے ساتھ کھڑا کر دیا۔
محسوس کیا کہ امراء نوریہ میں سے کسی نے بھی اس سے صاحب
نہیں کی۔ امراء دراصل المقدم کی تلمون مزاجی سے واقف تھے اور تلمون
سان کسی کا وفادار نہیں رہ سکتا۔ بعض امیروں نے تو اس کی طرف سے
لیا تھا۔

رملاح الدین کو اپنی بات کا کس قدر خیال تھا۔ وہ جامعہ دمشق آیا تو
نے اسے باری باری سلام پیش کیا۔ جب المقدم کی باری آئی تو سلطان نے

"امیر المقدم ہم نے آپ کو طلبک عطا کیا۔ اس وقت سند دینے کا موقعہ
کل فرمان آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔" پھر جیسے سلطان کو کچھ یاد آگیا وہ
تمہاری بیٹی کہاں ہے؟

بد قسمی سے وہ بیمار ہو گئی ہے سلطان معظم۔" امیر المقدم نے جواب دیا
خ شاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔

مظان فرخ شاہ سے مخاطب ہوا۔ "امیر زادے تم سند حکمرانی اور ان کی بیٹی
م ان کے گھر پہنچا دیتا۔"

فرخ شاہ نے اطاعت میں سر جھکا لیا۔

سلطان صلاح الدین اور فرخ شاہ تقریب کے ہنگاموں میں لگ گئے۔ قاضی
جامعہ دمشق کے پیش امام نے سلطان کو خلیفہ مستمن کی بھیجی ہوئی تلعت

پہنائی۔ گلو بند زیب گلو کیا اور کلاہ بندی کی رسم ادا کی گئی۔ عوام کو
اس تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ اپنے محبوب سلطان کو ایک

لئے کے لئے جامعہ دمشق کے گرد دور دور تک جمع ہو گئے تھے۔ سلطان نے
بایں نہیں کیا اور رسوم کی ادائیگی کے بعد وہ جامعہ دمشق کے اس اونچے

پر کھڑا ہو گیا جہاں سے موزن اذان دیتا تھا۔
گام نے اپنے نئے سلطان کو دیکھا تو نعرہ ہائے مسرت بلند کئے۔ انہیں یوں

المقدم کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے کترا کے نکل جاتے اگر امیر زادہ
شاہ اس کی مدد نہ کرتا تو وہ نہ تو سلطان تک پہنچ سکتا اور نہ طلبک کی
حاصل کر سکتا۔

شمس الدین المقدم کو اگرچہ معاف کیا جا چکا تھا اور اس کا علم تھا
نوریہ کو ہو چکا تھا لیکن جب امیر المقدم جامعہ دمشق پہنچا تو وہ ہر شخص
اجنبی تھا۔ پہچاننے والوں نے بھی اسے پہچاننے کی کوشش نہ کی۔ وہ در
ادھر بھٹکتا رہا کسی نے اس سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ تو اتفاق تھا
زادہ فرخ شاہ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ المقدم کو اکیلا دیکھ کر اسے اگرچہ
تھا اور شاید غصہ بھی آیا تھا لیکن اس نے شرافت کا دامن نہ چھوڑا
کارکن کی حیثیت سے المقدم کا استقبال اس کا فرض تھا۔ فرخ شاہ
کے ساتھ اس کے پاس پہنچا۔

"خوش آمدید امیر شمس الدین المقدم۔" فرخ شاہ نے پر جوش انداز
کا استقبال کیا۔

"ہاں امیر زادے میں سلطان صلاح الدین کے حکم سے کیسے
تھا۔ المقدم نے رک رک کر کہا۔ "پھر آپ نے بھی تو تائید کی تھی۔"

امیر زادہ فرخ شاہ اس کے اس کھردرے انداز گفتگو سے بہت چڑا
نے ضبط سے کام لیا۔

"تشریف لے چلے امیر محترم۔" فرخ شاہ نے منذب طریقے سے
آپ کو صحیح مقام پر پہنچا دوں گا۔"

فرخ شاہ کی اس پیش کش پر بھی اس نے کسی خوشی کا اظہار نہ
"امیر زادے آپ زیادہ تکلیف نہ فرمائیے۔" المقدم کا یہی کھردرا

"آپ بس مجھے جلدی فارغ کر دیجئے۔"

فرخ شاہ نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا امیر محترم۔ آپ تقریب میں
ہیں کیا اندر تشریف نہیں لے چلیں گے۔"

"اگر طلبک کی سند حکمرانی مجھے آپ یہیں پہنچا دیجئے تو آپ کا
امیر المقدم نے بڑی بیگانگی سے کہا۔

"امیر محترم - آپ کیا فرما رہے ہیں۔ سند حکمرانی آپ کو

محسوس ہوا جیسے خدا نے انہیں صلاح کی صورت میں پھر سلطان نور اے دیا ہے۔ عوام کا یہ احساس ایک ایسی حقیقت بنا جسے دنیا نے تسلیم کیا پر اے سب ہی یہ پکار اٹھے کہ جس پورے کی نورالدین نے آبیاری کا ایک تناور درخت کی صورت میں بلند ہوا۔

شادیوں میں عام طور سے دولہا کے ساتھ شہ بالا ہوتا ہے تو اس آگر صلاح الدین کو دولہا تصور کیا جائے تو شہ بالا کا روپ فرخ شاہ تھا۔ امیر زادہ فرخ شاہ کو بھی خلیفہ بغداد نے نلعت عطا کی تھی اور تقریب میں نلعت زیب بدن کر کے آئے تھے۔ پھر چونکہ وہ اور گور متنگین اس تقریب کے کرتا دھرتا تھے اس لئے فرخ شاہ ایک شہ بالا میں سلطان صلاح الدین کے گرد گھوم پھر رہا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ عظیم تقریب بخیر و خوبی انجام پڑی ہوئی۔ دوسری نے دربار خاص منعقد کیا۔ اس دربار میں سلطان نے اپنے امراء اور سرداروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں انعام و اکرام مرتبہ اور خاک جاکیروں سے نوازا۔ اسی دربار میں امیر شمس الدین المقدم کو حاکم حلب جانے کا اعلان ہوا۔ امیر المقدم چونکہ دربار میں موجود نہ تھا اس لئے اس حکمرانی امیر زادہ فرخ شاہ نے وصول کی۔

پھر جب امیر زادہ فرخ شاہ امیر شمس الدین المقدم کی بیٹی کا نکاح المقدم کی سند لے کر حارث کے گھر پہنچا تو گھر پر سوائے المقدم کے موجود نہ تھا۔ گھر کے خالی ہونے کی وجہ نہ تو امیر زادے نے دریافت کی شمس الدین المقدم نے یہ ضرورت محسوس کی کہ وہ اس کی وضاحت کر طرح فرخ شاہ کو یہ علم ہی نہیں ہو سکا کہ ارمانہ کہاں اور کس حالت میں کئی دن کے بعد سلطان صلاح الدین نے فرخ شاہ کو بتایا کہ امیر المقدم اپنا نیا عہدہ چھٹانے کے لئے۔ حلب روانہ ہو چکا ہے اور یہ شمس الدین اور اسکی بیٹی۔ حلب کو روانگی سے پہلے سلطان کی سلامی ہوئے تھے۔ ان حالات میں امیر زادے فرخ شاہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ارمانہ کا خیال چھوڑ کے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خلوص دل جائے اور غیب سے بہتر حالات پیدا ہونے کی امید رکھے۔

قرون حماہ پر 1175ء کو امیر صلاح الدین نے موصل اور

نہوں کو شکست دی اور شاہ حلب ملک الصالح نے صلاح الدین سے صلح اے دمشق اور شام کے تمام مقبوضہ علاقوں کا خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا۔ 1175ء کو خلیفہ بغداد المستنصر علی طرف سے اسے مصر و شام کے ہونے کی سند موصول ہوئی جس کا جشن سلطان نے جامعہ دمشق میں منایا۔ ۲ بعد اس سال کوئی اور واقعہ پیش نہ آیا۔ سوائے اس کے ملک الصالح کا مصر کے خطبہ سے اور سکے سے خارج کر دیا گیا اور ان دونوں ملکوں امجد میں صلاح الدین ایوبی کی خود مختار حکمرانی کی حیثیت سے خصوصی مانگی گئیں۔

شہ سلطان منانے کے دن ہی سے شام اور مصر کی مساجد میں الصالح کی سلطان صلاح الدین کا نام خطبہ میں شامل کیا گیا۔ جہاں تک سکوں کا تعلق ن سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ صلاح الدین کے مصر سے دمشق کے بعد کچھ عرصہ تک سکہ ”الصالح“ کے نام پر چلتا رہا پھر سکے میں الصالح کے ساتھ صلاح الدین کا نام بھی شامل ہو گیا۔ یہ سکے غالباً صلاح الدین دمشق پر قبضہ کے بعد دمشق کی کسکال سے جاری ہوئے تھے۔ ان دونوں کے سکے آج بھی برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ پھر ملک الصالح اور صلاح کے معاہدہ کے بعد جس میں صلاح الدین ایوبی کو مصر اور شام کے تمام علاقوں کا بادشاہ تسلیم کیا گیا تھا مصر کی کسکال سے جو سکے جاری ہوئے ان ملک الناصر یوسف بن ایوب“ درج کیا گیا۔

ام خیال یہ تھا کہ قرون حماہ پر موصل اور حلب کی مشترکہ فوجوں کو جو ہوئی اس کے بعد زنگی خاندان اور ایوبی خاندان کی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا باقی نہیں ہوا۔ سلطان صلاح الدین اگرچہ سال کے باقی دنوں میں بظاہر ملکی میں مصروف رہا مگر درپردہ وہ نئی فوج بھرتی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس اسے بھی آزمودہ کار فوجی دستوں کو منگوا کر دمشق کے لشکر میں شامل کر دیا

ملکی طرف زنگی خاندان کا شاہ الصالح خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کا سب بامہر والی موصل سیف الدین غازی اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا۔ شاہ کی جنگ میں وہ بذات خود شریک نہیں ہوا تھا بلکہ موصل کے لشکر کی لاری اس کے بھائی عزیز الدین زلقندار نے کی تھی اور اس کی ماتحتی میں

پڑے بھائی۔“ ملک الصالح نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ”صلاح الدین نے
ہی اور اطاعت گزاری کا یقین دلایا ہے پھر ہم اس کے خلاف کیسے
ہیں؟“

”الصالح“ سیف الدین نے بڑی حقارت سے کہا۔ ”تمہاری حیثیت ہی کیا
اب کے ایک کٹھ پتلی بادشاہ ہو۔ وہ بھی میری وجہ سے اگر تمہارے
برا خوف نہ ہوتا وہ تمہیں تخت سے اتار کر اپنی بادشاہی کا اعلان

الصالح کو والی موصل کی یہ بات بہت ناگوار گزری۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکا
یہ بات واقعی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پس وہ اپنی ذلت کو پی کر رہ گیا
نہ بات کشمکشیں پر ڈال دی اس نے سیف الدین کو جواب دیا۔

”بھائی“ آپ نے جو فرمایا میں اسے درست تسلیم کرتا ہوں لیکن
ریا اقرار سے حلب کے لشکر پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دراصل فوج
امیر سعد الدین کشمکشیں کے کہنے میں ہے اگر امیر اجازت دیتے ہیں تو
کار نہیں۔“

کشمکشیں تو صلاح الدین سے ادھار کھانے بیٹھا تھا۔ وہ تو صلاح الدین
یا اس کی موت کے دن میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ سیف الدین کے
لے کے آنے سے اسے امید بندھی تھی کہ شاید اب صلاح الدین کو
اے۔ اس نے سیف الدین کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا دیا تھا۔
کے تحت ہی سیف الدین نے ملک الصالح کو کٹھ پتلی بادشاہ کہا تھا۔

الصالح نے بات کشمکشیں پس ڈالی تو سیف الدین نے ہنس کے کہا۔ ملک
لر کو کہ تمہارا وزیر امیر کشمکشیں تم سے زیادہ عقلمند ہے۔ اس وقت
نا کی بڑھتی ہوئی طاقت پر ایک کاری ضرب لگا کر اسے ہمیشہ کے لئے
مکا ہے وہ ابھی صرف نام کا سلطان بنا ہے اگر واقعی ہم نے اسے
کا موقع دیا تو پھر موصل اور حلب بھی اس کی طاقت کے سامنے بند
کھیں گے۔ کیوں امیر کشمکشیں تمہارا کیا خیال ہے؟“

کشمکشیں اور عزیز الدین زلقندار دونوں اس گفتگو میں شریک تھے۔
کشمکشیں نے فوراً جواب دیا۔ ”والی موصل کا خیال بالکل درست ہے۔
ہے کہ صلاح الدین کی طاقت کے اس پودے کو جس نے اس زمین سے

حلب اور موصل کا مشترکہ فوجوں نے قرونِ حماہ پر شکست کھائی تھی۔ اپنے
کی اس شکست پر سیف الدین نے غم کے آنسو تو بہائے مگر سلطان صلاح
کو ملک شام کا سلطان تسلیم نہ کیا اور بدلہ لینے کی کوششیں کرتا رہا۔

والی موصل۔ سیف الدین نے دیارِ مکر اور الجزیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی جاگہ
سے نئی فوج بھرتی کی۔ اس طرح اس کے پاس چھ ہزار کا لشکر ہو گیا۔ اس
خیال میں یہ لشکر بھی ناکافی تھا۔ اس لئے وہ مزید لشکر حاصل کرنے کے لئے
پہنچا۔ حلب میں سیف الدین کا بھائی عزیز الدین زلقندار پہلے سے موجود تھا۔
کے علاوہ امیر سعد الدین کشمکشیں بھی حلب ہی میں تھا۔ زلقندار اور کشمکشیں
نے اس معاہدہ کی مخالفت کی تھی جس میں الصالح نے صلاح الدین کو مہر
شام کے مقبوضات کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔

سیف الدین کی اچانک مدد چھ ہزار کا لشکر لے کر حلب پہنچ جانے
الصالح پریشان ہو گیا۔ اس نے صلاح الدین سے معاہدہ پر دستخط کئے تھے۔
الدین نے اسے زبانی طور پر یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ اس کا وفادار رہے گا۔
کے ساتھ ہی صلاح الدین نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس وفاداری اور امانت
گزاری کے باوجود دمشق کے قریب یا دمشق کے خلاف کسی قسم کی ٹو
برداشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس مسئلہ پر الصالح اور سیف الدین میں کچھ
گرمی بھی ہوئی تھی۔

سیف الدین نے کہا تھا۔ ”تم ابھی بچے ہو۔ صلاح الدین کو چالوں کو
سمجھ سکتے۔ جس نے دمشق پر قبضہ کر لیا ہو وہ تمہارا وفادار کس طرح
ہے۔“

الملك الصالح سیف الدین سے چھوٹا تھا اور اسے ”بڑے بھائی“ کہہ
مخاطب کرتا تھا۔ چنانچہ ملک الصالح نے جواب دیا۔ ”معاہدہ کو ابھی سال بھی
گزرا۔ ہم کس طرح اس معاہدے کو توڑ سکتے ہیں۔“

سیف الدین گھبر گیا۔ ”ملک الصالح اس وقت کو یاد کرو جب تم پر رقت
تھا اور تم نے مجھ سے مدد طلب کی تھی میں تمہیں صاف جواب دے کر
الدین سے صلح کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور معقول فوج اپنے بھائی
سالاری میں تمہاری مدد کو روانہ کر دی۔ کیا اس کا یہی صلہ ہے کہ تم نے
سے انکار کر دو؟“

سر نکالنا شروع کیا ہے فوراً" جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیں۔"

ادھر دمشق کے قلعہ میں ایک شب شام کے مشرقی علاقہ سے آئے ایک جاسوس نے سلطان صلاح الدین سے فوری طور پر ملنے کی درخواست سلطان پر حشیش کا ایک فدائی حملہ کر چکا تھا اس لئے سلطان نے رات ملاقات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ شاہی محلات کے ناظم نے جاسوس کو روک دیا اور صبح تک انتظار کرنے کا حکم دیا۔ جاسوس اڑ گیا اس نے غم کہا۔

"ناظم محترم اگر آپ نے مجھے سلطان تک پہنچنے سے روکا تو میں دیواریں پھاند کر ان تک پہنچ جاؤں گا۔ اس لئے کہ میں سلطان کو جو اپنا چاہتا ہوں ان کا تعلق سلطنت دمشق کی سلامتی سے ہے اور میں اپنے اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔"

پیچھا ناظم پریشان ہو گیا جاسوس کو باہر ہی چھوڑ کے وہ سلطان کو اطلاع پہنچا۔

"سلطان معظم ایک جاسوس شام کے مشرقی علاقے سے آیا ہے۔ او عالی میں فوراً پیش ہونا چاہتا ہے۔ میں نے اسے صبح تک انتظار کرنے کو بھڑک اٹھا اور بولا کہ جو اطلاع سلطان تک پہنچانا چاہتا ہے اس کا تعلق دمشق کی سلامتی سے ہے اور اگر اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر صورت میں آپ تک پہنچے گا۔"

سلطان صلاح الدین کو یہاں تک اطلاع مل چکی تھی کہ والی موصل اور الجبزیہ سے فوج بھرتی کر رہا ہے مگر اس کے آئندہ کے ارادوں کا نہیں۔ اس جاسوس کے آنے سے سلطان کا ماتھا ٹھنکا۔ ہر چند کہ وہ راستہ کم کسی سے ملاقات کرتا تھا پھر بھی وہ جاسوس کو نظر انداز نہ کر سکا۔ سلطان نے قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ "جاسوس کی شناخت کے پیش کیا جائے۔" وہ ایک پرانا جاسوس تھا۔ اسے سب ہی پہچانتے تھے محلات نے اس کی شناخت کی اور غلام کے ساتھ جاسوس کو حضور عالی دیا۔ سلطان کچھ کافذات کا مطالعہ کر رہا تھا انہیں چھوڑ کر وہ جاسوس ہوا۔

"خبر وہ کونسی خبر ہے جس نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اسی وقت ہمارے لئے بھد ہوئے جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ رات کے وقت صرف اہم بات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔"

خبر کو شاید اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا اسی لئے پر اعتماد لہجے میں بولا۔

"غلام کی خبر کا تعلق والی موصل سیف الدین کے ان اقدامات کے بارے میں ہے جو سلطنت دمشق کے لئے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔"

خبر نے رک کر سلطان کی طرف دیکھا وہ سلطان کے چہرے پر اپنی بات کا رکنا چاہتا تھا مگر سلطان کا چہرہ پہلے بے تاثر تھا اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

کوئی ہو مگر اس کا یہ تعجب سلطان نے خود ہی دور کر دیا۔

"خبر اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سیف الدین نے دیار بکر اور الجبزیہ سے فوج بھرتی کر کے اپنے لشکر کو دوگنا کر لیا ہے تو ہمارے لئے یہ خبر نئی نہیں کیونکہ دیار بکر اور الجبزیہ سے یہ اطلاعات ہمیں پہلے ہی موصول ہو چکی ہیں۔"

"سلطان معظم" خبر نے پہلے جیسے اعتماد سے کہا۔ "اگرچہ میری اطلاع کا یہ اسی سلسلے سے ہے لیکن میری خبر کا آغاز سیف الدین کے حلب پہنچنے اور ان روزنامے ہونے والے واقعات سے ہے اگر عالی جاہ کو ان باتوں کی بھی اطلاع مل چکی ہے تو غلام اپنی کم فہمی کی معافی کا درخواستگار ہے۔"

خبر نے ٹکھنوں سے دیکھا کہ سلطان اس کی بات پر چونک پڑا۔

"خبر جلد کو تم کیا خبر لائے ہو؟" سلطان نے بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔

خبر کا چہرہ دک اٹھا اس نے بڑے اطمینان اور سکون سے کہنا شروع کیا۔

عالی جاہ والی دمشق کے پاس اپنا چھ ہزار کا لشکر تھا۔ اس نے دیار بکر اور بڑے مقامات سے بھی اتنا ہی لشکر اور بھرتی کیا لیکن وہ خود کو سلطان دمشق کے مقابلے پر آنے کے لئے مطمئن نہ کر سکا۔ پھر اس نے حلب کا رخ کیا وہاں والی موصل کا بھائی زلفندار جو قرون حماہ میں میدان چھوڑ بھاگا تھا حلب میں موجود تھا۔

خبر نے رک کر سانس لی پھر آگے چلا۔ "سیف الدین نے ملک الصالح سے طلب کے لشکر کو طلب کیا تاکہ وہ اسے آپ کے خلاف استعمال کر سکے لیکن غلام کی اطلاع کے مطابق ملک الصالح کی نے انکار کر دیا۔ پھر شاید ملک الصالح کو شہر کی نوک پر رضامند کر لیا گیا اور حلب کا لشکر دغا باز کشتگین کی سالاری میں

جگہ حلب سے صرف پندرہ میل کے فاصلہ پر تھی۔ یہ دست بدست بی خوریز تھی۔ ایک طرف خاندان زنگی کے تمام خانوادے ایک عظیم لشکر جمع کر رہے تھے تو دوسری طرف خود سلطان صلاح الدین اپنے بہت سے ارادوں اور دمشق اور مصر کے آزمودہ کار سپاہیوں کے ساتھ داد شجاعت دے رہے تھے۔ جنگ میں ایک وقت ایسا آیا کہ سیف الدین کے حلیف ارمل کے لئے اپنے دستوں کے ساتھ صلاح الدین کے میسر (بایاں بازو) پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین قلب میں لڑ رہا تھا کہ اسے اپنے پیچھے ہٹنے کی خبر ملی۔ سلطان نے فوراً اپنے حفاظتی دستہ کو ساتھ لیا اور اور طوفان کی طرح ارمل کے حکمران کے دستوں پر جا پڑا۔

سلطان صلاح الدین کے اس حملہ نے جنگ کا نقشہ بدل کیا۔ کہاں تو اس کا ہاتھ ہو کر پیچھے ہٹ رہا تھا اور کہاں یہ حالت ہوئی کہ شکست کھاتے ہوئے نہ ہٹ کر حملہ کر دیا۔ ادھر سلطان کے مخالف دستے نے ارمل کے دستوں کو ہار دے کر دھری مار سے وہ ایسے گھبرائے کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ اس کا بدھرمنا اٹھا بھاگ پڑا۔ ارمل والوں کے بھاگتے ہی سیف الدین کا رعبی بدحواس ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔ اتنا بیک یعنی خاندان زنگی کے کئی بڑے افسر اس جنگ میں کام آئے۔ کیپ اور گھوڑے، خیمے اور سامان سب ان افواج کے ہاتھ لگا۔

سلطان کی جنگ نے سلطان صلاح الدین کی قائدانہ اہلیت اور جنگی کامیابیوں کا ثبوت مہیا کر دیا۔ بے شمار قیدی زخمی ہاتھ آئے جن میں بڑے بڑے افسر تھے۔ سلطان نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ان پر نہ کوئی سختی کی اور نہ زنجیوں کا اس نے خود علاج کرایا اور انہیں آزادی دیدی کہ وہ تندرست کے بعد جہاں جی چاہے جاسکتے ہیں۔ اس طرح اس دشمن کے سپاہیوں کے لئے اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ بہت سے سپاہیوں نے سلطان کے لشکر میں شمولیت کی جنہیں سلطان نے فوراً ملازم رکھ لیا۔

سلطان کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر تھے کہ تندرست ہونے والے ان میں سے ایک بھی واپس نہیں گیا اور بہتوں نے لشکر سلطانی میں شمولیت کر لی۔ زنگی خاندان کے جو افسر گرفتار ہوئے تھے انہیں سلطان نے نہ مارا نہ مارا بلکہ انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کیا وہ لوگ حلب موصل

سیف الدین کے ساتھ حلب چھوڑ چکا ہے۔ اس سے آگے کا حال بیان نہیں کر سکتا اس لئے کہ میں حلب چھوڑ کر دمشق کی روانہ ہو گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے شاید اطمینان کا سانس لیا۔ ”ہمیں تمساری کارگزاری سے مسرت ہوئی مگر تم اپنے کام پر واپس جاسکتے ہو۔“

ابن خلدون کے مطابق سیف الدین غازی 571 ہجری 1176ء میں سلطان صلاح الدین سے اپنے لشکر کی شکست کا بدلہ لینے موصل سے روانہ ہوا۔ اس نے کیسف اور ماردین کے حکام کو ملا کر چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور رجب الاول میں نصین پہنچا وہاں اس نے موسم سرما گزارا۔ جب غازی کا لشکر وہاں زیادہ دیر تک رہنے سے گھبرا گیا تو اس نے حلب کی طرف کوچ کیا۔ وہاں اس کے ساتھ ملک الصالح کا لشکر کشمکش کی قیادت میں شامل ہو گیا۔

واقعات کچھ بھی ہوں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ والی موصل کے لشکر کے ساتھ حلب کا بھی لشکر تھا جس کی قیادت کشمکش کے سپرد تھی اور یہ بھی سب تسلیم کرتے ہیں یہ مشترکہ لشکر اس بادشاہی صلاح الدین کے لشکر سے دو گنا سے کم نہ تھا۔ سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ دمشق سے بڑی تیزی سے روانہ ہوا۔ روایت ہے کہ ۱۱ اپریل ۱۱۷۶ء کو جب سلطان نے دیار اہل عرب عبور کیا تو اتنا زبردست سورج گرہن تھا کہ زمین پر اندھیرا چھا گیا اور دہر میں آسمان پر تارے چمکنے لگے۔ لیکن سلطان اس بدشگونی کے باوجود آگے بڑھتا رہا۔ حالانکہ اس کے کئی سرداروں نے اسے گرہن کے دوران لشکر کو کھینچنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

سلطان صلاح الدین، حماہ سے کچھ آگے بڑھا تھا کہ وہ ایک حادثہ سے بال بال بچ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت سلطان کے سپاہی الزکمان اپنے گھوڑوں کو ادھر ادھر پانی پلاتے پھر رہے تھے کہ والی موصل سیف الدین کا لشکر اچانک اس کے سر پر پہنچ گیا۔ سیف الدین کے لئے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ سلطان کے منتشر لشکر پر حملہ کر دے۔ اس صورت میں اس کی کامیابی کے بہت امکانات تھے لیکن سیف الدین خود جھجک گیا اور فوجوں کو ترتیب دے کر جنگ فیصلہ کیا۔ پھر جب دوسرے دن مقابلہ پر آیا تو اس نے سلطان کو اپنے مقابلہ تیار کیا۔

یہ جنگ جس مقام پر لڑی گئی اس کا نام تل سلطان Mount of Sultan

بچے تو سلطان کی تعریف کرتے کرتے ان کے منہ نہ نکلتے تھے۔

سلطان نے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ تو ایسا سلوک کیا کہ وہ سلطان گرویدہ ہو گئے مگر اس نے اپنے لشکریوں کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر سلوک کیونکہ اسی لشکر کے زور پر سلطان نے قتل سلطان کا معرکہ سر کیا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ میدان جنگ میں جس قدر بھی مال غنیمت حاصل ہوا ہے وہ تمام لشکریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح سلطان کے لشکریوں کو اس مال غنیمت ملا کہ وہ سلطان کی کمان میں ہر جگہ لڑنے کو آمادہ ہو گئے۔

سلطان صلاح الدین کے لشکر نے قتل سلطان کی کمان میں بڑی جانفشانی تھی مگر سلطان نے لشکر کو مال غنیمت دے کر خوش کر دیا تھا اور وہ مطمئن دوسرے معرکہ کے لئے تیار تھے پھر سلطان نے انہیں چند دن آرام دیا پھر یا مرغہ کی طرف کوچ کیا۔ یہ مقام قتل سلطان سے ایک دن کی مسافت پر سلطانی لشکر کی کامیابی کی خبر دور دور تک پھیل گئی تھی اس لئے حاکم نہروے مقابلہ کے قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔

سلطان صلاح الدین فوجی حکمت عملی میں ید طولی رکھتا تھا۔ اسے احساس تو لشکر مزید فتوحات کا خواہاں ہے اس لئے اس نے نہ صرف ایک دن کے بعد من بچ کی طرف کوچ کیا۔ من بچ قریب ہی تھا وہاں کا حاکم قطب نیال بن المن بچ تھا۔ وہ اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے بہت بدنام تھا۔ سلطان آمدن کر وہ موصل بھاگ گیا۔ والی موصل سیف الدین غازی شکست کھانے بعد اپنے دارالسلطنت موصل پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی عزیز الدین زک کو بچے کچے سپاہیوں کے ساتھ حلب بھیج دیا تھا۔ سیف الدین غازی شاید صلاح الدین سے کسی مقابلہ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے حاکم قطب الدین نیال کو خوش آمدید کہا اور اسے رقبہ کا حاکم بنا دیا۔

ادھر سلطان صلاح الدین ایوبی نصرت اور کامرانی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اعزاز پہنچا۔ یہ مشہور اور مضبوط قلعہ من بچ سے مغرب جانب واقع تھا۔ نے وہاں پہنچتے ہی قلعہ کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

عقاب آشیانہ

قلعہ اعزاز بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اس کا بڑا سخت دیکھا تھا لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود قلعہ کی طرف سے صلح کا سکوئی نہیں آیا۔ سلطان پر حشیش کے قاتلوں کی طرف سے ایک حملہ ہو چکا تھا سلطان نے فیصلہ کر لیا تھا وہ خانہ جنگی سے فارغ ہونے پر ان کرایہ کے ان کا ضرور کچھ ہندو بست کرے گا لیکن خانہ جنگی کا یہ سلسلہ ختم ہونے ہی نہ آ رہا تھا۔

15 مئی 571 عیسوی کو محاصرہ شروع ہوا تھا کہ اس کے آٹھویں دن ان کے ایک فدائی نے سلطان پر پھر قاتلانہ حملہ کیا۔ سلطان پہلے ہی حملہ غلط ہو گیا تھا اور محاذ پر اور زیادہ محتاط رہتا تھا۔ اس شب سلطان اپنے ایک رکے خیمے میں آرام کر رہا تھا کہ اچانک ایک فدائی خیمے میں گھس آیا۔ ان کے کسی طرح پتہ لگایا تھا کہ سلطان اس رات کسی سردار کے خیمے میں آکرے گا۔

جس وقت سلطان پر حملہ ہوا سلطان نیم دراز تھا۔ اس نے خود کے پیچھے کا سر پر ڈال رکھا تھا۔ قاتل نے سلطان کی گردن پر وار کیا اور خنجر خود سے اکر رہ گیا۔ پھر اس نے دوسرا وار گردن پر کیا۔ سلطان چونکہ بیٹھا تھا اس پر بڑی طرح بدافعت نہ کر سکا اور فدائی کا خنجر سلطان کی گردن تک پہنچ گیا۔ خنجر اس جالی میں الجھ گیا جو سلطان گردن کے گرز باندھتا تھا۔ اس لئے گردن گردن کو زخم نہ پہنچا سکا۔

سلطان نے اس کی کلائی پھڑکی اود جھٹکا دے کر خنجر چھین لینے کی کوشش کی

مکشین نے فدائین سے دوسری مرتبہ سلطان پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ پہلے کے لئے مکشین نے فدائین کے سردار اعلیٰ شیخ الجبل کو ایک خطیر رقم ادا کی۔ سلطان صلاح الدین اب مکشین سے اس قدر برکشتہ خاطر ہو گیا تھا کہ اعزاز سے فارغ ہوتے ہی اس نے لشکر کا رخ حلب کی طرف کر دیا اور وہاں کے حلب کا تیسری بار محاصرہ کر لیا۔

حلب میں اس وقت والی موصل سیف الدین غازی کا بھائی زلقندار بھی تھا۔ سلطان نے محاصرہ کرتے ہی قلعہ پر حملے شروع کرادے لیکن جیسا کہ ہی بیان کیا گیا ہے کہ اہل حلب سلطان نور الدین زنگی مرحوم کے بیٹے الملک الصالح کے پاس کم از کم ایک علاقہ تو باقی رہے اس دفعہ بھی حلب والوں اس قدر زبردست مدافعت کی کہ سلطان فتح نہ کر سکا۔ جب زیادہ دن گزر گئے ہر صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر سفارتیں جاتی رہیں۔ اہل حلب کا صرف یہ مطالبہ تھا کہ الملک الصالح کے لئے حلب دیا جائے اس کے صلہ میں سلطان جو شرط نکھیں قبول کر لی جائے گی۔

آز سلطان صلاح الدین کو اہل حلب کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اس سلسلہ میں عام سا معاہدہ لکھا گیا جس میں سلطان نے ملک الصالح کی حلب ریاست کو کر لیا تھا۔ اس کے جواب میں ملک الصالح نے سلطان صلاح الدین کے تمام مقبوضہ علاقوں پر سلطان کی بادشاہی تسلیم کی۔ اس معاہدہ کی ایک خاص بات تھی کہ اس پر حلب کے علاوہ کیفار ماروین اور موصل کے نمائندوں نے بھی لکھے۔ سلطان نے اسی وقت محاصرہ اٹھا لیا اور اس کا لشکر خیمہ گاہ میں آ گیا۔

سلطان صلاح الدین دوسرے دن دمشق واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ قلعہ حلب کی طرف سے ایک درخواست موصل ہوئی۔ قلعہ کا خاص ہرکارہ الصالح کا پیغام لے کر آیا تھا جس میں سلطان صلاح الدین سے درخواست کی تھی الملک الصالح کی چھوٹی بہن یعنی شہزادی حلب کو اپنے حضور میں باریابی اجازت دے۔ سلطان صلاح الدین نے اس پر مسرت کا اظہار کیا اگر انہیں گد میں آنے میں کوئی تکلیف ہو تو سلطان صلاح الدین ان سے ملاقات کے قلعہ حلب میں آنے کے لئے تیار ہے۔

مگر خنجر اس کے ہاتھ میں اس قدر جما ہوا تھا کہ نہ چھٹ سکا۔ سلطان نے فوراً اپنا خنجر نکال کے فدائی کے سینے میں اتار دیا۔ قاتل زمین پر گر گیا لیکن خنجر اب تک اس کی انگلیوں میں چپکا ہوا تھا۔

سلطان ابھی سنبھلتے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور فدائی تیزی سے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے سلطان پر بھرپور وار کیا لیکن سلطان اب کھڑا ہو چکا تو اس نے ایک ہاتھ سے قاتل کے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کے اس زور سے مروٹی کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت سلطان نے پہرے کے محافظ کو آواز دی۔

محافظ اس تیسرے فدائی سے الجھا ہوا تھا جو سلطان کے خیمے سے اب واپس نہیں آئے تھے۔ آخر تھوڑی جلد جند کے بعد محافظ نے اس فدائی کو جہنم بھیج دیا۔ اس وقت تک لشکر بیدار ہو چکا تھا اور بہت سے لشکری وہاں ہو گئے تھے جہاں تیسرا فدائی مارا گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین بھی خیمہ کے آگیا۔ اس نے حکم دیا کہ خیموں کے گرد سخت پہرہ لگادیا جائے اور ہر اجنبی گرفتار کیا جائے اگر کوئی بھاگے تو اسے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔

رات بھر لشکر میں پھیلے ہوئے فدائی گرفتار ہوتے رہے۔ ان سے پتہ چلا درجنوں فدائی لشکر میں ملازم ہو چکے ہیں اور یہ تینوں فدائی جو اس وقت آ گئے ہیں سلطان کے محافظ دستہ میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ صلاح الدین نے تمام گرفتار فدائین کے سر قلم کرادیے۔

صبح کو سلطان نے قلعہ اعزاز پر چاروں طرف سے حملہ کیا۔ اس حملہ قلعہ اعزاز کو نقصان تو بہت پہنچا لیکن قلعہ فتح نہ ہو پایا۔ آخر سلطان نے کر دیا کہ جب تک قلعہ فتح نہیں ہوگا لشکر کسی طرف نہیں جائے گا اور خیمے لگے رہیں گے۔

قلعہ پر روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا تھا محاصرہ اس قدر سخت تھا کہ نہ کوئی اندر جاسکتا تھا اور نہ کوئی اندر سے باہر آسکتا تھا۔ قلعہ میں آہستہ سامان رسد ختم ہونا شروع ہوا۔ آخر اڑتیس یا چالیس دن کے بعد قلعہ نے اپنی شکست تسلیم کرنی اور معمولی مراعات کے بدلہ میں قلعہ سلطان الدین کے حوالے کر دیا۔

اس محاصرے کے دوران ہی سلطان صلاح الدین کو پتہ چل گیا کہ ط

نہیں۔
 ”نہیں آقا زادی ہرگز نہیں“ سلطان نے زور دے کے کہا۔ ”میں آپ کے حکم سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔“
 ”یعنی آپ نے وعدہ کر لیا؟“ شہزادی پکا وعدہ لینا چاہتی تھی۔
 ”جی آقا زادی میں نے وعدہ کیا آپ فرمائیے۔ سلطان نے شہزادی کو یقین

”میں سلطان سے چاہتی ہوں کہ وہ مجھے قلعہ اعزاز عطا فرمادیں۔“ شہزادی سے سے انداز میں کہا۔

اعزاز کا معروف قلعہ صلاح الدین نے چالیس دنوں کے محاصرے کے بعد فتح پا تھا۔ محاصرے کے دوران جانی نقصان کوئی نہ ہوا تھا لیکن ان چالیس دنوں فکر کو جو جانفشانی کرنا پڑی تھی۔ سلطان نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ”اور کوئی آقا زادی“

سلطان کا مقصد تھا کہ شہزادی کی کوئی اور خواہش ہے یا وہ اس سلسلے میں نہ اور کتنا چاہتی ہے لیکن شہزادی ابھی بچی تھی وہ سمجھی کہ شاید سلطان اسے اعزاز نہیں دینا چاہتا اور اسے کچھ اور مانگنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ جلدی سے

”کیا۔۔۔ کیا سلطان نے میری درخواست نامنظور فرمادی؟“
 ”نہیں آقا زادی آپ کیسی بات کہہ رہی ہیں“ سلطان نے وضاحت کی۔
 برا مقصد ہے کہ آپ کی کوئی اور بھی خواہش ہے۔“

سلطان نے قیدہ بکاری کی طرف دیکھا جو سلطان کے مصائب وزیر اور نائبین فرائض ایک ساتھ ادا کر رہے تھے۔

”قیدہ محترم“ سلطان کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی تھی۔ میری آقا زادی کو سمجھائیے کہ اگر انہوں نے اس وقت مجھے سے دمشق بھی طلب کیا ہوتا تو اب کعبہ کی قسم میں ابھی سب کچھ چھوڑ کے مصر روانہ ہو جاتا۔ فرمان جاری ہے کہ ہم نے قلعہ اعزاز سے اپنا قبضہ اٹھالیا۔ آقا زادی کو اختیار ہے کہ وہ اس طرف سے جسے چاہیں قلعہ اعزاز کا حاکم مقرر کریں۔

پھر سلطان نے اشارہ کیا اور جواہرات سے بھرے ہوئے تین خوان لا کے ادلی کے سامنے رکھے گئے۔

القصہ شہزادی سلطان صلاح الدین کی خیمہ گاہ میں کینڑوں اور غلاموں کے جلو میں آئی۔ سلطان صلاح الدین نے خیمہ سے نکل کر شہزادی کا استقبال کیا اور بڑی عزت سے اسے خیمہ میں اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود دوسری نشست پر بیٹھ سلطان صلاح الدین طلب کی شہزادی کا اس قدر احترام کر رہا تھا جسے وہ شہزادی نہیں بلکہ سلطان صلاح الدین کا آقا نور الدین زنگی ہے۔

صلاح الدین نے بڑے ادب کے ساتھ شہزادی سے کہا۔ ”میری آقا زادی شہزادی طلب نے خیمہ گاہ میں آنے کی کیوں تکلیف گوارہ کی جبکہ میں نے قلعہ سے کہہ دیا تھا کہ شہزادی مجھے قلعہ میں بھی بلوائیں تو میں سر کے بل ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

شہزادی اگرچہ بالکل کسن تھی لیکن اس کی بہترین تربیت ہوئی تھی اس نے جواب دیا۔

”سلطان میری جو عزت افزائی فرما رہے ہیں اس کے لئے میں ان کی شکر گزار ہوں لیکن ان حالات میں سلطان کو نہیں بلکہ مجھے سلطان کے پاس نا تھا۔“

”حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں لیکن آقا زادی پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔“ سلطان کا لہجہ اور انداز اب بھی مودبانہ تھا۔ ”فرمائیے میں شہزادی کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

شہزادی نے معصومیت سے کہا۔ ”سلطان میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔“

”آقا زادی آپ مجھے شرمندہ نہ کیجئے آپ مجھے حکم دے سکتی ہیں۔“ سلطان نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اسی نرمی سے کہا۔

”سلطان وعدہ فرمائیے کہ میں جو سوال کروں گی اسے آپ نامنظور نہیں کر گے۔“ شہزادی کو جس طرح سکھا پڑھا کر بھیجا گیا تھا اس کے مطابق شہزادہ گفتگو کر رہی تھی۔ مستحکم اور ملک الصالح نے اسے سمجھادیا تھا کہ سلطان اس وقت تک سوال نہ کرنا جب تک وہ پورا کرنے کا وعدہ نہ کریں۔

سلطان نے لجاہت سے کہا۔ ”آقا زادی سوال کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ حکم دے کے دیجئے۔“

شہزادی نے بات کی تکرار کی۔ ”آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میرا سوال

سلطان نے فرمایا۔ ”آقا زادی یہ نذرانے قبول کیجئے“
 شہزادی کی خوشی کے مارے آواز نہیں نکلتی تھی اس نے گھٹی ہوئی آواز
 کہا۔ ”سلطان میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں آپ واقعی سلطان ہیں“
 سلطان نے حکم دیا۔ ”ہم اور ہمارے تمام عمائدین سلطنت حلب کی آقا
 کو حلب تک رخصت کرنے جائیں گے۔“

پھر لوگوں نے دیکھا کہ سلطان دمشق صلاح الدین ایوبی نے سارا در
 شہزادی حلب کو گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کے چلا
 مصر اور دمشق کے تمام عمائدین سلطان کے جلوس میں پایادہ چل رہے تھے
 یہ مختصر جلوس قلعہ کے دروازہ پر پہنچا تو لوگوں کی آنکھیں کھلی کی
 گئیں۔ اللہ اللہ کیا احترام تھا سلطان کو اپنے آقا کا۔ اپنے والی نعمت
 نور الدین زنگی کا۔ یہ سچ ہے کہ صلاح الدین کو ایوب نے صلاح الدین
 تھا بلکہ نور الدین زنگی کی اعلیٰ مگر خاموش تربیت تھی جس کی ٹھنڈی بھٹی
 سونا کنڈن بن کے نکلا تھا۔

صلاح الدین اور ملک الصالح کے اس معاہدہ سے جس میں ملک الصا
 ساتھ زنگی خانوادہ کے تمام معروف ارکان شامل تھے شام کی خانہ جنگی کا
 ہو گیا۔ ملک الصالح کو حلب دیا گیا تھا وہ اس پر قانع ہو گیا۔ والی موصل
 غازی نے قرون حماء اور موصل پر شکست پر شکستیں کھائیں تھیں اس
 کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بچی کچی رہا
 غنیمت سمجھے سلطان صلاح الدین سے پھر ٹکرانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ
 کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اسی دنوں سلطان کے فرنگیوں سے بھی معاہدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ
 (فرنگی) مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدہ کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے او
 نے اپنا یہ وطیرہ (وتیرہ) بنایا تھا کہ جب زور نہ چلے اس وقت تک
 پابندی کرو اور جب طاقت آجائے یا کوئی شہری موقع مل جائے تو معاہدہ
 نہ کرو۔ چنانچہ معاہدہ ہونے کے چند ہی دنوں بعد انہوں نے ”بکاع“ کی
 حملہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ فصلوں کو جلا دیا اور آبادیوں کو ویران کر دیا۔
 پر اپنے ساتھ مویشیوں کے گلے بھی لیتے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے
 مال غنیمت بھی لگا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے معاہدے کی خلاف روزی اور فرنگیوں کے ظلم و ستم
 بٹی شدت سے محسوس کیا لیکن انتقام کے ابھرتے ہوئے لاوے! اسے
 کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کرنا پڑا کیونکہ فرنگیوں کے علاوہ ایک اور طاقت
 تھی جس نے ابھر رہی تھی جس نے دوبار اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا یہ اس کی
 تھی کہ وہ بال بال بچ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے اس چور طاقت
 وئے کا فیصلہ کیا جو الیرز کے پہاڑوں میں بیٹھی انسانی جانوں سے کھیل رہی
 ان کرایہ کے قاتلوں نے صرف شام ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی علاقوں میں
 مچا رکھا تھا۔ پس صلاح الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کے پہاڑی علاقوں میں
 ان کے ان کا خاتمہ کرے گا۔

حلب سے معاہدے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر سے جو لشکر
 با تھا اسے واپس بھیج دیا اور باقی لشکر کے ساتھ وہ کوہ سماک کے دروں کی
 چلا۔ یہ پہاڑی سلسلہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا اور ان پر ان بد
 حشیش کا پورا پورا قبضہ تھا۔ اس طویل پہاڑی سلسلہ سے کسی قافلہ کا ٹکنا
 ممکن تھا بلکہ بعض سرداروں اور بادشاہوں نے حشیش کو ختم کرنے کے لئے
 لائی کی تو انہیں اپنی فوج سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی
 اپنے لشکر کے ساتھ ان کے مغربی مرکز میناف پر حملہ کیا تھا۔ اس حملہ کی
 بل بیان کرتے ہیں پہلے اس فرقہ حشیش جنہیں ”باہینہ“ اسماعیلیہ اور نزار بھی کہا
 ا تھا کے بارے میں کچھ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حشیش بھگ کو کہتے ہیں اور حشیش بھگ پینے والے کو کہتے ہیں مگر یہ پتہ
 نہ کہ بھگ پینا اس فرقہ کے مذہبی لوازم میں ضروری تھا یا پھر حسن بن صباح
 اس جنت جس کا نام فردوس بریں تھا اس میں داخلہ کی یہ لازمی شرط تھی۔
 جنت ارضی جس کا نام اس کے بنانے والے حسن بن صباح نے رکھا تھا۔
 با تھا بڑا دھوکہ تھا جس پر ہر دیکھنے والے کو اعتبار آجاتا تھا اور وہ اس جنت
 ہا ایک بار داخل ہونے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ دیکھنے کی آرزو پیدا ہو جاتی
 تھی۔

فردوس بریں کی دیواروں میں اوپر سے نیچے تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں اور
 مہل بہرے جواہرات جڑے ہوئے تھے جن کی چمک دمک دیکھ کر انسان پاگل سا
 ہو جاتا تھا۔ کچھ حال ایسی ہی حیرت انگیز عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کا تھا۔

خطرناک گروہ یا فرقہ کے دو اہم مرکز تھے۔ ایک مشرقی مرکز دوسرا مغربی مرکز کے دروازے جو پتھر کے ہوتے اور پہاڑوں میں اس طرح جڑے تھے کہ ان کے درمیان ذرا سی دراڑ بھی نظر نہ آتی تھی۔ ان دروازوں سے کھولنا ناممکن تھا یہ صرف اندر ہی سے کھولے جاسکتے تھے دروازوں کے ماہر تھے۔

سلام علیٰ حضرت باللہ امیر الدین و قاہر السلاسل الدین
عبارت پتھر پر ہی کندہ ہوتی تھی۔ ہر حال یہ خیشین جب اس جنت کی کل کے دنیا میں آتے تو شیطانوں سے بڑھ کے خطرناک ہوتے تھے۔ قتل اور قتل و غارت میں ایسے ماہر ہو جاتے تھے ان کی جرات پر حیرت ہوتی ہم طور سے ان شیاطین سے امیروں، وزیروں، سرداروں اور بادشاہوں کو اپنے کام لیا جاتا تھا۔ خیشین کے دفاتر پورے مشرق وسطیٰ میں پھیلے تھے جو اپنے آدمیوں سے پورا تعاون کرتے اور قتل کے بعد قاتل کو بچا دیتے تھے۔

ان قاتلوں کو شیخ الجبل کی طرف سے ”فدائین“ کا خطاب دیا گیا تھا وہ قتل نے بلکہ اپنے شیخ کے حکم پر فدا ہو جاتے تھے۔ جو فدائی پکڑا جاتا اور پھانسی مارا جاتا اسے شہید کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ لوگ شاہی محلات اور سرداروں کے خیمے میں گھس جاتے تھے اور لمحوں میں نامزد انسان کو موت کا تار دیتے تھے۔ یہ اس قدر جراتمند ہوتے تھے کہ انگریزی کا نو ASSASSIN اس خونخوار خیشین سے مشتق ہے گویا اسین اور خیشین ہم

خیشین کی تحریک میں ایک تو انسان کو بھگ کا ٹھنڈا شربت پلایا جاتا تھا اور یہ تار دیا جاتا تھا کہ یہ شرابا“ طہورا ہے اور جس پر یہ عمل کیا جاتا تھا شیخ الجبل اور اس کی جنت سے قریب قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ اس عمل ایسے ایسے قاتل بھی تھے جنہوں نے اپنے خنجر سے ایک دو نہیں بلکہ قاتل کئے تھے۔ یہ قاتل شیخ الجبل کے محبوب خدمتکاروں میں شامل ہوتے انہیں ہر ہفتہ اس جنت ارضی کی سیر کی اجازت ملتی تھی جن کی تحریک کا بانی ”حسن بن صباح“ تھا اس کا قول تھا کہ :-
”مقدس شے کو سلطنت اور مذہب کے کھنڈروں میں دفن کر دو۔“

یہ کھڑکیاں اور دروازے ٹھوس سونے یا چاندی کے بنے ہوتے تھے جن کے بیچ لعل اور زمرد جڑے جاتے تھے۔ ہر چھت مرصع تھی جن میں جواہرات جگنو ہر دم جگمگ کرتے تھے۔ فرش پر سبز بیگنہ اور ہرے بھرے درختوں پر روشنی اس طرح بکھرتی تھی جیسے قوس قزح کے ساتوں رنگ چمکھیر دئے گئے ہوں۔ درختوں پر جواہرات کے ترشے ہوئے پرندے بیٹھے دیتے تھے جو ہوا کے خشک اور سبک جھونکے کے ساتھ نغمہ سرائی کرتے دودھ کی نہریں بھی تھیں جن میں بجرے پڑے ہوتے جن میں مردوں اور کے جوڑے خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ خوبصورت پروں والی عورت نازک نازک حوریں ادھر ادھر گھومتی دکھائی دیتی تھیں۔ جنت کا سال پیرا کے لئے یہاں خوبصورت اور نوخیز لڑکے یعنی غلمان بھی مہمانوں کی خدمت نظر آتے تھے۔

یہاں ہر شخص اپنے رنگ میں مست نظر آتا تھا کسی کو کسی پر اعتراض ہوتا تھا۔ نیا مہمان جب اس جنت میں داخل ہوتا تو اسے حوریں گھیر لیتی اس کا ہاتھ پکڑ کے جنت کی سیر کراتیں۔ خوبصورت کشتیوں اور بجزوں پر وہ سیر کراتیں۔ لذیذ لذیذ پھلوں سے تواضع کرتیں۔ انہیں جو نازنین پناہ وہ اس کی خدمت پر مامور کردی جاتیں اور اسے دنیا کی ہر چیز مہیا کردی اس مہمان کو دو چار یا ایک ہفتہ اس جنت میں رکھا جاتا پھر جنت کی شراب پیالہ اسے پیش کیا جاتا جسے پیتے ہی وہ بے ہوش ہو جاتا اور وہ اس جنت پھر اس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سے اسے لایا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس جنت میں جو شخص چند دن گزار لیتا تھا وہ پھر وہاں کے لئے بے چین ہوتا اور خیشین کے امام جسے شیخ الجبل کہا جاتا تھا اسے گروہوں کی خوشامد کرتا اسے پھر جنت میں بھیج دیا جائے۔ اس طریقے سے جنت میں دوبارہ بھیجے جانے کا حکم دیا جاتا مگر مشروط طور پر شرط یہ ہوتی کہ الجبل کے نامزد کئے ہوئے شخص کو خنجر مار کر ختم کر دے۔ شیخ الجبل د کرائے کے قاتلوں کا ٹھیکہ دار تھا۔ قاتلوں کو وہ اپنی جنت کا جلوہ دکھا میں کر لیتا اور ان سے بڑے بڑے امراء، وزراء اور بادشاہوں تک کو قتل تھا اور اس سے جو کثیر رقم حاصل ہوتی تھی اسے وہ اپنی تیار کی ہوتی صرف کرتا تھا۔

چلی اور بامینہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔

بابطی حسن بن صباح کی سرداری میں آہستہ آہستہ ایران کے قلعوں پر قبضہ کرنے لگا۔ آخر 483 ہجری میں حسن بن صباح نے کوہ البرز کے ایک بلند اور بن قلعہ ”الموت“ پر قبضہ کر لیا۔ یہ قلعہ کو شہر قزوین کے علاقہ میں صوبہ ار کا ایک مشہور قلعہ تھا جس کی بلندی کی وجہ سے دیہاتی لوگ اسے طالقان شکر کا گھونٹہ کہتے تھے۔ طالقان دراصل ایک سلسلہ کوہ کا نام بھی ہے لے اسے آشیانہ عقاب بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس آشیانہ عقاب کو مرکز بنانے کے بعد عقاب یعنی ”حسن بن صباح“ ان کے لئے ملک الموت بن گیا اور اس نے قتل و خون ریزی کا بازار گرم دیا۔ پھر 485 ہجری میں اس دور کی ایک عظیم ہستی نظام الملک طوسی کو حسن صباح کے ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ اس تحریک میں لفظ فدائی کا اضافہ اسی ن بن صباح نے کیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو جنت کا فریب دے کر انہیں قاتل بنا دیا تھا اسے تحریک فدائی بھی کہا جاتا ہے۔

سلجوق سلطان ملک شاہ کی وفات پر جب جانشینی کا جھگڑا چلا تو ان نزاریوں نے یا فدائیوں نے اس بات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ملک شاہ کے جانشین باریق نے ان قاتلوں کی خدمات حاصل کر لیں وہ جس کو قتل کرانا چاہتا اس کا حسن بن صباح کو بھجوا دیتا اور چند ہی دنوں میں اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ یہ بات رہی عمادین سلطنت کو معلوم ہو گئی اور انہوں نے برکیارق پر الزام لگایا کہ وہ یہ فرقہ میں شامل ہو گیا ہے حالانکہ وہ بائینیوں سے اپنے دشمنوں کو ختم کرانے کا کام لیتا تھا۔ برکیارق کی جب زیادہ بدنامی ہوئی تو اس نے بائینیوں کو ختم کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ اس سے شہروں میں رہنے والے تقریباً تمام انہیں ختم ہو گئے اور ان کا زور ٹوٹ گیا لیکن قلعوں پر ان کا ہی قبضہ رہا۔

سلطان سنجر نے بھی فدائین کو ختم کرنے کا قصد کیا تھا مگر حسن بن صباح نے اسے صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک مغربی مورخ کے مطابق حسن بن صباح نے اپنی تحریک شام کے ملک میں بھی پھیلانے کا فیصلہ کیا اور یہ لوگ شمال مشرق سے شام میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے سلجوق امیر رضوان بن تمش ان کے قریب شامل ہوا۔ اس نے ایک ماہ تک جمعہ کے خطبہ میں فاطمی خلیفہ مستعلی کا نام پڑھوایا۔ فدائیوں نے بانیاس کو اپنا پہلا مستحکم قلعہ بنایا۔ پھر شام کے متعدد

علامہ ابن خلدون کا خیال ہے کہ شیشن سے عقائد فرقہ قرامطہ سے مل جاتے ہیں اور یہ اس فرقہ کی ایک شاخ ہے۔ قرامطہ فرقہ جو اسلام کے اصول کو نہیں مانتے تھے بلکہ ایک نئی شریعت کے موجد تھے۔ نماز صرف لاؤٹ پڑھتے لیکن طہارت اور پاکیزگی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ شراب یا عورت کو ملاپ اس فرقہ میں جائز تھا مگر شیشن کو ہم قرامطہ کی شاخ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے عقائد اسماعیلیہ فرقے سے ملتے جلتے ہیں۔ مصر کے فاطمی خلیفہ المستنصر زمانہ میں اس کی دو شاخیں ہو گئیں ایک مستعلویہ اور دوسری نزاریہ۔ مستنصر بڑے بیٹے کا نام نزار تھا۔ خلافت اس کو ملنا چاہئے تھی لیکن نزار کی بہن نے چھوٹے بھائی مستعلی کے حق میں فیصلہ دیا اور وہ خلیفہ ہو گیا۔ نزار اسکندریہ چلا گیا اور وہاں خلافت کا دعوے کیا مگر مستعلی کی فوجوں نے اسے شکست دی اور قہر کے قتل کر دیا۔

شیشن کا بانی حسن بن صباح اسی نزار کی امامت کے قائل تھے۔ حسن صباح اس کا داعی تھا اور اس نے مشرق میں اس کی دعوت دی اس لئے نزار کو مشرقی اسماعیلیہ کہہ سکتے ہیں اس حسن بن صباح کا شجرہ نصب کچھ یوں تھا۔ حسن بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن الصباح بن اطہری۔

حسن بن صباح کی ملاقات ناصر سے ہوئی جو فاطمی فرقہ کا داعی تھا تو حسن بن صباح کا جھکاؤ اسماعیلی مذہب طرف ہو گیا۔ حسن بن صباح دو اسماعیلی داعیوں کے ساتھ حلقہ اصفہان کے بزرگ شیخ ابن عطاش کے پاس پہنچا۔ شیخ ابن عطاش اس وقت رے میں مقیم تھے۔ حسن بن صباح ان کے پاس سات برس رہا پھر 471ھ میں شیخ نے اسے مصر جانے حکم دیا۔

یہ زمانہ فاطمی خلیفہ المستنصر کا تھا جس کے بیٹے مستعلی اور نزار تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں جانشینی کا جھگڑا چلا تو مصر کے وزیر امیر بدر جمالی نے حسن بن صباح کو مصر چھوڑنے پر اس لئے مجبور کر دیا کہ حسن بن صباح خلیفہ بڑے بیٹے نزار کی خلافت کے حق میں تھا۔ اس طرح حسن بن صباح پھر مصر واپس آ گیا اور ”نزاریہ“ کے نام سے دعوت دینے لگا۔ اس وقت قرامطہ کی لاؤٹ چکی تھی چنانچہ بچے کچے قرامطی اس نزاریہ تحریک میں شامل ہو گئے۔ مصر میں نزار کا چھوٹا بھائی مستعلی خلیفہ تھا اسے لئے نزار یا نزاریہ تحریک

انہیں کسی غیبی طاقت نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ انہیں اپنے اعضاء میں محسوس ہوئے۔

ابوالفراس کے مطابق یہ شیخ الجبل کی کرامت یا خرق عادت کا اثر تھا۔ اس متذہب کا عقیدہ تھا کہ شیخ انسان کی شکل میں زندہ خدا تھا چنانچہ شکست اور پریشان حال قاصد واپس صلاح الدین کے پاس گیا اور اس نے تمام بیان کی۔ ان کی محیر العقول اطلاع سے صلاح الدین بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ اپنے اوپر دونوں حملے یاد تھے۔ اب اسے (سلطان کو) شبہ ہونے لگا کہ شاید شیطان کی مافوق الفطرت طاقت سے نہ بچ سکے گا۔ اس نے اپنے خیمے درگمرا مٹی اور راکھ بکھرا دی تاکہ چوری چھپے آنے والے کے پیر کے نشان پر بن جائیں۔ صلاح الدین کے سپرد داروں کو رال کی شعلیں دی گئیں اور کو سپرد دینے والی گاڑی کو ہر گھنٹہ تبدیل ہونے کا حکم دیا گیا لیکن خوف نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس آرام کی نیند رخصت ہو گئی۔

ابوالفراس آگے چل کے ایک اور دلچسپ انکشاف کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ شب ایسا ہوا کہ سلطان کے سپرداروں نے دیکھا کہ مصیاف کی فصیل پر یک روشنی نیچے اترنے لگی۔ یہ روشنی وہاں پہنچی جہاں شیخ الجبل بیٹھا تھا پھر نئی سلطان کے لشکر میں داخل ہوئی سلطان کے خیمہ کے پاس جنگجو کی طرح درغائب ہو گئی۔ ابوالفراس کا بیان ہے کہ ٹھیک اس وقت جب مصیاف سے والی روشنی سلطان کے خیمے کے پاس آئے جنگجو کی طرح چمک کے غائب ہو گئے اسی وقت سلطان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے سائے کو خیمے سے باہر آ جاتا ہوا دیکھا۔

سلطان اٹھ کے بیٹھ گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کے لیپ کی جگہ تبدیل ہو گئی ہے۔ پھر اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے بستر کے قریب ٹکونی رکھی ہیں۔ روٹیوں کی ساخت اس طرح کی تھی جیسی اسٹیل پکاتے تھے۔ ان کے اوپر ایک کانڈ کا پرچہ رکھا ہوا تھا۔ اس پرچہ کو خنجر کی نوک سے روٹی کاٹ لیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خنجر زہر آلود تھا۔ سلطان خنجر ہٹا کر اسے اٹھاتے پڑھا تو لکھا تھا :-

سلطنت کے بادشاہ کی قسم تیرے پاس جو کچھ ہے وہ نہ رہے گا۔ ہر چیز فخر اقدار میں ہے۔ تیری طاقت اور اقدار کے باوجود فتح ہماری ہوگی۔

قلعے ان کے قبضہ میں آگئے۔ انہوں نے یہاں بھی ایرانیوں کے فدائیوں والا طریقہ اختیار کیا اور قتل و غارت گری کا کام کرتے رہے۔ اب مصیاف کو انہوں نے اپنا مرکز بنالیا تھا جہاں ان کا شیخ رہتا تھا کہتے ہیں ان کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں جب اس پر دوبارہ انہوں نے حملے کئے تو ان کا شیخ الجبل راشد اللہ بن سفیان باستان تھا۔ اس کا مرکز مصیاف تھا جس پر سلطان صلاح الدین نے حملہ کیا تھا اور اسے محاصرے میں لیا تھا۔

مغربی مورخ سلطان صلاح الدین ایوبی کی فدائیوں کے خلاف مہم کو بالکل ناکام قرار دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ سلطان فدائیوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا تھا حالانکہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سلطان نے شیخ الجبل کے بہت سے علاقوں کو تباہ کر دیا تھا اور پھر اس نے ان کے سب سے مضبوط قلعہ مصیاف کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ قلعہ سب سے مستحکم اور بلندی میں آشیانہ عقاب سے کم نہ تھا۔ اور ایک ناقابل دسترس چوٹی پر واقع تھا اس کے نشیب میں ایک ویران گھاٹی تھی۔ سلطان نے قلعہ پر شدید سنگ باری کی اور پیچہ یورش کی مگر قلعہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

فدائیوں کے ایک ہمدرد مورخ نے مصیاف پر حملہ کی ایک مافوق الفطرت تصویر کشی کی ہے جو قارئین کے مطالعہ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ یہ مورخ جو دراصل انسانہ تراش تھا اس کا نام ابو الفراس تھا اس کا بیان اس طرح ہے :-

صلاح الدین نے مصیاف کا محاصرہ کیا تو شیخ الجبل وہاں موجود نہ تھا۔ سلطان کا فرمان جس میں اسے قبول اطاعت کا حکم دیا گیا تھا وہ شیخ الجبل کے قریب ایک گاؤں میں موصول ہوا۔ اس نے قاصد سے کہا کہ وہ سلطان سے ملنا چاہتا ہے۔ محاصرہ کی وجہ سے مصیاف کا راستہ بند تھا۔ اس لئے شیخ الجبل اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک پہاڑ کی چوٹی کی طرف جا بیٹھا اور وہاں سے محاصرہ کے نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔ سلطان صلاح الدین نے (شیخ الجبل کو پہاڑی پر) دیکھا کہ شیخ الجبل سامنے کی پہاڑی پر بیٹھا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ دشمن اس کے بند میں ہے۔ اس لئے اس نے چند آدمیوں کو شیخ کی گرفتاری کے لئے چوٹی کی طرف بھیجا۔ لیکن اسے گرفتار کرنے کے لئے جانے والے اس وقت بے بس ہوئے

اور اس سے بدلہ لینے کے لئے ان خطرناک قاتلوں کے سب سے محفوظ مرکز قلعہ کیوں کرتا۔

اصل قصہ یہ تھا کہ سلطان صلاح الدین نے پہلے تو خیشن کے چھوٹے قلعے اور ایساں تیس تیس کہیں پھر اس نے ان کے مغربی مرکز مہیاف کا محاصرہ کیا۔ یہ وہ اس قدر سخت تھا اور سلطان کی منجیتوں نے قلعہ پر اس قدر پتھر برسائے کہ خیشن اور ان کے شیخ الجبل کا ناطقہ بند ہو گیا اور انہیں اپنی جیت کی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ مہیاف پر رات دن پتھر برستے رہتے تھے محاصرہ سخت تھا کہ شیخ الجبل کو باہر سے کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔ جب محاصرہ کی ایندھن سے بڑھ گئیں تو شیخ الجبل نے سلطان صلاح الدین کے ماموں شہاب الدین کے پاس اپنی سفارت بھیجی اور ان سے درخواست کی کہ وہ سلطان صلاح الدین سے اس کی جان بخشی کرا دیں۔

سلطان کے ماموں نے سلطان سے سفارش کی کہ شیخ الجبل کو معاف کر دیا جائے وہ وعدہ کرتا ہے سلطان صلاح الدین کے لشکر کی طرف کبھی رخ نہیں لے گا اور نہ سلطان کے کسی معاملہ میں دخل دے گا۔ سلطان صلاح الدین صاف انکار کر دیا کہ اس بے دین کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا پھر اس نے دو مرتبہ سلطان پر قاتلانہ حملے کرائے ہیں اس لئے اسے زندہ نہیں بڑھا جائے گا۔ شہاب الدین حاری نے شیخ الجبل کو اطلاع بھیجی کہ اس کی دل سے سلطان بے انتہا ناراض ہے اور اسے معاف کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہو رہا۔

شیخ الجبل بہت گھبرایا ہوا تھا اس نے شہاب سے درخواست کی کہ وہ شیخ کو سلطان کے سامنے پیش کرے اور شیخ الجبل خود سلطان سے معافی مانگے گا آئندہ کے بعد اس کے معاملات میں دخل دینے سے توبہ کرے گا۔ پس شہاب دین حماد سے چل کے سلطان صلاح الدین کے پاس آیا اور دوبارہ سفارش کی کہ شیخ الجبل کو سلطان کے پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ اس طرح شیخ الجبل شان و شوکت شہاب الدین حاری کے ساتھ سلطان صلاح الدین کے سامنے پیش ہوا۔ ایک لائسنے قد کا دلا آدمی تھا اور چلتے میں اس کی کمر میں خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گرجھٹائے ہوئے سلطان کے سامنے آیا اور اس سے معافی طلب کی۔ سلطان اپنے ماموں کی بے انتہا سفارش پر اسے معاف کر دیا اور محاصرہ اٹھا کر واپس

تھے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تجھے اس وقت تک زندہ رکھا جائے گا جب تک عمالوں کی تجھے سزا نہ مل جائے۔“

تحریر پڑھ کر سلطان نے ایک زور دار چیخ ماری پریدار اور محافظ آئے۔ سلطان نے انہیں روٹیاں، خنجر اور پزچہ دکھایا وہ سب بھی خوفزدہ، شیخ الجبل سلطان کے سرہانے تک آیا تھا اور یہ رقعہ لکھ کر رکھ گیا تھا کہ نہ تو اس کو دیکھا تھا اور نہ پیروں کی آواز سنی تھی۔ مگر جب خیمے کے مٹی یا راکھ بکھیری گئی تھی اس پر پاؤں کے نشان بنے تھے۔ یہ نشان طرف جارہے تھے۔

سلطان نے کہا۔ ”میں نے شیخ الجبل کو جاتے دیکھا ہے لوگ اس کے میں جو جاتے ہیں وہ اسے مختلف ہے“

پھر اس نے اپنے نائب کو حکم دیا۔ ”کسی کو شیخ الجبل کے پاس بھیجا دے کہ وہ ہمیں یہاں سے بخیریت نکل جانے دے اس پر بھی کہنا کہ یہ پہیلی غلطیوں کو معاف کر دے۔“

سلطان کے نائب نے ایک ہرکارہ شیخ الجبل کے پاس بھیجا ہرکارہ یہ کہ اسے پاس پہنچ گیا اور سلطان کی درخواست زبانی پیش کی۔

شیخ الجبل نے جواب دیا۔ ”تمہارا بادشاہ جب تک محاصرہ برقرار رکھے تک اس کی جان کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

ہرکارہ نے واپس جا کر سلطان کے سامنے شیخ الجبل کا جواب بیان کیا سلطان صلاح الدین نے جواب سن کر محاصرہ چھوڑ چھاڑ اور لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔ لشکر کے راستہ میں ابن مندخ نام کا ایک پل پڑتا ہے۔ اس پل پر پہنچا تو پل کے محافظوں نے صلاح الدین کو بتایا کہ وہ بے فکر گزر جائیں کیونکہ اس کی راہداری کا پروانہ پل کے محافظ سردار کے پاس ہے۔

ابوالفراح کا یہ بیان کس قدر مضحکہ خیز اور لغو ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کے فدائی مسلمان بادشاہوں اور والیوں کے لشکر میں قبل از وقت ملازم کرتے تھے تاکہ وقت مقررہ پر وہ بادشاہ یا والی کو آسانی سے اپنے خنجر کا سکیں۔ یہ بات خود سلطان کو بھی معلوم تھی اور اس پر دوبارہ قاتلانہ تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر سلطان خیشن کے شیخ الجبل -

آگیا۔

پچھلے صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے اپنے مصری قیام کے دوران جب وہ امیر صلاح الدین سے مصر کا گورنر تھا اپنے ایک بھائی شمس الدین توران شاہ کو ایک لشکر کے ساتھ یمن کی فتح پر بھیجا تھا۔ توران نے وہاں پہنچ کر یمن فتح کیا اور اس ملک کا پورا انتظام کر کے صلاح الدین بلاوے پر دمشق آگیا۔ صلاح الدین اپنی طاقت و مشق اور قاہرہ کے گرد جمع کر تھا اس لئے اس نے توران شاہ کو یمن سے واپس بلا لیا تھا۔

ادھر سلطان صلاح الدین خیشن کے مرکز مسیاف کا محاصرہ اٹھانے کے بعد دمشق واپس آیا تو توران شاہ وہاں موجود تھا۔ صلاح الدین تقریباً دو سال سے اس سے باہر تھا اور وہاں جانا چاہتا تھا۔ توران شاہ کے آنے سے اسے تقویت ملے اس نے دمشق (ملک شام) کا انتظام توران شاہ کے سپرد کیا اور خود مصر روانہ ہو گیا۔ صلاح الدین جب مصر سے دمشق آیا تھا تو اس نے ابوالحسن بن سنان ستقان بن محمد کو مصر میں اپنا نائب مقرر کیا تھا جو اب تک بڑی خوش اسلوبی سے انتظام سلطنت چلا رہا تھا۔

سلطان صلاح الدین کا قاہرہ میں بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ یہاں روانہ ہوا تھا تو امیر صلاح الدین تھا اور اب وہ سلطان دمشق اور قاہرہ ہو واپس آیا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے خیشن جیسے جابر اور خونی فرقہ کو مٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ فرقہ مصر کے سابق فاطمی امیروں کو بھی مصر کے ظالم بھڑکایا کرتا تھا۔ فرنگی بھی ان قاتلوں سے کام لیا کرتے تھے۔ اس طرح صلاح الدین نے خیشن کا زور توڑ کے فرنگیوں اور سابق امراء کا بالواسطہ زور دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین ابولی کا قاہرہ کی سرحد پر پرجوش استقبال کیا گیا اور اسے دارالوزارت اور شاہی محل تک اسے جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ یہ جلوس جن بستیوں اور راستوں سے گزرنا وہاں کے لوگ جلوس میں شامل ہو جانے اور طرح شاہی محل تک پہنچنے تک پہنچنے والوں کی تعداد دولاکھ سے زائد ہو گئی۔ اس میں وہ مرد عورتیں اور بچے شامل تھے جو اپنے بالاء خانوں پر کھڑے سلطان صلاح الدین کے حق میں پرجوش نعرے بلند کر رہے تھے۔

مصر کی فوج جو ملک کے طور پر دمشق بھیجی گئی تھی وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ابھی تھی۔ سلطان نے دوسرے دن دوبار عام لگایا۔ غراء اور مساکین میں چکرا اور نقد رقم تقسیم کی گئی۔ صلاح الدین شام کی جنگوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا ایک حصہ مصر ساتھ لے کے آیا تھا۔ اس کو مصر کے بیت المال میں جمع کر دیا گیا۔ یہ دراصل اس حق خدمت کا صلہ تھا جو مصری فوج نے شام میں شامیوں کے دوش بدوش میدان جنگ میں ادا کی تھی۔

سلطان صلاح الدین کو سب سے بڑی فکر فصیل شہر اور فصیل قلعہ کی تھی اس کے خیال میں بیرونی حملوں کو روکنے کے قابل نہ تھیں۔ سلطان نے دونوں دیواروں کی مرمت اور اس میں اضافہ کا ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس کام پر اہل کو مامور کیا۔ قراقوش سلطان کے لئے بڑی خدمات انجام دے چکا تھا اور نجرہ کار تھا۔ فصیل کا احاطہ تقریباً انتیس ہزار تین سو فیٹ تھا۔ یہ کام چار ہوا تو بس ہوتا ہی رہا۔ تین سال بعد سلطان صلاح الدین کے بھتیجے نے فصیل تک پہنچایا۔ قلعہ کے بانی کا یہ کتبہ باب الدرج پر اب بھی موجود ہے۔

”الملك الناصر صلاح الدنيا و الدين ابو فتح يوسف بن ايوب نے اس قلعہ تعمیر کا حکم دیا اور زیر ہدایت العادل سيف الدين ابوبکر محمد اور زیر اہتمام امیر قراقوش بن عبد اللہ مملوک ملک الناصر 579 ہجری بمطابق 1183-84ء تعمیر کرایا۔“

اس کے علاوہ 280 فٹ گہرائی کے کھنڈر میں کھنڈر یوسف صلاح الدین کے حکم سے لے کر چٹان میں کنوا تھا۔ صلاح الدین کی مشہور یادگاروں میں قاہرہ کا ایوان اور بالائی مصر کی سرحد پر اب تک موجود ہے۔ اس سرحد کو سر یوسف بھی کہتے ہیں۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں بیڑہ کی پتھر دیوار ہے یہ دیوار پتھر کے اہرام مصر کے صحرا کے دامن تک سات میل دور چالیس محرابوں پر تعمیر کی گئی تھی۔ یہ دراصل عربوں کے حملوں کی مدافعت کے لئے تیار کی گئی تھی لیکن کبھی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سلطان صلاح الدین کو مصر میں مصروف دیکھ کر فرنگس (فرنگی) نے ہاتھ پیر لے کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ قلعہ الحارم پر حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ شاہ حلب (صلاح) کے علاقہ میں تھا۔ ملک الصالح تو قلعہ کو کوئی کمک نہ بھیج سکا مگر اس کے گورنر نے اس وقت بڑا کام دکھایا۔ وہاں کا گورنر ارمنخانہ کا باپ

انچہ رملہ کے قریب تل ہزار کے مقام پر 25 نومبر 1177ء کو سلطان
دین اور نصرانی لشکر کا مقابلہ ہوا۔ ایک طرف سلطان اپنے محافظ دستہ اور
یوں کے ساتھ موجود تھا اور اس کے مقابلہ پر 375 ٹائٹس ، سیکڑوں
در ہزاروں سواروں اور پیادوں کا نصرانی لشکر تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ بڑی
لڑائی تھی۔ ایک طرف سے ٹائٹس اور ٹیلڈز حملہ آور ہو رہے تھے تو
دوسری طرف نصرانی سواروں کے غول کے غول سلطان کو گھیرے میں لینے کی
کوشش کر رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین اور ان کے محافظوں اور حواریوں نے برا سخت مقابلہ
دیا۔ ان کے ایک پیچھے محمد نے سلطان کی حفاظت میں بہادری کے بہت جوہر
سلطان کا دوسرا بھتیجا جس ابھی عفتوان شباب تھا اور مسیحیجک رہی
سلطان کی حفاظت کرتے کرتے قربان ہو گیا۔ تمام دن لڑائی ہوتی رہی پھر
تو ہوتے نصرانیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے سلطان کے حفاظتی دستے
ٹپٹے پر مجبور کر دیا۔ سلطان نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور
(نصرانیوں کے مطابق اونٹ) جنگل کی طرف موڑ دیا۔ سلطان کے اہم
میں فقیہ عیسیٰ بکاری بھی تھے جو شام تک مقابلہ کرتے رہے تو رات
ایک طرف نکل گئے مگر راستہ بھول گئے اور نصرانیوں نے انہیں گرفتار

سلطان صلاح الدین نے کسی اچانک حملہ کی پیش بندی نہیں کی تھی اور
در تک پھیلا دیا تھا۔ اس لئے انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عیسائیوں
ن کی اس شکست پر بہت بغلیں بجائیں۔ سلطان کئی دن جنگوں میں بھگتا
اور اس کے چند ساتھی بھوک پیاس کی تکلیف سے دوچار ہوئے پھر
بھیلے ہوئے کسی طرح قاہرہ پہنچے۔ سلطان کو اس جنگ میں بھاری جانی
فدا پڑا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے خاص دوست اور سردار فقیہ
دلی فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہیں تو اسے بہت افسوس ہوا۔

عیسیٰ بکاری کا حال یہ ہوا کہ جب وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹے تو رات
ان کے ساتھ ان کے بھائی ظہیر اور کچھ ساتھی بھی تھے۔ یہ لوگ
بے ہنگم گئے اور رات بھر ادھر ادھر بھٹکے پھرے اور صبح دم انہیں
کے ایک دستے نے گرفتار کر لیا۔ سلطان صلاح الدین نے ان لوگوں ساتھ

شمس الدین بن المقدم تھا۔ وہ ملک سے فوجی دستے لے کر نکلا اور الحار
قریب ایک دلدلی جنگل میں چھپ گیا پھر اچانک فرنگس پر حملہ کر کے انہیں
نقصان پہنچایا۔ المقدم کے اس اچانک حملہ سے بہت سے فرنگس مارے
امیر المقدم نے دوسو فرنگس کو گرفتار کر لیا۔

امیر المقدم کے ہاتھوں مار کھا کر فرنگی لشکر نے دمشق کی سرحد
کر دیا۔ دمشق کے حاکم توران شاہ کو فرنگیوں کے حملے کی اطلاع ملی تو وہ
سے فوج لے کر نکلا اور مروج کے مقام پر فرنگیوں کے مقابل ہوا۔ مروج
فرنگیوں اور دمشق کی فوج میں شدید جنگ ہوئی جس میں توران شاہ کو
ہو گئی اور اسے پسا ہونا پڑا۔ اس جنگ میں دمشق کا ایک مشہور سردار
الدین ابوبکر بن السور فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

فرنگیوں کے ان حملوں کی خبر قاہرہ پہنچی تو سلطان صلاح الدین فوراً
لے کر فرنگی علاقوں کی طرف چل پڑا۔ وہ عتقان پہنچا مگر اس کے مقابلہ میں
نہیں آیا۔ خیال تھا کہ اب نصرانی لشکر دمشق پر حملہ کرنے گیا ہے۔ سلطان
رملہ اور لد کو تاراج کیا اور یرودشلم کی سرحد کے ساتھ دور دور تک اپنے
پھیلا دیا۔ مگر اچانک نامعلوم کس طرف سے نکل کے فرنگی لشکر سلطان
الدین کے سامنے آگیا اس میں سینکڑوں ٹیلڈز اور ٹائٹس تھے۔ لشکر کے آگے
آف بیت اللہم ، اصلی صلیب جسے صلیب العلبوت کہا جاتا ہے اٹھا کے
تھا۔

فرنگیوں کے لشکر کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں ملتا بہر حال یہ ایک بڑا لشکر
جس میں بالیان ، ریجنڈ آف سیدن ، ڈروئی ، سڈ آف کی ٹیپل اور جو
دے سینے جیسے فرنگیوں کے لڑاکے موجود تھے۔ مغربی مورخ ایک طرف یہ
ہیں کہ سلطان صلاح الدین کے ساتھ چھبیس ہزار کا لشکر تھا پھر دوسرے
یہ کہتے ہیں کہ سلطان کا لشکر مختلف شہروں میں گھسا ہوا حملے کر رہا تھا۔
مورخوں کے مطابق سلطان کا تمام لشکر منتشر حالت میں شہروں کو گھیر
مصرف تھا اور سلطان کے ساتھ اس وقت اس کے محافظ دستوں اور
سرداروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ سلطان اگر چاہتا تو پسا ہو کر پیچھے ہٹ
مگر اس نے اس مختصر سواروں کے ساتھ دشمن کے مقابلہ کا فیصلہ کیا اور
میں ڈٹ گیا۔

سلطان صلاح الدین کے جو فوجی دستے فرنگیوں کے شہروں میں گھس گئے ان میں سے کچھ شہید ہوئے، کچھ گرفتار ہوئے اور بہت کم بچ کے واپس نکلے گرفتار ہونے والوں کو سلطان نے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا تھا۔

1178ء کے چند ماہ سلطان صلاح الدین اور اس کے لشکر کے لئے بہت بے بہت ہوئے۔ جنوب میں سلطان کو رملہ (جزائر) میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک اسی وقت شمالی حمہ پر مصیبت آئی۔ ان دنوں ایک فرنگی سردار ساحل پر فرنگیوں کی طاقت کو جمع کر رہا تھا۔ اس نے دولت کے زور پر ایک بڑا لشکر لیا تھا۔ اس کی خبر دمشق میں پہنچ گئی تھی لیکن دمشق کے حاکم توران شاہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ تاریخ تو یہاں تک بتاتی ہے کہ جس وقت فرنگی لشکر کی طرف بڑھ رہا تھا تو والی دمشق حالات سے باخبر ہونے کے باوجود عیش و عشرت میں مبتلا تھا۔

نئے فرنگی سردار کے تحت فرنگیوں کے ایک بڑے لشکر نے حمہ پر حملہ کیا۔ حمہ کا حاکم سلطان صلاح الدین کا ماموں شہاب الدین حارثی تھا وہ اس سخت بیمار تھا۔ فرنگیوں کا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ حمہ کا شہر آدھے سے زائد فرنگیوں کے قبضہ میں آگیا۔ باقی شہر اور قلعہ مسلمانوں کے پاس رہا۔ مسلمان راجہ قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنا چاہتے تھے لیکن اس صورت میں انہیں بقیہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔

ادھر فرنگیوں کا محاصرہ سخت ہوتا جا رہا تھا حاکم حمہ تو صاحب فراموش تھا۔ مائے نائب نے تمام فوجی سرداروں کو اکٹھا کر کے مشورہ کیا۔ سرداروں نے اسے دیا کہ شہر کا ایک حصہ تو دشمن کے قبضہ میں جا چکا ہے اس لئے اگر اسے نہ کھڑی کا اظہار کیا گیا تو دشمن پورے شہر پر قابض ہو جائے گا۔ پھر قلعہ کو باغی ہو جائے گا۔ اس لئے رائے یہ ٹھہری کہ بجائے آدھے شہر کی حفاظت کرنے کے تخت یا تختہ کے مصدق شہر کے مقبوضہ حصے کو واپس لینے کے لئے بلا حملہ کر دیا جائے اس سے گوگو کی حالت ختم ہو جائے گی اور جلد قبضہ بھی ہائے گا۔

پس حمہ کے فوجی سردار مجاہدین اسلام کی طرح جھجھری لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اپنے سرداروں کا جوش و جذبہ دیکھ کر ان کے ماتحت لشکری بھی سرفروشی کا رہ گئے اور دوسرے دن مسلمانوں نے اچانک فرنگیوں پر جوابی حملہ شروع کیا۔

ہزار دینار فدیہ ادا کر کے رہا کرایا۔ اس طرح مسلمانوں کا جانی نقصان کے مالی نقصان بھی ہوا۔ اسلحہ کا پورا ذخیرہ اور سامان خورد و نوش بھی نصرانیوں ہاتھ لگا اور وہ اسے یرد شلم اٹھا لے گئے۔

حماد پر ایک ذرا سی غلطی کس طرح شکست کا شاخسانہ بن جاتی ہے اس مثال جزائر کا معرکہ ہے سلطان صلاح الدین نے عثمان پہنچ کر جب نصرانیوں اپنے مقابل پایا تو اس نے اندازہ لگایا کہ نصرانی خوفزدہ ہو کر دور کے شہروں بھاگ گئے ہیں لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ نصرانی لشکر نے سلطان کو اندر آ کر موقع دیا تھا پھر جب سلطان نے اپنے لشکر کو ٹکڑوں اور گروہوں کی شکل شہروں میں گھس جانے کا حکم دیا تو نصرانیوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اور فوراً سلطان اور محافظ دستے کو گھیرے میں لے کر شکست سے دوچار کیا اس مغربی مورخ نے لکھا ہے سلطان نے چھپیس ہزار لشکر کے ساتھ حماد پر حملہ کیا تھا۔ پھر عیسائیوں نے انہیں جزائر کے میدان میں بری طرح شکست اور سلطان کے لشکر کو کٹ کے رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں سلطان کا پورا قتل ہو گیا اور مشکل ہی چند لشکری میدان سے جانیں بچا کر بھاگ سکے تھے۔ مغربی مورخ کے اندازے میں اگرچہ بہت مبالغہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے سلطان کے ساتھ جانے والا لشکر اس بری طرح تباہ ہوا تھا کہ سلطان کو اسے سر نو ترتیب دینا پڑا۔ اپنی اس شکست کے بارے میں سلطان صلاح الدین دمشق میں اپنے بھائی توران شاہ کو جو خط لکھا وہ کچھ یوں ہے۔

خط کے شروع میں حماد کے ایک شاعر کا شعر لکھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ :-

”میں نے تمہیں اس وقت یاد کیا جب ہمارے درمیان نیزوں کی بوچھاڑ تھی اور گندم گوں سیدھے نیزے ہم پر حملہ کر رہے تھے“

آگے چل کے سلطان نے لکھا :-

”ہم کئی مرتبہ ہلاکت اور تباہی کے کنارے پہنچ گئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان خطرات سے بچایا۔ وہ ہم سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اس کے حکم کے مطابق میں ثابت قدم اور صحیح و سالم رہا۔“

کر دیا۔ فرنگی اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ تو یہ سمجھ کے محاصرہ کے تھے کہ دوچار دن میں شہر کا باقی حصہ ان کے قبضہ میں آجائے اور پھر وہ مضبوطی سے محاصرہ میں لے کر اس پر بھی قبضہ کر لیں گے۔

مسلمانوں کے اس جوابی حملہ سے وہ سخت پریشان ہوئے انہوں نے جانے کی بہت کوشش کی لیکن مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے ان طرح جا پڑے کہ جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نے سیکڑوں فرنگیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ فرنگی حملہ آور بدحواس ہو گئے اور اڑ ہوتا پڑا۔ مسلمانوں نے شام ہونے سے پہلے شہر کا وہ حصہ جو حملہ آور قبضہ میں آگیا تھا ان سے واپس لے لیا اور دفاع کو مضبوط کر کے مدافعت اختیار کر لیا۔

فرنگیوں میں افراطی پرمی تھی ان کے سردار نے یہی غنیمت جان مسلمانوں نے شہر واپس لینے کے بعد شہر سے باہر نکل کر حملہ نہیں کیا اور انہیں شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ پھر دوسرے دن صبح کو مسلمانوں نے فیہ سے جھانک کے دیکھا تو میدان صاف تھا۔ فرنگی اپنے خیمے اکھاڑ کر واپس تھے۔ یہ حمہ کے محاصرے کا تیسرا دن تھا کہ فرنگیوں کو مجبور ہو کے محاصرے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

پھر اس دن اطلاع ملی کہ فرنگی حمہ سے ہٹ کر ”الحارم“ پہنچ گئے انہوں نے ”الحارم“ کا سخت محاصرہ کر لیا ہے۔ حمہ میں اتنی طاقت نہ تھی ”الحارم“ کی مدد کو جاتا۔ دمشق کا والی توران شاہ محفل عیش جمائے بیٹھا تھا حلب ملک الصالح کو الحارم کی مدد کرنا چاہئے تھی کیونکہ یہ علاقہ اسی کے مگر وہ اس وجہ سے کوئی قدم نہ اٹھا سکا کہ اس میں اور اس کے وزیر میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حلب میں جب ”الحارم“ کے محاصرے کی تو الملک الصالح نے فوری اقدام کے بجائے فرنگیوں کو ایک معقول رقم ”الحارم“ سے واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس کے اس بزدلانہ اقدام میں مخالف مسلمان بھی برابر کا شریک تھا۔

ملک الصالح نے الحارم کو بچانے کے لئے فرنگیوں کو ایک بڑی کثیر کی تھی فرنگیوں نے الحارم سے محاصرہ تو اٹھا لیا مگر اب ان کے حوصلے تھے اور ان کے ہاتھ مفت کی دولت آگئی تھی۔ ادھر حمہ والے مطمئن ہو

ان نے فرنگیوں کو شہر سے مار بھگایا ہے اس لئے اب ادھر آنے کی نہ کریں گے لیکن فرنگی الحارم کو چھوڑ کے ایک دم حمہ کی طرف گھوم انہوں نے حمہ شہر اور قلعہ کو چھوڑ کے باقی تمام مصافاتی بستیاں تہ و بالا اور انہیں لوٹ مار کے جلا دیا۔

اد کے والی شاب الدین حاری جو حمہ پر پہلے حملہ کے وقت شدید بیمار تھا ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ حمہ والے اس صدمہ سے دوچار تھے اور سلطان کی سے کوئی نیا حاکم پہنچے جانے کے منتظر تھے کہ ایک بار پھر ان پر فرنگیوں بت نازل ہوگئی۔ مرحوم والی حمہ کے نائب نے ایک بار پھر مجلس مشورہ اور طے پایا کہ فکیل شہر سے نکل کر فرنگیوں کا مقابلہ کیا جائے ورنہ جنگ میں شہر ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ فرنگی اس وقت تک آس آبادی کو خاکستر کر کے حمہ شہر پر حملہ کی تیاری کر رہے تھے۔

مقبل اس کے کہ فرنگی حمہ کی فکیل شہر پر حملہ آور ہوتے حمہ کے سرکردگی میں وہاں موجود لشکر سروں سے کفن باندھ کے حملہ آوروں پر - فرنگی حمہ کی فوج سے پہلے بھی شکست کھا چکے تھے اس لئے ان کے لئے نہ بن پڑی اور ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حمہ کی فوج نے ان کی گھبراہٹ زوری سے فائدہ اٹھایا اور بڑھ چڑھ کر اتنے زبردست حملے کئے کہ فرنگیوں ہٹ کر پھر اپنی صف بندی کرنا پڑی لیکن حمہ کی فوج نے ان کی ساری مڈی توڑ پھوڑ کے رکھ دی اور اس قدر دباؤ ڈالا کہ فرنگیوں کو سر پر پیر بھاگنا پڑا۔ اس طرح حمہ والوں نے نہ صرف اپنے والی کی عدم موجودگی اور قلعہ کی پوری حفاظت کی بلکہ حملہ آوروں کو مار بھگایا اور ان کے لشکری گرفتار کر لئے۔

ان جنگ میں فرنگیوں کا بہت جانی نقصان ہوا تھا۔ اس لئے نائب والی نے فکیل کے سروں کو اکٹھا کیا اور فرنگی قیدیوں کے ساتھ فوج کے اس تحفہ کو صلاح الدین ایوبی کے پاس روانہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے رملہ کے برہم کے لشکر کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی اور اس کے ساتھ کا لشکر آدھے سے زیادہ تباہ ہو گیا تھا لیکن سلطان نے اس شکست سے بدلہ کی بجائے سبق سیکھا اور صرف تین دن کے اندر اس نے اپنا نیا لشکر تیار سلطان کا رابطہ دمشق سے قائم تھا اور اسے دمشق کے شمال میں مسلمان

امیر المقدم نے سلطان کو سلام پیش کیا۔ باپ کی تقلید میں ارمغانہ بھی اس کے سامنے خم ہو کر آداب بجا لائی۔
 ”یہ تمہاری بیٹی ہے المقدم؟“ سلطان نے سوالیہ انداز میں کہا۔
 ”جی عالیجاہ یہ میری بیٹی اور آپ کی کنیز ہے۔“ المقدم نے بڑے مذہب سے جواب دیا۔

”کچھ دن پہلے تم نے بتایا تھا کہ یہ بیمار ہے۔ اب کیا حال ہے اس کا؟“
 ”کوچہ نہیں کیوں المقدم کی بیٹی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ایک تو پہچان لیا تھا اب اس کی بیماری کا حال بھی پوچھ رہا ہے۔“
 ”ارمغانہ اب بالکل ٹھیک ہے عالی جاہ۔“ پھر المقدم نے بیٹی کی طرف دیکھ کر ٹاپہ ٹپا کر کہا۔ ”تم خوش قسمت ہو ارمغانہ سلطان معظم نے نہ صرف تم کو بلکہ تمہاری خیریت بھی دریافت کی ہے۔“

ارمغانہ نے جھک کے پھر تسلیم پیش کی اور ادب سے کہا۔ ”میں سلطان کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری خیریت دریافت فرمائی۔“
 سلطان صلاح الدین نے ارمغانہ کو جواب دینے کی بجائے امیر المقدم سے ”امیر المقدم تمہاری بیٹی نے ہمارے بھتیجے عزالدین فرخ شاہ پر ایسا احسان کیا ہے نہ ہم بھول سکتے ہیں اور نہ فرخ شاہ۔“

پھر سلطان نے فرخ شاہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں فرخ شاہ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”عالیجاہ میں نہ امیر شمس الدین ابن المقدم کو بھول سکتا ہوں اور نہ ان کی کے احسان کو کبھی بھلا سکوں گا۔ کاش میں اس احسان کو کسی طرح اتار کر فرخ شاہ نے ٹھہر ٹھہر کے کہا اور آخر میں ارمغانہ کی طرف دیکھا۔“

امیر المقدم شاید فرخ شاہ سے جل گیا تھا اس نے فوراً ”بات کا رخ موڑا۔“
 ”عالیجاہ دمشق سے آپ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بد بخت فرنگیوں نے کے زیر تسلط علاقہ پر اچانک حملہ کر دیا۔“ امیر المقدم نے سلطان کی توجہ کی طرف کرنے کے لئے اپنی کہانی شروع کر دی مگر سلطان نے قطع کلام کیا۔
 سلطان اس حملہ کا تمام حال اور المقدم کی کارکردگی اپنے آدمیوں سے پہلے ان کا تھا اس لئے اس نے کہا۔ ”المقدم ہمیں فرنگیوں کے حملہ کا حال اور ان کی کارکردگی کی تمام داستان اپنے آدمیوں سے معلوم ہو چکی ہے۔ ہم تمہارے

علاقوں پر فرنگیوں کے حملوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں اس لئے وہ سے بڑی تیزی سے دمشق کے شمالی اور مشرقی علاقوں کو بچانے کے لئے روانہ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ حماء پر فرنگیوں کے دوسرے کی اطلاع ملی اور سلطان کے محسوس پہنچنے سے پہلے ہی حماء والوں نے فرنگیوں کی شکست دے کر بھاگ دیا تھا۔ پھر جب سلطان محسوس پہنچ گیا تو حماء والوں کی اس سے فرنگیوں کی شکست کی نوید کے ساتھ فرنگی قیدیوں اور فرنگی مقتولین کے اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ سلطان کے لشکر کو جنوب میں شکست ہوئی تھی اس میں بہت سے لشکر قتل ہوئے تھے۔ اس کے بدلے میں سلطان نے قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

سلطان کو محسوس میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ اسے فرنگی قیدیوں کا اور تحفہ موصول ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شام کے نئے فرنگی سردار فرنگیوں کو اکٹھا کر کے جو لشکر ترتیب دیا تھا اس نے سب سے پہلے حلب علاقہ پر حملہ کیا تھا اور اس حملہ میں حلب کا گورنر امیر شمس الدین فرنگیوں کے مقابل آیا تھا اور اس نے فرنگیوں کو شکست دے کر مار بھاگا۔ امیر المقدم کے ہاتھ بہت سے فرنگی قیدی بھی آئے تھے جنہیں وہ اپنے حلب لے گیا تھا۔ چونکہ اس وقت سلطان صلاح الدین ابوبی مصر گیا ہو اس لئے امیر المقدم نے فرنگی قیدیوں کو قید خانہ میں رکھا تھا تاکہ جب مصر سے واپس آئے تو اپنی کارکردگی کے ثبوت میں المقدم ان قیدیوں کو کے سامنے پیش کرے۔

المقدم کو جب اطلاع ملی کہ سلطان صلاح الدین مصر سے محسوس پہنچا تو وہ فوراً ”فرنگی قیدیوں کو ساتھ لے کر سلطان کی طرف روانہ ہوا۔ امیر کے ساتھ اس کی بیٹی ارمغانہ بھی تھی۔ جب یہ باپ بیٹی سلطان کے سامنے سلطان صلاح الدین کے پاس اس کا ہمارے بھتیجے عزالدین فرخ شاہ بھی بیٹا فرخ شاہ اور ارمغانہ کی نظریں چار ہوئیں تو ان کے دلوں پر جیسے قیامت گئی۔ ارمغانہ نے تو حیاء کی وجہ سے چند لمحوں کے بعد اپنی نظریں نیچی کر فرخ کی نظر کی پیاس تو بجھتی ہی نہ تھی وہ ممکنہ باندھے ارمغانہ کو دیکھتا تھا۔“

بچی کی شادی کی تقریب سعید میں شرکت فرمائیں۔“
 ”کیا کیا؟“ سلطان چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”کیا تم نے اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں
 لیا ہے؟“
 ”جی عالیجاہ بن ماں کی بچی ہے ارمنخانہ میں اسے زیادہ دن تک گھر میں نہیں
 ملا۔“ المقدم نے بڑی معصومیت سے کہا اور کنکھوں سے فرخ شاہ کی
 دیکھا۔

فرخ شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کچھ دکھائی دے رہا
 نہیں۔ جب اس نے المقدم کے ساتھ ارمنخانہ کو سلطان کے پاس آتے
 تو وہ کس قدر خوش ہوا تھا۔

اب تک اس کی نظریں ارمنخانہ ہی کے ارد گرد گھوم رہی تھیں مگر المقدم
 بنحوں خبر سنا کر اس کے خوابوں کا تانا بانا بکھیر دیا تھا۔

اور سلطان سانٹے میں آگیا تھا وہ نہ معلوم کیا سوچے بیٹھا تھا کہ المقدم
 بچی کی شادی کی خبر سنا کر اسے مبہوت کر دیا۔

امیر شمس الدین المقدم نے سلطان کو ناخوش دیکھا تو اپنی التجاء دہرائی۔ ”کیا
 المقدم کی درخواست کو شرف قبولیت عطا نہیں کریں گے؟“

”امیر المقدم“ سلطان نے ساٹ لہجہ میں کہا۔ ”بیٹی کی تقریب کب منعقد
 “ المقدم نے انگلیوں پر حساب لگا کے بتایا۔ قمری مہینہ ختم ہونے میں چار

تہ ہیں بس نئے چاند کی چھ تاریخ کو ارمنخانہ کا عقد اور رخصتی ہوگی۔“
 ”کیا عقد ابھی نہیں ہوا ہے؟“ سلطان نے نہ جانے کیوں سوال کیا؟

”عالیجاہ میرے خاندان میں مگنی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔“ امیر المقدم نے
 تکی۔

”مگنی میں نے دو ماہ پہلے کر دی تھی بس رخصتی باقی ہے۔“
 ”اگلی نکاح بھی تو باقی ہے امیر المقدم۔“ سلطان نے پھر سوال کیا۔

”جی عالیجاہ وہ بھی ہو جائے گا بات تو مگنی ہی سے پکی ہو جاتی ہے۔ ہم
 میں مگنی توڑنے کا رواج نہیں ہے عالیجاہ۔ امیر المقدم نے اس طرح کہا

کہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ وہ دراصل اپنی سادگی ہی سادگی میں سلطان اور
 کفرخ شاہ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ارمنخانہ کا رشتہ طے کر دیا ہے

لے اس کا خیال دل سے نکال دیا جائے سلطان امیر المقدم کا منہ دکھتا رہ

اس دلیرانہ اور شجاعانہ کارنامہ سے خوش ہوئے۔ ہم نے سنا ہے کہ تم نے کچھ
 فرنگیوں کو گرفتار کیا ہے ان کا کیا بنا؟“

”عالیجاہ ان بدبختوں کو میں آپ کے قدموں میں پیش کرنے ساتھ لایا
 ہوں۔“ امیر المقدم نے بڑے فخر سے جس میں تکبر کی آمیزش تھی گردن اٹھا کر
 فرخ شاہ کی طرف دیکھا۔

”بہت خوب“ سلطان نے مسرت سے کہا۔ ”ہم قیدیوں کو تمہاری موابیدہ
 پر چھوڑتے ہیں چاہو تو انہیں قتل کر دو یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو۔“

”جو حکم ہو عالیجاہ“ المقدم پھول گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ قیدیوں کو قتل
 کرنے یا زرنہ لے کر چھوڑنے کا اختیار صرف بادشاہ یا سلطان کو ہوتا
 سوائے اس کے کہ سلطان اپنے طور پر یہ اختیار کسی گورنر یا والی کے ہر
 کر دے۔

المقدم نے گردن گھما کر حاضرین کو دیکھا جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو
 سلطان کے اس حکم کا دوسرے امیروں اور سرداروں پر کیا اثر ہوا؟ اس وقت

کی نظر فرخ شاہ پر پڑی جس کی نظر ارمنخانہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
 المقدم بوکھلائے ہوئے لہجہ میں بولا۔ ”عالیجاہ میں حضور عالی میں ابا

درخواست اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”اجازت ہے کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو کیونکہ ہم بھی تمہیں ایک انعام

چاہتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین نے بڑے خوشگوار لہجہ میں کہا۔
 ”امیر المقدم کو بے چینی ہوگئی“ اس نے کہا ”عالیجاہ آپ مجھے پہلے انعام

فرمائیے تب میں اپنی درخواست پیش کروں گا۔“
 ”نہیں امیر المقدم تم نے درخواست کا ذکر پہلے کیا ہے اس لئے تم درخواست

پیش کرو گے۔ سلطان متانت سے بولا۔
 ”عالیجاہ میں درخواست پیش کرتے اس لئے گھبرا رہا ہوں کہ کہیں آپ

درخواست نامنظور نہ فرمادیں اور پھر میں انعام سے بھی محروم رہ جاؤں
 امیر المقدم نے اپنی لالچ کا اظہار کر دیا۔ سلطان نے امیر المقدم کو یقین دلایا۔

نہ کرو المقدم درخواست پیش کرو۔“
 ”عالیجاہ“ امیر المقدم نے کہنا شروع کیا۔ ”میری درخواست ہے کہ عالیجاہ

اپنے تمام امراء اور والیان علاقہ جات کے میرے غریب خانہ کو عزت بخشیں

”ہمیں افسوس ہے امیرالمقدم ہم تمہاری اس خوشی میں شریک نہ ہو گے۔“ سلطان نے افسردگی سے کہا۔

”عالیجاہ اگر آپ مصروفیت کی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکتے تو امیرزادہ شاہ کو حکم دیجئے کہ وہ آپ کی نمائندگی فرمائیں۔ ان کی شرکت میرے لئے مسرت ہوگی۔ امیرالمقدم نے سلطان سے امیرزادہ کی شرکت کی درخواست جھجک محسوس نہ کی۔

امیرالمقدم کی اس بات پر ہر ایک حیران رہ گیا۔ امیرزادہ فرخ شاہ حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے المقدم نے اس کے سینے میں دوسرا خنجر گھونپ دیا ہو۔ اس کے لئے یہ خبر ہی قیامت سے تھی کہ اس کی پسند کو کسی اور کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ شادی میں شریک ہو کے اپنے ہاتھوں سے ارمغانہ کو ڈولے میں بٹھاتا ہے۔

پچاری ارمغانہ اپنی جگہ پریشان تھی اس نے باپ کے سامنے قسم کھائی کہ امیرزادہ فرخ شاہ کے علاوہ کسی اور جگہ شادی کرنے کے بجائے تمام کنواری بیٹھی رہے گی لیکن پھر اس کی قسم پر المقدم نے بھی قسم کھائی کہ ارمغانہ سال رواں کے اندر المقدم کی مرضی کے مطابق شادی کرنے پر آمادہ ہوئی تو وہ خود کشی کر لے گا۔

ان حالات میں پچاری ارمغانہ کیا کرتی۔ اس نے اپنی سہیلی حارثہ سے کیا۔ حارثہ امیرالمقدم کے احسانوں تلے دبی تھی۔ المقدم نے نہ صرف حارثہ کی شادی کے تمام اخراجات برداشت کئے تھے بلکہ حارثہ کے والدین اور اس شوہر کو اپنے ساتھ جہاز لے گیا تھا۔ حارثہ نے بھی ارمغانہ سے سفارش کی کہ وہ اپنے باپ کی جان بچانے کے لئے اس کے کہنے کے مطابق شادی کر لے وہ باتیں تھیں کہ ارمغانہ کو شادی پر تیار ہونا پڑا اور اسے امیرزادہ فرخ شاہ کی تصویر کو اپنے دل سے نکالنا پڑا۔

پھر امیرالمقدم نے ارمغانہ پر ایک اور ظلم کیا وہ یہ کہ جب فرنگی قیدیوں کے حضور پیش کرنے محسوس جانے لگا تو بیٹی کو حکم دیا کہ وہ بھی اس ساتھ محسوس چلے۔ اس بات کی حارثہ نے سخت مخالفت کی اور امیرالمقدم کو باتوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ محسوس میں سلطان کے ساتھ امیرزادہ فرخ

شاہ کا ہے۔ اگر ارمغانہ اور فرخ شاہ کا آتما سامنا ہو گیا تو کوئی نیا گل بھی ہے مگر ضدی المقدم کے دل میں تو فرخ شاہ کے خلاف غبار بھرا ہوا ارمغانہ اور فرخ شاہ کی موجودگی میں یہ اعلان کرنا چاہتا تھا کہ اس نے کہیں اور رشتہ طے کر دیا ہے اور فرخ شاہ کا یہ بات سن کر کس قدر گما۔ المقدم تو فرخ شاہ سے انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ قدم قدم پر انتقام لے رہا تھا۔ فرخ شاہ کو ارمغانہ کی شادی میں بلانا بھی ایک طرح کا انتقام تھا۔

ان نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد امیرالمقدم کی درخواست قبول کر لی۔ ایک موقع پر شبہ ہوا تھا کہ شاید امیرزادہ فرخ شاہ کو ارمغانہ سے کچھ باتوں نے سوچا تھا کہ کسی مناسب موقع پر وہ امیرالمقدم سے اس بات کرے گا۔ آج ارمغانہ کو المقدم کے ساتھ دیکھ کر سلطان نے سوچا کہ وہ فرخ شاہ اور ارمغانہ کی شادی کے لئے المقدم سے سفارش کرے گا۔ انہی گفتگو میں یہ کہہ کر کہ آج وہ المقدم کو ایک انعام دے گا۔ ات کا اشارہ کیا تھا کہ وہ فرخ شاہ کو المقدم کی فرزندگی میں دینے کی بات کرے گا۔ المقدم نے ارمغانہ کی شادی کا اعلان کر کے سلطان کو خاموش کر دیا تھا۔

م کی باتوں سے سلطان کی طبیعت کچھ مکدر ہو گئی تھی۔ اسی لئے اس سے بدلتے سے کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے ارمغانہ کی شادی میں فرخ شاہ بھی ہیں گے۔“

باہ میرے لئے یہ باعث انبساط اور افتخار ہوگا کہ امیرزادہ فرخ شاہ کی شادی میں سلطان معظم کی نیابت کریں۔ ازراہ الطاف خسروانہ عالیجاہ کو تاکید فرمادیں کہ اس سلسلہ میں کوئی تعاطل نہ برتیں۔ المقدم کا انداز لیکن اس سے اس کی خباثت بھی ظاہر ہوتی تھی۔

تان رکھو امیرالمقدم امیرزاوے ضرور شریک ہوں گے۔“ اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا جو اس بات کی علامت تھی کہ دربار برخاست ہوا اور سب غصوں میں واپس جاسکتے ہیں۔ امیرالمقدم ارمغانہ کو ساتھ لے کر خیمہ لے گیا۔ سلطان جاتے جاتے رک گیا پھر اس نے تجلیہ کا حکم دیا سب سے باہر جا چکے تھے۔ فرخ شاہ اور دو ایک امیر باقی رہ گئے تھے تجلیہ کر وہ بھی خیمے کے پردے کی طرف بڑھے۔ فرخ شاہ بھی جانے والوں

”بہتر ہے سلطان معظم۔“ فرخ شاہ کو تسلی ہوئی۔ ”آپ مجھے ہر حال میں تابع پائیں گے۔“

”شاباش ہم تمہیں اور نقی الدین کو اپنے بیٹوں میں شمار کرتے ہیں“

عزا نقی الدین اور عزا الدین فرخ شاہ دونوں گئے بھائی تھے۔ ان دونوں ہاتھوں نے سلطان صلاح الدین کے ساتھ صلیبی جنگوں میں بڑے نمایاں کارنامے انجام دئے تھے۔

سلطان صلاح الدین کی باتوں سے فرخ شاہ کو بڑا حوصلہ ہوا اور شاید اس نے یہ سوچا کہ۔

اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ محبت میں آنسو بہانے کے بجائے میدان میں دن بھائے گا۔ اس دن سے امیرزادہ فرخ شاہ کی معمولات میں ایک کی تبدیلی آگئی اور عشق عاشقی میں الجھا ہوا ذہن خالی ہوا اور اس میں اور شوق شہادت کا دریا موجیں لینے لگا۔

زمانہ میں بالڈون چہارم شاہ یروشلم نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ دمشق پر حملہ کیا۔ اس فرنگی لشکر نے مسلمانوں کی آبادیاں برباد کردیں بڑی کی اور بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ سلطان نے خبر پاتے ہی ایک روانہ کیا اس لشکر کی سپہ سالاری سلطان نے عزالدین فرخ شاہ کو دی۔ بڑی تیزی سے دشمن کی طرف بڑھا فرنگی لشکر قتل و غارت گری اور کے بعد واپس جانا چاہتا تھا کہ فرخ شاہ لشکر لے کر ان کے مقابلہ پر لی اور اسلامی لشکر میں بڑی خوریز جنگ ہوئی فرخ شاہ نے شجاعت کے دکھائے اور نصرائیوں کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

لی لشکر بڑی بے سروسامانی کا عالم میں پسا ہوا۔ مسلمانوں نے بہت سے ہل کو گرفتار کر لیا۔ دوہڈو جنگ میں نصرائیوں کے سردار ٹورون ہنری ہوئی اور اسے فرخ شاہ نے گرفتار کر لیا تھا۔ مغربی مورخوں نے لکھا ہے کی آف ٹورون یروشلم کے شاہ بالڈون کو بچاتے ہوئے مسلمانوں کے آگیا۔ ہنری کی بہادری کے ساتھ ابن کثیر نے لکھا ہے :-

”الفاظ ہنری کی تعریف سے قاصر ہیں۔ وہ بہادری اور کاہکستی کے لئے ضرب النثل تھا۔ مسلمانوں کی تہدید

میں شامل تھا اور بھاری بھاری قدموں سے خیالات میں کھویا چل رہا تھا۔ سلطان اس دوران پھر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے غلام سے سرگوشیوں میں کہ وہ فرخ شاہ کو واپس لے آئے۔ غلام تیزی سے فرخ شاہ کی طرف بڑھا جو کا پردہ اٹھا کر باہر نکلے والا تھا۔

”سلطان آپ کو یاد فرما رہے ہیں امیرزادے۔“ غلام نے آہستہ سے کہا۔ فرخ شاہ چونک پڑا پھر سانس درست کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بلارہے سلطان جیسے اسے غلام کی بات پر اعتبار نہ آیا ہو۔“

”جی ہاں امیرزادے سلطان معظم نے مجھے آپ کو واپس لانے کا حکم ہے“ غلام نے اسے ٹھہر ٹھہر کے سمجھایا۔

فرخ شاہ اس کے ساتھ واپس آگیا سلطان مسند پر بیٹھا تھا۔ اس نے شاہ کو اپنے سامنے بیٹھا لیا اور بزرگوں کی طرح سمجھایا۔

”فرخ شاہ ہم نے تمہیں یہ سمجھانے کو بلایا ہے کہ امیر شمس الدین ایک بہترین ناظم فوج جنگ کا ماہر اور مرد میدان ہے لیکن یہ شخص اعتماد نہیں دوسرے کے احسان کو ایک لمحے میں بھول جاتا ہے اور سازشی مالک ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کا کہیں اور رشتہ کر دیا ہے اس کا ہمیں انسوس تھا اس لئے کہ اس بہادر اور انسان دوست لڑکی کو ہم نے تمہارے لئے پڑھا تھا اور آج اس سلسلے میں ہم المقدم سے گفتگو کرنے والے تھے مگر اس اس کی شادی کی اطلاع دے کے ہمیں روک دیا۔ مگر اب ہم اس نتیجے پر ہیں کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ تم اس رشتے سے بچ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی سے شادی کے بعد تمہارا اور اس کا روز روز سامنا ہوتا تھا اور اس کے دل تمہارے لئے جو کدورت ہے اس کی بنا پر جلد یا بعد کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور ہوتا تھا۔“

”میں سلطان معظم کے خیالات سے بالکل متفق ہوں۔“ فرخ شاہ نے کے خیالات کی تائید کر دی۔

”صرف تمہیں نہیں فرخ شاہ“ سلطان نے زور دے کر کہا۔ ”تم ابھی ہو اور تمہیں بہت ترقی کرنا ہے۔ اس لئے تمہیں بہت پرسکون ہونا چاہئے اس سکون کے لئے تمہیں جلد از جلد شادی کرنا ہوگی ہم تمہارے لئے کوئی لڑکی پسند کریں گے۔“

”تنبیہ اور پریشان کرنے کے لئے خدا نے اسے عذاب کی صورت پر رکھا تھا۔“

سلطان صلاح الدین نے عزالدین فرخ شاہ کو ایک لشکر کی سروری کا یہ موقع دیا تھا جس میں فرخ شاہ نے ہنری آف ٹولڈن کو قتل کر کے دھڑ بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرخ شاہ اپنی کامیابی کے بعد جب سلطان کے حضور ہوا تو سلطان نے اسے بہت شاباش دی۔

ہنری کے مارے جانے کا نصرانیوں کو بڑا تعلق تھا۔ چنانچہ اس کا بدلہ کے لئے انگلیہ اور لازدیکہ کے پرنس نے مسلمان کے قلعہ شیرز پر حملہ کر حاکم شیرز نے سلطان صلاح الدین کو کمک کے لئے اطلاع بھجوائی۔ سلطان موجود نہ تھا۔ وہ بانیاس گیا ہوا تھا۔ پھر سلطان نے اطلاع پا کر فرخ شاہ دوسرے بھائی تقی الدین عمر اور ناصر الدین کو فوج کمک کے ساتھ شیرز بھیج دی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی بانیاس میں اس لئے گیا تھا کہ وہاں فرنگیوں حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر کے قریب ایک قلعہ بنا لیا تھا جس کا نام الاضرار تھا۔ پس سلطان نے دمشق سے لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور بانیاس گیا۔ وہاں بیٹھ کے سلطان نے نصرانی شہروں پر حملہ کے لئے اپنے فوجی روانہ کئے مگر اس وقت سلطان نے اپنے پاس بھی کافی لشکر رکھا تاکہ اگر سمت سے اچانک حملہ ہو جائے تو اس کا رملہ جیسا حال نہ ہو۔

اس کے بعد سلطان نے قلعہ مخائنت الاضرار کے طرف کوچ کیا اور وہاں قلعہ پر حملہ کر دیا۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ دشمن کے پاس کتنی ہے۔ قلعہ والوں کی طرف سے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ سلطان یہاں بھی چند فوجی دستے نصرانی شہروں کی طرف چھاپہ مارنے کے لئے بھیجے ہوئے دستوں میں سے ایک دستہ پر فرنگیوں کے بادشاہ نے اپنی فوجی حملہ کر دیا۔ جنگ چھڑ گئی تو مسلمانوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی۔ فوجیں لے کر اس طرف چل پڑا۔

جس وقت سلطان وہاں پہنچا تو دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہو رہی سلطان نے اپنی فوجوں سے فرنگیوں کو شکست دی اور انہیں تباہ کر دیا۔ فرخ بادشاہ مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلا مگر رملہ اور بانیاس کا حاکم جو فرنگی ساتھی تھا گرفتار ہو گیا۔ اس کا دوسرا بھائی بھی گرفتار ہوا جو جیل اور

فرنگیوں کے مددگار فرقتہ فدائیہ داسا تادیہ کے سردار بھی گرفتار ہوئے۔ بادشاہ کا حاکم جس کا نام ارتیزاں تھا اس نے ڈیڑھ لاکھ ذرفیہ اور ایک ہزار قدیوں کی رہائی کے بدلہ میں خود کو رہا کر لیا۔

جنگ میں فرخ شاہ کے بھائی تقی الدین عمر نے فرنگیوں سے مقابلہ کر میں بھاگ کر اپنی بہادری کا دشمنوں سے لوہا منوالیا۔ سلطان نے اپنا لشکر لے کر پھر بانیاس واپس آیا۔ یہاں سے اس نے چھوٹے فوجی دستوں کو فوجی علاقوں میں تاخت و تاراج کے لئے بھیجا۔ اس زمانہ حکمت عملی اس طرح تھی کہ جب کسی بڑے قلعہ یا شہر پر حملہ کیا جاتا یا محاصرہ کرنے کے بعد یا پہلے ہی کچھ فوجی دستے قرب و جوار کے علاقوں میں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ جس قلعہ یا شہر کا محاصرہ کیا گیا ہے یا محاصرہ کرنے کا ارادہ ہے اس کو لے کر کمک نہ پہنچ سکے اور دہشت کی وجہ سے کمک بھیجنے والے اپنے میں رہیں۔ سلطان نے یہ سب کچھ اس حکمت کے تحت کیا تھا۔

یہ دستوں کی روانگی کے بعد سلطان پھر قلعہ مخائنت الاضرار پہنچا اور اس کا لڑ لیا۔ یہ قلعہ بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔ کئی دن کی کوشش کے بعد جب یہاں نہ ہوئی تو سلطان نے فسیل کو سرنگ کے ذریعہ اڑا دینے کا حکم دیا۔ سرنگ کھدنا شروع ہوئی۔ ادھر سرنگ کھدتی رہی اور ادھر دشمن کو مصروف رکھنے کے لئے قلعہ پر حملہ جاری رہا۔ آخر سرنگ کھد ہوئی۔ پھر اس میں لکڑیاں بھر کر آگ لگائی گئی۔ سرنگ پھٹ کے اڑی اور اسے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا کیونکہ اس سے فسیل کا صرف ذرا سا حصہ جس سے حملہ آور قلعہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

سلطان نے دوبارہ سرنگ کھودنے کا حکم دیا۔ ادھر سلطان کو اطلاع ملی کہ طبریہ میں فوس اٹھا ہو رہی ہیں تاکہ قلعہ مخائنت الاضرار کو بچانے کے لئے لشکر پر عقب سے حملہ آور ہوں۔ اس اطلاع پر سلطان نے سرنگ کی لکڑیوں کو شیش تیز کرادیں۔ پھر قسمت نے سلطان کا ساتھ دیا۔ روایت کے ایک عام سا آدمی جس کا تعلق سلطانی لشکر سے نہ تھا وہ ششیر برہنہ ہاتھ نہ معلوم کس طرح فسیل کے اوپر چڑھ گیا سلطان لشکر نے جو ایک فسیل پر چڑھتے دیکھا تو وہ بھی یلغار کرتا ہوا فسیل کی طرف بڑھا اور اتنا

رمغانہ کا خیال تو وہ اپنے دل سے ہی نکال چکا تھا مگر اس وقت اس نے
کو معاف کر کے اپنا دل پوری طرح مطمئن کر لیا پھر طلبک جانے کا قصد
طلبک کا دمشق سے فاصلہ پچاس میل کے لگ بھگ تھا۔ یہ سفر وہ ایک
ن بھی باسانی طے کر سکتا تھا لیکن وہ قصداً دو دن پہلے طلبک روانہ ہوا
طلبک سے صرف بیس میل پہلے اس نے ایک سرائے میں قیام کیا پھر
دو دن صبح کو طلبک روانہ ہوا۔

بیس میل کا فاصلہ کیا ہوتا ہے پھر فرخ شاہ جیسے شہسوار کے لئے تو ایک گھنٹے
زما۔ فرخ شاہ دن چڑھے سرائے سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے فصیل
داخل ہو گیا۔ طلبک ایک پرانا تاریخی مقام تھا۔ سلطان صلاح الدین کے
میر نجم الدین ایوب کو اس شہر و قلعہ کی گورنری زنگی امیر عماد الدین والی
نے عطا کی تھی اور سلطان صلاح الدین کے عہد طفلی کے کئی سال اس
میں گزرے تھے۔

فرخ شاہ شہر میں داخل ہوا تو اسے حیرت نے گھیر لیا۔ امیر شمس الدین ابن
اس کا والی تھا اور اس کی بیٹی کی آج شادی تھی مگر شہر پر اس شادی کے
آثار نظر نہ آتے تھے۔ فرخ شاہ کو اچانک خیال آیا کہ وہ یقیناً شادی کی
بول گیا ہے۔

ہاند کی چھ تاریخ ”فرخ شاہ نے ذہن پر زور دے کے سوچا۔ یہی تاریخ امیر
نے سلطان کو بتائی تھی۔ بھولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کل پانچ
روز آج چھ۔ پھر بھی فرخ شاہ گھوڑے سے اترا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
بزرگ صورت دور سے آتے دکھائی دیئے۔ فرخ شاہ نے گھوڑا سایہ میں
اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

بزرگ قریب آئے تو فرخ شاہ نے سلام کے بعد ان سے دریافت کیا۔
”محترم آج کون سی تاریخ ہے؟“

بزرگ نے جواب میں کہا۔ ”چھ تاریخ ہے آج۔“ پھر اس کے ساتھ سوال
انہی معلوم ہوتے ہو۔ کہاں سے آتا ہوا؟“

آپ کا خیال درست ہے بزرگ۔ ”فرخ شاہ نے جواب دیا۔ ”طلبک۔
ایک بار آیا تھا وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے۔“

مگر کہاں ہے تمہارا سوار؟“ بزرگ نے اپنا سوال دہرایا۔

زبردست حملہ کیا کہ قلعہ والے کچھ نہ کر سکے اور سلطانی لشکر کے بے شمار
پیڑھیاں لگا کر قلعہ پر چڑھ گئے۔

قلعہ کے اوپر دست بدست جنگ ہوئی اور آخر قلعہ فتح ہو گیا۔ ایک دن
یہ بھی ہے کہ دوسری سرنگ جب پھٹی تو فصیل کا ایک حصہ اڑ گیا اور اس
قلعہ میں داخل ہوئے بہر حال روایت کچھ بھی ہو لیکن انجام قلعہ کی تسخیر
سلطان کو یہ عظیم فتح ماہ ربیع الاول ۵۷۵ ہجری بمطابق ۱۱۷۹ء حاصل ہو
سلطان کے حکم کے مطابق قلعہ کی فصیل کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا
فرنگیوں کا جو لشکر طبریہ میں اکھٹا ہو رہا تھا۔ اسے جب قلعہ کی تسخیر پر اس
بربادی کا حال معلوم ہوا تو وہ لوگ منتشر ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس
ہو گئے۔ ایک بیان کے مطابق فرنگی لشکر اس وقت قلعہ نمانہ الاضرار پہنچا
وہاں قلعہ کے بجائے مٹی اور پتھر کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

امیر شمس الدین ابن المقدم کی بیٹی کی تاریخ شادی بہت قریب آگئی
امیر زادہ فرخ شاہ نے سلطان سے کچھ دن کے لئے دمشق جانے کی خواہش
اظہار کیا۔ سلطان کو یقین تھا کہ امیر زادہ طلبک جانا چاہتا ہے مگر اس سے
شاہ سے اس سلسلہ میں کوئی گفتگو نہ کی اور اسے اجازت دیدی۔ فرخ شاہ کو
تو طلبک ہی تھا مگر وہاں جانے سے پہلے اپنے دماغ کو بالکل پرسکون کرنا
تھا۔ سلطان کے سمجھانے کا اس پر پورا اثر ہوا تھا اسے ارمغانہ سے بھی
شکایت نہ تھی کیونکہ وہ غریب اپنے ظالم باپ کے اختیار میں تھی وہ اس سے
مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔

فرخ شاہ کو ارمغانہ کی کمزور طبیعت کا بھی تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ اس
باپ امیر المقدم نے جب اسے سردار دانیال کے ساتھ فرخ شاہ کے قتل پر
کیا تھا تو وہ چپ چاپ دانیال کے ساتھ اس کے قتل پر آمادہ ہو کر آگئی
وہ تو فرخ شاہ کی قسمت اچھی تھی کہ خدا نے ارمغانہ کے دل میں نیکی ڈال
اور اسے فرخ شاہ کی بھولی صورت پر رحم آگیا ورنہ اس دن فرخ شاہ کا
ہوجانا ضروری تھا۔ فرخ شاہ نے سوچا کہ جب ارمغانہ باپ کے کہنے سے
بے گناہ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے تو پھر اس سے اور کوئی کام لینا
کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

پر لپٹ گیا۔ پھر جو اس نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا ہے تو راکھ کے کھڑے ہو گئے۔ فرخ شاہ کا دل تو پہلے ہی رو رہا تھا۔ مقدم دیکھ کر اس کے بھی آنسو نکل آئے۔ امیر مقدم ایسے دھاڑیں مار کے کہ پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

فرخ شاہ نے مشکل سے امیر مقدم کو اپنے سے الگ کیا اور رہا۔ کیجئے امیر جس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ ہم آپ کیا کر سکتے مقدم نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”امیر زادے مرنا تو سب کو ہے ایسے مرنا ہے رات کو اچھی بھلی سوئی اور ایسی سوئی کہ پھر آنکھ ہی نہ کچھ کمانہ سنا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی اسے۔ کون سا غم کھا گیا اسے پھر مقدم اک دم چپ ہو گیا۔ سنبھل کے بولا۔ ”آپ کب تشریف کیا آپ کو میرے غم کا علم ہو گیا تھا؟“

”نہیں امیر محترم۔۔“ امیر زادے نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”میں ا رخصت کرنے آیا تھا۔ اس نے اتنی جلدی کی۔ انتظار بھی نہ کیا۔ مجھے ورنہ دو دن پہلے آجاتا۔“

المقدم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں امیر زادے۔ کسی کو پتہ نہ تھا۔ والوں کو کتنی خوشی تھی اس شادی کی۔ ان کے دلوں میں کیا کیا ارمان سب دل ہی میں رہ گئے۔“

المقدم نے امیر زادہ کا گھوڑا سنبھالنے کا ایک سوار کو حکم دیا پھر فر لے کر گھوڑا گاڑی پر بیٹھ گیا۔ مقدم نے اپنا جانا ملتوی کر دیا تھا۔ وہ شاہ محل میں آگئے۔

المقدم نے خود ہی بتایا۔ ”کوئی بیماری آزاری نہ تھی ارمخانہ کو۔ تھی۔ حارش اس سے روز ملنے آتی تھی۔ قریب ہی ہے اس کا گھر۔ چار سے ارمخانہ کچھ چپ چاپ تھی۔ میں حکیم کو بلا کر دکھایا۔ انہوں دیکھی اور اطمینان دلایا کہ بچی کو آپ کا ساتھ چھوٹے کا غم ہے۔ مگر اسے کھا گیا۔ بھلا کوئی ایسا غم کرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ امیر زادے اسے کہ تو مجھے بتایا ہوتا۔ میرے سوا اور کون ہے اس کا۔ باپ بھی میں ماں بھی کو اس کے لئے کچھ کرنا تھا مگر وہ کچھ کہتی تو۔۔۔۔۔“

فرخ شاہ نے محسوس کیا کہ شدت غم سے امیر مقدم ہلکنے لگا ہے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زیادہ مت بولے بلکہ آرام کیجئے۔“ ام کو ارمخانہ کا سوئم تھا۔ محل کی تمام راہداریاں اور پائیں باغ میں آدمی لائے۔ زنانخانہ میں عورتیں بھری تھیں۔ سب کی سب پر ایک ہی کلمہ

”اللہ ایسی جوان موت کسی کو نہ دکھائے“

فرخ شاہ کی طبیعت بہت بھاری ہو گئی تھی۔ سوئم سے فارغ ہونے پر اس سے اجازت مانگی۔ امیر مقدم کو دو تین روز قیام کی درخواست کی مگر اسے مجبوری ظاہر کی۔ پھر اسی رات فرخ شاہ۔ طلبک سے روانہ ہو گیا۔ بلانے کے بجائے اس نے محاذ کا رخ کیا جہاں سلطان لشکر لئے مقیم تھا۔ سلطان قلعہ مخاضہ الاضرار کو پیوند زمین کرنے کے بعد وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ خیال تھا کہ فرنگیوں کا وہ لشکر جو طبریہ میں جمع ہو رہا تھا شاید مقابلہ پر اپنی دونوں امیر زادہ فرخ شاہ سلطان کے پاس پہنچا اور سلام کر کے چپ ہو گیا۔

یا دمشق سے آرہے ہو فرخ شاہ؟“ سلطان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

یا دمشق گیا تھا مگر اس وقت۔ طلبک سے آرہا ہوں عالیجاہ۔ ”فرخ شاہ روکی سے جواب دیا۔

اچھا!“ سلطان نے سر ہلایا۔ ”امیر شمس الدین کا کیا حال ہے۔ اس کی شادی ہو گئی؟“

عالیجاہ آپ کے امیر شمس الدین مقدم غم زدہ ہیں آج کل ان پر غموں کا ث پڑا ہے۔“

فرخ شاہ نے بتایا۔ ”وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن۔۔۔۔۔“

لکھتے لکھتے رک گیا۔ لیکن کیا۔۔۔ خاموش کیوں ہو گئے؟۔ سلطان نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

فرخ شاہ نے افسردگی سے کہا۔ ”عالیجاہ وہ شادی کس کی کرتے۔ ان کی بیٹی کا دل سے دو دن پہلے ہی انتقال کر گئی۔“

”سلطان چونکہ پڑا۔“ وہ بچی انتقال کر گئی تم کب گئے تھے

مد نے اندر آ کر سلام پیش کیا۔

محمود کا کیا حال ہے قاصد؟“ سلطان نے قاصد سے دریافت کیا۔ حاکم کیفہ کا پورا نام تھا نور الدین محمود عالی قلیج ارسلان - سلطان اسے صرف محمود تھے۔

عالیجاہ - میرے آقا اس وقت سخت مصیبت میں ہیں اور اعلیٰ حضرت سے دیکر درخواست فرمائی ہے۔“ قاصد نے ادب سے جواب دیا۔

با مصیبت پڑی اس پر کس نے حملہ کر دیا؟“ سلطان نے پوچھا۔ مد نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔ عالیجاہ ان کا اور ان کے خسر کا خاندانی ہے۔ میرا مطلب ہے دونوں میں ذاتی اختلاف ہے کئی بار چھڑپیں ہو چکی ہیں انہوں نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔“

علان کر دیا ہے تو محمود سے کہو کہ جنگ کرے۔ میں خسر داماد کے جھگڑے کو بہت برا سمجھتا ہوں۔“ سلطان نے سرا سامنے بنایا۔

عالیجاہ -- میرے آقا آپ کی طرف سے کیفہ اور آمد کے والی ہیں۔ ان پر نہ پڑی ہے۔ آپ کے نہیں تو پھر کس کے دروازے پر جائیں۔“ قاصد نے اچھے انداز سے اپنے آقا کی وکالت کی۔

سلطان نے حیرت سے قاصد کو دیکھا۔ ”تم قاصد ہو یا محمود کے وزیر؟“ مد گھبرا گیا۔ ”عالیجاہ -- غلام کی گستاخی معاف فرمائی جائے۔ شاید میری رائے مرتبے سے بہت بلند تھی۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ قاصد --- تمہاری اپنے آقا کے ساتھ وفاداری سے ہم خوش ہوئے۔“ نے نرمی سے کہا۔

لیا محمود کے خسر نے کیفہ پر حملہ کر دیا ہے یا صرف جنگ کا اعلان کر کے آیا ہے؟“

شاید دھوکا دیا ہے عالیجاہ - لیکن جنگ ضرور ہوگی۔ خبر ملی ہے کہ حاکم بلاد نے فوجی تیاریاں مکمل کر لی ہیں اور وہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔“ لہذا ہم تک علم تھا وہ اس نے بتا دیا۔

اچھا تم جاؤ اور محمود کو اطمینان دلادو کہ ہم اس کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔“ مد نے اسے جواب دے کر واپس بھیج دیا۔

یہاں تک سلطان نے فرمایا۔ یہ واقعی خسر داماد کا خاندانی اور ذاتی جھگڑا تھا۔ نور

”میں ٹھیک شادی کے دن پہنچا تھا عالیجاہ - فرخ شاہ نے بتایا -“ امیر الدین المتقدم مجھے قلعہ سے نکلتے ہوئے مل گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس دو دن پہلے اچانک انتقال کر گئی ہے اس دن اس کا سوئم تھا۔“

”تم نے معلوم کیا لڑکی کو کیا بیماری تھی؟“ سلطان کا دماغ کچھ چڑھا تھا۔

”میں۔ طلبک گیا تو میرا خیال تھا کہ آج وہاں بڑی رونق ہوگی۔ آخر گور بیٹی کی شادی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہر پر ویرانی طاری تھی۔ نے اس بزرگ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ کی بیٹی دو دن پہلے مر گئی تھی اس کے سوگ میں پورا شہر ماتم کتنا تھا۔“

سلطان صلاح الدین بھی اس خبر سے افسردہ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک جھکائے بیٹھا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کے بولا - ”خدا کرے میرا خیال غلط ہے اس وقت سلطان کے پاس دمشق کا سابق گورنر شمس الدولہ توران بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان کو اس کے بارے میں بہت سی شکائتیں موصول ہوئی جن کی بنا پر توران شاہ کو دمشق سے اپنے پاس بلوایا تھا۔

توران شاہ نے سلطان سے سوال کر دیا۔ ”عالیجاہ۔ طلبک پر ہمارے خاندان پہلا حق ہے۔ آپ۔ طلبک کی گورنری مجھے عطا کر دیجئے؟“

”فضول باتیں مت کرو توران شاہ۔“ سلطان نے اسے جھڑک دیا۔

میں ایک گورنر پہلے سے موجود ہے۔“

”پھر کیا ہوا عالیجاہ -- اسے کوئی اور علاقہ دے دیجئے اور۔ طلبک مجھے دے“ توران شاہ جیسے ضد پکڑ گیا۔ ”میری سلطنت دمشق اور مصر کے لئے ہے۔ میں۔ کیا میں ایک قلعہ کی گورنری کے بھی قائل نہیں؟“

”اچھا اچھا - سوچیں گے ہم۔“ سلطان نے اسے ٹال دیا۔

”آپ سوچیں گے عالیجاہ؟“ توران شاہ سلطان کا منہ چڑھا تھا۔ اس نے بات چھیڑ دی۔ سوچتے ہیں چھوٹے لوگ - آپ سلطان ہیں فرمان جاری فرما میں کل ہی۔ طلبک روانہ ہو جاؤں گا۔“

اسی وقت غلام نے اطلاع دی کہ حاکم کیفہ کا قاصد حاضر ہوا ہے۔ اپنے بھائی توران شاہ کی باتوں سے بددل ہو رہا تھا۔ اس نے قاصد کی غنیمت جانا اور اسے طلب کر لیا۔

الدین محمود عادل جو سلطان کی طرف سے کیفا اور آمد کا والی تھا۔ اس نے قلعہ رعیاں کے حاکم قلعہ اور ارسلان کی بیٹی سے شادی کی تھی مگر محمود کچھ زیادہ ہی شوخ طبیعت تھا۔ اس نے ایک خوبصورت اور شریف بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لی اور بیوی کی سوکن کو اسی گھر میں لے آیا۔ ظاہر ہے محمود کی پہلی بیوی اعلیٰ خاندان کی تھی جبکہ دوسری بیوی کسی نچلے طبقہ کی تھی۔ اس طرح دونوں میں لڑائی جھگڑا شروع ہوا اور یہ روز کا معمول بن گیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ قلعہ ارسلان کی بیٹی میکے جا کے بیٹھ گئی۔ قلعہ ارسلان نے بیٹی کو جیز میں بہت کچھ دیا تھا۔ اسے داماد پر سخت غصہ آیا مگر رشتہ کی نزاکت کی وجہ سے خاموش رہا اور معززین کے ذریعہ داماد کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ محمود بددماغ اور ضدی تھا۔ اس کے کسی کی کوئی بات نہ سنی اور آخر نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔ ان میں کئی بار معمولی جھڑپیں ہو چکی تھیں مگر کسی بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی تھی۔

قلعہ ارسلان نے بڑے صبر و سکون سے بیٹی کو دوبارہ شوہر کے پاس بھیجے کی کوشش کرتا رہا مگر محمود نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اس نے جس عورت سے دوسری شادی کی تھی وہ بالکل جاہل تھی ورنہ بڑے لوگوں کے گھر دو بیویوں کا ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ آخر تنگ آکے قلعہ ارسلان نے محمود کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ محمود کو اپنے آقا سلطان صلاح الدین کا زلم تھا۔ اس نے آقا سے مدد طلب کی اور صلاح الدین کو اس کی مدد پر آمادہ ہوا۔

سلطان صلاح الدین نے محمود کے حق میں فوجی اقدام سے پہلے معاملہ کی پوری حقیقت سے آگاہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ محمود اور قلعہ ارسلان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس شادی کے بعد تو انہیں اور قریب ہو جانا چاہیے تھا لیکن قلعہ ارسلان کی بیٹی اپنے اوپر سوکن برداشت نہ کر سکی اور شوہر سے جھگڑا کر کے میکے آ بیٹھی۔ باپ نے سمجھا بھکا کے بیٹی کو شوہر کے گھر جانے کے لئے شرط پر رضامند کر لیا کہ اس کا شوہر محمود اسے سوکن کے ساتھ رکھنے کے بجائے الگ حویلی میں رکھے اور دونوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرے۔

بات معقول تھی۔ قلعہ ارسلان کے ایک قاصد کے ذریعہ محمود کو پیغام

لی پوری شوہر کے پاس جانے کے لئے آمادہ ہے اس لئے محمود خود آئے ی متعہ کے ذریعہ بیوی کو بلوائے اور اسے الگ جگہ رکھے اور برابری بھی کرے۔ قاصد محمود کے پاس پہنچا تو اس نے یہ شرط فوراً منظور نہ کی وہ محل کے اندر گیا تو اس کی دوسری بیوی نے نہ جانے اس پر کیا کہ اس نے واپس آکر قلعہ ارسلان کو صاف جواب دے دیا۔

ارسلان سے جا کے کہہ دو کہ محمود ان کا ماتحت نہیں اگر بیٹی کو بھیجنا کے ساتھ بھجوا دو یا خود پہنچا دو۔ میری بیویاں ایک ہی محل میں رہیں سلوک دونوں کے ساتھ برابر کا ہوگا۔

یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ حاکم کیفا ابھی آپ نے حاکم بلا دوام کی شرط مان لی تھی اور اپنی بیگم بلانے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ الگ رہائش کا بھی آپ نے اعلان کیا ہے آپ صاف انکار کر رہے ہیں۔ براہ کرم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی

کیفا محمود کو غصہ آگیا۔ ”تم قاصد ہو یا میرے مشیر کار۔“ جو میں نے وہ جواب قلعہ ارسلان حاکم بلا دوام کو پہنچا دو۔ اس جواب میں کوئی ترمیم نہ تھی۔

ر نے کچھ اور کہنا چاہا مگر محمود نے اسے روک دیا۔ ”مزید کی ضرورت کی نہیں۔ تم واپس جاسکتے ہو۔“

ر کے لئے سوائے واپس جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا وہ سلام کر کے قلعہ رعیاں پہنچ کے قاصد نے حاکم بلا دوام قلعہ ارسلان کو بتایا۔

میرے آقا۔ حاکم کیفا دل کا برا نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے آپ کا نہ ہی تمام باتیں مان لی تھیں۔ شاید وہ خود بیوی کو واپس لینے یہاں آتا ہے وہ محل کے اندر گیا اور پھر واپس آیا تو اس کا دماغ الٹ چکا تھا۔ اس شرط ماننے سے انکار کر دیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ انہیں میری بیوی بچا ہے تو اسے پہنچا جائیں مگر دونوں کو ایک ہی گھر میں رہنا ہوگا۔

ارسلان ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اس نے غاکو الٹی میٹم دیدیا کہ اگر ایک ماہ کے اندر محمود اپنی بیوی کو واپس لے لے اور شرمیں تسلیم کرنے کا اعلان کرنے میں ناکام رہا تو کیفا اور آمد پر

فرخ شاہ بہت پریشان تھا۔ اس کے خیال میں یہ بلا وجہ کی جنگ تھی جس میں جتنی ہی جانوں کے ضائع ہونے کا احتمال تھا۔ فرخ شاہ نے سلطان سے تو کہہ دیا کہ بلکہ نور الدین محمود کو سمجھایا کہ وہ بلا وجہ کی ضد کر کے قیمتی جانوں نقصان نہ کرے اور بیوی کو الگ مکان میں رہنے کا وعدہ کرے۔ نور الدین نے دوسری بیوی کے بھڑکانے پر قلعہ ارسلان کو صاف جواب دیا تھا مگر جب اسے فرخ شاہ نے سمجھایا تو اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے خود سلطان کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور بیوی کو ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔

جنگ کے آئے ہوئے بادل چھٹ گئے۔ امیر زادہ فرخ شاہ کی کوشش سے جنگ ہوتی ہوئی رک گئی۔ سلطان نے فرخ شاہ کے ساتھ محمود کو قلعہ رعیان پر دیا۔ محمود نے وہاں اپنے خسر سے معافی مانگ لی۔

اس طرح ایک اجڑا ہوا گھر پھر سے بس گیا۔ محمود اپنی بیوی کو کیٹا گیا۔ پھر اللہ کا کچھ ایسا کرم ہوا کہ محمود اپنی دوسری بیوی سے جو ایک پر گھرانے کی خوبصورت عورت تھی ناراض ہوا اور یہ ناراضگی اس قدر بڑھی کہ محمود نے اسے طلاق دے کر پیش کے لئے محل سے رخصت کر دیا۔

غافل فرمانروا

نور الدین کو خانہ جنگیوں میں گھرے ہوئے ساتواں سال تھا۔ صلاح الدین اور آقا سلطان نور الدین زنگی نے 15 مئی 1174ء کو انتقال کیا تھا۔ 118ء چل رہا تھا کہنے کو تو سلطان صلاح الدین نے تقریباً پورا ملک لیا تھا لیکن اب بھی بعض علاقے اس کو سلطان تسلیم نہ کرتے تھے۔ دل میں دراصل شروع ہی سے جہاد کا جوش تھا اور وہ اہل فرنگ کے پر جہاد کرنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس دوران اس نے نصرانیوں سے کی تھی لیکن اس کے دل کے ارمان اب تک نہ کھل سکے تھے۔ مصر کے دوران بھی اس کے شاہ یرشلیم کے ساتھ کئی معرکے ہوئے لیکن دمشق کے سلطان کا نائب تھا اس لئے نصرانیوں کے خلاف کوئی نہ ملتا تھا۔

اب سلطان نور الدین زنگی کے بعد مصر کے ساتھ ساتھ اس کا دمشق و گیا تو اس کے شوق جہاد نے ایک بار پھر چنگیاں لینا شروع کیا۔ مگر برا نہ جنگی کا جس نے سلطان صلاح الدین کو اپنے نصب العین کی تکمیل دیا۔ یوں تو مسلمان چھ سو سال سے برابر دنیا کے کسی نہ کسی حصہ کا رخ پر پروانہ وار قربان ہوتے اور اس روشنی کو تاریک گوشوں تک رہے تھے لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کا شوق جہاد صرف جذبہ جہاد نہیں تھا بلکہ اس کے دل میں ایک اور اعلیٰ اور ارفع خیال بھی جاگزیں خیال تھا بیت المقدس کو نصرانیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اس پر اللہ کی لڑائی تھا۔

المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ اسی قبلہ کی طرف مسلمان

ن کرنا تھا۔

1180ء میں ایسا ہوا کہ دریائے فرات کے کنارے شام کے سرحدی شہر میں ایک بین العاقلاتی مجلس منعقد ہوئی جس میں سلطان قونیہ غلیج، دوم، شاہ آرمینیہ سقمان دوم، شاہ موصل عزالدین مسعود جو غازی سیف کے بعد شاہ موصل ہوا تھا اور جسے حلب کے شاہ ملک الصالح نے اپنے رطب کا بھی وارث بنا دیا تھا شریک ہوئے۔ ان شاہوں کے علاوہ اس الجزائر، ازیل، کیفا اور مارون کے شہزادوں نے بھی شرکت کی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس مجلس کی صدارت کی اور باہمی گفتگو اور شورے سے تمام شرکاء دو سال کے لئے امن کے معاہدے پر رضامند ہوئے۔ معاہدہ تیار ہوا۔ سب نے اس پر دستخط کئے اور زبانی قسم کھائی کہ وہ کاربند رہیں گے اور اپنی حدود میں امن و امان قائم رکھیں گے۔ یہ ایک کام تھا اور ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا۔

ان دوران یورپ اور ایشیاء کے بہت سے ملکوں میں تبدیلیاں آگئی تھیں۔ شاہ لوی مرگیا تھا اور اس کی جگہ فرانس کا بادشاہ آگسٹس بن گیا تھا۔ کا اسقف اعظم ایکبمزر کے بجائے نیو سی ایس ہو گیا تھا۔ قسطنطنیہ کے دوم کاہنئس کے بجائے تحت قسطنطنیہ پر الکسی ایس براہمن تھا۔ بغداد کی خلافت میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ عباسی خاندان کے تیسویں (33) خلیفہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ الناصر تحت خلافت پر بیٹھا تھا۔

وسط کے دو سالہ معاہدہ سے پہلے سلطان صلاح الدین کو ایک بار پھر شمس المقدم سے مورچہ لینا پڑا۔ یہ امیر بڑا تجربہ کار اور شجاع تھا لیکن خود سری تھا۔ شاہ کر رکھا تھا۔ سلطان نے اسے حلب کی حکومت بخشی دی تھی مگر یہ ہوا کہ جب صلاح الدین کے بھائی توران شاہ کو دمشق کے حاکم کی سے فرنگیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی اور جس میں دمشق کا ایک مشہور ملاک سیف الدین ابوبکر بن السار ہوا تھا۔ اس وقت توران شاہ کو دمشق کی حیثیت سے معذول کر دیا گیا تھا۔ توران شاہ اس رات سے سلطان لدین کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

لہذا جب سلطان صلاح الدین نے شمس الدین المقدم کو حلب کا حاکم بنادیا تو شاہ کو امر بہت ناگوار گزرا۔ وہ اکثر حلب جانے کے لئے کہتا رہتا تھا

وقت تک منہ کر کے نماز پڑھنا ادا کرتے رہے جب تک خانہ کعبہ کی سجدہ کرنے کا حکم خداوندی نازل نہیں ہوا۔ اس طرح بیت المقدس گزشتہ صدی سے نصرائیوں کے قبضہ میں چلا آ رہا تھا۔ نصرائیوں نے 1099ء میں بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں مگر جب سلطان ملک شاہ سلجوقی کا انتقال ہوا تو سلجوقی شہزادوں میں ایسی خانہ شروع ہوئی جس میں نہ صرف تونیہ کی عظیم سلطنت تباہ بلکہ مسلمانوں کا قبلہ اور ملک شام کا تقریباً سارا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور مسلمان مقداد اور اوزہ کے سو گئے۔

پھر اپنی تباہ شدہ سلجوقی سلطنت کی خاکستر سے اتابک موصل کی پڑ بھڑکی۔ اتابک اتالیق اور استاد کو کہتے ہیں۔ اتابک کا جد امجد عماد الدین سلجوقی شہزادہ کا اتالیق تھا جس نے سلجوقی چراغ نکل ہونے کے بعد موصل حریت اور جوش جہاد کا چراغ روشن کیا۔ عماد الدین زنگی ہی دراصل صلاح کے باپ نجم الدین ایوب کا مربی اور آقا تھا۔ جس نے ایک احسان کے نجم الدین ایوب کو حلب کے قلعہ کا حاکم بنادیا۔ پھر عماد الدین زنگی کے بیٹے سلطان نور الدین زنگی نے نہ صرف دمشق میں ایک ایسی اسلامی مملکت رکھی جس نے نصرائیوں کی عظیم طاقت سے آنکھیں ملانا شروع کر دیں۔

سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی اسی سلطان نور الدین زنگی کا پروردہ ہے تھا جس نے اپنے چچا امیر اسد الدین شیرکوہ کے ساتھ مصر کی فاطمی سلطنت خاتمہ کیا اور نصرائیوں اور خصوصاً شاہ یروشلم سے کئی بار جنگ کی۔ سلطان الدین کی نظریں بار بار بیت المقدس کی طرف اٹھتی اور وہ خانہ بیکبار جلد سے جلد پیچھا چھڑا کر اپنے دل کی اس آرزو کی تکمیل میں خود کو کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت تک سلطان صلاح الدین کی دھاک پورے ایشیائی کوپک وسطی پر بیٹھ گئی تھی۔ سلطان دریائے فرات سے دریائے نیل کے علاقوں مسلم حکمران تھا۔ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور شہزادے نہ صرف اس کی کرتے تھے بلکہ اپنے آپ کے جھگڑوں میں سلطان کو ثالث کا درجہ دیتے تھے۔ سلطان اپنے جذبہ میں پر غلوں تھا اس لئے وہ اپنے اس مرتبہ سے کوئی شش نہیں کرتا تھا اور تمام علاقوں میں امن و امان برقرار

مگر سلطان ٹالتا رہا۔ پھر جب اس نے بہت ضد کی تو سلطان نے اسے طلبہ حکمرانی کا پروانہ دے دیا۔ اتفاق سے اسی دن المقدم دمشق آیا۔ سلطان نے سے بھی زبانی کہہ دیا۔ لیکن جب توران شاہ اس سے طلبہ کا قبضہ لینے وہ قلعہ بند ہو گیا اور اس نے بغاوت کردی۔

توران شاہ نے واپس آکے سلطان سے المقدم کی بغاوت کی شکایت سلطان کو شمس الدین المقدم کی جرات پر بڑی حیرت ہوئی۔ سلطان کی طاقت وقت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ملک شام کا ہر چھوٹا بڑا اس کے نام سے تھا اور حکم عدولی یا بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال سلطان طلبہ کے لئے ایک لشکر تیار کرایا اور اس کا سالار عزالدین فرخ شاہ کیا۔ فرخ شاہ نے دے الفاظ میں احتجاج کیا۔

”عالیجاہ خدا کے لئے آپ مجھے طلبہ نہ بھیجئے۔ میں امیر المقدم نہیں کرنا چاہتا۔“

”یہ توقف نہ ہو فرخ شاہ۔ ہم تم اس سے صلاح کی گفتگو کرنے رہے بلکہ طلبہ پر قبضہ اور امیر شمس الدین کو قید کرنے کے لئے ہیں حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ المقدم کو قید کر کے ہم ایک بہتر سردار ہو جائیں گے۔“

فرخ شاہ کے خیال میں امیر شمس الدین المقدم ایک سرپھرا انسان کوئی سرپھرا اور پاگل انسان ہی اپنی اکلوتی بیٹی پر اس قدر ظلم کر سکتا تھا ہی چھوڑ جائے۔ اس لئے فرخ شاہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ المقدم کے مقابل ہو۔

فرخ شاہ کچھ کہنے کے لئے پھر منہ کھولا مگر سلطان نے اسے اشارہ روک دیا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ طلبہ پر قبضہ کے بعد ہم تحفہ دیں گے۔“

فرخ شاہ میں مخالفت کی طاقت نہ تھی۔ اس نے حکم پر سر تسلیم ”میں عالیجاہ کے حکم کی تعمیل میں آج ہی طلبہ روانہ ہو جاؤں؟“ فرخ شاہ سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو سلطان نے اسے روک دیا۔ ”ہم نے تمہیں ایک تحفہ دینے کو کہا ہے فرخ شاہ۔ تم نے پوچھا

کون سا ایسا تحفہ ہے جس کا اعلان ہم پہلے کر رہے ہیں؟“ عالیجاہ آپ مصر اور شام کے سلطان ہیں۔ کوئی بھی تحفہ دے سکتے ہیں فرخ شاہ نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو فرخ“ سلطان نے کہا۔ ”لیکن یہ تحفہ تمہاری طبیعت سے مطابقت رکھتا ہے اور تمہیں اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے ہم تمہیں دے رہے ہیں کہ طلبہ سے واپس آنے پر تمہاری شادی ہوگی۔ لڑکی ہم نے اسے لئے خود پسند کی ہے۔“

سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے بھائی نورالدولہ شاہاں شاہ کے دونوں بیٹوں تقی الدین محمد اور عزالدین فرخ شاہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ سلطان کی محبت صرف والد سے نہ تھی کہ وہ دونوں بھائی اس کے پیچھے تھے بلکہ ان کی شجاعت اور بہادری نے انہیں سلطان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ خصوصاً سلطان کو فرخ سے گہرا لگاؤ تھا اور اس کا اظہار اس نے آگے چل کے عملی طور پر کیا۔

ارمغانہ کے انتقال یا خودکشی نے فرخ شاہ کو خانگی زندگی کے تصور ہی سے ت ہونے لگی تھی۔ عورت کے معاملہ میں وہ پہلے بھی بے حس تھا مگر ارمغانہ کی تک اور دھماکہ خیز ملاقات نے اس کی دیران زندگی میں محبت کے پھول بوٹے اُٹھے تھے اور اس نے ارمغانہ کو اپنا شریک حیات بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ سلطان کو بھی اس کی خبر تھی اور وہ کسی مناسب موقعہ کی تلاش میں تھے کہ امیر شمس الدین المقدم نے اس کی شادی کا دعوت نامہ دے کر سلطان کا منہ بند دیا تھا۔ پھر جب فرخ شاہ سلطان کے حکم سے ارمغانہ کی شادی میں شرکت کے لئے پہنچا تو خود المقدم نے اسے ارمغانہ کی موت کی اطلاع دی۔

فرخ شاہ کے دل میں محبت کی جو چنگاری چمکی تھی وہ دب گئی اور اس نے بالکل پھر تیر تلوار سے لگا لیا۔ سلطان نے اس وقت شادی کا ذکر چھیڑا تو ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی مگر اچانک ارمغانہ کے تصور نے اسے افسردہ کر دیا۔ وہ سلطان کو جواب دینے والا تھا کہ اسی وقت توران شاہ آگیا۔ ”امانت آگے نہ بڑھ سکی۔“

”عالیجاہ آپ نے میری درخواست کا کیا فیصلہ کیا؟“ توران شاہ نے آتے ہی لے لیا۔

سلطان کو توران شاہ کا یہ انداز پسند نہ آیا لیکن سلطان بھائی بھیجیوں سے

بت محبت کرتا تھا اس لئے نرمی سے بولا۔ ”توران شاہ ایک بات کو بار بار دہراتے ہم نے تمہاری درخواست منظور کر لی ہے۔ فرخ شاہ لشکر لے کے ہے۔ عبلک کے قبضہ کے بعد تمہیں وہاں بھیجا جائے گا۔“

”عالیجاہ لشکر کے ساتھ میں بھی عبلک پر قبضہ کر سکتا ہوں۔“ توران شاہ گستاخانہ انداز میں کہا۔ ”آپ لشکر کی کمان مجھے دیں۔“

سلطان چڑ گیا۔ بولا۔ ”توران شاہ سلطان تم ہو کہ میں ہوں۔ ہم جس کو سمجھتے ہیں اسے لشکر کا سالار بناتے ہیں۔“

توران شاہ پھر بھی خاموش ہوا۔ ”عالیجاہ لشکر کے ساتھ مجھے بھی جانے کی اجازت دی جائے۔“

”تم کیا کرو گے وہاں جا کے؟“ سلطان کو غصہ آ گیا۔ ”سالار فرخ شاہ ہے اس کا چلے گا۔“

توران شاہ بڑا ڈھیٹ پھر بولا۔ ”فرخ شاہ بے شک سالار ہے میں سپاہیہ طرح جنگ کروں گا۔“

اب فرخ شاہ نے اعتراض کیا۔ ”آپ میرے چچا ہیں توران شاہ۔ میں کو حکم دیتے ہوئے اچھا نہ معلوم ہوں گا۔“

توران شاہ نے فوراً جواب دیا اور بڑی ذہانت کا جواب دیا۔ ”کیا معظم کے بڑے بھائی سلطان کی کمان میں جنگ نہیں کرتے۔ تمہارا حکم مان فرض ہوگا۔“

سلطان سمجھ گیا کہ توران شاہ نہیں مانے گا اس نے توران شاہ کو فر کے ساتھ جانے کی اجازت دیدی۔ پھر فرخ کو سمجھایا۔

”فرخ شاہ عبلک کی گلیوں میں ہم کھیلے ہیں۔ ہمیں وہاں کے راستوں عمارتوں سے محبت ہے۔ خونریزی سے پرہیز کرنا امیر شمس الدین مطیع ہوگا اسے گرفتار نہ کرنا۔ اپنے خیمے میں جگہ دینا اور اسے عزت سے ہار لانا۔“

”بہتر ہے عالیجاہ“ فرخ شاہ نے سر جھکایا۔ ”تمام احکامات پر عمل ہوگا۔ فرخ شاہ لشکر لے کر عبلک پہنچ گیا۔ سلطان نے خونریزی سے منع پر قلعہ پر حملہ کیسے کرتا محاصرہ کر کے بیٹھ گیا اور محاصرہ میں روز بختی کرتا محاصرہ ہی شمس الدین کو اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا۔ المقدم قلعہ

در بیٹھا تھا۔ تفصیل پر تیر انداز موجود تھے لیکن انہیں اس وقت تک تیر چلانے کی اجازت نہ تھی جب تک تفصیل پر حملہ نہ ہو۔ یہ عجیب طرح کا محاصرہ تھا نہ محاصرہ کرنے والا پتھر برساتا نہ محصور تیر چلاتے۔

توران شاہ یہ دیکھ کر جلتا تھا۔ ایک دن فرخ شاہ کو سنانے کے لئے بولا۔ میں نے یمن میں بڑے بڑے قلعوں کو دنوں میں فتح کر لیا تھا۔

”وہ کس طرح چچا توران شاہ؟“ فرخ شاہ نے زہر خند کیا۔

”اس طرح کہ ایک دم یلغار کی۔ قلعہ پر سیڑھیاں لگائیں اور اوپر چڑھ کر زیادہ مدافعت کا امکان ہوا تو سرنگ میں لکڑیاں بھر کر تفصیل کو اڑا دیا۔“

ان شاہ نے بڑے فخر سے کہا۔ ”اس کے صلہ میں آپ کو فاتح یمن کا خطاب ملا تھا۔“ فرخ شاہ نے الہ انداز میں کہا۔

”ہاں ملا تھا۔“ توران شاہ نے جواب دیا۔ ”بہادری کا مظاہرہ کرنے والوں کو اب ملتا ہے۔“

”کتنے آدمی کام آتے تھے ایک قلعہ فتح کرنے میں؟“ فرخ شاہ نے پوچھا۔ ”جنگ میں مرنے والوں کو نہیں گنا کرتے۔“ توران شاہ نے اڑکے جواب

”اب فرمائیے مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”چاہتے کیا ہیں؟ حملہ کرو اور قلعہ فتح کرلو۔“

”اور جب قلعہ فتح کر کے جاؤں تو سلطان مجھے سولی پہ چڑھا دیں۔“ فرخ شاہ غصہ سے کہا۔

”کیوں کیوں سولی پر کیوں چڑھائیں گے۔“ توران شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میرے پیارے چچا جان۔“ توران شاہ نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”چچا

فرخ شاہ دانت پیس کے بولا۔ ”سلطان نے فرمایا تھا کہ خونریزی سے پرہیز نہ المقدم اطاعت کر لے تو اسے گرفتار نہ کرنا۔ آپ مجھے سلطان کی نظروں کرنا چاہتے ہیں۔“

”ارے نہیں نہیں تم تو ناراض ہو گئے فرخ۔“ توران شاہ نے فرخ کو غصہ دکھا تو خوشامد پر اتر آئے۔ ”میں نے یونہی بات کی تھی۔ لشکر تمہاری کمان ہے تم جیسا چاہو کرو۔“

محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور توران شاہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہیں طلبک پر قبضہ کی جلدی تھی۔ اس لئے وہ فرخ شاہ پر رعب ڈالنے یا اپنی بے چینی ثابت کرنے کے لئے رات کے بیشتر حصہ میں خیمے کے سامنے ٹپکتے رہے تھے۔ ادھر محاذ جنگ بالکل خاموش تھا نہ شمس الدین مقدم محاصرہ توڑنے کی کوشش کرتا اور نہ فرخ شاہ حملے کا حکم دے رہا تھا۔ اسی طرح پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور دونوں طرف سے کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ توران شاہ کی حالت دیکھنے والی تھی۔ فرخ شاہ جیسے سنجیدہ آدمی کو بھی ان کی بیقراری دیکھ کے ہنسی آتی تھی۔

پھر ایک دن قلعہ کا دروازہ کھلا اور سوار نیزہ پر سفید کپڑا باندھے نکلا۔ سفید پرچم یا کپڑا امن کی نشانی تھی۔ فرخ شاہ امن کی ایک رکنی سفارت کے استقبال کے لئے خیمے سے باہر نکل آیا۔ توران شاہ بھی اس کے پاس آکے کھڑا ہو گیا۔ سوار آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔

توران شاہ نے تبصرہ کیا۔ ”ذرا چال تو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے نہیں مگر سوار ہے۔“

”بچا جان۔“ فرخ شاہ نے ادب سے درخواست کی۔ ”امن کا سفیر ہے۔“
 کے لئے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجئے گا کہ شرمندگی اٹھانا پڑے۔“
 ”واہ میں کیوں بات کرنے لگا۔ سپہ سالار تم ہو میں کچھ نہیں بولوں گا۔“
 توران شاہ مسلسل اور ہر بات میں بول رہے تھے مگر بڑی معصومیت سے فرما رہے تھے کہ میں کیوں بولوں گا۔

سوار قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ خود امیر شمس الدین مقدم ہے۔ فرخ شاہ نے آگے بڑھ کے اس کا استقبال کیا۔

”امیر شمس الدین مقدم میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری میرے لئے باعث فخر ہے۔“ فرخ شاہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

جس طرح فرخ شاہ کو مقدم کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا اسی طرح مقدم شاہ کو دیکھ کے چونکا۔ ”امیر زادے آپ۔ کیا آپ عالیجاہ کے ساتھ آئے ہیں۔“

فرخ شاہ کے جواب دینے سے پہلے قریب کھڑے ہوئے توران شاہ جواب دیا۔ ”سلطان معظم چھوٹے چھوٹے قلعوں کو سرنگوں کرنے نہیں آتے۔“

”سلار عزالدین فرخ شاہ ہیں۔“
 فرخ شاہ توران شاہ کو گھور کے رہ گیا۔ بھلا ان کو دخل دینے کی کیا بات تھی۔ مقدم نے فرخ شاہ سے سوال کیا تھا وہی جواب دیتا۔

فرخ شاہ ہی نہیں مقدم بھی توران شاہ کی اس بے جا مداخلت سے جل گیا۔ ان نے جواب دیا۔ ”درست فرمایا آپ نے توران شاہ۔ سلطان معظم نے قلعوں کو فتح کرنے نہیں جایا کرتے لیکن شاید آپ کو علم نہیں کہ سلطان رزادے کو اہم جنگوں پر سپہ سالار بنا کر بھیجتے ہیں۔“

توران شاہ نے طلبک کے قلعہ کو چھوٹا کہا تھا اور فرخ شاہ کی سپہ سالاری کو اہمیت نہ دی تھی اس طرح اس نے اپنے خیال میں مقدم اور فرخ شاہ دونوں کو حقیر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن امیر شمس الدین مقدم نے اسے اجواب دیا کہ اس کے دانت کھٹے ہو گئے تھے۔

فرخ شاہ نے شاید مقدم کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر مقدم سے ”امیر محترم فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”امیر زادے۔“ مقدم نے سنبھل کر کہا۔ ”میں امیر شمس الدین نہیں بلکہ ملک کے حاکم کا سفیر ہوں۔ مجھے آپ کی کسی خدمت کی حاجت نہیں۔“

”پھر کیا سفیر محترم یہ فرمائیں گے کہ وہ قلعہ سے نکل کر دشمن کے خیموں کیوں تشریف لائے ہیں۔“ فرخ شاہ نے بھی سنجیدگی اختیار کی۔

”امیر زادے میں سلطان کے پاس امن کا پیام لے کے آیا تھا لیکن وہ آئے ہیں۔“ مقدم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کے امن کا پیغام لینے کا مجھے اختیار ہے امیر محترم۔“ شمس الدین کے ال کے جواب میں فرخ شاہ نے کہا۔ ”مگر ابھی تک امن کھنی کسی طرف سے ملنا ہوئی ہر طرف امن ہی امن ہے۔ قلعہ کے اندر امن اور قلعہ کے باہر امن کے شاہی لشکر کے خیموں میں امن۔ کیا آپ نقص امن کا شکوہ کرنے آئے ہیں؟“

”میں سلطان سے کچھ مانگنے آیا تھا امیر زادے۔ اور میں جو مانگنا چاہتا ہوں، آپ کو دینے کا اختیار نہیں ہے۔“ شمس الدین مقدم نے کہا۔

”امیر محترم آپ کو مانگنا چاہتے ہیں صرف وہی میرے اختیار سے باہر نہیں ملے گا۔“ فرخ شاہ نے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔

شس الدین المقدم نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”امیرزادے غلاموں
روز تجدید عہد نہیں کرایا جاتا۔ میں سلطان کا غلام ہوں اور آخری
غلام رہوں گا۔“

و اللہ۔ آمین۔“ فرخ شاہ کی زبان سے نکلا۔
ن شاہ نے فوراً دخل دیا۔ ”امیر اس کا مطلب ہے کہ تم قلعہ طبلک
رہا ہو گئے۔“

ہر توران شاہ میں طبلک سے اسی دن دستبردار ہو گیا تھا جس دن سلطان
کو یہ قلعہ عطا کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ”امیر شس الدین نے بالکل واضح
کہا۔ ”ہا میرے قلعہ بند ہونے کا سوال تو اس کے لئے عرض ہے کہ
غلام بھی اپنے آقا سے اکڑ جاتا ہے آخر اس کا بھی تو کوئی حق ہے۔
نے والا اگر ایک حکم ماننے سے انکار کر دے تو کیا آقا اسے قتل کر دے

ن نہیں امیر المقدم۔“ فرخ شاہ نے تائید کی۔ ”شاید یہی وجہ ہے کہ
ہ کی حکم عدولی کو بھی برداشت کر جاتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہمیشہ
زلف کی ہے۔“

آخر آقا ہی ہوتا ہے۔“

کیا ارادہ ہے آپ کا؟“ فرخ شاہ نے پوچھا۔

کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔ سلطان میرا آقا اور میں اس کا غلام۔“

آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں دمشق۔“

شس نے ایک لمحہ سوچا۔ دمشق تو مجھے جانا ہی ہے۔ مجھے سلطان سے

ہی ہے۔“ امیر دمشق چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

آپ قلعہ والوں سے کہہ آئیے کہ وہ آپ کا انتظار نہ کریں اور یہ

مشق جارہے ہیں۔“ فرخ شاہ نے امیر المقدم کو اصول کی بات بتائی۔

آپ تشریف رکھنے میں ابھی قلعہ ہو کے آ رہا ہوں۔“

شس الدین المقدم نے جواب دے کے اپنے دونوں بازو کھول دئے

ن شاہ سے بغلیں ہونا چاہتا تھا۔ فرخ شاہ کو بھی نہ جانے کیا سوچھی کہ

ل کے سینے سے لگ گیا۔ پھر دیر تک اسی طرح سینے سے کھڑا رہا۔

شاہ امیر شس الدین المقدم کو دمشق لے گیا لیکن سلطان اس سے اس

ہاں میں آپ کو ایک چیز ضرور دے سکتا ہوں بشرطیکہ آپ اس کی خواہش
کریں۔“

”جھلا وہ کون سی چیز ہے امیرزادے۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیے۔“ المقدم۔
دلچسپی سے پوچھا۔

”وہ چیز عزت اور احترام“ فرخ شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”سلطان
نے فرمایا تھا کہ اگر امیر شس الدین المقدم اطاعت قبول کر لیں تو ان کا
احترام کیا جائے اور انہیں سلطان کے پاس بڑی عزت سے لے جایا جائے۔“
”میں اپنے آقا سلطان دمشق و مصر اور امیر زادے آپ کا بھی شکر
ہوں کہ سلطان مجھے اب بھی قابل احترام سمجھتے ہیں۔“ امیر المقدم نے ہر
خلوص سے کہا۔ پھر کھڑے ہوتے بولا۔ ”امیرزادے کیا میں آپ سے بغلیں
ہوں؟“

واضح رہے کہ فرخ شاہ امیر المقدم کو اپنے خیمہ میں لے آیا تھا اور یہ
مفتگو خیمہ میں فرش خاک پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر ہوئی تھی۔
امیر زادہ، المقدم کی اس فرمائش پر پریشان ہو گیا۔ ”امیر المقدم میں آپ

بات سمجھ نہیں سکا آپ مجھ سے بغلیں کیوں ہونا چاہتے ہیں؟“
”یہ بھی میں آپ کو بتا دوں گا آپ میری درخواست تو قبول فرمائیے
المقدم نے اصرار کیا۔

امیر زادہ کو اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے کھڑا ہونا پڑا۔ امیر
فرخ شاہ کے سینے سے سینہ ملا کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے سرگوشی کی۔

”امیر زادے میں جب آپ کو دیکھتا ہوں تو یقین کیجئے کہ مجھے اپنی
ارمغان یاد آ جاتی ہے۔“

امیرزادے فرخ شاہ کے جسم سے غم کی ایک تیز لہر دور کر نکل گئی
نے سرگوشی کی۔

”امیر میرے ساتھ توران شاہ ہیں۔ آپ کچھ خیال فرمائیں۔“

امیر شس الدین اس سے الگ ہو گیا۔

فرخ شاہ نے دریافت کیا۔ ”امیر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”کیسا فیصلہ امیر زادے؟“

”کیا آپ سلطان کی اطاعت قبول کرتے ہیں؟“

اس طرح یہ کہ آور صرف مال و دولت ہی میں دوسری ریاستوں پر فوقیت رکھتی تھی بلکہ اس مختصر سی ریاست میں دولت علم کے بھی بیش بہا خزانے درجہ تھے۔ تمام مودخ اس بات پر متفق ہیں کہ آور کی سرکاری لائبریری میں لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ علم کا یہ اتنا بڑا خزانہ ہے کہ سوائے بغداد کے کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیسری انفرادیت اس ریاست کو اس وجہ سے حاصل تھی کہ چاروں طرف ان ریاستوں اور مسلم تہذیب میں گہرے ہونے کے باوجود آور کی ریاست نصرانی ریاست کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ آور کا فرمانروا مسلمان، وزیر مسلمان، ہادی مسلمان، عمارتیں مسلم طرز تعمیر کا نمونہ مگر پھر بھی اس ریاست پر کسی حکومت کا شبہ ہوتا تھا۔ شاہی محل پر جاییے تو بیشتر پیردار عیسائی، کنیزیں عیسائی، لباس عیسائی، گفتگو کا انداز نصرانی بلکہ شاہی محل کے پائیں باغ ایک چوٹی (ککڑی کا بنا ہوا) چھوٹا سا مگر خوبصورت گرجا بھی بنوایا گیا تھا اور سب کچھ لوازمات صرف ایک ہستی یعنی فرمانروائے آور کی عیسائی ملکہ مرینا کی ہاکی وجہ سے کیا گیا تھا۔

مشہور ہے کہ مسلمان جہاں جاتے ہیں یا جس جگہ رچے ہیں وہاں کی ہر چیز ان کر لیتے ہیں۔ لیکن ریاست آور میں یہ کام ملکہ مرینا نے کیا تھا۔ وہ عیسائی جس دن سے شاہی محل میں داخل ہوئی تھی اس روز ہر چیز جیسے کافر ہو گئی روایت ہے کہ آور کی ملکہ مرینا ایک عیسائی راہب مسٹر فلپ اوفالڈ کی بیٹی راہب فلپ نے مرینا کو نن بنایا تھا تاکہ وہ عمر بھر دوشیزہ رہ کر کنواری مریم باورث کرتی رہی مگر مسٹر فلپ کا یہ ارادہ اس وقت تبدیل ہو گیا یا انہوں نے ارادہ کو خود بدل دیا جب ریاست آور کے عاشق مزاج اور جوان عمر فرمانروا کی بیٹی مرینا پر دل آگیا۔

اس خوبصورت مگر تباہ کن حادثہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آور کا دلی عہد جس روز باقاعدہ ریاست کا بادشاہ بنا تھا اس دن ایک اتنا ن مٹایا گیا تھا جس کی مثال ملک شام کی ریاستوں میں نہیں ملتی۔ نو جوان آور نے اپنی تاجپوشی کی رسومات ادا ہونے کے بعد حکم دیا کہ اعلیٰ حضرت سواری پر سیر کو نکلیں گے اور اس طرح اپنی پیاری رعیت کو دعوت نظارہ لے انہوں نے کہیں سن لیا تھا کہ عباسی خلیفہ رزمگاہوں میں داد شجاعت

قدر ناراض تھا کہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ دی۔ ایک دن 'دو دن' چار دن گزر گئے مگر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ امیرالمقدم مہمان خانہ میں پڑے پڑے تک آگیا تھا۔ امیرزادہ فرخ شاہ اس سے روز ملے آتا اور تسلی دے کر چلا جاتا اور امیرالمقدم کو روز یہ امید بندھتی کہ شاید آج سلطان بازیابی کی اجازت دی ہو۔

مگر فرخ شاہ آتا اور افسردگی سے مطلع کرتا۔ "امیر محترم سلطان آج بھی آپ کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکے۔" امیرالمقدم کا دل بیٹھا جاتا اور وہ پھر آئندہ روز پر امید لگا لیتا۔ ایک دن امیرالمقدم صبح سے ہی جزیب ہو رہا تھا۔ فرخ شاہ اپنے وقت مقررہ لینے آیا اور بولا۔

"امیر محترم۔ سلطان۔"

فرخ شاہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ امیرالمقدم نے اسے روک دیا اور جج کے بولا۔ "بس امیرزادے بہت ہو چکی۔ میرا فیصلہ سلطان نہیں بلکہ میں خود کروں گا۔"

"امیر محترم۔" فرخ شاہ نے دخل دیا۔ "آپ میری بات تو سنئے۔" "نہیں امیرزادے اب تک میں آپ کی سنتا تھا لیکن آج آپ میری سننا گئے میں نے اپنا فیصلہ خود ہی کر لیا ہے۔ آپ سلطان معظم سے میری جانب سے عرض کیجئے کہ شمس الدین ابن المقدم کے قتل کا حکم صادر فرمایا جائے کیونکہ انتظار کے اس کرب کو ختم کرنا چاہتا ہے آپ جاییے اور ان سے کہہ دیجئے۔" فرخ شاہ نے امیرالمقدم کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امیر محترم میں آپ کے اور سلطان کے درمیان نہیں آتا چاہتا جو کہتا ہے وہ آپ خود سلطان سے جانے کہہ دیجئے کیونکہ سلطان نے آج آپ کو دربار میں طلب کیا ہے۔"

"ہائیں" المقدم حیران رہ گیا۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا امیرزادے؟" "آپ نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا تھا۔" فرخ شاہ نے اسے جواب دیا۔

پھر فرخ امیرالمقدم کو ساتھ لے کر دربار میں پہنچا۔ المقدم نے سلطان دیکھتے ہوئے سلام پیش کیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ سلطان کی تیوریوں پر اس دن بھی بل پڑے ہیں۔

اپنے اعتماد کی چند کنیزیں اور غلام مقرر کئے تھے جن کے ذریعہ امیر کو بے کی پند و ناپند کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی تھیں۔

شیطان طبیعت والوں کے کام اکثر شیطان کرتا ہے۔ آور کا وزیر اعظم بھی ن کا چپلا تھا اس نے سوچا تھا کہ حکومت کے نظم و نسق کے اختیارات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تاجپوشی کے بعد آور کے فرمانروا کو کسی طرح محل میں قید کر دیا جائے۔ مگر قید اس طرح ہو کہ فرمانروا محل سے باہر نکلنے خود پرہیز کرنے لگے۔ پس اس کے شیطان کام میں شیطان نے اس کا بھرپور فائدہ دیا اور عین تاجپوشی کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فرمانروا کو محل کے دلفریب قید خانے میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔

دلی عہد کی تاجپوشی میں نزدیک اور دور کی بہت سی ریاستوں کو دعوت دی تھی لیکن شاطر وزیر امیر بھاء الدین بن نیاں نے کسی ملک کے والی یا بے کو مدعو نہیں کیا تھا بلکہ عام طور سے وزیروں کو بلایا گیا تھا اور وزیر بھی جو اپنی اپنی حکومتوں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ تاجپوشی کے دن قلعہ نر کو دہلی کی طرح سجایا گیا تھا۔ رعایا کی دلہنسی کے لئے تاج رنگ کے مائلے بلائے گئے تھے۔ تاجپوشی کا جشن ایک ہفتے تک منایا جاتا تھا اور خواص کو حکم دیا گیا تھا کہ جشن کے دوران سوائے کھیل تماشاؤں اور ناچ کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ نہ کسی کے گھر چولہا جلے گا۔ ہر گھر پر شاہی سے کھانا پہنچایا جائے گا۔ وزیر امیر بھاء الدین نے واقعی اس قدر اعلیٰ قسم کی عظمت کئے تھے جو قابل ستائش تھے۔ وزیر اپنے فرمانروا کو پوری طرح متاثر اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔

تاجپوشی کے دن آور کے حکمران کے سر پر تاج نہیں رکھا گیا اس لئے ایک نئے کے حکمران کو ”شاہ“ بننے کا حق حاصل نہ تھا۔ ملک شام میں صرف صلاح الدین کو سلطانی اور حکمرانی کی سند عباسی خلیفہ بغداد نے عطا کی تھی ایک شاہ ملک الصالح تھا جو دلی عہد سلطنت ہونے کی وجہ سے خود کو شاہ قرار دیتا تھا اور لوگ بھی سلطان نور الدین زنگی مرحوم کی نسبت سے اسے شاہ یا شاہ سے نہ پہچانتے تھے۔ تاج شاہی کے علاوہ فرمانروا آور کی تاجپوشی کے تمام دیگر رسومات ادا کی گئیں۔ اسے لباس فاخرہ پہنا کر جس میں ہزاروں درہمیں میرے جواہرات ٹانگے گئے تھے۔ سونے کی ایک چوکی پر بٹھایا گیا تھا

دینے کے بعد اب محل نشیں بلکہ جھروکہ نشیں ہو گئے ہیں اور اپنی محبوب کے بے حد اصرار پر کبھی کبھی یا ہفتہ مینے میں ایک بار جھروکہ میں آ بیٹھے ہیں کیونکہ انہیں اب محلاتی رنگ ریلوں میں اس قدر مشغولیت رہتی ہے کہ وہ روز دربار خاص یا دربار عام نہیں لگا سکتے۔

فرمانروا رائے آور نے اپنے ایام شہزادگی میں عباسی خلیفہ کے اس دتہ پر بڑا غور کیا تھا اور ان کی عقل رسائی سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ انہیں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے عباسی خلفاء کے بالکل برعکس یعنی جس طرح وہ اپنی رعایا کو کبھی کبھی درشن دیتے تھے، فرمانروائے آور اپنی رعایا کو روزانہ درشن دیا کرے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ شاہی سواری میں شاہی لباس زیب تن کر کے شاہانہ شان و شوکت سے آور کے تمام کوچہ و بازار کا دن میں کم از کم ایک بار مشاہدہ کرے گا۔ یہ دلی عہد شہزادے کی عہد طفلی کی طفلانہ باتیں تھیں مگر ضرور چکر لگایا کرے گا۔ جس روز انہوں نے بادشاہت کا تاج اپنے سر پر رکھا اس دن یہ باتیں حقیقت کا روپ دھار گئیں۔

فرمانروائے آور نے اپنے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے بہت پہلے سے تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کی سواری کے لئے ایک شاہی رتھ تیار کیا جائے جو سوائے پیوں کے اور پورے کا پورا خالص سونے کا ہو۔ مقصد یہ تھا کہ شاہی سواری تمام کی تمام سونے کی بنائی جائے اور سوائے سونے کے اور کوئی دھات استعمال نہ ہو۔ چنانچہ اس قسم کا رتھ ان کی تاجپوشی سے بہت پہلے تیار ہو گیا تھا اور انہوں نے اسے پسند فرمایا تھا۔ سوائے اس کے رتھ کے پہنے لکڑی کے تھے جن پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے اور لگائیں چڑے کی تھیں جس پر سونے کے تار لپیٹے گئے تھے۔

امیر بھاء الدین بن نیاں اس سلطنت کا کرتا دھرتا اور وزیر اعظم تھا۔ اس نے بچپن سے جوانی تک دلی عہد کے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے یا یوں کہنا چاہئے کہ اسے شہزادے کی کمزوریوں کا علم ہو گیا تھا۔ امیر بھاء الدین ایک انتہائی سخت مزاج بلکہ ایک جابر قسم کا امیر تھا اور خود سر اٹاتا تھا کہ اپنی من مانی کے آگے کسی دوسرے کی چلنے نہیں دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو بغیر کسی قدغن اور روک ٹوک کے ہر قسم کے اختیارات ملنا چاہئے تھے۔ یہ اختیارات حاصل کرنے کے لئے امیر نے بہت پہلے سے تدبیریں شروع کر دی تھیں۔ شہزادے کے گرد اس

جو تخت شاهی کی طرح آراستہ کی گئی تھی۔

اس کے بعد نذرانہ کی رسم ادا کی گئی امراء عمائدین ریاست اور محفل شہریوں نے نذریں پیش کیں پھر ان نذرانوں سے بڑھ کے انہیں نوازا گیا۔ کسی قیمتی پارچہ جات کا تحفہ ملا تو کسی کو موتیوں اور جواہروں کے ہار عطا کئے گئے شہر میں جگہ جگہ فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم ہونے کے لئے کپڑے، جنس اور ضروریات زندگی کی بہت سی چیزیں تقسیم کرنے کے لئے رکھی گئیں تھیں۔ مگر ان کے عوام کی خوشحالی اور دولتندی کہ جشن کے ایک ہفتے کے دوران کیا حال کوئی فقیر اس جگہ کے قریب سے گزرے۔ یہ تقسیم کا سامان جس طرح آیا سبایا گیا تھا اسی طرح اجاڑ اور واپس بھیج دیا گیا۔ یقیناً اس ریاست کے خواہ عوام پر اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش تھی جس نے انہیں اپنی ضرورتوں سے نیاز کر دیا تھا۔

ان رسموں کے بعد جنہیں تاجپوشی کا نام دیا گیا تھا۔ دل عمد نے جو آور کا حکمران بن گیا تھا حکم دیا کہ اس کی شاہی سواری کا جلوس محل شاهی ہو کے بڑی سڑک اور بڑے بڑے محلوں سے گذر کر محل واپس آئے۔ انے وزیر ہباء الدین بن نیاں سے ایک دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا برآمد ہوگا۔ اس اشارہ پر امیر ہباء الدین نے صبح ہی کو شاہی سواری کو آرا پیراستہ کرا دیا تھا اور شاہی رتھ محل کے باہر بیڑھیوں کے نیچے لاکر کھڑا تھا۔ حکمران کا حکم پاتے ہی امیر ہباء الدین نے فوراً "اعلانچی کے ذریعہ پورے میں ڈگ پڑا دی کہ ریاست آور کے والی اور حکمران کا جلوس سڑکوں اور سے گذرنے والا ہے اس لئے لوگ اپنے حکمران کا استقبال اور دیدار کر لئے سڑکوں کے کنارے قطار در قطار کھڑے ہو جائیں۔ خواتین کو حکم دیا گیا اپنے مکان کی چھتوں سے جلوس کا منظر دیکھیں۔

نقارہ پر چوٹ پڑی ڈھول تاشے بجتے گئے۔ مختصر ریاست کی مختصر بہت چاق و چوبند اور نئے اسلحہ سے آراستہ جلوس کے آگے پیچھے اور بائیں چلنے لگے۔ امراء اور معززین شہر کو حکم تھا کہ آور کے حکمران کے پایادہ چلیں۔ وزیر باتدبیر امیر ہباء الدین نے شہر کے کسی مفتی، فقیہ یا کو جلوس میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا ضرور اس جلوس کو خلاف شرع قرار دینے میں ذرا بھی رعایت نہیں کر

اس تقریب پر وزیر نے بے دریغ روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ اپنی جلوس دیکھنے کے لئے پورا شہر و قلعہ اٹھ آیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اپنے حکمران کی تعظیم اور اس کے دیدار کے لئے جمع تھے۔ چھتوں اور اڑنوں پر عورتیں پرے بجائے بیٹھی تھیں۔ جس سمت سے جلوس گزرتا، رے ہوئے بچے خوشی سے تالیاں بجاتے، بڑے اپنے حکمران کی درازی عمر کے لئے لگاتے، خواتین کا عالم ہی کچھ اور تھا وہ کونٹے پر چڑھی تھیں جلوس راہ پر بچے کے بیشتر خواتین نے ٹولیاں بنائی تھیں اور جلوس کے خبر ہو کر ان میں مشغول ہو گئی تھیں۔ ان کی باتیں کسی خاص موضوع سے متعلق نہ تھیں۔ چلنا ہانڈی اور دال ترکاری سے شروع ہو کر یہ باتیں ملکی حالات پر تک پہنچ گئی تھیں۔ بعض عورتیں اور لڑکیاں ایک کونٹے سے دوسرے در دوسرے سے تیسرے پر پھاند پھاند کے اپنی پرانی سہیلیوں کو تلاش فرمیں۔

پھر جلوس اچانک ایک جگہ رک گیا کہنے والے کہتے ہیں کہ فرمانروائے خود ہاتھ کے اشارے سے جلوس کو رکنے کا حکم دیا تھا۔ یہ ایک بڑی چوڑا تھا اور چاروں طرف لوگوں کا اٹھوہام تھا۔ فرمانروا نے اپنے وزیر الدین بن نیاں کو جو اس کے رتھ کے ساتھ پیدل چل رہا تھا اسے اور اسے سرگوشی میں کچھ کہا۔

یہ کہلاتا ہوا شاہی سواری کے پاس سے ہٹ کر سڑک کے کنارے اس جہاں مسلمانوں کے درمیان ایک نصرانی راہب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سال کی دو شیرہ تھی۔ دونوں کے لباس گرد آلود تھے۔ ان کے گلوں میں لی ملیس لٹک رہی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ مسافر معلوم ہوتے تھے۔ ہباء الدین نے قریب پہنچ کے اس لائے بوڑھے آدمی کو مخاطب کیا جو اوپر نظر آتا تھا۔

نام ہے تمہارا بزرگ محترم؟

بوڑھا اور اس کے ساتھ کی لڑکی شاہی رتھ کے پاس سے آتے ہوئے غامی اور قدرے خوف سے دیکھ رہے تھے۔ جب آنے والے نے اسے مذہب انداز میں مخاطب کیا تو اس کا خوف کچھ کم ہوا۔ ایک نصرانی راہب ہوں اور میرا نام قلب رونالد ہے۔ بوڑھے نے

بھی بڑی تمیزداری سے جواب دیا۔

”اور یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟“ وزیر سوال کیا۔

”بوڑھے نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ میرے بیٹا یہ جس نے اپنی ساری زندگی کنواری مریم پر نچھاور کر دی ہے اور ایک پا گنی ہے۔“

وزیر ہماء الدین نے فلپ کے جواب پر غور نہیں کیا بلکہ وہ بات جس کے لئے فرمانروا نے اسے بھیجا تھا۔ ”مقدس راہب ہمارے فرما دونوں کو شادی محل میں بلایا ہے۔ وہ تم دونوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں بوڑھا کائیاں تھا آخر اس نے دنیا دیکھی تھی وہ سمجھ گیا کہ اسے میں کیوں بلایا جا رہا ہے۔ بے پروائی سے بولا۔ ”تمہارے فرمانروا ایک کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ خیر میں آجاؤں گا مگر یہ بچی نہیں آسکے گی اس نے دنیا کا تمام عیش و آرام چھوڑ دیا ہے۔ شادی محل میں جا۔ کی وہ قسم ٹوٹ جائے گی جو اس نے ”نن“ بننے کے وقت کھائی تھی۔“ ”یہ میں کچھ نہیں جانتا تمہیں فرمانروا نے طلب کیا ہے اگر جانے سے انکار کرے گی تو میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا۔“ وزیر نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

راہب تو اپنی قیمت بڑھا رہا تھا پھر بھی اس نے بات کو طول دیا ایک سوال اور کیا۔ ”کیا فرمانروا نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ انکار کی ہمیں طاقت کے زور پر اٹھوایا جائے۔“

”ہاں ہاں یہ فرمانروا کا حکم ہے۔ اب بتاؤ سیدھی طرح چلتے“ وزیر کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

”فرمانروا تو خدا کا نائب ہوتا ہے اس کے حکم سے کون انکار کرے؟“

راہب نے جواب دیا۔ ”میں ضرور چلوں گا میری بیٹی مرنا بھی فرما کر کے خوش ہوگی۔“

وزیر ہماء الدین نے جلوس کے ساتھ چلتے والے ایک سوار کا کہا۔ سوار تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ہماء الدین اپنے فرما واپس گیا۔ اس سے باتیں کیں اور واپس آکر پھر فلپ اور مرنا

اسی وقت جلوس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ فلپ اور لڑکی جلوس کو دیکھتے تو کبھی اس آدمی کو جس نے انہیں حکم دیا تھا اور لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

جلوس کے گزرنے کے بعد راہب نے کہا۔ ”میرے بیٹے تم نے میرا نام لے کر بتایا لیکن تم نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ تم کون ہو اور ہمیں ل میں کیوں طلب کیا گیا ہے؟“

”مقدس باپ“ وزیر کے لہجہ میں اچانک تبدیلی آگئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ الفاظ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ میں اس کے لئے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

راہب نے ایک لمحہ وزیر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور بولا۔ ”بیٹے یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے۔ ویسے ہم راہب کسی کی بات کا لے لیتے۔“

”مقدس باپ“ وزیر خوش ہو گیا۔ ”اب میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں میرا مراد وزیر ہماء الدین ہے اور میں اس ریاست کا سب سے بڑا وزیر یعنی ہوں۔ رہا اس سوال کا جواب کہ آپ کو شادی محل میں کیوں طلب کیا ہے اس کا جواب فی الحال وہی ہے جو میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں یعنی نے ریاست اور آپ دونوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہوں۔“ راہب نے زور سے ہنکاری بھری۔ ”تمہارے فرمانروا کی شادی ہے کیا؟“

وزیر نے چونک کر راہب کو دیکھا۔ ”مقدس باپ کسی فرمانروا کے بارے میں سوالات نہیں پوچھتے جانتے کیونکہ اس سوال سے فرمانروا کی توہین ہوتی فرمانروا تو فرمانروا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو روز ایک شادی کر سکتا ہے اور اگر نہ بھی کرے تو اسے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا بیٹے۔ مگر مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔ راہب فلپ نے ذرا ناگوار لہجے میں کہا جیسے اسے وزیر کے جواب سے تکلیف دے۔“

وزیر ہماء الدین کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بات بتانے کے لئے ”مقدس باپ“ آپ کو ناگوار گزرا ہو تو مجھے ایک بار پھر معافی دیجئے۔“

ریاستوں کا چراغ گل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے تو موصل کے اہلبک الدین زنگی نے نصرائیوں کو شکست دے کر بانیاس اور الرہا جیسے علاقے نصرائیوں کے چھین لئے تھے۔ پھر اس کے بیٹے نورالدین زنگی نے تو اپنی زندگی ہی جہاد کے لئے وقف کر دی تھی۔ نورالدین زنگی خود بہادر تھا۔ اسی لئے وہ بہادروں کی برائی کرتا تھا۔ ایوبی خاندان کا وہی آقا اور مربی تھا۔ اس نے اپنے دور میں نجم الدین ایوب اور اسد الدین شیرکوه جیسے سرداروں کو اپنے دامن عاقبت میں پناہ دے کر اپنی سلطنت کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ اس کا لشکر شام سے نکل کر مصر پہنچا اور اس پر قابض ہو گیا۔

اس صدی میں مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو چکے تھے۔ انہیں اپنی ملت پارینہ کا نہ صرف احساس تھا بلکہ وہ اپنے ماضی کو پھر واپس لانا چاہتے تھے۔ سلطان نورالدین زنگی کے انتقال پر اگرچہ ایشیاء اور یورپ کی ریاستوں اور شاہوں نے خوب بغلیں بجائی تھیں لیکن ان کی یہ خوشی زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی کیونکہ سلطان نورالدین کے فوراً بعد اس کا تربیت یافتہ امیر صلاح الدین ایوبی اس شان اور تمکنت سے شام کے سیاسی افق پر سورج بن کر ابھرا کہ شام کی تمام اسلامی اور نصرائی ریاستیں اس سے کانپنے لگیں۔

چونکہ نصرائیوں کے اہلکار کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے بڑی بڑی مسلمان ریاستوں میں آباد ہونا شروع کر دیا۔ اس آباد ہونے کا یہ مقصد نہ تھا کہ اسلامی ریاستوں میں ہر چیز سستی اور امن و امان کا دور دورہ تھا بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی خوبصورت بیٹیوں اور بہنوں کو کوشش کر کے کسی طرح شاہی محل تک پہنچائیں اور جب یہ دوشیزائیں ملکہ کا مرتبہ حاصل کر لیں تو ان کے توسط سے نصرائیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔ غریب لڑکی تو اپنی جوان بیٹیوں کو لے کر اسلامی ریاستوں کے قہوہ خانوں میں میمنوں بنے رہتے تھے اس خیال سے کہ ان کی بیٹی کی شادی کسی صاحب اقتدار مسلمان سے ہو جائے اور ان کی بقیہ زندگی عیش و عشرت میں گزرتی۔

راہب قلب نے اپنی بیٹی مرینا کے ساتھ اسی لئے مسلمان ریاستوں کا رخ کیا تھا کہ مرینا کو کسی امیر زادے کے سپرد کر کے اس کے سائے میں آرام کرے۔ ظاہر راہب نظر آنے والا روائد حقیقت میں تیسرے درجہ کا ایک آوارہ مزاج انسان تھا۔ اس نے پوری جوانی جوا خانوں اور تہج خانوں میں گزاری تھی یا پھر

دراصل فرمانروا جوان ہیں۔ انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے ان کی فرمانروائی کا بھی یہ پہلا دن ہے۔ پھر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کسی قسم کا دوسرا اپنے دل میں نہ پیدا ہونے دیں۔ فرمانروا کی طرف سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ میں اس بات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے میں کسی کو آپ کی طرف ٹیڑھی نظریں نہ اٹھانے دوں گا۔

”میرے وزیر بیٹے اب تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔“ راہب نے چہرے پر ایسا کھینچا پیدا ہوا جیسے وہ مسکرا رہا ہو مگر اس کی مسکراہٹ اس کی لالچ اور بے ترتیب داڑھی میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

”آپ بت عظیم بھی ہیں مقدس باپ۔“ وزیر خوشامد کرنے لگا۔ ”اب تم سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ میں آپ کی خدمت میں ماز ہوتا رہوں گا۔“

قلب کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ ایک بند گاڑی ان کے قریب آئے رکے گاڑی میں تشریف رکھے مقدس باپ۔“ وزیر ہماء الدین نے بڑی عاجزی۔ درخواست کی۔ راہب نے مرینا کو اشارہ کیا پھر دونوں بڑی بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وزیر کے حکم سے گاڑی کے پردے گرا دیے گئے۔ گاڑی چلی تو ان کے دائیں بائیں دو مسلح سوار چل رہے تھے۔ راہب قلب نے پردے۔ جھانکا۔ وزیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کے کسی طرف جا رہا تھا۔

قلب نے آہستہ سے کہا۔ ”مرینا معلوم ہوتا ہے ہم اپنی منزل پہ آگئے۔“ مرینا چہرے سے بت بھولی معلوم ہوتی تھی لیکن تھی سمجھدار۔ اس قلب سے جو دراصل اس کا باپ تھا کہا۔ ”بابا کیا آپ کو یقین ہے کہ شاہی محل میں جگہ مل جائے گی؟“

”بیٹی مرینا جب خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کے طفیل ہم مل طرف جا رہے ہیں تو پھر ان کی دعا سے محل میں جگہ بھی مل جائے گی۔“ نے بیٹی کو امید دلائی۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہیں ریاست کے حکمران کے پیش کیا جائے گا۔ اب یہ تمہاری قابلیت ہے کہ تم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر محل کے دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کرو۔“

مرینا نے اپنے باپ کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ کسی گہری سوچ میں ڈوب بارہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے ملک شام اور بحر روم کے کنارے

تھے۔ ایک کنیز نے آگے بڑھ کے گاڑی کا ربڑی پردہ ہٹایا۔
 "خوش آمدید آپ شاہ آور کے مہمان ہیں۔ گاڑی سے نیچے تشریف لائیے۔"
 مرزا اور قلم دونوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے دونوں گاڑی سے
 غلاموں نے قلم کو گھیر لیا تو مرزا کو کنیزوں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔
 "بزرگ محترم - تشریف لے چلئے۔" ایک غلام نے بڑے ادب سے کہا۔
 "اور میری بیٹی اسے بھی ساتھ لے چلو۔" قلم گھبرا گیا تھا کہ کیس مرزا کو
 اس سے جدا نہ کر دیا جائے۔

غلام نے اسے تسلی دی۔ "محترم بزرگ آپ فکر نہ کیجئے آپ کی دختر غسل
 کے بعد لباس تبدیل کریں گی پھر آپ کے پاس تشریف لائیں گی۔"
 قلم کو کچھ اطمینان ہوا۔ "مگر مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے دریافت
 کیا۔

"آپ بھی پہلے غسل فرمائیں گے پھر لباس تبدیل کر کے مہمان خانہ میں اپنی
 بیٹی کے پاس تشریف رکھیں گے اور جب آپ کو فرمانروا کی طرف سے طلب کیا
 جائے گا تو پیش ہوں گے۔"

راہب قلم کو مہمان خانہ کے برابر والے حمام میں پہنچایا گیا۔ مہمان خانہ
 اسانو سلمان دیکھ کے اس کے حواس اڑ گئے تھے اب جو حمام میں داخل ہوا تو
 دو غلاموں اور دو کنیزوں نے اسے گھیر لیا اور راہب کے کپڑے اتارنے چاہے۔
 راہب بگڑ گیا بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو مجھے ننگا کر دو گے؟"

"مقدس باپ۔" ایک غلام نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں ہم سب آپ کی
 خدمت پر مامور ہیں۔ ہم آپ کے کپڑے اتاریں گے اور جسم پر خوشبوئیں مل
 گئے آپ کو غسل دیں گے۔ نئے لباس ان الماریوں میں رکھے ہیں۔ آپ اپنی
 روضی کا لباس پہن سکتے ہیں۔"

راہب کا سر چکرائے گا۔ وہ مہینے میں ایک بار نہاتا اور ایک ہی بار کپڑے
 تبدیل کرتا تھا۔ یہاں چار چار خدمت گار اسے نہلانے کو تیار تھے۔ اس نے زور
 سے سر کو جھٹکا دیا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ مگر یہ تو حقیقت تھی
 "شاہی سواری میں بیٹھ کے یہاں تک آیا تھا اور یہ تمام شاہانہ انتظامات میں
 حصہ نہ کوئی سحر تھا نہ ٹونا ٹونکا ہے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔"

آخر راہب نے خود کو غلاموں اور کنیزوں کے حوالہ کر دیا۔ حمام میں نہ

قید خانہ کی زندگی تھی۔ جب بڑھاپا آیا اور ہاتھ پیروں نے جواب دینا شروع کیا تو
 اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت سے شادی کر لی۔ مرزا اسی عورت کی بیٹی تھی۔
 جس کے باپ کا نام نہ قلم تھا اور نہ مرزا کو معلوم تھا۔ قلم نے اپنی بیوی سے
 والی بیوی سے اس کے پہلے شوہر کا نام کبھی نہیں پوچھا۔ اس لئے کہ اس عورت
 نے قلم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی سچیلی زندگی کے متعلق کوئی سوال نہیں
 کرے گا۔

مرزا چھ ماہ کی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے قلم
 رونالڈ اس معصوم بچی کو کھلونا بنائے ہوئے تھا۔ اس میں کام کاج کی طاقت نہ رہ
 گئی تھی۔ اس لئے پہلے تو مرزا کے نام پر لوگوں سے مختلف انداز میں رقم انٹنا
 رہا۔ پھر جب مرزا بڑی ہوئی تو اسے ملازم کرا کر اپنا اور اس کا پیٹ پالنا رہا۔
 مرزا اگرچہ نیک اور سمجھدار تھی لیکن اس نے قلم کے ساتھ اس لئے سمجھوتا
 کر رکھا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی اور نہ تھا۔ بد قسمتی یہ بھی تھی کہ مرزا
 قلم کو اپنا سگا باپ سمجھتی تھی۔

پھر جب مرزا میں جوانی کے آثار پیدا ہوئے تو قلم کو زیادہ لالچ سوار
 ہوئی۔ دراصل اس کی آوارگی کے زمانہ میں ایک دوست اسے کچھ دنوں پہلے کا
 تھا۔ اس نے قلم کو مشورہ دیا تھا کہ اگر بڑھاپا آرام سے گزارنا ہے تو بیٹی کو
 لے کر کسی اسلامی ریاست میں چلا جا اور وہاں اس کی شادی کسی امیر زادے سے
 کر دے۔ اس طرح تیری زندگی آرام سے گزرے گی۔ مسلمانوں میں چونکہ ہار
 شادیاں شرعاً جائز ہیں اس لئے ریاستی امیر زادے اکثر عیسائی لڑکیوں سے شادی
 کر لیتے تھے۔

قلم رونالڈ کا اسلامی ریاستوں کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس نے ایک راہب کا
 روپ دھارا۔ مرزا کو سن بنایا اور انطاکیہ سے چل پڑا جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔
 قلم نے مرزا کو اچھی طرح سمجھا بجا دیا تھا اور اسے یہ سبز باغ دکھایا تھا کہ اگر
 اس کی شادی کسی مسلمان امیر زادے سے ہو جائے تو اس کی زندگی بڑے آرام
 سے گزرے گی ورنہ اسے کسی لفنگے اور شرابی عیسائی نوجوان سے شادی کرنا پڑے
 گی اور تمام عمر تنگدستی اور غربت میں بسر کرے گی۔

مرزا اور رونالڈ دونوں ہی اپنے خیالوں میں گم تھے کہ گاڑی ایک جھنگے کے
 ساتھ رک گئی۔ قلم نے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا کئی کنیزیں اور غلام باہر

کہ وہاں خود تجھے اپنی تقدیر بنانا ہوگی۔ میں تیری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔
مرزا کوئی جواب تو نہ دے سکی اس نے صرف شرما کے نظریں جھکا لیں۔
پھر فلپ اور مرزا کو اطلاع دی گئی کہ کچھ دیر بعد انہیں فرمانروائے آدر کے
نے پیش کیا جائے گا۔ فرمانروا کی طرف سے وزیر سلطنت امیر ہماء الدین بن
دولوں سے کچھ سوالات کریں گے۔ انہیں مذہب طریقے سے جواب دیا
یہ دراصل وزیر ہماء الدین نے نواردر فرمانروا کے ذہن میں یہ بات ڈال دی
کہ وہ عام انسانوں سے بلند ہستی ہے اس لئے اسے عام انسانوں سے گفتگو نہ
چاہئے بلکہ صرف اپنے مرتبہ کے لوگوں سے ہی اسے بات کرنا چاہئے۔

اس موقع پر فرمانروائے نے کہا تھا کہ وہ راہب کی لڑکی سے بات کرنا چاہتا
لیکن وزیر نے اسے روک دیا تھا۔ اور مرزا اور راہب سے گفتگو کی ذمہ
اپنے سر لے لی تھی۔ فرمانروا نے وزیر کو وہ تمام سوالات بتائے تھے جو
اور اس کے باپ راہب فلپ سے کرنا چاہتا تھا۔

فلپ اور مرزا کو فرمانروا کے خاص کمرے میں پہنچایا گیا تو اس کی آرائش
کردوں رنگ رہ گئے۔ انہوں نے جنت کے محلات کے بارے میں جو تصور
کیا تھا یہ کمرہ اس سے خوبصورت اور آرائش میں ان کے خیالوں سے بھی
بلند تھا۔ انہیں آتے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کثیر نے اطلاع دی۔

”بابا! ملاحظہ۔ فرمانروائے آدر تشریف لارہے ہیں۔“
اس کمرے یا ہال میں جگہ جگہ گنگا جمنی چوکیاں رکھی تھیں جن پر خوبصورت
بال رکھی تھیں لیکن کینڑوں نے انہیں بتادیا تھا کہ وہ فرمانروا کے آنے تک
بے رہیں پھر جب انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جائے تو اس جگہ بیٹھیں جہاں بیٹھنے کا
اہ کیا جائے۔

فراروا کے آنے پر مرزا اور فلپ نے جھک کے کورٹش پیش کیا مگر نظریں
کے کھڑے رہے۔ وزیر سلطنت نے ہماء الدین فراروا کے پاس ہی آیا تھا۔
”مقدس باپ“ وزیر سلطنت نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”آپ سر بلند کر کے
نوائے آدر کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور فرمائیے اور اپنی پری جمال بیٹی کو
عم دیکھئے کہ وہ فرمانروائے آدر کے دیدار سے فیض یاب ہوں۔“

فلپ اور مرزا نے آہستہ آہستہ سر بلند کیا اور جھکتی نظروں سے فرمانروائے
کو دیکھا۔ فرمانروا ایک نو خیز نوجوان تھا ابھی اس کی مسلمیں جھک رہی

معلوم کیا کیا چیزیں جلائی جارہی تھیں خوشبوؤں کے بھجکے اڑ رہے تھے۔ راہب
نشہ سا طاری ہونے لگا پھر اسے نہیں معلوم کہ اس کا لباس کیسے الگ ہوا۔ اس
کے بدن پر کن کن روغنیات کی مائش ہوئی اور کس نے اسے غسل دیا۔ وہ ان
تمام مراحل سے اس طرح گزرا جیسے وہ خواب کے عالم میں تھا۔ کینڑوں اور
غلاموں نے راہب کے لئے خود ہی لباس کا انتخاب کیا اور اسے پہنا دیا۔

پھر راہب نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو چونک اٹھا۔ اسے اپنے اور
شبہ ہونے لگا۔ اگر اس کی داڑھی نہ ہوتی تو وہ اپنی شکل بھی نہ پہچان پاتا۔
لباس میں وہ ایک بزرگ رئیس معلوم ہوتا تھا۔ جس کی خدمت کے لئے چار چار
خدمت گار موجود تھے۔ راہب ان خدمتگاروں کے جلو میں مہمان خانہ میں پہنچا
تو اس پر حیرت کا ایک اور دورہ پڑا۔

مہمان خانہ میں دروازے کے بالکل سامنے ایک خوبصورت اور بھولی بھالی
شنزادی بیٹھی تھی۔ راہب نے کبھی کسی شنزادی کو نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ
لوگوں سے سنا تھا۔ اس کی بنیاد پر اس نے شنزادیوں اور ملکوں کے اپنے ذہن
میں پیکرز تراش رکھے تھے۔ اس وقت اسکے سامنے بیٹھی ہوئی شنزادی بالکل ار
کے خیالی پیکر کی مانند تھی۔

”بابا۔“ شنزادی نے ایک دم کھڑے ہو کر راہب کو مخاطب کیا۔
راہب کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ یہ آواز تو اس کی مرزا کی تھی لیکن
یہ تو شنزادی ہے۔ پھر جب اس نے شنزادی کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مطلقاً
ہوا کہ جس طرح نئے لباس نے خود راہب کو اپنی نظروں میں اجنبی بنادیا تھا
طرح اس کی مرزا بھی نئے لباس میں اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔ لباس
علاوہ اس کے بال بھی خوبصورتی سے سنوارے گئے تھے اور اس کے ہاتھوں اور
گلے میں ہلکا زیور بھی تھا جس کی دمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔

”ارے مرزا یہ تو ہے۔“ راہب نے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ بٹھا
دئے۔

”اور یہ آپ ہیں بابا۔“ مرزا نے بھی ہاتھ پھیلا کے راہب کی طرف بڑھا
اور اس کے سینے سے لگ گئی۔

راہب نے مرزا کو الگ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”مرزا شنزادی مرزا
تجھ پر رحمتوں کی بارش کی ہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں فرمانروا کے سامنے پیش

مل ہے تو میرا یہ جواب ہے کہ فرمانروائے آور مجھے پسند ہیں۔ اگر وہ مجھ سے مل کرنا چاہتے ہیں تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔

باپ کی گجڑی ہوئی بات کو بیٹی نے سنبھال لیا۔ حالانکہ قلب بھی یہی چاہتا تھا اس نے مرزا کی قیت بڑھانے کے لئے انکار کا سارا لیا تھا۔

مرزا کے اس جواب سے وزیر ہماء الدین بہت حیران ہوا مگر فرمانروائے آور انہیں چمک انھیں اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب تک وہ گونگا بیٹھا لیکن مرزا کے اعلان کے بعد جیسے اس کے منہ میں بھی زبان آگئی۔

فرمانروائے آور نے حکم دیا۔ ”قاضی شر کو بلایا جائے۔“

وزیر نے ایک غلام کو قاضی شر کی طرف دوڑا دیا۔ پھر اس نے راہب روٹلہ سے دریافت کیا۔ ”مقدس باپ آپ نے اپنی بیٹی کا فیصلہ سن لیا آپ کی اعتراض ہے اس فیصلہ پر۔“

”میری بیٹی بالغ اور بااختیار ہے اس کے فیصلہ پر اعتراض نہیں کر سکتا۔“

اب قلب نے یہ کہہ کر اپنی غلطی کا ازالہ کر دیا۔

وزیر ہماء الدین نے اس وقت جب قلب نے مرزا کی شادی میں اڑنگا لگایا تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ قلب کو اتنی سخت سزا دے گا کہ وہ عمر بھر یاد لے گا مگر قلب نے اپنے پہلے خیال کو خود ہی رد کر دیا۔ ہماء الدین نے بھی اپنا راہ تبدیل کر دیا کیونکہ اب مرزا فرمانروائے آور کی ملکہ اور راہب خسر بننے لے تھے۔

وزیر نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ ”مقدس باپ ہمیں آپ کے تازہ فیصلہ سے خوش ہوئی ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔“

آور کے قاضی شر جو مفتی شر بھی تھے تشریف لے آئے۔ دربار میں کسی کو نے حکم نہ تھا۔ قاضی صاحب بھی امیروں کی قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔

فرمانروا نے قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”قاضی شر کا مقام امیروں میں ملکہ ہمارے میں ہے۔“

پھر اس نے وزیر ہماء الدین کو حکم دیا۔ ”امیر ہماء الدین قاضی شر کو احترام کے ساتھ ہمارے پاس لائیے اور تخت شاہی کے دائیں جانب کی چو پر بٹھائیے۔“

وزیر ہماء الدین بن نیمان کو فرمانروا کا یہ حکم بہت شاق مگرزا۔ وہ اپنے دل کی کو نہیں سمجھتا تھا۔ قاضی شر کی اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی

تھیں۔ وہ اکہرے بدن اور درمیانے قدو قامت کا جوان تھا۔ باوجود کمسنی کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار تھا جس نے اسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ ”مقدس باپ“ وزیر سلطنت نے پہلا سوال کیا۔ ”کیا آپ اپنے اور اپنی کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے۔“

تجربہ کار اور جہاندیدہ راہب قلب روٹلہ نے اپنے آپ کو گفتگو کے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ اس نے متانت مگر قدرے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”وزیر سلطنت جانتے ہیں کہ میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو رہی ہے۔ میں تفصیل پیش نہیں کر سکتا۔ نوازش ہوگی اگر مجھ سے مختصر سوال کیا جائے اور مختصر جواب عرض کر سکوں۔“

وزیر نے فرمانروا کی طرف دیکھا پھر سوال کیا۔ ”مقدس باپ آپ کا کس ریاست سے ہے اور آپ کس پیشے سے متعلق ہیں؟“

قلب نے جواب میں کہا۔ ”میں اخلاکیہ کا رہنے والا ہوں میرا نام روٹلہ ہے میں راہب ہوں اور میری بیٹی مرزا ایک نن ہے۔“

وزیر ہماء الدین نے کہا۔ ”فرمانروائے آور کو تمہاری بیٹی پسند آگئی ہے اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

قلب نے تیز لہجہ میں کہا۔ ”میں نصرانی راہب ہوں۔ میری بیٹی ہے اور ہمیشہ کنواری رہنے کا عہد کیا ہے وہ شادی کیسے کر سکتی ہے؟“ قلب نے یہ مرزا کی اہمیت جتانے کے لئے کسی تہی ورنہ وزیر کی بات سن کے تو اس باغ باغ ہو گیا تھا۔

راہب کے انکار پر وزیر ہماء الدین کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ مرزا نے وزیر کو غصہ میں دیکھا تو ان کی جان نکل گئی۔ مگر تیر کمان سے کا تھا لیکن انکار کے بعد اپنے منہ سے اقرار کیسے کر سکتا تھا۔

اسی وقت فرمانروائے آور نے اشارہ سے وزیر کو اپنے پاس بلا کے آہستہ کچھ کہا۔ وزیر نے وہاں سے واپس آکے قلب کے بجائے مرزا سے

کیا۔ ”اے راہب کی خوبصورت بیٹی تم بالغ ہو اپنے متعلق تمہیں فیصلہ کر حق ہے۔ بتاؤ کہ اگر فرمانروائے آور تمہارے ساتھ شادی کرنے کی خواہش

تو تم کیا جواب دو گی؟“

مرزا نے فوراً جواب دیا۔ ”اگر مجھے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے

دارسرت کیا۔ وزیر ہماء الدین اور فلپ بھی بہت خوش تھے۔ فلپ کو
 کاخربین کے دنیا کا عیش و آرام ہاتھ آ رہا تھا اور وزیر ہماء الدین کو
 آدر کو کار سلطنت سے غافل رکھنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔
 ما دلسن وہاں موجود تھے۔ تمام درباری باراتی بن گئے اور اسی وقت
 پنے سے عقد ہو گیا۔ فلپ نے اس عقد پر نصرانی رنگ چڑھانے کے لئے
 ی کی خدمات حاصل کیں۔ پادری نے شاہی محل پہنچ کے نصرانی مذہب
 کے مطابق کچھ رسوم ادا کر کے اس عقد کو پکا کر دیا۔

وا کی شادی کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ مریا اور فلپ کا
 ناکہ انہیں بغیر محنت کے غیب سے جو عزت اور دولت حاصل ہوئی وہ
 ں میں مظاہرہ کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے جس مریا اور فلپ کو
 ت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ ایک ریاست کے شاہی خاندان میں داخل
 - مریا اپنا ہنی مون منانے کے لئے انطاکیہ جانا چاہتی تھی مگر یہ بات
 ردور اندیشی کے خلاف تھی۔ آدر کے فرمانروا کی تین بیویاں پہلے ہی
 کے علاوہ محل کی تقریباً تمام کنیزیں جوان اور طردار تھیں اور
 رکی ان پر نظر کرم بھی رہتی تھی۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر انہوں
 جھو ایک دن کے لئے بھی چھوڑا تو انہیں نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

ب فلپ رونالڈ جس نے رہبانیت کو سلام کر کے چھوڑ دیا تھا اور اب
 لیر شہری کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے بیٹی سے وابستگی کے لئے
 کے اس بڑے حصے کو جس میں مریا کی رہائش تھی اسے مسلم ثقافت
 نصرانی ثقافت میں ڈھال دیا تھا۔ مریا کے محل (محل سے مراد محل کا
 ں میں مریا کا قیام تھا) کے تمام مسلم ملازمین برخاست کر دیئے گئے تھے
 ا جگہ نصرانی کنیزیں اور غلاموں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ محل کی سجاوٹ میں
 انداز فکر اختیار کیا گیا تھا۔

کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ پائیں باغ کے ایک حصہ میں ایک چوٹی گر جا
 لیا گیا تھا۔ یہ عبارت خانہ فولڈنگ تھا اور ضرورت کے وقت اسے
 تقسیم کر کے اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ باورچی نصرانی 'دھوبی' نصرانی میاں
 نرائیاں بھی نصرانی بلائی گئی تھیں۔ غرضیکہ شاہی محل کا یہ حصہ آدر کے
 فلک کے شاہی محل کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ ان تمام تبدیلیوں پر وزیر

چنانچہ اس نے اپنی اس خباثت کا ثبوت اسی وقت مہیا کر دیا۔
 وزیر ہماء الدین نے قاضی شہر سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "قاضی شہر
 شہا کے قریب تشریف لے جائیں اور اس جانب رکھی چوکی پر تشریف رکھیں۔
 فرمانروا نے فوراً دخل دیا۔ "نہیں وزیر ہماء الدین اس طرح نہیں۔
 مذہب سے کتنی ہی دور سہی لیکن مذہبی لوگوں کا احترام ہم پر فرض ہے۔
 شہر کا ہاتھ پکڑ کر چوکی تک لایا جائے اور انہیں احترام سے بٹھایا جائے۔"
 وزیر ہماء الدین کو فرمانروا کا یہ حکم پہلے سے زیادہ ناگوار گزرا مگر
 مجبوراً" قیصل کرنا پڑی۔ وہ قاضی شہر کا ہاتھ پکڑ کر چوکی تک لایا اور انہیں بٹھا
 فرمانروا کی زبان کھل چکی تھی۔ اس نے خود سوال کیا۔
 "قاضی شہر ہمیں بتایا جائے کیا ایک مسلمان ایک نصرانی دوشیزہ کو اپنے
 میں لاسکتا ہے؟"

"اعلیٰ حضرت فرمانروائے آدر۔" قاضی نے بڑے صاف لہجہ میں جواب
 "نصرانی بائبل مقدس پر بالکل اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح ہم مس
 قرآن حکیم پر ایمان رکھتے ہیں۔ بائبل مقدس چار آسمانی کتابوں میں سے ایک
 اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ آپس
 شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان مرد کا ایک نصرانی عورت سے
 جائز ہوگا۔"

اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انجیل (بائبل) 'تورہ'
 زبور اور قرآن حکیم چاروں الہامی اور آسمانی کتابیں تسلیم کی گئی ہیں اور
 کتابوں کے ماننے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے
 کر سکتے ہیں۔

فرمانروائے آدر اگرچہ مسلمان تھا لیکن وہ اس نکتہ کو نہیں جانتا تھا
 خیال تھا کہ قاضی شہر اس شادی پر اعتراض کرے گا تو وہ اس سے پوچھے
 پھر یہ شادی کس طرح کی جاسکتی ہے اور اسے اس کے لئے کیا کرنا ہوگا۔
 مسئلہ اپنے آپ حل ہو گیا۔

فرمانروائے آدر نے اعلان کیا۔ "ہم اپنی اور مریا بنت فلپ کی شادی
 اعلان کرتے ہیں اور قاضی شہر سے عقد کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔"
 قاضی شہر نے چونکہ اس عقد کو جائز قرار دیا تھا اس لئے درباریوں

سلطنت بہاء الدین ابن سنیاں نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا بلکہ وہ اس سلسلہ فلف کو خود بھی مشورے دیا کرتا تھا۔

یہ باتیں چھپنے والی تو نہ تھیں۔ محل کا ایک حصہ کرشناں اور فرمستان تھا۔ باتیں محل میں پھیلتے پھیلتے باہر تک جا پہنچیں۔ پھر لوگوں میں بڑے شروع ہوئیں۔ قہوہ خانوں میں اس موضوع پر بحث مباحثہ ہونے لگا۔ لوگوں علماء کرام تک بات پہنچائی۔ علماء ایک وفد لے کر قاضی شہر جو مفتی شہر کے پاس پہنچے۔ قاضی کو پہلے ہی اس قسم کی شکایتیں مل رہی تھیں۔ اس علماء سے وعدہ کیا کہ وہ وزیر سلطنت سے اس سلسلہ میں گفتگو کرے گا۔ قاضی شہر وزیر سلطنت کے پاس گئے اور انہیں علماء کی شکایتوں سے کیا۔ وزیر سلطنت بجائے شکایات پر توجہ دینے کا وعدہ کرتا۔ اس نے قاضی معذور کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا قاضی مقرر کر دیا۔ اس پر قلعہ میں ہنگامہ ہو گیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے انہوں نے وزیر سلطنت بہاء الدین خلاف نعرے لگائے۔ جواب میں وزیر سلطنت کے حکم سے لوگوں کے ہجوم نے تھیلوں کی بارش کر دی۔ درجن بھر سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ دہشت پھیل گئی۔ وہ کونوں کھدروں میں دھب گئے۔

درجن بھر آدمی جان سے گئے سڑکیں انسانی خون سے رنگیں ہو گئیں واد نہ فریاد۔ فریاد کس سے کی جائے فرمانروا تک کوئی پہنچ ہی نہ سکا۔ ہنگامہ سے وزیر سلطنت بہاء الدین کے لوگ بہت خلاف ہو گئے۔ وزیر فطرتاً جابر اور ظالم تھا۔ اس نے فرمانروائے آدر کو محل تک محدود فرمانروائے دربار لگاتا کیا۔ سیرو تفریح کو لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شراب البیاض (برائیوں کی ماں) کما گیا ہے۔ فرمانروا پہلے شراب نہ پیتا تھا۔ کے محل میں آنے سے شراب بھی آگئی۔ ایک نوجوان فرمانروا کو کیا چاہا اور شباب۔ یہ دونوں چیزیں اسے میر تھیں۔ مرزا کا رنگ ہی سفید نہ واقعی میں ایک حسین لڑکی تھی اور شادی کے بعد تو اس کے حسن میں آگیا تھا۔

ریاست آدر کے یہ حالات تھے لوگ وزیر سے بچ تھے مگر ریا کے کسی اور جگہ جانے کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ آدر میں روپے پانچ پلن تھی۔ چیزیں سستی۔ روپے کی افراد۔ آدر والوں کو وزیر کی وجہ

مگر کسی اور قسم کی پریشانی نہ تھی۔ آدر کے علماء پریشان ضرور تھے۔ شامی محل میں بڑی کثرت سے شراب جانے لگی تھی۔ عیسائی غلام اپنی کر محل سے باہر آجاتے۔ وہ غل غپاڑہ مچاتے مار پیٹ بھی کرتے۔ کام لینے کیونکہ اگر لڑتے تو وزیر عیسائیوں کی حمایت پر آجاتا۔ اس کرتے تو وہ اٹا گلے پڑ جاتا۔

کی فرمانروا سے شادی ہونے کی بات نصرانی ریاستوں میں بھی پھیل گئی ریاستوں کے لوگ مفلس اور قلاش تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کی ہم ایک مسلمان فرمانروا کی بیوی بن گئی ہے تو انہوں نے ریاست آدر کا اس طرح آدر میں آہستہ آہستہ عیسائیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ لوگوں نے وزیر سلطنت تک پہنچائی مگر اس نے قطعی پرواہ نہ کی۔ اس کا حلوہ ہا تھا۔ اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا۔ لشکریوں اور سول افسروں کو بھی تھ میں لے رکھا تھا۔ ریاست آدر پر اندھیر عمری چوہٹ راجہ کی مثال تھی۔

ت موصل اور ریاست حلب میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی اس سے رح الدین بہت فکر مند تھا۔ موصل کا والی سیف الدین غازی کا انتقال کی وصیت کے مطابق اس کا بھائی عزالدین موصل کا حاکم ہو گیا۔ پھر الصالح کا انتقال ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق حلب کا حکمران بھی کو بنایا گیا۔ ایک اور تبدیلی یہ آئی کہ عزالدین نے حلب اپنے چچیرے الدین کے حوالے کر دیا اور اس کا علاقہ سنجاہ موصل کے تحت کر لیا۔

ن صلاح الدین، عماد الدین کو جو اب حلب کا حاکم بن گیا تھا۔ اسے نہ کرتا تھا۔ عماد الدین بڑا بوالہوس اور بے باک حکمران تھا۔ حلب پر تہ سے سلطان کے منصوبہ میں رخنہ پڑتا تھا۔ عماد الدین نے حلب پر ای ان علاقوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ سلطان اس وقت تک تھا لیکن اپنے شامی علاقہ جات کو خطرہ میں دیکھ کر اس نے دمشق واپس لے لیا۔

ن کے معاہدہ کی تاریخ 11 ستمبر 1182ء کو ختم ہو رہی تھی۔ مخالف فریق اس موصل کا حکمران عزالدین اور عیسائیوں کا رنجی نالہ نے حسب

معمول اپنا قول و قرار توڑ دیا تھا۔ ربیجی نالہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے چھین تھا۔ کرک کا حاکم صفری آف نوروں مرچکا تھا اور ربیجی نالہ نے ایوہ وارث ایشینیا سے شادی کر لی تھی اور اس کے طفیل وہ بحیرہ مردار کے کا مالک بن گیا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور معاہدہ دوران مسلمانوں کے ایک قافلہ کو جس میں تمام کے تمام پرامن سوداگر گمراہ کر لیا۔ سلطان کو اس کی خبر ملی تو اسے برا دکھ ہوا۔ اتفاق سے نصرانی زائرین کا ایک جہاز جو یروشلم جا رہا تھا وہ طوفانی ہواؤں سے دھماکا اور خشکی پر چڑھ آیا۔ سلطان نے اسے روک لینے کا حکم دیدیا۔ سلطان کا ربیجی نالہ کے اس اقدام کا رد عمل تھا جس میں اس نے مسلمان سوداگر قافلہ کو روکا تھا۔ مگر مغربی مورخین نے اس پر برا داویلا مچایا ہے اور کی حرکت کو نظر انداز کیا ہے۔

11 مئی 1182ء کو سلطان صلاح الدین قاہرہ سے دمشق روانہ ہو رخصت کرنے کے لئے تمام عمائدین سلطنت موجود تھے۔ وہ ایک ایک سلطان کی طرف بڑھتے اور اسے پرہم آنکھوں سے الوداع کہتے۔ سلطان چودہ سال میں جو عظمت، شہرت اور مقام حاصل کیا تھا اس نے مصر و عوام کے دل جیت لئے تھے۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے گئے گئیں اور پرچوش تقریریں ہوئیں۔ سلطان کو رخصت کرنے کے لئے میدان میں جمع ہو گیا تھا۔ سلطان کے رخصت ہونے کا منظر بڑا پر اثر تھا اور بچے تک اپنے محبوب سلطان کو اشک بار نظروں سے جاتے ہوئے تھے۔

حکومت کے جاسوس ایک دوسرے کے علاقوں میں چکر لگاتے۔ سلطان کی مصر سے روانگی کی اطلاع جاسوسوں کے ذریعہ عیسائی حکومت تھی۔ سلطان بھی یہ جانتا تھا کہ نصرانی اس کا راستہ ضرور روکیں گے۔ دمشق جانے والی شاہراہ نصرانی سرحدوں کے قریب سے گزرتی تھی۔ سلطان نے شاہراہ چھوڑ کر ریگستان شامی کا راستہ اختیار کیا اور خلیج لکھ پر پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ کوہ سیر سے آگے چٹانی میدان سے ہوتا ہوا پہنچا اور راستہ میں دشمن کو تلاش کرتا رہا۔ وہ الشوبک کے قریب سے کے نواحی علاقہ کو روندتا ہوا آگے بڑھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ کرک

ہندوؤں میں نصرانی فوج بیٹھی تھی لیکن اس نے باہر نکل کے سلطان کو کی کوشش نہ کی۔ پس وسط جون میں سلطان موآب ہوتا ہوا دمشق پہنچ

ی دوران دمشق کے قائم مقام حاکم فرخ شاہ نے دریائے اردن کو پار ملی اور دیوریا کو تاراج کیا اور پہاڑی قلعہ جبیس (تھبت) پر قبضہ کر لیا۔ بغداد میں فرخ شاہ کے ہاتھ بیس ہزار مومئی اور ایک ہزار قیدی آئے۔ اس کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔

بابہ کی معیار ختم ہو رہی تھی اور سلطان کو موصل اور حلب کے داعیوں بات کا حساب لینا تھا کہ انہوں نے فرنگیوں اور شیخ الجبل سے اس کے ہاں معاہدہ کیا۔ اتفاق سے انہی دنوں امیر مظہر الدین کو کبریٰ جو موصل مایہ حراں پر حکومت کر رہا تھا وہ عزالدین والی موصل کے خلاف ہو گیا۔ سلطان نے مل کے انہیں جزیرہ پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ سلطان وہ میں شام اور جزیرہ کی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں بڑا رخنہ ڈالتی تھیں۔ فرنگیوں کے مقابلہ جانے سے پہلے وہ ان ریاستوں کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے چند روز دمشق میں قیام کیا پھر وہ طبریہ کی طرف را طبریہ میں فرنگیوں کی فوجیں جمع ہو گئی تھیں۔ سلطان کی آمد کی خبر سن ان فوجیں وہاں سے ہٹ کے کوبک کی پہاڑی کے دامن میں اپنا کیپ ما پہاڑی پر قلعہ کوبک کی فصیل بنی ہوئی تھیں۔ سلطان اس وقت طبریہ تھا۔ اس نے اپنے دونوں بھتیجوں تقی الدین اور فرخ شاہ کو لشکر اور دستوں کے ساتھ فرنگیوں کے مقابلہ پر بھیجا۔ دونوں لشکروں میں ایک جگہ ہوئی۔ جس میں مسلمان کامیاب ہوئے۔ فرنگی ہپا ہو کر فریاد مچا سلطان دمشق واپس آیا۔

سلطان پھر لشکر لے کر نکلا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ حلب کو فتح کرنے - موصل اور حلب کے لشکر سلطان کے مقابلہ کے لئے یکجا ہو گئے تھے وہ کے کہ سلطان کا رخ حلب کی طرف ہے فوراً اپنے علاقوں کو واپس اس طرح سلطان نے بڑے اطمینان سے ہرا کے مقام پر دریا فرات عبور کے اس طرف سلطان کے ہی خواہ موجود تھے جنہیں سلطان نے اپنی غیہ طور پر مطلع کر دیا تھا۔

ان استقبال کرنے والوں میں مظفرالدین کو کبریٰ بھی تھا جس نے سلا الجزیرہ پر حملہ کا مشورہ دیا تھا۔ مظفرالدین، حاکم موصل سے اس قدر خوف کہ اس نے سلطان سے موصل پر حملہ کرنے کی بھی درخواست کی۔ امجنوں کے حکمران نے بھی سلطان سے ملاقات کی۔ سلطان نے اعلان کرا الجزیرہ کا جو حکمران اس کی اطاعت قبول کرے گا اور اسے اس کے علاقہ رکھا جائے گا اور جو اطاعت سے سرتابی کرے گا اس پر بزور شمشیر جائے گا اور اس علاقہ کو تباہ کر دیا جائے گا۔ سلطان کے اس اعلان کا یہ کہ الجزیرہ کا بڑا حصہ اس کے زیرِ نگیں آگیا۔

سلطان ادھر فتوحات میں مصروف تھا کہ دمشق سے اطلاع آئی کہ نے دمشق کے مضافات پر حملہ کر دیا ہے اور وہ تاخت و تاراج میں مصروف سلطان چونکہ موصل پر حملہ کا منصوبہ بنا چکا تھا اس لئے دمشق واپس لیکن فرنگیوں کی روک تھام کے لئے اس نے عارضی انتظامات کروئے کے ساتھ موصل کی طرف پیش قدمی کی۔

تاریخیں جانتے ہیں کہ موصل کا قلعہ کس قدر مضبوط تھا۔ اسی کبھی عمادالدین زنگی کی حکمرانی تھی اور سلطان صلاح الدین کا باپ اسی عمادالدین زنگی کے سامنے پیش ہوا تھا اور اس سے مدد حاصل کی تھی۔ الدین زنگی کے بعد سیف الدین غازی اس کا حاکم رہا تھا اور اب سینہ غازی کا بھائی عزالدین مسعود یہاں کا والی اور مسلمانوں کا سب سے تھا۔ اس قلعہ کو سلطان نورالدین زنگی نے جنگی نقطہ نظر کے مطابق اضافے کئے تھے اور اب عزالدین کے نائب مجاہدین قاناز نے مدافعت اعلیٰ انتظامات کئے تھے۔

سلطان صلاح الدین نے قلعہ پر حملہ تو کر دیا کیونکہ اس کا یہ خواب تھا مگر اس کے مقتدرہ الیش کے سپاہیوں کے لئے قلعہ کی دیوار ثابت ہوئیں۔ اس قلعہ کی دوہری فصیلیں تھیں۔ اس کا کوئی حصہ کمزور آتا تھا۔ دونوں فصیلوں پر چاق و چوبند مدافعتی دستے تعینات تھے۔ قلعہ سامان خورد و نوش تقریباً ایک سال کے لئے موجود تھا یہی حال اسلحہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

روایت ہے کہ والی موصل عزالدین مسعود اور بعض دوسرے والیا

صلاح الدین کو صلح پر آمادہ کرنا چاہا مگر سلطان نے صلح کی پہلی شرط کی رکھی کہ اگر حلب اس کے حوالہ کر دیا جائے تو وہ موصل سے گا۔ عزالدین یہ شرط ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس لئے کہ اب اس کا نہ تھا۔ اس نے حلب کو سنجر سے بدل دیا تھا اور حلب پر اس قابض تھا جس پر عزالدین کا کوئی اثر نہ تھا۔ ادھر سلطان کا ایک ”حلب یا موصل“

1182ء کو موصل کا محاصرہ شروع ہوا۔ سلطان نے خودیاب کندہ کا اور اپنے بھائی تاج الملوک بوری کا باب عمادیہ پر مقرر کیا۔ فصیلوں باری کی گئی لیکن یہ دیواریں ٹھوس تھیں۔ سنگ باری کا ان پر ہوا۔ ایک ماہ تک فصیلوں میں شکاف ڈالنے کی کوششیں کی گئی مگر لی اور سلطان کو موصل کا محاصرہ اٹھانا پڑا۔

نے موصل سے ہٹ کر سنجر پر حملہ کیا۔ یہ وہی سنجر تھا جس کا تھا۔ اس نے سنجر کا علاقہ حلب سے بدل لیا تھا اور اس وقت ز دہاں موجود تھا۔ اس علاقہ سے موصل کو رسد مہیا ہوتی تھی۔ ی لئے اس پر حملہ کیا تھا کہ موصل کے ہاتھ سے رسد کا علاقہ نکل اس کے حوصلے پست ہو جائیں گے لیکن سنجر نے زبردست مدافعت کی دنوں تک سلطانی فوجیں قلعہ پر قابض نہ ہو سکیں۔ سلطان نے فوراً تبدیل کی اور اک دم ایسی یلغار کی کہ قلعہ کا تمام مدافعتی نظام وگیا اور سلطانی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان نے قلعہ کے گورنر الشروں کو غضبناک لشکریوں کے ہاتھوں سے بچا کر انہیں احترام کے ت موصل پہنچا دیا۔

نے سنجر میں مختصر سی فوج چھوڑی اور اس متحدہ دشمن کی طرف چلا انتظار کر رہا تھا۔ اس اتحاد میں موصل کا والی، آرمینیا کا بادشاہ شہزادے، سپاہی اور حلب کی فوج تھی۔ یہ متحد لشکر ہرزم کے مقام تھا۔ پہلے تو متحد لشکر کے حوصلے بہت بلند تھے لیکن جب سلطانی لشکر اتحادیوں نے صلح کے لئے فوراً قاصد بھیجا۔

سلطان کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے کہا۔

”اگلیں نے سلطان سے صلح کی بات چیت کا پیغام دیا۔“

نے علماء اور عوام کو ناراض کر دیا تھا۔ اس لئے علماء نے عیسائیوں کی کثرت
 دہتی ہوئی آبادی پر اعتراض کیا تھا اور شراب پر پابندی کا مطالبہ کیا تھا۔
 کے یہ مطالبے تو پورے نہ ہوئے مگر علماء اور مفتی گرفتار کر کے قید میں ڈال
 گئے۔ عوام اس وجہ سے وزیر امیر بھاء الدین سے بہت ناراض تھے۔
 اور کے وزیر بھاء الدین کو نہ عوام کی پرواہ تھی خواص کی۔ فوج اس کے
 میں تھی اور وہ ہر معاملہ میں اپنی من مانی کرتا تھا۔ سلطان نے اور کا محاصرہ
 فوج اور عوام کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ قلعہ کی مضبوطی
 پیش نظر سلطان نے بجائے قلعہ پر حملہ کرنے کے ایک اور ترکیب استعمال
 اس نے قلعہ کے اندر سیکڑوں تیر پھنکوائے۔ ہر تیر کے ساتھ ایک پرچہ لگا
 فاجس میں سلطان صلاح الدین کا ایک فرمان لکھا ہوا تھا جس کا مضمون کچھ
 اس طرح تھا:-

”اہلیان آدر کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سلطان صلاح الدین
 قلعہ پر حملہ کر کے بے گناہ شہریوں کو تباہ اور شہر کے حسن
 کو برباد نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے سلطان اعلان کرتے ہیں
 کہ جو لوگ بغیر مقابلہ کے سلطان کی اطاعت قبول کر لیں
 گے۔ ان کے ساتھ فتح کے بعد احسان کیا جائے گا اور جو
 مقابلہ کریں گے ان سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔“

اہل شہر وزیر امیر بھاء الدین کے ظلم و ستم سے عاجز تھے وہ اس کی غلامی
 آزاد ہونا چاہتے تھے۔ ادھر قلعہ کی حفاظت کرنے والے لشکریوں کو یہ معلوم
 کہ قلعہ فتح ہو جائے گا کیونکہ سلطان کے سامنے قلعہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا
 ۔ اہل عوام اور فوجیوں دونوں میں بددلی پھیل گئی اور انہیں اپنی جانوں کی فکر
 نہ ایک طرف عوام نے تعاون سے ہاتھ کھینچا تو دوسری طرف فوجیوں نے
 قلعہ سے لشکر سے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اب تو وزیر بھاء الدین کی عقل
 لے آئی۔ اس نے فوراً سلطان کے وزیر قاضی فاضل کو امن کی گفتگو کرنے
 بلاتے قلعہ میں بلایا۔

سلطان نے وزیر قاضی فاضل کو قلعہ میں جانے کی اجازت دیدی۔ قاضی
 اہل دیہات پہنچا تو وزیر بھاء الدین نے بڑے عجز سے قاضی فاضل کو سلام کیا۔
 اہل دیہات کے عرض کیا۔

سلطان نے جواب دیا۔
 ”اس پیغام کا جواب ہرزم کے میدان میں دیا جائے گا۔“
 متحدہ لشکر کا پیغام ایک جملہ میں تھا۔ سلطان نے جواب بھی ایک
 میں دیا۔ جب یہ پیغام متحدہ کمان پہنچایا گیا تو وہ حواس باختہ ہو گئے اور
 چھوڑ بھاگے۔
 سلطان ہرزم کے میدان میں پہنچا تو میدان صاف تھا۔ بڑے چھوڑ
 حریف خوف اور دہشت کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو بھاگ کر
 تھے۔

ایک مورخ نے میدان ہرزم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔
 ”وہ مردوں کی طرح آئے لیکن عورتوں کی طرح روپوش ہو گئے۔“
 حقیقت یہ ہے کہ ہوا کا رخ بدل گیا تھا اور کامیابی سلطان کے
 رہی تھی۔ والی موصل اپنے قلعہ کے باہر آیا تھا لیکن سلطان کا مقابلہ
 اور بھاگ کر پھر موصل میں قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان نے موصل کو اس
 پر چھوڑا اور الجبیزہ کے علاقوں کا انتظام کر کے شمال کی طرف روانہ
 سلطان کے سامنے قلعہ آدر یا عمید تھا۔ آدر کا ایک امیر محمد بن قراء
 جابر اور ظالم وزیر امیر بھاء الدین کے خلاف ہو گیا تھا۔ اس امیر نے
 توجہ قلعہ آدر کی طرف دلائی تھی۔ اس وقت امیر محمد بن قراء اور
 سلطان کے ساتھ تھے۔

آدر کا قلعہ بھی موصل کی طرح بہت مستحکم تھا۔ اس پر آسانی سے
 مشکل نظر آرہا تھا مگر قلعہ پر مسٹر اور ڈارلنگ کی حکومت تھی۔ فرمانروا
 نے راہب فلپ روتالڈ کی بیٹی مرزا سے شادی کی تھی اور شاہی محل
 رہ گیا تھا۔ روایت ہے کہ شادی کے بعد فرمانروائے آدر نے شاہی محل
 دن بھی باہر قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ فرمانروا کو اس کی بیوی مرزا
 کہتی تھی اور فرمانروا مسٹر اپنی بیوی کو ڈارلنگ کے نام سے پکارتا تھا۔
 قلعہ کے اندر باہر مسٹر اور ڈارلنگ کی حکومت مشہور ہو گئی تھی۔
 سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر مسٹر اور ڈارلنگ کو اس کی خبر
 نہ کسی نے خبر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ فرمانروائے آدر نے
 شروع کر دی تھی۔ اقتدار اس کے وزیر بھاء الدین ابن نیساں کے ہاتھ

رے دانت نکال کے کہا۔ ”قاضی محترم یہ سب آپ جیسے کرم فرماؤں کی انتہی ہے۔“

فی صاحب ابھی امیر بہاء الدین کے اس عالیشان محل کی آرائش و دیکھ رہے تھے کہ محل کے سامنے کے میدان میں لوگ جمع ہونا شروع قاضی فاضل کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ امیر بہاء الدین دوڑ کے باہر گیا بی واپس آگیا۔

قاضی محترم کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ یہ سب جیل کے قیدی ہیں جو شہرہ دارا کرنے آئے ہیں۔“ امیر بہاء الدین نے بڑی مسرت سے کہا۔

قاضی فاضل چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ”صرف مذہبی لوگوں کو اندر بلایا لوگوں کو میرے شہرہ دار کے ساتھ واپس کر دیا جائے۔“

قاضی فاضل کے کہنے کے مطابق سوائے مفتی، قاضی اور مذہبی لوگوں کے شہرہ دار کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔ مفتی وغیرہ اندر آئے تو قاضی فاضل نے انہیں کہا اور ان سے بغلیں ہوئے۔

قاضی فاضل نے امیر بہاء الدین سے کہا۔ ”ہاں امیر بہاء الدین اب فرمائیے کہنا چاہتے ہیں؟“

امیر بہاء الدین نے مفتی وغیرہ پر نظر ڈالی پھر بولا۔ ”قاضی محترم یہ کوئی نالہ نہیں ہے کہ مفتی اور علماء کے سامنے گفتگو کی جائے۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے اس میں کسی دوسرے کو کس طرح شریک نہیں کیا جاسکتا

قاضی فاضل کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”امیر بہاء الدین اسلام کے دائرے لائق باہر نہیں۔ سیاست، ثقافت، تجارت ہر چیز مذہب کے تابع ہے۔ میں انہیں کی موجودگی میں اس لئے گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہماری گفتگو کے لئے نہیں جو کہنا ہے صاف اور برملا کہو۔“

امیر بہاء الدین نے پھر مردہ آواز میں کہا۔ ”میں قلعہ آور ایک شرط پر لے کر تیار ہوں۔“

اسی شرط ہے تھلڈی قاضی فاضل نے دریافت کیا۔

میں صرف دو دن کی مہلت دی جائے تاکہ میں اپنے ساتھ لے جانے والا

”قاضی محترم آپ سلطان معظم کے وزیر ہیں اور میں فرمانروائے اور ہوں۔ اس رشتہ سے ہم آپ ایک ہی قبیلہ کے ہیں۔ آپ کو میری چاہئے۔“

قاضی فاضل اس کی تعریف سن چکے تھے کہ وہ بہت ظالم اور جاہل۔ نے مفتی اور علماء کو قید میں بند رکھا ہے۔ قاضی فاضل نے اسے جواب ”امیر بہاء الدین میں آپ کی مدد صرف اس حالات میں کر سکتا ہوں مفتی اور قاضی شہر کو آزاد کر دیں۔ اس کے علاوہ علماء اور دیگر جتنے قیدی آپ نے قید میں ڈال رکھا ہے ان سب کو فوراً چھوڑ دیں۔“

”یہ سب کچھ ہو جائے گا قاضی محترم۔ آپ مجھ سے وعدہ تو فرمائیے میری مدد فرمائیں گے۔“ امیر بہاء الدین قاضی سے پہلے یہ قول دے چاہتا تھا۔

قاضی فاضل کو غصہ آگیا۔ ”امیر بہاء الدین تم کیا مجھے بیوقوف میں صلح کی گفتگو کرنے آیا ہوں تمہاری خواہش پوری کرنے نہیں آیا۔“ امیر بہاء الدین سسم گیا۔ ”آپ ناراض نہ ہوں قاضی محترم میں تو کو اسی وقت رہا کئے دیتا ہوں۔“

امیر بہاء الدین نے اپنے نائب سے کہا۔ ”قید خانے کے دروازے دئے جائیں اور اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتادیا جائے کہ انہیں سلطان الدین کے وزیر قاضی فاضل کے حکم پر رہا کیا جا رہا ہے۔“

واضح رہے کہ یہ گفتگو قلعہ کے صدر دروازے کے اندر ہوئی امیر بہاء الدین نے قاضی فاضل کو صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی گھیر لیا قاضی فاضل نے کہا۔ ”کیا اس شہر کا یہی دستور ہے کہ شرفاء کھڑے کھڑے گفتگو کرتے ہیں؟“

امیر بہاء الدین قاضی کے اس گہرے طنز پر پانی پانی ہو گیا۔ ”آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلے۔“ امیر بہاء الدین انکسار سے کہا۔

پھر وہ قاضی کو اپنے غریب خانہ پر لے گیا۔ امیر کا غریب خانہ دیکھ کی عقل دنگ رہ گئی۔ انہوں نے امیر بہاء الدین پر دوسرا طنز کیا۔ آپ کے غریب خانہ کا یہ حال ہے تو پھر قصر شاہی شاید جنت کے

الدین محل کے زنانہ میں چلا گیا۔
انی دیر تک امیر بہاء الدین اندر سے نہ آیا تو قاضی فاضل کو فکر
نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی غلام یا کنیز نظر آجائے مگر اتنے بڑے
نے ایک ملازم بھی نظر نہ آیا۔ اسی وقت امیر بہاء الدین اندر سے

اں چلے گئے تھے امیر بہاء الدین؟ کیا تمہارے غریب خانہ میں ایک
میں؟“ قاضی فاضل نے اس سے پوچھا۔

نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”قاضی محترم اگر ملازم ہوتا تو اندر سے
کیوں آتا؟ دیکھئے کیا خراب زمانہ آگیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ غلام
جان دیتے تھے مگر آج کل ان کی نمک حرامی کا یہ حال ہے کہ ابھی
یار بھی نہیں ڈالے مگر تمام غلام اور کنیزیں مجھے چھوڑ کے بھاگ گئے
انخواستہ میں چھوٹ کی بیماری ہوں۔ مجھے آنے میں دیر اس وجہ سے
گھر کی پچھلی طرف کی ایک دیوار توڑ رہا تھا۔ میں آپ کو اسی ٹوٹی
لے راستے سے قلعہ کے باہر بھیجوں گا کیونکہ میری خواتین آپ کے
اور میرے مخالف خواجواہ آپ مزاحم ہوں گے۔“

اء الدین کی بڑی عبرتناک حالت تھی۔ وہ ایک عظیم الشان قصر میں
س کے ظلم اور جبر کی وجہ سے کیا عوام کیا خواص سب ہی اس کے
تھے۔ آج صبح ہی سے قلعہ میں یہ افواہ گرم تھی کہ بہاء الدین
نا کا قبضہ کراوے گا کیونکہ فیصل کے محافظوں نے سلطان کے خلاف
سے انکار کر دیا ہے۔ اس افواہ کا یہ اثر تھا کہ اس کے تمام ملازم
سے بھاگ گئے تھے۔

اء الدین، قاضی فاضل کو اندر لے گیا۔ اس کی بیوی اور ایک بیٹی
ڈالے چلنے کو تیار تھیں۔ پھر یہ سب ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس پہنچے۔
ایک ویران سڑک پر تھا جس پر لوگوں کی بہت کم آمدورفت تھی۔
ان خواتین اور قاضی فاضل کو اس راستے سے لے کر فیصل کے
پہنچا۔ وہاں کے محافظ اب تک بہاء الدین کے وفادار تھے۔
راہ دروازہ کھول دیا۔ پہلے خواتین پھر قاضی فاضل قلعہ سے باہر نکلے
نہ ہو گیا۔

سامان قلعہ سے نکال سکوں۔“ ایک اور بیان کے مطابق امیر بہاء الدین نے
دن کی مہلت مانگی تھی۔“

قاضی فاضل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”امیر بہاء الدین تمہاری ٹم
میں واپس جا کے سلطان معظم کے سامنے پیش کروں گا کیونکہ میں شرط قبول کر
کا مجاز نہیں۔“

”آپ سلطان معظم سے میری سفارش تو کریں گے؟“ امیر بہاء الدین۔
عاجزی سے درخواست کی۔

”میں پوری کوشش کروں گا امیر۔“
”آپ کو امید ہے کہ سلطان میری شرط منظور کر لیں گے۔“ امیر کو یقین
آ رہا تھا۔

”امیر کوشش کرنا میرا کام ہے اور منظور کرنا سلطان کے اختیار میں ہے
میں اس سلسلہ میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ قاضی فاضل نے ماہ
الفاظ میں جواب دیا۔

”اچھا خیر آپ کی مرضی۔“ امیر بہاء الدین نے بڑی افسردگی سے کہا۔
قاضی فاضل اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی کھڑے
ہو گئے۔

”آپ تشریف رکھئے قاضی محترم۔“ امیر بہاء الدین نے درخواست کی۔
لوگوں کو جانے دیتے مجھے آپ سے ذاتی گفتگو کرنا ہے۔“
مفتی وغیرہ قاضی صاحب کا شکریہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔
قاضی نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”امیر آپ کو مجھ سے ذاتی گفتگو کیا کرنا ہے
میں سلطان کے حکم سے صلح کی گفتگو کرنے آیا ہوں۔ ذاتی گفتگو کا مجھے کوئی
نہیں۔“

امیر بہاء الدین نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔ ”قاضی محترم دراصل ہم
اشخاص میرے اور میرے گھر والوں کے دشمن ہو رہے ہیں۔ میں اپنے اہل خانہ
آپ کے ساتھ سلطانی لشکر گاہ میں بھیجنا چاہتا ہوں۔“
قاضی فاضل کو بڑی حیرانی ہوئی مگر بات اس طرح کی تھی کہ وہ انکار
کر سکے۔

امیر بہاء الدین نے کہا۔ ”میں ابھی انتظام کر کے حاضر ہوتا ہوں۔“ یہ

”مگر کیوں کیا ریاست آدر میں سامان اٹھانے والے مزدور نہیں ہوتے؟“
فاضل نے حیران نظروں سے خاتون کو دیکھا۔

”قاضی محترم آدر میں مزدور ہوتے ہیں۔“ خاتون نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
جب وقت بگڑتا ہے تو اپنا سائیہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ آدر کی فوجوں
نابلہ سے انکار کر دیا ہے۔ میری کینز اور غلام گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔
و علم ہے کہ ہم مکان کی پچھلی دیوار توڑ کر قلعہ سے نکلے ہیں اگر ہم
دروازے سے آنے کی کوشش کرتے تو عوام و خواص ہمیں پریشان کرتے مگر
پ سے شکوہ نہیں بلکہ میرے شوہر کے اعمال کی یہ سزا ہے۔ انہوں نے
کے کسی آدمی سے بنا کے نہیں رکھی۔ اقتدار کے نشہ نے انہیں اپنوں
باندھ کر دیا۔“

سلطان اور تمام درباری خاتون کے اس اظہار سے بہت متاثر ہوئے۔ سلطان
علم دیا کہ خاتون کو جس قدر آدمیوں کی ضرورت ہو وہ انہیں عطا کئے
۔ اس کے علاوہ بھی اگر کوئی ضرورت ہو تو وہ بھی پوری کی جائے۔

کتاب الرشتین کا بیان ہے کہ سلطانی لشکر کے تین سپاہی تین دن اور
قلعہ سے وزیر ہماء الدین کا سامان لٹکا رہا پھر چوتھے دن سلطان لشکر نے
اقتدار لیا تو وزیر سلطنت اپنا سینہ پیٹ رہا تھا کہ ہائے میرے سامان کا
حصہ بھی قلعہ سے نہیں آسکا۔ یہ سامان پانچ بڑے ٹیموں میں جمع کیا گیا

ریاست کے کتب خانہ میں دس لاکھ چالیس ہزار کتب موجود تھیں۔ سلطان
الدین نے علم و ادب کا یہ بیش بہا خزانہ اپنے وزیر قاضی فاضل کو بخش
اضی فاضل اتنی کتابیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

قاضی فاضل نے سلطان کے حضور عرض کیا۔ ”سلطان معظم بغداد کے علاوہ
ب کا اتنا بڑا خزانہ دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہیں۔ میں اس لئے حضور
ما قدر بھی شکر یہ ادا کروں وہ کم ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ ان کتابوں
نے سلیقے سے رکھنے کے لئے دمشق میں مجھے کم از کم چار بڑی بڑی حویلیاں
مل گئیں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ میں ان میں کچھ منتخب خود اپنے
مکمل باقی کتب کو دمشق کے سلطانی کتب خانہ میں منتقل کر دیا جائے۔“
سلطان نے قاضی فاضل کو انتخاب کی اجازت دیدی۔ لیکن پول کے مطابق

لشکر میں پہنچ کے قاضی فاضل نے خواتین کو سلطان کے سامنے پیش کیا
”سلطان معظم“ قاضی نے تفصیل بیان کی۔ ”وزیر سلطنت امیر ہماء
قلعہ آدر حوالہ کرنے پر تیار ہے۔ اس کی اس کے صلہ میں درخواست۔
اسے صرف تین دن کی مہلت عطا کی جائے تاکہ وہ قلعہ سے اپنا سامان
لے سکے۔ چوتھے دن قلعہ سلطانی لشکر کے حوالہ کر دیا جائے گا۔“
سلطان صلاح الدین بڑی توجہ سے قاضی کی باتیں سن رہے تھے انہوں
فرمایا۔

”یہ خواتین کون ہیں اور لشکر گاہ میں کس لئے آئی ہیں؟“
خواتین نے اس وقت فوراً ”جبکہ بچے سلطان کی خدمت میں تسلیم
کی۔“

قاضی فاضل نے سلطان کو جواب دیا۔ ”سلطان عالی مقام یہ خواتین آ
وزیر امیر ہماء الدین کی بیوی اور بیٹی ہیں۔ وزیر کے کہنے کے مطابق یہ
قلعہ میں محفوظ نہیں ہیں اس لئے وزیر موصوف نے انہیں سلطان کی ہ
بھیجا ہے۔“

سلطان نے ذرا توقف کے بعد فرمایا۔
”امیر ہماء الدین کو سامان نکالنے کے لئے تین دن کی مہلت دی جائے
یہ خواتین ہماری پناہ میں رہیں گی۔“

سلطان کا حکم ختم ہوا تھا کہ امیر ہماء الدین کی بیوی بولی۔
”سلطان معظم نے میرے شوہر کو سامان اٹھانے کے لئے تین دن کی
دی ہے۔ میں اور میرا پورا خاندان سلطان کو دعاؤں میں رہے گا لیکن میر
سلطان کی اس کرم نوازی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جب تک سامان اٹھا
لئے مزدوروں کا انتظام نہ کیا جائے۔“

خاتون کی بات شاید سلطان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے سوالیہ
سے قاضی فاضل کی طرف دیکھا۔ قاضی نے خاتون سے سوال کیا۔
”خاتون شاید تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارا سامان اٹھانے کے لئے ہم
مزدور بھی مہیا کریں۔“

”جی ہاں قاضی محترم۔ میری سلطان سے یہی درخواست ہے۔“ خاتون
تائید کی۔

قاضی فاضل نے جو کتابیں منتخب کیں انہیں وہ ستر ہزار اونٹوں پر بار کر کے اپنے ساتھ دمشق لے گیا۔ باقی کتابوں کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آور کے ایک باغی امیر محمد بن قراء نے سلطان سے مل کے انہیں آور کے وزیر بقاء الدین کے ظلم و ستم سے آگاہ کر کے ان سے آور پر حملہ کی درخواست کی تھی۔ اس لئے سلطان نے امیر محمد بن قراء کے لڑکے کو آور کا حاکم مقرر کر دیا۔ قلعہ کا چارج لینے گیا تو وہاں سونے اور جواہرات کے ڈھیر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اس قدر گھبرایا کہ فوراً سلطان کے پاس پہنچا۔

سلطان معظم آپ نے مجھے آور کا حاکم مقرر فرمایا ہے لیکن وہاں مال و دولت کے علاوہ نادر و ثایب چیزوں کا اس قدر انبار ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔ آپ ازراہ کرم ریاست کا خزانہ اور نادر اشیاء اپنے ساتھ دمشق لیتے جائیے۔

”نہیں بدرالدین ہم نے جب تمہیں آور کا حاکم بتایا تو اب آور میں جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں جو بیڑ تو دے دیتے ہیں مگر شاخ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔“

سلطان صلاح الدین کی بخشش کا یہ انداز تاریخ میں درج ہو کر امر ہو گیا اور اس کے ساتھ یہ بات بھی تاریخ کی زینت ہو گئی کہ آور کا حاکم بدرالدین سات سال تک شاہی محلات کا فالتو سامان فروخت کرتا رہا اور پوری ریاست آور کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں فروخت کیا ہوا مال نہ پہنچا ہو۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ ریاست آور الجزیرہ کی سب سے زیادہ مالدار اور خوشحال ریاست تھی۔ فرمانروایان آور کا عہد قدیم ہی سے یہ دستور تھا کہ وہ ہر تقریب کے لئے نیا سامان خریدتے تھے۔ مثلاً جب نیا فرمانروا مقرر ہوتا تھا تو اس کے لئے نیا محل تعمیر کیا جاتا اور اس محل میں نیا ساز و سامان لگایا جاتا۔ نوادرات بھی نئے خریدے ہوئے ہوتے تھے۔

اس طرح آور میں نئے محل اور نیا سامان جمع ہوتا گیا۔ کوئی فرمانروا پرانا محل اور پرانا سامان نہ استعمال کرتا۔ پرانے محل کو مع ساز و سامان کے محفوظ کر دیا جاتا اور اس کی دیکھ بھال کے لئے باقاعدہ چند غلام مقرر کر دئے جاتے۔ اس طرح کے سامان سے بھرے ہوئے محلات ریاست کے قلعہ اور بیرون قلعہ درجنوں

بکھیر دیں کی تعداد میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا سامان تصور سے بھی زیادہ

ریاست آور پر قبضہ اور اس کے مال و دولت اور نوادرات کا ذکر ادھورا رہا اگر ریاست کے اصل فرمانروا مسٹر فرمانزوا کے نام سے ان کی بیگم مرزا دارلنگ کا خطاب دیا گیا تھا ان کا کچھ نہ کیا جائے۔ مسٹر فرمانزوا اپنی رنگ میں مصروف تھے کہ انہیں قلعہ پر حملہ اور قبضہ کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ کیا قلعہ بدرالدین قلعہ میں داخل ہوا جہاں مسٹر فرمانزوا کا بھی شاہی ناتو لوگوں نے بدرالدین کو بتایا کہ امیر وزیر بقاء الدین یہاں سے چلا گیا ہیں آور کا اصل حاکم اور فرمانزوا ابھی تک اپنے محل میں موجود ہے۔ لازم اسے بھی قلعہ سے بے دخل کیا جائے۔

بدرالدین نے پہلے تو فرمانزوا کے تمام حالات سنے اور خوب ہنسا پھر اس نے فنی دستے کو حکم دیا کہ مسٹر فرمانزوا کو محل سے لے آؤ اگر وہ آنے سے لڑیں تو انہیں زبردستی لایا جائے۔ شاہی محل پر فوجی دستہ پہنچا تو وہاں کھرام لہان کی تو تباہی الگ تھی۔ اپنی علم ہی نہ ہوتا کہ سورج کب نکلا اور کب نہ ہوا۔ انہیں بتایا کہ ریاست آور کے میل و نمار بدل گئے ہیں۔ وزیر امیر الدین نے قلعہ سلطان و دمشق کے حوالہ کر دیا ہے اور نئے حاکم قلعہ نے اسے لکھا ہے اگر وہ جانے سے انکار کرے گا تو لشکری اسے پکڑ لے جائیں

قلعہ والوں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کنیزوں اور غلاموں نے جو تمام کے تمام عیسائی لادو کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پھر دارلنگ مرزا نے فرمانزوا کو مشورہ دیا کہ ہم قلعہ کے پاس جائے کیونکہ حاکم اب قلعہ کا مالک اور وہ (فرمانزوا) اس کا اور ایک عام شہری ہے۔ مرزا نے بھی یہ مشورہ دیا کہ وہ حاکم سے اپنی لڑائی کے لئے ایک معقول رقم کا سوال کرے۔ کیا عجب کہ حاکم کو رحم اور خزانہ سے اتنا کچھ دیدے کہ انہیں کسی اور کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

مرزا نے مسٹر فرمانزوا کو ایک جند گاڑی میں سوار کیا اور کنواری مریم کی ساتھ رخصت کرنا چاہا مگر مسٹر فرمانزوا اڑ گئے کہ اگر مرزا ساتھ نہیں لے گا تو وہ بھی حاکم کے پاس نہیں جائے گا خواہ اسے لشکریوں کے ساتھ ہو کر جانا پڑا۔

مرزا نے مسٹر فرمانروا کی بات سن لی مگر اس نے دوسرا لباس تبدیل کر
کیونکہ وہ ایک مسلمان حکمران کے سامنے جا رہی تھی اور اس کا نصرانی لباس
عریاں نہیں بلکہ تقریباً "عریاں" تھا۔ پھر اس نے فرمانروا کو سمجھایا۔

"مسٹر فرمانروا میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں اس لئے آپ کے بجائے
حاکم قلعہ سے میں گفتگو کروں گی آپ بالکل خاموش رہیں گے۔
مسٹر فرمانروا نے سر ہلا کر اقرار کیا اور مرزا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ
روانہ ہوئے۔

حاکم کے سامنے پہنچ کے فرمانروا اور اس کی بیوی مرزا نے عام رعایا
طرح حاکم کو جھک کے سلام کیا۔ پھر مرزا نے کہا۔ "اے حاکم قلعہ اور یہ
سابق قلعدار اور کی بیوی ہوں۔ ہم دونوں آپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہو
ہیں اس خیال سے کہ ہم نے نہ سلطان سے جنگ کی ہے اور نہ ان کے خلاف
منہ سے کوئی بات نکالی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں وزیر سلطنت
خطاؤں کی سزا نہیں دیں گے۔"

"ٹھیک ہے تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔" حاکم بدر الدین نے ا
کی بات مان لی۔ "ہاں اگر تم اور میں رہنا چاہتے ہو تو تمہیں شاہی محل چ
کے ایک عام انسان کی طرح یہاں رہنا ہوگا۔"

مرزا نے احتجاجی انداز میں کہا۔ "اے حاکم قلعہ آپ غور کر سکتے ہیں کہ
لوگوں کے ہم کبھی آقا تھے اب ان کے ساتھ برابری کے درجہ پر رہنا کس
مشکل ہوگا۔ اگر آپ ہم پر نوازش فرمائیں تو ہمیں ایک معقول رقم شاہی
سے عطا کر دیں تو ہم اور چھوڑ کر کہیں چلیں جائیں۔"

"معقول رقم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" امیر بدر الدین نے پوچھا۔
مرزا نے جواب میں کہا۔ "رقم اتنی ہونا چاہئے کہ ہم اپنی بقیہ زندگی ا
طرح گزار سکیں۔"

"دیکھو سلطان دمشق ابھی قلعہ کے باہر لشکر گاہ میں موجود ہیں۔ تم ان
جو چاہے طلب کر سکتے ہو اور وہ سب کچھ عطا کر سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم ان
سامنے اپنی درخواست پیش کرو۔" حاکم قلعہ نے اسے مشورہ دیا۔

مرزا اس بات سے بہت خوش ہوئی۔ اس نے سلطان صلاح الدین کا پلا
نا تھا وہ سلطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ مسٹر فرمانروا اور وہ

ذی میں بیٹھ کے سلطان کے پاس پہنچے۔ ان کے ساتھ گھوڑے پر سوار حاکم
بدر الدین بھی چل رہا تھا۔

مسٹر فرمانروا نے سلطان کے سامنے بڑے مذہب طریقے سے اپنا مقدمہ پیش
کیا۔ سلطان معظم آپ نے قلعہ آور فتح کیا اس کی میں مبارک باد پیش
تا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ روزانہ ایک قلعہ فتح کیا کریں۔ میں
لی۔"

سلطان صلاح الدین نے پریشان ہو کے بدر الدین کی طرف دیکھا جو مسٹر
ازدا کے برابر کھڑا تھا۔

"بدر الدین تم کس شخص کو لے آئے۔ تم نے تو کہا تھا کہ اور کا سابق
ازدا حاضری کی اجازت چاہتا ہے مگر یہ؟"

"سلطان عالم۔" بدر الدین سر کو خم کر کے بولا۔ "یہی اور کے سابق فرمانروا
اجن کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انہیں آج معلوم ہوا کہ سلطانی لشکر نے اور
کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب میں نے سپاہی بھیج کے انہیں
ل سے بلوایا۔"

"یہاں کس لئے آئے ہیں یہ لوگ؟" سلطان کا مزاج مکدر ہو گیا تھا۔
"یہ مجھ سے اتنی رقم طلب کر رہے تھے جسے دینے کا مجھے اختیار نہیں۔ میں
اور عالی میں انہیں لایا ہوں کہ ان کا مقابلہ منظور کیا جائے یا رد کر دیا
ئے۔" بدر الدین نے اصل حال بیان کر دیا۔

سلطان خدا جانے کیوں نرم پڑ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا
چاہو کیا مقابلہ ہے تمہارا؟"

"سلطان نخی اور بخشش کرنے والے ہوتے ہیں۔" مسٹر فرمانروا نے کہا۔
"میرے میری غفلت کی مجھے سزا دی۔ مجھے نہ خدا سے شکوہ ہے اور نہ آپ
عظمت۔ بس اس قدر التماس ہے کہ سلطان عالی مقام مجھے اتنی رقم عطا
کریں کہ ہم دونوں میاں بیوی کی بقیہ زندگی آرام سے گزر جائے۔"

"اے نادان انسان تو غافل تھا اس لئے خدا نے تجھ سے ریاست اور اقتدار
لیا۔ مگر میں تیرے التماس کو رد نہیں کر سکتا اس لئے کہ مجھے روز قیامت
خدا کو جواب دینا ہے۔" پھر سلطان نے بدر الدین کو حکم دیا۔ "اے
امیر ان دونوں میاں بیوی کو عزت سے اور کے شاہی خزانہ میں لے جاؤ

اور اس سے کہو یہ جس قدر سونا چاندی ہیرے جواہرات اور نوادرات اٹھا کر
سے باہر لے جاسکتے ہوں وہ لے جائیں لیکن یہ موقعہ انہیں ایک بار دیا جا
پھر یہ قلعہ میں لوٹ کے نہیں آسکتے۔“

مسٹر فرمانروا اور ڈارلنگ مرزا سلطان کے حضور سجدہ کی حد تک جھک کر
مرزا نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ ”سلطان عالی مقام میرے بابا سلطان کی شہاد
اور جوانمردی کے جو قصے سناتے تھے ان مجھے یقین نہ آتا تھا مگر آج آپ
سخاوت کا عالم آنکھوں سے دیکھا یہ بھی ثابت ہوا کہ جس انسان کو خداوند
صبح نے شجاعت بخشی ہے اس نے اسے اتنا ہی سخی بھی بنایا ہے۔“

دونوں سلطان کو سلام کر کے واپس ہوئے۔ گاڑی باہر کھڑی تھی۔ اس پر
کے وہ آور کے خزانہ کی طرف چلے۔ بدرالدین گھوڑے پر سوار ان کے
ساتھ تھا۔ خزانہ پر پہنچ کے مسٹر فرمانروا نے دو چڑی تھیلے طلب کئے جو انہیں
کردئے گئے۔ پھر میاں بیوی نے ان تھیلوں کو صرف ہیرے جواہرات سے اتنا
جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ بدرالدین دور کھڑا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
نے فرمائش کی کہ اس کے بابا کو محل سے بلوایا جائے۔ بابا یعنی راجہ
رونالد کو علم ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں اندر باہر بھاگ رہا تھا۔ اطلاع
وہ بھاگتا ہوا آیا۔

مسٹر فرمانروا اور مرزا ڈارلنگ تھیلے سنبھالے کھڑے تھے۔ بابا نے بیٹی کے
سے تھیلا لیتا چاہا مگر مرزا نے اسے منع کر دیا۔ ”نہیں بابا سلطان کا حکم ہے
اور مسٹر جس قدر دولت اٹھا کر لے جاسکتے ہیں وہ لے کر قلعہ سے نکل جائیں
پھر ایک نابل اور غافل فرمانروا کا انجام پورے قلعہ نے دیکھا۔ برا
ان کے ساتھ تھا اور جب تک وہ دونوں قلعہ سے نکل نہ گئے وہ انہیں دیکھتا

فتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین دریائے فرات عبور کر کے موصل اور الجزیرہ کی طرف
ہا تھا کہ اس دوران دمشق سے ایک تیز رفتار سوار سلطان کی خدمت میں حاضر
ہوا۔ سوار کو دیکھ کر سلطان چونکا۔ اس لئے کہ سوار نے اپنا گریبان چاک کر رکھا
اس زمانہ میں عوام جب کوئی غناک خبر کسی دوسرے کو سناتے تو اپنا گریبان
کھینچ لیتے تھے۔

سلطان سوار کو دیکھتے ہی افسردہ ہو گیا تھا۔ سوار آنکھیں پٹی کئے گفتگو کی
ات کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور فرمایا۔

”اے چاک گریبان قاصد۔ ہم نے خود کو اس غناک خبر سننے پر آمادہ کر لیا
جو تو لے کر آیا ہے۔ ہمیں بتا کہ ہمارا کون عزیز ہم سے منہ موڑ گیا ہے؟“
”عالیجاہ۔“ اور قاصد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔

”تیرا غم ہمارے غم میں شامل ہو گیا ہے قاصد۔ اب امتحان نے لے اور بتا
کون ستارہ ٹوٹ کر املاک کی گہرائیوں میں گم ہو گیا ہے؟“

قاصد نے آنسو پونچھے اور اٹکبار آنکھیں اٹھا کر کہا۔ ”عالی جاہ آپ کے
بھتیجے عزالدین فرخ شاہ بن شاہاں شاہ نے آپ کو داغ مفارقت دے دیا

سلطان سنائے میں آگئے۔ ”جواں عمر فرخ شاہ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔
راہل تو اس کے روشن مستقبل کی پیش گوئیاں کر رہا تھا اور وہ ہمیں چھوڑ

سلطان کو یقیناً اس خبر سے صدمہ ہوا مگر خدا نے انہیں صبر و تحمل کا عظیم
عطا کیا تھا اور بردباری اور قوت برداشت کی صفات سے نوازا تھا۔ کچھ

کی گورنری کے لئے ضد کی جس پر سلطان کے حکم سے یہی شمس الدین
نہ تھا اس وقت سلطان نے بھائی کی ضد سے مجبور ہو کر مقدم کو حکم دیا
طلک کی گورنری اس کے بھائی کے سپرد کر دے تو احسان فراموش مقدم
نے آکر میاں اور طلک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

سلطان کو اس کی اس حرکت پر غصہ آیا اور بہت آیا۔ اس نے طلک کا
حکم دے دیا۔ شاہی فوجوں نے طلک کو گھیر لیا۔ اسی قلعہ طلک میں
کا بچپن گزرا تھا کیونکہ ایک زمانہ میں سلطان کا باپ نجم الدین ایوب اس
کا حاکم تھا۔ سلطان کو بھی اس قلعہ سے دلی محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا
شمس الدین مقدم کو سزا دینے کے لئے وہ قلعہ پر سنگ باری کرائے اور
کی فیلین منہدم ہو جائیں۔ اسی لئے اس نے حکم دیا تھا کہ قلعہ کا سختی سے
دیکھا جائے مگر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

افغان شمس الدین مقدم کچھ دنوں تو قلعہ میں بند رہا مگر جب سامان رسد
ہونے لگا اور باہر سے محاصرہ کی وجہ سے ہر چیز کی آمدورفت بند ہو گئی تو
برطان ہوا اور سلطان کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور شرط لگائی کہ وہ اس
قلعہ طلک خالی کرے گا جب اسے اس کی مرضی کا علاقہ دیا جائے گا۔
اس کو اس کی اس شرط یا فرمائش پر غصہ کی بجائے ہنسی آئی ہوگی۔ مگر سلطان
مقدم کے قاصد کے سامنے اپنے تاثرات کا کوئی اظہار نہ ہونے دیا اور
کی شرط تسلیم کر لی۔

اس جگہ سلطان کو ہنسی آنے کی بات اس وجہ سے لکھی گئی ہے کہ پہلے
انے خود شمس الدین مقدم کے پاس حکم بھیجا تھا کہ وہ طلک کا قلعہ
کے بھائی کے حوالے کر دے اور اسے (المقدم کو) اس قلعہ کے بدلہ میں وہ
دیا گیا جائے گا جس کو خود شمس الدین مقدم پسند کرے گا۔ یہی دلچسپ
تھی اور اس پر ضرور ہنسی آنا چاہئے تھی کہ مقدم نے قلعہ خالی کرنے کی
شرط لگائی تھی وہ سلطان نے اسے پہلے ہی صلہ میں دینے کا اعلان کیا تھا۔ مگر
سلطان نے اسے بہترین علاقہ دے کر اس سے طلک کا قلعہ خالی کرا لیا۔

امیر شمس الدین مقدم کی صرف یہی گستاخیاں نہ تھیں بلکہ اس نے ارمغانہ
فرخ شاہ کے درمیان فراق کے جو کانٹے بوئے تھے اس کی اطلاع سلطان کو
فرخ شاہ کو یہاں تک شبہ ہوا تھا کہ شاید امیر شمس الدین مقدم نے

توقف کے بعد انا اللہ وانا الیہ راجعون کہا۔ پھر دریافت فرمایا۔
”یہ سانحہ کہاں اور کیسے واقع ہوا؟“
قاصد نے تفصیل بتائی۔

”امیر زادے فرخ شاہ دمشق سے ایک لشکر لے کر جہاد کے لئے روانہ
ہوئے۔ راستہ میں طبیعت خراب ہوئی۔ سرداروں نے واپسی کا مشورہ دیا۔ وہ
لشکر کے واپس آئے۔ بیماری اگرچہ کچھ نہ تھی بس بہانہ ہو گیا۔ امیر زادے کی
جوانمردی پر پورا دمشق سوگ میں ڈوب گیا۔“

”بے شک وہ جوانمرد تھا اور ہمارا دست و بازو۔“ سلطان نے فرخ شاہ کی
خدمات کا اعتراف کیا۔

سلطان کے ایک بھائی نور الدولہ شاہاں شاہ کے دو بیٹے۔ عزالدین فرخ شاہ اور
تقی الدین المنظر اور ایک بیٹی عذرا خاتون تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں بیٹیوں کا
شروع ہی سے اپنے ساتھ رکھا تھا اور یہ سلطان کے زیر سایہ اپنی شجاعت اور
ہمدردی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان دونوں سلطان نے عزالدین فرخ شاہ کو دمشق
کا حاکم اور اپنے اہل خانہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ فرخ شاہ اپنے ان دنوں
فرانض کو احسن طریقے سے نباہ رہا تھا کہ اچانک اسے موت نے آگھیرا اور
جوانی کے عالم میں اس نے انتقال کیا۔

فرخ شاہ ایک خاموش طبع نوجوان تھا۔ فرخ شاہ اور تقی الدین دونوں
ہمدردی میں ثانی نہ تھے اور سلطان ہمیشہ انہیں اہم کام یا معرکوں پر مامور کر
تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جس عہد پر سلطان خود جانا چاہتا تھا مگر مجبوریوں کی
سے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا تو وہاں تقی الدین یا فرخ شاہ کو بھیجتا تھا۔ فرخ
میں شجاعت کے ساتھ ساتھ محبت کا بھی کچھ سایہ تھا لیکن اس کی بد قسمتی کہ
بڑے بڑے میدان مارنے کے بعد بھی محبت کے میدان میں ناکام رہا۔ جس
وجہ ارمغانہ کا باپ امیر شمس الدین محمد بن مقدم تھا جو خدا معلوم کیوں
شاہ کے خلاف ہو گیا تھا اور مقدم کی مخالفت ہی نے آخر ارمغانہ کی جان لے
اور وہ فرخ شاہ کی خاموش محبت میں گھٹ گھٹ کر مرنے لگا۔

مگر یہ قسمت بھی کچھ عجیب چیز ہے اور اس کی کار فرمایاں عجیب تھیں۔
شمس الدین مقدم دو معصوم دلوں کی محبت میں دیوار بن کے کھڑا ہوا۔ اس
فرخ شاہ کو قتل کرانے کی کوشش کی پھر جب سلطان صلاح الدین کے بھائی

صلاح الدین پھر بھی کچھ نہ سمجھ سکا تھا اور اسے نے دست بدست عرض کیا
 ”اے سلطان عالی مقام۔ آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ مجھے دیکھو اور کچھ
 کہیں۔ میں آپ کو دیکھتا ہوں اور وہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو مجھے
 دکھائی دیتا ہے لیکن میری رسائی آپ کے دل تک نہیں پھر میں آپ کا
 اہلین کیسے سمجھ سکتا ہوں؟“

اس وقت سلطان مرحوم نے بڑے دکھ سے بتایا تھا۔

”صلاح الدین ارض مقدس اور قبلہ اول یعنی بیت المقدس کو تقریباً پون
 پہلے لھرائیوں نے ہم مسلمانوں سے چھینا تھا مگر اتنے طویل عرصہ میں کوئی
 کوئی بادشاہ اور کوئی خلیفہ یا سلطان اس ارض پاک کو لھرائیوں کے ناپاک
 ہاتھ سے آزاد نہ کرا سکا۔ کہنے کو میں سلطان ہوں۔ مسلمانوں کے عباسی خلیفہ
 کی بار میری توجہ اس طرف مبذول کرائی مگر افسوس کہ میں اس مقصد کو نہ
 کما جس کی آرزو مجھ سے پہلے کے تمام بادشاہوں اور سلطانوں کے دل میں

صلاح الدین نے بڑے جوش سے کہا تھا۔

”اے آقا محترم آج میں نے آپ سے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر مسلمان کو
 قبلہ اول کی بازیابی کے لئے کوشش کرنا چاہئے صرف کوشش ہی نہیں بلکہ
 المقدس کی آزادی کو اپنا مقصد زندگی اور نصب العین بنانا چاہئے۔“

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ جس دن صلاح الدین نے اپنے اس جذبہ کا
 اعلان مرحوم سے اظہار کیا تھا اسی دن سلطان نورالدین زنگی نے اپنے مشہور جنرل
 صلاح الدین شیرکوہ کو حکم دیا تھا کہ وہ مصر کے محاذ پر جاتے وقت اپنے ساتھ نو
 صلاح الدین کو بھی لیتا جائے۔ اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ صلاح الدین نے
 مروجہ کی سخت مخالفت کی تھی لیکن اسے سلطان کے حکم پر مصر جانا پڑا اور
 صلاح الدین کی مصر روانگی ہی اس کے عروج کی پہلی سیڑھی ثابت ہوئی۔

صلاح الدین نے مصر میں بخت ایک امیرزادے پھر بخت وزیراعظم مصر پھر
 لازم مصر کی حیثیت میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ان سے قارئین کرام بخوبی
 واقف ہو چکے ہیں۔ پھر جب مصر کے بعد صلاح الدین کو سلطنت دمشق حاصل
 ہوئی تو اس کے جذبہ جہاد اور بیت المقدس کی بازیابی کے تصور میں شدت پیدا

اپنی بیٹی سے ناراض ہو کر اسے زہر دیدیا تھا مگر ان تمام باتوں کے باوجود صلاح
 الدین نے مقدم کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور اسے سلطنت کے
 سے اہم شہر اور قلعہ اپنی دار السلطنت دمشق کا گورنر بنا دیا۔ یہی نہیں بلکہ ا
 شمس الدین مقدم کو دمشق میں اپنا نائب بھی مقرر کیا۔ سلطان کے اس فی
 سے ثابت ہوتا ہے کہ ملکی انتظام اور کاروبار سلطنت میں سلطان کس قدر
 ایماندار اور دوراندیش تھا۔ سلطان کے درجنوں بھائی اور بھتیجے تھے مگر سلطان ا
 اپنے اپنے مقام پر رکھتا تھا۔

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان نے کچھ دنوں کے لئے اپنے
 بھائی کو دمشق کا گورنر بنایا تھا جس کی بے پروائی کی وجہ سے دمشق کی فوج
 لھرائیوں کے ہاتھوں زبردست شکست اٹھانی پڑی تھی اور ملکی انتظام کے معاملہ
 احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امیر شمس الدین مقدم میں کئی عیب تھے لیکن وہ
 اچھا منتظم تھا بہادر سردار تھا۔ دمشق کا حاکم اسے اسی وجہ سے مامور کیا گیا
 سلطان صلاح الدین نے اپنے مرحوم آقا نورالدین زنگی کے دن دیکھے۔
 نورالدین زنگی مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جہاد میں گزارا تھا اور اسی
 نقش قدم پر چلنے کے لئے سلطان صلاح الدین اپنی تمام تر کوششیں کر رہا تھا۔
 تو اس کی فرنگیوں (لھرائیوں) سے کئی بار جنگ ہو چکی تھی۔ مصر کے تمام
 دوران شاہ یروشلیم سے اور اسکندریہ کے محاصرہ میں رومی شہنشاہ قسطنطین سے
 اس کا سابقہ پڑ چکا تھا لیکن اب تک اس کے دل میں چھپے ہوئے جذبہ جہاد
 تسکین نہیں ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ اس کے مربی سلطان نورالدین زنگی نے اس سے کہا تھا۔

”صلاح الدین جانتے ہو میری زندگی کا مقصد اور میرا نصب العین کیا ہے؟
 صلاح الدین اس وقت بہت کم عمر تھا اس لئے نورالدین زنگی کے جواب
 جواب نہ دے سکا تھا اور اس نے کہا تھا۔

”آقائے محترم میری عقل ناقص آپ کے پرواز خیال تک نہیں پہنچ سکتی
 پھر مرحوم نورالدین نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا۔

”صلاح الدین میری زندگی کا مقصد وہ ہے جو میرے باپ امیر عباد
 زنگی کا تھا۔ جو سلجوقی سلطان تھا۔ جو عباسی خلفاء کا تھا مگر جسے کوئی بھی
 کرسکا۔ کاش میں اس مقصد زندگی تک پہنچ سکتا۔“

ی جن میں نصرانی لشکر موجود تھا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور پہاڑ پر چڑھ گیا
انے اپنے ارد گرد خندق کھود کے خود کو محفوظ کر لیا۔

سلطان پہاڑی کے پاس پہنچے اور نصرانی لشکر کو قلعہ سے اتارنے کی کوشش
وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور خندق کی وجہ سے محفوظ رہے۔ سلطان نے
ان کے حال پر چھوڑا اور قلعہ الکرک کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قلعہ بڑا
نا اور یہاں کا حاکم بڑا متعصب نصرانی تھا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ
س پر مجاہدیت سے سک باری شروع کر دی۔ اہل علاقہ نے زبردست مدافعت
دینی علاقے تو فتح ہو گئے لیکن قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔

ان وقت مصر پر سلطان کا بھائی ابوبکر الملک العادل حاکم تھا۔ سلطان نے
اس سے بلوایا اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ قلعہ
پر جہاں وہ محاصرہ کئے ہوئے تھا آکر ملے۔ چنانچہ الملک العادل اپنے اہل
ساتھ قلعہ الکرک کے محاصرہ کے دوران ہی آکر سلطان سے مل گیا۔
نے الملک العادل کو حلب شہر اور حلب کے قلعہ کی حکومت پیش کی جو
قبول کر لی۔

سلطان نے دراصل الکرک کی فتح کا پورا سامان نہیں کیا تھا اس لئے وہ کچھ
محاصرہ کے بعد مال غنیمت سمیٹ کر دمشق واپس ہو گیا۔ دمشق پہنچ کے
نے اپنے بھتیجے تقی الدین بن شاہاں شاہ کو ملک العادل کی جگہ مصر کا حاکم
لایا اور ملک العادل کو حلب اور فوج کی امامت سونپی۔ جب ملک العادل
اے لگا تو سلطان نے اپنے ایک بیٹے ملک العزیز عثمان کو اس کے ساتھ
اور دوسرے بیٹے ملک الفاضل کو تقی الدین کے پاس مصر روانہ کیا۔

سلطان نے کچھ دن بعد قلعہ الکرک پر دوبارہ بلغار کی مگر کامیابی حاصل نہ
اسی طرح موصل پر کئی بار حملہ کیا مگر موصل فتح نہ ہو سکا پھر ایک شدید
کے بعد موصل اسے حاصل ہو گیا مگر وہ جب حران میں مقیم تھا تو سخت
لیا اور زندگی کی توقع نہ رہی۔ شخصی حکومتوں میں بادشاہ وقت کے بنیاد
عی تخت و تاج کے دعویدار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے حق میں زمین
لے کر شروع کر دیتے ہیں۔

لیا اور جب سلطان اپنی زندگی سے مایوس ہوا تو اس بات کا بہت افسوس
اس نے اپنے کسی بیٹے کو بھی کسی علاقہ کا مستقل اور خود مختار حاکم مقرر

ہو گئی۔ اگرچہ اس سے پہلے شام میں الرہا (اڈیبہ) کی مضبوط عیسائی دیوار
مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور سلطان نور الدین زنگی نے بھی تاحیات جہاد
نصرانیوں پر کئی کاری ضربیں لگائی تھیں لیکن اب بھی ان کا زور باقی تھا۔

سلطان کو نصرانیوں سے زیادہ شام کے مختلف مسلمان حکمرانوں کی طرف
پریشانی تھی۔ اس لئے اس نے پہلے اسی پریشانی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو
اس کا بہت ساقبتی وقت ضائع ہو گیا اور وہ اپنے اصل مقصد کی طرف رہ
ہو سکا۔ شام میں مسلمانوں کی صرف حلب اور موصل ایسی ریاستیں باقی تھیں
اب تک سلطان کے قبضہ میں نہ آسکی تھیں اور اسے پریشان کر رہی تھیں۔

پس سلطان نے فتح آور کے بعد اپنی فوجیں حلب کے مضافات داخل
اور تل خالد اور عنتاب کے علاقے فتح کرنے کے بعد قلعہ حلب کا محاصرہ
محاصرہ کے دوران محصورین نے شدید مدافعت کی اور اس لڑائی میں سلا
چھوٹا بھائی تاج الملوک بوری شدید زخمی ہوا۔ سلطان حلب کو ہر قیمت پر
کرتا چاہتا تھا۔ حاکم حلب عماد الدین کچھ عرصہ تک مدافعت کرتا رہا مگر عام
قدر سخت تھا کہ اہل قلعہ چھ آٹھے۔ ادھر فوج نے اپنی تنخواہ کا مطالبہ
عماد الدین نے مجبور ہو کر قلعہ اس شرط پر حوالہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ
حلب کے بدلے میں نصیبن وغیرہ کے علاقے دے دئے جائیں۔

عماد الدین کی طرف سے طوفان الباروقی صلح کا پیغام لے کر آیا۔ سلطان
اس کی شرائط منظور کر لیں اور عماد الدین نے معاہدہ کے مطابق قلعہ خالی
اس فتح کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا گیا لیکن قلعہ میں داخل ہونے سے
سلطان تاج الملوک بوری کا انتقال ہو گیا جو اس محاصرہ کے دوران بہت زخمی
تھا۔ اس طرح جشن کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا پھر بھی حلب پر قبضہ کی ہر آہ
خوشی تھی۔ سلطان نے حلب پر اپنے کسب بیٹے الظاہر غازی کو حاکم مقرر کیا
امیر سیف الدین تاجک کو اس کا نگران بنا دیا۔

حلب پر فتح کے ساتھ ہی اس میں جذبہ جہاد بڑی شدت سے عود کر آیا
اسے نے دیار بکر اور الجزیرہ سے فوجیں طلب کر لیں۔ پھر وہ ایک بڑے لشکر
ساتھ دریائے اردن عبور کر کے نصرانی علاقوں میں داخل ہو گیا۔ سلطانی لشکر
اڑتے ہی نصرانی اپنے علاقے چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے
نے بیسان کا رخ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ بیسان کی تباہی کے بعد تمام

الدين اور مصریوں کو اس وقت تک یہی علم تھا کہ (خداخواستہ) سلطان بن کا انتقال ہو گیا ہے۔

الدين نے اسی خیال کے تحت اپنا مقدمہ یا حق فقیہ صاحب کے سامنے لے ہوئے کہا۔

یہ محترم یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ خاندان ابوبی کی نوجوان نسل میں دمشق کے لئے میری خدمات سب سے زیادہ ہیں۔

یعنی نے جواب دیا۔

یہ تسلیم کر لیا مگر۔۔۔۔۔

مگر اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔“ تقی الدین عیسیٰ ہکاری کی بات دے گا۔ ”آپ بھی یہ تسلیم کریں گے کہ تمام بڑی بڑی جنگوں میں میں لیا۔“

یہ بھی تسلیم مگر۔۔۔۔۔

تقی الدین نے پھر بات کاٹی۔ ”فقیہ محترم پہلے مجھے عرض کر لینے دیجئے پھر ب دوں گا۔“ پھر تقی الدین نے ذرا رک کے کہا۔ ”تیسری بات یہ کہ کئی مہینوں پر مجھے سرداری اور سپہ سالاری کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ اعزاز اس کی طرف تین افراد کو حاصل ہوا۔ ایک شمس الدولہ توران شاہ جس نے ایک دو سوا میرا بھائی عزالدین فرخ شاہ جسے دمشق کی گورنری بھی حاصل تھی اور تیسرا میں یعنی تقی الدین بن نورالدولہ شاہاں شاہ بن نجم الدین شمس الدولہ توران شاہ اور عزالدین فرخ شاہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی میں سلطنت کے داروں میں سب سے افضل ہوں۔ چوتھی بات جس کا رواج اور دستور ہے وہ یہ کہ سلطان صلاح الدین پہلے مصر کے حاکم تھے اور دمشق کی سلطنت حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت سلطنت دمشق کے سب سے صوبہ اور علاقہ مصر کا میں حاکم ہوں اس لئے بھی مجھے دمشق کے تحت ناگوارت ہونے کا حق پہنچتا ہے۔“

فقیہ عیسیٰ نے بڑے تحمل سے تقی الدین کی دلیلیں سنیں جب وہ چپ ہوا تو

”تم اپنی کمائی سنا چکے یا ابھی کچھ اور کہتا ہے۔“

”میں ہاں میں سب کچھ کہہ چکا اب آپ انصاف فرمائیے۔“ تقی الدین نے

نہیں کیا۔ سلطان کے بعض دوستوں نے بھی اس کی اس طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ سلطان نے اپنے فرزند ملک العزیز عثمان کو مصر کا خود مختار حاکم بنا کر بھیجا اور مصر سے اپنے پیچھے تقی الدین اور بیٹے ملک الافضل کو اپنے پاس بلوایا مگر تقی الدین نے دمشق جانے سے انکار کر دیا۔ تقی الدین کا ایک غلام قراقوش تھا جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔ اس نے شمالی افریقہ کے علاقہ طرابلس اور جریہ کو فتح کیا تھا اور ان پر قابض تھا۔ تقی الدین کا ارادہ تھا کہ وہ بھی افریقہ چلا جائے گا۔

سلطان کو تقی الدین کی مخالفت اور حکم عدولی کی اطلاع ملی تو اسے بہت افسوس ہوا۔ تقی الدین کا بھائی عزالدین فرخ شاہ تو سلطان کا دست راست تھا اس کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ تقی الدین پر بھی سلطان کم و بیش فرخ شاہ کی طرح اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے تقی الدین کو ایک پیار بھرا خط لکھا اور سلطنت کے لئے اس کی خدمات کو سراہا۔ تقی الدین دل سے سلطان کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس خط موصول ہوتے ہی دمشق آیا۔ سلطان نے اسے حیات بنج، مصر، کفرتاب، جبل جوز اور اس کے تمام علاقوں کی حکومت عطا کر دی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت تقی الدین جسے سلطان نے مصر کا حاکم مقرر کیا تھا اس کو سلطان کی بیماری اور اس کے ساتھ اس کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے خود سلطان بننے کا ارادہ کیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے یہ جواز پیش کیا کہ سلطان صلاح الدین پہلے مصر کے حاکم تھے پھر انہیں دمشق کی حکومت ملی تھی اس لئے ان کے بعد میں مصر کا حاکم ہونے کی وجہ سے سلطنت دمشق کا حقدار ہوں۔

یہ خبر سلطان تک پہنچی تو انہوں نے اپنے معتد ترین امیر فقیہ عیسیٰ ہکاری کو مصر روانہ کیا۔ فقیہ عیسیٰ کی بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ان کا سلطان کا حکم سمجھا جاتا تھا۔ سلطان نے فقیہ عیسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ وہ تقی الدین کو مصر سے نکال کے وہاں خود قیام کریں۔ فقیہ عیسیٰ ہکاری بڑی خاموشی سے مصر پہنچے۔ وہ رات کے وقت پہنچے تھے اس لئے انہوں نے رات ایک کا رواں سرائے میں گزاری۔ پھر صبح کو جب تقی الدین دربار لگائے بیٹھا تھا تو اچانک دربار میں پہنچے۔

تقی الدین انہیں دیکھ کے پاس ادب سے کھڑا ہو گیا۔

فقیہ عیسیٰ نے اس سے سوال کیا۔ ”تقی الدین تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

ہکاری نے اپنی سانس ٹھہرائی اور کہا۔ ”تقی الدین تمہاری اس گستاخی کی سزا ہے کہ تم سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے قاہرہ کی حدود سے نکل جاؤ۔“
تقی الدین سناٹے میں آگیا اور درباریوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل

تقی الدین نے ایک جھر جھری لے کر خود کو سنبھالا اور مضبوط لمبے میں ”فقہ محترم آپ مجھے کس حیثیت سے قاہرہ بدر ہونے کا حکم دے رہے ہیں آپ کو علم نہیں کہ میں صوبہ مصر کا گورنر ہوں مجھے سلطان صلاح ایوبی اپنے ایک فرمان کے ذریعہ مصر کی امامت عطا کی تھی۔“

فقہ ہکاری نے بھی اتنے ہی مضبوط لمبے میں جواب دیا۔
”تقی الدین جس سلطان دمشق نے تمہیں مصر کا امامت کا پروانہ جاری کیا، سلطان دمشق نے تمہیں امامت سے معزول کر کے مجھے مصر کی گورنری پر فرمایا ہے اس لئے اس وقت مصر کا گورنر تم نہیں میں ہوں۔“

”مگر آپ کو کس سلطان دمشق نے مصر کی گورنری عطا کی ہے؟“ تقی الدین یزانی سے سوال کیا۔

”اے نادان تقی الدین مجھے اس سلطان نے گورنری دی ہے جس نے تم اعزاز چھین لیا ہے۔ اگر اب بھی نہیں سمجھ سکے یا سمجھنے سے قاصر ہو تو دمشق کا ایوبی سلطان صلاح الدین پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔“ فقہ نے انتہائی غصہ سے جواب دیا۔

لیکن سلطان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔“ تقی الدین نے فوراً کہا۔

فقہ عیسیٰ نے فوراً ”کھوار کھینچ لی اور چیخ کر کہا۔

”گستاخ تقی الدین اگر تو نے اب میرے سامنے سلطان کو مردہ کہا تو میں ہانکھنچ لوں گا۔“

تقی الدین گھبرا گیا اور بولا۔ ”بزرگ محترم کیا میں نے جو کچھ سنا وہ جھوٹ

نہ تو جھوٹ تھا ہی مگر تو سب سے بڑا جھوٹا ہے جس نے بغیر تحقیق کئے راہ پر یقین کر لیا۔“

مجھے معاف کر دیجئے بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔“ تقی الدین بگڑ گزرنے لگا۔
نہا جس تیری یہی سزا ہے کہ فوراً قاہرہ سے نکل جا۔“ فقہ عیسیٰ ہکاری

بڑی امیدوں سے کہا۔

”انصاف۔“ فقہ عیسیٰ ہکاری نے تلخی سے جواب دیا۔ ”کس بات کا از چاہتے ہو؟“

تقی الدین نے وضاحت کی۔ ”یہی کہ میں خاندان ایوبیہ میں سلطنت و سب سے بڑا حق دار ہوں۔“

”سنو تقی الدین۔“ فقہ کے لمبے میں اور تلخی آگئی۔ ”اگر انصاف چاہتے تو سنو تم دروغ گو اور جھوٹے ہو۔“

اس وقت دربار میں مصری امراء اور سرداروں کے علاوہ بعض قدماء نوریہ بھی موجود تھے جو سلطان صلاح الدین کے مصر سے دمشق منتقل ہونے وقت مصر میں ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے فقہ عیسیٰ ہکاری کے تیور اور رخ کو محسوس کیا تو گھبرائے۔ خود تقی الدین کو پسینہ آگیا۔ اس نے لکھیاے میں کہا۔

”عالی مقام فقہ عیسیٰ ہکاری۔ آپ میرے بزرگ ہیں میں آپ کا کم سکتا ہوں لیکن آپ نے سردبار مجھے دروغ گو اور جھوٹا کہہ کے میری توہین ہے۔ میں نے کون سی غلط بات کہی کیا جھوٹ بولا؟“

”تمہارے جھوٹا ہونے کی صرف یہی دلیل کافی ہے کہ تم نے سنی سنائی پر کان دھرے اور ان پر بغیر تحقیق کے یقین کر لیا۔“ فقہ عیسیٰ ہکاری کو آگیا تھا اور ان کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے تھے۔

تقی الدین اور درباریوں کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ فقہ عیسیٰ ہکاری سنجیدہ اور تہہ قسم کے انسان ایک بالکل عام لہجہ میں گفتگو کر رہے اور حاکم پر ایک سنگین الزام لگا رہے تھے۔

تقی الدین کو بھی غصہ آگیا تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور ادب بولا۔

”فقہ محترم میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ سلطنت دمشق پر اپنا دعویٰ اور ثابت کرنا کس طرح جھوٹ ہے اور میں نے کسی سنی سنائی بات پر کان دم ہیں۔“

”تقی الدین تمہاری بہادری کی میں قدر کرتا ہوں لیکن تم ایک ایسی سلطنت اور تخت و تاج کے دعویدار ہو تم سے زیادہ شجاع اور عالی دماغ ہے۔“

پر اب تک غصہ سوار تھا۔ ”مجھے معلوم ہوتا کہ تم کان بکے اتنے کچے ہو اور تمہاری نادانی کا یہ عالم ہے تو میں تمہیں مصر کا حاکم بنانے کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔ شکر کرو تقی الدین کہ سلطان نے صرف تمہیں مصر کی گورنری سے معذلل کیا ورنہ اگر انہوں نے مجھے سزا دینے کا اختیار دیا ہوتا تو میں تمہارا بڑا برا شٹر کرتا۔“

تقی الدین اس کے حواریوں اور تمام درباریوں نے سن لیا کہ خود سلطان نے تقی الدین کو امامت مصر سے معذلل کر دیا ہے تو ان کی نظریں خود پھر گئیں اور تقی الدین کو غروب آفتاب سے قبل قاہرہ چھوڑ دینا پڑا۔

تقی الدین قاہرہ کی سرحد سے نکل آیا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ جائے تو جائے کدھر جائے۔ سلطان اس کے خلاف ہو گیا تھا اس لئے اسے کسی جگہ نہ ملنے کی امید نہ تھی۔ اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سلطان کی نظروں سے دور رہ کر اس وقت کا انتظار کرے جب سلطان اسے معاف کر دیں۔ چنانچہ وہ تقی الدین نے قاہرہ کی سرحد پار کر کے ایک مقام پر اپنا خیمہ نصب کیا اور وہیں رہنے لگا۔

پھر یہ بات پورے شہر قاہرہ میں مشہور ہو گئی کل کے گورنر تقی الدین کو سلطان نے معذلل کر کے شہر بدر کر دیا ہے اور اب وہ قاہرہ سے باہر ایک خیمہ میں تنہا پڑا ہوا ہے۔ سلطان کے خوف کی وجہ سے کوئی اس کے پاس نہیں پہنچتا۔

روایت ہے کہ مصر کے پرچہ نویس (شاہی جلوس) نے دربار دمشق میں پہنچا کہ تقی الدین معذلل اور مرود ہو کے قاہرہ کے باہر اکیلا ایک خیمہ میں پڑا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ شاید کسی وقت کرم سلطانی کا کوئی ایسا بادل اٹھے جو دمشق سے اڑ کر قاہرہ پہنچے اور تقی الدین کے خیمہ پر اس طرح برسے کہ اس کے تمام دلدر دور ہو جائیں۔ سلطان نے پرچہ نویس کی اس اطلاع پر فوراً ہی تقی الدین کو معاف کر دیا اور اس سے ایک پیار سے بھرا خط لکھ کر دمشق بلوایا۔

یہ تو خیر مصر کی بات تھی جو ملک شام سے ہزاروں میل دور تھا مگر سلطان کچھ اس قدر شدید بیمار ہوا تھا کہ خود سلطان کے پاس رہنے والے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان پر بیماری کا وہاں اس وقت پڑا تھا جب وہ حراں میں مقیم تھا۔ اس وقت سلطان کے ساتھ ان کا

اب العادل اور ایک بیٹا ملک العزیز عثمان موجود تھا۔ ان دو کے علاوہ سلطان زاد بھائی ناصر الدین محمد بن شیر کوہ بھی سلطان کے پاس تھا۔

شیر کوہ کے نام سے کون واقف نہیں۔ صلاح الدین کو صلاح الدین بنانے کا چچا اسد الدین شیر کوہ ہی تو تھا۔ شیر کوہ، صلاح الدین کو جو ان دنوں دمشق میں مذہبی کتب کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا اپنے ساتھ زبردستی مصر کے لئے گیا تھا اور مصر کے اس محاذ نے جس میں صلاح الدین بادل نا خواستہ وا تھا سلطان کی قسمت کے در پیچے کھول دئے۔ پہلے اس چھوٹے چھوٹے میں اپنی تلوار صاف کی اور شمشیر زنی کا سکہ بٹھایا پھر اسکندریہ کے محاذ پر اپنی جنگی حکمت عملی اور شجاعت کی بدولت اس شہنشاہ روم کے بحری بیڑے پر لگا دیا۔

نئے کا مقصد یہ ہے کہ اگر امیر اسد الدین شیر کوہ صلاح الدین کو زبردستی اٹھ مصر نہ لے جاتا تو وہ صلاح الدین تو رہتا مگر سلطان صلاح الدین نہ مروج سلطان نور الدین زنگی نے اس عظیم جنرل اور سپہ سالار کے بیٹے بن محمد کو اس کے باپ کے انتقال پر محض اور رجبہ کا علاقہ دے دیا تھا۔ ان صلاح الدین نے اپنے دور میں بھی بحال رکھا تھا بلکہ اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

یہ ناصر الدین محمد بن شیر کوہ ایسا احسان فراموش نکلا کہ جب حراں میں بار ہوئے اور ان کی بیماری نے طول کھینچا تو ناصر الدین حراں سے حلب وہاں کے امراء سے مل کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ سلطان کی وفات کے بعد اسے بادشاہ بنائے جانے کی حمایت کریں۔

ان کے ایک دوست اور وفادار امیر ناصر الدین کی باتیں سنیں تو اسے اس نے ناصر الدین کو ٹوک دیا۔

میر زادے اللہ اللہ کیجئے خدا ہمارے سلطان کو ہمارے سروں پر قیامت لڑائے۔ آپ کو ان کی زندگی ہی میں اپنی بادشاہت کی فکر پڑ گئی۔“
ناصر الدین غل ہو گیا بولا۔ ”میں ابھی کی بات نہیں کر رہا ہوں میرا مطلب خدا خواستہ سلطان۔۔۔۔۔“

اب ہو جائیے امیر زادے۔“ امیر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کو زندگی کی دعا مانگنی چاہئے۔“

شور سے شعور کی سطح تک آگیا تھا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ تین سال سے خود کو تیار کر رہا تھا۔

ناصر الدین کے اس رویے سے بعض امراء نے اسے برا بھلا کہا بعض مسکرا رہے تھے اور کچھ لوگوں نے محض اس کا دل رکھنے کے لئے اسے اپنی حمایت دلایا مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھتے کہ سلطان عالی مقام کو خدا نے شفا بخشی جس روز اس نے غسل صحت کیا وہ بقر عید کی رات تھی اسی رات ناصر الدین بادشاہی کا ارمان لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا ایسے ہی کے لئے کہا گیا ہے کہ جس اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

سلطان کو اگرچہ ناصر الدین کے ارمانوں اور ارادوں کا علم ہو گیا تھا لیکن اس نے اس کے بیٹے کے پاس حمص اور رجبہ کا علاقہ بحال رکھا اور وہ شیر لے کے نام سے سلطان کے زیر سایہ حمص کا حاکم مقرر ہوا۔

1183ء (579ھ) میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر مجوزہ حملے کا وہ واقعہ جس کے تصور سے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شام کے فرنگی فرمانرواؤں الی کرک ریجی ٹالڈ (پرنس ارطاط) مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ طبیعت اور فتنہ پرور ذہن کا مالک تھا اور ہمیشہ اس دھن میں لگا رہتا تھا کہ طرح غایت پسند مسلمانوں کو دکھ دے۔ مسلمان قاتلوں پر حملہ کرنا اور مکہ ہانے والے حاجیوں کو تنگ کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔

لیڈ کرک کا ریجی ٹالڈ شام کے سلیسوں (فرنگیوں) کو مسلمانوں کے خلاف لڑایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی مسلم دشمنی اس حد کو پہنچ گئی کہ اس نے کیا کہ وہ مردود اپنی قوت سے مسلمانوں کے خدا کا گھر یعنی خانہ کعبہ اور مکہ کے رسول کا روضہ یعنی مدینہ منورہ کو (نعوذ باللہ) پیوند خاک کر دے گا۔ اہم قوم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور ان کی آن و بان شرم و خجالت کا بار کرے۔

ریجی ٹالڈ نے اپنے اس ناپاک ارادہ کی تکمیل کے لئے ایک سال پہلے بھی کی تھی لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا پھر اگلے سال نے پھر ارادہ باندھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کے لئے حملہ و فکرم سے گزرتا تھا اور اس سمندری سفر کے لئے ریجی ٹالڈ کو بحری

”امیر محترم میرا یہ مقصد نہیں کہ خداخواستہ۔۔۔۔۔“

”امیر زادے۔“ وفادار امیر چیخ پڑا۔ ”آپ امیر کے لئے خداخواستہ کے لفظ نہ استعمال کیجئے بلکہ دعا کیجئے کہ ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ برقرار رہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ ناصر الدین عمر شیر کوہ شرمندہ ہو گیا۔ ”میری یہی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے سلطان کو ہمیشہ رکھے۔“

اب آپ نے درست فرمایا۔ امیر زادے ہمیں سلطان کی زندگی میں ان بارے میں کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونا چاہئے اور نہ افواہوں پر توجہ دینا چاہئے۔ افواہ تو آخر افواہ ہی ہوتی ہے۔ اسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ وفادار امیر خوش ہو گیا بولا۔

”اب آپ نے اس سلسلے میں حلب کے کچھ اور امیروں سے بھی گفتگو

اور ان کے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا مگر انہوں نے اسے مثبت جواب دیا۔ ناصر الدین شاید ضدی طبیعت کا انسان تھا۔ کسی طرف سے بھی تعاون وعدہ نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ حلب سے

حمص پہنچا۔ وہاں اس نے اپنے امراء سے تعاون کی اپیل کی۔ وہ اس کے تھے پھر انہوں نے بہت بے دلی سے ناصر الدین کی حمایت پر آمادگی کا اظہار

ناصر الدین نے محسوس کر لیا کہ اس کی کامیابی تقریباً ناممکن ہے لیکن اب

اس پر سلطان دمشق ہونے کا بھوت سوار ہو گیا تھا دوسرے اسے یہ بھی غلا

تھی کہ وہ امیر اسد الدین شیر کوہ کا بیٹا ہے۔ لوگ اس کے نسبى تعلق کی

اس کا ضرور ساتھ دیں گے۔ بس اس نے اپنی ٹیک دو کا سلسلہ دارا

دمشق تک پہنچایا اور وہاں کے امیروں کو خط لکھ کر ان کے تعاون کی کوشش

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سلطان پر فدائیوں کی طرف

قاتلانہ حملے ہو چکے تھے اور سلطان پھر بھی زندہ تھے جو کسی عجوبے سے

تھے۔ اس لئے کہ ظالم فدائیوں کے خنجر کبھی خطا نہ کرتے تھے مگر سلطان

الدین کے معاملہ میں قاتلوں کی تمام مہارت اکارت ہو گئی اور اس پر حملہ

والے خود ہی مقتول ہو گئے۔ خدا نے صلاح الدین کو اس لئے پیدا نہیں کیا

وہ بے دین فدائیوں کے ہاتھ سے قتل ہو یا بیماری اس کی زندگی کا

کردے۔ وہ تو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ مقصد ملا

بیڑوں کی ضرورت تھی۔ قلعہ کرک اور بحیرہ قلم کے درمیان ریگستان واقع جس پر عرب بدو قبیلے قابض تھے اور انہیں ساتھ ملائے بغیر اس کا لشکر بحر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اس دغا باز نے ایک طرف تو ایسے بنانے کا حکم دیا جن کے ٹکڑے الگ ہو سکتے تھے اور ضرورت کے وقت انہیں کر جہاز مکمل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ کرک میں بڑی خاموشی سے اس طرح کے بننے شروع ہو گئے۔ دوسری طرف ریجی ٹالڈ نے عرب بدوؤں کو رشوت دے اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ نہ صرف ریجی ٹالڈ کی فوج کو ریگستان سے گزر دیں گے بلکہ لشکر کے سامان کو کرک سے ساحل قلم تک پہنچانے میں مدد کریں گے۔

یہ دونوں کام اس قدر خاموشی سے ہوئے کہ مسلمانوں کو اس کی کانوں خبر نہ ہو سکی۔ جب جہاز تیار ہو گئے تو ریجی ٹالڈ ان جہازوں کو الگ الگ میں تقسیم کر کے خلیج عقبہ لے آیا۔ اس کام میں اسے بدوؤں کی مدد حاصل پھر اس نے افریقی ساحل کے بندر گاہ الیہ کے کچھ جہازوں سے ٹاکہ بند اور باقی جہازوں کو جوڑ کے ان پر نصرانی لشکر کو سوار کرایا اور بحر قلم کی بندر گاہ عیذاب کو تباہ کرنے روانہ کیا۔ یہ بحر قلم میں اتنی بڑی جرات مندانہ کارروائی تھی کہ چھپی نہ رہ سکی اور اس کی خبر قاہرہ تک پہنچ گئی اس حیرت انگیز خبر سے قاہرہ اور اسکندریہ والے ششدر رہ گئے۔ حیرانگی کو ہسپانوی عرب ابن جیر کے الفاظ میں سنئے۔ ابن جیر ان دنوں اس میں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

1183ء میں ریجی ٹالڈ کی مہم کے کچھ قیدی اسکندریہ لائے گئے قیدیوں کو اونٹوں پر بٹھایا گیا تھا یعنی ان کے منہ اونٹوں کی دم کی طرف انہیں رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر نصرانی حملہ سے مصریوں میں جو اضطراب پیدا ہوا تھا۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں لوگ ایک دوسرے کو ٹکڑوں میں واقعات سناتے تھے اور شدت جذبات کے جسم کاٹتے تھے۔

ایک مہری نے دوسرے کو بتایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ بلحون نصرانی ریگستان کے بدوؤں کو رشوت دے کر اس پہنچنے پر رضا مند کیا تھا کہ وہ

بحر قلم تک پہنچنے کے لئے راستہ دیدیں۔“

دوسرے نے انکشاف کیا۔ ”دراصل وہ جہاز نہیں تھے بلکہ جہازوں کے ٹکڑے تھے جنہیں بدوؤں کی مدد سے ریگستان پار کر کے بحر قلم تک لایا گیا اور وہاں انہیں جوڑ کے جہاز تیار کئے گئے۔“

تیسرے نے ایک اور خبر سنائی۔ ”میں نے تو یہ سنا ہے کہ ظالم نصرانیوں نے مسلمانوں کے سولہ جہازوں میں آگ لگا کر انہیں سمندر میں غرق کر دیا تھا۔“ وہ خاموش ہوا تو کسی اور نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”ان کافروں نے جدہ کی قریب حاجیوں کا ایک جہاز بھی پکڑ لیا تھا۔ وہ عیراب (بندر گاہ) پر بھی لے گئے اور جدہ سے آنے والے ایک مسلمان قافلہ کو گرفتار کر کے ان کا قتل کر دیا تھا۔ انہوں نے یمن سے آنے والے ان دو جہازوں پر بھی قبضہ کر لیا جو مکہ کے لئے سامان لا رہے تھے۔“

اور آخر میں ایک بوڑھے مصری نے سرو آہ کھینچ کے کہا۔ ”دراصل نصرانی ٹاکہ اس وجہ سے ملک عرب گیا تھا کہ مدینہ منورہ کو لوٹنے اور تاراج کرے پھر رسول سے حضور پاک کے جسم اطہر کو باہر نکالے۔“

پھر اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولا۔ ”کیا اس سے پہلے کسی نے ایسی بات ناک خبر سنی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے امیر البحر لولو کو وقت پر ڈکڑا اور اس کے تیز رفتار جہازوں نے کافروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔“

یہ تو ابن جیر کا تجزیہ ہے۔ تاریخ میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ریجی ٹالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر فوج کشی کا مقصد اس لئے کیا تھا کہ مدینہ منورہ میں روضہ رسول منہدم کر کے حضور کے جسم اطہر کی بے حرمتی سے اور خانہ کعبہ کو زمین دوز کر دے۔ اس کے لئے اس نے ایسے جہاز تیار کرائے جن کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو وہ کرک سے خلیج عقبہ لے کر وہاں اس نے ٹکڑوں کے بحری بیڑہ تیار کیا اور عیراب کو لوٹنے چلا۔ اس جہازوں کے ذریعہ الیہ کا آبی راستہ بھی بند کر دیا۔

اس کی اطلاع جب مسلمانوں کو پہنچی تو ان کا بحری بیڑہ فوراً حرکت میں آیا اس بیڑے کا امیر البحر لولو تھا۔ امیر البحر لولو پہلے الیہ کا بحری راستہ کھولا پھر اپنے بیڑے کو ”المحور“ تک لے گیا جو بحر قلم کی ایک چھوٹی بندرگاہ تھی۔ اس نے مسلمانوں کے بحری بیڑے کو آتے دیکھا تو جہازوں سے اتر کر پہاڑوں

کی طرف بھاگے اور پہاڑوں اور جھاڑیوں میں جا چھپے۔

مسلمان بھی ساحل پر پہنچ کے جہازوں سے اترے۔ لولو نے بددوں گھوڑے خریدنے کا حکم دیا۔ گھوڑے جمع ہو تو لولو نے فوجیوں کو گھوڑوں پر کرایا اور دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ نصرانی عاروں اور باغوں میں ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ایک ایک ڈھونڈ نکالا۔ ان میں بیشتر کو قتل کر دیا۔ اسکندریہ بھیج دئے گئے۔ یہ وہی قیدی تھے جنہیں ابن حبیر نے اسکندریہ دیکھا تھا۔ نصرانی بادشاہ یعنی فرمانروائے کرک اس دارو گیر میں اپنی جان بچا کر گیا۔

ربیعی ثالث فرمانروائے کرک کو اپنی جہازت کی کافی سزا مل گئی تھی یہ واقعہ ایسا نہ تھا جسے سلطان صلاح الدین نظر انداز کر دیتا۔ سلطان نے فیصلہ دیا کہ نصرانیوں کو اس بیباکی کی ضرورت سزا دے گا۔ اس نے حلب کے قیام دوران فوجیوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اسے ان کی بد ضرورت پر گہنی اور انہیں واپس بلا لیا گیا۔ اس کے علاوہ سلطان نے اپنے ز تمام علاقوں کے حاکموں کو فوج لے کر دمشق پہنچنے کا حکم دیا۔

پھر آغا سراما میں سلطان اپنا لشکر لے کر ریگستان کے راستے جنوب کی روانہ ہوا۔ اسلامی لشکر نے فوار سے گزر کر دریائے اردن عبور کیا اور کے زرخیز علاقہ کو تاراج کرتا ہوا بیسان میں داخل ہوا۔ بیسان والے اسلاف کی خبر سن کر پہلے ہی شہر چھوڑ بھاگ گئے تھے۔ وہاں سے سلطان وادی پہنچا پھر کلبوا کے دامن میں بیرجالت کے قریب خیمہ زن ہوا۔ اس علاقہ سلطان کے ایک گشتی دستہ سے فرنگس (نصرانی) کی اس فوجی جماعت سے ہو گئی جو کرک سے صفوریہ کی مرکزی فوج کے پاس جا رہی تھی۔ مسلمان فرنگس کو شکست دی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کا صرف ایک سوار شہید ہوا۔ اس شکست کی خبر جب گائی لیکن کو جو بالڈون کی بیماری کے زمانہ میں سنبھالے ہوئے تھا پہنچی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ مسلمانوں کے لئے چلا۔ اس نے نصارت کی پہاڑیاں پار کیں اور ایسڈران کے مقام پر آیا۔ پھر وہ الفولا کی طرف بڑھا جہاں سلطان صلاح الدین کے لشکر سے مقابلہ ہوا۔

آرچ کا بیان ہے کہ۔

بڑے پوڑھوں کا کہنا ہے کہ فلسطین میں اس سے زیادہ صلیبی کبھی جمع نہ تھے۔ ایک ہزار تین سو نائش اور پندرہ ہزار سے زیادہ مسلح سپاہی تھے۔ ہارپ کے بڑے بڑے حکمران بھی شامل تھے۔ ہنری ہیوین کا ڈیوک، رالف، اس کے علاوہ شام کے بڑے بڑے مسیحی رئیس گائی، ربیعی ثالث، عیسیٰ کا بالیاں، میداکا، قباریہ کا والٹر اور کورنٹی جو سلیم وغیرہ تھے۔ نصرانیوں کی اس تیاری کے پیش نظر سلطان صلاح الدین بھی عین جالوت والا (الغولہ) پہنچا۔ اس مقام پر سلطان کے پانچ سو سواروں نے جو ہراول میں شامل تھے نصرانی لشکر میں طوفان برپا کر دیا۔ ایک دستہ دشمن کے پورے ہر جاتا ہی ایک حیرت انگیز بات تھی۔ ظاہر ہے نصرانی لشکر کے مقابلہ سوار صرف داد شجاعت ہی دے سکتے تھے۔ انہوں نے کمال شجاعت کا اظہار دشمن کی نیزہ بردار صفوں میں نہ گھس سکے۔ آخر دونوں لشکروں نے دوسرے کے بمقابلہ تو بایا اور جالوت پر اپنے لشکر اتارے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر تھے۔

دونوں لشکر پانچ دن تک ایک ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے۔ صفوریہ سے لایہ نصرانی لشکر بڑے طہرات سے آیا تھا اور خیال تھا کہ وہ آتے ہی لشکر پر حملہ آور ہوگا لیکن پتہ نہیں وہ آپس میں کیا کچھڑی پکاتے رہے۔ اس وقت سے پورا فائدہ اٹھایا اور سطح مرتفع پر قبضہ کر لیا۔ پھر سلطان ان کے گرد لشکر پھیلا کر اس کے خزاں کا راستہ بند کر دیا۔ اس دوران سوار ویش اور لبارڈی سے آنے والوں نے نصرانی لشکر میں اضافہ کر دیا یہ سوار اپنے جہاز کو چھوڑ کر صلیبی جنگوں میں شرکت کے لئے وہاں پہنچ گئے۔

لشکر کی اس کثرت کے باوجود نصرانی دیکے بیٹھے رہے۔ سلطان نے انہیں میں ٹکالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن نصرانی مقابلہ پر نہ ٹکے۔ رسد کا نہ ہوجانے سے نصرانی لشکر میں قطع سا پیدا ہو گیا۔ مدد کو آنے والے ان مانے اور زیادہ مصیبت کھڑی کر دی۔ یہ سوار گر پر جوش تو تھے لیکن نہ تیار باندھنے کی عادت تھی اور نہ وہ تکلیف برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بہت کم کامرے سے تھک گئے۔ غذائی صورت حال نے انہیں اور زیادہ کمزور کر دیا۔

اٹھ کر دمشق واپس جانا پڑتا۔

فلج سعدی نے کسی جگہ ایک شعر میں کہا ہے کہ ایک مرتبہ دمشق میں ایسا بارش ہوا کہ لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے۔ جنگ کے زمانہ میں بھی کچھ اس طرح بیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ سسے سسے اور ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔ سلطان الدین کی زندگی کا یہ دور ایک مسلسل جنگ کا دور تھا اور لوگوں کو سوائے یاروں کے عشق عاشقی یا شادی بیاہ کا خیال ہی نہ آتا تھا لیکن نصرانیوں کی حالات اس کے برعکس تھے۔

پہلی کرک پر پانچویں بار فوج کشی کے دوران کرک میں ایک عظیم شادی کا منایا جا رہا تھا۔ شاہ یروثلیم کی سوتیلی بہن شہزادی ازایلا کی شادی ہنرے سے ٹورن چہارم کے ساتھ ہو رہی تھی۔ پورے شہر میں چراغاں تھا اور خوشیاں جاری تھیں۔ لوگ رنگ رلیوں میں مشغول تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اور شہر کرک والوں کو جنگ یا محاصرہ کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس دور میں قلعہ شراک الگ ہوتے تھے اور دونوں کے گرد سکی فصیلیں ہوتی تھیں۔

سلطان لشکر لے کے پہنچا تو اس نے شہر میں جشن بھاراں محسوس کیا۔ شہر لہ کی برجیاں جگمگا رہی تھیں۔ فصیلوں پر بھی چراغاں تھا اور موسیقی کی تانیں میں بکھری ہوئی تھیں۔ سلطان کو ان کی اس جرات پر بڑا غصہ آیا۔ اس راہ حملہ کا حکم دیدیا۔ مسلمان لشکر بھوکے شیروں کی طرح دشمن پر جھپٹا۔ نصرانیوں کی پہلی دفاعی لائن یعنی شہر کی فصیل سے تیروں کی بارش شروع کر مسلمان یلغار کرتے ہوئے فصیل کے دروازے تک پہنچے اور اتنا شدید بارش صدر دروازہ ٹوٹ گیا اور مسلمان لشکر شہر میں گھس گئے۔

اس طرح سلطان کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ حاکم کرک ریجی ٹالڈ اور دولھا دولہن اتیوں اور بچے بچے فوجیوں کے قلعہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں انہوں نے دوام و حاکم سے شادی کا جشن منانا شروع کیا۔ اس طرح ان کی رنگ رلیوں کی فرق نہ آیا۔ سلطان کے لئے قلعہ پہلے کی طرح ناقابل تسخیر نظر آ رہا تھا۔ وقت قلعہ کا دروازہ کھلا اور سفید پرچم بلند کئے سوار باہر نکلتا شروع کر سواروں کے پیچھے غلاموں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے سروں پر سامان لٹا ہوا تھا۔

جنگی دستہ کے مطابق آنے والوں کا استقبال کیا گیا۔ سفید پرچم امن اور

اکتوبر کا مہینہ آگیا تھا اور برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ واقعہ یہ کہ یہ بحرہوم کی آب و ہوا کا علاقہ تھا اور اس آب و ہوا کی یہ خاصیت کہ بارش موسم سرما میں ہوتی ہے۔ سلطان جنگ کا فیصلہ بارش سے پہلے ہی لیکن دشمن کسی صورت میں میدان میں آنے پر تیار نہ تھا۔ کتنے ہی دن نہایت صاف ہو اور ارادہ میں خلوص ہو تو جنگ کے موقعوں پر اکثر تاخیر حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو تاخیر غیبی کا پہلے بھی تجربہ ہو چکا تھا۔

پس ایسا ہوا کہ نصرانی لشکر میں شامل ہونے والوں نے قحط اور محاصرہ گھبرا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ سلطان نے انہیں باہر نکالنے کے لئے ایک راستہ کھول دیا تھا۔ جب بھگدڑ مچی تو کیا سوچا اور کیا لشکر سب بھاگ گئے۔ دوسری طرف مسلمان اس راستہ کو دور تک گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان کے تیر اندازوں نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب کیا۔ نصرانی بھاگتے رہے تیر ان پر برستے رہے۔ اس طرح یہ بھگدڑ بڑے شرمندہ اور جھل ہو کر واپس آئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے ایک ہفتہ پہلے وہ بڑی شان سے باندھ کر مسلمانوں کو تباہ کرنے روانہ ہوئے تھے۔

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے کرک کا رخ کیا۔ ریجی حاکم کرک مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ فریبی اور دغا باز بھی تھا۔ کرک کو تباہ کر کے اس مسلم دشمن کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ایک روایت کے کرک پر حملہ کے وقت سلطان کے ساتھ مصری فوج بھی تھی جس کی کمان کا بھائی ملک العادل کے ہاتھ میں تھی۔ یہ قلعہ کرک کی فصیل بہت مضبوط اس کے گرد ایک گہری فصیل بھی تھی۔ سلطان نے سات مہینوں سے قلعہ کی سنگباری شروع کرانی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی دوران جاسوسوں نے اطلاع دشمن کے لئے فوجی کمک آ رہی ہے۔ چنانچہ سلطان محاصرہ اٹھا کر دمشق ہو گیا۔

چند ماہ بعد سلطان نے کرک پر دوبارہ فوج کشی کی۔ سلطان کا مرزا برہم تھا۔ جب تک کرک پر قبضہ نہ ہوتا سلطان کو چین نہیں آ سکتا تھا۔ طرح کرک کے خلاف چار مرتبہ فوج کشی کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ بار ناکام ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ عزم کے ساتھ حملہ کرنا لیکن کسی مہینوں کی سنگ باری کا کوئی اثر نہ ہوتا اور سلطان کو کسی نہ کسی

یا کے ساتھ اگر شاہی خاندان کی شادی کے جشن میں شرکت فرمائیں تو ان کی نوازش ہوگی۔

شاہی خاندان کے کس فرد کی شادی ہو رہی ہے اسے ناظم وفد؟“ سلطان نے استفسار کیا۔

”مالی مقام سلطان۔“ ناظم نے جواب دیا۔ ”شاہ ایمالوک کی سوتیلی بہن ازابیلا کی شادی ہفرے آف ٹورون چارم کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہ اور جشن اسی سلسلے میں منعقد ہوا ہے۔“

سلطان نے بڑی متانت سے کہا۔ ”افسوس کہ ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں ورنہ شاہی جوڑے کے شایان شان تحائف بھیجے جاتے پھر بھی ہماری سے حاکم قلعہ کا شکریہ ادا کیا جائے۔ میاں شاہی جوڑے کی ضیافت کا تو نہیں کیا جاسکتا پھر بھی تمام پارٹیوں کا آج رات کا کھانا ہماری خیمہ گاہ بچھا جائے گا۔ ہمیں یہ اندازہ نہیں اور ہم ناظم سے اس بارے میں سوال نہیں کریں گے کہ شادی میں کتنے باراتی شریک ہو رہے ہیں۔ بس ہم اپنے کے تحت دس ہزار اشخاص کا کھانا روانہ کریں گے جسے قلعہ کے کسی بھی اے پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

”میں اپنے آقا اور شاہی جوڑے کی طرف سلطان کے اس پر خلوص عنایت پر ادا کرتا ہوں۔“ قائد امن سلطان کے رعب سے تھرا گیا تھا اور اس کی شکل سے نکل رہی تھی۔ ”میں اپنے آقا تک سلطان کا پیغام پہنچا دوں گا۔“ اسے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ میرے آقا کو پہلے سے یہ علم تھا کہ اس شادی میں شرکت نہیں فرمائیں گے اس لئے میرے آقا نے آپ کے لئے کھانا اور بیش قیمت شراب کی ایک ہزار بوتلیں میرے ساتھ بھیجی امید ہے کہ سلطان اسے قبول کرتے ہوئے شکریہ کا موقعہ عطا کریں گے۔“

سلطان اس پیش کش پر ذرا دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کھانا قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن جہاں تک شراب کا سوال ہے تو حاکم قلعہ کو معلوم ہونا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے بلکہ اسے ام (بدائیوں کی ماں) کہا گیا ہے۔ ہم اسے قبول کرنے سے قطعی معذور ہیں۔“

”نہ اسے اپنے ساتھ واپس لے جاسکتے ہیں۔“

فرمانوں میں شراب کا استعمال لوازمات زندگی کا ایک عام جز ہے۔ قائد وفد

صلح کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے بڑی خوشدلی سے انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ قائد رجی نالڈ کا نائب تھا۔ سلطان کی طرف سے ملک العادل نے اس کا استقبال کیا۔ رجی نالڈ کا نائب گھوڑے سے نیچے اترتا۔ ملک العادل نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔

”میں سلطان دمشق کی طرف سے امن کے وفد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“ ملک العادل نے وفد کے قائد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”وفد کے قائد نے مسکرا کے پوچھا۔“ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں کون مسلم سردار سے مخاطب ہوں؟

”میں سلطان معظم کا بھائی ملک العادل ہوں اور آپ کا کیا نام ہے؟“ ملک العادل نے اپنا تعارف کرایا اور اس سے متعارف ہونے کی کوشش کی۔

”میں فرمانروائے کرک کا نائب ہوں اور سلطان کو شہزادی ازابیلا اور ہفرے آف ٹورون چارم کی شادی میں شرکت کی استدعا لے کر حاضر ہوا ہوں۔“ نائب نے متانت سے جواب دیا۔

”ملک العادل نے کہا۔“ میں آپ کو سلطان کے حضور پیش کئے رہا ہوں آپ ان سے گفتگو کر لیجئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ نائب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور ہاں میں فرمانروائے کرک کی طرف سے مسلم سرداروں کے لئے کھانے اور شراب کا تحفہ لے کر آ ہوں۔ اسے قبول کیا جائے۔“

”یہ بات بھی آپ سلطان سے عرض کیجئے گا۔“ اور ملک العادل اسے لے کر چلا۔

سلطان کو پہلے اطلاع مل چکی تھی کہ قلعہ سے امن کا وفد آ رہا ہے۔ سلطان اپنے خیمہ میں بیٹھا تھا جب فرمانروائے کرک کا نائب سلطان کا بھائی ملک العادل اس کے حضور پہنچے۔ ملک العادل نے ناظم وفد کا تعارف کرایا۔ ”سلطان معظم حاکم کرک کے نائب حضور سلطانی میں حاضر ہیں اور کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔“

”اجازت ہے۔“ سلطان نے شاہانہ انداز میں جواب دیا۔ ناظم وفد نے عرض کیا۔ ”اے سلطان دمشق میرے آقا پرنس اربانڈ نالڈ نے آپ کو دوستی کا پیغام دیا ہے اور التماس کیا ہے کہ سلطان دمشق

متفق تھے کہ اس وقت جنگ وجدل کا موقعہ نہیں اس لئے فی الحال صلح کر لی جائے اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے لیکن جنگجو ہاپلس میں اس رائے سے متفق نہ تھے مگر صلح پسندوں کا پلہ بھاری دن کے دلی کا مشورہ سے سلطان کے ساتھ آئندہ چار سال کے لئے

آف طرابلس کا یہ معاہدہ مدافغانہ اور جارہانہ تھا۔ سلطان صلاح الدین تخت و تاج حاصل کرنے کی کوششوں میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے صلہ میں قید تمام مسلمانوں کو رہا کر دیا۔ اس کے علاوہ دمشق دوران اس نے بڑی فراخ دل سے غلہ بھیجا تھا پھر بھی اس دوستی کی غلوں بہت کم تھا۔ اس لئے کہ یہ تو ان دو صلح سپاہیوں کی نیند کی عالم خواب میں جنگی بگل سن کر چونک پڑتے ہیں اور ایسی صلح لحوں و ریخت سے دوچار ہو جاتی ہے۔

طرف صلیبی جنگوں کے خواہاں پورے دول یورپ میں جنگی جنوں پیدا ہل ہڑکانے میں مصروف تھے۔ نصرانی بطریق ہر کلیس فوجی بھرتی کے کے ملکوں ملکوں میں مگھوم رہا تھا جبکہ انگریز فائنس کوہ شیوٹیس تے کوہ ملیس بلند کئے کھڑے تھے۔ یہ دونوں گروہ مسلمانوں کے خلاف نے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ اگرچہ کسی جگہ بھی صلیبی جنگ نہ لیکن ان تیاریوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ آئندہ جلد ہی صلیبی جنگ کی ٹپے گی۔

صلاح الدین خود بھی اس صلح کو قطعی عارضی سمجھتا تھا۔ اسے یورپ مل رہی تھی کہ عیسائی بطریق لوگوں میں جنگی جنونی پیدا کر کے انہیں (صلیبی جنگ) کے لئے فوجی بھرتی کی کوشش کر رہا ہے اور انگریز پورے یورپ میں ملیس اٹھا رکھی ہیں۔ ان اطلاعات کے باوجود سلطنت کے حالات درست کرنے میں لگ گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین کو اپنا دارالسلطنت مقرر کیا تھا اور اس شر اور اس کے قلعہ کو مضبوط تر بنا رہا تھا۔

نائب تاریخ میں ایک اہم شر تھا۔ اس شر کو مشرق کی تمام ریاستوں ام ہونے کا فخر حاصل رہا اور تمام قوموں کا اتصال کا مرکزی مقام بھی

کو سلطان کے اس انکار پر تعجب سا ہوا۔ مگر وہ خاموش رہا اور واپس جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

سلطان نے اس سے دریافت کیا۔ ”شادی کی محفل قلعہ کے کس حصہ میں منعقد ہو رہی ہے۔ تم جانتے ہو کہ جنگ کا زمانہ ہے ہم نہیں چاہتے کہ لاطلی میں کوئی ایسی بات ہو جائے جس سے باراتیوں اور شاہی جوڑے کو کوئی نقصان پہنچے۔“

دند کا ناظم سلطان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ ”میں سلطان کا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں کہ انہیں ہمارے مہمانوں کا اس قدر خیال ہے۔ سلطان کی اس اطلاع کے لئے میں عرض کروں گا کہ شادی کی محفل صدر دروازے کے مشرق کی جانب ایک بڑے حال میں منعقد ہوگی۔ اس حصہ کی شناخت یہ ہے کہ اس کے اوپر قلعہ کے دو بڑے برجوں میں سے دائیں جانب کا برج واقع ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم سمجھ گئے۔“ سلطان نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ کتے ہیں کہ شاہی جوڑے کی شادی کے سلسلہ میں ایک ہفتہ تک قلعہ میں جشن منایا گیا۔ مگر مشرقی برج کی طرف نہ تو منہنق سے کوئی پتھر پھینکا گیا اور نہ تیر اندازوں نے فسیل کے اس حصہ کو نشانہ بنایا۔ سلطان نے اس کے لئے خن تاکید کی تھی۔ اس تمام علاقہ میں جنگ جاری رہی اور تو منہنقیتیں سوائے مخصوص حصہ کے باقی قلعہ پر سنگ باری کرتی رہیں۔ اس سنگ بادی نے فسیل میں شکاف ڈال دیا۔ لیکن نصرانیوں اے اس قدر مدافعت کی کہ سلطانی لشکر فسیل کے اس شکاف سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔

فسیل کے گرد گمری خندق کو بھی بڑی حد تک پاٹ دیا گیا مگر پھر بھی اسلامی لشکر کے سپاہی فسیل تک نہ پہنچ سکے کیونکہ فسیل سے اس قدر تیر برس رہے تھے کہ خندق پار کرنے والا لقمہ اجل بن جاتا تھا۔ اس اثناء میں قلعہ والوں کے قاصد شاہ یروشلم بالڈون تک پہنچ گئے اور اس نے فوراً ”مدد کے لئے ایک بھاری لشکر روانہ کر دیا۔ سلطان کو تاخیر پسند نہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ یروشلم سے امدادی لشکر روانہ ہو چکا ہے تو وہ محاصرہ اٹھا کر دمشق واپس آ گیا۔

اس دوران شاہ ایمارک بالڈون کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے کسن بیٹے بالڈون دوم کو بادشاہ بنایا گیا تھا اور ریمنڈ آف تریپولس (طرابلس) کو اس کا ولی مقرر کیا گیا تھا۔ ریمنڈ اور لو لگنن ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے مگر دونوں

سلطان جو کان بازی اور گھوڑے دوڑانے اس میں جاتے ہیں۔ ہر شام تیر کی مشق کرنے، چوگان اور گھڑ سواری کے لئے شہزادے بھی یہاں آتے

ابن جبر لکھتا ہے کہ سلطان اپنی رعایا کے حقیر ترین مزدور کی طرح محنت و کرتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ہفتہ میں دو دن ایوان عام میں بیٹھتا اور کی شکایات سنتا اور انہیں فوری انصاف مہیا کرتا تھا۔ اس کا بہت سا وقت ان کے پڑھنے جواب دینے میں گزرتا تھا۔ اگرچہ قاضی فاضل، عماد الدین اور الدین سلطان کے مستعد اور بے مثال مشیر اور ناظم تھے لیکن مراسلہ نگاری خود خاص حصہ لیتا تھا۔

صلاح الدین نے شجاعت و بصیرت اور عدل و انصاف کا نظام اپنے آقا نور الدین زنگی سے سیکھا تھا لیکن باوجود اس قدر منصف اور عادل ہونے عدل کے معاملات میں اپنے آقا کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا تھا۔ مرحوم سلطان الدین زنگی کے عدل کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے اور اس واقعہ کو صلاح الدین نے خود اپنے امیروں کی اصلاح کے لئے ان کے سامنے کئی ان کیا تھا۔ وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے۔

سلطان نور الدین زنگی نے جب دمشق کو دارالسلطنت بنایا تو اس کے امراء بھی وہیں اپنے محلات تعمیر کرائے تھے اور املاک اور جائدادیں حاصل کی۔ یہ امراء پڑوسی زمینداروں پر ظلم و زیادتی کرتے تھے اور یہ شکایتیں سلطان قاضی کمال الدین کے پاس پہنچی تھیں۔ قاضی کمال الدین بہت سخت قاضی نہ کسی امیر کی پرواہ نہ کرتے تھے اور روز ایک نہ ایک امیر ان کے ہاتھ لڑا پاکر سلطان نور الدین کے پاس قاضی کی شکایت لے کر جاتا تھا۔

سلطان نور الدین زنگی کے پاس قاضی کمال الدین کی صمدی شکایتیں پہنچ چکی لیکن سلطان نے ان شکایتوں پر کوئی کارروائی نہ کی تھی حالانکہ قاضی کمال دروازہ دربار سلطانی میں کسی نہ کسی مشورے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ کمال الدین کو بھی یہ علم تھا کہ سلطان کے امراء نے ان کی شکایتیں کی اور وہ تیار ہو کر جاتے تھے کہ سلطان ان سے کسی مقدمہ کے بارے میں طلب کریں تو وہ تفصیلی جواب پیش کریں مگر سلطان نور الدین کو اپنے اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے امراء کی کسی بات پر کان نہیں دھریے

یہی دمشق تھا۔ مصر، ایران اور بھارت جانے والا سامان اسی شہر کی منزلیں ہو کر گزرتا تھا۔ زمانہ قدیم سے سوداگروں کے قافلے دریائے فرات کے پاس اور حلب کے راستے اپنے بیش قیمت سامان کی گانٹھیں بحروم کی بندرگاہ اور مصو عرب کو لے جاتے تھے۔ اس طرح بدوؤں کے خانہ بدوش قبیلے مویشیوں کو موسم بہار اور موسم سرما میں دمشق لانے اور عرب دریائے فرات درمیانی علاقوں میں کنوؤں کے سلسلے کے ساتھ ساتھ گھوما کرتے۔

دمشق کی خوشحالی اس کے محل وقوع اور قدرتی برتری کی وجہ سے دمشق کو یونانی "حسین ترین" اور عربوں میں یہ شہر "عروس مشرق" اور "جہاں" کے نام سے مشہور تھا۔ سلطان صلاح الدین کے دور حکومت میں دمشق میں رنگ و نسل کے لوگ آباد تھے۔ شہر مختلف محلوں میں تقسیم تھا ہر کے گرد چار دیواری ہوتی تھی جس کے دروازے رات ہوتے ہی بند کر دیتے تھے۔ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں سائے دار درخت تھے جن کا مکان کے اندر کے منقش کمروں کی دیواروں پر لہرایا کرتا تھا۔ اسی شہر دمشق وہ مسجد امیہ ہے جس کے صحن میں کھڑے ہو کر والی شام حضرت امیر معاویہ حضرت عثمان غنی کا خون آلود کرتا کانپتے اور لرزتے ہاتھوں سے لوگوں کو دم اور اس مسجد کے منبر پر زوجہ عثمان نائیلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں سجائی گئی تھیں سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور حکومت میں ہسپانوی عرب ابن جبر آیا تھا تو دمشق کی بعض عجیب و غریب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ مسجد امیہ میں ایک دیوار گھڑی تھی جس میں پیتل کے عقاب گھٹتے تھے۔ ہر گھنٹہ کے بعد پیتل کا ایک دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ رات کے وقت روشنی کے وقت ظاہر کیا جاتا تھا جس کا گھٹے ہوئے پانی سے اندازہ کیا جا اس نے شہر کے بیس جامعہ (کالج) خیراتی شفاخانوں اور خانقاہوں کا بھی تفصیل کیا ہے۔

ابن جبر لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین، قلعہ میں رہتا ہے۔ قلعہ جدید حصہ میں بالکل الگ بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے اندر ہی سلطان کی مسجد قلعہ کے نزدیک شہر ہے۔ باہر مغرب کی طرف وہ میدان ہیں جو اپنی سرتر خوبصورتی میں ریشمی زربقت کے تھان معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں میدان درمیان ندی بہتی ہے۔ میدان کے برابر حور کے درختوں کا ایک چھوٹا سا

اور قاضی بے خوف و خطر انصاف کے تقاضے پورے کرتے رہے۔

ایک دن سلطان نورالدین نے قاضی کمال الدین سے بریکیل تذکرہ دریافت کیا۔ ”کسے قاضی کمال آپ کو انصاف کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں۔“

”الحمد للہ مجھے کوئی پریشانی نہیں۔“ قاضی نے جواب دیا۔ ”عالی جاہ نے اس قدر اختیارات عطا کر دیے ہیں کہ مجھے انصاف کرتے وقت شرعی تقاضے پورے کرنے میں کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے امراء اور وزراء نے کمزور اور زیردستوں پریشان کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ سلطان نے بڑی مسرت سے کہا۔

”سلطان معظم اس سلسلہ میں کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا۔“ قاضی۔

ادب سے جواب دیا۔ ”جہاں تک ان شکایات کا تعلق ہے جو میری عدالت میں پیش ہوتی ہیں۔ ان کے لئے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مظلوموں کو انصاف مل رہا ہے اور زیادتی کرنے والے کو شرعی سزا دیدی جاتی ہے لیکن دوسری زیادتیوں اور ناانصافیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ جا سکتا۔“

سلطان نورالدین نے چونک کے قاضی کو دیکھا۔ ”قاضی کیا تمہارا مطلب ہے کہ زیادتیوں اور ناانصافیوں کے کچھ ایسے معاملات اور مقدمات ہوتے ہیں جنہیں تمہارے علم میں نہیں لائے جاتے۔“

”جی عالی جاہ۔ ایسے صدہا مقدمات ہیں جو میری عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔“ قاضی کمال الدین نے بے خوف کہہ دیا۔

سلطان نورالدین زنگی کا چہرہ منتظر ہو گیا۔ انہوں نے دریافت کیا۔ ”قاضی کمال اس کی جواب طلبی تو روز قیامت مجھ سے ہوگی۔“

”ہرگز نہیں عالیجاہ۔“ قاضی کمال الدین نے سلطان کے اطمینان کے لئے کہا۔ ”جو زیادتی اور انصافی آپ کے علم میں نہ آئے یا میری عدالت نہ پہنچے آپ سے اس کی پوچھ گچھ کیوں ہوگی۔“

”مگر قاضی کمال اللہ تعالیٰ نے مجھے رعایا کا محافظ بنایا ہے اگر کسی پر زیادتی ہوتی ہے تو مجھے اس کا ازالہ کرنا چاہئے ورنہ میں گناہگار رہوں گا۔“ سلطان نے جرح کا رخ اختیار کیا۔

”سلطان عالی مقام۔“ قاضی کمال نے سنبھل کے کہا۔ ”عالم الغیب صرف خدا کی ذات واحد ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس پر ظلم کر رہا ہے۔ بندہ تو :

عالم نہیں کر سکتا کہ کس نے کس پر کتنا ظلم کیا۔ وہ تو صرف یہی جانتا ہے کہ زیادتی ہوتی ہے اور ہو رہی ہے۔“

”کیا تم کہہ رہے ہو قاضی کمال۔“ سلطان نورالدین کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”کیا تم بتا چاہتے ہو کہ میرے امراء عوام کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کو روکنے کی بات نہیں؟“

”عالیجاہ میری تقصیر معاف فرمائی جائے۔“ قاضی کمال الدین نے سلطان کا نام کرنے کے لئے فوراً کہا۔ ”قاضی شہر ہونے کی وجہ سے یہ بات میرے اہل داخل ہے کہ میں عوام کے دکھ درد سے واقف اور باخبر رہنے کی کوشش میں اپنی اطلاعات کی بنا پر یہ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ کے ایک امیر سے عوام کو بہت سی شکایتیں ہیں مگر وہ اپنی شکایات میرے لئے کی ہمت نہیں کرتے۔“

”میں اس کا سبب کیا ہے۔ کیا تم انہیں انصاف نہیں دے سکتے؟“ سلطان زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

”سلطان معظم۔“ قاضی نے جواب دیا۔ ”دراصل آپ کے امیر کا اس قدر درد ہے کہ عوام کو یقین ہی نہیں آتا کہ انہیں میری عدالت سے مل سکے گا۔“

”قاضی کمال۔“ سلطان نورالدین تخت شاہی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ ”یہ انصاف کی توہین ہے۔ احکامات شرعیہ میں دخل ہے کہ امیر نے اس گستاخی کی جرات کی ہے؟“

”عالیجاہ۔“ قاضی کمال الدین نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ”خدا مجھے غیبت کے معاف فرمائے۔ حالانکہ کسی کے ظلم کی تشہیر کرنا ”غیبت“ نہیں ہے۔“

”کیا ہے امیر الامراء اسد الدین شیرکوہ کے حواری اور ملازمین غریب عوام پر زیادتی کرتے ہیں مگر مظلوم اس خوف سے شکایت نہیں کرتے کہ ان کی عدالت میں کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ میں اس سلسلہ میں قطعی مجبور ہوں اس کے شکایت میری عدالت میں پیش کی جائے تو میں بے خوف و خطر ظالم کے ظلم ثابت ہونے پر بے خوف و خطر سزا دوں گا۔ مگر یہ میری مجبوری ہے کہ میں اس افواہ کو حضور عالی کے گوش گزار کروں۔“

اسد الدین شیرکوہ سلطان صلاح الدین کا چچا تھا۔ اس نے ہی صلاح

ل کے قیام کے اعلان سے گونج رہے تھے اسی وقت امیرالامراء اسدالدین اپنے حواریوں اور طفیلی اہلکاروں پر برس رہا تھا۔

”تمہاری زیادتیوں بدعنوانیوں اور چہرہ دستیوں نے یہ وقت دکھایا ہے کہ اب معظم بذات خود تمہارے خلاف عوام کی شکایت سنیں گے اور تمہیں کیفر تک پہنچائیں گے۔ آخر تمہارا ظلم عوام کہاں تک برداشت کریں۔ وہ اب عوام کو میرا لحاظ رہا اور انہوں نے قاضی شہر کے انصاف کو آواز نہیں دی قاضی کمال الدین ہی تمہارے دماغ درست کر دیتا۔ یقین کرو کہ اگر تمہارا قاضی کمال الدین کی عدالت میں پیش ہوتا تو میں بخدا اس کی عدالت میں سفارش کو ہرگز نہ جاتا۔ میں قاضی کمال الدین کی طبیعت سے واقف تم لوگ کیا چیز ہو اگر قاضی کو میری کوئی کمزوری مل جائے تو وہ مجھے بھی پڑھانے سے دریغ نہیں کرے گا۔“

اسدالدین کے طفیلی اراکین تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے واقعی زیادتیاں نہیں عوام نے اس خیال سے قاضی کی عدالت میں مقدمات درج نہیں کیے تھے کہ ان کے خیال میں قاضی شہر امیرالامراء کے جلال سے مرعوب ہو کر انصاف نہ کرتے اس لئے وہ گھٹ گھٹ رہ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اب خود مقدمہ سنے گا اس لئے کسی رو رعایت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ”امیرالامراء بہادر۔“ ایک طفیلی افسر نے کہا۔ ”خدا کے لئے ہمیں اس بار نہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کریں گے۔“

”میں۔۔ میں تمہیں بچالوں۔“ شیرکوہ غصہ سے بولا۔ ”تمہارا مقصد ہے کہ سلطان معظم سے یہ سفارش کروں کہ میرے ماتحت اب تک عوام کے ساتھ اوستم کرتے رہے ہیں ان سے درگزر کیا جائے۔ اے عقل کے دشمنو بھلا سلطان سے یہ سفارش کر سکتا ہوں جاؤ اور اپنے کئے کی سزا بھگتو۔“

شیرکوہ کے ماتحت روتے ہوئے شیرکوہ کے قدموں پر گر پڑے۔ انہیں اپنی صاف نظر آ رہی تھی۔ ”امیرالامراء ہمیں بچالیتے صرف اس دفعہ آئندہ کے ان کو توبہ کرتے ہیں۔“

شیرکوہ جتنا بہادر اور جلالی طبیعت کا مالک تھا اتنا ہی نرم دل بھی تھا۔ وہ کمصیبت میں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ آخر اس کا دل تھک گیا اور بولا۔۔۔۔۔

تمہاری بخت کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ

الدین کو صلاح الدین بنایا تھا۔ صلاح الدین اپنے بچپن میں نہایت مذہبی سا لڑکا تھا اور عام طور پر جامعہ امیہ (جامعہ مسجد دمشق) میں درس و تدریس کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ پھر جب شیرکوہ مصر پر حملہ کے لئے روانہ ہوا تو اس نے سلطان نورالدین سے صلاح الدین کے لئے خاص احکام جاری کرائے کہ وہ مصر کی مہم پر شیرکوہ کے ساتھ جائے گا۔ دراصل مصر کے اس سفر ہی نے صلاح الدین کے جوہر کھولے جو بڑھتے بڑھتے سلطان صلاح الدین کے مرتبہ تک پہنچا تھا۔ سلطان نورالدین زنگی دیر تک اپنے قاضی شہر کمال الدین کے انکشاف پر ہرگز کرتا رہا پھر اس نے اعلان کیا۔

”قاضی کمال“ اسی وقت اعلان کیا جائے کہ ”دارالعدل“ کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے تحت عوام کے انصاف کے لئے ایک اعلیٰ عدالت بیٹھے گی جس کے ہفتے میں تین اجلاس ہوا کریں گے۔ اس عدالت میں تمہارا سلطان یعنی نورالدین زنگی خود منصف کی حیثیت سے بیٹھے گا اور عوام کے مقدمات سن کے فوری انصاف مہیا کرے گا۔“

ڈھنڈورچی نے پورے دمشق میں ڈھنڈورا پیٹا کہ سلطان معظم دارالعدل میں خود مقدمات سنیں گے اور اسی وقت فیصلہ فرمائیں گے۔ بادشاہوں اور سلطنتوں کا محکمہ جاسوسی ہر دور میں چاق و چوبند اور کمر بستہ رہتا تھا اور آج بھی اسی طرح مستعد نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے جاسوسی کام انسان سرانجام دیتے تھے اور اب یہی کام سلطنتوں کے جاسوسی سارے سرانجام دیتے ہیں اور زیر زمین انجام دیا جانے والا کام بھی سیاروں کی نظروں سے بچا نہیں رہ سکتا۔

خیر یہ ذکر شاہی زمانہ اور اس زمانہ کا جب مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی تخت دمشق پر متمکن تھا جس کے جلال سے صرف ایشیاء ہی نہیں بلکہ یورپ کے ایوانوں میں بھی زلزلہ آجاتا تھا۔ مگر اس جلیل القدر سلطان کے محلات بھی سازشوں اور مصلحتی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھے۔ سلطان نورالدین زنگی اور قاضی کمال الدین میں جو گفتگو ہوئی اور جس کی بنا پر دمشق میں ”دارالعدل“ قائم ہوا تھا تحلیل میں ہونے والی گفتگو جاسوس کینزوں اور غلاموں کے ذریعہ اس وقت امیرالامراء اسدالدین شیرکوہ کے کانوں تک پہنچا دی گئی۔

امیرالامراء اسدالدین نے اسی وقت اپنے تمام حواریوں کو اپنے محل میں طلب کر لیا اور ٹھیک وقت جب دمشق کے درودیوار سلطان نورالدین زنگی کے

تم ان تمام لوگوں کے پاس جاؤ جنہیں تمہارے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ سلطان کے حضور تمہارے خلاف مقدمہ پیش کریں گے ان سے مل کے ہر قیمت پر صلح صفائی کرو۔ ان سے زبانی معافی مانگو۔ اگر وہ رضا مند نہ ہوں تو انہیں کچھ لے دے کر خاموش کرو۔ مجھے اس سلسلہ میں بالکل بے بس سمجھو۔“

ایک ماتحت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”امیر الامراء بہادر۔ ہم اپنے مخالفوں کی خوشامد کریں گے تو وہ اور اکر جائیں گے اور اپنی قیمت بڑھا دیں گے۔“

شیرکوہ چیخ اٹھا۔ ”میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے مخالفوں کو ہر قیمت پر رضا کرو۔ خواہ اس میں تم فقیر کیوں نہ ہو جاؤ۔ تمہاری آراضی اور جائداد کیوں نہ بک جائے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر تمہارے مخالفین کے مطالبات تمہاری استطاعت سے باہر ہیں تو میری جاگیر فروخت کر دو۔ میں اپنی جاگیر سے محروم ہو سکتا ہوں لیکن یہ کہا جائے کہ میرے ماتحتوں نے کسی پر ظلم کیا ہے۔“

چنانچہ شیرکوہ کے ماتحتوں نے دوڑ دوڑ کر شروع کر دی۔ آئندہ نماز جمعہ کے بعد دارالعدل کی پہلی پکیری بیٹھنا تھی۔ جمعہ کو دو دن باقی تھے۔ اس دو دن کے عرصہ میں بد ذات اور ظالم اہلکاروں نے ان غریب لوگوں کے گھروں کے پکر لگا شروع کر دیے جو ستم زدہ تھے۔ اور امیر الامراء شیرکوہ کے جاہ و جلال کی وجہ سے اس کے ماتحت افسروں کی شکایت قاضی شہر کے سامنے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ جان کا خوف ہو تو انسان ہر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی عالم ماتحتوں کا تھا۔ مظلوموں اور ستم زدہ لوگوں کو ہر طرح سے خاموش رہنے اور ان کی غلطیاں معاف کر دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام مظلوم الحال اور بے سارا لوگ جنہیں امیر الامراء کے ماتحتوں سے دکھ پہنچا تھا انہیں ستم کاروں نے صرف مقول رہنا دے کر خوش کیا بلکہ اس قدر خوشامد کی کہ وہ غریب خود شرمندہ ہو گئے۔ امیر الامراء کے علاوہ دوسرے امراء کے ہوش درست ہو گئے اور انہوں نے دل و دماغ میں فیصلہ کیا کہ وہ کسی غریب سے ستم نہ کریں گے ورنہ انہیں سلطان کے سامنے دارالعدل میں پیش ہونا پڑے گا۔

اس وضاحت پر سلطان نور الدین زنگی بھی مسکرایا۔

سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے ملط و دمشق میں مستقل رہائش اختیار کی تو ان کے امراء نے بھی دمشق کو مرکز بنایا اور محلات تعمیر کر کے رہائش اختیار کی۔ فوجی سرداروں سے عوام کو رہائش دینا رہتی تھی۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین کے کسی سردار نے کسی آدمی کے ساتھ کوئی زیادتی کی وہ آدمی اپنی فریاد لے کر سلطانی دربار میں اس سے آگے دو بیان ہیں ایک میں کہا گیا ہے سلطان نے اس کی بات سنی اور اس کی دادرسی نہ ہو سکی۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ سلطان کسی مہم پر

سلطان صلاح الدین نے جمعہ اور ہفتہ کے دو دن دارالعدل کا دربار لگایا۔ اس دربار یا عدالت میں تقریباً تمام ہی امراء اور وزراء شریک تھے۔ سلطان نو

جابر تھا اس لئے فریادی کی دادرسی نہ کر سکا۔

ایک تیسرا بیان یہ ہے کہ شاہی دربار کے پسریداروں نے فریادی کو دربار میں نہ سمجھنے دیا اور وہ اپنی فریاد سلطان کے سامنے پیش نہ کر سکا۔ بہر حال یہ کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت تھی کہ فریادی کی شکایت سنی نہیں گئی اور وہ دہائی دہائیوں اور چھٹا چھٹا مرحوم سلطان نورالدین زنگی کے مزار کی طرف چلا۔ اس دہائیوں اور دہائیوں میں ایسا اثر تھا کہ جو سنتا وہ اس کے ساتھ ہولیتا۔ اس نورالدین زنگی مرحوم کے مزار تک پہنچتے پہنچتے فریادی کے ساتھ ہزاروں آدمیوں انہو ہو گیا۔

فریادی ان الفاظ میں دواہلا کرتا جابر تھا۔

”اے سلطان نورالدین آج تمہارا انصاف کہاں ہے جس ظلم کے ہم لوگ شکار ہیں اگر تم اسے دیکھ پاتے تو تمہیں ہمارے حال پر ضرور رحم آجاتا۔“

فریادی کے ان الفاظ سے میں دمشق کی آبادی میں آگ سے لگادی۔ فریادی جوں جوں آگے بڑھتا جاتا آدمیوں کی تعداد بڑھتی جاتی۔ آخر داروغہ محلات اور شہر کوئوال کو فکر پڑ گئی کہ کہیں ان پر بات نہ آجائے اس لئے انہوں نے سلطان کے سامنے حاضر ہو کر اسے فریادی کے حال سے آگاہ کیا۔ سلطان نے اسی وقت فریادی کو اس کے حضور میں پیش کرنے کا حکم دیا۔

فریادی اس وقت تک کئی ہزار آدمیوں کے ساتھ نورالدین زنگی کی قبر پر چکا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ سلطان صلاح الدین نے اسے فوراً دربار میں طلب ہے۔ فریادی نورالدین زنگی کی قبر سے اٹھا اور اسی طرح روتا پینٹا دربار کی طرف چلا۔ لطف یہ کہ اس کے ساتھ دو ہزار کا مجمع بھی چل رہا تھا۔ وہ دمشق کے عوام تھے اور فریادی کے ساتھ دربار میں اس لئے جانا چاہتے تھے وہ سلطان کو انصاف کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

سلطان کو مطلع کیا گیا کہ فریادی آیا ہے مگر اس کے ساتھ دو ہزار اشخاص جم غیر بھی ہے۔ چنانچہ سلطان نے دربار عام لگانے کا حکم دیا اور خود انصاف کرنے دربار عام میں پہنچا۔ سلطان نے اس کا بیان سن کے ظلم کرنے والے اسی وقت حاضر ہونے کا حکم دیا۔ پھر اس سے حالات سننے کے بعد ظالم کو فریادی واقعی سزا دی اور فریادی سے پوچھا کہ وہ اس فیصلہ اور انصاف سے خوش ہے

نہ ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر پھوٹ پھوٹ کے روتا شروع کر دیا۔ فریادی پریشان ہو گیا اس نے دریافت کیا۔ ”اے شخص تجھ پر ظلم ہوا۔ تو نے سلطان پر انصاف کیا تو اس سزا سے مطمئن نہیں؟“ فریادی نے سلطان کو جواب دیا۔ ”اے سلطان آپ نے میری فریاد سنی اور سزا دی۔ آپ نے انصاف کے تقاضے پورے کئے ہیں اور مجرم کو اس سزا کی پوری سزا ملی ہے۔“

مگر اے شخص تو پھر رو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں کہ مجھے انصاف نہیں ملا۔“ فریادی نے کہا۔ ”اے سلطان میں کہتا ہوں تو اس بادشاہ کو رو رہا ہوں جس کی عدالت قائم ہے اور اس کے عدل کا فیض جاری ہے۔“

فریادی کا اشارہ مرحوم نورالدین کی طرف تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”بے شک تو نے سچ کہا۔ میں جو کچھ بھی عدل و انصاف ہے وہ سلطان مرحوم کے فیض کا نتیجہ ہے۔“

سلطان صلاح الدین اور شام کے نصرانی فرمانرواؤں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ سلطان نے اس عہد کی اپنی طرف سے پوری طرح پابندی کی لیکن ملک کا حاکم رجبی ثالث اپنی عہد شکنی کی عادت سے باز نہ آتا تھا۔ مسلمانوں کو جانی دشمن تھا اور انہیں تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ 1183ء پھر 1186ء میں رجبی ثالث نے مسلمان قاتلوں کو لوٹا اور انہیں قید کر کے شہر یروٹلم لے آیا۔ اس کی اس حرکت پر سخت احتجاج کیا اور لوٹ کا مال واپس لانے کے رجبی ثالث کے پاس سفارت بھیجی مگر اس مغرور نے سفارت کی کوئی توجہ نہ لی اور شہر یروٹلم کی مسلمان ہمدردی کا مذاق اڑایا۔

1186ء کے واقعہ کے وقت مسلمانوں نے رجبی ثالث کو یاد دلایا کہ اس کا اہل کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہے اس لئے وہ انہیں قید سے آزاد کر دے لیکن ثالث نے ان کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

ہفت کے مقام میں ملے اور ایک دوسرے سے بغلیں ہوئے۔ ان میں
ایک نے کہا کہ تمام نصرانی بادشاہ اور قلعہ دار متحدہ طور پر سلطان دمشق صلاح
نابلی کا مقابلہ کریں گے۔

اس طرح صفوریہ کے مشہور شہر میں تمام نصرانی لشکر جمع ہوئے اور انہوں
میں مقدس بلند کی۔ اس صلیب کو صلیب الصلوب بھی کہا جاتا ہے۔ اس
کہ اس صلیب کو اس لکڑی سے تیار کیا گیا تھا جس پر حضرت عیسیٰ علیہ
ام کو مصلوب کیا گیا تھا۔ صلیب مقدس کو عام طور پر مسلمانوں کے خلاف
جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ صفوریہ میں اس وقت نصرانی لشکر کی تعداد
ن ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس میں بارہ سو نائٹس بھی شامل تھے۔

سلطان صلاح الدین بھی اپنے لشکر کے ساتھ صفوریہ پہنچا اور اس نے اپنے
کو طبریہ کی پہاڑی پر اتار دیا۔ سلطان کئی روز تک اس انتظار میں رہا کہ
نی صفوریہ سے باہر نکل کر مقابلہ پر آئیں لیکن نصرانی اپنی جگہ سے نہیں
۔ پھر سلطان نے اپنے کچھ فوجی دستے لے کر طبریہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس
خیال تھا کہ نصرانی طبریہ کو بچانے کے لئے صفوریہ سے باہر نکل آئیں گے
کہ طبریہ میں شاہ رمند والی طرابلس کی بیوی بچے موجود تھے لیکن نصرانیوں کے
ہل پر اس اطلاع سے جوں نہیں رہی۔ ادھر سلطان نے طبریہ پر حملہ کر کے
پر قبضہ کر لیا لیکن قلعہ اس کے قبضہ میں نہ آسکا۔

نصرانیوں کو یہ گمان ہی نہ تھا کہ طبریہ پر سلطان کا اس آسانی سے قبضہ
ہائے گا لیکن جب حقیقت بن کے ان کے سامنے آگئی تو وہ بدحواس ہو گئے۔
ایروٹلم نے بڑے غصے سے کہا۔

”ہم طبریہ کو سلطان کے قبضہ سے آزاد کرائیں گے۔“

شاہ رمند والی طبریہ نے نرمی سے وضاحت کی۔ ”اے شاہ ایروٹلم قلعہ طبریہ
میرے بیوی بچے موجود ہیں اور قلعہ کو سلطانی فوجیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اس
سورت حال میں طبریہ کو بچانے کے لئے میں آپ سے بھی زیادہ بے چین ہوں
ن میں جانتا ہوں کہ اس وقت طبریہ آزاد کرانا ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیں
ملی سے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔“

”شاہ رمند تم کیا کہہ رہے ہو۔“ شاہ ایروٹلم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
”ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ طبریہ میں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ سلطانی فوجوں

”تم لوگ محمدؐ پر ایمان رکھتے ہو۔ اس سے کیوں نہیں
کہتے کہ وہ تمہیں چھڑالے۔“

ریجی ٹالڈ کی اس گستاخی کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو اس کو سخت
اور اس نے اعلان کیا۔

”میں قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ اس صلح شکن کافر کو
خدا نے چاہا تو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔“

سلطان نے بھی جہاد کا اعلان کر دیا تھا اور اسلامی علاقوں کو اپنے
لے کر جہاد میں شرکت کی دعوت دیدی تھی۔ اس الماء کے مقام پر
فوجیں جمع بھی ہو گئی تھیں کہ اسی دوران سلطان کو اطلاع ملی کہ مسلمانوں
قافلہ آ رہا ہے جو کہ قلعہ کرک سے گزرے گا اور ریجی ٹالڈ اس قافلہ
کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ سلطان نے اپنے بیٹے الملک الفاضل
الماء میں چھوڑا خود تھوڑی فوج لے کر قافلہ کی مدد کو پہنچا۔

ریجی ٹالڈ کو سلطان کے آنے کی خبر مل گئی اس لئے وہ قلعہ سے
اور قافلہ بغیر کسی پریشانی کے اس علاقہ سے آگے نکل گیا۔ کہتے ہیں اس
میں سلطان کا بھانجا حسام الدین بھی سفر کر رہا تھا۔ قافلہ کو بحریہ گزارنے
سلطان اس الماء واپس آ گیا۔ اس وقت سلطان کے لشکر میں مسلمان علاقہ
آنی والی فوجیں شامل ہو چکی تھیں۔

سلطان اس لشکر کو ملک الفاضل کی زیر سرگی ساحل کے ساتھ سا
شریف کی طرف روانہ کیا۔

یہ لشکر صفوریہ پہنچا تھا کہ اس کی مدد بھیڑ نصرانیوں کی ایک جماعت
الداریہ اور استباریہ کی فوجوں سے ہو گئی۔ ملک الفاضل نے نصرانیوں کو
فاش سے دوچار کر کے بھگا دیا۔ اس جنگ اور فتح کی خبر سن کر سلطان بھی با
لے کر بیٹے کے پاس آ گیا۔ پھر دونوں لشکر طبریہ کی طرف بڑھے۔

نصرانی جماعت الادبیہ اور استباریہ کی شکست سے عیسائیوں میں شور مچا
اور ان میں صلاح مشورہ شروع ہو گئے۔ طرابلس کے رمند اور ایروٹلم
میں اختلاف تھا اور رمند شاہ طرابلس نے شاہ ایروٹلم کو چھوڑ کے سلطان
رشتہ جوڑ لیا تھا لیکن نصرانیوں کی اس شکست نے اسے بھی پریشان کر دیا۔
پادریوں نے بھی اسے بہت لعنت ملامت کی پھر رمند اور گالی ایک دوسرے

نے انہیں گھیر رکھا ہے۔ دوسری طرف تم طبریہ جانے سے ہچکچا رہے ہو۔ آخر یہ کیا ہے تم کیا چاہتے ہو؟

”اے شاہ یروشلم۔“ والی طرابلس نے جواب دیا۔ ”میں بھی وہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جس سے پورا لشکر ہلاکت میں پڑ جائے۔“

”گویا طبریہ کو مسلمانوں سے بچانے کے بجائے ہمیں صفوریہ میں آرام چاہئے۔“ شاہ یروشلم چڑچڑا ہوا گیا تھا۔

”شاہ یروشلم آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔“ رمند کو بھی ڈر آگیا۔ ”آپ دراصل یہاں کے موسم اور راستوں کی دشواریوں سے واقف نہیں صفوریہ اور طبریہ کا دریائی راستہ، خشک پہاڑیوں اور اونچے نیچے نیلیوں سے بھرا ہے۔ راستہ میں پانی کی شدید قلت ہے۔“

”رمند تم تو اس قدر مطمئن ہو جیسے تم نے سلطان سے کوئی الگ مو کر رکھا ہے۔“ شاہ یروشلم نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔ ”کیا تمہیں امید ہے سلطان قلعہ پر قبضہ کے بعد تمہارے بیوی بچوں سے دوستانہ سلوک کرے گا؟“ ”یہ بات نہیں شاہ یروشلم۔“ رمند نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دراصل میرا اندازہ یہ ہے کہ سلطان طبریہ پر زیادہ دن تک قبضہ نہیں رکھ وہ چند دنوں بعد محاصرہ اٹھا کر واپس آجائے گا لیکن اس وقت طبریہ پہنچ کے اس کا مقابلہ کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔“

”آخر کیوں۔ یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“ شاہ یروشلم گائی بھی اپنی پر اڑ گیا۔

”وجہ صاف ظاہر ہے شاہ یروشلم۔“ رمند نے جواب دیا۔ ”میری اطاعت کے مطابق سلطان کے ساتھ اس وقت پورے ملک شام کے شہزادوں اور ان کی فوجیں موجود ہیں اس وقت سلطان کو شکست دینا ناممکن ہے۔ ہاں طبریہ اس کی واپسی کے بعد قلعہ کو آسانی سے آزاد کرایا جاسکے گا۔“

شاہ یروشلم اور دوسرے والیوں نے رمند کی اس بات پر کان نہ دھری بلکہ انہیں اس پر الزام دھرا کہ اس نے سلطان سے کوئی معاہدہ کر لیا ہے اسی وجہ سے اس قدر مطمئن ہے۔ شاہ یروشلم اور دوسرے تمام نصرانی امیروں نے طبریہ طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا اور نصرانی لشکر صفوریہ سے نکل کے طبریہ کی طرف

سلطان صلاح الدین نے طبریہ پر چھیڑ چھاڑ ہی اس وجہ سے شروع کی تھی۔ پہلے ہی امکان تھا کہ نصرانی طبریہ کو بچانے چلیں گے اس لئے اس نے اور طبریہ کے راستہ میں جگہ جگہ تیر انداز دستے مقرر کر دیے تھے۔ صفوریہ سے نکلے ہی نصرانی سواروں پر مسلم تیر اندازوں نے تیر برسانا شروع کر دیا۔ اس سے نصرانی سوار جن میں کثرت سے ٹائٹس شامل تھے اسے سخت نقصان پہنچا۔ ان طبریہ میں چند دستے چھوڑ کر اپنی خیمہ گاہ پر پہنچ چکا تھا اور اس نے فوجوں کو کمان سنبھال لی تھی۔

نصرانی لشکر کو صفوریہ چھوڑتے ہی سب سے پہلے پیاس کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے چشموں پر سلطانی دستوں نے قبضہ کر لیا تھا یا انہیں برباد کر دیا تھا۔ اس لئے نصرانیوں کو پانی شدت قلت محسوس ہوئی۔ پھر بھی وہ کسی طرح لڑتے بھڑتے سلطان لشکر گاہ کے قریب پہنچ گئے اور رات گزارنے کے بعد صبح 3 ربیع الاول 58ھ (1187ء) کو نصرانیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ نوبیا کے میدان میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کے تیر اندازوں نے اس مقابلہ میں اس قدر تیر مارے کہ نصرانیوں کو پسپا ہونا پڑا۔

نصرانیوں نے لڑ بھڑ کے طبریہ نکل جانے کی کوشش کی لیکن سلطان صلاح الدین اپنے دستوں کے ساتھ ان کا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین خود گھوڑا دوڑا کر اپنے مختلف دستوں کے پاس جاتا اور انہیں جوش دلاتا اور ان کے حوصلے بلند کرتا۔ نصرانی فوجوں کی طرف خشک جھاڑیوں کا جنگل تھا مسلمانوں نے اس جنگل میں آگ لگادی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ہوا نصرانیوں کے رخ پر چل رہی تھی۔ جنگل نے یہ آگ پکڑتے ہی دھواں اگلتا ٹوٹ کر دیا۔ یہ دھواں نصرانی فوجیوں کو پریشان کرنے لگا۔

نصرانی پیاس کی شدت سے پہلے ہی بے حال ہو رہے تھے۔ آسمان سے الگ آگ برس رہی تھی اس پر آنکھوں اور ناک میں گھسٹا ہوا دھواں ان پر قیامت لٹ پڑی تھی۔ نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے تھے اور نہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب جان بچنے کی کوئی صورت نہیں تو انہوں نے موت جنگ لڑنا ٹوٹ کر دی اور بھوکے شیروں کی طرح مسلمانوں کی صفوں میں گھس گئے مگر مسلمانوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور اگرچہ نصرانیوں نے ہتھیلی پر سر رکھ کر

حملہ کر کے مسلمانوں کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی اور مسلم لشکر نے انہیں کوہِ حطین تک پہنچنے سے باز رکھا۔

پھر ایک شدید جنگ کے بعد عیسائیوں کی صلیب مقدس کو ان سے چھین لیا گیا۔ مسلمان سوار نصرائیوں کی صفیں درہم برہم کرتے ہوئے گاٹی شاہ یروثلیم کے اس جھنڈے تک پہنچ گئے جو ایک اونچے مقام پر گاٹی کے عظیم الشان نیچے کے آگے نصب تھا۔ گاٹی کے جھنڈے کو گرا کر نیچے کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی نصرائی فوجوں نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے۔ مسلمانوں نے تمام شاہوں، امیروں اور تائش کو گرفتار کر لیا۔

انگریز مورخ ابن پول نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:-

”مسیحی شہسوار اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ اپنی جانوں کو زیادہ قیمت پر فروخت نہیں کر سکے۔ انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں اور مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب اشخاص قید کر لئے گئے۔ ان میں شاہ یروثلیم گاٹی۔ اس کا بھائی پائیلوں، کرک کا ربی نالڈ، تینین کا ہفرے، دادیہ اور استباریہ جماعتوں کے سردار اور تمام بڑے بڑے سردار گرفتار کر لئے گئے۔ صرف طبریہ کا فرمانروا رمندہ جنگ کا رنگ دیکھ کر میدان سے نکل بھاگا اور گرفتاری سے محفوظ رہا۔ لیکن وہ صلاح الدین سے اس قدر شرمندہ تھا کہ زیادہ دن زندہ نہ رہا اور شرم سے مر گیا۔“

ابن اثیر کا بیان ہے معرکہ حطین میں عیسائی مقتولین کے انبار دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ نصرائیوں کا پورا لشکر قتل ہو گیا ہے لیکن جب گرفتار عیسائیوں کو دیکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پورا لشکر قیدی بنا لیا گیا ہے۔

دوسرا مورخ ابوشامہ لکھتا ہے کہ مسیحی لشکر کے تمام مشہور سردار مسلمانوں کی قید میں تھے اور عیسائی سپاہیوں کا ایک ایک مسلمان لشکری تیس تیس عیسائی پادروں کو خیمے کی سی میں باندھے جانوروں کی طرح ہنکارتا پھر رہا تھا۔ 491ء (پہلی صلیبی جنگ) کے بعد اتنا بڑا کوئی معرکہ نہ ہوا تھا۔

جنگ کے خاتمہ پر تمام معزز قیدیوں کو سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ سب

ام قیدی شاہ یروثلیم (بیت المقدس) کا بادشاہ گاٹی تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے اسے سامنے آیا۔ سلطان نے اسے اپنے برابر منہ پر بٹھالیا۔ پھر تمام امیروں اور سرداروں کو ان کے مرتبہ کے مطابق اپنے سرداروں کے کمرے ہونے کا حکم دیا۔

شاہ یروثلیم گاٹی کو معلوم تھا کہ سلطان نے امیر و قلعدار کرک کو اپنے قتل کرنے کا عہد کیا ہے۔ گاٹی کو یہ معلوم تھا کہ سلطان بادشاہوں اور سرداروں کو قتل نہیں کرتا مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان ربی نالڈ کو کسی صورت زندہ نہ چھوڑے گا مگر گاٹی اسے بچانا چاہتا تھا اس لئے سلطان سے درخواست کی۔

اسے شہنشاہ اور سلطان شام ہمیں سخت پیاس معلوم ہو رہی ہے اگر سلطان پیاس بجھانے کا انتظام فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔“

”ہم تمہاری درخواست بخوشی منظور کرتے ہیں۔“

کہتے ہوئے سلطان نے شاہ یروثلیم کے لئے آبِ خشک (ٹھنڈا پانی) لانے دیا۔

ٹھنڈا پانی لایا گیا تو شہنشاہ یروثلیم کو پانی پیش کرنے کا اشارہ کیا گیا۔ چنانچہ لے ایک قیمتی گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کے شاہ یروثلیم کو پیش کیا گیا۔ شاہ نے شکریہ ادا کر کے گلاس غلام کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر شاہ یروثلیم نے گلاس پانی پی کے سامنے کھڑے ہوئے قلعدار کرک ربی نالڈ کو قریب آنے رو کیا۔

ربی نالڈ قریب آیا تو شاہ یروثلیم نے اس سے کہا۔ ”ربی نالڈ یہ باقی پانی لو۔“ ربی نالڈ نے جلدی سے شاہ یروثلیم کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور لگا کر ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

سلطان صلاح الدین کی پیشانی پر غصہ سے سلوٹیں پڑ گئیں انہوں نے فرمایا۔

”شاہ یروثلیم ہم نے پانی نہیں پینے کو دیا تھا تم نے کچھ پانی ربی نالڈ کو مگر ہم نے اسے پانی نہیں دیا اس لئے اس کی جان بخشی ہم پر فرض نہیں“

ک زمانہ کا دستور تھا کہ بادشاہ یا خلیفہ کسی قیدی کو کھانا پانی دینے کا حکم دے پھر وہ اس قیدی کو قتل نہیں کرا سکتا تھا۔ مسلمان شاہوں کے اس

دستور سے شاہ یروشلم واقف تھا۔ اس نے اسی لئے اپنا بچا ہوا پانی ربی نالڈ پلادیا تھا تاکہ سلطان اس کے قتل کا حکم نہ دے سکے مگر سلطان نے فوراً کی وضاحت کر دی۔

پھر سلطان نے تمام معزز قیدیوں کو کھانے کے لئے دوسرے خیمے میں دیا۔ واضح رہے کہ سلطان صلاح الدین کا یہ دربار میدان جنگ غمیس میں ا بڑے خیمہ میں لگا تھا۔ سلطان نے صرف شاہ یروشلم اور ربی نالڈ قلعہ دار کر کے اپنے پاس روک لیا تھا۔

قیدیوں کے جانے کے بعد سلطان نے ربی نالڈ کے سامنے اس کے پچھلے گناہ بیان کئے اور کہا۔ ”اے ربی نالڈ اس وقت میں محمد رسول اللہ اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد چاہتا ہوں۔“

سلطان کا یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جب مسلمانوں کے ایک قائد ربی نالڈ نے گرفتار کر لیا تھا اور قافلے والوں نے ربی نالڈ سے رہائی درخواست کی تھی۔ اس گھڑی ظالم ربی نالڈ نے قتلہ لگا کر کہا تھا کہ تم لوگ محمدؐ پر اعتقاد رکھتے ہو۔ اس وقت محمدؐ کو اپنی مدد کے لئے کیوں نہیں بلا۔ سلطان نے اگرچہ ربی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اسلامی اصول کے مطابق سلطان نے پہلے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے اپنے ہاتھ سے اس کا قلم کر دیا۔

شاہ یروشلم گاٹی حاکم کرک کا یہ انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ سلطان نے اس کی تسلی دی۔

”اے شاہ یروشلم تمہیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں بادشاہوں کا یہ نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہوں کا سر اتار دیں۔ ربی نالڈ کو اس کے حدود تجاوز کرنے کی سزا دی گئی ہے۔“

معرکہ حنین میں شکست کے بعد شام میں نصرانی ریاستوں کا خاتمہ ہو نصرانیوں کے بڑے بڑے سردار اور امیر گرفتار ہو چکے تھے اور اب کوئی ایسا باقی نہ تھی جو شکست خوردہ اور عیسائیوں کے منتشر فوجیوں کو اکٹھا کرتا۔ عیسائی کی چھوٹی ریاستیں اور جاگیرداریاں باقی تھیں جو ساحل سمندر سے دور اند علاقوں میں تھیں مگر ان کا بھی یہ حال تھا کہ جب سلطان صلاح الدین کا

شہر کے سامنے یا قلعہ کی تفصیل کے قریب پہنچتا تو اس کی دیواریں گر جاتیں قلعہ اور شہر کی کتھیاں سلطان کے حوالے کر دی جاتی تھیں۔

پورے ملک شام میں صور اور یروشلم کے علاوہ عیسائیوں کی کوئی ریاست باقی نہ تھی۔ شام میں بیروت سے جنوب میں غاذہ تک سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہو چکا تھا۔ پورا فلسطین سلطان کے رحم و کرم پر تھا۔ اس علاقہ کو عیسائیوں نے نوے سال پہلے مسلمانوں سے چھینا تھا اور اب یہ مسلمانوں کو مل رہا تھا۔ ان کے قبضہ کے بعد اسلامی لشکر چاروں طرف پھیلنا شروع ہو گیا۔ بہت کم دنوں نے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ اگر کوئی قلعہ بند ہوا بھی تو ایک دن سے زیادہ کی تکلیف گوارہ نہ کر سکا۔

سلطان نے سب سے پہلے طبرہ کی طرف کوچ کیا۔ طبرہ کے قلعہ میں ربی نالڈ کی بیوی بچے تھے انہوں نے قلعہ فوراً حوالے کر دیا اور سلطان نے انہیں دستار کے ساتھ قلعہ چھوڑنے کا پروانہ عطا کر دیا۔ اب سلطانی لشکر نے کمد رخ کیا یہ بحر روم پر فلسطین کی ایک بہت بڑی منڈی تھی۔ سلطان لشکر قلعہ قریب پہنچا تو وہاں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ قلعہ بند لڑائی کی جائے اور یورپ کے نصرانی دنیا سے مدد مانگی جائے لیکن دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ اسلامی لشکر سے ٹکرانا یا اس سیل گراں کے آگے بند باندھنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس گروہ کی دلیل تھی کہ جب گاٹی یروشلم ربی نالڈ امیر کرک تمام شامی امیروں نائبین اور ہاسپٹلز کے ساتھ لاج الدین سے شکست کھا چکا ہے تو پھر کمد کتنی ساعتوں تک سلطان کو روک سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ کمد نے بھی قبضہ دے کر اپنی جان بچائی۔ سلطان نے عام معافی اعلان کیا اور فرمان جاری ہوا کہ جو لوگ کمد میں رہنا چاہیں ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے مگر جو کمد چھوڑنا چاہیں انہیں اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ اپنا مال و متاع لے جاسکتے ہیں۔ عام طور سے لوگوں نے کمد چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنا مال لے کر نکل گئے لیکن یہ ایک بڑی منڈی تھی لہذا وہ تمام مال نہ لے جاسکے۔ کمد میں ایک مسجد تھی جو گزشتہ نوے سال سے نصرانیوں کے دور حکومت میں کنیہ (گرجا) بنادی گئی تھی۔ سلطان نے اس مسجد کو دوبارہ مسجد کا روپ دیا اور وہاں نماز جمعہ ادا کی۔

سلطان کلمہ میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے بھائی بھتیجے اطراف میں فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ سلطان کے بھائی ملک العادل نے ناصرہ، قباریہ، حیفہ، صفوریہ اور شقیف وغیرہ کو فتح کرنے کے بعد یافا کی مشہور بندر گاہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

دوسری سمت سلطان کا بھتیجا تقی الدین بن شاہ شامان (یہ فرخ شاہ کا بھائی تھا) نے تبیین کا محاصرہ کیا۔ یہ سنگین قلعہ بڑا مضبوط تھا۔ قلعہ والوں نے اس کی سخت مدافعت کی۔ جب قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا تو تقی الدین کو اپنی مدد کے لئے سلطان کو بلانا پڑا۔ سلطان لشکر لے کر تبیین پہنچا۔ سلطان کی آمد کی خبر سن کر قلعہ والوں کے حوصلے پت ہو گئے اور انہوں نے بغیر مزید جنگ کے قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے سلطان صیدا پہنچا۔ قلعہ صیدا والوں میں سلطان کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لئے انہوں نے بغیر کسی جنگ کے قلعہ سلطان کے حوالہ کر دیا۔

بیروت اس وقت بھی ایک مستحکم اور خوبصورت شہر تھا۔ بیروت والوں نے سخت مدافعت کی لیکن جنگ شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد شہر میں افواہ اڑی کہ صلاح الدین کی فوجیں ایک سمت سے شہر میں داخل ہو گئیں ہیں۔ اس افواہ سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور انہوں نے صلح پر زور دینا شروع کیا۔ فنی سردار انہیں ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ محل افواہ ہے اور کسی قسم کے خوف کی ضرورت نہیں لیکن لوگوں پر خوف طاری ہو گیا۔ آخر شہر سلطان کے حوالے کرنا پڑا۔

بحرہ روم کے ساحل پر صیدا اور عتقان دو بڑے شہر (بندرگاہ) تھے۔ صیدا زیادہ مستحکم تھا اس لئے کہ صیدا میں طاقت ور تمام عیسائی لشکر اور سردار جمع ہو گئے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ چنانچہ سلطان نے پہلے عتقان کا محاصرہ کیا۔ سلطان نے عتقان والوں کو پیغام بھیج دیا کہ اگر وہ عتقان بغیر جنگ کے حوالے کر دیں تو گالی شاہ یروشلم کو قید سے آزاد کر دیا جائے گا لیکن شہر والوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ سلطان نے مجبور ہو کر فصیل شہر پر سنگباری شروع کرادی اس سنگباری سے فصیل ایک جگہ سے ٹوٹ ہو گئی مگر مدافعت اس قدر زبردست تھی اسلامی لشکر اندر داخل نہ ہو سکا۔ سلطان زیادہ تباہی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے محاصرہ سخت کر دیا۔

فرخشاہ والوں نے جب دیکھا کہ محاصرہ ختم نہیں ہو رہا اور اگر سلطان نے حملے کا حکم دے دیا تو بڑی تباہی مچے گی۔ ادھر شاہ یروشلم انہیں برابر پیغام بھیج رہا تھا۔ تمام طرف سے مجبور ہو کر اور ناامید شہر والوں نے جان کی ضمانت پر عتقان حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ سلطان نے کی در کر لی اور عتقان کے نصرانی اپنا سامان لے کر یروشلم چلے گئے۔

شام مصر سے قریب ترین بندرگاہ تھا۔ عتقان کے بعد رملہ، داروم، غزوہ ابراہیم اور بیت جبرئیل بھی آسانی سے فتح ہو گئے۔ حطین کی فتح کے بعد ہی شام نے خود کو ذہنی طور پر بیت المقدس پر بھی قبضہ کے لئے تیار کر لیا کہ حطین کی خبریں اقصائے عالم اور خصوصیت سے اسلامی دنیا میں پہنچ گئی ر دور دراز کے علماء اور فضلاء دھڑا دھڑا عتقان پہنچنا شروع ہو گئے تھے ان کے ساتھ قدم ملا کر اس ارض پاک اور قدیم قبلہ میں داخل ہوں نصرانیوں نے 1092 عیسوی سے قبضہ جما رکھا تھا۔

شام اور بیت المقدس کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی جو سلطان کا رک سکتی۔ نصرانیوں کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ان کے بادشاہ اور مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار تھے۔ اس کے باوجود سلطان بیت المقدس پر حملہ کر کے قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا ہر چند کہ نصرانیوں نے گذشتہ نوے بیت المقدس کے مسلمانوں کے تمام مقامات کی ہیبت تبدیل کر دی تھی۔ بیت المقدس مسلمانوں کا پرانا کعبہ تھا اور وہ عرصہ تک اسی کے رخ پر کرتے تھے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ارض مقدس کی زمین کو خون سے آلودہ کیا جائے جس طرح آج یہ نہیں چاہتے کہ کعبہ (مکہ) کے خونریزی اسی طرح بیت المقدس کے لئے یہی احترام چاہتے تھے۔

شام کو یہ بھی معلوم تھا کہ شام کے ان تمام علاقوں کے نصرانی جو سے شکست کھا کر اپنے اپنے شہروں اور ملکوں سے بھاگے تھے۔ وہ تمام بیت المقدس میں پناہ گزین ہوئے تھے ان میں امیر بھی تھے، فقیر بھی، امیر بھی تھے اور بھکاری بھی۔ ایک اندازے کے مطابق بیت المقدس میں ۱۰۰۰ مرد اور عورتوں کے علاوہ ساٹھ ہزار کا مسلح لشکر تھا۔ ہر چند کہ اس سلطان کو کوئی پروا نہ تھی پھر بھی سلطان چاہتا تھا کہ اس ارض پاک پر بلائے مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے جسے نصرانیوں نے مسلمانوں سے خون

انہوں نے اپنے ایک سردار بانیان کو سلطان کے پاس بھیجا۔ اس نے خدمت میں عرض کیا۔

سلطان عالی مقام۔ ہم لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کا مقابلہ نہیں آپ پر یردِ ظلم پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لیں گے لیکن آپ جانتے تھے اس خون کا ایک قطرہ نہ گرے لیکن ہوگا یہ کہ یردِ ظلم کے مرد اپنی بیوی کو قتل کر دیں گے۔ پھر شر کی تمام دولت ایک جگہ جمع کر کے اس میں باغی اور مسلمانوں کے جتنے مقدس مقامات ہیں ان سب کو تباہ و برباد کر لواریں کھینچ کے شہر کے تمام دروازے کھول دیں گے اور جب آپ شہر ہوں گے تو وہاں آپ کو کوئی تنفس نظر نہ آئے گا اس لئے ہم اپنی بیوی ساتھ یردِ ظلم کے تمام مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کر دیں گے۔ یہاں تک شہر کوئی چرند پرند بھی نہیں ملے گا۔

ان کے انکار سے سلطان کو غصہ تو بہت تھا لیکن وہ بیت المقدس میں اس باری بھی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے نصرانیوں سے اس شرط پر صلح المقدس سے نکلنے والا ہر فرد دس دینار عورت پانچ دینار اور بچہ دو دینار۔ اس طرح بیت المقدس چالیس دن کے اندر اندر جو نکل سکتا ہے اس ند جو نصرانی بیت المقدس میں پایا جائے گا اسے غلام بنا لیا جائے گا۔

ارداد کے بعد مسلمان ۷ رجب ۵۸۳ ہجری (ستمبر ۱۱۸۷ء) بروز جمعہ بیت داخل ہوئے اور اکانوے سال بعد خدا کا یہ پاک گھر اس کے حقیقی حوالے ہوا۔ یہ کتنا اتفاق ہے کہ 27 رجب معراج نبوی کی تاریخ ہے مبارک سے بیت المقدس کو جو نسبت ہے اس سے ہر مسلمان واقف ہوں کہ مسلمان اس ارض مقدس پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور آج اس نصرانیوں کے بجائے یہودی قابض ہیں اور انہوں نے وہاں اصل باشندوں کو در بدر کر رکھا ہے۔

قدس کے در و دیوار مسجد اقصیٰ کے مینار آج پھر کسی صلاح الدین کو ہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ صلاح الدین کس سرزمین سے اٹھا ہے۔

کے دریا پار کر کے حاصل کیا تھا۔ پس سلطان نے بیت المقدس کے نواح میں اپنی لشکر گاہ قائم کی اور امر کو پیغام بھیجا۔

”اے ارض مقدس کے نصرانی باسیو۔ بیت المقدس ہمارے لئے بھی اہم محترم ہے جتنا کہ دنیا کی کسی اور قوم کے لئے ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم چاہتے کہ ایک صدی پہلے کی طرف ایک بار پھر بیت المقدس میں اس قدر بے سے کہ ہمارے گھوڑے گلی کوچوں کو بننے والے خون کو تیرنے لگے۔ اس لئے بیت المقدس بغیر خون ہمارے حوالے کر دیا جائے تو ہم نصرانیوں صرف جان و مال کی حفاظت دیں گے بلکہ اگر وہ بیت المقدس میں مگر چاہیں تو انہیں اس شہر کے برابر زمین دی جائے گی تاکہ وہ وہاں اپنی آبادی کریں۔ انہیں بیت المقدس میں داخلہ کی عام اجازت ہوگی اور انہیں کسی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اگر بیت المقدس والے شہر کو چھوڑ کر کہیں چاہیں تو بھی انہیں اجازت ہوگی اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔“ مگر بیت المقدس کے نصرانیوں نے سلطان کی یہ باعزت پیش کش قبول اور جواب بھیجوا دیا۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس زمین پر ہمارے خداوند یسوع مسیح نے کھولی اور جہاں وہ مصلوب ہوئے اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔“ سلطان کو مجبور ہو کر کموار بے نیام کرنا پڑا۔ نصرانیوں کا لشکر شہر کے اور فصیل شہر کے باہر بھی وہ پہرے جمائے مسلمانوں سے بیت المقدس کو کے لئے کھڑے تھے۔ سلطان نے ایک شدید حملہ کر کے فصیل شہر سے لشکر کو شہر کے اندر دھکیل دیا اور فصیل پر شدید سگباری کرائی جس سے کئی جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ جب نصرانیوں نے دیکھا کہ اب بچت کی کوئی نہیں اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانا یقینی ہے تو انہوں نے سلطان کی خدمت میں سفارت بھیجی۔

اس وقت سلطان نے صلح سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”اب میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم نے اب سے نو۔ قبل مسلمانوں سے بیت المقدس کا قبضہ لینے کے لئے کیا تھا۔“ مسلمانوں کے اس صاف جواب سے بیت المقدس کے نصرانیوں کے

اپورا احترام کیا جائے اور جس طرح حرم مدینہ اور حرم کعبہ میں خون نہیں بہایا
طرح اگر بیت المقدس میں کسی نے کسی مخالف کی تکبیر بھی پھوڑی تو وہ سزا کا

ہے کہ کسی مقام کو فتح کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا مشکل اور دشوار اس پر قبضہ
ہے۔ اس کی بہترین مثال مسلمانوں کا اکیانوے سال (91) بعد بیت المقدس پر
کیونکہ اس قبضہ کے رد عمل پر ہی تیسری صلیبی جنگ شروع ہوئی تھی جس میں
اپورا دول یورپ یعنی انگلستان، فرانس، جرمنی، سلطنت روم مشرقی اور سلطنت
سلسلی، قبرص، شام کی تمام عیسائی ریاستیں یعنی انطاکیہ، یروٹلم، قباریہ غرض
ایشیاء کی کوئی ایسی سلطنت نہ تھی جس نے تیسری صلیبی جنگ میں براہ راست یا
مدد نہ لیا ہو اور یہ پورا دول یورپ اور ایشیاء کی عیسائی ریاستیں محض ایک شخص
تھا ہوئی تھیں وہ شخص تھا مجاہد اعظم صلاح الدین ایوبی جس نے بہادری اور
اس متحدہ طاقت سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ اسے شکست سے دوچار کر کے
اپنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس
فلسطین کے تاریخی واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

بیت المقدس جہاں امت محمدی ان گنت قربانیوں کے باوجود آج بھی بے خانماں دکھائی
ہے یہ دنیا کے ان شہروں میں سے ایک ہے جنہیں ہر نوع انسان تکریم اور عزت کی نظر
دیتی ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ قابل احترام ہے۔ اللہ کے بڑے بڑے انبیاء اسی سرزمین
ہوئے اور انہوں نے اللہ کی یکتائی اور وحدانیت کا درس دیا۔ مسلمان ہو کہ عیسائی یا
اب کے لئے یہ مقام یکساں طور پر متبرک ہے۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول
خدا اکرم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت مدینہ کے بعد سترہ ماہ (17) ماہ تک بیت
الہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ حضور کے سفر معراج کی پہلی منزل بیت
الہیہ ہے۔ یہیں پر حضور نے تمام انبیائے کرام کی امامت فرمائی تھی اور اسی بیت
الہی حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا مدفن ہے۔ حضرت عیسیٰ کی مہد اور ہمد کو
یہ مقام کو لکھا جاتا ہے۔

اہل بات کا خیال رکھئے کہ عیسائیوں کے عقیدے کے تحت حضرت عیسیٰ اسی جگہ
ہو کر عیسیٰ دفن ہوئے ہیں جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمانوں
پر اٹھائے گئے تھے۔

یہاں کی بلند ترین پہاڑی کا نام ”زیتون“ ہے جو بحر روم سے چھبیس سو فیٹ اور بحیرہ

قبلہ اول کے در و دیوار

معمر کہ جنہیں کے بعد ہی یروٹلم کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ حق و باطل کے اس مزہ
میں عیسائی متحدہ طاقت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان کے تمام بڑے بڑے سردار ٹائٹس، ہاپٹا
اور اسپلرز یہاں تک کہ قلعوں کے سردار اور والیان ریاست تک گرفتار ہو گئے تھے اور
تمام اس وقت مسلمانوں کے قبضہ میں تھے سوائے کرک کے قلعہ کے والی رجبی نالڈ کے
بد ذات فرنگی مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کج بخت نے مدینہ النبی کو تباہ کر کے
رسول کو اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کیا تھا اور لشکر لے کر عرب کے ساحل تک بھی پہنچ گیا تھا
پھر اس پر مسلمانوں کی ایسی مار پڑی کہ اس کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔

رجبی نالڈ مسلمانوں کو اذیت دینے سے خوش ہوتا تھا۔ مسلمانوں کا ایک قافلہ جو
بیت اللہ سے واپس آ رہا تھا جب وہ قلعہ کرک کے قریب سے گذرا تو یہ ظالم ان پر
آور ہوا اور سب کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت ایک مسلمان نے اس سے درخواست کی
وہ انہیں چھوڑ دے کیونکہ وہ صلح پسند شہری ہیں اور مدینہ سے واپس آ رہے ہیں۔
بد بخت رجبی نالڈ نے انہیں بڑے تسخرانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

”تمہیں اپنے مدینہ والے نبی سے عقیدت ہے تو بلاؤ اپنی مدد کو۔“

رجبی نالڈ کے یہ توہین آمیز جملے ایک دوسرے سے ہوتے ہوئے سلطان صلاح
ایوبی کے کانوں تک پہنچے تو سلطان نے بھرے دربار میں قسم کھائی۔

”میں اس گستاخ کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔“

پس سلطان نے باقی تمام والیان ریاست کو معاف کر دیا مگر رجبی نالڈ کو اپنی
سے قتل کر کے قسم پوری کی۔ سلطان نے یروٹلم میں داخل ہونے کے بعد کسی
انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ حکم دے دیا کہ ارض فلسطین اور خاص کر بیت المقدس

مردار سے پینتیس سو فٹ بلند ہے۔ اسی طرح بحیرہ روم کا یہاں سے فاصلہ 33 میل اور بحیرہ مردار صرف دس میل دور ہے۔ اس سطح مرتفع کے کئی مقام پر چوٹے کا پتھر پلایا جاتا ہے۔ شہر کے جنوب گلابی اور سفید رنگ کا سنگ مرمر زمین کی بہت گہرائی تک پایا جاتا ہے اسے سینا گروس یا کیدرون کا سنگ مرمر بھی کہتے ہیں۔ اس کے قریب ہی نرم سفید چوٹے کا پتھر ہے جو زمین میں چالیس فٹ گہرائی تک پایا جاتا ہے پھر گرمی چاک کی سخت سطح ہے۔ کوہ زیتون اس طرح کے پتھر سے بنا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ شہر نہ تو کسی درہ پر آباد ہے اور نہ کسی دریا کے کنارے واقع ہے۔ یہ بھی نہیں کہ بیت المقدس سے کوئی تجارتی شاہراہ گزرتی ہو۔ ان باتوں کی عدم موجودگی کے باوجود اس شہر میں آج تک قحط نہیں پڑا۔ اور یہ تین ہزار سال سے موجود ہے۔ اس شہر کی آبادی کو نہرام الاراج یعنی دریائے نیہون سے لائے ہوئے چشموں سے پانی حاصل ہوتا تھا۔ پھر یہ چشمے بیکار ہو گئے گھروں میں حوض بنانے کا عام رواج تھا جس سے برسات کا پانی بھر جایا کرتا تھا اور اسے صاف کر کے استعمال کیا جاتا تھا۔

ہر سال لاکھوں کی تعداد میں یہاں زیارتوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ زیارتوں کی تعداد اور قدر زیادہ ہے کہ گائیڈ کی مدد کے بغیر انہیں نہیں دیکھا جاسکتا۔ زائرین شہر کے گرد و نواح دیکھ کے حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ شہر کے اطراف میں خنجر وادیاں بغیر سبزے کی پہاڑیاں ہیں۔ کہتے ہیں یہ شہر تین ہزار سال پرانا اور قدیم ہے۔ اس شہر کی قسمت میں تباہی و بربادی لکھی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بیس مرتبہ اس کا محاصرہ ہوا اٹھارہ بار اسے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ دو مرتبہ تو اسے زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔ ہادیان و بخت نصر کے زمانہ میں اس پر سخت قیامت گزری اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

بیت المقدس پر چھ مذہب کے پیروکاروں نے حکومت کی۔ ایک وقت تو اس پر قدرت ختم آیا کہ شہر میں کوئی مکان بھی باقی نہ رہا۔ گلی کوچے برباد اور ویران ہو گئے یہ کے باشندوں کو قتل کر دیا گیا یا انہیں جنگلوں میں مار بھگایا گیا تھا۔ بیت المقدس کے کئی ہے اور مذہبی ادوار میں اس کے نام تبدیل ہوتے رہے۔ یہودی اور عیسائی اسے یروخلیم کہتے ہیں اس کا سب سے پرانا نام جیوس ہے۔ حضرت داؤد کے زمانہ میں اس کا یروخلیم رکھا گیا۔ مگر یہودی رہیوں نے اس کا تعلق حضرت ابراہیم سے ملانے کے لئے اسے نام جرج بتایا اور اس میں ”خلیم“ کا اضافہ شیلیم یا شالیم بادشاہ نے کیا جو دو ہزار آٹھ قبل مسیح (2008 ق م) میں یہاں کا حاکم تھا۔

ایک یہ بھی روایت ہے کہ قیصر ہادیان نے اسے یہودیوں سے خالی کرانے کے

نام ”الیلیا“ کا پتھر لیا تھا۔ یہ واقعہ 130ء کا ہے۔ اس نام کا پہلا لفظ الیا تو باقی رہا نام کا معنی کہہ کر ختم کر دیا گیا۔ یا قوت لکھتا ہے۔

اس بادشاہ کا نام الیا اس لئے تھا کہ اسے آباد کرنے والی عورت کا نام الیا تھا۔ الیا کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ یہ اپنے بانی کے نام پر ہے جو روم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا۔ اس کے بھائیوں کے نام دمشق، حمص اور فلسطین ہیں۔

عروں نے اسے البلاط کا نام دیا ہے جس کے معنی دربار شاہی کے ہیں۔ اس کا ایک نام شہر یعنی شہر شہر ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی صبح کو جب سورج طلوع ہوتا ہے تو پتھروں سے بنی ہوئی عمارتیں چمکنے لگتی ہیں۔ یہ نام اس کا اب بھی رائج ہے اس کا ایک اور مشہور نام ہے یعنی ”امن کا شہر“ (City of Peace) مگر یہ نام نہ چڑاتا معلوم ہوتا ہے کیونکہ بیت المقدس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس شہر کی عمر تین سو برسوں میں مشکل ہی ہے بیس سال ایسے نکلیں گے جن کے دوران اس میں امن کا دور دورہ رہا ہو ورنہ اس شہر نے اپنی پوری عمر لڑائیوں میں گزاری ہے۔

بیت المقدس میں ہونے والی لڑائیوں کی فہرست ترتیب دینا مشکل ہے۔ ان لڑائیوں نے والے اور مجروح ہونے والوں کا شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو ایک عمر ہے مگر یہ شہر ہے کہ اب تک قائم ہے۔ بھرا پڑا شہر اجڑتا ہے آبادی الٹ پلٹ ہے۔ کھیتیاں برباد ہوتی ہیں۔ لوگ گھر چھوڑ کر جنگلوں میں پناہ لیتے ہیں پھر کچھ ہی دنوں کے کھنڈرات پر ایک نیا شہر آباد ہوتا ہے۔ اس کے تقدس میں ذرا بھی فرق

بیت المقدس کو یہودیوں نے اس وقت ”شہر امن“ کا نام دیا جب 200 ق م میں نے انٹی اوکس اسینی فینس کو شکست دی۔ عیسائیوں کو یہ شہر اس لئے پیارا ہے اعلیٰ اس شہر میں تھی اور حضرت عیسیٰ اسی شہر میں پیدا ہوئے اور انہیں عیسیٰ چڑھایا گیا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہوں نے اس شہر کو روز اول ہی سے مقدس قرار دیا۔ عربوں کے مطابق اس شہر کی بنیاد ایک پہوئی بادشاہ صادق ملیک نامی جو سلا عرب تھا۔

دایت ہے کہ انسانی ذہن اور تاریخ میں بیت المقدس سے زیادہ قدیم کوئی اور شہر نال رہے کہ دمشق کو بھی سب سے قدیم شہر کہا جاتا ہے) بہر حال اس شہر کی تاریخ عموماً م سے شروع ہوتی ہے جب یہاں آل سام آباد تھے اور انہیں کنعانی یا فونیقی

لما جاتا ہے لیکن ایک روایت کے مطابق فونیقی دراصل یمن کے قدیم باشندے تھے ترک وطن کر کے بیت المقدس کے اطراف میں آباد ہوئے تھے۔ ان قبائل کی ایک شاخ جو سی ق م میں یہاں شالیم بادشاہ کی حکومت تھی۔

دریائے دجلہ اور فرات کے سنگم پر شہر شراز آباد تھا جہاں سے حضرت ابراہیم سب سے پہلے ہجرت کی تھی اور جردن میں آکر قیام فرمایا تھا۔ جردن بعد میں اٹلی کے سے مشہور ہوا۔ کتاب مقدس کی بعض روایت اور زمین سے نکلنے والی تختیوں سے یہ بھی معلوم ہوئی ہے کہ وہاں کا بادشاہ بھی حضرت ابراہیم کی طرح ایک خدا کی پرستش کرتا اور اپنے آپ کو خدا کا بیٹا ہوا پیغمبر کہتا تھا۔

کتاب پیدائش اور ابن کثیر کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ آہستہ طاقت حاصل کی۔ اسی وقت اردن میں حضرت لوط رہتے تھے۔ دمشق کے بادشاہ انہیں پریشان کیا اور ان سے گستاخی کی تو حضرت ابراہیم اپنے آدمیوں کے ساتھ حضرت کی مدد کو پہنچے اور شاہ دمشق کو شکست دے کر دمشق کی سرحد تک اس کا تعقب کیا۔ جنگ میں جب حضرت ابراہیم کامیاب و کامراں واپس آئے پیوسی بادشاہ نے شہر سے نکل ان کا استقبال کیا۔

عرب کی قدیم تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیم اسی وادی سے پل لیا اور اسٹیل کو وادی فاران میں چھوڑ گئے تھے۔ حضرت ابراہیم نے یہیں 175 ایک پچتر سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور جردن میں دفن ہوئے پھر ان کی وفات کے 10 سال بعد حضرت یعقوب نے بیت المقدس کے ایک مقام ”بیت ایل“ پر ایک مذبح تعمیر کیا۔ اس کے کئی صد بعد حضرت سلیمان نے اس قربان گاہ کے کنذرات پر ”سلیمانی“ کی عمارت تعمیر کی تھی۔

کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔

یعقوب ان لوگوں سمیت جو اس کے ساتھ تھے لوز پہنچا۔ بیت

ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے۔ وہاں اس نے مذبح بنایا اور

اس کا نام ”بیت ایل“ رکھا۔

جب حضرت یعقوب طویل جلاوطنی کے بعد واپس آئے تو ان کا نام اسرائیلؑ وہ اپنے بھائی اردم کے خوف سے جلاوطن ہوئے تھے۔ مگر اب ان کے بھائی نے انہیں مظاہر کیا اور یہ علاقہ یعقوب کے حوالے کر کے پسپا ہو گئے۔ اسی اردم کے بیٹے حضرت تھے حضرت یعقوب کا دور 2200 ق م (بیسویں صدی قبل مسیح) بتایا جاتا ہے۔

بیت ایل کے خدا کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوب نے اسے عالم رکھا اور اس کے نام کا ایک مذبح تعمیر کیا۔ اسی مقام سے حضرت یوسف اپنے کی شرارت سے تاجروں کے ہاتھ فروخت ہو کر مصر پہنچے تھے۔ یوسف کا حسن بے اچانچہ جب بازار مصر میں ان کی فروخت کے لئے بولی شروع ہوئی تو شاہ مصر نے رکھا جاتا تھا اس کی بیوی زلیخا نے یوسف کو خرید لیا۔ یوسف غلام کی حیثیت سے عمل میں پہنچے مگر زلیخا یوسف کے حسن کی غلام ہو چکی تھی۔

یوسف زلیخا کی ایک الگ داستان ہے جو دامن یوسف کے نام سے لکھی گئی ہے۔ جب مصر کے بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیم کے پوتے اسرائیل (یعقوب) کی اولاد جو ان کے برادران یوسف کے نام سے مشہور ہیں حضرت یوسف کے پاس مصر میں پہنچے کے ان بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں پھینک دیا تھا مگر یوسف نے اپنے بھائیوں کو لگایا۔ یوسف کی وجہ سے آل اسرائیل کو مصر میں پڑا عروج حاصل ہوا۔

یوسف کا انتقال ہوا تو آل اسرائیل عتاب نازل ہوا اور یہ قوم نخوت اور ادبار کو برپا ہوئی پھر جب چار سو سال غلامی میں گزرے تو اللہ تعالیٰ کو بنی اسرائیل پر اور ان میں حضرت موسیٰ کو مبعوث کیا۔ موسیٰ نے مصر کے شہنشاہ فرعون کے ظلم سے انہیں نجات دلائی اور انہیں دریا پار کر کے وادی سینا میں لے گئے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں کہہ طور ہے جس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے تھے اسی لئے وہ کلیم اللہ کہلاتے تھے۔

بنی اسرائیل فطرتاً بدطینت اور نافرمان ہے۔ وادی سینا میں آباد ہوتے ہی یہ قوم ان کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنے لگے۔ جب موسیٰ نے انہیں سختی سے منع کیا انہی کے خلاف کھڑے ہو گئے اور ان کی صریحاً نافرمانی شروع کر دی۔ حضرت ”موسیٰ“ انہیں حکم دیا کہ وہ بیت المقدس کو واپس چلیں تو جو ان کا اصل مرکز تھا تو انہوں نے موسیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور صاف لفظوں میں کہا۔

”تو اور تیرا رب جائے ہم تو ہمیں بیٹھے ہیں“

ناکے اس جواب سے موسیٰ بہت مایوس ہوئے۔ خدا کو بھی ان کا جواب ناگزیر گزرا لایہ سزا دی گئی کہ جب تک ان کے تمام بالغ مرد مرنے جائیں گے اس وقت تک ان کی تہ میں پریشان بھٹکتی رہے گی۔ طبری نے نخوت کے اس زمانہ کو چالیس سال اس دوران بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے تین لاکھ آدمی مرے پھر یہ بیت المقدس داخل ہو سکے۔ روایت ہے بنی اسرائیل اپنے اصل مرکز یعنی بیت المقدس سے

جس جوش و جذبہ سے سرشار ہو کر فاتح بیت المقدس بنے تھے وہ جذبہ معدوم نہیں ان میں پرانے جذبہ اور جوش کا احیاء ہوتا اور کچھ دن وہ خدا پرست رہتے رہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہودی قوم جسے وہ بیت المقدس سے بالکل بے باغ تھے اس قوم نے زور پکڑا پھر ایک وقت وہ آیا جب محکوم یہودیوں نے سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور انہیں بیت المقدس سے نکال باہر کیا۔

پھر بیت المقدس کے دروازے بند ہو گئے اور یہ قوم طوائف الملوکی کا شکار بن گئی۔ ایک حاکم اعلیٰ نہ تھا بلکہ قبیلہ قاضیوں سے بٹ گئے تھے۔ یہ قاضی ان کے سردار ہوتے اور اپنا حکم چلاتے تھے مگر اس قوم کی اخلاقی اور معاشرتی حالت رنجی تھی خود ان کے قاضی اور کاہن (مذہبی پیشوا) ان کی بد اعمالیوں میں شریک حالات سدھرنے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گئے۔

دور غم و اندوہ اور ادبار میں یہودیوں میں سیموئیل نبی مبعوث ہوئے۔ اس نبی کے نام بنی اسرائیل کو اضمحلال پرستی (بت پرستی سے) چھٹکارا دلایا اور انہیں اللہ کے پایا۔ یہودیوں نے ایک بار پھر سنبھالا لیا۔ ان کا دور غلامی ختم ہو گیا تھا اور پرانی بات لوٹ آئی تھی۔ سیموئیل نبی کو یہودی حضرت موسیٰ کے بعد دوسرا نبی شمار کیا۔ جب سیموئیل کا وقت آخر آیا تو انہوں نے بنی اسرائیل کی مرضی کے تحت رت طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا۔ یہاں پر اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ طالوت ہونے سے تیس سال پہلے یعنی 1050ء ق م میں شدودی قوم بنی اسرائیل کو مار کر تابوت سیکنہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ تابوت سیکنہ ایک صندوق تھا جس میں تورات کے تبرکات رکھے گئے تھے۔ مگر صرف سات ماہ بعد انہوں نے خود ہی اس راہیں دیدیا تھا۔

ت کا بیشتر وقت فلیتوں (یہودیوں) سے جنگ کرتے گزرے۔ طالوت کے مخالف کافر کی لکھن جالوت کے ہاتھ میں تھی۔ جالوت بڑا سفاک اور ظالم تھا۔ بہادری میں وہ نہیں رکھتا تھا۔ مگر طالوت اور جالوت کی ان جنگوں میں ایک جوان رعنا نے اُٹھ کر بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس کا نام داؤد تھا مخالف سردار جالوت کی لکھن سے مارا گیا تھا۔ انہی داؤد کو آگے چل کے پیغمبری عطا ہوئی تھی اور یہ نبی اساتھ بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی منتخب ہوئے تھے۔

ات کے آغاز عہد میں بنی اسرائیل نے قوم کی صورت اختیار نہ کی تھی بلکہ وہ لڑنے کے لئے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا تھا۔ حضرت

دو سال تک باہر رہ کر پھر وہاں واپس آئے تھے۔

بنی اسرائیل بیت المقدس میں واپسی ایک شدید جنگ کے بعد 1451ء ق م میں تھی۔ اس وقت بنی اسرائیل کا سردار یثوع بن نون تھا اور بیت المقدس کے بادشاہ اودنی صدق تھا۔ جس وقت بنی اسرائیل حملہ آور ہوئے اس وقت شاہ یروشلم کی فلسطین کے چار اور بادشاہ جرون، برلوت، کلیس اور عجلون نے اس کی مدد کی تھی۔ اسرائیل نے پانچوں بادشاہوں کے متحدہ لشکر کو شکست دی اور پانچوں بادشاہ جنگ میں گئے اور پورے فلسطین پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ عموادی بادشاہوں کے مارے جا۔ بعد بنی اسرائیل نے جرون کو اپنا صدر مقام بنایا اور اس سلطنت کی سرحدیں شام اور یمن تک پہنچ گئیں۔ حضرت یوسف اس علاقہ کے مقام کنعان میں پیدا ہوئے انہیں خوبصورتی کی وجہ سے ”ماہ کنعان“ کہا جاتا تھا۔

آثار قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلتا ہے کہ یثوع بن نون کی بیت المقدس میں سے پانچ سو سال قبل برنجی دور کا آغاز ہو گیا تھا اور فلسطینی تانبے میں ٹین ٹاکری کا استعمال کرنے لگے تھے۔ عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے فراعنہ مصر کے ہاتھوں دو سو سال تک ذلت کی زندگی گزاری تھی۔ اس کے چالیس سال تک وادی تیار میں بھٹکے تھے تب جا کے انہیں بیت المقدس میں قدم ر سعادۃ نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت ابراہیم کو انتقال کئے ہوئے پانچ صدیاں تھیں۔ بنی اسرائیل جس وقت فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اس وقت وہ خدا پر دیندار تھے۔ وہ احکام الہی بجالانے میں کوئی پس و پیش نہ کرتے تھے۔

یثوع بن نون نے ارض فلسطین کو تقسیم کیا تھا۔ اس نے یروشلم یودا کو دیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ یودا نے اپنے بھائی شمعون کی مدد سے لڑ کر اس شہر پر قبضہ کیا۔ یہ واقعہ 1400 ق م کا ہے۔ انجیل اس بات کی بھی گواہی دیتی ہے کہ یودا نے کے لوگوں کو تہ تیغ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور شہر کو بری طرح تباہ کر دیا۔ یثوع بیت المقدس پر قبضہ کے بعد اپنا فاتح لشکر لے کر آگے کی طرف روانہ ہوا۔ نے شہر کی گمرانی بنی بنیمین کے سپرد کی تھی۔ یودا نے بنی بنیمین کو تاکید کی تھی کہ یہودیوں سے جو وہاں کے قدیم باشندے تھے خالی کرالیا جائے مگر بنی بنیمین یہودیوں سے نکلنے میں ناکام ہو گئے تھے۔

پھر جب یہودی طاقت کے نشہ میں جا رہے تھے اس وقت سے بٹ گئے اور انہوں نے انا کی تعمیل سے روگردانی شروع کر دی تو وہ ذلیل ہو گئے اور ان کا وقار کا آہستہ آہستہ

حضرت داؤد نے اپنے بیٹے سلیمان کا کام آسان کرنے کے لئے سونا چاندی 'لوہا' بلکہ کہ لبنان سے دیوار کی لکڑی تک منگوالی۔ پھر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بیٹے کو ہیکل کی تعمیر کی جگہ اور اس کے مجوزہ نقشہ سے آگاہ کیا۔ یہ ہیکل کا نقشہ حضرت داؤد نے عالم رویا میں دیکھا تھا۔ 1015ء ق م میں حضرت داؤد کا ہلاک ہوا اور 1012ء ق م میں حضرت سلیمان نے ہیکل سلیمانی کی تعمیر شروع کرائی۔ ہر زمانہ میں فنِ تعمیر سے ناواقف رہے۔ اس لئے تعمیر کے لئے مصر اور لبنان سے اپنے بچے حضرت داؤد نے اپنے بچے ایک کروڑ تیس ہزار پونڈ سونا اور 1270 ہزار لوہا چھوڑی تھی۔

یہ روایت کے مطابق 7 سال میں ہیکل سلیمانی کی عمارت تیار ہوئی۔ اس میں بے ن مرف ہوئی۔ زرعی اٹھنی اور پانچ ہزار ہزاروں کے نذرانے بھی اس تعمیر میں کام آئے۔ ہوا ہے دولاکھ آدمیوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ یہودیوں کی کتاب سکہ کے مطابق ہیکل سلیمانی اپنے دور کی بے مثال عمارت تھی۔ اس عمارت میں ایک لایا گیا تھا جس میں خداوند کے زمانہ کا ثبوت کیونکہ رکھا گیا۔ اس صندوق میں ہیکل کی ہڈیاں اور کپڑے اور دیگر تحریکات تھے۔ مشہور ہے کہ بابلی کے بادشاہ بخت نصر کے دوران سکینہ ایسا عائب ہوا کہ آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

حضرت سلیمان ایک برگزیدہ نبی ہونے کے علاوہ ایک زبردست بادشاہ بھی تھے۔ خدا نے ان کی اور دیوؤں کو ان کے قبضہ میں دیا تھا۔ آپ کا تخت دیوؤں کے گاندھوں پر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ تمام چاند پرند کی بولیاں سمجھتے تھے۔ حضرت سلیمان نے ان کے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا تھا جس کی تعمیر تیرہ سال میں مکمل ہوئی۔ ان کے بے شمار دولت صرف ہوئی محل کی آرائش اور زیبائش میں نادر اور نایاب نکل ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی تھی۔

حضرت سلیمان کے اسی محل میں حضرت سلیمان نے ملکہ بلقیس سباء کا استقبال کیا تھا۔ ملکہ سباء کی ملکہ تھی جو یمن میں واقع ہے۔ ملکہ سباء جب حضرت سلیمان سے القدس گئی تو اس کے ساتھ ہزاروں من سونا تھا اور دنیا کی بہترین خوشبوئیں لے کر تھیں۔ ملکہ نے جو خوشبوئیں حضرت سلیمان کے حضور پیش کیں وہ دنیا میں کسی اور خوشبو (سلیمان بلقیس سباء کے نام سے ایک تفصیلی کہانی لکھی جا چکی ہے) کی اسطاعت حضرت سلیمان کے عہد میں بام عروج پر تھی۔

حضرت سلیمان کی وفات ہوتے ہی سلطنت بیت المقدس پر زوال آگیا۔ یہ عظیم

طاہوت نے ان کا قبائلی نظام ختم کرانے کی پوری کوشش کی اور وہ بڑی حد تک اس کامیاب بھی ہوئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ایک روحانی آمر کہا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت پادشاہ، روحانی پیشوا، قاضی القضاہ، استاد اور پیغمبر تھے۔ طاہوت نے بھی اپنے وارثوں کو جبروت کو بنایا تھا جہاں سے وہ جنگوں کی نگرانی کرتا تھا۔ طاہوت شاہی آداب کا ماہر تھا۔ خود ان آداب کی پاسداری کرتا اور لوگوں کو آداب شاہی پر عمل کرنے کا حکم دیتا تھا۔ طاہوت کے بعد بنی اسرائیل نے حقیقہ طور پر داؤد کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور ابتدائی وارث سلطنت جبروت ہی تھا کیونکہ بیت المقدس پر یہی قاضی تھے۔ حضرت داؤد اسرائیلی قبائل کی متحدہ طاقت کے ساتھ جنوبی بیت المقدس پر حملہ کیا اور ایک شدید کے بعد بیت المقدس جنوبی پر حضرت داؤد کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد حضرت داؤد بیت المقدس پر ایک شدید حملہ کیا۔ اس حملہ کا مقصد شاہی بیت المقدس پر قبضہ کرنا آخر ایک سخت لڑائی کے بعد بیت المقدس کا شاہی حصہ فتح ہو گیا اور اسرائیل کی وہاں وسیع سلطنت قائم ہو گئی۔ یہی شہریدہ کر دئے گئے یہ پہلا موقع تھا کہ بنی اسرائیل کا پورا بیت المقدس پر قبضہ ہو گیا۔

یہودیوں کی شکست سے بیت المقدس کے قریب کی تمام ریاستیں خوفزدہ ہو گئیں انہوں نے اپنا ایک متحدہ محاذ بنالیا اور تمام لشکروں کو ملا کر جبروت پر حملہ کر دیا۔ حضرت خود بہادر تھے ان کی فوج کے حوصلے بلند تھے۔ انہوں نے مشترکہ لشکر کو شکست دے دیا۔ ان میں سے بعض ریاستوں نے حضرت داؤد کی قیادت قبول کر کے حضرت داؤد دوستی کر لی۔ حضرت داؤد نے کوہ زیتون پر شاہی محل تعمیر کرایا اور وادی میں شاہی لگوایا۔ حضرت داؤد کا تینتیس سالہ (33) دور حکومت میں امن کا زمانہ بہت کم رہا برابر لڑائیاں ہوتی رہیں مگر ان لڑائیوں سے حضرت داؤد کو فائدہ ہی ہوتا رہا۔

بنی اسرائیل قبائل کے بجائے اب ایک قوم بن چکے تھے۔ قرب و جوار کی ریاستوں پر ان کی بہادری اور شجاعت کا رعب بیٹھ گیا تھا۔ خزانے دولت سے معمور اور رعیت خوشحال۔ مال غنیمت اور نذرانوں میں اس قدر دولت حاصل ہوئی تھی کہ سے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ حضرت داؤد کی خواہش تھی کہ وہ تابوت سکینہ کے لئے گھر تعمیر کریں۔ مگر اسرائیلیات (اسرائیلی کتب کے حوالے) کے مطابق انہیں خدا اطلاع دی کہ وہ گھر جس کا داؤد ارادہ کر رہے ہیں وہ اس وقت نہیں بلکہ مستقبل میں کے بیٹے کے ہاتھ سے تعمیر ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اس تعمیر کے لئے ابھی سے سلمان کرنا شروع کر دیا۔

یہ کہ زرد باہل ساتی ایل نے جو حضرت داؤد کی نسل سے تھا صیہونیت کی پہلی
ہاتھ دیا۔ صیہون دراصل بیت المقدس کی ایک پہاڑی کا نام ہے حضرت داؤد نے
اپنی فتح کا جشن منایا تھا۔ اس لئے یہودی اس پہاڑی کو مقدس خیال کرتے
رہے۔ بیت المقدس کو ”ذخیر صیہون“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ تحریک صیہونیت کے معنی
بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کرنا اور وہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے۔

یہودی جب ایک عرصہ تک اپنے اعمال کی سزا بھگت چکے اور جب 539 ق م نے
کے پہلے کسریٰ خسرو نے جسے باہل میں فورس کا نام دیا گیا ہے بیت المقدس کو اس
بہ عام منادی کے ذریعہ یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت عطا کی۔ پس
ہائے قافلے کے قافلے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ یہ لوگ خالی ہاتھ تھے
لئے کسریٰ نے ازراہ الطاف خسروانہ انہیں وہ سونے اور چاندی کے برتن واپس لے
لی اجازت دیدی جو بخت نصر اپنے ساتھ اٹھوا لایا تھا۔

یہودیوں کا اس وقت کا قائد ”شیش“ تھا۔ کنارہ فرات سے تمام یہودی فلسطین
نہیں گئے جانے والوں کی مجموعی تعداد صرف 4336 بتائی گئی ہے۔ فلسطین میں
ماکی واپسی یثوبن صدق اور زرد باہل بھی ساتھی ایل کی قیادت میں ہیکل سلیمانی کی از
قبر شروع ہوئی۔ یہودیوں کے دل بچھے ہوئے تھے۔ وہ اچھے معمار بھی نہیں تھے اس
م بھی بڑی سست رفتاری سے شروع ہوا اور اس کی تعمیر میں بیس سال لگ گئے۔

ہیکل سلیمانی کی تیاری کے بعد عزرا جو ایک ماہر فقیہ تھا اس نے وہ کتاب مقدس
تہذیب کرنا کی جو اس نے بزرگ یہودیوں کے مشورے اور اپنی یادداشتوں کے زور
نہی دی تھی۔ اصل توریت بخت نصر کے حملہ میں جل کے خاک ہو گئی تھی اور یہ
اوتار جو یہودیوں میں زائج ہے یہ دراصل عزرا کی تالیف ہے جس کا نہ صرف لہجہ
بلکہ اس میں عزرا نے اپنی طرف سے بہت سی عبارتیں بڑھادی
ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے باوجود فصیل شہر اور شہر ابھی تک لمبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔

یہودیوں کو فلسطین جانے اور ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی لیکن
اہل فصیل شہر کی تعمیر کی اجازت نہ تھی۔ ایک روایت کے مطابق بیت المقدس کی
کے ایک سو تینتالیس سال (143) بعد ”نحمیاہ“ نامی ایک شخص نے ایران پہنچ کے
اے شہنشاہ اردشہر اول سے یروشلم کی فصیل اور شہر کی تعمیر کی اجازت حاصل کی۔ وہ
اہل طرح کہ شہنشاہ ایران شراب کے نشہ میں مدہوش تھا۔ اس وقت ”نحمیاہ“ نے
اہل کے تعاون سے اجازت حاصل کی۔

سلطنت شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ پھر جنوبی حکومت کے یہودی راہ مستقیم
سے ہٹ کر بت پرستی پر راغب ہوئے اور انہوں نے باغوں اور گھروں میں بت بیکران کی
پہنچ شروع کی اور طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا ہو گئے۔ جو قوم راہ مستقیم سے ہٹ
جاتی ہے خدا اس پر اپنا قہر نازل کرتا ہے۔ چنانچہ مصر کے بادشاہ نے حملہ کر کے جنوبی
حکومت کو اپنا باغدار بنالیا۔

اب یہودیوں اور بیت المقدس کی بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ یہودیوں کی دونوں
سلطنتوں پر کبھی مصری کبھی شامی اور کبھی باہل کے آشوری حملہ کرتے اور مال غنیمت لوٹ
کر لے جاتے۔ ہیکل سلیمانی کا تمام قیمتی سامان اس طرح لٹا رہا۔ عیاری، مکاری اور
غدار یہودی قوم کی فطرت میں داخل ہے اور یہ اس سے کسی زمانہ میں بھی باز نہ آتے
تھے۔ باہل کے شہنشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کے پہلے حملے میں بیت المقدس کو ہی ہم
کے لوٹا اور اپنی مرضی کا بادشاہ بنا کے لوٹ گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد یہودیوں نے بخت نصر کے
خلاف مصریوں سے معاہدہ کیا اور بخت نصر سے بغاوت کردی۔ بخت نصر ایک لشکر جرار کے
ساتھ بیت المقدس میں داخل ہوا اسے کوئی روک نہ سکا۔ اس نے پہلے سے زیادہ قتل و
غارت گری اور لوٹ مار کی اور یہودیوں ہی میں سے ایک کو بادشاہ بنا کر لوٹ گیا لیکن
یہودی کس کے ساتھ وفا کرنا تو جانتے ہی تھے۔ انہوں نے پھر بغاوت کے ڈول ڈالے۔ اور
بار بخت نصر نے یہودیوں کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ اس نے بیت المقدس میں قتل عام کا م
دیدیا۔ تمام عمارتیں بمعہ ہیکل سلیمانی کے زمین کے برابر کر دی گئے۔

اس طرح اس واقعہ بخت نصر بیت المقدس کو اس طرح ویران کر کے واپس ہوا کہ ایک
طویل عرصہ تک ان کھنڈرات پر کوئی عمارت کھڑی نہ ہو سکی بخت نصر اپنے ساتھ ان تمام
یہودیوں کو لے گیا جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے۔ باہل پہنچ کے اس نے یہودی اسیروں
دریائے فرات کے کنارے آباد کیا۔ ان قیدیوں نے اس جگہ کا نام تل ابیب رکھا۔ یہودیوں
کا موجودہ دارالسلطنت اسی کی یادگار ہے۔ بیت المقدس کے اس حملے میں بخت نصر۔
یہودیوں کے تمام مذہبی کتابوں کو جلا دیا تھا۔ اس میں توریت بھی شامل ہے۔ اس
یہودیوں کی جدید توریت وہ نہیں جو آسمانی کتاب تھی بلکہ یہ یہودیوں کے کاہنوں اور قاضیوں
کی یادداشتیں ہیں جو توریت کی تباہی کے بعد ترتیب دی گئی تھیں۔ کاہنوں اور قاضیوں
اس توریت میں اپنی مرضی کے مطابق اس قدر کمی بیشی کی ہے کہ اس کا اوصاف متن
ہو کر رہ گیا ہے۔

اس دور غلامی میں دانیال اور عزیز بنی ان خانماں برباد یہودیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔

ہی نام کا بچہ پیدا ہو رہا ہے جو ہیرودا عظم کی سلطنت کی مخالفت کرے گا۔ اس نے دو سال کے اندر پیدا ہونے والے تمام لڑکوں کو اٹھوایا اور قتل کرا دیا۔ اسی طرح اپنی موت سے چند دن پہلے حکم دیا کہ یہودیوں کے تمام بڑے بڑے سردار اور امیر لے جائیں۔ چنانچہ یہودیوں کے کئی سو سردار گرفتار کر کے قید کر دیے گئے۔ اس سردار کو بتایا کہ اس نے یہودیوں کو اس لئے گرفتار کرایا کہ انہیں میری وفات قتل کیا جائے۔ اس کا اثر یہ ہو گا کہ یہودی میری موت پر خوشی نہ مناسکیں گے بلکہ واروں کی موت پر ماتم کناں ہوں گے۔

ہیرودا عظم کے مرنے پر یہودی یعنی جنوبی بیت المقدس کا بادشاہ ارخلدوس (اگرہا) ہوا۔ یہودیہ میں تین زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اول عبرانی اس زبان کو کاہن اور ربی نے عام فلسطینیوں میں آرامی زبان رائج تھی۔ تیسری زبان جسے دربار اور بادشاہ کی اصل تھی یہ یونانی تھی۔ عبرانی بولنے والے کاہن اپنے کو سب سے برتر سمجھتے تھے جو عبرانی زبان نہیں بولتا وہ ”بے روح“ ہے۔

ماہوں کا یہ کہنا ہے حضرت عیسیٰ کو چار سال کی عمر میں بیت المقدس لایا گیا تاکہ خدا کے سامنے نذر گزاری جائے۔ عیسائی مورخوں نے لکھا ہے کہ عیسیٰ کے نہیں لے کر بیت المقدس گئے تھے۔ یہاں والدین کا لفظ قابل غور ہے کیونکہ بچہ غیر باپ کے خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے لیکن عیسائیوں نے عیسیٰ کو خدا کا مگر زیادہ امکان ہے کہ انہیں 12 سال کی عمر میں بیت المقدس لایا گیا وہاں نے خود کو

”اللہ کا فرستادہ“

رایا اور یہودیوں کو دعوت حق دی لیکن یہودیوں نے انہیں جھٹلایا۔ اس طرح نیا پانچ مرتبہ بیت المقدس تشریف لائے اور یہودیوں کو ”دعوت حق“ دی لیکن یہاں پر عیسیٰ کو جھٹلایا اور انہیں تکلیف دینا شروع کر دیں۔ اس وقت یہودہ (جنوبی) کی حکومت کا بادشاہ ہینش یا پلاطس تھا۔ وہ یونانی تھا۔ یہودیوں نے اس عیسیٰ کی شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ عیسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے پر آمادہ نہیں تھا وہ ٹالتا رہا۔ پھر ایک دن حضرت عیسیٰ عیسائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہودیوں سے فرمایا۔ ”تم لوگ مجھے جھٹلاتے ہو تم دیکھو گے اس پیکل کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ باقی نہ رہے گی۔“ حضرت ارشاد پر یہودی آئے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بادشاہ پلاطس کو مجھ کا

پس 54 روز کی مسلسل کوشش سے بیت المقدس کی فیصلہ تعمیر ہو گئی لیکن یہ تعمیر کی پہلی بنیادوں پر پرانے سامان سے مکمل ہو گئی تھی۔ پھر بھی بیت المقدس کا شہر آباد ہو گیا اس کی پچھلی رونقیں لوٹ آئیں اور یہودی خوشحال ہو گئے مگر خوشحال ہوتے ہی انہوں نے پھر خدا کی راہ چھوڑ کے بت پرستی اختیار کر لی اور دنیا کے تمام محبوب ان میں پیدا ہو گئے ان کے عیش و عشرت کا یہ عالم تھا کہ 332ء ق م میں جب سکندر اعظم نے ایران شہنشاہ دارا کو شکست دی اور غزہ کی فتح کے بعد یروشلیم کی طرف بڑھا تو بڑوں یہودیوں نے اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے شہر سے تین میل آگے نکل کر سکندر کا استقبال کیا۔ اس طرح شہر محفوظ رہا ایک روایت کے مطابق سکندر کا اسی شہر میں انتقال ہوا تھا اور اس لاش کو سونے کے تابوت میں رکھ کر سکندریہ بھیجا گیا تھا۔

جب سکندر اعظم کی سلطنت کا بڑا وارہ ہوا تو بیت المقدس مصریوں کو دیا گیا۔ پھر جب بیت المقدس مصریوں اور شامیوں کے درمیان ”ہڈی“ بن گیا کبھی اس پر شامیوں کا قبضہ ہو اور کبھی مصری اسے اپنے قبضہ میں لے آتے پھر یونانی اس پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے یہودیوں کا قتل عام کیا اور تمام عبادت گاہوں کو تباہ کر دیا۔ اس ظلم و ستم کے نتیجہ میں یہ بیت المقدس میں ایک تحریک ”مکائی“ کے نام سے شروع ہوئی۔ مکائی ایک یہودی تھا اسی نے اپنے بیٹوں کی مدد سے یونانیوں کے خلاف تحریک چلائی۔ یہ تحریک کامیاب ہوئی اور یونانیوں کو شکست کھا کر بیت المقدس چھوڑنا پڑا۔ مکائی نے اس فتح کا ایک زبردست جشن منایا اس جشن کو یہودی ”عید منوکہ“ کہتے ہیں اور یہ عید آج تک یہودیوں میں منائی جاتی ہے۔ بیت المقدس کا شہر اس طرح انقلاب سے گزرتا ہے ہیرودا عظم کے ہاتھ آیا۔ اس نے اسے بہت ترقی دی۔ پیکل سلیمانی میں اضافہ کیا مگر پیکل کے ارد گرد رقص گاہیں اور موسیقی کے تعمیر بھی تعمیر کئے۔ ہیرودا عظم کے بعد بیت المقدس تین ریاستوں میں بٹ گیا یہ تینوں ریاستیں سلطنت روم کے ماتحت رہیں۔

یہ اجمالی اور مختصر حالات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کے ہیں۔ جب حضرت عیسیٰ ناصرہ میں پیدا ہوئے اس وقت بیت المقدس کا بادشاہ ہیرودا عظم تھا۔ یہودی نہیں بلکہ آردی مذہب کا پیروکار تھا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چند سال پہلے ہیرودا عظم کا انتقال ہوا تھا۔ چونکہ یہ یہودی نہ تھا اس لئے یہودی اسے پسند نہ کرے حالانکہ ہیرودا عظم نے پیکل سلیمانی کو آرامتہ کرنے میں بہت دولت خرچ کی تھی لیکن یہودیوں کا دل پھر بھی اس کی طرف سے صاف نہیں تھا۔

ہیرودا عظم بڑا ظالم اور سفاک انسان تھا۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو اسے معلو

کہ وہ عیسیٰ کو سولی دیدے پلاس نے کہا۔

”میں اس راہباز جوان کے خون سے بری الذمہ ہوں“

یہ کہہ کر اس نے حضرت عیسیٰ کو 16 اپریل 30ء کو رومی سلطنت سے بغاوت کے جرم میں سولی پر چڑھا دیا۔ متی کی انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ کو یسوی کاہنوں کے اصرار پر مصلوب کیا گیا جبکہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے اور یہ قرآن حکیم کا اعلان ہے حضرت عیسیٰ کو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ مصلوب بلکہ خدا نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔

یسودیوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا تو دیا لیکن انہیں اس کی جلد سزا مل گئی۔ صرف چالیس سال بعد رومیوں نے یسودیوں کا قتل عام شروع کر کے ان کے ہیکل سلیمان کو زمین کے برابر کر دیا۔ یہ قتل عام ایسا خوفناک اور عظیم تھا کہ یسودیوں میں سے ایک یسودی بھی باقی نہ بچا تھا مغربی جانب۔ دراصل یسودیوں کی اس تمام خباثت اور بربادی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں کسی یسودی کاہن کا یہ قول درج ہے۔

”خدا نے یسود کو فرشتوں سے بہتر قرار دیا ہے اور یسود اور غیر

یسود میں وہی فرق ہے جو انسان اور درندے میں ہوتا ہے۔“

یسودیوں کا یہ تفاخر آج بھی قائم ہے اور وہ دنیا کی ہر قوم کو اپنے سے کم تر خیال کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی صدائے حق سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے تھے لیکن یسودی انہیں چین نہ لینے دیتے تھے چونکہ بیت المقدس میں رومی گورنر کا ماتحت رہتا تھا۔ اس لئے وہ عیسائیوں اور یسودیوں کے جھگڑے میں دخل نہ دیتا تھا۔ روم میں اس وقت تک بت پرستی اور اصنام پرستی کا رواج تھا۔

288ء میں بیت المقدس میں ایک مذہبی انقلاب آیا۔ وہ اس طرح کہ شہنشاہ روم قسطنطین جس کے ماتحت بیت المقدس تھا اس نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ شہنشاہ روم دراصل اندرونی خلفشار سے تنگ آگیا تھا اور اس نے روم کو چھوڑ کے باسفورس کے دہانے ایک نیا شہر قسطنطیہ آباد کیا تھا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنا کر وہاں مقیم ہو گیا تھا۔ اس کا سلطنت روما دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک روما مغربی تھی جس کا دارالسلطنت روما اور دوسری سلطنت روما مشرقی جس کا دارالسلطنت قسطنطیہ تھا۔

اس دور میں عیسائیوں نے سنبھالا لیا۔ اس سے پہلے وہ بیت المقدس کو چھوڑ پھاڑوں اور ویرانوں میں جا چکے تھے۔ شہنشاہ قسطنطین نے بیت المقدس میں مشہد اور کلیسائے نشور تعمیر کرائے۔ بیت المقدس چھوڑنے والے عیسائی پھر واپس آئے وہاں آئے ہوئے۔ عیسائی روایتوں کے مطابق شہنشاہ قسطنطین کی والدہ ہیلنا نے خواب میں دیکھا۔

پلاڑی کی پاڑی پر وہ صلیب دفن ہے جس پر حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ چنانچہ ن پاڑی پر کھدائی شروع ہو گئی اور وہاں سے صلیب برآمد کی گئی۔ پھر اس صلیب پر سونا بھا کر بڑے اہتمام سے اپنے بیت المقدس کے بڑے کلیسا میں سجایا گیا۔ اس صلیب کو صلیب الصلوب کا نام دیا گیا اور اسے جواہرات کے ہاروں سے ڈھانپ دیا گیا۔

عیسائی مورخوں کے ایک بیان کے مطابق شہنشاہ قسطنطین بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی اور خسر کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اس وقت رومیوں اور ایرانیوں کی آویزش شروع ہو چکی تھی۔ یسودی ہمیشہ کی طرح حکومت وقت یعنی رومیوں سے غداری کر رہے تھے۔ آخر اسی غداری کے طفیل ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز نے رومیوں کو شکست کے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ ایرانیوں نے بیس ہزار سے زائد عیسائیوں کو تہ تیغ کیا اور بیت المقدس کے تمام کلیسا اور مزار مقدس کو برباد کر دیا۔ تمام پادری قید ہوئے اور خزانہ پر پانچوں کا قبضہ ہو گیا۔

ایرانیوں کا بیت المقدس پر قبضہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ روم کے شاہ ہرقل نے خسرو کو شکست دے کر عیسائیوں کا بدلہ لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہرقل نے یسودیوں کو غداری کی بنا پر بیت المقدس سے باہر نکال کیا۔ اس وقت عرب میں آفتاب نبوت ضیاء ریزہ لپکا تھا اور فتح روم کی شہادت مل چکی تھی۔ یہ شہادت سورۃ الروم میں موجود ہے۔ ارادان عرب (مشرکین مکہ) کو ایرانیوں سے ہمدردی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ رومیوں اور ایرانیوں کی جنگ میں رومیوں کو شکست ہو اس لئے جب مسلمانوں نے سورۃ الروم کے ملان کے تحت رومیوں کی فتح کی خبر دی تو مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا خوب تسخر اڑایا۔ رجب جنگ میں رومیوں کو فتح حاصل ہوئی تو مشرکین کے حوصلے پست ہو گئے۔

واقعہ معراج۔۔۔ میرا قلم اک دم رک گیا۔ شاید اس لئے کہ اسلامیانِ عالم کے عظیم ترین رہنما اور عظیم ترین پیغمبر اور رسول محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرنا تھا جس نے مسلمانوں کے دین کو اس کے رسولؐ نے عظیم یقیقوں سے روشناس کرایا اور بتایا کہ ہمارے سروں پر گھرے ہوئے اس نیلے آسمان پر کیا ہے اور وہاں کونسی مخلوق آباد ہے اور خلاقِ عالم پر کیسا روح پرور سماں ہے۔

میرے قلم نے آگے بڑھنے سے پہلے ایک بار پلٹ کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف چند دراق میں 2600 ق م سے 800 عیسوی تک یعنی تقریباً ”تین ہزار تین سو سال کے واقعات کو سمودیا ہے۔ ہم باتوں ہی باتوں میں تین ہزار سال سے زیادہ کا سفر طے کر چکے تھے اور اب ساتویں صدی عیسوی کے کسی سال میں تصور کی آنکھوں سے دنیا کے عظیم

ترین اور مکمل انسان کا رف رف پر سوار فضاؤں میں پرواز کرتے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں اللہ وہ کیا مبارک دن تھا کونسا مہینہ اور کس دن کی مبارک رات تھی جب سرکارِ دو عالم مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ (مکہ سے بیت المقدس) روانہ ہوئے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ تاریخ ہمیں کن کن حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔ پہلی یک سال اور دن کا تعلق ہے تو اس کے لئے مورخین کسی بات پر متفق نہیں ہو سکے مگر اس پر سب کا اتفاق ہے معراج اسرا کا واقعہ شب میں پیش آیا وہ مبارک شب 27 رجب المرجب کی تھی۔ اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ واقعہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے اٹھارہ ماہ پہلے پیش آیا تھا۔ جس نے حرم کعبہ کے بعد حرم القدس کو مسلمانوں کی نظروں میں پاک اور حرک بنا دیا۔

ابن ہشام اور ابن اسحاق کے بیان کی روشنی میں
”پھر اللہ اپنے رسول کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔“

ابن سعد کے بیان کے مطابق۔

رسول اللہ کو معراج مدینہ سے ہجرت سے اٹھارہ مہینے پہلے ہوئی تھی اور رسول اللہ اس رات گم پائے گئے تھے۔ عبدالمطلب کے بیٹے انہیں ڈھونڈتے پھرے عباسؓ بھی انہیں ڈھونڈنے والوں میں تھے۔ وہ رسول کا نام لے لے کر انہیں پکار رہے تھے۔ یاحجر۔ یاحجر۔ رسول اللہ نے یہ آواز سن لی۔ جواب دیا تو عباس نے ان سے

پوچھا۔

”کہاں گئے تھے؟“

رسول اللہ نے کہا۔

”میں بیت المقدس سے آیا ہوں“

عباسؓ نے تعجب ظاہر کیا۔

”ایک رات میں گئے اور لوٹ بھی آئے۔“

رسول اللہ نے فرمایا۔

”ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔“

واقعہ معراج کی ایک بڑی راوی حضرت ام ہانی بنت ابی طالب فرماتی ہیں۔ رسول اللہ کو اسراء ہمارے گھر سے ہوا تھا اور اس شب عشاء

نماز پڑھ کر ہمارے ہاں ہی سو گئے تھے۔ فجر سے کچھ پہلے وہ اٹھے۔ جب نماز پڑھ چکے

۳۷ ام ہانی میں نے تمہارے ساتھ نماز پڑھی جیسا کہ تم نے خود دیکھا تھا۔ پھر میں بیت المقدس گیا میں نے وہاں نماز پڑھی۔ پھر اب تمہارے ساتھ فجر کی نماز پڑھی ہے۔ موصیٰ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔

۳۸ اسراء اور معراج ایک ہی رات ہوا۔ اسراء آغاز تھا اور معراج اختتام۔ رسول اللہ عالمِ ربانی میں روح و جسم کے ساتھ مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تشریف لے گئے۔ پھر مسجد نبویؐ سے سات آسمانوں کی طرف پرواز فرمائی اور اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اے اس موقع پر رسول اللہ پر کچھ وحی کی۔ پانچ نمازیں فرض کیں پھر رسول اللہ اس ن لوٹ کر مکہ آئے اور یہ خبر عام کی۔ حضرت ابوبکر صدیق اور مسلمانوں نے اس کی رات کی مگر کفار نے اسے جھٹلایا۔“

”پس اللہ کریم نے ارشاد فرمایا۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گئی۔ جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ اسے ہم اپنی نشانیوں دکھائیں۔“

قرآن حکیم کی یہ عبارت اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ کو معراج بدن اور روح کے ساتھ ہوئی تھی کیونکہ ”عبد“ روح اور جسم سے عبارت ہے محض روح نہیں۔

بیت المقدس اجڑا اور بتا رہا۔ فاتح آتے اور جاتے رہے مگر تاریخ میں ایک فاتح ایسا بھی ہے جس کے ورود پر شہر نے جشن منایا اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے درمیان وہ فاتح تھا ہے جس نے نے سلطنامہ میں مفتوح کو ایسی مراعات عطا کی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طے پانے والے اس سلطنامہ میں مفتوح کو فاتح قوم کے برابر درجہ دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کو یقین دلایا تھا کہ ان پر اگر کوئی مسلمان انگلی بھی اٹھائے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

حضرت عمر فاروق کے بیت المقدس آنے کا واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کی یہ نشانی تھی اونٹنی پر دو تھیلے دامیں لگے تھے۔ ایک میں کھجوریں اور دوسرے میں سنتو تھے۔ ایک مشکیزہ اور ایک اور بس میں سفر کے لئے ضروری چیزیں تھیں۔ حضرت عمر کے پاس ایک ہی اونٹنی تھی اری باری وہ اور ان کے ساتھ آنے والا ملازم بیٹھتے تھے۔ جس وقت خلیفہ کی یہ بیت المقدس کے قریب مقام جابیہ میں پہنچی تو وہاں حضرت امیر معاویہ گورنر شام، حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص نے خلیفہ دوم کا استقبال ہمیدہ کیا جب وہ اونٹ کی مہار پکڑے آرہے تھے اور ان کا مقدم اپنی باری پر اونٹ مارتا تھا۔

شان تھی اس خلیفہ کی جو مسلمان قوم کا افسر اعلیٰ تھا اور اس وقت مسلمانوں کے قیصر و کسریٰ کانپ رہے تھے کیونکہ اس وقت مسلمان اللہ اور سنت نبوی کے پیرو اس لئے انہوں نے بیت المقدس فتح کیا پھر جب وہی مسلمان جاوہ حق سے ہٹ گئے غار ہوئے اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

یہاں کے جنرل ارطون کو جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے سالار اعظم اور خلیفہ مکہ خالد بن ولید دس خط کر کے بیت المقدس آرہے ہیں تو وہ اپنے اعتماد کے کئی دستے فوج لے کر مصر کی طرف نکل گیا۔ حضرت عمر کی نظر جب اپنے استقبال کرنے والوں پر پڑی تو پیش پیش امیر معاویہ، ابو عبیدہ بن جراح اور خالد بن ولید تھے تو آپ کی اپنی پڑگئے کیونکہ یہ تینوں سردار ریشم کے بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ عزت عمر نے زمین سے چند کنکریاں اٹھا کر مسلمان سرداروں کو ماریں اور غصہ سے تم لوگوں نے صرف دو برس میں اپنی حالت بالکل بدل ڈالی مگر آئندہ دو سو سال تم لٹ میں رہے تو اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہو کر یہ سلطنت کسی اور کو دیدے گا۔ اس طرح میرے سامنے آتے ہوئے ذرا بھی حیاء نہ آئی۔

اس پر سرداران اسلام نے ریشمی لباس اٹھا کر اپنا جسم دکھایا جس پر سلیقہ سے اسلحہ اٹھا۔ ان کے جسم پر اسلحہ دیکھ کر حضرت عمر کا جلال کم ہوا۔ خود ان کے یعنی خالد بن ولید نے خلیفہ المسلمین دوم حضرت عمر کے بدن پر نمدے کا ایک کرتہ تھا جس میں بوند لگے تھے۔ بعض کا بیان ہے کہ حضرت عمر گاڑھے کا کرتہ پہنا کرتے تھے جو ایک سے پہنا ہوا تھا۔

روایت ہے کہ جابیہ پہنچ کر حضرت عمر نے اپنا کرتہ اتار کے ایک مقامی سردار جاسم والے کیا وہ اسے دھو کر اور سی کر لے آیا۔ اس وقفہ میں پہننے کے لئے آپ نے

فتح یرموک کے بعد خلیفہ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق نے عمرو بن العاص المقدس کی طرف توجہ دینے کا حکم دیا۔ یہ عمرو بن العاص وہی ہیں جو بعد میں فاتح نام سے مشہور ہوئے انہیں سیاس العرب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب عمرو بن العاص لشکر کر بیت المقدس پہنچے تو ان کا مقابلہ پر رومیوں کا سب سے بڑا سردار ارطون حضرت عمر کو جب بیت المقدس کے محاصرہ کی خبر ملی اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ بیت المقدس کی کمان جنرل ارطون کے ہاتھ میں ہے تو آپ نے مسکرا کے فرمایا۔

”میں نے یونانی ارطون کے سامنے عرب کے ارطون کو کھڑا کر دیا ہے دیکھئے کرا ہوتا ہے؟“

بیت المقدس کے محاصرہ کے چند ہی دنوں بعد حضرت ابو عبیدہ بھی وہاں پہنچ گئے انہوں نے بیت المقدس کے بڑے بڑے سرداروں کو خط لکھے۔ جس کا مضمون اس تھا۔

صحت اور خوشی ان لوگوں کے لئے ہے جو خدا کی راہ پر چلتے اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لاؤ تو تمہاری اور تمہارے بچوں کی حفاظت ہم پر فرض ہوگی۔ اگر تم ایمان نہیں لاؤ تو ہمیں خراج دو اور ہماری حفاظت میں رہنا اختیار کرو۔ اگر یہ بھی نہیں تو ہم تمہارے مقابلہ پر ایسے لوگ لائیں گے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی آرزو کرتے ہیں اور ہم بغیر فتح کئے یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔

بیت المقدس کے بطریق صفرونیوس نے اپنے سرداروں سے صلاح مشورہ کیا۔ نے بیت المقدس کے معززین کو ایک سفید علم دے کر لشکر اسلام میں بھیجا۔ مسلمانوں کے پاس بطریق کا یہ پیغام لے گیا تھا کہ بیت المقدس ایک پاک مقام ہے۔ چاہیایا خلیفہ المسلمین کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دی جائیں گی۔

ایک اور روایت ہے کہ بیت المقدس کا محاصرہ بہت سخت ہو گیا تھا۔ رومی مدافعت کر رہے تھے اور محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا اس لئے ابن عاص (عمرو بن العاص) خلیفہ کو ایک خط لکھا کہ محاصرہ طول پکڑتا جا رہا ہے مکہ روانہ کی جائے اور اس کا ساتھ خود حضرت عمر فاروق تشریف لے آئیں۔

بہر حال حضرت عمر بیت المقدس کے بطریق کے مطالبہ پر یا عمرو بن العاص

جاس سے کوئی کرتہ مانگا۔ جاس نے ایک ریٹھی قبض لاکر دی۔

حضرت عمر نے دریافت فرمایا۔ ”یہ قیمتی قمیص کس کپڑے کی ہے؟“

جاس نے جواب دیا۔ ”ریٹیم کی ہے امیر المومنین۔“

حضرت عمر نے پوچھا۔ ”یہ ریٹیم کیا ہوتا ہے؟“

سردار جاس نے اس کی تفصیل بیان کی اور درخواست کی۔ ”اے خلیفہ! آپ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں۔ مفتوح قوم کے سامنے اس کرتہ اور اس اونٹنی پر بیٹھ کر تشریف نہ لے جائیے بلکہ ریٹیم کا لباس پہنئے اور عربی گھوڑے پر سواری کیجئے۔“

حضرت عمر یہ سن کر اس وقت تک خاموش رہے اور وقت گزاری کے لئے قمیص پہن لی مگر جیسے ہی ان کا کرتہ دھل کر اور سل کر آیا تو آپ نے اسے پہن لیا ریٹھی قمیص واپس کر دی۔ کہتے ہیں کہ پھر امیر معاویہ ابو عبیدہ اور خالد بن ولید کے اصرار پر سفید ریٹیم کا لباس زیب تن کیا اور عربی گھوڑے پر بیٹھے۔ گھوڑے کو شاید ہوا کہ آج اس کی پیٹھ پر جلیل القدر بادشاہ سوار ہے تو اس نے اٹھیلیاں کھینچ کر دیں۔

حضرت عمر نے فوراً فرمایا۔

”روکو روکو میں نے اس سے پہلے کسی کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔“
دوسری روایت میں ہے کہ سب کے سمجھانے بچھانے پر حضرت عمر نے سفید ریٹھ کپڑے زیب تن کئے۔ وہ رومال کاندھے پر ڈالا جو عمرو بن العاص نے ان کو دیا تھا؛ گھوڑے پر سوار ہوئے مگر فوراً ہی اتار پڑے اور فرمایا۔

”خدا میری غلطی معاف کرے اور تمہاری غلطیاں قیامت میں درگزر فرمائے۔ وقت میرے دل میں غرور اور تکبر نے اس درجہ جگہ پائی تھی جو میرے ہلاک کرنے کے لائق تھی۔“

یہ کہہ کر ریٹھی لباس اتار دیا اور اپنا پرانا کرتہ پہن لیا۔ بہر حال یہ حضرت عمر اور آخری سفر تھا۔ یہ سفر اگرچہ بہت سادہ تھا مگر بڑا پروقار مدینہ منورہ سے جابہ تک جس بستی یا شہر سے گزرتے لوگ اپنے خلیفہ کو دیکھنے جمع ہو جاتے۔ آپ لوگوں کو دین بتاتے اور سمجھاتے جابہ پہنچ گئے۔ اس سفر کی تفصیل بیان کرتے وقت نہیں مزا کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کے بڑے جبروت شہنشاہوں کے جلوس نکلتے تھے اور وہ مدینہ سفر کرتے تھے لیکن ان کے ذکر کو تاریخ اسلام اور تاریخ میں چار سطر بھی نہ مل سکیں مسلمانوں کے اس خلیفہ کا سفر جس کے ساتھ ایک غلام تھا تاریخ میں ایسا مشہور ہوا

ایک ایک بات سیل سے بیان کی گئی۔

مناز باشندگان شہر اور مسلمانوں کے مابین فتح بیت المقدس پر عہد نامہ تحریر ہوا اس کا اس طرح ہے۔

”یہ ایک اقرار ہے منجانب عیسائی باشندگان بیت المقدس جو مرتب کیا گیا حضرت عمر بن الخطاب خلیفۃ المسلمین کے نام۔“

جب آپ ہم پر غالب آئے ہم نے آپ کی اطاعت قبول کی اور ہم نے اپنے تئیں اپنے ہم مذہبوں اور اپنے مقبوضات کو آپ کے حوالے کر دیا اور عہد کیا کہ چھوٹے بڑے گرجوں، خانقاہوں اور راہبوں کے جبروں میں کسی قسم مداخلت نہ ہوگی اور نہ ان میں سکونت اختیار کی جائے گی۔ نہ ڈھائے جائیں گے۔ ان میں کوئی ایسا شخص جو مخالف ہو نہ رہ سکے گا۔ ان میں مسلمان ہر وقت داخل ہو سکیں گے مسافروں اور سیاحوں کے لئے ان کے دروازے ہر وقت کھلے رہیں گے۔ اگر کوئی مسلمان مسافر ان میں رہنا چاہے گا تو اسے تین دن تک بطور مہمان کھانا اور جگہ دیں گے۔ اسے گرجاؤں میں کسی راز کے معلوم کرنے سے نہیں روکیں گے اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہ رکھیں گے۔ اسے اپنی کسی عبادت میں شریک نہیں کریں گے کسی کو عیسائی مذہب کی دعوت نہیں دیں گے اور نہ کسی طرح کا جبر کریں گے۔ اپنے کسی ہم مذہب کو اسلام قبول کرنے سے نہ روکیں گے مسلمانوں کی ہر جگہ تعظیم کریں گے۔ لباس، پٹکے، سامنے، زہر یا سر کی مانگ میں مسلمانوں کی مناسبت نہیں کریں گے۔ ان کی زبان میں کچھ نہ لکھیں گے اور نہ ان کے اپنے آپ کو پکاریں گے۔ سواری میں گھوڑوں پر زین نہیں کہیں گے اپنی تلواروں کو پیٹیوں کے ساتھ نہیں لٹکائیں گے۔ تیر کمان، تلوار یا لٹھ لے کر نہیں نکلیں گے اپنی انگوٹھی پر عربی رسم الخط میں کچھ نہ لکھوائیں گے۔ شراب نہیں پیئیں گے۔ اپنی پیشانیاں نہیں منڈوائیں گے اور ان پر کپڑا نہیں باندھیں گے۔ کمر میں زیادہ چوڑا پٹکا استعمال نہیں کریں گے۔ اپنی عبادت گاہوں کے باہر صلیب نہیں لٹکائیں گے۔ شارع عام، مسلمانوں کے راستوں یا ان کی کاروباری

رس تھا مسلمانوں کا پہلا قبلہ عیسائیوں کے لئے حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش اور مقام یسویوں کے لئے ارض ماد و مد عور، انبیاء رسل کا شہر حضرت موسیٰ علیہ السلام یسویوں سے نکال کر یہیں لائے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو سولی دینے کا واقعہ یہیں پیش آیا تھا کی بنا پر کلیسائے قیامت تعمیر کیا گیا۔ محراب داؤد صفرہ یعقوب، دیوار گریہ، ہیکل الن۔ الغرض اس شہر کے درو دیوار پر روحانیت کی تاریخ نقش تھی۔ اسی ارض مقدس حضور پر نور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے اور یہیں کی امامت میں تمام جلیل القدر پیغمبروں نے نماز ادا کی تھی۔ حضور صلی وسلم کے بعد ب عمر فاروق پہلے مسلمان تھے جنہوں نے یہاں نماز کی امامت فرمائی۔

اللہ اللہ کیا عالم جذب و شوق تھا۔ فرشتے عالم بالا سے جھک جھک کے دیکھ رہے تھے۔ وقت حضور کے قدموں کے بعد پہلے مسلمان کے قدم اس پاک سرزمین پر پڑ رہے بیت المقدس کا بطریق اعظم صفرونیوس آگے آگے چل رہا تھا اور ایک ایک زیارت کی بل بیان کر رہا تھا اور حضرت عمر کی زبان کلمہ اور درود سے متحرک تھی۔ میر کے دوران نماز کا وقت آیا تو حضرت عمر کے قدم کلیسائے قمامہ میں تھے بطریق نے لایا۔

”یہ بھی ایک سجدہ گاہ خداوندی ہے آپ یہاں نماز پڑھ لیجئے۔“
”اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان بھی ایسا ہی کریں گے اور عیسائیوں کو ان گرجوں سے نکال دیں گے۔“

دوسری روایت ہے کہ حضرت عمر آگے بڑھے تو کلیسائے قمامہ کے دروازے پر ٹپوں نے نماز کے لئے چادر بچھادی۔ آپ نے یہاں نماز پڑھ لی لیکن فوراً ہی اپنی غلطی مٹا ہوا اور اسی وقت یہ فرمان لکھ کر بطریق کے حوالے کیا۔
”مسلمان کبھی گرجوں (کلیس) کی دہلیز پر نماز نہ پڑھ سکیں گے۔“

خلفائے اسلام اور مسلمانوں کی رواداری تھی اور ان کی نظروں میں غیر مسلموں کی ت گاہوں کا اس قدر احترام تھا مگر آج ہم پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ بابر مسجد اجدوہیا (دہلی) کے دیوتا اور پرامتا (رام بھوی) کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہے اب ان مانتوں کو کون سمجھائے کہ حضرت عمر نے کلیسا میں مسلمانوں کو سجدے سے منع کر دیا اس سے کہیں حضرت عمر کی تقلید میں وہ کلیسائے ”قمامہ“ کو مسجد میں نہ تبدیل کر دیں رت عمر نے فوراً اس کلیسا کے سامنے ایک مسجد تعمیر کی جسے مسجد فاروق کہتے ہیں جسے انہوں نے یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔

جگہوں پر ملیوں کی نمائش نہیں کریں گے۔ گھنٹے زور سے نہیں بجائیں گے اپنے مردوں پر نوحہ نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کی گزر گاہوں پر چراغاں یا اس طرح کی آراستگی نہیں کریں گے اپنی میتوں کو مسلمانوں کے قریب نہیں لے جائیں گے۔ غلام جو مسلمان ہو جائے گا پھر اسے اپنے پاس نہیں رکھیں گے نہ اس کے گھر کی طرف نگاہ کریں گے اور ایلیا (بیت المقدس) میں ہمارے ساتھ یسودی نہ رہنے پائیں گے۔ (تاریخی شہادتوں کے مطابق اس فقرہ کا اضافہ عیسائی سفیر صفرونیوس نے اصرار کر کے کرایا تھا۔ یسودی اس معاہدے سے سو سال پہلے ہی نکالے جا چکے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف چار پانچ سو برس اور جنوبی فلسطین میں آٹھ سو برس رہے تھے)۔

حضرت عمر نے اس معاہدہ کی تصدیق کرتے وقت حسب ذیل اضافہ فرمایا۔
”ہم مسلمانوں میں کسی کو اذیت نہیں دیں گے ہم اپنی طرف سے اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے عہد کرتے ہیں کہ ہم مندرجہ بالا شرائط تسلیم کرتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اگر کریں تو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے اور ہم اختیار دیتے ہیں کہ ہمیں جو سخت سے سخت سزا دیں ہم اس کے سزا دار ہوں گے۔“

اس کے بعد حضرت عمر نے اپنی طرف سے لکھا۔
”اور جو کچھ اس میں تحریر ہے اس پر خدا کا رسول خدا کا خلفاء کا اور لوگوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔“

اس معاہدہ پر حضرت عمر نے مہر لگائی۔ خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان نے دستخط کئے اور یہ معاہدہ 15ھ (636ء) میں لکھا تاریخ شاہد ہے جب اس صلحنامہ کی اطلاع عیسائیوں کو ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے خوش کہ انہوں نے جشن منایا کیونکہ اس دور میں فاتح اپنے مفتوح دشمن کے بوڑھوں اور عورتوں تک کو تہ تیغ کر دیا کرتے تھے۔

پھر حضرت عمر فاروق شہر میں داخل ہوئے۔ پادریوں اور عوام نے آکھیں فر کر دیں آپ نے ہر ایک کے ساتھ شفقت کا سلوک کیا۔ حضرت عمر کے ساتھ

اس چٹان اور حرم کے رقبہ کو متبرک اور مبارک سمجھا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ ایمان اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ مسلمان قوم اسلامی حکومت یا اسی وقت تک آزاد اور فارغ البال رہی جب تک وہ احکام خداوندی اور سنت الہی پابندی کرتی رہی پھر جب وہ جارح حق سے ہٹی اور اس نے ظلم و ستم کا راستہ اختیار اس کا زوال شروع ہو گیا اور دوسری قوموں نے اسے غلام بنالیا۔

بیت المقدس ہمارے ہاتھوں سے کیوں نکلا اس کے اسباب و علل پر اگر غور کیا جائے ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں خلافت کے پردہ میں ملوکیت نے جنم لیا۔ پہلے بنو امیہ آئے جو خالص عربی خون کے حامل تھے کہنے کو یہ عربی بنو امیہ ایک دو کے باقی کے اطوار مطلق العنان بادشاہوں جیسے تھے پھر عباسیوں کی باط سیاست الٹ دی۔ عباسی کمزور ہوئے تو مصر میں فاطمی خلافت نے زور فاطمی دور خلافت میں بیت المقدس پر فاطمیوں کا قبضہ تھا۔ فاطمیوں کا دور صلاح الدین کے قبضہ تک برقرار رہا مگر اسی فاطمی دور میں ایک حادثہ پیش آیا جو بیت المقدس مسلمانوں کے بے دخل ہونے کا ایک سبب بھی کہا جاتا ہے۔

برہن مورخین کے مطابق پوپ سلوسٹر بیت المقدس کی زیارت کو گیا۔ زیارت سے لے کر بعد اس نے بیت المقدس کے عیسائیوں پر مسلمانوں کے ظلم و ستم کی فرضی لوگوں کو سنا سنا کر ان میں مذہبی جوش اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی۔ اس میں فرانس اور اٹلی کے مسلح گروہ بیت المقدس کی زیارت کے بہانے سواحل شام کے پھر لگاتے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے۔ بیت المقدس کی زیارت کی ماکو عام اجازت تھی اس لئے مسلح گروہوں جن کے ہاتھوں میں سلیس ہوتیں کوئی نہ

لنا نہ میں فاطمی خلیفہ الحاکم برسر اقتدار جس کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ در فطی ہے۔ اس نے حکم جاری کیا تھا کہ دن کے وقت دکانیں بند رہا کریں اور بازار لگا کریں۔ قاہرہ کے تمام کتوں کو مروا دیا۔ قربانی کے علاوہ گائے بیل کا ذبیحہ بند امر معاویہ اور متوکل جو ترکاریاں پسند کرتے تھے ان کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے کر ایک شخص نے ایک جدید شریعت نکالی تھی۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے اہمین کے مقام طالب کی زیارت کافی تھی۔ اس شریعت میں ماں، بہن اور بیٹی کا نکاح ہو سکتا تھا۔ فاطمی خلیفہ الحاکم بھی ضرار کا معاون ہو گیا اور غیب دانی کا دعویٰ جنل معلوم پر روزانہ جا کے مناجات پڑھتا۔ لوگوں کو حکم دیا گیا جب خلیفہ گزرے تو

کاش میں حضرت عمر فاروق کے حوالہ سے احاطہ حرم کی زیادتیوں کا حال بیان کر سکتا مگر ڈر ہے میرے وہ قاری خفا ہو جائیں گے جو کہانی میں صرف تاریخ پسند نہیں کرتے۔ گذشتہ قسط میں بھی میں انہیں بیان کی چاشنی نہیں دے سکا اور وقت بھی بیت المقدس کے واقعات کا ایسا سیلاب اٹھا رہا ہے کہ اومان کی طرف جانے کو طبیعت نہیں مانتی ہر حال میں قارئین کو ناخوش بھی نہیں کر سکتا اس لئے صرف زیارتوں کے نام لکھنے پر اکتفا کرنا ہوں۔ اگر موقع ملا تو ان کی تفصیل سے بھی آگاہ کروں گا۔

سبحن الذی اسری بعبده لیل من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی۔ اس مسجد الاقصیٰ کی وجہ سے اس شہر کو مکہ اور مدینہ کے بعد قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اقصیٰ کے معنی دور کے ہیں۔ مسجد الاقصیٰ کے معنی دور کی مسجد کے ہوئے۔ مسجد سے مطلب بیت المقدس کے حرم مقدس کا پورا رقبہ ہے کیونکہ واقعہ معراج کے وقت وہاں کوئی مسجد نہیں تھی۔

شب معراج کی روایت کے مطابق آنحضرت ایک پردار اسپ، براق (بجلی) جسے رف رف کہا گیا ہے پر سوار تھے اور حضرت جبرائیل آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ مکہ سے طور بنا گئے وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔ ارشاد رسول اکرم ہے:-

”جس وقت ہم بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے (یعنی حرم کے احاطہ پر) تو جبرائیل نے مجھ کو اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا۔ جس سے انبیائے سابق نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے۔“

حضور حرم شریف میں اس دروازے سے داخل ہو کر (اس کا نام بعد میں باب محمد رکھا گیا) اس چٹان پر چڑھے جسے قبلہ الصخرا کہا جاتا ہے۔ یہودی روایات کے مطابق یہ جگہ ہیکل سلیمانی کے درمیان تھی۔ تاریخ کے مطابق یہاں پر مذبح تھا۔ وہاں آپ کی انبیائے علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پھر آپ نے وہاں حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ وغیرہ کے ساتھ نماز ادا کی اور اس نماز کی امامت آپ نے فرمائی۔ پھر اس چٹان سے آپ اس نور کے زینہ سے آسمان پر چڑھے اور فردوس بریں اور اس کی نعمتوں کو دیکھا۔ پھر ہفت افلاک طے کر کے حضور باری تعالیٰ میں پہنچے۔ وہاں نماز کا حکم ملا۔ پھر آپ دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور حجرہ مرقمہ پر قیام فرمایا۔ وہاں سے براق پر واپس آئے اور رات ختم ہونے سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہ شب معراج کا خلاصہ ہے اور اسی لئے اہل اسلام کی

نہا چنچا۔ عیسائی بیت المقدس کی شمالی دیوار توڑ کر اندر آگئے ایک قیامت برپا ہو گئی۔
 عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے۔ معصوم بچوں کو فیصلوں پر لٹکا دیا گیا۔ علماء پر تیل
 برسایا گیا۔ صرف مسجد الاقصیٰ اور محراب داؤد میں شداء کی تعداد سات
 لاکھ مرنے والوں کی مجموعی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے۔ بیت المقدس کے گلی کوچوں
 اور دیرانوں اور کھنڈروں میں لاشوں کے انبار لگے تھے۔

تیسری صدی نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو عیسائی بیت
 المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔
 یعنی شاہد رابرٹ کے حوالے سے لیبان نے لکھا ہے۔

ہمارے آدمی (عیسائی) راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر اس طرح دوڑ رہے تھے جس
 کی کے بچے چھین لئے گئے ہوں اور وہ جھپٹ جھپٹ کے حملہ کر رہی ہو۔ ہمارے آدمی
 عام کے مزے لے رہے تھے۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ پھانسی کے
 پے رکھے تھے ایک ہی رسی میں تیس تیس آدمیوں کو لٹکا دیتے تھے۔

ایک دوسرا یعنی شاہد ریمانڈ واٹیل پوٹی بیان کرتا ہے۔

بیت المقدس کے راستوں پر ہر جگہ سروں، ہاتھوں اور رانوں کے ڈھیر لگے تھے۔
 باہر چلنا پڑتا تھا۔ ہیکل سلیمانی (مسجد عمر) میں اس قدر خون بھرا تھا کہ اس کے صحن
 ایشیں تیرتی تھیں۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر اور کسی کا دھڑ اس طرح سے ایک دوسرے
 لے ہوئے تھے کہ ان کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ ملیوں نے اس قتل عام کو کافی
 کہ ایک مینگ میں لے گیا کہ دوسرے دن باشندگان بیت المقدس (مسلمانوں کو) تہ
 پہنچائے۔ بعض عیسائیوں نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو لیکن ان کی ایک نہ چلی اور آٹھ
 لاکھ قتل عام کا بازار گرم رہا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے سب مارے گئے۔ بیت

المقدس پر قبضہ کے بعد صلیبی سوراخوں نے اپنے پوپ (بطریق اعظم) کو مندرجہ ذیل الفاظ
 کا کاغذ بھیجا تھا۔

خدا ہمارے مجزہ انکسار سے رام ہو گیا اور ہمارے مجزہ الحاح
 کے آسمانوں روز اس نے دشمنوں سمیت ہمارے روانہ کر دیا۔ اگر
 آپ یہ بھی معلوم کرنا چاہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے ان کے
 ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب
 ہمارے آدمی حضرت سلیمان کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے
 گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔

لوگ سجدے میں جھک جائیں۔ جب اس کا نام خطبہ میں آئے تو سننے والے فوراً
 کریں۔ پھر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ مصریوں نے مذاق اڑایا تو شہر میں آگ لگادی
 سیکڑوں آدمیوں کو تہ تیغ کرادیا۔

عیسائیوں کو اس نے بہت سرچڑھایا تھا۔ ازبوں نام کا ایک غلام اس کا بہت
 چڑھا تھا اور محل میں خلیفہ کے ساتھ رہتا تھا۔ عیسائیوں کا عروج اسے ناگوار گزرتا تھا
 دن اس نے خلیفہ سے کہا کہ یورپ سے مسلح آدمی پادریوں کے لباس میں بیت المقدس
 آتے ہیں اور کلیسائے "قمامہ" میں قیام کرتے ہیں پھر واپسی میں شام کے ساحلی علاقوں
 لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ الحاکم تو خبیثی تھا ہی اس نے فوراً "فرمان جا
 کردیا کہ عیسائیوں کے تمام کلیسا (گرجے) گرا دئے جائیں اور بیت المقدس کے احاطہ
 کلیسائے قمامہ کو زمین کے برابر کر دیا جائے۔

چنانچہ اس کے حکم پر بیت المقدس میں مسجد عمر کے سامنے کلیسائے قمامہ
 گیا۔ الحاکم کا یہ اقدام اسلامی رواداری کے واقعی خلاف تھا کیونکہ ہمیں دوسرے مذہب
 عبادت گاہوں اور ان کے پادریوں اور مذہبی لوگوں کا احترام کرنے کا حکم ہے۔ بعض
 نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ بیت المقدس کے عیسائی رومن شہنشاہ قسطنطین کو
 ممالک کی خبریں پہنچاتے تھے یہ باتیں ٹھیک تھیں اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا
 خلیفہ کے اقدام کو درست نہیں کہا جاسکتا جو غلط ہے اسے غلط کہا جائے گا۔

چنانچہ چالیس سال بعد الحاکم کے پوتے المستمر نے 1028ء میں فرمان جاری
 عیسائیوں کا کلیسائے قمامہ جس میں حضرت عیسیٰ کا مرقد بیان کیا جاتا ہے کو دوبارہ
 جائے۔ تاریخ تصدیق کرتی ہے کہ المستمر کے حکم سے کو مرقد مسیح (قمامہ) تعمیر ہوا
 عمارت سے زیادہ خوبصورت اور پر شکوہ ہے۔ یہ تو ہوا۔ اس سے عیسائیوں کی انگلی
 ہوئی مگر ایک خبیثی خلیفہ کے غلط قدم نے عیسائیت کے پرستاروں میں جو آگ لگادی
 کا تدارک تو کسی نہ کسی طرح ہونا تھا۔

پھر اس اندر ہی اندر سکتی ہوئی آگ کا تدارک یا رد عمل یہ ہوا کہ غصہ اور
 یہ لاوا 1098ء میں اس طرح پھٹا کہ 636ء سے جو مسلمانوں کا بیت المقدس
 وہ اس طرح ختم ہوا کہ بیت المقدس میں خون کے دریا بہہ گئے اور وہاں ایک
 زندہ نہ بچا۔ صلیبی فوجیں کوہ سبیل کی طرف سے شہر (بیت المقدس) میں داخل
 مسلمانوں نے مسجد الاقصیٰ میں پناہ لی۔ عیسائیوں نے شہر میں قتل عام کے بعد مسجد
 رخ کیا اور بچوں، بوڑھوں اور جوانوں سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کیا۔ ایک گروہ

بنے والوں کی گمرانی کرتا تھا زر فدیہ کی ادائیگی بڑے احتیاط سے عمل میں آئی جو زر فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے ان کے فدیہ کی ادائیگی میں امراء سلطانی نے حصہ لیا۔
 رالدین کو کیری نے ایک ہزار ارضی عیسائیوں کا زر فدیہ اپنی جیب سے ادا کیا۔
 اہلہ کے مطابق زر فدیہ پر رہائی چالیس دن کے اندر اندر ہونا تھی۔ اس کے بعد
 دس میں رہ جانے والوں کو غلام بنالیا جائے گا لیکن چالیس دن گزرے جانے پر بھی
 غریب عیسائی اپنی غرمت کی وجہ سے زر فدیہ نہ ادا کر سکے۔ عیسائیوں کی بطریق جو
 لا حاوٹی تھا۔ اس نے اپنا تمام سامان سمیت زر و نقد اکٹھا کیا پھر مسیح پر رکھے جانے
 والی ظروف بھی سمیٹ لئے۔ سلطان کے امراء کو اس بات پر بہت غصہ آیا ایک
 سلطان سے کہا۔

باجوہ اس بے ایمان اور ثلاثی پادری کو لوٹ کا اتنا مال لے جانے سے روکا
 طان نے جواب دیا۔

میں قول دے چکا ہوں اس سے پھر نہیں سکتا۔

وہ پادری تمام مال متاع سمیٹ کے بیت المقدس سے نکلا۔ سلطان نے اس کے
 پیچھے سپاہی کر کے جو اسے صورت تک حفاظت سے پہنچا آئے۔

پس دن کے اندر بیت المقدس کے تمام امیر و کبیر عیسائی نکل گئے انہیں اپنے
 بائیں پر ذرا بھی ترس نہ آیا حالانکہ اگر بطریق اور دوسرے امراء چاہتے تو کئی
 یوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں رہا کر سکتے تھے۔ سلطان کے بھائی ملک العادل کو غریب
 کو دیکھ کر ان پر بہت رحم آیا اور اس نے عیسائیوں کو بطور غلام خرید کر اپنی
 آزاد کردیا ملک العادل کی دریا دلی دیکھ کر سلطان نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

دلی طرف سے منادی کی جائے کہ وہ تمام بوڑھے جو فدیہ ادا نہیں کر سکے وہ تمام
 آزاد کئے جاتے ہیں۔ وہ جس طرف جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔

ایک ایک ملکہ ہجرت کر کے بیت المقدس سے عبادت و ریاضت کے لئے آگئی تھی۔
 سلطان سے خواہش کی کہ اسے جانے کی اجازت دی جائے۔ سلطان نے اسے مع
 دلت کے جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح فرمانروائے یروشلم گائی کی بیوی
 شوہر گائی کے پاس جو اس وقت نابلس میں قید تھا جانے کی خواہش کی سلطان نے
 شوہر کے پاس بھجوا دیا۔ اس طرح کرک کے شاہ ربیعہ ثالث جسے سلطان نے اپنے
 قتل کیا تھا اس کی بیوی کی خواہش پر اس کے لئے ”عفری“ کو جو دمشق میں

عیسائیوں نے دل کھول کے مسلمانوں کا خون بہایا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی
 نہیں بخشا۔ سب کو تہ تیغ کیا اور مسجد عمر میں اس قدر خون بہایا کہ مسلمانوں کے جسم کے
 اعضاء ان کے ہی خون میں تیرتے پھرتے تھے۔ یہ عیسائیوں کا عرف تھا جو انہوں نے
 دکھایا۔ یہ اس پیغمبر کے پیروکار تھے جس کی تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک طمانچہ مارے تو اپنا
 دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دے۔ اسی قوم نے مسلمانوں کو ان کے ہی خون میں
 نہلایا۔

اب ذرا مسلمانوں کا ظرف دیکھئے جس کے مذہب نے یہ اجازت دی ہے کہ اگر جس
 کسی نے مارا ہے تو تم اس سے بدلہ لے سکتے ہو مگر صرف اس مار کی حد تک یعنی جیسے کو
 تینسا جواب دینے اور بدلہ لینا اسلام میں حکم ہے مگر اس حکم کے ساتھ ہی ایک اور بات کی
 گئی ہے وہ یہ کہ نہ۔

”مسلمان اپنے اوپر ظلم و زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے اور اگر وہ

معاف کر دے تو خدا کی نظر میں اس کا یہ فعل زیادہ پسندیدہ ہے۔“

مجاہد اعظم صلاح الدین یوسف ایوبی کے سامنے دونوں راستے کھلے تھے۔ وہ ان ستر ہزار
 (70000) مسلمانوں کے خون ناحق کا انتقام لے سکتا تھا جنہیں عیسائیوں نے 1091ء
 میں بیت المقدس پر قبضہ کے دوران بے وردی اور ہیمنانہ انداز میں قتل کیا تھا۔ اس انتقام
 کی مذہب اسلام نے اسے اجازت دی تھی مگر سلطان صلاح الدین نے دوسرا راستہ اختیار
 کیا۔

”اور اگر معاف کر دو تو تمہیں مستحسن ہے کہ خدا درگزر کرنے

والے کو پسند کرتا ہے۔“

چنانچہ سلطان نے اعلان کیا کہ کسی کی نہ جان لی جائے گی اور نہ اس پر زیادتی ہوگی۔
 ہر شخص مقررہ زر فدیہ ادا کرے اور بیت المقدس سے چلا جائے۔ یہ عمل کس قدر سکون
 سے انجام دیا گیا اس کا ذکر اسٹیل پولی اور ولیم صوری سے سنئے جو بہت متعجب مومن اور
 ادیب ہیں اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہ لکھتے
 ہیں۔

صلاح الدین نے ایسی اعلیٰ عرفی کا ثبوت پہلے کبھی نہیں دیا تھا جس کا اس نے بیت
 المقدس کے قبضہ کے وقت اظہار کیا۔ ہر گلی اور کوچہ پر سلطان کے افسران پہرہ دے رہے
 تھے۔ اور سپاہی گشت کرتے تھے۔ اس لئے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا جس میں
 کسی عیسائی کو رتی بھر بھی گزند پہنچا ہو۔ باب داؤد پر ایک بڑا افسر مقرر تھا۔ جو فدیہ ادا نہ

ے کر رہا پر قبضہ کر لیا۔

ہا (اڈیہ) ملک شام میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس جنگ کے حالات پھیل چکے تھے اور پڑھ چکے ہیں) پس سوط الہا کی بازگشت سارے یورپ میں سنائی دے رہی تھی۔ اپنے قاصد بھیج کر تمام یورپ میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا کیا۔ عیسائی اقوام ایک بار پھر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چنانچہ بادشاہ لوئی سابع اور الحانیہ کا فرمانروا کنراڈ ثالث اپنی فوجوں کو ساتھ لے کر ارض طرف بڑھا۔ پہلے کنراڈ آیا مسلمانوں نے اسے شکست فاش دی اور لشکر کو کاٹ دیا۔ جو بچے وہ اٹے پیروں بھاگے راستے میں فرانس کا لشکر آتے ہوئے ملا۔ یہ اس نے دیکھا لیکن اسے بھی مار پڑی اور بچے مجھے صلیبی طرح کی سختیاں جھیلنے پڑیں۔ کہاں سے دمشق پر جو بھیر الدین آتی کے قبضہ میں تھا حملہ کیا۔ الدین زنگی کے بیٹے سیف الدین نور الدین زنگی نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

اب یہ تیسری صلیبی جنگ شروع ہونے والی تھی۔ بیت المقدس پر سلطان صلاح الدین نے قبضہ پورے یورپ میں ایک بار پھر آگ لگا دی تھی۔ عیسائیوں نے بیت المقدس کی مدد کے لیے فریاد کیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبلہ نبوتوں سے پاک کر کے ان کا فرش اور دیواریں دمشق گلاب سے دھوا لیں۔ ان مقامات پر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی خیالی تصویریں بنوا رکھی ہیں صاف کرایا۔

ب مغربی مروج اس کا احوال اس طرح بیان کرتا ہے:-

ب فرنگس (مسلح فرنگی) چلے گئے اور صرف سلطان غلام آزاد شدہ مسلمان جنہیں تم نے قید کر رکھا تھا اور وہ مقامی عیسائی جنہوں نے زہد یہ عطا کر کے بیت المقدس کی اجازت حاصل کر لی تھی تو سلطان نے مقامات مقدسہ کی تطہیر کا حکم دیا۔ صخرہ ہر سنگ مرمر جڑیا گیا تھا۔ اسے ہٹا کر صاف کیا گیا گنبد صحرا پر سونے کی صلیب لگا دی اسے وہاں سے ہٹایا گیا۔ مسجد عمر کے سامنے ٹائٹل اور ہاسٹلر نے مار کرے بنائے تھے انہیں صاف کیا گیا۔ سلطان کے وزیر اعظم نے اس وقت تک ان جاری کئے تھے۔ فتح بیت المقدس کا مژدہ دور دور تک پہنچایا گیا تھا۔ دور و نزدیک اہل کرام، قاری اور قاضی حرم مقدس کی تطہیر کی تقریب میں شرکت کے لئے جمع ہوئے۔

قید تھا وہاں سے بلا کر ماں سے ملاقات کرائی اور وعدہ کیا کہ کرک پر قبضہ کے بعد عزم رہا کر دیا جائے گا۔

عیسائیوں کے بڑے بڑے سردار نائٹ اور ہمپل (یا تو قتل ہو گئے یا پھر قید کر لئے تھے ان کی عورتوں کا ایک گروہ سلطان کے حضور پیش ہوا۔ ان کی آہ زاری دیکھ کر ما بہت متاثر ہوا۔ اس نے ان پریشان حال خواتین کے ساتھ لطف و کرم کا سلوک کیا۔ ان کے شوہر قتل ہو گئے تھے انہیں حسب حیثیت رقم عطا کر کے جہاں انہوں نے جانے وہاں بھجوا دیا گیا اور جن خواتین کے شوہر زندہ قید میں تھے انہیں سلطان کے حکم پر رہا کیا۔ وہ خواتین سلطان کے حسن سلوک سے ایسی متاثر ہوئیں کہ اپنے گھروں میں واپس سلطان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

لین پول لکھتا ہے کہ جس سلطان کے اس سلوک کا خیال آتا ہے اسی وقت یہ کے اس جو رسد اور ہیبت کا نقشہ بھی آنکھوں میں گھوم جاتا ہے جو سو سال پہلے یہ نے بیت المقدس حاصل کرتے وقت مسلمانوں پر توڑے تھے۔ بیت المقدس کے بازار گزرے تھے تو راستے میں مسلمانوں کے سروں اور اعضاء سے پٹے ہوئے تھے عیسائیوں نے اذیتیں دے دے کے کٹھڑے کٹھڑے کیا تھا۔ جن مسلمانوں نے چھتوں سے رکھی تھی انہیں عیسائی سوراخوں نے جانوروں کی طرح تیروں سے چھتی کر دیا تھا طرف ان کا یہ سلوک تھا اور ایک طرف سلطان کے رحم و کرم اور غفور و مہربان نظارے تھے۔

اس پہلی صلیبی جنگ جو 1099ء میں پورے یورپ کی طاقت کے ساتھ نے بیت المقدس پر قبضہ کے لئے لڑی تھی اور جس میں سترہ ہزار مسلمان شہید ہوئے اس پہلی صلیبی جنگ اور سلطان صلاح الدین کے ساتھ تیسری صلیبی جنگ کا رد مسلمان اگرچہ شکست کھا گئے تھے اور بیت المقدس ایک خونخوار معرکے کے بعد مسلمان ہاتھوں سے نکل گیا تھا لیکن مسلمان اپنی شکست پر قانع نہیں ہوئے تھے بلکہ زخم اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔

بقول ہیرلڈ ولیم مصائب کے اس اندھیرے میں بھی مسلمانوں کا ایمان عقیدہ طرح مضبوط تھا۔ انہیں یقین تھا کہ موجوں کی طوفان انگیزی عارضی ہے اور وہ موج اصل مقام کی طرف ضرور لوٹ جائیں گی۔ پہلی صلیبی جنگ میں شکست کھانے مختلف علماء اس عقیدے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان ایک عماد الدین زنگی والی موصل کا نام سرفروست ہے۔ اس نے 1142ء میں

”یا اللہ العالمین۔ اپنے ممنون احسان بندے۔ اپنی بخششوں کے شکر گزار بندے، اپنی رحمتوں کے مستحق فروداں، حامی دین، محافظ ارض مقدس، شاہ ظفر مند، پشت پناہ و تائید دینا و دین، امیر المومنین، ابو مظفر صلاح الدین یوسف ابن ایوب کی سلطنت کو ربیع الاخر ۶۵۷ھ فرمادے۔ فرشتے اس کے جھنڈے کے گرد جمع رہیں اور اسلام کی سر بلندی اور اس کے لئے اسے زندہ رکھ۔ اسلام کی خدمت کے لئے اس کی تمکینی کر اور مشرق و وسطیٰ میں اس کی سلطنت وسیع فرما۔ بار اللہ! اس کی اور اس کے عیال کی حفاظت فرما۔ وہ ہماری حکومت کریں۔ اس کے بھائیوں اور بیٹوں کو عہد راز عطا فرما۔ اس کی طاقت اور اس میں اضافہ فرما۔ تو نے اس کے ذریعہ اسلام کو ایک مستقل خاندان بخشا ہے تو اسے برس تک قائم رکھ۔ اسے ابدی سلطنت عطا فرما اور اس کی دعائیں مستجاب فرما۔“

(قرآن حکیم) اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جیسے جیسے احسانات مجھ پر کئے ہیں والدین پر کئے ہیں تیرے ان احسانات کا شکریہ ادا کروں اور (زندگی بھر) ایسے اعمال کرتا رہوں جن کو تو پسند فرمائے اور آخر کار (مرنے کے بعد) تو مجھے اپنے نیک اعمال میں لے جا کر داخل کر۔

(یہ دعا حضرت سلیمان علیہ السلام کے منہ سے ادا ہوئی تھی۔ القرآن) قاضی الفاضل لکھتا ہے کہ یہ خطبہ اور دعا اس رقت سے ادا ہوئی کہ آسمان آنسو کو شق ہو گئے اور ستارے خوشیاں منانے کو ایک جگہ جمع ہو گئے۔ مسجد اقصیٰ کی بازیابی مسلمان بہت خوش ہوئے صلاح الدین نے اس کی پرانی خوبصورتی اور سادگی بحال کی۔ روایت ہے امیر عماد الدین زنگی نے ایک خوبصورت سبز منبر بنوایا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے مسجد اقصیٰ میں اسے نصب کرے گا۔ وہ بیچارہ جہاد کرتے کرتے حضور علیہ السلام کو پہنچ گیا پھر اس کے بیٹے سلطان نور الدین زنگی نے اس جہاد کو جاری رکھا مگر بیت المقدس کی بازیابی تو سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی کی تقدیر میں لکھی تھی۔ پس سلطان نے منبر کو حلب سے منگوایا اور اسے مسجد اقصیٰ میں نصب کرایا۔

”مذہب مسجد اقصیٰ میں 1967ء (یہودیوں کے قبضہ) تک موجود تھا مگر اب یہ نہیں رہا۔ گزری۔ جس طرح عیسائیوں نے 1187ء میں بیت المقدس کی پاکیزگی اور عظمت کو لوٹ لیا تھا اور اپنی رعایا پر ظلم و ستم روا رکھا تھا اور جس کی سزا کے طور پر ان کو پاک خطہ ارض مقدس چھین لیا گیا تھا اسی طرح مسلمانوں نے اپنے قبلہ اول اور والدین ایوبی کی شاندار فتح کو ایسا گھن لگایا اور احکام الہی اور سنت نبوی سے ایسے کہ خدا نے ناراض ہو کر یہ سر زمین مسلمانوں سے پھر چھین لی اور آج یہودی سپاہی

سلطان صلاح الدین کا خیمہ شہر سے باہر نصب کیا گیا تھا۔ مندوبین کلام پاک تلاوت کرنے، حمد و نعت پر مشتمل نظمیں پڑھتے اور سلطان کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے تھے۔ پھر 9 اکتوبر 1187ء سلطان کے ساتھ ایک عظیم جماعت نے مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ پڑھا۔ انہوں نے دمشق کی فتح اور اول کی تطہیر پر خدائے ذوالجلال کا شکریہ ادا کیا اور پیغمبر خدا اور خلیفہ وقت پر صلوات بھیجا۔

انہوں نے خطبہ میں فرمایا۔ ”اے ایمان والو یہ خبر موجب فضاہ و مسرت ہے کہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بہت خوش ہوا ہے اور ایک مومن کی یہی معراج ہوتی ہے۔ نے ایک بھٹکے ہوئے اونٹ کی مہار غلط ہاتھوں سے نکال کر تمہارے ہاتھ میں دیدی ہے اسے اسلامی اخوت میں دوبارہ داخل ہونے میں تمہاری مدد کی ہے جبکہ کافروں نے تقریباً ایک صدی تک اس پر ناجائز قبضہ جمائے رکھا تھا۔ اس محترم گھر کی تطہیر پر ہمیں ناز چاہئے۔ وہ جو خدا نے بنوایا اور اس میں اپنا کلمہ پڑھوایا۔ وہ گھر جس کی بنیاد خدائے کے دین پر رکھی گئی اور یہی بہترین بنیاد ہو سکتی ہے جس کی دیواریں اس کی عظمت اور کی خاطر تعمیر ہوئیں اور زمانہ قدیم سے آج تک زاہد و تقویٰ پر قائم ہیں۔ یہ تمہارا (دینی) باپ کی قیام گاہ تھی اور یہیں سے تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ یہی اسلام کا اولین قبلہ ہے جس کی طرف منہ کر کے ہم نماز پڑھتے۔ پیغمبروں کا مسکن ہے۔ رسولوں کی آخری آرام گاہ اور اولیائے کرام کا ماویٰ ہے۔ یہ وہاں ہے جہاں خدا نے اپنے رسول اور بندہ کو بھیجا۔ جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ جنہیں نے اپنی رسالت سے نوازا اور پیشین گوئی کی طاقت عطا فرمائی تاہم انہیں مخلوق کے سے نہیں بڑھایا۔

”اگر تم اس کے ہرگز بندوں میں سے نہ ہوتے تو وہ تم پر یہ برکت نازل نہ کرتا۔ میں نہ تو تمہارا ثانی ہو سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کی تکمیل زمیں تمہارا حصہ دار ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ غزوہ بدر کے صحابہ کرام کی طرح تم نے جہاد کیا۔ حضرت اکبر کی طرح ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر کی طرح فتح مند۔ تم نے حضرت عثمان کے اور حضرت علی کے حملوں کی یاد تازہ کرادی۔ تم نے اسلام کی شان اور اس کی سر بلندی خاطر قادیسہ، یرموک، خیبر اور خالد بن ولید کی شاندار روایتیں دہرائیں۔ خداوند تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور خون کی قربانی جو تم نے اس کی راہ میں بہایا ہے فرمائے اور جنت الفردوس کو ہمیشہ کے لئے تمہارا جلاوادی بنائے۔“

اور عام آدمی اس مسجد کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔

آج عالم اسلام اپنی غلطیوں پر نادم اور اشک فشان ہے۔ مسلمانوں کی توبہ اور از عرش اعظم تک پہنچ چکا ہے اور پھر کوئی صلاح الدین پیدا ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے یہودیوں کے ناپاک قدموں سے قبلہ اول کی زمین کو پاک کرے گا۔ آئیے ہم سب مل کر اس دن کے آنے کی دعا کریں جب ارض مقدس ایک بار پھر اللہ اکبر کے نعروں سے اٹھے۔ قوموں کی تاریخ میں صدیوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی کیونکہ قوموں کی تقدیر بدلتے بدلتی ہے مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کو اپنی غلطیوں کا ادب ہو چکا ہے اور یہودیوں کے ظلم و ستم کی بھی انتہا ہو چکی ہے۔

سلطان صلاح الدین کی بیت المقدس کی بازیابی کے سلسلہ میں مسجد اقصیٰ کی محراب پر ایک یادگار کتبہ کتبہ ہے (پتہ نہیں اب یہودیوں نے اس کتبہ کے ساتھ کیا کیا کیا)۔ کتبہ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا بندہ یوسف ابن ایوب المنظر الملک الناصر صلاح الدین نے اس محراب مقدس کی مرمت اور مسجد اقصیٰ کی تجدید کا حکم دیا جبکہ اللہ نے اسے فتح مند کیا۔ دعا ہے کہ خدا اسے اپنے احسانات کا شکریہ ادا کرے کی صلاحیت بخشے اور اپنے رحم و کرم سے اس کے گناہ معاف فرمائے۔

جذبات ہیں کہ اندے پڑتے ہیں۔ قلم ہے کہ بے چین ہوا جا رہا ہے کہ جب المقدس کا ذکر ہوا ہے تو اس ارض مقدس میں جو زیارات موجود ہیں ان کا تذکرہ بھی ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ سلسلہ صلاح الدین ایوبی کی سوانحیات اور مجاہدانہ کارناموں ہے۔ اس میں زیارتوں کی تفصیل کی گنجائش نہیں پھر بھی میں ان زیارات کے نام اور ممکن ہو سکا تو ایک ایک درود جملوں میں ان کا تعارف پیش کروں گا۔ ایک اندازہ کے مطابق بیت المقدس میں ایک سو سے زائد زیارات ہیں جن میں خاص خاص زیارتوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر 1۔ قبتہ الصخرہ

حدیث نبوی ہے :-

”اس جگہ جو نماز ادا کی جائے پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔“ علماء کرام اور

عالم حلیم کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ اور گنبد خضرا (روضہ رسول) کے بعد روضۃ الصخرہ مسلمانوں کے لئے مقدس ترین مقام ہے۔ یہاں گنبد خضرا اور قبتہ زین لوط خاطر رہے۔ گنبد خضرا وہ بنر گنبد ہے جو مدینہ منورہ میں روضہ رسول پر اور قبتہ الصخرہ وہ پاک چٹان ہے جو بیت المقدس میں ہے۔ عراقی زبان میں بتے ہیں۔ یہ چٹان زمین سے صرف دو گز اونچی ہے۔ نہ یہ مریخ ہے اور نہ اس کی لمبائی 58 فٹ ہے اور چوڑائی 42 فٹ ہے۔

اس کی قدامت کے سلسلہ میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت ہے کہ تخلیق ۷۰۰ سال پہلے فرشتے اس کا طواف کر چکے تھے۔ دوسری روایت یوں ہے کہ حج کے اختتام پر کشتی نوح جس مقام پر رکی تھی وہ یہی چٹان ہے۔ یہ بھی کہا جاتا روز قیامت حضرت اسرائیل اسی چٹان پر کھڑے ہو کر صور پھونکیں گے۔ اکثر مفسرین یمن اسے بہشت کی چٹانوں میں سے بتاتے ہیں کیونکہ اسے ”بنت البنت“ (جنت کی لڑکی) کہا گیا ہے۔

یہ چٹان پر حضور صلی وسلم نے عرش اعلیٰ پر جاتے ہوئے تمام انبیائے کرام کی نماز ت فرمائی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس خطے میں پیدا ہونے والے رسول اسی بننے کے لوگوں کو احکام الہی پہنچاتے تھے۔ اگر قبضہ الصخرہ کی برکات اور فیوض کی لہ جائے تو اس کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے اس اختصار کو سمجھا جائے۔

قبتہ السلسلہ

قدسی کا بیان ہے کہ حرم شریف کا صحن پختہ ہے اور اس کے درمیان میں مدینہ کی مسجد کی طرح ایک چبوترہ اٹھا ہوا ہے جس کے چاروں طرف چوڑی چوڑی بائیں۔ اس کے چبوترے پر چار گنبد ہیں۔ ان میں قبتہ السلسلہ، قبتہ المعراج اور لٹا چھوٹے پیمانے کے ہیں۔ یہ دیواروں کے بغیر سنگ مرمر کے ستون پر قائم اوپر سے کی چادریں چڑھی ہیں۔ ابن اتیہ نے اس کے بیس ستون بتائے ہیں۔

اس کے روبرو مشرق جانب حضرت خضر کا مقام عبادت ہے اور اس کے شمال میں قبتہ مقام جبریل ہیں اور چٹان کے برابر قبتہ المعراج واقع ہے۔ ابن عبد ربیہ کا بیان ہے کہ گنبد ہے جس میں بنی اسرائیل کے زمانہ میں جس میں ایک زنجیر لٹکی رہتی تھی جو ”درمیان کذب و صدق“ کا فیصلہ کرتی تھی۔

قبتہ المعراج

ملینوں کے دور میں حرم شریف کے شمالی پہلو میں محراب داؤد تھی جو ختم ہو گئی ہے۔
اب اس کے قریب کرسی سلیمان جو ایک قد آدم بلند چٹان ہے وہ باقی ہے۔

نمبر 11 قبة موسیٰ

عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ باب السلسلہ کے مقابل قبة موسیٰ بنا ہوا ہے لیکن اسے حضرت موسیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔

اسی طرح کتابوں میں کیف نمبر 12، ابراہیم نمبر 13، یسار ابراہیم نمبر 14، مقام الخلد نمبر 15، مقام النار نمبر 16، مقام کعبہ اور نمبر 17، محراب یعقوب کا ذکر ملتا ہے لیکن اب یہ مہدم ہیں۔

نمبر 18 سیدنا سلیمان کا مصلیٰ یا کرسی

باب حد میں داخل ہو کے مسجد کے شمالی دروازہ باب الانبیاء ہے۔ باحد اور باب الانبیاء کے درمیان میں یہ قبلہ چارستوں پر قائم ہے۔ جس میں قبلہ رو محراب بنی ہوئی ہے۔ اسے سیدنا سلیمان کا مصلیٰ کہتے ہیں، معبد کی تعمیر کے وقت حضرت سلیمان اسی جگہ بیٹھ کے فیصلہ فرمایا کرتے ہیں۔

نمبر 19 روضہ سیدنا سلیمان

یہ روضہ حرم شریف میں مسجد محراب کے مشرق میں تین سو قدم کے فاصلہ پر بیرونی دیوار کے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دونوں جانب جالی دار کھڑکیاں لگی ہیں۔ جن سے روضہ دیکھا جاسکتا ہے قبرسات گزلبی ہے۔ روضہ کے متصل جس سلیمان (نیل خانہ) ہے۔ وہاں شریر جنات کو قید کیا جاتا تھا۔ اصطبل وہاں سے تھوڑے فاصلہ پر ہے۔

نمبر 20 دیوار براق

یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاج کی رات براق (پردہ پرندہ) باندھا گیا تھا۔ حرم میں خواتین کے لئے ایک چھوٹی سی کھدنی ہے۔

نمبر 21 مزار مولانا محمد علی جوہر

مولانا جوہر کا مزار مسجد محراب میں مغرب جانب ایک بند کمرے میں ہے کتبہ پر عربی عبارت لکھی گئی ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

”اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کی جان و مال کے صدقے جنت دے

گا۔ یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی ہندی کی قبر ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی

وہ گنبد جہاں سے حضور معراج کے لئے براق (پردہ جانور جسے رف رف بھی کہتے ہیں) پر سوار ہو کے معراج کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

نمبر 4 قبة النبی

وہ گنبد جہاں پر حضور نے کھڑے ہو کر انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا کی تھی۔

نمبر 5 معبد جبرئیل

بعض روایتوں میں قبة النبی اور قبة المعراج ہی کو معبد جبرئیل بیان کیا گیا ہے عمارتیں مستحکم نہیں تھیں اس لئے اب اس کا کوئی وجود نہیں

نمبر 6 گنبد سلیمان

باب شرف الانبیاء کے قریب احاطہ حرم میں جو گنبد واقع ہے اسے گنبد سلیمان جاتا ہے۔ یہاں سلیمان سے مراد حضرت سلیمان نہیں بلکہ بنو امیہ کے خلیفہ عبدالملک سلیمان بن عبدالملک سے ہے جس نے یہ گنبد بنوایا تھا۔

نمبر 7-8 قبة الارواح - قبة الصخر

چوتہ کے باہر شمال مغربی کوفہ میں قبة الارواح اور جنوب میں قبة الصخر ہیں

نمبر 9 مہد مسج (مقام پیدائش حضرت مسیح)

احاطہ حرم کے جنوبی مشرقی گوشہ میں قدیم بنیادوں پر ایک چھوٹی سی زمین دوسرے جو مہد مسیح کے نام سے مشہور ہے۔ ابن عبد ربیع نے اسے محراب مریم بنت عمران مقدسی نے اسے محراب مریم و زکریا کا نام دیا ہے۔ روایت ہے محراب مریم میں فر حضرت مریم کے لئے گرمی میں سردیوں کے اور سردی میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے۔ محراب زکریا اس کے ساتھ ہی مہد مسیح میں زمانہ قدیم سے حضرت مسیح کا پگھلا رکھا۔ یہ پگھلا پتھر کا ہے اور اس قدر وسیع ہے کہ ایک آدمی اس کے اندر کھڑے ہو کر نماز کر سکتا ہے۔ پگھلا پتھر میں گڑا ہوا ہے۔ اس میں حضرت مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) کو لایا تھا جہاں انہوں نے ایام شیرخواری میں لوگوں سے گفتگو کی تھی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ ایک ستون اٹھلیوں کے نشان ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مریم نے دروہ کی شدت میں اس کو پکڑا تھا اور یہ نشان ان کی اٹھلیوں کے ہیں۔ عیسائیوں کے دور میں حرم شریف کے زمین دوز مقامات کو اصطبل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لئے اسے اصطبل سلیمان کہا جاتا ہے۔

نمبر 10 محراب داؤد

رحمت میں جگہ دے۔ انہوں نے پندرہ شعبان کو لندن میں وفات پائی اور جمعہ کے دن 1349ء ہجری میں قدس میں دفن ہوئے۔
نمبر 22 دیوار گریہ

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فیٹ کے ایک ککڑے کے لئے یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ کل سلیمانی کے باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مقام پر آتے اور گریہ کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس دیوار کا نام گریہ پڑ گیا ہے۔ مسلمان اس مقام کو براق کہتے ہیں کیونکہ شب معراج حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مقام پر براق سے اترے تھے۔ براق پانچ کھجور مسجد میں تشریف لے گئے تھے۔ اس مقام کی نشاندہی لئے یہاں ایک کڑا لگا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب حضرت عمر بیت المقدس میں داخل ہوئے تو دیوار دیوار گریہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ حضرت سلیمان کے معبد کو تباہ ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں اور ہیرودا اعظم نے اس جگہ جو عمارت تعمیر کرائی تھی اسے بمطس رومی نے 70ء میں مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور جو آثار باقی تھے اسے ملکہ ہیلنا نے مٹا دیا۔ بہر حال اب تو یہودی بیت المقدس پر قابض ہیں۔ انہیں امریکہ بہادر نے شہر دے رکھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ امریکہ میں دراصل یہودیوں ہی کی حکومت ہے۔ یہودیوں کا بے خانماں فلسطینیوں پر ظم و ستم حد سے بڑھ گیا ہے اور اب ذات باری تعالیٰ جلال میں آنے ہی والی ہے۔
نمبر 23 حوض اور تالاب

احاطہ حرم کے نیچے چٹانوں میں مختلف مقامات پر بہت سے حوض بنے ہوئے ہیں جو پائے جمع کرنے کے کام آتے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں جرون کے قریب وادی اوطاس سے چشموں کا پانی ایک بند کے ذریعہ ان حوضوں میں پہنچایا جاتا تھا بیت المقدس کا سب سے بڑا حوض جس کا ایک حصہ خود مسجد اقصیٰ کے نیچے کھودا گیا۔ یہ درقہ کہلاتا ہے۔ سیوطی نے اس کی وجہ تسمیہ میں عجیب روایت لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

ابوبکر بن ابی مریم، عطیہ ابن قیس کے واسطے سے بیان کرتا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تحقیق میری امت میں سے ایک شخص اپنے دو پاؤں پر جنت میں داخل ہوگا اور وہ واپس آئے گا اور وہ زندہ یعنی دنیا کا رہنے والا ہوگا۔“

اب اس سلسلہ میں روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق کے بعد خلافت میں بنی تیمم کے ایک شخص جس کا نام شریک بنی حباث تھا وہ بیت المقدس گیا اور ایک کنویں میں اتر

کنویں میں ایک دروازہ دکھائی دیا جو ایک باغ میں کھلتا تھا۔ شریک ابن حباث اس باغ داخل ہوا اور اس کی سیر سے دماغ کو فرحت پہنچائی پھر واپسی پر اس نے کسی درخت کا ٹوکے کان کے پیچھے لگا کر ڈول کے ساتھ اوپر آگیا۔

شریک ابن حباث اوپر آکر وہ پتہ جسے وہ باغ سے لایا تھا اسے لے کر حاکم وقت کے پاس گیا اور کنویں کے اندر باغ کا حال بیان کیا۔ حاکم وقت نے اس کے ساتھ چند آدمی لئے تاکہ وہ تحقیق کر کے اصل حال معلوم کریں۔ ان میں دو آدمی شریک ابن حباث کے ساتھ کنویں کے اندر اترے مگر وہاں کوئی دروازہ نہیں دکھائی دیا۔ شریک ابن حباث کو لئے گئے حاکم شہر کے پاس آیا اور بتایا کہ اب کنویں کے اندر کوئی دروازہ نہیں۔ لیکن یقین ہے کہتا ہوں کہ میں باغ میں گیا تھا اور میں نے یہ پتہ اس باغ کے ایک درخت سے توڑا

حاکم شہر نے وہ پتہ جسے اس نے اپنے پاس رکھوایا تھا منکوا کر دیکھا مگر وہاں کوئی شخص نہ پایا نہ کوئی پہچان سکا کہ وہ کس درخت کا ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بیت المقدس میں لوگوں کو وہ پتہ دکھایا گیا مگر کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اب یہ مقدمہ حاکم شہر نے عمر فاروق کے دربار میں بھیجا اور ساتھ میں حضور کی ایک حدیث تحریر کر دی جس کا مطلب تھا

”میری امت میں سے ایک شخص اپنے پیروں پر جنت میں داخل ہوگا

اور واپس آئے گا اور وہ زندہ ہوگا۔“

اسی کے جواب میں حضرت عمر فاروق نے فرمایا:-

”اس پتہ کو دیکھا جائے۔ اگر وہ سرسبز ہے اور پتہ مردہ نہ ہو تو وہ جنت کا پتہ ہے لہذا کبھی نہیں مرجھاتے اور مذکورہ حدیث میں بھی رسول اللہ کا یہ ارشاد فرمایا گیا ہے اس پتہ میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوگی۔“
جب پتہ کو دیکھا تو اسے سرسبز پایا۔

24 وادی ساہرہ۔ میدان جنم

ناصر خسرو کہتا ہے کہ جامعہ مسجد سے آگے بڑا سا مسطح میدان ہے جسے ساہرہ کہتے ہیں مشہور ہے کہ یہ میدان قیامت ہے اور یہی محشر خلافت ہوگا۔ اس کے اندر ایک بڑا نمونہ اور بہت سے مقدس مقامات ہیں جہاں لوگ مندرجہ ذیل دعا مانگتے ہیں:-
”اے خدا ہماری مراد کو پورا کر۔ ہمارے گناہوں اور بد اعمالیوں کو معاف فرما اور اے سب سے بڑے رحیم اپنی رحمت سے ہم پر

رحم فرما۔“

مسجد اور دست ساہرہ کے درمیان نشیب میں ایک وادی ہے جو خندق معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروق نے اسے وادی جنم کا نام دیا ہے اور آج بھی اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ اسی وادی میں وہ عمارت ہے جسے ”فرعون کا گھر“ کہا گیا ہے۔ یہ اپنی ساخت کے لحاظ سے حیران کن ہے۔

وادی جنم جسے یہودی کیدرون کہتے ہیں کے نشیبی علاقہ میں عین ایوب بنی چشمہ ایوب ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اس چشمہ میں غسل فرمایا تھا۔ اس کے پانی سے کوئی نہالے تو اس کا جسم کا درد دور ہو جاتا ہے۔

نمبر 25 غار قارون

بیت المقدس کے عجائبات میں ایک بڑے غار کا بھی ذکر ہے جسے کلام پاک کی سورہ قصص کے حوالے سے قارون سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہاں سے ایک دروازہ اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں حضرت موسیٰ کے مقتولین دفن ہیں۔

نمبر 26 جامعہ عمر

مسجد اتھے اور قبۃ الصخرہ کے علاوہ شہر میں پینتیس مساجد ہیں۔ ان میں سب سے مشہور قابل دید جامعہ عمر ہے۔ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب بیت المقدس نے بطریق اعظم (لارڈ پادری) نے آپ کو کنیہ، قمامہ دیکھنے کی دعوت دی تو اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب سیر کے بعد واپس ہوئے تو بیڑھیوں پر نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ بطریق اعظم نے درخواست کی کہ قمامہ بھی عبادت گاہ ہے آپ یہاں نماز پڑھ لیں۔ آپ نے انکار کر دیا مبادا کہ مسلمان حضرت عمر کی پیروی میں کلیساؤں میں نماز پڑھنے کا رواج ڈال دیں اور ان کی عبادت گاہیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ آپ نے بیڑھیوں پر نماز پڑھی اور پھر ایک حجر لکھدی کہ مسلمان میری تقلید میں اس گرجا پر تعریف نہ کریں۔ مسلمان حضرت عمر کے اس حکم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے قمامہ کے سامنے ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت چاہی اور حضرت عمر کی منظوری پر ایک نہایت خوبصورت مسجد بالمقابل کنیہ قمامہ عیسائیوں نے اپنی طرف سے تعمیر کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دی۔

بیت المقدس اور اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی زیارات کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا اگر نصاریٰ (عیسائی) کی دو زیادتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان میں ایک تو بکینہ قمامہ ہے اور دوسری کینہ صعد ہے۔ اس لئے اس کا مختصر حال تحریر کیا جاتا ہے۔

نمبر 1 کینہ قمامہ

کنیہ قمامہ اور القیامہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس قیادت خیر کنیہ کو بقول کے پورا یورپ کافروں سے آزاد کرانے کے لئے اٹھ آیا تھا۔ عیسائی اس کنیہ کو سمجھتے تھے۔ ان کی روایتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ یہیں مصلوب ہوئے اور انہوں نے یہیں دوبارہ زندہ ہوں گے۔ اس گرجا میں ایک صلیب بنائی گئی ہے جو ل مرمر کے ایک مستطیل چوترے پر کھڑی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی ہتھیلیوں میں ناٹکی ہیں۔ پاؤں کو تلے اوپر لکڑی رکھ کر کیل اس طرح ٹھوکی گئی ہے کہ وہ مژر کر لکڑی سے نکل گئی ہے۔ اسی کے ایک طرف حضرت مریم غمگین کھڑی رت مریم کا مجسمہ نہایت شاندار ہے۔ ساری مورت سونے کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم اسی جگہ شدت غم سے بے ہوش ہو کر گری تھیں۔ اس جگہ وہ چٹان بھی ہے روایت کے مطابق ٹوٹ گئی تھی اور حضرت آدم اس میں سے برآمد ہوئے تھے۔ کے مطابق وہ چٹان حضرت عیسیٰ کے صلیب دئے جانے کے مقام کے نیچے تھی۔

کلامہ میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور ان دونوں، حضرت عیسیٰ اور ان کے گدھے کی تصویریں اور جنت و دوزخ کے نقشے بنے۔ اسی کنیہ میں آگ کا معجزہ پیش آیا تھا جس کے حوالہ سے عقیدت مند عیسائیوں کو دھوکہ دیتے اور لوٹتے رہتے تھے۔ یہ گرجا شہر کی سطح سے نیچا اور بیت المقدس دروازہ کے اندر گلی میں ایک ایسی تنگ جگہ واقع ہے کہ جانے والا یقیناً ”سجدے میں ہو جاتا ہے۔“

کینہ صعد

ماکن کا باغ، جبل زیتون کے دامن میں حرم شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر ب کی سمت واقع ہے۔ اس گرجا میں ایک غار ہے جس میں حضرت عیسیٰ اپنے کے ساتھ عبادت خداوندی میں مصروف رہتے تھے۔ اس سے آگے حضرت مریم کا ہے جو ایک وسیع اور عمیق مکان میں ہے۔ روضہ تک پہنچنے کے لئے موم بتی جلانا۔ حضرت مریم کا روضہ ایک مختصر کمرے میں ہے جس میں پانچ چھ آدمیوں سے ماسکتے۔ روضہ کی دیواروں پر حضرت عیسیٰ کی زندگی کے ادوار کی مختلف تصویریں لیں جنہیں دیکھ کر عیسائی روتے ہیں۔

کنیہ صعد

کنیہ صعد زیتون پر واقع ہے۔ حضرت عیسیٰ رات کے وقت وہاں عبادت کرتے تھے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو شہید کرنے کے خیال سے اس مکان کا ارادہ کیا تو اللہ

- نمبر 10 مہدی عیسیٰ علیہ السلام
نمبر 11 اصطلیل سلیمان
نمبر 12 مسجد اقصیٰ
نمبر 13 باب النبی
نمبر 14 باب المغاریہ
نمبر 15 باب السلسلہ
نمبر 16 باب المطارہ
نمبر 17 باب القناتین
نمبر 18 باب الحدید
نمبر 19 باب المناظر
نمبر 20 باب الزوایا
نمبر 21 باب الخوانجر
نمبر 22 باب السمر
نمبر 23 باب التوبہ
نمبر 24 باب الاسباب
نمبر 25 باب الذهب
نمبر 26 باب التقديم
27 اکبرہ دروازہ
28 تہ دروازہ
29 ڈہرا دروازہ
30 1918ء سے قبل تک افواج کا مستقر
31 یہودیوں کا مقام گریہ

تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھا دیا۔ اس کنیہ ”العاذر“ کی بھی قبر ہے جسے حضرت میرا حکم خداوندی سے زندہ کر دیا تھا۔ یہاں وہ گر جا بھی ہے جس میں عیسائی مرد و زن قربہ کے لئے اپنے آپ کو قید کر لیتے ہیں۔

اسی گر جا میں وہ ضیافت خانہ (ڈائننگ ہال) ہے جس میں حضرت عیسیٰ اپنے شاگرد کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ وہ میز اور مائدہ جو آسمان سے اتری تھی آج بھی موجود ہے۔ جس مقام پر حضرت عیسیٰ کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا وہاں آج کل ایک بنا ہوا ہے اور اس میں وہ حصہ جہاں پیلاٹس کی عدالت موجود تھی اب ایک تہہ نا شکل میں واقع ہے۔ اس کے پتھر وہی ہیں جو رومن دور میں تھے۔ اس گر جا سے ایک کنیہ الکمامہ کو جاتا ہے۔ اس راستہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عدالت سے سزائے پانے کے بعد حضرت عیسیٰ صلیب اپنے کاندھے پر رکھ کر اس مقام کی طرف لئے گئے جو صلیب دینے کے لئے مقرر تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس راستے میں بارہ مقامات حضرت عیسیٰ تک کر دم لینے کے لئے ٹھہرے تھے۔ ان تمام مقامات پر عیسائیوں کے فرقوں نے اپنے گرجے بنا رکھے ہیں۔

مختصر یہ کہ کنیہ الکمامہ کے علاوہ شہر کے اندر اور باہر عیسائیوں کی متعدد زیارتیں ہیں۔

احاطہ حرم کی تمام زیارتوں کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکی۔ ذیل میں مرا کے نام ترتیب سے درج کئے جا رہے ہیں تاکہ آپ یادداشت کے لئے آزر کر لیجئے۔

احاطہ حرم کی زیارتیں

- نمبر 1 قبۃ الصخرہ
نمبر 2 قبۃ السلسلہ
نمبر 3 قبۃ المعراج
نمبر 4 قبۃ النبی
نمبر 5 قبۃ الازواج
نمبر 6 قبۃ الخضر علیہ السلام
نمبر 7 قبۃ سلیمان عید السلام
نمبر 8 کھلا منبر
نمبر 9 تخت سلیمان علیہ السلام

دے رہے تھے۔ جب سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے بعد سلطان صلاح الدین
تسلیم ہوا تو فلسطین اور شام کے امراء باہم خانہ جنگوں میں مصروف رہنے
پڑے۔ یہ مختصر علاقہ دمشق، حلب، الرہا اور موصل وغیرہ کی چھوٹی ریاستوں
کا تھا لیکن سلطان صلاح الدین نے 1183ء تک دجلہ سے نیل تک تمام ریاستوں
پر قابض ہو کر متحد کر دیا تھا۔

ان اور فرنگیوں کے درمیان لڑائی کا آغاز طبرہ کے میدان سے ہوا۔ جنگ طبرہ
ن کا جو انجام ہوا اس کا اندازہ ایک چشم دید گواہ کے بیان سے ہوتا ہے وہ کہتا

نقص میدان جنگ میں پڑی لاشوں پر نظر دوڑاتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے تمام
ارے گئے ہیں اور اگر وہ قیدیوں پر نظر ڈالتا تو ان کی کثرت سے یہ اندازہ ہوتا کہ
جنگی گرفتار ہو گئے ہیں۔

سلطان نے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کی اور بیت المقدس پر قبضہ عیسائی
کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ فتح بیت المقدس کے بعد غازی اسلام
ابن الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبتہ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔
ان دیواروں پر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی خیالی تصویریں بنوا رکھی
سلطان نے ان تصاویر کو صاف کرا کے فرش اور دیواروں کو گلاب و مشک سے دھوا
لایا اور مسلمانوں کو عام حکم ہوا کہ آئندہ جمعہ کو وہاں نماز جمعہ ادا کریں۔ چنانچہ
582ء کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔
ماروز شرم میں مقیم رہا پھر صور کی طرف روانہ ہوا۔

ان کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ سے پہلے وہاں کی جو حالت تھی اس کے
آف ہاؤز کہتا ہے۔

ارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں جسے باعصمت کہا جائے۔“ ملیوں اور
ارہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس کے بارے میں اس کا بیان ہے۔ ”عام
ت مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں میں روز بروز دولت کے ڈھیر لگتے
۔ استغنا اعظم ہر قلیس کے صندوق سم و زر سے بھرتے جاتے تھے۔ وہ دولت کا
۔ اس کی زندگی حرم و ہوس کا افسانہ تھی۔ وہ زمین جو کلیسا کی ملکیت نہیں تھی
بیکل کے محافظوں (مپلز اور ہاپٹلز) جیسی نیم مذہبی اور نیم فوجی تنظیموں کے
مالچی مکی تھیں۔ سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ

محبت اور ہوس

فرنگی مورخ لکھتے ہیں:-

صلیبی دور میں یروشلم عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح
الدین نے اسے فتح کر کے عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کے خون کا
انتقام نہ لیا جو ایک صدی پہلے بیت المقدس میں مسلمانوں کے ہاتھوں ذبح کر دیے گئے تھے۔
تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ سلطان صلاح الدین کے فرمان کے مطابق جب بیت المقدس
سے جانے والے جاچکے تو سلطان 27 رجب بروز جمعہ 582 ہجری مطابق اکتوبر 1187ء
ہلالی پرچم اڑاتا بیت المقدس میں داخل ہوا۔ مسجد عمر اور دیگر مقامات پر عیسائیوں نے
سلیس چڑھا رکھی تھیں وہ سب اتاری گئیں اور ان کی جگہ ہلالی پرچم لہرایا گیا۔
وہ صبح جلیل جب کفر کے علم سرنگوں ہوئے نعت ازیں میں
روپوش ہوئے وہ صبح امید اسلام کی حیات تازہ کی نوید نورانی کی
درخشندہ دمید

تاریخ بتاتی ہے کہ مصر میں سلطان صلاح الدین کے اقتدار قائم ہوتے ہی دنیا
افریک میں تشویش پیدا ہو گئی تھی اور اسی وقت سے اندلس، سسلی اور فرانس کی حکومتوں
میں سفارتی گھوڑے دوڑنا شروع ہو گئے تھے۔ فرنگیوں میں اتحاد تو پیدا ہو گیا تھا لیکن ان کی
امداد اس وقت پہنچی جب بیت المقدس پر اسلامی پرچم لہرایا گیا تھا۔ فرنگیوں نے بوکھلا
دنیا پر حملہ کر دیا لیکن وہاں سے مار بھگائے گئے۔

سلطان صلاح الدین کی پیدائش قلعہ حکریت میں 532ھ مطابق 1138ء ہوئی تھی۔
اس کی پیدائش سے دس سال پہلے فلسطین اور شام میں لاطینی ریاست اپنے عروج پر تھی۔
شام اور بالائی علاقہ یعنی الجزائر وغیرہ ان کی جولا نگاہ بنے رہتے تھے اور مریدین سے نرا

مسلمان مجاہدین پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

حمید کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ قلعہ اور شہر صور کے وہ حالات بائیس جس کی وجہ سے وہاں پہلے صور فتح نہ ہو سکا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اگر مکہ کے ذریعہ "بدر" صور پر حملہ کر دیا جاتا تو اس کا فتح ہو جانا یقینی تھا۔ سلطان نے فلسطین کے تمام شہر فتح کر لئے تھے صرف بحر روم کے ساحل کے تین شہر صور، عتقان اور ذس باقی تھے۔ ان میں سے عتقان اور بیت المقدس بعد میں تسخیر ہوئے مگر صور تک سر نہ ہو سکا تھا۔ سلطان نے صور کا محاصرہ کر لیا تھا مگر وہ صور پر کوئی شدید کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ صور کا محاصرہ طویل ہو۔ اس سے پہلے کئی شہر بیت کے ذریعہ سلطان کو حاصل ہو گئے تھے۔ صور کے معاملہ میں بھی اس کی معلوم ہوتی تھی۔ صور کا فتح ہو جانا یوں بھی آسان معلوم ہو رہا تھا کہ کاؤنٹ رابن چلا گیا تھا مگر وہ زندہ نہ رہ سکا اور جلد ہی مر گیا۔ انطاکیہ کا شہزادہ اس کا داماد صور کی فوجی طاقت نہ بڑھا سکا۔

لکھتا ہے کہ جب رجبی نالذ اور کماندار نے دیکھا کہ صور سے تمام نائش چلے اور سامان رسد کی بھی کمی ہے تو ان لوگوں نے سلطان کے پاس سفارت بھیجی اور کہا کہ اگر سلطان محاصرہ اٹھالے تو دوسرے قلعوں کی طرح صور ان کے حوالے نہ لگے۔ مقصد یہ تھا کہ صور والوں کو بھی اپنا سامان لے کر نکل جانے کی اجازت ملے۔ سلطان پہلے ہی قلعوں کے سلسلہ میں یہ رعایت دے چکا تھا اس لئے اس نے سلطان کو صور کی فتح کا اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ اس نے قلعہ کی سفارت کے سامان پر چم بھی بھجوائے کہ انہیں قلعہ کے برجوں پر لگا دیا جائے اور قلعہ والوں رعایت میں اسلامی پرچم صور کے برجوں پر اڑائے تھے لیکن صور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف شہر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا لیا بلکہ شام کے دیگر مستقبل بھی بدل کے رکھ دیا۔

یہی اٹلی کا ایک مہم جو جنگ آزما نوجوان جس کا نام کونرڈ تھا جسے مانٹ فیئرٹ کا نام ہے۔ اس نے جب اطالوی اور ہینرٹینی معرکوں میں نام پیدا کیا تو وہ مشرقی شام جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا (قسطنطنیہ اس وقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا) میں پہنچا مگر جوش جوانی میں اس نے قسطنطنیہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور فرار ہو گیا (اس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی)۔ کونرڈ کو یہ کہہ کر چھپایا تھا وہ بیت المقدس کی زیارت کو جا رہا ہے۔ سلطان صلاح

جامعتیں براہ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے یہاں پناہ محفوظ ہو جاتے تھے۔

یکم نومبر 1187ء کو سلطان نے اپنے لشکر کو صور کی طرف روانہ کیا اور بارہ دن بعد بھی بیت المقدس سے صور پہنچ گیا۔ صور بحر روم پر فلسطین کا ایک محفوظ قلعہ تھا۔ پشتر بھی سلطان نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا اور قلعہ فتح ہونے والا تھا کہ ایک ایسا واقعہ آیا جس نے نہ صرف قلعہ صور کو اس وقت سلطان کے مضبوط ہاتھوں سے بچا لیا بلکہ وقت بھی وہ اونچا پہاڑ بن کے سلطان کے راستہ میں کھڑا ہو گیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے اس دوسرے محاصرے کا حال بیان کرنے سے پہلے صور کے پہلے محاصرے کا حال بیان کرنا ضروری ہے اس لئے کہ قلعہ صور کے محاصرہ میں نہ صرف سلطانی لشکر پر اثر ڈالا بلکہ وہ آئندہ چل کے تیسری صلیبی جنگ موقعہ پر سلیبوں کے لئے بھی ایک مصیبت ثابت ہوا تھا۔ آئیے اب ہم قلعہ صور کے محاصرہ کا مختصر حال بیان کرتے ہیں۔

بیت المقدس کی فتح سے تقریباً "ذیہ" ماہ پہلے یعنی 8 جولائی 1187ء کو سلطان الدین ایوبی قلعہ کی تفصیل کے سامنے موجود تھا پھر اس کے دو دن بعد سلطان نے قلعہ اسی مسجد میں نماز ادا کی جسے نوے سال پہلے کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مسجد کو کچھ تبدیل کر دینے کے وقت سے اب تک ساحل فلسطین پر پہلی نماز ادا کی گئی تھی۔ سلطان مکہ میں نہایت نرم شرطوں پر معاہدہ کر کے اسے حاصل کیا۔ قلعہ میں اس وقت مسلمان قید و بند کی سختیاں بھگت رہے تھے انہیں آزادی نصیب ہوئی۔ قلعہ پر قبضہ۔ روم کی منڈی کے دروازے مسلمانوں پر کھل گئے۔ یہاں اس قدر دولت میر آئی کہ جنگ کی تمام کمی پوری ہوئی اور فوج کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

سلطان نے اندرون ملک فتوحات کے لئے الگ الگ لشکر روانہ کئے اور مصر بھائی ملک العادل کو اطلاع بھجوائی کہ وہ مصری لشکر لے کر فلسطین کی تسخیر میں فوراً پہنچے۔ سلطانی دستوں نے فوراً "فتوحات کا آغاز کیا۔ نیزارتھ مغربیہ اور الفل ہوئے۔ ساحل پر حیضہ اور قیاریہ کو فتح کیا گیا۔ بیت اور نابلس پر بھی جلد ہی قبضہ ملک العادل مصر سے روانہ ہوا اور اس نے آتے ہی قلعہ میراتیل اور جانف لے لیا۔ اس دوران نورون کا محاصرہ کر کے فتح کیا پھر ساحل پر سرائفہ، صیدون، بیروت کئے۔ نورون اور بیروت پر کچھ مقابلہ ہوا۔ سلطان نے عام طور پر شہروں کے لئے شرائط پیش کیں اور قلعے اور شہر کے دروازے کھل گئے۔ ان فتوحات سے مسلمان

الدین کی بیت المقدس کی خبر ابھی قسطنطنیہ نہیں پہنچی تھی اور کوزیڈ اسی خیال میں بیت المقدس پر شاہ یروثلیم لو گننان کی حکمرانی ہے۔

کوزیڈ نے اس خیال سے کہ مکہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہے اپنے بحری بیڑے کے مکہ کے ساحل کے قریب پہنچا۔ مکہ میں نصرانی تسلط کے دوران یہ قاعدہ تھا کہ جب جہاز مکہ کی طرف آتا دکھائی دیتا تو بندر گاہ اور شہر کی تمام گھنٹیاں جو اسی مقصد کے لگائی گئی تھیں ایک ساتھ بجنا شروع ہو جاتیں تھیں اور ساحل پر کھڑی کشتیاں فوراً ہر طرف استقبال اور دریافت حال کے لئے چل پڑتی تھیں۔ کوزیڈ اس سے پہلے ہی با آچکا تھا اور دستور سے واقف تھا۔ اس دفعہ اس نے جو گھنٹیاں خاموش دیکھی اور سے کوئی کشتی بھی بحری بیڑے کی آتی نہ دکھائی دی تو اس کا ماتھا ٹھنکے جنگ کا آغاز چکا تھا۔ وہ بڑا چالاک اور دور اندیش تھا وہ فوراً اپنے بحری بیڑے کو دور سمندر میں گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ صحیح حالات معلوم کئے بغیر وہ بندر گاہ پر نہیں اترے گا۔ اس دوران مسلمانوں کی دیدبان کشتیوں نے کوزیڈ کے بحری بیڑے کو آنے اور ایک مسلمان بحری افسر کشتی پر بیٹھ کے بحری بیڑے کی طرف چل پڑا۔ کوزیڈ کشتی آتے دیکھ لی اور خود بھی ایک کشتی پر بیٹھ کے دریافت حال کے لئے روانہ ہوا۔ کشتیاں سمندر کے درمیان ملیں۔

چالاک کوزیڈ مسلمان افسر کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور وہ سمجھ گیا کہ دال میں ہے۔ ادھر مسلمان افسر نے اپنی کشتی کوزیڈ کی کشتی سے بھڑادی اور سوال کیا۔

”یہ جہاز کہاں سے آیا ہے اور اس طرف جانا چاہتا ہے؟“
کوزیڈ نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”ہم سوداگری ہیں اور جہازوں پر سوداگری ہے۔“
”پھر جہاز گمرے سمندر میں کیوں کھڑے ہیں۔ ساحل پر کیوں نہیں اتارتے افسر نے کوزیڈ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”دراصل ہم مسافر ہیں اور ہمارے ساتھ سوداگری سامان ہے۔“ کوزیڈ نے لفظ ٹھہر ٹھہر کے ادا کیا۔ ”چونکہ جنگ کا زمانہ ہے اور ہمیں معلوم کہ بندر کا قبضہ ہے اور ہمارا سامان محفوظ بھی رہے گا کہ نہیں۔“

بحری افسر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”بے فکر ہو کہ جہاز ساحل پر آئے سلطان صلاح الدین کا قبضہ ہے۔ سلطان کے تمام مقبوضہ علاقے بالکل محفوظ ہیں اور بیت المقدس پر بھی سلطان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کے تقریباً پورے مسلمان قابض ہو چکے ہیں۔ تم بے شک اطمینان سے سامان اتارو اور اسے فروخت

ہائے کیا یروثلیم پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا؟“ یہ آواز ملاحوں میں سے ایک ملاح جو کوزیڈ کی کشتی کو لائے تھے۔

سلطان افسر نے کان کھڑے کئے اور قبل اس کے کہ وہ کوزیڈ سے سوال و جواب اس نے ملاحوں کو واپسی کا اشارہ کیا۔ کوزیڈ کی کشتی واپس ہوئی اور بڑی تیزی سے بیڑے کی طرف بھاگنے لگی۔

”حق‘ بے وقوف تجھے ذرا بھی صبر نہ ہو سکا۔ جب معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان افسر اس کے سامنے رونے چلانے کی کیا ضرورت تھی۔“ کوزیڈ نے ملاح کو پھینکا اور پھر کشتی جہاز سے لگی وہ جلدی سے اوپر چڑھا اور لنگر اٹھانے کا حکم دیدیا۔

ملاحوں نے کشتی سے پہلے تو ملاحوں کے روتے اور منہ بسورتے چہرے حیرت سے دیکھتا رہا۔ کوزیڈ کی کشتی تیزی سے واپس ہوئی تو اسے اپنے فرض کا احساس ہوا اور وہ بھی اپنی ساحل کی طرف لے چلا۔ وہاں پہنچ کے اس نے فوجی حکام سے عیسائی بحری کے بارے میں بات چیت کی اور دم کے دم میں چار بحری جہاز گمرے سمندر کی طرف جہاں عیسائی بحری بیڑا لنگر انداز تھا۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی کوزیڈ اپنے لوے کرشال کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے مصر سے لشکر کے بیڑے کو بھی طلب کر لیا تھا اور وہ بحری بیڑہ اس وقت مکہ کے ساحل پر لنگر لگا۔

کوزیڈ اپنے بیڑے کے ساتھ صور کے بندر گاہ پر پہنچا۔ یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو لے شہری سلطان کو صور کا قبضہ دینے والے تھے۔ اہل شہر نے عیسائی بحری بیڑے کو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس وقت صور میں کوئی قابل ذکر سردار یا شہزادہ موجود نہیں تھا۔ کوزیڈ کو گھیر لیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ صور کی کمان سنبھالے۔ مسلمانوں سے بچائے۔ کوزیڈ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ ادھر شہریوں کا دھڑکا رہا اور ادھر کوزیڈ حالات پر غور کرتا رہا۔ ایک طرف صور کی بلا شرکت غیرے اور امارت تھی دوسری طرف سلطان صلاح الدین سے مقابلہ۔ وہ صلاح الدین جس عظیم جیسی عظمت کو الٹ دیا تھا۔ آخر کوزیڈ نے جو اکیلے کا فیصلہ کیا۔ صور میں کی کمی نہ تھی کیونکہ جو شہر اور قلعے مسلمانوں کے قبضہ میں چلے گئے تھے وہاں کیا اور کیا فوجی بھاگ کے صور میں پناہ گزین ہونے آگئے تھے۔

کوزیڈ نے سوچا کہ اگر وہ مسلمانوں کے حملے کو نہ روک سکا تو وہ اپنے بحری بیڑے میں پناہ گزینوں کے کسی اور طرف روانہ ہو جائے گا اور اگر اس نے مسلمانوں کا حملہ

روک دیا تو پھر صور اس کے قبضہ میں رہے گا ہی اس کے علاوہ بھی وہ ہاتھ پیر مارے گا اور
بٹکن ہے کہ وہ عیسائیوں سے نکلے ہوئے علاقوں پر قابض ہو سکے۔ مگر وہ شہریوں اور فوجیوں
سے پکا عہد لیتا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے دھوکہ نہ دے سکیں۔

صور کے شہریوں کی نمائندگی کو تو ال شہر کر رہا تھا۔ کوزیڈ نے بڑے غور و فکر کے بعد
کو تو ال شہر کو مخاطب کیا۔ ”میں صور کو بچانے کے لئے تیار ہوں۔ میں فوجیوں کو سالان
حرب بھی دوں گا اور جتنی رقم کی ضرورت ہوگی میں خرچ کروں گا اس کے لئے مجھ سے کچھ
دعے کرنا پڑیں گے۔“

”ہم آپ کی ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہیں اور جو عہد چاہیں گے ہم وعدہ کرنے پر
بھی تیار ہیں۔“ شہر کو تو ال نے بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔ ”آپ فرمائیے ہمیں کیا
عہد کرنا ہے؟“

”سب سے پہلے تو آپ کو یہ عہد کرنا ہوگا کہ صور کو کسی صورت میں بھی مسلمانوں
کے حوالے نہ کریں گے بلکہ اپنے خون کے آخری قطرے تک اس کی حفاظت کرتے رہیں
گے۔“ کوزیڈ نے انہیں بتایا۔

صور میں ایک چھوٹا پادری موجود تھا۔ وہ آگے بڑھ کے آیا۔ ”مار کونیس کوزیڈ میں
صلیب پر ہاتھ رکھ کے عہد کرتا ہوں کہ صور پر قربان ہو جاؤں گا۔“
صور کے شہریوں نے کوزیڈ اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

کوزیڈ نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔ ”اب میں پہ سالار کی حیثیت
سے صور کی حفاظت کروں گا لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر میں صور کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تو
میری حکومت ہوگی۔ ان سرداروں اور شہزادوں کو تم اپنا حاکم تسلیم نہیں کرو گے جو جہنم
دشمن کے ہاتھوں میں بے یار و مددگار چھوڑ کے چلے جائیں گے۔“

”ہم وعدہ کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ صور کا حاکم سوائے مار کونیس کوزیڈ کے
کسی اور کو نہ ہونے دیں گے۔“ پادری نے شہریوں کی طرف سے قسم کھائی اور حلف اٹھایا۔

ان یقین دہانیوں اور عہد و پیمان کے بعد کوزیڈ نے ان تمام غیر مسلح فوجیوں کو سلام
جو دوسرے مقامات سے شکست کھا کر صور میں پناہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ کوزیڈ کے بڑے
بیڑے پر اس قدر اسلحہ موجود تھا جو ایک ماہ تک محاصرہ میں استعمال ہو سکتا تھا۔ فوجیوں
مسلح کرنے کے بعد اس نے صور کے ان نوجوانوں کو مسلح ہونے کی دعوت دی جو مار دلا
پر قربان ہونا چاہتے تھے۔ نوجوان جوق در جوق مسلح ہوئے اور انہوں نے ملک کے لئے جا
دینے کا عہد کیا۔ اس طرح صور کی وہ آبادی جو چند گھنٹے پہلے بے سہارا اور کس چہرے

میں تھی ان میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

مار کونیس کوزیڈ نے صور کے برجوں پر دو اسلامی جھنڈے لہراتے دیکھ لئے تھے۔ جب
قلعہ والوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے دونوں اسلامی جھنڈوں کو برجوں سے
زخندق میں پھینک دیا۔ صور کے قلعہ کے گرد ایک گہری خندق تھی۔ اب کوزیڈ
کی فوج کا سبہ سالار بھی تھا اور وہاں کا بادشاہ بھی۔ صور میں بھی بہت سا ناکارہ اسلحہ پڑا
تھا۔ کوزیڈ نے اپنے آدمی لگا کر اس اسلحہ کو کار آمد بنایا۔ سنگ باری کرنے والی چھوٹی
میتھیں تھیں انہیں فسیل پر چڑھا کے ان کا رخ سلطان صلاح الدین کی محاصرہ کرنے
لے فوجوں کی طرف کر دیا۔ کوزیڈ تمام رات فوج کے ساتھ فسیلوں کو مضبوط کرنے میں لگا
اور جب سویرا ہوا تو اسلامی لشکر نے دیکھا کہ صور کی فسیلوں کے محافظ چاق و چوبند
رہے ہیں اور حملے اور جوابی حملے کے لئے بالکل تیار ہیں۔

سلطان صلاح الدین کو اطلاع دی گئی کہ صور والوں نے اسلامی جھنڈے رات ہونے
پہلے برجوں پر لگا دیے تھے مگر اب وہ جھنڈے اتار دئے گئے ہیں اور فسیل پر فوج
بے بجائے کھڑی ہے۔ سلطان اپنے خیمہ سے نکل کر آگے پہنچا تو قلعہ والوں کی تیاریاں
بکریاں رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ قلعہ کو کسی طرح سے زبردست کمک مل
نا ہے۔ بیت المقدس پر قبضہ کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے اس لئے دوسرے ممالک
کے کمک آنے کا تو ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر یہ ضرور خیال ہوتا تھا کہ بغیر کمک
مل گئے ہوئے صور کی یہ تیاری کسی طرح ممکن نہیں۔

سلطان دوپہر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید قلعہ کی طرف سے کوئی سلسلہ جنہائی شروع
کرادھر سے کوئی نہ آیا۔ سلطان صلاح الدین نے بعد دوپہر ایک سوار کو قلعہ کی طرف
لپکا کہ وہ قلعہ والوں کے ارادے معلوم کر کے جواب لائے۔ اس سفارت کا فرض سلطان
خاطے پیچھے تقی الدین بن شاہان شاہ کے سپرد کیا۔ تقی الدین دو روز پہلے ہی بعض علاقوں
میں فوج کے بعد واپس آیا تھا۔

تقی الدین نیزے پر سفید پرچم لگا کر گھوڑا اڑاتا قلعہ صور کے جنوبی دروازہ پر پہنچا۔
نیزہ پر سفید پرچم یعنی امن کا نشان تھا اس لئے صدر دروازے کا چھوٹا دروازہ کھول کر
نیزہ کو اندر کر لیا گیا۔ تقی الدین نے اندر پہنچ کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو حیران رہ گیا۔
صدر دروازے کے اندر کی طرف سے دائیں بائیں سڑکیں جاری تھیں اور ان سڑکوں کے
دونوں طرف حد نظر تک نیزہ بردار اور شمشیر بکت سوار کھڑے تھے۔ اوپر فسیلوں پر اس
نوکھلت اور حیران داز موجود تھے جن کا شمار کرنا مشکل تھا۔

”آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ مارکوئیس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
سوار نے تقی الدین کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور سفارت کو ساتھ لے کر پھر بارہ
لی میں داخل ہوا۔ راہداری میں تقی الدین کو کھڑا کر کے وہ سامنے کمرے میں داخل ہوا
”ذرا“ واپس آ کے بولا۔
”آجائے معزز سفیر“

تقی الدین اور سوار دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ تقی الدین نے دیکھا
کہ کمرے میں ایک لائے قد کا جوان تنہا ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو
ارکیاں بیٹھی ہیں۔ اس نے کھڑے ہو کر تقی الدین کا استقبال کیا۔
”میں سلطان کے سفیر کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ فرمائیے میں سلطان کی کیا خدمت
رسکتا ہوں؟“

تقی الدین نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ”سلطان معظم نے دریافت فرمایا ہے کہ اسلامی
ہندوں کو قلعہ کے برجوں سے کیوں اتارا گیا ہے؟“

”سلطان سے ہماری طرف سے عرض کیا جائے کہ قلعہ پر جھنڈا اس کا لہراتا ہے جس
اقتضیٰ ہو۔ صور پر میرا قبضہ ہے اور میں صلیب مقدس کا پرستار ہوں اس لئے برجوں پر
میں نصب کی گئی ہیں۔“ مارکوئیس کانریڈ کا لہجہ بڑا پرسکون تھا۔

”مگر کل تک تو صور والے صلح کے لئے بھاگ رہے تھے۔“ تقی الدین نے حالات کی
تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان عالی مقام نے صور والوں کی جان و مال کی
حفاظت کی ضمانت بھی دیدی تھی مگر اب یہ تبدیلی کیوں۔ کیا یہ وعدہ خلافی اور عہد شکنی نہیں
فرماؤ گئے قلعہ کو عہد شکنی کے انجام پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔“

”تم صرف سفیر ہو اور ایک سفیر کو یہ سلیقہ ہونا چاہئے کہ کسی سفیر کو کسی فرمانروا سے
کس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔“ مارکوئیس کانریڈ نے تقی الدین کو مرعوب کرنے کی کوشش
کی۔

تقی الدین نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔ ”فرمانروا کا شکوہ بجا ہے۔ سفیر کو واقعی ایک
فرمانروا سے بات کرنے کا سلیقہ ہونا چاہئے مگر سفیر، سفیر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس وقت
سلطان صلاح الدین کا سفیر کوئی معمولی سفیر نہیں بلکہ سلطان کا برادر زادہ محمد تقی الدین عمر
ابن شاہان شاہ ہے جو ہر صلیبی حکمران اور فرمانروا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گفتگو
کر سکتا ہے۔“

مارکوئیس کانریڈ نے چونک کے تقی الدین کو دیکھا۔ ”آپ۔ آپ سلطان کے برادر

ایک سوار گھوڑا بڑھا کر تقی الدین کے پاس آیا۔

”خوش آمدید امن کے سفیر۔“ سوار نے ادب سے کہا۔

تقی الدین قلعہ کا سامان دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اس نے سوار کی طرف پہلے
پر رعب لہجے میں کہا۔

”میں تمہارے قلعہ دار سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔“

”معزز سفیر اب اس قلعہ میں کوئی قلعہ دار نہیں۔“ سوار نے نہایت بے خوں

جواب دیا۔

”تو پھر تم مجھے اپنے پہ سالار کے پاس لے چلو۔“ تقی الدین کا لہجہ قدرے

تھا۔

”مجھے افسوس ہے سفیر کہ قلعہ میں کوئی پہ سالار موجود نہیں۔“ سوار بہت

اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

تقی الدین کو گمان ہوتا تھا کہ سوار شاید اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ چڑکے

”سوار تم سلطان عالی مقام کے سفیر کا مذاق اڑا رہے ہو۔ میں سلطان کا نمائندہ ہوں ا

ذمہ دار شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ یہاں کوئی نہیں پھر آ

حکومت کس کے سپرد ہے۔“

”معزز سفیر۔“ سوار نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں

سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں سفیر اور سفارت کے مرتبے سے واقف ہوں اسی لئے؛

آپ کے سوالوں کا نہایت ادب سے جواب دیا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اس قلعہ

کوئی قلعہ دار ہے اور نہ پہ سالار۔ جہاں تک کسی ذمہ دار شخص کا تعلق ہے تو میں

یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ قلعہ صور اور بندر گاہ کی باگ ڈور

مارکوئیس کانریڈ کے ہاتھ میں ہے جو یہاں کے کلی طور پر مالک اور بادشاہ ہیں۔ آپ

فرمائیں تو میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے مجھے وہیں لے چلو۔“

سوار سر ہلا کے آگے چلنے لگا۔ تقی الدین نے اپنا گھوڑا اس کے عقب میں لگا

نے اپنا گھوڑا ایک سنگی بارہ دری کے سامنے روکا۔

”میں ابھی اجازت لے کر واپس آتا ہوں۔“ سوار یہ کہہ کر بارہ دری میں چلا گیا

تقی الدین گھوڑے سے اتر کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد سوار بارہ دری سے واپس آگیا۔

زادے ہیں۔ میں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا چاہتا ہوں۔

”کوئی بات نہیں مار کو نہیں۔“ تقی الدین نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ ”منہ سے نکلی بات پرانی ہو جاتی ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکے اور مجھے جو دریافت کرنا تھی اس کا مجھے جواب مل گیا۔ اب صور کا فیصلہ نوک شمشیر ہی سے ہو گا۔“

”میں اسلامی لشکر کے ایک عظیم سردار سے پھر معافی کا درخواستگار ہوں۔“ مار کو نہیں کا لہجہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ ”بے شک صور کا فیصلہ تو نوک شمشیر ہی سے ہو گا اور میں اس سے کم پر کسی طرح آمادہ بھی نہیں ہو سکتا لیکن شاہوں اور شہزادوں کی عزت ہر صورت برقرار رہنا چاہئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے سلطان نے کئی ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو پا بہ زنجیر کر دیا۔“

”غلط بات مت کہو مار کو نہیں۔“ تقی الدین نے قطع کلام کیا۔ ”تمام نصرانی فرماؤ اور سردار ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارا سلطان زنجیریں تو کسی مجرم کو بھی نہیں پہناتا۔“

”خیر اگر آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں یہ الفاظ بھی واپس لیتا ہوں۔“ مار کو نہیں نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ ”مگر مسلم سردار آپ اپنے سردار کو یہ مشورہ ضرور دیجئے گا کہ وہ اب صور سے محاصرہ اٹھالے کیونکہ کل تک مسلمانوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے والا صور اب پہلا صور نہیں۔ آپ نے ہماری تیاریاں دیکھ لی ہیں اگر اسلحہ اور سامان رسد کے ذخائر دیکھنا ہوں تو ہمارے ساتھ چلئے ہم آپ کو اپنی تیاریوں کی ایک جھلک خود بھی دکھانا چاہتے ہیں۔“

”کل کچھ زیادہ دور نہیں ہے مار کو نہیں۔ کل تمہاری تیاریاں اور تمہاری تلواروں کی کٹ میدان میں دیکھیں گے۔“ تقی الدین یہ کہتا ہوا باہر آگیا۔

اسے یہاں لانے والا سردار اس کے ساتھ ہی باہر آگیا تھا۔ تقی الدین نے چونکہ اپنی شخصیت کا اظہار کر دیا تھا اس لئے وہ بہت مرعوب دکھائی دے رہا تھا۔ تقی الدین عمراد ملک العادل دو ایسے مسلم سردار تھے جن کے نام سے نصرانی سپاہی تک واقف تھے۔ اس نے سلطانی سفیر اور ایک عظیم سردار کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔

سلطان صلاح الدین اپنے خیمہ میں بیٹھا تقی الدین کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے تمام بڑے بڑے سردار اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ غلام نے تقی الدین کے واپس آنے کی اطلاع دی تو سلطان نے فوراً اسے طلب کر لیا۔ تقی الدین نے حاضر ہو کر سلام پیش کیا۔

”کیوں تقی الدین قلعہ والوں کا دماغ آگ دم کیوں خراب ہو گیا۔“ سلطان نے نرمی سے دریافت کیا۔ ”یہ نصرانی آخر اس قدر بد عمد کیوں ہوتے ہیں؟“

عالمیاباد۔ ڈوبتے کو تھکے کا سہارا۔“ تقی الدین نے سلطان کو بتایا۔ ”صور میں اس وقت لیکن کونسی نصرانی سردار یا فرماؤ موجود نہیں بلکہ ان کی جگہ یورپ کا ایک سردار یا ملک کا فرماؤ مار کو نہیں کو نرید صور پر قابض ہے۔ وہ اپنے ساتھ بدلی لشکر لایا ہے جو اس کی سڑکوں اور فصیلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ شاید اسی لشکر کے زور پر صور والوں نے بے رحم آوارہ گردوں پر مسلسل چڑھادی ہیں۔“

”اس کی طاقت کا تم نے کیا اندازہ کیا ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔ ”کیا حطین سے زیادہ مقابلہ ہو سکتا ہے؟“

”نہیں عالمیاباد۔ صور میں اتنی طاقت نہیں۔“ تقی الدین نے جواب دیا۔ ”دو چار دن زیادہ صور مقابلہ نہ کر سکے گا۔“

سلطان صلاح الدین کو تو صور کی طرف سے اس قدر اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے لائی جھڑے بھی نصب کرنے کے لئے بجھوا دئے تھے مگر صور والوں نے نہ صرف وہ ڈبے بھجوں پر سے نوح پھینکے تھے بلکہ فصیلوں پر چڑھائی ہوئی بجھتیوں ان کے جنگی اڈوں کو ظاہر کر دی تھیں۔ چنانچہ سلطان کو از سرنو حملہ کی تیاریاں کرنا پڑیں۔

سلطان صلاح الدین دودن کی تیاری کے بعد صور پر شدید حملہ کا حکم دیدیا۔ ادھر صور دن نے شر اور قلعہ کے گرد خندق کو پہلے ہی سے گہرا کر لیا تھا۔ صور کے تین طرف پانی چھٹی سمت ایک پتلی سی زمین کی پٹی تھی جو اسے سمندر سے جدا کرتی تھی۔ صور والوں نے اسے کاٹنا شروع کر دیا۔ صلاح الدین نے یہ اطلاع ملنے ہی ایک تیر انداز دستے کو اس رف تعینات کر دیا تھا جس نے تیروں کی بارش کر کے خشکی کاٹنے کا کام روک دیا تھا۔

طمان کی فوجوں نے صور پر شدید سنگ باری کرائی۔ کئی جگہ خندقیں پاٹ کے فصیل تک نچنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر مار کو نہیں کو نرید کی یورپ سے ساتھ آئی ہوئی ٹرینڈ فوج نے حملہ اور ہر کوشش ناکام بنادی۔

صور پر حملے کرتے ہوئے چار دن ہو گئے تھے لیکن صور والوں کی مدافعت میں کوئی زبردی پیدا نہ ہوئی تھی۔ سلطان کا اصل مقصد ”بیت المقدس“ کی بازیابی تھی۔ اسی لئے طویل محاصرہ کے خلاف تھا پھر اس کی فوج میں بھی کچھ بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ لڑائیوں سے جنگ طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی اور اس کے خاتمہ کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ شاید انہی باتوں کے پیش نظر سلطان نے صور کا محاصرہ ختم کر دیا اور لے کر نکلنے کی طرف چلا گیا۔

سلطان کے مورخ بقاء الدین نے صور سے محاصرہ اٹھانے کا یہ پہلا سبب بیان کیا ہے

کہ سلطان کا لشکر شام کے تقریباً پورے ساحلی علاقے پر پھیلا ہوا تھا اور اس نے اٹھا مرضی سے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ لشکر تھک چکا تھا اور جنگ ختم ہوتے نظر نہ آتی تھی لیکن وجہ زیادہ معبر نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس سلسلہ میں ابن اثیر کا بیان زیادہ قابل دید ہے۔ وہ کہتا ہے:-

”عقلان اور یروشلم (بیت المقدس) کا فتح کرنا بھی اشد ضروری تھا کیونکہ وہ مصر اور شام کے درمیان آمدورفت میں مزامم ہوتے تھے۔“

سلطان صلاح الدین کے صور کا محاصرہ اٹھانے کی اصلی وجہ یہی معلوم ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک عقلان اور بیت المقدس فتح نہیں ہوئے تھے۔ پس سلطان نے صور سے محاصرہ اٹھا کر مغربی سرحد کی طرف بڑھا اور رملہ، آبی بیلن اور دام پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے عقلان کا محاصرہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد کا حال یعنی عقلان اور یروشلم (بیت المقدس) کی فتح کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس حملہ معترضہ کے بعد ہم صور کے دوسرے محاصرے کی طرف پھر آتے ہیں۔ بیت المقدس اور عقلان فتح ہو چکے تھے۔ صور کے جنوبی قلعوں پر کسی وقت بھی قبضہ کیا جاسکتا تھا لیکن پورے فلسطین میں صرف صور کا ایک ایسا بندرگاہ جو سلطان کے قبضہ میں اب نہ آتا تھا حالانکہ اس کا پہلے بھی محاصرہ کیا گیا تھا جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔ سلطان صلاح الدین یکم نومبر 1187ء کو اپنی فوج صور روانہ کی پھر بارہ دن بعد خود بھی فوج کی کمان کرنے صور پہنچ گیا۔

سلطان صلاح الدین جتنا بڑا جنگجو اور عظیم مجاہد تھا وہ دل کا نرم اور بے انتہا خدا ترس انسان تھا۔ اس کی فتوحات کی تفصیل بڑی طویل ہے لیکن ان تمام فتوحات میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے۔ سلطان نے جس قلعہ یا شہر پر حملہ کیا پہلے اس کے سامنے صلح کی شرط پیش کی۔ اس کی سب سے زیادہ نرم شرط یہ تھی کہ قلعہ دار یا فرمانروا اپنا سامان لے کر قلعہ یا شہر خالی کر دے۔ حکمرانوں کے ساتھ عام شہریوں اور فوجیوں کے لئے بھی اس کا کیا اعلان ہوتا تھا کہ وہ شہر خالی کر دیں یا معمولی ٹیکس دے کر مفتوحہ شہر میں رہ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو قلعہ یا شہر سلطان کے قبضہ میں آتا اس کے پاس، کیا شہری اور کیا فوجی وہ سب اپنا سامان بٹور کے کسی محفوظ نصرانی قلعہ کا رخ کرتے تھے پھر جب اس قلعہ بھی سلطان کا حملہ ہو جاتا تو وہ کسی اور ٹکڑے میں منتقل ہو جاتے۔

اس طرح فتح بیت المقدس کے بعد شامی ساحل پر نصرانیوں کا قریب ترین قلعہ صور تھا۔ جہاں تمام نصرانی قلعوں کے لوگ آکر پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اب سلطان چاہتا تھا کہ

یہاں کے اس آخری سارے پر بھی قبضہ کر کے بادی النظر میں انہیں پورے فلسطین میں دھکیل کر دے۔ یہ بات جس طرح صلاح الدین کے ذہن میں تھی اسی طرح صور والوں میں یہ بات معلوم تھی کہ صرف یہی ان کا آخری سارا ہے اور اس کی تباہی کے بعد پورے فلسطین پر کسی اور جگہ سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے گی۔

صور والوں کے علاوہ مارکونیس کونزید کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ صور کے ذمے نکلنے کے بعد شام و فلسطین ہی کیا اسے پورے ایشیاء کی جگہ بھی پناہ نہ مل سکے۔ یورپ وہ یوں بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اٹلی اور قسطنطنیہ میں عیاشی اور مکاری کے ایسے کارنامے انجام دئے تھے کہ وہاں کے لوگ اسے دیکھتے ہی قتل کر دینے پر تیار ہو جاتے۔ ہالے کا نزیہ اس کے بحری بیڑے اور اہل صور نے صور کی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے اپنی جانیں لڑا دی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سلطان نے صور کا پہلا محاصرہ نہ معلوم ان وجوہات کی بنا پر اٹھایا تھا لیکن وہ بغیر صور حاصل کئے واپس نہ جائے گا۔ اس لئے وہ کا محاصرہ دوسرا ”حنین“ کا محاذ جنگ بن گیا تھا۔ صور کی فصیل کے گرد خندق گہری اور باہر چوڑی کر دی گئی تھی اور خندق کے اس پار فصیل کے آگے مٹی کے ٹیلے بنا کر ان پر باران بھائے گئے تھے تاکہ خندق پار کرنے والوں کو نشانہ بنائیں۔ اسی طرح فصیل کے باہر توڑی توڑی دور منجینتیں لگائی گئی تھیں جو سنگباری کے لئے تیار تھیں۔ مارکونیس کونزید کا بحری بیڑا ساحل کی حفاظت کر رہا تھا۔ صور کا دفاع اس قدر مضبوط بنادیا گیا تھا جسے ڈنکا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ صور اب ایسے جزیرہ میں تبدیل ہو گیا جسے ایک تنگ خاکنائے کے ذریعہ خشکی سے ملایا گیا تھا۔ اس تنگ راستے کو بھی روکنے کے لئے خندق کے کنارے اور لکڑیوں پر تیر انداز مقرر کئے تھے۔ اس تنگ خاکنائے سے برابر برابر دو تین آدمیوں سے زیادہ ایک وقت میں لوگ گزر نہ سکتے تھے۔

صور پر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ شروع کیا گیا۔ مصر حلب اور حمص کے لشکر سلطان کے بھائی العادل بھتیجے قتی الدین اور دو بیٹوں الفاضل اور الظاہر کی زیر کمان سلطان کا مدد کو موجود تھے۔ سلطانی لشکر کی سترہ منجینتیں نے رات دن فصیل پر سنگباری شروع کی۔ خاکنائے کے راستے پر سے بھی کچھ فوجیوں نے خندق پار کرنے کی کوشش کی مگر اس راستے کے دونوں طرف تیر انداز گھات لگائے بیٹھے تھے انہوں نے فوجیوں کی یہ کوشش بیکار کر دی۔ منجینتوں سے پھینکے ہوئے پتھر بھی کچھ زیادہ کام نہ کرتے تھے۔ فصیل کو سرنگ لگا کر اڑانا بھی ممکن نہ تھا کہ بیچ میں گہری خندق تھی اور خندق کے نیچے سے فصیل تک ایک پہچان بھی ناممکن تھا۔

سلطان نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ صور پر قبضہ جلد ممکن نہیں اور اس کے حوالے کے لئے ایک طویل محاصرے کی ضرورت ہوگی۔ اسے ایک بار صور کے محاصرے میں باہر ہو چکی تھی۔ لہرائیوں کا بحری بیڑہ بھی ساحل پر موجود تھا۔ سلطان نے مکہ میں ٹہر ہوئے اسلامی بحری بیڑے کو طلب کیا۔ اسلامی بیڑے میں کل دس جہاز تھے۔ اتنے ہی مار کوئیس کانریڈ کے بھی تھے۔ اسلامی بیڑے کے آنے سے بحری اور بری دونوں جہاز شروع ہوئیں۔ جنگ اتنی شدید تھی کہ رات دن کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ صور والوں ایک تو حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سلطان کا پہلا محاصرہ ناکام بنادیا تھا دوسرے کہ یہ محاصرہ ان کی موت زندگی کا مسئلہ تھا۔ صور پر سلطان کا قبضہ اہل صور کی کھلی رہ تھی کیونکہ سلطان کے قبضہ کے بعد اپنی پہلی ناکامی کا بھی حساب لے گا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ صور کی تیسری سمت خشکی کی جو چھوٹی سی پٹی تھی، والوں نے اسے توڑ کے خندق کو سمندر سے ملا دیا۔ اس طرح صور ایک جزیرہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اب فیصل تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مگر اس کی کو سلطان کے بیڑے نے پورا کر دیا۔ بحری بیڑا امیر البحر نوٹو کے زیرِ کمان تھا۔ اس نے صور کے بیڑے پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ وہ سمندر چھوڑ کے صور کے ساحل سے آگیا۔ اس صور والوں کی بحری سرگرمیاں دفاع میں تبدیل ہو گئیں۔

کچھ امید ہو چکی تھی کہ شاید بحری بیڑے کی مدد سے صور پر قبضہ ہو جائے کہ مسلمانوں سے ایک سخت غلطی ہوئی۔ جنگ کے دوران ایک لمحہ کی غفلت جنگ کا نقشہ بدل دیتی۔ ہوا یہ کہ دن بھر بحری اور بری جنگ ہوتی تھی اور رات کو دونوں محاذوں پر خاموشی طاری ہو جاتی تھی لیکن درپردہ تو جنگ جاری رہتی تھی۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ صبح سے شام شدید جنگ ہوتی رہی پھر رات ہوئی اور پہرے چوکی کا انتظام حسب معمول جاری ہوا۔ بھال اور رات کو غفلت کرنے والے اپنے اپنے کام اور مقام پر لگ گئے مگر مسلمانوں بد قسمتی کہ وہ نصف شب کے بعد غافل ہو گئے۔ اس غفلت کا شکار بحری گشت دا ہوئے۔ اہل صور کا بحری بیڑہ صرف مدافعت کر رہا تھا اور ساحل کے ساتھ لگا کھڑا رہتا کھلے سمندر میں آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن مار کوئیس کانریڈ کا بیڑہ بھی تجربہ کار لوگوں پر مشتمل تھا۔ وہ دب کر ساحل پر تو آگئے تھے مگر گھات میں لگے تھے موقع کی تلاش میں تھے۔

پھر اس رات انہیں موقع مل گیا۔ مسلمان بحری بیڑے والے ذرا سے غافل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سو گئے تھے مگر یہ بات ناقابل یقین نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ پہرے

لے کے ہوں خواہ سمندر کے۔ ان کا کام تو جاگنا ہوتا ہے۔ بہر حال ان سے غفلت اس غفلت سے دشمن نے فائدہ اٹھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر البحر نوٹو کے دس بیڑے میں ایک وقت آگ بھڑک اٹھی۔ آگ بھڑکنے کا مطلب یہی تھا کہ آگ لگی کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے بحری بیڑے تک پہنچے اور انہوں نے پانچ میں آگ لگادی۔

رف آگ بجھانے کا مسئلہ نہ تھا۔ ایک طرف تو آگ بجھانا دوسری طرف دشمن کے لئے ساحل سے نکل کر مسلم بیڑے پر حملہ کر دیا۔ اب ایک طرف پانچ جہازوں کی مائی جارہی تھی دوسری طرف دشمن کے بحری بیڑے کا حملہ۔ مسلمان بحری بیڑہ عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر بھی امیر البحر نے پانچ جہازوں سے یعنی آدمی بحری سے مار کوئیس کی پوری بحری طاقت سے مقابلہ شروع کیا مگر کب تک آخر اسے پسپا ل کی طرف پسپا ہونا پڑا مگر اس پسپائی میں بھی اسے زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔

مار کوئیس کانریڈ کے جہاز مسلم بحری بیڑے کے دو گئے سے بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے بے مسلم بیڑے کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مسلم بیڑے کو لٹ چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس وقت مسلمانوں کی چھوٹی کشتیوں اور غوطہ خوروں کام کیا۔ سلطان صلاح الدین نے چھوٹی چھوٹی تیز رفتار کشتیوں پر غوطہ خوروں کو بے کی طرف روانہ کیا اور امیر البحر کو پیغام بھیجا کہ وہ باقی جہازوں کو کسی طرح بچا کر طرف نکل جائے۔

لم غوطہ خور بحری بیڑے تک پہنچ گئے۔ امیر البحر کو سلطان کا حکم بھی مل گیا مگر دشمن نے اسے اس بری طرح سے گھیرا تھا کہ اسے جان بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ریتیزی کے ساتھ شمال کی طرف پسپائی اختیار کی۔ اس کے ساتھ اس نے دشمن کے کا حلقہ توڑنے کی بھی کوشش کی۔ آخر امیر البحر ایک سخت جدوجہد کے بعد ساحل پر آنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

لم بحری بیڑے پر اتنا شدید دباؤ تھا کہ اس کے بنائے کچھ نہ بن پڑ رہا تھا۔ آپا دھاپی اٹھ بیڑے کے تین جہاز خشکی پر چڑھ گئے۔ دشمن تعقب میں تھا۔ اس نے فوراً ہتھے ہوئے ان جہازوں میں بھی آگ لگادی۔ صرف دو جنگی جہاز بچ سکے جنہیں ہیرت لے کر پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا بحری بیڑہ تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اگو دونوں محاذوں پر شکست کا سامنا تھا۔ بحری طاقت تو ختم ہی ہو گئی تھی اور خشکی کے صور پر حملے کا کوئی نتیجہ نہ نکل رہا تھا۔

صور پر حملہ نے عیسائیوں کو نقصان پہنچانے کی بجائے کچھ فائدہ ہی پہنچایا تھا۔ حالانکہ ظاہر ہو رہا تھا کہ سور کے محاصرہ کو زیادہ طول دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چونکہ مسئلہ سری سوچ اور فکر کا تقاضہ کرتا تھا اس لئے سلطان مجلس شوریٰ طلب کر لیا۔ سلطان کے لشکر میں دو طرح کی افواج تھیں۔ ایک تو وہ جو سلطان کے مفتوحہ علاقوں مثلث طرب، تمس، حماہ، موصل اور مصر وغیرہ سے آئی تھیں۔ یہ افواج اپنے اپنے علاقائی فرمانرواؤں اور بگورنر کے زیرِ کمان تھیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اپنے علاقوں سے محبت اور فرمانرواؤں کی عزت کا خیال تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ اسلام، عیسائیت کی جنگ ہے جو مسلمانوں کے لئے جہاد تھا۔ اس لئے یہ لوگ سر سے کفن باندھ کر لڑتے اور شہادت کی آرزو دل میں رکھتے تھے۔

دوسری فوج غیر مستقل رضاکاروں پر مشتمل تھی۔ ان افواج کی تعداد مستقل افواج سے بھی زیادہ تھی۔ ان کی بہادری اور شجاعت پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا اور بعض اوقات تو یہ اس قدر سرفروشانہ انداز میں یلغار کرتے تھے کہ سلطان دیکھتا رہ جاتا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ جہاد کے جذبہ سے بھی سرشار تھے لیکن ان کی جنگ کا طریقہ کچھ مختلف تھا۔ رضاکار افواج یلغار، جنگ اور فتح کے قائل تھے۔ یہ فتح حاصل کرنے کی دھن میں پڑا سے لکرا جاتے تھے۔ تیروں کی بارش میں بے دھڑک کود جاتے تھے۔ میدان جنگ میں امداد مقابل کو زیادہ دیر نہ ٹھہرنے دیتے تھے لیکن یہ طویل محاصرہ سے کابل اور کسی حد تک پست ہمت ہو جاتے تھے۔ فصیلیں کاٹنا سرنگیں کھودنا اور مورچوں میں چھپے رہنا انہیں پسند نہ تھا۔

ان افواج میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ خراب موسم خاص طور پر موسم سرما برف باری کے زمانہ میں انہیں باہر میدان جنگ میں گھات لگا کے بیٹھنے سے الجھن تھی۔ کٹائی اور بوائی کے زمانہ میں یہ لوگ اپنے بال بچوں اور ریاستوں میں بیٹھنا زیادہ کرتے تھے اور اگر ان پر زور ڈالا جاتا تو ان کے باغی ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سلطان کی شوریٰ میں پیش آئی۔

”میرے سردارو اور جان نثارو۔“ سلطان کا دل افسردہ تھا اور اس کے الفاظ میں کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”ہمارے آدمیوں کی ذرا سی غفلت سے ہمارا مضبوط اور عظیم ہوا گیا۔ تعجب ہے کہ اس قدر ہوشیار بحری عملہ کس طرح سو گیا کہ دشمن نے ہمارے جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ (ایک بیان یہ بھی ہے کہ پانچ جہازوں میں آگ نہیں لگی تھی) کوئٹہ کے جہازوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔“

سلطان کا سپہ سالار اور بھائی ملک العادل سینہ تان کے بولا۔ ”انسان غلطی پر آج تک ہمارے بحری بیڑے نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی مگر پتہ نہیں ہے نیند آگئی اور وہ دشمن کی طرف سے کس طرح غافل ہو گئے کہ پانچ جہازوں کو خربوئی جب ان پر قبضہ ہو چکا تھا۔“

اموصل نے اور زیادہ جوش سے کہا۔ ”کوئی بات نہیں عالیجاہ جنگ میں فتح و شکست نہ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ میں جنگوں کے بعد اگر ایک جنگ میں ہمیں نقصان اٹھانا اس پر افسوس نہ ہونا چاہئے۔ صور کا ہم اب بھی محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور اہل بیت نہیں کہ وہ باہر نکل کر جنگ کر سکیں۔ بحری بیڑے کی تباہی کا نقصان ہم جلد کر لیں گے۔ چند ہی دنوں میں نیا بیڑا تیار ہو جائے گا۔ پھر سمندر میں انہیں دوبارہ پکڑیں گے۔ صور پر قبضہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ساحل فلسطین پر یہ آخری ہے جہاں سے عیسائیوں کو سمندری راستے سے تک مل سکتی ہے۔“

امردار نے دبے الفاظ میں کہا۔ ”محترم ملک العادل نے صحیح فرمایا ہم جلد ہی نیا بیڑا کر لیں گے۔ اس وقت موسم بھی خراب ہے اور برف باری بھی شروع ہونے لگی۔ اس موسم میں ہمارے گھوڑے بیمار ہو جاتے ہیں۔“

امردار فرار کا اظہار تھا۔ لشکر کے قبضہ سردار جنہیں غیر منظم رضاکاروں کی اہل تھی۔ رضاکار سلطان سے خود گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی آواز اہل کے ذریعہ دربار میں پہنچائی جو خود بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتے تھے۔

بات نکل ہی پڑی تو ایک دوسرے سردار نے اس کی ذرا اور کھل کے بات آگے ”سردار نے ٹھیک کہا اس موسم میں گھوڑے بیمار ہو جاتے ہیں پھر سردی بھی سخت لگی ہے۔ پورے لشکر کو اس قلعہ کے محاصرے لگا کے بیکار بیٹھا دینا کچھ مناسب نہیں ہے۔ ہم سلطان کے حکم کی ہر حال میں تابعداری کریں گے۔ سلطان نے مشورہ دیا ہے تو میں نے کہا ہے ورنہ میری وہی رائے ہے جس کا حکم سلطان صادر فرمائیں۔“

ان نمانیت خاموشی سے سرداروں کی باتیں سن رہا تھا۔ مندرجہ بالا سرداروں کی باتوں نے سمجھ لیا تھا کہ رضاکاروں کی رائے میں محاصرہ اٹھا کر واپس جانا چاہئے مگر اہل تبہو نہ کیا مگر ملک العادل سے برداشت نہ ہو سکا وہ تڑپ کے بولا۔

”مجھے ان سرداروں پر افسوس ہوتا ہے جو میدان جنگ میں بزدلی کی باتیں کرتے ہیں۔ سلطان نے محسوس کیا کہ بات بگڑ رہی ہے اور اگر اس نے دخل نہ دیا تو ملک العادل

جب سلطان لشکر کے بار برداری کا آخری چھڑا بھی وہاں سے روانہ ہو گیا اور صور
س میں میل تک سلطان صلاح الدین اور اس کے لشکر کا پیچھا کر کے واپس نہ
آئے۔ اب تک ان کے دل کی دھڑکنیں قابو میں نہ آئیں۔ حالانکہ اب سلطان کی فی
ہی کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن کوزیہ اور اس کے سرداروں کے ہونٹوں پر اب بھی
ہوئی تھیں اور آنکھوں میں ایک نامعلوم خوف تیر رہا تھا۔

ابن صلاح الدین کی واپسی کے آٹھ روز تک قلعہ صور میں کسی کے لبوں پر
نہیں کھلی اور نہ کوئی نفرتی قہقہہ فضاؤں میں ابھرا۔ کہتے ہیں کہ وقت بہتے بڑا
آہستہ آہستہ قلعہ کی رونقیں واپس آنے لگیں۔ سرسراتے لباسوں نے ہواؤں
پاں بکیرا شروع کیں۔ آنکھوں کے گلاب کڑے چھلکے لگے اور البر جوانیاں
لاش کرنے لگیں۔ اگرچہ مغربی تہذیب میں البر جوانی ایک جنس کیاب اور نایاب
یہ وہم یا صور میں اگرچہ مغربی ممالک نہ تھے لیکن وہاں نصرانیت کا دور دورہ تھا
شراب و شباب کی ہمیشہ از رانی رہی ہے۔ محاصرہ اور جنگ نے شوخ جوانیوں کی
ائے رکھی تھی مگر اب تو جنگ دور جا چکی تھی۔ محاصرہ ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ پیباک
بینوں کے مدو جز میں پھر گردش پیدا ہوئی۔ صور کے قلعہ اور شہر میں دزدیدہ
لغزہ قدموں کی نمائش لگنا شروع ہوئی۔

مشہور ہے کہ جو مذہب بادشاہ کا وہی رعایا کا۔ مارکو پولس کوزیہ اس وقت تک
نہایت غیرے بادشاہ تھا۔ بوہمنڈ اور اس کے بیٹے ریمنڈ نے صور کو اس وقت
دہرا چھوڑا جب سلطان صلاح الدین بیت المقدس میں داخل ہوا تھا۔ قارئین کو
بیت المقدس کی جنگ دراصل حطین میں لڑی گئی تھیں۔ جس دن سلطان نے
یران میں عیسائیوں پر فتح حاصل کی تھی اسی دن شام و فلسطین کے تمام نصرانی
نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے وہ اپنے علاقے
اور علاقوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ صور کے حاکموں نے بھی صور کے شہر اور
قلعہ کے بجائے اسے آنے والے اسلامی لشکر کے حوالے کر دیا تھا۔

مغربی مورخ کے مطابق شمالی شام کی نصرانی ریاستوں کے حکمران سلطان سے
ناخوش تھے۔ طرابلس بھی ایسی ہی ریاستوں میں شامل تھا۔ بوہمنڈ طرابلس کا
برہمنڈ اس کا بیٹا۔ یہ دونوں معرکہ حطین میں نصرانیوں کے ساتھ مقابلہ پر آئے
برائیں شکست ہوئی تو وہ دونوں بھاگ کے طرابلس چلے گئے۔ صور کا علاقہ انہیں
نہیں لگتا انہیں اپنی جان کی بڑی تھی وہ صور کی کیوں پرواہ کرتے۔ یہ دونوں

کسی نہ کسی سردار سے لڑ پڑے گا۔ ملک العادل بڑا غصہ ور مجاہد تھا۔ جنگ اس کا اور
چھوڑا تھا۔ وہ بلا کا بہادر تھا خطرہ تو اس کے پاس سے گزرتا بھی نہ تھا۔ وہ میدان
دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتا تھا۔ سلطان نے اپنا ہاتھ بلند کر دیا۔
مطلب تھا کہ سب لوگ خاموش ہو جائیں کیونکہ وہ خود بولنے والا تھا۔

سلطان نے اپنے سرداروں پر طائرانہ نظر ڈالی پھر کہا۔ ”ہم نے مجلس مشورہ
مختلف سرداروں کی باتیں سنیں اور خیالات کا اندازہ لگایا۔ مصر، شام اور الجزائرہ کی افوا
ان کے مقامات پر واپس جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ صور کا محاصرہ تا حکم ثانی ختم
ہے۔ کوئی فوری ضرورت ہوئی تو انہیں طلب کر لیا جائے گا۔

سلطان کے مختصر حکم نے تمام لوگوں کے منہ بند کر دیے۔ سلطان نے محاصرہ اٹھا
کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ رضا کاروں کی گھر واپس جانے کی نہ
خواہش نے سلطان کو اس طرح کا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہو گا مگر یہ ضروری نہیں کہ
کی واپسی کی صرف یہی وجہ ہے اس کے علاوہ بھی اور وجوہات موجود تھیں۔
مورخوں نے سلطان کے اس اقدام کی تعریف نہیں کی۔ ابن اشیر کا لہجہ بہت سخت
اس نے نہ صرف سخت الفاظ میں اس فیصلہ کی مذمت کی ہے بلکہ وہ اس قدر شد
ہو گیا کہ اس نے سلطان کے اس اقدام کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔

صور کا محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ مصر، الجزائرہ اور شام کی فوجیں روانہ ہو گئیں پھر
خیمہ اکھاڑا گیا اور سامان بار کیا گیا۔ قلعہ صور کے برجوں اور فصیل پر لوگ گرد
بڑی حیرانی اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مارکو پولس کوزیہ نے اگرچہ سخت
تھا۔ مسلمانوں کا بحری بیڑہ بھی تباہ ہو گیا تھا لیکن کوزیہ کو پھر بھی اطمینان نہ تھا۔
معرکہ حطین کے واقعات سن رکھے تھے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان جب
کا محاصرہ کرتا ہے تو جب تک اس کا سر نہیں جھکا لیتا اس وقت تک محاصرہ ختم نہیں
مگر اب تو بالکل خلاف امید بات ہو رہی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس سے پہلے
محاصرہ ختم کیا گیا تھا لیکن اس وقت حالات کچھ اور تھے۔ اب تو سلطان بیت
قبضہ بھی کر چکا تھا۔ ساحل روم کی سب سے بڑی عیسائی ریاست یروشلم کا خاتمہ
سلطان کو فوری طور پر کوئی ایسی مہم بھی درپیش نہ تھی کہ وہ صور سے محاصرہ اٹھا
کسی اور جگہ لے جاتا۔ اہل قلعہ خوش تھے۔ بہت خوش تھے مگر ان کے دل
جھجک رہے تھے۔ ایک چور تھا ایک خوف تھا جو ان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔

نہیں۔
 روکیں کانریڈ بلا کا حسین اور جاذب نظر جوان تھا۔ اس کا چوڑا سینہ، مضبوط دست و ہنسی ہوئی نیلی آنکھیں مخالف صنف کو متاثر اور مرعوب کرنے میں بڑی ماہر تھیں۔ زندگی کی سختیوں اور مسلسل جنگوں نے اس کے چہرے پر تجربے کی لکیریں ڈال دی تھیں۔ لیکن اپنے استقبال کو آنے والی خواتین، دوستیوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر اس کا اٹھا تھا اور کلف اور کوفت کی پرچھائیاں ختم ہو گئی تھیں اور کانریڈ برسوں کی بھوکی دس نظروں کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

مقابل کے اس هجوم میں نہ جانے کہاں سے ایک کس لڑکی لوگوں کو ہناتے ہوئے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مارکوئیس کانریڈ کی نظریں لڑکی کے چہرے پر پڑیں تو جیسے وہ گئیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، درمیانہ قد اور متناسب اعضاء جو تناسب سے تائی کے پیکر تھے۔ کانریڈ کا شاطر اور چالاک دماغ اس ماہ پورہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دنیا گھوما ہوا اور طرح طرح کی کلیوں کا رس چوسنے والا بخنورا تھا مگر اس لڑکی کی نے اس پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ بوکھلا گیا اور یہ بھی بھول گیا کہ اس کے استقبال والے سیکڑوں لوگ اس کے منتظر تھے۔

لوئیس کانریڈ نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور مجمع پر ایک مسکراتی ہوئی نظر ڈالی مگر بے ساختہ اس لڑکی کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ لڑکی اب تک اس سے صرف ایک فاصلہ پر کھڑی تھی اور حیران نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے لئے اتنے بے سے آدمی جمع ہوئے تھے۔ کانریڈ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔

لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا۔

”لڑکی تمہارا نام کیا ہے؟“

کارمگ حیا سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ اس نے گھبرائے لہجے میں کہا۔

”ماریا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور ایک اوجیز عمر شخص کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میرے پاپا۔“

لوئیس کانریڈ نے ایک زبردست ریلا آیا۔ لڑکی اپنے پاپا سے چٹ گئی جب ریلے کا اہوا تو لڑکی کے پاپا نے دریافت کیا۔
 ”لوئیس آپ کس جگہ ٹھہریں گے؟“

باپ بیٹے اس قدر تنگ نظر اور سنگدل تھے کہ بیت المقدس سے زور دیا اور اسے جب چند قافلے طرابلس پہنچے تو انہیں طرابلس میں داخل نہیں ہونے دیا گیا اور صاف گھبرا گیا کہ ان کے پاس سامان رسد اتنا نہیں کہ وہ انہیں طرابلس میں جگہ دے کر ان کے پونچھ سکیں۔

جب طرابلس کے حکمرانوں کی طرف سے ان پریشان حال لوگوں کو جوان کے بڑا ایسا سخت جواب دیا گیا تو ان پناہ ڈھونڈنے والوں کے دلوں پر کیا گزری ہوگی اس کا ایک طرف رہا۔ خود طرابلس کے محافظوں پر اپنے حکمرانوں کے اس جواب کا یہ غلا کہ انہیں فیصل کے دروازوں کے سپرد اوروں نے باہر نکل کر پناہ مانگنے والوں پر حملہ وہ یروہلم (بیت المقدس) سے جو کچھ رقم یا زیورات بچا کے لائے تھے وہ سب اچھین لیا۔ بیت المقدس سے آنے والوں کے ساتھ ریاست اخلاقیہ اور دوسری ریاستوں نے بھی اسی قسم کا سلوک کیا۔

کہنے کا یہ مقصد ہے کہ صورت کی حفاظت کا کسی نے بھی انتظام نہیں کیا اس۔ مارکوئیس کانریڈ اگر خود کو صورت کا حکران سمجھتا تھا تو وہ یقیناً ”اس کا اہل تھا مگر اس صورت کو مارکوئیس کانریڈ کو اس کے اخلاقی پس منظر میں دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ مارکوئیم اوائل عمری ہی سے ایک آوارہ اور عشرت پسند جوان تھا۔ اس کے اور بھی عیوب ان عیوب کے باوجود وہ ایک بہت بڑے جنگجو بہادر اور پرلے درجے کا مکار اور شاطر شاید یہی وجہ تھی کہ کانریڈ نے اپنے بچپن کے ایام آوارگی ہی میں بحری تربیت مانگی تھی اور روتہ اکبری، فرانس، یونان وغیرہ کی بحری جنگوں میں اپنی بہادری کے بڑے نام پیدا کیا تھا۔ 185ء کے آخری دنوں میں مارکوئیس کانریڈ پانچ چھ بحری کپتان بن گیا تھا۔ کانریڈ چونکہ کافی مشہور ہو چکا تھا اس لئے جب وہ اٹلی کی ریاست مانس اسٹریٹ پہنچا تو اسے لوگوں نے سر پر بٹھایا۔

مارکوئیس کانریڈ کا زیادہ وقت بحری جہازوں اور بحری جنگوں میں گزرا تھا۔ اپنی عیاشی اور مکاری کو اس جبلت کو استعمال نہیں کر سکا تھا جو دوران جنگ اس میں کھیلا جاتی رہتی تھی۔ مانس اسٹریٹ میں اس کا اس قدر شاندار استقبال کیا گیا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ بوڑھوں نے کانریڈ کو دعاؤں کے ہار پہنائے۔ جوانوں نے بہادری کے گیت گائے مگر عورتوں نے کانریڈ کے راستے میں اپنی آنکھیں پھیر کر عورتوں میں جوان عورتیں بھی تھیں اور جوانی میں قدم رکھنے والی دوستیوں تک کہ وہ لڑکیاں جو ابھی جوانی کی حدود سے دور ہی تھیں وہ بھی مارکوئیس کو

”امیر البحر کنٹیری کے گھر ٹھہروں گا۔“ مارکوئیس نے جلدی سے جواب دیا۔
 ”برائے میرانی آپ رات کے کھانے کی دعوت قبول فرمائیے میں آپ کو لینے گا۔“ پھر ایک دوسرا ریل آیا پایا کو ایک زور کا دم لگا اور وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔
 ”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔“ نہ جانے کیسے مارکوئیس کی زبان سے نکل گیا۔
 وہ رات بڑی سمانی تھی۔ مارکوئیس کو نزیڈ کے یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ اس کی اسٹریٹ میں پہلی شام دنیا کی کسی حسین ترین حسینہ کے ساتھ گزرے گی۔ کتنی خوبصورت ہے اشاریا۔ کو نزیڈ نے سوچا پھر کسی حسین خیال سے وہ مسکرا اٹھا۔ بوڑھا امیر البحر وہ اس کا دماغ چاٹتا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کو نزیڈ اپنے کارناموں کی تفصیل اس انداز میں کرے وہ اس کی بحری جنگوں میں اپنی جوانی تلاش کر سکے۔ امیر البحر اگرچہ کافی بوڑھا ہو لیکن جب کوئی سمان اس کے یہاں آتا تو اک دم جوان ہو جاتا اور ایسی صورت میں والے کا تعلق فوج سے ہو تو پھر امیر البحر کی جوانی کے ساتھ ساتھ اس کا بچپن بھی کب ساتھ چلا آتا تھا۔

امیر البحر کی سمان توازی کا دور دور تک شہر تھا۔ مارکوئیس کو نزیڈ کے لئے امیر البحر اجنبی تھا اور نہ یہ مانس اسٹریٹ کا شہر۔ یہ دونوں ہی اس کے دیکھے بھالے کو نزیڈ کا بچپن ان سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتے گذرا تھا پھر وہ ایک طویل کے لئے مانس اسٹریٹ چھوڑ گیا۔ مانس اسٹریٹ چھوڑنے کے بعد ہی اس کی تقدیر بدل وہ ایک کلنڈرے اوباش لڑکے کی صورت میں یہاں سے نکلا تھا اور سات سال بعد بحری طوفانوں سے لڑتا بھڑتا واپس آیا تھا تو اس کی ٹوپی اور سینے پر شجاعت اور بہادری کے نشان اور تمنے آویزاں تھے۔ اس نے بحری جنگوں میں اتنا نام کمایا تھا کہ ال کے استقبال کو گھروں سے نکل پڑے تھے اور امیر البحر نے اسے خط لکھ کر اس بات کر لیا تھا کہ وہ اپنی تعطیل کے چند دن اس کے بنگلے پر ضرور گزارے گا۔
 ابھی گلیوں بازاروں کے قیمتی روشن ہی نہ ہوئے تھے کہ امیر البحر کے بنگلے کے ایک بند گاڑی رکی۔ مارکوئیس کو نزیڈ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ باہر جائے اور اپنی محبوبہ دلنواز کی راہ میں پلکوں کا فرش بچھائے مگر وہ دل پکڑ کے امیر البحر پہلے ہی ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے ایک اجنبی کی دعوت کیوں قبول کی۔ وہ اٹھ کے استقبال کے لئے باہر جاتا تو پتہ نہیں امیر البحر کتنی آفت کرتا۔

اس وقت ملازم نے اندر آکر بتایا۔

”آقا ایک بند گاڑی میں سمان آئے ہیں۔“

”سمان ہیں؟“ امیر البحر نے چڑھے لہجے میں سوال کیا۔
 ”نہ دو ہیں میرے آقا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور ایک گڑیا جیسی لڑکی۔“
 جس طرح دیکھا تھا اسی طرح بیان کر دیا۔
 ”لڑکی کون ہے؟“ اور اس نے کو نزیڈ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”یہ کا نام اشاریا ہے۔ وہ مجھے لینے آئے ہیں امیر البحر۔“ مارکوئیس کو نزیڈ نے بڑے بہ میں جواب دیا۔
 ”انے کسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کیا تھا مارکوئیس۔“ امیر البحر نے خواہ مخواہ جرح شروع کر دی کہ غصہ آگیا مگر اس نے ضبط کیا اور امیر البحر کو کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”امیر البحر سمجھ گیا کہ اس کے سمان کو پوچھ ناگوار گزری ہے۔ اس نے نرمی سے کوئیس کو نزیڈ۔ میں نے اس لئے پوچھا کہ جب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی موجود ہے تو اس کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ممکن ہے کہ وہ تمہیں متاثر کرنا چاہتی

نہیں کو نزیڈ چڑ کے بولا

”یہ اجازت دیجئے امیر البحر کہ میں باہر جا کر اپنے میزبان سے یہ کہہ دوں کہ میں ان نہیں جاسکتا۔“

”ہاں کیوں مارکوئیس تم ان کی دعوت کیوں رد کر رہے ہو؟“ امیر البحر نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”لے لے کہ آپ نہیں چاہتے کہ میں ان کے گھر جاؤں۔“ مارکوئیس کا لہجہ اور الفاظ ہر کر رہے تھے کہ مارکوئیس کو سخت غصہ آگیا ہے۔

”امیر البحر نے چونک کے پہلے مارکوئیس کو دیکھا پھر سوچ کر پہلو بدل کر بولا۔

”مارکوئیس مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میزبان تو دراصل میں تمہارا لے لے میرا فرض ہے کہ جب تک تم مانس اسٹریٹ کی حدود میں ہو میں تمہاری نال لگاؤں۔ بہر حال میں پھر معذرت خواہ ہوں مگر جانے سے پہلے یہ تو بتاتے جاؤ کہ تم میزبان کے گھر کتنی دیر ٹھہرو گے اور خدا نخواستہ تمہیں دیر ہو جائے تو تمہیں کس کا کیا جائے۔ مطلب ہے کہ تم اپنے میزبان کا پتہ مجھے بتاتے جاؤ۔“

”تو میں خود بھی نہیں جانتا۔“ مارکوئیس کو نزیڈ نے گھبرا کے کہا۔ ”دراصل وہاں بھڑ بھڑا تھی کہ میں اپنے میزبان کا نام تک نہ پوچھ سکا۔ انہوں نے مجھے دعوت

دی میں نے قبول کر لی۔ انہوں نے پوچھا میرا قیام کہاں ہوگا۔ میں نے آپ کے بھرا بتادیا۔ بس یہی باتیں ہوئی تھیں۔ چونکہ انہوں نے مجھے لے جانے کی خدمات اپنے ر لی تھیں اس لئے مجھے کچھ زیادہ فکر نہ تھی۔“

امیر البحر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔

”مارکو کس جاؤ مگر اشاریہ کے گھر سے جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔“

امیر البحر نے لفظ اشاریا پر کافی زور دیا تھا۔ مارکو کس کچھ جمل سا ہو گیا اور جب اٹھ کر باہر نکل آیا۔

پاپا اور اشاریا گاڑی سے نیچے اترے کھڑے تھے۔ مارکو کس کو آتے دیکھ کے اڑ آگے بڑھی اور بڑی بے تکلفی مگر خچرے سے بولی۔

”جانیے مارکو کس ہم آپ سے نہیں بولتے۔ اتنی دیر کردی آپ نے آنے میں۔“
مارکو کس اس کی سادگی مگر پرکاری پر حیران رہ گیا۔ پہلی ملاقات کے پہلے ہی جانا اشاریا نے مارکو کس کا دل جیت لیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اشاریا کو بہت سے جانتا ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر پاپا کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔

اشاریا کے پاپا نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”مارکو کس اس کی باتوں کا برا نہ مائے ابھی نادان ہے یہ۔“

”نادان!“ مارکو کس نے لفظ دہرایا۔ ”ہاں ہاں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا مگر اشاریا بہت اچھی۔“

اشاریا نے بات اپک لی۔ ”میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟“

”ہاں بہت اچھی۔“ یہ کہتے ہوئے مارکو کس پر سرشاری کا عالم طاری ہو گیا۔

”ہائے آپ بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔“ پھر اشاریا نے پاپا کی طرف دیکھ کے ا

”کیوں پاپا۔ مارکو کس اچھے ہیں نا؟“

”ہاں ہاں اچھے ہیں اشاریا۔“ پاپا نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”صرف اچھے نہیں بہت اچھے کہنے پاپا۔“ اشاریا نے اٹھلا کے کہا۔

”کیوں نہیں میری گڑیا تیرے مارکو کس بہت بہت اچھے ہیں۔“ اس کے ساتھ ا

آبدیدہ ہو گئے۔

مارکو کس پریشان ہو گیا۔ ”یہ۔۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا؟“

اشاریا نے جھٹ اپنے گریبان میں اٹکا ہوا رومال نکالا اور پاپا کے ہاتھ میں پکڑا

”پاپا۔ اتنا نہ یاد کیا کرو ماما ماریہ کو۔“

”کیا ہوا تمہاری ماما کو؟“ مارکو کس نے گھبرا کے پوچھا۔

پاپا نے اشاریا کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور رندھے گٹے سے بولے۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔
ماں کب تک کھڑی باتیں کرتی رہو گی۔

باتوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ مارکو کس کو اشاریا کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ پیاری ری بھولی بھولی باتیں۔

جس گھر کے سامنے ان کی گاڑی رکی اس کے باہر کی طرف ایک خوبصورت سالان گاڑی کو آتا دیکھ کر دور برآمدے میں بیٹھا چوکیدار بھاگ کے آیا اور ٹھکڑی کا براگیٹ لے گیا۔

اشاریا باتیں کرنے کے لئے بہت جلد چلن ہو رہی تھی مگر پاپا نے اسے راستہ میں گفتگو سے منع کر دیا تھا کیونکہ راستہ خراب تھا اور گاڑی جھٹکے کھا رہی تھی۔ اندر پہنچتے ہی اشاریا سوال جڑ دیا۔

”آپ کب تک یہاں رہیں گے؟“

”جب تک تم کوگی۔“ مارکو کس کو نرید کے منہ سے جیسے الفاظ پھسل پڑے۔

اشاریا نے رک کر مارکو کس کو دیکھا۔ پاپا اس کے ساتھ ہی برآمدے کی میز پر چڑھے تھے۔ ان کے قدم بھی رک گئے۔

اشاریا بھولے پن سے بولی۔ ”میں تو چاہتی ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔“
”مگر بھی نہ جایا کریں بس میرے پاس رہا کریں۔“

مارکو کس کو نرید کے جذبات میں غلام پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں بہت سی تیں آئی تھیں لیکن ان کی گفتگو کا اندازہ بڑا محتاط اور تاجرانہ ہوا کرتا تھا۔ یہ بیباکی ا اور روانی کسی کے لہجہ میں نہ تھی۔

پاپا نے اشاریا کو گھسیٹا۔ ”اندر چل کے بیٹھو پھر باتیں کر لیتا۔“

اشاریا پاپا کے ساتھ تھکتی چلی گئی۔ منہ سی گڑیا کی طرح جیسے بچے گھستے پھرتے ہیں۔ یا جسامت اور شکل و صورت میں گڑیا ہی لگتی تھی۔ ہلکی پھلکی چھریہ سا بدن، حلقوں تیزی سے گردش کرتی ہوئی آنکھیں۔

”گدھر ہو ماریہ دیکھو مہمان آئے ہیں۔“ اشاریا کے پاپا نے برآمدے میں پہنچ کے لگائی۔ ماریہ کے نام سے مارکو کس چونک پڑا۔ ”اشاریا تمہاری ماما کا کیا نام تھا؟“

”ان کا نام ماریہ تھا۔“ اشاریا نے بتایا۔

”اندر آجاؤ بیٹے مارکو کس کو نرید۔“ یہ آواز اشاریا کے پاپا کی تھی۔ وہ راہداری کا

دوسرا نمبر کھولے ہوئے کھڑے تھے اور مارکوئیس کو ڈرائنگ روم میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

مارکوئیس اور اشاریا ڈرائنگ روم میں پہنچے اور آئے سامنے کوچوں میں بیٹھ گئے۔

مارکوئیس کو اپنا سوال یاد آگیا۔ ”تمہاری ماما اب کہاں ہے اشاریا؟“

”ارے واہ اتنی جلدی بھول گئے۔“ اشاریا ہنس پڑی اور اس کے منہ سے جیسے سیکڑوں پھول جھڑ گئے۔ ”انہیں مرے ہوئے بارہ تیرہ سال ہو گئے۔ میں اس وقت دودھ پیا جی تھی جب ان کا انتقال ہوا۔“

”مگر تمہارے پیپا نے انہیں ابھی آواز دی تھی۔“ مارکوئیس نے الجھن کا اظہار کیا۔

”پیپا نے۔۔“ اشاریا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”کیسے آواز دی تھی؟“

اشاریا کو کچھ یاد نہ آیا وہ اس وقت مارکوئیس سے باتوں میں محو تھی۔ اسے دنیا مانیسا سے بالکل بے خبر تھی۔

مارکوئیس نے اسے یاد دلایا۔ ”اشاریا ابھی تمہارے پیپا ماریہ۔۔ ماریہ کہہ کر کسی پکار رہے تھے۔“

”اچھا۔“ اشاریا نے پھر ایک بھر پور تبسم بکھیر دیا۔ ”پیپا کو دراصل ماما سے اس قدر محبت تھی انہوں نے اپنے دوستوں سے درخواست کی تھی کہ اگر انہیں ماریہ نام کی کوئی ملازمہ ملے تو وہ ضرور بتائیں۔ کچھ ہی دن بعد پیپا کو یہ ملازمہ مل گئی اور پیپا اسے گھر آئے جب سے یہ ہمارے گھر ہیں۔ ماریہ کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ یہاں آئی تو بس بیٹا کی ہو کر رہ گئی۔ اس کا نام بھی ماریہ ہے اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہیں۔ پیپا کہتے؟ بیٹی اشاریا تجھے تیری ماں مل گئی مگر میں اب تک اکیلا ہوں۔ پیپا نے میری وجہ سے ”م شادی نہیں کی۔ کتنے پیارے ہیں میرے پیپا۔“

”تم بھی کتنی پیاری ہو اشاریا۔“ مارکوئیس نے چھیڑ جانے کا آغاز کیا۔

”میں۔۔۔۔۔ اشاریا نے آنکھیں پٹپٹا کے مارکوئیس کو دیکھا۔“

”ہاں ہاں تم۔۔۔ اشاریا تمہیں اس کا احساس نہیں کہ تم کتنی پیاری اور خوبصورت ہو؟“ تجربہ دار اور بوالہوس مارکوئیس کو نرینہ نے دو شیرازوں کی فطری کمزوری۔ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ بارہ اور سولہ سال کے درمیان کی لڑکیاں دراصل بچے کی مانند ہوتی ہیں۔ ان کے ذرا ہاتھ لگے یا سارا ملے تو وہ آم کی طرح ٹوٹ کے گودا گر جاتی ہیں۔ ان دنوں لڑکیوں میں اشقی جوانی ہوتی ہیں۔ وہ حسین حسین خواب دیکھ

ہیں اور مضبوط بازوؤں میں سٹٹا چاہتی ہیں۔ اسی لئے اس عمر کو بچی عمر کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس عمر کی لڑکیوں سے شریف لڑکے دور بھاگتے ہیں۔ اس لئے کسی غلط قدم کے نتیجے میں لڑکے کو کئی سال کی سزا ہو جاتی ہے۔

نمر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ مارکوئیس کو نرینہ کو شرافت تو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ اسے ایسی کلیوں کو چھیڑنے میں لطف آتا تھا۔ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے نہ معلوم اس نے کتنے لڑکوں کو مسلا تھا اور کتنے گھر خراب کئے تھے۔ پس اشاریا نے جب ”مرد“ ”مرد بھی جوان اور جوان بھی وجیہ اور خوبصورت کی زبان سے اپنی تعریف سنی تو اس پر سرور طاری ہو گیا اور اس کی آنکھیں جیسے جھپکنے لگیں۔

”مارکوئیس تم کتنے اچھے ہو۔“ اس کے ساتھ ہی اشاریا کھڑی ہو گئی اور اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادہ طور پر مارکوئیس کو نرینہ کی طرف بڑھنے لگے اور پھر اشاریا کو نرینہ کے مضبوط بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی اور سر کو نرینہ کے سینے سے لگ گیا۔ اچھا ہوا کہ اسی وقت ماریہ ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر اندر آگئی۔ اشاریا اور کو نرینہ فوراً ”سنبھل کر بیٹھ گئے۔“

”ماریہ پلٹتے ہوئے بولی۔ ”کھانا لگایا ہے آپ تشریف لے آئیے مارکوئیس کو نرینہ۔ صاحب انتظار فرما رہے ہیں۔“

”ماما ماریہ ہم ابھی آتے ہیں۔“ اشاریا بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ماریہ نے کھانے کے کمرے میں پہنچ کے اشاریا کے پیپا کو چونکا دیا۔ ”صاحب اشاریا اور مارکوئیس کا کتنا اچھا جوڑ ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو ماریہ۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟“ پیپا بے یقینی انداز میں بولے ”کیوں ممکن نہیں صاحب۔“ ماریہ نے پیپا کو حیرانی سے دیکھا۔ ”مارکوئیس لمبا چوڑا جوان نہیں، خوبصورت نہیں، کیا عیب ہے اس میں؟“

پیپا نے جانے کیا سوچنے لگے تھے ماریہ ان کا منہ تک رہی تھی۔ پیپا نہیں بولے تو اس نے خود ہی کہا۔ ”آپ چپ کیوں ہیں صاحب کیسے مارکوئیس شادی شدہ تو نہیں؟“ ”یہ تو پتہ نہیں میں نے تو ابھی اس سے بات ہی نہیں کی۔“ پیپا نے افسردگی سے بولے۔

”صاحب آپ بات کریں یا نہ کریں لیکن یہ ضرور خیال رکھیں کہ اشاریا بی بی مارکوئیس کو پسند کرنے لگی ہیں۔“ تجربہ کار ماریہ نے صاف صاف بتا دیا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے ماریہ؟“ پیپا نے تصدیق چاہی۔

پاپا ان کے ساتھ۔ پاپا آپ مہمان کی توہین کر رہے ہیں۔“
 نہیں اشاریا میں کسی کی توہین نہیں کر رہا۔ پاپا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”شاید سوچ رہے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ بات بھی نہیں ہے۔ میں مارکو کیس سے یہ راز چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں کس حد تک پسند کرتے ہیں۔“
 پاپا میں بتاتی ہوں آپ کو۔“ اشاریا نے باپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”مارکو نہیں ہی پسند کرتے ہیں جتنا میں انہیں پسند کرتی ہوں۔ میں نے مارکو کیس سے شادی اہلہ کیا ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیجئے۔“
 نے زہر خند کیا۔ ”تنی دیر سے یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ ایک رکنیں باپ کی جب بیٹی ہو تو اس کی پریشائیاں کس قدر بڑھ جاتی ہیں۔ میں تو خود تمہاری شادی جلد از کا خواہش مند ہوں۔“

را نے جلدی سے باپ کے گلے میں ہاں ڈال دیں۔ پھر مارکو کیس کی طرف دیکھتے ہیں۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مارکو کیس کو پاپا بھی پسند کرتے ہیں؟“
 کو کیس ایک خوبصورت جوان ہیں۔ بحری جنگوں میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا نا پسند کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ پاپا نے بڑے خلوص سے کہا۔
 تو ہم شادی کر سکتے ہیں۔ کیوں مارکو کیس؟“ اشاریا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی

ہاں۔ بالکل شادی کر سکتے ہیں۔“ مارکو کیس کے دل میں بھی لڈو پھونسنے لگے۔
 باپوں کی طرح کودتی ہوئی ماریہ کے پاس پہنچی جو اب تک وہیں میز کے دائیں کھڑی تھی۔ اس نے ماریہ کے گلے میں ہاںیں محاکل کر دیں اور اسے چومتے۔
 ”اما ماریہ جلدی جلدی انتظام کرو۔ ہم آج ہی شادی کریں گے۔“
 اشاریا۔“ پاپا کی رعب دار آواز نے کھانے کے کمرے میں خاموشی طاری ل قدر خوش نہ ہو کہ بعد میں رونا پڑے۔“

۔ محترم۔“

پا۔“

علاوہ کمرے میں یہی تین تنفس موجود تھے اور تینوں حیران و پریشان۔ کسی کو تھا کہ پاپا اس شادی میں روڑے اٹکائیں گے جب کہ مارکو کیس کو زہر کو وہ خود نے لگے تھے اور ابھی ابھی انہوں نے صاف الفاظ میں اس کا اظہار کیا تھا۔

”صاحب آپ یقین کو کہتے ہیں میں نے ان لوگوں کو پیار کی باتیں کرتے دیکھا ہے ماریہ نے کھلے الفاظ میں تصدیق کر دی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ پاپا متشکر تھے۔ ”کاش یہ ممکن ہوتا۔۔۔“

اشاریا اور مارکو کیس کو زہر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھانے کے کمرے میں داخل ہو اور پاپا کی بات ادھوری رہ گئی۔

اشاریا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پاپا میں مارکو کیس کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔“

”ضرور بیٹھنا اشاریا۔“ پاپا نے بڑے پیار سے کہا۔ ”مگر پہلے مارکو کیس میرے پاس بیٹھیں گے مجھے ان سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”پاپا۔ آپ۔۔۔“ اور اشاریا منہ بناتی اور اٹھلائی ہوئی میز کے دوسری جانب جا بیٹھ گئی۔

مارکو کیس کو زہر پاپا کے برابر بیٹھا۔ اشاریا تو کچھ سمجھ نہ سکی تھی مگر گھاگ کو زہر سمجھ گیا تھا کہ پاپا اس وقت خود ہی اس کے لئے اشاریا کا پیام دیں گے۔ کھانا شروع ہو گیا۔ ماریہ میز سے ذرا دور کھڑی تھی۔ اشاریا میز کی دوسری طرف مارکو کیس کے بالکل مقابل بیٹھی تھی۔ کھانے کے دوران بالکل خاموشی تھی لیکن اشاریا اور مارکو کیس کی نظریں برابر ملتیں اور جدا ہوتی رہیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر رہے تھے اور ان باتوں پر دوا کھڑی ماریہ غمراں تھی۔ پاپا کبھی کبھی آنکھوں سے دیکھ لیتے تھے۔

کھانا ختم ہونے پر تھا کہ پاپا نے مارکو کیس سے اچانک سوال کیا۔

”مارکو کیس کیا اشاریا تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

مارکو کیس کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا اس نے بڑی حیرانی سے پاپا کو دیکھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔

چند لمحوں بعد پاپا نے اپنا سوال دہرایا۔

”کیا اشاریا تمہیں پسند ہے؟“

”محترم۔۔۔“ آخر مارکو کیس نے زبان کھولی۔ ”اچھی چیز کو سب ہی اچھا کہیں گے۔“

اشاریا جس گھر جائے گی وہ گھر روشن ہو جائے گا۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں مارکو کیس؟“ پاپا کا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا تھا۔

مارکو کیس پریشان ہو گیا۔ ”اور کیا سوال تھا آپ کا محترم؟“

”میرا سوال یہ ہے کہ کیا تمہیں اشاریا بہت پسند ہے؟“ پاپا نے تقریباً چیخے ہوئے کہا۔

اشاریا گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔ ”پاپا مارکو کیس ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کس طرح بول

پھر ایک طویل خاموشی کے بعد مارکوئیس نے کہا۔ ”پاپا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے۔ آپ سب لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اس وقت چرچ کا قانون ہمارے راستہ کی دیوار بن گیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کروں گا کہ اگر اشاریہ میرا ساتھ دے تو میں چرچ کی شادی کی اجازت حاصل کر سکتا ہوں۔“

اشاریہ کی بجائے ماریہ نے جواب دیا۔ ”مارکوئیس آپ قطعی فکر نہ کیجئے۔ اشاریہ آپ اگلے گلے پانی میں بھی ساتھ دیں گی۔“

اشاریہ نے فوراً ”جذباتی انداز میں ماریہ کی تائید کی۔“ ”پیارے مارکوئیس۔ میں تو ہمارے لئے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔“

اشاریہ کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لیتی دوبارہ ماریہ کے گلے سے لگ گئی۔

پاپا نے فوراً ”اپنی صفائی پیش کی۔“ ”مارکوئیس تمہیں میری طرف سے بالکل اطمینان رکنا۔ اگر تم مانس اسٹریٹ چرچ سے اجازت حاصل کر لو تو مجھے اشاریہ کو تمہارے ساتھ رخصت کرتے ہوئے بہت خوشی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے پاپا۔“ مارکوئیس کو نریڈ بہت مطمئن تھا۔ ”ہمیں چرچ کے قانون کا پیٹ بھڑا ہوگا۔ اجازت خواہ لارڈ پادری دے یا کوئی اور پادری۔“

کو نریڈ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ”اب مجھے اجازت دیجئے پاپا۔ رات کافی گزر چکی ہے؟“ اشاریہ تیز قدموں سے کو نریڈ کے پاس آگئی۔ اس نے کو نریڈ کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے دایا۔

”اب کب آؤ گے مارکوئیس؟“ وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

”جب تم کو۔“ مارکوئیس کو نریڈ مسکرا رہا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہیں سو جاؤ۔“ اشاریہ نے بڑے پیار سے کہا۔

”مت گھبراؤ اشاریہ۔ وہ وقت بھی بہت جلد آئے گا۔“ مارکوئیس دروازے کی طرف بڑھا۔

”میں تمہیں پہچانے چلوں گا مارکوئیس۔“ پاپا نے پیش کش کی۔

”نہیں پاپا آپ اس وقت کہاں جائیں گے۔ آپ کی گاڑی مجھے چھوڑ آئے گی۔“

مارکوئیس نے بڑے اخلاق سے پاپا کو روکنے کی کوشش کی۔

”اسی وقت اشاریہ نے پیش کش کر دی۔“ ”پاپا مارکوئیس کو میں چھوڑے آتی ہوں۔“

”تم۔۔۔“ مارکوئیس نے حیرانی سے کہا۔ ”آدھی رات گزر چکی ہے اشاریہ۔“

”میرے بچو۔“ ہنسا ہنسا کر بڑے کرب سے اشاریہ اور اس کے محبوب کو نریڈ کو مخاطب کیا۔ ”میری وفادار ملازمہ ماریہ جس نے میری بیٹی کو اپنی ماں کی طرح نہ ہونے دی وہ گواہی دے گی کہ میں اشاریہ کو کس قدر چاہتا ہوں۔ میں نے آج کی کوئی خواہش رد نہیں کی پھر اس وقت ایک ظالم باپ کی طرح میں اس کی کو ساتھ شادی سے کیوں انکار کر رہا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں مارکوئیس کو نریڈ کو پسند نہ کرنا۔ کو نریڈ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ہم میں کوئی فرقہ درانہ اختلاف ہم مارکوئیس ایک عظیم جوان ہے، اس نے ملک و ملت کے لئے بیش بہا خدمات سہا ہیں۔ ماریہ بھی کو نریڈ کی مداح ہے مگر میرے بچو۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں مارکوئیس کو نریڈ سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں مجبور۔۔۔“

”میرے آقا۔ میرے صاحب جی۔“ ماریہ بے چین ہو کے بولی۔ ”مارکوئیس! پسند ہیں۔ آپ بھی انہیں پسند کرتے ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ مارکوئیس کو نریڈ کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی ہے پھر وہ کوئی مجبوری ہے جو آپ کی شادی سے روکتی ہے۔ کیا آپ اپنی مرحوم بیوی کی روح سے شرمندہ ہونا چاہتے ماریہ تم مجھے غلط نہ سمجھو۔“ پاپا نے اسی عالم کرب میں جواب دیا۔ ”مجھے اپنی بیٹی اشاریہ کے لئے پیارے مارکوئیس کو نریڈ سے بہتر اور کون شوہر مل سکتا ہے۔ میری بیٹی کے ساتھ شادی ہونے سے تو خود میری عزت بڑھے گی۔ میں مارکوئیس کو خسر ہونے پر فخر سے سر بلند کر سکوں گا لیکن میں مجبور ہوں۔ میں ہی نہیں بلکہ تم! کے میری طرح مجبور ہو جاؤ گے کہ اشاریہ کی عمر اس وقت تیرہ سال سے بھی کم اس کم عمری میں شادی ہونے پر ہمارا چرچ (مانس اسٹریٹ کا پادری) اشاریہ اور گردانے گا اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔“

چرچ کا نام سن کے سب کچھ گردنیں جھک گئیں۔ اس زمانہ میں ہر ملک میں دو طاقتیں ہوتی تھیں۔ ایک بادشاہ کی طاقت اور دوسرے لارڈ پادری کی طاقت۔ ان کے سامنے شاہ وقت بھی چوں نہ کر سکتا تھا۔ شادی بیاہ تو خالص مذہبی معاملہ تھا اور صرف مانس اسٹریٹ کے لارڈ پادری کا حکم مانا جاتا تھا۔ نصرانیوں میں کم سنی کی شادی کے قانون کے مطابق ایک بہت بڑا گناہ اور جرم تھا اور اس جرم کی سزا سات مشقت تک ہو سکتی تھی۔

چرچ کا نام سن کے سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔ ماریہ کا چہرہ فق ہو گیا اور تو آنسو نکل آئے اور وہ ماریہ کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

”تو کیا ہوا۔ گاڑی میں جانا ہے اور گاڑی ہی میں واپس آنا ہے۔“ اشاریہ نے اتنی محبت سے کہا کہ مارکوئیس کو نرپیڈ انکار نہ کر سکا۔

مارکوئیس تو دل میں خوش ہوا کہ بند گاڑی میں اشاریہ سے گفتگو کر سکے گا اور ہر گرجوشی کا اظہار بھی کرے گا۔ پیانے اشاریہ کے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ رات بیک چلی تھی اس لئے سردی بھی چمک اٹھی تھی۔ مارکوئیس اور اشاریہ نے تیز برائڈی کا ایک ایک پیگ چڑھایا اور بند گاڑی میں جا کے بیٹھ گئے۔

مارکوئیس کو نرپیڈ بڑا عیاش تھا۔ وہ ہر رات ایک نئی عورت بدلتا تھا مگر اشاریہ کی صورت میں اسے نہ معلوم کیا چیز نظر آئی کہ اس نے اسے بیوی بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس نے اس وقت کیا تھا جب پیانے اشاریہ کی کسمنی کا رونا رو کر شادی سے انکار کیا تھا۔ اس وقت کو نرپیڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ اشاریہ سے شادی کر کے کچھ دن سکون سے گزارے گا۔

مارکوئیس کو نرپیڈ جیسے آوارہ مزاج لوگ فطری طور پر دھن کے بہت بکے ہوتے ہیں۔ اس کے ماضی کے بارے میں کچھ زیادہ حال تو معلوم نہ ہو سکا سوائے اس کے کہ وہ ایک بہت آوارہ مزاج مگر بہادر جوان تھا۔ دھن کا پکا شاید اسے اس لئے کہا گیا کہ وہ اپنی عسکری اور بحری زندگی میں ایک اڑیل جوان مشہور تھا اور اسی اڑیل پن کی وجہ سے اس نے بحری لڑائیوں میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ اس نے چار پانچ سال پہلے ہانس اسٹریٹ کو بھی اسی وجہ سے خیر باد کہا تھا کہ اس کی آوارگی حد سے بڑھ گئی تھی اور لوگ اس سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔

پھر جب اس نے بحری سفر کا ارادہ کیا تو اس کے جوہر کھلے۔ کہنے کو تو وہ بحری فوج کا ایک عام ملاح تھا مگر جب پہلی بحری جنگ کے دوران اس کا ہیڈ ملاح مارا گیا تو اس نے اپنے جہاز کی کمان بغیر کسی حکم کے خود سنبھال لی۔ بحری بیڑے کا کپتان دوسرے جہاز پر تھا۔ اس نے بحری بیڑے کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے پسپائی کا سگنل دیا مگر کو نرپیڈ نے اس کے حکم کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے جہاز کو لے کر قریب ترین دشمن جہاز پر نہ صرف زبردست تیر برسائے بلکہ کتوار کھینچ کر مخالف جہاز پر چڑھ گیا اور زبردست دودو جنگ کے بعد اس جہاز پر قبضہ کر لیا۔ دشمن بیڑے کا کپتان ایسا گھبرایا کہ اپنے بحری جہاز کی مدد کرنے کی بجائے وہ باقی جہازوں کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مارکوئیس کو نرپیڈ کی یہ ایک بے مثال بہادری تھی۔ چنانچہ کپتان کی سفارش پر کو نرپیڈ کو بحری بیڑے کے نائب کپتانوں میں شامل کر لیا گیا۔ اگلے دو سال میں کو نرپیڈ نے اسی قسم کے

مظاہرے کئے اور وہ ترقی کرتے کرتے کپتان کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ مارکوئیس اعلیٰ عہدے پر فائز تھا لیکن شراب و شباب کی کمزوریاں اس سے ظاہر ہوتی۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر وہ بے قابو ہو جایا کرتا تھا۔ کئی موقعوں پر وہ اپنی اوج سے قتل ہوتے ہوتے بچا مگر اپنے ملک اور قوم کے لئے اس قدر کارنامے رہا تھا کہ کوئی عدالت اس پر ہاتھ نہ ڈال سکی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جج اپنے ہر د کو قانون پر قربان نہ کر سکے اور وہ ہر بار پچتا رہا۔

مارکوئیس کو نرپیڈ وطن واپس آیا تو اس کے کارنامے اس سے پہلے وہاں پہنچا۔ نرپیڈ دراصل وطن اس لئے آیا تھا کہ اپنے پرانے دوستوں سے ملے اور ان میں جن راہوں میں اس کا بچپن گم ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں سے بھی آنکھیں ملانا دل نے اسے ذلیل کر کے در بدر کر لیا تھا مگر وطن پہنچ کے اسے معلوم ہوا کہ اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ دشمن اس سے آنکھ ملانے کی بھی جرات نہیں کر سکتے۔ گھوٹے پھرنے یا پرانے دوستوں سے ملاقات کی فرصت ہی نہ ملی۔ وہ اشاریہ کے اہساکہ اسے کسی اور طرف کا دھیان ہی نہ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کو نرپیڈ سے واقعی محبت ہو گئی تھی اور اس کے وطن آنے کا مقصد اشاریہ اور صرف دل تھا۔

ن کو نرپیڈ جس رطائرڈ امیر البحر کے بنگلے پر مقیم تھا وہ بیچارہ کو نرپیڈ کی روش دیکھ رہا تھا۔ کو نرپیڈ اس بنگلے پر قیام برائے نام ہی تھا۔ وہ صبح ہی صبح اٹھ جاتا۔ منہ لے سے دھوتا پھر کپڑے پہنتا اور نکل جاتا۔ امیر البحر اسے نگر نگر دیکھتا رہتا مگر نہ بولتا۔ اسے کو نرپیڈ کے مزاج کا کچھ کچھ اندازہ پہلے ہی دنوں ہو گیا تھا جب اس کے لئے تیار تھا اور امیر البحر اسے باتوں میں لگائے ہوئے تھا اس روز کی تلخی اب تک یاد تھی۔ اسی لئے نہ وہ کو نرپیڈ کو جاتے وقت ٹوکتا اور نہ رات گئے ہر کوئی سوال و جواب کرتا۔

لڑنے سوچا تھا کہ کو نرپیڈ کی مصروفیت دو چار دن میں ختم ہو جائے گی پھر وہ کو نرپیڈ گفتگو کرے گا۔ امیر البحر اتنے بڑے بنگلے میں چار ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ بیٹا اور ایک بیٹی تھی جو بال بچوں والے تھے اور الگ الگ اپنے اپنے گھروں میں جب کبھی اپنے کاموں سے فرصت ملتی تو وہ ایک دن کے لئے باپ کے گھر میں گھر میں دن سے زیادہ وہ کبھی نہ ٹھہرتے تھے۔

لڑنے کتابوں سے دوستی کر لی تھی۔ اسے کوئی کام نہ تھا۔ معقول پنشن ملتی تھی

پے ہی خیالوں میں الجھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ خیالات کے جھوم میں اس جا رہا تھا کتاب تو اس نے بس یونہی کھول لی تھی کہ اس کے کمرے کے باہر کی چاب ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو مارکوئیس کو نرید کو دروازے میں بیس شاید اندر آتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ چند لمحوں میں ایک دوسرے کو خود مارکوئیس نے گفتگو میں پیش قدمی کی۔

امیر البحر۔ کیا میں آپ کے خیالوں میں غل ہو سکتا ہوں۔
امیر البحر مسکرایا۔ ”مارکوئیس۔ خیالوں پر قبضہ تو جوانوں کا ہوتا ہے ہم تو اس دور نکل آئے ہیں۔“

ہوئے امیر البحر اٹھا اور دروازے پر جا کر مارکوئیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مارکوئیس۔ فوجی تو بہت سادہ اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ تمہیں میرے پاس رت کی کیا ضرورت ہے۔ مہمان تو گھر کا ایک فرد ہوا کرتا ہے۔؟“

اس طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مارکوئیس کو کمرے میں لے آیا۔ امیر البحر کا یہ نامہ بھی تھا اور لاہوری بھی اس وسیع و عریض کمرے میں دو شیشے دار الماریاں در ایک کونے میں گول میز اور کرسی بچھی تھی۔ امیر البحر شاید اس میز پر لکھنے کا مارکوئیس کے لئے یہ کمرے بالکل نیا تھا۔ یہی ایک کمرہ کیا مارکوئیس کے لئے ہوا بلکہ ہی اجنبی تھا۔ اس لئے کہ وہ صبح کو بلکہ سے لکھا تو کافی رات ڈھلے۔ اسے تو صرف اس کمرہ کا پتہ تھا جس میں وہ سوتا تھا۔

نرنے مارکوئیس کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”آج سویرے سویرے شہزادے کو بے آگئی۔ مارکوئیس ایک ہفتہ سے زیادہ تمہیں ہمارا مہمان ہوئے ہو گیا ہے مگر تک مجھے میزبانی کا شرف نہیں بخشا۔ اس میں شاید میری بھی کچھ خطا ہے اس ان میں ہوں۔ صبح کو تمہاری مزاج پرسی کے لئے مجھے تمہارے پاس آنا چاہئے۔ کوشش بھی کی لیکن صبح کو تم اس جلدی میں ہوتے ہو کہ میں تمہیں اب تک کا۔ خیر جھوڑاں باتوں کو۔ میزبان پر یہ واجب نہیں کہ وہ مہمان کے سامنے اپنی کے بیٹھ جاتے۔“

ا بزرگ۔ ”مارکوئیس نے بڑے مذہب طریقے سے کہا۔ مجھے افسوس ہی نہیں پ سے شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں آپ کا مہمان رہنے کے باوجود اب تک آپ فضلی گفتگو نہ کر سکا حالانکہ آپ کے یہاں قیام کرنے کا عزم اسی لئے کیا تھا کہ نے کی وجہ سے ہماری طبیعتوں میں بھی ہم آہنگی ہوگی۔ اس طرح دو دلوں نے مل

اور خاندانی رئیس ہونے کی وجہ سے معقول جائیداد اور زمین کے اس حصہ میں کئی بھی وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتا اور ایک متوازن زندگی گزارنے کا چکا تھا۔ مطالعہ کے شوق نے اس کی زندگی میں رکھ رکھاؤ اور توازن پیدا کیا تھا۔ وہ بہت قدر کرتا اور باہر سے آنے والے کاروباری یا غیر کاروباری دوست اس ہفتوں اور میزبانی ٹھہرتے تھے۔

امیر البحر نے بڑی مہمان نواز طبیعت پائی تھی۔ جب کوئی بڑا آدمی اس شہر خواہ سے شنائی ہو یا نہ ہو امیر البحر اسے اپنے بلکہ پر ضرور مدعو کرتا۔ اسی شوق مجبور کیا تھا کہ وہ مارکوئیس کو نرید کو اپنے گھر قیام کی دعوت دی تھی اور مارکوئیس اس خیال سے قبول کر لیا تھا وہ اس کا ہم پیشہ تھا مگر مارکوئیس کو نرید نے پہلے تو اشاریا کا گھرایا دیکھا تھا کہ اسے کسی اور جگہ چین ہی نہ ملتا تھا۔ امیر البحر کے با رات کے صرف چند گھنٹے گزارنے آیا کرتا تھا۔

مگر اس صبح اسے بڑا تعجب ہوا جب اسے ایک ملازم نے بڑی رازداری۔ ”آقائے محترم۔ آج آپ کے مہمان اب تک اپنے کمرے میں ہیں۔“
”کیا کیا کام تم نے۔ مارکوئیس اپنے کمرے میں ہے؟ امیر البحر نے اس طرح کوئی بہت غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔

”جی آقا وہ اپنے کمرے میں ہیں اور آپ سے ملاقات کے لئے آنے والے نے ایک اور انکشاف کیا۔“ انہوں نے مجھے بلا کے پوچھا تھا کہ کیا امیر البحر ہیں۔

امیر البحر کے لئے یہ خبر اس سے زیادہ حیرت ناک تھی۔ اس کے لئے مارکو کی ذات بڑی پر اسرار تھی۔ آج تک اس کے گھر کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا کی طرح مہمان ہوتے ہوئے اپنے میزبان سے اس قدر بے تعلق اور اجنبی رہا رات کے کھانے کا تو کوئی سوال نہ پیدا ہوتا کہ مارکوئیس کھانے کے دونوں اوقہ موجود ہی نہ ہوتا تھا۔ امیر البحر کو صرف یہ یاد تھا کہ مارکوئیس کو نرید نے مرز اس کے ساتھ ناشتہ کیا تھا ورنہ وہ ناشتہ سے بہت پہلے بلکہ سے نکل جایا کر حالات میں اسے یہ معلوم ہوتا کہ مارکوئیس کو نرید اس وقت تک یعنی دن چڑھنے میں موجود تھا اور اس نے امیر البحر کے متعلق دریافت بھی کیا ہے۔ پورے امیر البحر نے مارکوئیس کی روش میں ایک دم اس تبدیلی یہ اندازہ ضرور لگایا تھا کو آج اس سے کوئی کام ضرور پڑا ہے۔

”شاباش مارکوئیس۔“ امیر البحر نے اسے اور سارا دیا۔ ”تمہارے چہرے پر ایک پانہ شان دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ہاں اب بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے۔“

عاشق کو اگر کوئی ہمدرد اور دمساز مل جائے تو وہ دل کھول کے دکھ دیتا ہے۔ مارکوئیس ریڈ کے عشق عاشقی کا یہ پہلا ڈرامہ نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ نہ معلوم کتنے گل کھلا تھا مگر وہ تمام کھیل یا کھیل تماشے تھے۔ محبت کی یہ بازیاد وہ اپنی لا اباہی طبیعت کے کھیل تھا۔ اس میں اس کے خلوص کو کوئی دخل نہ ہوتا۔ رہا محبت کا سوال تو مارکوئیس لفظ کے صحیح مفہوم سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کے خیال میں محبت یہ تھی کہ کسی لڑکی رات کے ساتھ دو چار دن ہنسی خوشی گزارے پھر دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔

اشاریا کے معاملہ میں بھی مارکوئیس کو ریڈ کا پہلے ہی خیال تھا کہ وہ اس نازک کلی دو چار دن یا ہفتہ دو ہفتہ کھیلے گا پھر رخ بدل کے کسی اور شمع کا پروانہ بن جائے گا۔ ”کیا سوچنے لگے مارکوئیس“ امیر البحر نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ وہ راس زادی جس کا نام شاید اشاریا ہے۔ اس کا کوئی چکر ہے شاید یہ خیال بھی درست ہے کہ وہ لڑکی بھی تمہیں پسند کرتی ہے پھر یہ کون رقیب پیدا ہو گیا نے تمہیں پریشان کر کے رکھ دیا۔“

”محترم۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ اشاریا مجھے پسند کرتی ہے اور میری کسی بات سے انکار کرے گی۔“ مارکوئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس کا باپ بھی میری مخالفت نہیں لے گا بلکہ میری مدد کرنے پر آمادہ ہے۔“

”پھر تو کئی شکل ہی نہیں مارکوئیس۔“ امیر البحر نے پر سکون لہجے میں کہا۔ ”بیٹی راضی۔ تم رضامند۔ پھر تمہیں کون روک رہا ہے۔ مجھے اس کا نام بتاؤ۔ میں اس کا خاتمہ کرا گا۔“

”مشکل تو یہی ہے محترم مخالف وہ ہے جس پر نہ میں قابو پا سکتا ہوں اور نہ آپ۔“

مارکیس کو ریڈ شروع سے آخر تک تمام اوقات بیان کر دیئے اصل مسئلہ اشاریا کا نہ اور کسی شخص کی نابالغ لڑکی سے شادی کرنا بہت بڑا جرم تھا اور اس کی کسی طرح انہ ہو سکتی تھی امیر البحر بھی فکر مند ہو گیا۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ مارکوئیس، امیر البحر کے چہرے پر نظریں گاڑے اتار دیکھ رہا تھا۔ آخر امیر البحر نے کہا۔

”میں گزشتہ دس سال سے کسی دوسرے شہر نہیں گیا۔ اس شہر میں بھی میں سوائے خاص تقریبوں کے اور کہیں نہیں جاتا مگر اب مجھے دوسرے شہر جانا پڑے گا۔ بغیر باہر

جائیں گے تو اچھی مگر رے گی مگر کیا عرض کروں یہاں آکے کچھ ایسا الجھ گیا کہ کم کا وقت ہی نہ مل سکا۔“

کوئی بات نہیں مارکوئیس۔ ”امیر البحر نے ہنس کے کہا۔“ جوانی دیوانی بھی ہوا اندھی بھی۔ اس دشت بلا خیز سے ہم بھی گزر چکے ہیں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خبر ہوں؟“

مارکوئیس نے چونک کے امیر البحر کو دیکھا پھر احساس شرمندگی سے سر جھکا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ تمام باتوں سے آگاہ ہیں۔“

مارکوئیس آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

”مارکوئیس۔ نہ تم نے کچھ بتایا ہے اور نہ میں نے اس کی کھوج کی ہے۔“

نے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ ”مگر قیاس بھی کوئی چیز۔ اندازے اگرچہ ہوتے ہیں مگر وہ کبھی کبھی سچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر تفصیل سے بتاؤ گے تو شاید مشورہ دے سکوں۔“

”بزرگ محترم۔“ مارکوئیس نے درد دل بیان کرنے کے لئے بہت سے اند سوچے تھے مگر اس وقت وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ بہر حال اس نے جس طرح سکا اپنا اور اشاریا کا مسئلہ بیان کرنے کا آغاز کیا۔

”آپ کا قیاس اور اندازہ بالکل درست ہے۔ میں اتنے دنوں بعد وطن یہ سمجھا کہ کچھ دنوں پرانے دوستوں کے ساتھ گھوموں پھروں گا مگر اشاریا کو دیکھنے کا بھٹک گیا اور اب اس طرح پھنس گیا ہوں کہ نہ آگے بڑھ سکتا ہوں اور نہ پیچھے نہ جاسکتے ہیں۔“ مارکوئیس نے رک کر پیشانی کا پینہ صاف کیا حالانکہ اچھی خاصی رہی تھی اور پینہ آنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

امیر البحر نے بزرگانہ فصاحت کی۔ ”مارکوئیس اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت تمہیں اپنی جنگی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک موقعے پیش آتے ہوں گے طرح تم نے ان خطرات کا مقابلہ کیا اس طرح اب بھی ثابت قدم رہو اور صرف رکھو کہ فوجی کا قدم جب ایک بار آگے بڑھ جاتا ہے تو پس کے پیچھے آنے کا قصہ ہے۔ تمہیں تو آگے اور آگے ہی بڑھنا ہے خواہ سر رہے یا کٹ جائے۔“

امیر البحر کے آخری جملے سے مارکوئیس میں جیسے جان پڑ گئی وہ پر عزم لہجے ”محترم بزرگ“ آپ نے مجھے ایک نیا حوصلہ دیا ہے۔ میں تو پریشان ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔“

گئے کام سیدھا نہ ہوگا۔“

مارکوئیس اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں امیر البحر کی یہ باتیں مضمحل سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ باہر کس لئے جانا چاہتے ہیں اور اس کا اس مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق کیوں نہیں ہے مارکوئیس۔“ امیر البحر نے متانت سے جواب دیا۔ ”میں تمہارے ہی کلمہ کے لئے باہر جاؤں گا۔ صرف میں نہیں بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہو گے اور اشاریا اور اس کے پیلا بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ایک اچھا دورہ ہو گا یہ۔“

مارکوئیس پر کچھ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے ملتی نظر سے امیر البحر کو دیکھتے ہوئے کہا ”محترم براہ کرم اپنی بات کی وضاحت فرمائیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔“

”اے بحریہ کے نوجوان افسر۔ تمہیں اس سلسلہ میں زیادہ داغ سوزی کی ضرورت نہیں۔“ امیر البحر نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”کچھ ضروری باتیں میں تمہیں سمجھائے گا۔“

”ہوں۔ اس سے زیادہ سمجھنے کی تمہیں ضرورت بھی نہیں۔ جزیرہ سلسلی (مغلیہ) کا لارڈ پادری میرا دوست ہے۔ دوست اس طرح کہ بچپن میں ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے پھر اس کے والدین مع اپنے گھر بار کے ہمیشہ کے لئے سلسلی منتقل ہو گئے۔ اس طرح ہم دونوں جدا ہو گئے بچپن کی اس جدائی کے بعد تقریباً چالیس سال بعد میرا اتفاقاً سلسلی جانا ہوا اور ایک اتوار جب نماز کے لئے بڑے گرجے میں گیا تو میرا وہ بچپن کا بار مجھے لارڈ پادری کے روپ میں نظر آیا۔ نماز کے بعد میں اس خاص کمرے پر گیا پھر میرا سامنا ہونے لگا۔ اس نے مجھے بالکل اس طرح پہچان لیا جس طرح میں چالیس سال بعد اسے لارڈ پادری کے روپ پہنچاتا تھا۔“

اس نے ایک ہفتہ تک مجھے سلسلی میں روکے رکھا پھر اس وعدہ کے ساتھ رخصت کیا میں دوسرے تیسرے سال اس سے ملنا جایا کروں گا میں نے اس سے کیا ہوا وعدہ یاد رکھا اور اب دوسرے تیسرے تو ہاں پانچویں چھٹے سال اس سے ملاقات کے لئے سلسلی جانا ہوں اس سے ملے ہوئے مجھے تقریباً پانچ سال ہو چکے اس زمانہ اس سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور تمہارا کام بھی بن جائے گا۔“

مارکوئیس بہت بے چین تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا لارڈ پادری چرچ کا قانون توڑ کے اشاریا سے میری شادی کر دیں گے؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے انکار نہیں کرے گا۔“ امیر البحر نے وثوق سے کہا۔ ”م“

دوسرے سے بہت بے تکلف ہیں۔ جب میں وہاں جاتا ہوں تو ہم دونوں اپنے بچپن کی دہرائے ہیں اور اس دوران ہمیں بہت سی ناشائستہ باتیں بھی کر ڈالتے ہیں۔ مجھے اس پر امید ہے۔“

مارکوئیس نے امیر البحر کو جواب نہ دیا مگر اپنے طور پر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر بارہا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ تھا کہ اشاریا کے پیلا کو کیا ضرورت پڑی ہے وہ کو ساتھ لے کر سلسلی کا طویل سفر اختیار کریں۔ دوسری بات یہ کہ سب سلسلی پہنچے مگر امیر البحر کے خیال کے برعکس لارڈ پادری نے اس غیر قانونی کام میں ہاتھ ڈالنے کا رد کر دیا تو کیا ہو گا کونزید کی پیلا اور اشاریا کے سامنے کیا عزت رہ جائے گی۔ یہ سوال بہت اہم تھے اور عقل کوئی معقول جواب دینے سے قاصر تھی۔

مارکوئیس کونزید کو امیر البحر کینکری کے جنگلہ پر دیر لگی تو وہاں اشاریا پریشان ہو گئی۔ اس پر ایسی فریفتہ ہوئی تھی کہ صبح سے رات گئے تک مارکوئیس سے چٹنی رہتی بلکہ نے تو مارکوئیس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ کونزید بڑا چالاک اور مشاطہ تھا۔ اس نے عورت سے دوستی صرف ایک ملاقات تک محدود رہتی پھر وہ اس عورت کو اپنے رشتہ سے اس طرح اتار پھینکتا جس طرح پرانی جوتی پھینکی جاتی ہے مگر اشاریا اس نے ایسی بڑی تھی جس سے وہ کوشش کرنے کے باوجود الگ نہ کر سکا۔

اشاریا تھی بھی ایسی ہی خوبصورت اس کی شریقی آنکھیں ہر وقت شراب میں ڈوبی مست چال اور مست سراپا کونزید سے چند ملاقاتوں ہی میں وہ بندھ گئی سے ایک مہکتا ملا ہوا گلاب نظر آنے لگی تھی اوڑتی جوانی اور چڑھتے ہوئے شباب کی مثال اسی پر آتی تھی۔ کونزید اس کی نظروں میں ڈوب گیا تھا اور اشاریا اس کے رگ و پے میں تھی۔

اشاریا باہر گیت پر کھڑی تھی کونزید فکر مند سا واپس آیا۔ اشاریا نے بے دھڑک اس دن میں دونوں ہاتھ ڈال کے اس کا منہ چوم لیا مغربی تہذیب میں سرعام بوس و کنار کی عیب نہ تھا اشاریا تو اپنے مکان کے گیت پر تھی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے دو لڑکوں نے دالمانہ محبت کے اس بیباک اظہار کو دیکھا بھی مگر وہ سوائے مسکرانے اور ناثر نہ دے سکے۔

”اے افسردہ کیوں ہو کونزید میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ چرچ بازت نہیں دیتا ہے تو نہ دے۔ تمہیں ساتھ رہنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔“ بڑی مستقل مزاجی سے کونزید کو تسلی دی۔

اشاریا نے ٹھیک کہا تھا یورپ میں جوان یا نوجوان لڑکی لڑکا ایک سالہ ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی دن رہیں اس طرح رہتے ہوئے وہ بال بچوں والے بھی ہو جائیں مگر مغربی تہذیب نہ انہیں ٹوک سکتی ہے اور نہ کوئی اعتراض کر سکتا ہے اور شاید اسی کو کہتے ہیں اشاریا نے کوزیڈ کو یقین دلا دیا کہ وہ بغیر شادی کے اس کے ساتھ رہ سکتی ہے پھر اسے شادی کرنے اس قدر بے چینی اور جلدی کیوں ہے۔ اشاریا کے بھی ان کے ناجائز (جو ان کے خیال میں جائز تھے) تعلقات پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ جو لڑ رہی تھی جس کی جوانی برباد ہو رہی تھی جس نے اپنی زندگی برباد کر دیا تھا وہ تو بالکل مطمئن تھی مگر جوانی کا وہ لیرا، حسن کا وہ ڈاکو جو اشار پہلے کتنے غنچوں اور پھولوں کی کچی پکی پنکھریوں کو نوچ چکا تھا۔ جو اس بات پر قادر جب چاہتا اپنے بحری بیڑے کو لے کر کسی طرف نکل جاتا مگر اشاریا کی محبت کی زنجیر اسے جکڑا تھا کہ وہ اشاریا کو چھوڑ کے کیس جانے پر آمادہ نہ نظر آتا تھا۔ کوزیڈ، اشاریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر مکان میں گیا۔ پایا تمام باتوں سے واقف وہ بھی کوزیڈ کی طرح پریشان تھے۔ اسے دیکھتے ہی پایا نے سوال کیا۔

”کیا ہوا بیٹے کوزیڈ۔ کوئی کام بنا؟“

”آپ فکر نہ کیجئے۔ کام ہو جائے گا۔ کچھ پریشانی ضرور اٹھانی ہو گی۔“

کوزیڈ نے پایا کو مطمئن کرنے کے لئے کہہ دیا حالانکہ اسے خود کچھ زیادہ امید نہ چرچ کے قوانین بہت سخت ہوتے تھے۔ چرچ کی طاقت بادشاہ وقت کے برابر ہوتی لازماً پادری کے معاملہ میں بادشاہ چوں چا کرنے قطعی مجاز نہ تھا۔ اشاریا نے مارکوئیس کوزیڈ کو ہنسانے اور اس کا غم دور کرنے بہت کوشش کی مگر غنچہ دل نہ کھل سکا۔ وہ اس قدر افسردہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بس اب رو رہے۔

اشاریا کو غصہ آ گیا۔ ”تم عجیب آدمی ہو کوزیڈ مجھ سے عمر میں کتنے بڑے ہو بنے جا رہے ہو۔ میں مطمئن ہوں مجھے کوئی فکر نہیں اور تم ہو کہ پاگل ہوتے جاتے“

”اشاریا۔ تم چرچ کی طاقت کو نہیں جانتیں“ کوزیڈ نے افسردگی سے کہا۔ ”اگر شبہ ہو گیا تو ہم تم عمر بھر شادی نہ کر سکیں گے۔“

”میں تو تمہارے ساتھ عمر بھر رہنے کو تیار ہوں۔“ اشاریا نے اکڑ کے کہا۔

”ہمیں الگ تو نہیں کر سکتا۔“

”اشاریا۔ معاملے کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ مارکوئیس کوزیڈ بے بسی

”اجاب ان باتوں کو چھوڑ دو اور غور سے سنو۔ امیر البحر کینیڈی نے ایک ترکیب بتائی ہے۔“

”یہ امیر البحر کینیڈی کون ہیں۔“ اشاریا نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ارے یہ وہی امیر البحر کینیڈی ہیں جن کے بنگلہ پر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ مارکوئیس نے بتایا۔

ان کے پیچھے ہی پایا بھی آگئے۔ مارکوئیس کوزیڈ نے امیر البحر کینیڈی وہ تمام باتیں برائیں جو انہوں نے اس سلسلہ میں کہی تھیں۔ مارکوئیس چونکہ خود اس مسئلہ میں پیش قدمی کر رہا تھا اس لئے اس نے پایا کو اس طرح سمجھایا کہ وہ سلسلی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اشاریا کو کوزیڈ نے سمجھا بھگا کے راضی کر لیا۔ دوسرے دن امیر البحر کینیڈی کے بنگلہ پر ایک موسمی میٹنگ ہوئی جس میں کوزیڈ کے علاوہ اشاریا اور پایا شریک ہوئے۔

پھر اس سے اگلے دن امیر البحر کینیڈی، مارکوئیس کوزیڈ، اشاریا اور پایا ایک بحری جہاز سلسلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ جہاز مارکوئیس کوزیڈ کے بحری بیڑے کا سب سے زیادہ بزرگوار جہاز تھا۔

نہ۔ لوگ مقدس جنگ کے لئے چھاؤنیوں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جنگی اخراجات کے لئے چندہ جمع ہونے لگا۔ عورتوں نے اپنے قیمتی زیورات بیچ کے چندہ دیا۔ ہر شخص کی دولت مصلح الدین ٹیکس " لگ گیا شاعروں نے جنگی ترانے لکھے اور گانے والوں نے یہ ترانے ہاں گلیوں پھیلانے اور لوگوں کے جمع کر کے سنائے۔

پاریوں، شاعروں اور گویوں نے عوام کے دلوں کو توجہ و جذبہ سے بھر دیا لیکن اپنی اقتدار فکروں اور مصلحتوں میں الجھا رہا۔ فرانس اور انگلستان میں سفارتی گھوڑے تو تودڑے مگر فلسطین میں صلیبی جنگ کے لئے لشکر کی روانگی میں تاخیر پر تاخیر ہوتی رہی۔ اس اور انگلستان کے پرانے جھگڑے اک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے جنہیں بناتے بناتے 118ء کا پورا سال گزر گیا۔ سب سے پہلے جس یورپی حکمران کا لشکر صلیبی جنگ کے لئے فلسطین روانہ ہوا وہ جرمن کا شہنشاہ فریڈرک باربروسہ تھا مگر اس کی قسمت میں صلیبی جنگ میں شرکت کرنا نہیں تھا۔ شہنشاہ فریڈرک اپنا لشکر لے کر براست یونان آ رہا تھا کہ یہ بوڑھا شہنشاہ دریائے "سالف" پار کرتے ہوئے ڈوب کے مر گیا۔ اس کا لشکر بھی تباہی کا شکار ہو یا اور صرف دو ہزار کی قلیل تعداد اس کے بیٹے کی سرکردگی میں ساحل فلسطین تک پہنچ لی۔

سلطان صلاح الدین نے فرنگیوں کے تمام ساحلی قلعے اور علاقے ایلہ سے ہیرو تک فتح کر لئے تھے۔ ان کے درمیان صرف صور "قلعہ اور شہر" حائل تھا جہاں سے سلطان نے غل مصلحتوں کی وجہ سے محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ صور پر اٹلی سے آئے ہوئے مارکونیس کا نرڈ قبضہ تھا۔ سلطان صفد اور کوکب فتح کرنے کے بعد بیت المقدس پہنچا۔ بیت المقدس میں سلطان نے عید الاضحیٰ تک قیام کیا پھر قربانی کی رسم ادا کرنے کے بعد مکہ واپس گیا اور وہاں واپس سب کے آخر تک مقیم رہا۔

موسم بہار میں سلطان نے قلعہ شقیف کا رخ کیا۔ یہ قلعہ فرنگی حاکم صیدا ارفاط کے مات تھا۔ مشہور تھا کہ ارتباط تمام فرنگی حاکموں میں سب سے زیادہ چال باز اور مکار حاکم تھا۔ اب سلطان قلعہ شقیف کے قریب مرج العیون پہنچا تو ارتباط خود ہی سلطان کی پڑاؤ گاہ میں نافرو ہو کر سلام بجا لایا۔

سلطان نے اسے دیکھ کر دریافت کیا۔ "ارتباط تمہارے آنے کا کیا مقصد ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم تمہارے قلعہ پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ تم ہماری طلبی کے بغیر ہمارے آگے آنے کی پاداش میں قتل بھی کئے جاسکتے ہو۔"

سلطان معظم۔ میں اسی لئے تو دوبار سلطانی میں خود حاضر ہو گیا ہوں کہ آپ کو شقیف

محاصرہ حکمہ

فتح بیت المقدس کے بعد دوسرے سال سلطان صلاح الدین کو تین اہم فتوحات ما ہوئی تھیں یعنی کوکب، صفد اور الکرك۔ ان قلعوں کی فتح کی وجہ سے مصر اور عرب راستوں پر اور دریائے اردن کی وادی میں سوداگروں کے قافلے بغیر روک ٹوک کے گزرتے تھے۔ خانہ کعبہ اور روضہ رسول پر جانے والوں کو کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھنے کی جڑ نہ کر سکتا تھا لیکن فلسطین اور شام کے ساحل کی ان فتوحات کے مقابلہ میں صور پر قبضہ کے قبضہ سے سلطان کو جو نقصان پہنچا ان کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

بیت المقدس (یروشلم) کا اسقف اعظم جب بیت المقدس پر سلطان صلاح الدین کے قبضہ کی خبر لے کر یورپ پہنچا تو وہاں ہر دربار، شہر، قریبے اور بستی میں کرام کا ایک مغربی مورخ لکھتا ہے:-

"یروشلم کی چھوٹی سی سلطنت لاطینی کایا اور لاطینی ادب کی مشرقی ممالک میں اہم بیرونی چوکی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ دور اول کے ان صلیبی بہادروں کی تحقیق تھی جن کا زمانہ متعدد رزمیہ داستانوں کے موضوع بن چکے تھے۔ یہ ان پر اسرار مشرقی ممالک سرحد پر واقع تھی جہاں سیم و زر کی فراوانی تھی۔ فلسطین مغربی عیسائیت کے تخیل اعتقاد کا محرک بھی تھا اور مرکز بھی۔"

یورپ کے ہر ملک میں ایک نئی صلیبی جنگ کا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔ ٹائش (افوجدار) نے صلیبی جنگ کو اپنی مہم کا مرکز اور مدعا بنا لیا۔ روم کے پوپ اعظم نے فر جاری کیا کہ جو شخص اس مقدس جنگ میں داسے، دسے اور خفیہ شرکت کرے گا اس تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ فرانس اور برطانیہ کچھ صدیوں سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آ رہے تھے انہیں نے فوراً "صلح کر لی۔ ہر جگہ رضا کاروں کی بھرتی

جانے کی زحمت سے محفوظ رکھوں۔ جلاو کو میرے قتل کا حکم دیجئے۔ میں اپنی زندگی سے ہی۔ تنگ آ چکا ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے قتل ہوں گا تو میری روح کو سکون ملے گا کہ قتل ایک سلطان عادل کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔“

ارناتھ اگرچہ فرنگی تھا لیکن اسے عربی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ مسلمانوں تہذیب و تمدن سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان عادل رحمدل ہے اور لوگوں پر احسان کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ارناتھ گفتگو کرنے دوسرے سے وقتی بات منوانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔

”ارناتھ ہمیں خوشامد ہرگز پسند نہیں۔ صاف صاف بیان کرو تم کیا چاہتے ہو؟“ مار نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔

”اے سلطان عالی مقام“ ارناتھ نے زبان دانی کا تیر چلایا ”میں چاہتا ہوں کہ خوشامد ظالم بادشاہ خوش ہوتا ہے اور جھوٹ سے سنگدل کو موم کیا جاتا ہے مگر ایک عادل سلا اس دونوں عیبوں سے پاک ہوتا ہے۔ سلطان کو بچ پسند اس لئے میں حضور عالی میں مر بچ عرض کروں گا۔

ارناتھ سلطان کے چہرے پر اپنی زبان دانی کا تاثر دیکھنے کے لئے ذرا رکا اور اس کی مڑا دیکھا لیکن سلطان کا چہرہ ساٹھا اور اس پر کوئی تاثر نہ تھا۔

”سلطان معظم“ ارناتھ نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”صور کے حاکم مار کو نیس کو نریڈ۔ میرے بیوی بچوں کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ میرے اہل و عیال کو صرف اس صورت میں واپس کرے گا جب اسے یقین ہو جائے گا کہ میں اس کے ساتھ ا کر سلطان معظم سے جنگ کروں گا۔ میں کو نریڈ سے ایک سے زیادہ بار انکار کر چکا ہوں اس لئے نہیں کہ میں سلطان کا حلیف یا دوست ہوں بلکہ اس لئے کہ سلطان کے لشکر۔ فکرانا خود کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف ہے۔ کو نریڈ اس وقت آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے لیکن جلد یا بدیر وہ دوسرے بادشاہوں اور سرداروں کی طرح آپ کی قید میں ہو گا۔“

ارناتھ نے کچھ ایسے جذباتی انداز میں گفتگو کی کہ سلطان کو اس پر رحم آ گیا۔ انھوں نے کہا۔ ”مگر تم ہمارے پاس کیوں آئے ہو۔ ہم کیا کر سکتے ہیں تمہارے لئے؟“

”اے شاہوں کے شاہ۔“ ارناتھ نے پھر لسانی شروع کی۔ ”میں صور جانا چاہتا ہوں تاکہ کو نریڈ کے ہاتھوں سے کسی طرح اپنے بال بچوں کو بچا سکوں۔ اگر سلطان مجھے اتنا موقع عطا کریں کہ میں کو نریڈ کا اعتماد حاصل کر کے اپنے بچوں کو اس کے چنگل سے نکال سکوں۔ تو

کی بندہ پروری ہو گی میں اپنے بچوں کو صور سے نکال کے واپس آتے ہی قلعہ آپ نے حوالے کر دوں گا۔“

ارناتھ ہم محتسب کرتے ہیں کہ تم اس وقت مصیبت میں ہو۔ سلطان نے نرمی سے اور اگر تم ہمیں دھوکہ بھی دے رہے ہو تو اس سے تمہارا ہی نقصان ہو گا۔ بتاؤ اکتاقت درکار ہے؟“

صرف تین ماہ سلطان معظم۔“ ارناتھ نے جواب دیا۔ میں بچوں کو صور سے واپس لا لے آپ کے حوالہ کر دوں گا اور اپنی گزر اوقات کے لئے آپ ہی کے زیر سایہ کسی نماز گاہ آپ کی خدمات بجا لانا رہوں گا۔“

خبر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ سلطان نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ ”تم مطمئن ہو کے باؤ اور اپنے بچوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تین ماہ تک قلعہ شقیف پر کوئی حملہ گا۔“

سلطان کی اس شفقت اور مہربانی سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ سلطان کا محکمہ جاسوسی کچھ فعال نہ تھا ورنہ وہ سلطان کو یہ ضرور بتاتا کہ صور کے حکمران مار کو نیس کو نریڈ اور تین کے ارناتھ میں بڑی گہری دوستی ہے ارناتھ کے بیوی بچوں کو صور میں روکنے کا تو ہی پیدانہ ہوتا تھا۔ ارناتھ نے تو جان بوجھ کے اپنے اہل خانہ کو صور میں چھوڑ رکھا، لے اس وقت نصرائینوں کے لئے صور سے زیادہ محفوظ اور کوئی جگہ نہ تھی۔

ارناتھ اچانک صور پہنچا تو مار کو نیس کو نریڈ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا اس نے۔ ”اے حاکم الٹاکیہ کیا آپ کے قلعہ شقیف پر سلطان کا قبضہ ہو گا؟“

”نہیں۔“ ارناتھ مختصر جواب دے کر مسکرانے لگا۔

ارکو نیس اور زیادہ حیران ہوا۔ ”اس وقت آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟“

”قلعہ شقیف سے۔“ ارناتھ نے جواب دیا۔ وہ بدستور مسکراتا رہا۔

ارکو نیس چڑ گیا۔ ”آپ مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں حاکم الٹاکیہ۔ میں نے سنا ہے کہ اے قلعہ شقیف کا محاصرہ کر لیا ہے لیکن آپ شقیف ہی سے آرہے ہیں جبکہ آپ انفرادہ ہیں کہ شقیف پر سلطان کا قبضہ نہیں ہے۔ ان باتوں میں سے کوئی بات سچ میں کس پر یقین کروں؟“

اے جوانمرد مار کو نیس۔“ ارناتھ سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ میری تمام باتوں پر یقین کر سکتے ہیں درست ہے کہ سلطان اپنا لشکر لے کر شقیف پر قبضہ کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن اے شقیف سے پہلے ہی روک لیا اور اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ قلعہ شقیف پر

آئندہ تین ماہ تک حملہ نہیں کرے گا۔

آپ کی باتیں بہت اچھی ہوئی ہیں حاکم الٹاکیہ۔ "مارکوئیس نے ناگواری کے انداز میں کہا۔ "سلطان حملہ کے لئے جا رہا تھا اور آپ نے اسے روک دیا۔ مزید یہ کہ وہ آئندہ تین ماہ شقیہ پر حملہ بھی نہیں کرے گا۔ مگر کیوں۔ اس نے آپ کی بات کیوں مانی۔ کہہ نے اسے کیا گھول کے پلایا تھا؟"

"اے نصرانیوں کے محافظ۔ میں نے سلطان سے جھوٹ بولا تھا۔" ارناط نے اپنی زبان سے پردہ اٹھایا۔ "میں سلطان کے پاس غمگین صورت بنائے گیا تھا۔ میں نے اسے یہ بتایا کہ میں اس کی اطاعت پر تیار ہوں لیکن میرے بیوی بچے صور میں مارکوئیس کے پاس قید ہیں اگر میں شقیہ پر آپ کا قبضہ کرائے دیتا ہوں تو مارکوئیس میرے بیوی بچوں کو مار ڈالے گا۔ اس لئے آپ مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں صور سے کسی طرح اپنے اہل خانہ کو لے آؤں۔ پس سلطان نے مجھے تین ماہ کی مہلت دیدی۔"

"یہ تو تعجب کی بات ہے" مارکوئیس نے حیرانگی کا اظہار کیا۔ "کیا سلطان اس قدر ہوا ہے کہ اسے آپ کے فریب پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا؟"

"مارکوئیس کونزید۔ آپ جانتے ہیں کہ "جنگ اور محبت" میں ہر بات جائز ہے۔ میں عربی زبان اور ادب سے اچھی طرح واقف ہوں پھر سلطان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی رحمہل ہے۔ میں نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور سلطان کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میرے بال بچے صور میں ہیں اور ان کی جان خطرے میں ہے۔ اس طرح میں نے اس کی جذبہ ترحم کو جھنجھوڑ دیا اور وہ مجھے مہلت دینے پر آمادہ ہو گیا۔" ارناط نے غور سے گردن اگڑالی جیسے اس نے کوئی قلعہ سر کیا ہو۔

"شاباش ہے فرمانروائے الٹاکیہ۔" مارکوئیس نے اس کی تعریف کی۔ "آپ کی عقل فراست کی داد دینا چاہیے۔"

مارکوئیس خود ایک چال باز اور فریبی انسان تھا۔ اس نے بظاہر تو ارناط کی تعریف کی مگر دل میں یہ فیصلہ کیا کہ ایسے چالاک اور شاطر انسان پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسے آدمی کسی وقت بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔

"مگر تمہارے اہل خانہ ہیں کہاں؟" مارکوئیس نے اچانک پوچھا۔
"وہ بہت آرام سے ہیں۔ میں نے انھیں الٹاکیہ بھجوا دیا ہے۔" ارناط نے ہنسنے لگا۔

"تعجب ہے کہ سلطان کو تمہاری باتوں پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔" مارکوئیس نے ایک بار

ایک حیرت انگیز چالاک کی پر اظہار تعجب کیا۔

سلطان کو تعجب ہوتا بھی کیسے۔" ارناط نے ڈیک ماری۔ "میں نے سلطان کو یقین دہ میں بال بچوں کو حاصل کرنے کے بعد نہ صرف قلعہ شقیہ اس کے حوالے کر بلکہ اس کی اطاعت قبول کر کے پوری عمر اس کے قدموں میں گزار دوں گا۔"

مارکوئیس کونزید ذہنی طور پر پریشان ہو گیا۔ ارناط کی چالاک سے اسے خوف محسوس ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارناط جیسا چالاک آدمی قلعہ صور میں ٹھہرے کیونکہ کوہ کسی کی بیوفائی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپنے جذبات دہاتے ہوئے مارکوئیس نے اس نے کیا۔

بہت خوب۔ آپ تو بہت کام کے آدمی ہیں۔ فرمائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا

یہ تو آپ کو دیکھنا ہے کہ میں کس کام آ سکتا ہوں۔" چالاک ارناط نے کہا۔ "سنا ہے کہ آپ کے لشکر بیت المقدس کو آزاد کرانے میں اسلحہ پہنچ رہے ہیں۔ ان کا جذبہ قابل ہے۔ میں بھی اس جذبہ کے تحت آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے جس کام پر لے اس میں جان دے دوں گا۔"

ہانک ایک موش حینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ارناط نے لچائی نظروں سے اسے حینہ کی نظریں ارناط سے ملیں تو وہ شراب کے واپس جانے لگی۔
"تھو تھو مرینہ۔" مارکوئیس نے اسے روکا۔

مرینہ مارکوئیس کی آواز پر رکی اور واپس آکر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔
"مرینہ۔ یہ ہیں پرنس ارناط۔ الٹاکیہ کے فرمانروا۔ صلیبی جنگ میں حصہ لینے شقیہ طرف لائے ہیں۔" مارکوئیس نے تعارف کرایا۔

ب مرینہ نے ارناط کو ذرا دلچسپی سے دیکھا۔ ارناط نے اس بات کا انتظار کیا کہ مارکوئیس اس کا تعارف بھی کرائے مگر مارکوئیس نے شاید اس سے گریز کیا۔ ارناط براہ ہو سکا۔ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔

سے فرمانروائے صور۔ آپ نے میرے متعلق تو مرینہ کو سب کچھ بتا دیا مگر ان کے میں کچھ نہیں فرمایا؟"

مارکوئیس کونزید نے ارناط کو تیز نظروں سے دیکھا۔
"یہ میری مسمان ہیں۔ قسطنطنیہ سے صلیبی جنگ میں حصہ لینے میرے ساتھ آئی ہیں۔
"مرینہ۔ آپ کے جذبہ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے" ارناط نے براہ

مگر رفتار ہوا تھا کہ شادی کر کے ہی دم لیا۔ ان کی شادی کو دو ماہ تو اس طرح گزر گئے کہ دنت کا پتہ ہی نہیں چلا لیکن جب مارکوئیس نے اشاریا کے گھر سے نکل کے کچھ دوازارا دیکھا اور اپنے نام کی وجہ سے اسے اعلیٰ سوسائٹی میں بذریعہ ملی تو اس کے خیالات بدلا شروع ہوئے۔

ادھر اشاریا کو سب سے پہلے کونزید سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ اس نے اسے گھر میں چھوڑ کے باہر جانا شروع کر دیا۔ اشاریا کو دراصل یہ معلوم ہی نہ تھا کہ مرد گھر میں بیٹے کے بجائے باہر کا انسان ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھا جو اسے بے انتہا چاہتے تھے۔ انہیں نے اشاریا کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کی تھی ملازمت وہ نہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ تمام عمر ریمینڈ ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ بھی دن بھر گھر میں گھسے رہنے اور اشاریا کی نازبرداری کرتے رہتے۔ دوسرا مرد اشاریا کی زندگی میں مارکوئیس کونزید تھا جس نے اشار کو سر پر بٹھالیا تھا یہاں تک کہ اشاریا اپنے پیلا سے کہیں زیادہ مارکوئیس کونزید کو چاہنے لگے تھی۔

مارکوئیس کے رویہ میں اس تبدیلی پر اشاریا نے پہلے تو چار چھ دن منہ پھلایا۔ اس کا خیال تھا کہ کونزید حسب معمول اس کی خوشامد کر کے منالے گا مگر جب مارکوئیس نے یہ پروا ہی نہ کی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ایک دن وہ شیرینی کی طرح ہزار مارکوئیس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مارکوئیس کو تو شرم میں اور بہت سے سارے مل گئے تھے اور اس نے اب راتیں باہر گزارنا بھی شروع کر دی تھیں۔ اس لئے اس نے اشاریا کی ترکی یہ ترکی جواب دیا اور اس کے دوچار تھپڑ بھی جھٹائیے۔

اس طرح بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ مارکوئیس نے اشاریا کے گھر رہنا بھی چھوڑ دیا۔ اب اشاریا کی آنکھیں کھلیں اس نے مارکوئیس کی خوشامد شروع کر دی مگر مارکوئیس کونزید کی اس کی کوئی پروا نہ تھی پھر اس سے اگلے ماہ مارکوئیس کونزید اپنا بحری بیڑا لے کر کئی معلوم سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے چلتے وقت اشاریا سے ملنے کی بھی کوشش نہ کی اور نہ ہی کبھی روانگی کے بعد اشاریا کو اطلاع ہی بھیجی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

سلطان کو صور کے بارے میں برابر اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ فلسطین اور شام کے تمام بھگوڑے نصرانی بادشاہ، امیر، نائش اور لشکری اکٹھا ہو رہے ہیں بلکہ یورپ کے ملکوں سے بھی لوگ صور آ رہے ہیں۔ صور میں نصرانیوں کی اجتماع کا یہ مقصد بیان کیا گیا کہ "بیت المقدس کو مسلمانوں سے دوبارہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ انھار کیہ کا پرنس ارناط سلطان

تین ماہ کی مہلت لے کر صور گیا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کو حاکم صور مارکوئیس کونزید آزاد کرا کے دوسری جگہ پہنچا دے۔

آخر ٹھیک تین ماہ بعد پرنس ارناط سلطان کے پاس واپس آیا۔ اس کا چہرہ اترا تھا اور ان نظر آتا تھا۔ سلطان نے اسے فکر مند دیکھ کے نرمی سے دریافت کیا۔

"کیا ہوا تمہیں۔ بیوی بچوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا کیا؟"

ارناط نے روپائی آواز میں جواب دیا۔ "سلطان معظم۔ حاکم صور مارکوئیس کونزید۔ بد معاش اور کمینہ آدمی ہے تین ماہ تک میں اس کی خوشامد کرتا رہا مگر وہ اپنے کمینہ پن باز نہ آیا اور یہی کہتا رہا کہ ارناط تو سلطان کا آدمی ہے اس لئے تجھ پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور نہ تیرے اہل و عیال تجھے مل سکتے ہیں۔"

سلطان کا دماغ پہلے ہی پرنس ارناط کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ میں اس وقت فتح بیت المقدس کے موقع پر آزاد کئے ہوئے تمام بادشاہ اور امیر و اراکھا ہو گئے ہیں اور اب وہ سلطان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر یروشلم کو واپس کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ پرنس ارناط میں ان لوگوں کا دوست ہے اور سلطان کو اہل و کافر قبیلے دے کر صور گیا ہے تاکہ مارکوئیس کونزید سے اسلامی لشکر کی جاسوسی کرے۔ سلطان صلاح الدین نے قدرے تلخ لہجہ اختیار کیا۔

آخر صور والوں نے تمہارے بیوی بچوں کو کیوں روک رکھا ہے۔ انہیں اس سے کیا مل ہو گا؟

ارناط نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔ "سلطان معظم۔ مارکوئیس کونزید کے خیال میں شمالی علاقوں کا ایک پائزہ شہزادہ ہوں اور اگر میں چاہوں تو سلطان لشکر کو ایک طویل تک شمال میں الجھا کے رکھ سکتا ہوں۔ اس لئے وہ میرا تعاون چاہتا ہے۔ مگر میں نے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں۔ تم نے انکار کیوں کر دیا۔؟" سلطان کا لہجہ کچھ اور سخت ہو گیا۔

"اس لئے عالیجاہ کہ میں آپ کی وفاداری کا حلف اٹھا چکا ہوں۔ اب میں ان لوگوں کس طرح تعاون کر سکتا ہوں۔؟"

پرنس ارناط نے ایک بار پھر اپنی چرب زبانی کا جادہ چلانے کی جوشش کی۔ اسے عربی ناو ادب پر کافی عبور حاصل تھا اس لئے وہ گفتگو کے دوران عربی زبان کے بعض درے بے تکلف استعمال کر رہا تھا۔

سلطان نے دیکھا کہ ارناط گول مول باتیں کر رہا ہے تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

نامانہ ہو گیا تھا۔

سارنات اب بھی خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

”سلطان معظم نے پہلے بھی میرے اوپر رحم فرمایا ہے اور اب بھی مجھے سلطان سے ر
کی امید ہے عالیجاہ۔ مجھے مزید تین ماہ کی مہلت عطا فرمائیں تو میں اس عرصہ میں مارکوئی
ضرور رضامند کر لوں گا۔“

علاء- سلطان معظم۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔" ارناط نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

مظلم اگر قلعہ شقیں پر آپ کا قبضہ ہو گیا تو مار کونیں کونڈی میں
چڑھا دے گا۔“

ارتباط خوش ہو گیا۔ اس نے بڑی سگری چال چلی تھی۔ وہ سلطان ہے مہلت مانگے
تھا کہ اگر سلطان اس کی مظلومی سے فریب کھا گیا تو مہلت کو اس عرصہ میں وہ صور میں
ہونے والوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ صور سے باہر نکلے
سلطان پر حملہ کریں اس طرح شاید نصرانی کامیاب ہو جائیں اور ارتباط کا قلعہ
رہے۔ مگر صور میں اسے مارکوئیس کوئیڈ نے گھاس نہیں ڈالی اور اس نے ارتباط کو ایک
خونفک آدمی سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ارتباط نے بھر بھی ہمت نہ ہارا
اور صور میں بیٹھا توڑ جوڑ کرتا رہا پھر مدت ختم ہوتے ہی سلطان کو پھر فریب دینے آ گیا۔
”سلطان نے مزید مہلت پر آمادگی کا اشارہ کیا تو فوراً“ بولا۔

”سلطان نے مزید مہلت پر آمادگی کا اشارہ کیا تو فوراً“ بولا۔

”عالیجاہ۔ آپ آقا ہیں اور میں آپ کا غلام۔ آقا، غلام کو حکم دیا کرتے ہیں کوئی ٹر نہیں لگاتے۔ آپ میری مہلت کی مدت میں مزید اضافہ فرما رہے ہیں آپ حکم دیجئے۔ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنا تابعدار پائیں گے؟“

”ٹھیک ہے پرنس ارناؤ۔“ سلطان نے بالکل واضح الفاظ میں کہا۔ ”تم اپنے حاکم قلعہ دار - تینت کے نام ایک خط لکھو کہ وہ قلعہ کا قبضہ ہمیں ویدے۔ ہم تمہیں تین ماہ کی الامت دے دے۔“

سلطان کی شرط سن کر پرنس ارنلٹ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان جو شرط لگائے گا وہ اسے فوراً تسلیم کر لے گا اور اس سے مزید مہلت حاصل کر کے ہجرہ چلا جائے گا لیکن یہاں تو کیا پلٹ سکے رہ گئی تھی۔ سلطان نے جو شرط لگائی تھی اس سے تو وہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اقرار۔ انکار اور اقرار تو الگ رہا وہ تو اس قابل بھی نہ رہا تھا اپنی زبان بھی کھول سکے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کے سامنے خاموش رہتا بھی ناممکن تھا۔

”بولو ارنلٹ۔ کیا جواب ہے تمہارا؟“ سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے اور بل

بچے مورچوں سے آگے بڑھ آئے ہیں اور ان کا تعلق سلطان کے اصل لشکر سے نہیں

اس خبر کے ملتے ہی نصرائیوں نے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر مسلمانوں پر طوفانی حملہ کیا۔ مسلمانوں نے پوری قوت سے اس حملہ کو روکا۔ ان کا خیال تھا کہ سلطانی لشکر کسی ن ان کی مدد کو آجائے گا لیکن جب انھیں کسی طرف سے کمک نہ پہنچی تو انھوں نے گھبرنے والے نصرائیوں کا حلقہ توڑ کر نکل جاتے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور بجائے ہتھیار ڈالنے کے یہ تمام مجاہد اسلام کی آن پر قربان ہو گئے۔

سلطان نے اس شکست کا بدلہ فوراً ہی لے لیا۔ وہ لشکر کا ایک حصہ لے کر شمال کی طرف چلا اور اس نے پلٹ کے شمال ہی کی طرف سے ان نصرائی افواج پر شاہین کی طرح مارا جو اپنی فتح کا جشن منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے فوجی دستوں کو دیکھا تو فوراً "مصفیٰ ترتیب دے لیں۔ انھیں اپنی پہلی فتح کا زعم تھا لے وہ بگل بجا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے شیر اسلام اور مجاہد اعظم سلطان صلاح ایوبی اور اس کے دستوں نے نصرائیوں کو کٹ کے رکھ دیا اور میدان جنگ نصرائیوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔

ہال سے سلطان مکہ کی طرف روانہ ہوا کیونکہ اسے برابر خبریں مل رہی تھیں یورپ نے والے جنگجو۔ صور میں اکٹھا ہو رہے تھے اور صور والے اس لشکر سے مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ پر یوحنا کا لارڈ شپ (بطریق اعظم) اپنے ساتھ اسرائیل کے شکست خوردہ نصرائیوں کا کثیر تعداد کے ساتھ یورپ روانہ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کے لیے سیاہ لباس زیب تن کیا تھا۔ یورپ پہنچ کے بطریق اعظم اور اس کے چیلے یورپ ملکوں میں پھیل گئے اور وہاں انھوں نے یوحنا (بیت المقدس) کی تباہی اور بربادی کی قصے بیان کر کے عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے شروع کر دیئے۔

ان طرح پورے یورپ اور جزائر برطانیہ تک میں مسلمانوں اور سلطان صلاح الدین افواج کو غاصبانہ، ظالمانہ اور تشددانہ انداز میں اس طرح پیش کیا گیا کہ پورا یورپ مقدس کی واپسی کے لئے سر سے کفن باندھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ خواتین نے صلیبی ماحصہ لینے کے لئے اپنے مذہبی جوش و خروش کا اس طرح اظہار کیا کہ انھوں نے بارات بچ کے اس کی رقم "صلاح الدین فنڈ" میں جمع کرا دی۔ صلاح الدین فنڈ رقم نے رقم اکٹھا کرنے اور سلطان صلاح الدین کی عظمت گھٹانے کے لئے قائم کیا

سلطان صلاح الدین ایوبی کو معلوم ہو گیا تھا کہ یورپ سے برابر نصرائی صور میں آج جمع ہو رہے ہیں اور شاہ یروشلیم جسے سلطان نے اس کی ملکہ سبل کی آہ و زاری پر آنکار دیا تھا وہ بھی صور میں پہنچ گیا ہے اور انھیں برابر بیرون ملک سے فوجی مدد پہنچ رہی ہے۔ سلطان نے پہلے ارادہ کیا کہ وہ قلعہ صور پہنچ کر ایک بار پھر اس کا سختی سے محاصرہ کر لیکن قلعہ شقیث بھی ایک بہت اہم قلعہ تھا اس لئے وہ اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا چنانچہ سلطان کو معلوم ہو چکا تھا لیکن ارتباط کے آنے پر اس نے بڑے تحمل کا ثبوت دیا پہلے اس کی فریب کاری کی باتیں سنیں پھر اسے اچھی طرح پہنکارا۔

پرنس ارتباط ادھر ادھر کے حیلے بہانے کرتا رہا اور کسی طرح قلعہ شقیث سلطان حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سلطان نے اسے قید کرا کے دمشق بھجوا دیا۔ اب سلطان لشکر لے کر قلعہ شقیث کی طرف چلا۔ اسی دوران اس نے کچھ لشکر شمال کی جانب رکھ دیا۔ اس لئے کہ اسے اطلاع ملی تھی کہ صور کا نصرائی لشکر قلعہ سے نکل کر صیدا کی طرف بڑھا ہے۔ چنانچہ سلطان کے پیچھے ہوئے لشکر سے نصرائیوں کا سامنا ہوا۔ مسلمانوں نے شدید لڑائی کے بعد نصرائیوں کو صور کی طرف مار بھگایا۔ اس جنگ میں نصرائیوں کے سے شہسوار (نائب) مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے لیکن سلطان کا ایک آزاد کردہ (خوالی) جو شہسواروں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا وہ نصرائیوں کا مقابلہ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔ سلطان کو اس جنگ کی اطلاع ملی تو فوراً اس طرف روانہ ہوا۔ سلطان کو اپنے غلام کی شہادت ملی تو اسے بہت افسوس ہوا۔ سلطان نے وہاں ایک ہفتہ سے زیادہ قیام کیا۔ دن ایسا ہوا کہ سلطان گھوڑے پر سوار ہو کے دشمن کے مورچوں کو دیکھنے کے چلا۔ اس کی فوج دور دور تک پھیلی اور مورچے بنائے پڑی ہوئی تھیں۔ بعض مورچے فوجوں کی نظر سلطان پر پڑی تو وہ سمجھے کہ سلطان حملہ کے لئے آگے بڑھ رہا ہے اس بھی مورچے چھوڑ کے آگے بڑھنے لگے۔ سلطان کو جب اس غلط فہمی کی اطلاع ملی فوراً واپس آیا اور ان مورچے بند فوجوں کی طرف سوار روانہ کئے جو مورچے چھوڑ آگے بڑھ گئے تھے۔

قبل اس کے کہ سلطانی سوار آگے بڑھنے والوں تک سلطان کا حکم لے کر پہنچا سامنا نصرائیوں سے ہو گیا تھا اور ان میں شدید جنگ شروع ہو گئی تھی۔ نصرائی سلطان نے لشکر آتے دیکھا تو پہلے وہ پریشان ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلطان کے دستے ہیں اور اس کے پیچھے سلطان کا اصل لشکر ہو گا مگر جلد ہی ان کی یہ غلط فہمی سمجھ گئی۔ ان کے جاسوسوں نے واپس جا کر بتایا کہ اسلامی فوج کے یہ دستے کسی غلط فہمی

تھا۔ اس فنڈ میں اس قدر رقم اکٹھا ہو گئی جس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

سلطان کے خلاف پروپیگنڈے میں اس وقت اور زیادہ تیزی آگئی جب یروشلم بطریق اعظم کو ”روم“ کے گرانڈ فادر کی آشریاد حاصل ہو گئی۔ روم کا گرانڈ فادر نے پروپیگنڈے کو ”روم“ کے گرانڈ فادر کے لیے تاج بادشاہ تھا۔ اس کا حکم عیسائیوں کے لیے اس کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ پوپ نے اعلان کیا کہ جو یروشلم کی جنگ میں کسی طور بھی لے گا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اگر وہ جنگ میں کام آیا تو وہ شہر کے درجہ پر فائز ہو گا۔ رومی پوپ یعنی پاپائے اعظم نے اس صلیبی جنگ کو یروشلم کے فرد کے لیے فرض قرار دیا اور فرمان جاری کیا کہ وہ لوگ جو اس مذہبی جنگ میں حصہ کے لیے بوجہ بیماری یا کسی اور سبب یروشلم نہیں جاسکتے وہ اپنے خرچ پر کسی دوسرے آ کو جنگ میں بھیج کر اس کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح یروشلم کے تمام ملکوں نے کر فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی وغیرہ سے سلیبوں کا ایک سیلاب تھا جو ساحل قد کی طرف رواں دواں تھا۔ یروشلم سے آنے والے یہ نصرانی لشکری بھوکے پیاسے نہ تھے ان کے کھانے پینے کا معقول انتظام کیا گیا تھا اور ان کے ساتھ سامان رسد بھی بھجوا دیا تھا۔

صرف ایک سال پہلے یعنی جولائی سنہ 1188ء میں شاہ یروشلم اور اس کے ساتھیوں کو طرطوسہ کے مقام پر سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ وہ تمام امراء اور نصرانی سردار تھے جو معرکہ حنین میں شکست کھا کر مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئے تھے۔ ان سب کی بیگمات نے یروشلم میں سلطان کے حضور پیش ہو کے اپنے واپس کی رہائی کی درخواست کی تھی اور رحمت سلطان صلاح الدین نے ان آہ و بکا کر کے خواتین سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کے لواحقین گرفتار ہو کے قید میں ہیں تو انھیں رہا جائے گا۔ چنانچہ سلطان نے طرطوسہ میں اپنا وہ وعدہ پورا کیا۔ جب ان نصرانی گرفتاروں نے سلطان کے سامنے ہتھیار نہ اٹھانے کی قسم کھائی تو انھیں باعزت طریقہ سے رہا کیا گیا۔

اس طرح مارکو نیس آف مانٹ فیراٹ کو اس کے بیٹے کے پاس صور میں بھیج دیا۔ صفری آف ٹورون اپنی والدہ یعنی رجبینڈ کی بیوی کے پاس چلا گیا۔ گائی شاہ یروشلم اس کا بھائی ماسٹر آف دی شپل، ملکہ سل سے آئے۔ ان سب لوگوں نے سلطان کے خلاف تلوار نہ اٹھانے کی قسم کھائی تھی لیکن رہائی پاتے ہی طرابلس اور اللطاکہ کی طرف کا بدلہ لینے کی تدبیروں میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں نے سلطان سے جو قول دیا

ان کہتے تھے فلسطین کے موجودہ بطریق نے انھیں اس سے بری الذمہ قرار دیدیا اور نے سلطان کی نیک نیتی اور فیاضی کا اپنی شرافت یعنی خباثت کے مطابق بدلہ دینے نہ لگائی۔ یہ سب لوگ ملکہ یروشلم سبل اور شاہ یروشلم سگائی لو سگناں کے تھے جمع ہوئے اور صور کی طرف پیش قدمی شروع کی۔

لم صور مارکو نیس کو فریڈ کو ان شکست خوردہ لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے دروازے ان پر بند کر دیئے۔ مارکو نیس کا یہ اقدام اس لئے درست تھا کہ یہی ان جان بچانے کے لئے صور کو خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ اس وقت مارکو نیس نصرانیوں کے لئے فرشتہ بن کے معہ اپنے بحری بیڑے کے ساحل صور پر پہنچا تھا اور انھیں کی حکمت عملی کی وجہ سے آج صور نصرانیوں کے قبضہ میں تھا۔ ان لوگوں کو در میں داخلہ نہ ملا تو یہ بد عمد فوجی بھگوڑے جن کے اقتدار کو مارکو نیس کو فریڈ نے نے سے انکار کر دیا تھا، پہلے صور کے قلعہ کے باہر خیمہ زن ہوئے پھر جب آہستہ ل کئی ہزار شکست خوردہ ناکث بھی اکٹھا ہو گئے اور ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ کر روم کے کنارے کنارے مکہ کی طرف اس طرح گامزن ہوئے کہ ان کے مندر میں اٹلی سے آنے والا مارکو نیس کا بحری بیڑہ چل رہا تھا۔ یہ بحری بیڑہ شاہ اور خواست پر انھیں مکہ تک بحفاظت پہنچانے پر تیار ہوا تھا۔

احسان فراموشوں اور بد عمدوں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ مکہ کے قریب پہنچا۔ مکہ ل کا قبضہ تھا اور اس کے اور گرد مسلمانوں کی حفاظتی چوکیاں بھی تھیں۔ مغربی کے مطابق شاہ یروشلم کے ساتھ آنے والی فوج کی تعداد صرف نو سو تھی (900) اٹ کی تعداد سات سو تھی لیکن یہ تعداد کسی صورت درست نہیں معلوم ہوتی لے کہ صور سے مکہ تک مسافرت کے دوران ان کی مسلمان چوکیوں سے جھڑپیں تھیں جو دیکھ بھال اور مکہ کے بیرونی دفاعی مورچوں کا کام دیتی تھیں۔

ہلکی کے بھاگوں اس طرح چھینکا ٹوٹا کہ مکہ کے قریب پہنچتے ہی شاہ یروشلم کی مدد ورپ سے صلیبی لشکر سے بھرے ہوئے پچاس جہاز آ پہنچے۔ ان جہازوں پر رفرز لینڈ کے سپاہی سوار تھے جن کی تعداد میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مغرب ان کی تعداد اکیس ہزار بتائی ہے۔ جبکہ ہباء الدین جو کہ سلطان کا سوانح نگار ہے نہ تیس ہزار کا ہے جس میں نائش کا تعداد دو ہزار تھی۔ اس لشکر میں مشہور آف آویز اور بشپ آف یورائس بھی شامل تھے۔ مغرب والوں نے حسب ل لشکر کی تعداد کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔

اس لشکر کی تعداد بعض مورخین نے چھ لاکھ اور بعض نے دس لاکھ لکھی ہے جتنے
 اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے۔ اس سے پہلے کسی صلیبی جنگ میں شریک
 ہوئے تھے اور اس متحدہ طاقت کا مقابلہ ایک اور صرف ایک سلطان صلاح الدین کو
 اٹھنا۔

قیصر جرمنی فریڈرک جس نے سلطان صلاح الدین کو دھمکی آمیز خط لکھا تھا، وہ صرف
 اے کوچک تک پہنچ سکا جہاں دریائے سالس کو عبور کرنے ہوئے ڈوب کے مر گیا۔ خدا
 شاید اس کا یہ انجام اس وجہ سے کیا کہ اس نے بھی فرعون کی طرح غرور کیا تھا جس
 نتیجے میں وہ بھی دریائے نیل میں ڈوب کر مرا تھا۔ قیصر کرمنگ کی فوج کا صرف ایک
 اور بعض کے مطابق صرف دو سو لشکر ارض فلسطین پہنچ سکے۔ باقی یا تو واپس چلے
 یا راستے کے مصائب کا شکار ہو گئے۔ آسٹروی، اطالوی، برطانوی، فرانسیسی، اور جرمن
 یہ کہ یورپ کے ہر ملک اور ہر خطہ کے صلیبی ارض فلسطین کی رواں دواں تھے۔

اس دوران سلطان قلعہ شقیث کے محاصرے میں مصروف رہا۔ اس نے پرنس ارنلڈ کو
 ماہ کی مہلت دی تھی کہ اس مہلت کے دوران ہی سلطان کو معلوم ہو گیا تھا کہ پرنس
 نے اس کی رحمتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ مہلت حاصل کی ہے اور پرنس اس
 میں حاکم صور سے اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔ سلطان اگر چاہتا تو معاہدہ کی
 - درزی کر سکتا تھا لیکن اس نے اس بد عہدی کا داغ دامن پر نہیں لیا اور معاہدہ کے
 ے تین ماہ شقیث پر حملہ نہیں کیا۔ پھر جب ارنلڈ نے مدت ختم ہوئے پر واپس آ کر
 ن نے مزید مہلت حاصل کرنا چاہی تو بھی سلطان نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ قلعہ
 ن پر بغیر جنگ کے قبضہ کرا دے تو اسے معاف کر دیا جائے گا لیکن ارنلڈ نے قبضہ
 نے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر سلطان نے مجبور ہو کر اسے قید کر کے دمشق بھیج دیا۔

شقیث پر آئندہ تین ماہ بعد مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغرب والوں نے سلطان کے اس
 ا کو نافرمانی پر مجبور کیا ہے۔ قلعہ صور کے محاصرہ سے دستک ہونے پر بھی مغرب والوں
 سلطان کو کم فہم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلطان کے بعض امرا اور خود سلطان کا
 انگار براء الدین بھی قلعہ صور سے محاصرہ اٹھانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ دراصل
 زامات سلطان کو محض بدنام کرنے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ صور سے
 ہوا اٹھانے نے شکست خوردہ نصرانی سرداروں، ٹائٹس، پمپلز اور بادشاہوں کو موقع دیا کہ
 نبھل سکیں اور اپنی طاقت کو مضبوط کر سکیں لیکن سلطان کے معترنین یہ اندازہ نہیں
 لے تھے کہ سلطان صلاح الدین کو کچھ ہی عرصہ بعد پورے دول یورپ کے شاہوں اور

ملکوں میں اپنی جواں سال بیٹی کو لئے لئے گھومتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر ہوتی
 جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو ان پر حملہ
 دکھایا گیا تھا۔

آخر یہ آگ بھڑک اٹھی۔ نصرانی بادشاہ جرمنی فریڈرک کو سلطان پر اس قدر
 کہ اس نادان نے سلطان کو ایک خط لکھ مارا جس میں تحریر کیا۔

”میں شاہ فریڈرک فرمانروائے جرمنی، صلاح الدین (یورپ والے سلطان کو مرنے،
 دین کے نام سے پکارتے تھے) کو مطلع کرتا ہوں کہ اگر یرودن عیسائیوں کے حوالے
 کیا گیا تو میں اپنے لشکر کے ساتھ اسے سزا دینے کے لئے پہنچ جاؤں گا۔“

سلطان نے شاہ جرمنی کے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا لیکن یورپ میں ایک خوفناک
 کی تیاریاں زور شور سے شروع تھیں۔ اس میں ہر عیسائی نے حصہ لیا۔ یہاں تک
 عورتیں تک سپاہی بن گئیں۔ پس قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اول اور
 آف آسٹریا۔ اپنی فوجوں اور صلیبی رضاکاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی گواہی
 لئے روانہ ہوئے یہ تیاری تھی تیسری صلیبی جنگ کی۔

اس جنگ کی اس زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس کے مصارف کے
 انگلستان اور فرانس میں ”عشر صلاح الدین“ یعنی صلاح الدین ٹیکس لگا دیا گیا۔ پادروں
 فوجی ویدیا کہ جو محض اس کار خیر میں حصہ نہیں لے گا وہ سمیت سے خارج ہو جائے
 مشہور مورخ گین نے لکھا ہے:-

صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا خراج جو اس ٹیکس کی
 شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاجدار کو نصیب نہیں ہو سکا۔ رچرڈ نے
 مصارف جنگ کے لئے اپنی جاگیر بیچ دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو
 نیلام کیا۔ رچرڈ کہتا تھا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک پہنچنے کو تیار
 ہوں۔

جو لوگ خود کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے انھوں نے اپنے خرچ پر اپنی جانب سے
 بھیجے۔ عورتوں نے اپنی اکوتی اولادوں کو نذر کر دیا۔ بہر حال دو سال کی زبردست تیار
 بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مورخوں نے اس لشکر کی شان میں یوں تعریف فرمائی
 ہے:-

یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی۔ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو
 خاشاک کی طرح ہما دینے کے لئے اٹھ آیا تھا۔

آگئے ہیں۔ بہر حال یہ تو ایک پرانی بات تھی۔ اب سلا اس جنگ کا جو ہمیں درپیش تھا اس سلسلے میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے آپ لوگ بغیر جھجک کے ظاہر کر دیں۔“

سب سے پہلے تقی الدین بولا۔ ”عالیجاہ۔ تقی الدین سلطان کے ہر حکم کی تعمیل اپنا سہما ہے۔ اس لئے میں سلطان کو مشورہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

تقی الدین کے بعد مظفر الدین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مظفر الدین، رہا اور ان سے لشکر لے کر آیا تھا۔ ”عالی مقام سلطان۔ میں نے سنا ہے کہ یورپ سے آنے والے نصرانی لشکروں کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں انہیں سے ڈرتا ہوں بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اتنے بڑے لشکر سے لڑنے میں کم کم مجھے ضرور لطف آنے گا۔“

سلطان نے اپنے سرداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تاج دمشق کے جاں نثار نصرانی لشکر کی تعداد خواہ کتنی کثیر کیوں نہ ہو تمہیں اپنے بہادریوں پر فخر ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن جاں بازوں نے بیت المقدس سے نصرانیوں کو بے دخل کیا ہے وہ ان کو اس ارض پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گے، جو نبیوں اور پیغمبروں کی سرزمین کلماتی ہے۔ ہم انشاء اللہ نصرانیوں کو ایک بار پھر اسی طرح شکست دیں گے جس طرح انہیں معرکہ حنین میں شکست سے دو چار کیا تھا۔“

آئین۔ ثم آئین کی صدا تیں بلند ہوئیں۔

سلطان نے ذرا رک کے کہا۔ ”اس وقت مسئلہ یہ درپیش ہے کہ نصرانی لشکر صور سے کی طرف کوچ کرنے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بہتر ہو گا کہ ہم لشکر کثیر کو عکہ کا موقع فراہم کر دیں پہلی جنگ ہی آخری جنگ ہو۔؟“

سلطان کے بھائی ملک العادل نے سر کو ذرا خم کر کے جواب دیا۔ ”عالیجاہ۔ ہم اردن کی جانب آپ پر تخت دمشق پر تیار۔ ہم لوگ اپنے آپ کو ایسے اہم معاملات الجھانا نہیں چاہتے۔ ہمیں تو صرف آپ کا حکم چاہیے۔“

ملک العادل جو سلطانی لشکر کا سپہ سالار بھی تھا اس نے جو صلاح مشورے سے واپس تو مظفر الدین کو کبریٰ کو موقع مل گیا۔ اتنے فوراً کہا۔

”سلطان معظم۔ سپہ سالار ملک العادل نے سچ کہا کہ ہم لوگ صرف حکم کے بندے جنگی حکمت عملی تو ہمیشہ سلطان نے ترتیب دینی اور اس پر عمل کر کے ہم نے معرکہ ناکر کے بیت المقدس کا راستہ کھولا تھا۔ اس وقت حکمت عملی آپ ترتیب دیں گے

شہنشاہ کے مشترکہ لشکر کے سامنے سینہ سپر ہونا ہے جو بیت المقدس کو مسلمانوں سے واپس لینے کے لئے ارض فلسطین کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ سلطان کو دس لاکھ نصرانیوں کے لشکر کے لشکر کا مقابلہ کرنا ہو گا لیکن سلطان صلاح الدین کی دور بین نظروں نے آنے والے وقتوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے ایک طرف تو سلطان رضا کار لشکر کو اور دوسری طرف سلطانی افواج کو کچھ عرصہ آرام دے کر انہیں ایک خوفناک وقت کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ قلعہ تثلیث کے محاصرہ میں اپنی فوج کو الجھا کر ان میں بے دلی اور کالی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔

قلعہ صور کے باہر یورپ سے آنے والے صلیبی جنگجو اکٹھا ہو رہے تھے۔ ارض شام اور ارض فلسطین کے تمام بھگوڑے اور شکست کا داغ اٹھائے نصرانی لشکری اور بادشاہ بھی قلعہ صور کے باہر اکٹھے ہو چکے تھے۔ سلطان نے بھی تمام مسلمان علاقوں سے اسلامی لشکر کو از سر نو طلب کر لیا تھا۔ سلطان کے جانوروں کے اطلاع دی تھی کہ یورپ کے نصرانیوں کا یہ کاہ یہ سیلاب عکہ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

”عالیجاہ۔۔۔“ ایک جابوس نے دست بستہ عرض کیا۔ ”نصرانی لشکر میں اس وقت شاہ فرانس، شاہ اطالیہ، شاہ آسٹریا، قیصر جرمنی اور شاہ انگلستان بذات خود موجود ہیں۔ ٹائٹس اور ہاپٹلز کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے کہ ان کی ایک الگ فوج تیار کی جا سکتی ہے۔ یورپ سے آنے والوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں صلیبی روزانہ صور پہنچ رہے ہیں۔۔۔“

سلطان کے پاس اس وقت اسلامی لشکر کے تقریباً تین درجن سردار موجود تھے۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ تمام سرداروں کے سامنے اس گفتگو کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے پیچھے تقی الدین اور موصل، دیار بکر، سنجا، الجزیرہ کے سرداروں کو روک کے باقی سرداروں کو رخصت کر دیا۔

”میرے جانباز اور جاں نثار۔۔۔“ عام سرداروں کے جانے کے بعد سلطان نے اپنے ان خاص سرداروں کو مخاطب کیا۔ ”تم لوگوں کو یاد ہو گا کہ قلعہ صور سے محاصرہ اٹھانے کے وقت ہمارے سرداروں میں کچھ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ جہا تک سلطانی لشکر کے سرداروں کا سوال تھا تو انہوں نے تو اپنی جانبیں تخت دمشق کے لئے وقف کر دی ہیں لیکن رضا کاروں کی کیفیت ان سے مختلف ہے چونکہ انہیں اپنا گھر بار چھوڑے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لئے انہیں کچھ دن کے لئے انہیں گھر بھیجنا ضروری تھا اور میں نے صور کا محاصرہ ختم کر کے ان کو رخصت دیدی۔ اس رخصت کا یہ نتیجہ ہے کہ آج وہ تمام لشکر خوشی خوشی

نہج تھا جہاں کھیاں مہنہنایا کرتی تھیں۔ پھر اسی جگہ ایک برج تعمیر ہوا اور اس نے برج یعنی ”کھیموں کا برج“ کا نام پایا۔ شہر کی فسیل سے مکہ کا بڑا میدان دکھائی پڑتا تھا۔ میل لبا یہ میدان شمالاً ”جنوباً“ پھیلا ہوا تھا۔ دریائے ییلے کی دو بڑی شاخیں، پھر ان کی بے شمار شاخیں اس میدان کو سیراب کرتی ہیں۔ جنوب میں دریائے کشن بہتا ہوا کے قریب سمندر میں گرتا ہے۔ مندر کے اندر پانچ میل کے فاصلہ پر چنی چنی پہاڑیاں جو مورچوں کا کام دیتی ہیں۔ پھر دو میل پیچھے کی طرف کوہ نسیان کا سلسلہ تھا جو میدان شرقی سرحد پر واقع تھا جو موسم سرما میں لیویا سے محفوظ رکھتا اور فوج کے لئے کمینگاہ عائدہ چوکی کا کام دیتا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے رجب المرجب کے باقی دن بالکل پر سکون طریقے سے رہے۔ پھر رجب شعبان کا مہینہ شروع ہوا تو سلطان نے حملہ کا حکم دیا۔ دن پھر شدید ہوتی رہی۔ ایک طرف پورا دل یورپ دوسری طرف سلطان کا اکبلا لشکر پھر بھی لشکر نے تمام دن نصرانیوں کو دبائے رکھا۔ رات ہوئی تو دونوں لشکر اپنے اپنے ٹھکانوں پہنچے ہوئے۔ سلطانی لشکر نے رات میں بھی کمر نہیں کھولی اور صف بندی میں رہا۔ صبح ہی لشکر اسلام بڑے استقلال کے ساتھ میدان جنگ میں آیا۔ دوسرے دن سلطان شیخ تقی الدین نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور نصرانیوں پانی کے آثار پیدا ہوئے۔

افرن کے ذہن میں یہ بات ہو گئی کہ قلعہ اور شہر مکہ پر دونوں لشکروں کی صرف کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ قلعہ مکہ میں صوف چار ساڑھے چار ہزار کا اسلامی فوج کے سپرد شہر اور قلعہ کی حفاظت تھی۔ قلعہ کا باہر دو طرف خشکی اور دو طرف سمندر۔ خشکی کی سمت نصرانیوں کا لشکر لاکھوں کی تعداد میں صفیں باندھے کھڑا تھا۔ ایک طرف تو سلطانی لشکر سے نبرد آزما تھا دوسری طرف قلعہ کے دروازے کے ہجوم در ہجوم جمع تھا تاکہ قلعہ کا لشکر باہر نہ نکل سکے۔ سلطان کو حسام الدین اور مانے مطلع کیا تھا کہ قلعہ میں سامان رسد بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اس اطلاع سلطان کو پریشان کر دیا تھا۔

فخری مورخین نے صلیبی جنگ کی تفصیل بیان کرنے میں ہمیشہ ابہام سے کام لیا ہے۔ ماکو اگر ذرا سی کامیابی حاصل ہوتی تو وہ خوب بڑھا چڑھا کے فتح کا ڈھنڈورا پیٹتے مگر ان کے کارناموں کو ہمیشہ دھندلا دیتے اور غلط تاویلیں پیش کر کے حقیقت کو چھپانے لگتے کرتے۔ 14-15 ستمبر کو دوسرے وقت تقی الدین نے جو سلطانی لشکر کے ہند

ہم لوگ آنکھیں بند کر کے اس پر عمل پیرا ہوں گے۔“

جس طرح نصرانیوں کا قلعہ صورت بہت مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اسی طرح مکہ کا قلعہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گڑھ تھا۔ سلطان صلاح الدین نے پیش بندی کے طور پر سردار قراقوس کو ملا کر مکہ کا دفاع اس کے سپرد کیا تھا۔ ایک پرانا سردار مشہور پہلے ہی سے مکہ میں موجود تھا۔ آخر سلطان کو اطلاع ملی کہ نصرانی لشکر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ سلطان نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے سردار خود کو اس کی حکمت عملی کے اس قدر تابع سمجھتے ہیں کہ وہ سلطان کے کسی اقدام کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے۔

صور اور مکہ کے درمیان سلطان کی بہت سی فوجی چوکیاں تھیں۔ نصرانی لشکر جس چوکی کے قریب سے گزرتا مسلم چوکی کے محافظ دستے اس پر حملہ کرتے۔ نصرانی لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے سلطانی دستے اس لشکر کو روک تو نہ سکتے تھے لیکن جس قدر جانی نقصان پہنچا سکتے تھے وہ انھوں نے پہنچایا۔ نصرانی لشکر مواصل کے ساتھ چل رہا تھا اور اسے سمندر میں اپنے محافظ بحری بیڑے کا تعاون حاصل تھا۔ یہ راستہ بہت کم چوڑا تھا شاید اسی وجہ سے سلطان نے اس لشکر پر راستے میں حملہ کرنے کے بجائے اسے مکہ جانے دیا۔

بحری راستہ غیر محفوظ تھا اور اس لئے سلطان نے خشکی کا راستہ اختیار کیا سلطان کا لشکر روانہ ہوا تو اس شان سے کہ وہ دن بھر سفر کے بعد رات کو کہیں قیام نہ کرتا بلکہ رات دن سفر کرتا ہوا صرف تین دن بعد قیاف سے مکہ پہنچ گیا۔ اس نے مکہ کے سامنے والی پہاڑیوں پر اپنا کیمپ لگایا۔ اس نے شاہ تک یروشلم گائی لو گننان، مکہ شہر کے باقائل تم صلیبیین پر اپنے خیمے لگا چکا تھا۔ سلطان چاہتا تھا کہ وہ نصرانی لشکر کے پہلو سے ٹکا کر اس سے آگے نکل جائے اور مکہ کا محاصرہ کرنے والے نصرانی لشکر کا خود بھی محاصرہ کر لے۔ اس حکمت عملی کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے مورچوں کو دریائے ییلے سے آگے بڑھا کر العیادیہ کی پہاڑیوں تک وسیع کر دیا اور زیادہ شمال میں ساحل تک پھیل گیا۔

مکہ کا شہر اور بندرگاہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ مکہ کا شہر ایک خانائے پر واقع ہے جو جنوب میں پانی کے اندر چلی گئی ہے۔ شمال اور مغرب کی سمت یہ انتہائی محفوظ ہے۔ اس کے گرد برج اور فصیلیں ہیں جو اسے خشکی کی طرف سے محفوظ کرتے ہیں۔ جنوب اور مغرب میں سمندر کی وجہ سے اس پر حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ شمال مشرق میں ایک عظیم برج ملعون تھا۔ اس کا نام ملعون اس وجہ سے پڑا کہ یہ یہود کی رشوت ستیوں کی آماجگاہ تھا۔

اسی طرح بندرگاہ کی حفاظت کے لئے برج گئیں تھا۔ مشہور تھا کہ یہاں پر ایک بہت

ہوئے راستے تک محدود تھی اس راستے کے زبردست حملوں کو سپا کر کے راستہ برقرار ہوئے تھے۔ وہ منظر بھی کیا عجب ہو گا کہ سلطان صلاح الدین فیصل شہر سے نصرائیوں کے درمیان بنے ہوئے راستے پر نظریں جمائے کھڑا ہے اور اس راستے کے آغاز پر سردار نصرائیوں کے گھوڑے پر سوار موجود ہے اور لشکر گاہ سے سامان حرب اور رسد کے بھرے آؤٹ مکہ کی طرف رواں دواں ہیں۔

ایک انگریز مورخ کہتا ہے کہ اس وقت تک صلیبی لشکر پوری طرح مکہ کی ناکہ بندی کا قائل نہ تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اپنی یہ فخت مٹانے کی کوشش کی ہے کہ سلطان نے اپنی لشکر کے درمیان اپنی طاقت کے زور پر ایک اتنا چوڑا راستہ بنا لیا تھا جس سے آؤٹ مکہ کی ناکہ بندی کے لیے سلطان کی لشکر گاہ سے مکہ سے لشکر اور قلعہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا یہ ایک ایسا قافلہ تھا جو دوپہر سے شام تک قلعہ کے محصورین کے لیے سامان پاتا رہا۔

اس راستے کے شروع میں تقی الدین کی آواز بار بار بلند ہوتی۔

”شاباش بہادرو۔ اپنا کام جاری رکھو۔“

دوسری طرف سلطان کی آواز ابھرتی۔

میرے جاں نثارو۔ تم اپنی شجاعت اور بہادری کی ایک داستان رقم کر رہے ہو جس کی ل تاریخ عالم میں موجود نہیں۔“

سلطان صلاح الدین ایک طرف تو اپنے بہادروں کو ایک ناقابل یقین کارنامہ انجام دینے انہیں شاباشی دے رہا تھا تو دوسری طرف اس کی نظریں مکہ کی دفاعی انتظامات پر تھیں۔ اہم مورچوں اور برجوں پر حسب ضرورت فوجی دستے مقرر کر رہا تھا اور سرداران کو رہنمائی دیتا جا رہا تھا کیونکہ یہ دفاعی انتظامات ایک طویل عرصہ کے لیے تھے اور ان کو خود یقین نہ تھا کہ وہ کس وقت تک مکہ سے رابطہ برقرار رکھ سکے گا۔ اندھیرا جتنی ہی سلطان نے کر دیا کے سردار حسام الدین کو طلب کیا۔

”حسام الدین۔ اگرچہ مکہ کا دفاع ایک طویل عرصہ تک کام دے سکے گا پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ تم اپنے دستوں کے ساتھ قلعہ مکہ کے دفاع میں قراقرس کا ہاتھ بٹاؤ۔“

”جو حکم عالیجاہ۔۔۔“ کر دیا کے سردار حسام الدین نے سر کو ذرا سا خم کر کے جواب دیا۔ ”میرے بہادر کرو۔ مکہ کے دفاع پر قربان ہونے پر فخر کریں گے۔“

کر دیا کے یہ جھگڑتے کئی بار آزمائش سے گزر چکے تھے اور اگر دفاع کا کام سونپا جاتا ہے اپنے مقام پر اس طرح چپک جاتے کہ دیکھنے والوں کو یہ شبہ ہوتا تو اپنے ذاتی گھر

(دایاں بازو) کی کمان کر رہا تھا۔ نعرہ بکیر بلند کر کے نصرائیوں پر ایسا طوفانی حملہ کیا کہ اسے نہ روک سکا اور کائی کی طرح سامنے سے پھٹ گیا۔ تقی الدین فوراً دشمن کی طرف میں داخل ہو گیا اور اس نے ان کے درمیان راستہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات بعد میں کہ سلطان نے تقی الدین کو حکم دیا تھا کہ آج اسے دشمن کی صفوں میں گھس کے فیصل شہر تک ضرور پہنچنا ہے۔

تقی الدین مہم کے ساتھ نصرائی صفوں میں داخل ہوا تو سلطان فوراً گھوڑا چمکا دیتے ہوئے نصرائیوں پر جا پڑا۔ سلطان قلب فوج کی کمان کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ محافظ دستے اور قلب لشکر کے ساتھ تقی الدین کے ساتھ ہی نصرائی صفوں پر حملہ آور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی فوجوں کے درمیان اسلامی لشکر گاہ سے مکہ کی فیصل شہر ایک چوڑا راستہ بن گیا۔ اب ذرا آپ چشم بقصور سے دیکھتے تو یہ منظر کس قدر حیرت معلوم ہوتا ہے۔

اس منظر کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک تیز رو پہاڑی دریا میدان میں ہے تو وہ زمین (خشکی) کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اپنے لیے ایک راستہ بنالے اور خشکی اسے راستہ بنا لیتا ہے اور خشکی اسے راستہ دینے پر مجبور ہو جاتی ہے یہی حال دن دوپہر کو صلیبی جنگ کا تھا۔ دس لاکھ کے نصرائی لشکر کے درمیان میں سلطانی لشکر بزدل شمشیر ایک اتنا چوڑا راستہ بنا لیا تھا جس سے آؤٹ مکہ کی ناکہ بندی کے بعد سلطان نے جو خود اس راستے کے درمیان کھڑا تھا، تقی الدین کو حکم دیا۔

”تقی الدین۔ لشکر گاہ میں اطلاع بھیجو کہ فوجی سامان سے لدے ہوئے آؤٹ مکہ سے راستے سے مکہ پہنچایا جائے۔“

تقی الدین نے بڑے فخر سے گردن اٹھا کر راستے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے نصرائیوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر کہا۔

”عالیجاہ۔ خادم تعمیل ارشاد کے لیے خود لشکر گاہ میں جا رہا ہے۔“

تقی الدین نے لشکر گاہ کا رخ کیا اور سلطان گھوڑے بڑھا کر فیصل شہر کے در سے گزر کر شہر میں پہنچا۔ قلعہ دار سردار قراقرس نے سلطان کو سلام پیش کیا۔

”سلطان کا مکہ میں تشریف لانا مبارک ہو۔ سلطانی لشکر کے حوصلے بلند ہیں۔“

سلطان گھوڑا چھوڑ کر فیصل شہر پر چڑھا۔ قراقرس اس کے پیچھے تھا۔ سلطان نے گھبرا کر دیکھا تو تا حد نظر نصرائی لشکر صفیں باندھے موجود تھا۔ اس وقت بھی جنگ تھی لیکن یہ جنگ سٹ کر سلطانی خیمہ گاہ سے فیصل شہر تک نصرائی فوج کے

کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ کرد قبائل اپنے مورچوں میں اپنی قبریں پہلے ہی سے کھود لیتے تھے۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے سلطان نے قلعہ مکہ میں ضروری اشیاء کا اتنا بڑا ذخیرہ کر رکھا کہ اگر محاصرہ ایک سال تک جاری رہتا تو بھی قلعہ والوں کو باہر سے کسی قسم کے سامان کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس اہم کام کی تکمیل کے بعد سلطان، تقی الدین اور راستہ بنائے والے لشکر سلطانی خیمہ گاہ کو اس طرح واپس ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں مگر معرکہ مکہ کی تاریخ میں یہ بات جلی حروف میں سرقم کر دی گئی کہ تیسری صلیبی جنگ کے دوران ایک ایسا موقع آیا کہ سلطان صلاح الدین مکہ کے مسلمان محصورین کو ملیسوں کے لاکھوں محاصرہ کر والوں کے درمیان راستہ بنا کر سامان رسد سے بھرے ہوئے اونٹ قلعہ مکہ میں پہنچا اور ملیسوں کا لشکر منہ دیکھتا رہا اس کے بنائے کچھ بھی نہ بن سکی۔

مکہ کا محاصرہ طویل کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ ملیسوں نے لاکھ سرمارہ، سینکڑوں تدمیریں کیر لیکن مکہ کے ساڑھے چار ہزار محصورین روزاؤں کی طرح جے رہے۔ مکہ کا قلعہ تو ایک طرف رہا صلیبی سورا اپنے ہزاروں حملوں کے باوجود شہر کی تفصیل تک بھی نہ پہنچ سکے مسلمانوں کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ وہ قلعہ کے دروازے کھول کے لڑتے جھڑتے اور نصرانیوں کی صفیں توڑتے ہوئے سلطانی لشکر سے آٹھتے یا سلطانی لشکر پہلے ہی کی طرف دشمنوں کی صفوں میں ایک بار پھر راستہ بنا کے قلعہ تک پہنچتا اور قلعہ والوں کو اپنی حفاظت میں قلعہ سے نکال کر اسلامی خیمہ گاہ تک لے آتا مگر نہ قلعہ والوں نے چھوڑنا پسند کیا اور نہ سلطان نے قراقرش کا کردوں کے سردار حسام الدین کو قلعہ چھوڑنے کا حکم دیا۔

محاصرہ کی مدت جتنی طویل ہوتی جا رہی تھی اسی اعتبار سے مخالف لشکروں کی دشمنی تنگ مزاجی اور نفرت میں کمی ہو رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ نصرانی اور مسلمان آپس میں دوست ہو گئے تھے کیونکہ ان دونوں قوموں، دونوں مذہبوں اور دونوں کے تمدن اور روایات میں بعداً المشرقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اذلی اور ابدی دشمن تھے۔ نصرانی (عیسائی) تثلیث پرست تھے یعنی وہ تین خداؤں کو ملا کر ایک خدا بناتے تھے۔ ان کا ایک خدا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے جنہیں نصرانی خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان کا دوسرا خدا حضرت بابا مریم علیہ السلام تھیں جن کے بطن سے حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور تیسرا خدا وہ ان دیکھا خدا تھا جو ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ کی باپ تھا۔ ان تینوں کو ملا کر ایک خدا کو تسلیم کرتے تھے۔

لیکن مسلمان صرف ایک خدا کے واحد کی پرستش کرتے ہیں جو ہو چیز کا مالک اور خالق

اس کا نہ تو کوئی باپ ہے اور نہ۔ مثلاً۔ وہی افضل و اعلیٰ ہے اور اور اسی اور اسی کے میں سب سر جھکاتے ہیں۔ اس نے دنیا کی ہر چیز پیدا کی ہے مگر اسے کسی نے پیدا کیا۔ وہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اس نے ہر زمانہ اور ہر قوم میں اپنے نبی بھیجا کہ وہ راہ حق سے بھٹکنے والوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے اس عالم فانی میں

ن مختصر تبصرے میں نصرانیوں (عیسائیوں) اور مسلمانوں کے مذہب کی موٹی موٹی باتیں کہتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مذہب ایک دوسرے سے مختلف اور مخالف عزت عیسیٰ جنہیں نصرانی خدا کا بیٹا کہتے ہیں ہم انہیں خدا کا ایک عظیم پیغمبر اور ماننے ہیں ان کی لائی ہوئی آسمانی کتاب ”انجیل“ کو مسلمان تسلیم کرتے ہیں لیکن عزت عیسیٰ کی انجیل مقدس میں ان کے مصلوب ہونے کے بعد بے شمار تبدیلیاں کی در ایک انجیل کے بجائے کئی انجیلیں بن گئیں اس لئے مسلمان اس کے مندرجان کو تسلیم کرتے۔

طرح مسلمانوں کے مذہب اسلام اور عیسائیوں کے عیسائی مذہب یا نصرانی مذہب کا بڑا فرق ہے اس لئے ان دونوں مذاہب کے پیروکاروں میں جنہیں مسلمان اور مان جاتا ہے ہمیشہ سے دشمنی اور ففاق ہے اور ان کے درمیان مذہبی جنگیں جنہیں ”جنگ“ کہا جاتا ہے ہوتی رہی ہیں، ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔

لالی لشکر کا نصرانیوں کے درمیان راستہ بنا کر قلعہ مکہ میں سامان حرب اور فوجی چلنے کا واقعہ اس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس پر مغربی ممالک کے لوگ یقین کرنے آتے نہ ہوتے تھے لیکن اس واقعہ کا بڑا تفصیلی احوال بماء الدین نے لکھا ہے جو ملا الدین کا نہ صرف سوانح نگار بلکہ ایک مستند مورخ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بماء الدین سلطان کے ساتھ نصرانیوں کے درمیان بنائے جانے والے راستے سے قلعہ تھا۔ بماء الدین نے اس کی بہت کچھ تفصیل لکھی ہے لیکن اس کا ایک جملہ معرکہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ وہ لکھتا ہے:-

”میں بھی دوسرے جانبازوں کی طرح دیوار پر چڑھا اور سب سے پہلے جو چیز میرے ہاتھ میں لگی وہ میں نے اٹھا کر دشمنوں پر کھینچ ماری۔“

الدین کی تحریروں کو مغربی مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے انہیں بماء الدین کا جملہ اپنے بیانات میں شامل کرنا پڑا۔

دشمن زیادہ عرصہ تک قریب قریب رہیں تو ان کے درمیان بھی ایک

معاندانہ قسم کی رفاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے با بعض مشاغل میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ مکہ کے محاذ پر کچھ ایسا ہوا مسلمان اور عیسائی لڑتے لڑتے رک جاتے اور اپنے بچوں جو دوسرے مذہب کے بچوں ساتھ کشتی لڑتے ہوئے دیکھنے لگتے۔ جب دو مخالف بچے ایک دوسرے سے محرم گت جاتے تو لٹکری جنگ بھول کے بچوں کی کشتی دیکھنے لگتے اور ان کی حوصلہ افزائی بالکل طرح کرتے جیسے مرغ باز، مرغوں کو لڑاتے ہوئے اپنے اپنے مرغ کا حوصلہ بڑھانے کے آوازیں لگاتے ہیں۔

دونوں طرف کے فوجی روزانہ کی جھڑپوں کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اگر لڑتے رک جاتے اور آپس میں روزمرہ کی گفتگو شروع کر دیتے یا پھر اپنے بچوں کو مرنا طرح بظلوں میں دبا کر لے آتے اور انہیں لڑا کے لطف اٹھاتے۔ اس کے باوجود ان کے کی کدورتیں ختم نہ ہوتی تھیں اور وہ اکیلے اکیلے ایک دوسرے کی گردن اتارنے سے قطعی دریغ نہ کرتے۔

اس طرح کی جھوٹی موٹی جھڑپوں میں بیس دن کے قریب گزرے اور ستمبر کا مہینہ ہو کے اکتوبر آ گیا۔ 4 اکتوبر سنہ 1189ء کو فریکس (نہرائیوں) میں حرکت پڑا ہوئی ہو ان کا لشکر ساحل سمندر سے نہر نعمین تک دو میل کی لمبائی میں مکہ کے گرد نیم دائرہ شکل میں صف در صف پھیل گیا۔ بیتہ میں یروشلم کا شاہ گائی او سکنان تھا۔ شاہ گائی شکست اور مسلمانوں کو ہاتھوں اپنی گرفتاری بھول چکا تھا اور اس سلطان کے مقابلہ پر نکلا جس نے اسے اس شرط پر رہا کیا تھا کہ وہ آئندہ سلطان کے خلاف کبھی تلوار بلند نہ کر گا۔ دراصل شاہ یروشلم کو زندگی بھیک میں ملی تھی۔ شاہ کی ملکہ سبل نہ سلطان کے پاس پیش ہو کے اپنے شوہر کی زندگی کی بھیک مانگی تھی جو سلطان نے اسے بخش دی تھی۔ مگر شاہ یروشلم بے غیرتی سے سر بلند کئے سلطان کے خلاف نہرائیوں کے مہینہ (دایاں) کو کمان کر رہا تھا۔

نہرائیوں کے لشکر کے سب سے آگے حسب معمول تیر انداز دستے تھے۔ اس کے نائش اور پیادے تھے۔ شاہ گائی کے آگے ریشمی چھتر کے سائے میں انجیل مقدس جالی جا رہی تھی۔ قلب لشکر میں مارکوئیس کوزیڈ اور لوئیس کی کمان تھی۔ دوسری اسلامی لشکر میں قلب کی کمان سلطان صلاح الدین کے ہاتھ میں تھی۔ سلطان کے با جانب اس کے دو بیٹے افضل اور ظاہر تھے۔ میسرہ برویار بکر کی افواج تھیں اور مہینہ شام کی تجربہ کار فوجیں تھیں جن کی کمان تقی الدین کے سپرد تھی۔

لطان کے بائیں جانب کرو قبائل، سنجاہ کی سپاہ اور حران کے گلبری سپاہی تھے۔ میسرہ بروہ کے زمانہ کے وہ ممالک تھے جنہوں نے مصر فتح کیا تھا۔ سلطان نے تمام اہم اور موہجوں پر تجربہ کار افواج تعینات کی تھیں لیکن قلب فوج جس میں وہ خود موجود تھا سلطان کے حفاظتی دستوں کے ساتھ الجزیرہ اور کردستان کے کم تجربہ کار دستے مقرر تھے۔

نہرائیوں اور مسلمانوں میں آج وہ پہلی عظیم جنگ ہوئی جسے تیسری صلیبی جنگ کا آغاز ایچے۔ نہرائیوں نے طلوع آفتاب کے چار گھنٹے بعد سلطانی لشکر کے مہینہ پر زبردست حملہ کیا۔ اس حصہ کی کمان سلطان کے برادر زاہد تقی الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اس وہ منصوبہ کے مطابق پسپا ہونے کا مظاہرہ کیا۔ جب تقی الدین پسپا ہوتا ہوا خیمہ گاہ چا گیا تو سلطان نے مجبوراً اس کی مدد کو قلب فوج سے کچھ دستے روانہ کئے۔ دشمن ب فوج کو کمزور دیکھ کر سوار اور پیادوں سے قلب پر زبردست حملہ کر دیا۔ سلطان نے دروں کو اندر آنے کے لئے جگہ دیدی۔ حملہ آوروں میں نائش سواروں کی کثرت اپنے زور میں مسلمانوں کو دبا تے چلے گئے۔

لطان نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور حملہ آور نائشوں اور پیادہ فوج کے گرد گھیر انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ مکہ والوں نے بھی قلعہ سے نکل کر حملہ کر دیا۔ اس حملہ آوروں کو واپس آتے یا بھاگنے کا موقع نہ مل سکا اور نہرائیوں کو شکست فاش اس لڑائی میں مارکوئیس کوزیڈ مرتے مرتے بچا۔ اگر شاہ یروشلم اس کی مدد نہ کرتا تو ہو گیا ہوتا۔ اس جنگ میں اینڈرو برو نے بھی مارا گیا۔ اس سے بڑا نقصان ماسٹر آف ماکا تھا۔ اس کا نام جیراؤ آف رائڈفرد تھا جو مکہ کے میدان میں مارا گیا۔ یہ شخص پرورد تھا اور اس کی ہوس نہرائیوں نے نہرائیوں کے درمیان بڑا تفرقہ پیدا کیا تھا۔ ہے کہ ماسٹر آف دی ٹیمپل کی ہوس کا بہت سی امرا کی بیگمات شکار ہوئی تھیں اور ان نے اپنے بہت سے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔

اب کے مورخوں نے اس جنگ کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس میں زوریں بھی زور بکتر پین کے مسلمانوں کے مقابلہ پر بڑی تھیں۔ زور بکتر میں ان کا ہوا تھا اس لئے پہچان میں نہ آیا پھر جب وہ گرفتار ہوئیں تو عقدہ کھلا کہ مردوں مائیں وہ عورتیں تھیں لیکن یہ بات مہمل اور لغو ہے اس لئے کہ مسلم مورخین بہاء الدین جو ہمیشہ سلطان کے ساتھ رہتا تھا اور ابن خلدون نے اس کا کوئی ذکر یہ اور اس قسم کے بہت سے الزامات مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے لگائے گئے

تھے۔

اس جھوٹ کا الزام تو اس طرح کھل جاتا ہے کہ نصرانی لشکر کی تعداد لاکھوں میں اور اس جنگ میں انہیں کوئی مجبوری بھی نہ تھی تو پھر انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ اس کو زیادہ بکتر پھرنے کے میدان جنگ میں بھیجتے۔ اس طرح کے اور بہت سے ریکٹ حملے والوں نے مسلمانوں کے کردار پر کئے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ ظالم اور سفاک نام سے پکارا ہے۔ انہیں بہادر کہنے کے بجائے بزدل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نصرانی مورخوں نے اس جنگ میں عیسائی مقتولین کی تعداد صرف پندرہ سو (1500) بتائی ہے جبکہ بھاء الدین جو اس جنگ کا غیبی شاہد ہے اس نے عیسائی مقتولین کا کم اندازہ چار ہزار (4000) لگایا ہے۔ مسلمان شہیدوں میں کروڑوں کا ایک لیڈر ایک امیر اور صرف ایک سو پچاس سپاہی (150) شامل تھے۔ نصرانیوں نے اس تعداد کو (150) کو پندرہ سو کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دیار بکر کے سپاہی بہ کر بھاگ تھے اس افرا تفری میں ان کا زیادہ نقصان ہوا۔

سلطان نے مکہ کی پہلی بڑی جنگ میں عظیم فتح حاصل کی تھی مگر اس کو کیا باد دشمن قوم کے مورخ مسلمان کی ہر فتح کی غلط تاویلیں پیش کر کے اسے شکست کی کوشش کرتے ہیں انہیں سلطان کی اس روز روشن کی طرح واضح فتح سے انکار کرنے جرات نہ ہوئی مگر انہوں نے حسب عادت غلط تاویلوں کا سہارا لیا ان کے بیان کے یہ سلطان نے فتح حاصل کرنے کے باوجود اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اگر سلطان چاہتا تو حملہ کر کے نصرانیوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر سکتا تھا لیکن سلطان نے دہم حملہ کرنے کے بجائے اپنا مقدمہ سرداروں کے سامنے پیش کیا۔ اس نے بڑے سرداروں کی مجلس شورت منعقد کی اور انہیں مخاطب کیا۔

”میرے وفا دارو۔ دشمن دین اور دشمن خدا ہمارے ملک میں گھس آیا۔ فتح ہم پر چمک رہا ہے۔ ہم نے دشمن کے لشکر کو کافی نقصان پہنچایا ہے باقی لشکر جو رہ گیا ہے انشاء اللہ اسے ہم برباد کر کے رکھ دیں گے۔ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ آپ کو علم ہے کہ مصر سے الملک العادل ملک لے کر آ رہا ہے، اگر مصر سے ملک پہنچنے تک دمشق اپنے مورچوں پر قابض رہا تو اس کی طاقت بڑھ سکتی ہے۔ اب آپ اپنی رائے ظاہر کیجئے کہ اس موقع پر جنگ بہتر ہوگی یا ملک کا انتظار۔“

یہاں اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 4 اکتوبر کو اچانک نصرانیوں نے بی جنگ کا ڈول ڈالا تھا۔ اس وقت ان کا انداز جارحانہ تھا لیکن جب سلطان نے ان کو روک کر جوابی حملہ کیا تو ان کے قدم میدان سے اکڑ گئے اور وہ چار ہزار لاشیں میں چھوڑ کے اپنی خیمہ گاہ میں جا چپے پر اس سے اگلے دن جب سلطان لشکر لے کر اس میں اترا تو اسے بتایا گیا کہ نصرانی لشکر نے اپنے گرد گری خندق کھودی ہے اور وہ طرح حملہ کرنے کے بجائے خندق میں چھپ کے مدافعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس اہم سلطان نے مندرجہ بالا تقریر کی تھی۔

سلطان کا یہ دستور تھا کہ وہ حکمت علمی خود تیار کرتا تھا لیکن اس سے پہلے تمام کچھ کر کے ان کی رائے معلوم کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سرداروں کو یہ علم تھا کہ جو کچھ ملے کر چکا ہے عمل تو اسی پر ہوتا ہے پھر وہ اس کی مخالفت کیوں کریں۔ مجلس کے انعقاد میں سلطان نے جو تقریر کی تھی اس کے آخری جملہ میں سلطان نے اس عندیہ دیا تھا کہ اگر شکست خوردہ لشکر کو سمجھنے کا موقعہ دیا گیا تو ان کی طاقت بڑھ گی۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ سلطان فوری حملے کے حق میں ہے مگر مجلس شورت کا جو وہ اس کے خیال کے بالکل برعکس تھا یعنی فوراً حملہ سے گریز کیا جائے اور فوجوں کو یا جائے۔ اس فیصلہ کو دشمنان اسلام نے غلط اور غیر دانشمندانہ قرار دیا ہے ان کے سلطان اگر فوری طور پر نصرانی لشکر پر حملہ آور ہو جاتا تو نصرانیوں کو سنبھلنے کا ملتا اور سلطان کو حنین کی طرح ”فتح عظیم“ کا موقعہ ہاتھ لگتا۔

سلطان کے پیش نظر صرف مکہ کا محاصرہ ہی نہ تھا۔ مکہ میں صرف ساڑھے چار ہزار محصور ہے جن کے پاس مہینوں بلکہ برسوں کے لئے سامان رسد موجود تھا اس کے مالک کو اپنے لشکر پر بجا طور پر ناز تھا اور اسے امید تھی کہ اگر آئندہ کسی موقعہ پر ان کے پاس کسی طرح کی کمی ہوئی تو وہ ایک بار پھر دشمنی لشکر میں راستہ بنا کر مکہ میں سامان پہنچا سکتا ہے اور اگر اس نے ضروری محسوس کیا تو وہ مکہ خالی کر کے یوں کو با آسانی قلعہ سے واپس لا سکتا ہے۔ مگر اس وقت اپنے لشکر کو ایک فصول میں الجھا کر مکہ کے باہر پڑا رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ پھر وہ کیونکہ اپنے اس کام میں لگائے تاکہ اس کا لشکر یورپ سے آنے والے اس بڑے طوفان کا نئے کے قابل ہو سکے جو بڑے گف گرج کے ساتھ فلسطین کی طرف آرہا تھا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی اپنے سرداروں کے ساتھ یہ حکمت عملی تھی کہ وہ ایک آتا اور اس پر خوب غور و خوض کرنے کے بعد جب کسی نتیجے پر پہنچ جاتا تو اپنے

سرداروں کو مشورے کے لئے طلب کرتا اور بات اس انداز سے شروع کرتا کہ ا
سردار اس کے مقصد کو نہ سمجھ سکتے۔ ان کے درمیان بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا
ان کی گفتگو غور سے سنتا پر اس طرح فیصلہ کرتا کہ سرداروں کو یہی گمان رہتا کہ سلا
ان کی بحث کے بعد یہ نتیجہ نکلا ہے جب کہ وہ فیصلہ اس نے پہلے ہی کر لیا ہوتا تھا۔
آخر سلطان نے فیصلہ کر دیا اور فیصلہ یہ تھا کہ ملک العادل کی کمک کا انتظار کر
اور لشکر کو آرام کرنے کے لئے رخصت دی جائے۔ اگر مکہ کے حالات پر غور کیا
یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ سلطان مکہ کے محاذ سے کیوں واپس ہوا جبکہ ا
نصرانیوں کے خلاف ایک بڑی فتح حاصل کی تھی سلطانی فوجیں گزشتہ پندرہ ماہ سے
جنگ و جدل کی حالت میں چل آ رہی تھیں جس سے ان میں تکلیف کا پیدا ہونا ایک
عمل تھا دوسری بات یہ تھی کہ نصرانیوں سے جو معرکے ہوئے تھے اس میں دشمن
مقتولین کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور ان کی بے گورو کفن لاشیں میدان میں
سڑ رہی تھیں۔ ان کی عفونت نے فضا مکدر کر دی تھی۔ سلطان پر درد قریح کا پہلے ہی
ہوا تھا اور اب پھر اس کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

سلطان کی عمر پچاس کے اوپر ہو چکی تھی وہ اگرچہ مضبوط اعضاء کا باہمت اور
مند انسان تھا لیکن موسموں کی سختی، گرمی، سردی، بارش، میدان اور کبھی سخت چٹانیں،
دھوپ میں گھٹنوں کھڑے ہو کر لشکری کام کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی ان تمام باتوں
کی صحت پر برا اثر کیا تھا۔ سلطان کے اطباء اسے آرام کا بار بار مشورہ دیتے تھے۔
العادل اگرچہ مصر سے کمک لے کر روانہ ہو چکا تھا مگر اس کے آنے میں ابھی دیر
سلطان نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا (جس کا اس نے کسی سے اظہار نہیں کیا تھا) کہ وہ خو
سے گریز کرے گا اور نصرانیوں کو اس وقت تک الجھائے رکھے گا جب تک جب
یورپ کے تمام نصرانی لشکر ارض فلسطین نہیں پہنچتے۔ سلطان کا اصل معرکہ تو ان
ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے ایک ایک سپاہی کو بچا بچا کے رکھ رہا تھا۔ سلطان پر الزام
اس نے مکہ کو نصرانیوں کے ہاتھ میں بے یار و مددگار چھوڑ کر دوسری غلطی کی لیکن
بھی پہلی بات کی طرح غلط ہے۔

اکتوبر کے مہینہ میں سلطانی لشکر طے شدہ منصوبہ کے تحت مکہ کے شمال میں ہما
سے واپس ہونا شروع ہوا۔ سلطان کی یہ مراجعت عارضی تھی۔ اس لئے کہ بارشیں
ہو چکی تھیں اور موسم بہار تک جنگ کے لئے میدان بیکار ہو چکا تھا سلطان اگرچہ واپس
گیا تھا لیکن مکہ کے گرد اس کی مدافعتی اور دیکھ بھال کرنے والی چوکیاں قائم تھیں

ان کے چھوٹی موٹی جھڑپوں کے باوجود ایک بڑی خندق کھود کر خود کو محفوظ کر لیا تھا۔
ادھر سلطان نئی فوج بھرتی کرنے میں مصروف تھا۔ مصر سے سلطان کا بھائی ملک العادل
لے کر پہنچ گیا تھا۔ زمین فوج کے علاوہ مصر سے پچاس جہازوں کا ایک بحری بیڑہ میں
جس کی کمان اس دور کے عظیم امیر البحر مونو کے ہاتھ میں تھی۔ اس بحری بیڑے
ن ہزار کے قریب ملاح ساحل پر اتر گئے تھے جو نصرانیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے
ش کی وجہ سے علاقہ میں اس قدر کچھڑ ہو گیا تھا کہ دست بہ ست لڑائی ممکن نہ تھی
۔ کا کوئی موقع نہ آیا۔

ن دوران سلطان پھر واپس آیا۔ اس نے مکہ کے دفاع اور سامان رسد کا معائنہ کیا
دستے لے کر الخرویہ چلا گیا اور موسم بہار کا انتظار کرنے لگا کیونکہ بہار سے پہلے
سڑ کے لئے ناکارہ رہتی تھیں یہ وہی وقت تک جب مصر جرمنی فریڈرک اپنے لشکر
نہ اس ارادے سے چلا تھا کہ ارض فلسطین پہنچ کر سلطان کو سزا دے اور بیت
کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے واپس لے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور وہ
رہتے ہوئے ڈوب کے مر گیا اور اس کی آرزو بھی اسی کی طرح تہ آب چلی

لان کو قیصر جرمنی فریڈرک کے مرنے کی اطلاع آر مینیا کے کیتھولک باشندوں
تھی۔ یہ لوگ مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کے رومی شہنشاہ کے حامی تھے اور اس
ی سلطان کے بھی وفادار تھے۔ ان لوگوں نے سلطان کے حضور پیش ہو کے عرض

ے مسلمانوں کے عظیم سلطان۔ قسمت نے قیصر جرمنی فریڈرک کے ساتھ پیش دیا
ئے ساس پار کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔
جرمنی کے ساتھ کتنا لشکر آ رہا تھا؟ سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔
ہزار۔۔۔ کیتھولک قاصد نے انکشاف کیا۔

سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ بیت المقدس کے اسقف اعظم نے یورپ کے تمام
موم پھر کے بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ کا رونا رویا تھا اور تمام بادشاہوں
قدس کی واپسی کے لئے فوجی مدد طلب کی تھی فریڈرک اس پروپیگنڈے سے ایسا
اکر اس نے فوراً سلطان کو ایک خط روانہ کیا تھا جس میں بڑے گستاخانہ انداز
لو مخاطب کر کے تنبیہ کی گئی تھی کہ سلطان فوراً بیت المقدس کا قبضہ چھوڑ
ایک بڑے لشکر کے ساتھ اسے (سلطان کو) سزا دینے فلسطین آئے گا۔ سلطان

نے اس خط کی کوئی پروا نہ کی تھی اور فریڈرک بڑے طیش کے عالم میں ایک لشکر ہزار
ساتھ فلسطین روانہ ہوا تھا۔

سلطان کو کیتھولک قاصد کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے پھر سوال کیا۔ ”تم
پچاس ہزار کا لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ قاصد نے انکار کر دیا
”پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ قیصر کے ساتھ پچاس ہزار کا لشکر تھا؟“ سلطان نے اس
سے جرح کی۔

”اے مسلمانوں کے سلطان۔۔۔“ قاصد نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ ”میں
بڑے سردار کو باتیں کرتے سنا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ جرمنی کا بادشاہ پچاس ہزار کا لشکر
کر مسلمانوں لڑنے جا رہا ہے۔۔۔“

سلطان کو قیصر کے لشکر کی تعداد کا تو یقین نہ ہوا لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور
کہ یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اپنے ساتھ بہت بڑے بڑے لشکر لے کر اوہ آر
ہیں۔ شاید سی وجوہات تھیں جن کی بنا پر سلطان اپنے سپاہیوں کو کسی آئندہ جنگ کے
مخفوظ کر رہا تھا۔ اس نے قاصد کو تو رخصت کر دیا لیکن احتیاط کے طور پر ایک مفوض
قیصر کے لشکر کو روکنے کے سے شمال کی طرف بھیج دیا۔ سلطان نے اپنا مستقر العیاد یہ
کر مل عجول پر لگایا اور حلب، حران، الجزیر، سنجا، موصل اور اروہل کی طرف
دوڑائے کہ وہاں سے فوری فوجی کمک بھیجی جائے۔ اس سلسلہ میں سلطان کے سوائے
ہماؤ الدین نے بہت کام کیا اور مئی اور جون کے مہینوں میں سلطان کے کیمپ میں کمک
رہی۔

ہماؤ الدین نے سلطان کے حکم پر عباسی خلیفہ کے دربار کا بھی چکر لگایا اہل
پہنچ کے امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین کے حضور عرض کیا۔

”امیر المومنین کے حضور سلطان صلاح الدین ایوبی نے سلام نیاز بھیجا ہے اور
کیا ہے کہ یورپ کے تمام فرنگی شاہوں اور بادشاہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی
مشترکہ لشکر سے بیت المقدس کو مسلمانوں سے بازیاب کر کے اس پر صلیبی پھر اڑا
گئے۔ اس سلسلہ اور منصوبہ کے تحت قیصر جرمنی شاہ فریڈرک کا ایک لشکر ہزار سائل
پر اترنے والا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ انگلستان رچرڈ، شاہ فرانس فلپ شاہ آسٹریا
ڈنمارک وغیرہ اپنے ملکوں میں فوجوں کو ترتیب دے کر روانہ ہو رہے ہیں سلطان
تمام مسلمان امرا اور حکمرانوں سے طاعنوں کی طاقتوں کے خلاف فوجی کمک کی درخواست کی

آپ کے حضور اس غلام کو خاص طور پر بھیجا گیا ہے۔“
عباسی خلیفہ کو فتح بیت المقدس کی خبر مل چکی تھی اور انہوں نے سلطان کے اس
ام پر مبارکباد بھی دی تھی۔ خلیفہ کو یہ بھی علم تھا کہ سلطان نصرانیوں کے خلاف
مل جاد کر رہا ہے اور نصرانی بیت المقدس کی بازیابی کے لئے کوشاں ہیں۔ خلیفہ لوگوں
بہت کم ملتے تھے لیکن سلطانی قاصد کی اطلاع ملتے ہی اسے قعر خلافت میں طلب کر لیا
تھا۔ سلطان کی عرضداشت کو خلیفہ نے پوری توجہ سے سنا پھر فکر مند انداز میں فرمایا۔

”اسلام کی خاطر سلطان کی تنگ و دو کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ سلطان
اپنی زندگی جہاد کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ ہم اپنے آپ کو سلطان کے جہاد میں شریک
نہیں۔ ہم اسی وقت مسلم حکمرانوں کو اپنی طرف سے فرمان جاری کر رہے ہیں کہ وہ
جہاد میں شریک ہو کر خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔ ابن نجم الدین (صلاح
ابن نجم الدین) کو ہماری دعاؤں کے ساتھ پیغام دیا جائے کہ ہم اپنی اور مسلمانان عالم
عازوں کے ساتھ اس جہاد میں شریک رہیں گے اور اپنی طرف جو سامان حرب اس مجاہد
لئے بھیج سکتے ہیں وہ تمہارے ساتھ ہی بھیجا جائے گا۔“

ہماؤ الدین نے عرض کیا۔ ”اے امیر المومنین غلام بغداد سے سیدھا الجزیرہ جانے کا
ارکناہ کیونکہ مجھے الجزیرہ کے شہزادوں کو بھی جہاد میں شرکت کی دعوت دینا ہے۔ اگر
محترم سلطان معظم کو کمک اور رسد براہ راست مکہ کے محاذ پر بھجوانے کا فرمان جاری
یہ تو عین کرم نوازی ہوگی۔“

خلیفہ نے ہماؤ الدین کی یہ درخواست قبول کر لی اور اس کی روانگی کے فوراً بعد
نہا کو دو چھکڑے نیزوں سے بھر لے، دو چھکڑے ایسی کلوں کے جو دشمن پر جلتے ہوئے
پکے تھیں اور دس چھکڑے تیروں سے بھرے مکہ کی طرف روانہ کئے۔ خلیفہ نے یہ
انتخت پہرے میں روانہ کیا۔

نصرانیوں کو بھی یورپ سے کمک پہنچتی جا رہی تھی۔ جون میں سلطان کو الجزیرہ سے
ایلی تو نصرانیوں کے لئے ہنری آف سمپسن دس ہزار فوج، متعدد ٹانٹس، امیروں اور
انتھنوں کے ساتھ یورپ سے ارض فلسطین پہنچ گیا۔ محاذ جنگ پر اس وقت تک کوئی
تبدیلی نہ آئی تھی۔ مکہ بدستور نصرانیوں کے محاصرے میں تھا اور نصرانیوں کو سلطانی
نے گمیر رکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی جھڑپ ہو جاتی تھی ورنہ پھر وہی بچوں کی تھم میں گتھا
بچوں کا دونوں طرف سے تماشائیوں کی طرح ہو حق۔ مکہ کے قلعہ میں گھرے ہوئے
نہا اکثر نصرانیوں پر حملہ کرتے اور ان کی خندقوں اور منجیتوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔

سلطانی فوج میں دمشق کا ایک جوان ”آتش یوں“ تیار کرنے کا طریقہ جاننا تو ”آتش یوں“ میں اس قدر شدت کی گرمی ہوتی تھی کہ اس سے دبا بے اور محبتیں جل جہاں ہو جاتی تھیں۔ سلطان کو اس کا علم ہوا تو سلطان نے اس جوان کو اپنے حضور طلب کیا۔

”شہنشاہ عالی مقام۔۔۔۔“ دمشق نے ادب سے عرض کیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا۔ راہ مواد اور اپنے رب کی خوشنودی کے لئے کیا ہے۔ میں اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔“

”سبحان اللہ۔۔۔۔“ سلطان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔۔۔۔ ”بندے میں کرم طاقت ہے کہ وہ تمہاری خدمات کا صلہ دے سکے۔ اس اجر تو تمہیں دربار مولا ہی سے ملے گا۔“

اسی دوران اسکندریہ کا بیڑہ لڑتا بھڑتا مکہ بندرگاہ میں داخل ہو گیا اور قلعہ کے محصور بن کو سمندری راستے سے سامان رسد پہنچایا گیا۔ سلطان نے قیصر جرمنی کے لشکر کی خبر پر اس فوج کا ایک حصہ مدافعت کے لئے شمال میں بھیج دیا تھا۔ شاید نصرانیوں کو اس کی خبر ہو گئی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے 25 جولائی 1190ء کو سلطانی لشکر کے بیڑہ پر حملہ کر دیا۔ فوج کے اس حصہ سے سلطان کا برادر زاہد تقی الدین فوج کے مضبوط دستوں کے ساتھ فریڈرک قیصر جرمنی کو روکنے کے لئے شمال کی طرف گیا ہوا تھا۔ نصرانیوں نے اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن انہیں اس کا علم نہ ہو سکا تھا کہ اگر تقی الدین شمال کی طرف گیا ہے تو مصر سے سلطان کا بہادر بھائی ملک العادل حمزہ پر پہنچ چکا ہے۔ نصرانیوں کے خندق سے نکل کر بڑا زبردست حملہ کیا تھا لیکن ملک العادل نہ صرف اس حملہ کو ناکام بنا دیا بلکہ صبح سے شام تک نصرانی حملہ آوروں کو دبائے رکھا۔

تمام دن شدید لڑائی ہوتی رہی اور کشتوں کے پٹے نکلتے رہے۔ نصرانی جس امید کے ساتھ خندق سے نکلے تھے اس میں کامیاب ہونا تو ایک طرف رہا بلکہ وہ اب ملک العادل کے فوجی دستوں میں اس طرح گھر گئے تھے کہ انہیں خندق میں واپس جانا کا موقعہ بھی نہ مل رہا تھا۔

آخر جب شام ہوئی اور دوست و دشمن کی تمیز ختم ہو گئی تو دونوں لشکر اپنے اپنے مستقر کو واپس آئے دن بھر کی اس سخت لڑائی میں نصرانیوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اس نقصان کا انہیں بھی اندازہ ہوا مغربی مورخوں کے مطابق اس جنگ میں نصرانیوں کے چار ہزار آدمی مارے گئے جبکہ بماء الدین اور عماد الدین نے نصرانی مقتولین کی تعداد آٹھ ہزار

زیادہ بتائی ہے لطف یہ ہے کہ سلطانی لشکر کے شہداء کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اس قدر کم تھی دشمن بھی اس کا ذکر کرنے سے باز رہے۔ اس شکست کا یہ اثر ہوا کہ یوں کو دوبارہ لڑائی کا خطرہ مول لینے کی ہمت نہ پڑی۔

اب تک شاہ یروشلم گائی لو گئناں اور مارکوئیس کو فریڈ کے ہاتھوں میں ملیوں کی نئی لیکن اس شرمناک شکست کے بعد ہنری آف شیمین جو دس ہزار سپاہیوں، ٹائٹس، ل اور جنگجو استغفوں کے ساتھ مکہ پہنچا تھا، ملیوں کی کمان اس کے سپرد کر دی گئی۔ صور کا حکمران مارکوئیس کافرڈ اور اٹلی کی حسینہ اشارپا کی معاشقہ اور شادی کی پچھلے صفحات میں بیان کئے گئے ہیں۔ تھون مزاج کو مزید اپنی نادان بیوی اشارپا کو کر پڑی خاموشی سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے بقیہ سیاہ کو آئندہ قسط میں پیش کیا جائے گا۔

ی جنگ) کے لئے فلسطین جا رہا ہے۔ سب نے اس کی تعزیر کی۔ ایک بولا۔ ”مارکوئیس کو نزیڈ جو انمرو ہے اور اس کا رجحان ہمیشہ مرواگی کی طرف رہتا“

دوسرے نے اور کھل کے تعریف کی۔ ”کیوں نہیں مارکوئیس نے اتنی شہرت آخر کس حاصل کی ہے۔ ایسے بہادروں کو صلیبی جنگ میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔“

تیسرا زیادہ جوش میں آگیا۔ ان دنوں بیت المقدس معانی یافتہ اسقف ہر کلیس یورپ دورے پر آیا ہوا تھا اور اس نے پاپائے روم سے تمام یورپی حکومتوں کے لئے یہ فرمان ل کر لیا تھا کہ جو عیسائی بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے جائے گا اس تمام پچھلے اور مستقبل کے گناہ بھی معاف کر دئے جائیں گے۔ اس سے لہرائیوں میں جوش پیدا ہو گیا تھا اور ہر بیکار جوان یروٹلم کو آزاد کرانے کے لئے پر توں رہا تھا۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا مارکوئیس۔“ اس نے بڑے جوش سے کہا۔ ”آپ مجھے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔؟“

”ضرور ضرور۔۔۔ یروٹلم کو تمہارے جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔“ مارکوئیس کو نزیڈ اسے حوصلہ دیا۔ ”میں تمہارے جڑے کی قدر کرتا ہوں۔ تم چلو اور اپنے دوستوں کو یروٹلم کی زیارت اور ایک مذہبی فریضہ ادا کرنے کی دعوت دو۔ تمہارے تمام اخراجات اگر تم اپنے گھر کے واحد کفیل ہو تمہارے گھر والوں کے اخراجات بھی ہماری ذمہ ہے۔“

مانٹریٹ کی ریاست میں مارکوئیس کو نزیڈ کی اس بات نے آگ سی لگادی۔ مارکوئیس جگجو کی حیثیت سے پہلے ہی وہاں معروف تھا۔ اب وہ اس قدر مشہور ہوا کہ دو تین اندر اسے تقریباً ”دو سو جوانوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ یہ تمام جوان مانٹریٹ کے وہ عزاج وہ بیکار شہزادے تھے جو صبح سے شام تک سڑکیں ٹانپتے اور روٹی اپنے متول بن سے کھاتے تھے۔ ادھر مارکوئیس نے ان جوانوں کی پزیرائی کی اور ان کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیا۔

مارکوئیس کے پاس خود بھی کافی رقم تھی۔ اس کے علاوہ ”کروسیڈ“ کے نام پر اس نے ت کے امیروں اور تاجروں سے بہت سی رقم بٹوری اور پھر ایک دن اس نے رواگی کا کر دیا۔ اس کی بیوی اشاریا کو مارکوئیس کی تمام کاروائیوں کی اطلاع تھی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ مارکوئیس یروٹلم جانے سے پہلے اس سے ملنے ضرور آئے گا۔ میاں بیوی تعلقات میں کشیدگی ہو جایا کرتی ہے۔ اسی لئے اس کے باپ نے ان کے جھگڑے میں

شاخ زریں کی شہزادی

عشرت پسندی اور عیاشی میں نمایاں فرق ہے۔

عشرت پسندی دراصل امیروں، وزیروں اور بادشاہوں کی آن، ایک اوا یا ایک شہزادی ہوتی ہے۔ وہ روز ایک خوبصورت چہرے کو پہلو میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ عشق عاشقی کو درد سر سمجھتے ہیں اور اس طرح کے جھگڑوں سے دور ہی رہتے ہیں مگر عیاش طبع لوگ ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جب بھی کسی خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہیں اس کے حصول کے لئے تن من اور دھن سے لگ جاتے ہیں۔ جائز اور ناجائز کا فرق اس کی نظر سے مٹ جاتا ہے اور جب تک اسے وہ حاصل نہیں کر لیتے انہیں چین نہیں آتا۔ مانٹریٹ کا مارکوئیس کانزیڈ عشرت پسند نہیں بلکہ عیاش ذہن اور طبیعت کا مالک تھا۔ ارودہ حسن کو اسیر کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بناتا اور اس منصوبہ پر احتیاط سے عمل کرتا محبوب کو اپنے دام میں لے آتا۔ اٹلی کی اشاریا جیسی درجنوں دوشیزاؤں کی جوانیاں وہ بڑا کر چکا تھا لیکن وہ کام منصوبہ سے کرتا اس لئے پکڑا نہ جاتا تھا۔ اشاریا کے معاملہ میں شاہ اسے اس بھولی بھالی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ جہی اس نے اشاریا کو حاصل کرنے کے لئے سسلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے اسقف (پادری) نے اس کی مشکل آسان کر دی نیز مارکوئیس کانزیڈ اور اشاریا میاں بیوی کے بندھن میں بندھ گئے۔

لیکن بے جوڑ ذہنوں کی یہ گاڑی زیادہ دیر نہ چل سکی اور مانٹریٹ کا عیاش مارکوئیس کو نزیڈ اپنی اشاریا کو اسی حالت میں چھوڑ چھاڑ کسی نئے عشق اور مہم کے لئے جہاز بڑھا ہو گیا۔ مارکوئیس کو نزیڈ نے اپنے اس سفر کے لئے بھی پہلے سے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اس نے اونچے حلقے کے بعض لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔

اور ایک دن مارکوئیس کو نزیڈ نے اچانک محفل میں اعلان کیا کہ وہ کروسیڈ (مذہبی)

دغل نہ دیا۔

مگر جب اسے مارکوئیس کی روائی کی تاریخ کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اس کے خیال میں مارکوئیس اور اس کی بیوی اشاریا کے تعلقات اس قدر خراب نہ ہوئے تھے کہ وہ بیڑے لئے الگ ہو جاتے۔ اشاریا بھی کچھ چپ دکھائی دے رہی تھی۔ اس شادی میں دغل اشاریا کا زیادہ دخل تھا اس لئے وہ باپ سے شکوہ بھی نہ کر سکتی تھی۔

اشاریا کا باپ اسی اصرار میں مبتلا تھا کہ اشاریا اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اس آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اب بچے کہ اب بچے۔

”کیا بات ہے بیٹی۔ تم بہت افسردہ دکھائی دیتی ہو؟“ باپ کا دل بھر آیا تھا۔
”بابا... میں کیا کروں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ اشاریا باپ کے کاندر لگ کے رونے لگی۔

”بیٹی۔ میں نے تمہارے معاملات میں اس لئے دخل نہ دیا کہ مارکوئیس کو شاید ہمارا گزرے گا مگر اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔“ اس کے باپ نے بڑے افسوس سے کہا۔

”میں کیا کروں بابا... مجھے کچھ بتائے۔ اشاریا سسکیاں بھر رہی تھی۔ ”آپ مارکوئیس کو سمجھائیے۔“

”میں کیسے سمجھاؤں اشاریا۔ وہ یہاں آئے تو...؟“ بابا کا لہجہ بھی افسردہ ہو گیا تھا۔
”اب تو وہ جانے والا ہے۔“

”مجھے لے چلے اس کے پاس۔“ اشاریا بے چین ہو گئی۔ ”میں اس سے معافی مانگوں گی۔ خوشامد کروں گی اس کی۔ وہ جہاں جانا چاہتا ہے ضرور جائے مگر مجھے اس طرح تو چھوڑے۔“

”اچھا اشاریا... انہوں نے کہا۔“ آج پہلے میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا؛ تمہیں لے کے جاؤں گا۔“

اشاریا کی ساری اکر نکل گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مارکوئیس کا سامنا ہونے والا اس کے ہاتھ جوڑے گی پیر پڑے گی۔ آخر وہ اس کی بیوی ہے۔ کب تک نہیں مانے گا؟ کتنا ہی سخت دل سہی مگر اسے دل نرم ہی کرنا پڑے گا۔ اس کے بابا تو صبح ہی صبح مارکوئیس کو بیڑے سے ملنے ساحل پر چلے گئے اور اشاریا دوپہر تک انہی خیالوں میں الجھتی رہی۔

اشاریا کے بابا دوپہر کے بعد آئے تو منہ لٹکائے ہوئے۔ اشاریا اس کے چرنے ہی پہچان گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مگر وہ تھی عقلمند اور بڑی صبر والی۔ بابا اس کے پاس

بچہ گئے مگر اشاریا خاموش بیٹھی رہی۔

بابا نے بھری بھری آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا۔

”بیٹی وہ تمہیں دھوکہ دے گیا۔ انسان نہیں شیطان تھا وہ۔“

اشاریا نے پہلے تو بابا کو حیران نظروں سے دیکھا پھر ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کے مٹی۔

”بابا... بابا...“

اور اشاریا بے ہوش ہو گئی۔

شام کو جب اسے ہوش آیا تو بابا نے بتایا۔ ”وہ تو کل شام کو چلا گیا تھا یہاں سے لے جہاز کے دفتر میں اس کے بارے میں پوچھا تو اس کا نام سن کے سب نے کانوں کو لگائے اور جب میں نے بتایا کہ مارکوئیس کو بیڑے میں لے لیا ہے۔ دو ماہ پیشتر اس نے میری سے شادی کی ہے تو انہیں بڑی حیرانی ہوئی۔ انہوں نے بتایا وہ تو روز ہی کسی نہ کسی سے شادی رچاتا ہے اور صبح کو دھکے دے کر اسے نکلوا دیتا ہے۔“

”اب کیا ہو گا بابا؟“ اشاریا کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ ”ہم چرچ میں شکایت تو لے رہے ہیں؟“

بابا نے ذرا رک کے جواب دیا۔

”اشاریا۔ چرچ جانے کا ہمارا منہ نہیں۔ الٹا ہمیں دھر لیا جائے گا چرچ کے قانون مطابق تم تو اس وقت بھی کی عمر کو نہیں پہنچی ہو۔ مفت میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔“

اشاریا گھبرا آگئی۔ ”ٹھیک ہے بابا۔ اسنے مجھے چھوڑا تو میں اس کا نام نہ لوں گی۔ خدا مرنے چاہا تو کتے کی موت مارا جائے گا۔“

اشاریا کا دل جلا تھا وہ دیر تک مارکوئیس کو جلی کٹی سناپی رہی۔ اس کا باپ بیچارہ کیا لڑکی کے معاملے والدین جوں بھی بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی اہتمام والدین کا فرض ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ زن و شو (بیوی میاں) کے تعلق کو قائم رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی لڑکی ہی کو سمجھاتے بچھاتے رہیں۔

عام معاشرہ اور روایات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کے عقد سے رخصت والدین کے قدم قدم سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ لڑکے والوں کے سامنے معجزہ کا بیکر بن جاتے ہیں۔ گویا وہ لڑکی رخصت نہیں کر رہے بلکہ فروخت کر رہے ہیں۔ اسے کہ لڑکے والوں کا زیادہ حق ہوتا ہے لیکن مسلم معاشرہ میں جیز کے سلسلے میں

ہندوانہ رسمیں اور طور طریقے رائج ہیں اور لڑکے والے جب لڑکی کا رشتہ پسند کر لیتے تو تعلیم یافتہ گھرانوں میں سے بڑی بے شرمی سے کچھ اس طرح کی گفتگو کی جاتی ہے۔ لڑکے کی والدہ الفاظ چبا چبا کر فرماتی ہیں۔

”اے بہن۔ لڑکی تو آپ کی ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے۔ غار میں بھی کوئی اونچ نیچ نہیں۔ آپ لوگ باعزت ہیں۔ رئیسوں کے خاندان سے ہیں۔“ اس وقت لڑکی ماں لڑکے والوں کو چونک کے دیکھتی ہے اور عاجزانہ بلکہ نفیضانہ میں کہتی ہے۔ ”بہن یہ تو ٹھیک ہے میرا گھرانہ عزت والوں کا ہے لیکن میں نے میرا کو پہلی گفتگو میں بتایا تھا کہ ہمارا گھرانہ اوسط درجہ کا ہے اس لئے آپ ہمیں امیوکیہ کر کوئی بڑی توقع وابستہ نہ کر لیجئے گا کہ ہمیں عین وقت پر شرمندگی ہو اور آپ بھی اہم چشموں میں نظریں اٹھانے میں سبکی محسوس کریں۔“

”اے بہن لو میں کوئی غلط توقع کیوں باندھنے لگی۔“ کس طرح لڑکے کی ماں پہلے اس طرہ الفاظ چباتے ہوئے کہتی ہے۔ ”میں جانتی ہوں آپ کروڑ پتی عرب پتی نہیں۔ بھی کچھ تو دنیا داری کریں گے ہی۔ اللہ نہ کرے لڑکی کو تنگی بچی تو رخصت نہیں کر گئے؟“

انداز طلب کا یہ کس قدر مذہب مگر خطرناک طریقہ ہے۔ لڑکی کی ماں کو کچھ نہ بجا جواب دینا ہی پڑے گا۔ اس غریب کو کتنا پڑتا ہے۔ ”نہیں اللہ کا شکر ہے۔ وال کھاتے ہیں۔ بیٹی یوں بھی ماں باپ کی عزت ہوتی ہے۔ ماں باپ کے پاس کچھ بھی نہ بھی دو چار برتن اور چار چھ جوڑے تو دینا ہی پڑتے ہیں۔ سو تم اس کا اطمینان رکھو۔ ایسا وقت نہ لائے کہ لوگ رخصتی کے وقت انگلیاں اٹھائیں۔“

”یہی تو میرے کہنے کا مقصد تھا۔“ لڑکے کی ماں آخر مطالبات کا اظہار شروع کرتی ہیں۔

”میں نے اسی لئے آپ سے چیز کا نام نہیں لیا۔ کپڑے، زیورات اور گھر گرت سامان تو ہر لڑکی کو ملتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو دیں گی اس سے آپ کا نام ہوگا آپ کی لڑکی کا ہی تو ہو گا۔ ٹی وی، فریج تو ہر گھر میں ہوتا ہی ہے۔ میں کو بھی کار کا نہیں کرتی ہاں لڑکے کو اگر دفتر جانے کے لئے اسکوٹریا موٹر سائیکل مل جائے تو آپ کا نام ہے اور میرا بھی یقین کیجئے کہ میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کرتی۔ رہا بار بار استقبال تو اس کا انتظام تو آپ نے کسی ایسے میرج ہال میں کیا ہو گا۔ اگر گھر آپ میں نہ ہوتا تو میرج ہال کی ضرورت نہیں۔ مجھے بھی اس طرح کی فضول خرچی کا

پسند نہیں۔“

لڑکی کی ماں کا لڑکے والوں کی ہر فرمائش پر رنگ اڑتا جا رہا تھا مگر وہ غریب کچھ بھی نہیں رہی۔ جیسا کہ یہ رواج کسی وجہ سے سہی مگر ہم مسلمانوں کی رگ رگ میں رچا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمیں اس برائی جو گناہ سے کسی طرح کم نہیں، کب ملے گا۔

ناریا کا بابا بیٹی سے کیا کہتا۔ مارکوئیس سے شادی اشاریا کی مرضی بلکہ پسند سے ہوئی ناریا روتی تو اس کا دل بھی رونے لگتا مگر مجبور کو سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہ

رکویس کو نریڈ کو اٹلی کا ساحل چھوڑے ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اشاریا نے گھر کا نہ پڑ لیا تھا۔ اس نے خود کو ایک کمرے میں قید کر لیا تھا۔ رات دن میں ایک دو بار ادا وہ اس کمرے سے نہ نکلتی تھی۔ ایک دن اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ گھر دو نوکر موجود تھے مگر اشاریا کی بابا نے انہیں روک دیا کہ وہ دروازہ نہ کھولیں بلکہ وہ والے کا استقبال کرے گا۔

بالکھڑاتے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ کھولا تو باہر بابا کو اپنی عمر کا ایک آدمی کھڑا یا۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی تھی۔ تقریباً اشاریا کی عمر کے برابر۔ آنے والے دو نظروں سے دیکھ رہے تھے اور بابا ان کے بارے میں سوچ رہے کہ وہ کون ہو اور نزدیک کسی عزیز کی شکل آنے والے سے نہ ملتی تھی۔

آپ لوگ کون ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ انہیں خاموش دیکھ لپوچھتا پڑا۔

ہم مظلوم ہیں۔ مسافر ہیں۔“ اس کے ہم عمر نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

ہاں میں جانتا ہوں۔“ بابا نے چونک کے جواب دیا۔

نے والے نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اس کے اتھ آئی تھی اور شاید اس کی بیٹی کی نے اشاروں ہی میں جواب دیا جسے اشاریا کا بابا نہ سمجھ سکا۔

کیا میں اپنی بیٹی کے ساتھ اندر آسکتا ہوں؟“ آنے والے نے ڈرتے ڈرتے سوال

پوچھا۔ آپ اندر آسکتے ہیں۔“ بابا نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ بالکل بے ضرر ہیں۔

میلان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔“

پہلی اندر آگئے۔ بابا نے انہیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔

باندھ کر دیا ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ میں کیا سوال کر رہا ہوں۔۔۔“
اس وقت مسٹر ہیڈلے کی بیٹی جس کا نام بھی اشاریا تھا نے بڑی افسردگی سے
”اگل۔ کیا آپ یہ جتنا پسند کریں گے کہ مارکوئیس کو نرڈ اس وقت کہاں ہوں

”شاید میں تمہیں یہ بتا سکوں۔۔۔“ بابا نے نرمی سے کہا۔۔۔ ”لیکن پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ
میں کو نرڈ نے تمہارے ساتھ کیا فریب کیا ہے؟“

”یہ۔۔۔ یہ میرے والد بتائیں گے۔۔۔“ مہمان اشاریا نے باپ کی طرف
”پارے باپ آپ انہیں بتائیں کہ مارکوئیس نے مجھے کیا دھوکہ دیا ہے؟“
”میرے بھائی۔۔۔“ ہیڈلے نے بابا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔۔۔ ”وہ فریبی۔۔۔ دغا باز
بی کو چار مہینے سے شادی کا فریب دے رہا ہے۔ میری معصوم بیٹی نے اس کے فریب
راہا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے ایسا
بد کیا کیا تھا میری بیٹی نے اس کے ساتھ۔۔۔؟“

باس کی بات سن کے سائلے میں آگئے۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں کہ مارکوئیس
بل فریبی اور چالاک انسان ہے۔ بابا کا تو یہ خیال تھا کہ مارکوئیس کو نرڈ اور اس کی
دیا کے باہمی اختلاف میں اشاریا کی بھی کچھ نہ کچھ ضرور غلط ہوگی۔ ورنہ ایک شوہر
ت خوبصورت بیوی کو اس طرح بغیر اطلاع دے چھوڑ کر سمندر پار کس طرح جا سکتا

نرڈ ہیڈلے نے پھر بات شروع کی۔ ”آپ میری بات کا یقین کیجئے محترم۔ مارکوئیس
آؤی ہے اور اس نے میری بیٹی کو کھلا ہوا دھوکہ دیا ہے۔ وہ کمینہ انسان میری بیٹی
رات کے دو قیمتی ہار یہ کہہ کر لے گیا ہے کہ مذہبی جنگ کے لئے رقم کی ضرورت
اٹلی کی تمام خواتین نے اپنی تمام قیمتی (جواہرات کے زیورات) چنگی چندبے میں
ہیں۔“

ات ایک ایک حد تک درست بھی تھی۔ روم کے لارڈ پادری (پاپائے روم) جو کل
کے بغیر اختلاف سب سے بڑے پیشوا تھے۔ انہوں نے یروشلم کی پادری اسقف
صلیبی جنگ کے لئے نصرانی مردوں اور عورتوں کو دل کھول کے چندہ دینے کی اپیل
اور اس کے جواب میں نصرانی خواتین نے واقعی اپنے زیورات تک چندے میں
ایک یورپی مورخ نے یہاں تک لکھا ہے کہ تیسری صلیبی جنگ کے لئے پورے
”میں“ صلاح دین“ ٹیکس لگایا گیا تھا اور اس ٹیکس میں جتنی رقم حاصل ہوئی تھی

”میرا نام ہیڈلے ہے۔۔۔“ آئے رائے نے پہا تعارف کیا۔۔۔ ”اور یہ میری بیٹی
اشاریا۔۔۔“

”جی۔۔۔“ بابا کرسی سے اچھل پڑا۔۔۔ ”کیا نام بتایا آپ نے؟“
”اشاریا۔۔۔“ ہیڈلے نے اپنی بیٹی کا نام دہرا دیا۔۔۔ ”مگر آپ اس قدر حیران
ہوئے؟“

آنے والوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہیڈلے نے سنبھل سے
آپ کی بیٹی کا یہ نام اصلی ہے یا کسی نے آپ کو رکھے کو کہا تھا؟
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔۔۔“ بابا نے جواب دیا۔۔۔ ”اولاد کا نام والدین
رکھتے ہیں۔ دوسرے نہیں رکھا کرتے۔۔۔“ بیڑ چھوڑے ناموں کو۔۔۔ ایک نام کی لڑکیوں
سکتا ہے۔ ہاں فرمائیے۔ میں آپ لوگوں کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“
ہیڈلے نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں مارکوئیس کو نرڈ کے بارے میں
پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکیں گے؟“

بابا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”مسٹر ہیڈلے۔ اگرچہ مارکوئیس کے بارے میں
کرتا کم از کم میرے لئے مناسب نہیں لیکن آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے
مارکوئیس کو نرڈ نے آپ کو بھی تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ سوال کیجئے۔ مارکوئیس کے
میں جو کچھ مجھے علم ہے اسے بتانے میں کوئی درج نہ کروں گا۔۔۔“
ہیڈلے تیار ہو کے بیٹھ گیا اور اس کی بیٹی نے اس طرف کان لگا دئے۔ ہیڈلے
سوال کیا۔۔۔ ”مارکوئیس کو نرڈ سے آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی؟“

بابا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ”تقریباً“ ڈیڑھ ماہ پہلے۔۔۔“
”ڈیڑھ ماہ پہلے۔۔۔“ ہیڈلے نے یہ الفاظ دہرائے پھر صاحب خانہ (اشاریا کے
شکوہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے تو معلوم ہوا کہ مارکوئیس کو نرڈ آپ
ساتھ اس مکان میں رہتا ہے۔۔۔“

”آپ نے ٹھیک سنا۔۔۔“ بابا نے جواب دیا۔۔۔ کو نرڈ میرے پاس ہی رہتا تھا لیکن
اس نے یہاں رہنا تو الگ بات ہے ادھر آتا بھی چھوڑ دیا ہے۔۔۔“
”کیا آپ اس کا سبب جتنا پسند فرمائیں گے؟“ ہیڈلے نے سپاٹ لہجے میں سوال
”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے مسٹر ہیڈلے۔۔۔“ بابا کو غصہ آگیا۔۔۔ ”آپ میرے
ورنہ میں آپ کو سخت جواب دیتا۔۔۔“
ہیڈ کا منہ اتر گیا عاجزی سے بولا۔۔۔ ”آپ ناراض نہ ہوں۔ دراصل پریشانی۔

اتنی رقم آج تک کام کے لئے اکٹھا نہ ہو سکی تھی۔

بابا کی زبان اب بھی نہ کھل سکی وہ دراصل مارکوئیس کو نرید کی فریب کارا الجھے ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ یہ ان کا اور ان کی بیٹی کا ہی غم نہیں فریب کار نے معلوم نہیں اٹلی والوں کے اسی طرح کہنے اور گھرجاڑے تھے۔

”آپ اب بھی خاموش ہیں۔“ ہیڈلے نے انہیں چونکا دیا۔ ”مجھ پر رحم جناب۔ مجھے جواہرات کے ہاروں کے جانے کی کوئی فکر نہیں۔ ہاں اگر آپ مجھے کو نرید کا صحیح صحیح پتہ دیجئے تو اس سے مل کے شاید میں اپنی معصوم بیٹی کا مستقبہ سکوں؟“

”مسٹر ہیڈلے۔“ بابا نے جب سر اٹھایا تو ہیڈلے نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں موٹے موٹے آنسو گرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ ”کاش میں اس کا پتہ آپ کو آپ کی بیٹی اشاریا اس لئے مظلوم ہے کہ مارکوئیس کو نرید اس کی عزت لوٹ کے ہے اور میری بیٹی جس کا نام بھی اشاریا ہے وہ اس لئے مظلوم ہے کہ مارکوئیس اس سے شادی کی ہے اور اب جبکہ میری بیٹی کے حکم میں ایک ننھی جان پروا ہے تو اس کا باپ اپنے تمام جہازوں کے ساتھ اٹلی کا ساحل ہمیشہ کے لئے چھو کو نرید نے ایک اشاریا کو نہیں بلکہ ”دو اشاریا“ کو دھوکہ دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کئی اور شکار کئے ہوں جنہیں وہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔“

بابا کے اس انکشاف پر مسٹر ہیڈلے اور ان کی بیٹی اشاریا حیران ہو گئی تھیں۔ حیرت میں بابا کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

مسٹر ہیڈلے بولے۔ ”ہم تو آپ کے پاس اپنا وردے کے آئے تھے مگر آپ تو ہم سے زیادہ زخمی ہیں اور غضب یہ ہے کہ دونوں بیٹیوں کو زخم لگائے ظالم ہے۔“

ان کی گفتگو کے دوران اشاریا اندر سے اٹھ کے ان کے پاس آ کے ایک میں کھڑی ہو گئی تھی۔ ناظرین نے روم کے کھنڈرات کے بارے میں کتاہول گا۔ ان کھنڈرات کی تصویریں اسکرین اور کینٹھروں میں دیکھی ہوں گی۔ اس کھنڈرات کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ناظرین نے جیسا دیکھا اور پڑھا ہو گا تعمیر زمانہ قدیم میں دنیا کا سب سے مشہور فن تعمیر تھا۔

رومن طرز تعمیر کو خوبصورت کے بجائے شاندار کہا جاتا ہے اس کا مطالعہ رومن طرز تعمیر میں عمارات کو ستون پر کھڑا کیا جاتا تھا اور یہ ستون بہت

تھے اس اعتبار کی چھتیں بھی بہت بلند اور بڑے بڑے نہایت اونچے چوڑے ہال تھے۔ روم کی بلند و بالا عمارات کے کھنڈرات اب بھی اٹلی کے کئی مقامات پر پائے جاتے ہیں مگر اب کھنڈرات میں سوائے اونچے اونچے ستونوں کے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔

راور ایران کے قدیم کھنڈرات کی عمارتیں بھی ستونوں کے سارے تعمیر کی گئی تھیں اور ان کے طرز تعمیر میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ مصر ایران اور روم کا ایک عرصہ تک قبضہ رہ چکا ہے جس نے وہاں کے طرز تعمیر کو متاثر کیا

روم اور شہنشاہ روم کے بارے میں بعض باتیں بہت دلچسپ ہیں اور اس کے ذکر سے ہمیں ضرور مستفید ہوں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ کسی زمانہ سلطنت روم یورپ اور ایشیاء ہند کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے بانیوں کا عقیدہ تھا بادشاہ وقت خدا کا اوتار یا جانشین ہوتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ اگر رعیت پر جور و ستم کرے تو خدا کی طرف سے سبھا جاتا تھا۔

لوگوں کی اس ضعیف الاعتقادی سے شہنشاہ روم خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ رعیت کی بیعت ہو گئی تھی کہ وہ بادشاہ کے ہر حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر بے چوں و چرا تسلیم کر لیتی خواہ وہ حکم کتنا ہی غلط ہو یا اس سے رعیت کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو۔ زیادہ بات یہ تھی کہ رعایا کے علاوہ سلطنت کا ہر سردار، امیر اور وزیر بھی شہنشاہ کے حکم کو کا حکم سمجھ کے اس پر فوراً عمل شروع کر دیتا تھا۔

سلطنت روما کے ایک شہنشاہ کا نام ”نیو“ تھا۔ یہ مطلق العنان حکمران سفاک ہونے علاوہ حد درجہ بیوقوف بھی تھا۔ ایک مرتبہ اس پر ایسا جنوں سوار ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ ”در السلطنت روم“ میں آگ لگا دی جائے۔ بس حکم کی دیر تھی۔ امیروں اور بڑوں نے فوج کو شہنشاہ کا فرمان سنا کر انہیں شہر میں پھیل کے آگ لگانے کا حکم دیدیا اور انے اس حکم کی پوری تعمیل کی۔ کسی شاہی افسر نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہ کی آخر آگ کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ شہنشاہ کا فرمان ہے کہ ”روم“ میں آگ لگا جائے اور انہوں نے آگ لگانے اور شعلے بلند ہونے کے بعد شاہی محل میں اطلاع دی کہ شہنشاہ کی تعمیل ہو گئی ہے۔

نہایت شہنشاہ روم نے یہ خبر اس طرح سنی جیسے کوئی نوید مسرت سن رہا ہے۔ نیو مے دربار اس وقت تمام بڑے بڑے جزل اور انتظامیہ کے عہدیدار موجود تھے۔ وہ اپنے جزلوں عہدیدار کو ساتھ لے کر شاہی محل کی سب سے بلند چھت پر چڑھ گیا۔ اس وقت کیفیت

یہ تھی روم کے عظیم شہر کے ایک حصہ میں آگ کے شعلے بھڑک رہے آگ بغیر مطلع کئے لگائی تھی اس لئے غریب عوام اپنا تمام مال و متاع چھوڑ کے پناہ حاصل کر ادھر ادھر بھاگ رہے۔ مظلوموں کی چیخیں اور آہ بکا کی آوازیں آسمان تک پہنچ رہی تھیں اس خوفناک عبرت انگیز اور لرزہ خیز مناظر کا نیو پر یہ رد عمل تھا کہ وہ بھڑکتے کو دیکھتا اور قہقہے لگاتا۔ اس کے درباری بھی اس کے ہنسنے میں اپنی آواز شامل کر اس طرح شاہی محل پر قہقروں کا سیلاب تھا اور روم کی آبادی شعلوں کی لپیٹ میں درو دیوار گر رہے۔ ستون اکھڑ رہے تھے اور کتب خانوں اور عجائب گھروں میں نوا سلگ رہے تھے۔ نیو تو مر گیا لیکن رواں کی سفاکی اور حماقت کا یہ خوبی ساتھ تار اور اراق میں محفوظ ہو گیا۔ اس سانحہ پر مضامین لکھے گئے۔ افسانے اور ناولیں ترتیب کیں لیکن کسی مصنف یہ جملہ ایک یادگار بن گیا وہ جملہ یہ تھا۔

”روم جل رہا تھا اور نیو قہقہے لگا رہا تھا“

خیر یہ تو ایک جملہ مقررہ تھا۔ اب ہم پھر اصل کہانی کی طرف آگئے ہیں۔ اشاریا کو ستون کی آر میں کھڑے دیکھا تو محبت سے آواز دی۔

”اشاریا بیٹی ادھر آؤ۔۔۔“

اشار ستون سے ہٹ کے باپ کے پاس آگئی۔ بیٹھے سے پہلے اس نے مسٹر ہیڈ۔ اوب سے سلام کیا۔ انہوں نے اشاریا کو بزرگانہ دعا دی۔

بابا نے تعارف کرایا۔۔۔ ”ان سے ملو بیٹی“ یہ تمہاری ہم نام ہیں۔ اور یہ یہ ہیں ہیڈ۔ ان کے والد۔۔۔ یہ بتاتے ہیں۔۔۔“

”آپ ٹھہرے بھائی صاحب۔“ مسٹر ہیڈ نے قطع کلام کیا۔ ”میں اس کی تہ بتاتا ہوں۔ دو تین ماہ پہلے مارکوئیس کو نرید سے ایک محفل میں میری ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات نہ تھی بلکہ اس کا اہتمام میری بیٹی نے خود کیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں جوان! باپ کس قدر پریشان ہوتا ہے پھر اس صورت میں تو اس کی پریشانیوں اور ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں جب بیٹی کی ماں اسے اکیلا چھوڑ کے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے۔ سال پہلے میری بیوی نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا اور باپ کے ساتھ ساتھ ماں کی داریاں بھی مجھ پر آئیں۔

جب میری بیٹی نے مارکوئیس کو نرید کو مجھ سے ملایا تو اسے دیکھ کر اور اس کی

کی گفتگو سن کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ مجھے معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ مجھے مارکوئیس کی شکل میں ایک بہترین داماد بلکہ اپنا سگا بیٹا نظر آیا پھر جب مجھے یہ معلوم ارکوئیس کو نرید اب تک غیر شادی شدہ ہے اور میری بیٹی میں دلچسپی بھی لے رہا ہے سرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

مارکوئیس کو نرید سے پہلی ملاقات کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو خوشی سے میرے پر نہ پڑتے تھے پھر گر گیا بھی رات گئے واپس آگئی۔۔۔“

بابا یہ گر گیا کون ہے مسٹر ہیڈ لے۔۔۔“ بابا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

بابا یہ کوئی نو ہے گر گیا۔۔۔“ مسٹر ہیڈ نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ ”اس کا اصل نام ہے۔ اشاریا کا نام تو میں نے اس کو مارکوئیس کو نرید کے کہنے سے دیا تھا۔۔۔“

اب یہ نام رکھنے کو کیوں کہا تھا؟“ بابا نے دلچسپی سے پوچھا۔

مارکوئیس کو نرید نے کہا تھا کہ اشاریا اس کی پہلی محبت تھی جس کا ایک حادثہ میں نال ہو گیا تھا۔۔۔“ مسٹر ہیڈ نے بتایا۔۔۔ ”یہ کہنے کے بعد مارکوئیس کو نرید نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے گرینا کے بجائے اشاریا کے نام سے پکار سکوں۔ میں نے شرط پر اجازت دے سکتا ہوں کہ گرینا کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ گرینا نے اسے جی تب سے مارکوئیس نے گرینا کو اشاریا کہنا شروع کر دیا۔“

اشاریا اپنی جگہ سے اٹھ کے گرینا کے پاس آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ پھیلا کے اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئیں جیسے مدت سے بچھڑے ہیں۔

ہیڈ لے۔۔۔“ اشاریا، گرینا سے الگ ہو گئی۔“ آپ کو اختیار ہے کہ آپ گرینا کو اسے پکاریں یا اشاریا کے فرضی نام سے۔ یوں نام کے بدل جانے سے تقدیر کرتی۔ ہم دونوں کی تقدیریں بھی یکساں ہیں۔ مارکوئیس کو نرید نے ہم دونوں ہی سے۔ فرق صرف رہا کہ مجھے اس نے شادی کر کے دھوکہ دیا اور گرینا کو شادی نہ کر جاہ کیا۔“

بابا نے کہا۔۔۔ ”میرے پیارے باپ۔ اب میں آپ کو کبھی پریشان نہیں کی وقت بہت پریشان ہوئی تو اصلی اشاریا سے ملنے چلی آیا کروں گی۔“

جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا باپ بول پڑا۔ ”مسٹر ہیڈ لے اور بیٹی گرینا۔ میں معلومات حاصل کی ہیں ان سے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ مارکوئیس کو نرید نازوں کی تعداد میں اختلاف ہے) جہازوں کے ساتھ رومی شہنشاہ اسحاق کے

دربار میں حاضری کے لئے تفسیفہ گیا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ مگر کہ شہنشاہ تفسیفہ سے ملاقات کے بعد اٹلی (اطالیہ) واپس آجائے یا پھر کوزیڈ (میلیہ جنگ) میں حصہ لینے کے لئے فلسطین چلا جائے۔“

گریشا چی پیڑی۔ ”تفسیفہ جاتے یا فلسطین میرے لئے تو وہ مرچکا ہے اب اگر واپس بھی آیا تو میں اسے منہ نہ لگاؤں گی اس لئے ایک تو وہ فریبی اور بدکار ہے دوسرے کہ وہ میری پیاری سسلی اشاریا کا جائز اور قانونی شوہر ہے۔ میں اپنی سسلی کے حق پر دائر ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

اشاریا نے گریشا کو اپنی طرف کھینچ کے اس کا منہ چوم لیا۔ ”گریشا میں خداوند مسیح کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر مارکوئیس کوزیڈ اطالیہ واپس آگیا تو اسے منہ لگاؤں گی طرف رہا میں چرچ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی کہ اس نے مجھے شادی سے پہلے بھی دھوکہ دیا اور بعد میں بھی۔۔۔“

اس موقع پر اشاریا کے باپ نے اسے ٹوکا۔ ”کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔ ہم مارکوئیس کوزیڈ کے خلاف چرچ میں مقدمہ نہیں کر سکتے؟“

”کیوں نہیں کر سکتے بابا۔۔۔“ اشاریا بڑے جوش سے بولی۔ ”میں لارڈ پارڈی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرلوں گی کہ اس کے گناہ میں میں بھی شریک تھی لیکن سسلی جا شادی کرنے کا فیصلہ مارکوئیس کوزیڈ کا تھا اور وہی مجھے اور آپ کو درغلا کے سسلی لئے تھا۔“

مسٹر ہیڈلے نے کان کھڑے کئے۔ ”کیا مارکوئیس اور اشاریا کی شادی سسلی میں تھی۔؟“

”جی ہاں سسلی میں ہوئی تھی اور اس میں بھی مارکوئیس کوزیڈ کی ایک چال تھی۔ اشاریا کے بابا نے جل کے کہا۔ ”مگر اب ان باتوں کو کرنے سے کیا فائدہ۔ مارکوئیس ہانچ سے بہت دور ہو چکا ہے۔ اگر وہ فلسطین چلا گیا تو شاید اس کی مٹی سوارت ہو جائے وہ تفسیفہ گیا تو یقین ہے کہ وہ وہاں کتے کی موت مارا جائے گا۔“

مسٹر ہیڈلے اور گریشا دونوں ہی اس بات سے پریشان ہو گئے۔ ہیڈلے کے دل بات کی وضاحت کی خواہش تو ضرور تھی لیکن وہ اس موقع پر اشاریا کے باپ کو ہار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے منہ سی لیا۔

گریشا کے دل میں بھی ایک جھین سی تھی وہ چاہتی تھی اشاریا یا اس کا باپ اس کی وضاحت کرے کہ مارکوئیس کوزیڈ اور اشاریا کی شادی مانسٹرٹ کے بجائے

کی تھی۔ اشاریا کے باپ نے محسوس کر لیا کہ اشاریا اور مارکوئیس کوزیڈ کی شادی کے میں آنے والے باپ بیٹی کے دل میں کچھ شکوک و شبہات ہیں اس لئے انہوں ہی یہ بات صاف کر دی۔

مسٹر ہیڈلے۔ اس وقت ہم اور آپ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اس لئے آپ ان بات پوشیدہ رکھنا فائدے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اس لئے میں نے دل میں اٹھتے ہوئے شبہات کو دور کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ دراصل جب مارکوئیس کا ہمارے گھر آنا جانا ہوا اور اس نے اشاریا سے تعلقات بڑھانا شروع کئے تو میں نے اشاریا کو بتایا کہ وہ اپنے تعلقات کو ایک حد کے اندر رکھے ورنہ اسے نقصان پہنچ سکتا میں اپنی بیٹی کا باپ ہونے کے علاوہ دوست بھی ہوں اور میری بیٹی ہر اچھی بری بات، نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتی ہے۔

”میرے اس بروقت اعتراض پر اشاریا نے مجھے بتایا کہ وہ تعلقات کی حد مقرر کر چکی ہے کہ مارکوئیس کوزیڈ کا دل صاف ہے اور وہ اس سے شادی کرنے کی بہت جلد مت کرنے والا ہے۔ اس وقت میں نے اشاریا کو بتایا کہ اس کی شادی مارکوئیس سے اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس کی (اشاریا) کی عمر چرچ کے قانون کے مطابق ابھی کے قابل نہیں۔ میرے اس جواب پر اشاریا چپ ہو گئی۔ اس نے مارکوئیس کوزیڈ نامی چھوڑ دیا اور ہر گھڑی اداس اداس رہنے لگی۔

”اشاریا میرا کھوتی اولاد ہے اس لئے مجھے فطرتاً اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اس سردی سے میں بھی افسردہ ہو گیا۔ میں خود چاہتا تھا کہ اشاریا اور مارکوئیس کی شادی بے غم میں مجبور تھا۔ چرچ کا قانون تو شہنشاہ بھی نہیں توڑ سکتا تھا پھر بھلا میں کیا کرنا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح دونوں ادا ہو جائے۔

”مصیبت کے وقت لوگ یار دوستوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ایک رٹائزڈ کرنل میرے ساتھ تھے اور ہمدرد بھی۔ میں اپنا دکھڑا ان سے روایا۔ میں اشاریا کو ان کے پاس لے گیا انہوں نے اشاریا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے تسلی دی اور کہا کہ مجھے اشاریا اور میں کو ان کے ساتھ سسلی (جزائر مقلیہ) چلنا ہو گا کیونکہ یہ کام وہیں ہو سکے گا۔

”مختصر یہ کہ ہم سب جزائر مقلیہ پہنچے۔ میرے دوست نے وہاں کے چرچ کے لارڈ مانسٹرٹ کی۔ وہ میرے دوست کا بچپن کا ساتھی تھا۔ اس طرح اس کی مدد سے یا اور مارکوئیس کی شادی سسلی میں ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر مارکوئیس مشکل سے ایک

کوزیڈ کے ساتھ ایک چھوٹا سا بحری بیڑہ تھا جس پر جہازوں کے عملے کے علاوہ بارہ سو اور مہم جو جوان سوار تھے۔ یہ خبریں سچ تھیں کہ مارکونیس اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے خط و کتابت ہوئی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ مارکونیس کوزیڈ ہر کام سے پہلے اپنے منصوبہ بناتا تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس نے قسطنطنیہ جانے کا کب منصوبہ بنایا شہنشاہ اور اس کے درمیان کتنے عرصہ سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ چونکہ اٹلی اور کے الگ الگ دو شہنشاہ تھے اس لئے مارکونیس اور قسطنطنیہ کی خط و کتابت بہت خفیہ فی اور دونوں طرف کے خطوط بھیجنے والوں کے خاص قاصد لاتے اور لے جاتے تھے۔

س جگہ روم کے دو شہنشاہوں کی بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کسی ہے کہ ایک بیان میں دو تلوایں نہیں رہ سکتیں اور ایک سلطنت کے دو بادشاہ نہیں مگر سلطنت روما کے دو شہنشاہ تھے۔ ایک شہنشاہ سلطنت روما شرقی اور شہنشاہ سلطنت اٹلی کلاتا تھا۔ شرقی شہنشاہ کو باز لیبینی شہنشاہ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا اسی طرح شہنشاہ کو شہنشاہ رومہ الکبریٰ بھی کہا جاتا تھا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ روما جس کا دار السلطنت اٹلی کا شہر روم تھا وہ یورپ کی سب سے بڑی اور طاقتور تھی۔ بس روم کا شہنشاہ مطلق العنان ہی نہیں تھا بلکہ اس نے خدا کے اختیارات مال رکھتے تھے۔ شہنشاہ کو خدا کا روتا نام دے کر اس کے اختیارات لامحدود کر دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب طاقت کسی ایک فرد واحد کے ہاتھ میں جمع ہو جائے معاشرے کی آجاتی ہے۔ ہر بڑا اپنے سے چھوٹے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہم کی نہ مطلق العنانی حکومت صدیوں تک اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ اس کی سرحدیں چین اور پھیلیں۔ نصف سے زیادہ یورپ اس کے قبضہ میں تھا۔ ایشیا میں ملک شام ماکہ عیسائی ریاست بھی سلطنت روم کی سیادت تسلیم کرتی تھیں۔ شمالی افریقہ کے لاقہ بھی اسی کے ماتحت تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی وسیع سلطنت کے انتظامات میں ہوتی تھیں جس کے نتیجے میں بغاوت کا ہونا لازمی تھا۔

رودراز کے علاقوں میں بغاوتوں کو روکنے اور ملکی انتظام میں گڑبڑ کو دور کرنے اور سلطنت روم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک سلطنت روما یا روم شرقی اور سلطنت روم غربی۔ اس طرح مغرب کا شہنشاہ شہنشاہ رومہ الکبریٰ اور شرقی کا شہنشاہ باز نطین کلاتے اور پکارا جانے لگا۔ پس مارکونیس کوزیڈ نے روم کے جس شہنشاہ کتابت کی تھی وہ روم شرقیہ کا شہنشاہ باز نطین اسحاق تھا۔

مارکونیس کوزیڈ کے باز نطینی شہنشاہ کو اپنے جنگی کوائف لکھتے ہوئے یہ تحریر کیا تھا کہ

ماہ ٹھیک رہا اس کے بعد اس نے رنگ بدلنا شروع کئے۔ میری بیٹی نے اس کا پیچھا کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے تو کلب کی بہت سی لڑکیوں سے تعلقات ہیں۔ مارکونیس میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا مگر وہ رات کو اکثر غائب رہنے لگا۔ میاں بیوی میں اس بات پر کئی بار اختلاف ہوا۔ باپ ہونے کی حیثیت سے میں ہمیشہ اشاریا ہی کو ڈانٹتا اور سمجھاتا رہتا۔ مگر مارکونیس کے دل میں تو چور تھا۔ اس لئے وہ ایک دن کچھ کسے سے بغیر چپکے سے یہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کے دوستوں نے یہی بتایا کہ وہ کوزیڈ میں حصہ لینے فلسطین گیا ہے لیکن اس کے ایک دوست نے جو کسی وجہ سے اس سے خفا ہو گیا تھا اس نے مجھے صاف بتایا کہ مارکونیس کوزیڈ نے شہنشاہ قسطنطنیہ سے خط و کتابت کی تھی اور اب وہ شہنشاہ کے بلاوے پر قسطنطنیہ گیا ہے۔“

مسٹر ہیڈلے اور گرینا رخصت ہو گئے۔ وہ دونوں افسردہ آئے تھے اور افسردہ ہی والہی گئے۔ ان کی افسردگی میں تو کوئی کمی نہ ہوئی مگر انہیں ایک ہمدرد گھرانہ مل گیا۔ گرینا اور اشاریا میں خوب دوستی ہو گئی۔ اس سے دونوں کی طبیعت پر اچھا اثر پڑا۔ اب ان کے چہرے اکثر خوشی سے دکھ اٹھتے تھے۔ مارکونیس کوزیڈ تو ان دونوں میں سے ایک کو بھی نہ ملا مگر انہیں ایک اچھی سیلی مل گئی۔

ان کے سلسلہ میں بات اور سن لیجئے کہ دوسرے سال کے آغاز میں دونوں کے گھر مارکونیس کوزیڈ کے الگ الگ دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان دونوں کی صورتیں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے مشابہ تھیں اور انہیں جڑواں بچے سمجھا جانے لگا تھا۔ اشاریا کی مارکونیس کوزیڈ سے شادی ہوئی تھی پھر بھی وہ اس بچہ کو جائز ثابت نہ کر سکی اس لئے وہ کرٹل جس نے اشاریا اور مارکونیس کی سسلی نے جاکر کرائی تھی، اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ گرینا کا بیٹا تو ناجائز تھا ہی۔

یورپ کے قانون میں ناجائز اولاد پیدا کرنا کسی جرم کے تحت نہیں آتا۔ وہاں سب سے بڑا جرم یہ کہ کوئی لڑکی بلاغت کی عمر تک پہنچے بغیر اگر شادی کرے تو مرد اور عورت دونوں کو سزا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مرد ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ لیکن مرد کو بیوی کی موجودگی اور بیوی کو میاں کی موجودگی میں دوسری عورتوں اور مردوں سے ناجائز تعلقات پیدا کرنے کی پوری اجازت ہے۔

اور آخر مارکونیس کوزیڈ، مانسٹرٹ اور اٹلی کے دوسرے شہروں میں جائز اور ناجائز دونوں طریقے سے رنگ رلیاں بنا کر قسطنطنیہ پہنچ گیا۔

جانب کی نظریں خط میں لکھے ہوئے لفظ ”شادی“ پر گھوم پھر کے رک جاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ مارکوئیس کو کسی طرح علم ہو گیا ہو کہ شہنشاہ کے ایک بہن بھی ہے اور وہ جوان اور باری بھی ہے اور اس نے شہنشاہ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہو کہ وہ قسطنطنیہ آکر لڑکی بھی کرے گا۔

مارکوئیس کو نرید جیسے شاطر آدمی کی ذات سے ہر بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ عین اس لیے کہ مارکوئیس کو شہزادی اسحاقیہ کے بارے میں کسی طرح معلومات حاصل ہو گئی ہیں اور اس نے سوچا ہو کہ مذہبی جنگ کے بعد اس کی اہلی واپسی تو ناممکن ہو گی کیونکہ اس کی ایک بیابا بیوی اسٹاریا کے علاوہ کتنی اور لڑکیاں بیٹھی اس کی جان کو کوس رہی ہوں گی۔ اس لیے اس نے اس خط مقدم (دوراندیشی) کے طور پر شہنشاہ کو اس مضابطہ میں ڈال دیا ہو کہ قسطنطنیہ پہنچ کے شادی کرے گا اور اگر شہنشاہ کی بہن اس وقت تک غیر شادی شدہ رہی اس کی پہلی پسند شہزادی اسحاقیہ ہی ہو گی۔

مارکوئیس کو نرید نے اپنے قسطنطنیہ آنے کی تاریخ و مہینہ کا کوئی ذکر نہ کیا تھا کہ ایک اس زمانہ میں تیز رفتار ذرائع سفر موجود نہ تھی۔ خشکی کا سفر عام طور پر گھوڑوں پر ہوتا تھا اور بحری سفر میں وہ دفائی جہاز استعمال ہوتے تھے جن کی رفتار بہت ہی کم ہوتی لیکن مارکوئیس کے قسطنطنیہ آنے کی تاریخ کا کوئی اندازہ بھی نہ ہو سکتا تھا لیکن شہزادی اسحاقیہ کی آمد کا اس طرح انتظار کر رہی تھی جیسے مارکوئیس نے اسے ہی اپنے آنے کی اطلاع دی ہو۔ وہ روز شہنشاہ ایک دو بار مارکوئیس کو آمد کے بارے میں ضرور سوال کرتی تھی۔

مارکوئیس کو نرید میں بہن کی اتنی دلچسپی محسوس کر کے شہنشاہ بہت خوش تھا۔ وہ شہزادی اسحاقیہ کی طرف سے بہت پریشان رہتا تھا۔ شہزادی کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے لیے کوئی رشتہ نہ مل رہا تھا۔ یہ نہیں کہ شہزادی خوبصورت نہ تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل لائبرہ تھی۔ بڑی بڑی زرگی آنکھیں گول چہرہ، شہابی رنگت۔ دراز قامت اور متناسب بدن۔ شہزادی اسحاقیہ کی سب سے بڑے خوابی یہ تھی کہ وہ شہنشاہ قسطنطنیہ کی جیتی بہن تھی۔ اس کی یہی خوبی اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتی تھی۔

پندرہ سولہ سال کی عمر میں شہزادی اسحاقیہ کے کئی رشتے آئے۔ اس میں کچھ رشتے منقرض اور شاہی معیار پر پورے بھی اترتے تھے لیکن اس وقت شہزادی چھوٹی بچی تصور کی جاتی تھی۔ وہ بچکانہ کھیل کھیلتی اور بچکانہ ضدیں کرتی تھی۔ شہنشاہ نے یہ کہہ کر رشتوں سے انکار کر دیا کہ ابھی شہزادی بہت کم سن ہے اور یہ اس کے کھیل کود کے دن ہیں۔ ایک دو سال اس حال میں گزر گئے۔ پھر جو رشتے آتے تو وہ شہزادی اسحاقیہ نے خود ناپسند کر

اس نے اپنی عمر کو کروسیڈ (میلیبی جنگ) کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس کے لیے اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر اسے کروسیڈ میں کامیاب حاصل ہوئی اور اس کی کوششوں سے یروشلم مسلمانوں کے ہاتھ سے آزاد ہو گیا تو وہ وہاں سے کامیاب واپسی پر مانسٹرٹ جانے کے بجائے قسطنطنیہ میں رہائش کا پروانہ عطا جائے۔

مارکوئیس کو نرید نے بے شک اپنی ذاتی قابلیت اور جنگی اور بحری اہلیت کی بنا پر جنگوں میں حصہ لیا تھا اور شہرت بھی اس قدر حاصل کی تھی کہ جب مارکوئیس کو نرید کا پر خط اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے شہرت کی بنا پر مارکوئیس کو پہچان لیا۔ اس کی بد قسمتی اور مارکوئیس کو نرید کی خوش قسمتی کہ شہنشاہ اسحاق کی ایک جوان بہن جو شہزادی اسحاقیہ کے نام سے جانی جاتی تھی، قسطنطنیہ میں کنواری بیٹھی تھی شہزادی کی عمر پچیس سال کے قریب تھی اور اسے اب تک کوئی رشتہ نہ ملا تھا۔

پس شہنشاہ اسحاق کو جب مارکوئیس کو نرید کا پہلا خط ملا جس میں اس نے اشارات اپنے کنوارے ہونے کا ذکر کیا تھا تو وہ خط شہنشاہ نے اپنی بہن کو قصداً پڑھنے کے لیے دیدیا۔ شہزادی نے مارکوئیس کو نرید کا پہلے ایک بار کسی سے نام سنا تھا۔ یہ اس کی سہیلی جو ایک سال اٹالیہ (اٹلی) میں رہ چکی تھی۔ اس نے شہزادی اسحاقیہ کے سامنے مارکوئیس کو نرید کی حیرت انگیز شخصیت اور دلچسپ باتوں کا کچھ اس انداز سے تذکرہ کیا تھا کہ شہزادی اس پر ان دیکھے ہی عاشق ہو گئی تھی۔ اگر شہزادی کی سہیلی قسطنطنیہ میں کچھ دن اور رہا ہوتی تو شاید وہ شہزادی کے ان دیکھے عشق کی داستان مارکوئیس کو نرید کو لکھ چکی ہوتی۔ اچھا ہوا کہ سہیلی کچھ دن قسطنطنیہ میں رہنے کے بعد اپنے گھر فرانس واپس چلی گئی تھی۔ اب اس کے بھائی شہنشاہ نے اسے مارکوئیس کو نرید کا اچانک خط دیا اور اس نے آ میں مارکوئیس کو نرید کا نام پڑھا تو وہ مارکوئیس کے تصور میں ایسی کھوئی کہ صبح سے دوپہر ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ مارکوئیس کو نرید نے اس خط میں سوائے قسطنطنیہ آنے کے کوئی بات نہ لکھی تھی لیکن شہزادی اسحاقیہ کے تصور میں خود اس کے خیالوں کی مارکوئیس کو نرید کی ایک تصویر گردش کرنے لگی۔ شہزادی اس خط کو بار بار پڑھتی اور اپنے طور اس کا کوئی غلط مطلب نکالتے خوش ہو جاتی۔

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مارکوئیس کو نرید نے اپنے خط میں سوائے کروسیڈ کے متعلق اور کسی بات کا ذکر نہ کیا تھا اور صرف ”مننا“ یہ لکھا تھا کہ اگر وہ مذہبی جنگ میں زندہ رہا تو قسطنطنیہ آکر اپنی بقیہ زندگی شہنشاہ قسطنطنیہ کے سامنے میں گزارے گا لیکن شہزادی

اے کہا۔

”مذہبورت ہے۔ شجاع ہے۔ مشہور ہے۔ کم عمر ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔ اب کی کوئی بات باقی ہے۔“ شہنشاہ نے شہزادی کو مجبور کر دیا۔

”ٹھیک۔ میں نا نہیں پسند کرتی ہوں لیکن ان کی پسند بھی تو معلوم کرنی ہو گی۔“ شہزادی نے جواب دیا۔

”شہزادی اگر مارکوئیس کو نزیڈ میں بیٹیں خوبیاں ہیں تو اس کے مقابلہ میں تم میں چالیس اپائی ہیں۔“ شہنشاہ بڑے تکبر سے بولا۔ ”تمہاری سب بڑی خوبی تو یہ ہے کہ تم سلطنت کے تاجدار اور شہنشاہ روم شرقی آتزرک (اسحاق) کی بہن ہو۔ مارکوئیس کے یہ کیا کم اعزاز ہو گا کہ اس کے گھر ایک شہنشاہ کی بہن ہو گی۔“

”بے شک شہنشاہ بھائی آپ نے درست فرمایا۔“ شہزادی جواب دے کے خاموش

شہنشاہ نے بھی اس وقت زیادہ گفتگو مناسب نہ سمجھی۔ مارکوئیس کو نزیڈ کوئی ایسی اہم نہ تھی کہ شہنشاہ کو خیال ہوتا کہ وہ شہزادی کو قبول کرنے سے انکار کرے گا۔ شہنشاہ اہتا تو اپنے کسی امیر یا وزیر سے شہزادی بڑی آسانی سے کر دیتا لیکن شہنشاہ اپنے بہن کی شہزادے کی نسبت کا انتظار کرتا رہا پھر یہ ہوا کہ شہزادوں کے رشتے آئے لیکن اس سے بعض کو شہنشاہ نے نامنظور کیا اور جنہیں شہنشاہ نے پسند کیا وہ شہزادی اسحاقیہ کی میں نہ سائیکے اور انہیں ناکام ہونا پڑا۔

پھر شہزادوں کے رشتے آنا بند ہو گئے۔ امیروں، وزیروں نے اس لئے رشتہ نہ بھیجا کہ دی کی بد دماغی یا بد مزاجی سے واقف تھے۔ شہنشاہ اور شہزادی دونوں نے مارکوئیس سے اس لئے امید واپست کر لی تھی کہ وہ اگرچہ شہزادہ نہ تھا لیکن اس نے اپنی اور بیدار مغزی سے اس جوانی میں کئی اہم بحری معرکے جیتے تھے اور شہزادوں سے زیادہ عزت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے طور پر مارکوئیس کو شہزادوں کا درجہ عطا کر دیا تھا۔

شہنشاہ کو مارکوئیس کو نزیڈ اور شہزادی اسحاقیہ کی شادی کا اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ اس کوئیس کو نزیڈ کے قسطنطنیہ میں قیام و طعام کی ذمہ داری شہزادی کے سپرد کر دی تھی رادی اسحاقیہ نے یہ ذمہ داری شکریہ کے ساتھ قبول کی تھی۔ شہزادی کو دن بھر کام ہی نہ تھا۔ ادھر بیٹھی۔ کسی کو ڈانٹا تو کسی سے خوش ہو کر اس کا دامن جواہرات سے بھر

شہنشاہ بہن کا بہت خیال رکھتا اور اس کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔

دیے۔ وہ لاڈلو پیار میں بہت ضدی اور خود سر ہو گئی تھی اس لئے اس کی نظریں کوئی چٹا ہی نہ تھا۔

مزید تین چار سال کا عرصہ خود شہزادی نے انکار کر کے ضائع کر دیا۔ اس طرح شہزادی کی عمر تیس سال کی ہو گئی۔ اس عمر میں لڑکیوں کے چہرے پر بھولے پن کے بجائے خاص قسم کی سنجیدگی آجاتی ہے جو اسے اور زیادہ عمر رسیدہ بنا دیتی ہے۔ یوں شہزادی شادی کے دن نکل گئے اور اس کے رشتے آنا بھی بند ہو گئے۔ اب جو اطالیہ سے مارکوئیس کو نزیڈ کا خط آیا تو جیسے شہزادی کے خزاں رسیدہ گلستان میں اچانک بہار آگئی۔ اس افسردہ چہرے پر رونق آگئی اور ڈھلتی جوانی کا روڑھا پن جاتا رہا۔

پھر دوسرا خط قاصد لے کر آیا۔ اس میں مارکوئیس کو نزیڈ نے شہنشاہ کو اطلاع دی کہ وہ اطالیہ کے ساحل سے روانہ ہو چکا ہے اور کسی وقت بھی قسطنطنیہ پہنچ سکتا ہے شہزادی اسحاقیہ نے یہ خط پڑھا تو وہ مسرت سے جھوم پڑی۔ شہنشاہ اسحاق نے شہزادی اسحاق کو شام کے وقت اپنے کمرہ خاص میں طلب کیا۔

”شہزادی تم نے مارکوئیس کو نزیڈ کو خط پڑھ لیا؟“ شہنشاہ اسحاق نے مسکراتے ہو۔ دریافت کیا۔

”جی شہنشاہ بھائی۔ خط پڑھ لیا میں نے۔“ مسرت سے شہزادی کا کلیجہ ہلکتا اچھل تھا۔ ”کب آرہے ہیں شہزادے کو نزیڈ؟“

شہزادی۔ کو نزیڈ شہزادے نہیں بلکہ امیر البحر ہیں۔ پندرہ بحری جہازوں کے افرام ... شہنشاہ نے وضاحت کی۔

”میں جانتی ہوں شہنشاہ بھائی۔“ شہزادی نے اٹھلا کے کہا۔ ”ہمارے مارکوئیس کو نزیڈ شہزادوں سے کسی طرح کم ہیں کیا! میں تو انہیں شہزادوں سے زیادہ اہم سمجھتی ہوں۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ شہنشاہ نے تعریف کے انداز میں کہا۔ ”مارکوئیس کا نزیڈ بہت خوبیوں کا مالک جوان ہے۔ میں نے بہت لوگوں سے اس کی تعریف سنی ہے۔“

شہنشاہ نے انتظار کیا کہ شاید شہزادی کچھ کہے گی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی دراصل شہنشاہ کی اس قدر تعریف سے شرمائی جا رہی تھی۔

شہنشاہ نے شہزادی سے پوچھا۔ ”کیوں شہزادی، مارکوئیس کو نزیڈ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”سب کی بات نہیں۔ تم اپنی پسند بتاؤ؟“ شہنشاہ نے اسے پابند کرنے کی کوشش کی۔

”یوں تو مجھے وہ پسند ہیں مگر فیصلہ تو میں دیکھ ہی کے کروں گی۔“ شہزادی اسحاقیہ نے

شہزادی کو مارکوئیس کی مہمان نوازی کی ذمہ داری ملی تو اس نے فوراً ہی شاہد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اور والیان ریاست سرحدوں کے قسطنطنیہ آیا ہی کرتے تھے۔ شہزادی کو نئے نئے لوگوں سے ملنے کا شوق تھا اس لئے مہمان نوازی کے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی اور انتظامات کے سلسلہ میں ہر جگہ موجود تھی۔ اب تو اسے خود ہی میزبان کا درجہ دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ شہزادی اسحاقیہ نے فوراً انتظامات شروع کر دیے۔

شہزادی کو سب بڑی یہ فکر تھی کہ مارکوئیس کو نرید کیسے اچانک ساحل پر نہ جائے۔ شہزادی دراصل مارکوئیس کو ساحل سمندر پر شاہانہ استقبال کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے لازم تھا کہ اسے مارکوئیس کے آنے کی کچھ دیر پہلے خبر مل جائے۔ اس کی تدبیر شہزادی نے یہ کی کہ دو تیز رفتار کشتیاں اس نے دور سمندر میں بھجوا دیں۔ ان کشتیوں کی داری تھی کہ وہ مارکوئیس کو نرید کے بیڑے کی تصدیق کرتے ہی فوراً "شہزادی کو مطلع دیں تاکہ شہزادی ساحل سمندر پر پہنچ کر مارکوئیس کو نرید کو خوش آمدید کہہ سکے۔

شہنشاہ اپنی بہن کی خاطر مارکوئیس کو نرید کے استقبال کو خود بھی ساحل سمندر پر جا کے لئے آمادہ تھا مگر شہزادی نے خود ہی اسے روک دیا تھا۔ شاہی خاندان اور امرا سلطنت کو جب معلوم ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ ایک معمولی بحری بیڑے کے امیر البحر استقبال کو ساحل پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ لوگ فوراً "شہزادی اسحاقیہ کے پاس گئے۔

شہزادی کو ان کا انداز ناگوار گزرا۔ اس نے بھی اسی سختی سے جواب دیا۔ "امراء سلطنت۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے انتظامات دیکھنے کے لئے یہاں تشریف لائے۔ جہا تک شہنشاہ کے استقبال کے لئے ساحل پر آنے کا سوال ہے اس کے لئے افسوس کی ساتھ آپ کو مطلع کرتی ہوں کہ نہ تو میں شہنشاہ کی افسر بکار خاص (CD) ہوں کہ اس قسم کی اطلاعات آپ کو فراہم کر سکوں اور نہ مجھ میں یہ ہمت کہ کہ میں شہنشاہ کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگا سکوں۔"

دند بنا کے آنے والے امرا اور اس کے عزیز و اقارب اپنا سامانہ لے کے رہ گئے یوں کہنا چاہئے کہ وہ گھگھیا نے اور کھیا نے لگے۔ ایک نے خوشامد انداز سے کہا۔ "شہزادی عالیہ نے درست فرمایا۔ شہنشاہ معظم کو کون روک سکتا ہے۔ شہنشاہ تو شاہنشاہ ہوتا ہے۔ انہیں تو ہر بات کا اختیار ہے۔"

"اے عقلمند امیر۔" شہزادی کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت ہو گیا۔ "جب آپ کو ملتا

شہنشاہ مطلق انسان ہیں تو پھر آپ یہ دند لے کر میرے پاس کیوں آئے۔ میں یہاں شاہی مہمان کے استقبالی انتظامات دیکھنے آئی ہوں اس لئے کی یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ میں یہ نہیں جانتی کہ اس استقبالیے میں کون آئے گا۔ کون شریک ہو گا اور کسی کو بلایا جائے گا۔ اگر شہنشاہ نے یہاں آنے کی مجھے اطلاع دی تو میں انہیں روکنے والی ہوتی ہوں۔ آپ نے خود کہا ہے کہ بادشاہ تو پھر بادشاہ ہوتا ہے اسے کون روک سکتا

شہزادی حرم سرارے شاہی پر پہنچی تو اسے بتایا گیا کہ شہنشاہ دوپہر کے کھانے کے بعد فرا رہے۔ شہزادی کو اپنی نادانی پر افسوس ہوا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ خود بھی رکتی تھی۔ اسے یہ پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا کہ یہ وقت شہنشاہ کے آرام کا ہے۔ ات ان سے ملاقات ناممکن ہے لیکن امرا کے دند سے ملاقات نے اسے غصہ دلا دیا۔ ان کے رخصت ہوتے ہی وہ قسطنطنیہ شاہی حرم مرا پہنچ گئی۔ ظاہر تھا کہ اس وقت اسکے راب ملنا تھا۔ حرم سرار کے محافظ شہزادی اسحاقیہ کو پہچانتے تھے۔ شہنشاہ کو عام حالات بار کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ انہوں نے شہزادی کو وہی روایتی جواب دیا جو ایسے دیا جاتا ہے۔

شہزادی واپس جانے کے بجائے برابر کے کمرے میں بیٹھ گئی اور غلام کو کھانا لگانے کا۔ کھانے کا وقت اگرچہ گزر چکا تھا لیکن ناظم مطبخ شہزادی سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے منٹوں میں انتظام کیا خود شہزادی کو اطلاع دینے پہنچا۔ "شہزادی عالیہ۔ کھانا لگ چکا ہے۔ آپ تشریف لے چلے۔" ناظم مطبخ نے شہزادی کو بلا۔

شہزادی ناظم کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ شاید تم نے ہماری بھوک کا اندازہ کر لیا ورنہ اتنی جلدی کھانا تیار نہیں ہو سکتا۔ در شہزادی ناظم کے پیچھے کھانے کی کمرے کی طرف چل پڑی۔

ناظم نے چلے ہوئے کہا۔ "شہزادی عالیہ۔ شاہی محلات کے ملازم خاص کر شاہی خوابگاہ کی مطبخ کے داروغہ صرف حکم سنتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کو ڈرتے ہیں۔ ان کی بات کو قبول حکم میں لیت و عمل کریں یا بھانے تراشیں۔ یہ تو دن کا وقت ہے اگر مطبخ سے نصف شب کے بعد کھانا طلب کیا جائے تو صرف چند لمحوں میں تیار کر کے جائے گا۔"

غیر اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح فرتج اور ہاٹ

پاٹ نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ لوگ اس مثل پر عمل کرتے تھے....
”شہنشاہی چولہا کبھی نہیں بجھتا۔“

شہنشاہی مطبخ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ شہنشاہ سے ملنے والے دور دور سے آتے تھے کھانے وقت نہ بھی ہو تو داروغہ مطبخ کو حکم تھا کہ مہمانوں کو لازمی طور پر کھانا پڑ جائے۔ اسی لئے شہزادی کے کھانا طلب کرتے ہی فوراً میز پر لگا دیا گیا۔ جس مسلمانوں میں عام طور سے دستر خواں کا رواج تھا اسی طرح نصرانی میز کرسی پر کھانا کرتے تھے۔ ہم کس قدر نادان ہیں انگریزوں کو برصغیر چھوڑے نصف صدی گزرنے کے قریب مگر ہم ان کی تقلید میں میز کرسی پر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ فی زمانہ کر بھی متروک ہو گئی ہیں اور دعوتوں میں صرف میزس استعمال ہوتی ہیں اور لوگ شادی و یا شامیانوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے کھانا کھاتے ہیں بلکہ مشغل فرماتے ہیں۔ پیر پیاریوں کی ایک وجہ کھڑے ہو کر کھانا کھانا بھی ہے۔

کھانے کے بعد شہزادی نے وہیں ایک کمرے میں تھوڑے دیر آرام کیا بالفاظ دیگر سیدھی کی۔ اسے امیروں پر سخت غصہ آ رہا تھا اس لئے اسے پوری طرح غنیمت بھی نہ آ مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شہزادی کے ساتھ ہی شہنشاہ بھی بیدار ہو گیا۔
”شہزادی نے حیرت بھری نظروں سے کنیز کو دیکھا۔“ شہنشاہ بھائی کو کیسے معلوم ہو ہم ان سے ملنے آئے ہیں؟“

کنیز نے ادب سے جواب دیا۔ ”شہنشاہ کا حکم ہے ان کے صبح کو بیدار ہونے پر باا کے سونے کے بعد ان کے اٹھنے پر انہیں پہلے یہ بتایا جائے ان کے محو خواب ہونے اور سے کون کون اشخاص ان سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ کے بیدار ہونے انہیں آپ کے آنے کی اطلاع دی گئی اور انہوں نے آپ کو فوراً طلب کر لیا۔“
کنیز کے اس جواب سے شہزادی کا آدھا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے شہنشاہ روم شتی کی مغزی اور دور اندیشی سے بڑے مسرت ہوئی۔ شہزادی نے بھائی کو سلام کیا تو اس نے کیا۔

”شہزادی تم آئی تھیں تو ہمیں بیدار کر لیا ہوتا۔ انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“
”شہنشاہ بھائی....“ شہزادی نے بات بتائی۔ ”کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ میں کو غنیمت سے بیدار کرتی۔ بس یونہی آگئی تھی۔“
”مجھے نہیں چگانا تھا تو پھر واپس چلی جاتیں۔ میں تمہیں تمہارے محل سے بلوا رہا شکایت کے لہجے میں شکایت کے ساتھ محبت بھی تھی۔“

”شہنشاہ بھائی۔ میں آگئی تو سوچا کہ مل ہی کے جاؤں گی۔“ شہزادی اسحاقیہ نے جواب دیا۔ ”غلطی میری ہی تھی۔ مجھے پہلے ہی سوچ لینا تھا کہ یہ وقت آپ کے آرام کا ہے دوسرے کھانے کے بعد آپ تھوڑی دیر آرام ضرور فرماتے ہیں۔“

”ارے ہاں تمہارے کہنے پر یاد آیا۔“ شہنشاہ چونک کے بولا۔ ”تم نے کھانا بھی کھایا یا یک بھوک ہی ہو۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم بہت دیر سے ہمارا انتظار کر رہی ہو؟“
”میں نے یہاں پہنچتے ہی کھانا کھا لیا تھا۔“ شہزادی نے جواب دیا۔
”ہالانکہ مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔“

”کیا کہہ رہی ہو شہزادی....؟“ شہنشاہ فکر مند ہو گیا۔ ”بھوک کا وقت پر نہ کھانا کوئی علامت نہیں۔“

”میری فکر نہ کیجئے شہنشاہ بھائی....“ شہزادی نے ہنس کے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم کی وجہ سے کبھی کبھی کھانا بھول جاتی ہوں۔“
”کام۔ تم سے کام کرنے کے لئے کس نے کہا۔؟“ شہنشاہ کوچ پر سنبھل کے بیٹھ گیا۔ وہ رنے کے لئے ہزاروں نوکر چاکر موجود ہیں۔“

”شہنشاہ بھائی۔ آپ تو بھول جاتے ہیں۔“ شہزادی بولی.... ”آپ نے خود ہی تو مجھے اس کو نرید کے قیام و طعام کی ذمہ داری سونپی ہے۔ صبح سے شام تک اس کے انتظام نہ رہتی ہوں۔ کھانے پینے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔“

”ارے واہ بھی یہ عجیب بات ہو گئی....“ شہنشاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ہمیں نہیں تھا کہ تم اس قدر دلچسپی سے استقبال کے انتظام میں مصروف ہو۔ کام تو ہوتا ہی رہتا پس اتنی جان لگانے کی ضرورت نہیں۔“

”شہنشاہ بھائی۔ آپ نے تو کہا تھا کہ مارکوئیس کا خاص خیال رکھا جائے۔“ شہزادی نے جزیبات دہاتے ہوئے کہا۔ ”اگر ان کے استقبال میں کوئی کمی رہ گئی اور انہیں ہوا کہ انتظامات کی میں ذمہ دار ہوں تو وہ دل میں کیا سوچیں گے۔؟“

شہنشاہ نے شوخ نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔ ”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ جب مار آف مانسٹرٹ کو معلوم ہو گا کہ ان کے استقبال کے انتظامات شہزادی قسطنطنیہ کا پھر وہ کیا سوچیں گے۔ یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔ انتظامات بالکل ٹھیک ٹھاک نہیں تاکہ مارکوئیس کسی بات پر انگلی نہ اٹھا سکے۔“ اور شہنشاہ نے ایک بار پھر ہلکا سا ہر دیا۔

”رہنے دیجئے بھائی جان۔ آپ تو میرا مذاق اڑانے لگے۔“ شہزادی شرارتے ہوئے

ہوں۔ ”شہنشاہ بھائی یہ تو فرمائیے کہ آپ کے کون کون سے امیر و وزیر مارکوئیس کو زیرِ ساحل پر استقبال کریں گے۔۔۔“

”یہ بھی تم اچھا یاد دلایا۔۔۔“ شہنشاہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔۔۔ ”ہمارا خیال ہے کہ مارکوئیس کا پر امیر البحر قسطنطنیہ اور وزیر اعظم مارکوئیس کا اس حثیت سے پر تپاک استقبال کریں گے۔ سید کا پر جوش مجاہد ہے اور وہ اس موقع پر بھی صلیبی جنگ لڑنے فلسطین جا رہا ہے ایسے مجاہدوں اور کلیسا کے سپاہیوں کا استقبال کرنا ہر بادشاہ کا فرض ہے۔ ساحل کے استقبال کے بعد دوسری صبح ہم مارکوئیس کا دربار خاص میں اپنے تمام اور معززین کے ساتھ استقبال کریں گے پھر اسی شب کو اسے ایک شاندار ضیافت اس کا کی عزت افزائی فراہم کیے۔۔۔“

”شہنشاہ نے بالکل درست فرمایا۔۔۔“ شہزادی نے شہنشاہ کی تائید کی۔

پھر کچھ دیر شہزادی اور شہنشاہ مارکوئیس کا زریڈ کے بارے میں ذاتی طور سے گفتگو کر رہے۔ شہزادی کا جی چاہا وہ ساحل پر آنے والے امیروں کو بے نقاب کر کے انہیں دلائے کی کوشش کرے مگر پھر یہ سوچ کے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ ایسے خوشی موقع پر کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہونا چاہئے۔

قسطنطنیہ کا خوبصورت شہر بحر اسود کے کنارے شاخ زریں پر آباد ہے۔ شاخ زریں خشکی اور نمکونی پٹی جو سمندر میں دور تک چلی گی ہے اس کے تین اطراف ہیں سمندر اور صرف ایک طرف خشکی ہے۔ اسی لئے قسطنطنیہ جو ایک نہایت مضبوط قلعہ کی پناہ میں تھا۔ اتنا قابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس پر حملہ کرنے کے لئے بحری جہازوں کی ضرورت تھی لیکن جس بحری راستے سے بیرونی جہاز بحر اسود میں آسکتے تھے اسے باز نہیں (شہنشاہ در مشرقی جہازوں نے گھیر رکھا تھا اور ساحل کے دونوں طرف اس قدر مضبوط مورچے قائم کئے تھے کہ ان کی زد سے بچ کر جہاز بحر اسود میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

قسطنطنیہ کا خوبصورت شہر صدیوں سے سر اٹھائے شاخ زریں کے سینے پر جما ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے تمام جہازوں کو بحر اسود کے بحری راستے سے گزرتا پڑتا تھا اور جب تک کوئی جہاز بحاسود میں داخلہ کا پروانہ نہ حاصل کر لیتا اس کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ بحر اسود میں داخل ہونے کا راستہ ایک تنگ درہ سے گزرتا تھا جسے درہ وانیال کہا جاتا ہے۔

ایک شام شہزادی اسحاقیہ استقبالی انتظامات دیکھ کے آ رہی تھی۔ وہ ابھی اپنی چار گھوڑوں کی بٹھی میں آکے بیٹھی ہی تھی کہ ایک غلام بھاگتا ہوا بٹھی کے پاس پہنچا۔ شہزادی

زور سے اچھلا۔

”کیا بات ہے تم پریشان کیوں ہو؟“ شہزادی نے نرمی سے دریافت کیا۔
”شہزادی عالیہ۔۔۔“ اس نے تیز تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ ”وہی بحری بیڑا آگیا جس کا انتظار تھا۔۔۔“

”آگیا۔۔۔ کہاں ہے وہ؟“ شہزادی پھل کے بگھی سے اتر پڑی۔
”جی وہ ابھی سمندر میں ہے۔ ایک کشتی یہ خبر لے کر ساحل پر آئی ہے اور میں فوراً اس طرف بھاگ پڑا۔۔۔“ غلام نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔

شہزادی واپس ساحل پر آگئی۔ وہاں وہ قاصد موجود تھا جو بحری بیڑے کی خبر لایا تھا۔
”شہزادی کو بتایا کہ چودہ بحری جنگی جہازوں کا ایک بیڑا دور سمندر میں ٹھہرا ہوا ہے۔
”اپنے دو ملاح ساحلی دفتر سے بحری بیڑے کے آنے کی اجازت لانے کے لیے بھیجے ہم روک کے تحقیقات کی تو معلوم ہوا بیڑے کے امیر البحر کا نام مارکوئیس ہے اور انہوں نے شہنشاہ کو خط بھی بھیجے تھے۔

ہاں ہاں وہی ہیں۔۔۔“ شہزادی خوش ہو گئی۔

شہزادی نے اسی وقت استقبال کا انتظام کرنے والوں کو وہیں طلب کر لیا اور انہیں ہدایت دے کر کام میں لگا دیا۔ پھر ایک آدمی کو بادشاہ کی طرف اور دوسرے کو نظم کی طرف روانہ کیا۔ شہنشاہ نے شہزادی سے کہہ دیا تھا کہ جس وقت مارکوئیس نے کی خبر ملے تو وہ وزیر اعظم کو اطلاع کر دے۔ وزیر اعظم استقبال میں شریک ہونے کا اور وزرا کو لے کر ساحل پر پہنچ جائیں گے۔

شہزادی اس کام سے فارغ ہوئی تھی کہ اسے مطلع کیا گیا کہ بحری بیڑے کا ایک جوہر ہے اور وہ ساحل پر کسی ذمہ دار آدمی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ شہزادی نے اس ایک آدمی بھیج کے وہیں بلوایا۔ آدمی نے وہاں جا کے اس آدمی کو بتایا کہ اسے بلاری ہیں۔

”شہزادی کے علم پر وہ چونکا۔“ یہ شہزادی کون ہیں اور مجھے کیوں بلواری ہیں“
شہزادی کے غلام نے جواب دیا۔ ”تم کسی ذمہ دار شخص سے ملنا چاہتے تھے۔ اس آدمی سے زیادہ اور کوئی ذمہ دار ساحل پر موجود نہیں۔ میں تمہیں انہی کے پاس لے رہا ہوں۔

”شہنشاہ کے مہمان کے استقبال کا وہی انتظام کر رہی ہیں؟“
”تمہاری شہزادی کا نام کیا ہے؟“ بحری افسر نے دلچسپی سے پوچھا ”ان کا نام شہزادی

اسحاقیہ ہے۔ محل والے انہیں شہزادی قسطنطنیہ بھی کہتے ہیں اور ایک راز کی بات میں اُن کو بتاؤں....“ غلام بہت باتوں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے غیر ملکی پر رعب جمانے کے لئے راز بتانے کی پیش کش بھی کر دی۔

”ہاں... ہاں ضرور بتاؤ.... راز کی کوئی بات ہے؟“ بحری افسر نے اور زیادہ دلچسپی غلام نے ادھر ادھر دیکھا پھر آہستہ سے بولا.... ”کان ادھر لاؤ کسی کو بتانا نہیں....“ بحری افسر نے کان اس کے منہ کے قریب کر دیا.... ”لو اب بتاؤ....“

اور غلام نے راز اگل دیا.... ”راز یہ ہے کہ شہزادی قسطنطنیہ ہمارے شہنشاہ کی ہیں“

”اچھا تو یہ شہنشاہ کی بہن ہیں؟“ بحری افسر نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔
”ہاں ہاں بہن ہیں شہنشاہ کی....“ غلام نے دوبارہ زور دے کے کہا.... ”اور تم ایک اور راز کی بتاؤں؟“

بحری افسر سمجھ گیا غلام یا تو بہت سیدھا ہے، پھر شہزادی کا کوئی چالاک جاسوس ہے اس پر شہزادی کا رعب ڈالنا چاہتا تھا۔

”تم تو اپنے دوست ہو....“ بحری افسر نے بڑے پیار سے کہا.... ”جتنے چاہے رازہ میں کسی سے کون کا تھوڑی....“

”تو کان کھول کے یہ بھی سن لو کہ شہزادی نے اب تک شادی نہیں کی....“ غلام ایک راز اور اگل دیا۔

”کیوں شادی نہیں کی اب تک؟“ بحری افسر نے پوچھا۔
”بہت خوبصورت ہے نا۔ کوئی مرد پسند ہی نہیں آتا اس کو....“ غلام نے سادگی

بتا دیا۔
بحری افسر اک دم رکا اور بولا۔ ”اچھا بھئی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ....“

غلام نے حیرانی سے اس کا منہ دیکھا۔ ”آپ کیا فرما رہے ہیں۔ شکریہ کس بات کا“

”بس یہی باتیں کرنے کا شکریہ۔“ بحری افسر مسکرا رہا تھا.... ”تم بہت سچے اور آدمی ہو۔ پھر ملاقات ہو گئی....“

یہ کہہ کے بحری افسر واپس ہو کر ساحل کی طرف چلے لگا۔ غلام گھبرا گیا۔ اس نے افسر کو پکڑ لیا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ شہزادی سے ملاقات نہیں کیجئے گا....“ غلام نے بڑا عاجزی سے کہا۔

”نہیں بھائی۔ اب شہزادی سے ملاقات کی ضرورت نہیں....“ بحری افسر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

”کیوں ملاقات کی ضرورت کیوں نہیں۔“ غلام گھبرا گیا تھا.... ”آپ میرے ساتھ ضرور درندہ میری نوکری چلی جائے گی....“ شہزادی پوچھیں گی کہ انہیں کیوں نہیں لائے تو میں جواب دوں گا؟“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ بحری افسر رک کے کھڑا ہو گیا پھر سوچتے ہوئے بولا.... ”اچھا تم دی سے کہہ دینا کہ شہنشاہ کے مہمان دو گھنٹے بعد ساحل پر پہنچ جائیں گے....“

بحری افسر کی یہ بات غلام کی سمجھ میں آگئی۔
اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا.... ”دو گھنٹے بعد مہمان آئیں گے....“

اور غلام تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس ہو گیا۔ اب بحری افسر اسے حیران نظروں سے جاتا دیکھا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ غلام واقعی بھولا آدمی تھا یا کوئی چالاک

ن۔ بہر حال وہ یہی سوچتا ہوا ساحل کی طرف چلے لگا۔
ٹھیک دو گھنٹے بعد مارکوئیس کا بحری بیڑا ساحل سے لگ گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر

مارکوئیس کی اس قدر تیز روشنی تھی کہ دن کا گمان ہوتا تھا۔ شہزادی نے پچھلے دو دن میں مشرقی سلطنت روما کے تمام مقتدر لوگوں مارکوئیس کو زینہ کے استقبال کے لئے

سامندر پر بلا لیا تھا۔ شہزادی اسحاقیہ وزیراعظم کے ساتھ استقبال کے لئے سب سے کمزری تھی پھر پیچھے کی طرف عمائدین سلطنت تھے۔

اس طرح سب سے آگے مارکوئیس کو زینہ کا جہاز تھا۔ مارکوئیس بڑا خوبصورت جوان

اس کا دل تو واقعی کالا تھا مگر اوپر سے اس قدر وجیہ اور با رعب تھا کہ دیکھنے والا دل

ل میں اس کی وجاہت کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ شہزادی اسحاقیہ کو اسے

نئے میں کوئی وقت نہ ہوئی۔ مارکوئیس کو زینہ کے چہرے کی ہلکی سی مسکراہٹ اور ناپ

کے قدم رکھنے کا انداز پکار پکار کے کہہ رہا تھا کہ وہ اس بحری بیڑے کا امیر البحر ہے۔ اس کے سینے پر اطالیہ (ٹلی) کا بحری نشان بھی جگمگا رہا تھا۔

عمر رسیدہ وزیراعظم نے آگے بڑھ کے مارکوئیس سے مصافحہ کیا اور شہزادی سے

کہا۔

”آپ ہیں شہزادی اسحاقیہ۔ شاہی خاندان کی سب سے عظیم اور محترم خاتون۔“

مارکوئیس کو زینہ کا دل شہزادی کو دیکھتے ہی چل گیا تھا۔ اس نے جذبات سے پر لہجہ میں

”خوش قسمت ہوں کہ مجھے قسطنطنیہ میں سب سے پہلے شہزادی سے ملاقات کا شرف

شنزادی، مارکوئیس کو نرید کی وجاہت اور مہذب انداز سے مرعوب ہو گئی تھی۔
نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر زبان ساتھ نہ دے سکی پھر بھی اس کا ہاتھ مصافحہ سے
مارکوئیس کی طرف بڑھ گیا۔ مارکوئیس کی نظریں شنزادی کی نظروں سے ملی ہوئی تھیں
لئے وہ شنزادی کا اٹھا ہوا ہاتھ نہ دیکھ سکا۔

وزیراعظم جو ادھیڑ عمر تھا مگر شنزادی کی خواہش ایک عرصہ... اس کے دل میں
ہوئی تھی، نے ان کی نظروں کے تصادم سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اب شنزادی ہاتھ
گئی۔ آخر اس نے زور سے کھٹک کر شنزادی اور مارکوئیس دونوں ہی چونکا دیا۔

”پیارے مارکوئیس کو نرید...“ وزیراعظم نے اسے مخاطب کیا۔ ”شنزادی عالیہ آ
مصافحہ کا شرف بھی بخشا چاہتی ہیں۔ آپ توجہ فرمائیے...“
مارکوئیس کو نرید گڑبڑا گیا۔ ”جی بہت بہت شکریہ...“

اور مارکوئیس نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں شنزادی کا ہاتھ دبایا۔ شنزادی کے ہا
پر دستانے چڑھے تھے لیکن مارکوئیس کو نرید نے انگلیوں کی نرمی سے یہ اندازہ لگایا کہ
ہاتھوں اور شاہی خاندان کی خواتین میں ایک خاص قسم کا فرق ہوتا۔
مارکوئیس کو نرید نے شنزادی کا ہاتھ معمول سے زیادہ دیر تک اپنے ہاتھ میں دبائے،
اس سے کو نرید نے یہ بھی محسوس کیا کہ شنزادی کے ہاتھ میں ہلکی سی تھر تھراہٹ ہے
تھر تھراہٹ لڑکی کے ہاتھ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ کسی اپنی پسند کے آدمی
مصافحہ کرتی ہے۔

شنزادی اسحاقیہ، مارکوئیس کو نرید سے کچھ اس درجہ مرعوب ہوئی کہ اسے بالکل
لگ گئی۔ بندرگاہ پر تمام بڑے بڑے امرا، وزرا اور عمائدین سلطنت مارکوئیس سے ملا
کے لئے آئے تھے۔ مارکوئیس کو نرید ان سے بڑے اخلاق اور مہذب طریقہ سے ملا اور
ہنس کے گفتگو کرتا ہر مگر اس تمام عرصہ شنزادی بالکل خاموش رہی حالانکہ وہ سب
ساتھ تھی۔

بندرگاہ کے شاندار استقبال سے مارکوئیس کو نرید بہت خوش تھا۔ پہلے نہیں شہ
اسحاقیہ کے بارے میں اس نے پہلے کچھ سن رکھا تھا کہ نہیں لیکن اس پہلی ملاقات ہی
مارکوئیس کو نرید اس کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ مارکوئیس کو اس بے قوف غلام سے
معلوم ہی ہو گیا تھا کہ شنزادی ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور اس کی شادی نہ ہونے
وجہ سے بھی وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ مارکوئیس کو نرید خود ہی ایک بحری افسر کے بیٹے میں سا

فاہر جب اسے تمام باتیں غلام سے معلوم ہو گئیں تو پھر وہ کسی اور سے ملے بغیر واپس
لا تھا۔

استقبال کی رسومات ختم ہو گئیں۔ مارکوئیس کو نرید کا ایک ایک کر کے استقبال کے لئے
والے تمام عمائدین سے تعارف کرایا گیا۔ اس کے دوران شاہی بیڈ موقعہ کے لحاظ
طریقہ دہیں بجا کر داد تحسین وصول کرتے رہے۔ پھر وزیراعظم نے سب کو باری باری
ت کر دیا۔ اب جو اس نے نظریں گھما کر شنزادی اسحاقیہ کو دیکھا تو وہ مارکوئیس کو نرید
ہاتھ دور پر ساحلی جنگلے کے قریب کھڑی دکھائی دی۔ تجربہ کار وزیراعظم کے چہرے پر
اسکرہٹ پیدا ہوئی پھر وہ آہستہ آہستہ ساحل پر سے چلا گیا۔

شنزادی اسحاقیہ اور مارکوئیس کو نرید باتوں نے ایسے مشغول ہوئے کہ انہیں یہ بھی خبر
نہ کہ عمائدین سلطنت ساحل سے کب واپس گئے اور وزیراعظم ان سے مسکراتا ہوا
سے کب رخصت ہوا۔ ان کے باتیں تھیں کہ شیطان کی آیت۔ ختم ہونے کا نام ہی نہ
ن۔ آخر ان دلچسپ باتوں میں ساحل کا شاہی منتظم حائل ہوا۔ اسے شنزادی کو اس
ع دینے حاضر ہوا تھا۔

شنزادی عالیہ میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں“ اور منتظم نے سر جھکا دیا۔

نزدی نے پلٹ کے دیکھا۔ ”کو کیا بات ہے؟“

شنزادی عالیہ... مہمان رخصت ہو چکے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے...“ منتظم نے
ناٹی۔

مارے معزز مہمان مارکوئیس کو نرید کے ساتھی کہاں ہیں...“ شنزادی نے سوال کیا۔
وئی تکلیف نہ ہونا چاہئے...“

تکلیف کیسے ہو گی شنزادی عالیہ... مارکوئیس کو نرید آپ کے مہمان ہیں۔ ناظم نے
...“ میں نے آپ کے محل کے برابر والے محل میں معزز مہمان کے قیام کا انتظام
کوئی تکلیف نہیں ہو گی انہیں...“

مارکوئیس کے بحری لشکر کے لئے کہاں انتظام کیا ہے؟“ شنزادی نے دریافت کیا۔
لیوں کے لئے محل کے پاس باغ اور محل کے باہر مشرقی میدان میں خیمہ لگوا دئے
...“ ناظم نے فخر سے کہا۔

ی کو غصہ آگیا۔ ”مگر تم نے ابھی تک جہازوں سے لشکراتانے کا انتظام کیوں نہیں

دی عالیہ...“ ناظم سر بلند کر کے بولا۔ ”لشکری جہازوں سے اتر کر محل پہنچ چکے

ہیں اور اس وقت اپنے خیموں میں آرام کر رہے ہوں گے سوائے ان لشکریوں کے جنہ نے جہازوں پر ہی مقیم رہنا پسند کیا یا جنہیں ان کے یونٹ پکتان نے جہاز ہی پر ٹھہرنے حکم دیا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ تم پوری محنت اور لگن سے کام کیا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ شہزاد نے ناظم کو رخصت کرنا چاہا۔

”بہتر ہے شہزادی عالیہ۔۔۔۔۔“ ناظم نے کہا۔ ”لیکن میں تو آپ کو لینے آیا ہوں۔۔۔“

”کیوں۔ کیا ضرورت پڑ گئی ہماری؟“ شہزادی مسکرائی۔

”میں آپ کو مطلع کرنے آیا ہوں کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔۔۔“ ناظم نے بتایا۔

”آپ محل میں کھانا تناول فرمائیں گی یا یہیں انتظام کیا جائے؟“

شہزادی نے مارکوئیس کی طرف دیکھا۔۔۔ ”کیا خیال ہے مارکوئیس کو نریڈ۔۔۔ کھانا سز کے کنارے کھایا جائے یا محل چلیں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلہ میں۔۔۔“ مارکوئیس نے بڑی خوبصورت نہی اور چہرے پر ہنسائی تھی۔ ”میں تو شہزادی قسطنطنیہ کے حکم کا تابع ہوں۔۔۔“

شہزادی نے ناظم سے کہا۔ ”ہم محل جا رہے ہیں۔ وہیں کھانا کھائیں گے۔۔۔“

ناظم نے جانے سے پہلے پھر سر جھکا کر کہا۔ ”شہنشاہ معظم نے خواہش کی ہے مہمانوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شہزادی عالیہ، شہنشاہ سے ملاقات فرمائیں۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ یہ حکم ہے۔۔۔“ شہزادی گھبرا گئی۔ ”شہنشاہ نے کوئی اور بھی حکم دیا ہے؟“

”نظام کو اس کے علاوہ کسی اور بات کی خبر نہیں۔۔۔“ ناظم نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔۔۔ ”مجھے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا۔“

شہزادی اسحاقیہ کو مارکوئیس کو نریڈ اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ اس سے ایک لمحہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ مارکوئیس کو نریڈ کو اپنی ہی جگہ میں بٹھا کے اپنے محل لاؤ

شہزادی کا محل، شہنشاہ کے محل سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ مارکوئیس کو نریڈ کے لئے اس نے برابر کا محل خالی کرایا تھا۔

کھانا وہ بھی شاہی محلات کا۔ پھر اس وقت تو شہزادی نے اپنے مہمان کے لئے بہت خوش (کھانوں) کا حکم دیا تھا۔ کمرے جتنی لمبائی والی میز پر قسم قسم کے کھانے موجود

لیکن یہ کھانے ہمارے بادشاہوں والے کھانے نہیں تھے بلکہ تمام کے تمام یورپ والوں کھانے تھے۔ پھیکے، پیٹھے اور ابلے ہوئے۔

اتنی بڑی میز کے گرد کھانے والے صرف دو ۲ تھے۔ ایک مہمان مارکوئیس کو نریڈ

ی میزبان شہزادی اسحاقیہ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے باقی بیروں اور

ن کی ایک فوج کی فوج تھی جو صرف دو ہتھیوں کو کھانا کھلانے پر مقرر تھی۔ مارکوئیس نے

یہ نے خوب مزے لے کے کھانا کھایا اور کھانے کے تعریف میں زمین و آسمان کے

ملا دیے۔ وہ دراصل ہر بات ایسی کر رہا تھا جس سے شہزادی کا دل خوش ہو۔ اسی لئے

وہ کسی کھانے کی تعریف کرتا تو اس کے بعد کھانے پکانے والے کی تعریف ہوتی پھر ٹانگ

ی کی تعریف پر جا کے ٹوٹی۔ وہ بات کے آخر میں کہتا کہ شہزادی کے حسن ذوق نے

بادچی اکٹھا کر لئے ہیں جو دنیا کے بہترین کھانا پکانا جانتے ہیں۔

کھانے کے بعد شہزادی اور مارکوئیس کی گفتگو کا سلسلہ پھر طویل ہو گیا مگر شہنشاہ کا بلاوا

اور شہزادی کو گفتگو صبح پر اٹھا رکھنا پڑی۔ شہزادی، شہنشاہ کے سامنے پہنچی تو مسرت سے

کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ شہنشاہ اسے مسرور دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوا۔

”کو شہزادی۔ تم نے مارکوئیس کو نریڈ کو کیا پایا؟“ شہنشاہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”شہنشاہ بھائی۔ میں مارکوئیس کی کیا تعریف کروں۔ وہ تو حیرت انگیز انسان ہے۔

تہ مذہب۔ بے انتہا خوش مزاج، بات کرتا ہی تو جیسے منہ سے پھول جھرتے ہیں۔

بار، تجربہ کار، اعلیٰ نسب اور خوبصورت۔۔۔۔۔“

”بس بس۔ زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔۔۔“ شہنشاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

کا مطلب یہ ہے کہ مارکوئیس تمہارے میزان میں پورا اترا۔۔۔“

”بادشاہ بھائی۔ مارکوئیس کو نریڈ دنیا کے تمام لوگوں سے۔۔۔۔۔“ شہزادی اپنے رو میں کتنی

ہی تھی کہ اک دم اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور سنبھل کے بولی۔۔۔۔۔ ”میرا مطلب

کہ دنیا میں شہنشاہ بھائی دنیا میں آپ پہلے شخص ہیں اور آپ کے بعد مارکوئیس کو نریڈ

رے شخص ہیں جن کا کوئی ثانی اور نظیر نہیں۔ ایک ایک بات لاکھ لاکھ روپے کی تجربہ

اس قدر کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس نے معلوم نہیں کتنے بحری معرکے مارے

۔۔۔۔۔“

”پھر کیا خیال شہزادی کا؟“ شہنشاہ نے ایک سوال کر کے شہزادی کو گھبرا دیا۔

”کس بارے میں شہنشاہ بھائی؟“ شہزادی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ تمہیں اور مارکوئیس کو ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا جائے۔۔۔۔۔“ شہنشاہ نے بات

صاف کر دی۔

”دیکھو شہزادی۔۔۔۔۔“ شہنشاہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”خوش بختی صرف ایک بار

انہی پر دستک دیتی ہے۔ اگر تمہاری مرضی ہو اور تم اس کی طرف سے مطمئن ہو تو ہم

اس سے کل ملاقات کے درمیان اس کا عندیہ معلوم کریں۔۔۔

”مگر شہنشاہ بھائی۔۔۔۔۔“ شہزادی نے دلی آواز میں کہا۔۔۔۔۔ ”مارکوئیس کوزیڈ کا ارا کروئید میں حصہ لینے پر یوٹلم جانے کا ہے۔ شاید وہ ابھی کسی اور بات پر آمادہ نہ ہو آپ بات کیجئے تو بہت سنبھل کے اور سوچ کے۔۔۔“

سوچنا سمجھنا کیا تھا۔ دوسرے دن شہنشاہ نے دربار خاص میں مارکوئیس کوزیڈ کو یاربا شرف بخشا اور اس کی قسطنطنیہ آنے پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس دن شہنشاہ نے دربار جلدی ختم کر دیا پھر تنائی میں مارکوئیس سے گفتگو شروع کی۔ ان کی ملاقات کیا تھی دو تہ کار اور چالاک دماغوں کا ٹکراؤ تھا۔ دونوں نے سنبھل کے گفتگو شروع کی۔

”شہنشاہ نیما کوئیس سے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ ”مارکوئیس کوزیڈ“ قسطنطنیہ۔ تمہارا آگے کدھر جانا کا ارادہ ہے؟“

مارکوئیس کوزیڈ نے الفاظ تول کے جواب دیا۔ ”عالی جاہ۔ غلام نے آپ کو خط۔ مطلع کیا تھا کہ قسطنطنیہ سے میں فلسطین جاؤں گا اور کروئید مقدس میں حصہ لوں گا۔۔۔“

مارکوئیس۔ ہمیں جہاں تک یاد پڑتا ہے تم اپنے خط میں کچھ اور بھی لکھا تھا؟“

مارکوئیس انجان بن گیا۔ ”غلام کو اور کچھ یاد نہیں پڑ رہا۔۔۔“ پھر اس نے اپنے ماتے کو انگلیوں سے اس طرح دبایا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

”یاو کرو مارکوئیس۔۔۔“ شہنشاہ نے اسے یاد دلایا۔۔۔ ”تم نے قسطنطنیہ میں مستقل رہائش کا خیال ظاہر کیا تھا۔۔۔“

”شہنشاہ درست فرما رہے ہیں۔۔۔“ مارکوئیس نے فوراً جواب دیا۔۔۔ ”مجھے یاد آیا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر میں اب بھی قائم ہوں۔ اگر میں یوٹلم کو آزاد کرا کے زندہ

واپس آیا تو قسطنطنیہ ہی میں ہمیشہ کے لئے رہ پڑوں گا آپ کے سائے میں۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں مارکوئیس۔۔۔“ شہنشاہ نے گہرا لہجے میں کہا۔

”ہمارا خیال ہے کہ شہزادی نے تمہیں پسند کر لیا ہے اور شاید تم نے بھی۔ ہمارا خیال ٹھیک ہے نا مارکوئیس؟“

”شہنشاہ منتظم۔۔۔ شہزادی عالیہ میں اس قدر خوبیاں ہیں جس کے بیان ہی میری زبان

قاصر ہے۔۔۔“ مارکوئیس کوزیڈ نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔

”وہ شخص واقعی دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہو گا جسے شہزادی عالیہ اپنا

شریک سفر منتخب فرمائیں گی۔۔۔“

”ہم خوش ہوئی کہ تم نے بات صاف کر دی۔۔۔“ شہنشاہ بولا۔۔۔ ”ہم بہت جلد ف

اں کو نہ ہی اور قانونی رشتہ میں شملک کر دیں گے۔۔۔“

”شہنشاہ کے حاکم سے سرتابی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔۔“ چالاک مارکوئیس نے ”میں تو شہنشاہ سے یہ درخواست بھی کرنا چاہتا ہوں کہ شہنشاہ روم بذات خود اپنے لشکر ساتھ اس مزیدی جنگ میں اسی طرح حصہ ہیں جس طرح دوسرے بادشاہ شریک ہو رہے

۔۔۔“

”اچھا۔ کیا یورپ کا کوئی بادشاہ بھی کروئید میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے؟۔۔۔“

اے قسطنطنیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”جی ہاں عالی جاہ۔۔۔“ مارکوئیس کوزیڈ نے جواب دیا۔ ”انگلستان کے شاہ

فرانس نے شاہ آگسٹس۔۔۔ اور جرمن کے قیصر بار بروس نے کروئید (صلیبی

میں شریک کی رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ میری درخواست ہے کہ شہنشاہ بھی اس

جنگ میں حصہ لے کر فدوانہ یسوع مسیح کی جائے پیدائش سے مسلمانوں کے ناپاک

سے پاک کریں۔۔۔۔۔“

”مارکوئیس کوزیڈ۔۔۔ تم ہماری طرف سے کروئید میں حصہ لینے تو جا رہے ہو۔ اب

جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ شہنشاہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گیا۔

شہنشاہ قسطنطنیہ نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے شہنشاہ نے سلطان صلاح

ایوبی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اور اس سے دوستی کی زبردست

رزق کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فلسطین کی تمام

طاقتیں شکست کھا چکی تھیں اور معرکہ حنین میں یوٹلم (بیت المقدس) کا فیصلہ ہو

۔۔۔

سلطان صلاح الدین نے شہنشاہ کے اس رابطہ کو درخو اعتنا سمجھا اور شہنشاہ کو

تک نہ دیا تھا۔ شاہوں، شہنشاہوں، خصوصاً ”نصرانی بادشاہوں اور شہنشاہوں کی پر

خط و کتابت سے صلاح الدین واقف تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نصرانی بادشاہ

اپنے مفاد اپنی مرضی سے جنگ کرتے ہیں اور جہاں اپنا مفاد نہیں دیکھتے ادھر سے منہ

نہیں۔

مارکوئیس کوزیڈ کا قسطنطنیہ میں قیام بڑھتا گیا۔ اسے عیش و عشرت کے تمام سامان وہاں

میں سب سے بڑھ کے شہزادی اسحاقیہ کی دن رات کی قربت۔ مارکوئیس کو اور کیا

غنا۔ شہنشاہ نے مارکوئیس کو فلسطین جانے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر

بالا کا ذہن اور شاطر تھا۔ اسے قسطنطنیہ میں اپنا مستقبل روشن نہیں دکھائی دیتا تھا۔

مارکوئیس کو نزیڈ کو باوجود تمام کمزوریوں کے ایک پر عزم جوان کہا جاسکتا ہے۔ اسے قلعہ میں بہت کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے وہ شہزادی اسحاقیہ کی صحبت سے دو ہی ہفتوں آتا گیا اور وہ قسطنطنیہ سے جلد سے جلد نکل بھاگنے کی فکر کرنے لگا۔

شہزادی اسحاقیہ، اشاریا کی طرح سیدھی سادی لڑکی نہ تھی جسے یہ خبر بھی نہ ہو مارکوئیس کب اسے چھوڑ کے چل دیا۔ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ مارکوئیس اطالیہ سے بھا والا ہے تو بھی وہ اس قدر با اختیار نہ تھی کہ مارکوئیس کو نزیڈ کو روک سکتی لیکن شہزادی اسحاقیہ کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اشاریا سے زیادہ عقلمند بھی تھی اور با اختیار بھی۔

شہزادی اسحاقیہ کا جس دن شبہ ہوا کہ مارکوئیس کو نزیڈ کے رویے میں پہلی سی جوشی نہیں، اس نے اسی دن شہنشاہ سے گفتگو کی اور دوسرے دن شہزادی اور مارکوئیس بڑے شاندار طریقہ شادی ہو گئی۔ مارکوئیس کو نزیڈ کو مجبوراً یہ شادی کرنا پڑی کیونکہ شہزادی نے اس کے بھاگنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے اور اس کے بحری بیڑے کی پوری بندی کر دی گئی تھی۔

اس طرح مارکوئیس کو نزیڈ نے قسطنطنیہ میں مزید ایک ہفتہ خوشی یا ناخوشی سے گزارا اس آخری ہفتہ میں مارکوئیس کو نزیڈ نے شہزادی کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ شہزادی کے ساتھ اس قدر لگاؤ اور محبت کا رویہ اختیار کیا اسے یقین ہو گیا کہ مارکوئیس کو نزیڈ کو اس سے بے حد محبت ہے۔ مارکوئیس کو نزیڈ اس سے یہ فائدہ ہوا جس طرح اس کا شاندار استقبال ہوا تھا بالکل اسی طرح مارکوئیس کو نزیڈ کو قسطنطنیہ رخصت کیا گیا۔

مارکوئیس کو نزیڈ کی روانگی کے وقت شہنشاہ اسحاق فرمانروائے سلطنت روم شہزادہ نفس نفیس ساحل سمندر پر موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ جہاں شہنشاہ ہو گا وہاں اسے امیرودا ہوں گے ہی۔ ساحل پر یہ حال تھا کہ جہاں تک دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتا تھا۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ مارکوئیس کو نزیڈ کو شہنشاہ نے لگایا۔ شہزادی اسحاقیہ روتے روتے بیدم ہو گئی۔ اس کے دل کے کسی کونے سے آواز تھی۔

”مارکوئیس کو نزیڈ واپس نہیں آئے گا۔“

ذہن اور عیار مارکوئیس کو نزیڈ سب سے خوشی خوشی رخصت ہو کے اپنے جہاز پر ہوا۔ وہ عرشہ پر کھڑا اس وقت تک اپنا رومال ہلاتا رہا جب تک اسے ساحل نظر آتا رہا۔ بھی اس کی مکاری تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ابھی وہ شہنشاہ کی حدود میں ہے پھر جب

براوردہ وانیال کو عبور کر آیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہانسریٹ کا مارکوئیس کو نزیڈ نے ایک شادی ہانسریٹ (اطالیہ) میں کی اور اسے دھوکہ قسطنطنیہ بھاگ آیا۔ اب وہ قسطنطنیہ کی شہزادی کو محبت کا فریب دے کر فلسطین جا مارکوئیس اس وقت صور کے ساحل پر اترا جب تمام بڑے بڑے والیان ریاست بے سارا چھوڑ گئے تھے۔ مارکوئیس واقعی صور کے بے ساروں کا سارا بن گیا۔ بعد جو کچھ ہوا اسے ناظرین پچھلی اقساط میں پڑھ چکے ہیں۔

ہم ایک بار پھر ”مکہ“ کی طرف چلتے ہیں جسے نصرانیوں نے گھیر رکھا ہے فلسطین شام ہاں ملک سے بحری راستے سے نصرانیوں کو برابر مکہ پہنچ رہی ہے۔ جرمن کا فریڈرک آف سوابیا تقریباً ایک ہزار کی جمیعت کے ساتھ مکہ پہنچ گیا ہے۔ یہ مکہ اگرچہ ہے لیکن شہنشاہ جرمن برابر وصال کے بیٹے کی موجودگی نے محاصرہ کرنے والے نصرانیوں صلے بڑھا دیے ہیں۔

سلطان صلاح الدین کے ہراول دستہ العیادیہ میں تعینات تھے جن کی مدد کو موصل ہی موجود تھے لیکن انہیں قتل قیسان سے آگے بڑھ جانے کا حکم مل چکا ہے۔ نووارد فرماؤ فریڈرک نے کھلی میدان میں مسلمان ہراول دستوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی ہاں کی لیکن ہراول دستوں نے انہیں آسانی سے مار بھگایا۔ اس کے بعد انہوں نے جنگ کے مکہ کا محاصرہ بخت کرنے میں اپنی تمام توانیاں ختم کرنا شروع کر دیں۔

لڑنے یا جنگ کی آڑ میں فلسطین میں لوٹ مار کرنے آرہے یا آنے والے تھا۔
رہے کہ اگر سلطان اپنا لشکر قلعہ صور یا قلعہ شقیق کے محاصرے میں الجھا رہا تو
دو سال تک مدافعتی جنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال اس کے متعلق کچھ بعد میں
کا پہلے کچھ محاصرہ مکہ اور ذکر ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو گا

دوسرے سال کے موسم خزاں کی دوسری بارش کا واقعہ ہے۔ اس بارش نے بھی
ریوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اس طوفان کے ہنگام میں مصر سے غلہ لے کے
لے جہازوں کی آمد نے لشکریوں میں دوسرا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں
روں میں غلہ بردار جہازوں پر قبضہ کے لئے ایک خوں ریز جنگ چھڑ گئی۔ ادھر
وہاں نے جہازوں کو دھکیل کر غلہ مکہ کے ساحل پر پہنچا دیا۔

کی فیصل کئی جگہ سے شکست ہو کے گر گئی تھی۔ محصور مسلمان فیصل کی مرمت میں
آئے تھے۔ عیسائی تیغ زن مسلمانوں پر برابر حملے کر رہے تھے مگر مسلمان پھر بھی مرمت
میں اٹھنا ہی مصروف تھے۔

آگے چل کے لکھتا ہی کہ اس بارش سے ایک خطرناک دبا پھیل گئی۔
دن تک مسلسل بارش ہوتی گئی اور پورا لشکر شرابور ہو گیا تو ہر ایک کو کھانسی ہو
ب کے گلے بیٹھ گئی۔ سر اور ہاتھ پاؤں سوچ گئے۔ ایک دن میں ایک ہزار آدمی مر
اے لوگوں کے دانت گر گئے۔

اترے لوگ، خستہ حال لوگوں کی مدد کر رہے تھے۔ کاؤنٹ ہنری اور بشپ آف
نے بڑی فراخ دلی سے لوگوں کی اعانت کی۔ پھر طوفانی ہوا میں جہازوں پر آنے والا
شریٹ کے مارکولیس کو نریڈ کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے سامان رسد کو صور پہنچا دیا
تصرف میں لے آیا اور دوسرے لشکریوں کو ایک دانہ نہ دیا۔ لوگ مار کو نہیں کو
یتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ وہ ایک دوسرے سے آنکھیں
نہہ۔

اور بد حالی کے باوجود محاصرین نے محاصرے میں کوئی کمی نہ واقع ہونے دی۔ پھر
غلہ کے دنوں میں غلہ کا ایک جہاز ساحل سے دور نمودار ہوا۔ لوگ خوشی سے
بے جا تے تھے۔ اطالوی تاجر جنہوں نے گلہ منگا کر رکھا تھا ان کے چرے اتر گئے۔
ت میں ناقابل یقین کمی ہو گئی۔ لوگوں نے ان تاجروں کے نقصان پر خوب تالیاں
دوسرے دن کئی اور جہاز غلہ لے کر آ گئے۔

۱۱۹۱ء میں چھ عظیم الشان جہاز لشکر لے کر مکہ پہنچ گئے۔ ان جہازوں پر شاہ

موسم

مکہ کے محاصرے کو دو سال گزر چکے تھے۔

یہ محاصرہ بھی عجیب قسم کا تھا۔ چار ساڑھے چار ہزار مسلمان مکہ کے قلعہ میں ہوئے
تھے۔ پچھلے دو سال میں ان پر کیا کیا قیامتیں نہ گزریں۔ ان مسلمانوں کو شام اور فلسطین
مشترکہ نصرانی لشکروں نے گھیر رکھا تھا اور پھر ان گھیرے ہوئے نصرانیوں کے چاروں طرف
سلطان صلاح الدین ایوبی اپنا لشکر لئے موجود تھا۔

یورپ کے تمام مورخین نے اپنا پورا زور قلم سلطان دمشق صلاح الدین ایوبی کو آیا
نااہل جنرل ثابت کرنے پر صرف کیا ہے۔ اسٹینٹن لین پول، ہیرلڈ، لیم اور امیروز کو یہ
کھائے جاتا ہے کہ سلطان نے صور پر پوری طاقت سے حملہ کر کے اس کا خاتمہ کیوں نہیں
کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ جب صور کے حکمران مارکوئیس کو نریڈ
سابق شاہ یروڈم سگائی کو صور میں داخل نہ ہونے دیا اور وہ خانماں برباد پورے قلعہ
خوردہ نصرانی لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف چلا تو سلطان نے اسے مکہ پہنچنے سے پہلے
کیوں نہیں کر دیا۔

اس سلسلہ میں اگر ان متعصب مورخین نے سلطان صلاح الدین کے شب و روز
توجہ سے غور کیا ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ سلطان کی ہمیشہ یہ حکمت عملی رہی کہ وہ آج
قدم اٹھاتا تھا اس کا رد عمل چھ ماہ، ایک سال یا دو سال بعد ظاہر ہوتا تھا۔ صور کا قلعہ واقف
بہت اہم قلعہ تھا اور اس پر ایک زبردست حملہ یا سخت محاصرہ سے خاتمہ کیا جاسکتا تھا
سلطان کی نظریں تو صور سے ہٹ کے یورپ سے آنے ان لاکھوں کے لشکر پر تھیں۔

فرانس فلپ آگنس مانی کے پرچم لہا رہے تھے۔ ایک جہاز پر شاہ فرانس کا ذاتی نشان ا تھا۔ شاہ فرانس کے ساتھ کئی دلیر اور تجربہ کار نائٹ بھی آئے تھے۔ ان میں کاؤنٹ فلینڈر بھی شامل تھا۔ شاہ فرانس بڑے طویل سفر کے بعد پہنچا تھا۔ مغربی یورپ کے نصرانی نائٹ ایک ایک کر کے مکہ کے ریتے ساحل پر اکٹھا ہوتے جا رہے تھے۔ جب جہاز ساحل پر لنگر انداز ہو گئے اور فوجیں ساحل پر اتر گئیں تو شاہ فرانس آگنس مانی کا سفید باز محافظ کے ہاتھوں سے چھٹ کے اڑ گیا۔ باز نے چھاؤنی کے کئی لگائے پھر مکہ کی فیصل پر بیٹھ گیا۔ مکہ کے محصور مسلمان یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ باز فیصل پر بیٹھا تو مسلمانوں نے اسے پکڑ لیا۔ عیسائیوں نے اس واقعہ کو بدگلا کھول کیا۔

شاہ فرانس نے اپنا خادم سلطان کے حضور میں بھیجا۔ خادم نے سلطان سے عرض کیا کہ شاہ فرانس کا باز مکہ کی فیصل پر پکڑا گیا ہے۔ شاہ کو باز واپس کر دیا جائے وہ اس قیمت ادا کرنے پر تیار ہیں۔ مسلمانوں کا سلطان یہ بات سن کر مسکرایا اور اس نے شاہ کو جواب بھیجوا یا کہ باز یوں واپس نہیں ہو گا بلکہ طاقت سے حاصل کرنا ہو گا۔

چنانچہ شاہ فرانس نے اپنے لشکر کو بھی مکہ کے مقابلہ اور محاصرے میں لگا دیا۔ لوگ پوری طاقت سے شکستہ قلعہ پر حملہ کرتے۔ اس کا زیادہ زور فیصل کی شکستہ دیواروں ہوتا لیکن مسلمان حملہ روکنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے طبل جنگ بجاتے۔ طبل بڑے کی آواز جیسے ہی سلطان کے کانوں میں پہنچتی تو وہ فوراً اپنے باروں کو عیسائیوں کے حصہ پر حملے کا حکم دیتا اس طرح عیسائیوں کا زور مکہ کی طرف کم ہو جاتا۔

جون کے مہینے میں عیسائیوں کو ایک خوشخبری اور نصیب ہوئی۔ چپتیس جہاز اور کئی بحریہ ساحل سمندر پر نمودار ہوئے۔ مکہ کو محاصرہ کرنے والے عیسائیوں کی خیمہ بستیاں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے کام کاج چھوڑ دیا۔ نائٹ، سردار اور سپاہی ناچنے کو۔ ساحل کی طرف بھاگے۔ باجوں تاشوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہر طرف مسرت کا ہنگامہ ہا گیا۔ لوگوں نے سب سے آگے آنے والے جہاز کو خوش آمدید کہا۔ اس سرخ جہاز انگلستان کا جھنڈا لہا رہا تھا۔

اس بات کا خیال رہے کہ مکہ کے باہر عیسائیوں کی خیمہ بستی بن گئی۔ کتنے کونو خیمہ بستی تھی لیکن اس میں انسانی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بڑے بڑے بازار چوڑے چوڑے راستے خیموں کے محلات۔ جن کے اندر داخل ہونے پر یوں محسوس ہوتا جیسے صبح کے محل میں چل پھر رہے ہوں۔ وہی قالینوں کا فرش، وہی چوکی پرے کا اٹھنا

شاہ اپنے محل نما خیمے سے برآمد ہو کر دربار لگاتا، درباری اکٹھے ہوتے۔ بازاروں میں بھری پری دکائیں، غلہ، سبزی، گوشت، کوئی چیز تھی جو وہاں نہ ملتی تھی۔ بازار عیسائیوں کے خیمہ بستیوں میں بھی تھے اور مسلمانوں کی خیمہ بستیوں میں بھی ایسی نا بازار لگتے تھے دونوں جگہ کی بازار میں فرق دو چیزوں کا نمایاں ہوتا تھا۔ نصرانی بازاروں ن شراب کی بوتلیں اور خنزیر (سور) کا گوشت کھلے عام فروخت ہوتا جبکہ مسلمانوں کے بازار ان حرام اشیاء سے پاک ہوتے تھے۔

ایک یورپی مورخ نے شاہ انگلستان کی تعریف میں ایک مسلمان مورخ ہباء الدین کے درجہ ذیل جملے نقل کئے ہیں۔

”وہ بلا کا طاقتور تھا۔ نہایت دلیر اور الواعزم۔ اس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ جنگ میں اس کی شجاعت مسلم تھی۔“

ہباء الدین کے یہ جملے سیاق و سباق سے الگ کر کے کہے گئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ چڑ نے انگلستان میں کئی جنگیں لڑی تھیں لیکن وہ جنگیں محدود قسم کی تھیں۔ اس نے ہی لڑائیوں میں شجاعت کا مظاہر کیا تھا لیکن رچرڈ تیسری صلیبی جنگ میں شروع سے خربک کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکا۔ رچرڈ کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو گر جتے ہیں وہ برستے نہیں۔ رچرڈ کی بہت شہرت تھی۔ اور اس کی مکہ پہنچنے پر نصرانیوں نے خوب ٹپس بجائیں مگر رچرڈ مسلمانوں کے خلاف بہادری کا ایک کارنامہ بھی انجام نہیں دے سکا۔ رچرڈ یقیناً ایک بہادر جوان تھا مگر انتہائی خود سر۔ مغلوب انقبض، بڑی حد تک ظالم اور عیش و عشرت تو اس کی کھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ رچرڈ کو شیر دل کہا جاتا ہے مگر تاریخی آلات اور واقعات اسے نفی کرتے ہیں۔ یورپی مورخ ہیرلڈیم نے رچرڈ کے جو کوائف پیش کئے ہیں ان کا ذکر یہاں پر اس لئے ضروری ہے تاکہ انہیں تاریخی میزان پر تول جائے۔

ہیرلڈیم، شاہ انگلستان رچرڈ کے بارے میں لکھتا ہے۔ رچرڈ چونتیس سال کا بھر پور جوان تھا۔ وہ شہابی رعب اور جلال کا پیکر تھا۔ اس کے بالوں پر سنہری سرخ بال پھیلے رہتے تھے۔ اس کی پیشانی ہموار اور کشادہ تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اس کی مختصر داڑھی فراہمی تراش کی تھی۔ اسے اپنی دست پر ناز تھا۔ وہ کسی کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ طبیعت کا فیاض تھا اور بچوں ل طرح نمود و نمائش کا دلدادہ۔ اس کی ہر جوش طبیعت کو کھیلوں کے مقابلوں اور عمدہ یافتوں میں تسکین ملتی۔ وہ تیغ زنی اور نیزہ بازی میں انتہائی لطف محسوس کرتا۔ رچرڈ کو مربوط بانے کا بھی شوق تھا۔ وہ ہر کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور جنگ میں سرداروں کے

وہ انگلستان سے روانہ ہو کے سسلی (مقلید) پہنچا اور ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ مقلید میں وہ اپنی بہن کے حقوق کے لئے غاصب ٹینکروڈ کے خلاف بڑا آزمائش رہا۔ اس جہاں "ٹینکروڈ" کے خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر اسے کئی بیش قیمت تحائف بھی پیش کئے۔ آخر وہ مقلید سے روانہ ہوا تو راستے میں اس کے بیڑے کو طوفان نے گھیر لیا۔ اس کے جہاز بمشکل جزیرہ قبرص پہنچے۔ وہاں باز ٹینیسی حکام کی بدسلوکی کا شکار ہو گئے "رچرڈ" کو غصہ آیا۔ وہ پایاب پانی کو پار کر کے ساحل پر پہنچا اور جزیرے کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اس نے باز ٹینیسی شہزادے کو نفرتی ذخیرہ میں اسیر کر لیا اور اس کی نوجوان بیٹی کو بطور پرغمال لیا۔

رچرڈ نے قبرص ہی میں وہاں کے بڑے گرجا میں اپنی منگیت بریگیٹیرا آف نوارے۔ بڑے ترک و حشام کے ساتھ شادی رچائی پھر اس نے فلسطین کی راہ لی۔ صلیبی جنگوں۔ دوسرے مورخ اسٹینٹن لین پول نے شاہ انگلستان رچرڈ کے انگلستان سے فلسطین تک صرف چار سطروں میں لکھ کر رچرڈ کی راستے کی تمام سیاہ کاریوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ لی پول کی ہلکی ہوئی چار سطریں درج ذیل کی جاتی ہیں جو اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ یورپی مورخوں نے اپنے جزیروں اور بادشاہوں کی سوائے تعریف کرنے کے کے عیوب و تہمت کرنے سے گریز کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"رچرڈ شاہ انگلستان اور فلپ شاہ فرانس ارض مقدس پہنچنے والے تھے۔ وہ دونوں ۱۱۹۰ء کے موسم بہار میں روانہ ہوئے تھے لیکن ان کی رفتار اس قدر تھی جیسے وہ مگر بیرو تفریح کے لئے نکلے ہوں۔ مینا (سسلی کا ایک شہر) کو مسخر کرنے، جزیرہ قبرص کو فتح کرنے اور بریگیٹیرا سے شادی رچانے میں شاہ رچرڈ کو کافی دیر لگی اور اس عرصہ میں انہوں نے مکہ کے لشکر کو قریب قریب تباہ کر دیا۔ قبرص میں ماہ غسل (جہی مون) گزار کر قازانچین کی کیمپ کو بچا لیتا ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔"

لین پول کا یہ مختصر بیان تاریخی بددیانتی کی ایک کمرہ مثال ہے۔ رچرڈ نے شاہ قبرص کو گرفتار کر کے اس کی کم سن بیٹی شہزادی سوسن کو جس طرح پرغمال بنایا اس کا تذکرہ نہ کر کے مورخ نے تاریخی حقائق سے کھلی ہوئی چشم پوشی کی ہے۔

آئیے اب ہم رچرڈ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتے اور اس کے کردار کو تیسری صلیبی جنگ کے حوالے سے مختصراً بیان کرتے ہیں۔

شاہ انگلستان رچرڈ اول جس کا دور ۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۹ء رہا۔ جسے مغربی مورخین اور فرانسیسی

مطربوں (ایبروز جو شاہی گویا تھا) نے شیردل کے لقب سے نوازا، تیسری صلیبی جنگ کا بانی اور غازی سلطان صلاح الدین ایوبی کا مد مقابل قرار دیا۔ ۱۱۸۵ء تا ۱۱۸۹ء کا بیٹا تھا جس نے اپنے ظلم و جور اور تند خوئی سے اس کے اقتدار کو سخت نہیں پہنچائی، جاگیرداری نظام پر کاری ضربیں لگائیں اور پھر شاہی رکو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہنری دوم کی بیوی ایلینار (ایلینور) آف گاسک، خود سر اور مغرور حسینہ اور شہنشاہ لوئی آف فرانس کی مطلقہ تھی (رچرڈ اسی ایلینار کا ناپ، خود سر، لارباہی اور مقلون مزاج۔ جس نے اپنی جوانی کے ایام فرانس کی غیر منظم، جاگیرداروں کی جھڑپوں اور ڈونسل لڑائیوں (محض مقابلہ جس دو آدمی پستول یا تلوار کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں) میں گزارے یا فرانس کے مطربوں بدلہ گوئی کے مقابلوں میں شہر کھتے ہوئے بسر کئے۔ یہ بانکا بھیلہ جوان، یورپ کے رومان پرور دور کی پیداوار تھا جس نوجوان نسل عشق و محب کی دیوانی، دو بیڑ لڑائی اور جنگوں میں بے خطر کود پڑنے اور نام حاصل کرنے کی از خود جستجو کیا کرتے تھے۔ یہی لی ہمت جرات، بہادری اور شجاعت کا رومان پرور معیار تھا۔ دوسرے الفاظ میں شجاعت، بہادری کا اظہار کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کم اور کسی حسینہ کو متاثر کرنے، اسے اپنے دام لائے، کسی محبوبہ کے جذبات کو برا لگینے کرنے یا ذاتی شہرت اور ناموری کے لئے زیادہ تھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ صلیبی جنگوں کا آغاز اس دور میں ہوا جو رچرڈ کی بھرپور جوانی کا رچرڈ کے سر میں ایام شہزادی ہی سے صلیبی جنگوں میں حصہ لینے کا سودا سمایا ہوا تھا اور میں بریگیٹیرا کی محبت کی دیوانگی تھی۔ ایسے حالات میں دل کیس لے چلے؟

لی انگلیں دل میں گدگدی پیدا کرتی ہیں

اس زمانہ میں یعنی ۱۱۸۳ء میں شاہ انگلستان ہنری دوم اور اس کے بیٹوں میں اختلاف ہوئے اور بیٹوں نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ دراصل زخم خوردہ جاگیرداروں کی انتقام اور ہنری کے خلاف شدید رد عمل تھا۔ اس بغاوت میں شاہ انگلستان اس کی ایلینار نے بھی بے وفائی کی۔ یہ ایلینار وہی ہے جو پہلے شاہ فرانس کی بیوی تھی اور شاہ فرانس نے اسے طلاق دیدی تو اس نے شاہ انگلستان سے شادی کر لی تھی۔ یہی نور (ایلینار) رچرڈ کی ماں تھی۔

شاہ انگلستان کے خلاف یہ شورش اور بغاوت کامیاب ہوئی۔ جاگیرداروں نے رچرڈ کا

ساتھ دیا کیونکہ وہ رچرڈ کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار سال کی بغاوت کے بعد ہنر دوم کو معزول کر کے رچرڈ کو شاہ انگلستان بنا دیا گیا۔ مگر رچرڈ تو ہمیشہ کا خوش باش اور پرواہ انسان تھا۔ اس نے بادشاہ ہونے کے بعد بھی حکومت کے سنجیدہ امور میں کوئی جھڑپ لیا اور سلطنت سے ایک طرح بے تعلق سا رہا۔

رچرڈ کی حکومت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا وہ اپنے دس سالہ دور حکومت میں صرف دو مرتبہ انگلستان میں کچھ عرصہ تک مقیم رہا۔ ایک بار جب اس نے حکومت سنبھالی اور دوسری مرتبہ جب اس کا دور ختم ہونے والا تھا۔ اس کا یہ قیام میں صرف اس ضرورت کے لئے تھا کہ وہ انگلستان میں رہ کر اپنے جادے جا کاموں کے لئے رقم اکٹھا کرے اور اپنا ہم پندانہ طبیعت کو سکون دے۔

رچرڈ کا یہ قول بہت مشہور ہے۔

”اگر مجھے کوئی خریدار ملتا تو میں لندن کو بھی فروخت کر دیتا“

اس نے لندن کو تو فروخت نہ کیا مگر اپنی مہم جوئی کے لئے تصور سے زیادہ رقم حاصل کی اور فضول خرچ کی۔

رچرڈ کو ۱۱۹۹ء میں بادشاہت ملی گویا دیوانگی کے تمام لوازمات اکٹھا ہو گئے پس اس نے سلطنت مان (۱ ملینیار) اور بھائی کے حوالے کی اور اگلے سال یعنی ۱۲۰۰ء میں تیسری صلیبی جنگ کے لئے روانہ ہوا۔ چھتیس سالہ شاہ انگلستان اپنی بھئی اور بھئی ہوئی جوانی کے ساتھ جنگ کے لئے چلا مگر راستہ میں کئی جگہ ٹکرایا۔ پہلے اس نے جزیرہ سلی (مغلیہ) پر حملہ کیا اس لئے حاکم سلی ٹکڑ نے اس کی جوان بہن جین کے حقوق غصب کر لئے تھے۔ سلی کا حاکم ٹکڑ بھی رچرڈ کی طرح ادبش اور بے پروا تھا۔ اس نے رچرڈ کی بہن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور وہ ناراض ہو کر سیکے بیٹھ گئی تھی۔ رچرڈ اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ مسئلہ میاں بیوی اور سالے بہنوئی کا تھا۔ سالے بہنوئی کا رشتہ یوں بھی بہت نازک ہوتا ہے اور سالے کو بہن کے لئے جھکتا پڑتا ہے مگر رچرڈ کے ساتھ لشکر تھا اور اسے اپنے شہنشاہ ہونے کا زعم تھا۔ اس کا فرض تھا کہ اپنے بہنوئی حاکم سلی ڈکڑ کے ساتھ نرمی سے پیش آتا اور صلح صفائی سے جین کو اس کے حوالے کر دیتا لیکن اس نے کیا یہ کہ پہلے اپنے بحری بیڑے کو سلی کے ساحل سے لگا کر لشکر اتار دیا پھر ٹکڑ کو اپنے حضور طلب کیا۔

ٹکڑ اس سے زیادہ خود سر اور بد دماغ جوان تھا۔ پھر اسے شہنشاہ انگلستان کے بہنوئی ہونے کا زعم بھی تھا۔ اپنے سالے رچرڈ کا یہ بلاوا اسے ناگوار گزرا

”رچرڈ نے مجھے کس حیثیت سے بلایا ہے؟“ اس نے رچرڈ کے ہنسنے ہوئے قاصد سے سوال کیا۔

قاصد جھبرا گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ رچرڈ حاکم سلی کا سالہ ہے مگر وہ یہ بات خود تو نہ سکتا تھا، قاصد سمجھدار تھا، اس نے رچرڈ کے ان الفاظ کو بھی نہیں دہرایا تھا جن سے رچرڈ نے اپنے بہنوئی کو طلب کیا تھا۔ رچرڈ کا لہجہ اور الفاظ انتہائی ہنک آمیز تھے ہمد نے انتہائی نرم الفاظ میں ٹکڑ کو اطلاع دی تھی۔

شاہ انگلستان ڈکڑ حاکم سلی سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ لیکن ٹکڑ اسے نرم ہی برداشت نہ کر سکا اور اس نے قاصد سے جرح شروع کر دی۔ قاصد نے پھر بھی نبھالی۔ اس نے پہلے جیسے نرم لہجے میں کہا۔

”حاکم سلی آخر شاہ انگلستان کے رشتہ دار ہیں۔ شاہ انگلستان کے ساتھ شہزادی جین ٹریف لائی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ ان کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہوں؟“

ٹکڑ بھڑک اٹھا۔ ”میرا جین سے کوئی تعلق نہیں میں اس کے بارے میں کوئی بات لڑنا چاہتا۔۔۔“

قاصد نے دیکھا کہ بات تو پہلے ہی قدم پر ختم ہوتی جاتی ہے۔ اس نے ٹکڑ کو -

”حاکم سلی سے میری درخواست ہے کہ وہ رسم و رواج اور شاہانہ طور طریقوں کو پیش نظر رکھیں۔ یہ ضرور ہے کہ روایت کے لحاظ سے آپ کا درجہ بلند ہے لیکن اس شاہ انگلستان کی فوجیں ساحل پر اتر چکی ہیں اور اس سے زیادہ لشکر ابھی جہازوں میں ہے۔ میں اگرچہ شاہ انگلستان کا قاصد ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ حاکم سلی اس اپنی ریاست اور اپنی حاکمیت کو داؤ پر نہ لگائیں۔“

ٹکڑ تھا تو بہت بد دماغ، اسے سلی کی بھی پروانہ تھی لیکن قاصد کی باتیں اور انداز سے بہت متاثر کیا۔

”عزز قاصد۔۔۔“ ٹکڑ کا انداز اک دم بدل گیا۔ ”میں آخر شاہ انگلستان کا بہنوئی۔ اس کا ملازم نہیں۔ سلی ایک آزاد ملک ہے۔ یہ اور بات ہے ہمارا انگلستان ہے کا معاہدہ ہے لیکن رچرڈ کو یہاں آنے سے پہلے مجھے مطلع کرنا چاہئے تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ صلیبی جنگ کے لئے جا رہا ہے۔ میں اس کے جزیرہ کی قدر کرتا ہوں مگر اسے اس نے دیا کہ وہ حاکم سلی کی اجازت کے بغیر سلی کی سرزمین پر قدم رکھتا کیا اس

کی یہ حرکت عاصمانہ اقدام کے تحت نہیں آتی؟

”ضرور آتی ہے اے حاکم سلی۔“ قاصد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کھلا ہوا عاصمانہ قبضہ ہے۔ لیکن مصلحت بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ شاہ انگلستان کے پاس اس وقت کثیر لشکر ہے۔ تقریباً ایک سال کا سامان رسد بھی جہازوں پر بار۔ بے شمار سامان حرب بھی موجود ہے۔ انگلستان کا لشکر سلی کے ایک ساحلی علاقہ پر قابض ہو چکا ہے۔ ان حالات میں آپ کو مصلحت سے کام لینا چاہئے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو قاصد۔“ ٹنکڑو نے قاصد کی رائے تسلیم کر لی۔ ”مگر اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”اے حاکم سلی۔ میں اس سلسلہ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس قیامت ٹانے کی کوشش کیجئے۔“ قاصد نے مشورہ پیش کیا۔ ”ایسا نہ ہو کہ فلسطین میں استعمال لئے جانے والا یہ لشکر اور اسلحہ، سلی کو تاخت و تاراج اور خاک تر کرنے میں نہ مرا ہو جائے۔ رہا آپ کے ذاتی معاملات کا مسئلہ اسے تو آپ ہی بہتر طور پر پنٹا سکتے ہیں۔ جو تک ہو سکے گرمی سردی سے پرہیز فرمائیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ رچڑ سے جا کے کہہ دو کہ میں اس سے ملنے آرہا ہوں۔“ حاکم سلی ٹنکڑو مصالحت کے لئے تیار ہو گیا۔

قاصد نے کھڑے ہوتے کہا۔ ”اس طرح نہیں اے حاکم سلی۔ اگر آپ فوراً ملاقات پر آمادہ ہو گئے تو شاہ انگلستان آپ کو بہت ہی کمزور سمجھیں گے اور اپنی شرائط سلی سے جانے پر آمادہ ہوں گے۔“

”پھر کیا کروں؟“ ٹنکڑو پریشان ہو گیا۔ ”تم ہی نے تو کہا ہے کہ پالیسی سے کام لو اے سلی سے بھاگنے کی کوشش کرو۔“

”جی ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔“ قاصد نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ اس وقت شاہ انگلستان کو یہ پیغام بھجوائیں کہ وہ آپ کے جواب کا انتظار شام تک کریں اور یہ کہ آپ شام تک ہی ملاقات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ آپ فوراً اپنی افواج کو تیاری کا حکم دیدیں؟“

”پھر کیا ہو گا؟“ حاکم سلی نے تعجب سے پوچھا۔ قاصد نے جواب دیا۔ ”پھر کیا ہو گا اس کا جواب آپ کو شام کو مل جائے گا۔“ ٹنکڑو نے اچھے ہوئے پوچھا۔ ”مگر میں شام تک اور کیا کروں۔ اگر رچڑو نے اپنے لشکر کو پورے ملک (سلی) پر قبضہ کا حکم دیدیا تو؟“

”ایسا نہیں ہو گا میری سرکار۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔“ قاصد نے زور دے

”آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہئے۔ شام ہوتے ہی آپ اپنے آدمی کے ذریعہ شاہ انگلستان کو اطلاع بھجوا دیں کہ شاہ سے ملاقات کے لئے آرہے ہیں۔“

”حاکم سلی ٹنکڑو، قاصد کی اس حکمت عملی سے بہت خوش ہوا۔“ اے قاصد قاصد کمال کے آدمی ہو بلکہ بڑے کام کے آدمی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم شاہ انگلستان کو اپنے میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں کوئی اچھی ملازمت دوں گا؟“

”اے شاہ سلی۔“ قاصد نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ ”مجھے انگلستان اور شاہ انگلستان سے اسی طرح محبت ہے جس طرح آپ کو سلی سے ہے۔ میری اور میری اولاد کی دل میں انگلستان کا نمک دوڑ رہا ہے۔ میں شاہ رچڑو سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ سے میں نے جو کچھ گفتگو کی ہے اس کی بنیاد خالص قومی اور انسانی ہمدردی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے شاہ کا مقابلہ کیا تو خواہ مخواہ خون خرابہ ہو گا اور ہم نصرانیوں کی جان جو ہم یرو ظلم کی بازیابی میں بھنا چاہتے ہیں وہ آپ کی لڑائیوں میں بے گارہ۔ دوسرے لڑے اگر آپ اور شہزادی جین کے درمیان کسی صورت ختم ہو جائیں تو بات ہم سب کے میں ہو گی۔“

حاکم سلی ٹنکڑو نے قاصد کو رخصت کر دیا۔ وہ شاہ انگلستان رچڑو کے دربار میں پہنچا اے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کیا جواب دیا اس ذلیل کتے نے؟“ شاہ کے لمبے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”اے شاہ اعلیٰ مقام۔“ قاصد نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ ”حاکم سلی نے فرمایا کہ انہیں آج شام تک وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے احباب سے مشورہ کر لیں۔“

”ہونہ۔ معلوم ہوتا ہے ٹنکڑو کا اب دماغ ٹھکانے آرہا ہے“ شاہ انگلستان نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اگر اس نے ذرا الٹی سیدھی بات کی تو ہم سلی کی اینٹ سے اینٹ بجا گئے۔ اسے گستاخی کی ضرورت ملائی چاہئے۔ کیوں جین تمہارا کیا خیال ہے؟“

”شاہ بھائی۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کیجئے۔“ جین مختصر سا جواب دے کے خاموش ہو گئے۔

شاہ انگلستان کی تند مزاجی اور سخت لہجے سے جین کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور جاتا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہی ٹنکڑو کا پیغام آگیا۔ اس نے کہلوانا تھا کہ وہ شہنشاہ ملاقات کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔

شاہ انگلستان نے سفر کی حالت میں ہوتے ہوئے ایک شاندار دربار سجایا۔ دراصل رچڑو ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ خواہ انگلستان میں ہو خواہ اطالیہ میں اس کی شان میں کوئی فرق

ایک مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے فلسطین کے لئے جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں
 خزانہ بھی اس فرض کی ادائیگی میں خرچ ہو۔ تم واپس جا کر متعلقہ افسر کو اطلاع کر دو
 ہمارا ایک فوجی دستہ آ رہا ہے وہ اپنی ضرورت کے لئے جتنی رقم چاہے حاصل کر سکتا
 اس سے کسی قسم کا تعزیر نہ کیا جائے۔“

ٹکڑو نے محسوس کیا کہ رچرڈ کی نظر متلیہ کے خزانے پر ہے۔ وہ اگر رچرڈ کے فوجی
 کور کمان میں چاہے تو نہیں روک سکتا۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”میرا خزانہ شاہ اور شاہی خاندان کے افراد پر قربان ہے۔ فوجی دستہ میرے ساتھ ہی
 پائے تاکہ حکم کی جلد تعمیل ہو سکے۔“

”ہمیں اتنی بھی جلدی نہیں ٹکڑو۔“ شاہ نے زہر خند کیا۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم ابھی کافی
 متلیہ میں گزاریں گے۔“

ٹکڑو دل میں بہت کڑھا مگر ادب سے بولا۔ ”میرے لئے اور کوئی حکم ہے؟“

رچرڈ نے پھر بہن کی طرف دیکھا لیکن شہزادی جین بدستور بت بنی بیٹھی رہی۔

”ہم نہیں پھر کسی وقت بلائیں گے ٹکڑو۔ اب تم جا سکتے ہو؟“

ٹکڑو جو شاہ رچرڈ کا بہنوئی تھا۔ منہ لٹکائے واپس آگیا۔ اس میں اور شہزادی میں شادی
 پہلے ہی دن اختلاف پیدا ہو گیا۔ شہزادی دلہن بن کے متلیہ آئی تھی پھر جب وہ کچھ
 متلیہ میں رہنے کے بعد لڑ جھگڑ کے انگلستان واپس گئی تو پھر متلیہ کا اس نے رخ بھی نہ
 اس وقت انگلستان میں رچرڈ کا باپ برسرِ اقتدار تھا۔ اس لئے بھی جین نے ڈکڑو کی
 کہ۔ پھر ان میں اختلاف اور جدائی کا عرصہ بڑھتا ہی گیا۔

شہزادی جین اور حاکم متلیہ ٹکڑو کے درمیان قانونی طور طلاق نہ ہوئی تھی لیکن اس
 جدائی کے بعد دونوں نے سمجھ لیا تھا جیسے ان میں بیٹھ کے لئے علیحدگی ہو گئی ہے۔
 لہ انگلستان رچرڈ اچانک متلیہ نہ پہنچ جاتا تو شاید ٹکڑو شہزادی جین کے بارے میں
 نہ سوچتا۔ لیکن شاہ رچرڈ نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ متلیہ آتے ہی ساحل متلیہ کے
 حصہ پر اپنے جہازوں کو فوراً خالی کر دیا۔ اس طرح اس وقت انگلستان کی فوجوں کا
 کلات اور دفاتر کو چھوڑ کے باقی پورے جزیرے پر قبضہ تھا۔

متلیہ (سسلی) یورپ کے ملک اٹلی کا بحرِ روم میں ایک جزیرہ تھا۔ اس دور میں دور
 تجارت کا دارو مدار بحری راستوں پر تھا۔ متلیہ بھی بحری راستے پر واقع ہونے کی
 ایک دولت مند آزاد ملک تھا اس کا حکمران ٹکڑو ایک سخت مزاج شخص تھا۔ اس
 لہذا بد قسمتی سے رچرڈ کی بہن سے ہوئی تھی جو اب بظاہر ختم ہو چکی تھی لیکن رچرڈ کو

نہیں آتا۔ ٹکڑو کو معلوم تھا کہ رچرڈ کینہ پرور انسان ہے اور اس سے کوئی بات بعید نہیں
 یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہ اپنے آدمیوں کو لگا کر اسے بیٹھ کے لئے راستے سے ہٹا دے۔
 ٹکڑو سخت پہرے میں آیا اور گھوڑے کے بجائے اس نے بند گھوڑا گاڑی استہ
 کی۔ دربار کے سرے پر شاہ کے باڈی گارڈ نے ٹکڑو کا استقبال کیا۔ ٹکڑو نے دربار میں
 انگلستان کو کورنش بجالایا۔ شاہ نے ٹکڑو کو اپنے امرا کی قطار میں جگہ دی۔

حاکم سسلی ٹکڑو نے گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہی بڑے وقار کے ساتھ کہا۔ ”
 انگلستان کے عظیم شہنشاہ میں بحرِ روم کے ایک چھوٹے سے جزیرے کا حکمران ہونا
 انگلستان اور سسلی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کہاں آفتاب اور کہاں ایک ذرہ ناچنے۔ پھر جی
 شہنشاہ قیام سسلی کے دوران مجھے مہمان نوازی کا فرض عطا فرمائیں جو میرے لئے یہ
 ناقابلِ فراموش نعر ہو گا۔ میں کوشش کروں گا کہ شہنشاہ اور ان کے تمام ہم سفروں کو
 قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

رچرڈ کا خیال تھا کہ ٹکڑو گستافی سے پیش آئے گا لیکن اس نے مذہب رویہ اختیار
 تو اس نے اپنا منصوبہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اگر ٹکڑو نے ذرا
 بدتمیزی کا اظہار کیا تو وہ اسے گرفتار کر کے ایک قیدی کی طرح اپنے ساتھ رکھے گا مگر
 اسے اپنے ارادے میں ترمیم کرنا پڑی۔ پھر بھی وہ پر جلال لہجہ میں گویا ہوا۔

”ٹکڑو تم ہمیں اپنی مہمان نوازی سے اپنی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتے
 مگر یہ ممکن نہیں اس لئے کہ مہمان نوازی تو مہمانوں کی کی جاتی ہے۔ انگلستان کا لشکر
 تمہارا مہمان نہیں اس نے ایک فاتح کی طرح متلیہ (سسلی) پر قبضہ کیا ہے پھر کیسے مہما
 اور کہاں کی مہمان نوازی؟“

رچرڈ کا لہجہ اکڑا ہوا تھا مگر ٹکڑو شاید اس سے جان بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس
 رچرڈ کے سخت لہجے کو نظر انداز کر دیا۔

”شاہ انگلستان نے درست فرمایا۔ لشکر یقیناً فاتح ہے اور اس نے سسلی کے بیشتر علاقے
 پر قبضہ بھی کر لیا ہے لیکن اس ناچیز کو تخت و تاج انگلستان سے ایک رشتے کا اعزاز
 حاصل ہے۔ میں اس اعزاز کے ناطے کم از کم شاہی خاندان کے افراد کو تو مہمان نوازی
 دعوت دے سکتا ہوں؟“

رچرڈ نے اپنی بہن جین کی طرف دیکھا جو بالکل بے تعلق سی بیٹھی تھی مگر جین۔
 کسی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ رچرڈ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہاری دعوت پر غور کریں گے ٹکڑو۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت ہم سفر ہیں؟“

ہنوی سے یہ شکایت تھی اس نے جین کے ساتھ ایک اچھے شوہر جیسے تعلقات نہیں اور اس کے جزبات پامال کئے۔

رچرڈ کی یہ شکایت درست نہ تھی۔ اس لئے کہ شزاوی جین ایک خود سر اور لڑکی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں نے اس کی ناز برداری کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا پس شادی ہونے پر اس کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ٹکڑو ایک آزاد ملک حکمران تھا وہ بھلا شزاوی کے غرے کیوں برداشت کرتا۔ اس طرح دونوں میں اختلاف اور شزاوی جین صرف ایک بار سسرال جانے کے بعد میکے میں بیٹھ گئی۔

جین چونکہ شزاوی تھی۔ چرچ پر بھی اس کا اثر تھا۔ اس نے اس نے چاہا کہ سے طلاق لے کے کسی اور جگہ شادی کر لے۔ پس انگلستان کے بڑے پادری (پشپ) شزاوی کو دوسری شادی کی اجازت دیدی۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ پادری نے شزاوی کو بات کی بھی اجازت دیدی کہ اگر وہ دوسری شادی کرنے سے پہلے ٹکڑو کے پاس جانا تو بھی جاسکتی ہے اور اس کے ساتھ بیوی میاں کی حیثیت سے رہ سکتی ہے۔

اس طرح شزاوی جین نے بظاہر طلاق حاصل کر لی تھی لیکن اس کی اطلاع ٹکڑو پاس متبادل نہیں بھیجی گئی تھی۔ ٹکڑو نے اسی وجہ سے اپنی مہنگو کے دوران شاہ رچرڈ اپنی رشتہ داری کا حوالہ دیا تھا۔ انگلستان کے اچانک لشکر کے آجانے کی وجہ سے ٹکڑو پریشان ہو گیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر شزاوی جین اس کے ساتھ رہنے پڑتا تو وہ فی الوقت اسے قبول کرے گا لیکن دربار میں جین کی خاموشی نے اسے نامید اور اسے اپنا مستقبل تاریک ہونے دکھائی دیا۔

ٹکڑو کا خیال درست نکلا۔ اس کے واپس جاتے ہی رچرڈ نے اپنے محافظ دستوں سالار کو بلا کے کہا۔

”متبادل کے شاہی خزانہ پہ پہنچ کے اس پر قبضہ کیا جائے اور تمام دولت ہماری لشکر پہنچائی جائے۔ اگر مزاحمت کی کوشش ہو تو شاہی محلات کو بھی تباہ بریاد کر کے تمام قیمتی مالاٹھوا لیا جائے۔“

کہتے ہیں کسی بادشاہ نے ایک آبادی کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اپنے خاص آدمی ذریعہ آبادی سے چند انڈے منگوائے۔ چنانچہ بادشاہ کا ہر کارہ بادشاہ کے لئے چند انڈے آیا۔ لشکریوں کو جب معلوم ہوا کہ بادشاہ نے آبادی سے چند انڈے اپنے لئے منگوائے ہیں۔

تو لشکر کے کچھ منگلے آبادی میں پہنچے انہوں نے آبادی کی تمام مرغیاں پکڑیں اور

آبادی میں کھرام بچ گیا۔ آبادی کے اسیر لوگ تو خاموش رہے لیکن وہ غریب جن کا بڑا مرغیاں اور انڈے تھے انہوں نے چیخ چیخ کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

لہ شدہ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی کہ ان کے لشکریوں نے آبادی پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ بادشاہ ہاتھ اس نے آبادی کے پریشان لوگوں کو بلوا بھیجا۔ امیر لوگ اس موقع پر بھی کئی لئے۔ امیروں کا ہر دور میں اسی طرح کا کردار رہتا ہے۔ وہ خاموش ہو کے گھروں میں لیکن غریبوں کے تودل سے لگی تھی وہ روتے پیٹتے بادشاہ کی سامنے پہنچ گئے۔

جہیں کس نے لوٹا ہے؟“ بادشاہ نے رونے والوں سے سوال کیا۔ ”ہمیں بتاؤ ہم فتنہ سزا دیں گے؟“

بادی والوں پر شاہی دربار کا رعب پڑ گیا تھا۔ وہاں سپہ سالار، وزیر، عالم، مفتی قاضی بڑے بڑے سردار بیٹھے تھے۔ روئیالوں کی آوازیں تو دربار میں پہنچتے ہی بند ہو گئی تھیں کا کا ایک ایک کا منہ دیکھ رہے تھے۔

ایک آدمی نے ہمت کر کے کہا۔ ”بادشاہ سلامت۔ ہم نہ ان کا نام جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں مگر تھے وہ آپ ہی کے لشکری۔“

لر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہمارے لشکری تھے؟“ نے ان سے الٹا سوال کر دیا۔ ی نے اپنے حواس بجا رکھتے اور بولا۔ ”بادشاہ سلامت۔ پہلے ایک آدمی ہماری بستی تھا اس نے کہا تھا کہ وہ بادشاہ کے لئے چند انڈے لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں دے دئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس جیسے بستی سے آدمی بستی میں گھس آئے۔ نے ہماری مرغیوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ ہمارے بعض آدمیوں نے انہیں ٹوکا مگر نے جواب دیا کہ وہ شاہی فوج کے آدمی ہیں۔ بس انہوں نے ساری مرغیاں پکڑ لیں لے گئے۔“

ناہ نے سپہ سالار کو حکم دیا۔ ”ہجرموں کو فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔“ سالار اٹھ کے باہر گیا اور چند منٹوں بعد دس بارہ آدمیوں کو لے کے آیا۔ بختو۔ تم بستی کی تمام مرغیاں پکڑ لائے“ بادشاہ نے غصہ سے کہا۔ ”واپس کرو مرغیاں۔ یہ ہمارا حکم ہے۔“

لشکری سر جھکائے کھڑے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب یوں پر تو وہ پہلے ہی چھری پھیر چکے تھے۔ آخر ایک لشکری نے ہمت کی۔

لی جاہ۔ ہمیں معاف کر دیجئے غلطی ہو گئی۔“

ناہ نے چڑکے کہا۔ ”وہ تو ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم ان کی مرغیاں واپس

کرو۔ ”مرغیاں تو ہم ذبح کر ڈالیں عالی جاہ۔“ لشکری نے ہمت کر کے بتا ہی دیا۔
”تمہیں سخت سزا ملے گی؟ بادشاہ کا غصہ تیز ہو گیا۔ اس نے حکم دیا۔ ان سب کے قید کر دو۔“

دربار کے غلام ان کو پکڑنے بڑھے۔ اس وقت مفتی صاحب جو لشکر کے ساتھ تھے وہ بولے۔ ”عالی جاہ۔ آپ نے ایک غلام کے ذریعہ بستی سے چند انڈے منگائے وہ بستی سے انڈے تو لے آیا لیکن اس نے انڈوں کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس سے لا کو شہ ملی اور وہ بستی کی تمام مرغیاں پکڑ لائے۔ پہلے سزا آپ کے غلام کو ملنا چاہیے۔ انڈے کی قیمت ادا نہیں کی تھی۔“

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر کے بعد بولا۔ مفتی صاحب آپ نے درست لیکن خطا وار غلام بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس سے کہا ہی نہیں تھا کہ ا قیمت ادا کر کے لاتا۔ اصل خطا وار تو میں ہوں۔ اگر انڈوں کی قیمت ادا کر دی گئی، لشکری بغیر قیمت کے مرغی لانے کی ہمت ہی نہ کرتے۔“

اس کا مقصد یہ ہے اگر بادشاہ خود کوئی غلطی کرے تو اس کے ماتحت بادشاہ سے غلط کام کر جاتے ہیں۔

شاہ انگلستان رچرڈ نے محافظ دستے کو مقبلہ کا خزانہ اٹھا لانے کو کہا تھا مگر جب والوں نے انگلستان کے فوجی دستے کو سرکاری دفاتر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ شاہ انگلستان نے شاہی محلات اور دفاتر پر قبضہ کرنے کا حکم دیدیا ہے۔ لوگ بھاگ کے گھروں میں گھس گئے اور ہر طرف غل مچ گیا۔
”حملہ ہو گیا۔ انگریز فوج آگئی۔“

مقبلہ کی فوج اور سالار فوج کے کان میں یہ آواز پڑی تو پہلے وہ کچھ سوچتے رہے فوجی بیروں میں واپس چلے گئے۔ شاہی دستہ لوگوں سے پوچھتا پوچھتا خزانہ پر پہنچے محافظوں کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ انگلستان کے فوجی دستے شہر میں پھیل گئے ہیں اور مقامات پر قبضہ کیا جا رہا ہے اس لئے جب شاہی دستہ خزانہ پر پہنچا تو محافظوں نے خواہاںیاں ان کے حوالے کر دیں۔

شاہی دستے کی تو بن آئی۔ انہوں نے محافظوں کی مدد سے سونے چاندی کے تمام تھیلوں میں بھر دئے اور گاڑیاں منگوا کے تھیلے لاد لئے گئے۔ شاہی دستے نے خزانہ کرنے کے بعد قریب کے محلات کا رخ کیا۔ یہ تمام محلات مقبلہ کے وزیر خزانہ کے لشکر کا بہنوئی تھا۔ وزیر خزانہ ہی مقبلہ کی افواج کا سپہ سالار تھا۔ اسی لئے اس نے

نلوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس وقت اپنے بیوی بچوں کو لے کر اطالیہ (اطلی) فرار ہو چکا

رچرڈ کی بہن جین نے لشکرڈ سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مقبلہ کا خزانہ کے جہاز پر لاوا جا چکا تھا۔ رچرڈ صلیبی جنگ کے لئے فلسطین پہنچتا تھا مگر وہ مقبلہ میں ہوا تھا۔ اس کا مقبلہ میں قیام کوئی معنی نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ رات دن رقص سیتی کی محفلیں جیتیں۔ رات گئے یہ محفلیں برخاست ہوئیں تو عشرت کدے چمک۔ مثال مشہور ہے کہ جو مذہب بادشاہ کا وہ رعایا کا۔ بادشاہ کے دن رات عیش و عشرت زر رہے تھے تو پھر جنرل کرٹل اور چھوٹے افسر کیوں خاموش رہے۔ انتظامات کی ذمہ لشکرڈ اور اس کے عمائدین سلطنت پر تھی۔ انہیں جو اطلاع دی جاتی وہ حاضر کرنا

لشکرڈ کا خزانہ لٹ چکا تھا مگر رچرڈ کی فرمائشیں کم نہ ہوتی تھیں۔ رچرڈ کی دیکھا دیکھی ا لے بھی طرح طرح کی فرمائش کرتے۔ لشکرڈ بہت پریشان ہوا تو غصہ میں بھرا ہوا رچرڈ دربار میں پہنچا۔ رچرڈ نے یہ چالاکی کی تھی کہ نہ تو کسی سرکاری دفتر پر قبضہ کیا تھا اور محلات میں ٹھہرا تھا۔ سلطنت کے کاموں میں بھی اس نے کوئی دخل نہ دیا تھا۔

رچرڈ جوان اور ایک شہ زور جوان تھا۔ وہ ایک زمانہ تک اپنے باپ کے زیر عتاب رہا اس زمانہ میں وہ بڑے بڑے تجربات سے گزرا تھا۔ رچرڈ تجربات کے لحاظ سے بڑے جرنیلوں اور کرنلوں سے آگے تھا۔ قیادت شناسی میں بھی اسے مہارت حاصل ہو گئی نیکرڈ غصہ میں بھرا دربار میں داخل ہوا تو رچرڈ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ لشکرڈ بہت پریشان ہے۔ خزانہ اس کے پاس نہ تھا۔ شاہی لشکر کے اخراجات پھر شاہی خاندان کی ہیں۔ انگلستان سے آنے والا ہر شخص خود کو مقبلہ کا مالک سمجھتا تھا اور چھوٹا بڑا سب انکیش کرتے رہے تھے۔

نیکرڈ سلام کر کے کچھ کہنے ہی ولا تھا کہ رچرڈ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک

”ٹھہرو نیکرڈ۔ ہمیں تم سے کچھ کہنا ہے ہم تمہیں بلوانے والے ہی تھے۔“

نیکرڈ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ تو اپنا دکھڑا رونے آیا تھا مگر کا مزاج کچھ برہم تھا۔ اس نے نیکرڈ کو گفتگو سے روک دیا تھا۔ لشکرڈ کو پچھلے لگ کہیں رچرڈ اسے معزول کر کے کسی اور کو مقبلہ کا حکمران نہ بنا دے۔ لشکرڈ ایسی اسے پریشان تھا اور شاید یہی کہنے آیا تھا کہ اس کی جگہ کسی اور کو حکمران بنا دیا جائے

مکراتب تو رچڑا اسے معزول کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

اس بات کا تھوڑا سا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ شاہ رچڑا یا فرانس کا بادشاہ یہ لوگ جب سفر پر روانہ ہوتے تھے تو ان کے تمام سول اور فوجی ملازم شاہی قافلہ کے ساتھ ہوتے تھے یہ جگہ پڑاؤ کرتے وہاں ایک شہر نہیں بلکہ کئی کئی شہر لگ جاتے تھے۔ بادشاہ اپنے دربار بالکل اس طرح لگاتے جیسے دارالسلطنت میں لگتے تھے۔ یہ دربار بڑے بڑے شامیانوں میں لگتے جو خاص پر اس کام کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ جب دربار بھٹتا تو کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ اس وقت کسی ویرانے میں دربار میں بیٹھے ہیں۔ انہیں دربار کی ہر چیز میسر ہوتی تھی۔

دربار کی طرح شاہی محلات کے تمام کمرے، توشہ خانہ، آئینہ خانہ (ڈرائنگ روم) مہمان خانہ غسل خانے، خواب گاہیں، راہداریاں اور غلام گردشیں وغیرہ تمام کی تمام موجود ہوتی تھیں۔ مکہ کے محاصرے کے دوران تو نصرانی لشکر گاہ میں الگ کئی کئی بازار لگے اور سلطان کی خیمہ گاہ میں الگ بازار بچتے تھے۔ یہ تفصیل اس لئے ضروری ہوئی کہ آگے چل کر کہیں راہداری، زینہ، ستون وغیرہ کا ذکر آجائے تو آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ یہ کوئی زیادہ مشکل بات نہ تھی اس لئے کہ اس قسم کے لوازمات اور آرائشوں کے لئے پیسے کی ضروری ہوتی تھی اور بادشاہوں کو پیسے کی کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔

شاہ رچڑا جب انگلستان سے چلا تھا تو پہلے اس نے انگلستان کا خزانہ بھرا۔ چونکہ وہ ایک مذہبی جنگ کے لئے نکلا تھا اس لئے اس کے اعلان پر ہی رقم اکٹھا ہونا شروع ہو گئی۔ پھر اس نے پوری سلطنت میں تمام بڑی بڑی عمارتوں کو فروخت کر دیا۔ خود رچڑا کے بیان کے مطابق کہ اسے لندن کا کوئی خریدار نہیں ورنہ وہ اس شہر کو بھی فروخت کر دیتا۔ اس طرح اس نے صلیبی جنگ کے نام پر ملک اور سلطنت کی تمام دولت سمیٹ لی تھی۔

مقتلہ کا سفر اسے بہت راس آ یا۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنی بہن کے حقوق کے بہانے وہ ہلمو (مقتلہ کا دارالسلطنت) کو تاخت و تاراج کر کے اس میں آگ لگا دے گا لیکن اتنی آسانی سے اسے مقتلہ کا پورا خزانہ مل گیا تو اس کی لالچ اور بڑھ گئی اور اس نے بے قصور شہریوں کو لوٹنا شروع کیا۔ مگر کہا گیا ہے کہ تنگ آمد جنگ آمد۔ جب رچڑا نے دیکھا کہ ڈیکڑو لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آ رہا ہے تو اس نے فوراً "ہترا بدلا اور قبل اس کے وہ اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار کرے رچڑا نے اسے بات کرنے سے روک دیا۔

رچڑا نے ناظم دربار کو اپنے پاس بلا کر اس سے سرگوشیوں میں کچھ کیا ناظم باہر چلا گیا اس ٹینکڑ کو پیسے پر پیسے آتے رہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں شاہ نے اس کی گرفتاری کا حکم

یا پھر کہیں اس کے قتل کو جلا نہ بلایا گیا ہو۔ بہر حال اسے طرح طرح کے خیالات رہے۔ اتنے میں ناظم واپس آیا اس کے پیچھے ایک غلام سر پر ایک خوان رکھے نقل ہوا۔ وہ دونوں بادشاہ کی پشت پر آکر کھڑے ہو گئے۔

وقت نے ٹینکڑ کی طرف دیکھا۔ "ٹینکڑو آگے بڑھو۔"

رچڑا اس کی صف سے دو قدم آگے بڑھ آیا مگر لرزاں و ترسان۔

ور آگے آؤ۔ ہمارے قریب" شاہ رچڑا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

رچڑا یہ اندازہ نہ کر سکا کہ رچڑا نے اسے حکم دیا ہے یا رسمی طور پر آگے بلایا ہے۔

رچڑا لرزتے قدموں سے رچڑا کے سامنے پہنچ گیا۔

رچڑا نے بڑے متین لہجے میں کہا۔

برے درباریو۔ حاکم مقتلہ کو دیکھ رہے ہو۔ ٹینکڑو ہمارا دوست۔ ہمارا وفادار ہے۔

دونوں سے ہمارے درمیاں کچھ خاندانی اختلاف پیدا ہو گئے تھے لیکن لاشی کے

پانی الگ تو نہیں ہو جاتا۔ ٹینکڑو ہمارا ہے اور ہم ٹینکڑو کے ہیں۔ تم نے دیکھا کہ

نہ کس فروانی سے ہماری مہمان نوازی کی ہے۔ اس نے سلطنت کے تمام ذرائع اور

ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اس کی وفاداروں اور خلوص کی قدر کرتے ہیں۔"

اے رچڑا نے رک کر تمام دربار پر نظر ڈالی پھر بولا۔ "ہمیں ٹینکڑو کی وفاداری کا

کرنا چاہئے اور تم جانتے ہو کہ انگلستان جب کسی سے خوش ہوتا ہے تو اس کی

کس طرح کرتا ہے۔"

اے نے کیا اور غلام نے خوان شاہ کے سامنے کر دیا۔ شاہ رچڑا نے خوان سے ایک

لکڑی کی بنی چھوٹی سی صندوق تھپہ اٹھا کر اس میں سے ایک موتی نکال کے اپنی

رکھا۔

یہ کیا ہے ڈیکڑو؟" شاہ نے سوال کیا۔

موتی ہے عالی جاہ۔" شاہ رچڑا نے ذرا تیز آواز میں پوچھا۔

آئی نہایت قیمتی اور کبوتر کے انڈے کے برابر تھا۔ ڈیکڑو نے آنکھیں جھپکا کے

کہیں اس نے غلط تو نہیں کہا۔ لیکن اسے وہ موتی ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑا موتی۔

نے جواب دیا۔

فی ہاں عالی جاہ۔ یہ موتی ہے ایک لاجواب اور بے مثال موتی۔"

ٹینکڑو کا تم نے۔" شاہ رچڑا جیسے خوش ہو گیا۔ "اچھا اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔" ڈیکڑو

نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

شاہ رچڑ نے پہلے ڈنکرڈ کو دیکھا پھر حاضرین دربار پر نظریں دوڑائیں اور مسکرا ہوئے اس بے مثال موتی کو ڈنکرڈ ہتھیلی پر منتقل کر دیا۔
 ”اب یہ تمہارا ہے ڈنکرڈ... ہم نے تمہیں بخش دیا۔“
 دربار میں تحسین آفریں کا غلغلہ بلند ہوا۔

ڈنکرڈ کے دونوں گھٹنے زمین میں ٹیک کے پہلے موتی کو سر سے لگا کر بوسہ دیا
 ”اے شاہ انگلستان میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کے اس اعزاز کا شکریہ ادا سکوں۔“

شاہ رچڑ کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔
 ”ہم دوستوں اور دشمنوں کو اس طرح نوازتے ہیں! ٹنکرڈ...“ اس کے ساتھ ہی ڈنکرڈ نے درباریوں کی طرف دیکھا جیسے ان سے داد چاہتا ہو۔

درباروں میں خوشامد خورے موجود ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے شاہ کی تعریفوں کے پاندھ دئے۔ یہ ضرور ہے کہ رچڑ کا داد و دہش میں ہاتھ کھلا ہوا تھا لیکن خوشامدیوں نے اس کی تعریف میں ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن کا اس میں دور دور تک پتہ بھی نہ تھا۔
 ٹنکرڈ دوبارہ شکریہ ادا کر کے پیچھے ہٹنے لگا تو شاہ نے اسے روکا۔

”ابھی کدھر جا رہے ہو ٹنکرڈ...“

ٹنکرڈ کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ شاہ نے اسے ذرا سی خوشی دی تھی مگر اب دوسرے ہی لمحے کیسا حکم۔ کہیں شاہ انگلستان اسے اعزاز دے تو نہیں مارتا چاہتا۔ اس کا د زور زور سے دھڑکنے لگا۔

شاہ رچڑ اس وقت صند قچیہ سے ایک اور موتی برآمد کر چکا تھا۔ یہ موتی بھی اُپ کے مانند بڑا تھا اور اس کا جوڑا معلوم ہوتا تھا۔
 ٹنکرڈ دم سادھے اپنی جگہ کھڑا تھا۔

”آگے بڑھو ٹنکرڈ اور ہماری بخشش کی انتہا دیکھو۔“ شاہ رچڑ مسکرا رہا تھا۔

ٹنکرڈ پھر سوالیوں کی طرح بڑھ کے شاہ انگلستان کے سامنے جھک گیا۔

شاہ نے دوسرا قیمتی موتی بھی ٹنکرڈ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

”ہم تمہیں یہ دوسرا موتی اس لئے بخش رہے ہیں۔“ شاہ نے خود وضاحت شروع کر دی۔
 ”ہمارا دیا ہوا ایک آدمی تمہارے پاس اکیلا گھبرائے گا۔ اس موتی کے دینے کا مقصد ہے کہ ہم اس موتی کی تہائی دور کریں۔ تہائی کو ہم پسند نہیں کرتے۔ تم بھی تہائی اور اپنی تہائی دور کر لو۔“

ٹنکرڈ میں دوسرا موتی لینے کے بعد حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہزادی جین سے مصالحت ادا ہو گیا تھا مگر شہزادی نے خود ہی اس کی طرف التفات نہ کیا۔ اس لئے وہ بھی اُل ہو گیا تھا۔ اس وقت شاہ نے لطیف الفاظ میں اس کی تہائی پر اعتراض کیا گیا۔
 جین دربار میں موجود نہ تھی اس لئے اس نے دبے الفاظ میں جواب دیا۔

”ہاں جاہ... تہائی سے میں نے بھاگنے کی ہمت کو شش کی مگر نہ بھاگ سکا۔“ ٹنکرڈ نے یہ نظروں سے شاہ کی طرف دیکھا کہ لیکن اس کا مزاج برہم تو نہیں ہو رہا۔

دراصل جین اور ٹنکرڈ کے اختلاف کو شاہ رچڑ ہی نے ہوا دی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا ہے کہ ٹنکرڈ متقلد کا حکمران تھا اور جین شاہ انگلستان کی شہزادی تھی۔ اس لئے ہی اپنی اپنی جگہ اکڑے رہتے تھے۔ رچڑ کی ماں ملکہ ایلینور چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی بس جائے مگر لا ابالی شہزادہ رچڑ جو ان دنوں اسپین کی شہزادی بریگیٹریا سے عشق لڑا وہ ایک دن متقلد پہنچا۔ ظاہر ہے کہ جین نے شوہر کے خلاف شکایت کئے ہوں گے۔ اپنی شان میں بہنوں سے لڑ جھگڑا اور بہن کو ساتھ لے کے انگلستان چلے آئے۔ جب ج تک جین نے نہ متقلد کا منہ دیکھا اور حاکم متقلد نے اسے بلایا۔

شاہ انگلستان نے ٹنکرڈ کو صرف دو قیمتی موتی نہیں دئے ایک الماس کی گراں بہا بھی عنایت کی۔

ٹنکرڈ تم یہ نہ سمجھتا کہ ہم نے یہ ہیرے جواہرات تمہارے خزانے سے نکال کے دئے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ جس خزانے میں نقد رقم تو موجود ہے لیکن کوئی نہیں۔ تم نوادر کی کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ اسی لئے تمہارا خزانہ نوادرات سے بے جو نادر چیزیں تمہارے پاس تھیں۔ تم ان کی قدر نہ کر سکے اور وہ ضائع ہو اب ان چیزوں کو اپنے پاس ہماری یادگار سمجھ کر رکھنا۔“

رُش یہ کہ شاہ رچڑ نے مگرچھ کے آنسو کی طرح ٹنکرڈ پر یہ مہمانی کی کہ اس کا تمام نئے اور متقلد کی پوری اقتصادیات برباد کرنے کے بعد اسے ایک انگوٹھی اور دو قیمتی بطور بخشش عطا کیا۔ رچڑ مع اپنے لشکر کے پورے ایک سال تک متقلد پر قبضہ بیٹھا رہا۔ اتنے بڑے لشکر کے روزانہ اخراجات، پھر ماہانہ، آخر میں ایک سال کے بیج کا تخمینہ لگایا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ رچڑ جب متقلد سے چلا تو متقلد کی بالکل کھوکھلی ہو چکی۔ اس نے رچڑ کا چلنے وقت اہل متقلد کے سامنے الوداعی تقریر لیا ستم بلائے ستم کہا جاسکتا ہے جس کا ٹنکرڈ نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔

اہل متقلد اور فرمانروائے متقلد مبارک باد کے قابل ہیں کہ انہوں نے شاہ انگلستان

اس خط نے رچرڈ کو یقیناً "بہت خوشی دی اس لئے برطانیہ سے متغنی ہونے کے باوجود کی شادی میں طرح طرح کے رنخے پڑتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی وجہ دراصل ہان اور فرانس کے کشیدہ تعلقات تھے۔ یورپ کے ان ملکوں یعنی فرانس اور انگلستان اگرچہ باہم رشتہ داریاں بھی ہوتی تھیں۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان صرف بیس میل کی پانی کی پٹی تھی جسے انگلش چینل کہا جاتا ہے لیکن یہ فاصلہ دل کی دوریوں کی طرح جا رہا تھا۔

شہزادی بریگیٹا آف نورے، اسپین کے علاقہ کی شہزادی تھی۔ اسپین اور فرانس دونوں
ساتھ ساتھ تھے۔ فرانس نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پڑوسی ملک اسپین کی شہزادی کی
یا چڑھ جیسے مغرور بادشاہ ہو۔ چڑھ اپنی شہزادی کے زمانہ میں ایک عرصہ تک فرانس میں
تھا۔ خود چڑھ کی ماں ملکہ ایلینور فرانس کی ملکہ رہ چکی تھی، اس وجہ سے حکومت فرانس
اس بیٹوں کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔

فرانس کی حکومت رچرڈ اور برٹگیرا کے رومان کو تو برداشت کرتا رہا مگر رچرڈ نے تان کا بادشاہ ہونے کے بعد اپنے خیالوں کی ملکہ شہزادی برٹگیرا کو ملکہ انگلستان بنانے لئے اس سے باقاعدہ شادی کرنا چاہی تو حکومت فرانس نے طرح طرح کے حربے مال کرنا شروع کر دیے۔ حکومت فرانس نہیں چاہتی تھی کہ رچرڈ کو فرانس کے قریب ن ایک ایسا حلیف مل جائے جو کسی وقت بھی فرانس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا

بہر حال اب انگلستان اور فرانس کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اس لئے اس نے رچرڈ اور برٹگیرا آف نوارے کی شادی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور ملکہ لینور اپنی ہونے والی بہو کو ساتھ لے کر مقید جانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔ شاہ انگلستان کو ادی برٹگیرا آف نوارے سے محبت تو بہت تھی لیکن اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں لیریا ملکہ انگلستان بن جانے کے بعد شاہ انگلستان کی عیاشیوں پر کسی طرح کی قدغن بندی لگانے کی کوشش نہ کرے۔

شاہ رچڑ اپنی ماں کو منع تو نہ کر سکا مگر چونکہ اس کے متقلد چھوڑنے کے تمام غلامت ہو چکے تھے اس لئے اس نے متقلد سے روانگی ملتوی بھی نہ کی اور ملکہ ایلینور کو اب دیا کہ اسے متقلد میں قیام کئے ایک سال ہو چکا ہے اور اب وہ متقلد میں مزید انتظار میں کر سکتا۔ پھر بھی اس نے ماں کی ولداری کے لئے لکھ دیا کہ شہزادی برتگیہ یا آف رے کو قسطنطنیہ بھیج دے اور یہ کہ شہزادی کا روائتی استقبال کیا جائے گا۔ شاہ انگلستان

اور لشکر انگلستان جو صلیبی جنگ لڑنے اور مسلمانوں کو بیت المقدس سے بے دخل کر کے فلسطین جا رہے ہیں، ان کی خاطر خواہ مہمانداری کی۔ اس مہمانداری کا عرصہ اگرچہ غلاف معمول کچھ زیادہ ہو گیا (یہ مہمانداری ایک سال کے عرصہ پر محیط تھی) لیکن اس سے نر لوگوں کے ثواب میں بھی اضافہ ہو گا۔

اہل عقیدہ اور حاکم عقیدہ اس وجہ سے بھی مبارک باد کے لائق ہیں کہ عقیدہ کا خزانہ صلیبی جنگ کے اخراجات پر صرف ہو گا۔ جس طرح ”صلاح دین“ ٹیکس کی رقم خرچ ہو رہی ہے۔ اس کا ثواب علیحدہ سے ہو گا۔“

حاکم عقیدہ اور اہل عقیدہ کے دلوں پر اس تقریر نے کیا ستم ڈھایا ہو گا کہتے ہیں کہ نہ دست مارے اور رونے نہ دے۔ یہی حال اہل عقیدہ کا تھا وہ بیچارے کیا کہہ سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس کے جواب میں شاہ کی تعریف میں دو چار نعرے اور لگائے۔

مختصر یہ کہ شاہ رچڑد متلیہ سے رخصت ہوا تو ساحل پر موجود اہل متلیہ کے دل خون کے آنسو بہا رہے تھے اگرچہ بظاہر انہیں شاہ انگلستان کے حق میں نعرے لگانا پڑ رہے تھے۔ پھر وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہے تھے کہ رچڑد نے متلیہ کو قتل و خون سے محفوظ رکھا تھا۔

شاہ رچرڈ کو متقلہ کو ساحل چھوڑتے وقت ایک مسرت انگیز اطلاع ملی۔ اسی دن اپن کا ایک جہاز متقلہ کے ساحل سے لگا۔ اس جہاز میں اپن سے آنے والی ڈاک بھی تھی اور خاص کر شاہ رچرڈ کے نام اس کی ماں کا ایک خط۔ بند لفافہ جب رچرڈ کے سامنے پیش کیا گیا اس کی والدہ ملکہ ایلینور نے رچرڈ کو اطلاع دی تھی کہ شاہ رچرڈ کی منگیت شزادی بریگیا اس کے پاس آگئی ہے اور اسے ملکہ ایلینور اپنے ساتھ لے کر بہت جلد متقلہ پہنچنے والی ہے۔

جن لوگوں کو رچرڈ اور شہزادی برتھیریا آف نوارے کے رومان کا علم تھا ان کا خیال تھا رچرڈ فلسطین جانے کا پروگرام کچھ دن کے لئے ملتوی کر کے اپنی جان بھار جو اب اس سے منسوب بھی ہو چکی تھی، اسے متلیہ ہی میں خوش آمدید کہے گا اور متلیہ میں ہنی منانے کے بعد ہی آگے بڑھے گا۔

رچرڈ کی ماں نے اپنے خط میں یہ بات زور دے کے لکھی تھی کہ اب اسے (رچرڈ) اپنی ملکہ سمجھ لینا چاہئے اور وہ عتیقہ پہنچتے ہی رچرڈ اور برٹگیرا کی شادی کر دے گی۔ اس ملا شہزادی برٹگیرا کی مرضی کا بھی دخل تھی۔ اس نے اپنی ساس ایلینور سے اس بات کی خواہش کی تھی وہ رچرڈ کے ساتھ شادی کے بعد فلسطین جائے گی اور شوہر کے ساتھ بدھم کی زیارت کا ثواب حاصل کرے گی۔

نے ماں کے خط کو راز نہیں رکھا بلکہ اس نے دربار میں بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا۔

شاہ رچڑ نے اپنی ماں کو جو جواب دیا اس کی سب سے زیادہ خوشی ٹینکڑ کو ہوئی۔ یہ ڈر رہا تھا کہ کہیں رچڑ کا آگے بڑھنا ملتوی نہ ہو جائے اور پھر مقلید ہی میں شاہ رچڑ بریگیڈ کی شادی کی رسومات بھی ادا کی جائیں۔ اگر خزانہ اس کے پاس ہوتا تو یہ محسوس نہ ہوتا لیکن خزانہ کی عدم موجودگی میں اس نے ایک سال تک شاہ انگلستان اور کے لشکر کی مہمان نوازی کی تھی۔ اس کے لئے کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ شاہ رچڑ نے چلتے وقت ایک بار پھر ٹینکڑ کو سمجھایا۔

”ٹینکڑ۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے اس ایک سال کے دوران تم پر اپنا کوئی بوجھ ڈالا۔ ہم اپنے مذہب کی سرپرستی کے لئے جانیں نچھاور کرنے فلسطین جا رہے ہیں۔ تم ہماری یا ہمارے لشکر کی جو خدمت کی ہے اس کا ثواب تو تمہیں اوپر والا دے گا اور ثواب تمہارے تصور سے کہیں زیادہ ہو گا۔“

”آپ درست فرماتے ہیں شاہ انگلستان۔“ ٹینکڑ نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”شاہ انگلستان اور ان کے لشکر کے مقلید میں قیام کی وجہ سے مجھے دہرا فائدہ ہوا۔ اب فائدہ تو یہ کہ شاہ انگلستان اور لشکر انگلستان مذہبی جنگ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ لشکر کے اس جگہ قیام نے دراصل مجھے بھی ایک طرح سے اس مذہبی جنگ میں شامل لیا۔ میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یوٹلم نہیں جاسکتا اس لئے جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ کہ مجھے بھی صلیبی جنگ کا ثواب حاصل ہو گا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ عالی جاہ نے سرزمین مذہ پر کچھ دن قیام فرما کر مجھے جو اعزاز بخشا ہے یہ اس پہلے فائدہ سے کہیں زیادہ ہے۔ امید کہ عالی جاہ جب صلیبی جنگ سے کامیاب اور کامراں واپس آئیں تو اس خادم کو ایک بار پھر مہمانداری کا موقع عطا فرمایا جائے۔“

شاہ انگلستان نے تعجب سے ٹینکڑ کو دیکھا۔ ”ٹینکڑ۔ تم تو حساب کتاب کے پکے اور ایک کھرے انسان معلوم ہوتے ہو مگر پتہ نہیں کہ تم نے شہزادی کا دل کس انداز سے دکھا تھا کہ وہ تمہارے معاملے میں درگزر سے کام نہ لے سکیں۔ خیر ہم تمہیں یہ یقین دلاؤ ہیں کہ ہم فلسطین سے واپسی پر مقلید میں چند روز ضرور قیام کریں گے۔ اس وقت ہمارے ساتھ ملکہ انگلستان ہر مجبئی بریگیڈ آف نوارے بھی ہوں گے۔“

بہت خوب عالی جاہ۔ میں اور اہل مقلید شاہ انگلستان اور ہر مجبئی ملکہ انگلستان کے منتظر رہیں گے۔“

حالانکہ ٹینکڑ نے ساحل پر آنے سے پہلے مقلید کے بڑے گرجے میں جا کر آہستہ شاہ انگلستان کی بربادی اور تباہی کی دعا مانگی تھی۔ مقلید پچھلے ایک سال میں بالکل مالا ہو گیا تھا۔ شاہی خزانہ پر تو پہلے قبضہ ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان اور لشکر کے اخراجات اپنی جیب سے پورے کر رہا تھا پھر جب اس کی جیب خالی ہوئی تو اس نے مقلید کے سکی مدد حاصل کی۔ امرا جانتے تھے کہ اگر شاہ انگلستان کے لشکر کو ذرا بھی تکلیف تو ان کے محلات کا بھی وہی حشر ہو گا جو انگلستانی دستوں نے مقلید کے شاہی خزانے کا کیا۔ وہ اسی لئے حاکم مقلید کا بڑی فراخ دلی سے ساتھ دے چلے جا رہے تھے۔

بہر حال ٹینکڑ کے نقطہ نظر سے شاہ انگلستان اور اس کا لشکر مقلید والوں کی بڑی دعاؤں بعد فلسطین کی طرف روانہ ہوا اور جب پچیس جہازوں اور سکڑوں بحیروں کے ساتھ یہ الشان بیڑا نظروں سے اوجھل ہوا تو ٹینکڑ سیدھا بڑے گرجے میں گیا اور اس شہر کے رچوں کی گھینٹیاں بجوا کر اپنی خوشی کو اظہار کیا۔ اس خوشی میں ٹینکڑ کے ساتھ مقلید ام باشندے اور امرا بھی شامل تھے کیونکہ انہیں راتوں کو اس خیال سے نیند نہ آتی کہ کہیں انگلستانی لشکر ان کے گھروں اور محلات پر نہ چڑھ دوڑے۔

موسم گرما کے آخر میں ملیسوں نے مکہ پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ انہوں نے قلعہ کے گرد رہ تنگ کرنا شروع کیا۔ اس سے جنگ میں شدت پیدا ہو گئی اور دونوں طرف سے دن اور میدان جنگ میں تیار کئے گئے الجھنوں سے تنگ باری ہونے لگی۔ منجینقوں ماری پتھر اور درختوں کے موٹے موٹے تنے چڑھا کر مخالف سمت پھینکے جاتے۔ جو ان میں آجاتا وہ چٹنی بن کے رہ جاتا۔

سلطانی لشکر اور مکہ کے مسلمان محصورین کے درمیان سوائے نامہ پر کبوتروں کے اور بریہ پیغام رسانی کا نہ رہ گیا تھا۔ باریک کاغذ پر خط لکھا جاتا پھر اسے چاندی کے انتہائی خول میں داخل کر کے بند کر دیا جاتا اور یہ خول قاصد کبوتر کے پیر میں دھاگے کے باندھ دیا جاتا۔ کبوتر کو قلعہ کی چھت سے اڑایا جاتا۔ تربیت یافتہ قاصد کبوتر ملیسوں کوں پر سے اڑتا سلطانی لشکر میں پہنچتا اور وہیں کبوتر کے پیر سے لٹکا ہوا خط حاصل کر لیا۔

خط میں عیسائیوں کے دن بھر کے حملوں کی تفصیل ہوتی۔ قلعہ والے اپنی مدافعت کا حکم دیتے۔ سلطان خط کے مطالعہ کے بعد محصورین کو استقامت کی تلقین کرنا اور جو انمردی سے مدافعت کا حکم دیتا۔ ایک دن نامہ بر کبوتر کے ذریعہ ہی سے سلطان کو دی گئی کہ محصور مسلمانوں نے عیسائیوں کی دو دھمکیوں سے ایک خطرناک منجینق کو جلا

پل کے ذریعے فیصل پر اترا جاسکتا تھا۔

قلعہ کی مدافعت کرنے والوں نے بحیرے کو تو دیکھا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ نصرانیوں نے فیصل پر اترنے کے لئے ایک قیامت کی چال چلی ہے پھر جب مسلولوں کے ہندے ہوئے پل فیصل پر آگے اٹکے اور ایک راستہ بن گیا تو مسلمان غزوہ مار کر فیصل پر گئے عیسائی برابر تیر برسا رہے تھے مگر مسلمان اس سے بے پروا ہو کر فیصل کے اس حصے پر نچے جہاں معلق پل ٹٹکائے گئے تھے اور فوراً ان اٹکے ہوئے پلوں پر آتش یونانی کی بارش ردی۔

عیسائیوں کی یہ ذریعہ دست چال دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئی۔ آتش یونانی دراصل تل میں کچھ اور کیما دی مادے ڈال کر تیار کی جاتی تھی پھر انہیں ہاتھوں میں بھر کر منجیق کے ذریعے آگے پھینکتے تھے۔ آتش یونانی ایسی ظالم آگ تھی کہ یہ لوہے کو بھی ملا دیتی تھی۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کا یہ حملہ تو پسپا کر دیا لیکن ان کے دو دبا بے لمانوں کو بہت پریشان کر رہے تھے۔

یہ دبا بے کیا تھے لوہے کے چلتے پھرتے قلعے تھے۔ سامنے کی طرف رستوں کی بٹی ہوئی پیاں ٹٹکائی گئی تھیں۔ تاکہ مسلمانوں کی سنجیتوں سے آنے والے پھران رسوں میں الجھ رہ جائیں۔ ان کے اوپری سروں فولادی چادروں سے ڈھاپا گیا تھا۔ دبا بے میں ایک راج تھا جس میں سے ہو کر ایک فولادی شیلر کو اندر کی طرف پینڈل سے گھمایا جاتا۔ اس پل سے فیصل کے نچلے حصے کے پتھروں پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دبا بے پ آف بیگان اور دو سرا ڈیوک آف سوربیا نے بنوایا تھا۔

خیال رہے کہ یہ ڈیوک آف سوربیا، فریڈرک شاہ جرمن کا بیٹا تھا۔ شاہ جرمن نے پ کی فلسطین کی طرف روانگی سے پہلے سلطان صلاح الدین کو ایک گستاخانہ خط لکھا تھا، کالب لباب یہ تھا کہ اگر سلطان نے فوراً یرد شلم خالی نہ کر دیا تو میں اپنے لشکر سے مانوں کو پیس کے رکھ دوں گا مگر اس بد بخت کا انجام یہ ہوا کہ راستے میں ایک دریا پار تے ہوئے گر گیا۔ وہ ڈوبنے سے تو بچ گیا مگر دزدان بعد مر گیا۔

سلطان صلاح الدین نے شاہ جرمن کو روکنے کے لئے اپنے بھتیجے تقی الدین کو ایک لشکر کے ساتھ شمال کی طرف روانہ کر دیا تھا لیکن شاہ جرمن ختم ہو چکا تھا اور اس لشکر میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ آدھا لشکر تو شاہ جرمن کے مرتے ہی واپس ہو گیا۔ باقی لشکر ل کا بیٹا ڈیوک آف سوابیا لے کر روانہ ہوا مگر اس پر ایسی افتاد پڑی جب وہ مکہ کے ل پر اترا تو اس کے ساتھ صرف بارہ سو سپاہی رہ گئے تھے۔

کر راکھ کر دیا ہے۔ ان دو منجیقوں نے قلعہ کے محصورین کو بہت تنگ کیا تھا۔ مسلمانوں نے اس منجیق کو اس طرح تباہ کیا کہ انہوں نے فولاد کا ایک زبرد بنایا پھر اسے آگ میں ڈال کے خوب گرم کیا۔ جب یہ تیر سرخ ہو گیا تو اسے اپنی چڑھا کر دشمن کی منجیق پر پھینکا۔ اس تیر نے تباہی مچادی اور عیسائیوں کی منجیقز راکھ ہو گئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اس مسرت انگیز اطلاع پر خدا کا شکر بجالایا۔ سمندر بھی شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ عیسائی ہر صورت قلعہ مکہ میں داخل کے لئے چناب ہو رہے تھے۔ وہ خود کو لغت ملامت کرتے کہ دو سال کے طویل کے بعد بھی وہ ایک قلعہ تک فتح نہ کر سکے۔ قلعہ مکہ میں مدافعتی فوج کی تعداد آگ بروز کم ہوتی جا رہی تھی لیکن مدافعت کم ہونے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔ بحری فوج طرح طرح حلوں سے قلعہ کے پر اترنے کی کوشش میں تھے۔

انہی دنوں عیسائیوں کے ایک بڑی بحیرے کے مسلول کے ساتھ چوڑے چوڑے نصب کئے۔ ان تختوں کے ساتھ معلق پل بندھے ہوئے تھے جنہیں مرضی کے مطابق جاسکتا تھا۔ عیسائیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اس بحیرے کو مکہ کی فیصل کے سامنے سر پہنچایا جائے پھر معلق پلوں کو جو تختوں پر نصب تھے، فیصل پر جھکایا جائے اس طرح جانے کا راستہ بن جائے گا۔ اس بحیرے کو قلعہ سے برسائی جانے والی آگ سے رکھنے کے لئے اس پر چھت ڈال دی گئی تھی۔

پس منصوبے کے م مطابق عیسائیوں کے جتنے بھی جنگی جہاز سمندر میں تھے ان قلعہ کے برج باب الزہب کے گرد لاکر قلعہ پر شدید سنگ باری کی گئی۔ یہ سنگ دراصل قلعہ والوں کو مصروف رکھنے اور ان کی توجہ فیصل کی طرف سے ہٹانے کے مگنی تھی۔ اس سنگ باری کا جواب قلعہ سے بھی دیا گیا اور منجیقوں کا ایک زہر معرکہ شروع ہو گیا۔

پھر اس وقت سنگ باری کے دوران وہ بحیرا جس پر چھت پڑی تھی اور مسلولوں سے معلق پل بندھے تھے وہ برج الزہب کے عین سامنے لاکے کھڑا کیا ملاحوں نے معلق پلوں کے سروں کو فیصل پر اٹکایا۔ اس طرح بحیرے پر سے ایک ل

یہ دبا بے کھڑی کے پیوں پر چلتے تھے۔ انہیں آہستہ آہستہ فیصل کے قریب لایا گیا۔ مکہ کے قلعہ میں سطلانی لشکر کے دو عظیم سردار المشوب اور قراقوش محصور فوجوں کی کمر کر رہے تھے۔ انہیں قلعہ کی مدافعت کرتے ہوئے دو سال گزر چکے تھے اور وہ ہر طرح گرم سرد سے گزر چکے تھے مگر ان دو بابوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ قراقوش دبا بوں کی جلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ رال کی ہانڈیاں، آتش یونانی، غرض تمام کوششیں انہیں جلانے یا تباہ کرنے کی بیکار ہو گئی تھی۔

پھر المشوب نے دبا بے کی نوک جس پر آہنی چادر لپیٹی گئی تھیں، اس نوک کو نثار بنانے کا حکم دیا۔ بس برقدازوں سنگ باروں نے اس کا نشانہ لیا اور آگ اور پھر بار شروع کئے۔ شدید سنگ باری سے دبا بے کا سرا تھوڑا سا ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹنے پر ”آتش یونی“ کی ہانڈیاں اور گولے برسائے۔ اس طرح دبا بے کی سر سے شعلے بھڑک اٹھے اور وہ جل کر خاک ہو گیا۔

دوسرا دبا بے قلعہ کے بالکل مقابل کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے اچانک حملہ کر دیا اور قلعہ سے نکل کر دبا بے کو گھیر لیا۔ پھر اس کے اندر آگ لگا دی۔ اب دبا بے مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ مسلمانوں نے دبا بے کو زنجیروں سے باندھا اور اسے اسی طرح گھٹیت قلعہ میں لے گئے جس طرح ”ثرائے“ کے میدان سے قلعہ والے لکڑی کا گھوڑا گھٹیت کرے گئے تھے۔ ثرائے کے میدان سے لے جانے والے دیو قامت لکڑی کے گھوڑی میں دشمن کے سپاہی چھپے ہوئے۔

قلعہ والے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر گھوڑا قلعہ میں کھینچ لے گئے تھے۔ پھر اندر پہنچ کر انہوں نے فتح کا جشن منانا شروع کیا اور شراب کے قدے کھل گئے۔ جب یہ لوگ شراب میں دھت ہو گئے تو گھوڑے میں چھپے ہوئے دشمن سپاہیوں نے باہر نکل کر ان دبا بوں کا قتل عام کیا اور فتح یاب ہوئے۔

لیکن مسلمان ان سے زیادہ ہوشیار تھے۔ انہوں نے دبا بے کے اندر آگ لگا کر اسے پھونک دیا تھا اور جتنے آدمی اس کے اندر تھے وہ سب خاکستر ہو گئے تھے۔ یہ جلا ہوا دبا بے کئی دن بعد ٹھنڈا ہوا تو مسلمان انجینیئروں نے اس کے کل پرزوں کا معائنہ شروع کیا۔ کئے ہیں کہ اس کی تیاری میں ہزاروں پونڈ فولاد استعمال ہوا تھا۔

دونوں دبا بوں کی تباہی سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے شعلہ انداز آلات سے لیس ہو کر عیسائیوں پر حملہ کر دیا۔ ندرہ بکتر سے مسلح عیسائی فائٹ مسلمانوں کے حملہ کو روکنے کے آگے بڑھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں لپکتے ہوئے شعلے تھے وہ انہوں نے

اں پر کھینچ مارے۔ ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور زرہ بکتر گرم ہو کر پھٹنے لگے۔ تڑپ تڑپ کے زمین پر گرتے اور آگ کی شدت سے دم توڑ دیتے۔ اس وقت نوں کے شعلہ انداز آلات دبا بوں اور منجیقوں کو نشانہ بناتے تھے۔

سلطان صلاح الدین کو ان لڑائیوں کی تفصیل قاصد کبوتروں کے ذریعہ سے پہنچا دی۔ ادھر کچھ دنوں سے قاصد کبوتروں کے ذریعہ سے نامہ پیام بند ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ قاصد کبوتر جب عیسائی چھاؤنیوں کے اوپر سے گزر رہا تھا تو ایک تیر انداز نے کمان کے اس کا نشانہ لیا۔ تیر کبوتر کے پوست ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ عیسائی نے کبوتر کو اٹھایا تو اس کے پیر سے چاندی کی ٹالی بندھی ہوئی تھی۔ ٹالی کے اندر غنڈ نکال کر پڑھا تو وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا خط اپنے سردار قراقوش کے نام تھا۔ اور المشوب قلعہ کے مدافعتی لشکر کے سردار تھے۔ عیسائی چوکے ہو گئے۔ اس قلعہ سے پیغام لانے والا ایک کبوتر عیسائی تیر اندازوں کا نشانہ بنا۔ پھر ایک زخمی اسی طرح سلطان کے پاس پہنچ گیا جس سے سلطان کو علم ہو گیا قاصد کبوتر دشمن کے زول کا نشانہ بن رہے ہیں۔ سلطان نے اس طرح کی خط و کتابت کو فوراً بند کرا

ریہ جنگ کا زمانہ تھا قلعہ والوں کو سلطان کی خبر اور سلطان کو قلعہ کی روزانہ کی خبر دی تھی۔ سلطان نے اس کے لئے ماہر غوطہ خوروں اور تیراکوں کی خدمات حاصل ایک تیراک رات کے اندھیرے میں سلطانی فرود گاہ سے ساحل کی طرف جاتا۔ اسے لاکھ لاکھ سے بھی گزرنا پڑتا مگر وہ چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچتا۔ پھر وہ اتار کر کنارے پر چھپا دیتا اور سمندر میں تیرتا ہوا کلکی بندرگاہ پر اس جگہ پہنچتا۔ عیسائی پہنچنے کی جرات نہ کرتے تھے۔

تیراک جلدی جلدی زبانی یا کانڈی احکامات شاہی رکبوالوں کو منتقل کرتا اور اسی ہوا واپس آجاتا۔ پیغام رسانی کا یہ طریقہ بہت خطرناک تھا پھر ایسی صورت میں کہ کو یہ اطلاع ہو گئی تھی اب قلعہ اور شاہی خیمہ گاہ کے درمیان تیراکوں کے ذریعہ ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ تیر انداز لگا دئے تھے جو پانی کے اندر یا کنارے پر کسی نہ پر بھی تیر چلا دیتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ خود عیسائیوں کے کئی لشکری تیر اندازوں کا نشانہ بن گئے۔ لیکن مسلمان تیراک بھی اکثر ان کا نشانہ بنتے تھے۔ کبوتروں کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے پاس سوائے تیراکوں کا ذریعہ استعمال قلعہ سے اور طرح رابطہ قائم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک شاہی

تیراک کا حال بڑا درد ناک مگر ایمان افروز ہے۔ وہ ہر تیسرے دن اپنے مشن پر تیرتا نکلتا اور صبح ہونے سے پہلے عیسائیوں کی نظروں اور تیروں سے بچتا ہوا خیمہ گاہ واپس آجاتا تھا مگر ایک رات وہ ایسا گیا کہ دو دن تک اس کی واپسی نہ ہوئی۔ سلطان اسے ساحل سمندر پر تلاش کرنے کا حکم دیا۔ چوتھے دن ساحل پر اس کی لاش تیرتی ملی۔

تیراک کی لاش سلطان کے سامنے پیش کی گئی۔ اس کے جسم پر تیریا کسی اور جہم نشان نہ تھا اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ کسی وجہ سے ڈوب گیا ہے مگر حیرت انگیز یہ تھی کہ جب اس کی ہیمانی (وہ چھٹی تھیلی جس پر پانی کا اثر نہیں ہوتا اور اس میں اہم چیزوں کو چھپائے رکھا ہے) دیکھی گئی تو سلطان کا خط کچھ دیگر چیزیں اس میں تھیں۔ مرنے والے کے اس کارنامہ پر ہر ایک آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سلطان صلاح کے قاضی اور مورخ کی زبان سے اک دم نکلا۔

”اس سے پہلے کبھی کسی انسان نے

موت کے بعد اپنا فرض اس طرح

انجام نہ دیا ہو گا۔“

صلاح الدین نے دریا کے بالائی حصہ میں اپنی بیکریں تعمیر کی تھیں اور یہاں تہ بازار بن گیا تھا۔ اس بازار میں دھوبی، ناکی، چمار جیسے ضروری کام کرنے والوں کی کلاہ گھوڑے کے ساز تیار کرنے والی اور زین بنانے والوں کی کثرت سے دکانیں ان دکانوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے ان پر ترپالوں کی عارضی چھتیاں ڈال گئی تھیں۔ ضروریات زندگی کی تقریباً ہر چیز اس بازار میں دستیاب تھی۔ گھموں، چاول کے بھرے اونٹ یہاں اترتے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ تاجروں کے ضرورت مند لوگ آجاتے اور انہیں کسی نہ کسی کام میں لگا دیا جاتا۔ ایک مسافر کا با کہ اس نے اس بازار میں صرف کفش معزوں (موچی) کی دو سو دکانیں لگیں۔ اس فوج کا اتنے عرصہ قیام رہا کہ ایک ہزار عارضی دکانیں تیار ہو گئی تھیں۔

بشپوں نے جگہ جگہ جام بنائے تھے۔ وہ ایک گزر کھودتے تو پانی نکل آتا۔ انہ پانی کے لئے حوض بنائے تھے اور ان کے گرد کچی دیواریں کھینچ کر لکڑی اور کچھتیاں بنا دی تھیں۔ یہ سفری حمام تھے اور ان میں ایک درم دم دے کر غسل کیا جاتا۔ یہ ایک نئے قسم کی جنگ تھی۔ دراصل یہ فوجوں کے ممبر کا امتحان تھا۔ جنہر کے سامنے ہونے کے باوجود یہ نہ معلوم تھا کہ جنگ کب شروع ہوگی اس کا غائب

تو روز کوئی نہ کوئی جھڑپ ہو جاتی اور کبھی لشکری ہفتوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے یہ بھی کہہ سکتے ہیں لشکروں پر جمود طاری ہو گیا تھا یا پھر وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر ہتھے۔ مکہ کا قلعہ نہ فتح ہوتا تھا اور نہ قلعہ والے مکہ خالی کر کے باہر آنے کا نام لے۔ سلطان کا قلعہ والوں سے براہ راست رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی قاصد کبوتر یا راک کے ذریعہ خبروں کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔

دونوں طرف اسے جاسوسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ سلطان کی طرف سے نہ دہقان نصرانی لشکر میں بے دھڑک چلے جاتے تھے اور کبھی کبھی بڑی اہم خبریں لے تھے یہی حال عیسائیوں کی طرف سے بھیجے ہوئے جاسوسوں کا تھا وہ بھی تاجروں کے پنے جاسوس بھیج دیتے جو سلطانی لشکر کی خبریں نصرانیوں میں پہنچاتے تھے۔ اگر سلطان نئی اور ذاتی مورخ ہماء الدین کو یہ علم ہوتا تھا کہ فلاں فلاں دن سمندر کے راستے ما کو اتنی کمک پہنچی تو عیسائیوں کو بھی یہ پتہ چل جاتا کہ شمال سے تقی الدین کب یا اور اس کے ساتھ کس قدر لشکر ہے۔

زائ کا موسم گزر چکا تھا کہ جاسوسوں نے عیسائی سرداروں کو اطلاع دی کہ مسلمانوں نے سامان رسد کا ذخیرہ متیقہ کے قریب جبل کارمل کے سائے میں چھپا رکھا ہے۔ ما کو سامان رسد کی شدید کمی تھی۔ چنانچہ عیسائیوں کے تین سردار آرج بشب آف کاؤنٹ ہنری اور مارکوئیس کو نریڈ نے منصوبہ بنایا کہ حیضہ کے ذخیرہ کو لوٹا جائے۔ انہوں نے اپنے اپنے لشکر سے چیدہ چیدہ سپاہیوں کا انتخاب کیا اور ایک رات طرف روانہ ہوئے۔

ہر سلطان نے اپنے مدافعتی منصوبہ میں عیسائیوں کے ہر بڑے سردار کی خیمہ گاہ پر سے مقرر کر رکھے تھے کہ جس وقت بھی ان بڑے سرداروں کے فوجی دستے کسی رکت کریں تو فوراً ان کا تعقب کیا جائے اور معقول جگہ روک کر حملہ کیا جائے۔ ح جب آرج بشب، ہنری اور کو نریڈ نے اپنے دستوں کے ساتھ حیضہ کا رخ کیا تو سے بھی ان کے دائیں بائیں لگ گئے۔

رجب یہ دونوں اپنی اپنی خیمہ گاہ سے کافی دور نکل آئے تو سلطانی دستوں نے اللہ نو لگا کر عیسائیوں پر حملہ کر دیا۔ انہیں اس حملہ کی قطعی توقع نہ تھی اس لئے وہ نہ عیسائیوں میں بہت سے نائی گرامی فائٹ اور ٹپل شامل تھے مگر ان پر بری طرح حیضہ کا ذخیرہ لوٹا تو ایک طرف رہا انہیں اپنی جانیں بچانا مشکل ہو گئی۔ مسلمانوں کا گھیر کر اس قدر مارا کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہو گا۔ عیسائی دستوں کو حیضہ

پہلے ہی گھیر لیا گیا تھا۔ دستوں کی یہ لڑائی ایک خوفناک جنگ میں تبدیل ہو گئی تین دن تک ایسا خونریز معرکہ چلا کہ زمین کانپ کانپ گئی۔

پھر عیسائیوں نے پیٹھ دکھائی اور اپنا رخ اپنی لشکر گاہ کی طرف کر لیا اور لڑتے ہو مار کھاتے اور قتل ہوتے ہوئے بڑی مشکل سے واپس ہوئے۔ ان خونریز جنگ میں نقصان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ آرج بشپ کے نائب نے نصرانی کیپ کا اس طرح سے کھینچا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کیپ میں یوں مہوتا ہے جیسے خدا کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ جنگ کے زمانہ میں عام لشکری اور سردار اپنی را عبادت میں مگزارتے ہیں مگر ہمارے سردار اپنی راتیں عیش و عشرت میں بسر کرتے ہیں درجہ لشکروں کی حالت بہت خراب ہے ان کو کوئی پرسان حال نہیں۔ ہر شخص تن آ اور شہوانی خواہشات کا شکار ہے۔ امرا ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔

سلطان کی طاقت روز بروز ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے فائٹس بزدل ہوتے جا رہے ہیں مسلمان ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں دعوت مبارزت دیتے ہیں مگر ہمارے فائٹس میں دم دبائے پڑے رہتے ہیں۔ یہ باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اگر نے سنی ہوئیں تو ان پر ہرگز اعتبار نہ کرتا۔ مجھے تو یہ یقین نہیں آتا کہ یہ ہمارے فائٹس اور لشکری ہیں۔

مغربی مورخین نے یوں تو سلطان صلاح الدین پر صدمہ کتابیں لکھی ہیں مگر ان کا تاریخی نہیں۔ یا تو انہوں نے ظلم نگاری کی ہے یا افسانہ طرازی۔ ان کے اس انداز مسلمانوں کے عظیم سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس کے کارناموں کو اجاگر کر کے بجائے دھندلا کر دیا ہے اور یہی ان کا مقصد بھی تھا اس لئے ان سے شکوہ بیکار۔ یہاں پر صرف اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سلطان پر طرح طرح کڑے الزام عائد کر کے ان کی اہلیت اور شخصیت کو مسخ کرنے کی جو ناکام کوشش کی گئی ہے اس میں چند باتیں کہی جائیں۔

مغربی مورخ (لین پول) ہیریڈ لیم۔ امیر روز وغیرہ کو قدر کی نگاہ سے اس لئے دیکھتے کہ انہوں نے اس نیک سلطان کو کسی نہ کسی طور نااہل اور خود غرض ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ سلطان کے بارے میں بعض ایسے واقعات بھی بیان کئے جو کسی دوسری جگہ ملتے۔ خصوصاً "لین پول اور ہیریڈ لیم کے اگر ناول اور داستانیں موجود نہ ہوتیں تو صلاح الدین کے بعض اہم گوشے ہماری نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ مغربی مورخ سلطان صلاح الدین ایوبی کی جنگی حکمت اس قدر غلط نہ اعتراض کرتے ہیں جن پر ہنسی آتی ہے۔ ان کی پہلی نہ سمجھ میں والی بات تو یہ ہے کہ انہیں اس بات پر تعجب ہے کہ سلطان نے شکست خوردہ ن کے اس گردہ کا خاتمہ کیوں نہیں کیا جو قلعہ صور پہنچا تھا اور حاکم قلعہ مارکوئیس نے اسے قلعہ میں پناہ دینے کے بجائے قلعہ ملک کی طرف ڈھکیل دیا تھا۔

ن کے اس اعتراض یا ناکہجی اور اسی طرح کی اور باتوں کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کو ایک معمولی سردار سے سلطان دمشق بننے میں جو جو پاپڑے تھے ان تجربات نے سلطان کو ضرورت سے بھی زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔ قلعہ صور ہو کثیف سلطان صلاح الدین نے ان قلعوں پر قبضہ کرنے میں اپنی طاقت کو ضائع کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ براعظم ایشیا اور براعظم یورپ کی تمام نصرانی (عیسائی) ایک جگہ اکٹھا ہو جائے تاکہ ان سے ایک ہی فیصلہ کن جنگ ہو اور روز بروز یہ ناکل ختم ہو جائے۔

سلطان کی اس دور اندیشی اور انتہائی کامیاب حکمت عملی کی کون داد دے سکتا ہے کہ نے چار ساڑھے چار ہزار کا اسلامی لشکر قلعہ ملک میں گھیر کر عیسائیوں کی پوری اس کے گرد اکٹھا کر دیا۔ پھر قلعہ والوں نے اندر سے مدافعتی اور سلطان نے باہر جانہ جنگ سے عیسائیوں کو مجبور کر کے رکھ دیا اور وہ لشکر جو یروشلم (بیت المقدس) کرانے کے لئے ایشیا اور یورپ کے تمام ملکوں سے آرہا تھا وہ یروشلم کی طرف لے بجائے قلعہ ملک کا محاصرہ میں لگ گیا تھا

سلطان کی اس حکمت عملی اور دور اندیشی کا کیا نتیجہ ہوا یہ تو آپ آئندہ صفحات میں گئے۔ یہاں پر اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ جب نصرانی لشکر جس میں یورپ کے تمام فوجیں شامل ہو چکی تھیں، انہیں یروشلم (بیت المقدس) پر یلغار کا موقع ملا تو اس نے اور کمزور ہو چکا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ وہ کم از کم یروشلم کا محاصرہ ہی لائے وہ تو اسے آزاد کرانے آئے تھے۔

ملک کو اسی طرح محاصرہ کی حالت میں چھوڑ کے ہم ایک بار پھر بحر روم کے جزیرہ میں جہاز سے انگلستان کا بادشاہ رچرڈ فلسطین کی طرف روانہ ہونے کے لئے پرتول

تاریخی حوالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ رچرڈ کی والدہ ملکہ ایلینور اپنی بہنوئی رچرڈ کو خود اپنے ساتھ لے کر قتلہ پہنچی تھی تاکہ شاہ رچرڈ

رواں دواں تھا کہ اچانک بحرِ روم میں طوفان آگیا۔ سمندر کے غصے سے خدا محفوظ ہی اس کا مزاج بگڑتا تو وہ بڑے بڑے جہازوں کو پتوں کی طرح الٹ دیتا ہے۔ وہ تو خیر شاہِ رچڑ کا بحری بیڑہ جزیرہ قبرص کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ملاحوں نے فوراً جہازوں کا ڈیوں کی طرف موڑ دیا۔ ان کھانڈیوں کو اونچی نیچی پہاڑیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ جنوں کے سامنے سمندر ہیں۔ پہاڑیاں ہوتی ہیں ان بندرگاہوں کو محفوظ سمجھا جاتا ہے طوفان کے زمانہ میں سمندر کی تیز ہواؤں اور لہروں کا زور یہ پہاڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ رص کا جزیرہ ان دنوں بازِ نطنی شہنشاہِ روم کے ماتحت تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یورپ مِ الشان "سلطنتِ روم" دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہو گئی تھی۔ جس میں ایک کا انت اطالیہ کا شہر روم تھا اور یہ سلطنت روم تہ اکبری کہلاتی تھی۔ عیسائیوں کا سب پڑوا جسے "پوپ" کہا جاتا ہے وہ روم ہی میں رہتا تھا۔ دوسری سلطنت روم مشرق جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ (استنبول) تھا۔ اس سلطنت کے ماتحت مشرقی یورپ کے اور بحرِ روم کے بیشتر جزائر تھے۔

ب سے سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس (یروشلم) کو فتح کیا تھا، یورپ کے تمام میں خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی، ہر جگہ آگ سی لگی ہوتی تھی۔ یہ آگ یروشلم کے دی نے لگائی تھی سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس پر قبضہ کے بعد لارڈ جزیرے کو چھوڑ دیا تھا۔ اسی کو بعض بلکہ گائی کننن شاہِ یروشلم اور دوسرے عیسائی شہزادوں، فائٹوں اور ہاپٹلر کو بھی جزیرہ لے کر رہا کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین کی غلطی سمجھیں لیکن یہ سب کچھ سلطان نے خالص رومی کے تحت کیا تھا۔ بیت المقدس پر سلطانی قبضہ سے پہلے طین کے مقام پر اور مسلمانوں کا عظیم معرکہ ہوا تھا۔ یہ جنگ ہی دراصل بیت المقدس کی جنگ بن طین کے میدان میں عیسائیوں کے تقریباً تمام بڑے بڑے سردار اور حکمران یا تو تھے یا پھر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔

جب سلطان فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس کے حضور وہ عیسائی خواتین ان جن کے شوہر مارے جا چکے تھے یا گرفتار تھے۔ ان خواتین کا تعلق حکمرانوں سے تھا اور یہ زارو قطار روتی ہوئی سلطان کے سامنے آئی تھیں۔ سلطان کو ان پریشان حال خواتین پر برا رحم آیا اور اسے فوراً وہ حدیث یاد آگئی جس کا مفہوم طرح تھا۔

ما تخلق خدا پر رحم کرو

کے فلسطین جانے سے پہلے وہ برتگیا اور رچڑ کی شادی کر دے۔ ملکہ ایلینور کے اہم اقدام میں برتگیا آف نوارے کی یہ ضد بھی شامل تھی کہ وہ خود بھی صلیبی جنگ میں بحیثیت ملکہ انگلستان حصہ لینا چاہتی ہے۔

اس طرح ملکہ ایلینور متقیہ پہنچی مگر اسے بتایا گیا کہ شاہ انگلستان رچڑ متقیہ کا رام دور روز پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ ملکہ کو یہ بس بتایا گیا کہ شاہ رچڑ اپنے بحری بیڑے ساتھ سینا سے جو متقیہ کے شمال مشرق کا مشہور بندرگاہ ہے، فلسطین روانہ ہو چکا ہے مزید یہ کہ شاہ فلسطین کے ساحل پر اترنے سے پہلے جزیرہ قبرص میں کچھ روز قیام کر فلسطین کی جنگ کے حالات معلوم کرے گا پھر کسی معقول بندرگاہ پر اپنے بحری بیڑے اتارے گا۔

ملکہ ایلینور خود فلسطین نہیں جانا چاہتی تھی اس لئے اس نے متقیہ کے ایک بڑا جہاز پر برتگیا کو سوار کرا کے قبرص روانہ کر دیا اور خود انگلستان واپس چلی گئی۔ شاہ رچڑ انگلستان چھوڑے تقریباً ایک سال ہو رہا تھا مگر اس کے بحری بیڑے کی رفتار اس قدر تھی جیسے وہ صلیبی جنگ پر جانے کے بجائے سمندر کی سیر کو نکلا ہو۔ رچڑ ایک ما تک متقیہ میں مقیم رہا۔ اس نے اپنے بہنوئی حاکم متقیہ نیکرڈ سے بہن پر زیادتیوں کا با اس طرح لیا کہ متقیہ کے خزانہ جہاز ضبط کر کے اسے جہازوں پر بار کرا دیا پھر نہ جانے سو جی کہ ایک دن نیکرڈ کو دربار میں بلا کر بیش قیمت ہیرے جواہرات سے نوازا۔ یہ ا کی طرفہ طبیعت تھی جیسے کنون مزاجی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ گھڑی میں تولہ اور گھڑی ماشہ ہوتا بادشاہوں کا مزاج ہوا ہی کرتا ہے۔ اسی طرح یہ مقولہ بہت مشہور ہوا کہ۔

"بادشاہ کی گاڑی سے یا گھوڑے کی بچھاڑی سے ہر شخص کو بچنا چاہئے۔"

اس لئے کہ ہر دم بادشاہ کے سامنے رہنے والا کسی وقت بھی نقصان اٹھا سکتا کیونکہ بادشاہوں کا مزاج تو ایسا ہوتا ہے اگر خوش ہیں تو انہیں گالی بھی دیدے تو وہ انعام و اکرام سے نواز دیتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ مزاج برہم ہے تو اسے اگر کوئی خوش بات سنائی جائے ہنسانے کی کوشش کی جائے تو بادشاہ فوراً تلوکھا جاتا ہے اور انعام بجائے اسے سولی پر چڑھا دیتا ہے۔

اب رہا "گھوڑے کی بچھاڑی کا مطب" تو گھوڑا بھی ہی مزاج کا ہوتا ہے۔ جب ہے خوش ہے اور اگر ذرا سا اس کا مزاج بگڑا اور آپ کے پیچھے کھڑے ہیں ایسی زمانہ دولتی مارے گا کہ خدا کی پناہ۔

بہر حال شاہ انگلستان کا پچیس بڑے جہازوں اور بے شمار بحیروں کا بحری بیڑہ قبر

اللہ آسمان پر پر تم سے مہربانی سے
پیش آئے گا۔

سلطان نے حاجب کے ذریعہ دریافت کیا کہ یہ خواتین کون ہیں۔ حاجب نے ذہ
سے دریافت کر کے عرض کیا۔

عالی جاہ یہ خواتین وہ ہیں جن کے وارث جنگ طلبین میں مارے گئے ہیں یا م
ہوئے ہیں۔

سلطان نے پھر دریافت کیا کہ ان سے پوچھا جائے کہ یہ کیا چاہتی ہیں۔

حاجب پھر خواتین کے پاس گیا اور ان کے سامنے سلطان کا سوال دہرایا۔ پھر
جواب لے کر سلطان عالی میں عرض کیا۔

”اے سلطان عالی مقام۔ خواتین درخواست کرتی ہیں کہ اگر ان کے وارث لڑائ
مارے جا چکے ہیں تو انہیں ”قلعہ صنور“ میں بھیج دیا جائے اور اگر وہ گرفتار ہیں تو ا
الطاف خسروانہ کے تحت معاف فرمایا جائے اور ان کی رہائی کا فرمان جاری ہو۔“

سلطان نے اسی وقت فرمان جاری کیا۔

”جن خواتین کے وارث لڑائی میں مارے جا چکے ہیں انہیں ان کی خواہش کے م
ان کے عزیزوں کے پاس سرکاری اخراجات سے پہنچایا جائے نیز انہیں کم از کم چھ ما
اخراجات کے لئے نقد رقم ادا کی جائے تاکہ وہ کوئی معقول ٹھکانہ بنا سکیں۔“

ایک دوسرے فرمان میں سلطان نے حکم دیا۔

”وہ تمام حکمران اور سردار جو جنگ طلبین میں گرفتار ہوئے ہیں انہیں فی الفور
دیا جائے اور انہیں ان کی مرضی کے مطابق اس جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ جانا
ہوں۔“

اللہ اللہ یہ مسلمانوں کا سلطان تھا جس نے فاتح ہوئے بے کس اور نادار خواتین
فرمایا ان کے وارثوں کو جن میں شاہ یروٹلم کے علاوہ عیسائیوں کے بڑے سردار اور
شامل تھے بغیر کسی تفریق کے خواتین کی درخواست پر رہا کر دیا۔ اسی طرح یروٹلم ک
مسلم آبادی کو جزیرے سے جانے کی اجازت دیدی۔ اس فاتح بیت المقدس کے مقابلہ
ابن فاتحین بیت المقدس کا کردار ملاحظہ فرمائیے جنہوں 1098ء میں یعنی تقریباً ایک
سال پہلے اسی یروٹلم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تھا۔ ان فاتحین میں سے ایک
جنرل نے روم کے پوپ کو اپنی فتح کے سلسلہ میں بڑے فخر کے ساتھ لکھا تھا۔
”ہم فاتحانہ یروٹلم میں داخل ہوئے تو کافروں (مسلمانوں) کے خون سے یرو

یہ صرف سرخ تھی بلکہ وہ خون کا ایک دریا بہہ رہا تھا اور ہمارے گھوڑے اس خون
نہیں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ اس قتل عام کے متعلق ایک عیسائی کا خط ہے پھر ایک سو سال بعد جب سلطان
الدين ایوبی یروٹلم (بیت المقدس) میں فاتحانہ داخل ہوا تو ہر طرف اس کا یہ اعلان
ہا تھا کہ خبردار اس ارض پاک پر انسانی خون کا ایک قطرہ نہ گرنا چاہئے اگر کسی نے
تکسیر بھی پھوڑی تو اس سے باز پرس ہوگی۔

مرحالہ یہ تو اپنا اپنا طرف ہے۔ عیسائیوں نے اسی بیت المقدس میں مسلمانوں کے
لہ دریا بہا دئے تھے پھر جب مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا تو کسی عیسائی کی تکسیر نہ
آئی۔ اب پھر اسی بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہوا تو اس طرح کہ پوری قوم
ماجر ہو کر ملکوں ملکوں خانماں برباد پھر رہی ہے اور جو فلسطین میں موجود ہیں ان کا
ہے کہ کوئی ایسا دن نہیں جاتا جب کسی فلسطینی جوان یا بچہ کا خون یہودی فوج نے
د۔

اس وقت ذکر ہو رہا تھا باز ظہنی سلطنت روما کا۔ قبرص کا جزیرہ اسی سلطنت کے
اور وہاں کا حکمران ایک باز ظہنی شہزادہ تھا۔ ایک تو شہزادہ دوسرے حاکم قبرص۔
ہیں کریٹا اور ٹیم چڑھا۔ یہی حال قبرص کے حاکم کا تھا۔ وہ زمین پر قدم ہی نہیں
حاکم بد دماغ ہو تو اس کے عمال (افسر) اس سے بھی زبان بد دماغ اور مغرور ہو
ا۔ چنانچہ شاہ انگلستان کا بیڑہ ہواؤں اور لہروں کے تھپڑے کھاتا قبرص کے ساحل
پہنچا تو جزیرے والوں نے اپنے چند جنگی جہاز اور جنگی کشتیاں بھیج کر انگلستان کے
اپنے ساحل پر اترنے سے روک دیا۔

تالی بیڑے ہراول جہاز کا کپتان بھی اتنا ہی سر پھرا تھا جتنا قبرص کے جنگی جہازوں
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں خوب تو تو میں میں ہوئی۔

سے کے کپتان نے اپنے جہاز کے عرشے سے انگلستان کے ہراول جہاز کے کپتان

لموم ہوتا ہے کہ تم نے کپتانی نئی نئی سنبھالی ہے۔ اسی لئے کپتانی کے اصول اور
اواقف ہو؟“

الی کپتان نے بھی سختی سے جواب دیا۔

تو بہت پرانا کپتان ہوں لیکن تم پر یہ ضرور شبہ ہوتا ہے کہ کسی کی سفارش نے
از وقت کپتان بنوا دیا ہے ورنہ تمہیں یہ ضرور معلوم ہوتا کہ شاہوں اور شہنشاہ

ملق رکھتا ہے بلکہ وہ شاہ انگلستان کا ذاتی جہاز ہے مگر اب کرتا تو کیا کرتا۔ سوائے کے اسے کوئی اور بات سوچھی ہی نہیں۔

اور پکتان۔ مجھے معاف کر دو۔ آپ کو پہچاننے میں مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔۔۔“

پتان مڑ گزرتے ہوئے انگریز پکتان کے سامنے جھک گیا۔

انگریز پکتان اڑ گیا۔۔۔ ”میرے معاف کرنے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شہنشاہ خود ملے کریں گے۔۔۔“

ب انگلستان کی سینکڑوں جنگی کشتیاں قبرص کے ساحل کی طرف بڑھ رہی بلکہ یوں کہتا کہ قبرص کے گرد گھرا ڈال رہی تھیں۔ قبرصی پکتان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس سمندر میں کشتیاں اتارنے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ شہنشاہ انگلستان کو سلامی۔۔۔

نی در میں شاہ رچرڈ ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے ساحل پر اترنے کی اتنی سی اس نے ساحل سے چند قدم پہلے ہی کشتی چھوڑ دی اور گھنٹوں گھنٹوں پانی میں مپ کرتا ہوا کنارے کی طرف چلا۔ اس کی کشتی والوں نے اپنے شاہ کو پانی میں خود بھی کشتی چھوڑ کے پانی میں اتر گئے اور اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ شاہی کچھ لشکری پہلے ہی کنارے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے قبرصی ساحلی افسروں کو ڈرا کچھ کو چیز اور کرسیاں منگالی تھیں۔

رچرڈ بھیگا ہوا کنارے پہنچا تو ایک بحری پکتان نے اسے سارا دے کر اوپر چڑھایا اور لاکے بٹھا دیا۔ شاہ رچرڈ سخت غصہ میں تھا اور کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ دیکھتے بحری بیڑے کے تمام لشکری ساحل پر اتر گئے اور انہوں نے پوزیشن منبھال

ر شاہ رچرڈ نے پہلا حکم صادر کیا۔۔۔ ”بندرگاہ کے تمام قبرصی افسروں کو حراست میں آئے۔“

ای زبان سے الفاظ ادا ہوئے تھے۔ اس کے فوجی جوان اور افسر ساحلی دفتر میں اور منٹوں میں آٹھ افسروں کو گرفتار کر کے لے آئے۔

رچرڈ نے دوسرا حکم جاری کیا۔ ”اس قبرصی افسر کو پایہ زنجیر حاضر کیا جائے جس نے پکتان سے گستاخی کی تھی۔“

پتان ساحل پر آچکا تھا اور ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ نکل جائے مگر پھر اس نے ہی اپنا ارادہ بدل دیا اور خود ہی حاضر ہو گیا۔

کے جہازوں کا رنگ کیسا ہوتا ہی اور ان پر کس طرح کا پرچم لہراتا ہے؟“

قبرص پکتان گھیرا گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو دور پر ایک سرخ رنگ کا جہاز تھا۔ جہاز پر لہراتا جھنڈا صاف کہہ رہا تھا کہ یہ جہاز انگلستان کا ہے اور جہاز کا لال رنگ بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ خاص جہاز انگلستان کے حکمران یعنی شاہ رچرڈ کا ہے۔ ا شانتوں کے باوجود قبرص پکتان ضد کھا گیا اور سختی سے بولا۔

”اس سے بحث نہیں کہ یہ بحری بیڑہ کسی ملک کا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ دوسرے ملک سے آنے والے جہازوں کا یہ فرض ہے کہ وہ پہلے اپنی شناخت کرائیں اور ساحل اترنے کی اجازت مانگیں کیونکہ آنے والا تو ممان ہوتا ہے اور ممان کا یہ فرض ہے کہ اپنی شناخت کرائے۔۔۔“

اس وقت تک شاہ رچرڈ اپنے جہاز کے عرشہ پر آگیا تھا۔ اس کا جہاز بڑا تھا اور گہر سمندر میں کھڑا تھا اس لئے وہ دونوں پکتانوں کی گفتگو تو نہیں سن سکا مگر ان کے ہاتھ اشاروں سے یہ اندازہ لگانے میں اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں پکتانوں کا تکرار ہو رہی ہے۔

اتنے سمجھتے ہی شاہ رچرڈ کا دماغ پھر گیا۔ اس نے ایک چھوٹی کشتی سمندر میں اتارنے حکم دیا اور کشتی کے جہاز سے نکلے ہی رسی کے ذریعہ رچرڈ بڑی تیزی سے کشتی میں اتر اور ملاح کو حکم دیا کہ کشتی اس جہاز کی طرف لے چلے جہاں دونوں پکتانوں میں تکرار رہی تھی۔ ملاح نے کشتی کا رخ اسی طرف کر دیا۔

انگلستانی بحری بیڑے کے ملاحوں اور لشکریوں نے شاہ رچرڈ کو مخالف کے جہاز کی طرف جاتے دیکھا تو سینکڑوں کشتیاں شاہ رچرڈ کی تھلید میں سمندر میں اتر گئیں اور انگریز ملاح لشکری۔

”شاہ انگلستان زندہ باد“

شہنشاہ انگلستان زندہ باد“

کے نعرے لگاتے سلطان کشتی کی طرف بڑھے۔ اب تو یوں محسوس ہونے لگے کہ قبرص پر انگلستانی بحری بیڑے نے حملہ کر دیا ہے۔ کئی سو جنگی کشتیاں چینی چلاتی شاہ رچرڈ طرف بڑھ رہی تھیں۔ شاہ رچرڈ کا دل اور بڑھ گیا اور اس نے ملاح کو کشتی کا رخ سام کی طرف پھرنے کا حکم دیا۔ رچرڈ کے پیچھے آنے والی کشتیوں کا رخ بھی اُدھر قبرص کے غصہ میں آئے انگریز پکتان کو برا بھلا تو کہہ دیا تھا لیکن اب بچتا رہا تھا۔ اس نے

سرچرڈ کے جھنڈے سے پہچان لیا تھا کہ وہ سرخ جہاز نہ صرف یہ کہ انگلستان کے بحری بیڑے

”عالی جاہ یہ گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھ انگلستان کے بحری بیڑے کو پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ امید ہے کہ عالی جاہ اس گستاخی درگزر فرمائیں گے۔“

”تم نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ہم نے تمہیں معاف کیا۔“ اتنا کہہ کے شاہ نے دوسری طرف گھما لیا جیسے یہ کوئی غیر اہم بات تھی۔

قبرصی کپتان کو فوراً ”چھوڑ دیا گیا۔

شاہ رچرڈ نے پھر پلٹ کے کہا۔

”جزیرہ کا حکمران اب تک ہماری پیشوائی کو نہیں آیا۔“ رچرڈ نے ایک اور حکم جا کیا۔ ”ایسے غافل حکمران کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔“

انگریز بحری افسروں نے شاہ کے اس حکم کو سنا تو ان کے چروں سے پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔ ایک غیر ملک میں انگلستان سے ہزاروں میل دور کسی حکمران کی گرفتاری کا دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔

قبرص کے گرفتار افسر جو سامنے ہی کھڑے تھے۔ ان کے چہرے بھی متغیر ہو گئے۔ آیا تو یہ ان کی اور ان کے حکمران کی سخت توہین تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہیں خطرہ ہوا کہ کہیں قبرص کا باز ٹینیسی حکمران جو شہنشاہ قیصر کا قریبی عزیز تھا۔ غیرت میں آجنگ نہ شروع کر دے۔

مگر شاہ رچرڈ کا چہرہ بالکل ساٹ تھا۔ اس کے افسر حاکم قبرص کے محل کا پہنچنے پر دریافت کرنے میں لگے تھے۔ اسی وقت ایک قبرصی ملاح نے چیخ کے کہا۔

”شاہ قبرص تشریف لا رہے ہیں۔“

سب کی نظریں ملاح کی طرف انھیں پھر اس کی نظروں کے تعقب میں شاہ قبرص تک پہنچیں۔ شاہ قبرص ایک ادھیڑ عمر کا تومند آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم جلال تھا مگر اس وقت وہ گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند قبرصی افسر تیز قدموں سے چل رہے تھے۔

اس وقت رچرڈ کے سر پر نہ تو تاج تھا اور نہ جسم پر شاہی لباس اس کے باوجود قبرص کے حکمران کے جزیرے میں زبردستی گھس آیا ہے۔ قبرص میں نہ تو اتنی فوج تھی کہ وہ شاہ انگلستان کا مقابلہ کر سکتی اور نہ اس کے پاس کوئی بڑا بحری بیڑا تھا جس کے زور پر وہ شاہ انگلستان کو قبرص کے قبضہ سے روک سکتا۔

قبرص کے حکمران نے بہتر یہی سمجھا کہ جزیرہ کو کشت و خون سے بچانے کے لئے اسے

بند انداز اختیار کرنا چاہئے۔ اس نے شاہ رچرڈ کے سامنے پہنچ کے بڑی استقلال سے

”قبرص کا حکمران، شاہ انگلستان کو اپنے ملک میں خوش آمدید کہتا ہے۔“

شاہ رچرڈ نے اسے سر سے پیر تک گھور کے دیکھا۔

”اچھا تو تم قبرص کے گورنر ہو؟“ رچرڈ کا انداز تحقیر آمیز تھا۔

”جی ہاں شاہ انگلستان۔ میں اس جزیرے کا حکمران ہوں اور باز ٹینیسی شہنشاہ روم نے

شاہ قبرص“ کا خطاب بھی دیا ہے۔“ حاکم قبرص نے اپنا مختصر تعارف کر دیا۔

”تم نے یہ کس طرح پہچانا کہ ہم سلطنت انگلیش کے تاجدار ہیں؟“

شاہ انگلستان کو شاہ انگلیش اور تاجدار انگلیش بھی کہا جاتا تھا۔

قبرص کے حکمران نے قانت سے جواب دیا۔ ”اے شاہ انگلستان، ایک بادشاہ

بادشاہ کو اپنی جس لطیف (چھٹی حس) سے پہچان لیا کرتا ہے۔“

مگر تمہارے بد تمیز کپتان نے ہمیں کیوں نہیں پہچانا اور تمہارے ایک بحری افسر سے

لسانِ قسم کی گفتگو کی؟“

رچرڈ کا محض اندازہ تھا ورنہ اس کی اپنے کپتان سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ

ہوتی۔

قبرص کا حکمران کافی ذہین اور کچھ بڑے سنح قسم کا انسان تھا۔ اس نے مسکرا کے جواب

اے شاہ انگلستان میرا افسر کسی ملک کا بادشاہ نہیں تھا کہ آپ کو شناخت کر سکتا۔ مگر

نکہ قبرص کا بادشاہ ہوں اس لئے میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا۔“

بادشاہ! ”شاہ رچرڈ نے منہ بنایا۔“ اس چھوٹے سے جزیرہ کا حاکم خود کو بادشاہ

کہتا ہے۔“

اے شاہ انگلستان... ”قبرص کا حکمران بڑے استقلال سے بولا۔“ میں واقعی اس

بادشاہ ہوں۔ مطلق انسان بادشاہ، خاندانی طور پر بھی میں ایک شہزادہ ہوں اور مجھے

نفسانیہ کے نتیجے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس بادشاہت پر میرا حق اس لئے بھی ہے

تھا نے مجھے ”شاہ قبرص“ کا خطاب خود عطا فرمایا ہے۔“

رچرڈ کو اس کی یہ بات بھی پسند نہ آئی۔ اس نے کہا۔

اے قبرص کے گورنر۔ یاد رکھو کہ بادشاہ کسی ملک کا ہوتا ہے۔ قبرص جیسے جزیرے

زیرِ حاکم ہی ہو سکتا ہے؟ ”شاہ رچرڈ نے اس کی دوبارہ توہین کی۔ مگر اس کی رگوں

خون دوڑ رہا تھا۔ اس لئے اس نے بے خونی سے جواب دیا۔

میں شاہ رچرڈ قبرص کے شاہی محل میں منتقل ہو گیا۔ قبرص کے حکمران کے اہل خانہ یہ محل زبردستی خالی کرایا گیا تھا۔ شاہ رچرڈ کے حکم کے مطابق قبرص کے حکمران کو اسی پایہ زنجیر رچرڈ کے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں اسے بیٹھنا تھا۔

شاہ رچرڈ نے حکم دیا تھا کہ قبرص کے حاکم کو رات دن ایسی جگہ رکھا جائے جہاں شاہ کی نظر پہنچ سکتی ہو۔ پتہ نہیں شاہ رچرڈ نے ایسا حکم کیوں دیا تھا بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا اس نے یہ اقدام انتہائی احتیاط کے طور پر اٹھایا تھا۔ شاید اسے یہ خطرہ تھا کہ اگر قبرص حکمران کو قید خانہ میں رکھا گیا تو قبرصی اسے قید خانہ توڑ کے نکال لے جائیں گے۔

جزیرہ قبرص کی تقدیر رات تک بالکل بدل چکی تھی۔ قبرصی بہرادر، محافظ، چھوٹے کارکن سب کے سب غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ انگریز لشکری ہر جگہ چلتے پھرتے ٹلٹے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی ملک کی حکومت بدلتی ہے تو بدلی جانے والی حکومت مخالف سینہ تان کر باہر آجاتے ہیں۔ وہ نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور والوں پر لعنت بھیجتے ہیں حالانکہ کل تک یہی لوگ ان جانے والوں کے ٹکڑے چائے اٹے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کو منافق کہا جاتا ہے۔

رات کا کھانا شاہ رچرڈ اپنی بہن جین اور چند بڑے سرداروں کے ساتھ کھا رہا تھا۔ یہ محل کا وہ حصہ تھا جس کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ صبح کے طوفان کی دھند ہو چکی تھی۔ مطلع صاف تھا اور چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بحر روم بات ٹن کر دوں (ستارے) کا حسن دیکھنے والا ہوتا ہے۔

کھانا نہایت خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔ شاید ہر شخص اپنی جگہ پریشان تھا۔ سوائے شاہ کے۔ جسے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ اس کی لالہابی طبیعت اور بگڑی جوانی حوادث سے ٹکراتی ہی رہتی تھی۔ مہم جوئی اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ شاہ رچرڈ نے قبرص حکمران کو پابند سلاسل کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ اس حکمران کا چچا شہنشاہ قسطنطنیہ کی مشرقی یورپ اور وسطی و مغربی ایشیا میں ایک ساکھ تھی۔ اگر شہنشاہ قسطنطنیہ نتیجے اور قبرص کی بازیابی کے لئے میدان میں آجاتا تو رچرڈ کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کا مقصد تو فلسطین پہنچ کے صلیبی جنگ میں حصہ لینا تھا مگر رچرڈ راستہ ہی میں اٹکا

شاہ رچرڈ نے تقریباً ایک سال مقید میں گزارا تھا اور اب وہ قبرص پر اس انداز میں جما رہا تھا جیسے وہ انگلستان کے بجائے قبرص ہی میں رہتا ہے۔ خیر یہ تو اس کے سوچنے والا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جس طرح اس نے ایک سال مقید میں گزارا ہے اسی

”اے انگلستان کے بادشاہ۔ قبرص ایک جزیرہ ہے اس لئے آپ کو یہاں کا پارٹر نہیں آتا لیکن جس ملک کے آپ بادشاہ ہیں وہ ملک بھی تو ایک جزیرہ ہی ہے یعنی برطانیہ جس کے ایک ملک یعنی انگلستان کے آپ بادشاہ ہیں۔“

قبرص کے حکمران کے اس برہتہ اور منہ توڑ جواب سے شاہ انگلستان کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ حاکم قبرص نے صحیح کہا تھا۔ جزائر برطانیہ کے ایک حصہ کا نام انکا دوسرے کا نام اسکٹ لینڈ اور تیسرے کا ویلز وغیرہ ہیں۔ مگر رچرڈ بجائے اس کے کہ شاہ کے اس برہتہ جواب کی داد دیتا، الٹا اس پر تاؤ کھا گیا۔

شاہ نے اپنی کمینہ پرور طبیعت کا مظاہرہ کیا۔ بولا۔۔۔
”قبرص کے بد زبان گورنر کو گرفتار کر لیا جائے۔“

قبرص کا حکمران اس اچانک حکم پر سن پڑ گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”اے انگلستان میں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ آپ کو کورٹش پیش کیا۔ آپ اپنے مرتبہ خیال فرمائیے۔ میری گرفتاری کا حکم کیوں دے رہے ہیں۔ میں مشرقی روم کے قسطنطنیہ کا بستیجا ہوں۔ انہیں میری گرفتاری کی اطلاع ملے گی تو کتنا افسوس ہو گا؟“
شاہ رچرڈ نے قبرص کے حکمران کے اس مدلل اور مفصل جواب کا جواب الجوار طرح پیش کیا۔ اس نے حکم دیا۔

”قبرص کے سابق حاکم کو پایہ زنجیر کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے اور کسی وقت بھی کسی کو کاٹ سکتا ہے۔“
قبرص کے حاکم کو بلاتا خیر زنجیریں پہنا دی گئیں۔ اور اسے جانوروں کی طرح با ایک طرف کھڑا کر دیا گیا اور شاہ رچرڈ نے نئے نئے حکم دینا شروع کرے۔
شاہ رچرڈ نے دوسرا حکم دیا۔

”فوج کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قبرص کے تمام بحری اور بری فوجیوں کو غیر مسلح اور پورے جزیرے میں اعلان کیا جائے کہ قبرص کے گورنر کو معزول کر دیا گیا۔ لئے تا حکم ثانی تمام انتظامی معاملات میں انگلستان کے ناظم سے رجوع کیا جائے جنہیں طور مقرر کیا جا رہا ہے۔“

غرضیکہ شاہ رچرڈ اس جگہ بیٹھا دو ڈھائی گھنٹے تک مختلف قسم کے احکامات صادر رہا۔ اس تمام وقت میں بیچارہ قبرص کا حکمران زنجیر میں اپنے ایک طرف سر جھکائے کہ انگلستان کی بحری فوج نے پورے جزیرے پر قبضہ کر کے ہر جگہ اپنے بہرادر اور محافظ کر دئے تھے۔ قبرص کے حکمران خاندان کے افراد سے تمام محلات خالی کرا لئے گئے۔

ے میں محافظوں کو اپنے آگے سے ہٹاتی ہوئی داخل ہوئی۔
 ”تم میں رچرڈ کون ہے؟“ لڑکی نے چیخ کے کہا۔ جوش و غصہ سے اس کی آواز تھر
 تی تھی۔ تمام حاضرین کی نظریں سمٹ کر شاہ رچرڈ کے چہرے پر جم گئیں۔
 ”تو تم ہو رچرڈ؟“ اور لڑکی آہستہ قدم اٹھاتی رچرڈ کی طرف بڑھی۔ اس کا نصف
 بیاہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔

”میرا باپ کہاں ہے رچرڈ؟“ لڑکی شاہ رچرڈ کی بالکل قریب پہنچ کر چیخ پڑی اور اس
 ماتھ ہی اس نے چہرہ کا نصف نقاب نوچ کر پھینک دیا۔
 پھر تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں سینکڑوں قدیلیں ایک ساتھ بھڑک اٹھیں ہوں۔
 زمین پر اتر آیا ہوں یا آفتاب کچھ زیادہ ہی جھک پڑا ہو...

طرح کچھ دن قبرص میں عیش و عشرت میں گزارے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس دوران صلیبی
 جنگ کا کوئی فیصلہ ہو جائے۔ عیسائی صلیبی جنگ تو اسی وقت ہار گئے تھے جب انہیں (حطین)
 کے میدان میں شکست ہوئی تھی اور ان کے تمام بڑے بڑے فائٹس، ٹیلرز اور ہاپٹلز،
 یہاں تک کر شاہ یروٹلم بھی مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی اس سے بڑھ کر اعلیٰ طرفی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس نے
 عیسائیوں کو شکست فاش دینے کے بعد بیت المقدس پر قبضہ کیا پھر عیسائی خواتین کی آہ
 و زاری پر رحم کھاتے ہوئے اپنے ان تمام دشمنوں کو پھر آزاد کر دیا جو حطین کے میدان میں
 گرفتار ہوئے تھے۔ اگر سلطان صلاح الدین انہیں رحم کھا کر آزاد نہ کرتا تو آج وہ سلطان
 کے مقابلہ پر کیسے کھڑا ہو سکتے تھے۔

رچرڈ کھانے کے بعد کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ سامنے کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور
 ایک نقاب پوش لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے چیخ کر کہا۔
 ”تم میں رچرڈ کون ہے؟“

شاہ یروٹلم گائی گنگنا، سلطان کے مقابلہ پر کیسے آتا، یروٹلم کا لارڈ پادری یورپ
 جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر کیسے اگلتا۔ بعض مسلم موبخین نے دے الفاظ میں لکھا ہے کہ
 اگر سلطان صلاح الدین ایوبی، حطین کے میدان میں گرفتار ہونے والے عیسائی شاہوں،
 حکمرانوں اور پادریوں کو آزاد نہ کرتا تو تیسری صلیبی جنگ نہ ہوتی۔ نہ ڈیوک آف سوابیا
 فلسطین آتا اور نہ شاہ فرانس فلپ اور شاہ انگلستان رچرڈ فلسطین کا رخ کرتے۔

بہر حال سلطان عالی مقام صلاح الدین ایوبی کی ذات اس قسم کے خیالات سے بہت بلند
 ہے۔ وہ عالی حوصلہ اور اعلیٰ ظرف تھا۔ جس قدر بہادر اور شجاع تھا اسی قدر رحمدل اور
 غریب پرور بھی تھا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف تھا اور جس دل میں خوف خدا ہو اس کے
 دل کو دنیا کی کوئی طاقت خوفزدہ نہیں کر سکتی۔

ذکر تھا جزیرہ قبرص کا شاہ رچرڈ اپنے مصاحبین کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔ قبرص کا
 حکمران اسی کمرے کے ایک کونے میں پایہ زنجیر کھڑا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا کہ اچانک
 باہر سے شور غل کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی آدمی آگے پیچھے بھاگ
 رہے ہیں۔ چیخ پکار مچی ہے۔

شاہ رچرڈ کا ہاتھ رک گیا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور چہرہ غصہ سے لال بھوکا
 ہو گیا۔ شاہ رچرڈ کی دونوں مٹھیاں بھینچ گئیں تھیں اور شاید وہ کوئی سخت حکم دینے والا تھا کہ
 کھانے کے کمرے کا دروازہ ایک زور دار جھٹکے سے کھلا اور ایک خاتون یا دو شیزہ یا لڑکی

”قبرص کا بادشاہ!“ رچرڈ نے اس کو نے کی طرف دیکھا جہاں لڑکی کا باپ پابجولاں کو نے اٹھا تھا۔

لڑکی کی نظریں زنجیروں میں جکڑے باپ پڑیں تو وہ دانت پیس کر رچرڈ پر جھپٹی۔ ”ظالم میرے باپ اور اس ملک کے بادشاہ کا یہ حال کیا ہے؟“ وہ تو خیر ہوئی کہ رچرڈ کا حائب درمیان میں آگیا ورنہ شاید لڑکی شاہ رچرڈ کا منہ اپنے نوں سے نوچ ڈالتی۔

”سیدھی کھڑی رہ لڑکی ورنہ ہم کوئی سخت حکم بھی دے سکتے ہیں۔“ رچرڈ نے لڑکی کو رعب کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم انگلستان کے بادشاہ رچرڈ ہو؟“ لڑکی نے تحقیر آمیز لہجے کہا۔

”تیرے یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے لڑکی۔؟“ شاہ رچرڈ نے پہلی بار قبرص کی زادی کو دلچسپی سے دیکھا۔

”اس لئے کہ اگر تم انگلستان کے بادشاہ ہوتے تو قبرص کے بادشاہ کو زنجیریں ہرگز نہ دیتے۔“ لڑکی نے دلیری سے کہا۔

”اے انگلستان کے بادشاہ۔“ لڑکی اور جرات سے بولی۔ ”ممکن ہے کہ ادھر کے ملک میں یہی دستور ہو لیکن ہمارے باز غیبی شہنشاہ یا بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتے ہیں تو مغرب بادشاہ کو یا تو قتل کر دیتے ہیں یا پھر آزاد کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ قیدیوں کا لوگ نہیں کیا جاتا۔“

”مگر ہم تمہارے بادشاہ کو زنجیروں سے آزاد نہیں کر سکتے۔“ رچرڈ نے فیصلہ کن لہجے ل کہا۔

”مگر میرے باپ کو پاپہ زنجیر کیوں کیا گیا۔ انہوں نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا تھا۔۔۔“ لڑکی نے جرح کا انداز اختیار کیا۔ ”ایک تو تم نے ایک آزاد ملک پر بغیر الٹی میٹم کے حملہ لیا۔ خزانہ لوٹا آبادیاں تاراج کیں پھر ایک بے قصور بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔۔۔“

”لڑکی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رچرڈ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے اور ہم حکم دینے کے بعد واپس نہیں لیا کرتے۔“ شاہ رچرڈ نے اسے صاف جواب دیا۔

مگر شہزادی قبرص اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔ اس نے کمال جرات کا مظاہرہ۔۔۔ بولی۔ ”شاہ رچرڈ نے اچھا کیا کہ مجھے یہ بتایا کہ وہ حکم دے کر واپس نہیں لیا کرتے۔ اس سے ظاہر ہو

یروشلم کا مقدمہ

”تم میں سے رچرڈ کون ہے؟“ نقاب پوش دو شیرہ نے چیخ کے کہا۔ اس کی آواز جوش غضب سے تھرا رہی تھی۔

حاضرین کی نظریں سمٹ کر شاہ رچرڈ کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ نقاب پوش دو شیرہ نظریں بھی دوسروں کی نظروں کا تعقب کرتی ہوئی رچرڈ تک پہنچ چکی تھیں۔

”تو۔۔۔ تم ہو رچرڈ؟“ نقاب پوش لڑکی آہستہ قدم اٹھاتی رچرڈ کے سامنے پہنچ گئی۔

کا نصف چہرہ اب تک نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

”میرا باپ کہاں ہے رچرڈ؟“ لڑکی شیرنی کی طرح گرجی اور ساتھ ہی چہرے کا نقاد نوچ کر دور پھینکا۔

پھر تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں ایک ساتھ سینکڑوں قدیلیں بھڑک اٹھی ہوں چاند اچانک زمیں پر آگیا ہوا پھر بقول شاعر۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

شاہ رچرڈ کا چہرہ جو غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کی رنگت پھلکی پڑ گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں۔ لڑکی بے نقاب کیا ہوئی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے سب پر سحر کر دیا ہو اور سب مہسوت ہو کر رہ گئے ہوں۔

لڑکی تھی کہ رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھور رہی تھی۔ باقی لوگ بخود تھے۔

”کیا نام تیرا ہے لڑکی؟“ رچرڈ نے سنبھل کر پر رعب لہجے میں کہا۔

”میں لڑکی نہیں شہزادی ہوں۔“ لڑکی بھڑکی۔ ”میرا چچا شہنشاہ قسطنطنیہ اور باپ قبر

کا بادشاہ ہے۔“

”اگر شاہ رچڑ کو واقعی مجھ مظلوم کی بات کا اتنا ہی پاس ہے تو وہ میرے باپ کے
نوں میں چاندی کے کڑے ڈالنے کے احکامات واپس لے لیں۔“ شہزادی نے اپنے حسن
برپور تیر چلایا۔

شاہ رچڑ اس تیر کی پہلے ہی چوٹ کھا چکا تھا اب تو وہ بالکل ہسل ہو کے رہ گیا۔ ہم
قبرص کو چاندی کے کڑے پہنانے کا حکم واپس لیتے ہیں لیکن شاہ قبرص کے پاس کوئی
نشان ضرور ہونا چاہئے جسے دیکھ کر ہمارے لشکر یہ اندازہ کر سکیں کہ شاہ قبرص کو
دی کی ایک جزاؤ زنجیر گلے میں پہنائی جاسکتی ہے جس میں ایک چھوٹی صلیب مقدس
ہاں ہو۔“

شاہ رچڑ، شہزادی کو اب ہر صورت خوش رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے شہزادی
ن کی خواہش کو اپنے اعلان میں شامل کر دیا۔ شاہ نے نیا فرمان جاری کیا۔

”فرمان جاری کیا جاتا ہے کہ شاہ قبرص کے متعلق اس سے پہلے جتنے احکامات جاری
ہے وہ سب منسوخ تصور کئے جائیں۔ شاہ قبرص کی عزت، حرمت، تخت و تاج اور اقتدار
فرمان کے ذریعہ بحال کیا جاتا ہے کہیں شاہ قبرص اپنے نام، احکام اور اقتدار کو اس
عمل میں لائیں گے جب انگلستان کا لشکر قبرص کو چھوڑ کر فلسطین روانہ ہو گا۔ اسی
شاہ قبرص کے تمام محلات اور دفاتر بھی واکزار کئے جاتے ہیں۔ ان محلات اور دفاتر پر
ن کی فوجوں کا صرف عارضی قبضہ رہے گا۔“

شاہ انگلستان کا فرمان بڑا دلفریب نہیں بلکہ پر فریب تھا۔ فرمان کے خوبصورت الفاظ
بچھے کوئی خوش آئند بات نہ تھی۔ غیر ملکی فوجوں کے قبرص چھوڑنے کی کوئی تاریخ مقرر
کی گئی تھی۔ شہزادی قبرص کو رچڑ اپنی حفاظت میں کیوں لے رہا تھا اس کی بھی کوئی
ت نہ کی گئی تھی۔

مگر اب کون بول سکتا تھا۔ شہزادی اپنی بے پناہ جرات کے زور پر جس میں اس کے
کا زنجیر بھی شامل تھا صرف اس قابل ہوئی تھی کہ اپنے باپ کو باعزت بری کرا سکی
لیکن شاہ قبرص کے بری ہونے سے وہ خود شاہ رچڑ کی قید میں چلی گئی تھی کیونکہ
اس کو اس کے اپنے محل سے رچڑ کے برابر والے محل میں رہنے کا حکم ہوا تھا اور
اس کے لئے وہی لوازمات مہیا کئے گئے تھے جو ایک ملکہ کے شاہان شان ہوتے ہیں اور
اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شاہ رچڑ بہت جلد شہزادی قبرص سے شادی
کے لئے تمام اندازے اس وقت بالکل غلط ثابت ہوئے جب مقلد سے اس کے پاس

گیا کہ شاہ رچڑ کسی قانون کے پابند نہیں ہیں ورنہ بادشاہ تو صرف وہ ہوتا ہے جو حکم دیتے
قادر ہو اور اپنے دئے ہوئے حکم کو منسوخ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہو۔“

اس ترکی بہ ترکی جواب نے شاہ رچڑ کو بد حواس کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ
شہزادی قبرص سے بحث کر کے اس نے غلطی کی۔ شہزادی جس قدر خوبصورت تھی اس سے
کیس زیادہ عقلمند بھی تھی۔

شاہ رچڑ کچھ دیر سوچنے کے بعد مضطرب آواز میں بولا۔

”ہم شاہ قبرص کو آزاد کرتے ہیں لیکن اس کے دونوں ہاتھوں میں الگ الگ چاندی
کے دو کڑے پہنائے جائیں اور یہ کڑے ہیرے جواہرات سے مرصع ہونا چاہئیں۔ شہزادی
قبرص جس نے اب تک ہمیں اپنا نام بتانے سے گریز کیا ہے وہ آج سے ہماری حفاظت میں
رہے گی۔“

اب قبرص کی شہزادی نے زبان کھولی۔

”اے عالی مقام شاہ انگلستان“ شہزادی بڑے ادب سے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں
شاہ رچڑ سے گستاخی کی مرتکب ہوئی ہوں۔ سب سے پہلے میں اس کے لئے معذرت خواہ
ہوں۔ میں نے شاہ سے ایک گستاخی اور کی۔ یہ گستاخی میں نے شاہ کے حکم کے باوجود اپنا
نام بتانے سے گریز کر کے کی تھی۔ جب میں شاہ کے حضور میں آئی تھی تو جذبات سے
مغلوب تھی اور مجھے اپنے باپ کی سلامتی کے علاوہ اور کوئی بات سمجھائی نہ دیتی۔“

”شہزادی...“ شاہ رچڑ جو شہزادی کے سحر انگیز حسن میں پوری طرح گرفتار ہو چکا تھا
اس نے شہزادی کو ٹوکا۔ ”تمہیں مزید معذرت کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تمہیں اور
تمہارے باپ کو معاف کر دیا ہے۔“

”اے بادشاہ انگلستان“ شہزادی نے شوخ نظروں سے شاہ کو دیکھا۔ ”آپ بادشاہ ہیں
اور بقول آپ کے آپ نے قبرص پر قبضہ کیا ہے مگر ایک طرف آپ شاہ قبرص کو طوق و
سلاسل میں جکڑنے کا حکم دیتے ہیں مگر فوراً“ شاہ قبرص کی معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ
معافی شاہ قبرص کی قید و بند کی پابندیوں سے کچھ کم ہے۔ اگر میرا باپ شاہ قبرص غلامی کا
چاندی کے کڑے پن کے محل سے باہر نکلے گا تو کیا لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں گے۔ اس
پر قیدی کا آوازہ تو نہ کیس گے۔؟“

شاہ رچڑ، شہزادی کو دیکھتے ہی اسے دل دے بیٹھا تھا اور اب اس کی ناراضگی مول
لینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس لئے انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ ”تم اپنے باپ کے سلسلہ میں
کیا رعایت چاہتی ہو۔؟“

ضرور پابندی لگے گی کیونکہ برتگیا کو آخر ملکہ انگلستان ہونا تھا۔
 رحال شہزادی برتگیا آف نوارے قبرص آ رہی تھی اور اس کی آمد کو کوئی نہیں
 لگا تھا۔ شاہ رچرڈ چاہتا تو وہ برتگیا کو قبرص آنے سے روک سکتا تھا۔ اس کے لئے
 خاص ہمانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ شاہ رچرڈ اپنی ماں ایلینور کو اطلاع بھیج سکتا
 تھا۔ حال شہزادی برتگیا کو اس کے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں یا وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا
 کہ شادی کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس کے اتنا کہنے سے شہزادی ادھر آنے
 ہی نہ کرتی۔ وہ شاہ رچرڈ کی ٹکون مزاجی سے واقف تھی۔

شاہ رچرڈ نے برتگیا کو روکنے کی قطعی کوشش نہ کی بلکہ وہ اس خبر سے مسرور ہوا۔ بلا
 میں کی شہزادی سوسن حسن و جمال میں شہزادی برتگیا سے کہیں آگے تھی مگر رچرڈ کی
 برتگیا ہونے والی ملکہ انگلستان تھی اور سوسن کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہ
 تھی۔ اس لئے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شہزادی برتگیا اور شہزادی قبرص یعنی سوسن کو
 اپنے مقام پر رکھے گا اور کوشش کرے گا کہ برتگیا کو شہزادی سوسن کے بارے میں
 نہ ہو سکے۔

ماں تک شہزادی سوسن کا تعلق تھا وہ شاہ رچرڈ کے مزاج سے بڑی حد تک واقف ہو
 گی۔ اس کے کانوں تک بھی برتگیا کی آمد کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس سلسلہ میں اس
 اکیڑوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سوسن کے ارد گرد جو
 خدمت پر مامور تھیں وہ سب کی سب انگریز عورتیں تھیں۔ ایک تو وہ قبرص یا
 ان نہ جانتی تھیں دوسرے جو سوسن کی باتیں سمجھ بھی نہ سکتی تھیں وہ جان بوجھ کے
 ان جاتی تھیں اور جب سوسن ان سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کرتی وہ
 میں شائین کر کے بات کو ٹال جاتیں۔

ایک دن شاہ رچرڈ نے شہزادی قبرص کو بلا کر اچانک انکشاف کیا۔

شہزادی سوسن ہماری مگنیر شہزادی برتگیا آف نوارے قبرص آ رہی ہیں۔ ہم اس
 میں ہی میں شادی کریں گے اور ہمیں ہنی مومن متائیں گے۔۔۔

شہزادی کے پیروں کے نیچے زمین نکل گئی۔ اس کے تمام پنے اک جھٹکے ساتھ ٹوٹ
 گئے۔ اس نے شاہ رچرڈ سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ شاہ رچرڈ اس
 تیس سالہ جوان تھا اور اسے خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ اس نے جوانی کی بیشتر
 کو بے دردی سے برباد کیا تھا لیکن انگلستان کی شاہی نے اس کا چہرہ پر رعب بنا دیا
 جوانی میں اس طرح کے زیادہ دل آویز ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً عورتیں انہیں بہت

اطلاع پہنچی کہ شہزادی برتگیا آف نوارے بہت جلد اس کے پاس قبرص پہنچ رہی۔
 نوارے شاہی اسپین کی مسیحی ریاست تھی۔ اس زمانہ سے خلافت اندلس خود اپنے اعمال
 وجہ سے ختم ہو چکی تھی اور اندلس (اسپین) میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ نوارے
 سلطان اور اراگون کی مسیحی ریاستیں بہت طاقتور ہو چکی تھیں۔

شاہ رچرڈ کی ماں ملکہ ایلینور شاہ فرانس کی مطلقہ بیوی تھی جس نے طلاق کے
 رچرڈ کے باپ سے شادی کی تھی جو بعد میں انگلستان کا بادشاہ بنا تھا اور اسی وقت
 ایلینور کے بطن سے بادشاہ انگلستان کے رچرڈ اور جین وغیرہ اولادیں ہوئی تھیں۔

فرانس سے اس تعلق کی بنا پر رچرڈ کی عمر کا بیشتر حصہ فرانس میں آوارہ گردی کرتا
 تھا (اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی) اور اسی دوران رچرڈ اور شہزادی برتگیا
 نوارے کا عشق چلا تھا۔ رچرڈ نے شہزادی برتگیا آف نوارے سے وعدہ کیا تھا کہ
 قسمت نے یادری کی اور وہ انگلستان بادشاہ ہو گیا تو اس کی ملکہ برتگیا آف نوارے ہو
 رچرڈ کی ماں ملکہ ایلینور نے کوشش کی تھی کہ شہزادی برتگیا آف نوارے اور رچرڈ
 شادی اس کی فلسطین روانگی سے پہلے ہو جائے کیونکہ شاہ رچرڈ نے ماں کو خود اس کا
 دیا تھا۔

لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ شہزادی برتگیا انگلستان نہ پہنچ سکی اور شاہ
 اپنے بحری بیڑے اور لشکر کے ساتھ تیسری صلیبی جنگ میں حصہ لینے کے انگلستان
 روانہ ہو گیا۔ شہزادی برتگیا خود شاہ سے شادی کر کے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ
 شرکت کا ثواب کماتا چاہتی تھی لیکن شاہ رچرڈ کے فیصلہ میں تقریباً ایک سال قیام
 باوجود شہزادی برتگیا اس تک نہ پہنچ سکی۔

اس طرح شاہ رچرڈ مقبلیہ سے فلسطین روانہ ہوا مگر طوفانی ہواؤں نے اسے فلسطین
 پہنچانے کے بجائے قبرص پہنچا دیا۔ شاہ رچرڈ کے لئے قبرص پہنچنا بلی کے بھاگوں جھینکا ٹو
 مثال بن گیا۔ اس نے قبرص کو تاراج کیا۔ بازنطینی شاہ قبرص کو نفرتی ذخیرہ پسنائی
 شہزادی قبرص کو اپنی داشتہ بنا لیا تاکہ ارین مقدس اور ممکن ہو تو بیت المقدس میں یہ
 بکار آید کے مصداق رہے۔

ابھی یہ ڈرامہ شروع ہی ہوا تھا کہ شہزادی برتگیا کے قبرص آنے کی اطلاع نے
 رچرڈ اور اس سرداروں اور عمائدین کو ششدر کر دیا۔ رچرڈ کے سرداروں کا بھی یہی
 تھا کہ جس طرح رچرڈ نے مقبلیہ میں ایک سال تک عیاشیوں کا بازار گرم کر رکھا تھا
 طرح وہ قبرص میں بھی سال چھ مہینے ضرور داد عیش دے گا لیکن برتگیا کی آمد سے

پسند کرتی ہیں۔

ممکن ہے کہ شہزادی سون کو رچڑ سے محبت ہو گئی ہو۔ اسے عشق بھی ہو سکتا لیکن اس نے شہزادی سون کو جس غالبانہ انداز میں شہزادی برنگیریا آف نوارے کے ار کی اطلاع دی اس سے شہزادی سون کا دل ٹوٹ گیا۔

شاہ رچڑ کچھ دیر سون کی جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن سون بولتی کیا اس کے کوئی جواب ہی نہ تھا شاہ رچڑ اپنے فیصلوں میں آزاد تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ رچڑ کے دل و دماغ پر قابو پاسکے مگر اب تو یہ خیال بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

”تم نے ہمیں جواب نہیں دیا سون؟“ شاہ رچڑ کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔
سون نے ڈیڑھاتی آنکھوں سے رچڑ کو دیکھا۔ ”شاہ نے مجھ سے کوئی سوال تو نہیں تھا جس کا میں جواب دوں۔ آپ کو مجھ تک ایک خبر پہنچنا تھی وہ پہنچ گئی۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ شاہ رچڑ نے نہ جانے کیا سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اطلاع ضروری تھی۔ ممکن ہے کہ اس سے تمہیں تکلیف پہنچی ہو لیکن تمہیں کسی قسم کی فکر ہونا چاہئے۔“

”بالکل نہیں شاہ محترم۔“ سون نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اطلاع تو میرے لئے مسرت ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ شاہ رچڑ نے اسے گھور کے دیکھا اور تیوریوں پر بل پر گئے تھے۔ سون نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کو سچاتے ہوئے کہا۔ ”شاہ کی شادی ہو رہی۔ کیا یہ میرے لئے نوید مسرت نہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ کے اور کون قریب ہو گا اور مجھ سے زیادہ خوشی اور کسی کا کیسے ہو سکتی ہے؟“

”ٹھیک ٹھیک ہے۔“ شاہ خوش ہو گیا۔ ”ہمیں تم سے یہی امید تھی سون۔ تمہارا مقام یہی رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بات تمہارے حق میں ہو گا کہ تم برنگیریا سے دور دور رہو۔ اسے تمہارے بارے میں کوئی اطلاع نہ ہو سکے گی۔ بھی کوشش کرنا کہ اس کی زنجیروں میں نہ آؤ۔“

میں آپ کے حکم کی ہمیشہ پابند رہوں گا۔“ سون نے افسردگی سے کہا۔ پھر ذرا دک کے اچانک بولی۔ ”کیا مجھے قبرص میں قیام کرنا ہو گا؟“

”ہرگز نہیں سون۔ تم ہمارے جسم کا ایک حصہ بن چکی ہو۔“ شاہ نے بڑے جوش سے کہا۔ ”تمہیں برنگیریا کے برابر اختیارات حاصل ہوں گے نوائے اس کے کہ تم دنیا کے نظروں میں ملکہ انگلستان نہ بن سکو گی

”شاہ بے فکر رہیں۔“ سون نے یوں کہا جیسے اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔
میں اپنی اوقات پر ہمیشہ نظر رکھوں گی۔“

”پھر تم یوں سمجھو کہ رچڑ کی نظروں میں تم سے زیادہ کسی اور کا مقام نہیں ہو گا۔“ شاہ رچڑ نے زور دے کر کہا۔ ”شہزادی برنگیریا انگلستان کی ملکہ ہو گی اور شہزادی سون شاہ انگلستان کے دل کی ملکہ بن کر رہے گی۔“

شہزادی سون کو حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ شاہ نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ شہزادی قبرص ہماری حفاظت میں رہے گی اس کا ف مطلب تھا کہ اسے یہ غمال بنا کے رکھا جائے گا اور اس کی حیثیت ایک شاہی داشتہ سے زیادہ کبھی نہ بڑھ سکے گی۔

شہزادی برنگیریا آف نوارے کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ انگلستان کے بحری اور فوجی رادروں کے علاوہ قبرص کا پورا عملہ ساحل پر موجود تھا۔ شاہ رچڑ خود بھی بڑی شان و کت کے ساتھ شہزادی کے استقبال کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک اعلان کے ذریعہ ہر اس و عام کو تاکید کی تھی شہزادی سون کے بارے میں شہزادی برنگیریا آف نوارے کو کچھ معلوم ہونا چاہئے اگر کسی نے غلطی سے بھی سون کے بارے میں شہزادی برنگیریا کے لئے کسی قسم کا بھی ذکر کیا تو قابل گردن زدنی ٹھہرے گا۔ اس لیلیگوں نے سون اور شاہ رچڑ کے تعلقات کو اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔

ساحل سمندر کو خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح سڑک کے دونوں اطراف بھی رانچی محرابیں اور دروازے بنائے گئے تھے۔ شہزادی برنگیریا آف نوارے کو پورے اعزاز کے ساتھ ساحل پر اتارا گیا۔ اس کے ساتھ ایک سو سے زیادہ آدمیوں کا شاہی عملہ تھا اس نے کہ وہ ”نوارے“ کی شہزادی تھی اور اسپین کے خوبصورت جہاز میں سفر کر کے قبرص آئی تھی۔ اس کے جہاز کے ساتھ اسپین کے چار جنگی جہاز بھی حفاظت کے لئے آئے تھے۔ شہزادی برنگیریا آف نوارے کو ساحل کے استقبال کے بعد سیدھا اس محل میں پہنچا دیا جا جو شاہ رچڑ کی طرف سے اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس استقبال اور چل پھل کے قریب و جوار کے تمام لوگ موجود تھے یہاں تک کہ شاہ قبرص کو بھی شہزادی برنگیریا کے استقبال کرنے کا حکم ہوا تھا مگر شہزادی سون کو ان ہنگاموں سے بہت دور رکھا گیا تھا۔ شاہ نے حکم سے اسے سات پردوں میں چھپا دیا گیا تھا۔ شہزادی سون سے کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کا باپ بھی اس سے ملاقات نہ کر سکتا تھا۔

شہزادی برنگیریا کے قبرص آنے سے شہزادی سون اپنی سیلیوں میں بھی خود کو تنہا

محسوس کرتی تھی۔ شاہ رچرڈ نے شہزادی سوسن کو انگلستان کی کینزوں کے علاوہ چھ قبرص کینزیں اور اتنی ہی سیلیاں ساتھ رکنے کی اجازت تھی لیکن شہزادی سوسن کی سیلیاں اور کینزیں، شہزادی ہی طرح اس کے محل میں قید ہو گئی تھیں۔ ان کے محل پر سخت پہرہ تھا اور پرندہ تک پر نہ مار سکتا تھا۔

شہزادی برنگیریا کو قبرص آئے دس دن ہو چکے تھے۔ ان دنوں میں شاہ کے حضور صرف ایک بار طلبی ہوئی تھی۔ وہ نصف شب گزرنے کے بعد جبکہ وہ اپنے محل میں سو خواب تھی کہ اس کی کینز اسے نیند سے بیدار کر دیا۔

شہزادی سوسن بڑا بڑا کے اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں ملتی ہوئی بولی۔ ”خیریت تو ہے۔ مجھے اس وقت کیوں جگایا ہے؟“

”آپ کو شاہ انگلستان نے یاد فرمایا ہے شہزادی۔“ کینز نے وضاحت کی۔ ”ایک شاہی غلام اور دو کینزیں مہمان خانہ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

شاہ رچرڈ کا حکم۔ سوسن کو تعیل کرنی پڑی۔ جلدی جلدی تیار ہوئی اور شاہی غلام اور کینزوں کے ساتھ شاہ کے پاس پہنچ گئی۔ واضح رہے کہ شہزادی سوسن نے اپنے محل سے رچرڈ کے محل تک کا فاصلہ ایک بند گاڑی میں طے کیا تھا جس کی کم از کم دس جگہ چینگ ہوئی لیکن شہزادی سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوئی۔ کوہان کے ساتھ شاہی غلام بیٹھا تھا وہ گاڑی روکنے والوں کو اپنی باتوں یا نشانوں سے مطمئن کر دیتا تھا اور گاڑی آگے بڑھ جاتی تھی۔

شاہی خوابگاہ کے باہر صرف ایک سنگین بردار محافظ پہرے پر تھا۔ شہزادی دونوں کینزوں کے جلو میں خوابگاہ میں داخل ہوئی شاہ کے پاس دو مسلح کینزوں کے اور کوئی نہ تھا۔ شاہ رچرڈ مسہری کی ٹیک لگائے خیالوں میں گم تھا۔ سوسن کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسلح کینزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

خواب گاہ کی فضا مختلف خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ روشنی کم تھی صرف ایک چوٹا سا قدیل روشن تھی۔ ماحول پر اسرار نہیں بلکہ ہیمنان انگیز تھا۔ سوسن نے مسہری کے قریب پہنچ کر شاہ کو بجرا پیش کیا۔ شاہ نے اسے پانچ بیٹھنے کا اشارہ کیا

”تم سوچتی ہو گی کہ شاید ہم نے تمہیں بھلا دیا۔؟“ شاہ کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔

”ہم تمہیں کبھی نہیں بھلائیں گے سوسن۔“

شاہ نے خود ہی سوال کیا پھر خود ہی اس کا جواب بھی دیدیا۔ شہزادی سوسن کی بھرپور جوانی تھی۔ نیند سے بھری آنکھوں میں سرخ دوڑے عجب ہمار دکھا رہے تھے مگر شہزادی کا

دل رو رہا تھا۔ رخساروں کی دہکتی ہوئی آگ میں پیلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بھی یہ سوچ رہی تھی کہ مرد کی شخصیت کس قدر بے مروت اور بے وفا ہوتی ہے۔ شہزادی کو اپنے حسن عالمتاب کا صحیح اندازہ تھا۔ وہ اپنے حسن کے جلال سے درختوں کو تو خاکستر کر سکتی تھی لیکن شاہ انگلستان کے پتھر دل پر ایک نقش بھی نہ بنا سکی تھی۔

”تم نے ہمیں جواب نہیں دیا سوسن؟“ شاہ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

”شاہ نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی اس کا جواب دیدیا۔“ شہزادی سوسن جل کے بولی۔ ”پھر میں کیا بولوں جبکہ میرے کسی جواب سے آپ مطمئن نہیں ہو سکتے۔“

”مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تم ہمارے حضور گوئی بھری بنی بیٹھی رہو؟“ شاہ رچرڈ کا مزاج اک دم چڑھا ہو گیا۔ ”ہم آج کل کچھ فکر مند ہیں اور تم ہماری فکر میں اضافہ کرنا چاہتی ہو۔“

”اس دن میں مرجانا پسند کروں گی جس دن میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی بدگمانی پیدا ہو“ سوسن نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میں تو آپ پر اپنا سب کچھ نچھاور کر چکی ہوں۔ میرے لئے تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی سوسن کی آنکھیں برکھارت بن گئیں۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ شاہ رچرڈ نے اسے ڈرانے دھمکانے کے لئے بلایا تھا کیونکہ وہ آئندہ اتوار کو برنگیریا سے شادی کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ سوسن کی طرف سے اس موقع پر کوئی رد عمل نہ ہونا چاہئے لیکن سوسن کی پر خلوص گفتگو اور محبت بھری باتوں سے اسے برا متاثر کیا۔

”سوسن یقین کرو ہم تمہاری محبت کی قدر کرتے ہیں۔“ رچرڈ نے بھی محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ اچھے برے وقت میں تم ہی ہماری رفیق ہو گئی لیکن تمہیں ہماری مجبوریوں کا بھی خیال کرنا چاہئے۔ ہم برنگیریا کو ملکہ انگلستان بنانے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس وقت ہم نے تمہیں اسی لئے بلایا تھا کہ تمہیں یہ بتائیں کہ اتوار کو قبرص کے بڑے گرجا گھر میں ہم برنگیریا سے شادی کریں گے۔ ہم تمہیں پہلے سے اس لئے مطلع کر رہے ہیں تاکہ تم حالات سے سمجھوتہ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔“

”یہ میرا وعدہ رہا سوسن۔“ شاہ نے سوسن کو قہقہے سے کہہ کر اس کے زخموں پر پھایا رکھ دیا۔

وہ شب سوسن نے شاہ رچرڈ کے عشرت کدے میں گزار دی اور صبح کو جب وہاں سے رخصت ہوئی تو بہت خوش تھی۔ نہ معلوم شاہ رچرڈ نے اسے کون سے سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ خوشی سے پھولے نہ مار رہی تھی اور اس کے قدم ہلکے رہے تھے۔

مشہور ہے کہ جس طرح شکاری عورتیں ہوتی ہیں جو مرد کو لمحوں میں اپنا غلام بنا لیجیں ہیں اسی طرح شکاری مرد بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے مضبوط سے مضبوط عورت بھی پھسل کر موم ہو جاتی ہے۔

آئندہ اتوار کو سون کی تمام کینیز اس کے ارد گرد رہیں۔ ہر کینیز باری باری سون کے پاس آتی اور اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن سون کا چہرہ دن بھر بالکل ساٹ رہا۔ اسے معلوم تھا کہ آج شاہ رچرڈ اور شہزادی برتگییرا آف نوارے کی شادی ہو رہی ہے وہ اپنے تصور میں دونوں کو نکاح نامہ پر دستخط کرتے بھی دیکھ چکی تھی مگر اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کا تاثر ظاہر نہیں کیا یا پھر وہ کینیزوں کے سامنے سسکیاں بھر کے اپنی توہین نہ کرانا چاہتی تھی۔

دوسرے دن صبح کو شہزادی سون کی آنکھ کچھ جلدی کھل گئی۔ وہ یوں بھی تمام رات جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ کل دن بھر شاہ رچرڈ اور شہزادی برتگییرا آف نوارے کی شادی کے ہنگامے رہے۔ رات بھر شراب و شباب کے جام لٹکھائے گئے تھے۔ یہ تمام لہو لعب اگرچہ شہزادی سون کی آنکھوں کے سامنے نہ ہوا تھا اور اس نے کانوں نے شادی کے شادیانے سنے تھے مگر حساس شہزادی نے یہ پورے نظارے اپنی تصور کی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

صبح آنکھ کھلی تو اس نے اپنی قبرصی کینز کو اپنی پانچ با ادب کھڑے دیکھا۔ شہزادی نے اپنے آپ کو محل میں قید کر رکھا تھا۔ اسے قبرصی کینیز اور سیلیاں ساتھ رکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی لیکن اس کا دل دنیا سے ایسا اچاٹ ہو گیا تھا کہ قبرصی کینزوں اور سیلیوں سے بہت کم گفتگو کرتی۔ کوئی بات کرتی تو الفاظ تول تول کے نکالتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دشمنوں میں گھری ہو۔ اپنی سیلیاں اور کینیز بھی اسے غیر ہی نظر آتی تھیں۔

”کلیٹیا۔ کیا بات ہے۔ تم یہاں کب سے کھڑی ہو؟“ شہزادی سون نے قبرصی کینز کلیٹیا سے سوال کیا۔ صرف یہی ایک کینز تھی جس سے کسی وقت سون گفتگو کرتی تھی مگر سنبھل سنبھل کے اور ڈرتے ڈرتے۔

کلیٹیا نے جواب بعد میں دیا اور دو موٹے موٹے آنسو پہلے ہی اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ شہزادی سون اٹھ کی بیٹھ گئی اور کلیٹیا کو اشارے سے بلا کے پاس بٹھالیا۔

”رو کیوں رہی ہو کلیٹیا۔ مجھے بتاؤ۔ کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟“ شہزادی نے بڑے پیار سے مگر ادھر ادھر دیکھ کے احتیاط سے کہا۔

کلیٹیا نے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔ ”شہزادی عالیہ۔ آپ نے بھی کمال کا دل پایا ہے۔“

پچھلی دو راتوں سے ایک منٹ بھی نہیں سو پائی اور آپ تمام رات اطمینان سے سوئی۔۔۔؟“

شہزادی سون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تیرے خیال میں میں رات بھر سوئی رہی ہوں۔ میں ہی جانتی ہوں کہ ان دنوں میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ خیر تو اپنی بتا۔ اتنے بے کیوں آگئی۔“

”شہزادی عالیہ۔ کینیز تو چوبیس گھنٹوں کی ملازم ہوتی ہیں۔“

بہت کسن تھی لیکن شہزادی کے دکھ درد میں خود کو شریک سمجھتی تھی۔ ”میں آپ کی ہوں۔ جب آپ بے چین ہوں تو میں کیسے آرام پا سکتی ہوں۔“

”باقی کینیز کہاں ہیں؟“ شہزادی نے گھبرا کے پوچھا۔

”رات بھر جشن میں مدہوش رہیں اور اب اپنے اپنے کمروں میں دوستوں کے ساتھ ٹپ پڑی ہیں۔۔۔“ کلیٹیا نے منہ بنا کے کہا۔

شہزادی سون نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔ ان کے دوست اس محل کے اندر آئے ہوئے ہیں؟“

”وہ تو روز ہی آتے ہیں شہزادی عالیہ۔۔۔“ کلیٹیا نے بتایا ”آپ اپنے غموں میں منہ لیٹیے رہتی ہیں اور دن رات محل چھڑے اڑاتی ہیں۔۔۔“

”تو یہ بات ہے۔۔۔“ شہزادی سون کو غصہ آیا۔ ”میں ان سب کو نکال باہر کروں۔“

”اس سے کچھ نہ بنے گا شہزادی عالیہ۔۔۔“ کلیٹیا نامح میران بن کے بولی۔

پ اپنے آپ کو سنبھالنے۔ ہر چیز خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ معاف کیجئے شہزادی اگر کی جگہ میں ہوتی تو شاہ رچرڈ کو اتنی آسانی سے برتگییرا سے شادی نہ کرنے دیتی۔“

شہزادی کھیانی ہنسی ہنس دی۔ ”تجھے شاہوں کے مزاج کا علم نہیں۔ گھڑی میں تولہ اور ہا میں ماش۔ ان کی مخالفت کرنا دیوار میں ٹکرا مارنے کے برابر ہے۔ میں نے اسی لئے اختیار کر لی ہے۔“

”ہائے شہزادی۔ محل کا جشن دیکھ کے سینے پر سانپ لونٹے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ کی لیا دھرا ہے۔ خزانہ ہمارا خالی ہو رہا ہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ گرجا گھر ٹاہی محل تک تمام راستے جواہرات کی بارش ہوئی ہے دولہا دلہن پر حد ہوتی ہے خرچی کی۔“

کلیٹیا بڑبڑا رہی تھی اور سون دل ہی دل میں اس کی ناسمجھی پر افسوس کر رہی تھی۔

ہے اگرچہ اس میں رچڑ کی سراسر طرفداری ہے پھر بھی ہم اس کی تفصیل پیش کر رہے ہیں۔ سفرنامہ کا بیان ہے کہ۔

ان مصروفیتوں سے فراغت پاکر شاہ رچڑ ارض مقدس کے لئے روانہ ہوا۔ اپنا رخت زباندھنے کے بعد اس نے لنگر اٹھا دئے۔ ہوا موافق تھی ہمیں اطلاع ملی کہ عکہ عنقریب بیار ڈال دے گا یہ سن کر شاہ رچڑ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خدا سے دعا کی اس نے پہلے شہر پر مسلمانوں کا قبضہ نہ ہو۔ اس نے کہا اتنے طویل محاصرے کے بعد بے اللہ ہماری فتح بڑی شاندار ہوگی۔

رچڑ فاماگشا کے بندرگاہ سے اپنے بہترین اور سب سے بڑے جہاز پر سوار ہوا۔ وہ کاجلد باز تھا۔ اس وقت تاخیر ہو جانے کی وجہ سے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے اس نے اپنے جہاز کو سب سے آگے رکھا اور دوسرے جہاز اس کے عقب میں نہ ہوئے۔ انہیں سب سے پہلے کوکب کا قلعہ نظر آیا۔ پھر طرطوس، طرابلس، اشام، باقردن اور جبلہ کے اونچے اونچے مینار نظر آئے۔

آخر میں صیدون کے اس طرف بیدوت کے قریب انہیں صلاح الدین کے منتخب ہوں کا ایک جہاز نظر آیا۔ وہ عکہ کے محصورین کی مدد کو جا رہا تھا لیکن لہرائیوں کے پاپڑوں کی وجہ سے براہ راست نہیں جاسکتا تھا اس لئے وسط سمندر میں لنگر انداز تھا۔ بندرگاہ میں داخل ہونے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔

شاہ رچڑ نے جہاز کو دیکھ لیا اور اپنے ملاح پیر کو حکم دیا کہ تیزی سے جاکر معلوم کرے کہ وہ کس کا جہاز ہے۔ اطلاع ملی کہ جہاز شاہ فرانس کا ہے لیکن جب شاہ انگلستان پہنچا تو نہ اس نے کوئی فرانسیسی لفظ سنا اور نہ لہرائی جھنڈا دیکھا۔ جب اور قریب گیا تو کی ساخت اور مضبوطی پر حیرت ہوئی۔ اس پر تین اونچے مستول لگے تھے اور اس کے درمستول بازو سبز اور زرد کھال سے منڈھے ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ اس جہاز کو لہرائیوں نے بڑی جدوجہد کے بعد ڈبو دیا۔ اپنے اس کارنامہ کو کے سفرنامہ میں تقریباً "دس صفحات پر پھیلا گیا ہے جبکہ بھاء الدین نے آنے والے جہاز اور اس کے ساتھ ۶۵۰ سپاہیوں کا سامان رسد، اسلحہ جنگ وغیرہ کے ضائع ہونے مدق کی ہے لیکن بھاء الدین کا بیان ہے جب جہاز کے کپتان نے دیکھا کہ وہ اب پکڑا جائے گا تو اس نے یہ سوچتے ہوئے اسے خود ہی غرق کر دیا کہ دشمن کو سامان کے کچھ بھی ہاتھ نہ آئے۔

فرنامہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ ہوا موافق تھی اس لئے شاہ رچڑ دوسری رات صور

کھٹیا کچھ ہی دنوں پہلے محل میں داخل ہوئی تھی۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات ریل پہل اس نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ یہاں اس نے جواہرات کو کوزیوں کی طرح دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ کے رہ گئیں۔ اسے ہر بات فضول خرچ معلوم ہوتی۔ "کیا کیا دیکھا کل جشن میں تو نے؟" شہزادی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خاک پڑے جشن پر۔ میں جشن دیکھنے تھوڑی گی۔" گلیشیا جل کے بولے۔ میں وجہ سے گئی تھی کہ شاید آپ کوئی بات پوچھ بیٹھیں تو میں کیا جواب دوں گی۔"

"پھر بھی کچھ تھوڑا بہت حال تو بتا؟" شہزادی نے فرمائش کی۔ گلیشیا نے شہزادی سون کے زور دینے پر جشن شادی کا مختصر حال بتایا مگر شہزادی کو اندازہ ہو گیا کہ شاہ رچڑ نے دل بھر کے شاہ خرچی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان افراد کا قبرس کے خزانہ ہی پر تو اثر پڑا ہو گا۔ مگر رچڑ کا ادبائش دل ان باتوں کی پروا کب تھا۔

پورا ایک ماہ محفل (ہنی مون) گزارنے کے بعد شاہ رچڑ کی سواری بادشاہی قہر سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی لیکن رفتار اس قدر ست تھی جیسے محفل سیرو تفریح لئے نکلا ہو۔ متقلد کو مسخر کرنا، قبرص کی فتح اور برٹیکیرا سے شادی رچانے میں شاہ رچڑ کافی دیر لگی۔

شاہ فرانس فلپ کی رفتار بھی ست تھی لیکن وہ شاہ انگلستان رچڑ سے پہلے عکہ گیا جو تیسری صلیبی جنگ کا مرکز تھا۔ لہرائیوں کے لئے وہ تائید غیبی بن کے آیا تھا۔ ف نے آتے ہی اپنی بیٹیئیں نصب کرا دیں۔ بھاء الدین لکھتا ہے کہ!

لہرائیوں نے لکڑی کے برجوں، بیٹیئوں، قلعہ شکن گرزوں اور دوسرے آلات سے حملہ کیا۔ وہ دن میں قلعہ کی دیوار ڈھانے، رات میں خندقیں کھودنے، کھائیاں پانے اور میزبیاں لگانے میں مشغول رہے۔ انھوں نے دیوار کی طرح مٹی کا ایک پشتہ بنایا۔ میں گول مینار بنائے اور چوبی تختوں اور پتھروں سے اسے بندرتیج اونچا کرتے گئے۔ پشتہ انھوں نے اپنے کپ کے پاس سے شروع کیا تھا۔ پیچھے سے مٹی کھود کر آگے ڈال تھے۔

اس طرح وہ پشتہ بناتے بناتے اسے فیصل کے پاس تک لے آئے۔ اس پر چھوٹا اثر ہوتا تھا نہ آگ کا، شاہ فلپ بڑی تیزی سے محاصرہ سخت کر رہا تھا اور حملہ کرنے پہلے شاہ رچڑ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

شاہ رچڑ کے عکہ کو روانگی کا حال اس کے سفرنامہ میں بہت تفصیل سے بیان کیا

پر سکر انداز ہو گیا اور علی الصبح اس نے بادبان چڑھا دیے۔ وہ آگے بڑھا تو اسے اسکندر نے نظر پڑا پھر کچھ دور مکہ کا بلند برج دکھائی دیا اور رفتہ رفتہ شہر کے دوسرے علاقے نظر آنے لگے۔ اس وقت عیسائی قوم کے بے شمار لوگ مکہ کے چاروں طرف احاطہ باندھے پڑے ہوئے تھے۔

پہاڑیوں، وادیوں اور میدانوں میں ترکوں کی بے شمار فوج پڑی تھی۔ جگہ جگہ ان کے رنگ برنگے خیمے نصب تھے۔ خود صلاح الدین ساحل سمندر اور بندرگاہ کی تمکبانی کر رہا تھا اور وقتاً فوقتاً عیسائیوں پر زبردست حملے کرتا رہتا تھا۔ شاہ رچرڈ بھی دشمن کی افواج کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب وہ بندرگاہ پر پہنچا تو شاہ فرانس قلب نے تمام سرداروں کے ساتھ اس کا پر جوش استقبال کیا۔ وہ سب بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے تھے شبہ ۸ جون ۱۱۹۱ء کو رچرڈ مکہ پہنچا۔ اس کی آمد پر عیسائی پھولے نہ ساتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور قرنا اور بوتل پھونکتے اور نعرے لگاتے اسے ساحل سمندر پر لائے۔ ہر عیسائی خوشی سے مست تھا کیونکہ ان کا محبوب (شاہ رچرڈ) آپہنچا تھا۔

صلاح الدین نے تین دن پہلے العیاقبہ کی پہاڑی پر دوبارہ مورچے بنائے تھے۔ وہاں سے وہ دشمن کے مورچوں پر روزانہ حملے کرتا رہتا تھا۔ سلطان کی فوج پر سخت دباؤ پڑ رہا تھا پھر بھی سلطان کے لشکری نصرانی مردہ گھوڑوں اور سپاہیوں کی لاشوں سے کھائیاں پاٹ دیتے تھے جو نصرانیوں ہی کو روزانہ صاف کرنا پڑتیں۔ حملہ آوروں کو پسپا کرنے اور ان کے سامان حرب کو برباد کرنے فرامض ہیں اس کام کا اور اضافہ ہو گیا۔ سلطان دراصل یہ چاہتا تھا کہ نصرانیوں کو اس طرف الجھائے رکھا جائے تاکہ محصورین مکہ پر ان کا دباؤ کچھ کم ہو جائے۔ ادھر مکہ کے قریب قلعہ شکن آلات تیار کئے اور ان کے ذریعہ شہر پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے جوابی حملہ کر کے فرنگیوں کے آلات یا تو جلا دیے یا پھر ان پر قبضہ کر لیا۔ فرنگی یہ صورت حال دیکھ کر پیچھے ہٹے اور انہوں نے مٹی کے ٹیلے قائم کئے اور ان آلات کے ذریعہ ٹیلوں کی آڑ سے مکہ پر حملہ کیا۔ اس تدبیر سے انہیں کچھ کامیابی ہوئی اور محصورین مکہ کی حالت نازک ہو گئی۔

پھر جب مسلمان مکہ کے محاصرے سے تنگ آ گئے تو مکہ کا سب سے بڑا سپہ سالار امیر سیف الدین علی بن احمد اہکاری المشغوب نیزے پر سفید جھنڈا باندھ کر قلعہ سے نکلا۔ سفید جھنڈا امن کا نشان ہوتا ہے اس لئے امیر المشغوب کو عزت سے شاہ فرانس قلب کے سامنے پیش کیا گیا۔

امیر المشغوب نے شاہ فرانس سے درخواست کی۔ ”اگر اہل مکہ کو امن کی ضمانت دلا

مکہ شاہ فرانس کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

نور شاہ فرانس نے صاف انکار کر دیا۔ ”حاکم قلعہ کی درخواست نامنتظر کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں آپکا ہے۔ اب صلح ہماری شرطوں پر ہو گی۔“

المشغوب بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ مکہ کے شہریوں کے حوصلے اور پست ہو گئے۔ محاصرہ کو تقریباً دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور قلعہ کے اندر مسلمان لشکر کی چار ہزار تھی جو گھٹتے گھٹتے تین ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اس سفارت کا الٹا در مسلمانوں کے تین حلیف سردار ارسل لاسری، ابن عزالدین جادلی اور سقار ج لے کر بھاگ گئے۔ اس سے اہل مکہ کو اور پریشانی ہوئی۔

ان دراصل ابن خلدون کا ہے لیکن اسے درست نہیں کہا جاسکتا کیونکہ مکہ کو نصرانی لشکروں کو گھیر رکھا تھا۔ سلطان صلاح الدین اور امیر سیف الدین رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ پیامبر کوتروں کے ذریعہ بھی خط و کتابت ختم ہو چکی تھی۔ نوطہ خور نصرانی لشکر کی آنکھیں بچا کر سمندر میں تیرتا ہوا سلطان تک پہنچ سکتا درت میں تین امیروں کا مکہ سے اپنے فوجیوں کے ساتھ نکل جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ ”کوئی سہو موجود ہے۔“

مکہ کے مسلمان ان برے حالات میں بھی مقابلہ پر ڈٹے رہے تو فرنگیوں نے خود ہی اس سفارت بھیجی۔ جس نے سلطان سے درخواست کی کہ شہر فرنگیوں کے حوالہ تو اہل شہر کے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔

نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ ”ہم مکہ فرنگیوں کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوں گے۔ شہر والوں کو پناہ دیں۔ ہم اس بات پر بھی تیار ہیں کہ فرنگی جس قدر دیں گے ہم اتنی ہی تعداد میں فرنگیوں کے قیدیوں کو آزاد کر دیں گے۔ اس بیوں کی اس صلیب عظیم“ کو بھی فرنگیوں کو واپس کر دی گا جو ہمیں بیت کے حاصل ہوئی تھی۔“

ارت واپس گئی مگر ادھر سے کوئی مزید جواب نہ آیا جس کا مطلب سوائے انکار جاسکتا تھا۔

دن صبح کو نصرانیوں نے مکہ پر شدید حملہ کیا۔ محصورین کی مدافعت کی طاقت اس لئے امیر سیف الدین المشغوب کے حکم پر سفید جھنڈے بلند کر دیے۔ رک گیا اور مندرجہ ذیل شرائط پر دو سال سے مقابلہ کرنے والا مکہ نصرانیوں کو دیا گیا۔ شرائط صلح اس طرح تھیں۔

نمبر ۱۔ حاکم شہر امیر المشغوب فرنگیوں کو دو لاکھ دینار تاوان دے گا۔

نمبر ۲۔ پانچ سو نصرانی قیدی رہائے جائیں گے

نمبر ۳۔ صلیب عظیم واپس کی جائے گی

نمبر ۴۔ حاکم صور مار کو تیس کو مزید چودہ ہزار دینار الگ ادا کئے جائیں گے

ان شرائط پر صلح ہو گئی۔ مال کی ادائیگی اور قیدیوں کی واپسی کے لئے دو ماہ مقرر ہوئی۔ شہر فرنگیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن شہر پر قبضہ کے بعد فرنگیوں کے ساتھ غداری کی اور انہیں مال کی ادائیگی، قیدیوں کی رہائی اور صلیب کو بدلے میں یرغمال بنا لیا گیا۔

سلطان صلاح الدین نے فوری طور پر ایک لاکھ دینار دینے کی رقم اکٹھا کی اور فرنگیوں کے پاس بھیجا کہ سلطان فوری طور پر ایک لاکھ دینار دینے پر تیار ہے لیکن کی ندایہ جماعت اس بات کی ضمانت دے کہ فرنگی عہد شکنی اور وعدہ خلافی نہیں لیکن فرنگیوں کے دل میں چور تھا وہ مسلمان یرغالیوں کو کسی صورت چھوڑنے سے تھے بلکہ ان سے پچھلے دو سال میں قتل ہونے والے عیسائیوں کا بدلہ لینا چاہتے تھے شاہ فرانس نے مسلم سردار کو جواب دیا۔ ”جب تمہارا سلطان ہمیں ایک لاکھ قیدی اور صلیب بھیجے گا تو ہم جنہیں مناسب سمجھیں گے رہا کر دیں گے۔ باقی لوگ وقت تک قید رکھیں گے جب تک باقی رقم نہیں مل جاتی۔“

اس سے فرنگیوں کی غداری ظاہر ہو گئی۔ وہ ایک لاکھ دینار حاصل کر کے قیدیوں (یرغالی) کو آزاد کر دیتے اور بڑے یرغالیوں کے لئے بھاری فدیہ طلب چنانچہ سلطان نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔

ماہ رجب کے آخر میں فرنگی شہر سے باہر جشن فتح منانے کے لئے نکلے تو مسلمان سواری ہو کر ان پر حملہ کیا۔ جب مسلمان ان کے محاذ تک پہنچے تو انہیں معلوم مسلمان جو فرنگیوں کے پاس قید تھے وہ دونوں صنفوں کے درمیان قتل کر دئے فرنگیوں نے کمزور مسلمانوں کا صفایا کر دیا اور ان کے افسروں اور امرا کو فدیہ مانگنے کے لئے اپنے پاس قید رکھا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے۔

ہیرلڈ لیم انگلستان کے شاہ رچرڈ کے اس قتل عام کو انتہائی پر غور انداز میں ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

رچرڈ نے سلطان کی تجویز رد کرتے ہوئے اس سے غیر مشروط ادائیگی کا مطالبہ طرح دن گزرتے گئے اور سلطان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

سلطان کے ارادے کیا تھے البتہ یہ بات واضح تھی کہ اسے عیسائیوں کی نیت پر شبہ قیدیوں کی پہلی قسط کی واپسی کا خطر تھا۔

بن رچرڈ کے روسیے کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے مکہ میں اکابر امراء کی مجلس متورت طلب کی اور پھر فیصلہ کیا چھپیس سو (2600) لاکھ کو ہانگ کر کھلے میدان میں لے جایا گیا جہاں کھمبوں سے رسیاں پاندھ کر ان پر ادبے گئے تھے۔ یہ مقل تھا۔ مسلمان قیدیوں کی مشکیں بکس کے ان کے سر قلم کر تھے۔ اور باقی ماندہ مسلمانوں کو عشتی دستوں کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے صرف چند امرا کی جاں بخشی کی باقی سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

و غصہ سے پھرے ہوئے مسلمان عشتی رسالے نے عیسائیوں پر پر جوش دھوا دیا بھی خون شہیدیاں خشک بھی نہ ہوا تھا کہ اس میدان میں دوبارہ تلواریں نکرانے فرکار رسالہ پسا ہو گیا اور اس نے سلطان کو اس حادثہ فاجدہ کی خبر دی۔

یہ سلطان کو اس برہیت کی توقع نہ تھی۔ مسلمانوں کے قتل کا اسے بہت صدمہ غیظ و غضب میں اس نے عیسائی اسیران جنگ سے نرمی کا برتاؤ نہیں کیا لیکن اس قتل عام کے جواب میں انتقامی طور پر ان عیسائی اسیروں سے جو اس کے قبضے کی تعرض نہ کیا۔

کے آگے ہیرلڈ لیم بڑی بے شرمی اور دیدہ دلیری سے لکھتا ہے کہ رچرڈ کے اس سے مسلمانوں کے جزبات سخت مشتعل ہو گئے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرار مارو سے رچرڈ من مالی کاروائی کرنے کا مجاز تھا۔ عیسائی محاصرے کے دوران نیت دار سے گزرے تھے۔ انہوں نے بھاری نقصانات اٹھائے تھے۔ وہ اپنے میں بھولے تھے۔ ان کے دلوں کے زخم بڑے تھے۔ وہ مسلمانوں کو گردن زدنی نے لیکن عیسائیوں کے ان تندو تیز جزبات کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس غیر ضروری کشت و خون سے رچرڈ کی ناموس اور عزت ہمیشہ کی لئے۔ سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف علانیہ ن سے بدلہ لیا۔

کا یہ خیال غلط ہے کہ رچرڈ قزاق داد معاہدہ کی رو سے اسیران جنگ کے قتل۔ رچرڈ کا یہ فعل سرا سرا اس بہیمانہ فطرت کا مظہر تھا۔ اس نے سلطان کو اپنی ان دلائل سے انکار کر دیا اور پھر نہ صرف اسیران جنگ کو بلکہ امراء یرغمال کر دیا۔ سزا اور یرغمال کا قتل تو کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا جا

سکتا۔ اس کشت و خون کا کوئی جواز نہ تھا۔ تمام مورخین نے اس کی پر زور مذمت کی۔ اس سلسلے میں لین پول کے الفاظ قابل غور ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

”پشتر اس کے کہ خدا عیسائیوں کو

چھوڑتا عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا۔“

دو سالہ معرکہ مکہ تیسری اور سب سے بڑی صلیبی جنگ کا ایک واقعہ ہے اس کوئی شبہ نہیں کہ محصورین مکہ نے مکہ کو بہ مجبوری اور سلطان صلاح الدین کی مرضی خلاف یہ شکستہ حال قلعہ عیسائیوں کے حوالے کرنا پڑا مگر فیصلوں کے ٹوٹ جانے، ان بڑے بڑے شگاف پڑ جانے اور برجوں کے گر جانے کے باوجود نصرانی اس وقت تک میں قدم نہیں رکھ سکے جب تک مسلمانوں نے خود مکہ کو ان کے سپرد نہ کر دیا۔

صلیب و ہلال کا یہ معرکہ تقریباً ”دو سال رہا۔ یہ طویل مدت خود اس بات کی شہادت ہے کہ فنون جنگ میں مسلمانوں کی قابلیت نصرانیوں سے کچھ کم نہیں تھی۔ مسلمان بہت اور مزادگی کی واد لین پول نے اس دور کے مورخین کے حوالے سے دی ہے۔ میں شبہ نہیں کہ مسلمان عیسائیوں سے کہیں زیادہ دلیری اور بے جگری سے لڑے۔

مسلمان لشکر تعداد میں کم اور بیرونی امداد معاونت سے محروم تھا۔ خلیفہ بغداد، سلجوق اور مراکش کے حکمران سلطان صلاح الدین ایوبی کی بار بار کی کمک کی درخواست پر مدد نہ کر سکے جبکہ صلیبی دنیا کے چیدہ چیدہ بادشاہ اپنے بڑے بڑے لشکر لے کر ساحل فلسطین کی طرف آ رہے تھے۔ سلطان صرف اپنے مقبوضہ علاقے مصر سے امداد کا امیدوار وہ بھی ناکافی۔

اس کے علاوہ اسلامی فوج میں صرف سلطان صلاح الدین کی تیار اور نحیف ذات واحد تھی جو شہنشاہان انگلستان، فرانس اور جرمن کا مقابلہ تنہا کر رہی تھی۔ مکہ سلطان سے امداد کی درخواست کرتے ہیں۔ سلطان بڑے عزم سے دوسرے دن اعلان کرتا ہے مگر نا طاقی اسے بستر سے اٹھنے بھی نہیں دیتی۔ آخر کار اپنے پیچھے نو کو اپنی نیابت میں بھیجتا ہے اور لینے ہی لینے ہدایات دیتا رہتا ہے۔

یہ محاصرہ مکہ کا ابتدائی دور تھا اور تیس ہزار عیسائی لشکر نے مکہ کا سختی سے لیا تھا۔ اہل بیروہ و نمارک اور فریز لینڈ کے بحری بیڑے مکہ کی ناکہ بندی کئے ہوئے سلطان کے لئے مکہ کی حفاظت، اس کو کمک پہنچانا اور اس کے ذخائر مہیا کرنا بہر حال

باہمت اور شجاع تقی الدین نے اہل بیروہ کی صفوں کو چیر کر دو دن تک راستہ کھلا، غلے اور سامان اس سے لدے ہوئے اونٹن قطار اندر قطار مکہ میں داخل ہوتے

سلطان نے قرائش کو قاہرہ سے بلوایا تھا۔ وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ بڑے آرام اور سکون کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا اور کوئی بھی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ صرف یہی بلکہ خود سلطان اور ہباء الدین اندر داخل ہو کر قلعہ کی فیصلوں پر گھوم کرنا کہ بندی کا لینے رہے اور کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ سلطان واپس ہوا اور اپنی فوج کی قیادت سنبھال

مکہ پر متعدد معرکے ہوئے اور پھر جب عیسائی مقتولین کی تعداد زیادہ ہو گئی تو سلطان ادا نشندانہ کام کیا۔ لاشوں کو دریائے مکہ میں ڈبوایا گیا جس کا ہبائو صلیبی پڑاؤ کی تھا۔ یہ تمام لاشیں صلیبی پڑاؤ میں پہنچ گئیں۔ ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے۔

”یہ کراہت انگیز منظر تھا۔ لاشوں کے انبار ہو گئے تو چاروں طرف دماغ سوز عذوبت لی۔ بدلو اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ ہمیں دور تک پیچھے ہٹنا پڑا۔“

شہنشاہ فرانس اور انگلستان نے بڑی بڑی سنگ بار مشینیں اور دبا بے تیار کئے مگر نے ایک ایک چیز کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس کا اعتراف خود لین پول نے بھی کیا۔ دوسرے عیسائی مورخین بھی اس کے معترف ہیں۔ بہر حال دو سال کی مسلسل سنگ سے فصلیں اور برج شکستہ ہو چکے تھے مگر مسلمان اس وقت خود فیصلوں کی طرح سینہ لئے لیکن وہ جانتے تھے کہ اب دشمنوں کی زد میں پوری طرح آچکے ہیں۔ امداد کا پہنچنا ممکن۔ اس لئے انھوں نے باوقار شرائط پر عیسائیوں سے صلح کرنا قرن مصلحت سمجھا یوں نے وعدہ خلائی کرتے ہوئے اہل مکہ کو یہ غمال بتایا اور بعد میں ان پر غالیوں رچڑھنے رچڑھنے شیر دل کہا جاتا ہے۔ اس کے حکم سے ان بے گناہوں کا قتل عام کیا تھا شاہ رچڑھ شیر دل کا کارنامہ۔

انگلستان کے شاہ رچڑھ کا ڈھنڈورچی اور اس کے لئے ”شیر دل“ کے لقب کے تصدیق الابرہ لڈیم لکھتا ہے۔

رچڑھ کے کردار کے اصلی خدوخال متعین کرنا بہت مشکل ہے۔ سطروں کی فسانہ اور صدیوں کی رواہتوں میں سے حقیقت اور افسانے کے اجزا علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ رچڑھ شیر دل کے کردار اور فطرت کا تجزیہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ انہ سے اس کے خدو خال مدہم اور ماند پڑ چکے ہیں البتہ ہمیں اس کی زندگی کے

تلون مزاج اور حریص شاہ جان (رچڑ کا بڑا بھائی) میں باپ کی فطرت جلوہ گر تھی اور مزاج خوبو رچڑ میں اپنی ماں کی خوبیاں تھیں۔ وہ اپنی ماں کا چیتا بیٹا تھا۔
 ہیں اس کی زندگی کی مختلف تصویریں ملتی ہیں پہلے وہ پوشیز (فرانس کا صوبہ) میں سے بدیہ گوئی کے مقابلوں میں شعر کہتا سنائی دیتا ہے پھر وہ اپنے باپ کی لاش پر کھڑا دکھائی دیتا ہے اور اپنے سابقہ دشمنوں، یعنی انگریز فائٹوں کے روبرو نہایت سرد ہے کھڑا ہے۔ وہ نہ تو ان کے ساتھ ملائمت سے پیش آتا ہے اور نہ بادشاہ ہونے کے حسن سلوک کا وعدہ کرتا ہے۔

بادشاہ ہونے کے بعد وہ بے تحاشہ سیلی جنگ میں کود پڑتا ہے جیسے وہ اس مقدس ارجا آوری سے اپنی بیکار زندگی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ وہ برٹگیرا آف نوارے سے راتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن جس شام وہ (برٹگیرا) ایلینور کے نے والی تھی اسی شام وہ جہاز میں سوار ہو کر مینسا (مقلدہ کا ایک بندرگاہ) چلا گیا۔
 نہ جانے وہ کیوں بیوی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اپنی بہن جوانا (جان) - جین) سلی سے نجات دلا کر ساتھ لایا تھا اور خوبصورت ہیرز نطینی شزادی (بیز نطینی حکمران رچڑ کے پاس یرغمال تھی) کی تحویل میں دے کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ غالباً وہ باز ادی سے عشق لڑانے لگتا ہے اور اسے اپنی داشتہ بنا لیتا ہے۔ برٹگیرا اپنی مجروح کو چھپائے ہوئے خاموشی سے اس کے ساتھ رہی ہے۔ اس درخشاں سیلی بادشاہ وجود کے پیچھے ان تینوں عورتوں کے موبہوم سے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عورتیں ان و شوکت سے مکہ کے محل میں مقیم ہیں۔ وہ مختلف تقریبات اور ضیافتوں میں آئیں اور رچڑ انہیں چمکدار ریشم اور نادر جواہرات کے تحائف پیش کرنے میں کرتا ہے۔

اس شیر دل نوجوان رچڑ کا کردار جو ساحل ارض مقدس پر جون ۱۱۹۱ء میں اترتا ایسی ہستی کے مقابلہ کے لئے جس کا کردار اس سے کہیں بلندو اعلیٰ تھا۔ جس کی دے داغ تھی جس نے اپنی قوت بازو اور اپنے ذاتی تدبیر سے حکومت حاصل کی نے اپنے بل بوتے پر اور اپنی ذاتی ہمت اور شجاعت سے ۱۱۸۷ء میں بیت کیا تھا اور وہی اب بھی مسلسل جنگوں سے تھکا ماندہ، ضحنی کی عمر میں یک و تنہا می و مسائل سے بیت المقدس، اپنے قبلہ اول کے تحفظ کا ضامن اور اس کی نرم صمیم لئے ہوئے نبرد آزما تھا۔

ن محصورین مکہ نے قلعہ عیسائیوں کے سپرد کر دیا اگر اسے ملیوں کے زور

متعلق چند تاریخی حقائق حتی طور پر معلوم ہیں۔

ہیرلڈ لیم نے اپنے اس بیان میں رچڑ کے کردار اور فطرت کو سحر انگیز الفاظ کے حیر پردے میں پوشیدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہیرلڈ لیم نے دراصل اپنے عہد میں ایک کامیاب انشا پر داز اور افسانہ طراز کی بھرپور زندگی گزار دی ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں الفاظ کی ایسی بوقلمونی تراشی تھی کہ اس کا قاری ہر لفظ پر نعرہ تحسین بلند کرتا اور ہر جملے پر سر دھتا تھا۔ اپنی اس شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیرلڈ لیم نے افسانہ طرازی کے نوک قلم سے تاریخ کا سینہ پھلتی کرنا شروع کر دیا۔

ہیرلڈ لیم کی اس طرح کی تحریروں کا جب آج تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کھوکھلی ہیں۔ وہ کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ تاریخی حقائق اپنی جگہ لیکن ان سے رچڑ کے کردار اور فطرت کو نہیں جانچا جاسکتا یعنی رچڑ کی فطرت اور کردار کے صرف وہی گوشے درست ہیں جو خود اس کے قلم کے تراشیدہ ہیں۔ جس تراش خراش کے لباس میں اس نے شاہ رچڑ کا پیش کیا ہے وہ تاریخی حقائق کے خواہ کتنا ہی خلاف ہو مگر حقیقت وہی ہے کیونکہ وہ ہیرلڈ لیم کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

شاہ رچڑ کے بارے تاریخی حقائق کا ذکر خود ہیرلڈ لیم کے افسانہ طراز قلم سے سنئے۔

رچڑ کی ماں کا نام ایلینور (ایلینار) آف گاسن تھا۔ رچڑ اس کی آخری عمر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ (ایلینور) فرانس کے اس شاہ لوئیس کی سابقہ ملکہ تھی جو ۱۱۳۹ء کی سیلی جنگ میں عیسائی فوج کا ایک سردار تھا۔ لوئیس اپنی ملکہ کی بہت دھڑی سے فوراً بیزار ہوا کہ اس نے سیلی جنگ کو خیر باد کہا اور واپس آکر اسے طلاق دیدی۔ نامساعد حالات میں بھی خوبصورت ایلینور ثابت قدم رہی اور اس نے چری ڈوک آف آنجوسے شادی کر لی۔ ہنری بہت ظالم، مکار اور تند خو تھا لیکن ایلینور کو وہ بھی نہیں دبا سکا۔ وہ مروانہ لباس پہن کر کھلم کھلا مقابلے سے بھی گریز نہ کرتی۔

بالکل اس نے اپنے شوہر کی خلاف علم بغاوت بلند کر دیا جو اس دوران انگلستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔ ہنری خاصا لائق حکمران ثابت ہوا۔ اس نے پاپائے روم کے روحانی اقتدار کے خلاف بغاوت کی جس میں بطریق اعلم حامس ایکٹ قتل ہو گیا۔ لوگ ہنری سے نفرت کرنے لگے اور اس کے بیٹوں نے بھی باپ کے خلاف سرکشی اختیار کر لی۔ وہ اپنے ناہنجار بیٹوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا کہ موت نے اسے آدیا۔

اس کے بیٹوں نے نہایت ہنگامہ خیز حالات میں ہوش سنبھالا تھا۔ وہ دوبارہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے مسموم ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ وہ بچپن ہی سے بدیوں سے آگاہ

بازو کا نتیجہ کما جائے تو بھی اس میں رچڑ نے کیا کارنامہ انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس اور نوجوان نے فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور کانریڈ اور فلب جیسے قابلیت اور تجربہ رکھنے والے منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ یہ بس درست نے سب سے آخر اور تاخیر سے آنے والے کو میلیوں نے اپنا قائد بنالیا مگر اس نے جنگ میں کیا حصہ لیا۔ رچڑ ۹ جون ۱۹۱۹ء کو مکہ پہنچا اور ۱۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو مسلمانوں نے ایک باوقار مسلمان کے تحت قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ آخر اس میں رچڑ کا کیا حصہ تھا۔ قلعہ مکہ پر سال سے زیادہ عرصہ سے مسلسل یورشیں ہو رہی تھیں آخر قلعہ کی دیواریں اور برجیا مٹی کا ڈھیر بن گئے اور مسلمانوں نے مجبوراً قلعہ حوالے کر دیا تو اسی سے رچڑ شہر کیسے ہو گیا۔ کوئی جنگ کی تھی اس نے وہ تو شدید بخار میں مبتلا تھا۔ ادھر یہ کوششیں بدل کے بستر علالت پر شکستیں ڈال رہا تھا اور فوج نصیروں میں شکاف ڈال چکی تھی۔ تھم ڈالے جا چکے تھے پھر بھی مکہ کی فتح کا سرا اس کے سر باندھ دیا گیا۔

اس غلط اعزاز پر اس نے جشن فتح منایا تو اس طرح دو ہزار چھ سو مسلمان امیرانہ کو جو یرغمال تھے، ان کے خون پر رچڑ نے فتح کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ میلیوں کے تمام لشکریوں کی مجموعی تعداد اگر پانچ لاکھ تسلیم کر لی جائے اگرچہ یہ تعداد دس لاکھ بتائی جاتی ہے تو بھی یہ بات ہر میلی اور مسلمان لشکری جانتا ہے کہ صرف مکہ کے قلعہ پر قبضہ میں نصرانیوں کے لشکر کا نصف اپنی جانیں گنوا بیٹھا تھا یعنی میلیوں نے ڈھائی لاکھ نصرانیوں کی قربانی دے کر ارض قلعہ کا صرف ایک ٹکڑا حاصل کیا تھا اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا شاہ رچڑ یروٹلم (بیت المقدس) پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن اسی دور میلینی کیپوں میں ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

اصل قصہ یہ تھا کہ نصرانیوں کو مکہ فتح ہونے پر یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اب صلاح الدین شکست کھا گیا ہے اور وہ میلیوں کا کہیں پر مقابلہ نہ کر سکے گا اور اگلے حملہ میں یروٹلم پر میلیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ یروٹلم کا آئندہ ہا کون ہو گا۔ یروٹلم پر مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے وہاں کا بادشاہ گائی لو سکناں تھا۔ لو سکناں یروٹلم کا موروثی بادشاہ نہ تھا بلکہ اس کی بیوی شنزادی سبل شاہی خاندان سے اور اس کی شادی گائی لو سکناں سے ہوئی تھی اس لئے بادشاہت گائی کو حاصل ہوئی تھی یہ وہی گائی لو سکناں شاہ یروٹلم ہے جو فلسطین کی جنگ میں سلطانی لشکر کے ہاتہ گرفتار ہوا تھا پھر نصرانی بیگمات نے سلطان صلاح الدین سے ملاقات کی اور اس سے

شاہروں اور رشتہ داروں کی جاں بخشی کرائی تھی۔ اس طرح گائی لو سکناں اور دوسرے شہزادے اور سرداروں کو رہائی ملی تھی اور رہائی ملتے ہی وہ دوبارہ سلطان کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان دنوں گائی لو سکناں کی بیوی شنزادی سبل، مارکوس کو نریڈ کے علاقہ میں پناہ لئے ہوئی تھیں۔ وہیں اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اب سوال یہ اٹھا کہ یروٹلم کی بادشاہت کی اصل وارث شنزادی سبل تھی اور اس کے توسط سے اس کا شوہر گائی شاہ یروٹلم کہلاتا تھا۔ اس لئے سبل کے انتقال کے بعد اصولی طور سے گائی لو سکناں کی بادشاہت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ان حالات میں یروٹلم کا تخت خالی ہو گیا تھا اور اس کے لئے نئے بادشاہ کا انتخاب ہونا ضروری تھا۔

چنانچہ یروٹلم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مجلس مشورت طلب کی گئی۔ یہ مسئلہ نہایت اہم تھا کیونکہ اس سوال پر میلی امرا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ یروٹلم کی سلطنت بہت محترم سمجھی جاتی تھی اس لئے کہ شاہ یروٹلم کو معنوی و دنیاوی تاجدار کی حیثیت ہی نہ حاصل تھی بلکہ وہ سلطنت رہائی کے اختیارات کا بھی حامل تھا۔

مجلس شادرت میں شاہ فرانس فلب آرگنس بھی موجود تھا۔ وہ سیاہ لباس پہنے تھا۔ فلب اگر صرف پچیس چھیس سال کا جوان تھا لیکن اس کے چہرے پر قبل از وقت تفکر کی جھریاں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہاں طویل البدن شاہ رچڑ بھی تھا۔ اس کے بدن پر گلابی قمیض اور سر پر شکاری ٹوپی تھی۔ اس کی لمبی تلواری چاندی کے غلاف میں پٹی سے لٹک رہی تھی۔ وہ بظاہر لا پرواہ بیٹھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ہوشیاری کی چمک موجود تھی۔ وہ اس جگڑے میں اپنی بات منوانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں شنزادی سنبل کے مرنے کے بعد بھی گائی لو سکناں ہی یروٹلم کا بادشاہ تھا۔

اس کے پیچھے خاموش ارل آف یسٹر، ہنری کاؤنٹ آف شپین کھڑے تھے۔ ہنری شاہ فرانس اور شاہ انگلستان دونوں کا بھانجا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک مخلص شخص تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ اسے دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہی سے ملتی تھی۔

انگریز امرا کے ساتھ ٹیملر سردار سفید جھنڈے پہنے بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ لو سکناں خاندان کے بیٹوں بھائی موجود تھے یعنی نام نہاد بادشاہ گائی۔ انگریز افسانہ طراز ہیرلڈ لیم اپنی تحریروں میں شاہ رچڑ کے علاوہ اور کسی کو گھاس ڈالتے دکھائی نہیں دیتا۔ اور دوسرے بادشاہوں اور شہزادوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اسی لئے اس نے گائی لو سکناں بادشاہ یروٹلم کے لئے "نام نہاد" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

نہ کرائے تو سلطان نے یہ درخواست منظور فرمائی اور لشکر کو حکم دیا کہ قلعہ کے اس حصہ پر حملہ نہ کیا جائے جہاں شادی کی رسم کی ادا کی گئی ہوئے والی تھی۔ اس سلسلہ میں دونوں طرف سے شادی کے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ یہ شادی اس طرح کرک کی تاریخ کا ایک باب بن گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ نواب ہمسفرے آف ٹورون اور شہزادی ازاتیل میں کس قدر پیار ہو گا کہ انہوں نے جنگ کے میب یادلوں کے دوران شادی کی رسم ادا کی تھی۔ اس چالاک مارکوئیس کو نرید کی شاطرانہ چالوں کی بھی داو دینا پڑتی ہے جس نے ان دو محبت بھرے دلوں میں کچھ اس طرح فراق کا بیج بویا کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔

مشہور ہے کہ لگائی بجائی اور کئے سننے ہے دیواریں بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ المامیہ کی چالاک لومڑی مارکوئیس کو نرید نے شہزادی ازاتیل تک پہنچنے کا منصوبہ بنایا۔ ازاتیل اور نواب ہمسفرے ٹاروں کی شادی قلعہ کرک میں ہوئی تھی۔ اس قلعہ کو اس کی بلندی کی وجہ سے نجم السحر یا نجم السحر کہا جاتا تھا۔ اسی خیال سے شہزادی ازاتیل خود کو ”نجم السحر“ کہلاتی تھی اور خود کو سب سے بلند سمجھتی تھی۔

لیکن مارکوئیس نے اپنی ایک اطالوی کٹنی کے ذریعہ ایسا جال پھیلایا کہ ازاتیل بھی اس جال میں پھنس کے رہ گئی۔ اسی اطالوی کٹنی، ڈائن یا چالاک عورت کا نام لورینا تھا۔ یہ بڑھیا آسمان میں تکی لگاتی تھی اور محبت بھرے دلوں میں زہر گھول کے انہیں پھاڑ دیتی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ ازاتیل اور نواب ہمسفرے آف ٹورون میں بہت پیار ہے اور یہ شادی بھی پیار ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

ایک دن لورینا سیدھی نواب ہمسفرے کے محل پہنچ گئی۔ مکہ کا قلعہ فتح ہونے کے بعد سیلیوں نے اپنی دریاں اتار دی تھیں اور ہتھیار گھول کے رکھ دئے تھے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ دو سال تک خندقوں اور خیموں میں خون پینہ ایک کرنے کے بعد اب انہیں خیموں کی زندگی سے نجات حاصل ہوئی اور شہر میں مکانات اور قلعہ میں بارکیں بن گئی تھیں۔

مکہ کا ہر گھر عشرت کدہ بنا ہوا تھا۔ شراب کی فراوانی تھی اور ایسے ماحول میں شکاری اور تیس اپنی دکانیں سجاتی ہیں۔ آس پاس کے علاوہ بحر روم کے جزیروں سے خوبصورت اور تیس بڑی کثرت سے مکہ پہنچ گئی تھیں۔ طوائفوں کے علاوہ ان عورتوں میں بیشتر ایسی عیسائی دھرمیائیں اور خوبصورت خواتین تھیں جن کی جوانیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ صلیبی لکڑیوں کی آغوش میں اس طرح سمٹ جاتیں جیسے جنم جنم کی بھوکی پیاسی ہوں یہ دراصل

گائی لو گنناں کے ساتھ اس کا دوسرا بھائی جنگجو جافرے اور جانشیل کے مدد سے پرافتخار امریک۔ وغیرہ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری مخالف پارٹی یعنی فرانسیسیوں کے حامیوں میں اہل بصرہ کے علاوہ وہ امیر بھی تھے جنہوں نے جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ ایک طرف گائے کا پورا اور عقل کا پکا اطالوی شہزادہ کو نرید آف مانٹریٹ پر اسرار طور پر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے فائدے کی ناک میں تھا۔

چالاک شہزادہ کو نرید، شاہ یروٹلم کو ایک سال پہلے بھی رک دے چکا تھا اور اب یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ گائی کو یروٹلم کی متوقع بادشاہت سے ہٹانا چاہتا تھا۔ یہ قصہ یوں ہوا کہ خوش قسمت اطالوی شہزادہ کو نرید جو یروٹلم کی بادشاہت کا سودا اپنی سر میں لے کر صقلیہ سے چلا تھا وہ خوش قسمتی سے ساحل سام پر لشکر انداز ہوتے ہی صور کا حاکم بن گیا تھا۔

پھر جب مکہ پر قبضہ کے گفتگو شروع ہوئی تو شہزادہ کو نرید، حاکم قلعہ مکہ سیف الدین المشطب سے صلح کرانے میں پیش پیش تھا۔ اس طرح مارکوئیس کو نرید ارض فلسطین پر ایک اہم شخصیت بن کر ابھرا تھا اور شاہ یروٹلم کے تخت و تاج کا امیدوار بن کر گائی لو گنناں کے مقابلہ پر آگیا تھا۔

گائی لو گنناں کی پوزیشن یوں کمزور تھی کہ اس کی بیوی شہزادی سبل کا اچانک انتقال ہو گیا تھا اور سبل کی دوسری بہن شہزادی ازاتیل جو سبل کی جگہ یروٹلم کے تخت و تاج کی وارث ہو سکتی تھی اس نے نواب ہمسفرے سے شادی رکھ لی تھی۔ ان حالات میں مارکوئیس کو نرید کو پہلے نواب ہمسفرے کو راستے سے ہٹانا تھا اس کے بعد گائی لو گنناں سے نمٹنا تھا۔

مارکوئیس کو نرید ان دونوں مشکلات کے باوجود یروٹلم کے متوقع تخت و تاج سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھا اور اس نے واقعی ایک صورت پیدا کر دی جس سے اس کے لئے یروٹلم کا تاج حصول آسان نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کسی طرح شہزادی ازاتیل پر قابو حاصل کر لے تو اس کے لئے یروٹلم کا تاج کچھ زیادہ دور نہ رہ جائے گا۔ چنانچہ اس نے شہزادی ازاتیل کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر ازاتیل اور نواب ہمسفرے میں محبت کی شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی قلعہ کرک میں اس وقت ہوئی تھی جب سلطان صلاح الدین کی فوجیں قلعہ کو گھیرے ہوئی تھیں اور قلعہ پر سبک باری ہو رہی تھی مگر جب سلطان سے درخواست کی گئی کہ وہ نواب ہمسفرے اور شہزادی ازاتیل کی شادی میں تعاون کرے اور شادی کے دن قلعہ پر سبک باری اور حملہ

ان کی جنسی بھوک تھی جسے بچانے کے لئے وہ یورپ کے قریبی علاقوں سے مکہ پہنچیں تھیں اور خوب داد عیش دے رہی تھیں اور اپنے اس فعل کو کارِ ثواب کہتی تھیں۔

میلیوں کے یہ روزِ دُشِب تھے، یہ بے حیائیاں، عیش کو شیاں اور رنگینیاں تھیں جس میں فتح مکہ کے بعد صلیبی دُوب گئے۔ مسلمان ایرانِ جنگ جو ان کے پاس یرغمال کے طور تھے انہیں دیواریں کھرجنے اور فرش صاف کرنے کے ذلیل کاموں پر لگا کر ان کا مسخر اڑایا جاتا تھا۔ دراصل مکہ کی فتح نے ملیوں کے دماغ میں فتور پیدا کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف یروشلم واپس لے لیں گے بلکہ ارضِ فلسطین اور شام سے مسلمانوں کو نکال کے یہاں نصرانی حکومتیں قائم کریں گے۔

سلطان صلاح الدین کا مضبوط گڑھ دمشق اور مصر کا علاقہ تھا اور مکہ پر قبضہ کے بعد جب مسلم ایرانِ جنگ کی مارکوئیس کوزیڈ اور شاہ انگلستان اور فرانس نے درمیان تقسیم ہوتی تو اس وقت بھی یہ سوال اٹھا تھا کہ سلطان صلاح الدین ابوبی (حاکم بدین) کو شکست سے دوچار کرنے کے بعد اس کی عظیم سلطنت کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ اخلاقی گراؤٹ کے ساتھ ساتھ ملیسی اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

ایسے ماحول میں اگر مارکوئیس کوزیڈ نے یہ سوچا کہ نواب ہسفرے سے اس کی بیوی ازاتیل کو چھین کے اس سے شادی کی جائے اور پھر اس طرح یروشلم کے تخت و تاج کا دعویٰ کیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ اس لئے طاقت اور چالاکی کی ضرورت ہے اور اس چیز کی مارکوئیس کوزیڈ کے پاس کی نہ تھی۔

پس اطالوی کٹنی لورنیا نے شہزادی ازاتیل کی بلائیں لینے کے بعد ایک سرو آہ بھری اور دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے ٹپکا دئے۔ شہزادی ازاتیل اگرچہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن تھی لیکن لورنیا کے اس طرح غمگین ہو جانے سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے نری سے دریافت کیا۔

”خالہ جی آپ نے شاید اپنا نام لورنیا بتایا اور آپ کا تعلق اطالیہ (اٹلی) سے ہے؟“

”جی شہزادی عالیہ آپ نے درست فرمایا۔“ لورنیا خالہ نے زبردستی اپنے خشک آنسو پونچھے۔ ”میری پیدائش تو دراصل جنتِ ارضی یروشلم کی ہے مگر جب سے اس پر کافروں نے قبضہ کیا ہے۔ رات دن خون کے آنسو بہتی ہوں۔“

”مگر اس وقت آپ کو رونا کیوں آیا۔“ شہزادی ازاتیل نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ

وہ دعویٰ کی ضرورت نہیں۔ جس کام کے لئے آپ تشریف لائی ہیں وہ بیان ہے۔ میں اسے پورا کروں گی؟“

”شہزادی عالیہ۔ میری فکر نہ کیجئے۔“ مکار لورنیا نے کہا۔ ”میں آپ کے پاس کسی ت سے نہیں آئی۔ مجھے اطالوی شہزادے کوزیڈ مانسٹرٹ اپنے ساتھ ہی اطالیہ سے تھے۔ انہی کے پاس رہتی ہوں شہزادے ہمار میرا بڑا خیال کرتے ہیں۔“

مارکوئیس کوزیڈ کینام پر ازاتیل کے کان کھڑے ہوئے۔ ”یہ مارکوئیس کوزیڈ وہی تو جو صور کے حاکم ہیں؟“

”ہاں شہزادی وہی شہزادے کوزیڈ“ لورنیا نے جواب دیا۔ ”وہ صور کے حاکم بھی ہیں بری صلیبی جنگ بھی انہی کے زور پر لڑی گئی اور قلعہ مکہ کے فاتح بھی دراصل ہی شہزادے نے ہی ہیں۔“

”ہوں۔“ مکہ کی شہزادی چند لمحے خاموشی رہی پھر بولی۔ ”اچھا خالہ لورنیا، اب تو کہ آپ مجھے دیکھ کر رونے کیوں لگی تھیں؟“

”شہزادی عالیہ۔ یہ میرے دل کی بات ہے اسے کوئی دل ہی والا سمجھ سکتا ہے۔“ لورنیا ر زیادہ مکاری دکھائی۔ ”میں تمہیں بتاؤں تو شاید تم ناراض ہو جاؤ؟“

”نہیں خالہ مورنیا۔ میں ناراض کیوں ہوں گی۔ آپ اتنی تو اچھی ہیں۔“ ازاتیل نے خالہ مورنیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

دورنیا بھر آئی آواز میں بولی۔ ”شہزادی اگر تم میرے کی انگوٹھی کو گندی نالی میں پڑا اس انگوٹھی کی قسمت پر آنسو نہیں بہاؤ گی؟“

زنتیل، لورنیا کی بات سمجھ نہیں سکی۔ بولی۔ ”خالہ جان میں سمجھ نہیں سکی۔ جو بات وہ کھل کے کہو؟“

”تم منہ کھلوا رہی ہو تو سنو۔ شہزادی ازاتیل اس لئے پیدا نہیں ہوتی ہے کہ وہ ایک میں بیٹھ کے اپنی زندگی گزار دے۔ تم شہزادی نہیں بلکہ ملکہ یروشلم ازاتیل ہو۔ بہن سنیل ملکہ یروشلم تھی۔ اس کے بعد یروشلم کے تخت و تاج پر تمہارا حق رہنا جلدی جلدی بات ختم کھڑی ہو گئی۔“

رینا کی بات نے ازاتیل کے دل میں ایک نئی جوت لگائی تھی۔ اس نے لورنیا کا ہاتھ ٹر لیا۔ ”خالہ لورنیا۔ جب بات تم نے منہ سے نکال دی ہے تو پھر اسے پوری میں میری مدد کرو؟“

اے واہ شہزادی۔“ لورنیا اک دم مسکرا دی۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ جو راستہ بتائے وہ

اقتدار کے اور کوئی دکھائی نہیں دیتا اور جسے اقتدار کی ہوا لگ جائے پھر اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے۔ خالہ لورینا کی بات ازائیل کو کچھ اس طرح لگی تھی کہ وہ گھنٹوں بولائی بولائی کردوں میں گھومتی رہی اور جیسے نواب ہسفرے آف نورون محل میں آیا وہ اس کے سر پر سوار ہو گئی۔

”میری بات غور سے سنو نواب ہسفرے...“ ازائیل نے سخت لہجے میں کہا۔
نواب اس کے تلخ لہجے پر حیران رہ گیا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے ازائیل یہ کس طرح دل رہی ہو تم۔ کیا میں اب تمہاری نظروں میں ”پیارا ہسفرے“ نہیں ہوں؟“
”وہ تو تم ہی ہو مگر بات ذرا سنگین ہے غور سے سنو میری بات؟“ ازائیل کے لہجے کی فنی کم ہو گئی تھی مگر ختم نہ ہوئی تھی۔

نواب ہسفرے آف نورون ایک کنکا اور ناپسندیدہ شخص تھا۔ اس میں نہ وجاہت تھی نہ شجاعت۔ ہر دم دوسرے شہزادوں اور شاہوں کی حضوری میں لگا رہتا تھا۔ اس نے ازائیل کے تئیں بڑے ہوئے دیکھے تو بھیگی ملی بن گیا۔

”ہاں ہاں کو پیاری ازائیل۔“ نواب نے خوشامد شروع کر دی۔ ”میں نے تمہاری ت کب غور سے نہیں سنی۔ تمہارے سوا میرا اور ہے کون اس دنیا میں؟“
”اچھا بس خوشامد بند...“ ازائیل کے لہجے میں اب تک تلخی لگی تھی۔ ”میں جو پہچوں ان کا صحیح صحیح جواب دو...“

”پوچھو نا پیاری ازائیل...؟“ نواب ڈر گیا بلکہ سہم گیا۔ دراصل اس نے ازائیل کو بھلا اور درغلا کر اس وقت شادی کی تھی جب ازائیل کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ یہ بات ت سے لوگوں کو معلوم تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ۔ گائی لو گناں کو بادشاہت کیوں ملی تھی؟“ ازائیل نے سوال کیا۔ نواب ہسفرے نے فوراً جواب دیا۔ ”اس لئے کہ تخت و تاج کی وارث ملکہ سنبل تھی اور گائی گناں اس کا شوہر تھا اس لئے وہ یروٹلم کا بادشاہ کہلاتا تھا...“
”اب مکہ سبل تو مر چکی ہے۔ یروٹلم کے تخت و تاج کا مالک کون ہو گا...؟“
ائیل کے اس سوال پر نواب گھبرا گیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو ازائیل میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟...“ نواب نے عاجزی سے

”میری بات تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو مگر تم بزدل ہو۔ تم میں ہمت اور جرات نہیں ہے؟“ ازائیل بگڑ گئی۔ ”گائی صرف اس وجہ سے یروٹلم کا بادشاہ تھا کہ تخت و تاج کی

آگے چلے۔ میں غریب تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ اپنے شوہر نواب ہسفرے سے کہو کہ تمہیں یروٹلم کے تخت و تاج کا وارث ثابت کریں۔“

”ان سے یہ نہ ہو سکے گا خالہ لورینا...“ شہزادی ازائیل انگلیاں چٹکتا ہوئی بولی۔ ”تو محبت کرنے والے بھولے بھالے نواب ہیں۔ گائی لو گناں کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے۔ پھر مکہ فتح کرنے والے دو دو بادشاہ موجود ہیں۔ یروٹلم فتح کرنے کے بعد وہ میرے شوہر کے بجائے گائی کو تخت و تاج دیں گے...“

لورینا نے جھکے سے ہاتھ چھڑایا اور دو قدم چل کے رکی۔ ”شہزادی برا نہ مانو۔ اگر تمہارے شوہر نواب ہسفرے نورون، گائی لو گناں اور شاہ فرانس اور شاہ انگلستان کے مقابلے پر نہیں کھڑے ہو سکتے تو ان سے کہہ دو کہ وہ تمہارے راستے سے ہٹ جائیں اور ایسے آدمی کو آگے آنے دیں جو بادشاہوں کا بچہ مروڑ کر تمہیں یروٹلم کے تخت و تاج کا مالک بنا سکتا ہے۔“

خالہ لورینا دو قدم آگے بڑھ کے پھر رک گئیں۔
شہزادی ازائیل کو یوں محسوس ہوا جیسے یروٹلم کا تخت و تاج خود بخود اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے پر امید نظروں سے خالہ لورینا کو دیکھا اور مردہ آواز میں بولی۔ ”خالہ لورینا ایسا کون شخص ہو سکتا ہے اور وہ میرے لئے اتنی زبردست قربانی کیوں دینے لگا...؟“

”بھولی شہزادی...“ لورینا نے بڑے استغفال سے کہا۔ ”اتنا بڑا خطرہ وہ تمہارے لئے نہیں بلکہ اپنی محبت کے لئے مول لے گا...“
”کیا...!“ ازائیل ایک یا پھر چوکی۔ ”اپنی محبت کے لئے مول لے گا۔ کیا کہنا چاہتی ہو خالہ؟“

”میں نے ٹھیک کہا شہزادی...“ خالہ لورینا نے بھی مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اسے تم سے محبت ہے اور وہ تمہاری محبت میں حد سے گزر جانا چاہتا ہے۔ میں تمہیں تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ شخص ہے اطالوی شہزادہ کونریڈ آف مانٹریٹ جو شاہ فرانس اور شاہ انگلستان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ تمہارے سر پر مکہ یروٹلم کا تاج دیکھے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب تم اس کی محبت کا جواب محبت سے دو...“

یہ کہتی ہوئی خالہ لورینا وہاں سے رفو چکر ہو گئی مگر شہزادی ازائیل کو ایک عجیب طرح کے غم میں ڈال گئی۔ کتنے ہیں اقتدار کی جھلک جو ایک بار دیکھ لے پھر اسے سوانے

مالک ملکہ سبل تھی۔ ملکہ سبل کے مرنے کے بعد تخت و تاج کی وراثت اور حقدار میں ہوں اور میرا شوہر نواب ہسفرے آف ٹورون یروٹلم کا بادشاہ ہو گا۔“

نواب ہسفرے کا پورا بدن لرز اٹھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے گڑ گڑایا۔ ”چپ ہو جاؤ ازائیل تمہیں خداوند یسوع مسیح کا واسطہ۔ لو سگناں ابھی زندہ ہے اس نے تمہاری بات سن لی تو مجھے اور تمہیں دونوں کو سولی چڑھا دے گا۔ اس کی طاقت کا اندازہ ہے تمہیں۔ تیسری صلیبی جنگ لڑنے والا وہی شخص ہے۔“

”چپ ہو جاؤ بزدل ہسفرے۔“ ازائیل چیخ پڑی۔ ”تم مجھے میرا حق بھی نہیں دلا سکتے۔ لعنت ہے تم پر۔“

ازائیل بڑبڑاتی اندر جانے لگی تو ہسفرے اسے روک کے کہا۔ ”ازائیل۔ تم جو چاہو کہہ سکتی ہو مگر یروٹلم کے تخت و تاج کے نام نہ لینا ورنہ ہمیں جینا دو بھر ہو جائے گا۔“ دوسرے تیسرے دن اطالیہ کی کٹنی خالہ لورینا پھر ازائیل کے محل میں داخل ہو رہی تھی ازائیل، خالہ لورینا کو دیکھتے ہی دوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔ کٹنی نے ازائیل کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

”خالہ لورینا۔“ ازائیل نے روہانسی آواز میں کہا۔ ”نواب ہسفرے تو نرا نواب نکلا بزدل کہیں کا۔ کتا ہے کہ یروٹلم کے تخت و تاج کا نام نہ لینا ورنہ قتل کر دی جاؤ گی۔“ ”اور پھر بھی اسے تمہاری محبت کا دعویٰ ہے؟“ خالہ لورینا نے جھبتا ہوا سوال کیا۔ ”صرف خالی مولیٰ کی محبت۔ مجھے تو اس سے نفرت ہونے لگی ہے۔“ ازائیل ٹمکن ہونے لگی تھی۔

”پھر کروں کسی محبت کرنے والے سے بات؟“ لورینا نے فوراً بات ڈال دی۔ ”ابھی میں آرہی تھی تو شہزادہ کوزیڈ مجھے ملے تھے۔ وہ اب تک تم سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔“ شہزادی اب مجھے واپس جانے دو۔“ لورینا نے پلٹتے ہوئے کہا۔ ”میں یہی جواب لینے آئی تھی۔ شہزادہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“

ازائیل نے اب بھی اسے کوئی جواب نہیں دیا مگر کچھ اس انداز سے لورینا کو دیکھا جس میں ہزاروں امنگیں اور آرزوئیں بری تھیں۔ اس طرح لورینا کی معرفت پہلے ازائیل اور کوزیڈ میں کچھ دن سلام و پیام ہوئے پھر دو ایک طویل ملاقاتیں۔ ازائیل کپے آم کی طرف ٹوٹ کے کوزیڈ کی گود میں آگئی۔

مارکوئیس کوزیڈ صور کا نجات و ہندہ تھا اور تیسری صلیبی جنگ میں اس نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ سب ہی اسی کی عزت کرتے۔ صور والے تو اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔

نے صور کے استقف اعظم (لارڈ پادری) کو بلا کر اشاروں کنایوں میں اپنا مطلب بیان استقف اعظم نے تعاون کا وعدہ کر لیا۔

پھر ایک دن صلیب کے بزرگان دین کی طرف سے ایک فتویٰ جاری ہوا۔ اس پر اعظم صور کے بھی دستخط تھے۔ فتویٰ میں مندرجہ ذیل باتیں درج تھیں۔

”کے وقت ازائیل صرف ۱۳ سال کی نابالغ لڑکی تھی اور کلیسا کے قانون کے مطابق کی شادی جائز نہیں۔“

”علم کا شاہی خاندان شادی سے ناراض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہی خاندان کا کوئی س شادی میں شریک نہیں ہوا۔“

شادی خفیہ طور پر انجام پائی اور اس کی تقریب یروٹلم کے محلات کے بجائے کرک میں منعقد ہوئی تھی۔

واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ازائیل اور نواب ہسفرے کی شادی نہ صرف فائدہ مند تھی۔ (یروٹلم کا شاہی خاندان) کے خلاف ایک سازش بلکہ یہ کلیسا کے قانون کی ن ورزی تھی۔

مارکوئیس نے بزرگان صلیب سے حسب مرضی فتویٰ حاصل کر لیا۔ اس نے پہلے اس شہزادی ازائیل میں کافی طویل صلاح مشورے ہوئے ہوئے تھے اور عہد و پیمان کئے۔ فتویٰ سامنے آتے ہی شہزادی ازائیل نے کلیسا کو طلاق کی درخواست دیدی اور ہسفرے سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئی۔ اس کا اگلا قدم مارکوئیس کوزیڈ سے شادی

مارکوئیس کوزیڈ صور کا بادشاہ اور ملک کا ایک اہم رکن تھا بعض لوگ تو اسے فاتح کہتے تھے۔ بہر حال وہ ایک با اثر شخصیت تھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہادر انسان تھا یہ اور اس کا دماغ تعمیر سے کہیں زیادہ تخریب کی طرف مائل تھا اور یہ سب کچھ اس کی طبیعت کی وجہ سے تھا۔

یڈ کو ازائیل سے قطعی محبت نہ تھی وہ تو ازائیل کے ذریعہ یروٹلم کے تخت و تاج کا ایک آسان راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے جواب میں ازائیل بھی رغبت نہ

اسوائے اس کے کہ وہ کوزیڈ جسے مقبوض انسان کے ذریعہ یروٹلم کا تخت و تاج سے اور پھر شہزادے کوزیڈ کو اپنی طرف سے یروٹلم کے تخت و تاج کا اعزاز

دونوں کا نصب العین اور منزل ایک ہی تھی اس لئے ان کی شادی ہو گئی اور ملک

کے (کیٹھڈرل) میں ازائیل اور کوزیڈ کی شادی کا اعلان بد قسمتی سے اس دن ہوا جس دن یروٹلم کا اسقف اعظم ہرکلیس پطرس اپنے دینی ساتھیوں کے ہمراہ یورپ سے واپس آیا اور ایک اپنی جہاز سے مکہ کے بندرگاہ پر اترا۔

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ یروٹلم کا اسقف پطرس، یروٹلم پر سلطان ملکہ الدین ایوبی کے قبضہ کے وقت گرفتار ہوا تھا اور فدیہ دے کر آزادی حاصل کی تھی پھر پادریوں کے ساتھ یورپ روانہ ہوا تھا اور وہاں پہنچ کر اس نے مسلمانوں کے خلاف ہر ملک میں زہر اگلا تھا اور عیسائیوں کو یروٹلم واپس لینے کے لئے ابھارا تھا۔ اسی پادری پر دہکندہ کی وجہ سے شاہ انگلستان اور شاہ فرانس ارض فلسطین آئے تھے۔

اسقف ہرکلیس پطرس اور مارکوئیس کوزیڈ کی ملاقات اطالیہ میں ہوئی تھی۔ پطرس ایک جوان بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی جو فرانس کے شاہی کلبیا میں پر اسرار طور پر غائب گئی تھی۔ ان دونوں مارکوئیس کوزیڈ بھی جولیا کے تعقب میں فرانس پہنچا تھا۔ اسقف کو یہ تھا کہ جولیا کے اغوا میں کوزیڈ کا بھی ہاتھ ہے۔ اس لئے وہ کوزیڈ کے سخت خلاف تھا۔ اسقف پطرس کو مکہ کے بندرگاہ پر اترتے ہی معلوم ہو گیا کہ شاطر مارکوئیس کوزیڈ نے شہزادی ازائیل سے شادی رچا لی ہے۔ اس نے فوراً ہی ازائیل اور کوزیڈ کی شادی کے خلاف فتویٰ دیدیا جس سے مکہ کے عیسائی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ کے مرد آہن مارکوئیس کوزیڈ نے اسقف پطرس کے فتویٰ کی کوئی پروا نہ کی اور مارکوئیس کوزیڈ کے اشارہ پر صور کے آج بپ نے نئے کیٹھڈرل میں ازائیل اور مارکوئیس کوزیڈ کی شادی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت صور کے نئے کیٹھڈرل میں شادی کے موقع پر فلپ آگسٹس اور جانیڈ کے سردار دوست اور نواب موجود تھے۔

اس تمام جھگڑے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یروٹلم (بیت المقدس) کی پوری ریاست سلطان صلاح الدین ایوبی کے قبضے اور مضبوط ہاتھوں میں تھی مگر عقل کے اندر صلیبی بادشاہ اور لشکری یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مکہ کی طرح یروٹلم پر بھی ان کا قبضہ ہو جا گا اور اسی خیال کے تحت اس وقت یروٹلم کے متوقع بادشاہ کا انتخاب ہو رہا تھا۔

اس اجلاس میں سب ہی موجود تھے۔ یورپ سے آنے والے بادشاہ، شہزادے، ڈیو، ارل، کاؤنٹ، سردار اور سپہ سالار۔ دنیائے صلیب کے بڑے بڑے ہاسٹلز اور اساتذہ البحراریہ کے پر جوش سردار جن کی بات کلبیا والے بے چوں و چرا مانتے تھے۔

آخر مقدمہ شروع ہوا اور ایونز آف فلائڈز نے یروٹلم کی بادشاہت کا مقدمہ کے سامنے دائر کیا۔ وہ بادشاہت جو ان کے تصور میں تھی اور اس وقت اس پر

الدین ایوبی کے مضبوط پنجے جھے ہوئے تھے۔

ن ہوئی تصوراتی مقدمہ کا حال کچھ اس طرح بیان کیا گیا۔

یروٹلم کی مکہ سبل جن کے شوہر گائی لو سگناں ملکہ سبل کے وئے ہوئے اختیارات کی سلطنت یروٹلم پر بادشاہت کر رہے تھے کہ اچانک ملکہ سبل کی موت واقع ہو گئی۔ راج مجلس صلیب نے ملکہ سبل کی دوسری بہن ازائیل کو یروٹلم کے تخت و تاج کا تسلیم کر لیا۔ اس اعلان سے گائی لو سگناں کی بادشاہت کا اختیار بادشاہت بھی ختم ہو گیا۔ گائی لو سگناں یروٹلم کی بادشاہت چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ دوسری طرف یروٹلم کی تاج کی وارث ازائیل نے نواب مسفرے سے طلاق حاصل کر کے اطالوی شہزادے آف مانٹریٹ سے شادی کر لی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جس طرح ان کی بہن سبل نے شوہر گائی لو سگناں کو یروٹلم کی سلطنت اور بادشاہت کا پروانہ عطا کیا تھا اسی طرح شوہر شہزادہ کوزیڈ کو یروٹلم کی بادشاہت کا اعزاز عطا کرتی ہیں اس لئے ان کے کو تسلیم کر لیا جائے۔

مارکوئیس کوزیڈ کو علم تھا کہ یروٹلم کا سابق اسقف ہرکلیس پطرس نے اس کی اور لی شادی کو ناجائز قرار دیا ہے اور وہ اس مجلس میں شریک ہو گا اس لئے اس چالاک نے شاہ فلپ آگسٹس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور شاہ فلپ نے کوزیڈ سے خدان کا وعدہ کیا تھا۔ پس اس وقت شاہ فلپ کے تمام نواب نے آواز بلند کی۔ مکہ ازائیل کا مطالبہ جائز ہے کیونکہ بالذات خاندان کی وہی وارث تخت و تاج ہیں۔ فوراً ہی بعد ایک دوسری آواز اس کے حق میں بلند ہوئی۔

میں بے حد خوشی ہو گی اگر مارکوئیس کوزیڈ آف مانٹریٹ کو یروٹلم کا بادشاہ تسلیم کرے کہ وہ صور کے ہزاروں عیسائی باشندوں کے نجات دہندہ ہیں۔ انہوں نے تیسری ٹنگ کے لئے سلطان کے خلاف سب سے پہلے پرچم بلند کیا تھا۔ شہزادہ کانریڈ صلیبی نے جائز حقدار ہیں۔

یہ تائید شاہ فرانس نے کر دی۔

مارکوئیس کانریڈ کے حق میں بلند ہونے والی آواز کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ شاہ یروٹلم بننا مبارک ہو۔

مارکوئیس کانریڈ اور ازائیل بھی مجلس میں موجود تھے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹیں کو اس وقت چالاک بڑھیا لورینا بہت یاد آئی۔ وہ لورینا کا منہ چومنا چاہتی تھی اسے مارکوئیس کانریڈ سے ملو کے اصل منزل کی طرف جگمزن کیا تھا اور مارکوئیس

کونریڈ کو کتنی آسانی سے یروٹلم کی سلطنت بخشی گئی تھی۔

اسی وقت گائی لو گنٹان کا بھائی جافری تلواری لہراتا ہوا کھڑا ہوا اور اس نے مارکو کونریڈ کو ڈوئل (مبارزت-دوہدر جنگ) کی دعوت دی مگر شاہ فرانس نے اسے سخت ڈانٹ دیا۔

”یہ وقت ڈوئل کا نہیں۔ ابھی یروٹلم کی جنگ باقی ہے۔ جافری کو اس جنگ کے اپنی تلواری کو سنبھال کے رکھنا چاہئے۔“

جافری کو پکڑ کے بٹھا دیا گیا۔

اب حلقہ اسقف (جنگجو ٹیبلرز اور ہاسٹلرز) سے یروٹلم کا بوڑھا اسقف ہرکولیس اپنی درواز آتین لہراتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس نے براہ راست شاہ فرانس کو مخاطب کیا۔

جناب آگسٹس۔ یروٹلم کی دینی اور دنیاوی سلطنت ایسی نہیں جسے لیسروں کے حوالہ کر دیا جائے۔“

”محترم اسقف...“ شاہ فرانس غصے سے کھڑا ہو گیا۔ ”اسقف نے گفتگو کا انداز دیا۔“ میں نے مکہ کے ساحل پر قدم رکھتے ہی کانریڈ اور اراہیل کی شادی کو ناجائز نامبارک قرار دیا تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے صور کے نئے کیتھڈرل سے اس شاد اعلان اپنے سامنے کرایا۔ اس طرح آپ نے یروٹلم کے اسقف ہرکولیس پطرس ہی بلکہ پاپائے روم کی بھی نافرمانی کی ہے کیونکہ میں اس صلیبی جنگ کا محرک ہوں اور میں پورے یورپ کا سفر پایائے روم کے نمائندہ کی حیثیت سے کیا ہے؟“

شاہ فرانس گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔

”اے یروٹلم کے اسقف محترم۔ آپ نے یہ تو نہیں فرمایا۔ کہ آخر اراہیل مارکوئیس کونریڈ کی شادی کیوں نامبارک اور ناجائز ہے؟“

اسقف پر کونیس پطرس نے کراہی آواز میں اعلان کیا۔

”اس لئے کہ کونریڈ نے دو شادیاں پہلے کی ہیں اور یہ اس کی تیسری شادی ہے اس کی ایک بیوی اب تک اطالیہ میں دوسری بیوی قسطنطنیہ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کونریڈ تو ایک بیوی کی موجودگی ہی میں دوسری بیوی نہیں کر سکتا اور اس نے دھاندلی کی حد کر دی۔ اس نے تو دو کی موجودگی میں تیسری شادی رچا ڈالی۔“

حاضرین سنائے میں آگئے۔ مارکوئیس کانریڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ اراہیل کی نظروں یروٹلم کا تخت و تاج دور ہوتا محسوس ہوا۔

صلیبیوں کے حوصلے

نصرانیوں کی مجلس مشاورت میں مسئلہ درپیش تھا کہ یروٹلم کا بادشاہ کون ہو گا؟ یورپ سے آنے والے یہ نصرانی بادشاہ، شہزادے اور لشکری کس قدر خوش فہم اور جلد تھے۔ وہ یروٹلم کے بادشاہ کا انتخاب کر رہے تھے۔ اس یروٹلم کا بادشاہ جس پر سلطان ج الدین ایوبی نے سنہ 1187 عیسوی میں قبضہ کیا تھا اور جس پر ابھی تک اسی کا قبضہ مگر یہ جلد باز اور ضدی صلیبی اس خیالی یروٹلم کے بادشاہ کا انتخاب کر رہے تھے جو ابھی حاصل کرنا تھا۔

یروٹلم، مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں طور پر متبرک اور قابل احترام مسلمان اسے قبلہ اول کہتے تھے اس لئے کہ خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے پہلے ان بیت المقدس (یروٹلم) کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ یہی بیت المقدس، اسلام عظیم ترین شہر و رہنما، نبی و رسول اور سرکار دو عالم احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی پہلی منزل تھا۔ اسی بیت المقدس سے حضور پاک عالم بالا کی نچو پرواز ہوئے تھے۔

عیسائیوں کے لئے بیت المقدس یوں قابل تعظیم ہے کہ عیسائیت کے علمبردار حضرت علیہ السلام کا بیت المقدس مدد و لحد ہے۔ وہ اسی جگہ پیدا ہوئے اور اسی مقام پر اس دنیا سے اٹھایا گیا۔

یہودیوں کی وہ عبادت گاہ جسے ”ہیکل سلیمانی“ کہا جاتا ہے اگرچہ اب اس کا کوئی نشان نہیں لیکن کسی زمانہ میں وہ اس بیت المقدس میں موجود تھی۔

ان تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان، عیسائی اور یہودی اپنے مقدس مقامات، روایات اور زیارات کی وجہ سے اس مقام کو محبوب رکھتے ہیں اور

مسلمان شہیدوں کی تعداد آج تک کسی ذرائع سے بھی یہ نہ معلوم نہ ہو سکا کہ مکہ قلعہ پر دو سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو جنگ ہوتی رہی اس ملیوں کے مرنے والوں کی تعداد کتنی تھی۔ یعنی ملیوں نے کتنی جانیں گنوا کر ساحل ن پر سوا دو سال میں صرف ایک قلعہ (مکہ) پر قبضہ حاصل کیا تھا۔ ایک بیان کے قلعہ مکہ کو گھیرنے والا نصرانی لشکر جس میں انگلستان، فرانس، جرمنی، المانیہ اور تمام کے عیسائی ممالک کی فوجیں شامل تھیں۔ ان میں سے صرف ملیوں کا نصف لشکر پر قبضہ تک ختم ہو گیا۔

تیسری صلیبی جنگ کے سلسلے میں خود نصرانیوں کے بیان کے مطابق ان کی تعداد تین سے پانچ اور سات لاکھ تک پہنچتی تھی۔

بہر حال مکہ پر نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور اب وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ بہت جلد یروشلم (بیت المقدس) پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ بیت المقدس پر نوں کے قبضے سے پہلے عیسائیوں کے بالذون خاندان کی حکمرانی تھی۔ بالذون خاندان کی بل اصل وارث تھی اور اس کی طرف سے اس کا شوہر گائی لو سنگناں یروشلم کا بادشاہ

مگر اتفاق ایسا ہوا کہ مسلمانوں کے بیت المقدس پر قبضہ کے بعد جس شاہ یروشلم گائی اس کی بلکہ سبل ادھر ادھر پھر رہے تھے تو ملکہ سبل کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال نے ہی اصولی حیثیت سے اس کا شوہر گائی بھی یروشلم کے تخت سے بے دخل ہو گیا تھا وہ یروشلم کے تخت و تاج کے حق سے محروم ہونے پر تیار نہ تھا۔

جس نصرانی دستور یا کلیسائی قانون کے تحت شاہ گائی کو یروشلم کے تخت سے بے دخل تھا اسی قانون سے مرنے والی ملکہ سبل کی دوسری بہن ازائیل، تاج یروشلم کی مالک بن گئی۔ ازائیل نے نواب ہفرے آف ٹورون سے شادی کی تھی۔ اس لئے نواب نے کو بحیثیت شاہ یروشلم منتخب ہونا تھا۔

مگر انطاکیہ کا مائوٹیس آف مانسٹرٹ جب مقلہ سے روانہ ہوا تو اس کے دل و دماغ یروشلم کا تخت و تاج چھایا ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر صحیح سلامت فلسطین لیا تو یروشلم کا تاج حاصل کرنے کے لئے اپنی جان لڑا دے گا۔ مارکوٹیس کو نریڈ بہادر تھا اور ذہین بھی۔ اس نے قلعہ صور کی کمان اس وقت سنبھالی تھی جب ارض فلسطین تمام شاہ اور شہزادے صور سے منہ پھیر کر اپنی اپنی سلطنتیں اور جانیں بچانے کی فکر میں ہوئے تھے۔

اسے حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

جنگ اور امن کے زمانہ میں نصرانیوں اور مسلمانوں کا کردار رہتا تھا اور رہتا ہے مگر اور مفصل حال تاریخ میں درج ہے۔ مثلاً سنہ 1098 عیسوی میں جب نصرانیوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس حاصل تھا تو اس پاک زمین پر گھوڑوں کے گھنٹوں گھنٹوں تک انسانی خون موجود تھا۔ ایک صلیبی نے بیت المقدس سے یورپ میں ایک پادری کو لکھا تھا۔

”خداوند یسوع مسیح نے یروشلم پر ہمارا قبضہ کرا دیا۔ ہم نے کافروں

”مسلمانوں“ کا اس قدر خون بہایا کہ یروشلم کا احاطہ کے اندر تک

ہمارے گھوڑے ان کے خون میں گھنٹوں گھنٹوں تک ڈوبے ہوئے

ہیں۔۔۔“

یہ تھا ان نصرانی ملیوں کا کردار جنہوں نے سنہ 1098 عیسوی میں دوسری صلیبی جنگ میں مسلمانوں سے بیت المقدس واپس لیا تھا۔ پھر جب اس کے نوے 90 سال بعد مسلمانوں نے سلطان صلاح الدین کی سرکردگی میں سنہ 1189 عیسوی میں عیسائیوں سے دوبارہ بیت المقدس واپس لیا تو مسلمانوں کا سرخیل، سپہ سالار اور مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے سرداروں اور لشکریوں کو حکم دیا۔ ”خبردار۔۔۔ پاک بیت المقدس کی پاک زمین پر دشمن کی تکلیف بھی نہ پھوٹے پائے۔ اس سر زمین پر سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہیں۔ اسے انسانی خون سے ناپاک نہیں ہونا چاہیے۔“

اور مسلمانوں کی تلواریں کیسے کند ہو گئی تھیں۔

یہ قوموں کا اپنا اپنا طرف ہے۔ نصرانی ہمیشہ کامیابی کے واقعات میں وحشی درندے بن جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے سقوط مکہ کی مثال موجود ہے۔ مکہ کا قلعہ ایک معاہدے کے تحت ملیوں کے حوالہ کیا گیا تھا۔ جس میں مسلم سرداروں اور لشکریوں کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی مگر ہوا یہ کہ مکہ کے قلعہ پر قبضہ ہوتے ہی ملیوں نے آنکھیں سر پر رکھ لیں اور بھر انگلستان کے شاہ رچرڈ جسے بد بخت انگریز اور دوسرے یورپ انشا پردازوں نے ”شیر دل“ کا خطاب بزعیم خود عطا کر دیا تھا۔ اسی شیر دل نے حکم دیا کہ انہوں اور یرغمالیوں کو قتل کر دیا جائے۔

اس طرح ستائیس سو (2700) مسلمان شاہ رچرڈ کی درندگی اور ہیبت کا شکار ہو گئے۔ یہ تعداد بھی درست نہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے مسلمان مورخوں نے تاریخ نویسی کی طرف بہت کم توجہ دیا اور صرف سنی سائبانوں کو حقیقت بنا کر کتابوں میں درج کر دیا۔

ایک کے لئے یہ فیصلہ کرے کہ اگر (میرے منہ میں خاک) بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر نصرائیوں کے پاس آگیا تو اس ملک یروٹلم کا بادشاہ کون ہو گا۔

اس مجلس میں شاہ فلپ آگئیں بھی شریک تھا۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ فلپ جوان تھا مگر اس کے چہرے سے تفکر ظاہر ہوتا تھا۔ مکہ کی فتح میں اس کا نام بھی تھا مگر اس ایک شہر ایک قلعہ پر جو عظیم اور خوفناک جنگ ہوئی تھی اس کے تصور ہی سے فلپ کا منہ دھواں دھواں ہو جاتا تھا۔ فرانس میں وہ چھوٹی چھوٹی جنگوں میں شریک ہوا تھا لیکن فرانس کی ایک جنگ میں مجموعی طور پر جس قدر لوگ ہلاک ہوئے تھے اس سے کہیں زیادہ لشکر مکہ کی ایک دن کی لڑائی میں موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ کیا یہ فکر کی بات نہ تھی۔

شاہ فرانس فلپ آگئیں کے سامنے لمبے بازوؤں والا شاہ رچرڈ تھا جس نے مرغ رنگ کی میس اور شکاری ٹوپی پہن رکھی تھی۔ شاہ رچرڈ کی لمبی تلوار چاندی کے غلاف میں کمر سے لٹک رہی تھی۔ وہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے اس طرح مجالس اور محافل سے کوئی علاقہ نہیں لیکن جب وہ نظرس اٹھاتا تو اس کی آنکھوں میں عقاب جیسی گہرائی اور چمک تھی۔ شاہ فرانس کی طرح شاہ رچرڈ بھی اپنے امیدوار یعنی گائی لو گئناں کو ہر صورت میں اور ہر قیمت پر متوقع یروٹلم کی بادشاہت دلانے پر بضد نظر آتا تھا۔

ایونز آف فلائڈرز نے مقدمہ پیش کیا۔

”یروٹلم کے تخت و تاج کا اعزاز ملکہ سل نے اپنے شوہر کو عطا کیا تھا لیکن ملکہ کا انتقال ہو گیا ہے اس گئے گائی لو گئناں بھی یروٹلم کے تخت و تاج سے محروم ہو گئے ہیں مگر وہ اس حق کو چھوڑنے پر کسی صورت تیار نہیں۔ دوسری طرف مرحوم ملکہ سل کی بہن ازائیل ہے جس نے مارکوئیس کونزیڈ آف بانسٹریٹ سے شادی کی ہے۔ ملکہ سل کے بعد یروٹلم کا تخت و تاج ازائیل کو منتقل ہو جاتا ہے اور اس کے شوہر مارکوئیس کونزیڈ کو یروٹلم کا بادشاہ ہونا چاہئے۔ یہ مقدمہ مجلس مشاورت کے سامنے پیش ہے اور مجلس فیصلہ کرے گی یروٹلم (متوقع) کے تخت و تاج کا کون وارث اور بادشاہ ہو گا۔“

شاہ انگلستان کے ساتھ اول آف میسٹر، ہنری کاؤنٹ آف شپین اور سفید پھنوں میں ملبوس ٹیپلس کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہی لوگ خاندان کی تینوں بھائی یعنی شاہ گائی لو گئناں، جنگجو جافرے (جعفرے) اور کانشیل کے عہدے پر فائز الماریک تھا۔

فرانسیسیوں کی طرف سے اہل بیرو کے علاوہ امیر بھی تھے جنہوں نے جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ ساتھ ہی چالاک مارکوئیس کونزیڈ آف بانسٹریٹ خاموش بیٹھا تھا۔ کونزیڈ کے متعلق کئی افواہیں گرم تھیں۔ غرض یہ کہ امراء کی اس مجلس مشاورت میں یروٹلم کے تنازعے پر

مارکوئیس کونزیڈ، صور کا نجات دہندہ تھا۔ صور والے اس پر جان دیتے تھے۔ جب ملکہ سل کا انتقال ہوا اور یہ امکان پیدا ہوا کہ یروٹلم کا تخت سل کی بہن کو مل سکتا ہے تو مارکوئیس کونزیڈ اسی وقت سے متحرک ہو گیا اور اس نے عالی دماغ اور شاطرانہ چالوں سے ازائیل اور نواب ہنفرے کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا اور ازائیل نے نواب ہنفرے سے طلاق حاصل کر لی۔

یہ بھی مارکوئیس کونزیڈ کا ایک کارنامہ تھا۔ اس نے ازائیل کو اپنی محبت کا جال میں پھانسا۔ ازائیل کو اس سے محبت ہوئی تھی کہ نہیں مگر اس کے لئے مارکوئیس کونزیڈ کا سارا ہی غنیمت تھا چنانچہ اس نے نواب ہنفرے سے طلاق حاصل کرتے ہی مارکوئیس کونزیڈ آف بانسٹریٹ سے شادی رچا لی۔ کونزیڈ اور ازائیل کی شادی کو یروٹلم کی اسقف ہرولیس پطرس نے ناجائز قرار دیا تھا لیکن مارکوئیس کونزیڈ کب مار کھائے والا تھا۔ اس نے فوراً اپنے صور کے نئے کیڈرل کے اسقف سے اپنی اور ازائیل کی شادی اعلان کر کے اس کی تصدیق کر دی۔

اب سوال یہ تھا کہ یروٹلم کی متوقع سلطنت کا حقدار کون ہو گا۔

”سابق شاہ گائی لو گئناں یا ازائیل کا نیا شوہر مارکوئیس کونزیڈ آف بانسٹریٹ“

تخت و تاج کے دونوں متوقع حقدار اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم تھے۔ گائی کی اہمیت اس لئے تھی کہ تیسری صلیبی جنگ کا اس نے آغاز کیا تھا اور وہ اب تک میدان جنگ میں سینہ سپر رہا تھا یہ اور بات ہے کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتوں گرفتار ہونے پر اس نے اور اس کے بڑے بڑے سرداروں نے قسم کھائی تھی کہ وہ سلطان کے خلاف تلوار نہیں اٹھائیں گے لیکن آزادی کے دوسرے ہی دن سے اس نے سلطان کے خلاف فوجیں اکٹھا کرنا شروع کر دیں تھیں۔

اس کے مقابلہ پر مارکوئیس آف بانسٹریٹ یوں اہمیت کا حامل تھا کہ قطع نظر اس کے کہ اس نے ملیسوں کا نہ صرف بھرپور ساتھ دیا تھا بلکہ اس جنگ میں اپنے ہاتھ پیروں سے شریک رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے چالاک ذہن نے شاہ فلپ آگئیں آف فرانس کا تعاون بھی حاصل کر لیا تھا۔ شاہ فلپ آف فرانس مارکوئیس کونزیڈ کی اس قدر بات مانتا تھا کہ جب یروٹلم کے اسقف پطرس نے مارکوئیس کونزیڈ آف بانسٹریٹ اور ازائیل کے عقد کو ناجائز قرار دیا تھا تو مارکوئیس کونزیڈ نے شاہ فرانس ہی کے مشورہ سے صور کے اسقف سے اس شادی کی تصدیق کا اعلان کر دیا تھا۔

اب یہ مجلس مشاورت اس لئے منعقد ہوئی تھی کہ مارکوئیس اور گائی میں سے کس

خوب لے دے ہوئی۔

شاہ فلپ آگنس نے مارکوئیس کوزیڈ کو یروٹلم کا بادشاہ تسلیم کر لیا اور اسے مبارک باد بھی دیدی لیکن شاہ انگلستان رچرڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور شاہ فرانس کو مخاطب کر کے کہا۔

”شاہ فرانس کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم فلسطین میں مال غنیمت بانٹنے اور بادشاہتیں تقسیم کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ یروٹلم کی مذہبی سلطنت کو مسلمانوں سے چھین کے گاٹی لو گناں کو اس کا بادشاہ بنائیں۔“

شاہ فرانس نے رچرڈ کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”آج شاہ انگلستان کو اپنا حرم یاد آ رہا ہے مگر انہیں یہ حرم اس وقت کیوں نہیں یاد آیا جب وہ قبرص کو تاخت و تاراج کر کے وہاں قبضہ جمائے بیٹھ گئے تھے۔“

شاہ انگلستان جواب دینا چاہتا تھا کہ یروٹلم کے سابق اسقف ہرکولیس پطرس نے تقریباً ”چھینچھینے ہوئے کہا۔“ شاہ فرانس فلپ آگنس، مارکوئیس کوزیڈ کی حمایت سے باز آ جائیں کیونکہ کوزیڈ اور ازائیل کی شادی ہی غلط اور نامبارک ہے اس لئے ان کے یروٹلم کی بادشاہی کے امیدوار ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔“

”اے یروٹلم کے اسقف۔“ شاہ فرانس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ وضاحت فرمائیں گے کہ مارکوئیس کوزیڈ اور ازائیل کی شادی کس لئے غلط اور نامبارک ہے؟“

”اے شاہ فرانس آپ یہ سوال بہت تاخیر سے کر رہے ہیں۔“ اسقف پطرس غصہ سے بولا۔ ”اگر آپ نے یہ سوال اس وقت کیا ہوتا جب میں نے مکہ کے ساحل پر اترتے ہیں اعلان کیا تھا کہ کوزیڈ اور ازائیل کی شادی ناجائز ہے، تو زیادہ بہتر ہوتا۔ آپ نے مجھے وضاحت طلب کرنے کی بجائے صور کے اسقف سے اس شادی کو جائز قرار دینے کا اعلان کرا دیا۔ مگر خیر میں اس وقت بھی اس کی وضاحت کے لئے تیار ہوں۔ آپ لوگ دل تمام کر میری بات سنئے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجئے گا۔“

اسقف پطرس نے کما شروع کیا۔

”مارکوئیس کوزیڈ آف مانسٹرٹ ایک ایسے شاطر اور چالاک جوان ہیں جو بہت جلدی جلدی اپنے ٹھکانے بدلتے ہیں اور جہاں اور جس ملک میں تشریف لے جاتے ہیں وہاں ایک عدد شادی ضرور فرماتے ہیں۔ اس شہزادے نے پہلی شادی مانسٹرٹ کی ایک نابالغ رئیس زادی سے رچائی مگر چند ہی دنوں میں بیوی سے جی بھر گیا اور اسے چھوڑ چھاڑ کر جہاز پر سوار ہوئے اور اپنا بیڑا لے کر اطالیہ سے چل پڑے۔ بیچاری بیوی کو کئی دن بعد

چلا کہ اس کے شوہر نامدار چپ چاپ وہاں سے نکل گئے ہیں اور لوگوں میں مشہور کر لئے ہیں کہ وہ جنگ مقدس میں حصہ لینے فلسطین جا رہے ہیں۔ ان کی بیوی اب تک ان کی راجسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اب فرمائیے کیا ایک شخص کی دوسری شادی ہو سکتی ہے جس کی ایک بیوی زندہ سلامت ہو اور اپنے ملک میں بیٹھی اس کی جان کو رو رہی ہو؟“

”ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ شاہ انگلستان کے ساتھ بیٹھنے والے نوابوں نے شور مچایا۔ اسقف نے زور دے کے کہا۔

اگر مارکوئیس کوزیڈ انکار کرنے کی کوشش کریں تو میں ان کی دوسری شادی کا حال بیان کروں؟“

”کیا مارکوئیس نے دوسری شادی بھی کی ہے۔“ کسی طرف سے آواز آئی۔ ”مہربانی فرما ر اس شادی کا حال بھی بیان فرمائیں گے۔“

اسقف نے مزے لے لے کے بیان کیا۔

مارکوئیس کوزیڈ ایک بیوی کو اطالیہ میں چھوڑ کے بھاگے تو قسطنطینیہ میں آ کے دم لیا۔ ان کے ساتھ ایک بحری بیڑا بھی تھا اس لئے باز نطینی شہنشاہ ان کے ساتھ بہت محبت سے مل آیا اور انہیں شاہی مہمان کی حیثیت سے محل میں جگہ دی۔ وہاں مارکوئیس کوزیڈ نے گل کھلایا کہ اپنے آپ کو کنوارا ظاہر کیا اور شہنشاہ کی کنواری بہن سے محبت کے پینگ حانا شروع کر دیے۔ بھولی شہزادی ان کے فریب میں آ گئی۔ شہنشاہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے جوان اور کنوارا ہے اپنی بہن کی شادی ان سے کر دی۔ مگر اس دوسری بیوی کا حال بھی پہلی جیسا ہوا۔ وہاں مارکوئیس کوزیڈ نے یہ چال چلی کہ شہنشاہ سے کہا کہ بیت المقدس کی جنگ میں حصہ لینے جا رہا ہے اس لئے بیوی کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ بیوی پر بیوی کو ساتھ اٹھانیے لے جائے گا۔ اس طرح اس طرح یہ حضرت دو شادیاں کرنے کے بعد کنوارے بن کے صور میں داخل ہوئے اور اب ازائیل سے تیسری شادی رچائی ہے جبکہ ان کی دو بیویاں پہلے ہی موجود ہیں۔“

شرم۔ شرم کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ نھرائیوں (ہیسیائیوں) ایک بیوی کی موجودگی میں کوئی شوہر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ ان میں مذہبی اور دنی دونوں طرح سے دوسری شادی ممنوع ہے۔

ازائیل کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ مجلس کے تمام حاضرین کی نظریں اس پر اور اس کے شوہر مارکوئیس کوزیڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مارکوئیس پر جو الزامات عئے گئے ہیں ان کا وہ جواب دینے کے بعد معافی کا طلبگار ہو گا۔ ہو سکتا تھا کہ مارکوئیس

کی فوجی خدمات کے پیش نظر اسے معاف کر دیا جاتا لیکن ڈھیٹ اور بے غیرت مارکوئیس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت چاہی۔

مجلس مشاورت نے اسے صفائی کی اجازت دی تو اس نے کہا۔

”مجھ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ ایک ایسے شخص نے لگائے ہیں جس کی اہل فلسطین اور صلیبی لشکر بھی عزت کرتا ہے۔ میں خود بھی سابق اسقف یروٹلم ہرکولیس پطرس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ میں ان کی باتیں اور الزامات رد کرنے کا گنگار نہیں ہوتا چاہتا۔ اس لئے میں صرف اپنی صفائی پیش کروں گا۔“

مارکوئیس نے ذرا رک کے کہا۔

”یہ درست ہے کہ میں نے مانسٹرٹ کے ایک ریس کی بیٹی سے شادی کی تھی لیکن بد قسمتی سے میرے اور اس کے مزاج میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی اور ہم دونوں کو مجبوراً الگ ہونا پڑا۔ رہا میری دوسری شادی کا سوال۔ اس کے لئے میں یہ کہوں گا جس وقت میں باز نیٹینی شہنشاہ کے پاس قسطنطنیہ پہنچا اور میں نے شہنشاہ پر زور دیا کہ انہیں بھی دوسرے نصرانی بادشاہوں کی طرف اس مقدس جنگ میں حصہ لینا چاہئے تو وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ ان دنوں شہنشاہ کی طبیعت ناساز تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ ہی فلسطین چلتا مگر اس وقت میرا جانا ممکن نہیں۔ ہفتہ عشرہ میں میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور تم سے فلسطین میں آملوں گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں فلسطین روانہ ہو گیا تو باز نیٹینی شہنشاہ قسطنطنیہ سے قدم بھی نہ نکالیں گے اس لئے میں نے قسطنطنیہ میں چند دن قیام کی خواہش کی۔“

”شہنشاہ مجھ سے انکار نہ کر سکے اور میں ان کے شاہی مہمان خانہ میں رہنے لگا۔ انہی دنوں شہنشاہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی بہن کی شادی کے لئے بہت متکثر ہیں اگر اس کی کسا معقول جگہ شادی ہو جائے تو میں جنگ مقدس میں اطمینان سے حصہ لے سکوں گا۔ میں نے باز نیٹینی شہزادی کو ایک دو بار دیکھا تھا اور وہ مجھے ہر طرح سے معقول معلوم ہوئی تھی۔ اس لئے شہنشاہ کی تحریک پر میں نے باز نیٹینی شہزادی سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ ہی شہنشاہ نے اپنا رخ بدل لیا اور مجھ سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس صلیبی جنگ میں حصہ لینے فلسطین نہیں جاسکتے کیونکہ اس کی سلطنت کے حالات کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں۔“

”شہنشاہ کے اس انکار پر مجھے بہت غصہ آیا حالانکہ انہوں نے مجھ سے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اگر ان کی بہن کی شادی ہو جائے تو وہ میرے ساتھ فلسطین چلیں گے۔ اسی غصہ میں میں نے باز نیٹینی شہزادی کو طلاق دیدی اور قسطنطنیہ سے ارض فلسطین پہنچ گیا۔ چلنے سے

پہلے میں نے قسطنطنیہ کے اسقف کو بھی اطلاع دیدی تھی۔“

اس موقع پر یروٹلم کے اسقف ہرکولیس پطرس نے بھر دغل دیا۔

”معزز حاضرین مجلس“ اسقف نے کہا۔ ”اگر مارکوئیس کونزیڈ کو میرے لگائے ہوئے الزامات سے انکار ہے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ اور اطالیہ کے مرکزی کلیساؤں سے یہ دریافت کیا جائے کہ آیا مارکوئیس کونزیڈ نے شہنشاہ باز نیٹینی کی بہن اور مانسٹرٹ کی رکیس زادی سے جو شادیاں کی تھیں۔ ان کی تہنیک کلیسا کے رجسٹروں میں درج ہے کہ نہیں۔“

اس وقت مارکوئیس کونزیڈ کو کوئی بہانہ نہ سوجھا اور وہ چپ کھڑا رہا۔ شاید اس نے یہ سوچا کہ اگر بات آگے بڑھی تو اسے ازائیل جیسی حسین عورت سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ مگر اسقف جواب کا منتظر تھا۔ اس کی زندگی میں پہلی بار کسی سے اسے جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔

جب کسی طرف سے جواب نہ آیا تو اسقف پطرس دوبارہ مگر جا۔ ”معزز حاضرین۔ میں یعنی یروٹلم کی پاک سرزمین کا اسقف ہرکولیس پطرس یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس پر دروغ گوئی (جھوٹ) کا الزام لگائے۔ اس لئے میں شاہ فرانس فلپ آگسٹس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے چند آدمیوں کو قسطنطنیہ اور مانسٹرٹ روانہ فرمائیں تاکہ حقیقت معلوم ہو سکے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔“

شاہ فرانس فلپ آگسٹس جس کی پوزیشن اس مقدمہ کی وجہ سے گری جا رہی تھی اور وہ پہلے ہی سے اپنی نیکی محسوس کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”اے یروٹلم کی پاک سرزمین کے پاک باطن اسقف۔ مجھ پر خداوند یسوع مسیح کی مار پڑے اگر میں کسی اسقف کے بارے میں جھوٹ بولنے کا تصور بھی کر سکوں۔ میں اپنا دعویٰ واپس لیتے ہوئے مجلس سے درخواست کروں گا کہ وہ فیصلہ کرتے وقت مارکوئیس کونزیڈ کی ان خدمات کی ضرور خیال رکھے جو اس نے قلعہ صور کو سلطان سے بچانے اور مکہ پر قبضہ کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔“

شاہ انگلستان نے اپنی بات رکھنے کے لئے کہا۔ ”محترم اسقف۔ قسطنطنیہ اور مانسٹرٹ سے شہادت منگنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ساتھ قبرص کی شہزادی آئی ہے اور اس نے مجھ سے وہ تمام حالات بیان کئے ہیں جن کا اظہار معزز اسقف نے اپنے بیان میں کیا ہے۔ اس لئے میں پر زور اپیل کرتا ہوں کہ گاٹی لو گنگناں کو یروٹلم کے تخت و تاج پر بحال رکھا جائے۔ ہاں اگر اب بھی شاہ فرانس اپنے دوست مارکوئیس کونزیڈ کو یروٹلم کا بادشاہ بنانے پر

بعد ہیں تو انہیں اپنی تلواروں کا شمار کر لینا چاہئے۔“
یہ شاہ فرانس فلپ آگسٹس کو ایک طرح کا چیلنج تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا اور جواب دیا۔

”شاہ انگلستان ارض فلسطین کی تمام جنگوں اور کامیابیوں کو اپنے حصے میں ڈال فلسطین اور یروشلم میں بزور شمشیر اپنی مرضی کی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بھول جاتے کہ یہاں معاملات میں دوسروں کا حصہ اور حق ہے۔“

”ہم نے کسی کا حق نہیں مارا۔“ رچرڈ اپنی لابی آئینیں لہراتا ہوا بولا۔ ”مسلمان قیدیوں کو ہم نے نصف نصف کی نسبت سے تقسیم کیا۔ تمام مال غنیمت، اسلحہ اور سارے سود میں یہی نسبت رہی۔ ہم پر کسی کا حق مارنے کا الزام کیسے لگایا جاسکتا ہے؟“
شاہ فلپ آگسٹس جواب کے لئے کھڑا ہوا تو اس کے پیر کپکپا رہے تھے۔ اس نے غ سے لرزتی آواز میں کہا۔

”شاہ انگلستان نے ہمارا حق مارا ہے اگر وہ انصاف پسند ہوتے تو قبرص کے آرمے عا پر میرا حق تسلیم کرتے۔ میں بھی انہی کی طرح اپنا ملک چھوڑ کر اس مقدس جنگ کے آیا ہوں۔“

شاہ فرانس کا یہ حملہ بڑا زبردست تھا۔ قبرص واقعی مال غنیمت میں تھا اور اس پر قبۃ تیسری صلیبی جنگ کے سلسلے میں ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قبرص کو انگلستان کی بحریہ نے کیا تھا لیکن اس پر دوسرے صلیبیوں کا بھی حق تھا۔
مگر اس مشکل سوال کو شاہ رچرڈ نے چٹکیوں میں حل کر دیا۔ رچرڈ نے تیسری صلیبی جنگ میں پہلی اور آخری بار اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔

رچرڈ نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”شیر اگر چہ جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن وہ امارے ہوئے شکار سے دوسروں کو بھی حصہ دیتا ہے۔ ہم اعلان کرتے ہیں جزیرہ قبرص نصف حصہ تاج فرانس میں شامل کیا جائے۔ شاہ فرانس جزیرہ کو شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً طرح چاہیں تقسیم کر کے اپنے حصہ پر قبضہ کر سکتے ہیں۔“

رچرڈ کے اس جواب نے شاہ فرانس اور اسکے ہمدردوں کا منہ پھیر دیا۔
اور آخر مجلس مشاورت نے یروشلم کے متوقع بادشاہ کا فیصلہ کر دیا۔ طے ہوا کہ نہ

نمبر 1:- گاٹی لو سکنان تا حیات یروشلم کی متوقع سلطنت کا بادشاہ رہے گا۔

نمبر 2:- گاٹی لو سکنان کے بعد یروشلم کا بادشاہ مارکویس کونریڈ یا اس کا بیٹا ہو گا۔

نمبر 3:- اگر کونریڈ گاٹی لو سکنان سے پہلے انتقال کر جائے تو پھر شاہ انگلستان کو اختیار

وہ جیسے چاہے سلطنت یروشلم کا فیصلہ کرے بشرطیکہ شاہ انگلستان اس وقت مشرق وسطیٰ موجود ہو۔

اس فیصلہ سے سب کے آنسو پچھ گئے مگر شاہ فرانس کا اس پر شدید رد عمل ہوا۔ مجلس رت کے اختتام پر شاہ فرانس فلپ آگسٹس نے اپنے فیصلہ کا اعلان کیا۔ ایک تو رچرڈ سخت اور توہین آمیز رویہ سے وہ سخت دل برداشتہ تھا دوم فرانس میں ڈیوک آف رز کی موت واقع ہو گئی تھی اور شاہ فرانس کے اقتدار کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بلد سے جلد فرانس واپس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بیماری کا بہانہ کیا۔ کچھ تو وہ واقعی تھا اور کچھ اس نے بیماروں جیسی صورت بنالی اور فرانس جانے کا اعلان کر دیا۔

شاہ فرانس ان دنوں قلعہ صور میں مارکویس کونریڈ کا مہمان تھا اور وہیں آرام کر رہا فرانسیسی لشکر نے اس فیصلہ کا بہت برا بنایا۔ چند سرداروں نے فلپ آگسٹس سے تکرار کر کے اسے جنگ کے اختتام تک فلسطین میں رہنے کی درخواست کی لیکن فلپ نے راہ تبدیل نہیں کیا۔ شاہ فرانس کی عجلت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے چھپے اور کھلے دشمن رچرڈ (شاہ انگلستان) سے دو تیز رفتار جہاز مانگے جو اسے جلد از جلد فرانس پہنچا دیں۔

شاہ انگلستان نے فلپ آگسٹس کو جہاز مہیا کر دیے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ فلپ ن سے ہٹ جائے تاکہ اسے صلیبی جنگ کا قائد تسلیم کر لیا جائے۔ رچرڈ کو فلپ ن کے جانے سے یہ فائدہ تو ہوا مگر اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں فلپ آگسٹس فرانس کے انگلستان پر حملہ نہ کر دے یا اس کے حلیفوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس خطرے کے پیش نظر رچرڈ نے فلپ سے از سر نو حلف اٹھوایا کہ وہ رچرڈ کی نہ

ستان سے جنگ چھیڑے گا اور نہ انگلستان کے حلیفوں سے چھیڑ خانی کرے گا۔
فلپ آگسٹس نے یہ حلف اٹھا لیا مگر مشہور مقولہ کے مطابق کہ جنگ اور محبت میں ہر باتر ہے۔ ابھی دو سال ہی گزرے تھے فلپ نے اس حلف نامہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور ان سے جنگ چھیڑ دی۔ دراصل انگلستان اور فرانس کی سلطنتیں ایک ہی خاندان کے کے پاس تھیں اور ان دونوں میں اتفاق پیدا کرنے کے لئے شاہی اور عوامی سطح پر ن اور فرانس والے آپس میں بے دھڑک شادیاں کرتے تھے۔

ناہ رچرڈ اور فلپ آگسٹس آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔ اس لئے کہ رچرڈ کی ملکہ پہلے شاہ فرانس کی ملکہ تھی پھر جب شاہ فرانس نے اسے طلاق دیدی تو اس نے ن کے اس شخص سے شادی کر لی جو بعد میں انگلستان کا بادشاہ ہوا۔ رچرڈ اسی بادشاہ

۱۔ لینیور کے بطن سے بیٹا تھا۔

اسی طرح شاہ فرانس نے دوسری شادی کی تو اس سے فلپ آگسٹس پیدا ہوا۔ اس طرح رچرڈ کا سوتیلا باپ اس کی ماں کا پہلا شوہر تھا اور رچرڈ کی ماں فلپ آگسٹس کی سوتیلی ماں تھی۔ شاہ فلپ کے واپس جانے کے بعد شاہ رچرڈ صلیبی فوجوں کا واحد قائد تھا۔ فرانس کی بیشتر فوج بھی مکہ میں موجود تھی۔ شاہ فلپ چلتے وقت اپنے بہترین فوجی دستوں کو ڈیوکر آف برگنڈی کے سالاروں میں یہیں چھوڑ گیا تھا۔

یہاں شاہ انگلستان رچرڈ کے کردار کا ہمیں ایک پہلو اور نظر آتا ہے۔ اس نے تیر ہزار کے قریب نئے یرغابی مسلمانوں کو برسرعام قتل کرا دیا تھا مگر وہ ایسا ڈھیٹ تھا کہ اگر ہونناک اور قابل ملامت قتل عام کے بعد بھی وہ بڑی بے تکلفی سے سلطان سے بازوں اور خوراک کی فرمائش کرتا ہے۔ کم از کم ہمارے معاشرے میں تو اسے بے تکلفی کے بجائے بے غیرتی کہا جاتا ہے اس طرف سلطان کی اعلیٰ ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ رچرڈ کی فرمائش پوری کر دیتا تھا۔

ایک انگریز مصنف والٹر اسکٹ نے تو اپنے ایک ناول میں یہاں تک لکھ دیا کہ خود سلطان صلاح الدین شاہ رچرڈ کی بیماری کے زمانہ میں حکیم کا بھی بدل کر گیا تھا اور اس علاج کرتا رہا تھا۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں سلطان کو بدنام کرنے اور اسے بڑا ثابت کرنے کے لئے اسکٹ نے اپنے ناولوں میں لکھی ہیں۔

والٹر اسکٹ کا ذکر آگیا ہے تو اس کی اور اس جیسے افسانہ طرازوں کا تھوڑا سا ذکر جائے۔ کیونکہ اس سے انگریز قوم اور اس کی ذہنی پستی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک ناول نگار کا ایک ناول اتفاقاً میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس ناول کو پڑھ کے مجھے بہت اُم آئی۔ اس لئے کہ اس ناول نگار نے اپنے تخیل کے زور پر رچرڈ کی والدہ محترمہ کے ساتھ سلطان صلاح الدین کا ایک عظیم عشق کا افسانہ تراشا ہے۔

مگر قابل ناول نگار یہ افسانہ تراشتے وقت زمان و مکان کی پابندیوں سے بالکل آزاد آگیا۔ اس نے یہ لکھ کہ جب ملکہ ایلینور شاہ فرانس کی بیوی تھی تو وہ شاہ فرانس کے ساتھ دوسری صلیبی جنگ میں شام کے علاقہ میں آئی ہوئی تھی۔ اس وقت صلاح الدین مسلمانوں کی طرف سے جاسوسی کرنے فراہم کر لیا گیا تھا۔ وہیں کہیں ملکہ ایلینور اور صلاح الدین کی ملاقات ہوئی دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے پھر ان کی کتنی ہی محبت ملاقاتیں ہوئیں۔ ملکہ ایلینور صلاح الدین کو اپنے ساتھ اپنے خیمہ میں لے گئی۔ اس کے بعد شاہ فرانس کو اپنی ملکہ کے کردار پر شبہ ہو گیا اور وہ صلیبی جنگ چھوڑ کے مکہ

لینیور کے فرانس واپس چلا گیا۔

فرانس پہنچ کے شاہ فرانس نے اپنی ملکہ پر بدچلتی کا الزام لگا کر طلاق دیدی۔ اس کے ملکہ ایلینور نے شاہ انگلستان سے شادی کی تھی جس کے بطن سے شاہ رچرڈ پیدا ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ فرانس لوئی ملکہ ایلینور کے ساتھ سنہ 1149 عیسوی میں ہی جنگ پر آیا تھا۔ صلاح الدین کی پیدائش سنہ 1138 عیسوی میں قلعہ نکمرٹ میں تھی اس طرح سنہ 1149 میں صلاح الدین کی عمر گیارہ سال تھی جس کے عشق کا نہ فراہمی افسانہ طراز اور ایک نظم نگار نے بھی لکھ مارا ہے۔ اگر موقع ملا تو میں نین کی دلچسپی کے لئے یہ افسانہ یا اس کا اختصار ضرور پیش کروں گا۔

سلطان صلاح الدین ایک نیک مزاج، رحمدل اور انصاف پسند انسان تھا۔ اس کے رچرڈ بیماری کے زمانہ اسے پھل اور مشروب وغیرہ ضرور بھیجتے تھے۔ جنگ کے دوران ایک بار رچرڈ کا گھوڑا رخمی ہو کر گر گیا تو سلطان نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈکے پاس دو گھوڑے سواری کے لئے بھیج دیئے تھے۔

شاہ رچرڈ کی آخری وقت تک یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کہ سلطان اس سے ملاقات کرے۔ اس نے دو مرتبہ اپنے قاصد کے ذریعے سلطان سے ملاقات کی درخواست کی لیکن ان نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔

مسلمانوں میں سقوط مکہ سے بڑا ہیجان پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد صلیبیوں کے قائد شاہ ان نے تین ہزار مسلمان یرغابیوں کو قتل کرا دیا تو اس ہیجان میں اور اضافہ ہو گیا۔ پھر اس طرف سے جنگی تیاریوں میں اضافہ ہو گیا۔ شاہ فرانس فلپ آگسٹس واپس جا چکا تھا۔ فرانس کی وجہ سے مارکوئیس کو نیزہ کو بڑا سہارا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مارکوئیس نے مکہ میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے بہترین دستوں کے ساتھ صور واپس

ب فرنگیوں نے جس کا قائد شاہ رچرڈ ہو گیا تھا۔ انہوں نے مکہ سے قدم نکالے اور فتح کرنے کے لئے جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ بری فوج کے ساتھ حرکت کر رہی تھی اور بحری فوج سمندر میں ان کے متوازی چل رہی تھی نول کے متوازی پہاڑوں کی آڑ میں سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ چل رہا

نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔“

اسی سردار نے جواب دیا۔ ”سلطان عالی مقام۔ عسقلان کا محل وقوع، مکہ سے کچھ مختلف نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم عسقلان پہنچ کر مکہ کی طرح گھیرے میں آجائیں۔“ ایک دوسرے سردار نے کہا۔ ”سلطان معظم۔ مکہ اور عسقلان میں بہت فرق ہے۔ میں ہمارے فوجیوں کی تعداد چار ساڑھے چار ہزار سے زیادہ تھے اور فرنگیوں کی تعداد نہ بڑھتے تین لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ عسقلان میں ہم گھیرے میں نہیں آ سکیں، ہمارے ساتھ ایک بڑا لشکر ہے اور ہم ایک طویل عرصہ تک جنگ کر سکتے ہیں۔“

پہلے سردار نے جواب دیا۔ ”ایسی طویل جنگ سے کیا فائدہ کہ بعد میں ہم محصور رہیں۔ فرنگیوں کے ساتھ ان کا بحری بیڑہ ہے۔ شکست کی صورت میں وہ اپنے بحری بیڑے محفوظ ہو کے بیٹھ سکتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ اگر ہم شکست کھا گئے اور انہوں نے ان پر قبضہ کر لیا تو انہیں ہمارا بے انتہا سامان جنگ مل جائے گا اور ان کی طاقت میں ہو گا۔“

سلطان بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

”عسقلان میں خطرہ موجود ہے۔ ہم عسقلان کو مکہ بننے نہ دیں گے بلکہ ہم عسقلان کو کے برابر کر دیں گے۔“

سلطان نے یہ بات بڑے جوش سے کہی تھی۔ کسی سردار کی سمجھ میں نہ آیا کہ سلطان ارادے ہیں۔ انہوں نے پہلے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پھر ان میں سے ایک نے آواز میں کہا۔ ”سلطان جو بھی حکم دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے لیکن“

لے کہ سلطان، عسقلان کا کیا حشر کرنا چاہتے ہیں؟“

میرے بہادر سرداروں۔۔۔ ”سلطان صلاح الدین نے بڑے جوش سے کہا۔ ”میدان میں اگر چہ سپاہی لڑتا ہے مگر کامیابی کی صورت میں اس کے سردار کا نام بلند ہوتا ہے ہر لشکر میں سردار کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی رائے پر توجہ سے غور کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس وقت مکہ کی طرح عسقلان بھی ہمارے لئے پیدا کر سکتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں آپ لوگوں کی طرف سے بھی کہی گئی ہیں۔ اس میں ہم مکہ کا محاصرہ نہیں دہرانا چاہتے لیکن ہم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ ہمارے دستے عسقلان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ بیت المقدس کے محاصرے کے لئے نافذ فوجی اڈہ قائم کریں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم عسقلان کی شکل اس لڑیں گے کہ اگر فرنگی لشکر وہاں پہنچے تو اسے کھانے کے لئے دانہ اور پینے کے لئے

سلطان نے مکہ سے عسقلان تک پورے راستے پر جگہ جگہ اپنے چھاپے مار دستے مقرر کر دیئے تھے کہ فرنگی لشکر ان کے سامنے سے گزرے تو وہ دن اور رات میں ان پر حملہ کر کے انہیں پریشان کرتے اور نقصان کرتے رہیں۔ ان دستوں پر سلطان نے اپنے افضل سیف الدین ایوبی کو زکوش اور عزالدین خردیک وغیرہ کو سردار مقرر کیا تھا۔ پس جب رہزا اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا تو ان چھاپے مار دستوں نے انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہ دستے اچانک حملہ کر کے یا تو فرنگی لشکریوں کو قتل کر دیتے یا گرفتار کر لیتے تھے۔

شاہ رچڑ اپنی فرنگی فوج کے ساتھ لڑتا بھڑتا آخر یافا پہنچ گیا۔ فرنگیوں نے اس جگہ قیام کیا۔ رچڑ کی باقی فوج بھی مکہ سے آگئی۔ سلطان کی فوجیں بھی ان کے سامنے پڑاؤ ڈال ہوئے تھیں۔ یافا میں کچھ دن قیام کے بعد فرنگی فوجیں تیساریہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ مسلمان فوجیں بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوئیں۔ ان کے جو فرنگی ہاتھ آ جاتا اسے قتل کر دیتے۔ تیساریہ پہنچ کے دونوں فوجوں میں ایک بھڑپ ہوئی۔ فرنگیوں نے مقابلہ کیا، ان کا نقصان زیادہ ہوا۔ مسلمانوں نے رات کو شب خون مارا اور فرنگیوں کا زبردست نقصان ہوا۔

دوسرے دن فرنگی اوسوف پہنچے۔ راستہ بہت تنگ تھا۔ مسلمان ان سے پہلے اوسوف پہنچ چکے تھے۔ فرنگیوں کے پہنچنے ہی مسلمانوں نے ان پر زبردست حملہ کیا اور انہیں سمنہ کی طرف دھکیل دیا۔ مگر فرنگیوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ سمندر میں چلنے والے جہازوں قلب کی طرف پسا کر دیا۔ قلب میں خود سلطان موجود تھا اس کے پسا ہوتی فوج کو کنگا دے کر فرنگیوں کے حملہ کو روک دیا۔

فرنگی وہاں سے یافا واپس آئے۔ یافا خالی تھا۔ انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ رملہ پہنچا۔ وہاں اس نے فوجی سامان جنگ اکٹھا اور فرنگیوں پر ایک پھر پور حملہ کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں سلطان نے ایک مجلس شور منعقد کی۔

سلطان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں عسقلان پہنچ کر مورچے قائم کرنا چاہیے اور وہاں فرنگیوں کا مقابلہ کریں گے۔“

سلطان کے ایک سردار نے کہا۔ ”اگر یہ سلطان کا حکم ہے تو ہم اس پر عمل کرنے کے تیار ہیں۔“

سلطان نے جواب دیا۔ ”اگر ہمیں حکم دینا ہوتا تو مجلس مشورت کیوں منعقد کر۔“

ہوں ملیسوں اور ان کی قلعہ نما منیجٹوں، تیر اندازوں اور قد اندازوں کا مقابلہ کیا وہ
خ اسلام کا شہر باب بن چکا تھا۔

عسقلان بحر دم کے کنارے ایک تجارتی شہر، ایک کار آمد بندرگاہ اور ایک مضبوط قلعہ
خدا نخواستہ اگر عسقلان پر فرنگیوں کی قبضہ ہو جاتا تو اس مضبوط قلعہ سے فرنگیوں کے
چار لاکھ کے لشکر کو باہر نکالنا ممکن ہو جاتا۔ مسلمان اس قلعہ پر اور جتہ اور جافا کے
پر قبضہ تو کر سکتے تھے لیکن ان پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لئے کہ
نوں کی بحری طاقت ختم ہو چکی تھی جب دشمن کے بحری جہاز ساحل کے ساتھ ساتھ
ہوئے نصرانی لشکر کی حفاظت کر رہے تھے۔

اسی مجبوری نے سلطان کو عسقلان کو برباد کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ سلطان کے حفاظتی
پر مشتمل لشکر عسقلان کے باہر خیمہ زن ہوا۔ بندرگاہ کے سلطانی محافظ دستوں کے
سلطان کے ارغوانی خیمہ کے پاس پہنچ گئے۔ معززین شہر بھی سلامی کے لئے حاضر
تھے۔ سلطان اپنے خیمہ میں سرداروں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ مسئلہ درپیش
کہ ملی کے گلے میں کھنٹی کون ڈالے۔ باہر جمع ہونے والے شہر والوں سے کون کہے کہ ہم جو
گھروں کے محافظ اور رکھوالے ہیں آج اپنے ہی ہاتھوں سے ان گھروں کو آگ
اے ہیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی ایک دم خیمے کے باہر آیا۔ حاضرین نے سر کو ذرا خم کر کے
کو سلام پیش کیا۔ سلطان نے بغیر کسی تمہید کے مجمع سے سوال کیا۔
اے خوبصورت شہر عسقلان کے دلیر باشندو! تمہارا سلطان جو آج تک تمہاری
کر رہا تھا آج تم سے ایک سوال کرنے آیا ہے اور تمہیں اس کا جواب دینا ہو گا۔
سلطان نے رک کر مجمع پر نظر دوڑائی اور پھر بولا۔۔۔

تیر تعمیر ہوتے ہیں تاکہ عوام میں خوش حالی ہو۔ بندرگاہ بنائے جاتے ہیں تاکہ بیرونی
سے فائدہ اٹھایا جائے، اسی طرح مکانات اور قلعہ بنائے جاتے ہیں تاکہ اس میں
آرام کرو اور جنگ کے موقع پر محفوظ رہو۔۔۔

سل جنگ، دوڑوہوپ، مختلف آب و ہوا میں رہائش اور نامساعد حالات میں
اڑتالیس گھنٹے مسلسل گھوڑے کی پیٹھ پر سفر۔ اور آتے ہوئے بڑھاپے نے سلطان
ماء مضحل کر دیئے تھے۔ ان کا جگر خراب ہو چکا تھا اور موسمی بخار کے حملے ہوا
تھے۔ شاہی طبیب مجبور ہو کر انہیں آرام کا مشورہ دیتے۔ سلطان خاموشی سے
سننے مگر اس کے بعد ہی کوئی ایسا سفر درپیش آ جاتا کہ سلطان کو بخار کی حالت میں

پانی نہ مل سکے۔ یہی نہیں بلکہ آسمان کی چھت کے نیچے اپنے خیمے نصب کر سکیں۔
سلطان صلاح الدین میں یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے منصوبوں کو آخری وقت تک پورا
رکھتا تھا لیکن جب کسی منصوبہ میں فوج کا بھرپور تعاون چاہتا تھا تو اسے بے دھڑک بیان
دیتا تھا مگر اس بیان میں وہ اس قدر پر جوش ہوتا کہ پوری فوج اس کی ہمنوا ہو جاتی۔
چنانچہ سرداروں نے اس کے منصوبے کی تائید کر دی۔ ایک سردار نے کہا۔
”اگر سلطان یہ سمجھتے ہیں کہ عسقلان کسی وقت مشکلات پیدا کر سکتا ہے تو پھر ہاتھ
قربانی دے دیجئے۔ سلطان ہم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ ہم اس منصوبے کی پوری تائید کر
ہیں۔“

سلطان نے اپنے بیٹے افضل کو مخاطب کیا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ اس کام کی ذمہ داری الملک الافضل کو سونپ دیں۔ کیا خیال
تمہارا افضل؟“

شہزادہ افضل گھبرا گیا۔ عسقلان جیسے اہم اور بڑے شہر کو نیست و نابود کر دینا بڑے
گردے والے کا کام تھا۔ افضل نے اوب سے جواب دیا۔

”سلطان بابا کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں اپنے میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ عسقلان
پہنچ کر اس کی بربادی کا حکم دوں اور اس جہاں اور بربادی کو اپنی آنکھوں سے دکھ سکوں
سلطان کی آنکھوں میں ایک مضحل سی چمک پیدا ہوئی۔

”نادان افضل۔ یاد رکھو کہ یہ دنیا فانی ہے اور اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ اہم چیز
کے لئے نکلے ہیں اس میں تو اپنی سر کی بھی قربانی دینا پڑتی ہے پھر عسقلان کا شہر کیا چیز
شہر انسانوں کے آرام کے لئے کھڑے کئے جاتے ہیں پھر جب یہ شہر انسانوں کا راستہ
لگیں تو انہیں راستے سے ہٹانے کے لئے ان کا سر نیچا کرنا پڑتا ہے۔ اب کسی اور
اس کام پر مامور نہیں کروں گا اس لئے کہ وہ بھی اس انداز میں سوچ سکتا ہے جو
نے اٹھارہ کیا۔ لشکر کی سپہ سالاری میں ملک العادل کے سپرد کرتا ہوں اور میں خود
جا کر اس کام کو انجام دوں گا۔“

عسقلان کی بربادی بڑی دردناک تھی۔ جنگ میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب
کو اپنے گھر بار خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے پڑتے ہیں۔ سلطان اپنے دستوں کے
اٹھارہ شعبان کو عسقلان پہنچا۔ سلطانی لشکر کو دیکھ کر مسلمانوں کو بڑا اطمینان ہوا۔
جہاں اور قتل عام کا حال وہ پہلے ہی سن چکے تھے۔ انہیں کہہ کے سقوط کا غم تھا لیکن
شہر و قلعہ نے صرف ڈھائی سال تک صرف چار ہزار فوجیوں کی مدد سے جس بے جگر

گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرنا پڑتا۔

سلطان رک رک کے بول رہا تھا۔ عسقلان والے اب تک سلطان کے ارادے سے واقف نہ تھے۔ سلطان خاموش ہوا تو قاضی شہر نے باادب عرض کیا۔

”سلطان عالی مقام۔ اہل عسقلان آپ کو اپنے درمیاں دیکھ کر کس قدر مسرور ہیں اس کا بیان الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔“

”بزرگ محترم۔“ سلطان نے کہا۔ ”ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں۔ کاش اہل عسقلان جس طرح ہمارے آنے سے مسرور ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے عسقلان سے واپس جانے پر بھی مسرور رہیں۔“

پھر سلطان نے کچھ عجیب نظروں سے خیمہ کے سامنے جمع ہونے والے لوگوں کو دیکھا۔ قاضی شہر نے جواب میں عرض کیا۔

”اے بادشاہوں کے بادشاہ اور سلطانوں کے سلطان۔ یہ خادم آپ کے شہر عسقلان قاضی ہے اور آپ کو رات دن دعائیں دیتا ہے۔ یقین کیجئے کہ اہل شہر کو آپ سے اتنی عقیدت ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں اس جنگ کے دوران بھی اہل عسقلان اطمینان کی نیند سوتے ہیں اس لئے کہ ہمارا بادشاہ اور سلطان راتوں کو جاگتا ہے ہمارے لئے جنگ کرتا ہے۔ دوڑتا ہے دھوپتا ہے اور ہمارے پیوی بچے پیر پھیلا کر سو ہیں۔“

”اے قاضی شہر۔ اچھا ہوا کہ تم میرے مخاطب ہو۔“ سلطان نے چونک کے کہا۔ ”قاضی شہر۔ تم انصاف کی مسند پر بیٹھے ہو۔ ہم تمہارے سامنے ایک استغاثہ (مقدمہ) پیش کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تم اس کا فوراً انصاف کرو گے؟“

”عالی مقام سلطان۔“ قاضی نے سنبھل کے کہا۔ ”بلاشبہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو توسط سے مجھے انصاف کی مسند پر بیٹھنے کا اعزاز عطا کیا ہے اور میں پورے خلوص اور ایمان داری سے اسے نبھا رہا ہوں۔ سلطان محترم استغاثہ پیش فرمائیں میں فوری انصاف کر دوں گا۔ اس لئے کہ انصاف میں ذرا سی تاخیر بھی ظالم کو فائدہ اور مظلوم کو نقصان پہنچاتی ہے۔ قاضی شہر خاموش ہوا اور انتظار کرنے لگا کہ سلطان استغاثہ پیش کریں تو وہ انصاف

تقاضے پورے کرے۔ لیکن سلطان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے وہ وقت یاد آیا کہ اس نے اپنے بیٹے اور دوسرے سرداروں کو عسقلان کو برباد کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ فیصلہ سن کر گھبرا گئے۔ ان میں سے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ عسقلان جیسے خوبصورت بارونق شہر، بندرگاہ اور قلعہ کو برباد کرنے کی ہمکاری بھرے۔

”قاضی شہر سلطان کی استغاثہ کا شکر ہے۔“ آخر قاضی نے اس بڑھتے ہوئے سکوت کو آخر سلطان کو بولنا پڑا۔

”اے قاضی شہر۔ میرا استغاثہ یہ ہے کہ میرے لڑکے کے دائیں ہاتھ میں پھوڑا نکلا اور کے پورے ہاتھ میں زہر پھیل گیا۔ جراح نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر بچے کی جی بچانا ہے تو زہر زدہ ہاتھ کو کاٹ کر جسم سے الگ کرنے کا حکم دیا جائے ورنہ یہ زہر جسم کو بھی زہر آلودہ کر دے گا۔“

”میں نے جراح کو بچے کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیدیا۔ جراح نے ہاتھ کاٹ دیا اور بچے جان بچ گئی۔ اب بچے کی ماں الزام لگا رہی ہے کہ ہم نے اس کے بچے پر ظلم کیا ہے۔“

”محترم۔ فرمائیے آپ کا انصاف اس سلسلہ میں کیا کرتا ہے؟“

قاضی شہر نے چند لمحے سوچنے کے بعد اپنا فیصلہ دیدیا۔

”اے سلطان عالی مقام۔ اللہ عالم غیب ہے اور وہ نیتوں کا حال جانتا ہے لیکن ایک نیت اور ایک منصب ایسے معاملات میں صرف اس حدیث کو پیش نظر رکھتا ہے جس کے

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

”انما الاعمال بالنیات“

”زیر استغاثہ میں آپ نے بچے کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ بظاہر بڑا ظالمانہ ہے مگر اس کے وقت آپ کے پیش نظر اور آپ کی نیت یہ تھی کہ اس ظالمانہ حکم سے بچے کی جان بچ سکتی ہے۔ اس لئے آپ پر جرم ثابت نہیں کیونکہ آپ کی نیت نیک تھی۔“

مجمع سے کئی آوازیں قاضی کی تائید میں اٹھیں۔ مگر سلطان مطمئن نظر نہ آتا تھا۔ اس قاضی کو پھر مخاطب کیا۔

”قاضی محترم۔ جہاں تک حدیث مبارک کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مستند ہے لیکن تم نے اس کا جو اندازہ لگایا وہ غلط بھی ہو سکتا ہے یا پھر ظالم نیت کی غلط تعبیر کر کے جرم سے بچ سکتا ہے۔“

”سلطان معظم۔“ قاضی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”نسیاں، بشر کی فطرت میں داخل ہے کہ انسان صرف انسان ہے وہ فرشتہ نہیں ہو سکتا۔“

”درست فرمایا۔ قاضی شہر نے۔“ سلطان نے قاضی کی تائید کی۔ ”کیا قاضی محترم ت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کی سند پیش کر سکیں گے؟“

”ضرور۔۔ ضرور۔۔“ قاضی بیخ پڑا۔ ”سلطان عالی مقام۔ میں اپنے خدا سے دعا کر رہا ہوں کہ اے باری تعالیٰ تو میری نیت کو جانتا ہے اس لئے ایسے اسباب پیدا کر کہ میں سلطان اور اہل عسقلان کے سامنے سرخرو ہوں۔ ٹھیک اسی وقت مجھے حیات رحیول پاک کا وہ واقعہ یاد آگیا جو اس حدیث کی پوری تشریح کرتا ہے۔ وہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار سرکارِ دو عالم مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص منہ پر آیا وہ پیسے میں شرابور تھا۔ اس نے حضورؐ کو بتایا کہ اے رسول خدا آپ پر میرے باپ قربان۔ میں اس وقت فلاں فلاں کنویں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس کنویں پر قافلے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مسافر اپنے گھوڑوں کی نگاہیں پکڑے دھوپ میں کھڑے ہیں۔ میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ اگر کنویں کے پاس گھوڑے باندھنے کے لئے کچھ کھونٹے گاڑ دیئے جائیں تو کم از کم ان کے سوار اپنے گھوڑے باندھ کر کسی سائے میں جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ اس خیال کے تحت میں گھر سے دو کھونٹے لایا اور میر نے کنویں کے قریب گاڑ دیئے۔

حضورؐ مقبول نے اس کے اس فعل کو پسند فرمایا اور یہ بھی کہا کہ اس نے نیکی کا کام کیا ہے جس کا اسے اجر (ثواب) ملے گا۔

دوسرے دن ایک اور شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ اے رسول خدا! آپ پر میرے بال بچے قربان۔ میں اس وقت فلاں فلاں کنویں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ رہاں قافلے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کنویں کے قریب دو کھونٹے گڑے ہوئے ہیں۔ ان کا آدھا حصہ اندر اور آدھا باہر ہے۔ مجھے خطراً پیدا ہوا کہ اجنبی مسافر ان کھوٹوں سے ٹکرا کر زخمی ہو سکتے ہیں۔ پس میں نے دونوں کھوٹوں کو اکٹھا کر دو رو پھینک دیا۔

”حضورؐ نے اس شخص کے اس فعل کو پسند فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نے نیکی کا کام کیا ہے اللہ اسے اس کا اجر (ثواب) دے گا۔

حضورؐ کے سامنے بیٹھے ہوئے صحابہ کرام تقریباً وہی تھے جنہوں نے کل اس شخص کی باتیں سنی تھیں جس نے کنویں کے پاس کھونٹے گاڑے تھے۔ حضورؐ نے آج کھونٹے اکٹھا پھینکنے والے شخص کو جواب دیا اس سے صحابہ بہت حیران ہوئے۔

”اس شخص کے جانے کے بعد ایک صحابی نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اے سرکارِ دو عالم میری جان آپ پر قربان۔ کل ایک شخص کنویں کے پاس کھونٹے گاڑ آیا تھا تو آپ نے اس کے کام کو نیکی کہتے ہوئے اس ثواب کی نوید دی تھی اور جب یہ شخص ان کھوٹوں کو

”آپ لوگ مجھے اپنا امیر اور سلطان کہتے ہیں۔ آپ کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ میں فرنگیوں سے جنگ میں جو قدم بھی اٹھاؤں گا اس کا مقصد مسلمانوں کا مفاد ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پورا دول یورپ ارضِ فلسطین پر اٹھ آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اپنے قدیم کعبہ (بیت المقدس) سے جسے ہم نے حال میں نصرائیوں سے واپس لیا ہے۔ اس سے دستبردار ہو جائیں لیکن رب کعبہ کی قسم۔ صلاح الدین اپنی زندگی میں یہ نہیں ہونے دے گا۔ ہم بیت المقدس کی حفاظت کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ مسلمان اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں خون بہا رہے ہیں۔ طرح طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں۔

”اور اے الہیان عسقلان۔ اب یہ مقدس جنگ تم سے قربانی طلب کر رہی ہے۔ تمہیں بیت المقدس کی حفاظت کی خاطر قربانی دینا ہے۔ تم ہمیں یہاں دیکھ کر خوش ہوئے ہو کہ خطرہ کے وقت عسقلان کو بچانے کے لئے پہنچ گئے لیکن عسقلان کے شہر اور فوجیو۔ ہم تمہاری حفاظت کو ضرور آئے ہیں اس لئے کہ تمہاری حفاظت ہمارا فرض ہے لیکن تمہاری حفاظت سے زیادہ ہماری ایک ذمہ داری اور بھی ہے اور وہ ذمہ داری ہے بیت المقدس کی حفاظت۔ وہ بیت المقدس جو معراج نبوی کا پہلا زینہ تھی اور وہی بیت المقدس جہاں حضرت عیسیٰؑ، جہاں حلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ تشریف لائے تھے اور وہ بیت المقدس جہاں حضرت عیسیٰؑ، موسیٰؑ، یعقوبؑ و سلیمانؑ کے علاوہ اور بہت سے پیغمبروں کے مرقد ہیں۔

”اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں بیت المقدس کے لئے کس طرح قربانی دینا ہے۔

صبح کو سلطانی لشکریوں کے ساتھ شہر کے مزدور اور وہ جوان جو سلطانی لشکر میں ملازمت کے لئے آئے تھے یہ سب کے سب عسقلان کے دیدہ زیب شہر کو اس طرح گئے جیسے شہر کی گھیاں چھتے سے چمکتی ہیں۔ سلطان صلاح الدین باوجود شدید بخار کے گھوڑے پر سوار صبح سے شام تک عسقلان کی زمین کے برابر ہوتے دیکھتا رہا اور ضروری ہدایات بھی دیتا رہا۔ سلطان نے شہر کو کئی حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کے علاوہ فیصل کو ایک الگ حصہ قرار دے کر سب سے پہلے اس کی میٹنگ کنی کی گئی۔ اہل عسقلان صبح ہونے سے پہلے اپنا ضروری اور ہلکا سامان لے کر شہر سے نکل گئے تھے۔ ان میں زیادہ کا رخ مصر کی جانب تھا اور کچھ لوگ بیت المقدس کی طرف جا رہے تھے۔

اس سلسلہ میں ہباء الدین رقم طراز ہے:-
سلطان نے یہ ناگوار فریضہ اپنے لشکر کے سپرد کیا اور ان کی مدد کے لئے مزدوروں کی ایک کثیر جمعیت بھی مہیا کی۔

جب مزدور شہر میں داخل ہوئے تو گویا ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ شہر نہایت خوش منظر تھا اس کی فیصل مضبوط تھی اور مکان نہایت خوبصورت تھے۔ لوگوں نے اپنا وہ سامان جو وہ مضر ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے اونے پونے بیچ دیا۔ اس دن ایک درہم کی دس دس مرغیاں فروخت ہوئیں۔ اہل عسقلان اپنے اہل و عیال کو لے کر کمپ میں آگئے اور گھر کی باقی ماندہ چیزیں وہیں فروخت کر دیں۔ فوج تھکان سے خستہ تھی۔ سپاہیوں نے وہ رات خیموں میں بسر کی۔ اف خدایا یہ کتنی مصیبت کا وقت تھا۔

صبح ہوتے ہی سلطان نے فیصل کے انہدام کا کام شروع کرا دیا۔ سلطان نے شہر میں موجود غلہ کو مزدوروں میں تقسیم کر دیا۔ مزدوروں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکانوں کو آگ لگا دی۔ برجوں میں لکڑیاں بھر کر انہیں نذر آتش کر دیا گیا۔

سلطان کی طبیعت دو دن تک اتنی ناساز رہی کہ نہ وہ سواری کر سکتا تھا نہ کچھ کھ پی سکتا تھا۔ سلطان نے اپنا خیمہ فیصل کے قریب منتقل کرا لیا تھا۔ اس نے شہزادوں اور گدھے ہانکنے والوں کی بھی کام پر لگا دیا تھا۔ اس بخلت کی وجہ ظاہر تھی کہ اگر دشمن کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتا اور کام میں رخنہ اندازی ہوتی۔ عسقلان کی بربادی کبیر ملیسوں کو جافا میں پہنچی تو وہ ہنس دئے۔ رچرڈ نے جافا میں اپنے پہلی کانفرنس میں اعلان کیا۔

”معزز حاضرین۔ ترک عسقلان کو برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ہمارے خلاف نبو آزنا ہوش کر جرات نہیں اب ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہئے۔“

اس وقت ملیسوں کا رٹلا جافا تک آگیا ہے۔ یہ صلیبی لشکر ایشیا کے عیسائیوں کا نہیں بلکہ دہل یورپ کے تمام ترقی یافتہ ممالک کے لشکر اس میں شامل ہیں۔ شاہ رچرڈ انگلستان سے آیا ہے تو شاہ فلپ آگسٹس فرانس چھوڑ کر اس جنگ میں حصہ لینے آگیا ہے۔ یہ رٹلا اور یہ صلیبی لشکر دو تین دن میں عسقلان پہنچ جائے گا۔ ہم مکہ سے جافا تک ان پر برابر حملے جاری رکھے ہوئے ہیں ۶، ہم عسقلان کو بچا سکتے ہیں لیکن عسقلان کی حفاظت کرنے کی صورت میں ہمیں بیت المقدس کا دفاع کمزور کرنا پڑے گا۔ ہمیں بیت المقدس اور دوسرے اہم مقامات سے فوجیں ہٹا کر عسقلان کی حفاظت کے لئے فوجیں لانا ہوں گی۔

”ان حالات میں ہم بیت المقدس کا دفاع کمزور کر کے عسقلان کو بچا بھی نہیں سکتے اور عسقلان کو بے یار و مددگار چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ صلیبی رٹلا یہاں پہنچ کر عسقلان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور اہل عسقلان کا قتل عام کیا جائے۔ اسے لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے اس خوبصورت پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں کہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری۔“

”اے اہل عسقلان۔ یہ قربانی تو آپ کو دینا ہی ہوگی کیونکہ عسقلان اب اس زہریلے پھوڑے کے مانند ہو گیا ہے جسے جسم سے اس لئے کاٹا گیا تھا کہ باقی جسم زندہ اور محفوظ رہ سکے۔ اے قاضی شہر آپ اعلان کرا دیجئے کہ تمام لوگ بغیر رنگ و نسل عسقلان کو فوراً چھوڑ دیں۔ وہ جتنا سامان ساتھ لے جاسکتے ہیں لے جائیں۔ ان کے لئے بہترین پناہ گاہ مصر ہے اور پھر بیت المقدس۔ ہم دونوں مقامات پر یہ پیغام بھیج رہے ہیں کہ عسقلان کے مہاجرین کو وہی تمام مراعات دی جائیں جو مکہ سے مدینہ جانے والے مہاجرین کی دی گئی تھیں۔“

”اے ہمدرد قوم کے ہمدرد شہریو۔ جاؤ۔ اپنا سامان سمیٹو کیونکہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ عسقلان کو بنیادوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا جائے گا جیسے یہ شہر کبھی آباد ہی نہ تھا۔“
حاضرین اور سامعین پر اس قدر سناٹا طاری تھا کیسے وہاں ایک تنفس بھی موجود نہ ہو۔ صرف ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

سلطان صلاح الدین خاموش ہوا تو قاضی شہر نے ننناک آنکھوں سے کہا۔ ”خدا کی قسم۔ عسقلان کا ایک پتھر اکھڑنے کے بجائے میری ساری اولاد مر جاتی لیکن اب کیا کریں۔ یہ امر مجبوری ہے۔“

وہاں جمع ہونے والی خواتین کی سسکیاں پہلے ہلکی چیخوں پھر نالہ و فریاد کی صورت اختیار کر گئیں لیکن انہوں نے کوئی فریاد نہ کی اور روتی ہوئی اپنے گھروں کو واپس ہو گئیں۔

ہیں۔ قیسریہ یہ شہر خالی اور خاموش تھی۔ فضا اس گھر پر سکون تھی۔ ہمارا بیڑا قیسریہ پہنچا۔
ر مکہ سے سامان رسد اور باقی اڑکوں کو لے آیا۔

ایک اور تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ ہماری فوج جنگوں کے دریا کے کنارے خیمہ زن
ٹی۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا تھا کہ ہمارے دو آدمی اس دریا میں نہانے ہوئے مگر چھوٹ
کے شکار ہو گئے تھے۔ قیسریہ بہت بڑا شہر ہے اور اس کی عالیشان عمارتیں اعلیٰ ضاعی کا
نہ ہیں ہمارے آقا اور مولا یسوع مسیح اکثر یہاں اپنے حواریں کے پاس آیا کرتے تھے اور
ہوں نے یہاں کئی معجزے دکھائے تھے۔ اب ترکوں نے (سلطان کے لشکر نے) شہر پناہ کی
حصہ اور برج منہدم کر دیئے تھے۔

قیسریہ سے فوج ساحل کی اندرونی جانب ہٹ گئی کیونکہ پہاڑوں کا پر خطر سلسلہ ساحل
، دور چلا گیا تھا۔ سرداروں نے شاداب زمین، بشمال اور کنوؤں سے گزرتی ہوئی راہ
یار کی۔

عیسائی فوجیں قیسریہ سے روانہ ہوئیں تو اس کے عقب میں مسلمان رسالہ نمودار ہوا
الٰہی فوج کا ساتھ ان کے حملوں اور تیروں کی بوچھاڑ سے سخت پریشان تھا۔ رچرڈ نے یا
نے مشیروں نے ایسی ترتیب کی پر جوش دشمن کے حملے کا گر نہ ہوئے۔

عیسائی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جو لشکر پہاڑوں سے قریب اور مسلمانوں
، حملے کی زد میں تھا۔ اس میں صرف صف بند پیدل فوج رکھی گئی تھی۔ اس فوج کے
نی حصہ پر تیر انداز مقرر کئے گئے تھے۔ یہ تیر انداز نندے کی قیسیں اور زرہ بکتر پہنے
ئے تھے۔ وہ حملہ آوروں پر برابر تیر برساتے رہتے۔ زرہ اور نندے کی قیصوں کی وجہ
حملہ آور تیران پر کارگر نہ ہوتے تھے۔

تیر اندازوں کی قطاروں کے اندر نیزہ بردار اور شمشیر زن سپاہی تھے جو ہر وقت دشمن
خلاف ڈٹ کر لڑنے کے لئے کمر بستہ رہتے تھے۔ پیادہ فوج کی حفاظتی سپر کے اندر دوسرا
رداں تھا۔ اس حصہ میں نائٹ اور سوار تھے اور لشکر فوج کی اصل تھا۔ یہ حصہ دشمن
یورش اور تیر اندازوں سے محفوظ تھا۔ ورنہ رسالوں کی گھوڑوں کا بہت نقصان ہوتا۔

سمندر سے قریب اور مسلمانوں کی دسترس سے دور تیسرا لشکر تھا۔ اس لشکر میں
اں، سامان رسد، مال و اسباب، مجرین اور مریض شامل تھا۔ یہ لشکر مزے سے رواں
تھا۔ ہر کیف تیسرے لشکر کے دستے مقررہ وقت کے بعد باری باری پہلے لشکر کے
اں سے تبدیل کر دیئے جاتے تھے تاکہ انہیں آرام مل سکے۔

پہلے دن لڑائی دوپہر تک جاری رہی اور چلیچلاتی دھوپ میں فریقین کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

لیکن جانا سے باہر کوئی نہیں نکلا۔ زیتون کے درختوں پر ملیسیوں کی جھنڈے لہراتے
رہے۔ شمال کی خنک ہوا چلتی رہی اور نہر کے شاداب کناروں پر ملیسیوں نے گھوڑے
چرتے رہے۔ صلیبی لشکر انجیر، انگور اور بادام کھاتے رہے اور جانا کے محلوں میں آرام
کرتے رہے یا پھر ٹولیوں کی صورت میں کشتیوں پر بیٹھ کے مکہ پہنچ گئے ڈھائی سالہ بربادی
کے بعد ملیسیوں نے اس پر قبضہ کرتے ہی اسے عشرت کدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ قرب و
جوار ہی نہیں بلکہ پورے یورپ تک سے وہاں خوبصورت عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ
عورتیں ان عشرت گاہوں میں صلیبی سپاہیوں کی مفت میں دلداری کرتی تھیں۔ ان کے
خیال میں یہ کار ثواب تھا۔

جانا میں مقیم صلیبی اس بات پر بحث کرتے تھے کہ انہیں اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر یہ
طے پایا کہ جانا کی دیواروں کی پہلے مرمت کرنا چاہئے۔

مغربی افسانہ طرازوں نے اوسوف کی جھڑپ کو ایک معرکہ عظیم قرار دیا ہو حالانکہ
مورخین اسے جنگ کا نام میں نہیں دیتے اور اس کا ذکر ایک جھڑپ کی طرح کرتے ہیں۔
دراصل انہیں رچرڈ کو شیردل رچرڈ بنانا تھا اس کے لئے انہوں نے اوسوف کی ایک عام
جھڑپ کو ایک خوفناک جنگ بنایا اور اس کی تفصیل بیان کرنے میں کتنے ہی صفحات کالے کر
ڈالے ہیں۔ مغرب والوں نے اس جھڑپ کو اس لئے منتخب کیا کہ اس میں رچرڈ کو خود اپنے
دفاع کے لئے تلوار اٹھانا پڑی تھی۔

بس رچرڈ کا ہاتھ میں تلوار پکڑنا تھا کہ وہ تیسری صلیبی جنگ کا ہیرو اور ”شیردل رچرڈ“
بن گیا۔ آئیے پہلے اس جھڑپ اور بقول مغربی افسانہ طراز معرکہ عظیم کا حال ہیرلڈیم کی
زبان سے سنتے ہیں اگرچہ ہم اس کی پوری تفصیل تو بیان نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس کے
لئے پندرہ بیس صفحات درکار ہوں۔ چنانچہ ہم اسے اختصار سے کام لیتے ہوئے پیش کرتے
ہیں۔

اوسوف قیساریہ اور عسقلان کے درمیان ایک آبادی تھی جس کا ذکر تاریخوں میں
محض مسلمانوں اور عیسائیوں کی اس جھڑپ کی وجہ سے ہوا۔
ہیرلڈیم اس جنگ کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:-

فوج پڑھنی گئی۔ ساحل سنان تھا۔ کہیں بھیڑیں چنی و کھنی دیتی تھیں۔ فضا خاموش
تھی اور چہتی ہوئی زمین سے گرد بھی نہ اڑتی تھی۔ خاردار جھاڑیاں جھلس کر سیاہ ہو چکی

میں ذریعہ کی طرح بکھیر دیتے۔

ہرچہ اس خطرے سے آگاہ تھا۔ اس نے اس نے تاکید کی تھی کہ خواہ کتنا ہی اشتعال کیوں نہ آتا جائے وہ ہرگز صف بندی نہ چھوڑیں اور صفیں حملے کے اعلان کا منتظر رہنا چاہئے۔

اس دن فوج گنجان دستوں کے جم غفیر کی صورت میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی جیسے کوئی غریب تیروں اور بھالوں کی صفیں۔ بے پردا ہو کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہو۔ ٹپل مقدسہ الجیش میں تین تین کے پیچھے برہنہ کا لشکر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ برہنہ دراصل فرانس کا ایک صوبہ ہے اور وہاں کے لوگ برہنہ کھلاتے ہیں ان کا برطانیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ فرانس کا ایک صوبہ تھا۔

ان کے پیچھے گائی لوگسٹائی کی سرکردگی میں اہل پوشو۔ سنے مارچ کر رہے تھے۔ پوشو بھی فرانس کا ایک علاقہ ہے۔ ان کے پیچھے برطانوی اور نارمن سردار شاہی نشان لئے رواں تھے۔ ساری فوج کے عقب میں سیاہ پوش ہاسٹلر تھے جو ترکوں کی پییم یورش کا شکار ہوئے۔ شاہ رچرڈ اور ڈیوک آف برگنڈی صفوں کے درمیان میں سے گھوڑے دوڑاتے گزرے اور انھوں نے لشکر کو حوصلہ دیا۔

ڈیو ونسوف نامی مددگار کا بیان ہے کہ ہماری فوج کے عقب میں ایک شدید گرج نائی دی۔ گویا دشمن گرزوں سے سرب لگا رہا ہو۔ دشمن ہمارے عقبی دستوں سے یوں الجھ گیا کہ وہ اپنے جرمکان نہ استعمال کر سکے۔ دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ جب ترکوں کی تلواروں کی ضرب ان کی زربوں پر پڑتی تو یوں گونج اٹتی جیسے لوہے کو ہتھوڑے سے لوٹا جا رہا ہو۔ وہ گرمی سے بے حال ہو رہے تھے۔ انھیں دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ ہاسٹلر کی آخری صفیں ترکوں کے حملے کی تاب نہ لا سکیں اور بری طرح پکلی گئیں۔ وہ مایت حوصلے اور استقلال سے ڈٹے رہے اور بھاری نقصانات اٹھانے کے باوجود انھوں نے اپنی مقررہ پیش قدمی جاری رکھی۔

ترک فخریہ انداز میں تھرے لگائے ہوئے انھیں لکارتے۔

”ہم فولاد ہیں اور کوئی ضرب ہم پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

پھر تقریباً بیس ہزار ترک ہمارے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس خوفناک حملے سے گھبرا کر ارنیڈی لیپاز جو ہاسٹلر کا ایک سردار تھا بے اختیار چلا اٹھا۔

”المدد مدد جارج المدد۔ کیا تمہیں وارہ ہے کہ ہم یونہی روندے جائیں۔“

یہ دیکھ کر ہاسٹلر کا قائد۔ آ۔ شاہ رچرڈ نے پاس پہنچا اور عرض کیا۔

عیسائی فوج ریتلے ٹیلے عبور کر کے ایک تنگ گھاٹی میں جا پہنچی۔ مسلمانوں نے پڑی ہوئی تیاری سے یہاں کمین گاہیں بنائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے عیسائی ہراول دستوں کو گھیرے میں لینے کے لئے کئی پھندے لگائے تھے اور انہیں شاخوں سے چھپا دیا تھا لیکن ٹپل مسلمانوں کی چال کو بھانپ گئے۔ انہوں نے اپنی پیش قدمی روک دی اور دریا کے کنارے خیمہ زن ہو گئے۔ وہاں کا پانی اچھا تھا۔ عیسائیوں نے اس دریا کا نام ”دریائے مردار“ رکھا۔ دوسرے دن ہماری فوج ایک لٹل وڈل میدان سے گزری۔ ساتھ پر ٹپل متعین تھے۔ ترکوں کے پییم حملوں سے سخت پریشان ہوئے۔ ان کے پیشتر گھوڑے مارے گئے۔ شاہ رچرڈ نے ترکوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن اس معرکے میں اس کے پہلو میں برچھی کا ایک سخت زخم آیا۔ الفرس ہمارے بے شمار گھوڑے دشمن کے نیزوں اور برچھیوں سے زخمی ہوئے۔ ہماری فوج نے نمکین دریا کے قریب کہا۔ جہاں ہمدہ گھوڑوں کا گوشت خریدنے کے لئے بے پناہ ہجوم ہو گا۔ وہاں اس قدر ہنگامہ ہوا کہ کئی خریدار آپس میں جھگڑا ہو گئے۔ جب بادشاہ کو اس ہڑبازی کی خبر ملی تو اس نے نقیب کے ذریعہ ساری فوج میں اعلان کیا کہ جس کا گھوڑا مرا ہے اسے بادشاہ کی طرف سے گھوڑا دیا جائے گا بشرطیکہ وہ اپنے گھوڑے کا گوشت اپنے ماتحتوں یا ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔

تیسرے دن ہماری فوج نے نمکین دریا سے کوچ کیا اور صف بستہ ہو کر بڑھی۔ اس دن یہ افواہ گرم تھی کہ جنگل میں ترک گھات لگائے بیٹھے ہیں اور موقع پا کر ہمارے ارد گرد جھاڑیوں کو آگ لگا دیں گے لیکن ہماری فوج بڑے نظم و ضبط کے ساتھ مفروضہ کمین گاہوں سے نکل کے کھلے میدان میں آگئے۔ وہاں جاسوس خبر لائے کہ آگے ترکوں کی بے شمار فوج راستہ روکے پڑی ہے۔

صلاح الدین اور ملک العادل نے یہ میدان جنگ کے لئے منتخب کیا تھا اور دو دن تک سلطانی رسائی سواروں کو پیادوں کے حفاظتی حلقے سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بے سود۔ عیسائی سوار کھلے میدان میں لڑنے کے آمادہ ہوئے۔

مسلمان فوج سواروں پر مشتمل تھی اور اسے رسالہ پر کم از کم پانچ گنا عدوی فوقیت حاصل تھی (اس سفید جھوٹ کو کیا کہا جائے۔ رچرڈ کے ساتھ تقریباً تین لاکھ کا لشکر تھا۔ فساد طراز کے خیال کے مطابق پھر سلطان کی فوج پندرہ لاکھ ہونا چاہئے) مسلمان فوج کا مقصد صلیبی سواروں کے حفاظتی حلقے میں انتشار پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے صلیبی فوج کو پیادوں کے حفاظتی حلقے سے نکلنے کی بار بار ترغیب دی لیکن عیسائی فوج اپنی جائے پناہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئی۔ اگر وہ اپنی جگہ چھوڑ دیتے تو ترک انہیں میدانی علاقہ

”بادشاہ سلامت۔ دشمن نے ہمارا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم منہ موڑ کر ازلی بدبختی کا شکار نہ ہو جائیں۔ بے شمار گھوڑے دشمن کے تیروں کا نشانہ ہو چکے ہیں۔ آخر ہم ہی اکیلے دشمن کا حملہ کیوں روکیں؟“

”اچھے ٹائٹ۔ یہ حملہ آپ ہی کو روکنا ہے پڑے گا۔ کوئی شخص بھی ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتا۔“ رچرڈ نے اسے جواب دیا۔

جب ہاسٹل خاموشی سے واپس ہوا تو کوئی شہزادہ اور کاؤنٹ ایسا نہ تھا جس کا چہرے ندامت اور شرمندگی سے سرخ نہ ہو گیا ہو۔

وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”کیوں نہ گھوڑے دوڑا کر دشمن پر حملہ کیا جائے؟“

یہ سنتے ہی دو جوشیلے ٹائٹ آگے بڑھے۔ وہ مزید تاخیر برداشت نہ کر سکے۔ ان کی غلٹ پسندی سے دوبارہ اتھری پھیل گئی۔ وہ گھوڑے اڑاتے ترکوں کف صفوں پر بھجے اور دونوں نے اپنے اپنے مد مقابل کو چھید دیا۔ ان میں ایک ہاسٹلوں کا مارشل تھا اور دوسرا بالڈون ڈیکرو تھا۔ مورخ الذکر بڑا اچھا آدمی تھا اور شاہ رچرڈ کا مصاحب۔

جب عیسائیوں نے ان دو منجھلے سرداروں کو یوں بہادری سے دشمن پر چھینٹے ہوئے دیکھا اور ”نیٹ جان مد“ کا نعرہ سنا تو انہوں نے بھی ہانکیں اٹھائیں اور نہایت جوش و خروش سے دھاوا بول دیا۔ اب ہاسٹلوں کے بھی حوصلے بڑھے ورنہ دن بھر کی پورش سے ان کی صفوں میں اتنی بھیڑ لگ تھی کہ وہ پریشان تھے۔ تب انہوں نے بھی پیش قدمی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کا پچھلا حصہ آگے اور اگلا حصہ پیچھے ہو گیا یعنی ہاسٹلز جو عقب میں تھے اب مقدمہ الجش بن گئے تھے۔

کاؤنٹ آف ٹیمپن اپنے منتخب بہادروں کے ساتھ حملے میں پیش پیش تھا۔ جیمز ڈی ایویز، بشپ آف بولیس اور اول آف لیئر نے سمندر کی سمت سے یعنی بائیں جانب سے شدید حملہ کیا۔ ترک ہمارے سپاہیوں کو اپنے تیروں سے ٹھیک نشانہ لگانے کے لئے گھوڑوں سے اتر کر پایادہ لڑ رہے تھے۔ چنانچہ وہ ہمارے حملے کی تاب نہ لا سکے اور کٹ کٹ کر مرنے لگے۔ ہمارے پیادے انہیں گرا دیے اور پیادے ان کا کام تمام کر دیے۔

جب شاہ رچرڈ نے اپنی فوج کی تیز حرکت دیکھی تو وہ بھی ہاسٹلوں کے درمیان سے اپنا گھوڑا دوڑاتا ترک پیادوں پر جا پڑا۔ رچرڈ اور اس کے سرداروں کی خار اشکاف ضربوں سے ترک پیادے گھبرا گئے اور ان کے لئے راستہ کھلا چھوڑ کر دائیں بائیں بھاگنے لگے۔ زمین کشتوں سے پٹ گئی۔ دوست و دشمن بلا تمیز روندے جا رہے تھے۔ سواروں کے بغیر

بے غول در غول بھاگے جا رہے تھے۔

اف لڑائی ان لوگوں کے تصور سے جو خانقاہوں میں مراقبہ میں غرق رہتے ہیں کس مختلف اور بھیانک ہوتی ہے۔

اس معرکے میں ہمارے بادشاہ نے اپنی غیر معمولی شجاعت سے دشمن کی صفوں میں کر کے اپنے لئے ایک کشادہ راہ بنا لی۔ وہ اپنی شمشیر آبدار سے ترکوں کی صفوں کو کاٹتا ہوا نکل گیا جیسے کوئی پکی ہوئی فصل کو درختی سے کاٹتا چلا جائے (اس فضول تعریف انام دیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکوں کی صفیں نہیں بلکہ بھیڑ بکریاں تھیں) چنانچہ کے سپاہی مرعوب ہو کر رچرڈ کے راستے سے ہٹ گئے۔

کافی دیر تک لڑائی غیر یقینی رہی۔ کئی نشان سرنگوں ہوئے اور کئی جھنڈے تار تار۔ مودی تلواریں زمین پر بکھر گئیں اور خون کی ندیاں بہتی رہیں لیکن لڑائی کا فیصلہ نہ ترک میدان چھوڑنے لگے۔ کئی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جو درختوں پر چڑھے وہ زوں کا نشانہ بن گئے۔ انہیں بند لگتے اور وہ کراہتے ہوئے زمین پر آ رہے تھے۔ کئی لوہوں کو چھوڑ کر پھسلاؤں پگھندلیوں پر بھاگ نکلے۔ دو میل تک سوائے بھگوڑوں کے نہ نظر نہ آتا تھا۔

مارے سپاہی دشمن کے تعقب سے ہچکچائے اور رک گئے۔ بھگوڑوں کی تعداد تقریباً بارہو گی۔ جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو ان کی ہمت بندھ گئی۔ انہوں نے اپنی کو دوبارہ منظم کر کے ہمارے عقبی دلوں پر جو واپس جا رہے تھے اچانک حملہ کر کے ہمارے دستوں پر یہ کتنی خوفناک پورش تھی وہ دشمن کے زرنے میں پھنس گئے۔ طرف سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں وہ اپنی پر جھک گئے۔ گھوڑے بد کے اور سواروں کو گرا گرا کر بھاگنے لگے۔ ترکوں نے لشکر پر سخت جوابی حملہ کیا تھا۔

لوں کا قائد امیر تقی الدین تھا جو سلطان کا عزیز تھا اور سات سو منتخب بہادر تقی کے ہرکاب تھے۔ یہ دستہ صلاح الدین کے لشکر کا حصہ تھے۔ ہر دستہ زرد علم بلند نے بڑھا۔ وہ مرواگی کے خوفناک پیکر تھے۔ جب انہوں نے اپنے نازی گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے حملہ کیا تو ہمارے سردار عزم و استقلال کے باوجود ان کی بے پناہ تاب نہ لا سکے۔ اب لڑائی بہت خوریز اور خوفناک ہو گئی۔ دشمن بھی کچلنے کی بے ل کر رہا تھا اور ہم دشمن کو پیچھے دھکیلنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ دیکھ کر کہ بادشاہ اپنے قبرصی کیت (گھوڑا) پر سوار ہوا اور دشمن پر جھپٹا۔ اسے

مخالفوں کو منتشر کر دیا اور اس کی شمشیر کی ضرب سے کئی افراد پاش پاش ہو گئے۔ اس سامنے دشمن نہ ٹھہر سکا۔ اس طرح سے ہماری فوج کو چھٹکارا ملا۔

پھر ہم نے اوسوف کا رخ کیا اور شہر پناہ کے باہر خیمے نصب کئے گئے۔ ابھی ہم نصب کرنے میں مصروف تھے کہ ناگاہ دشمن کی ایک کثیر جمیعت نے ہمارے عقبی دستوں دوبارہ بلہ بول دیا۔ رچڑ صرف پندرہ سواروں کے لے کر دوڑا اور ترکوں کے مقابلہ میں ڈٹ گیا۔ انہوں نے زور کا نعرہ لگایا۔

”یا مزارا مسیح۔۔۔ الدرد۔۔۔ الغیث۔“

جب ہمارے سپاہیوں نے یہ نعرہ سنا تو وہ بھی تیزی سے بادشاہ کی طرف بھاگے۔ انہ نے ترکوں پر حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔

ہماری فوج دن بھر کی تکان سے چور تھی۔ اس رات وہ آرام سے سوئے۔ لوٹ طلبگار چپکے سے میدان کارزار کو چلے گئے۔ واپس آکر انہوں نے بتایا کہ ہم نے بیس ترک سواروں کی لاشیں خود گئی ہیں۔ ترک بھی اپنے سرداروں کی لاشوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

ہمیں جبرہ ڈی ایوز کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اتوار کو ہاپٹل اور شپل کی سردار نے مسلح ہو کر اس کی تلاش شروع کی۔ بالکل انہیں اس کی لاش مل گئی۔ اس کا چہرہ ہوئے خون سے اس قدر مسخ ہو چکا تھا کہ شناخت مشکل تھی۔ وہ اس کی لاش کو بد احترام سے کفن میں لپیٹ کر اوسوف لائے۔ سپاہیوں کے ایک جم غفیر نے باہر نکل کر اس کے جنازے کا استقبال کیا۔

اس طرح صلاح الدین کی ملیسوں کو کھلے میدان میں شکست دینے کی کوشش نا ہوئی۔ رچڑ کے حکم کے خلاف جب دو نائٹوں نے اچانک حملہ کیا اور عیسائی رسالہ نے کی متابعت کی تو مسلمان گھبرا گئے اور مسلمان لشکر کو بھاری نقصان اٹھا کر ہٹاؤں کی میں پسپا ہونا پڑا۔ اس حملے میں مسلمانوں کو پہلی مرتبہ رچڑ شیر دل کی غیر معمولی شجاعت سے سبقت پڑا تھا۔

تقی الدین اور ترک امیروں نے جوابی حملوں سے صلیبی لشکر کو بہ علت تمام اور کے باغات اور مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسرے دن صلاح الدین نے نفس میدان جنگ میں آیا۔ لیکن ملیسوں کو مقابلہ میں آنے کی جرات نہ ہوئی۔ یہ بیان تھا بیرلڈیم کا اوسوف کی جھڑپ کے متعلق جسے پہلے اس نے معرکہ عظیم دیا۔ پھر اوسوف میں مسلمانوں کی شکست کا اعلان کیا اور آخر میں خود ہی لکھتا ہے۔

اوسوف کی چپقلش کو باقاعدہ لڑائی نہیں کہا جا سکتا اگرچہ سلف کے چند مورخوں نے سے فیصلہ کن لڑائی قرار دیا ہے۔

پھر رچڑ نے جافا میں اپنی پہلی کانفرنس میں اعلان کیا۔ ”معزز سردارو۔ ترک عسقلان کو برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ہمارے خلاف نبرد آزما بننے کی جرأت نہیں۔ ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہئے۔“

مگر رچڑ کے اعلان پر کسی نے کان نہ دھرے۔ نہروں کے شاداب کناروں پر گھوڑے بے سے چرتے رہے اور صلیبی بڑے شوق سے کہے ہوئے انگور اور تازہ انجیر اور بادام کھاتے رہے۔ بہت سے کشتیوں کے ذریعہ مکہ کی عشرت گاہوں میں پہنچ گئے جہاں یورپ کے حسین عورتیں ان کا دل بہلانے اور داد عیش لینے آئی تھیں۔

شاہ رچڑ نے قبرص میں بڑی دھوم دھام سے شہزادی برنگیرا سے شادی کی تھی مگر جب ناہ قبرص سے مکہ آیا تو پتہ نہیں یہاں بیوی میں کیا بیچ پڑ گیا کہ رچڑ برنگیرا سے کھینچا نچا رہنے لگا۔ شاہ باز۔ طنی شہزادی سون کو بھی مکہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ سون کو اپنے رتبہ کا احساس ہو گیا تھا۔ اسے رچڑ اور برنگیرا کی شادی کے دن ہی معلوم ہو گیا تھا کہ با اس کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہیں ہے پھر وہ تن بہ تقدیر رچڑ سے چٹنی رہی اور لی حرف شکایت زباں پر نہ لائی۔

ہو سکتا ہے کہ سون کی یہ بے زبانی ہی اسکی سفارش بن گئی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مکہ کے محاصرے کے دوران جب شاہ رچڑ بظاہر بیمار تھا، وہ اکثر شہزادی سون کو اپنے خیمے میں بلایا کرتا تھا۔ سون اسی لشکر میں جس لشکر میں برنگیرا تھی۔ رکھی گئی تھی ان رچڑ نے تمام سپرداروں کو تائید کی تھی کہ سون اور برنگیرا جو ملکہ انگلستان ہو چکی ہو، کو ایک دوسرے کی خبر نہ ہونی چاہئے۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی پڑاؤ میں جب شہزادی سون کو طلب کیا جاتا اور وہ دل کی طویل غلام گردشیں طے کرتی شاہ رچڑ کے عالیشان خیمہ میں پہنچتی تو اسے کوئی نہ پاتا۔ محافظ ’لوئڈی‘ غلام ہر دوسے تیسرے دن یہ تماشہ دیکھتے لیکن اپنی آنکھیں بند اور ان پر تالے لگا لیتے تھے۔

شاہی محلات (یہ محلات خیموں، چھولہ اریاں اور قناتوں کے تھے کیونکہ رچڑ کی لشکر گاہ کے باہر میدان میں تھی) میں سازشیں اور ریشہ دوایاں تو ہوا ہی کرتی ہیں مگر میدان کے یہ محلات بھی اس بدعت سے پاک نہ تھے۔ ملکہ اور شہزادی کی اپنی اپنی خاص عورتیں جو جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کنیزوں کی اپنی

ماکنوں کی نظر میں اس وقت تک قدر رہتی ہے جب تک وہ ماکن کو روز کوئی نئی خبر پہنچ رہیں۔ اس طرح ان کینزوں کو اپنی کارکردگی برقرار رکھنے کے لئے سچ سے زیادہ جھوٹ سارا لینا پڑتا تھا اور یہی جھوٹ سازشوں کو جنم دیتا تھا۔

شاہ رچرڈ کے ساتھ اس کی بہن جین اور بیوی برٹگیرا تھیں مگر ان دو کے علاوہ اہم تیسری اہم شہزادی سوسن کی تھی۔ جو باوجود ”داشتہ“ ہونے کے شاہ رچرڈ کے ذہن پر چڑھ ہوئی تھی۔ شاہ نے اگرچہ ان دو پارٹیوں کو الگ الگ رکھا تھا اور اس کا خیال تھا کہ شہزاد سوسن اور ملکہ برٹگیرا ایک دوسرے کے حالات اور واقعات سے قطعی ناواقف ہیں۔ حالاً ہر رات جب سارا عالم سوتا تو برٹگیرا اور سوسن کی منہ چڑھی کینزیں اپنی ماکن کے خاں کمرے میں (خیال رہے یہ کمرے بھی غیموں کے اندر قاتلوں سے بنائے جاتے تھے) واہ ہوتیں اور دن بھر کی تمام جھوٹی سچی رام کہانی سنا کر انعام حاصل کرتیں۔

خود شاہ رچرڈ میں جاسوسی کے اس عیب سے خالی نہ تھا۔ اس کی بھی کچھ خاص کینز تھیں جنہیں اس نے ملکہ برٹگیرا اور شہزادی سوسن کی خدمت پر اس لئے مامور کیا تھا کہ دن بھر کا دیکھا سنا، بادشاہ کو سنایا کریں۔ اس سلسلہ میں ایک بات بہت دلچسپ ہے اور اقسام کے واقعات آج بھی پیش آتے ہیں جنہیں ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں۔ یہ واقعات جاسوس کی غداری کے ضمن میں آئے ہیں یعنی جاسوس کو جس کام کے لئے مقرر کیا جا وہ اس کے خلاف کام کرے۔

اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ شاہ رچرڈ کی جو کینز ملکہ برٹگیرا کی خدمت پر مامور تھیں وہ برٹگیرا کی جاسوسی شاہ رچرڈ سے کرتی اور شاہ رچرڈ کی ایک ایک بات نمک مرچ کر برٹگیرا کو سناتی تھی اس طرح وہ دونوں کی نظروں میں معتد اور معتبر تھی۔ یہی شہزادی سوسن کے پاس خدمت کے لئے بھیجی جانے والی کینزیں کرتی تھیں۔ شہزادی سوسن جس قدر حسین اور جاذب نظر تھی اتنی ہی زیادہ وہ عقلمند بھی تھی اور اس کی اس عقلمندی نے اسے شاہ رچرڈ کے ساتھ سمجھوتہ کرانے پر آمادہ کیا تھا ورنہ عام عورت تو کسی بادشاہ کی داشتہ بننے پر فخر کر سکتی ہے مگر شہزادی کا مرتبہ بھی تقریباً بادشاہ کے برابر ہوتا ہے وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ اسے داشتہ بنا کر رکھا جائے جبکہ اس کی شادی کسی شہزادہ شاہ سے ہو سکتی ہو۔

ایک صبح شاہ رچرڈ کے محل میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ کینزیں اور غلام ادھر ادھر بھاگ تو رہے تھے مگر ان کی زبانیں سر بھر تھیں مزاج شاہ برہم ہے اور جب شاہ کا منہ برہم ہو جائے تو پھر کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں رہتی شاہ کا مزاج برہم کرنے والا کوئی بھی ہو

اس کا سارا غصہ کینزوں اور غلاموں پر اترتا ہے۔ اس وقت بھی کچھ ایسی بات تھی۔ شاہ رچرڈ صبح بیدار ہوا تو الجھا الجھا سا تھا۔ ادھر ادھر سے جھانکتی ہوئی کینزوں نے فوراً اندازہ کر لیا کہ آج دو چار غلاموں اور کینزوں کا پتہ کٹ جائے گا اور کوئی پنہ نہیں کہ ایک دو غلاموں اور کینزوں کو سولی پر چڑھا دیا جائے۔

شاہ نے تکیہ سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا پھر شیر کی طرح دھاڑا۔ ”کینز کہاں ہے؟“ شاہ رچرڈ کی یوں تو کینزوں اور غلاموں کی ایک پوری فوج تھی مگر ان میں دو کینزیں اور دو غلام خاص تھے۔ جس میں ایک غلام اور ایک کینز دن میں اور ایک کینز اور ایک غلام رات کو خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کی خوابگاہ کے دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ دائیں دروازے پر ایک کینز اور بائیں پر غلام کی حاضری رہتی تھی۔ یہ غلام اور کینز دن یا رات جس وقت بھی ان کی ڈیوٹی ہوتی یہ خوابگاہ پر پہنچ جاتے اور دروازے کے باہر اپنی ڈیوٹی سنبھالتے تھے۔ یہ دونوں دن ہو کہ رات دروازے سے لگے کھڑے رہنے یا ٹہلنے رہتے۔ انہیں بیٹھنے یا ٹیک لگا کے کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ خوابگاہ کے محافظ ان کینزوں سے بیس بیس فیٹ دور کھڑے ہو کر پہرہ دیتے تھے۔ شاہ رچرڈ کی دھاڑ خوابگاہ کے باہر پہنچی تو دروازے سے لگی ہوئی کینز کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آداب بجالائی۔

”ہم نے تمہیں حکم دیا تھا۔ تم کیوں بولیں؟“ شاہ رچرڈ تکیوں کے سارے بیٹھ چکا تھا۔

کینز کو پسینہ آگیا۔ اس کا پورا بدن لرزنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ شاہ نے اسے کوئی بھی حکم نہ دیا تھا۔ وہ ابھی ابھی تو آئی ہے اور رات کی کینز کو رخصت کر کے اس نے بڑی احتیاط سے ڈیوٹی سنبھالی تھی۔ شاہ کی یہ پہلی آواز تھی۔ پھر اس نے حکم کس وقت دیا۔

”عالیجاہ۔“ کینز نے لرزتے ہوئے کہا۔ ”کینز ابھی ابھی اپنی خدمت پر حاضر ہوئی ہے۔“ کینز اس سے زیادہ وضاحت نہ کر سکی۔ وہ قتلون مزاج شاہ سے واقف تھی۔ اس سے بحث کرنا موت کو دعوت دیتا تھا۔

”تم سے پہلے کون کینز تھی؟“ رچرڈ کا لہجہ اسی طرح کھردرا تھا۔

”شالی تھی عالیجاہ شالی۔“ کینز نے جلدی سے جواب دے کر جان چھڑائی۔

”اے پیش کرو۔“

رچرڈ نے حکم دے کر پھر تکیہ پر سر رکھ دیا۔

کنیز فوراً باہر نکل گئی۔

”شاہ کا مزاج بہت برہم ہے۔“ اس کنیز نے رات والی کنیز کے پاس پہنچ کر اسے بتایا۔
”یہ تو میں تمہاری آمد سے سمجھ گئی تھی کہ کوئی بات ضرور ہو گی۔“ رات کی کنیز
تمام رات شاہ کی جی حضوری میں پیش ہونے کے بعد ابھی لیٹی ہی تھی کہ دن والی کنیز نے
اسے یہ کہہ کے ہولا دیا کہ بادشاہ غصہ میں ہے۔

”تمہاری فوری طلبی ہوئی ہے۔“ آنے والی کنیز نے اسے مزید بتایا۔
”وہ تو میں چلوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تاکہ میں بھی اس کا کوئی توڑ پہلے ہی سے
سوچ لوں۔“ کنیز بستر چھوڑتے ہوئی بولی۔

”تم کپڑے پہننا شروع کرو۔“ آنے والی کنیز نے کہا۔ ”میں تمہیں بتا رہی ہوں۔“
جلدی کرو کہیں دوسرا ہرکارہ نہ آجائے ہمیں بلانے۔“
کنیز جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگی۔

آنے والی نے بتایا۔ ”ہم تمہارے آنے کے بعد میں دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ کچھ
دیر تک ہو طرف خاموشی چھائی رہی۔ میں نے جھانک کے دیکھ لیا تھا کہ شاہ سو رہے ہیں۔
ان کا منہ دروازے کی طرف تھا اور ہلکے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ اچانک مجھے ایک دھاڑ
ستائی دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کنیز کہاں ہے۔“ میں جھٹ سے داخل ہو گئی۔ شاہ نے
پوچھا کہ ہم تے تمہیں حکم دیا تھا تم کیوں بھول گئیں۔ میں گھبرا گئی۔ ابھی تو میں آئی ہوں۔
پتہ نہیں شاہ نے کس کو حکم دیا تھا اور وہ حکم کیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ
عالیجاہ۔ میں تو ابھی ابھی خدمت کے لئے حاضر ہوئی ہوں۔ شکر ہے کہ انہوں نے یہ نہیں
کہا کہ ہم نے تم ہی کو حکم دیا تھا۔ پھر میں کیا کر لیتی ان کا؟ پھر انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے
پہلے جو کنیز پہرے پر تھی اسے حاضر کرو۔ بس میں بھاگتی بھاگتی تمہارے پاس آئی ہوں۔ اب
تم سوچو کہ شاہ نے کیا حکم دیا تھا۔“

رات والی کنیز کپڑے تبدیل کر کے کھڑی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے ہی سوچ میں گم ہو
گئی۔

آنے والی نے اسے ٹوکا۔ ”ارے کیا سوچنے لگی۔ چلتی ہے کہ میں جاؤں؟“
”نہیں نہیں۔ میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔“ اس نے جواب دیا اور دونوں چل
پڑیں۔

رات والی کنیز گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے پوری رات کے شاہ رچرڈ کے دیئے ہوئی
احکامات کو ایک ترتیب میں رکھا۔ مگر اس نے تو ان تمام احکامات کی تکمیل کی تھی۔ کوئی

بھی ایسا نہ تھا جسے وہ ٹال گئی ہو۔

تمام راتے دونوں خاموش چلتی رہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ رات والی بار بار
احکامات کو ترتیب دے کر ان پر غور کرتی مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس نے کون
علم نہیں پہنچایا۔ خواہگاہ پر پہنچ کے دن والی کنیز دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی
رات والی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

کنیز اندر داخل ہوئی۔ بادشاہ دروازے کی طرف پشت کئے لیٹا تھا۔
”کنیز تسلیات پیش کرتی ہے عالیجاہ۔“ کنیز کا جھکا ہوا سر زمین کو چھو رہا تھا۔
”تم نے ہماری حکم عدولی کی ہے۔ کیا سزا دی جائے تمہیں کنیز؟“ شہنشاہ کے لہجہ میں
ظن تھا تو نہ تھا مگر گرج موجود تھی۔

”عالیجاہ۔ کنیز کا سارا خاندان انگلستان کے شاہی خاندان کی خدمات بجالانے میں ہمیشہ
پیش رہا ہے۔ کنیز کی کوئی خطا ہو یا نہ ہو۔ میں ہر سزا بھگتتے پر تیار ہوں۔“ کنیز کچھ ایسی
ٹٹی سے بولی کہ بادشاہ ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

”دیکھو۔“ شاہ اور نرم ہو گیا۔ ”ہم بغیر قصور کے کسی کو سزا نہیں دیا کرتے۔ ہم نے
حکم دیا تھا کہ شہزادی سوسن سے کہا جائے کہ صبح جب ہم بیدار ہوں تو وہ ہماری خواہگاہ
موجود ہو۔ شہزادی سوسن یہاں نہیں آئی۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ تم ہمارا پیغام
ابھول گئیں۔“

”عالیجاہ نے درست فرمایا۔“ کنیز نے جیسے اقبال جرم کر لیا۔ ”کنیز کی ساعت نے غلطی
میں رات شہزادی سوسن کے حضور گئی تھی مگر میں نے غلطی سے انہیں یہ پیغام دیا کہ
کی طبیعت آج کچھ مکدر ہے۔ اس لئے انہیں حضور عالی میں حاضر ہونے کی ضرورت
ہے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ ہم نے تمہیں یہ پیغام دیا تھا۔۔ مگر۔“ شاہ رچرڈ کچھ کتے کتے سوچنے

”عالیجاہ۔ یہ پیغام تو میں نے شہزادی کے گوش گزار کر دیا تھا۔“ کنیز نے بہت سنبھل
یا۔

”مگر ہم نے دوسرا پیغام جس کے ذریعہ بھیجا۔“ بادشاہ الجھتے ہوئے بولا۔
”عالیجاہ۔ حضور عالی میں کل رات کوئی دوسرے کنیز حاضر نہیں ہوئی تھی۔“ کنیز کی بن
ٹی۔ الزام اس پر سے ہٹ گیا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ دوسرے دروازے سے کوئی غلام آیا ہو اور ہم نے اس کے ہاتھ پیغام

بچھ دیا ہو۔" شاہ رچرڈ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"جی عالیجاہ۔" کینز بولی۔ "ایسا ضرور ہو سکتا ہے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے کہ جہ عالیجاہ نے دوسرے دروازے کے غلام کو یہ "اجازت خاص" دی ہو کہ وہ کسی خاص آدمی اس دروازے سے داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر بھی عالیجاہ اگر کوئی دروازے سے خواگاہ میں داخل ہوتا تو مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔ اس لئے کہ میں دروازے کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور میری نظریں ہمہ وقت خواگاہ کے اندرونی حالات کا جائزہ لیتی رہتی ہیں کیونکہ یہ میرے فرائض میں داخل ہے۔"

"ہوں۔۔" بادشاہ نے ہکاری بھری۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا مہدم کا کوئی منتشر خوار ہو۔ بہر حال اب تم جاؤ اور شہزادی سون کو اپنے ساتھ لے کے آؤ۔"

کینز سلام کر کے باہر نکلی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہرے کی کینز نے پوچھا۔ "کیسی گزری تم تو بہت خوش نظر آ رہی ہو؟"

باہر آنے والی کینز نے آہستہ سے مگر جل کے کہا۔ "شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے بچ کے رہنا چاہئے۔ حضور نے خواب میں کسی کو دیا تھا کہ سون صبح کو خواگاہ میں موجود اور الزام مجھ پر لگ رہا تھا۔

پہرے والی کینز نے ٹھنڈی سانس لے کر منہ بنایا۔ "یہی تو عیب ہوتا ہے بادشاہوا میں۔ خوشیوں تو گالی دینے پر بھی انعام دے جاتے ہیں اور مزاج برہم ہو تو بے خطا ہونے بھی سولی پر چڑھا دیتے ہیں۔"

اور شہزادی سون کے پاس پیغام لے جانے والی ہستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کینز نے شہزادی سون کے محل میں پہنچ کر اسے شاہ رچرڈ کا پیغام پہنچایا۔ یہ شاہی کینز بڑی حسن پرست تھی۔ دو کئی بار پہلے بھی شہزادی سون کے پاس شاہ کا پیغام لے کر آ چکا تھی۔ مگر اس کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ بات تو منہ سے کرتی تھی مگر اس کی آنکھیں شہزاد کے چہرے پر ٹھہر کے رہ جاتی تھیں۔

شہزادی سون واقعی حسین تھی خصوصاً شہزادی کی آنکھیں تو ایسی گہری جھیلیں تھیں ج میں مرد تو مرد عورتیں دیکھتیں تو وہ بھی ڈوب جانے کی آرزو کرتی تھیں۔ شاہ رچرڈ کی کینز جس کا نام کلورا تھا، سون کی عاشق زار تھی۔ یہ بات کسی طرح شاہ کو معلوم ہو تھی۔ ممکن ہے سون نے خود شاہ کو یہ بات بتائی ہو۔

شہزادی سون کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ "یہ بادشاہ بھی اٹلے دماغ کے ہو۔ ہیں۔ رات کو فرمان جاری ہوا کہ آنے کی ضرورت نہیں اور اس وقت جبکہ اصل سونے

ن تو سویرا ہی ہوتا ہے بلاوا آگیا۔ فوراً آ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں وہاں نہ پہنچوں تو شاہ پچارے بستر ہی سے نہ اٹھیں گے۔"

"شہزادی نے بالکل ٹھیک کہا۔" کلورا جو شہزادی کو مسکرا مسکرا کے دیکھ رہی تھی اس شہزادی کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "شاہ بہادر رات بھر آپ کو خواب میں تے رہے ہیں اور صبح بیدار ہوتے ہی پہلا سوال یہ تھا کہ شہزادی سون کیوں نہیں آئی؟" شہزادی سون تیار ہو کے کلورا کے برابر آ کے کھڑی ہو گئی۔ "کلورا تو ایسی باتیں مجھ سے کیا کر۔ ہفتے پیچھے ایک بار بلاوا آتا ہے۔ اس میں بھی ایک دو ناخن ہو جاتے ہیں اور ہا پچاری آنکھوں میں رات کا ہنتی ہوں۔" شہزادی نے کہا۔

"ہائے شہزادی۔ آپ کی تمنائی اور بے کسی دیکھ کے کلچر منہ کو آتا ہے۔" کلورا نے بے پار بھرے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر اس کی نظریں سون کے چہرے کا طواف لے لگیں۔ "آپ کا یہ گلابی چہرہ اور یہ بھری جوانی اس لئے تو نہیں کہ یوں گھٹ گھٹ رہے۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ برنگیریا کے محل میں جا کے اس کا منہ نوچ لوں۔"

شہزادی سون نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور حسن جیسے اور نکھر گیا۔ "کیوں پچاری کے پیچھے نا ہو۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟"

بگاڑا یہ ہے کہ پوری شاہی مسند سنبھال کے بیٹھ گئی ہے۔ آپ کو ذرا سی جگہ نہیں نا۔" کلورا بڑبڑائی۔ "بھلا کوئی شکل بھی تو ہو۔ دلی پتلی۔ لمبی تاڑ۔ بھلا یہ صورتیں کہیں انگلستان بننے کے قابل ہیں؟"

"بکو مت کلورا۔" سون ٹھنڈی سانس لے کے بولی۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس کے بڑے گرجے میں شاہ نے اس سے شادی رکھائی تھی۔ اف کیا وقت تھا وہ مجھے لوم ہو گیا تھا کہ شاہ آج برنگیریا سے شادی کر رہے ہیں۔ مگر میں منہ سے نہیں بول سکتی۔ میری قبرصی کینز نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر میں نے کسی قسم کا وادیا کیا یا ادھم چلایا بابا حضور کی جان کی خیر نہ ہوگی۔ شاہ نے اپنے حلقہ میں اعلان کر دیا تھا کہ اگر شہزادی نے اس کی شادی میں تقریب میں قنہ کھڑا کیا تھا وہ بابا حضور کو قتل کرا دیں گے۔"

کلورا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ تھی تو شاہ کی جاسوس مگر نہ معلوم کیوں رادی سون کے حسن پر ریتھ گئی تھی۔ شہزادی کا ہاتھ چوم کے بولی۔ "مت گھبرائیے رادی۔ آپ کے گھر بھی چاندنی آئے گی۔ ہمیشہ یہ اندھیرا تو نہیں رہے گا۔ بادشاہوں کے پھورے پن سے کون واقف نہیں۔ آج برنگیریا شاہ کے سر پر بیٹھی ہے تو کل نظر سے گر لی سکتی ہے۔ دل سے اتر بھی سکتی ہے۔"

”مگر میں صرف آپ کی ذمہ داری پر جا سکتی ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے“ شہزادی نے سر ہلایا۔ ”میں شاہ سے کہوں گی کہ آپ نے مجھے بلوایا تھا۔
 فیہ شاہ کو اطلاع دیئے کیسے واپس جا سکتی تھی؟“

شاہی کنیز خوابگاہ میں داخل ہوئی پھر چند ہی لمحوں بعد مسکراتی ہوئی آئی۔ ”تشریف لے
 شہزادی سوسن۔ شاہ آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں“
 اندر کا ماحول کچھ گنبد سا تھا۔ ملکہ برنگیریا آف نوائے کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور
 لاجین سر جھکائے بیٹھی تھی۔ واضح رہے کہ برنگیریا اور شہزادی سوسن دونوں ایک
 ے کے لئے اجنبی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں مگر ایک
 ے سے ملنے کا اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔

شہزادی سوسن نے شاہ کو مجرا پیش کیا تو اس نے ہنس کے کہا۔
 ”ادھر آؤ سوسن۔ تم نے انتظار دکھایا۔“

شاہ رچڑ کی خوابگاہ کا فرش خالص قالین کا تھا جس پر ایک شکار گاہ کا منظر پیش کیا گیا
 س قالین کے فرش پر ایک طرف رچڑ کی منہ لگی تھی۔ شاہ کے سامنے ملکہ برنگیریا
 زادی جین (رچڑ کی بہن) بیٹھی تھیں۔ شاہ کے اشارہ پر سوسن شاہ کے پاس پہنچی تو
 نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی دائیں جانب بٹھالیا۔

”جین تم تو سوسن کو جانتی ہو نا؟“ شاہ کا بڑا خوشگوار موڈ معلوم ہوتا تھا۔

”جی ہاں۔ جانتی ہوں اور مل بھی چکی ہوں۔“ شہزادی جین نے جواب دیا۔

سوسن شاہ رچڑ نے اک دم شہزادی سوسن سے سوال کیا تو وہ چونک پڑی۔ دراصل
 انظرس ملکہ برنگیریا پر لگی تھیں اور وہ اس کے چہرے میں وہ چیز تلاش کر رہی تھی
 نے شاہ رچڑ کا دل ایسا موہ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جی عالیجاہ۔“ شہزادی سوسن نے جواب دیا۔

تم ہماری ملکہ برنگیریا کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتی ہو؟“ شاہ نے سوال

عالیجاہ۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ نے قبرص کے بڑے کلیسا میں شادی کی ہے۔ جس
 نادی کی اور کیوں کی اس کا مجھے علم نہیں۔“ شہزادی نے دل جلتے انداز میں جواب

خیر یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہے۔“ شاہ رچڑ بولا۔ ”اب آج سے تم پر ایک ذمہ
 الی جا رہی ہے جسے تم بہر صورت نبھاؤ گی۔ ذمہ داری یہ ہے کہ آج سے ہم اپنی ملکہ

”جس دن ایسا ہوا۔ میں تیرا منہ جواہرات سے بھردوں گی۔“ شہزادی نے بڑی سرور
 سے کہا۔

پھر وہ دونوں کنیزوں اور غلاموں کی نظروں سے بچتی ہوئی ایک طویل اور دراز
 راہداری سے گزر کر شاہی محل پہنچ گئیں۔ کپڑے کی قاتوں سے بنائی جائے والی یہ راہداری
 بڑی پر اسرار تھی شاہ اور سوسن کے محل نما خیموں کے درمیان یہ راہداری خاص طور
 شاہ نے بنوائی تھی اور رات کے پچھلے پہر شاہ اپنی محبوبہ شہزادی سوسن کے ساتھ اس
 راہداری میں گشت کرتا رہتا تھا۔

شہزادی سوسن اور کلورا شاہی خوابگاہ پر پہنچے تو پیردار کنیز نے انہیں اندر جانے سے
 روکا۔ کلورا نے کنیز کو بتایا ”شاہ نے مجھے شہزادی سوسن کو بلانے بھیجا تھا۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کلورا۔“ پیردار کنیز مسکرائی۔ ”مگر اب خوابگاہ کے اندر
 کیفیت بالکل تبدیل ہو گئی ہے۔ شاہ کے پاس اس وقت شاہ کی دو عزیز ترین ہستیاں موجو
 ہیں۔ ان کی موجودگی میں شہزادی سوسن کو میں کس طرح اندر جانے کی اجازت دے سکتی
 ہوں؟“

شہزادی نے کلورا سے کچھ سرگوشی کی۔ کلورا نے کنیز سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یہ بتانے
 پر بھی پابندی ہے کہ شاہ کے پاس اس وقت کون کون بیٹھا ہے؟“

”کوئی پابندی نہیں۔“ کنیز مسکرائی۔ شاید مسکرا کے بات کرنا اس کی عادت تھی۔ ”میر
 نام پہلے ہی بتا دیتی لیکن مجھے شہزادی سوسن کا لحاظ تھا اس لئے میں بتانے سے بچکا رہی
 تھی؟“

”کسی خوف و ہچکچاہٹ کی ضرورت نہیں کنیز۔“ شہزادی سوسن نے ٹھنڈی سانسوں کے
 درمیان کہا۔ ”میں نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے اب اس پر کسی بات کا اثر نہ ہو گا۔ تم بے
 تکلف نام بتاؤ۔“

کنیز سر جھکا اور آنکھیں چرا کے بولی۔ ”اندر ملکہ انگلستان برنگیریا آف نوائے اور
 شہزادی جین تشریف فرما ہیں۔“

”بہر حال ہم واپس تو نہیں جا سکتے“ شہزادی سوسن نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہمیں شاہ
 نے بلوایا ہے۔ انہیں ہماری آمد کی اطلاع ضرور ہونی چاہئے۔“

کنیز ہچکچائی تو کلورا نے کہا۔ ”تم جانا نہیں چاہتیں تو مجھے اندر جانے دو۔ شاہ نے میرے
 ذریعہ شہزادی سوسن کو بلوایا ہے۔ میں اندر جاؤں گی تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا؟“
 ”جب اندر جانا ہے تو پھر میں خود ہی جاتی ہوں۔“ کنیز نے شہزادی کی طرف دیکھ کر

”خاموش سون۔“ شاہ نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ”تم ملکہ کی اتالیق ضرور ہو کر مگر یہ خیال رکھنا کہ بریگیا ملکہ انگلستان ہے اور یہ مرتبہ کسی اور کو نہیں مل سکتا۔۔۔“

ہماری ملکہ برنگیرا کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتی ہو؟ "شاہ نے
متحان میں دال دیا۔

”صرف اس حد تک عالیجاہ کہ آپ نے قبرص کے بوے کلیسا میں اس سے شادی تھی۔ مگر یہ نہ معلوم کر سکی کہ یہ شادی آخر کیوں ہوئی تھی۔“ سوسن نے دل انداز میں جواب دیا یا یوں کہنے کے کیجئے ”بھولے پھوٹے۔“

”تمہیں یہ جاننے کی نہ ضرورت تھی اور نہ اب ہے۔“ یہ کہتے ہوئے شاہ برتگیرا کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سوسن کے طنزیہ انداز پر غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

ملکہ برتگیرا نے شاہ کی نظر اپنی طرف دیکھی تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عالیجاہ۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے آرام کی اجازت دی جائے۔ دراصل ملکہ انگلستان سوسن کے سامنے بیٹھنا اپنی توہین سمجھ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ برتگیرا۔“ شاہ کے لہجے میں تلخی آگئی۔ ”جس سوسن کے سامنے سے بھاگنا چاہتی ہو وہ چوبیس گھنٹے تمہارے سامنے رہے گی۔“

”جی عالیجاہ۔“ برتگیرا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے لگے۔ ”میں سمجھ نہیں سکی؟“

”ہم سمجھاتے ہیں تمہیں۔“ شاہ کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آ سے تم یعنی شہزادی قبرص سوسن اور شہزادی جین ہماری اور انگلستان کی ملکہ برتگیرا کی عداوت اور اتالیق ہو گی۔“

ملکہ برتگیرا کی آدمی جان تو پہلے نکل گئی تھی اب یہ سن کر تو اس پر غشی سی طاری ہوئے گی۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبالا اور احتجاج کے لئے منہ کھالا۔

”عالیجاہ۔۔۔۔۔“

شاہ نے اسے فوراً اشارے سے روک دیا۔ ”تم کچھ نہیں بولو گی برتگیرا۔“

برتگیرا کے سینے کے اندر لپکتے ہوئے شعلے سینے ہی میں دب گئے۔ اس گردن جھکا لی۔

”ہاں سوسن تم سن لو اور گرہ میں باندھ لو۔“ شاہ نے پلٹ کے سوسن سے کہا۔

”ملکہ انگلستان برتگیرا کی محافظ اور اتالیق ضرور ہو گی مگر تمہیں ہر وقت یہ خیال رکھنا ہو کہ صرف برتگیرا ہی ملکہ انگلستان ہے اور رہے گی۔ یہ مرتبہ کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔“

اس دفعہ شہزادی قبرص سوسن کا منہ لگ گیا۔

شاہ انگلستان کی آواز پھر ابھری۔ ”ایک بات اور سن لو سوسن۔ ہماری نظروں میں تمہارا جو مقام ہے اس سے نیچے تمہیں کوئی نہیں لا سکتا۔“

اس کے بعد شاہ رچرڈ نے تحلیہ کا اعلان کیا اور تینوں چمکتے دیکھتے ستارے سر جھکا۔

شہزادی خیمے سے باہر پلے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ فرنگیوں کے دماغ سے قلعہ مکہ کی فتح کا شمار اتر چکا تھا۔ مکہ کا قلعہ کن حالات میں فرنگیوں کے حوالہ کیا گیا اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مکہ کا محاصرہ تقریباً دو سال تک جاری رہا پھر جب قلعہ میں گھرے ہوئے ساڑھے چار ہزار مسلمانوں کے پاس کھانے پینے کا سامان اور اسلحہ ختم ہو گیا۔ برجیاں لر گئیں۔ مینارے زمین بوس ہو گئے اور باہر سے انھیں کسی امداد کی توقع نہ رہ گئی اس وقت قلعہ والوں نے ایک معاہدہ کے تحت قلعہ کو فرنگیوں کے حوالے کیا اور خود بھی ان کے زیر غلامی ہو گئے۔

شاہ انگلستان نے مکہ کے یرغمالیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت دی تھی لیکن اس نے تمام جنگی، اخلاقی اور انسانی قوانین کو منہ چڑھاتے ہوئے اٹھائیس سو (2800) یرغمالیوں کو میدان جنگ میں تہ تیغ کر کے اس ایک قلعہ مکہ کو حاصل کرنے کے دوران لاکھ فرنگیوں کی جو قربانی دی تھی اس کا انتقام لیا۔

شاہ انگلستان کی اس ذلیل حرکت یعنی اٹھائیس سو بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام نے لاطینی لشکر میں اس قدر سراسیمگی اور دیوانگی پھیلانی کہ مسلمان لشکر فرنگیوں پر اس رات سے حملہ آور ہوئے کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ اٹھائیس سو مسلمانوں کی شہادت نے جواب میں مسلمانوں نے تقریباً ”پانچ ہزار فرنگیوں کو ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیا لیکن مکہ کے مسلمان شہداء کے غم ان کے دلوں سے پھر بھی نہ مٹ سکا۔

قلعہ مکہ کی فتح و شکست پر دراصل بیت المقدس کی فتح و شکست کا دارومدار تھا۔ مکہ میدان جنگ کی صف بندی کچھ اس طرح تھی کہ قلعہ مکہ بندرگاہ پر تھا اور وہ دریائے مکہ کے وہانے پر بھی تھا۔ اس طرح قلعہ کا ایک حصہ سمندر کی سمت تھا اور باقی حصہ لی پر تھا جسکی حفاظت قلعہ کی فصیلوں کے علاوہ دریائے مکہ سے بھی ہوتی تھی۔

اب فرنگیوں کی پوزیشن یہ تھی کہ خشکی کے اطراف میں فرنگیوں کے متحدہ لشکر مکہ کو برے ہوئے تھے اور سمندر کی سمت میں انگلستان اور فرانس وغیرہ کے بحری بیڑوں نے نہ میں داخلہ کا راستہ روک رکھا تھا۔ اس طرح فرنگیوں نے چاروں سمتوں سے مکہ کو برے میں لے رکھا تھا اور اس کا تین سے چار لاکھ تک کا لشکر رات دن قلعہ پر سختیوں رتیوں سے سبک باری کر رہا تھا۔ مگر قلعہ کو گھیرنے والی یہ فرنگی فوجیں خود بھی خشکی تین اطراف میں مسلمانوں کے لشکر سے گھری ہوئی تھیں اور یہ لشکر تھا سلطان صلاح بن ایوبی فاتح بیت المقدس کا۔

کبوتروں کے خاتمہ کے بعد سلطان نے غوطہ خوروں سے کام لیا۔ یہ غوطہ خور فرنگی بحریہ کی نظریں بچاتے اور ساحل کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے قلعہ کی دیوار تک پہنچتے تھے اور انہیں رسے کے ذریعہ سے اوپر کھینچ لیا جاتا تھا۔ ایک عرصہ تک ان کے ذریعہ قلعہ والوں اور سلطان کے درمیان رابطہ قائم رہا پھر یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا اور تمام غوطہ خور ایک ایک کر کے دشمن کے ہاتھوں مارے گئے۔

سلطان قلعہ مکہ کو اس لئے خالی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ فرنگیوں کا پورے یورپ سے آنے والا لشکر تمام کا تمام مکہ پر قبضہ کے لئے ایک ہی جگہ اکٹھا ہو کے رہ گیا تھا اور اس فرنگی لشکر کو ایک طرف تو اندر کے لشکر کی فداختی جنگ کا سامنا تھا دوسرے سلطان لشکر ان کی پشت پر حملہ کر کے ان کا ناک میں دم کئے ہوئے تھے۔ سلطان صلاح الدین نے اپنی حکمت عملی سے دشمن کے تمام لشکر کو قلعہ مکہ کے حلقے میں مصروف کر دیا تھا اور اس دوران وہ بیت المقدس کو مضبوط سے مضبوط تر بھی کرتا رہتا تھا۔

فرنگی لشکر نے مکہ پر قبضہ کیا کیا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے بیت المقدس واپس لے لیا ہو یہاں تک کہ بیت المقدس (جس پر قبضہ کا ابھی خواب تھا) کے نئے بادشاہ کے انتخاب کا ایک عظیم جھگڑا شروع ہو گیا اور اس جھگڑے نے شاہ انگلستان رچرڈ اور شاہ فرانس آگسٹ فلپ کے درمیان اس قدر سخت کلامی ہوئی کہ شاہ فرانس اپنا لشکر وہیں چھوڑ کر تھا فرانس واپس چلا گیا۔

ادھر فرنگی لشکریوں کا یہ حال تھا کہ انہیں بڑی مشکل سے مکہ سے عشرت کدوں سے نکالا گیا۔ مکہ پر فتح ہوتے ہی شام کے تمام عیسائی علاقوں کی آوارہ عورتیں مکہ پہنچ گئیں تا کہ مکہ کے فاتح لشکر کو داد عیش لینے کا موقع مل سکے۔ یہ بھی روایت ہے کہ یورپ سے خوبصورت اور جوان عورتوں کی ایک فوج کی فوج مکہ کے ہیردوں پر اپنی جوانیاں لٹانے پہنچ گئی تھی۔

جس وقت فرنگی لشکر مکہ سے نکل کے بیت المقدس کی بازیابی کے لئے جنوب کی طرف روانہ ہوا تو اس کی رفتار شاہانہ نہیں بلکہ مستانہ تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ان میں مکہ فتح کرنے کے بعد بیت المقدس کی بازیابی کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ انگلستان نے کوشش کر کے بیت المقدس کے سابق شاہ لوگنا گالی کو پھر بیت المقدس کا بادشاہ نامزد کر دیا تھا۔

بیت المقدس تک فرنگی لشکر کو پہنچنے میں کئی منزلیں طے کرنا تھیں اور ہر منزل پہلی منزل سے خطرناک اور خوفناک تھی کیونکہ مکہ سے روانگی کے ساتھ ہی فرنگی لشکر پر سلطان صلاح الدین کے لشکر نے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس لئے شاہ انگلستان لشکر کو بالکل

سلطان صلاح الدین کی کوشش تھی کہ قلعہ کے صدر دروازے کی طرف کے فرنگی لشکر کے گھیرے کو کسی طرح توڑ کے دشمن کے درمیان میں قلعہ تک ایک راستہ بنائے اور ان راستے سے قلعہ والوں کو سامان خوردونوش اور اسلحہ پہنچائے۔ دشمن کے درمیان راستہ بنانا بڑا مشکل کام تھا مگر سلطان ایک بار اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے فرنگیوں کے درمیان راستہ بنانے کا کام اپنے بھائی شاہ شاہاں کے بیٹے جواں عمر تقی الدین کے سپرد کیا اور خود رات بھر اونٹوں پر سامان لادتا رہا۔

چنانچہ علی الصبح تقی الدین نے قلعہ کے صدر دروازے کے سامنے کے فرنگی لشکر کی دیوار پر ضرب لگائی۔ اس کا یہ حملہ اس قدر طوفانی تھا کہ چار گھنٹے کی مسلسل جنگ کے بعد فرنگی لشکر کے درمیان ایک چوڑا راستہ اس طرح بن گیا جس طرح تالاب میں پتھر پھینکنے سے کائی پھٹ جاتی ہے۔ دشمن کے درمیان راستہ بننے ہی سلطان صلاح الدین نے اس راستے میں اونٹ داخل کر دیئے جن پر اسلحہ اور سامان خوردونوش کے ساتھ ساتھ کچھ تیر انداز دستے بھی تھے۔ یہ اونٹ خراماں خراماں جگالی کرتے ہوئے قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اونٹوں کے دائیں اور بائیں سلطان لشکر اور تقی الدین کے دستوں نے ایک مضبوط دیوار بنا دی تھی جو تمام دن فرنگیوں کو پیچھے دھکیلتے رہے۔ سلطان معظم بذات خود اس راستے سے قلعہ مکہ میں داخل ہوئے اور قلعہ کی تفصیل پر چڑھ کے انہیں نے قلعہ گھیرنے والے فرنگی لشکر کی پوزیشنوں کو اچھی طرح دیکھا اور ذہن نشین کیا تھا۔

مگر یہ راستہ شام ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا کیونکہ شاہ رچرڈ نے اس راستے کی خبر پاتے ہی پانچ سو نائٹوں اور تین سو ٹمپلز کے کئی دستے ادھر روانہ کر دیئے اور مسلمانوں پر اس قدر دباؤ بڑھا کہ انہیں ہٹنا پڑا اور راستہ بند ہو گیا۔ سلطان میں جب اس قدر طاقت تھی کہ دشمنوں کے درمیان راستہ بنا کر قلعہ والوں کو سامان رسد پہنچا سکتا تھا تو اس کے لئے یہ اور زیادہ آسان تھا کہ قلعہ کے محصور لشکریوں کو اپنے ساتھ واپس لے آتا اور فرنگیوں کا قلعہ پر قبضہ کرا دیتا۔

مگر سلطان صلاح الدین نے قلعہ کے چار ساڑھے چار ہزار لشکر کو بچانے اور قلعہ فرنگیوں کے حوالے کرنے کا قطعی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ دراصل وہ قلعہ مکہ پر بہر صورت قبضہ رکھنا چاہتا تھا۔ راستہ بند ہونے کے بعد سلطان کے پالتو اور سدھائے ہوئے کبوتروں کے ذریعہ قلعہ والوں سے رابطہ برقرار رکھا۔ ان نامہ بر کبوتروں سے دشمن بھی واقف ہو گیا اور ان کبوتروں کو دوران پرواز ختم کرنے کے لئے بگو جگہ تیر انداز دستے مقرر کئے گئے جنہوں نے دو مہینے کے طویل عرصہ میں درجنوں کبوتروں کو تیروں کا نشانہ بنا دیا۔

اساطھ ایک شاندار سوار رسالے کے ساتھ رچڑ کے پاس پہنچا تھا۔ ایک فرنگی مورخ لکھتا ہے کہ ملک العادل تہایت محتاط اور خلیق تھا۔

شاہ رچڑ نے اپنے نارمن نائٹوں کے ساتھ ملک العادل کا استقبال کیا۔ ملک العادل نے مسکرا کر شاہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بھائیہ کیا۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ نوجوان مغرے آف نورون نے مترجم کے فرائض انجام دیئے۔

شاہ رچڑ نے پر رعب آواز بناتے ہوئے کہا۔ ”اس جنگ کو بہت مدت گزر چکی ہے دونوں طرف کے ہزاروں بہادر جانوں کا ہزارانہ پیش کر چکے ہیں۔ ہم تو شام کے ساحل کے بیسیائیوں کی مدد کو آئے تھے۔ آپ ان سے مصالحت کر لیجئے تاکہ دونوں طرف کی فریض اپنے اپنے ملکوں کو چلی جائیں۔“

ملک العادل حسن کلام کا ماہر تھا۔ اس نے بے پروائی سے پوچھا۔ ”بیسیائی کن شرائط پر صلح چاہتے ہیں؟“

رچڑ کو اس سوال کی امید نہ تھی۔ اسے جواب دینا ہی پڑا۔ ”یہ وہ غم ہمارے حوالے کر دیا ائے اور مسلمان فوجیں اردن کے اس پار چلی جائیں۔“

ملک العادل اٹھ کے کھڑا ہو گیا اور بڑی حکمت سے بولا۔ ”اے شاہ انگلستان یہ دونوں نہیں ناممکن ہیں۔“

اور اپنے رسالے کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

شیراز کے شیخ سعدی نے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ دمشق میں اتنا دست قلعہ پڑا کہ لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے۔ خدا قلعہ کی تباہ کاریوں سے ہر ملک اور شہر کو محفوظ رکھے۔ شیخ سعدی نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے اور یہ یقیناً ”صحیح ہو گا لیکن اپنا ہر تجربہ اور مطالعہ کہتا ہے کہ خواہ لوگ قلعہ سالی کے دوران عشق کرنا بھول جائیں میدان جنگ میں جبکہ موت ہر طرف منزلانی رہتی ہے لوگ عشق کرنے سے نہیں لے اور حسن و عشق کی ستم رانیاں اور کار فرمایاں اساحول میں بھی جاری اور ساری رہتی

اس تیسری صلیبی جنگ میں ایک فرنگی مورخ کے بقول اب تک بیسیائی متوطنین کی دو لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن عشق و محبت کے نظارے وہاں پر بھی دکھائی دیتے

اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ جس وقت ملک العادل شاہ رچڑ کے پاس سے شرائط ذکر کے مع اپنے دستے کے شاہی خیمے سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر کچھ ناگوار قسم

ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چلا رہا تھا مگر اس لشکر کے ساتھ ساتھ ساحل کے متوازی جو پہاڑیاں تھیں ان کے نشیب و فراز میں سلطانی لشکر متحرک تھا جو موقع پاتے ہو فرنگیوں پر طوفانی حملہ کرتا اور دم کے دم میں دو چار سو فرنگیوں کا صفایا کر کے پھر پہاڑیوں کی آڑ میں ہو جاتا تھا۔

جافا پہنچنے پہنچنے فرنگیوں کا کافی نقصان ہو گیا تھا۔ سلطان نے یہ بھی کیا تھا کہ تمام ساحل قلعوں کو ترڈا کے زمین کے برابر کر دیا تھا تاکہ فرنگیوں کو کسی جگہ نہ تو پناہ ملے اور نہ سامان کا ذخیرہ۔ اس وجہ سے فرنگی لشکر اور زیادہ پریشان اور بدول ہو گیا تھا۔

جافا پہنچنے پر شاہ انگلستان کو معلوم ہوا کہ سلطان نے عسقلان کے خوبصورت باروتی اور غیبی قلعہ کو بھی توڑنے کا حکم دیدیا ہے۔ شاہ نے فوراً سرداروں کی کانفرنس بلائی۔ یہ شاہ رچڑ کی پہلی کانفرنس تھی۔ اس نے سرداروں کو مخاطب کیا۔

”اے خداوند یسوع مسیح کے جانفروش سردارو! ترک (مسلمان) عسقلان کو برباد کر رہے ہیں۔ ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہیے۔“

مگر سرداروں کے کان پر جوں تک نہ رہا۔ وہ بادام اور انجیر کھاتے رہے۔ ان کے گھوڑے سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے رہے اور وہ آپس میں بحث کرتے رہے۔

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

آخر میں سرداروں نے طے کیا کہ پہلے جافا کی تفصیل کی محنت کرنا چاہیے جسے سلطان لشکر توڑ پھوڑ گیا تھا۔ رچڑ اپنے سرداروں کی رائے نہ بدل سکا۔ مکہ سے جافا تک کے خطرناک اور تھکا دینے والے سفر نے اسے چڑا کر دیا تھا۔ اس کے سردار اور لشکری جنگ سے جی چرانے لگے تھے۔ بعض لشکر تو کشتیوں پر سوار ہو کر مکہ کے عشرت کدوں میں واپس چلے گئے تھے۔

رچڑ کو پہلی مہینہ احساس ہوا کہ اس نے مکہ کو تو دو سال کی سخت جنگ کے بعد حاصل کر لیا مگر اب مسلمانوں سے کوئی اور قلعہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے بیت المقدس کا خیال چھوڑ کے مسلمانوں سے صلح کر لی جلسے۔ یہ اس کی بے دلی کا پہلا مظاہرہ تھا۔ آخر رچڑ نے سلطان صلاح الدین کے دیوپیکر بھائی اور سلطانی لشکر کے سپہ سالار ملک العادل کے پاس اپنا قاصد بھیجا۔

ملک العادل سلطان کا بھائی بھی تھا اور مشیر بھی۔ اسے سلطان کی طرف سے لاصحدو اختیارات حاصل تھے۔ اس نے شاہ رچڑ کی دعوت قبول کر لی اور شاہ رچڑ کے قاصد کے

کے تاثرات تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کا موڈ کچھ گبڑا ہوا تھا۔ مگر جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف چلا تو اسے ایک طرف سے دس پندرہ سوار تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

ملک العادل نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ اس کے لئے مشہور تھا کہ وہ حررات کی تلاش میں رہتا ہے۔ سواروں کو ڈور پر آتا دیکھ کر اس کی حمیت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ آنے والوں کی تحقیق لئے بغیر اپنے راستہ پر چلتا رہے۔ چنانچہ وہ گھوڑا روک کے کھڑا ہو گیا اور آنے والوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے روک لئے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ ٹھیک اسی وقت جب ملک العادل نے اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچیں تو پورے آنے والے بھی اپنے گھوڑے روک کر جہاں تک پہنچے تھے وہیں پر رک گئے۔ ان رکنے والوں میں چار خواتین یا پری پیکر لڑکیاں تھیں اور دس عدد ان کے محافظ سوار تھے۔ ان لڑکیوں میں ایک لڑکی شاہ انگلستان رچرڈ کی بہن شنزادی جین تھا جسکی شادی حاکم متقہ (سلی) سے ہوئی تھی لیکن میان بیوی کے ذہنوں میں کوئی مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں ہمیشہ کے لئے علیحدگی ہو چکی تھی۔

باقی تین لڑکیاں شنزادی کی کنیزیں تھیں جنہیں شنزادی نے اپنی سیلیوں کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ وہ تھیں تو شنزادی کی سیلیاں لیکن ان کا تقرر شاہ رچرڈ نے کیا تھا اس لئے وہ شنزادی کی راز دار ہونے کے باوجود شاہ رچرڈ کے لئے شنزادی جین کی جاسوسی کرتی تھیں۔ ادھر ملک العادل اور ادھر شنزادی جین اپنے اپنے ساتھیوں سے دوسرے کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

شنزادی کی ایک سیلی نے مزدور دے کے کہا۔ ”میں یقین سے کہتی ہوں اور شرط لگاؤ ہوں کہ ان میں آگے والا سوار سلطان صلاح الدین کا بھائی ملک العادل ہے۔“

”تمہارے یقین کی کوئی وجہ تو ہوگی؟“ شنزادی جین نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وجہ یہ ہے کہ میں لڑائی کے دوران اپنے لشکریوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بھاری بھر کم سوار جو سلطانی فوج کی سالاری کر رہا ہے سلطان کا بھائی ملک العادل ہے۔“

دوسری سیلی حیرانگی سے بولی۔ ”اچھا تو یہ وہ ملک العادل ہے جو پچھلا دن بہ اکیلے چٹا جاتا ہے؟“

پہلی سیلی نے فوراً تائید کی۔ ”ہاں ہاں یہ وہی ملک العادل اور اس کے لئے یہ با۔“

مشہور ہوئی ہے۔“

”یہ صرف دیکھنے میں بھاری بھر کم ہے یا فنون جنگ سے بھی واقفیت رکھتا ہے؟“ یہ سوال شنزادی نے اس طرح دھیمی آواز میں کیا تھا جیسے وہ سرگوشی کر رہی ہو یا خود سے ہم کلام ہو۔

”شنزادی عالیہ۔ میں نے اسے جنگ کرتے دیکھا ہے۔ یہ واقعی شیر ہے شیر۔“ پہلی نے جواب دیا۔ ”پورے مسلمان لشکر میں سلطان کے بعد دو بہادروں کے نام ہمارے لشکریوں میں مشہور ہیں۔ ایک ملک العادل اور دوسرا تقی الدین۔ ان دونوں پر سلطان کو بہت اعتماد ہے۔“

ملک العادل اور اس کے ساتھیوں میں بھی کچھ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ملک العادل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ہمیں رکتے دیکھ کر یہ آنے والے کیوں رک گئے۔ آخر یہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”محترم سپہ سالار اعلیٰ۔“ ایک سوار نے جواب دیا۔ ان آنے والوں میں ایک شنزادی جین ہے اور تین اسکی کنیزیں۔ اور باقی محافظ سوار ہیں۔“

شنزادی جین کے نام پر ملک العادل کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ ادی جین کون ہے؟“

سوار نے جواب دیا۔ ”محترم سپہ سالار۔ شنزادی شاہ انگلستان رچرڈ کی بہن ہے اور وہ کے ساتھ انگلستان سے آئی ہے۔ بڑی بڑر شنزادی ہے۔ اکثر اپنے پڑاؤ سے تمام سوار ہو نکل آتی ہے۔“

”اچھا۔ اس کا مطلب ہے کہ فرنگی لشکر میں ایک دیکھنے والی چیز بھی ہے۔“ اور ملک العادل نے خود بخود مسکرا دیا۔

”چلے حضور۔ قریب سے دیکھتے ہیں۔“ سوار نے کہا۔ ”میں نے بہت تعریف سنی ہے بی جین کی۔“

”نہیں۔ لڑکیوں سے ملنے جانا ہماری توہین ہے۔“ ملک العادل اک دم اکڑ گئے۔

”سپہ سالار۔ اگر لڑکی خود ملنے کی خواہش کرے تو؟“ سوار نے الٹا ملک العادل سے پوچھا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ ان کی خواہش ہے؟“ ملک العادل نے تیز نظروں سے دیکھا۔

میں ابھی معلوم کئے لیتا ہوں۔ آپ مجھے جانے کی اجازت تو دیجئے؟“ سوار نے باگ رجا کر کہا۔

”تم بہت جستجی معلوم ہوتے ہو قاصد۔“ سیلی چڑ کے بولی۔ ”شنزادی نے تمہارے الار کو گفتگو کی اجازت تو دے دی ہے۔ تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”شنزادی کی تنگ مزاج سیلی۔“ میرا نام شریف ہے اور شرافت کا جواب چاہتا ہوں۔ تمہارے جواب سے شنزادی کی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے شنزادی کسی کو حکم دے رہی ہیں۔“

”اے شریف اور شرافت کے پتلے۔۔۔“ سیلی نے دونوں ہاتھوں کے درمیان راسیں کے جیسے ہاتھ جوڑے۔۔۔ ”نا۔۔۔ بابا۔۔۔ میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی۔ اب مانف الفاظ میں کہہ رہی ہوں کہ یہ شنزادی عالیہ کی خواہش ہے، آرزو اور اور تمنا اب تو تم خوش ہو گئے۔“

”ہاں خوش تو ہو گیا۔“ شریف نے مسکرا کے کہا۔ ”مگر جب شنزادی عالیہ کی خوبصورت تک مزاج سیلی مجھے اپنا نام بتائے گی؟“

”دیکھو شریف۔ تم شرافت کے دائرے میں رہو۔“ سیلی مصنوعی غصہ سے۔ ”گفتگو شنزادی انگلستان اور سپہ سالار افواج اسلام کے درمیان ہونی ہے۔ اس میں نام کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

شنزادی اور دوسری سیلیاں ان دونوں کی نوک جھونک سے بہت لطف اٹھا رہی تھیں سکرائے جا رہی تھیں۔ حالانکہ میدان جنگ میں اس طرح کی ہنسی مذاق کا کوئی موقع نہ رہ سیکے اور قاصد کی باتوں ہی باتوں میں نوک جھونک شروع ہو گئی تھی۔

”اچھا شریف زادے اب جان چھوڑو بھی۔“ سیلی نے جواب دیا۔ ”میرا نام ہی سننا، ہو تو سنو۔ تمہارا نام شریف ہے اور میرا نام شریر ہے (Naughty)“

واہ واہ۔ کیا پیارا نام ہے۔ ”شریف ہنس پڑا اور گھوڑا اٹھا کر ملک العادل کی طرف چلا۔ یہ شنزادی ملک العادل اور شنزادی جین کی پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ شنزادی کی دل اور شنزادی کے محافظوں نے ان دونوں کو تنہائی میں گفتگو کا موقع فراہم کیا اور وہ تھوڑے دور ہٹ کے کھڑے ہو گئے تھے پھر بھی شنزادی اور شنزادہ میں حجاب مانع رہا انھوں نے صرف رسمی سی دو چار باتیں کیا لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ محبت کی الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی تو پھر یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس ملاقات کے دوران وقت شنزادہ اور شنزادی کی نظروں کے ملاپ یا تصادم میں گزرا اور انھوں نے نگاہوں میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا اور اس کا جواب بھی پالیا جو وہ زبان سے نہ کہہ سکے

ملک العادل نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہا۔ ”تم کیا کہو گے ان سے؟“

”سوار نے جواب دیا۔“ میں ان سے پوچھوں گا کہ وہ سپہ سالار لشکر اسلام ملک العادل کو دیکھ کر رک کیوں نہیں؟“

”ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔“ ملک العادل نے اسے اجازت دیدی۔

ملک العادل گرائڈ بھی اور بہت وجہ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کا ایک بیٹا جوانی کی منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔ لڑکیاں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، ملک العادل کو دیکھ کر ٹھنک کے کھڑی ہو جایا کرتی تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس دیو قامت انسان سے گفتگو کریں۔

سوار گھوڑا بڑھا کر اس جگہ پہنچا جہاں شنزادی اپنی سیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ادب سے شنزادی جین کو سلام کہا پھر اس طرح گویا ہوا۔ ”میں سپہ سالار لشکر اسلام اور سلطان صلاح الدین کے برادر محترم ملک العادل کا ایک ادنیٰ محافظ ہوں۔ کیا شنزادی عالیہ ہمارے سپہ سالار سے گفتگو کرنا پسند فرمائیں گی؟“

”کیا سپہ سالار ہم سے گفتگو پر آمادہ ہیں؟“ شنزادی نے یہی سوال محافظ سوار سے کر دیا۔

”بشرطیکہ شنزادی عالیہ اس کی خواہش فرمائیں۔“ محافظ سوار نے بڑی ذہانت سے جواب دیا۔

شنزادی سوار کے جواب پر گھبرا گئی۔ اس کی دل سے یہ خواہش تھی کہ وہ شنزادے ملک العادل سے ملاقات کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ ملک العادل میں وہ کوئی خویاں ہیں جن کی بنا پر اسے مسلمانوں کے لشکر کا سپہ سالار بنایا گیا ہے۔

یہ تو تھی اس کے دل کی بات مگر اب سوال یہ تھا کہ وہ اپنی خواہش کو ایک غیر موجود اس کی دشمن فوج کا ایک فرد تھا اس کے سامنے اسے کس طرح بیان کرے۔ آخر اس نے ایک سیلی کا سہارا لیا اور اس سے سرگوشیوں میں اپنا مدعا بیان کیا۔ سیلی نے سیلی کی طرف سے جواب کو ذہن میں ترتیب دیا پھر کہا۔

”اے مسلم سپہ سالار کے عقلمند قاصد۔ شنزادے ملک العادل ہماری شنزادی سے گفتگو کے لئے تشریف لا سکتے ہیں۔“

قاصد واقعی عقلمند اور ذہین تھا اس نے جواب میں کہا۔ ”اے انگلستان کی شنزادی کو خوبصورت سیلی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے سوال کا یہ جواب نہیں ہے یا پھر تم نے شنزادی کے جواب کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا۔“

اس طرف تو شہزادہ شہزادی نظروں کی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے اور دوسری شریف قاصد اور شریر سہیلی اپنے اپنے حلقے سے ہٹ کر دور جا کھڑے ہوئے تھے۔ اور گھوڑوں کے منہ تقریباً ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور وہ دونوں نہ معلوم کس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں ہاتھ کے اشارے بھی ہوتے تھے اور ہلکے تھپتھپے بلند ہوتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک زمانے سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

پھر جب شہزادہ اور شہزادی ایک گفتگو ختم کر چکے۔ شہزادہ محافظوں کی طرف لوٹ گیا شہزادی اپنی سہیلیوں میں آگئی اور ایک شہیلی نے ناٹی (شریر) کہہ کر اسے آواز دی کہ شریف اور ناٹی کو ہوش آیا اور کھیانی ہنسی کے ساتھ شہزادی کے پاس واپس لوٹ آئے اس ملاقات کے بعد شہزادی جین اور سپہ سالار لشکر اسلام شہزادے ملک عادل کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ شہزادی جین کی سہیلی ناٹی (شریر) بڑی بیباکی سے ملک عادل کے تک شہزادی کا پیغام لے جاتی۔ اسی طرح ملک عادل کا محافظ شریف فرنگی لشکر گاہ قریب ایک مقام تک جاتا جہاں یا تو ناٹی موجود ہوتی یا اس کی قبول اور کوئی کینز۔ شہزادہ ملک عادل کا پیغام پہنچا کر واپس آ جاتا۔ پھر طے شدہ منصوبے کے تحت جین اور ملک عادل میں ملاقاتیں ہوتیں تھیں۔

اتنی بڑی بات بھلا لشکریوں سے کیسے چھپ سکتی تھی۔ لشکر خواہ فرنگی ہوں یا مسلمان۔ انھیں تو کوئی مشغلہ چاہئے۔ چنانچہ پہلے یہ معاملہ فرنگی لشکر کا موضوع بنا۔ بات اتنی پھیلی کہ ایک دن شاہ رچڑ کے بھانجے کاؤنٹ ہنری آف ٹینن جسے رچڑ نے قبرص حاکم نامزد کر دیا تھا، اس نے شاہ رچڑ سے عرض کیا۔
”عالیجاہ۔ آج کل لشکر میں ایک افواہ گرم ہے“

شاہ رچڑ نے سراٹھا کر کاؤنٹ ہنری کو دیکھا مگر کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔ کاؤنٹ ہنری آف ٹینن ایک بیوقوف قسم کا انسان تھا۔ اس نے شاہ کی خاموشی کو نیم رضا سمجھا حالانکہ شاہ رچڑ کے چہرے کے تاثرات صاف ظاہر کرتے تھے کہ اسے یہ گفتگو ناگوار مگر زری ہے۔ کاؤنٹ نے دوبارہ بات شروع کی۔ ”عالیجاہ۔ لشکریوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا سالار ملک عادل ہماری خیمہ گاہ کے قریب اکثر دیکھا گیا ہے۔۔۔“

”دفع ہو جاؤ تم۔“ شاہ رچڑ نے اسے ڈانٹ دیا۔

کاؤنٹ ہنری منہ لٹکائے چلا گیا۔

شاہ رچڑ کے اس رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جین اور ملک عادل کی ملاقاتوں سے

واقف ہی نہیں بلکہ جین کی ہمت افزائی بھی کر رہا ہے۔ ادھر یہ خبریں سلطان صلاح الدین ایوبی کے کانوں تک مسلسل پہنچ رہی تھیں اور انھوں نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو ملک عادل پر پورا اعتماد تھا۔ ملک عادل شادی شدہ اور سنجیدہ پایہ تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر شہزادی سب کچھ جانتے ہوئے بھی ملک عادل سے شادی کی خواہش مند ہے تو وہ خواہ مخواہ دخل کیوں دے۔ پھر ابھی تک شاہ رچڑ کی طرف سے اس کے پاس کوئی پیغام بھی نہیں آیا تھا۔

پھر جب شاہ رچڑ نے ملک عادل کو دوبارہ بلاوا بھیجا تو وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ اس بار نژادہ ملک عادل بڑی شان و شوکت سے رچڑ کی ملاقات کے لئے گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک ت برا خیمہ لے گیا۔ اس کے علاوہ بیش قیمت اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے جن پر ریشی بولیں بڑی تھیں اور جن کا ساز و سامان مرصع اور جزاؤ تھا وہ سب ملک عادل نے شاہ رچڑ کو تحفہ میں پیش کئے۔

شاہ رچڑ نے بھی ملک عادل کے لئے نہایت شاندار خیمہ نصب کرایا اور اس میں سپہ سالار کی ضیافت دی۔ ملک عادل اپنے ساتھ شاہی باورچی خانہ سے اعلیٰ قسم کے کھانوں، طشت بھی لے گیا تھا۔ چنانچہ شاہ رچڑ کے مطبخ کے کھانوں کے ساتھ ملک عادل کے تھے آئے ہوئے شاہی کھانوں کے طشت بھی ضیافت میں رکھے گئے۔ یہ بڑی شاندار دعوت تھی ملک عادل کی سخن طرازیوں نے رچڑ کو اس کا مداح بنا دیا۔ ملک عادل سچ لطفے چھوڑتا تھا۔

رچڑ نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ ملک عادل ایک ہی نشست میں بھنا ہوا دنبہ کھا ہے۔ رچڑ نے اس آزمائش کے لئے ایک موٹا تازہ دنبہ ملک عادل کے لئے بھنویا۔ وہ دنبہ ملک عادل کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ رچڑ کو یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا کہ عادل نے دیکھتے ہی دیکھتے پورا دنبہ کھا لیا پھر یہ کہ وہ دوسرے کھانے بھی ساتھ ہی کھاتا رہا تھا۔ ایک پارسا مسلمان امیر جس میں زبان دانی، لطیفہ گوئی، شاہین بازی اور شکار ہر اور پھر اس کی جسمانی طاقت کا یہ حال ہو کہ مسلم بریاں دنبہ ایک وقت میں کھا کے تک نہ لیتا۔ اسے شاہ رچڑ پسند کیوں نہ کرتا۔

ضیافت کے دوران ایک بار شہزادی جین اچانک کھانے کے خیمے میں آگئی اور انتہائی کرنے کے باوجود ملک عادل اور جین کی ایک لمحہ کے لئے نظریں مل کے فوراً جھک کر پھر چلا گیا جین فوراً ہی شاہ بھائی سے معذرت کر کے فوراً ہی واپس ہو گئی تو شاہ جین کی دلی کیفیت پر مسکرا کے رہ گیا۔

اس کے بعد سے تو دونوں میں بڑے گہرے تعلقات ہو گئے مگر تعلقات جنگ سے الگ تھے۔ جنگ اپنی جگہ جاری تھی اور روزانہ جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ شاہ رچڑ کو جس چیز کی ضرورت پڑتی وہ بے تکلف ملک العادل سے منگوا بھیجتا اور ملک العادل اس کی فرمائش پوری کرنے میں خوشی محسوس کرتا۔ رچڑ کی طرف سے زیادہ شہرت کی فرمائش ہوتی پھر جب شاہ رچڑ کی بخار ہوا اور طبیعت خراب ہو گئی تو ملک العادل نے اس کے لئے جبل ہرمون کی برف پوش چوٹی سے اس کے لئے برف منگا کر بھیجا تھا غرض کہ ملک العادل بڑی خندہ پیشانی سے رچڑ کی فرمائش پوری کرتا اور اس سے مروت اور خودداری سے پیش آتا تھا۔ مسلمان مورخین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ ملک العادل اور شاہ رچڑ اس دوستی کے پردے میں ایک دوسرے کے ذہن اور طبیعت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فرنگیوں کے ایک گپ باز ناول نگار نے رچڑ کی اس بیماری کے سلسلہ میں یہ ایک گپ چھوڑی ہے کہ رچڑ کی بیماری کے دوران خود سلطان صلاح الدین ایوبی، ایک طبیب کا روپ دھار کے شاہ رچڑ کے پاس گیا تھا اور اس نے رچڑ کا علاج کیا تھا۔

یہ سراسر جھوٹ ہے۔ پہلے تو یہ کہ سلطان صلاح الدین کو فن طب سے نہ کوئی رغبت تھی اور نہ اس کا کوئی تجربہ تھا پھر وہ طبیب بن کے رچڑ کا علاج کرنے کیسے جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ سلطان اس کی بیماری کے زمانہ میں تازہ پھل اور برف بھجوا کرتے تھے۔ اس جگہ یہ بات بھی نظریں رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب رچڑ نے ملک العادل کی ضیافت کی تھی تو ملک العادل اپنے ساتھ شاہی بادچی خانے کے کھانے کے ٹٹت کے ٹٹت بھروا کے لے گیا تھا۔ ادھر رچڑ نے ملک العادل کے لئے مسلم بھنا ہوا دنبہ پیش کیا تھا۔ ان حالات میں یہ تو ممکن ہے کہ سلطان نے رچڑ کے علاج کے لئے اپنا طبیب بھیجا ہو لیکن اس کے خود جانے کا کوئی تکیہ نہیں بلکہ یہ محض ایک افسانہ اور سروالز اسکاٹ کا جدت طبع ہے۔

اس کے علاوہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سلطان اور رچڑ میں نہ تو میدان جنگ میں کبھی سامنا ہوا اور نہ جنگ ختم ہونے کے بعد کبھی انکھا ہوئے حالانکہ شاہ رچڑ نے اس کی کئی بار کوشش کی تھی۔

دو تین ماہ بعد رچڑ نے ایک بار پھر ملک العادل کو دعوت کا پیغام بھیجا کیونکہ ملک العادل اس کی نظروں میں ایک پروقار اور حسن اخلاق کا پیکر تھا۔ ملک العادل نے رچڑ کو مثبت جواب دیا اور دن اور وقت مقررہ پر اپنے رسالے کے ساتھ رچڑ کے خیمہ دربار میں پہنچ گیا۔ ان تین ماہ کے دوران ٹائی اور شریف کے توسط سے شہزادی جین اور ملک العادل میں کئی بار ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور خفیہ ملاقاتوں میں بات کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی

تھی۔ شہزادی جین نے ملک العادل کے سامنے اپنا دل نکال کے رکھ دیا تھا اور ملک العادل نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر سلطان نے یہ رشتہ منظور کر لیا تو وہ انکار نہیں کرے گا بلکہ کاپیالی کی کوشش بھی کرے گا۔

شاہ رچڑ کو ان خفیہ ملاقاتوں کی نہ صرف فوراً اطلاع مل جاتی تھی بلکہ آخری دنوں میں شہزادی جین نے خود ہی اپنی ملاقاتوں کی تفصیل سے شاہ بھائی کو آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس دفعہ ملک العادل کو جو دعوت دی گئی تھی وہ جین ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شہزادی جین نے شاہ رچڑ کو یقین دلایا تھا کہ اگر سلطان کو اس کی اور ملک العادل کی شادی کی تجویز پیش کی گئی تو ملک العادل اس رشتہ کی حمایت کرے گا۔

دراصل شاہ رچڑ اب صلیبی جنگ سے عاجز آ گیا تھا۔ اس نے شاہ فرانس اور مارکوئیس کونریڈ کو زچ کر کے لشکر کی باگ ڈور تو سنبھال لی تھی لیکن ان دونوں کے ساتھ چھوڑ جانے کے بعد جب عملی طور پر رچڑ مکہ سے فرنگی لشکر کی ساتھ بیت المقدس کی بازیابی کے لئے روانہ ہوا تو اس کے لشکر کو پہلی منزل پر پہنچنے تک مسلمان چھاپے ماروں سے اس قدر جانی نقصان پہنچا کہ اس کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

یہی حال شاہ رچڑ کا تھا۔ اس نے ملکہ برگیریا کو اپنے خیمے میں آنے سے قطعی روک دیا تھا۔ گرمی، بارش اور ریگستانی آب و ہوا نے اس کی ہمت پر برا اثر ڈالا تھا لیکن وہ بیت المقدس کے حصول کا بیڑہ اٹھا کر پھنس گیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ سلطان سے کسی طرح کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے اور اس کی عزت بچے۔

پھر جب جین اور شہزادے ملک العادل کا معاملہ اس کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اس کی آڑ میں ایک بڑی شاطرانہ چال چلی۔ چنانچہ جب ملک العادل کی تیسری دعوت ختم ہوئی جس کے دوران شہزادی جین کئی بار شاہ رچڑ کے کمرے میں آئی اور اس نے ملک العادل سے رسمی گفتگو بھی کی۔ تو شاہ رچڑ نے ملک العادل کے سامنے ایک نہایت دلچسپ مگر بڑی شاطرانہ تجویز رکھی۔

شاہ رچڑ نے ملک العادل سے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”اب مسلم سپہ سالار ملک العادل میرے ذہن میں اس طویل جنگ و جدل کو ختم کرنے کی ایک تدبیر موجود ہے اگر تم پسند کرو تو ہم اس کی تفصیل سے تمہیں آگاہ کریں؟“

ملک العادل نے فوراً جواب دیا۔ ”شاہ انگلستان جانتے ہیں کہ میں فیصلہ کرنے میں قطعی دیر نہیں کرتا۔ آپ تجویز پیش کیجئے میں فوراً اس پر اپنی رائے ظاہر کروں گا۔“

شاہ رچڑ نے بھی بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”ہمارے ذہن میں اس جنگ کو ختم کرنے کی

نہ کہ وہ اس سلطان پر الزام لگانے سے باز نہیں آتے جس نے مصر میں عیسائیوں کے پہلی بار تلواریں بے تیام کی تو آج تک وہ تلواریں اس کے ہاتھ میں بے تیام ہی ہیں۔ آٹھ سال تک تو اس نے عراق اور شام کے ان خود سر امیروں، سرداروں اور شاہوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لئے جنگ کی۔ پھر جب دمشق کی سلطنت مضبوط ہوئی تو اس نے جہاد کا آغاز کیا اور قبلہ اول بیت المقدس کی بازیابی شروع کی۔ اس لئے اسے پہلے شام کی تمام عیسائی حکومت سے ٹکرائی اور آخر کی کرم نوازی سے سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی تیسری صلیبی جنگ شروع ہو گئی اور پورا دہائی یورپ، فلسطین پر چڑھ کر پ کی سلطنتوں میں مسلمانوں کے خلاف فلسطین اور یروشلم کے بھگڑے پادریوں تدر زہر اگلا اور مسلمانوں کے ظلم و ستم کے اتنے فرضی قصے بیان کئے کہ وہاں کے لوگوں کے صلیبی جنگ میں شرکت اور یروشلم (بیت المقدس) کی بازیابی کے لئے بنا شروع ہو گئے۔ شاہ انگلستان، شاہ فرانس، شاہ جرمنی، پورے یورپ کے نائش، سپلز، ایڈریاٹک کے ممالک ناروے، فن لینڈ، یوگوسلاویہ، پرشیا، سفلیہ، غرض ہر ایک کا کوئی ایسا ملک نہ تھا جس نے اپنا لشکر تیسری صلیبی میں شرکت کے لئے نہ

پس سال کا تھا کا ماندہ سلطان پورے یورپ کے سامنے سینہ سپر تھا۔ یورپ والے اور سلطانی لشکر دس سال سے مسلسل جنگ کر رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے سے قاہرہ (مصر) چھوڑا تھا اسے وہاں جانے کا موقع نہ مل سکا۔ دس برس سے دارالسلطنت و دمشق سے نکلا ہوا تھا اور اسے ایک دن کا بھی آرام نہ مل رہا تھا۔ روکتے مگر سلطان علی الصبح گھوڑے کی پیٹھ پر نظر آتا، ایسے سلطان، ایسے مجاہد کس کالے منہ سے الزام لگائے۔ اس کا کروار بے داغ تھا۔

یہی سلطان کے متعلق شاہ رچرڈ یہ سوچ سکتا تھا کہ صلاح الدین کی حکومت عوام پر نہیں بلکہ وہ تو عوام اور خواص کے دلوں پر بھی حکومت کرتا تھا۔ ملک شاہ رچرڈ کو صحیح جواب دیا تھا کہ ”فیصلہ سلطان ہی کر سکتے ہیں۔“ اور پھر سلطان ملک العادل کی شادی کی تجویز کا فیصلہ کر دیا مگر وہ فیصلہ انتہائی غیر متوقع اور بڑا

نادل نے رچرڈ کی ضیافت سے واپس آنے کے بعد سلطان صلاح الدین سے عالیجاہ۔ شاہ رچرڈ نے آج کی ضیافت میں ایک ایسی تجویز پیش کی کہ میں اسے

بہترین ترکیب یہ ہے کہ میری پیاری بہن شہزادی جین اور تمہاری شادی کر دی جائے اور شادی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے سلطان صلاح الدین اور عیسائیوں کی طرف سے شاہ انگلستان یعنی ہم اپنے اپنے متفقہ علاقے نئے شادی شدہ جوڑے کو پیش کر دیا۔ اس طرح یروشلم پر فریقین کا پر امن تسلط ہو جائے گا۔ زائیں آزادانہ مقامات مقدسہ کی زیارت کر سکیں گے اور صلیب الصلوات عیسائیوں کو مل جائے گی۔“

شاہ رچرڈ نے بظاہر یہ تجویز بڑے غلو سے پیش کی لیکن یہ مکاری سے پر تھی اور مسلمانوں کو فریب دینے کی زبردست سازش تھی۔ تجویز پیش کرنے کے بعد رچرڈ نے ملک العادل کی طرف اس کا رد عمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ ملک العادل ایک کھرا سپاہی تھا اس نے فوراً جواب دیا۔ ”اگر سلطان نے اس رشتے کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا تو میں اس تجویز سے انکار نہ کروں گا لیکن اس کا فیصلہ صرف سلطان محترم کریں گے۔“

شاہ رچرڈ کو ملک العادل کے جواب پر بڑا تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادہ ملک العادل مسلمان فوجوں کا سپہ سالار ہے اور شاہی خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بڑی حد تک آزاد خیال اور خود مختار ہو گا مگر ملک العادل کے جواب سے شاہ رچرڈ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سلطان صلاح الدین نہ صرف جنگی اور ملکی معاملات میں مطلق العنان ہے بلکہ اس کے امیروں کی ذاتی زندگی بھی سلطان کے تابع ہوتی ہے۔ جب سپہ سالار کو سلطان کی ذات اور اس کے وقار کا اتنا خیال تھا تو پھر عام سرداروں اور لشکریوں کا کیا حال ہو گا۔

یورپین مورخین اور شاہ رچرڈ کے قیدیہ خوانوں نے سلطان پر الزام لگایا ہے کہ مسلمان لشکر پر سلطان کی گرفت مضبوط نہیں تھی اور وہ اکثر حکم عدولی کر جاتا تھا۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ فرنگی لشکر پر شاہ رچرڈ کی کتنی گرفت تھی اس کا حال تو ابھی تحریر کیا گیا ہے کہ جب شاہ رچرڈ نے اپنی سرداروں کی پہلی کانفرنس میں کہا۔

”سلطان عثمان کو برباد کر رہا ہے۔ ہمیں فوراً اسے بچانے کے لئے روانہ ہونا چاہئے۔“

اس کے جواب میں شاہ رچرڈ کے سرداروں نے جس سردہری کا اظہار کیا اس کا حال قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں۔ شاہ رچرڈ کو مجبور ہو کر کہنا پڑا۔

”اچھا تو پھر جاناکا فیصلوں کو درست کیا جائے۔“

شاہ فرانس آگنس فلپ، رچرڈ سے ناراض ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ مارکس کونریڈ نے رچرڈ کے رویہ سے بدل ہو کر صلیبی جنگ سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان حالات میں فرنگی مورخوں کو سلطان صلاح الدین پر الزام لگاتے ہوئے ذرا بھی شرم

سن کر حیران رہ گیا۔

اس وقت سلطان کے پاس ان کو وزیر، مشیر اور موسخ بھاء الدین بھی موجود سلطان نے ملک العادل سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ملک العادل کو حوصلہ ہوا اور اس نے عرض کیا۔ ”عالیجاہ۔ شاہ رچڑ نے دعوت کے کہا کہ اس طویل جنگ کو اب ختم ہو جانا چاہئے اور پھر خود ہی اس نے جنگ کے خاتمہ یہ تجویز پیش کی کہ اس کی بہن شہزادی جین کی شادی آپ کے اس غلام ملک العادل سے دی جائے۔“

سلطان اور بھاء الدین نے چونک کے ملک العادل کو دیکھا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو یہ تو معلوم تھا کہ شہزادی جین، ملک العادل کو ملاقات کے لئے اکثر اپنی ایک سہیلی ذریعہ بلوایا کرتی ہے اور ملک العادل ملاقات کو جاتا ہے۔ مگر کسی نے بھی اس معاملہ کو سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک انکشاف پر انھیں حجب ہوتا ہی تھا۔ ملک العادل خاموش ہوا تو دوسرے ہی لمحے سلطان کی پر رعب آواز ابھری۔ ”رچڑ کیا شرائط رکھی ہیں؟“

ملک العادل گھبرایا مگر فوراً سنبھل کے بولا۔ ”عالیجاہ۔ شاہ رچڑ نے کسی شرط کا تا نہیں لیا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ اس شادی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے سلطان صا الدین اور فرنگیوں کی طرف سے وہ یعنی شاہ انگلستان اپنے مفتوحہ علاقے نئے شادی جوڑے کو پیش کر دیں۔ اس طرح یروٹلم پر فریقین کا پر امن تسلط ہو جائے گا۔ زائر آزادانہ مقامات مقدس کی زیارت کر سکیں گے اور صلیب اہلبوت عیسائیوں کو واپس جائے گی۔“

سلطان کے چہرے پر ہلکی سی کرتختگی آئی۔ انہوں نے فرمایا۔ ”ملک العادل کیا نہیں تجویز میں کوئی شرط پوشیدہ نظر نہیں آتی؟“

اب ملک العادل کے بوکھلانے کی باری تھی۔ اس نے اسی بوکھلاہٹ میں کہا۔ ”عالیجاہ میں نے اس تجویز پر کچھ غور نہیں کیا اس لئے کہ تجویز کا فیصلہ کا حق سلطان صلاح الدین ایوبی اور صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس ہے۔“

سلطان کے چہرے کی شکنیں درست ہو گئیں۔ ”تم جانتے ہو ملک العادل۔“ اور سلطان نے ملک العادل کو رخصت کر دیا۔ ملک العادل نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ واقعی سلطان کے سوال پر بہت زیادہ گھبرا گیا تھا۔

ملک العادل کے جانے کے بعد سلطان اس طرح خاموش ہوا جیسے وہ اپنے ذہن میں ک

فیصلے پر پہنچ جانا چاہتا ہو۔ بھاء الدین وہاں موجود تھا لیکن اس نے صلاح الدین کے خیالوں میں خلل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ سلطان صلاح الدین ہر اہم فیصلے کے وقت گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں اور وہ اس وقت تک کسی کی بات کا جواب نہیں دیتے جب تک کسی نتیجہ پر پہنچ نہ جائیں اور جب وہ کسی اچھے یا برے نتیجے پر پہنچ جاتے تھے تو ان کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو جاتے تھے۔

بھاء الدین دیر تک سلطان کے چہرے پر نظریں کمائے بیٹھا رہا پھر اچانک سلطان نے بھاء الدین کی طرف دیکھا۔ بھاء الدین نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ سلطان کا چہرہ اپنی حالت پر آگیا تھا۔

”اگر غلام غلطی نہیں کرتا تو سلطان معظم کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں؟“ بھاء الدین نے بڑے ادب سے کہا۔

سلطان نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ ”تم ہمارے مزاج واقف ہو بھاء الدین۔ تم نے درست اندازہ کیا۔“

”کیا غلام کو ایک سوال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی؟“ بھاء الدین نے حوصلہ کر کے کہا۔

”ایک نہیں دو سوال کر سکتے ہو بھاء الدین۔“ سلطان کو لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ سوال کرنے کے لئے بھاء الدین کو محتاط ہونا پڑا۔ اس کے سوال سے سلطان منفض بھی ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے نظریں نیچی کر کے سوال کیا۔ ”کیا سلطان عالی مقام شاہ انگلستان کی تجویز منظور فرمالیں گے؟“

”ضرور۔“ سلطان نے صرف ایک لفظ میں جواب دیا اور فوراً دیا۔

بھاء الدین اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ سلطان کا اس لفظ ”ضرور“ کا کیا مطلب ہے۔ بھاء الدین سلطان کا منہ چڑھا تھا۔ اس نے پھر جرات کی۔ ”غلام، عالیجاہ زبان سے ادا ہونے والے لفظ ”ضرور“ کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔ اس لئے کہ غلام عقل اب بوڑھی ہو چکی ہے؟“

”بھاء الدین۔“ سلطان نے پورے اطمینان سے کہا۔ ”لفظ ”ضرور“ اپنے اصلی معنی میں تعال ہوا ہے۔ ہم نے تمہارے سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔“

”جی عالیجاہ۔“ بھاء الدین کا پورا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس کی نظریں سلطان کے بے پرواہی کے رہ گئیں۔

”بھاء الدین۔ تم ہماری بات اب بھی نہیں سمجھ سکے۔“ سلطان نے ٹھہرے لہجے میں

کی تھی تو وہاں بھاء الدین بھی بیٹھا تھا۔ ملک العادل کے دل میں کھلبلی یا مگدگی سی ہو رہی تھی کہ خدا معلوم سلطان نے شادی کی تجویز کا کیا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ ان نے جو بھی فیصلہ کیا ہو گا اس کا علم بھاء الدین کو ضرور ہو گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ الدین خود ہی سلطان کے فیصلے سے اسے آگاہ کرنے آیا ہو۔

بھاء الدین نے بیٹھتے ہوئے ملک العادل سے کہا۔ ”پہ سالار بہادر۔ میں آپ سے کچھ نہ آیا ہوں۔ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے؟“

ملک العادل بڑی خوشدلی سے بولا۔ ”محترم آپ میرے بزرگ ہیں۔ سلطان کے مزاج آپ کو کس قدر دخل ہے۔ اس کا بھی مجھے علم ہے۔ میں آپ سے کوئی بات چھپانے شش نہیں کروں گا بشرطیکہ وہ کوئی فوجی راز نہ ہو۔“

”طمینان رکھئے پہ سالار۔“ بھاء الدین نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ ”میں آپ سے ایسی بات دریافت نہ کروں گا جس کا تعلق فوجی معاملات سے ہو۔ ہاں اس کا تعلق کے دل سے ضرور ہو سکتا ہے۔“

”شکریہ وزیر محترم۔“ ملک العادل نے جواب دیا۔ ”اب میں آپ کے ہر سوال کا دینے پر آمادہ ہوں۔“

لہنگو کچھ ذاتی سی ہو رہی ہے اس لئے میں آپ کو پہ سالار کے بجائے شہزادے سے مخاطب کروں گا۔ اس سے آپ کے وقار میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا؟“ بھاء الدین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ہرگز نہیں بزرگ محترم۔“ ملک العادل بھی مسکرایا۔ ”بلکہ مجھے اس مخاطب سے خوشی اس لئے کہ میں دن بھر پہ سالار۔ پہ سالار سنتے سنتے تنگ آ جاتا ہوں اور مجھے ہوتا ہے جیسے میں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔“

پنجا خیر چھڑئے ان باتوں کو۔“ بھاء الدین نے موضوع بدلا۔ ”میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کراتا ہوں جو شاہ انگلستان نے آپ کے ذریعہ سلطان معظم تک پہنچائی۔“

ایسے۔ اس بارے میں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“ ملک العادل کا خیال درست

اس تجویز میں شہزادے بہادر کا بھی کوئی دخل ہے؟“ بھاء الدین نے ایک چھپتا واسوال کیا۔

ملک العادل چکر اگیا۔ ”میں آپ کا سوال سمجھ نہیں سکا بزرگ محترم۔ کیا آپ

کہا۔“ اب ایک بار تم اپنے سوال کو پھر دہراؤ اور ہمارے جواب کو غور سے سنو۔

بھاء الدین کی نظریں ایک بار پھر سلطان کے چہرے پر پھنپیں۔ اس نے محسوس کیا سلطان کے چہرے پر برا فروختگی اور غصہ کے کوئی آثار نہیں۔ اس لئے اس نے بڑے واضح طریقے سے اپنا سوال دہرایا۔ ”میں عالیجاہ کی زبان سے اس تجویز کا جواب سننا چاہتا ہوں جو شاہ انگلستان نے اپنی بہن شہزادی بھین اور ہمارے پہ سالار شہزادہ ملک العادل کی شادی کے سلسلے میں پیش کی ہے۔ کیا عالیجاہ اس تجویز کو منظور فرمائیں گے؟“

”بھاء الدین۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ بھین اور ملک العادل کی شادی کی تجویز ہم منظور کر لیں گے۔“ سلطان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کے جواب دیا۔ ”اب اس سلسلہ میں ہم سے کوئی سوال نہ کیا جائے“

بھاء الدین نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس سلسلہ میں کیا بھاء الدین نے اس دن پھر کسی اور سلسلہ میں بھی بات نہیں کی مگر جب وہ سلطان سے اجازت لے کر جانے کے لئے تیار ہوا تو سلطان نے اسے سمجھایا۔

”بھاء الدین۔ تمہیں اس بات پر سخت تعجب ہوا کہ ہم نے شہزادی بھین اور شہزادے ملک العادل کی شادی پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم تمہارے اس تعجب سے خوش ہوئے اس لئے کہ اس شادی کے بارے میں جو مسلمان بھی سننے گا اسے تعجب ہو گا یا پھر افسوس کرے گا لیکن ہماری ایک بات اور یاد رکھنا وہ یہ کہ ہم نے شادی کی اجازت دیدی ہے مگر یہ شادی نہیں ہوگی۔ اب تم جاسکتے ہو بھاء الدین۔“

بھاء الدین کو سلطان کے پہلے جواب پر بھی تعجب ہوا تھا اور مب ان کے یہ کہنے پر کہ ان کے قبول کرنے پر بھی یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ اس نے بھاء الدین کو اور زیادہ متعجب کیا۔ کیونکہ سلطان کی رضامندی کے بعد نہ تو ملک العادل اس سے انکار کر سکتا تھا اور نہ سلطان کا کوئی لشکری اس سلسلہ میں زبان کھولنے کا مجاز تھا۔ سلطان کے لشکریوں اور سرداروں کا یہ اعتقاد تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی جو کہتے ہیں اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوئی ہے اس لئے سلطان کے اس شادی پر رضامند ہونے میں بھی کوئی مصلحت ضرور ہو گی۔

بھاء الدین کے دل میں جیسے پٹکھے لگے ہوئے تھے۔ وہ سلطان کے پاس سے اٹھ کے پہ سالار شہزادہ ملک العادل کے پاس پہنچا۔ ملک العادل نے اسے خوش آمدید کہا۔ بھاء الدین سلطان کا منہ چڑھا وزیر، مشیر اور مورخ بھی تھا۔ مگر اس وقت بھاء الدین کو خوش آمدید کہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھا کہ جب ملک العادل نے شاہ رچڑ کی تجویز سلطان کے سامنے

طمان سے سوالیہ انداز میں دریافت کیا کہ وہ اس تجویز کو منظور کر لیں گے اور سلطان نے
سنہ فرمایا کہ وہ اس تجویز کو منظور کرتے ہیں۔ سلطان نے اپنے اس فرمان کی تین بار
ریف کر کے اسے ناقابلِ تنسیخ بنا دیا۔

شادی کی تجویز شہزادہ ملک العادل لے کے آیا تھا۔ اس لئے سلطان نے شہزادے کو
بکر کے اسے پیغام دیا۔

”شاہ انگلستان رچرڈ کو ہماری طرف سے پیغام دیا جائے کہ ہم نے شہزادی جین اور
وہ ملک العادل برادرزادہ صلاح الدین ایوبی کی شادی کی تجویز پسند کی اور منظور فرمائی
۔ اس نسبت کا اعلان کر دیا جائے۔“

شہزادے ملک العادل کو کیا کہنا تھا۔ وہ پیغام سن کر ذرا دیر کھڑا کہ شاید کچھ اور ارشاد
میں لیکن ادھر خاموشی تھی۔ شہزادے نے اجازت طلب کی۔ ”عالیجاہ۔ کیا مجھے اجازت
اور کیا یہ پیغام اسی وقت پہنچانا ہے؟“

”اجازت ہے۔ پیغام جب چاہے پہنچا سکتے ہو۔“ سلطان کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔
ملک العادل نے سلام کیا اور خیمہ سے نکل آیا۔ خیال رہے کہ رچرڈ نے تجویز چار دن
بھیجی تھی اور سلطان صلاح الدین نے اس کی منظوری آج دی تھی۔ ان چار دنوں کے
ن شہزادی جین نے ٹائی (شریر) کے ذریعہ ملک العادل کو کوئی پیغام بھیجا اور نہ ملک
نے شہزادی کو کوئی اطلاع دی۔ ملک العادل، سلطان کے فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا اور
ن کو بھی اسی فیصلہ کا انتظار تھا وہ جانتی تھی کہ سلطان جیسے ہی فیصلہ کریں گے ملک
اپنے قاصد شریف کے ذریعہ اسے فوراً مطلع کریں گے۔

پیغام پہنچانے کا حکم ملک العادل کو دیا گیا تھا لیکن شہزادہ بغیر اطلاع رچرڈ کے پاس جا
بنی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے ملک العادل نے شریف کو بلا کر
ا۔ ”تم فوراً شاہ رچرڈ کے خیمہ پر جاؤ اور ان سے کہو کہ ملک العادل ان سے ملاقات
شہند ہے۔“

شریف کو معلوم تھا کہ ملک العادل شادی کی تجویز لائے ہیں مگر اسے ابھی یہ نہ معلوم
کہ سلطان نے تجویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ اس لئے وہ ملک العادل کا حکم سننے
بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

شریف۔۔۔ شہزادہ ملک العادل چڑ گیا۔ ”تمہیں کچھ حکم دیا گیا ہے تم خاموش کیوں

وضاحت فرمائیں گے؟“ شہزادہ بہت سنبھل کے بول رہا تھا۔

”بہت مناسب سوال ہے آپ کا۔“ بھاء الدین نے جواب دیا۔ ”میں دراصل یہ معلوم
کرنا چاہتا ہوں کہ اس تجویز میں آپ کا کس حد تک دخل ہے۔ شاید میں اب بھی پوری
طرح واضح نہیں کر سکا۔ اگر مکیہ کہوں کہ شاہ انگلستان نے یہ تجویز پیش کرنے سے پہلے
اس سلسلہ میں آپ کی رائے مانگی تھی یا خود آپ نے شاہ انگلستان کو اس بات پر آمادہ کیا
تھا کہ وہ اس طرح کی تجویز سلطان معظم کے پاس بھجوائیں؟“

”میرے بزرگ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رچرڈ نے مجھ سے اس سلسلے میں کبھی
کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اس سے اس قسم کی درخواست کی۔“ ملک العادل نے
بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”ہاں میرے کان اس سلسلہ میں گناہگار ہیں کہ میں نے یہ بات
کسی اور ذریعہ سے سنی تھی کہ شاہ رچرڈ کے ذہن میں کوئی ایسی تجویز ہے۔“

بھاء الدین نے شہزادے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ ”اور آپ تک یہ بات
پہنچانے والا ذریعہ شاہ رچرڈ کی بہن جین ہے؟“

”درست فرمایا آپ نے۔“ اور شہزادے نے شراب کر سر جھکا لیا۔

بھاء الدین نے فوراً ہی ایک اور سوال کیا۔ ”شہزادے بہادر۔ آپ کا کیا خیال ہے۔
سلطان معظم اس تجویز کا کیا جواب دیں گے؟“

”یہ سوال تو میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔“ ملک العادل نے جواب دیا۔ ”میں تجویز
پیش کر کے چلا آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان نے آپ سے اپنا رد عمل ضرور بیان کیا
گا؟“

”ہاں شہزادے“ بھاء الدین فکر مند لمبے میں بولے۔ ”سلطان معظم نے تجویز پر غور ہو
فرمایا اور فیصلہ بھی کر دیا۔“

”یعنی سلطان نے رچرڈ کی تجویز نامنظور کر دی؟“ ملک العادل نے دھڑکتے دل سے
پوچھا۔

یہی تو حیرت انگیز بات ہے شہزادے۔“ بھاء الدین نے خشک منہ سے کہا۔ ”سلطان
معلم نے تجویز نامنظور نہیں کی بلکہ بڑی فراخ دلی سے اس تجویز کو منظور فرمایا ہے۔“

”کیا ج؟“ ملک العادل کا دل کھل اٹھا۔ ”آپ میری دلداری کے لئے تو نہیں کہہ رہے
ہیں؟“

”نہیں شہزادے۔ سلطان معظم کی بات میں جھوٹ کی آمیزش کا میں تصور نہیں کر
سکتا۔“ بھاء الدین تھکا تھکا تھا۔ ”دراصل یہ خود مجھے پسند نہیں آئی۔ اس لئے میں نے

لیکن پھر اس نے یہ بات اپنے وقار کے خلاف تصور کی کہ وہ ایک قاصد سے اپنی بہن کی شادی کے بارے میں گفتگو کرے۔ قاصد چلا گیا۔ لیکن اسکے آنے سے شاہ رچڑ کی بے چیتوں میں اضافہ ہو گیا۔

شاہ رچڑ اگرچہ ایک جذباتی اور نا تجربہ کار بادشاہ تھا لیکن وہ اس قدر بھولا بھی نہ تھا کہ جنگ کے حالات اور اپنے لشکر کے رویے سے یہ اندازہ نہ لگا سکتا کہ یروٹلم کی بازیابی کی جنگ ختم ہو چکی ہے اور اگر اپنی عزت بچانا چاہتا ہے تو کسی طرح سلطان صلاح الدین ایوبی سے کوئی باعزت سمجھوتہ کر لے۔ اس کے لشکر نے جب سے عسقلان کی طرف سے کوچ کرنے انکار کیا تھا اس کا دل اس سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے جب جوش اور جذبہ سے صلیبی لشکریوں کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اس کا وہ جوش اور جذبہ سرد پڑ گیا تھا اور وہ چوبیس گھنٹے اپنا وقار بچانے کی فکر میں رہنے لگا تھا۔

پھر جب شہزادی جین کا مسئلہ اس کے سامنے آیا تو اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ایک طرف تو اس نے شہزادی جین کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ شہزادے ملک العادل سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکے اور دوسری طرف اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ شہزادہ ملک العادل و اسلامی لشکر کا سپہ سالار، سلطان کا بھائی اور دست راست ہو اس کے ذریعہ وہ سلطان سے کس طرح مراعات حاصل حاصل کی جاسکتی ہیں جبکہ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان صلاح الدین اپنے بھائی کا بہت لحاظ کرتا ہے اور اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔

پھر ہفتوں اور مہینوں کے غور و خوض کے بعد وہ یہ منصوبہ بنانے میں کامیاب ہوا تھا کہ شہزادی جین اور ملک العادل کی شادی ہو جائے تو اس کے لشکریوں کے لئے یروٹلم کی اہمیت کو جانے کا راستہ کھل جائے گا۔ اس کی اس شرط میں کوئی وزن نہ تھا کہ اس شادی سے یروٹلم (بیت المقدس) میں داخل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ سلطان نے بیت المقدس کو ایک ایسے قلعہ میں تبدیل کر دیا تھا جس سے کوئی لشکر سرتو ٹکرا سکتا تھا مگر اس اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ رچڑ کے لئے یہی بات باعث طمانیت تھی اس شادی سے یروٹلم کی زیارت کرنے والوں کے کم از کم آنسو تو پچھ جائیں گے۔ اس لئے وہ اس تجویز ایمائی کے لئے اس قدر بے چین تھا۔

شاہ رچڑ اسی ادھیڑ بن میں اٹھ کے ٹل رہا تھا کہ اچانک اس کے خیمے کے ایک بغلی سے شہزادی قبرس سوسن داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی رچڑ کا پارہ چڑھ گیا اور اس طرف شہزادی سوسن کا رنگ زرد پڑ گیا۔

سوسن! رچڑ تقریباً "جیج پڑا۔" تمہیں بغیر اجازت ہمارے پاس آنے کی جرات کیسے

شریف نے ملک العادل کے لمبے کی تلخی محسوس کی مگر شہزادے کا رازدار تھا اس لئے سوال کر بیٹھا۔ "شہزادہ ہمدرد۔ آپ نے شاہ رچڑ کے لئے پیغام دیا ہے لیکن میں شہزادی عالیہ سے کیا کہوں گا۔ وہ مجھے اس طرح تو نہ آنے دیں گی؟"

"کہہ دیتا کہ ہم خود آ کے بات کریں گے۔" ملک العادل نے ٹال دیا۔

شہزادہ ملک العادل چاہتا تھا کہ سلطان کی رضامندی کی اطلاع وہ شہزادی کو اپنی زبا سے دے۔ اس لئے اس نے شریف کو ٹال دیا تھا۔ شہزادے کو شریف پر غصہ اس وجہ سے آیا تھا کہ رچڑ کے پاس جانے میں دیر کیوں کر رہا تھا جبکہ ملک العادل، شاہ انگلستان۔ فوراً ملاقات کرنا چاہتا تھا۔

شریف کا رخ جب شہزادی جین کے خیمے کی طرف ہوتا تو کوئی پیریدار اسے نہ روکتا یہ شہزادی کا حکم تھا مگر اس وقت شریف سیدھا شاہی خیمہ کی طرف جا رہا تھا۔ شاہی خیمہ چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا تھا۔ شاہی محافظوں نے شریف کو ٹوکا پھر جب شریف نے بتایا کہ وہ سپہ سالار افواج اسلامی کا ضروری پیغام لے کر شاہ رچڑ کے پاس جا رہا ہے تو پانچ سوار۔ شریف کے ساتھ ہو لئے۔ خیمے سے کچھ دور پہلے سوار گھوڑوں سے اترے اور ان میں سے ایک شاہی خیمے میں گیا۔ چند لمحوں بعد سوار واپس آیا اور اس نے شریف کو بتایا کہ شاہ انگلستان اس کے منتظر ہیں۔

شریف نے شاہ کے سامنے پہنچ کر سر کو ذرا خم کر کے سلام کیا۔

"تمہارا نام شاید شریف ہے؟" شاہ نے دریافت کیا۔

"جی شاہ معظم۔ مجھے شریف کہتے ہیں۔" شریف نے ادب سے جواب دیا۔

"کہو۔ ہمارے خوددار اور خوش مزاج دوست نے کیا پیغام بھیجا ہے؟" شاہ نے اس سے پوچھا۔ اس وقت شاہ کے پاس کوئی اور نہ تھا۔ شاہ رچڑ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے قلم الگ رکھ دیا اور شریف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"شاہ معظم۔ شہزادے ملک العادل سپہ سالار افواج اسلام آپ سے فوراً ملاقات کی خواہشمند ہیں؟" شریف نے پیغام سنایا۔

"ارے۔ اس میں اجازت کی کیا ضرورت تھی۔" شاہ رچڑ نے ٹھنکتے دلی سے کہا۔ "شہزادے ملک العادل ہمارے دوست ہیں وہ ہر وقت تشریف لاسکتے ہیں۔"

شاہ رچڑ خود بھی ملک العادل سے ملاقات کے لئے بے چین تھا۔ اس نے چاہا کہ ملک العادل کے قاصد سے دریافت کرے کہ اس کے سلطان نے شادی کی تجویز کا کیا فیصلہ کیا۔

ہوئی؟“

سوسن کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑانے لہجے میں کہا۔ ”عالیجاہ۔ گستاخی معاف کی جائے دراصل مجھے ایک ایسی خوشخبری ملی تھی جسے میں عالیجاہ کو سنانے کے لئے اس قدر بے چین ہوئی کہ آداب شاہی کا بھی لحاظ بھول گئی۔“

”خوش خبری۔“ رچرڈ رک کے کھڑا ہو گیا۔ ”کیسی خوشخبری۔ تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں سخت سزا دیں گے؟“

”عالیجاہ۔ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے سلطان نے شہزادی اور شہزادے ملک العادل کی شادی منظور کر لی ہے۔“ سوسن نے لرزتے ہوئے کہا۔

”کیا سچ؟“ شاہ رچرڈ دو قدم سوسن کی طرف بڑھ آیا۔

”جی عالیجاہ۔ میں شاہ کے حضور جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ سوسن میں ذرا حوصلہ پیدا ہوا۔

شاہ رچرڈ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ خیمہ کا بیرونی پردہ اٹھا اور غلام نے داخل ہو کر کہا۔

”مسلمان سپہ سالار ملاقات کے آرزو مند ہیں۔“

رچرڈ کا چہرہ بحال ہو گیا۔ اس نے سوسن کو جانے کا اشارہ کیا اور غلام سے مخاطب ہوا۔ ”شہزادے ملک العادل کو عزت اور احترام سے اندر لاؤ۔“

غلام باہر گیا پھر ملک العادل کو لے کے اندر آیا۔ شہزادے نے شاہ کی تعظیم کی۔

”ملک العادل۔“ شاہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے آنے سے ہماری طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔“

رچرڈ نے ملک العادل کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔

باہر کا موسم کیسا ہے شہزادے؟“ اور رچرڈ نے شہزادے کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”بہت خوشگوار موسم ہے شاہ معظم۔“ ملک العادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں خوشگوار موسم کی اطلاع دینے ہی آیا ہوں۔“

”اچھا۔“ اور شاہ رچرڈ بھی مسکرا دیا۔

”سلطان معظم نے شاہ کی تجویز کو شرف مقبولیت بخشا ہے اور اظہارِ مسرت فرمایا ہے۔“ شہزادے ملک العادل نے بڑی مسرت سے کہا۔

شاہ رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا مگر اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ”یہ بہت اچھا ہوا۔ مخلوق خدا جنگ کی آگ سے بچ جائے گی۔“

”درست فرمایا شاہ نے۔“ شہزادہ ملک العادل خود بھی خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ ”شاہ کا اب اگلا قدم کیا ہو گا؟“

”ہم آج ہی سرداروں کی میٹنگ طلب کریں گے اور ایک دو روز میں اپنے قاصد کے ذریعہ سلطان کو آئندہ انتظامات کے بارے میں مطلع کریں گے۔“ شاہ رچرڈ نے پر مسرت لہجے میں مگر ٹھہر ٹھہر کے جواب دیا۔

”اچھا مجھے اجازت دی جائے۔“ ملک العادل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اتنی جلدی شہزادے؟“ شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”جی ہاں۔ مجھے بھی بہت سے انتظامات کرنا ہیں۔“

شہزادہ ملک العادل کو جلدی اس لئے تھی کہ شہزادی عین اس کی منتظر تھی اور اس نے کھلویا تھا کہ اس سے ملے بغیر شہزادہ واپس نہ جائے۔

ملک العادل نے شاہ کے پاس سے واپسی پر شہزادی عین سے ملاقات کی جو اپنی شریر (نائی) سیلی کے ساتھ اس خاص جگہ پر کھڑی تھی جہاں وہ دو قوتوں ملا کرتے تھے۔ شہزادی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ملک العادل کو اس کے چہرے ہی سے اندازہ ہو گیا کہ شہزادی کو اس کی خبر ہو چکی ہے۔

”مبارک ہو شہزادی۔ سلطان نے تجویز منظور فرمائی۔“ شہزادے نے پھر بھی اپنی طرف سے مبارک باد دینا مناسب سمجھا۔

”شہزادے بہادر کو بھی مبارک ہو۔“ عین نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ ”مجھے جب سے معلوم ہوا ہے اس وقت سے میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔“

شہزادہ ملک العادل اس سے بہت کچھ کہتا اور سننا چاہتا تھا لیکن اسی وقت نائی نے شہزادی سے کوئی بات سرگوشیوں میں کہی۔ شہزادی نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

”شہزادے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات پورے لشکر میں پھیل گئی ہے اور فوجی سردار شاہ بھائی کو مبارکباد دینے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا یہاں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ میں آپ کو جلد ہی بلواؤں گی۔ اس وقت تک بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔ اچھا رخصت۔“

اور شہزادی نائی کا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ شہزادے کے دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں۔ اس نے چاہا کہ شہزادی کو بتا دے فوج کے سرداروں کو شاہ نے مشورہ کے لئے طلب کیا ہے لیکن شہزادی کچھ پریشان سی ہو گئی تھی اس لئے اس نے شہزادی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک معاہدہ کے حق میں تھا اور دوسرا معاہدہ کی شدید مخالفت کر رہا تھا۔

قلعہ مکہ اور صور کی طرف قاصد دوڑا دئے گئے تھے۔ شاہ انگلستان کے خیمہ پر سخت پہرہ لگ گیا تھا۔ دراصل اس زمانہ میں یورپ کے تمام ممالک میں دو طاقتیں حکومت کرتی تھیں۔ ایک تو ملک کے بادشاہ کی طاقت اور دوسرے کلیسا کی طاقت۔ یعنی پادریوں کی اور مذہبی لوگوں کی طاقت۔ یہ طاقت بادشاہ وقت کی طاقت سے کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور یہ طاقتیں ایک دوسرے کو بچا دکھانے کے لئے اکثر ششیر بکھت ہو جاتی تھیں جس طرح اس وقت ہو رہا تھا۔

یہ ہنگامہ اس قدر بڑھا کہ بیچارے شاہ انگلستان رچرڈ کو اپنی پوزیشن اور عزت بچانا مشکل ہو گیا۔ آخر شاہ رچرڈ کو یروٹلم کے سابق اسقف پطرس کو گفتگو کے لئے بلانا پڑا۔ اسقف چار دوسرے پادریوں کے ساتھ شاہ سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تقریباً ایک ہزار سواروں کے ایک مسلح اور مضبوط دستہ کو شاہ رچرڈ کے خیمے کے گرد ذرا دور پر غرق کیا اور انھیں حکم دیا کہ اگر شاہ رچرڈ اسے گرفتار کریں تو یسوار حملہ کر کے اسے گرفتار کرنے والوں نے ہاتھوں سے چھڑا لیں۔

اسقف شاہ کے خیمے میں داخل ہوا تو شاہ اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا اور قف کا ہاتھ چوم کے اسے اپنے ساتھ مسند پر بٹھالیا۔

شاہ رچرڈ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”اے مقدس یروٹلم کے مقدس اسقف اعظم۔ ہم نے مسلمان سلطان کے پاس ایک تجویز بھیجی تھی۔ اس کی نمایاں شرط یہ تھی کہ صلیب سلب ہمیں واپس کر دی جائے۔ اس کے علاوہ مقدس یروٹلم پر دونوں قوموں کا پرامن ہو اور خدائے یسوع مسیح کو ماننے والے تمام عیسائی یروٹلم کی بلا روک ٹوک زیارت کے لئے جایا کریں۔ اس کے لئے ہم نے کسی لشکر، کسی سردار یا کسی محافظ کلیسا کی کوئی فی نہیں دی بلکہ اپنی سگی بہن شہزادی جین کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ اگر کلیسا کے زار کے مالک ہمارے اس قدم کو غلط سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے تو ہم اس سے انکار دیں گے کیونکہ اس طرح کا کوئی معاہدہ ابھی تک ضبط تحریر میں نہیں آیا۔“

شاہ کے خاموش ہوتے ہی یروٹلم کے اسقف نے بھرے دربار میں نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ ”شہزادی جین ہماری بہن اور خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کے پیروکاروں سر کا تاج اور افتخار ہے۔ اسے ہم مسلمانوں کے سپہ سالار کے حوالے کر کے عیسائیوں عیسائیت کی گردن نہیں جھکا سکتے۔ یروٹلم کی زیارت کے لئے ہم شہزادی جین کا سودا

”تک آئے فوجی سرداروں کو جب شاہ انگلستان رچرڈ نے سلطان کے ساتھ طے پانے والے صلحنامہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ ایک سردار نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

”یہ سب کچھ خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کی مہربانیوں سے ہوا ہے۔ وہ ہمیں یروٹلم کی زیارت سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔“

دوسرے سردار نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک جاسوس نے بتایا ہے کہ یروٹلم کو صلاح دین نے ایک آہنی قلعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے فتح کرنا کیسا ہمارا لشکر اس کی تفصیل تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔“

شاہ رچرڈ کو اگرچہ ان کی باتیں اچھی لگ رہیں تھیں لیکن اس نے اس کانفرنس کو طول نہیں دیا اور یہ کہہ کے رخصت کر دیا کہ اس خبر کو لشکریوں کو مشتر کر دیا جائے۔

صلیبی سردار شاہ انگلستان کے پاس سے خوشی خوشی اٹھے مگر جب وہ اپنے یونٹ میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ لشکریوں کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی ہے اور وہ اس پر ملا جلا رد عمل کر رہے ہیں۔ شاہ کے انگلستان کے فوجی دستے تو اس معاہدہ کی شرائط پر رضامند ہیں مگر فرانسیسی فرمیں جو فرانس کے شاہ آگنس فلپ کے جانے کے بعد شاہ انگلستان کی زیرِ ممان دیدی گئی تھیں وہ اس معاہدہ کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔

سب سے زیادہ مخالفت چرچ کے پادریوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ ان پادریوں کا پیشوا یروٹلم کا وہی لارڈ پادری ہے جس نے مارکوئیس کوئزید اور شہزادی ازابیلا کی شادی میں روڑے اٹکائے تھے۔ وہ خیمہ گاہ میں ہزاروں لشکریوں کے درمیان کھڑا جیج جیج کر کہہ رہا ہے۔

”شاہ انگلستان نے انگلستان کی عزت اور آبرو کا سودا کیا ہے۔ انھوں نے شہزادی جین کو مسلمانوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ یورپ کے لشکر یروٹلم کی مقدس زمین کو مسلمانوں سے بازیاب کرانے آئے تھے مگر شاہ انگلستان نے اپنی خاندانی عزت اور حرمت کا سودا کر کے صلیب مقدس کے شیدائیوں کو یروٹلم کی زیارت کو سر جھکا کے فقیروں کی طرح جانے کا حق حاصل کیا۔ غرت مند صلیبی اس بے غیرت صلحنامہ کو نہیں تسلیم کریں گے۔ ہم یروٹلم پر قبضہ کریں گے یا اس پر قربان ہو جائیں گے۔“

فرنگی خیمہ گاہ اور لشکریوں میں اک ادھم مچ گیا تھا۔ وہ سردار جو شاہ انگلستان سے خوشخبری سن کے آئے تھے وہ اپنے اپنے خیموں میں جا چھپے تھے۔ انھیں بھرے ہوئے لشکریوں کے سامنے جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ لشکریوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ان میں

کی شادی کر کے ہم سے صرف یہ عایت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ یورپ سے آنے والوں کو یروشلم کی زیارت حاصل ہو جائے۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو شاہ رچڑ یقیناً "اپنے لشکریوں کی تمام ہمدردیاں حاصل کر لیتا۔

"مگر سلطان معظم اس مزح ہمیں بیت المقدس کو شہزادی کی منہ دکھائی میں کیا نہ دیتا پڑتا؟" بھاء الدین نے گھبرا کے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"شہزادی کو کچھ نہ ملتا بھاء الدین۔ سلطان نے جواب دیا۔ "شہزادی جین بھائی سے رشتہ ہو کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے کلمہ حق پڑھ کے مسلمان ہو چکی ہوتی اور مکہ کے قلعہ کے علاوہ یہ تمام قلعے جنہیں ہم نے مسمار کرا دیا تھا اپنے ساتھ جہیز میں لے کے آتی۔"

اب بھاء الدین کی عقل ٹھکانے آگئی۔ "سبحان اللہ۔ عالیجاہ کس قدر دور رس نظروں کے مالک ہیں۔ ایک بات اور بتا دیجئے عالیجاہ؟" بھاء الدین نے درخواست کی۔

"اور کیا پوچھتا ہے؟" سلطان نے کہا۔

"مگر کلیسا نے اس شادی کی مخالفت کیوں کی؟" بھاء الدین نے دوسرا سوال اٹھایا۔

"اس لئے کہ نہ تو یروشلم پر نصرانی حکومت قائم ہوتی اور نہ یروشلم کالارڈ پادری اپنے عہدے پر فائز ہو پاتا پھر وہ اس شکست کی بدنامی میں کیوں شامل ہوتا۔" سلطان نے بھاء الدین کو قائل کر دیا۔

دوسرے دن سے پھر جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ لشکر جو یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ شہزادی جین اور ملک العادل کی شادی کے بعد عیسائی بے دھڑک یروشلم کی زیارت گاہوں میں داخل جا سکیں گے ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ شاہ رچڑ کو اپنی گردن بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس نے نصرانیوں کو یروشلم کی زیارت کرنے کے لئے اپنے طور پر بڑا کامیاب منصوبہ بنایا تھا لیکن کلیسا نے اس کے ایک نہ چلنے دی۔

سلطانی دستوں کے حملے تیز ہو گئے۔ وہ دن میں بھی حملہ آور ہوتے اور رات کے اندھیرے میں بھی شب خوں مارتے۔ ایک بار تو وہ شاہ رچڑ کے خیمے تک پہنچ گئے تھے اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ ایک اور موقع پر فرنگیوں اور سلطانی حملہ آور دستوں میں جھڑپ ہو رہی تھی کہ رچڑ کو جو تاؤ آیا تو گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ میں کود پڑا۔

سلطانی حملہ آوروں میں سے کسی نے رچڑ کو پہچان لیا۔ اس نے فوراً آواز لگائی۔ "یہ شاہ انگلستان ہے جانے نہ پائے۔"

یہ آواز سنتے ہی سلطانی سواروں نے رچڑ کو گھیر لیا مگر ٹھیک اسی وقت ایک فرنگی سوار

کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ ہم شاہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس تجویز کو فوراً ختم کر دیں اور یروشلم کو بزور شمشیر مسلمانوں کے ناپاک وجود (حاکم بدین) سے پاک کریں۔"

شاہ رچڑ نے ہنگامہ کو سرد کرنے کے لئے تجویز ختم کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا۔

"ہم۔" منیر چڑ شاہ انگلستان خلوص دل سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم اسقف اعظم کے ساتھ ہیں اور ہم اپنی تجویز واپس لینے اور ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

اسقف کے پاس اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔ شاہ رچڑ کے آدمیوں نے فوراً شاہ رچڑ زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

آخر یروشلم کے اسقف کو کہنا پڑا۔ "ہم شاہ انگلستان کے شکر گزار ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ تمام لشکر بلا تفریق قومیت ان کے حکم کے تحت یروشلم کے لئے اپنی جانیں قربان کر دے گا۔"

اس سے اگلے دن سلطان صلاح الدین کے خیمہ پر شاہ انگلستان رچڑ کے قاصد پہنچا اور اس نے شاہ رچڑ کا زبانی پیغام پہنچایا۔

"سلطان عالی مقام۔" قاصد نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "ہمارے شاہ انگلستان رچڑ نے آپ کی خدمت میں پیغام بھیجا ہے کہ شاہ کی بہن شہزادی جین کسی مسلمان سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں۔"

سلطان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ "پیغام ہمیں مل گیا۔ تم جا سکتے ہو قاصد۔" سلطان نے رچڑ کے قاصد کو رخصت کر دیا۔

بھاء الدین اس وقت سلطان کے پاس موجود تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سلطان کو اور کبھی رچڑ کے قاصد کو دیکھ رہا تھا۔

سلطان نے فرمایا۔ "تمہیں کس بات کی حیرت ہے بھاء الدین۔ کیا ہم نے اسی دن تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ یہ تیل موٹے سے نہیں چڑھے گی؟"

"مگر کیوں عالیجاہ۔ رچڑ نے کیوں انکار کیا؟" بھاء الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں فرنگیوں کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ شکست کھانے کے بعد بھی وہ ایک باعزت معاہدہ کر رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین نے بھاء الدین کو سمجھایا۔ "بھاء الدین نصرانی حکومتوں کی یہ بد قسمتی ہے کہ وہ ملک پر دو طاقتیں بیک وقت حاکم ہوتی ہیں۔ ایک بادشاہ وقت کی طاقت اور دوسری نصرانی کلیسا کی طاقت جسے پادری اور لارڈ پادری سنبھالے ہوئے ہیں۔ شاہ رچڑ بہن

پھر سلطان کی طرف سے اعلان ہوا۔ ”شاہی لشکر کو مئی تک کے لئے رخصت دی جاتی ہے۔“

اس کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہی لشکر مسلسل چار سال سے شام میں جنگ کر رہا تھا۔ سلطان کے اس اعلان نے ان کا دل جیت لیا۔

فرنگی لشکر بدل تھا۔ شاہ رچرڈ کو پیڑ فورڈ کے پادری کی زبانی انگلستان کی کئی بری خبریں موصول ہوئی تھیں۔ پادری ولیم، بشپ آف دہلی کا خط لایا تھا جس میں تحریر تھا کہ شاہ رچرڈ کے بھائی اول جان نے شاہی چانسلر کو برخاست کر کے خزانہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان بری خبروں کے ساتھ ساتھ اہل جینوا اور اہل پیرا آپس میں الجھ پڑے۔ مکہ کے بازاروں میں انھوں نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ شاہ رچرڈ فوری طور پر تصفیہ کے لئے مکہ پہنچا۔ اس نے مخالف فریقوں کے سرغنوں کو طلب کر لیا۔ مگر ان کے بیانات نے شاہ رچرڈ کو اس شکست کا احساس دلا دیا۔ وہ ان کے قیادت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

فریقین نے اگرچہ دست بستہ عرض کیا مگر یہ شاہ رچرڈ سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور اس کی صریحا توہین کی جا رہی تھی۔

انھوں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”ہم لوگ جنگ کے التوا اور یروٹلم کے نامزد شاہ گائی کی نالائقی سے بیزار ہیں۔ ہماری قیادت مارکوئیس کوزیڈ آف مانسٹرٹ کر سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوزیڈ شاہ یروٹلم کی حیثیت سے فوجوں کی رہنمائی کرے۔“

انھوں نے شاہ رچرڈ کو دودھ کی مکھی کی طرف درمیان سے نکال پھینکا تھا۔ شاہ رچرڈ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور ان کا مطالبہ مان لیا۔ کوزیڈ کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ مکہ پہنچ جائے اور شاہ یروٹلم کی تاجپوشی کے بعد صلیبی فوجوں کی کمان سنبھالے۔ شاید شاہ رچرڈ کے انگلستان کی فوجوں کے علاوہ باقی تمام صلیبی لشکری خلاف ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا۔

لیکن حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ مارکوئیس کوزیڈ اپنے مرکز صور سے تاجپوشی کے لئے مکہ روانہ ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اسے شیخ الجبل کے فدائیوں نے قتل کیا تھا۔ قاتل گرفتار ہوئے اور انھوں نے بیان دیا کہ انھیں کوزیڈ کے قتل پر شاہ رچرڈ نے مامور کیا تھا۔

رچرڈ پر یہ الزام تو لگ گیا لیکن ثابت نہ کیا جاسکا۔ رچرڈ نے سرداروں اور امیروں کو جمع کر کے کہا۔ ”کوزیڈ کے قتل کے بعد ہنری کاؤنٹ آف تمپن کو یروٹلم کا بادشاہ بنا کے اس کے ہاتھ میں فوجی کمان دی جائے تاکہ وہ یروٹلم کی بازیابی کی جنگ جاری رکھے۔“

سلطانی حملہ آوروں کو لٹکارا۔ ”ادھر آؤ۔ شاہ انگلستان میں ہوں۔ میرا مقابلہ کرو۔“ یہ آواز ایک فرنگی ٹائٹ ولیم آف بیرو کی تھی جس نے شاہ کے لئے قربانی پیش کی اور حملہ آوروں کو خود کو شاہ انگلستان ظاہر کر کے اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ اس کی آواز سن کر سلطانی سوار اصلی رچرڈ کو چھوڑ کے منتقل رچرڈ کے گرد ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ یہی شاہ رچرڈ کیونکہ وہ ٹائٹ تھا اور بڑی تیزی سے تلوار چلا رہا تھا۔

سلطانی سواروں نے ولیم آف بیرو کو گھیر لیا تھا اور اسے آسانی سے قتل کر سکتے تھے لیکن شاہ انگلستان کو قتل کرنے کی انھیں اجازت نہ تھی اس لئے انھوں نے کمندیں پھینک کر ولیم آف بیرو کو گرفتار کر لیا اور اسے سلطانی خیمہ گاہ میں لے گئے۔ اس طرح ولیم کی کوشش سے شاہ رچرڈ گرفتاری سے بچ گیا۔

اب عام طور سے شاہ رچرڈ کے بجائے سرداروں اور امیروں کا حکم چلتا تھا۔ انھوں نے حکم صادر کیا۔ ”ساری فوج عسقلان کو جائے اور اس کی فسیلیں تعمیر کرے۔“

جب یہ خبر فوج میں مشہور ہوئی تو ان میں مایوسی پھیل گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ فرنگی لشکر بیت المقدس کا محاصرہ کرنے سے قاصر تھا۔ سلطان صلاح الدین کی منظم فوجوں کی موجودگی نے فرنگیوں کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ فرانسیسی امیر محاصرے پر زور دیتے تھے لیکن فرنگی سرداروں اور امیروں نے بیت المقدس سے مایوس ہو کر محاصرہ کا خیال چھوڑ دیا تھا اور کوئی منصوبہ تیار نہ کیا تھا۔ انھوں نے فوجی چھاؤنی کو پھاڑوں میں منتقل کر کے سپاہیوں کو صرف خوش کیا تھا تاکہ دور ہی سے بیت المقدس کی ایک جھلک دیکھ سکیں لیکن اس سے ان میں اور زیادہ مایوسی پھیل گئی۔

سرداروں اور امیروں کے حکم کے تحت فرنگی لشکر عسقلان کی طرف چلا۔ مایوس اور بدل فرنگی اپنے گھوڑوں کو مار کے ان پر اپنا غصہ اتارتے تھے۔ اس طرح ہشتم ہشتم وہ شام تک رملہ پہنچ گئے۔ رملہ میں بھی فرنگی فوج موجود تھی مگر مایوس اور بدل۔ بے شمار فرانسیسی ڈبوک آف برگنڈی کے ساتھ چلے گئے۔ شاہ رچرڈ اپنے ہتھیار کاؤنٹ ہنری آف تمپن کے ساتھ اہلین کو چلا گیا۔ دوسرے دن بعد از دوپہر فرنگی لشکر عسقلان پہنچا۔ سلطان صلاح الدین نے عسقلان کو زمین کے برابر کرا دیا تھا۔ فصیلوں کے پتھر سمندر میں پھینکا دئے گئے تھے۔ پورا شہر برباد پڑا تھا۔

ادھر سلطان صلاح الدین کو جاسوسوں نے اطلاع پہنچائی۔

”عالیجاہ۔ فرنگی لشکر مورچے چھوڑ کر سمندر کی طرف پہا ہو گیا ہے۔“

سلطان نے سر کی جنبش سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

اس بات کو سب نے تسلیم کر لیا۔ مارکوئیس کونزیڈ کے قتل اور شاہ انگلستان کے فوجی کمان چھوڑ دینے سے سلیسوں کے مخالف گروہوں میں صلح ہو گئی۔ وہ سب قلعہ صور میں آئندہ منصوبہ بندی کے لئے جمع ہوئے۔ ہنری کاؤنٹ آف ٹیمپن بھی وہاں پہنچ گیا۔ شہزادی ازابیل جب سے کونزیڈ نے شاہ یروٹلم بننے کی خاطر شادی کی تھی۔ وہ کونزیڈ کے مرنے سے بیوہ ہو گئی تھی۔ سلیسوں نے ہنری کاؤنٹ آف ٹیمپن سے ازابیل سے شادی کی درخواست کی جس نے اسے قبول کر لیا۔ شاہ سکٹان سکاٹی جسے شاہ رچرڈ نے شاہ فرانس آگسٹ فلپ کی مخالفت مول لے کر یروٹلم کا آئندہ بادشاہ بنا دیا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لئے رچرڈ نے اسے قبرص کی بادشاہی عطا کر دی۔

شاہ رچرڈ کو فرانس کے اندر چھوٹی چھوٹی جنگوں کا تجربہ تھا مگر بیت المقدس کی جنگ میں لاکھوں کے لشکر شریک تھے۔ کھلے میدان میں اتنے بڑے لشکر کو لڑانے کا رچرڈ کو کوئی تجربہ نہ تھا اس لئے وہ اس ذمہ داری سے ہی سبکدوش ہو گیا مگر اسے معلوم تھا کہ یروٹلم کو سلطان صلاح الدین کے قبضہ سے کوئی طاقت واپس نہیں لے سکتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی سفارتی کوششیں جاری رکھیں۔

رچرڈ نے سلطان کے پاس ایک بار پھر ایک سفارش بھیجی۔ سفیر نے سلطان کے سامنے رچرڈ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ انگلستان نے سلطان کی خدمت میں سلام عرض کیا اور کہا ہے کہ مسلمانوں اور فرنگیوں کے لشکروں کی حالت بہت خستہ ہو گئی ہے۔ فریقین کے ہزاروں لشکری میدان جنگ میں کام آئے ہیں پھر بھی ہم تمام عمر یروٹلم کے حصول کی کوشش سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ سلطان براہ کرم اردن سے پیچھے ہٹ کر اپنا لشکر ہٹا لے جائیں۔ دوسرے یہ کہ صلیب السلوب سلطان کے لئے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر عیسائیوں کے لئے وہ ایک انتہائی مقدس چیز ہے اس لئے سلطان اسے واپس فرمائیں۔“

سلطان نے سفارت کو دوسرے کمرے میں بھیج کر اپنے سرداروں سے مشورہ کیا پھر سفارت کو واپس بلا کر پیغام دیا۔ ”بیت المقدس کو ہم عیسائیوں سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کا سفر بیت المقدس سے ہی شروع کیا تھا اور قیامت کے دن مخلوق خدا کا اسی جگہ حساب ہو گا اس لئے شاہ اس خیال کو دل سے نکال دیں کہ ہم بیت المقدس کو کبھی ان کے حوالے کریں گے۔ رہا صلیب السلوب کا مسئلہ تو اس کا ہمارے پاس رہنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ بیت المقدس کی جنگ جب تک جاری رہے گی ہم آپ کو یہاں سے ایک پتھر بھی ہلانے نہیں دیں گے۔“

سفارت واپس ہو گئی۔ شاہ رچرڈ کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔

سفارت کی واپسی پر سلطان نے اپنے سرداروں سے خطاب کیا۔ ”مگر ہم ان سے کسی شرط پر بھی صلح کریں تو ان بدعبدوں کی کیا ضمانت ہے۔ قلعہ مکہ کے رہنماؤں کو اسی شاہ رچرڈ کے حکم سے یہ تیغ کیا گیا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم جہاد کو جاری رکھیں اور جب تک ان کو سمندر میں دھکیل نہ دیں ہاتھ نہ روکیں یا پھر جنگ کرتے کرتے ٹہید ہو جائیں۔“

باسی کڑھی میں ایک بار پھر اہل آیا۔ نصرانی فوجیں گردوغبار میں لپٹی ہوئی درہ سفید (تل مانیہ) سے گزر کر دامن کوہ کی طرف بڑھیں۔ یہاں سے سڑک گہری گھاٹی میں بل کھاتی یروٹلم کی طرف جاتی تھی۔ مگر اب ان کا آگے بڑھنا رک گیا۔ سلطان صلاح الدین کو ملوم ہو گیا کہ فرنگی فوجیں حرکت میں آئی ہیں۔ چنانچہ ان کے چھاپہ واردستوں نے فرنگیوں کے سامان رسد کی گاڑیوں پر حملہ کر کے انھیں تہہ و بالا کر ڈالا۔ سامان کے محافظ فوجی لاطانی دستوں کے ہاتھوں سے مارے گئے اور پورے لشکر میں چیخ و پکار پڑ گئی۔ فرنگی فوجوں و رکنا پڑا۔ رچرڈ نے اول آف لیٹر کو چھاپہ ماروں کے مقابلہ پر بھیجا اور باقی لشکر آلات اصرہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اس دوران شاہ رچرڈ کو اطلاع ملی کہ یہ مصر سے ایک بڑا تجارتی قافلہ قریب پڑاؤ لے ہوئے ہے۔ رچرڈ کو شاید ”شیردل“ رچرڈ بننے کا یہی موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ کئی ہزار اردوں کے ساتھ تجارتی قافلہ پر حملہ آور ہوا۔ اس قافلہ میں بچے اور عورتیں بھی تھیں ان رچرڈ کی فطری سفاکی عود کر آئی اور اس نے بے دریغ قافلے والوں کو قتل کر کے ارقی سامان لوٹ لیا۔ اس کامیاب چھاپے پر رچرڈ کو ”شیردل“ رچرڈ کا خطاب ملا اور اس نے نام کے نعرے لگائے گئے اور خوب خوشیاں منائی گئیں۔

ادھر سلطان کو نصرانی لشکر کے متحرک ہونے کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ انھوں نے طرف تو اپنے چھاپہ واردستوں کو متحرک کر دیا جس نے فرنگی لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور دوسری طرف سلطان نے یروٹلم کے گرد بننے والی فصیل کو فوراً مکمل کرنے کا حکم دیا۔

سلطان نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر معماروں کے انگریزی کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ سلطان نے فصیل کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے کئی روں کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ سارا دن معمار پوری تندہی سے کام کرنے اور دروں کے گروہ کے گروہ بھاری پتھر اٹھا اٹھا کے لاتے۔ بعض اوقات سلطان گھوڑے سے

رسد کی لائن کو کاٹ دیں گے۔ پھر شہر کا محیط اتنا بڑا ہے کہ محاصرے کے لئے بھی کافی لشکر درکار ہو گا۔ اس کے باوجود ہم ترکوں کے حملے کو نہیں روک سکیں گے۔ ہم شکست کھا کر رنام نہیں ہوتا چاہتے۔“

فرنگیوں کا یہ جھگڑا صبح تک ہوتا رہا۔ مختلف گروہوں نے مختلف انداز میں اس پر گفتگو کی پھر صبح کو سلطانی جاسوس نے اطلاع دی۔

”عالیجاہ۔ فرنگیوں نے پڑاؤ چھوڑ دیا ہے اور مکہ کی طرف لوٹ گئے ہیں۔“

اس طرح نصرانیوں کے متحدہ لشکر جس میں پورے یورپ کے فوجیں شامل تھیں اس پر سلطان صلاح الدین کو فتح حاصل ہوئی اور رچرڈ نے دروغ گو یورپین مورخوں نے ”شیر“ کا خطاب دیا تھا اس نے بغیر مقابلہ کے شکست تسلیم کر لی اور میدان چھوڑ کر بھاگ با۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیس ہزار سواروں کو پسپا ہوتے ہوئے فرنگی لشکر پر آخری رکنے کے لئے روانہ کیا۔ فرنگیوں کا لشکر منتشر ہو کر بھاگ رہا تھا۔ سلطان کے سواروں نے ان پر طوفانی حملہ کیا۔ پہلے ان کے تمام رسد کو برباد کیا پھر انہیں گاجر مولیٰ کی ح کاٹ کے رکھ دیا۔ فرنگیوں کی پسپائی میں جس قدر ان کا جانی نقصان ہوا اس کا اندازہ لاکھ سے زیادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس تیسری صلیبی جنگ میں نصرانی لشکر کے مرنے کی مجموعی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بیت المقدس کی ایک بھی اپنے ساتھ نہ لے جاسکے۔

شاہ انگلستان رچرڈ چاہتا تھا کہ اس کے فلسطین چھوڑے سے پہلے کوئی ایسا معاہدہ ہو کہ ملک شام میں عیسائیوں کے مقبوضات محفوظ ہو جائیں۔ اس نے سلطان سے پھر ایک درخواست کی مگر سلطان نے انکار کر دیا۔ اب اس نے ملک العادل کی خوشامد کی وہ ان میں پڑ کر معاہدہ کرا دے۔ آخر ملک العادل نے زور دینے پر سلطان نے اپنی ندی ظاہر کی۔

یہ معاہدہ یورپ کے سلیبس جن میں شام کے تمام بڑے بڑے نصرانی سردار بھی شامل سلطان صلاح الدین ایوبی کے درمیان 20 شعبان سنہ 588 ہجری مطابق 2 ستمبر سنہ 1190 عیسوی بروز چار شعبہ ہوا۔ معاہدہ کی معیاد چوالیس مہینے تھی۔ اس کے ساتھ مکہ کو بیت المقدس کی زیارت کی عام اجازت دیدی گئی۔

ابنہ کے فوراً بعد شاہ انگلستان ناکام و نامراد اپنے ملک روانہ ہو گیا۔ ادھر قدرت نے سلطان کو بیت المقدس کے حصول کے لئے ہی دنیا میں بھیجا تھا۔ یہاں کہ اس نے

اتر کر مزدوروں کے گردہ میں شامل ہو جاتا اور بذات خود پتھر ڈھونڈ لگتا۔

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ یروشلم کے گرد زمین سنگلاخ ہے اور ان میں کتوں کھونا ممکن ہے۔ سلطان صلاح الدین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے بیت المقدس کے گرد آب رسانی کے جتنے وسائل تھے انہیں مسدود کر دیا۔ چشے بند کرا دئے گئے۔ حوض پار دئے گئے اور کنوؤں کو توڑ دیا گیا۔ اس طرح بیت المقدس کے باہر بیس بیس میل تک پانی کا نشان باقی نہیں رہ گیا۔

یہ خبر فوراً فرنگی لشکر میں پہنچی۔ ایک جاسوس نے اطلاع دی۔

”عالیجاہ۔ سلطان نے یروشلم کے گرد اگر د کے تمام چشموں کے بند کرا دیا ہے۔ کنوؤں کو تڑوا دیا ہے اور حوضوں کو پڑا دیا ہے۔ دور دور تک پانی کا پتہ نہیں۔“

رچرڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ لشکریوں اور خصوصاً سوار فوج کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اس خبر سے فرنگیوں میں کھلبلی مچ گئی اور لشکریوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ فرانسیسی فوج یروشلم پر حملہ کرنے کے لئے بھند تھی مگر دوسری فوجوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اختلافی مسئلہ پھر شاہ انگلستان کے سامنے پیش ہوا۔ رچرڈ، یروشلم سے پہلے ہی ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے فرانسیسیوں کو جواب دیا۔

”اس مقام سے آگے پانی کے تمام ذرائع سلطان کے لشکریوں نے بند کر دئے ہیں؛ انہیں برباد کر دیا ہے۔ شہر کے قریب پانی مفقود ہے۔ ہم اپنے گھوڑوں کو پانی کہاں سے پلائیں گے۔“

اس پر ایک فرانسیسی سردار نے کہا۔ ”ہمیں گھواندی سے پانی مل سکتا جو شہر سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔“

شاہ رچرڈ نے دریافت کیا۔ ”ہم گھوڑوں کو وہاں سے کیسے پانی پلا سکتے ہیں؟“

ضدی فرانسیسی سردار نے جواب دیا۔ ”ہم اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ محاصرہ کے دوران فوج کا ایک حصہ گھوڑوں کو پانی پلانے ندی پر جائے گا اور دوسرا حصہ محاصرہ جاری رکھے گا۔ اس طرح دن میں ایک بار لشکر کے دونوں حصے باری باری ندی پر جا کر گھوڑوں کو پانی پلا سکتے ہیں۔“

شاہ رچرڈ چڑ گیا۔ اس نے چیخ کے کہا۔ ”جب ایک حصہ فوج گھوڑوں کو پانی پلانے گیا ہو گا اس وقت سلطان کی فوج شہر سے نکل کر ہماری آدھی فوج کو فنا کر دے گی۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت سمندر سے بہت دور ہیں اگر ہم اور آگے بڑھے تو ترک (فرنگی سلطانی لشکریوں کو ترک کہتے تھے حالانکہ لشکر میں کرد اور عربی لشکری بھی کافی تعداد میں تھے) ہماری

طیب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا چنانچہ وہ منہ پھلائے سلطان کے بستر مرگ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

قضا روزوں کی ادائیگی سے سلطان کی صحت اور بگڑ گئی اور وہ وسط صفر 589ء میں پھر بیمار پڑ گیا۔ علالت اگرچہ معمولی بخار سے شروع ہوئی مگر بہت جلد مرض الموت کی شکل اختیار کر لی۔ وفات سے تین دن پہلے غشی طاری ہوئی جو آخر تک قائم رہی نزع کے عالم میں شیخ ابو جعفر نے قرآن کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچے

هو الذی لا اله الا انتہ هو عالم الغیب والشہادہ تو سلطان نے اک دم آنکھیں کھول دیں اور زبان سے نکلا۔

”سچ ہے۔“

پھر لبوں پر تبسم اور چہرے پر بشارت طاری ہوئی اور پھر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ صفر 589ھ کی ستائیسویں تاریخ دو شنبہ کا دن اور فجر کا وقت تھا۔

سلطان کی موت تھا سلطان صلاح الدین ایوبی فرمانروائے مصر و شام کے موت نہ تھی بلکہ اس مجاہد کی موت تھی جس نے کبھی یہ آرزو کی تھی کہ

”اگر خدا باقی ساحلی علاقہ کو بھی فتح کرا دے تو میں اس کو تقسیم کر

کے سب سے رخصت ہو کر سمندر کے جزائر کی تلاش میں نکل

جاؤں تاکہ پھر کوئی روئے زمین پر منکر خدا باقی نہ رہے یا اسی راہ

میں مجھے موت آجائے۔“

پس وہ صلاح الدین جس نے میدان جہاد میں 564ھ میں اس وقت قدم رکھا بدمشق سے اس کے چچا اسد الدین شیرکوہ کی سرداری میں شامی لشکر مصر جا رہا تھا در پھر زندگی کے پورے پچیس سال گھوڑے کی پیٹھ پر گزارنے کے بعد 589ھ میں دت کو گلے لگایا اسے بیماری کیسے مار سکتی تھی وہ تو ان پچیس سالوں میں مسلسل جہاد کے دوران شہادت کے ارتقائی زینے طے کرتا رہا اور 589ھ میں شہادت کے اس رجب پر پہنچ گیا جس کی اس نے آرزو کی تھی۔

صلح نامہ کے فوراً بعد شاہ رچرڈ ناکام و نامراد انگلستان واپس چلا گیا۔ سلطان صلاح الدین نے ہر محاذ اور ہر مہم میں نصرائیوں کو شکست دی تھی۔ نصرائیوں کا یہ ارمان ہی رہ گیا کہ وہ سلطان کو شکست دے کر بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوں۔ سلطان نے پورے دول یورپ کے لشکروں سے تو ہزیمت نہ اٹھائی مگر زندگی کے میدان میں دست اجل نے اسے شکست دیدی۔

ادھر گزشتہ کئی سال سے سلطان کی صحت برابر بگڑتی جا رہی تھی۔ جہاد کی پر محنت اور مشقت آمیز زندگی کی وجہ سے سکون اور آرام کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ سلطان نے دمشق واپس آنے کے بعد قضا روزوں کو پورا کرنا شروع کیا۔ روزے مزاج کے موافق نہ پڑتے تھے۔

طیب شاہی نے دست بستہ عرض کیا۔

”روزے رکھنے سے صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ اس لئے قضا روزے فی الحال موقوف فرمائے جائیں؟“

سلطان نے جواب دیا۔

”معلوم نہیں آئندہ کیا پیش آئے۔ اس لئے روزے موقوف نہیں کئے جاسکتے۔“

طیب اس کی بگڑتی ہوئی حالت سے پہلے ہی پریشان تھا۔ چنانچہ اس نے سختی سے

تاکید کی۔

”سلطان معظم، میں آپ کا طیب ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ روزے موقوف کئے جائیں۔“

سلطان نے طیب کی جرات پر اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ پھر ہلکا سا مسکرا

اور بولا۔

”طیب کا فرض مشورہ دینا ہے اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا مریض کا کام ہے۔ کیا یہ نہیں چاہتے کہ تمہارا سلطان میدان جنگ میں شہید ہو یا پھر نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی میں موت کو لبیک کہے۔؟“

صلاح الدین کی موت اس مجاہد جلیل کی موت تھی جس کی تلوار تمام عمر خدا کی راہ میں بے نیام رہی جس نے اپنا گھر اور ساری کائنات اس کی راہ میں لٹا دی اور اسلام کی راہ میں تنہا متحدہ عیسائی دنیا کا مقابلہ کیا اور مرتے مرتے تثلیث کے مقابلہ میں اسلام کا پرچم سر بلند رکھا۔ اس لئے اس کی موت سے ساری دنیائے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس کے غم میں غم زدہ نہ ہوا ہو اور نہ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس کے ماتم میں اشک بار نہ ہوئی ہو۔

پھر سلطان کو بیماری کیسے مار سکتی تھی جس کی سلطنت شام، فلسطین اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی جس نے اپنی زندگی میں بے شمار دولت راہ خدا میں تقسیم کی مگر جب موت کو گلے لگایا تو اس کے پاس ایک دینار اور چالیس درہم کے علاوہ کچھ نہ تھا اور قاضی فاضل نے حلال اور طیب مال سے اس کی تجنیزو تکفین کا انتظام کیا۔

آئیے انسان کو ہم مردہ کیسے کہہ سکتے ہیں وہ تو شہید ہوا اور شہید کبھی نہیں مرتے۔ سلطان کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ اخلاق و سیرت، شعائر دین کے احترام، عدل پروری، شجاعت، حلم اور بردباری اور دینی خدمات میں آپ اپنی مثال نظر آتا ہے۔ اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ دنیائے اسلام میں یوں تو بہت سے جلیل القدر سلاطین پیدا ہوئے مگر جو مرنے کے بعد آج تک مسلمانوں کے دلوں اور مجاہدین کی تاریخوں میں زندہ ہیں وہ صرف دو سلطان ہیں۔ ان میں ایک سلطان ٹیپو شہید جس نے میدان جنگ میں جان جان آفرین کے سپرد کی اور دوسرا سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی جس نے اگرچہ میدان جنگ میں وفات نہیں پائی مگر جس کی موت کسی شہید سے کسی طرح کم نہیں۔

ختم شد